4

مرقاۃ المفاتیح

شرح اردو

مشکوۃ المصابیح

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

مکتبۃ رحمانیۃ

مرقاۃ المفاتیح اردو

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ھجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد چہارم

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743
MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اردو (جلد چہارم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

كِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازوں کا بیان

جنازہ کا لفظ جیم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ مستعمل ہے لیکن کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ اگر جیم پر فتحہ پڑھیں تو میت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جنازہ بالکسر تخت اور چارپائی کو کہتے ہیں جس پر میت کو رکھا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے بالکل اس کے برعکس کہا ہے یعنی جیم بالفتح چارپائی کو اور جیم بالکسر میت کو کہتے ہیں۔ جنائز میں جیم کا فتحہ ہے' کسرہ درست نہیں ہے۔

بَابُ عِيَادَةِ الْمَرِيضِ وَثَوَابِ الْمَرَضِ

عیادتِ مریض اور بیماری کا ثواب

الفصل الاول :

۱۵۲۳: وَعَنْ اَبِىْ مُوسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَعُوْدُوا الْمَرِيْضَ وَفُكُّوا الْعَانِيَ۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۲/۱۰ حدیث رقم ۵٦٤٩۔ والدارمی ۲۹٤/۲ حدیث رقم ۲٤٦٥۔ واحمد فی المسند ۲۹٤/٤

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بھوکے کو کھلاؤ اور مریض کی عیادت کرو اور قیدی کو (دشمن کے ہاتھوں سے) رہائی دلاؤ۔ (بخاری)

تشریح: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان تین باتوں پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں احکام وجوب علی الکفایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی نے بھی ادا کر دیا تو دوسروں کے ذمے سے ساقط ہو جاتا ہے یعنی باقی حضرات گناہ گار نہیں ہوں گے۔

اَطْعِمُوا الْجَائِعَ : بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ صاحب مرقاۃؒ نے جائع کی تشریح (المضطر والمسكين والفقير) کے ساتھ کی ہے۔

مسلمانوں کے مسلمانوں پر حقوق کا ذکر حدیث کی روشنی میں

۱۵۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ خَمْسٌ رَدُّ السَّلَامِ وَعِیَادَةُ الْمَرِیْضِ وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِیْتُ الْعَاطِسِ۔[متفق علیہ]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۲/۳۔ حدیث رقم ۱۲۴۰۔ ومسلم فی صحیحه ۱۷۰۴/٤ حدیث رقم (٤۔۲۱۶۲)۔ وابوداؤد ۲۸۸/۵ حدیث رقم ۵۰۳۰ وابن ماجه ٤٦١/١ حدیث رقم ١٤٣٥

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: ① سلام کا جواب دینا۔ ② مریض کی عیادت کرنا۔ ③ جنازے کی پیروی کرنا۔ ④ دعوت کا قبول کرنا۔ ⑤ چھینک مارنے والے کا جواب دینا۔

مسلمانوں کے حقوق پر مشتمل دوسری روایت جس میں چھ چیزوں کا ذکر ہے

۱۵۲۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ قِیْلَ مَاهُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا لَقِیْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ وَاِذَا دَعَاكَ فَاَجِبْهُ وَاِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهٗ وَ اِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۷۰۵/٤ حدیث رقم (۵۔۲۱۶۲)۔ والنسائی ٥٣/٤ حدیث رقم ۱۹۳۸۔ وابن ماجه ٤٦١/١ حدیث رقم ۱٤٣٣۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! وہ کون سے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت تو مسلمان سے ملاقات کرے تو سلام کر اور جس وقت وہ تجھ کو بلائے تو دعوت قبول کر اور جب کوئی تجھ سے خیر خواہی چاہے تو خیر خواہی کر اور جب وہ چھینک مار کر الحمدللہ کہے تو تو اس کو جواباً یرحمک اللہ کہہ اور جب وہ بیمار ہو جائے تو تو اس کی عیادت کر اور جب وہ مر جائے تو اس کے پیچھے جا (یعنی نمازِ جنازہ و دفن کے لئے ساتھ جائے)۔

سات چیزوں کے کرنے اور سات چیزوں سے باز رہنے کا حکم

۱۵۲۶: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اَمَرَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ اَمَرَنَا بِعِیَادَةِ الْمَرِیْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِیْتِ الْعَاطِسِ وَرَدِّ السَّلَامِ وَاِجَابَةِ الدَّاعِیْ وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ وَنَصْرِ الْمَظْلُوْمِ وَنَهَانَا عَنْ خَاتَمِ الذَّهَبِ وَعَنِ الْحَرِیْرِ وَالْاِسْتَبْرَقِ وَالدِّیْبَاجِ وَالْمِیْثَرَةِ الْحَمْرَاءِ

وَالْقَسِّيِّ وَاٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَنِ الشُّرْبِ فِي الْفِضَّةِ فَاِنَّهٗ مَنْ شَرِبَ فِيْهَا فِي الدُّنْيَا لَمْ يَشْرَبْ فِيْهَا فِي الْاٰخِرَةِ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۲/۳۔ حدیث رقم ۱۲۳۹۔ ومسلم فی صحیحه ۱٦۳۵/۳ حدیث رقم (۳۔٦٦ ۲۰)۔ والترمذی فی السنن ۱۵۸/۵ حدیث رقم ۲۸۰۹۔ والنسائی ۵٤/٤ حدیث رقم ۱۹۳۹۔

ترجمہ :حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کا حکم فرمایا اور سات چیزوں سے منع فرمایا ہے اور جن سات چیزوں کا حکم فرمایا وہ سات چیزیں یہ ہیں: ① مریض کی عیادت کرنا۔ ② جنازے کا اتباع کرنا۔ ③ چھینک مارنے والے کا جواب دینا۔ ④ سلام کا جواب دینا۔ ⑤ دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنا۔ ⑥ قسم کھانے والے کی قسم کو سچا کرنا۔ ⑦ مظلوم کی مدد کرنا اور آپ ﷺ نے ہمیں سات چیزوں سے منع فرمایا: ① سونے کی انگوٹھی پہننے سے۔ ② ریشم پہننے سے۔ ③ اور اطلس سے اور لاہی سے (الحریر والاستبرق والدیباج) یہ تینوں ریشمی کپڑے کی اقسام ہیں۔ ④ اور زین پوش سرخ (کپڑے) کے پہننے سے اور قسی کے کپڑے پہننے سے اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے اور ایک روایت میں چاندی کے برتن میں پینے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص دنیا میں اس برتن سے پیئے گا آخرت میں وہ اس برتن سے نہیں پیئے گا۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے

مریض کی عیادت کرنے پر انعام

۱۵۲۷: ۵/۱۴۲۷ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۹۸۹/٤۔ حدیث رقم (٤١۔٢٥٦٨)۔ والترمذی فی السنن ۲۹۹/۳ حدیث رقم ۹٦۷۔ وابن ماجه ٤٦۳/۱ حدیث رقم ۱٤٤۲۔ واحمد فی المسند ۲۷۹/۵۔

ترجمہ :حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی مسلمان اپنے بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ اس وقت تک بہشت (جنت) کے میوے کھاتا رہتا ہے جب تک واپس نہ لوٹ آئے۔

تشریح: فی خرفة الجنة: خاء کے ضمہ اور راء کے سکون کے ساتھ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① یعنی اس کے باغات میں میوہ خوری کرتا رہتا ہے۔ ② وہ جنت کے پھلوں کو چننے میں لگا رہتا ہے۔ ''النهاية'' میں ہے ''خرف الثمرة'' کا معنی ''پھل چننا'' ہے اور ''خرفه'' سے مراد کھجوریں ہیں جو پکنے کے وقت توڑی جاتی ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: عائد المریض علی مخارف الجنة حتی یرجع۔

المخارف : ''مخرف'' کی جمع ہے فتحہ کے ساتھ ہے اس سے مراد نخلستان ہے۔ یعنی عیادت کرنے والا اس ثواب کو اس طرح اکٹھا کرتا ہے گویا کہ وہ (کھجوروں کے باغ) میں ہے جس کا وہ پھل چن رہا ہے۔

قاضی کہتے ہیں ''خرفه'' سے مراد جو پھل چنے جائیں۔ اس سے بستان (باغ) مراد لینا بھی جائز ہے کیونکہ وہ اس کا محل

ہے۔اس کی دلیل حدیث کے یہ الفاظ ہیں: "علی مخارف الجنة" ہے یا مضاف مقدر ہے۔"ای فی مواضع خرفتها" "یعنی اس کی پھل چننے کی جگہوں میں"۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ مریض کی عیادت کر کے ثواب اکٹھا کرنے کو پھل اکٹھا (چننے) کرنے کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا مریض کی طرف چل کر جانا جنت اور مخارف جنت کو واجب کر دیتا ہے۔مخارف اسم مسبب کا اطلاق سبب پر ہے۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

عیادت نہ کرنے پر خدا کی ناراضگی اور کرنے پر انعام کا ذکر

۱۵۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَّنِیْ عِنْدَهٗ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ يَارَبِّ كَيْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَقَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ يَارَبِّ كَيْفَ اَسْقِيْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهٗ وَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ۔ [رواه مسلم]

أخرجه مسلم في صحيحه ١٩٩٠/٤۔ حديث رقم (٤٣-٥٦٩)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے۔اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے مجھ سے نہ پوچھا۔بندہ کہے گا اے میرے ربّ! میں کس طرح پوچھتا تو تو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے اور بیماری سے پاک ہے۔اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا تو نے نہیں جانا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو نے اس کی حالت دریافت نہیں کی۔اگر تو اس کی حالت پوچھتا تو مجھ کو اس کے پاس پاتا (یعنی میری رضامندی پالیتا) اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔آدمی کہے گا: اے میرے رب! میں کس طرح کھلاتا تو تو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور کسی کا محتاج نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تھا تو تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔اگر تو اس کو کھانا کھلا دیتا۔تو مجھ سے اس کا ثواب حاصل کر لیتا۔اے آدمؑ کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ کہے گا اے میرے رب میں تجھے کس طرح پلاتا اور تو تو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور تجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: اے میرے بندے فلاں آدمی نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو اس کا ثواب میرے پاس پالیتا (یعنی حاصل کر لیتا)۔

تشریح: قوله: ان الله تعالٰى يقول يوم القيامة: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے اس فرمانے (کی کیفیت) کے باب میں متعدد احتمال ہیں: ① فرشتے کے ذریعے فرمائے گا۔ ② عام وحی کے ذریعہ بغیر واسطے کے فرمائے گا۔ ③ مخلوق کے دلوں میں الہام کرے گا۔ ④ زبانِ حال سے فرمائے گا۔

ابن آدم کا یہ کلام بطور عتاب ہوگا۔ اس نے اس کے اولیاء کے حق میں کوتاہی کی ہے۔

قوله: يا ابن آدم مرضت فلم تعدني:

اس کلام سے اللہ تعالیٰ کی مراد اپنے بندے کا بیمار ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی جانب اضافت کرنا اس بندے کی عزت وشرف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بمنزلہ اپنی ذات کے قرار دیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی مریض کی عیادت کرتا ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرتا ہے۔

قوله: يارب! كيف اعودك وأنت رب العالمين:

"وانت رب العالمين" حال ہے۔ جہت اشکال کی تقریر کے لئے ہے جس کو "کیف" متضمن یعنی مرض تو عاجز مریض کے لیے ہوتا ہے اور اے اللہ! تُو تو غالب، قوی اور بادشاہ ہے۔

اگر کہا جائے کہ "كيف اعودك" کی بجائے "كيف تمرض" کیوں نہیں کہا گیا؟ تو اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ یہاں پر کلام کو اس چیز کی طرف پھیر دیا گیا ہے جس پر اسے سرزنش کی جارہی ہے یعنی عبادت پر۔ دوسرا یہ کہ ایسا کہنے سے مرض کی نفی لازم آتی ہے۔

قوله: قال: اما علمت ان عبدی فلاناً مرض فلم تعده' اما علمت انك لو عدته لو جدتني: (یہاں حذفِ مضاف ہے) ای لو جدت رضائي۔ یعنی میری رضامندی کو پاتا۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عاجزی اور انکساری کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **انا عند المنكسرة قلوبهم لاجلي۔** "میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو میری وجہ سے شکستہ دِل ہیں"۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں' اس عبارت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مریض کی عیادت کا ثواب کھانا کھلانے اور پانی پلانے کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ مذکورہ حدیث میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خصوصی طور پر فرمایا ہے کہ "تو مجھے اس کے پاس پاتا"۔ اس میں اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسکین اور عاجز کے زیادہ قریب ہے۔

ایک قول ہے کہ عجز وانکسار وہاں زیادہ لازم ہے اور عیادت عبادت سے افضل ہے اگرچہ دونوں کی شکل وصورت (لکھنے میں) ایک جیسی ہے۔ عیادت کا' رتبہ بڑھ کر ہے یا ایک نقطے کی وجہ سے اور اس اعتبار سے عیادۃ کا درجہ ایک زیادہ ہوا یا آٹھ مراتب بڑھ کر۔ "باء" میں دو درجے ہیں اور یاء میں دس درجے ("باء" کا عدد دو ہے اور "ی" کا عدد (۱۰) ہے۔ دس میں سے دو نفی کر دیں تو باقی آٹھ بچتے ہیں تو یہ آٹھ مراتب مراد ہیں واللہ اعلم)

اس میں "لا يزال عبدی يتقرب" والی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے بڑا ثواب کسی اور عمل کا

وارد نہیں ہوا ہے۔

استطعمتك : یعنی میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا

قوله : قال یا رب کیف اطعمك و انت رب العالمین:
یعنی حالت تو یہ ہے کہ تو کھلاتا اور پلاتا ہے اور تو تو غنی وقوی مطلق ہے۔ خرچ کرنے کی ضرورت تو عاجز کو پڑتی ہے۔

قوله : قال اما علمت انه: ضمیر شان ہے۔

قوله : اما علمت انك لو اطعمته لو جدت ذالك : اس کا مشار الیہ محذوف ہے۔ ای **ثواب اطعا مه** یعنی کھانا کھلانے کا ثواب حاصل کر لیتا۔

استسقیتك: یعنی میں نے تجھ سے پانی طلب کیا۔

فلم تسقی: تاء پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں

استقیك: یہاں پر بھی ضمہ اور فتحہ دونوں ہیں۔

قوله: وا نت رب العالمین: یعنی تو ان کی پرورش کرنے والا ہے تو کسی چیز کا محتاج نہیں ہے چہ جائیکہ تو کھائے پیے۔

قوله: اما تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لیے ہے۔

إنك : ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ایک نسخہ میں ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

وجدت : یہاں لام کے بغیر ہے۔ یہاں اشارہ ہے کہ (جواب شرط میں) لام کو حذف کرنا جائز ہے۔
یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا اور اس حدیث میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کو جاننے والا ہے۔ اس کے علم میں کلیات وجزیات برابر ہیں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے تا کہ یہ آزمائش ان کے گناہوں کا کفارہ اور درجات کی بلندی کا سبب بنے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

بیمار کی فضیلت

۱۵۲۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی اَعْرَابِیٍّ یَعُوْدُهٗ وَكَانَ اِذَا دَخَلَ عَلٰی مَرِیْضٍ یَعُوْدُهٗ قَالَ لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ فَقَالَ لَهٗ لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ قَالَ كَلَّا بَلْ حُمّٰی تَفُوْرُ عَلٰی شَیْخٍ كَبِیْرٍ تُزِیْرُهُ الْقُبُوْرَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَنَعَمْ اِذًا۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۱۲۳۔ حدیث رقم ۵۶۶۲۔ واحمد فی المسند ۳/۲۰۵۔

ترجمہ : ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیہاتی کی خبر گیری کے لیے تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار کے پاس حال پوچھنے کے لئے جاتے تو فرماتے بیماری سے غم نہ کھاؤ' یہ پاک کرنے والی ہے' اگر اللہ نے چاہا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کے لیے یہی الفاظ فرمائے اور فرمایا کوئی ڈر نہیں ہے بیماری پاک کرنے والی ہے' اگر اللہ نے چاہا' دیہاتی نے کہا ہر گز کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو بخار ہے جو بوڑھے آدمی پر جوش مارتا ہے اور یہ بخار اس کو قبر

میں لے جائے گا (یعنی مار دے گا) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اسی طرح ہوگا (یعنی اگر تمہارا یہی خیال ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا) یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔

تشریح: قوله دخل على اعرابى: یعنی ایک دیہاتی کے پاس۔

یعوده: اس میں آپ ﷺ کے کمال تواضع کا ذکر ہے جس میں محبت وشفقت پنہاں ہے اور اپنی امت کے لیے ایک تعلیم اور سبق ہے۔

قوله: (وكان) یعنی آپ ﷺ کی عادت تھی۔

قوله: اذا دخل على مريض يعوده قال لابأس۔

بأس۔ اس میں ہمزہ اور الف دونوں جائز ہیں۔

قوله (طهور) یعنی حقیقت میں اس بیماری کی وجہ سے تجھ پر کوئی مشقت اور نقصان نہیں ہے کیونکہ یہ بیماری تجھے گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔

قوله: ان شاء الله: یہ برکت کے لیے کہا یا پھر معاملے کی سپردگی کے لیے فرمایا یا پھر مشروط کرنے کے لیے ارشاد فرمایا کیونکہ بیماری "طهور" اس وقت ہوگی جب وہ صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہوگا۔

قوله: (لابأس ان شاء الله قال كلا) اس بدو نے اپنی ناسمجھی اور درشتی کی بنا پر کہا۔ بات ایسے نہیں جیسے آپ نے کی ہے۔ یا آپ ایسی بات نہ کریں۔ کیونکہ "كلا" محتمل کفر بھی ہے اور عدم محتمل کفر بھی ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہ انتہائی گنوار قسم کا دیہاتی تھا۔ اس اعرابی نے آپؐ کے فرمان کا مکمل رد اور تکذیب نہیں کی اور نہ ہی وہ نومیدی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

قوله: بل حمى تفور على شيخ كبير۔ یعنی بخار میرے جسم میں ایسے شعلے مار رہا ہے جیسے ہنڈیا میں پانی ابلتا ہے اور "شیخ کبیر" کہنے میں اشارہ تھا اپنے کم عقل اور اللہ کی قدرت سے ناامید ہونے کی طرف۔

قوله: تزيره القبور: یعنی بخار اسے قبروں کی زیارت کرانے پر مجبور کر رہا ہے اور اسے اصحاب قبور میں سے کرنا چاہتا ہے۔

قوله فقال النبى ﷺ فنعم اذا: یعنی غصے میں فرمایا،

قوله: فنعم: عین کے فتح اور کسرہ کے ساتھ ہے۔

إذا: ایک نسخے میں "إذن" ہے۔ اى اذن هذا المرض ليس بمطهره[ك] كما قلت...... یعنی اس وقت یہ بیماری تیرے لیے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوگی جیسا کہ تو نے خود کہا ہے۔ جب تو صرف ناامیدی اور کفران نعمت ہی پر مصر ہے تو تجھے وہی حاصل ہوگا جو تو نے کہا ہے' کیونکہ کفرانِ نعمت کی صرف یہی سزا ہے کہ وہ نعمت چھن جاتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: 'فاءٗ' کا ترتب محذوف عبارت پر ہے اور "نعم" آپ ﷺ کے فرمان کی تقریر ہے یعنی آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں نے تجھے لاباس کہہ کر یہ کہا تھا کہ یہ بیماری تجھے گناہوں سے پاک کر دیگی تو صبر کر اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر

لیکن تو نے تو ناامیدی پر کمر کس رکھی ہے تو جیسا تیرا گمان ہے ویسا ہی ہوگا۔ تو نے اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اللہ کی نعمت کا رد بھی کیا ہے اور اپنی اس بات کو تو مسجع کر کے بیان کر رہا ہے۔ یہ بات آپؐ نے اسے غصے سے کہی ہے۔

تخریج: میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام نسائی نے "**عمل یوم و لیلة**" میں ذکر کیا ہے۔

بیمار کے لیے دُعائیہ کلمات

۱۵۳۰: **عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَكٰى مِنَّا اِنْسَانٌ مَسَحَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَالَ اَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا۔** [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۳۱/۱۰۔ حديث رقم ۵۶۷۵۔ ومسلم في صحيحه ۱۲۷۱/۴ حديث رقم (۴۶۔۲۱۹۱) وابوداوٗد في السنن ۲۱۷/۴ حديث رقم ۳۸۹۰۔ والترمذي ۳۰۳/۳ حديث رقم ۹۷۳۔ وابن ماجه ۵۱۷/۱۔ حديث رقم ۱۶۱۹ واحمد في المسند ۷۶/۱۔

ترجمه :حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہم میں سے کوئی آدمی بیمار ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دایاں ہاتھ اس پر پھیرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے اے لوگوں کے (پروردگار) بیماری کو دور کر دے اور تو شفا دینے والا ہے شفا دیدے۔ تیری شفاء کے علاوہ کوئی شفا نہیں ہے' جو بیماری کو دور کر دے۔

تشریح:**قوله: اذهب البأس**: یعنی بیماری کی شدت کو ختم کر دے۔ صحیح بخاری میں "**اللهم اذهب الباس**" کے الفاظ ہیں' یعنی باس الف کے ساتھ ہے: "**رب الناس**" میں "**الناس**" کے سجع کی رعایت کرتے ہوئے۔

"**رب الناس**" صرف ندا کی بنا پر منصوب ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ "**باس**" ہمزہ کے بغیر کیونکہ اس کی اصل ہمزہ ہے۔

قوله : واشف انت الشافي : آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ **انت الممرض** تو مرض یعنی تو بیمار کرنے والا ہے، آپ نے ایسا ادباً کیا' جیسا کہ اس آیت: ﴿ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴾[الشعراء۔۸۹] میں کہا گیا ہے کہ (ادب کا لحاظ رکھا گیا) جبکہ ہر آدمی ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتا اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی دعا میں صراحتاً یوں کہا ہے: **الذی أمرضنی يشفينی**۔ بخاری کی ایک روایت میں "**اشفه و انت الشافي**" کے الفاظ ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اکثر راویوں نے اسی طرح 'واؤ' کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بعض نے اسے حذف کے ساتھ کیا ہے۔ "**اشفه**" میں ضمیر "مریض" کی طرف راجع ہے یا پھر یہ ہائے سکتہ ہے۔ اور اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کو اس نام سے موسوم کرنے کا جواز حاصل ہوتا ہے جو کہ قرآن پاک میں نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ سے اللہ کا نام ثابت کرنے کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں:

① اس نام میں کسی قسم کا نقص نہ ہو ② اس نام کی اصل قرآن پاک میں موجود ہو۔ اور یہ دونوں شرطیں اس نام میں موجود ہیں۔ (نہ تو اس میں کوئی نقص ہے) اور اس کی اصل قرآن پاک کی اس آیت میں ہے: ﴿ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴾

قوله : لا شفاء الا شفاوك : یہ جملہ "انت الشافی" کی تاکید ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "لا شفاءَ" مد کے ساتھ مبنی بر فتح ہے۔اس کی خبر محذوف ہے۔تقدیر یہ تھی: "لا شفاء لنا" یہ جملہ اور "إلا شفاء ك" مرفوع ہے کیونکہ "لا شفاءَ" کے محل سے بدل ہے۔اور صحیح بخاری میں "لا شافي الا انت" کے الفاظ ہیں۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی علاج معالجہ اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہوسکتا جب تک اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر شامل حال نہ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "لا شفاء" میں حصر ہے اور یہ جملہ "انت الشافي" کی تاکید ہے کیونکہ جب مبتدا کی خبر معرف باللام ہو تو حصر کا افادہ کرتی ہے۔کیونکہ حکیم کی کسی تدبیر اور دوا کا اثر مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا جس وقت تک اللہ کی تقدیر میں شفا نہ لکھی ہو۔

قوله : شفاء : لا يغادر سقما : یہ جملہ آپ کے فرمان "اشف" کا تکملہ ہے۔اور دونوں مذکورہ جملے جو فعل اور مفعول مطلق کے درمیان واقع ہوئے ہیں وہ جملہ معترضہ ہیں اور آپ ﷺ کا فرمان: "لا يغادر" غین معجمہ کے ساتھ ہے۔اس کا معنی ہے: لا يترك یعنی نہ چھوڑتے اور سقمًا میں "س" اور قاف دونوں مفتوح ہیں۔سین پر ضمہ اور قاف پر سکون بھی جائز ہے۔اس کا معنی ہے بیماری اور "سقمًا" نکرہ ہے اور یہ (تنوین تنکیر) تقلیل کے لی ہے۔حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "شفاء" اشف کی وجہ سے منصوب ہے اور مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر اس پر رفع بھی جائز ہے یعنی تقدیر یہ تھی: "هذا شفا" یا "هو شفاء" اس جملہ میں تقیید کا فائدہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک بیماری سے تو شفا مل جاتی ہے لیکن اس کے بعد کوئی اور بیماری ابھر آتی ہے۔اس لیے آپ شفائے مطلق کا سوال کرتے تھے نہ کہ مطلق شفاء کا سوال کرتے تھے۔

پھوڑے پھنسی پر دم کرنے کا طریقہ

۱۵۳۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ إِذَا اشْتَكَى الْإِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ أَوْ كَانَتْ بِهِ قُرْحَةٌ أَوْجُرْحٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِصْبَعِهِ بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيقَةِ بَعْضِنَا لِيُشْفٰى سَقِيْمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۰٦/۱۰ حديث رقم ۵۷۴۵۔ و مسلم فی صحيحه ۱۷۲۴/۴ حديث رقم (۵۴۔۲۱۹۴) وابوداوٗد فی السنن ۲۱۹/۴ حديث رقم ۳۸۹۵ وابن ماجه ۱۱٦۳/۲ حديث رقم ۳۵۲۱۔ واحمد فی المسند ۹۳/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے جب (کوئی) آدمی اپنے بدن کے کسی حصہ میں تکلیف کی شکایت کرتا تھا یا اس کے کسی عضو پر پھوڑا یا زخم ہوتا تھا تو نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ کی انگلی سے اشارہ کر کے فرماتے میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ برکت حاصل کرتا ہوں۔یہ زمین کی مٹی ہمارے بعض (آدمیوں) کے لعاب کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔تاکہ پروردگار کے حکم سے شفا ہو جائے۔یہ بخاری اور مسلم سے روایت ہے۔

3

تشریح:قولہ قالت کان ”کان“ : زائدہ ہے یا پھر اس میں ضمیر شان ہے جو مابعد کی تفسیر ہے۔

اذااشتکی :یعنی شکایت کرتا۔

الشیٔ: شیٔ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور ”شیٔ“ سے مراد عضو ہے۔

منہ: ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ای من جسدہ ۔یعنی کوئی ایک عضو انسان کے جسم میں ہے۔

او کانت بہ۔بہ سے مراد انسان ہے

قرحۃ: قاف پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں' پھوڑے کو کہتے ہیں۔

جرح: ضمہ کے ساتھ۔تلوار وغیرہ کے زخم کو کہتے ہیں۔

قال النبیؐ بأصبعہ : ای اشاربھا قائلا :یعنی آپؐ کہتے ہوئے اشارہ فرماتے

بسم اللّٰہ: یعنی میں بسم اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرتا ہوں۔

تربۃ ارضنا: ”تربۃ ھی مبتداء محذوف کی خبر ہے اور جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔ای ھذہ تربۃ ارضنا ممزوجۃ بریقۃ بعضنا۔یہ ہماری زمین کی مٹی ہے جس میں ہمارا لعاب ملا ہوا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ دم کرتے وقت ”تفل“ فرماتے تھے۔امام قرطبی فرماتے ہیں: اس حدیث میں دم کے جائز ہونے کی دلیل ہے ہر قسم کی تکلیف سے اور یہ ان کے ہاں معروف تھا۔فرماتے ہیں کہ نبی نے اپنی شہادت والی انگلی متاثرہ جگہ پر رکھی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دَم کرتے وقت ایسا کرنا مستحب ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں ہماری زمین سے مراد ساری زمین ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے مدینہ کی مٹی مراد ہے جو برکت کے لیے خاص ہے نبی کریم ﷺ اپنی شہادت کی انگلی پر اپنا لعاب لگاتے تھے اور پھر اسے مٹی کے ساتھ ملا کر زخم پر یا مریض پر پھیرتے تھے۔اور آپ ہاتھ پھیرتے وقت مذکورہ کلمات کہتے تھے۔

اشرف کہتے ہیں: یہ حدیث دم کے جواز پر دلالت کرتی ہے بشرطیکہ اس میں شئی محرم مثلاً جادو اور کفریہ کلمات نہ ہوں اھ۔

اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ دم کے کلمات خواہ عربی ہوں یا غیر عربی ہوں مگر ایسے نہ ہوں کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے یا انہیں صحیح طریقے سے ادا نہ کیا گیا ہو۔چاروں مذاہب کے ائمہ کی ایک جماعت نے اس کی حرمت کی صراحت کی ہے۔ کیونکہ کفریہ کلمات کے شامل ہونے کا احتمال ہے۔

امام تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آپ کے فعل اور قول سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زمین سے آدم کی فطرت کی طرف اشارہ ہے اور ہمارے لعاب سے اشارہ ہے اس نطفے کی طرف جس سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے گویا کہ آپ لسانِ حال سے عاجزی کر رہے ہیں اور اپنے کلام کا مدعا یہ پیش کر رہے ہیں کہ تو نے اصل اول کو مٹی سے پیدا کیا پھر تو نے اس کی ذریت کو گندے پانی سے انوکھے طریقہ پر پیدا فرمایا۔تو جس آدمی کی حقیقت ایسی ہو اسے شفا دینا تیرے لیے بہت آسان ہے اور تجھ پر یہ بھی آسان ہے کہ تو عافیت کا معاملہ کرتے ہوئے احسان کر دے اس شخص پر جس کی زندگی اور موت تیری ملک میں برابر ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ طبی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پھوڑے وغیرہ کے پکنے اور مزاج کی تبدیلی میں انسانی لعاب مددگار ثابت ہوتا ہے اور وطن کی مٹی مزاج اصلی کو برقرار رکھنے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔اسی طرح بیماریوں کو دفع کرنے میں بھی وطن کی مٹی کا بہت کردار ہوتا ہے۔اسی لیے ''تیسر المسافرین'' میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ مسافر اگر اپنے ساتھ وطن کا پانی لے جانے سے عاجز ہے تو اپنے ساتھ مٹی ہی لے جائے تاکہ غیر وطن میں پہنچ کر اس مٹی کو پانی کے برتن میں ڈال کر وہ پانی پیے تاکہ تغیر مزاج سے مامون رہے۔پھر یہ کہ دم اور عزائم (تعویزات) کے کیسے عجیب وغریب اثرات ہوتے ہیں کہ عقل ان کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ہر آدمی اپنے پانی کے گھاٹ کو جانتا ہے اور جو کچھ برتن میں ہوتا ہے وہی اس سے چھلکتا ہے۔

"بأصبعه" محلاً '' قال '' کے فاعل سے حال ہے۔''تربة ارضنا'' محذوف مبتدا "هذه" کی خبر ہے"بريقة" میں باء محذوف کے متعلق ہے اور وہ محذوف یا تو دوسری خبر ہے یا پھر حال ہے اور اشارہ کا معنی اس میں عامل ہے۔ای قال النبی مشیرا باصبعه (یعنی نبی ﷺ نے اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:)"بسم الله لهذاتربة ارضنا محجونة بريقة بعضنا قلنا بهذا القول أو صنعنا هذا الصنيع"۔

قوله يشفى سقيمنا امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس ترکیب کے لحاظ سے بسم اللہ واضح طور پر قول کا مقولہ ہے۔تو جائز ہے کہ بسم اللہ دوسرا حال مترادفه یامتدمتداخله ہو'اور تقدیری عبارت یوں ہو: قال متبر کا: بسم اللہ کہ آپ نے''تبرکاً بسم اللہ'' کہا۔اس ترکیب سے لازم آتا ہے کہ''بسم اللہ'' قول کا مقولہ ہے اور "تربة ارضنا" تو واضح مقولہ ہے۔''تربة ارضنا" اور ريقة بعضنا میں جو اضافت ہے یہ اختصاص پر دلالت کرتی ہے۔اور یہ کہ یہ مٹی اور لعاب ایک محترم جگہ کے ساتھ خاص ہیں بلکہ صرف مقام ہی نہیں نفس شریفہ مقدسہ وطاہرہ یعنی حضرت محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔

اور ترمذی کے علاوہ دوسری جماعت کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: "وريقة بعضنا" یعنی واؤ کے ساتھ۔اس کی تقدیر یہ ہوگی: مزجت احداهما بالاخرى کہ ان میں سے (یعنی مٹی اور لعاب) ہر ایک دوسرے سے ملایا گیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں'' يشفى "بصیغۂ مجہول ضبط کیا گیا ہے اور''سقيمنا" مرفوع ہے نائب فاعل ہونے کی وجہ سے، دوسرا اعراب یہ ہے کہ يشفى معروف کا صیغہ ہے فاعل مقدر ہے اور''سقيمنا" اس کا مفعول ہے۔

قوله: باذن ربنا یعنی حقیقت میں شفا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے خواہ سبب دعا ہو'دوا ہو یا کچھ اور ہو۔تخریج: امام میرک فرماتے ہیں کہ اسے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور "باذن ربنا" کے الفاظ میں امام بخاری منفرد ہیں۔(یعنی یہ الفاظ صرف بخاری شریف میں ہیں) اور بخاری کی ایک روایت میں'' باذن اللہ'' کے الفاظ ہیں۔میں کہتا ہوں کہ اسی لیے حدیث کو"حصن" میں صرف مسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

آیاتِ قرآنیہ پڑھ کر دَم کرنا مسنون ہے (حدیث سے ثابت ہے)

۱۵۳۲ وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اشْتَكَى نَفَثَ عَلَى نَفْسِهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ

وَمَسَحَ عَنْهُ بِيَدِهٖ فَلَمَّا اشْتَكٰى وَجَعَهُ الَّذِىْ تُوُفِّىَ فِيْهِ كُنْتُ أَنْفُثُ عَلَيْهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ الَّتِىْ كَانَ يَنْفُثُ وَأَمْسَحُ بِيَدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (متفق عليه وفى رواية لمسلم) قَالَتْ كَانَ إِذَا مَرِضَ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهٖ نَفَثَ عَلَيْهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۶/۱۰۔ حدیث رقم ۵۷۴۵۔ ومسلم فی صحیحه ۱۷۲۴/۴ حدیث رقم (۵۴۔۲۱۹۴) وابوداؤد فی السنن ۲۱۹/۴ حدیث رقم ۳۸۹۵ وابن ماجه ۱۱۶۳/۲ حدیث رقم ۳۵۲۱۔ واحمد فی المسند ۹۳/۶۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوتے تو اپنے اوپر معوذات پڑھ کر دم کرتے تھے اور اپنا ہاتھ اپنے جسم پر پھیرا کرتے تھے' جہاں تک پہنچ سکتا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذات پڑھ کر دم کیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معوذات پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اس طرح (آپ کے بدن مبارک) پر پھیرتی کہ میں معوذات پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر دم کر دیا کرتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک پر پھیرتی۔ یہ روایت بخاری اور مسلم سے منقول ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت سے منقول ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب گھر والوں (اہل والوں) میں سے کوئی آدمی بیمار ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معوذات پڑھ کر دم فرماتے تھے۔

تشریح: قوله: قالت: كان النبیؐ اذا اشتكى: یہ فعل لازم ہے۔ اور بعض اوقات متعدی آتا ہے۔ اس وقت ''وجعًا'' کو تقدیراً مانتے ہیں۔

قوله: نفث على نفسه: نہایہ میں ہے کہ نفث منہ کے ساتھ ہوتا ہے' یہ نفخ کے مشابہ ہوتا ہے اور یہ ''تفل'' سے کم ہوتا ہے کیونکہ تفل میں یہ پھونک کے ساتھ تھوڑا سا لعاب بھی ہوتا ہے

بالمعوذات: واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہے' اور کہا گیا ہے کہ فتحہ بھی پڑھا گیا ہے یعنی آپ ﷺ معوذات کو پڑھ کر اپنے بدن پر پھونکتے اور ساتھ ساتھ لعاب بھی اپنے جسم پر ملتے۔ اور ''معوذات'' سے مراد معوذتین اور ہر وہ آیت مراد ہے جو ان کے مشابہ ہے جیسے [وان يكاد فانی] اور [انی توكلت على الله]۔

یا تثنیہ پر مجازاً جمع کا لفظ بولا اور جو کہتا ہے کہ اقل جمع دو ہیں اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''معوذات'' سے ''معوذتین'' مراد ہیں یہ اس پر مبنی ہے کہ اقل جمع دو کو کہتے ہیں یا پھر مختلف آیات کا اعتبار کر کے جمع کا لفظ بولا ہے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: معوذات سے مراد آخری دو سورتیں اور سورۂ اخلاص ہیں اور سورۂ اخلاص کو تغلیباً معوذات کہا ہے اور یہی قول معتمد ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ (معوذات میں) سورۂ کافرون بھی شامل ہے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں بخاری میں ہے کہ معمر فرماتے ہیں کہ میں نے امام زہریؒ سے پوچھا کہ آپؐ کیسے پھونک مارتے تھے؟ تو امام زہریؒ نے جواب دیا کہ آپ اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے اور جسم پر پھیرتے تھے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''عنہ'' کی ضمیر ''نفث'' کی طرف راجع ہے اور جار مجرور حال ہیں۔ ای نفث علی بعض جسده ثم مسح بیده متجاوزا عن ذلك النفث الی سائر اعضائه۔ یعنی آپؐ اپنے بعض جسم پر پھونک مارتے پھر اپنے ہاتھ کو اپنے تمام اعضاء پر پھیرتے تھے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ کلام اللہ کے ساتھ دم کرنا سنت ہے۔

کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنے مرض الوفات میں یہ دم کرنا شاید اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ میری آخری بیماری ہے۔ اھ۔ اس کلام پر اعتراض ہے۔ تخریج: امام میرک فرماتے ہیں اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد، اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

قوله: وفی روایت لمسلم قالت: کان اذا مرض احد من اهل بیته الغت علیه بالمعوذاك اس حدیث میں مسح کا ذکر نہیں ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ آپ ﷺ ہاتھ بھی پھیرتے تھے اور چونکہ یہ بات نفث سے معلوم ہو رہی ہے اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ بعض اوقات آپ ﷺ صرف پھونک ہی پر اکتفاء کرتے تھے مسح نہیں کرتے تھے۔ زیادہ واضح (قول) اول ہے اور جمع افضل ہے۔

درد والے حصے پر ہاتھ رکھ کر دُعا پڑھنا

۱۵۳۳: وَعَنْ عُثْمَانَ ابْنِ اَبِی الْعَاصِ اَنَّهٗ شَكٰی اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَجَعًا یَجِدُهٗ فِیْ جَسَدِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ضَعْ یَدَكَ عَلَی الَّذِیْ یَاْلَمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَّقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّمَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ قَالَ فَفَعَلْتُ فَاَذْهَبَ اللّٰهُ مَا كَانَ بِیْ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۷۲۸/٤۔ حدیث رقم ٦٧۔۲۲۰۲۔ وابوداوٗد فی السنن ۲۱۸/٤ حدیث رقم ۳۸۹۱۔ والترمذی ۳۵۵/٤ حدیث رقم ۲۰۸۰ وابن ماجه ۱۱٦۳/۲ حدیث رقم ۳۵۲۲۔ واحمد فی المسند ۳۹۰/٦۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے درد کی شکایت کی جس کو وہ اپنے بدن کے اندر پا رہے تھے (یعنی محسوس کر رہے تھے)۔ تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے ارشاد فرمایا کہ اپنا ہاتھ درد والی جگہ پر رکھو اور تین بار بسم اللہ کہو اور سات بار یوں کہو میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اس کی عزت کے ساتھ اور اس کی قدرت کے ساتھ اس چیز کی برائی سے (یعنی درد سے) جو میں اپنے بدن میں پاتا ہوں اور میں ڈرتا ہوں اس کی (یعنی درد کی) زیادتی سے پس حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں میں نے یہ کام کیا تو اللہ رب العزت نے میری بیماری کو دور کر دیا۔

تشریح: قوله: عن عثمان بن ابی العاص، انه شکا الی رسول الله وجعا یجده فی جسده:

اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ جس سے برکت حاصل کی جاتی ہو اس سے دعا کی برکت کی امید پر اس قسم کی شکایت کی جا سکتی ہے۔

"ضع": وضع، یضع سے فعل امر کا صیغہ ہے۔

احاذر: یعنی جس کا مجھے ڈر اور خوف لاحق ہے اور "احذر" سے مبالغہ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس بیماری سے بھی پناہ مانگی گئی ہے جو فی الوقت اس کے بدن میں موجود تھی اور مستقبل میں لاحق ہونے والے متوقع غم وخوف سے بھی پناہ مانگی گئی ہے۔ کیونکہ حذر کا معنی ہے خوفناک چیز سے خوف محسوس کرنا اور اس سے احتراز کرنا۔

قولہ: فاذھب اللہ ماکان بی: یعنی تکلیف اور غم میں صبر کو لازم پکڑتے اور حکم کی بجا آوری کی برکت سے اللہ نے میرے درد وحزن کو دور کر دیا۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: اسے اصحاب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

جبرئیل علیہ السلام کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دم کرنا

۱۵۳۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ جِبْرِیْلَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اَشْتَکَیْتَ فَقَالَ نَعَمْ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِیْكَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّؤْذِیْكَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَیْنٍ حَاسِدٍ اَللّٰهُ یَشْفِیْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِیْكَ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۷۱۸/٤ حدیث رقم (٤٠-٢١٨٦)۔ وابن ماجه فی السنن ١١٦٥/٢ حدیث رقم ٣٥٢٧۔ واحمد فی المسند ١٦٠/٦۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جبرئیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے: کہ اے محمدؐ! کیا آپ بیمار ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں! جبرئیل نے فرمایا میں اللہ کے نام ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دم کرتا ہوں ہر ایسی چیز سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائے ہر شخص کی برائی سے، حسد کرنے والے کی آنکھ سے۔ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفا دے میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر منتر (دم) پڑھتا ہوں۔ یہ روایت مسلم سے منقول ہے۔

تشریح: جبریل: "جیم" فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔

قولہ: فقال: یا محمد أشتکیت؟: یہاں پر ہمزہ استفہام مفتوح ہے اور ہمزہ وصل محذوف ہے ایک قول یہ ہے کہ ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے الف سے بدل کر مد کے ساتھ پڑھا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ استفہام محذوف ہے۔

ابن حجرؒ نے بہت عجیب بات کہی ہے وہ یہ کہ "مذکورہ عبارت میں جو استفہام پوشیدہ ہے وہ تقریر کے لیے ہے" اور یہ قول اس لیے عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اگر استفہام تقریر کے لیے ہوتا تو آپ کو جواب دینے کی ضرورت نہ پڑتی، پھر جبرئیل کا آنا اس بات کو لازم نہیں کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال کی خبر بھی ہو۔

ارقیك: ہمزہ کے فتح اور قاف کے کسرہ کے ساتھ، یہ رقیہ سے ماخوذ ہے۔

یوذیك: میں ہمزہ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ہمزہ کو واؤ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

من شر کل نفس:

او عین: دونوں پرتنوین کے ساتھ ہیں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اضافت کے ساتھ ہیں یعنی حسد کرنے والے کی آنکھ سے اور "أو" شک کا احتمال بھی رکھتا ہے۔لیکن زیادہ واضح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ "تنویع" کے لیے ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ نفس سے مراد خود آدمی کا اپنا نفس ہے یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد "نظر" ہے۔کیونکہ "نظر" پر "نفس" کا لفظ بولا جاتا ہے۔عربی میں اس آدمی کو جسے لوگوں کی نظر لگ جائے "رجل منفوس" کہتے ہیں اس بنا پر آپ کا فرمان " أو من عین حاسد" مختلف الفاظ کے ساتھ تاکید کے لیے ہے' یا پھر راوی کی طرف سے شک کا اظہار کیا گیا ہے۔میرک نے "تصحیح" سے اسی طرح نقل کیا ہے

قوله : اللّٰه یشفیك بسم اللّٰه ارقیك: ان کلمات کا تکرار مبالغہ کے لیے ہے۔ابتدا اور انتہا انہی الفاظ پر کی ہے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ نفع دینے والا صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ حصن کے مصنف نے ترمذی کا حوالہ بھی دیا ہے۔

تکلیف دہ چیزوں سے پناہ پکڑنے کا بیان

۱۵۳۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُعَوِّذُ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّةٍ وَیَقُوْلُ اِنَّ اَبَاکُمَا یُعَوِّذُ بِهَا اِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ۔ (رواه البخاری وفی اکثر نسخ المصابیح بهما علی لفظ التثنیة)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۰۸/۷۔ حدیث رقم ۳۳۷۱۔ والترمذی فی السنن ۳۴۶/۴ حدیث رقم ۲۰۶۰۔ وابن ماجه ۱۱۶۴/۲ حدیث رقم ۳۵۲۵۔ واحمد فی المسند ۲۷۰/۱۔

ترجمہ :حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو اللہ کی پناہ میں دیتے تھے اور یہ دعا پڑھتے تھے کہ تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں اللہ تعالیٰ کے ان کلمات کے ساتھ جو کہ پورے ہیں ہر شیطان کی برائی سے اور ہر زہریلے جانور سے جو مار ڈالنے والا ہے اور ہر نظر لگا دینے والی آنکھ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیل اور اسحٰق علیہما السلام کو ان کلمات کے ساتھ اللہ کی پناہ میں دیا کرتے تھے۔اس کو بخاری نے روایت کیا ہے اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں بهما تثنیه کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

تشریح:قوله : کان رسول اللّٰه یعوذ الحسن و الحسین اعیذکما : یہ "یعوذ" کی تفسیر اور اس کا بیان ہے۔

بکلمات اللّٰه: امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لغت عرب میں "کلمۃ" کلام کے ہر ہر جزو پر بولا جاتا ہے خواہ اسم ہو خواہ فعل ہو خواہ حرف ہو۔(ان سب کو کلمہ کہتے ہیں)~~اسی طرح~~ کلمہ کا اطلاق الفاظ مبسوطہ اور معانی مجموعہ (یعنی جملوں) پر بھی بولا

جاتا ہے۔ یہاں پر کلمات سے مراد اسمائے حسنیٰ اور آسمانی کتابیں ہیں کیونکہ انہی کے ذریعے سے پناہ مانگی جاتی ہے اور ''کلمات ''کو''تامۃ'' کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اور کتابیں ہر قسم کے نقائص و عوارض سے پاک ہیں برخلاف لوگوں کے کلام کے کیونکہ لوگوں کے کلام میں ان کے علم، لہجے اور اسلوب میں فرق ہونے کی وجہ سے تفاوت ہوتا ہے۔ پس ہر ایک کے مقابلے میں اس سے زیادہ معانی والا ہوتا ہے۔

پھر شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے اپنے معنی مرادی میں تعارض نسیان' خطا، یا معنی مرادی کے بیان سے عجز لاحق نہ ہوتا ہو۔ سب سے بڑا عیب تو یہ ہے کہ یہ کلمات مخلوق ہیں جو ایک ایسی مخلوق بولتی ہے جو حروف اور جوارح کی محتاج ہے اور یہ ایسا عیب ہے جس سے مخلوق کا کلام خالی نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے کلمات اس قسم کے عوارض سے بلند و بالا ہیں۔ نہ تو ان میں کسی نقص کی گنجائش ہے اور نہ انہیں کوئی خلل لاحق ہو سکتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس حدیث کو ان لوگوں کے خلاف حجت بنایا ہے جو قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام احمد فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ کے کلمات مخلوق ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ان کلمات کے ذریعے پناہ نہ مانگتے کیونکہ مخلوق کے ساتھ پناہ مانگنا جائز نہیں ہے۔

قولہ(من کل شیطن) یعنی جنوں اور انسانوں میں سے۔

''ھامۃ'' اس میں میم مشدد ہے۔''ھامہ'' ہر اس جانور کو کہتے ہیں جس میں مہلک زہر ہو۔ اس کی جمع ''ھوام'' ہے۔ رہا وہ جانور جس میں مہلک زہر تو ہو' مہلک نہ ہو اسے ''سامۃ'' کہتے ہیں جیسے بچھو اور بھڑ وغیرہ' بعض اوقات زمین پر رینگنے والے مثلاً حشرات الارض کو بھی'' ھوام'' کہتے ہیں اس کو طیبی نے بحوالہ نہایہ میں ذکر کیا ہے۔

لامۃ : میم مشدد ہے یعنی ''معیون'' (جسے نظر لگ گئی ہو) پر شر کو جمع کرنے والی نظر۔ یہ ''لمہ'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ یا پھر ''لامۃ'' ملمۃ کے معنی میں ہے امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''عین لامۃ'' اسے کہتے ہیں جس کی وجہ سے شر پہنچتا ہے اور ''لَمَمْ'' جنون کی ایک قسم ہے اور ''لامۃ'' کا معنی ''ذات لمم'' ہے (یعنی جنون والی) اور 'لمم' کی اصل ''الممت بالشئ'' ہے اور کہا گیا ہے کہ ''لامۃ'' ۔ ''ھامۃ'' کے ازدواج کے لئے لایا گیا ہے' ورنہ اصل تو ''ملمۃ'' ہے کیونکہ یہ فاعل ہے ''الممت'' کا۔اھ

کہا گیا ہے کہ نظر لگنے کی وجہ یہ ہے کہ جب دیکھنے والا کسی چیز کی طرف دیکھتا ہے اور وہ چیز اسے اچھی لگتی ہے' پھر اس کے باوجود وہ ''ماشاء اللہ'' نہیں کہتا تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس دیکھی گئی چیز میں دیکھنے والے کی غفلت کی وجہ سے کوئی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں اور ایسا بندوں کی آزمائش کے لیے ہوتا ہے۔ تاکہ ایماندار آدمی اس بات کی گواہی دے کہ وہ من جانب اللہ ہے اور اس کے علاوہ اس غیر اللہ کی جانب سے ہے۔ (یعنی اس میں جو خوبی تھی وہ اللہ کی طرف سے تھی اور جو خرابی پیدا ہوئی ہے وہ انسان کے غفلت کے ساتھ دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے)۔ واللہ اعلم

قولہ: ویقول: ان ابا کما: آپ نے ''اب'' سے ''جد اعلیٰ'' مراد لیا ہے اور وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

کان یعوذ بھا: یعنی ان کلمات کے ساتھ۔ اسماعیل و اسحاق ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اسماعیل و اسحاق' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا سرچشمہ ہیں ویسے ہی حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما آپ ﷺ

کی ذریت کا منبع ہیں۔

قولہ: و فی اکثر نسخ المصابیح "بهما" علٰی لفظ التثنية : امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ظاہراً یہ ناسخ کی طرف سے سہو معلوم ہوتا ہے اھ۔ الا یہ کہ اگر ''کلمات اللّٰہ'' کو مجازی طور پر ''معلومات اللّٰہ'' کے معنی میں لیا جائے اور اسی طرح تمام کتب منزلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کلام کیا ہے اسے بھی ''معلومات اللہ'' کے معنی میں لے لیا جائے۔ پہلے کو ''مستعاذ بہ'' اور دوسرے کو ''مستعاذ منہ'' وارد دیا جائے۔

بھلائی امتحان کا سبب ہے

۱۵۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ.

[رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۳/۱۰۔ حدیث رقم ۵٦٤٥۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی (خیر) کا ارادہ کرتے ہیں' اس کو بھلائی (خیر) کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ یہ روایت بخاری سے نقل کی ہے۔

تشریح: خیراً یہ تنوین تنویع کے لیے ہے اور جار مجرور اس سے حال ہے۔ ای خیر املتبسا به ہیں یعنی ایسی بھلائی جو اس کے ساتھ چمٹی ہوئی ہو۔

یصب : بصیغہ مجہول ہے' اور بعضوں کا کہنا ہے کہ بصیغہ معروف ہے۔

"منه" ای "لأجله" (یعنی اس کے سبب سے) ضمیر ''خیر'' کی طرف راجع ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: مجہول پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا: یصیر ذا مصيبة : یعنی مصیبت زدہ ہو جانا اور ''مصیبت'' ہر ناپسندیدہ شئی کو کہتے ہیں۔ ہر ناپسند چیز کو اور اگر بصیغہ معروف پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا: يجعله ذامصيبة کہ اللہ تعالیٰ اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ ان مصائب کے ذریعہ سے اسے گناہوں سے پاک فرما دیں اور اس کے درجات بلند کر دیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "یصب" کو صاد کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ادب کو ملحوظ رکھا جائے تو فتحہ زیادہ مناسب ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ [الشعراء:۸۰] ''اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے''۔

اور فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرة:۱۵۵] ''اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (اللہ) کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو''۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں "یصب" مجزوم ہے چونکہ جواب شرط ہے۔ اس میں اصل عبارت یوں تھی: "من یرد اللّٰہ به خیرًا او صل الیه مصیبة" پس اس میں "مِنْ" متعدی کرنے کے لیے ہے۔ کہا جاتا ہے: "اصاب زید من عمرو" اس کا معنی ہوتا ہے کہ زید نے عمرو کو مصیبت پہنچائی ہے۔

قاضی (عیاضؒ) فرماتے ہیں: "من یردا اللّٰہ به خیرًا" کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مصیبت پہنچاتے ہیں تاکہ اسے گناہوں سے پاک کردے اور اس کے درجات بلند کردے اور مصیبت ہر اس ناپسندیدہ چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو پہنچے۔

زین العرب فرماتے ہیں: ای نیل بالمصائب من اللّٰہ۔ اسے اللہ کی طرف سے مصائب پہنچتی ہیں اور صاحب "فائق" فرماتے ہیں: ای ینل منه بالمصائب" ضمیر "من" کی طرف عائد ہے اور شرح السنہ میں ہے کہ: ای یبتلیه بالمصائب (اسے مصائب میں مبتلا کردیتا ہے) یہ حاصل معنی ہے۔

مصائب گناہوں کو مٹانے کا باعث ہوتے ہیں

۱۵۳۷: وَعَنْهُ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَاهَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا اَذًی وَلَا غَمٍّ حَتّٰی الشَّوْکَةُ یُشَاکُهَا اِلَّا کَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَایَاهُ۔

[متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۳/۱۰۔ حدیث رقم ۵٦٤۱۔ ومسلم فی صحیحه ۱۹۹۲/٤ حدیث رقم (۵۲-۲۵۷۳) والترمذی فی السنن ۲۹۸/۳ حدیث رقم ۹٦٦۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مسلمان کو جو کوئی رنج و تکلیف غم یا فکر پہنچتی ہے یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو جھاڑ (مٹا) دیتا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اس کو نقل کیا ہے۔

تشریح: ما یصیب المسلم: ما نافیہ ہے۔

من نصب ولا وصب: دونوں میں پہلے حرف پر فتح ہے اور اس میں "من" زائدہ ہے استغراق کے لیے ہے "نصب" کا معنی ہوتا ہے تھکاوٹ اور وہ جسمانی درد جو کسی زخم وغیرہ سے پہنچتا ہے اور "وصب" دائمی درد اور دائمی بیماری کو کہتے ہیں۔ نہایہ سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

قوله : ولاهم ولا حزن:

حزن: کے حاء اور زاء دونوں کو مفتوح پڑھا جائے۔ اول کو مضموم اور ثانی کو جزم کے ساتھ پڑھا جائے۔

قوله : ولااذی ولاغم : ان تمام میں "لا" تاکید کی نفی کے لیے ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اذی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نفس کے موافق نہ ہو۔ پس یہ سب سے زیادہ عام ہے اور ظاہر یہ ہے کہ اذی اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی دوسرے انسان کی طرف سے پہنچتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ

وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا﴾ [آل عمران:۱۸۶] ''(اے اہل ایمان) تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی۔ اور تم اہل کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے'' اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا﴾ [الاحزاب:۵۸] ''اور جو لوگ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت سے) جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا'' اور اسی معنی کی یہ حدیث ہے: کل مؤذ فی النار۔

اور ''ھَمّ'' وہ ہے جو انسان کو ''مہموم'' (بے چین) کر دے یعنی پگھلا دے یہ ماخوذ ہے ''هممت الشحم'' سے یہ اس وقت کہتے ہیں جب چربی کو پگھلایا جائے اور ''حزن'' وہ ہے جس سے دل میں کرختگی پیدا ہو جائے (حزن کا لفظی معنی کھردرا) جیسے کہتے ہیں ''مکان حزن'' یعنی کھردرا مکان۔ پس ''ھم'' زیادہ خاص ہے۔ اور ''غم'' وہ حزن ہے جو آدمی کو ''مغموم'' کر دے یعنی ایسا غم کہ جب وہ انسان کو پہنچے تو بے ہوش ہونے کے قریب ہو جائے۔ پس ثابت ہوا کہ ''ھم'' اور ''حزن'' وہ تکلیف ہے جو انسان اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ اپنی محبوب چیز کو کھو بیٹھتا ہے۔ ہاں البتہ غم حزن سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ''ھم'' اس غم کو کہتے ہیں جو مستقبل کے بارے میں ہو اور ''حزن'' اس غم کو کہتے ہیں جس کا تعلق ماضی کی کسی بات یا واقعہ وغیرہ سے ہو۔ امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ امام وکیع نے فرمایا: لم یسمع فی الھم ان یکون کفارۃ الاّ فی ھذا الحدیث۔ (صرف اسی حدیث میں ''ھم'' کو کفارہ کہا گیا ہے۔)

شافعیہ کی عجیب و غریب فروعات ایک بات حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کی ہیں: ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ جب کسی انسان کو شدید غم پہنچے تو یہ جمعہ اور جماعت کو ترک کرنے کا ایک عذر ہے۔ کیونکہ یہ آندھی اور بارش کے عذر سے زیادہ سخت ہے جو کہ شریعت میں نماز جماعت اور جمعہ کو ترک کرنے کے عذر ہیں...... یہ ایک فاسد قیاس ہے کیونکہ آپ کا واضح فرمان ہے: ''ارحنا بھا یا بلال'' اے بلال! نماز کے ساتھ ہمیں سکون پہنچا اور حدیث میں ہے: کان اذا حزبه امر فزع الی الصلوۃ۔ جب آپ کے لیے کوئی معاملہ مصیبت بن جاتا تو آپ فوراً نماز پڑھتے تھے۔

قوله حتی الشوکة: رفع کے ساتھ ہے اور ''حتی'' ابتدائیہ ہے اور ''شوکة کاما'' بعد کا جملہ اس کی خبر ہے۔ اور ''شوکة'' جر کے ساتھ بھی جائز ہے اس وقت ''حتی'' عاطفہ ہوگا یا ''إلی'' کے معنی میں ہوگا اور اس کے بعد جو کلام ہے وہ حال ہوگا۔ امام زرکشی فرماتے ہیں: (شوکة) نصب کے ساتھ ہے۔ وہ اس طرح کہ فعل مقدر کا مفعول ہے یعنی اصل عبارت یوں تھی: ''حتی یجد الشوکة''۔

قوله یشاکھا: کشاف میں ہے: شکت الرجل شوکة یعنی اس کے جسم میں کانٹا داخل ہو گیا ہے۔ اور ''شیك'' اور ''یشاك'' اسی باب سے ماضی اور مضارع کے مجہول کے صیغے ہیں۔ اھ۔ ایک قول یہ ہے کہ اس میں ضمیر ہے جو ''مسلم'' کی طرف راجع ہے جو کہ اس کا نائب فاعل ہے اور ''یشاکھا'' کی ''ھا'' ضمیر ''شوکہ'' کی طرف راجع ہے۔ یعنی حتیٰ کہ وہ کانٹا جو ایک مسلم کو چبھتا ہے یعنی اس کانٹے کی وجہ سے اس کے اعضاء زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں پر ''شوکہ'' کا معنی ہے ایک مرتبہ

کانٹا چبھنا۔ اگر اس سے ''کانٹا'' مراد ہوتا تو ''یشاکھا'' کی بجائے ''یشاك بھا'' ارشاد فرمایا جاتا'' اس کو مرة من المصدر بنانے کی دلیل یہ ہے کہ اس کو معانی کی غایت بنایا گیا ہے۔ لہٰذا طیبیؒ کے قول کا کوئی معنی نہیں ہے۔

ابن حجرؒ نے امام طیبی کی متابعت کرتے ہوئے ''یشاك'' کی ضمیر کو اس کا مفعول ثانی قرار دیا ہے اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ سالک اگر مرتبہ رضا یعنی ولادت بلاد سے تلذذ تک پہنچنے سے عاجز آ جائے تو کم از کم اپنے آقا کی محبت میں صبر کے کڑوے گھونٹ اس سے فوت نہ ہوں۔ کیونکہ مروی ہے: المصاب من حرم التواب کہ ''مصیبت زدہ وہ ہے جو ثواب سے محروم ہے۔''

شدتِ مرض پر ثمرہ

۱۵۳۸ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُوْعَكُ فَمَسَسْتُهُ بِيَدَيَّ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ لَتُوْعَكُ وَعْكًا شَدِيْدًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجَلْ اِنِّيْ اُوْعَكُ كَمَا يُوْعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذٰلِكَ لِاَنَّ لَكَ اَجْرَيْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيْبُهُ اَذًى مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ بِهٖ سَيِّاٰتِهٖ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا۔

[متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۱/۱۰۔ حدیث رقم ۵۶۴۸۔ ومسلم فی صحیحه ۱۹۹۲/۴ حدیث رقم (۴۵۔ ۲۵۷۱) والدارمی فی السنن ۴۰۸/۲ حدیث رقم ۲۷۷۱۔ واحمد فی المسند ۳۸۱/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' اس حال میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخار میں مبتلا تھے۔ میں نے آپ کو اپنا ہاتھ لگایا اور کہا اے اللہ کے نبی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو سخت بخار ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جی ہاں مجھے تم میں سے دو شخصوں کے برابر بخار چڑھتا ہے۔ پھر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ اس واسطے (اس لیے) ہے کہ آپ کو دوگنا ثواب ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مسلمان کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو جھاڑ (مٹا) دیتا ہے جیسا کہ درخت کے پتے گرتے ہیں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: (وھو یوعك) وعك بخار کی حرارت اور اس کی تکلیف کو کہتے ہیں۔ ''وعکه المرض وعکا و وعکة فھو موعوك'' ای اشتدبه (سخت بخار میں مبتلا ہونا)

قوله فمسته بیدی: فصیح یہی ہے کہ مسست کو مکسور العین پڑھا جائے لیکن ابو عبید نے اسے مفتوح العین ماضی میں اور مضموم العین مضارع میں پڑھا ہے۔

وعکا: عین کے سکون کے ساتھ۔

انك لتوعك وعکا شدیدًا: یہ واقع کا بیان اور تفسیر ہے۔ اور ابن حجر کا یہ قول کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس لئے

ذکر فرمائی تا کہ سائل کو اس کی اس بات کا جواب مل جائے کہ "مصائب تو گناہوں کے کفارے کا سبب ہوتے ہیں جبکہ آپ تو معصوم عن الخطا ہیں (تو آپ ﷺ کو اتنا زیادہ بخار کیوں ہے؟) راوی کے قول 'فقلت : ذلك لان لك اجرين' کے مطابق نہیں ہے اسی طرح ابن حجرؒ کا قول خود ان کے اپنے کلام کے بھی معارض ہے کیونکہ انہوں نے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ "بعض اوقات مصائب محض درجات کی بلندی کے لیے نازل ہوتے ہیں"۔ اسی طرح ان کا قول نبی کے جواب کے بھی مطابق نہیں ہے کیونکہ آپ نے ہاں میں جواب دیا تھا۔

قوله فقال النبی: اجل: "اجل" بمعنی "نعم" ہے! یہ جواب راوی کے کلام "وعكا شديدًا" کے لیے تقریر ہے اس لیے کہ آپ نے صرف "اجل" نہیں کہا بلکہ: انی اوعك بھی ارشاد فرمایا اوعك: بصیغہ مضارع مجہول ہے۔ یعنی مجھے بخار آن پکڑتا ہے۔

قوله: لان لك اجرين: اس میں احتمال ہے کہ تثنیہ سے مراد کثرت ہو۔

قوله: ما من مسلم يصيبه اذى...... : یعنی وہ چیز جو اسے تکلیف پہنچائے اور تھکا ڈالے یا اس سے بھی کم تکلیف پہنچے۔ یا نفس کو ملے تکلیف دہ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مریض کی حالت، اس کے جسم کو پہنچنے والی بیماری پھر تیزی کے ساتھ اس سے گناہوں کا مٹ جانا' اس کیفیت کو درخت کی حالت خزاں کی ہواؤں کے چلنے اور۔ اس ہوا سے پتوں کا جھڑ جانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ تمثیلی ہے۔ اس میں وجہ تشبیہ کسی چیز کا مکمل طور پر بہت جلد ازلہ ہے۔ ابن الملک کہتے ہیں: اس میں ایک عظیم اشارہ ہے کیونکہ ہر مسلمان کو تکلیف تو پہنچتی ہی ہے۔

تخریج: امام میرکؒ کہتے ہیں کہ نسائی سے ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے کتاب الادب میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے بیہقی نے شعب الایمان میں۔ شعب الایمان میں ابوسعد سے مروی ہے: دخلت علی رسول الله ﷺ و هو محموم فوضعت يدى من فوق القطيفة 'فوجدت حرارة الحمى فوق القطيفة فقلت : مَاَاَشَدَّ حما ك يا رسول الله ! قال: انا كذلك معتر الانبياء يضاعف علينا ليضا عف لنا الاجر قلت: اى الناس اشد بلاء ؟ قال الا نبياء ثم الصالحون وان كان الرجل و فى رواية: النبى ليبتلى بالفقر حتى مايجد الا العباء ة فيجو بها فيلبسها' وان كان احدهم ليبتلى بالقمل حتى يقتله القمل وكان ذلك احب اليهم من العطا يا اليك۔ کہ ابوسعد کہتے ہیں کہ "میں نبی کے پاس گیا تو آپ کو بخار تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ چادر کے اوپر رکھا تو میں نے چادر کے اوپر سے بخار کی حرارت کو محسوس کیا۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ کو کس قدر بخار ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: ہم انبیاء کی جماعت کو اسی طرح دوگناہ تکلیف ہوتی ہے تا کہ ہمیں دوہرا اجر ملے۔" میں نے پوچھا کہ سب سے زیادہ مصائب کس پر آتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: انبیاء کو اور ان کے بعد نیک لوگوں کو (مجھ سے پہلے) ایک نبی کو اور ایک روایت میں ہے: النبى يبتلى بالفقر حتى مايجد الا العباء ة فيجوبها فيلبسها 'وان كان احدهم ليبتلى بالقمل حتى يتقله الغمل' وكان ذلك احب اليهم العطايا اليكم۔ کہ نبی کو "فقر کے ذریعہ اتنا زیادہ

آزمایا جاتا کہ ان کے پاس صرف ایک ہی چادر ہوتی تھی وہ اسے پھر پہن لیتا تھا اور ان میں سے ایک کو جوؤں کے ذریعے مصیبت میں مبتلا کیا جاتا حتی کہ وہ ان جوؤں کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا تھا اور یہ تکلیفیں ان کو اتنی محبوب تھیں کہ بڑے بڑے عطایا بھی تمہیں اتنا محبوب نہیں ہوں گے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدتِ درد کا بیان

۱۵۳۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ اَحَدًا ا لْوَجَعُ عَلَيْهِ اَشَدُّ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

[متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۔١١٠/١۔ حديث رقم ٥٦٤٦۔ ومسلم في صحيحه ١٩٩٠/٤ حديث رقم (٤٤۔٢٥٧٠)۔ وابن ماجه في السنن ٥١٨/١ حديث رقم ١٦٢٢ واحمد في المسند ١٧٣/٦۔

ترجمہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی بیماری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سے زیادہ سخت و شدید ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: الوجع: ضمہ کے ساتھ ہے۔

من رسول اللّٰہ: یعنی آپ کی بیماری سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "الوجع" مبتدا ہے "اشد" اس کی خبر ہے مکمل جملہ مفعول ثانی کے قائم مقام ہے۔ اور "من" زائدہ ہے یعنی اصل عبارت اس طرح تھی: "ما رأیت احدًا شد وجعًا من رسول اللّٰہ ﷺ" شاید ان کے نسخے میں "احد" کی بجائے "من احد" کے الفاظ ہوں کیونکہ "من رسول اللّٰہ" میں "من" زائدہ نہیں ہو سکتا اور ابن حجر کا یہ قول: "ما رأیت احداۃ اشد وجعا من الوجع علی رسول اللّٰہ" غیر صحیح ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے ذکر کیا ہے کہ اسے نسائی اور ابن ماجہ نے (بھی) روایت کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نزع کی کیفیت کا بیان

۱۵۴۰: وَعَنْهَا قَالَتْ مَاتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ حَاقِنَتِيْ وَذَاقِنَتِيْ فَلَا اَكْرَهُ شِدَّةَ الْمَوْتِ لِاَحَدٍ اَبَدًا بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ [رواه البخاري]

اخرجه البخاري في صحيحه ١٠٣/١۔ حديث رقم ٥٦٤٣۔ ومسلم في صحيحه ٢١٦٣/٤ حديث رقم (٥٩۔٢٨١٠)۔ والدارمي في السنن ٤٠٠/٢ حديث رقم ٢٧٤٩۔ واحمد في المسند ٤٥٤/٣۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے کے بالائی حصے اور میری ٹھوڑی کے درمیان وفات پائی۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی کی موت کی شدت کو مکروہ (ناپسند) نہیں سمجھتی۔ (بخاری)

تشریح: حاقنتی و ذاقنتی: دونوں الفاظ میں قاف مکسور ہے۔ امام تورپشتی فرماتے ہیں۔" حاقنہ" ہنسلی کی

دونوں ہڈیوں کے درمیان کی پست جگہ کو کہتے ہیں اور" ذاقنه" ٹھوڑی کو کہتے ہیں بعض کا کہنا ہے کہ" طرف الحلقوم " کو ذاقنه کہتے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ جگہ جو ٹھوڑی کے نیچے سینے سے متصل ہوتی ہے۔ کلام کا معنی یہ ہے: انه تو فی مستندا الی کہ جب آپ فوت ہوئے تو آپ مجھ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔

قوله: فلا اکره شدة الموت لاحد ابدا بعد النبی ﷺ:

یعنی میرا گمان یہ تھا کہ موت کی سختی زیادہ گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن جب میں نے آپ ﷺ کی شدت وفات کو دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ شدت موت برے انجام کا اشارہ نہیں ہے بلکہ درجات کی بلندی کے لیے ہے اور ہلکی موت کوئی شرف کی بات نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ اس کے زیادہ لائق تھے۔

مؤمن اور منافق کی زندگی کی حقیقت آپ ﷺ کی زبانی

۱۵۴۱: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْخَامَةِ مِنَ الزَّرْعِ تُفِيْئُهَا الرِّيَاحُ تَصْرَعُهَا مَرَّةً وَتَعْدِلُهَا اُخْرٰى حَتّٰى يَاتِيَهُ اَجَلُهُ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الْاُرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ الَّتِي لَا يُصِيْبُهَا شَيْءٌ حَتّٰى يَكُوْنَ انْجِعَا فُهَا مَرَّةً وَاحِدَةً۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۳/۱۰۔ حدیث رقم ۵٦٤٤۔ ومسلم فی صحیحه ۱۱٦۳/٤ حدیث رقم (۵۸۔۲۸۰۹) والترمذی فی السنن ۱۳۸/۵ حدیث رقم ۲۸٦٦۔

ترجمہ: حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مؤمن کی مثال کھیتی کے (پھٹے) (وتازہ) نرم ونازک شاخ کی طرح ہے ہوائیں اس کو جھکاتی (جھلاتی) ہیں کبھی اس کو گرا دیتی ہیں اور کبھی اس کو سیدھا (کھڑا) کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ موت کا وقت آ جاتا ہے۔ یعنی بعینہ اسی طرح مسلمان کو کبھی کمزوری اور بیماری کا حادثہ (واقعہ) گرا دیتا ہے اور کبھی صحت وتندرستی اس کو سیدھا اور (چاق وچوبند) کر دیتی ہے اور منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے وہ سیدھا اور مستحکم (مضبوط) ہوتا ہے اور زمین میں ثابت ہوتا ہے۔ اس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ نہ جھکتا ہے نہ گرتا ہے حتی کہ وہ ایک بارا کھڑتا ہے۔ (اور زمین پر گر پڑتا ہے) اسی طرح منافق کی مثال ہے وہ ہمیشہ توانا وتندرست رہتا ہے اس کو کوئی بیماری اور کمزوری نہیں پہنچتی۔ وہ یکبارگی زمین پر گر کر مر جاتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مثل المؤمن: یعنی کامل مؤمن یا مطلق مؤمن۔

قوله: کمثل الخامة: خاء کے ساتھ اور میم مخفف کے ساتھ خانہ نرم ٹہنی کو کہتے ہیں۔

قوله: الخامة: خائے معجمہ اور میم مخفف کے ساتھ۔ "النہایۃ" میں ہے کہ "الخامۃ"۔

قوله (من الزرع) اور خامہ کا الف اصل میں واؤ تھا اور کہا گیا ہے کہ خامہ پورے کی اس تازہ ٹہنی کو کہتے ہیں جو ابھی تک مضبوط نہ ہوئی ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ خامہ ایک تنے والے پودے کو کہتے ہیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ای طاقة من الزرع اس صورت میں یہ خامہ کی صفت ہے اور

قولہ تفیئھا الریاح: یہ دوسری صفت ہے...... **تفیئھا:** ی مشدد ہے اور اس کے بعد ہمزہ ہے یعنی ہوائیں اسے شمالاً جنوباً حرکت دیتی رہتی ہیں۔ امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ اس طرح کہ جب شمال کی جانب سے ہوا چلتی ہے تو نرم ٹہنیاں جنوب کی طرف جھک جاتی ہیں اور جب جنوب کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو شمال کی جانب جھک جاتی ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ یہ فیأۃ الشجرۃ کی قبیل سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے کہ درخت نے اپنا سایہ ڈال دیا ہے۔ چنانچہ جب ہوا پودوں کو ایک جانب مائل کرتی ہے تو ان کا سایہ بھی اس پر پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا معنی وہی ہوگا جو آیت قرآن کا کیا جاتا ہے کہ: ﴿يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ﴾۔

قولہ تصرعھا: یہ ماقبل کا بیان ہے یعنی اسے ہوائیں گرا دیتی ہیں نہایۃ میں ہے یعنی اسے کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف پھینک دیتی ہیں **تعدلھا:** تائے مفتوح اور عین ساکن کے ساتھ یا تائے مضموم اور دال مشدد کے ساتھ یعنی اسے کھڑا کر دیتی ہیں۔

قولہ اخری: یعنی دوسری مرتبہ۔ یعنی ایک مؤمن کو خوف وبھوک اور بیماری جیسی کئی قسم کی مشکلات لاحق ہوتی رہتی ہیں

قولہ حتی یا تیہ: اور ایک نسخے میں حتی یاتی کے الفاظ ہیں (اجلہ) یعنی موت۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ایک مؤمن کئی حالتوں میں سے ایک حالت میں ضرور رہتا ہے۔ بیماری، قلت مال، اور ذلت جیسا کہ روایت میں بھی ہے اور یہ تمام خوش بختی کی علامت ہیں۔ ابن ملک فرماتے ہیں: اس شرط پر خوش بختی کی علامت ہیں جب ان کے ساتھ صبر ورضا اور شکر ہو۔ مسند احمد میں ابی ابن کعبؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ”مؤمن کی مثال خامہ کی طرح ہے جو کبھی سرخ ہوتا ہے تو کبھی زرد ہوتا ہے۔“

قولہ: ومثل المنافق: یعنی حقیقی یا حکمی۔

کمثل الارزۃ: ہمزہ کے فتحہ، راء ساکن اور اس کے بعد زاء یہی اس لفظ کا صحیح ترین ضبط ہے اور یہی روایت میں منقول ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ راء کے فتح ساتھ بھی جائز ہے اور یہ صنوبر تو نہیں لیکن اسی طرح کا ایک درخت ہے میرکؒ نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔

اکثر شارحین راء کے سکون کے قائل ہیں اور صنوبر کے درخت کو کہتے ہیں اور صنوبر ایک قسم کے پھل کو کہتے ہیں یہ ایک مضبوط درخت ہے جس کی جڑیں زمین میں نیچے تک ہوتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ راء کے فتح اور سکون ہر دونوں صورتوں میں صنوبر کو ہی کہتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ راء کے فتح کے ساتھ ارزن کے درخت کو کہتے ہیں۔

اور نہایۃ میں ہے کہ ”ارزۃ“ راء کے سکون کے ساتھ ہے ایک قول راء کے فتحہ کا ہے اور ایک قول یہ ہے یہ فاعلہ کے وزن پر ہے۔ ابوعبیدہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ ارزن معروف لکڑی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ارزن صنوبر کو کہتے ہیں اور زین العرب نے کہا ہے بعض لوگوں نے راء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ پڑھنے کا ایک ہی معنی کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد ارزن کا درخت ہے اور یہ معنی یہاں مناسب نہیں ہے۔ اھ۔ گویا کہ ان کا خیال ہے کہ ارزن دخن کی ایک قسم ہے۔ واللہ اعلم۔

قاموس میں ہے۔ ارزن صنوبر کا درخت ہے جیسے ارزۃ سرو کا درخت ہوتا ہے اور راء کو حرکت کے ساتھ پڑھیں تو اس کا معنی ہے ارزن کا درخت جو کہ ایک مضبوط درخت ہے۔

قوله المجذية: میرکؒ نے کہا ہے: میں: میم مضموم، جیم ساکن، ذال مکسور اور یاء مخفف پڑھی جاتی ہے اور اس کا معنی ہے مضبوط اور قائم یعنی سیدھی۔

قوله التی لا یصیبها شیٔ: یعنی ہواؤں کے مختلف ہونے سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

قوله حق یکونانجعا فها: امام میرکؒ نے کہا: اس کا ضبط نون، جیم، عین مہملہ اور فاء کے بعد الف ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی کٹائی اور اکھڑنا مراد ہے "یہ جعف" کا "مطاوع" ہے۔

قوله مرة واحدة: اسی طرح منافق اور فاسق لوگوں کو بہت کم امراض اور مصائب لاحق ہوتے ہیں۔ تاکہ نہ تو ان کے گناہوں کا کفارہ بنیں اور نہ انہیں ثواب حاصل ہو۔ تخریج: میرکؒ نے کہا ہے اسے امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

حدیث کی روشنی میں مؤمن اور منافق کی زندگی میں فرق

۱۵۴۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ کَمَثَلِ الزَّرْعِ لَا تَزَالُ الرِّیْحُ تُمِیْلُهٗ وَلَا یَزَالُ الْمُؤْمِنُ یُصِیْبُهُ الْبَلَاءُ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ کَمَثَلِ شَجَرَةِ الْاَرْزَةِ لَا تَهْتَزُّ حَتّٰی تُسْتَحْصَدَ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۱۰۳۔ حدیث رقم ۵٦٤٤۔ ومسلم فی صحیحه ٤/۲۱٦۳ حدیث رقم (۵۸۔۲۸۰۹) والترمذی فی السنن ۵/۱۳۸ حدیث رقم ۲۸٦٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مؤمن کی مثال کھیتی کی مانند (طرح) ہے۔ بادیں (ہوائیں) اس کو ہمیشہ جھکاتی رہتی ہیں اور مؤمن کو ہمیشہ بلائیں (آزمائشیں) پہنچتی رہتی ہیں منافق کی مثال صنوبر کے درخت کی طرح ہے نہیں ہلتا (یعنی مضبوطی سے کھڑا رہتا ہے) مگر اچانک اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: الریح: لام جنس کے لیے ہے۔

قوله قیله: شد کے ساتھ ہے اور ایک نسخے میں بغیر شد کے ہے۔

اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: جس میں ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں نے ایسی عورت سے شادی کی ہے جو کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے طلاق دے دے کیونکہ اس میں کسی قسم کی بھلائی نہیں ہے۔ شاید اس میں وہی حکمت ہو جو رسول اللہ نے بیان فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی کی کہ اے دنیا! تو میرے اولیاء کے لیے گدلی اور کڑوی ہو جا یہاں تک کہ وہ میری ملاقات کے آرزومند ہو جائیں اور اسی باب سے وہ حدیث بھی ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے۔

قولہ (ولایزال المؤمن یصیبہ البلاء) یہ جملے ہیں کیونکہ ان کے درمیان ایک وجہ شبہ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان دونوں جملوں میں یا تو تشبیہ تمثیلی ہے یا پھر تشبیہ مفرق ہے۔ اس صورت میں مشبہ کے لیے مشبہ بہ کے مقابلے میں کئی معانی ہوں گے اور اس میں اشارہ ہے کہ ایک مؤمن کو اپنے آپ کو دنیاوی لذتوں سے عاری سمجھنا چاہیے اور اپنے آپ کو آزمائشوں کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔

قولہ (ومثل المنافق کمثل شجرہ الأرزۃ) راء پر جزم اور فتح دونوں جائز ہیں۔

قولہ (لاتھتز) یعنی حرکت نہیں کرتا۔

(حتی تستحصۃ) مضارع مجہول ہے۔ ابن مالک نے کہا ہے کہ مضارع معروف پڑھا جائے گا یعنی اس کے کاٹنے کا وقت آتا ہے اور اسے کاٹ لیا جاتا ہے اس طرح منافق کو اس دنیا میں بہت کم تکلیفیں پہنچتی ہیں تا کہ اسے آخرت میں پہنچنے والے عذاب میں کمی نہ ہو سکے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں منافق کے برے خاتمے کی طرف دلالت ہے۔ میرک نے کہا: اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور لفظ مسلم کے ہیں۔

بخار پر اَجر

۱۵۴۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی اُمِّ السَّائِبِ فَقَالَ مَالَكِ تُزَفْزِفِيْنَ قَالَتْ الْحُمّٰی لَا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْهَا فَقَالَ لَا تُسَبِّی الْحُمّٰی فَاِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَا يَابَنِیْ اٰدَمَ كَمَا يُذْهِبُ الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔ [رواہ مسلم]

اخرجہ البخاری مسلم فی صحیحہ ۱۹۹۳/٤ حدیث رقم (٥٣_٢٥٧٥)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ اُم السائبؓ کے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ آپ کیوں کانپ رہی ہیں۔ اس نے کہا تپ (یعنی بخار ہے) کہ اس میں اللہ برکت نہ دے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بخار کو برا مت کہو۔ اس لیے کہ بخار بنی آدم (انسانوں) سے گناہوں کو ایسے دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے سے میل کچیل دور کرتی ہے۔ (مسلم)

تشریح: تزفزفین؟ اس لفظ میں دو "زاء" ہیں اور معروف اور مجہول دونوں پڑھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی ہے۔ اور ایک صحیح نسخے میں دوراء کے ساتھ منقول ہے صیغہ معروف کے ساتھ۔ امام طیبی فرماتے ہیں: رفوف الطائر بجنا حیہ اس وقت بولتے ہیں جب پرندہ کسی چیز پر بیٹھنے کے لیے اپنے پر پھیلاتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ آپؐ نے پوچھا کہ تجھے کیا ہے کہ تو کانپ رہی ہے۔ اور ساتھ بھی مروی ہے جو کہ "زفزفہ" سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے سردی سے کانپنا یعنی تیرے کانپنے کی کیا وجہ ہے؟

قولہ (قالت: الحمی) یہ ایک قسم کا بخار ہے جس میں انسان کو بلغم آتا ہے، رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور جسم میں شدید قسم کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

قولہ (لا بارك الله فیها) یہ مبتدا اور خبر ہے اور جملہ جواب کا متضمن ہے یا اس کی تقدیر یوں ہوگی۔'' تاحذنی الحمی یا''الحمی معنی'' تقدیر ہوگی۔ اور اس کے بعد کا جملہ جملہ دعائیہ ہے

قولہ (فقال: لا تسبی الحمی) یعنی بخار کی تمام اقسام۔

قولہ (فانها تذهب) یعنی لٹا دیتا ہے اور زائل کر دیتا ہے۔

قولہ (خطایا بنی آدم) یعنی وہ گناہ جن کا کفارہ ممکن ہے۔

قولہ (کما یذهب الکیر) کسرہ کے ساتھ۔

(خبث الحدید) خبث میں پہلے دونوں حرف مفتوح ہیں یعنی میل کچیل امام طیبی فرماتے ہیں: ''کیر حداد'' وہ ہے جو مٹی سے بنی ہو۔ کہا گیا ہے کہ وہ بھٹی جس میں آگ پھونکی جاتی ہے اور ''منی'' بھی بھٹی کو ہی کہتے ہیں۔

امام سیوطی نے ''کشف الغمی فی اخبار الحمی'' میں ذکر کیا ہے کہ حضرت حسنؓ سے مرفوع حدیث منقول ہے:

آپؐ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک مؤمن کے تمام گناہ ایک رات کے بخار کی وجہ سے مٹا دیتا ہے۔''

ابن مبارک فرماتے ہیں یہ عمدہ احادیث میں سے ہے۔

اور حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں:

ایک رات کا بخار پورے سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

حضرت ابوامامہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ بخار جہنم کی بھٹی ہے اور یہ مؤمن کے لیے جہنم کی آگ میں سے ایک حصہ ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے:

میری امت کا بخار جہنم میں سے ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے:

انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! بخار کا کیا بدلہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب تک بیمار آدمی لنگڑا کر چلتا ہے یا اس کا پسینہ بہتا رہتا ہے تب تک اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے اس وقت حضرت ابی بن کعب نے دعا کی۔ اے اللہ! میں تجھ سے ایسے بخار کا سوال کرتا ہوں جو مجھے تیرے راستے میں تیرے گھر میں، اور تیرے نبی کی مسجد سے نہ روکے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ابی بن کعب کو ہر وقت بخار رہتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ شفقت و ہمدردی کا معاملہ

۱۵۴۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ اَوْسَافَرَ كُتِبَ لَهٗ بِمِثْلِ مَاكَانَ یَعْمَلُ مُقِیْمًا صَحِیْحًا۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳۶/۶۔ حدیث رقم ۲۹۹۶۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس وقت بندہ (انسان) بیمار ہوتا ہے یا

اس کو سفر کرنا پڑتا ہے تو سفر کی وجہ سے اس کے نوافل اوراد و وظائف جو حضر میں کیا کرتا تھا' فوت ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے (مانند) برابر ثواب لکھ دیتے ہیں۔ جو گھر میں عمل کرتا تھا۔ (یعنی تندرستی کی حالت میں جو نوافل وغیرہ پڑھتا تھا۔ اس کے برابر اللہ تعالیٰ اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں۔)

تشریح: (اذا مرض العبد) اور اسی معنی میں "اذا کبر" کے الفاظ بھی ہیں اور ایک روایت میں صریح الفاظ ہیں کہ "اذا سافر" یعنی اس کی وجہ سے اس کی نفلی عبادت رہ جائے۔

قولہ کتب بمثل ما کان یعمل) یعنی نفلی عبادت اور اس میں باء زائدہ ہے جیسا کہ قرآن پاک کی آیت میں زائدہ ہے: ﴿فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾[البقرہ۔۱۳۷] "تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے"۔

قولہ (مقیما صحیحا) یعنی حالت قیام اور حالت صحت میں جو عمل کرتا تھا اور اس میں شافعیہ کے اس قول کا رد ہے کہ جس نے جماعت ترک کر دی اس کے لیے ثواب نہیں لکھا جائے گا اور اسی طرح ان کا یہ قول آپؐ کے فرمان کے بھی خلاف ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جو آدمی غزوے میں سفر خرچ نہ ہونے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے اس کے لیے غزوے کا اور مجاہدین کے ساتھ سفر کرنے کا ثواب لکھا جائے گا۔

میرکؒ نے کہا اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

طاعون کی بیماری پر شہادت کا ثواب

۱۵۴۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ شَهَادَةٌ كُلِّ مُسْلِمٍ۔

[متفق علیہ]

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۸۰/۱۰۔ حدیث رقم ۵۷۳۲۔ ومسلم فی صحیحہ ۱۵۲۲/۳۔ حدیث رقم (۱۶۶۔ ۱۹۱۶)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طاعون ہر مسلمان کی شہادت ہے۔ یہ روایت بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے۔

تشریح: یعنی ان کا حکم شہداء والا ہوگا۔ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ اس سے مراد ہر مسلمان کی اُخروی شہادت مراد ہے تو یہ قول اس روایت کی مخالفت میں ہے کیونکہ اصل اضافت پر مبنی ہے اور طاعون وہ پھوڑے پھنسیاں ہیں جو بغل میں' انگلیوں کے درمیان اور پورے جسم پر گرمی کی وجہ سے نکلتی ہیں اور ان پھنسیوں کے اردگرد کی جگہ کبھی سیاہ کبھی سرخ اور کبھی سبز معلوم ہوتی ہے۔ رہی وبا تو اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ طاعون ہی کا نام ہے اور درست بات یہ ہے کہ یہ اس بیماری کو کہتے ہیں جو لوگوں میں بہت زیادہ پھیل جاتی ہے اور یہ بیماری ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ بات ابن ملک نے ذکر کی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: طاعون عام مرض کو کہتے ہیں اور وبا وہ ہے جس سے فضا خراب ہو جاتی ہے۔ جس سے لوگوں کے

مزاج اور ان کے جسم میں تبدیلی اور خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ایک قول یہ ہے کہ طاعون موت کو کہتے ہیں اور وباء میں مد بھی پڑھی جا سکتی ہے اور بغیر مد کے بھی پڑھا جا سکتا ہے اور وبا تمام موت اور عام بیماری کو کہتے ہیں۔امام احمد نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کی فنا جنگ اور طاعون ہے'' کہا گیا اے اللہ کے رسول ! طعن کو تو ہم پہچانتے ہیں یہ طاعون کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ جنوں میں سے تمہارے دشمنوں کے پرندوں کے زخم ہیں اور ان میں ہلاک ہونے والا ایک شہید تصور ہوگا۔

شہداء کی اقسام

۱۵۴۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ اَلْمَطْعُوْنُ وَالْمَبْطُوْنُ وَالْغَرِيْقُ وَصَاحِبُ الْهَدْمِ وَالشَّهِيْدُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٢/٦۔ حديث رقم ٢٨٢٩۔ ومسلم في صحيحه ١٥٢١/٣ حديث رقم (١٦٤۔ ١٩١٤)۔ والنسائي في السنن (٩٩/٤ حديث رقم ٢٠٥٤۔ والدارمي ٢٧٣/٢ حديث رقم ٢٤١٣۔ واحمد في المسند ٤٨٩/٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہداء کی پانچ قسمیں ہیں: ① ایک طاعون زدہ (طاعون سے ہلاک ہونے والا)۔ ② جو پیٹ کی بیماری سے مرے (ہلاک ہو جائے) یعنی دستوں اور استسقاء وغیرہما سے۔ ③ بدوں اختیار پانی میں ڈوبنے والا۔ ④ دیوار یا چھت کے نیچے دبنے والا۔ ⑤ خدا کی راہ میں جان دینے والا۔

تشریح: قوله (خمسة) اور یہ شہید کی جمع ہے جو فاعل کے معنی میں ہے۔کیونکہ شہید اپنی موت سے پہلے اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے یا پھر مفعول کے معنی میں ہے کیونکہ فرشتے اس کے پاس حاضر ہوتے ہیں یعنی اسے خوشخبری دینے کے لیے آتے ہیں۔

قوله (المطعون) یعنی وہ جو طاعون کی وجہ سے فوت ہوا ہو۔

قوله (والمبطون) یعنی وہ جو پیٹ کی بیماری کی وجہ سے فوت ہو جیسے پیچش وغیرہ۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو پیٹ کے درد کی وجہ سے فوت ہوا ہو۔امام قرطبی فرماتے ہیں۔اس میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد پیٹ پھولنے کی بیماری ہے یا اسہال ہے۔

قوله (والغ) یعنی وہ جو غرق ہو کر مر جائے۔ظاہراً اس میں یہ قید معلوم ہوتی ہے کہ جو سمندر میں کسی غلط کام کے لیے سوار نہ ہوا ہو۔

قوله (وصاحب الهدم) دال پر فتحہ اور جزم دونوں جائز ہیں۔امام طیبی فرماتے ہیں: ہدم یہ ہے کہ کنویں کی ایک جانب کی دیوار منہدم ہو اور کوئی آدمی اس میں گر کر ہلاک ہو جائے اور ابن مالک فرماتے ہیں یعنی وہ آدمی جو کسی دیوار یا عمارت کے

نیچے آ کر فوت ہو جائے اور دال مفتوح کے ساتھ گرنے والی چیز کو کہتے ہیں اور یہ اس وقت مفعول کے معنی میں ہوتا ہے اور اگر ساکن ہو تو مصدر کے معنی میں آتا ہے اور ابن حجرؒ کا یہ قول: ''هدم دال کے سکون کے ساتھ ہے۔ فتحہ بھی پڑھا گیا ہے لیکن اس وقت یہ مہدوم شئی کا نام ہوتا ہے اور یہاں پر اس کا وارد کرنا درست ہے سوائے اس کے کہ اس میں وہم ہوتا ہے۔'' یہ مذکورہ قول اعتراض سے خالی نہیں ہے کیونکہ فتحہ میں تو زیادہ وہم ہوتا ہے بلکہ تحقیق یہی ہے کہ مصدری معنی میں یہ استعمال نہیں ہوتا۔ اسی لیے شارحین نے فتحہ کو اختیار کیا ہے۔

قولہ (و الشهيد) یعنی مقتول۔

قولہ (فی سبیل الله) امام راغب فرماتے ہیں: شہید کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾[فصلت: ۳۰] ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ'' یا پھر اسلئے شہید کہتے ہیں کہ یہ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے انعامات حاصل کریں گے اور حاضر ہونگے یا پھر اس لیے کہ ان کی روحیں اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہوتی ہیں۔

ابن ملک فرماتے ہیں: شہید کو سب سے بعد میں ذکر کیا ہے کیونکہ یہاں پر ترقی کا اصول پیش نظر ہے۔ پہلے حکمی شہید ذکر کیئے ہیں اور بعد میں حقیقی شہید کو ذکر کیا ہے۔ اور جان لیجئے کہ حکمی (معنوی) شہداء کی بہت اقسام ہیں جو کہ مشہور احادیث میں منقول ہیں۔ امام سیوطیؒ نے انہیں ایک جلد میں جمع کیا جس کا نام (ابواب السعادة فی اسباب الشهادة) حکمی شہیدوں کا کچھ تذکرہ ہو چکا ہے اور مزید یہ ہیں: جوذات الخبب، آگ میں جل کر مرجائے اسی طرح حاملہ عورت مرجائے تو وہ شہید ہوگی۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ لڑکی جو کنواری مرجائے تو شہید کے درجے میں ہوگی۔

اسی طرح وہ عورت جو حمل کے دوران، وضع حمل کے وقت اور دودھ پلانے کی مدت میں فوت ہو جائے۔

اسی طرح وہ بھی شہید ہے جو تپ دق کی وجہ سے ہلاک ہو۔

مسافر یا اللہ کے راستے میں کسی سواری سے گر جائے اور مرجائے اسی طرح جانوروں کے بارے میں جس کو روند دیا جائے اونچی جگہ سے گر کر ہلاک ہونے والا۔ یا جسے درندے پھاڑ کھائیں اور جو شخص اپنی جان و مال وعزت کو بچاتے ہوئے مرجائے وہ بھی شہید ہے اسی طرح اللہ کی راہ میں فوت ہونے والا اور اللہ کے راستے میں اپنے بستر پر مرنے والا بھی شہید تصور ہوگا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے:

جو شخص بادشاہ کی قید میں ناحق ہو اور وہیں مرجائے تو وہ شہید ہے اور وہ شخص جسے کوئی شخص مارے اور اس کے مارنے کی وجہ سے وہ فوت ہو جائے تو وہ بھی شہید ہے۔

حضرت انسؓ سے مرفوع روایت ہے:

بخار شہادت ہے حضرت ابوعبیدہؓ فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے رسولؐ سے پوچھا: کون سا شہید اللہ کے ہاں زیادہ مرتبے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ شہید جو ظالم حکمران کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور وہ اسے قتل کردے۔

حضرت ابوموسیٰ فرماتے ہیں:

جس کو اس کا گھوڑا یا اونٹ گرادے یا اسے کوئی موذی ڈس لے تو یہ شہید ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: جو شخص کسی سے عشق کرے، پھر پاک دامن رہے اور اسے ظاہر نہ کرے اور مرجائے تو ایسا شخص شہید تصور ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: وہ شخص جسے سمندر میں چکر آجائیں اور قے آجائے اور پھر مرجائے تو اسے شہید کے برابر اجر ملے گا۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے مرفوع روایت ہے:

اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر غیرت لازم کی ہے اور مردوں پر جہاد لازم کیا ہے۔ پس جو عورت صبر کرے گی اس کے لیے شہید کے برابر اجر ہوگا۔

حضرت عائشہؓ سے مرفوع روایت ہے:

آپؐ نے فرمایا جو شخص ایک دن میں ۲۵ مرتبہ یہ دعا پڑھے۔ اللهم بارك لي في الموت و فيما بعد الموت۔ تو پھر وہ اپنے بستر پر مرگیا تو اسے اللہ تعالیٰ شہید کے برابر اجر عطا فرمائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوع روایت ہے:

جو شخص چاشت کی نماز پڑھتا رہے اور ہر مہینے تین دن کے روزے رکھے اور سفر و حضر میں نماز وتر ترک نہ کرے تو اس کے لیے شہید کے برابر اجر ہوگا۔ اسی طرح آپ کا فرمان ہے: جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو مضبوطی سے پکڑے رکھے تو اس کے لیے شہید کے برابر ثواب ہوگا۔ اسی طرح جو طالب علمی کے دور میں فوت ہوجائے وہ بھی شہید ہے اور مؤذن ثواب کی نیت سے اذان دیتا ہوا اور مرجائے تو وہ شہید ہے۔ اور جو شخص مداری کی صورت میں زندگی گزارے اور جو شخص مسلمانوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرے اور جو اپنی بیوی بچوں اور غلاموں کے لیے کوشش کرتے ہوئے مرجائے تو وہ شہید ہوگا۔ ان کے علاوہ بھی اقسام ہیں جن کے تذکرے سے بات لمبی ہوجائے گی پس ہر وہ شخص جس کی شہادت کے اسباب زیادہ ہوجائیں تو اسی نسبت سے اس کے لیے خوش بختی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

میرکؒ نے کہا اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

طاعون سے فرار اختیار کرنا منع ہے

۱۵۴۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُوْنِ فَاَخْبَرَنِيْ اَنَّهٗ عَذَابٌ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَهٗ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لَيْسَ مِنْ اَحَدٍ يَقَعُ الطَّاعُوْنُ فَيَمْكُثُ فِيْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا يُصِيْبُهٗ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ شَهِيْدٍ۔ [رواہ البخاری]

اخرجه البخاري في صحيحه ١٠/١٩٢۔ حديث رقم ٥٧٣٤۔

ترجمہ :حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کی حقیقت کے بارے میں پوچھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ یہ عذاب ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں جس پر چاہے نازل فرمادے۔ یہ مؤمنوں کے لیے رحمت ہے جوصبر کرتے ہیں یعنی جوشخص طاعون والے شہر میں صبر کرتا ہواثواب کی خاطر ٹھہرے اور کوئی غرض نہ ہواور اس کو یقین ہو کہ اسے وہ چیز پہنچ کر رہے گی جو اللہ نے اسکے لیے لکھ دی ہے تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

تشریح:سالت رسول الله ﷺ عن الطاعون: یعنی اس کی حکمت ہے؟

قوله (فاخبرني انه عذاب يبعثه الله على من يشاء) یعنی اپنے مؤمن اور کافر بندوں میں سے۔

قوله (وأن الله) عطف کی صورت میں ہمزہ مفتوح ہوگا اور استیناف کی صورت میں مکسور ہوگا۔

قوله (جعله رحمة) یعنی رحمت کی زیادتی کا سبب

قوله (للمؤمنين) یعنی اس پر صبر کرنے والوں کے لیے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾[الاسراء۔٨٢] ''اور ہم قرآن (کے ذریعے) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔'' ابن حجرؒ کا یہ قول کہ'' کافروں میں سے جس پر چاہتا ہے'' یہ تو دلیل کے ساتھ ہے اور ''أن الله'' سے آخر تک کی بات غیر ظاہر ہے۔

قوله (ليس) یہ جملہ آپؐ کے فرمان ''جعله رحمة'' کا بیان ہے۔

قوله (من احد) مِن زائدہ ہے یعنی لیس احد۔

قوله يقع الطاعون: یہ ''احد'' کی صفت ہے اور راجع محذوف ہے یعنی اصل میں یوں تھا۔يقع في بلده ،

قوله فيمكث في بلده: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فيمكث کا عطف يقع اور يعلم پر ہے۔ چنانچہ ان کے نسخے میں ''ويعلم'' کے الفاظ ہیں اور یہ اصول کے خلاف ہے رہا ابن حجر کا یہ قول کہ يمكث پر حرف عطف محذوف سمجھ کر عطف کیا گیا ہے'' تو یہ ناپسندیدہ قول ہے۔

قوله (صابراً محتسباً) یہ دونوں جملے يمكث کے فاعل سے حال ہیں یعنی وہ صبر کرتا ہے اس حال میں کہ وہ خروج کی طاقت رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور صرف ثواب کی امید کرتے ہوئے۔ مال اور کسی دوسری غرض سے نہیں۔

قوله (يعلم) دوسرا حال ہے یا يمكث سے بدل ہے۔

قوله (انه لا يصيبه الا ما كتب الله له) یعنی زندگی اور موت میں سے

قوله (الا كان له مثل اجر شهيد) یہ لیس کی خبر ہے اور استثناء مفرغ ہے۔

طاعون کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت

۱۵۴۸: وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ رِجْزٌ أُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيْلَ أَوْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَ أَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْهُ۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۴۵/۱۲۔ حديث رقم ۲۹۷۴۔ ومسلم في صحيحه ۱۷۳۶/٤ حديث رقم (۹۲۔۲۲۱۸) واحمد في المسند ۱۸۲/۱۔

ترجمه: حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ طاعون عذاب ہے یہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا تھا یا فرمایا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے۔راوی کو شک ہے کہ پہلی بات ارشاد فرمائی یا دوسری بات؟ جس وقت تم طاعون کے بارے میں سنو کہ وہ کسی زمین میں ہے۔تو اس زمین کی طرف نہ جاؤ۔جب تم ایک زمین میں ہو اور اس میں (یعنی اس علاقے میں) طاعون کی بیماری آ جائے تو اس سے بھاگ کر نہ نکلو۔اس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن اسامه بن زيد: یعنی ابن حارثہ

قوله (قال قال رسول الله ﷺ الطاعون رجز) راء پر کسرہ ہے اس کا معنی ہے عذاب

قوله (ارسل على طائفة من بني اسرائيل، او على من كان قبلكم فاذا سمعتم به بأرض) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ وہ لوگ تھے جنہیں کہا گیا تھا: ﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ تو انہوں نے مخالفت کی تھی۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾۔

ابن مالک فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون نازل کیا تھا جس کی وجہ سے ایک ہی ساعت میں ان کے بزرگ اور شیوخ میں سے ۲۴ ہزار مر گئے۔اور باب سے باب قبہ مراد ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیت المقدس میں منہ کر کے نماز پڑھی تھی "او على من كان قبلكم" یہ راوی کی طرف سے شک ہے" اور جب تم اس کے بارے میں کسی علاقے میں سنو"

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بہ کی جو باء ہے وہ سمعتم کے متعلق ہے یعنی سمعتم بمعنی اخبرتم اور "بأرض" حال ہے یعنی "واقعا في الارض۔ قوله (فلا تقدموا عليه) تقدم باب افعال سے ہے اور بعض نسخوں میں تاء کے فتحہ کے ساتھ اور دال کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔

زین العرب فرماتے ہیں: ۔تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور امام تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی راویوں نے تاء پڑھا ہے اور جو دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ مجرد قَدَمَ يَقْدُمُ سے لیتے ہیں اور بعض نے دال کو فتحہ دیا ہے اور وہ اس وقت "قدم من سفره" يقدم قدومًا" سے لیتے ہیں۔حفاظ حدیث کے ہاں تاء کا ضمہ ہی ہے۔جیسے: اقدم على ~~الامر~~ اقدامًا بولتے ہیں۔

ابن ملک فرماتے ہیں: اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس علاقے میں مت داخل ہو اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپ حجر یعنی ہلاک کیے گئے ثمودیوں کے علاقے میں پہنچے تو آپ نے اپنے صحابہ کو اس میں گھسنے سے منع کر دیا اور اس بات کی تائید آپ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے کہ ''جب تم ایسی قوم کے علاقے سے گزرو جنہیں عذاب دیا گیا تھا تو جلدی سے گزر جایا کرو مبادا کہ وہی عذاب تمہیں آن لے۔

قوله (واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا فرارًا منه)۔

ابن ملک فرماتے ہیں: بھاگ جانا عذاب الٰہی سے نہیں بچا سکتا۔ صرف توبہ اور استغفار ہی عذاب الٰہی سے بچا سکتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ ضرورت کے وقت آدمی ان علاقوں میں داخل ہو سکتا ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ جب طاعون عذاب کی صورت میں آئے تو ایسی صورت میں اس علاقے کی طرف پیش قدمی کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اور طاعون زدہ علاقے میں جانا بھی عقل کے خلاف ہے اسی طرح وہاں سے بھاگنے سے بھی منع کیا گیا ہے کیونکہ وہاں رہنا اس چیز میں تسلیم و رضا ہے جس میں کسی کا اختیار نہیں ہے۔ اور اس میں یہ احتمال بھی کہ اگر طاعون زدہ علاقے سے فرار اختیار کیا جائے تو وہاں کے مریضوں اور مرنے والوں کی میتوں کے ضائع ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ اگر تندرست لوگ وہاں سے بھاگ جائیں تو بیماروں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟

قاضی عیاض فرماتے ہیں: اس حدیث میں مصیبت کا استقبال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تقدیر سے بھاگنے والی بات ہے اور اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں: ان دونوں میں سے ایک میں ادب سکھایا گیا ہے اور تسلیم دی گئی ہے اور دوسرا حکم بھروسا اور تسلیم و رضا کے لیے دیا گیا ہے۔

امام میرکؒ فرماتے اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

بینائی کے ختم ہونے پر جنت کا وعدہ

۱۵۴۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِيْ بِحَبِيْبَتَيْهِ ثُمَّ صَبَرَ عَوَّضْتُهٗ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ يُرِيْدُ عَيْنَيْهِ۔ [رواه البخاري]

اخرجه البخاري في صحيحه ١١٦/١٠۔ حديث رقم ٥٦٥٣۔ واحمد في المسند ١٤٤/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور بلند ہے جس وقت میں اپنے بندے کو اس کی دو پیاریوں (آنکھوں) کے بارے میں مبتلا کرتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے تو میں ان دونوں کے عوض (بدلے) اسے بہشت عطا کرتا ہوں یعنی اس کو (جنت) داخل کروں گا۔ دو پیاریوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس کی دو آنکھیں ہیں۔ (اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے)۔

تشریح: اذا ابتليت عبدى بحبيبتيه: یعنی دونوں آنکھوں کی بینائی سلب کر کے اور انہیں حبیبۃ اس لیے کہا گیا

ہے کہ یہ دونوں حواسِ خمسہ میں انسان کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اگرچہ صحیح قول کے مطابق کان آنکھوں سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ کانوں کے زیادہ تر فوائد اُخروی ہیں کیونکہ یہ قرآن وسنت اور علوم کے ادراک کا محل ہیں اور آنکھوں کے زیادہ تر فوائد دنیاوی ہیں۔

قولہ (ثم صبر) ثم تراخی رتبہ کے لیے آیا ہے۔

قولہ (عوضة منهما) یعنی ان کے بدلے میں یا ان دونوں کے سلب کرنے کی وجہ سے

(الجنة) یعنی کامیاب ہونے والوں کے جنت کا ٹکٹ یا جنت میں مخصوص درجات مراد ہیں۔

قولہ (یرید) یعنی نبی ﷺ کی حبیبتیه سے مراد۔

قولہ (عینه) ظاہراً یہ حضرت انسؓ کی تفسیر ہے۔ بخاری کے علاوہ ایک اور حدیث میں ہے دونوں آنکھوں میں سے ایک کے نابینا ہونے کے بدلے میں جنت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تو اس سے بھی زیادہ وسیع ہے اور جو آدمی اس آزمائش میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے سلف اکابر، انبیاء اور صلحاء کی زندگیوں پر نظر ڈالے جو اس آزمائش میں مبتلا ہوئے تھے اور انہوں نے صبر کیا تھا اور اس پر راضی رہے تھے بلکہ اسے ایک نعمت شمار کیا تھا۔ اسی لیے تو جب خیر الامت اور ترجمان القرآن سیدنا عبداللہ بن عباسؓ اس آزمائش میں مبتلا ہوئے تھے تو انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

ان یذهب الله غینی نورهما ☆ ففی لسانی و قلبی للهدی نور

"اگر اللہ تعالیٰ نے میری آنکھوں کا نور لے لیا ہے (تو کیا ہوا) میرے دل اور زبان میں نور ہدایت موجود ہے۔"

الفصل الثانی:

مسلمان کی عیادت کرنے پر خدا کی طرف سے انعام

۱۵۵۰ : عَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مُسْلِمًا غُدْوَةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ عَادَهٗ عَشِيَّةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُصْبِحَ وَكَانَ لَهٗ خَرِيْفٌ فِي الْجَنَّةِ۔ [رواه الترمذی وابو داود]

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۷۵/۳ حدیث رقم ۳۰۹۸۔ والترمذی فی السنن ۳۰۰/۳ حدیث رقم ۹۶۹۔ وابن ماجه ۴۶۳/۱ حدیث رقم ۱۴۴۲۔ واحمد فی المسند ۹۱/۱۔

ترجمہ : حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے اس کے لیے ستر ہزار فرشتے دعائے مغفرت فرماتے ہیں یہاں تک کہ شام ہو جائے اور جب زوال کے بعد اس کی عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت فرماتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جائے اور اس کے لیے جنت میں باغ ہوگا۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: الغدوۃ، غین کے پیش کے ساتھ۔ صبح کی نماز سے لے کر طلوع آفتاب کے وقت کو غدوہ کہتے ہیں یہ ابن ملک کا قول ہے اور ظاہراً اس سے زوال سے قبل دن کا شروع حصہ مراد ہے۔

صلی علیه: یعنی اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

یعنی "حتی کے سورج غروب ہو جائے"۔ معنی قرینہ مقابل کی وجہ سے کیا ہے۔ اور ابن حجرؒ کا قول تو بہت عجیب ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "حتی یمسی" کا مطلب ہے "یہاں تک کہ شام ختم ہو جائے" اور شام آدھی رات کے وقت ختم ہوتی ہے" اور یہ قول امام ثعلبؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ قول جمہور اہل لغت کے خلاف ہے۔

وان عادہ: "ان" نافیہ ہے اس کی دلیل اس کے بعد آنے والا "الا" ہے اور اس کے مقابلے میں "ما" بھی موجود ہے۔

عشیة: زوال کے بعد کا وقت یا رات کا ابتدائی حصہ۔

قوله: الا صلی علیه سبعون الف ملك حتی یصبح و کان له: یعنی دونوں اوقات میں عیادت کرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

خریف: یعنی باغ۔ خریف اصل میں پکے ہوئے پھل کو کہتے ہیں یا "خریف"، بمعنی "مخروف"، "فعیل"، بمعنی "مفعول" جنت کا ایک پھل۔

اسنادی حیثیت امام ترمذیؒ نے اسے حسن غریب کہا ہے

تخریج: میرکؒ نے کہا: کہ امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

عیادت کے بارے میں دو مختلف روایات اور بہتر تطبیق

۱۵۵۱: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ عَادَنِى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ وَجَعٍ كَانَ بِعَيْنَيَّ۔

[رواہ احمد وابو داود]

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۴۷۷/۳ حدیث رقم ۳۱۰۲۔ واحمد فی المسند ۳۷۵/۴۔

ترجمہ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں میں درد کی وجہ سے میری عیادت کی۔ اس روایت کو احمد اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یاء فتح اور سکون کے ساتھ۔

من وجع: مراد آشوب چشم ہے جیسا کہ ایک روایت میں "من رمد" کا ذکر ہے۔ (قالہ میرک)

بعینی: یاء مشدد ہے اور ایک صحیح نسخ میں یا مخفف ہے۔ اور اس سے مراد جنس ہے۔

الازہار میں لکھتے ہیں: اس حدیث میں عیادت مریض کے مستحب ہونے کا بیان ہے اگرچہ بیماری خوفناک نہ ہو جیسے سر کا درد اور ڈاڑھ کا درد وغیرہ اور ایسی تکلیفوں میں پرسان حال کے لئے جانا بھی عبادت ہے حتی کہ عیادت کا اجر بھی ملے گا۔ اور (اگر کسی کی عیادت نہ کرنے کی قسم کھائی ہو اور اس قسم کی تکلیف میں مبتلا کسی شخص کی حال پرسی کے لئے چلا گیا تو) اس کی وجہ سے

حانث ہو جائے گا۔

اس میں اہل تشیع کا اختلاف ہے میں کہتا ہوں بعض حنفیوں سے مروی ہے کہ آشوب چشم یا ڈاڑھ کے درد میں کسی کی عیادت کرنا خلاف سنت ہے اور حدیث اس قول کا رد کرتی ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ ان حنفیوں نے کیسے یقین کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ یہ خلافِ سنت ہے۔ حالانکہ سنت تو اس کے برعکس ہے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا) امام ابوداؤد نے تو اپنی سنن میں اس کے بارے میں ایک علیحدہ باب باندھا ہے: "باب العیادۃ من الرمد" اور پھر انہوں نے (رمد میں عبادت کرنے کی) حدیث بیان کی ہے۔ اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے۔ (ذکر میرکؒ)۔

میں کہتا ہوں: خلافِ سنت والے قول کو خلاف سنت المؤکدہ پر محمول کیا جائے گا ایسا کرنے سے یہ قول حدیث کے معارض نہیں ہوگا' کیونکہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی جانب سے یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عیادت ہے، بلکہ اس میں احتمال ہے کہ اس سے مراد زیارت ہو اور صحابیؓ نے صرف اپنے گمان کے مطابق کہہ دیا ہو کہ یہ عیادت ہے یا عیادت کے مشابہ ہے۔ چنانچہ (اس گمان کے پیش نظر) انہوں نے مجازی طور پر عیادت کا لفظ بول دیا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ بیہقی اور طبرانی کی مرفوع روایت کے معارض ہے: "ثلاثۃ لیس لھم عیادۃ العین والرمد والضرس" تین چیزوں میں عیادت نہیں ہے: "آنکھ، آشوب چشم اور ڈاڑھ کے درد میں"، اگرچہ بیہقی نے اسی روایت کے یحییٰ بن ابی کثیر پر موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے اسے نقل کیا ہے۔

پھر ہمارے نزدیک ایمان کی بنیاد عرف اور عادت پر ہے کہ نہ کہ لغت اور سنت ثابتہ پر اور ابوداؤد نے جو باب باندھا ہے وہ خود انہیں کے لیے تو حجت ہو سکتا ہے دوسروں کے لیے نہیں۔

"شرعۃ الاسلام" میں ہے یہ بھی سنت مؤکدہ میں سے ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو پہنچنے والی ہر بیماری پر عیادت کرے سوائے تین امراض کے: ① آشوب چشم، ② ڈاڑھ کا درد ③ پھوڑا۔ شارحؒ فرماتے ہیں: "ہم نے سنت مؤکدہ کی قید اس لیے لگائی ہے کہ اس قید سے اس مخالفت کے وہم کا تدارک ہو جاتا ہے اور جو مصنفؒ (یعنی صاحب شرعۃ الاسلام) اور مصابیح میں مذکور روایت کے درمیان ہوتا ہے کہ "زید بن ارقم فرماتے ہیں: عادنی النبی ﷺ من وجع کان یصیبنی۔ کیونکہ یہ غیر مؤکدہ سنتوں پر محمول ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسی بیماریوں میں عیادت کرنا لازمی نہیں ہے' نہ کہ یہ معنی ہیں کہ (ایسی بیماریوں میں) عیادت منہی عنہ ہے۔ اھ۔

ابن ملک فرماتے ہیں: یہ اس بات پر دلالت ہے کہ وہ بیماری کہ جس کی وجہ سے آدمی اپنے گھر سے نکلنے پر قادر ہو نہ سکے' اس میں عیادت کرنا سنت ہے۔ اور اس میں جو کلام ہے وہ آپ جان ہی چکے ہیں اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث پر امام ابوداؤدؒ اور امام منذریؒ نے سکوت اختیار کیا ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

باوضو عیادت کرنے کی فضیلت

۱۵۵۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِيْرَةَ سِتِّيْنَ خَرِيْفًا۔ [رواه ابو داود]

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۳/۴۷۵ حديث رقم ۳۰۹۷۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے اچھی طرح وضو کیا پھر محض ثواب کی نیت سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی اس کو دوزخ سے ساٹھ برس کی مسافت کی مقدار دور رکھا جائے گا۔ اس کو ابوداوٗد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: من توضأفاحسن الوضوء: محتسبا: یعنی کامل وضو کیا اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ ''یعنی صحیح وضو کرے'' یہ درست نہیں ہے' کیونکہ جو صحیح وضو نہیں کرتا تو اسے شریعت میں وضوء کرنا نہیں کہتے۔

اور عیادت کے لئے طہارت کا حکم شاید اس لیے ہے کہ عیادت بھی ایک طرح کی عبادت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ (لفظ) ''عیادت'' میں ایک نقطہ زائد ہے اور یہ زیادت بھی عیادت کرنے والے کے لحاظ میں ہے کیونکہ جب وہ وضوء کر کے عیادت مریض کرتا ہے تو) وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کے ساتھ ساتھ اللہ کی مخلوق پر شفقت بھی کر رہا ہوتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس (حدیث) میں اس بات کا بیان ہے کہ عبادت کے لیے وضوء سنت ہے کیونکہ وضو کی حالت میں دعا کی جاتی ہے تو قبولیت کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔

زین العرب فرماتے ہیں: شاید یہاں وضو کی حکمت یہ جیسا کہ ہے کہ عیادت بھی عبادت ہے اور عبادت کو کامل طریقے سے ادا کرنا افضل ہوتا ہے۔ یہ بات شافعیہ کے خلاف حجت ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا کہ مریض کی عیادت کے لیے وضوء کرنا سنت نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں: ''اور ہوسکتا ہے کہ ان کا عذر یہ ہو کہ انہیں مذکورہ حدیث نہ پہنچی ہو''۔ یہ بات بعید ہے باوجو یکہ سنت تو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی''۔ میں کہتا ہوں: سبحان اللہ! ابن حجرؒ شافعیہ کے متعلق یہ بات بعید سمجھتے ہیں کہ انہیں اس جیسی حدیث نہ پہنچی ہو اور گزشتہ کئی مواضع میں وہ اس بات کو جائز قرار دیتے آرہے ہیں کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور احمدؒ جیسے ائمہ حدیث اور اصول وفروع کے ثقات رکھنے والے حضرات کو صحیح احادیث نہیں پہنچیں''۔ کیا کہا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ

''حبك الشئ يعمي و يضم''

قوله: بوعد من جهنم...... :

بوعد: مباعدة سے ماضی مجہول ہے اور باب مفاعلہ سے لانا مبالغہ کے لیے ہے۔

خریفًا: سال مراد ہے جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ''سنة'' کے الفاظ مذکور ہیں۔ ''سنہ'' کو ''خریف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ کہ موسم خریف بھی سال کے موسموں میں سے ایک موسم ہے ''جزء بول'' کر ''کل'' مراد ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: عرب لوگ اپنے سالوں کو خریف کے ساتھ لکھتے تھے، کیونکہ یہ موسم ان کے ہاں کھجور، پھل اور غلہ حاصل کرنے کا ہوتا تھا یہاں تک کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاریخ ہجری سال کے مطابق لکھی۔ اھ۔ ابن حجرؒ نے بھی اسی کی اتباع کی ہے۔ اس ایک اعتراض بھی وارد ہوتا ہے جیسا کہ ماقبل میں گذر چکا ہے اور ہم اس کا رد بھی کر چکے ہیں اس بارے میں تحقیق وہی ہے جو قاموس وغیرہ میں مذکور ہے کہ یہ ''امیر'' کے وزن پر ہے۔ تین ماہ کے دورانیہ پر مشتمل یہ موسم' موسم گرما اور موسم سرما کے درمیان آتا ہے۔ اس موسم میں پھل چنے جاتے ہیں۔ (اور کہا جاتا ہے:) أرخ الكتاب اى وقته (تاریخ نکالنا) پس ان کے قول ''عرب اپنے سالوں کو خریف کے ساتھ لکھا کرتے تھے'' کا مطلب یہ ہے وہ خریف کو مذکورہ علت کی بناپر اپنے سال کا اختتام یا آغاز شمار کرتے تھے یا مطلب یہ ہے کہ وہ پورے سال کو خریف کا نام دیتے تھے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کے ہجری سال سے لکھنے کا کوئی دخل نہیں ہے' اس (یعنی سیدنا عمرؓ کے ہجری تاریخ لکھنے) کا سبب یہ تھا کہ عرب لوگ گزشتہ سالوں کے واقعات کی معرفت کے لیے کسی غیر معمولی واقعے کو بنیاد بناتے تھے جو بعض اوقات واقع ہوتے ہیں جیسا کہ عام الفیل وغیرہ۔ تاریخ کے اس انداز کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تبدیل کر دیا اور تاریخ کا اعتبار ہجری سال سے قرار دیا جو کہ آج تک جاری ہے۔ واللہ اعلم

بیمار کے لیے دُعا کرنا مسنون ہے

١٥٥٣: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مُسْلِمًا فَيَقُوْلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ اَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَشْفِيَكَ اِلَّا شُفِيَ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ قَدْ حَضَرَ اَجَلُهُ. [رواه ابو داود والترمذى]

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٩٣/٤٧ حديث رقم ٣١٠٦۔ والترمذى ٤١٠/٤ حديث رقم ٢٠٨٠ واحمد فى المسند ٢٣٩/١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان بیمار مسلمان کو پوچھے (حال دریافت کرے) پھر سات مرتبہ کہے کہ میں اللہ بزرگ پروردگار عرش والے سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کو شفا دے اسے شفا دی جاتی ہے مگر یہ کہ اس کی موت حاضر ہو جائے یعنی مرض لاعلاج ہو جائے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے اسکو روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: مامن مسلم يعود مسلما فيقول سبع مرات:

مامن مسلم: ''ما'' نافیہ ہے اور ''من'' زائدہ ہے۔

سبع مرات: اس سے شاید سات اعضاء کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: اسال الله العظيم: یعنی جو اپنی ذات اور صفات میں عظیم ہے۔

عرش عظیم کا مالک ہونے کی صفت کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ عرش اس کی تمام مخلوقات میں سے بڑا ہے اور پوری کائنات کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ایک نسخہ میں ''العظیم'' پر نصب ہے اس بنا پر کہ ''رب'' کی صفت ہے۔

ان یشفیك پہلی یاء پر فتح ہے۔ یہ دوسرا مفعول ہے۔

شفی: بصیغہ مجہول ہے۔

یہ حصر غالبی ہے یا پھر ان شروط پر مبنی ہے جن کا پایا جانا ضروری ہے۔

قولہ : الا ان یکون قد حضر اجلہ: یعنی اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس کی موت آسان فرما دیتے ہیں اور اسے شفائے باطنی حاصل ہو جاتی ہے حتی کہ وہ اپنے رب کو قلب سلیم کے ساتھ ملتا ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام نسائی نے اس حدیث کو "عمل الیوم وا للیلة" میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے اپنی متدرک میں روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

۱۵۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُهُمْ مِنَ الْحُمّٰى وَمِنَ الْاَوْجَاعِ كُلِّهَا اَنْ يَقُوْلُوْا بِسْمِ اللّٰهِ الْكَبِيْرِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ مِنْ شَرِّ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب لا نعرفه الا من حدیث ابراهیم بن اسماعیل وهو یضعف فی الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٠٢/٤ حدیث رقم ٢٠٧٥۔ وابن ماجه ١١٦٥/٢ حدیث رقم ٣٥٢٦۔ واحمد فی المسند ٣٠٠/١۔

ترجمہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو بخار کے لیے دعا سکھاتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الْكَبِيْرِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ مِنْ شَرِّ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ وَمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ۔ میں اللہ بزرگ و برتر کے نام سے برکت چاہتا ہوں اور میں اللہ بزرگ و برتر کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہر جوش مارنے والی رگ کی برائی سے اور آگ کی گرمی کی برائی سے۔ اس کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور یہ حدیث غریب ہے اور یہ حدیث ابراہیم بن اسماعیل سے ہی پہچانی جاتی ہے اور ان کو روایت حدیث میں کمزور سمجھا جاتا ہے

تشریح: قولہ ان النبی کان یعلمھم :

من الحمی : ("من" تعلیلیہ ہے) ای من اجلھا۔

قولہ: بسم اللہ الکبیر الخ: یعنی اس کی شان اور دلیل بہت بڑی ہے۔

اعوذ باللہ: یہ الفاظ مصنف ابن ابی شیبہ کے ہیں۔ اکثر "اصول" میں "نعوذ باللہ" کے الفاظ ہیں۔

عرق: تنوین کے فتح کے ساتھ ہے۔

نعار: ای فوار الدم۔ کہا جاتا ہے: نعر العرق ینعر' ماضی مضارع دونوں میں فتحہ کے ساتھ' یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب خون جوش کے ساتھ نکلے۔

اس سے پناہ مانگی ہے کیونکہ جب خون حد سے زیادہ جوش مارتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "سائل الدم" کو کہتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ "مضطرب" کو کہتے ہیں۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "نعر العرق بالدم" اس وقت کہتے ہیں جب خون اوپر کو اٹھے۔ اور "جرح نعار" "جرح نعور" اس وقت بولتے ہیں

جب خون نکلنے کے ساتھ آواز بھی ہو۔

امام ترمذی فرماتے ہیں ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: "عرق نعار"۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: یہ متروک راوی ہے۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن ابی شیبہ، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن ابی دنیا نے روایت کیا ہے اور ابن سنیؒ نے اسے "عمل الیوم واللیلة" میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور امام بیہقی نے "کتاب الدعوات" میں روایت کیا ہے اور ابن حجر نے اس بارے میں عدم اطلاع کی وجہ سے کہا ہے کہ عیادت کرنے والے کے لیے مذکورہ دعا پڑھنا مسنون ہے کیونکہ اس قسم کے مسائل میں اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث بھی حجت بن سکتی ہے۔

بیمار کے لیے آپ ﷺ کی جامع دُعا

۱۵۵۵: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنِ اشْتَکٰی مِنْکُمْ شَیْئًا اَوِ اشْتَکَاهُ اَخٌ لَهٗ فَلْیَقُلْ رَبَّنَا اللّٰهُ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ اَمْرُكَ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ کَمَا رَحْمَتُكَ فِی السَّمَاءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِی الْاَرْضِ اِغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَخَطَایَانَا اَنْتَ رَبُّ الطَّیِّبِیْنَ اَنْزِلْ رَحْمَةً مِنْ رَّحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِنْ شِفَائِكَ عَلٰی هٰذَا الْوَجَعِ فَیَبْرَأُ. [رواه ابو داود]

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۱۸/۴ حدیث رقم ۳۸۹۲۔ واحمد فی المسند ۲۱/۶۔

ترجمہ: حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم میں سے کوئی بیمار ہو یا تمہارا بھائی بیمار ہو۔ تو اس کو یہ دعا پڑھنی چاہیے کہ اللہ ہمارا رب ہے ایسا اللہ کہ اس کی رحمت آسمان میں ہے یا اس کا امر یا اس کی بڑی سلطنت (بادشاہت) آسمان میں ہے یا وہ ایسا ہے کہ اس کی آسمان میں عبادت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس کی زمین میں عبادت کی جاتی ہے یعنی تیرا نام پاک ہے سب نقصانوں سے اور تیرا حکم مانا گیا ہے آسمان وزمین میں یعنی حکومت آسمان وزمین میں ہے۔ جیسا کہ تیری رحمت آسمان وزمین دونوں میں ہے اور تو زمین پر اپنی رحمت بخش دے اور رحمت کی برکت سے ہمارے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو معاف فرما۔ تو پاکیزہ لوگوں کا رب ہے۔ (یعنی محب وکارساز ہے) تو اپنی رحمت عظیمہ میں سے رحمت نازل فرما جو ہر چیز پر پھیل رہی ہے اور اپنی شفاء میں سے اس بیماری سے شفاء نازل فرما تو وہ بیمار شفایاب ہو جائے گا۔ یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے۔

تشریح: قوله: من اشتکی منکم۔۔۔۔رحمتك فی السماء:۔

اشتکی: بمعنی "شکی"۔

او اشتکاه: ضمیر "شیئا" کی طرف راجع ہے۔

قوله ربنا الله الذی فی السماء: زین العرب فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں (لفظ "ربنا") رفع کے ساتھ ہے اور

شرح میں ہے کہ یہ منصوب ہے اور لفظ ''اللہ'' اس سے بدل ہے۔

قولہ الذی: یہ صفت موضحہ ہے۔ ''جو آسمان میں ہے'' سے مراد اس کی رحمت، یا اس کا حکم یا اس کی عظیم سلطنت یا وہ ذات مراد ہے جو معبود ہے آسمان میں جیسا کہ وہ معبود ہے زمین میں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ [زخرف: ۸۴] ''اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور (وہی) زمین میں معبود ہے'' اور یہ وہ مسئلہ ہے جس میں متقدمین اور متاخرین کا باہم اختلاف ہے البتہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ پر ان سب کا اتفاق ہے کیونکہ ان الفاظ سے ظاہری مکان اور جہت کا وہم ہوتا ہے۔

قولہ: تقدس اسمك: ایک نسخے میں ''اسماء ك'' کے لفظ ہیں۔ یعنی جو تیری ذات کے لائق نہیں ان سے تیرے نام پاک ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لفظ ''رب'' مبتدا ہے اور لفظ ''اللہ'' اس کی خبر ہے جو کہ صفت مادحہ ہے جس میں صرف رفعت و بلندی کا مفہوم ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ مکان سے منزہ ہے اسی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ کے نام کی تنزیہ بیان کی گئی ہے ان چیزوں سے جو اسکے لائق نہیں ہے۔ جب اسم کی تنزیہ بیان ہوگئی تو مسمّٰی (اللہ) کی تنزیہ تو بطریق اولیٰ بیان ہوگئی۔

قولہ: امرك فی السماء و الارض: یعنی تیرا حکم (آسمان اور زمین میں) مانا جاتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ [فصلت: ۱۲] یعنی اس نے جو آسمان میں حکم دیا اور فرشتوں اور نور وغیرہ کو پیدا کرنے کی تدبیر کی۔

قولہ: کما رحمتك فی السماء فاجعل رحمتك فی الارض: ''ما'' کافہ ہے یہ جملہ کاف داخل کرنے کو ممکن بناتا ہے۔ فائق میں ہے کہ امر زمین اور آسمان کے درمیان مشترک ہے لیکن رحمت کی شان یہ ہے کہ یہ آسمان کے ساتھ خاص ہے نہ کہ زمین کے ساتھ کیونکہ آسمان طیبین و معصومین کا مسکن ہے۔ ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اسی لیے ''فاء'' جزائیہ لائی گئی اس کی تقدیر یوں ہے: ''اذا کان کذاك فاجعل رحمتك فی الارض۔

قولہ: اغفرلنا ۔۔۔ رب الطیبین: ذنوبنا: ''ذال'' کے ضمہ کے ساتھ ہے اور فتحہ بھی پڑھا گیا ہے۔ بمعنی گناہ۔

انت رب الطیبین: یعنی تو پاکیزہ لوگوں سے محبت کرنے والا ہے ان کے معاملات کا سرپرست ہے۔ یہاں پر اضافت تشریفیہ ہے، اور ''طیبین'' سے مراد وہ مؤمن ہیں جو شرک سے پاک ہیں یا وہ متقی مراد ہیں جو گھٹیا کاموں اور فضول باتوں سے بچتے ہیں۔

قولہ: انزل رحمة......: یعنی

اپنی وسیع رحمت سے جو ہر چیز سے زیادہ وسیع ہے عظیم الشان رحمت نازل فرما۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہاں سے لے کر آخر تک پچھلے مضمون کی تقریر ہے

وشفاء: تنوین برائے تعظیم ہے۔

من شفاء ك: یہ عموم کے بعد خصوص ہے۔

الوجع: فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "الوجع" میں لام،عہد ذہنی کے لیے ہے یعنی وجع وہ ہے جسے ہر آدمی جانتا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ اس سے "شیئًا" کی طرف اشارہ ہے اس صورت میں ''جیم'' مفتوح ہوگا۔''من اشتکی'' کے "مَن" کی طرف اشارہ ہو تو جیم مکسور ہوگا۔اور امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے اس کو جیم کے کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور''وَجِع'' درد والے کو کہتے ہیں۔بعض شارحین کا کہنا ہے کہ روایت کے الفاظ فتحہ کے ساتھ ہیں

فیبرأ: رفع کے ساتھ ہے۔ای فهو یتعافی پس وہ تندرست ہو جائے گا۔اور ابن حجرؒ کا قول کہ "فیبرأ" "لیقل" کا جواب ہے۔اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ منصوب ہے'' حالانکہ اصول میں اس طرح نہیں ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے اس حدیث کو امام نسائی نے'' نهی الیوم واللیلة'' میں روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔اھ۔لیکن امام حاکمؒ نے اس حدیث کو فضالہ بن عبید سے روایت کیا ہے۔

مریض کے لیے دُعائیہ الفاظ کہنے کا حکم

۱۵۵۲:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَ الرَّجُلُ يَعُوْدُ مَرِيْضًا فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ يَنْكَأُلَكَ عَدُوًّا اَوْ يَمْشِيْ لَكَ اِلٰى جَنَا زَةٍ۔ [رواہ ابوداود]

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۸۰/۳ حدیث رقم ۳۱۰۷۔ واحمد فی المسند ۱۷۲/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت آدمی کسی مریض کی عیادت کرے اس کو کہنا چاہیے اے اللہ! اپنے بندے کو شفا عطا فرما کہ وہ تیری خاطر تیرے دشمن کو تکلیف پہنچائے اور اس کو قتل کر دے یا تیری خوشی کی خاطر جنازہ کی طرف چلے۔یہ روایت ابوداوٗد نے نقل کی ہے۔

تشریح: ینکأ: شروع میں یاء پر فتحہ اور آخر میں ہمزہ کے جزم کے ساتھ۔

'' عدوًا'' سے مراد کفار اور ابلیس اور اس کا لشکر ہے۔اور ان میں سزا و عقاب، اقامت حجت اور الزام کثرت سے ہوتا ہے۔رفع کے ساتھ بھی مروی ہے اس صورت میں تقدیری عبارت "فهو ینکأ" ہوگی یہ "نَكْءٌ" سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے زخم ہونا اور "ینکی" جو''نکایہ'' مصدر سے از باب ضرب سے مشتق ہے اس کا معنی ہوتا ہے قتل اور شکست کے ذریعے اثر انداز ہونا۔شارحین نے ایسے ہی ذکر کیا ہے۔لیکن لفظ کا رسم الخط اس آخری بات کی تائید نہیں کرتا۔اور صحاح میں ہے: نکاك القرحة و انکأها نکأً۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب زخم کو چھیل دیا جائے اور نہایہ میں ہے: نکیت فی العدو أنکی نکایة فانا نائك" یہ اس وقت بولتے ہیں جب ان میں قتل اور خونریزی بڑھ جائے۔اور کبھی اس کو ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں: "ینکأ" امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے اور رفع بھی جائز ہے اس وقت تقدیری عبارت "فانه ینکأ" ہوگی اور ابن ملکؒ فرماتے ہیں: رفع کے ساتھ موضع حال میں ہے ای یغزو فی سبیلك یعنی تیرے راستے میں

أو یمشی رفع کے ساتھ۔ "اوھو یمشی" تقدیری عبارت ہوگی۔ میرکؒ نے کہا ہے کہ اسی طرح یاء کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے "ینکأ" کا مرفوع ہونا واضح ہے اور اگر جزم کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اس آیت میں وارد قراءت کی طرح ہوگا: [من یتق و یصبر]

قولہ لك: یعنی حکم کی وجہ سے اور تیری رضامندی کے حصول کے لیے۔

الی جنازۃ: فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ یعنی جنازہ پڑھنے کے لیے' کیونکہ ایک حدیث میں "الی صلاۃ" کے الفاظ بھی ہیں اور یہ توسع شائع ہونے کی وجہ سے ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: شاید نکایت کو اور جنازے کے ساتھ جانے کو ایک جگہ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہو کہ پہلے میں اللہ تعالیٰ کے دشمن پر عذاب نازل کرنے کے لیے محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے اور دوسرے میں اللہ کے ولی تک اللہ کی رحمت پہنچانے کی سعی ہے۔ اھ۔ یا (دونوں کو یکجا اس لئے ذکر کیا ہے کہ) بیماری کا مقصد یا گناہوں کا کفارہ' درجات کی بلندی اور موت و آخرت اور عذاب الٰہی کے ذکر کے ذریعے نصیحت کرنا ہے۔ اور یہ دونوں انہیں اعمال کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث پاک میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی آدمی کسی بھائی کی عیادت کرے تو اس کو عیادت کرتے وقت دعائیہ الفاظ کہنے چاہئیں جیسے مذکورہ حدیث میں الفاظ موجود ہیں: اَللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ يَنْكَأُ لَكَ عَدُوًّا اَوْ يَمْشِيْ لَكَ اِلٰى جَنَازَةٍ: جس کے معنی یہ ہیں اے اللہ اپنے بندے کو شفا بخش تا کہ وہ صحت مند ہو کر' یا تو تیرے راستے میں جہاد کرے یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کافروں سے لڑے۔ ان کو قتل کرے' زخمی کرے یا تجھے خوش کرنے کے لیے نمازِ جنازہ میں شریک ہو۔

تخریج و اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ امام ابوداؤد اور منذری نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے اور اسے ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

بندہ کو راہ راست پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ

۱۵۵۷: وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ عَنْ اُمَيَّةَ اَنَّهَا سَاَلَتْ عَائِشَةَ عَنْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ وَعَنْ قَوْلِهِ [وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَ بِهٖ] فَقَالَتْ مَا سَاَلَنِيْ عَنْهَا اَحَدٌ مُنْذُ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هٰذِهٖ مُعَاتَبَةُ اللّٰهِ الْعَبْدَ بِمَا يُصِيْبُهُ مِنَ الْحُمّٰى وَالنَّكْبَةِ حَتَّى الْبِضَاعَةِ يَضَعُهَا فِيْ يَدِ قَمِيْصِهٖ فَيَفْقِدُهَا فَيَفْزَعُ لَهَا حَتّٰى اِنَّ الْعَبْدَ لَيَخْرُجُ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَمَا يَخْرُجُ التِّبْرُ الْاَحْمَرُ مِنَ الْكِيْرِ۔ [رواہ الترمذی]

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۱/۵ حدیث رقم ۲۹۹۱۔ واحمد فی المسند ۲۱۸/۶۔

ترجمہ: علی بن زید تابعیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے نقل کیا ہے امیہؒ سے امیہؒ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے

اس مذکورہ آیت کے معنی پوچھے کہ اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے یا اس کو چھپاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے گا اور اس آیت کے معنی بھی پوچھے جس کے الفاظ حدیث میں گزر چکے ہیں کہ جو شخص برا کام کرے چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس کو عقبیٰ (آخرت) میں بدلہ دیا جائے گا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں مجھ سے یہ مسئلہ کسی نے نہیں پوچھا جب سے میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ ان آیتوں میں جو الفاظ محاسبہ اور جزا کے مذکور ہیں یہ بطور عتاب خداوندی کے ہیں۔ (اس عتاب یعنی ناراضگی کی وجہ سے) اس کو بخار غم وفکر لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی اپنے مال کو آستین میں رکھ کر بھول جاتا ہے پھر اس مال کے نہ ملنے پر غمگین ہو جاتا ہے اس پریشانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو دور کر دیتا ہے۔ وہ بندہ گناہوں سے ایسے نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا اور آگ میں ڈالنے کی وجہ سے۔ (اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے)۔

تشریح: قوله: وعن علي بن زيد عن امية: "امية" تصغیر کے ساتھ ہے۔ سیدؒ فرماتے ہیں: "اُمیہ" علی بن زید کے والد کی بیوی کا نام ہے۔ یہ ان کی والدہ نہیں ہے"۔ (قاله في تقريب) لہٰذا ترمذی کے بعض نسخوں میں "عن امہ" غلط ہے الا یہ کہ اسے مسامحہ یا مجاز پر محمول کر لیا جائے۔

ان تبدوا: "ان" سے پہلے واؤ مذکور نہیں ہے

یعنی جو تمہارے دلوں میں بیماری ہے اسے قول یا فعل کے ساتھ ظاہر کرو یا تم اس پر اصرار کے باوجود چھپاتے رہو۔ کیونکہ دل کے خیالات کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ دے گا تمہارے پوشیدہ اور ظاہری اعمال کا یعنی تمہیں خبر دے گا تمہارے ان اعمال کی جو تم چھپ کر یا اعلانیہ کیا کرتے تھے۔

قوله: فقال هذه معاتبة الله ـــ والنكبة: دونوں آیتوں کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے جن دو کے متعلق سوال ہوا ہے: ① عبادت کا محاسبہ۔ ② وہ جو ظاہری و پوشیدہ اعمال کرتے ہیں ان کا بدلہ۔

بما يصيبه: یہ "معاتبة" کا صلہ ہے اور یہاں پر "باء" کا سببیہ ہونا درست ہے۔

بخار وغیرہ یہ سب مصائب (اللہ تعالیٰ) کا مواخذہ ہے۔ اور یہاں پر حمی یعنی بخار کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بخار سب بیماریوں میں سے سخت اور خطرناک بیماری ہے۔

مفاتیح میں ہے: عتاب یہ ہے کہ ایک دوست اپنے دوسرے دوست پر اس کے برے کام کی وجہ سے برہمی کا اظہار کرے باوجودیکہ اس کے دل میں اپنے دوست کی محبت ہوتی ہے۔ یعنی آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو ان کے تمام گناہوں کا بدلہ قیامت کے دن دے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھوک پیاس، بیماری اور دوسری تکلیفوں سے دوچار کرتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو گناہوں سے پاک صاف ہو چکے ہوتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: گویا کہ حضرت عائشہؓ نے اس مؤاخذہ کو اخروی عذاب تصور کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے انہیں جواب یہ دیا کہ اس سے مراد دنیا میں اللہ تعالیٰ کا محاسبہ اور مواخذہ ہے اور یہ ایک قسم کی رحمت وعنایت ہے۔ اھ۔ اسی لیے تو جب پہلی آیت صحابہ پر گراں گزری اور انہیں ہلا کر رکھ دیا تو اس کے فوراً بعد یہ آیت نازل ہوئی: لا يكلف الله نفسا الا وسعها۔ اسی طرح جب صحابہ پر آیت: ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران۔ ١٠٢] گراں گزری اور اسی آیت کی وہ تفسیر بھی (گراں

گذری) جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھا جائے' بھلایا نہ جائے۔ اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے۔ شکر کیا جائے اور ناشکری سے بچا جائے۔ چنانچہ جب مذکورہ آیت اور اس کی تفسیر صحابہ کرامؓ پر گراں گزری تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] اور مصابیح میں ہے: هذه معاقبة الله۔ قاف کے ساتھ ہے' یہ بخار اللہ کی پکڑ ہے۔

زین العربؒ فرماتے ہیں: یہ اس آیت کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے جس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔ اور ایک روایت میں "معاتبة اللّٰه" کے الفاظ ہیں (جو کہ "عتاب" سے مشتق ہیں۔) ای یؤاخذ الله معه اخذ العاتب۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح مؤاخذہ کرے گا جس طرح کہ ایک عاتب (سزا دینے والا) سزا دیتا ہے۔ پہلی روایت کے شارح نے کہا کہ مصابیح کے تمام نسخوں میں ہے کہ حدیث میں اسی طرح کے الفاظ معروف نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی معنی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا: ایک روایت میں "متابعة الله" کے الفاظ ہیں اور یہاں پر ان الفاظ کا معنی صحیح ہے۔ برخلاف ان کے جنھوں نے اس میں نزاع کیا ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ طول دیا ہے۔ حقیقت میں یہ تصحیف ہے اور کسی اصل تک عدم استناد کی وجہ سے تحریف ہے۔ پھر حافظ ابن حجرؒ نے اسے "تبع" کے معنی میں لیا یعنی مطالبہ کرنا کے معنی میں ہے اور اس سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اس کی قبیل سے یہ حدیث ہے: اتبعوا القرآن ای اقتدوا به یعنی اس کی اقتدا کرو

النکبة: نون کے فتحہ کے ساتھ یعنی مشقت اور وہ حوادث زمانہ جو انسان کو لاحق ہوتے ہیں۔

قوله: حتى البضاعة۔۔۔ فيفزع لها:

حتى البضاعة: مجرور ہے' ماقبل پر عطف ہے۔ اور مرفوع بھی ہو سکتا ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ "بضاعة" باء کے کسرہ کے ساتھ' اس کا معنی ہے آدمی کی جمع پونجی سرمایہ۔

یعنی آستین میں رکھی ہوئی جمع پونجی بھرپور طریقے سے تلاش کرتا ہے لیکن اس کے گر جانے کی وجہ سے نہیں پاتا یا چور اسے چوری کر کے لے جاتا ہے اس لیے نہیں پاتا اور اس تھوڑے سے سامان کے ضائع ہونے کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے تو اس کا یہ ضائع ہونا اور آدمی کا غمگین ہونا اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ (کذا قاله ابن الملكؒ) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جب وہ پونجی اپنی آستین میں رکھتا ہے اور اس کو وہم ہوتا ہے کہ وہ غائب ہو گئی ہے' چنانچہ اس کو تلاش کرتا ہے' اور گھبرا جاتا ہے تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اور اس میں بے پناہ مبالغہ ہے۔

قوله: حتى ان العبد......: یعنی ہمیشہ اس پر یہ احوال بار بار آتے ہیں۔

إن العبد: ہمزہ مکسور ہے اور ایک نسخہ میں مفتوح ہے۔ اور ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر لایا گیا' اس کی عبودیت کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے جو صبر اور احکامات ربوبیت پر رضامندی کا تقاضا کرتی ہے۔

ليخرج من ذنبه: یعنی مصیبت میں مبتلا ہونے کے سبب۔

التبر: کسرہ کے ساتھ سونا اور چاندی درہم و دینار بنائے جانے سے پہلے "تبر" کہلاتے ہیں اور جب انہیں درہم و دینار

میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو یہ دونوں عین کہلاتے ہیں۔

الاحمر: وہ سونا جو آگ میں اچھی طرح گرم کیا گیا ہو۔

من الكير: کاف مکسور ہے (جار مجرور) ''یخرج'' کے متعلق ہے۔

دُنیا کے مصائب و پریشانیاں گناہوں کا ثمرہ ہوتا ہے

۱۵۵۸: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُصِيْبُ عَبْدًا نَكْبَةٌ فَمَا فَوْقَهَا اَوْدُوْنَهَا اِلَّا بِذَنْبٍ وَمَا يَعْفُو اللّٰهُ عَنْهُ اَكْثَرُ وَقَرَأَ وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ۔ [رواه الترمذي]

اخرجه الترمذي في السنن ٤٧٧/٥ حديث رقم ٣٢٥٢۔ واحمد في المسند ١٦٧/٦۔

ترجمہ: حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندے کو تھوڑی بہت تکلیف پہنچتی ہے یہ گناہوں کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو دنیا و آخرت میں سزا دیے بغیر معاف کر دیتا ہے اور یہ گناہ ان گناہوں سے زیادہ ہوتے ہیں جن پر سزا ملتی ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب بھی تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔ تو یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سارے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ان النبی ﷺ: اور ایک صحیح نسخے میں ''ان رسول اللّٰہ'' کے الفاظ ہیں۔

عبدًا تنوین تنکیر کے لیے ہے۔

''فما فوقها'' کی تحقیق

نكبة: یعنی مشقت اور تکلیف یہاں پر تنوین جنس کے لیے نہیں بلکہ قلت کے لیے ہے تاکہ بعد والے جملے ''فما فوقها'' کا ''فاء'' کے ساتھ اس پر ترتب درست ہو۔

''فما فوقها'' یعنی بڑا ہونے میں ''أو دونه'' یعنی مقدار میں اور ابن حجرؒ کا یہ قول کہ ''فما فوقها'' سے مراد ''بڑی ہونے میں'' اور ''أو دونها'' سے مراد حقارت کے لحاظ سے ہے اور اس کے الٹ بھی معنی صحیح ہو سکتا ہے۔'' یہ مذکورہ قول درست نہیں ہے کیونکہ یہ معروف لغت اور عرف عام کے خلاف ہے۔

اور حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ ''اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مثلاً ما بعوضة فما فوقها'' یہ بات بھی درست نہیں ہے کیونکہ مذکورہ آیت میں اس سے بڑی چیز کا ذکر ہے۔ اور مفسرین کا اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہے۔

جمہور علماء کہتے ہیں کہ ''فما فوقها'' کا معنی ہے ''مافوقها في الكبر'' یعنی جو بڑی ہو جیسے مکھی اور مکڑی۔ اور ابو عبیدہ فرماتے ہیں: یعنی فما دونها جیسے کہا جاتا ہے ''فلان جاهل'' تو کہا جاتا ہے ''وفوق ذالك'' ای واجهل۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں اور یہی اکثر محققین کا قول ہے لیکن امام کشاف اور بیضاوی کے نزدیک مختار یہ کہ جو جسامت میں اس سے بڑی ہو جیسے مکھی یا پھر اس کا وہی معنی ہے جو مثال میں بیان کیا گیا ہے یعنی چھوٹا ہونا اور حقیر ہونا جیسا کہ مچھر کے پر ہیں۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں: اور دونوں احتمالوں کی نظیر وہ روایت ہے کہ جس میں ہے کہ ایک آدمی منیٰ میں خیمے کی رسی پر گر گیا تو سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس مسلمان کو کوئی کانٹا چبھ جائے یا اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے حق میں ایک درجہ (نیکی) لکھ دیا کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کا ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ اب اس میں احتمال ہے کہ "فما فوقها" سے مراد جو تکلیف دینے میں کانٹے سے بڑھ کر ہو جیسے گر جانا اور یہ بھی احتمال ہے کہ جو تکلیف دینے میں اس سے بھی کم ہو جیسے چیونٹی کا کاٹنا کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: ما أصاب المؤمن من مكروه فهو لخطايا ه حتى نخبة النملة اه کہ جس مؤمن کو کوئی ناپسندیدہ چیز پہنچے تو وہ اس کے گناہوں کی وجہ سے پہنچتی ہے حتی کہ چیونٹی کا کاٹنا بھی۔ اھ۔

"نخبة" میں نون مفتوح، خائے معجمہ پر جزم اور اس کے بعد بائے موحدہ ہے۔ اس کا معنی ہے چیونٹی کا کاٹنا۔ پہلی حدیث کو امام بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور دوسری حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے کہا کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔

وما يعفو الله: "ما" موصولہ ہے۔

میرکؒ زین العرب سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یعنی دنیا میں بندے کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ مصیبت جو اسے دنیا میں لاحق ہوتی ہے اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے، اور وہ گناہ جو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے یعنی جن کا دنیا و آخرت میں حساب نہیں لے گا وہ تو بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا لطف و کرم کرنے والا ہے۔

قرأ: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی ضمیر فاعل نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے۔

وما اصابكم: "ما" شرطیہ ہے یا پھر موصولہ ہے، شرط کے معنی کو متضمن ہے۔

"مصيبة" بیماری، سختی، ہلاکت اور مال و جان کا تلف ہونا۔ اور یہ مصائب گناہ گاروں کے ساتھ خاص ہیں، اور گنہگاروں کے علاوہ جنہیں یہ مصیبت پہنچتی ہے سو وہ ان کے درجات کی بلندی کے لیے ہوتی ہے۔

فبما كسبت ايديكم: اصل روایت "فاء" کے ساتھ ہے۔ نافع اور ابن عامر نے اس کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

"ما" گناہوں سے کنایہ ہے۔ اى بذنوب كسبتها انفسكم۔ یعنی "وہ گناہ جن کو تم نے کیا تھا"۔ پس "ما" موصولہ ہے یا پھر موصوفہ ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ مصدریہ ہو اى بكسبكم یعنی "تمہارا گناہ کا ارتکاب کرنا"۔ اور "گناہ کرنے" کی نسبت "ہاتھوں" کی طرف اسی لیے کی گئی ہے کہ گناہ اکثر ہاتھوں ہی سے ہوتے ہیں چنانچہ اس کا مطالب یہی ہے کہ "وما ظلمنا هم ولكن ظلموا انفسهم"

فائدہ: "يعفوا" کے بعد الف رسم قرآنی کی بناء پر لکھا جاتا ہے باوجودیکہ یہ واحد کا صیغہ ہے۔

نیک لوگوں کی عزت افزائی

۱۵۵۹وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا كَانَ عَلٰى طَرِيْقَةٍ حَسَنَةٍ مِنَ الْعِبَادَةِ ثُمَّ مَرِضَ قِيْلَ لِلْمَلَكِ الْمُوَكَّلِ بِهٖ اُكْتُبْ لَهٗ مِثْلَ عَمَلِهٖ اِذَا كَانَ طَلِيْقًا حَتّٰى اُطْلِقَهٗ اَوْ اَكْفِتَهٗ اِلَيَّ۔

اخرجه الدارمي في السنن ٤٠٧/٢ حديث رقم ٢٧٧٠۔ واحمد في المسند ٢٠٣/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جس وقت تک نیکی کے راستے پر گامزن رہتا ہے یعنی عبادت کرتا رہتا ہے پھر بیمار ہو جاتا ہے اور عبادت پر قادر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرشتے سے کہتے ہیں کہ تجھے نیکی لکھنے کے لیے متعین کر دیا ہے تو اس کے لیے نیکیوں کو لکھ اس عمل کے برابر جس کو وہ تندرستی میں کیا کرتا تھا اس وقت تک کہ میں اس کو تندرست کر دوں یا اس کو اپنے پاس نہ بلالوں یعنی موت دے دوں۔

تشریح: عبد الله بن عمرو: واؤ کے ساتھ

ان العبد اذا كان على طريقة حسنة: یعنی شریعت کی پیروی والے طریقے پر ہوتا ہے۔

من العبادة: یعنی عبادت کی کسی قسم میں سے بھی یعنی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ نوافل کی بھی بجا آوری کرتا ہے۔

قيل للملك المؤ كل: یعنی اللہ تعالیٰ فرشتہ سے فرماتا ہے جیسا کہ ایک دوسری روایت میں گذر چکا ہے اور اس کی دلیل ''حتى اطلقه'' کے الفاظ ہیں۔

اذا كان طليقا: یعنی جب وہ اس بیماری سے آزاد تھا جو اسے اب لاحق ہوئی ہے۔ یہ ''اطلق'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے ''قید سے آزاد کرنا''۔ یعنی جب وہ صحیح تھا اور اس کو بیماری نے مقید نہیں کیا تھا۔ (کذا ذکرہ میرک)

حتى اطلق: ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **اى اكتب الى حين أرفع عنه**...... : یعنی تو اس کے حق میں ثواب لکھتا رہ جب تک میں اسے اس بیماری کی قید سے نجات نہیں دیتا۔

اكفته : ہمزہ کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنی اقبضہ۔

نہایہ میں ہے: ای ''**اضمه الى البقر** (اسے قبر تک پہنچا دوں)۔ اور اسی قبیل سے زمین کو'' **كفات**'' کہا گیا ہے مظہرؒ فرماتے ہیں: ای أميته'' کہا گیا ہے کہ ''الکفت'' کا معنی ہے ملانا اور جمع کرنا اور یہاں پر مجازی طور پر موت کے معنی میں ہے۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں: اسے امام احمدؒ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس میں صرف عاصم القاری ہے۔ جس سے اصحاب کتب اربعہ نے روایت کی ہے اور شیخین سے اس کی روایت متابعت میں نقل کی ہے۔

۱۵۶۰:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا ابْتُلِيَ الْمُسْلِمُ بِبَلَاءٍ فِيْ جَسَدِهٖ قِيْلَ لِلْمَلَكِ اُكْتُبْ لَهٗ صَالِحَ عَمَلِهِ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُ فَاِنْ شَفَاهُ غَسَّلَهٗ وَطَهَّرَهٗ وَاِنْ قَبَضَهٗ غَفَرَلَهٗ وَرَحِمَهٗ۔ [رواهما في شرح السنة]

اخرجه احمد فی المسند ۱۴۸/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جب مسلمان بندے کو جسمانی بیماری پہنچتی ہے (یا مبتلا کر دیا جاتا ہے) تو نیکی لکھنے والے فرشتے کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے وہ نیک اعمال لکھتا رہ جو یہ صحت کی حالت میں کرتا تھا' اگر اللہ نے شفا دے دی تو اللہ تعالیٰ اس کو دھو دیتے ہیں اور اس کو گناہوں سے پاک کر دیتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اس کو موت دے دیتا ہے تو اس کو بخش دیتا ہے اور رحم فرماتا ہے۔ یہ دونوں حدیثیں علامہ بغوی نے شرح السنہ میں ذکر کی ہیں۔

تشریح: قیل للملك: یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (مرقات کے متن میں "قال" ہے۔ چنانچہ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:) اور ایک نسخے میں "قیل" ہے۔

قوله: اکتب له صالح عمله۔

الذی کان یعمل: حدیث کے ظاہری الفاظ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ نفس عمل لکھا جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس کے ثواب کا لکھا جانا ہے۔ پہلا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ وہ تضاعف کو شامل ہے۔

غسله: شد کے ساتھ ہے اور بغیر شد کے بھی آیا ہے یعنی اسے صاف ستھرا کر دیتا ہے اور گناہوں سے پاک کر دیتا ہے کیونکہ بیماری اس کے لیے کفارہ بن جاتی ہے۔ "وطهره" میں واؤ تفسیریہ ہے یا تاکیدیہ ہے اور تنویعیہ بھی ہو سکتی ہے۔

و رحمه: یعنی نیکیاں قبول کر کے یا اسے زیادہ ثواب عطا کر کے رحم فرماتا ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ "تخریج" اور "تصحیح" سے سمجھ میں آتا ہے۔

شہید کی اقسام

۱۵۶۱: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِيْكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلشَّهَادَةُ سَبْعٌ سِوَى الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَلْمَطْعُوْنُ شَهِيْدٌ وَالْغَرِيْقُ شَهِيْدٌ وَصَاحِبُ ذَاتِ الْجَنْبِ شَهِيْدٌ وَالْمَبْطُوْنُ شَهِيْدٌ وَصَاحِبُ الْحَرِيْقِ شَهِيْدٌ وَالَّذِيْ يَمُوْتُ تَحْتَ الْهَدَمِ شَهِيْدٌ وَالْمَرْاَةُ تَمُوْتُ بِجُمْعٍ شَهِيْدٌ۔

[رواه مالك وابو داود والنسائی]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۸۲/۳ حديث رقم ۳۱۱۱۔ والنسائی ۱۳/۴ حديث رقم ۱۸۴۶۔ وابن ماجه ۹۳۷/۲ حديث رقم ۲۸۰۳۔ ومالك فی الموطأ ۲۳۳/۱ حديث رقم ۳۶ من كتاب الجنائز۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا کے راستے میں شہید ہو جانے کے علاوہ شہادتیں سات ہیں: ① جو وبا (طاعون) میں مرے وہ شہید ہے۔ ② جو ڈوب کر مرے وہ بھی شہید ہے۔ ③ ذات الجنب والا بھی شہید ہے۔ ④ اور پیٹ کی بیماری (یعنی استسقاء اور اسہال) سے مرنے والا بھی شہید ہے۔ ⑤ جو جل کر مرے وہ بھی شہید ہے۔ ⑥ اور جو شخص دیوار وغیرہ کے نیچے دب کر مر جائے وہ بھی شہید ہے۔ ⑦ اور وہ

عورت جو حمل کی وجہ سے فوت ہو جائے یا کنواری مر جائے' وہ بھی شہید ہے۔ اس کو امام مالک' اور ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

جابر بن عتیک:

''عتیک'' میں عین مفتوح اور تاء مکسور ہے۔ کنیت ابوعبداللہ انصاری ہے۔ جنگ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ یہ بات مؤلف ؒ نے ذکر کی ہے۔

قوله : قال: قال رسول الله ﷺ الشهادة سبع: بلکہ اس سے بھی زیادہ اقسام ہیں جیسا کہ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

القتل في سبيل الله یعنی حقیقی شہادت کے علاوہ شہادت کی سات قسمیں ہیں یہ قسمیں شہادت حکمیہ' غیر حقیقہ کہلاتی ہیں۔

المطعون شهيد الخ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں سے لے کر آخر تک ''سبع'' کا بیان ہے معنی کے اعتبار سے۔

وصاحب ذات الجنب : یہ ایک یا زیادہ زخم ہوتے ہیں جو انسان کے پہلو کے اندر پیدا ہوتے ہیں پھر یہ زخم (پھوڑے) کھل جاتے ہیں اور تکلیف میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور یہ وقت ہلاکت کا ہوتا ہے۔ اس بیماری کی علامات یہ ہے کہ پسلیوں کے نیچے درد محسوس ہوتا ہے' سانس لینے میں تنگی ہوتی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ بخار اور کھانسی بھی رہتی ہے یہ بیماری عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

المبطون: اسہال' استسقاء یا پیٹ کے درد سے مرنے والا۔

صاحب الحريق: یعنی ''المحرق'' جو آگ میں جل کر مرے۔

الهدم: دال پر فتحہ اور سکون دونوں جائز ہیں۔

بجمع: جیم فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور میم ساکن ہے۔

نہایہ میں لکھا ہے: یعنی وہ عورت جس کے پیٹ میں بچہ ہو اور وہ (عورت) مر جائے اور ایک قول یہ ہے کہ جو عورت باکرہ فوت ہو جائے' اور ''جُمع'' مجموع کے معنی میں ہے جیسا کہ ''ذخر'' مذخور کے معنی میں ہے۔ امام کسائی نے ''جمع'' کو جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ عورت جو فوت ہو جائے اور اسے حمل ہو یا باکرہ ہو یا اسے ابھی تک حیض نہ آیا ہو۔

(ذکرہ طیبی)

بعض شارحین نے کہا ہے کہ ''جمع'' پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور روایت میں ضمہ کے ساتھ ہے' اور مراد وہ عورت ہے جو حمل کی حالت میں فوت ہو جائے۔

ایک قول یہ ہے کہ طلاق کی حالت میں مر جائے۔

ایک قول یہ ہے کہ بچے کی ولادت سے فوت ہو جائے۔

ایک قول یہ ہے کہ جو عورت بچے کی جھلی پیٹ میں رہ جانے کی وجہ سے فوت ہو جائے ایسی عورت کو ''خلاص'' کہتے ہیں اور

ایک قول یہ ہے کہ عورت باکرہ فوت ہوا اس کے خاوند نے اس کی بکارت ختم نہ کی ہو۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے (بھی) روایت کیا ہے اور امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''یہ حدیث بغیر کسی اختلاف کے صحیح ہے اگرچہ شیخینؒ نے اسے روایت نہیں کیا''۔

نیک لوگوں پر امتحانات و آزمائش کی بارش (یعنی بکثرت ہونا)

۱۵۶۲: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَی الرَّجُلُ عَلٰی حَسَبِ دِيْنِهٖ فَاِنْ كَانَ فِیْ دِيْنِهٖ صُلْبًا اِشْتَدَّ بَلَاؤُهٗ وَاِنْ كَانَ فِیْ دِيْنِهٖ رِقَّةٌ هُوِّنَ عَلَيْهِ فَمَا زَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰی يَمْشِیَ عَلَی الْاَرْضِ مَالَهٗ ذَنْبٌ۔

[رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی وقال الترمذی ھذاحدیث حسن صحیح]

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٦٠١ حديث رقم ٢٣٩٨۔ وابن ماجه ٢/١٣٣٤ حديث رقم ٤٠٢٣۔ والدارمی فی السنن ٢/٤١٢ حديث رقم ٢٧٨٣۔ واحمد فی المسند ١/١٧٢۔

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ آدمیوں میں سے کن پر آزمائش (یعنی محنت و مصیبت) زیادہ آتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا انبیاء۔ پھر وہ جو انبیاء کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھے۔ آدمی کو اپنے دین کے بقدر آزمایا جاتا ہے اگر دین میں مضبوطی ہوتی ہے تو اتنی ہی زیادہ آزمائش سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کے دین میں نرمی ہوتی ہے تو اس کی آزمائش بھی کم ہوتی ہے۔ یعنی مضبوط دین والا ہمیشہ آزمائش میں گرفتار رہتا ہے اس کی امتحان کی وجہ سے مغفرت کر دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر چلتا ہے۔ اس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: اشد: یہ بمعنی ''اکثر'' یعنی زیادہ یا مشکل۔

''بلاء'' سے مراد مصیبت اور مشقت۔

قولہ: قال: الأنبیاء: یعنی انہیں آزمائش میں زیادہ ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ مصیبت میں ایسے لذت حاصل کرتے ہیں جیسے دوسرے لوگ نعمتیں ملنے پر لذت اُٹھاتے ہیں' اور اس لیے بھی کہا کہ اگر انہیں مصیبت میں مبتلا نہ کیا جائے تو لوگ ان میں الوہیت کا وہم کریں گے۔ اور اس لئے بھی تاکہ امت پر مصیبت کے وقت صبر کرنا آسان ہو۔

قولہ (ثم الأمثل فالامثل): یعنی انبیاء کرام کے بعد لوگوں میں از روئے بلاء سخت تر وہ لوگ ہیں جو انبیاء کرام ﷺ کے مشابہ ہوں یا وہ لوگ جو دوسروں سے افضل ہوں۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے: **الاشرف فالاشرف والا علی فالاعلی الخ** یعنی مرتبے اور مقام کے اعتبار سے بلند ترین یعنی وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کی مصیبت زیادہ سخت ہوتی ہے تاکہ اس کا ثواب زیادہ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس عبارت میں "ثم" تراخی رتبہ کے لیے ہے اور "فاء" تعاقب بر سبیل تو الی اعلیٰ سے ادنی کی طرف تنزل کے لئے ہے۔ اور "الا انبیاء" میں لام جنس کے لیے ہے اھ اور لام استغراق کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی بھی نبی ایسا نہیں جسے بہت بڑی آزمائش کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو بنسبت اپنے زمانے کے لوگوں کے۔ اس بات کی دلیل آپ کا یہی فرمان بھی ہے کہ "آدمی اپنی دینداری کے مطابق آزمایا جاتا ہے" یعنی دین کی کمزوری و مضبوطی اور نقص و کمال کے بقدر آزمایا جاتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: دوسرا جملہ پہلے جملے کا بیان ہے اور "الرجل" میں لام استغراق کے لیے ہے جس میں تمام اجناس شامل ہو جاتی ہیں اھ اور الف لام جنس کا بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہی درست ہے جیسا کہ اس پر "حسب دينه" کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

قوله: فان كان فى دينه صلبا فى دينه الخ: یہ آزمائش کی تفصیل اور مقدار کا بیان ہے۔

صلباً: "كان" کی خبر ہے۔ یعنی جو دین میں سخت اور مضبوط ہوگا اس کی آزمائش کمیت و کیفت کے اعتبار سے سخت ہوتی ہے۔ اور "كان" کا اسم ضمیر ہے جو "الرجل" کی طرف راجع ہے اور جار مجرور متعلق خبر ہے۔

دينه رقة: یہ مکمل جملہ "كان" کی خبر ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ "رقة" كان کا اسم ہو "رقۃ" کا معنی ہے کمزوری۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: صلابت کو آدمی کی صفت ظاہر کیا گیا ہے اور "رقت" کو اس کے دین کی صفت ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ مبالغے کے لیے ہے اور اس کا استعمال بھی اسی طرح ہے۔ اھ۔ گویا کہ "صلب" میں اصل یہ ہے کہ اسے "اجسام" میں استعمال کیا جائے اور "رقت" میں اصل یہ ہے کہ اسے "معانی" (معنوی اشیاء) میں استعمال کیا جائے اور یہ احتمال بھی ممکن ہے کہ اسے عبارت میں تفنن کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔

هون: مجہول کا صیغہ ہے۔ یعنی مصیبت آسان اور کم کر دی جاتی ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: یہ اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ اس کا ثواب کم ہو۔ میں کہتا ہوں بلکہ یہ اس پر رحمت اور شفقت کرتے ہوئے کیا جاتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اور اگر اس کمزور ایمان والے کی مصیبت اور آزمائش کم نہ ہو تو اس کے کافر ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے آپؐ کا فرمان ہے کہ: كاد الفقران يكون كفرا "قریب ہے کہ فقر کفر تک پہنچا دے"۔

فما زال: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر پہلے "كان" کے اسم کی طرف راجع ہے۔

كذالك: یعنی ہمیشہ ایسے ہوتا ہے کہ صالح آدمی پر مصیبت آتی ہے اور اس مصیبت کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

حتى يمشى على الارض: گناہوں سے خلاصی سے کنایہ ہے۔ گویا کہ وہ قید تھا پھر آزاد کر دیا گیا

ماله : اى ماعليه، یعنی اس پر کوئی ایسا گناہ نہیں رہتا جو اس کے ساتھ خاص ہو اور بسا اوقات ایسا آدمی دوسروں کے لیے سفارش کنندہ بھی بن جاتا ہے۔

حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نزع کی کیفیت کا بیان

۱۵٦۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا اَغْبِطُ اَحَدًا بِهَوْنِ مَوْتٍ بَعْدَ الَّذِی رَاَیْتُ مِنْ شِدَّةِ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. [رواه الترمذی والنسائی]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۹/۳ حدیث رقم ۹۷۹۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی سختی دیکھی ہے۔ اس کے بعد میں کسی کے لیے موت کی آسانی کی (آرزو) تمنا نہیں کرتی تھی۔ (ترمذی ونسائی)

تشریح: ما اغبط: باء کے کسرہ کے ساتھ ہے کہا جاتا ہے: غبطت الرجل اغبطه۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب آپ اس چیز کی خواہش ظاہر کریں جو کسی دوسرے کے پاس ہے کہ اسی طرح کی چیز آپ کے پاس بھی ہو اور وہ چیز اس کے پاس بھی ہے۔ اور نہ میں تمنا کرتی ہوں اور نہ میں کسی پر خوش ہوتی ہوں۔

الهون موت: یعنی آسان موت" الھون "فتحہ کے ساتھ رفق اور نرمی کے معنی میں آتا ہے۔

بعد الذی: (الذی "صفت ہے "الحال" موصوف محذوف کی۔) ای بعد الذی۔

اس حدیث کا مطلب ماقبل میں گزر چکا ہے۔

موت کی سختی کے وقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا دُعا پڑھنا

۱۵٦۴: وَعَنْهَا قَالَتْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِالْمَوْتِ وَعِنْدَهٗ قَدَحٌ فِيْهِ مَاءٌ وَهُوَ يُدْخِلُ يَدَهٗ فِی الْقَدَحِ ثُمَّ يَمْسَحُ وَجْهَهٗ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی مُنْكَرَاتِ الْمَوْتِ اَوْسَكَرَاتِ الْمَوْتِ۔ [رواه الترمذی وابن ماجة]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۸/۳ حدیث رقم ۹۷۸۔ وابن ماجه ۵۹۱/۱ حدیث رقم ۹۷۸۔ واحمد فی المسند ٦۴/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری وقت میں دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایک پیالہ تھا اور اس میں پانی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ مبارک پیالے میں ڈالتے تھے اور پھر اپنے چہرہ مبارک پر پھیرتے تھے اور فرماتے تھے اے اللہ موت کی سختی پر یا موت کی شدت پر تو میری مدد فرما۔ اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قالت: رأیت النبی ﷺ وهو بالموت: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) ای مشغول أو متلبس به۔ اور ترکیب میں بعد والے "حال" حال متداخلہ ہیں۔

آپؐ پیالہ میں ہاتھ ڈالتے اور پھر اپنے چہرہ مبارک پر پھیرتے (ایسا کیوں کرتے تھے؟ سو اس میں متعدد احتمالات ہیں):

① موت کی حرارت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے

② تکلیف اور غشی کو دور کرنے کے لیے۔

③ اپنے ربّ سے ملاقات کے لیے چہرے کو صاف کرنے کے لیے۔

④ عاجزی کو ظاہر کرنے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کے کے لیے۔

قولہ: ثم يقول: اللهم اعني على منكرات الموت......:

سکرات الموت: موت کی سختیاں سکرۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے موت کی سختی اور ایک قول یہ ہے کہ ''سکر'' اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی شخص کی عقل کو لاحق جائے اور اس کا زیادہ تر استعمال مشروبات میں ہوتا ہے۔ اور کبھی غصہ اور عشق کی وجہ سے بھی عقل پر پردہ آ جاتا ہے اگر چہ دنیاوی عشق ہو اور کبھی خوف سے بھی پردہ آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى﴾ (الحج: ٢) ''اور لوگ تجھ کو متوالے نظر آئیں گے مگر وہ متوالے نہیں ہوں گے''۔

اور ابن حجر کے اس قول کو کہ صحیح یہ بات ہے کہ آپ ﷺ پر مرض کی شدت کی وجہ سے غشی طاری ہوتی تھی'' آپ کے بلند مقام ومرتبے کے پیش نظر اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ اس غشی سے مراد ''الغعيبة بالشهود عند اللقاء'' ہے یا اس سے مراد ''فناء'' ہے جس پر بقا کا ترتب ہوتا ہے۔ یہ صوفیہ کی اصطلاح ہے۔

کہا گیا ہے کہ ''أو'' شک کے لیے ہے اور اسی بات پر ابن حجرؒ نے جزم کیا ہے۔ اور ایک احتمال ہے کہ یہ ''او'' تنویع کے لیے ہے اور'' منكرات الموت'' سے مراد وہ تقصیرات ہیں جو مریض سے اس حالت میں صادر ہوتی ہیں' یا شیطانی وساوس وخطرات' اور ان شیطانی خطرات کا مزین کرنا مراد ہے۔ اور ''سکرات الموت'' سے مراد موت کی وہ سختیاں ہیں کہ جن کو مرنے والا برداشت نہیں کر سکتا اور جزع فزع کے عالم میں فوت ہو جاتا ہے۔ اور اس دعا سے مطلوب یہ ہے کہ موت بحالت اسلام اپنے رب سے حسن ظن کی حالت میں موت آئے۔ اس میں آپ نے اپنی امت کو تعلیم دی ہے۔ اے اللہ! ہمیں بھی آپ کی ملت پر موت پر عطا فرما۔ (آمین)

عرضِ مرتب:

اس حدیث پاک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی نزع کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں کہ جب آپ ﷺ پر نزع کی کیفیت طاری تھی تو آپ ﷺ کے پاس پانی کا پیالہ پڑا ہوا تھا اور آپ ﷺ اپنا ہاتھ بھگو کر اپنے چہرہ اقدس پر پھیر رہے تھے اور یہ دعا پڑھ رہے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى مُنْكَرَاتِ الْمَوْتِ اَوْسَكَرَاتِ الْمَوْتِ اور یہ ہاتھ بھگو کر پھیرنا موت کی شدت کی وجہ سے تھا۔ شارحین نے اس کی بہت سی وجوہات لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک امت کی تسلی کے لیے ہے۔ جب آپ ﷺ کی اس نزع کی کیفیت کو دیکھیں گے تو صبر کا مظاہرہ کریں گے اور جان نکلنے میں آسانی ہو جائے گی۔

گناہوں کی سزا دینے میں اللہ کی حکمت

١٥٦٥: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ

فِي الدُّنْيَا وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتّٰى يُوَافِيَهُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [رواه الترمذى]

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٦٠١ حديث رقم ٢٣٩٦۔ واحمد فی المسند ٤/ ٨٧۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو گناہوں کی سزا دنیا میں جلدی دے دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا کو روکے رکھتا ہے (اس کو دنیا میں سزا نہیں دیتا) یہاں تک کہ قیامت کے دن اس کو اس کے گناہوں کی پوری سزا دے گا۔ امام ترمذیؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذا اراد الله ـــــ فی الدنيا:

اذا اراد الله: یعنی جب فیصلہ اور مقدر کرتا ہے۔ اس کلام میں مبالغہ ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔ اور اللہ دنیا میں مصائب میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ آخرت کا عذاب تو زیادہ سخت اور باقی رہنے والا ہے۔

قوله: واذا اراد الله بعبد خير: واذا اراد: اس کا فاعل لفظ جلالہ ہے جیسا کہ ایک نسخے میں ہے۔

بذنبه: باء سببیہ ہے۔

(به) یعنی اس کے گناہ کی وجہ سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر مرفوع "اللہ تعالیٰ" کی طرف راجع ہے اور ضمیر منصوب بندے کی طرف عائد ہے اور ضمائر کا مرجع اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ اھ۔ اور ممکن ہے کہ "موافات" اس وقت "ملاقات" کے معنی میں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے گناہوں کا بدلہ دنیا میں نہیں دیتا حتیٰ کہ وہ قیامت کے دن بہت سارے گناہ لے کر آئے گا تو اسے اس کے گناہوں کی پوری سزا دی جائے گی۔

قوله (يوم القيامة) اگر اس سے درگزر نہ کیا ہوگا۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس حدیث کو سعد بن سنان کے طریق سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث اس طریق سے حسن غریب ہے۔ یہ بات میرک نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں نظر ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں یہ (راوی) حجت نہیں ہے۔

امتحان پر صبر کرنے سے اللہ کی رضامندی کا وعدہ

١٥٦٦: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِنَّ عُظْمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَاءُ وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ۔ [رواه الترمذى وابن ماجة]

اخرجه ابن ماجه ٢/ ٣٣٨ حديث رقم ٤٠٣١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑی جزا (یعنی بدلہ) بڑی بلا (یعنی آزمائش) کے ساتھ ہے جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنا دوست بنا لیتا ہے تو اس کو آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے جو شخص بلا (یعنی

آزمائش) کے ساتھ راضی ہو جاتا ہے اللہ کی رضامندی اس کے لیے طے ہو جاتی ہے اور جو شخص آزمائش سے ناراض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس کو ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان عظم البلاء۔۔۔ فله السخط:

عظم الجزاء: عین پر ضمہ اور ظاء پر جزم ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ عین پر کسرہ اور ظاء پر فتحہ ہے یعنی بڑے اجر اور ثواب کی کثرت مصیبتوں سے ملی ہوتی ہے۔

جزاء کی کیفیت اور مقدار "جزاء وفاقا" اور "اجرا طباقا" کا پورا پورا مصداق ہوتی ہے۔

کیونکہ ولاء کے ساتھ آزمائش ہوتی ہے اور ابتلاء اولیاء کے لیے ہوتا ہے۔

فمن رضی فله الرضا: (یہاں تقدیری عبارت یوں ہے:) **ای فلیعلم ان له الرضا من المولی أوفیحصل له الرضا فی الآخرة والاولی**

یعنی اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے رضامندی ہے یا اسے دنیا اور آخرت میں رضا حاصل ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ بندہ کی رضا اللہ تعالیٰ کی دونوں رضاؤں' رضائے سابق اور رضائے لاحق کے درمیان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رضائے لاحق (یعنی آخرت کی رضامندی) رضائے سابق (یعنی دنیا کی رضامندی کا اثر اور نتیجہ ہے۔ اور اللہ ہی حقائق کو جاننے والا ہے۔

قوله: ومن سخط فله السخط:

"سخط" خاء پر کسرہ ہے: یعنی جو اللہ تعالیٰ کے امتحان اور آزمائش کو ناپسند کرے اور فزع کا شکار ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ناراضگی ہوگی اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کا غصہ ہوگا اور یہ بات ذہن نشین رہے کہ رضا اور سخط کا تعلق دل سے ہے پس کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو شدت مرض اور تکلیف کی وجہ سے روتے ہیں لیکن ان کے دل اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ نے "**اذا احب الله قومًا ابتلاهم جميعًا**" میں ایک فریق کا ذکر کیا ہے' لیکن دوسرے فریق کا ذکر حذف کر دیا ہے کیونکہ آئندہ تفصیل اس پر دلالت کر رہی تھی "فمن" میں فاء تفصیلیہ ہے اور تفصیل "مفصل" کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے کہ جس کی تفصیل بیان کی گئی ہے وہ صرف ایک فریق ہے بایں طور کہ یہ مشتمل ہے اور وہ اہل محبت کا گروہ ہے' اور تفصیل اہل رضا اور اہل محبت دونوں فریقوں کی بیان کی گئی ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصیبت کا نازل ہونا محبت کی علامت ہے۔ پس جو مصیبت پر رضامند ہو گیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی محبوب بن گیا اور جو مصیبت پر راضی نہ ہوا وہ ایسا بندہ بن جاتا ہے جس پر اللہ ناراض ہوتا ہے۔ تأمل۔

پھر امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا بندے کی رضا پر مقدم ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے بغیر اللہ سے راضی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

عَنْهُ﴾[البینة : ۸] اور یہ بھی ناممکن ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا تو حاصل ہو جائے اور آخرت میں بندے کی رضا حاصل نہ ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ [الفجر: ۲۷۔۲۸] ''اے اطمینان پانے والی روح۔ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔'' پس اللہ کی طرف سے رضا ازلی، ابدی، سابق اور لاحق ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ کہتے ہیں: اس کی سند وہی ہے جو اس سے پچھلی حدیث کی ہے۔ (سو اس اعتبار سے یہ حدیث بھی ''حسن غریب'' ہے۔)

مؤمنوں پر آزمائش اور امتحانات

۱۵۶۷: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ اَوِ الْمُؤْمِنَةِ فِیْ نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ وَوَلَدِهٖ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيْئَةٍ۔

(رواہ الترمذی وروی مالك نحوه وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۰۲/۴ حدیث رقم ۲۳۹۹۔ واحمد فی المسند ۲۸۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان مرد ہو یا عورت ہو اس کی ذات کو اس کے مال کو اور اس کی اولاد کو ہمیشہ تکلیف پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مرنے کے بعد اللہ سے ملاقات کر لیتا ہے۔ یعنی اس پر کوئی خطا نہیں ہوتی۔ آزمائشوں کی وجہ سے اس کی تمام خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اسی طرح امام مالکؒ نے بھی نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: بالمؤمن : او المؤمنة: ''أو'' تنویع کے لیے ہے اور ابن حجر کی اصل میں ''أو'' کے بجائے ''واؤ'' ہے۔ چنانچہ ابن حجر فرماتے ہیں: ''واؤ'' بمعنیٰ ''او'' ہے اور دلیل یہ ہے کہ مفرد کی ضمیر لائی گئی ہے۔ ابن حجرؒ کی یہ بات تصحیح شدہ نسخوں اور اصول معتمدہ کے خلاف ہے۔

''ولده'': واؤ اور لام مفتوح ہیں۔ واؤ کو مضموم اور لام کو ساکن بھی پڑھا جا سکتا ہے بمعنی اولاد

خطیئة: اس میں ہمزہ اور ادغام دونوں جائز ہیں

بندے کو درجاتِ عالیہ عطا فرمانے کا اللہ عزوجل کا انوکھا انداز

۱۵۶۸: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدِ السُّلَمِیِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهٖ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ فِیْ جَسَدِهٖ اَوْ فِیْ مَالِهٖ اَوْ فِیْ وَلَدِهٖ ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ حَتّٰى يُبَلِّغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِیْ سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔ [رواه احمد وابو داود]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۷۰/۳ حدیث رقم ۳۰۹۰۔ واحمد فی المسند ۲۷۲/۵۔

ترجمہ: محمد بن خالد سلمیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے نقل کیا اپنے باپ سے اور ان کے باپ نے نقل کیا اس کے دادا سے یعنی اپنے باپ سے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب بندے کے لیے ایک مرتبہ عالی (بلند درجہ) جنت میں مقدر (طے) کر دیا جاتا ہے اور وہ بندہ اپنے عمل سے اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مال کو اور اس کی اولاد کو امتحان میں ڈال دیتا ہے پھر آزمائش پر اس کو صبر عطا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے لیے طے کیا گیا تھا۔ اس کو ابوداؤد اور احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: **وعن محمد بن خالد السلمی عن ابیه عن جده**: امام میرک نے کہا ہے کہ ان کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ابن مندہ نے ان کا نام لجلاج بن حکیم ذکر کیا ہے۔ اور ''تقریب'' میں ہے کہ محمد کا والد مجہول ہے اور تیسرے طبقے کا میں سے ہے۔ امام ابوداؤد نے ان سے حدیث نقل کی ہے اور ان کے والد کا نام ذکر نہیں کیا۔ لیکن ابن مندہ نے ان کا نام ذکر کیا ہے۔

سبقت له: یعنی (بندہ کے بارے میں جب) اللہ تعالیٰ کے علم میں یا اس کے فیصلے اور تقدیر میں بلند مرتبہ مقدر ہوتا ہے اور وہ بندہ اس عالی مرتبہ تک پہنچانے والے عمل سے عاجز ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدن...... اس میں دلیل ہے کہ طاعات درجات کی بلندی کا سبب ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اللہ تعالیٰ کے فضل اور بندے کے ایمان کے سبب ہے ہے اور جنت کا خلود نیت کے سبب سے ہے۔

فی جسده او فی ماله أو فی ولده: دونوں مقامات پر ''أو'' تنویع کے لئے ہے باعتبار اوقات کے ہے یا مختلف اشخاص کے اعتبار سے ہے۔

صبره: شد کے ساتھ ہے یعنی اسے صبر عطا کرتا ہے۔

(حدیث مبارکہ کہ آخری جملہ کا مفہوم) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ [النحل: ۱۲۷] سے مستفاد ہے۔

حتی یبلغه تشدید کے ساتھ ہے اور ایک قول تخفیف کا بھی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں پر ''حتی'' یا تو ''غایت'' کے لیے ہے یا پھر ''کَیْ'' کے معنی میں ہے۔ ای حتی یوصله اللّٰه۔

ننانوے مہلک آزمائشیں

۱۵۶۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شِخِّيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُثِّلَ ابْنُ اٰدَمَ وَاِلٰى جَنْبِهٖ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ مَنِيَّةً اِنْ اَخْطَاَتْهُ الْمَنَايَا وَقَعَ فِي الْهَرَمِ حَتّٰى يَمُوْتَ۔ [رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٤٥٥ حديث رقم ٢١٥٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن شخیرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ابن آدم کو اس حال میں پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے پہلو کے قریب ننانوے آزمائشیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ اگر یہ آزمائشیں اس کو نہ پہنچیں تو وہ بوڑھا ہو جاتا

ہے۔ یہاں تک کہ اس کو موت آ جاتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: "شخیر" میں شین پر کسرہ ہے اور خاء مشدد ہے۔

مثل: میم مضموم ہے اور ثاء مشدد ہے (یعنی از باب تفعیل بصیغہ ماضی مجہول ہے) بمعنی صور و خلق۔

اور ایک قول یہ ہے کہ "مثل" میں پہلے دو حروف مفتوح ہیں اور ثائے مثلثہ تخفیف کے ساتھ ہے۔ اس سے مراد آدمی کی صفت ہے اور اس کی عجیب حالت ہے۔ یہ مبتدا ہے اور بعد والا جملہ اس کی خبر ہے یعنی ظرف اسی وجہ سے "تسع و تسعون" مرفوع ہیں۔ ای حال ابن آدم ان تسعة وتسعين منية متوجهة الى نحوه...... یعنی ابن آدم کی حالت یہ ہے کہ ننانوے موتیں اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی خبر محذوف ہے اصل عبارت یوں تھی: "مثل ابن آدم مثل الذی یکون الی جنبه تسعة و تسعون منية" اور شاید کہ حذف کسی راوی سے ہوا ہے۔

والی جنبه واؤ حالیہ ہے۔

تسع: اور مصابیح میں "تسعة" کے الفاظ ہیں۔ ننانوے (۹۹) سے مراد کثرت ہے' حصر مراد نہیں ہے۔

منية: میم مفتوح ہے' اور مراد مہلک بلاء ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد موت کا سبب ہے۔

قوله: ان اخطأته المنايا...... : امام طیبیؒ نے کہا ہے کہ "المنایا" منية کی جمع ہے' موت کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا ایک مخصوص وقت مقدر ہے۔ یہ لفظ "منی" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: "التقدیر" ہر آزمائش و تکلیف کو "منية" کہتے ہیں کیونکہ مصیبت و آزمائش موت کا سبب اور اس کے مقدمات میں سے ہے۔ اھ۔

یعنی فرض کرو اگر موت کے اسباب مثلاً بیماریاں' بھوک، غرقابی' جلنا یا کوئی اور سبب لاحق نہ ہو تو بڑھاپا تو لاحق ہوگا ہی۔ یہ مطلب ہے "وقع فی الهرم" کا۔ اور "بوڑھا" "مجمع المنایا اور "منبع البلایا" ہے۔

بعض نے کہا ہے: مطلب یہ ہے کہ انسان کی خلقت ایسی ہے کہ مصائب بلایا' امراض وادواء اس سے جدا ہوتے ہی نہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: البرایا اهداف البلایا "مخلوقات آزمائش کے اہداف ہیں"۔ اور جیسا کہ ابن عطاء نے کہا ہے: جب تک تو اس دنیا میں رہے مصائب لاحق ہونے کو اچنبھا نہ سمجھ' اگر شاذ و نادر یہ مصائب انسان سے چوک جائیں تو کوئی نہ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جس کی کوئی دوا نہیں ہوتی"۔ حاصل کلام یہ ہے کہ "یہ دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے جنت ہے"۔ اس لیے ایک مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر صبر کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر راضی ہو۔ حدیث قدسی ہے:

من لم يرض بقضائي' ولم يصبر على بلائي فليلتمس ربّا سوائي۔ جو آدمی میرے فیصلے پر راضی نہ ہو اور میری دی ہوئی مصیبت پر صبر نہ کرے تو وہ میرے علاوہ کوئی رب ڈھونڈ لے۔

قیامت کے دن اہل عافیت کی آرزوئیں یعنی تمنائیں

۱۵۷۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوَدُّ اَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ

يُعْطَى اَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ۔

[رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٤ ٦٠ حديث رقم ٢٤٠٢۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اہل عافیت (سلامت رہنے والے) قیامت کے دن یہ تمنا کریں گے جبکہ آزمائشوں میں مبتلا ہونے والوں کو بہت ثواب دیا جائے گا۔ کہ کاش ان کے چمڑے قینچیوں سے کاٹ دیے جاتے تاکہ انکو بھی انکے برابر ثواب مل جاتا۔ اسکو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: یوم القیامۃ: یود کا ظرف ہے۔

یعطی: بصیغہ مجہول ہے۔

الثواب: یہ دوسرا مفعول ہے یعنی بہت زیادہ اجر وثواب سے نوازا جائے گا یا بغیر حساب کے نوازا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] ''جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا''۔

قرضت: بغیر شد کے ہے اور احتمال ہے مبالغہ اور تاکید پیدا کرنے کے لیے تشدید کے ساتھ لایا گیا ہو۔

المقاریض'' مقراض'' کی جمع ہے۔ (تاکہ وہ بھی اسی طرح ثواب حاصل کرتے جس طرح اہل بلاء کو ثواب حاصل ہوا ہے۔) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ود'' کا معنی ہے کسی شے سے محبت کرنا اور کسی چیز کے بارے میں یہ تمنا کہ وہ اس کی ہو جائے۔ ہر دو معنی میں مستعمل ہے۔ اور حدیث میں وارد ''ود'' ''مودة'' تمنی کے تمنا کرنا میں ہے اور ''لو ان'' سے آخر تک کا کلام ''یود'' کے مفعول کی جگہ پر ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے: ''یود اهل العافية ما يلازم لو ان جلودهم كانت مقرضة فى الدنيا وهو الثواب المعطى''۔

میرکؒ فرماتے ہیں: یہ بھی احتمال ہے کہ'' الثواب'' یود کا مفعول ہو تنازع فعلین کے طور پر، اور: ''لو ان جلودهم'' حال ہو۔ ای متمنين أن جلودهم ...... او قائلين لو ان جلودهم ......اھ۔ اس صورت میں متکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا یہ تمام توجیہات محض تکلف ہیں بلکہ تعسف ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا وہی معنی ہے جو اس آیت: ﴿ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗ اَمَدًا ۢ بَعِيْدًا﴾ [آل عمران: ۳۰] ''اور اس برائی میں دور کی مسافت ہو جاتی'' کے اشکال کے جواب میں وارد ہوا ہے کہ ''لو'' فعل محذوف پر داخل ہے تقدیری عبارت یوں تھی: لو ثبت ان بينها اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ یہ تاکید لفظی بمرادفہ کے قبیل سے ہے جیسے ''فجاجا'' ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ کہتے ہیں: اس کی سند جید ہے اور حدیث حسن ہے۔

مؤمن بندے پر بیماری کے مثبت اثرات

۱۵۷۱: وَعَنْ عَامِرِ الرَّامِ قَالَ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَسْقَامَ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا

اَصَابَهُ السَّقَمُ ثُمَّ عَافَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْهُ كَانَ كَفَّارَةً لِّمَا مَضٰى مِنْ ذُنُوْبِهٖ وَمَوْعِظَةً لَّهٗ فِيْمَا يَسْتَقْبِلُ وَاِنَّ الْمُنَافِقَ اِذَا مَرِضَ ثُمَّ اُعْفِيَ كَانَ كَالْبَعِيْرِ عَقَلَهٗ اَهْلُهٗ ثُمَّ اَرْسَلُوْهُ فَلَمْ يَدْرِلِمَ عَقَلُوْهُ وَلِمَ اَرْسَلُوْهُ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْاَسْقَامُ وَاللّٰهِ مَا مَرِضْتُ قَطُّ فَقَالَ قُمْ عَنَّا فَلَسْتَ مِنَّا۔

[رواہ ابو داؤد]

اخرجه ابوداؤد في السنن ٤٦٨/٣ حديث رقم ٣٠٨٩۔

ترجمہ: حضرت عامر رامیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیماریوں کا ذکر فرمایا پھر فرمایا کہ مؤمن کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس بیماری سے عافیت دے دیتا ہے تو اس کی وہ بیماری اس کے گزرے ہوئے (گزشتہ گناہوں) کا کفارہ بن جاتی ہے اس کے لیے نصیحت اور تنبیہ ہو جاتی ہے پس وہ آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہے اور پرہیز کرتا ہے اور جب منافق بیمار ہوتا ہے۔ پھر اس کو عافیت (تندرستی) دے دی جاتی ہے تو وہ باندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے کہ اس کے مالک نے اس کو باندھ کر چھوڑ دیا۔ پس اونٹ کو معلوم نہیں کہ مجھے کس لیے باندھا ہے اور کیوں چھوڑا ہے پس نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! بیماری کیا چیز ہے؟ میں تو کبھی بیمار نہیں ہوا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے پاس سے اٹھ جا تو ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے۔

عامر الرام:

"الرام" یاء کو تخفیف کے لیے حذف کیا گیا ہے جیسا کہ (اسم باری تعالیٰ "متعال" میں ہے۔ ان کو "الرامی" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اچھے تیر انداز تھے اور مضبوط کلائی والے تھے۔ امام میرک کہتے ہیں: اور کہا جاتا ہے کہ عامر رامی صحابی ہیں صرف ابو داؤد نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ کذا قالہ شیخ جزریؒ اور عسقلانی نے کہا ہے کہ عامر راوی صحابی ہیں۔ ان کی ایک حدیث ہے جو مجہول سند سے روایت کی جاتی ہے۔

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "الرام" تخفیف کے ساتھ "رامی" کے معنی میں ہے اور ان کو عامر بن الرام بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جنہیں رویت اور روایت دونوں شرف حاصل ہیں۔

قوله: ذكر رسول اللّٰه الاسقام۔۔۔فيما يستقبل:

"السقم": سین اور قاف دونوں مفتوح ہیں البتہ میں پر ضمہ اور قاف پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔

درحقیقت بیماری پر کیا جانے والا صبر اس کا کفارہ بنتا ہے۔

یعنی مؤمن کے لیے ایک تنبیہ ہوتی ہے تاکہ وہ توبہ کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یعنی جب مؤمن بیمار ہوتا ہے اور پھر اسے صحت مل جاتی ہے تو وہ سنبھل جاتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کی بیماری اس کے گزشتہ کسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ وہ شرمندہ ہوتا ہے اور دوبارہ وہ گناہ نہیں کرتا چنانچہ اس طرح وہ بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

قوله: وان المنافق اذا امرض......:

منافق کے اس حکم میں وہ فاسق بھی ہے جو گناہ پر اصرار کرتا ہے۔

اعفی: "عوفی" کے معنی میں ہے اور" عافیه" اسی سے اسم ہے

کالبیعر عقله اهله: یہ بیماری سے کنایہ ہے اور وجہ شبہ کے لیے استیناف مبین ہے۔

ثم ارسلوه: یہ عافیت سے کنایہ ہے۔

یعنی اونٹ نہیں جانتا کہ کس سبب سے انہوں نے اسے باندھا تھا اور پھر کیوں چھوڑا ہے؟ یعنی منافق نہ تو نصیحت حاصل کرتا ہے اور نہ توبہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی بیماری نہ تو گزشتہ گناہوں کے لیے کفارہ بنتی ہے اور نہ وہ آئندہ گناہوں سے بچتا ہے (وہ اس آیت کا مصداق ہے:) ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الاعراف : ۱۷۹] "یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔"

وما الأسقام: امام طیبی فرماتے ہیں: اس کا عطف کلام مقدر پر ہے۔ ای "عرفنا ما يترتب على الاسقام وما الاسقام؟

فلست منا: یعنی تو ہمارے طریقے کے لوگوں میں سے نہیں ہے کیونکہ تو ہماری طرح آزمایا نہیں گیا۔ اور بعض روایت میں یہ ہے: قال: من سره ان ينظر الى رجل من اهل النار فلينظر الى هذا لو كان الله يريد به خيرا لطهره به جسده۔

آپ نے فرمایا: جو آدمی کسی جہنمی کو دیکھنا چاہے وہ اسے دیکھ لے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا ہوتا تو اس کے جسم کو پاک کر دیا ہوتا۔

اور ایک روایت میں ہے: ان الله يبغض العفريت النفريت الذى لا ير زأفي ولده ولا يصاب فى ماله۔

"اللہ تعالیٰ اس سرکش وخبیث کو پسند نہیں کرتا جو نہ تو اپنی اولاد میں اور نہ اپنے مال کے بارے میں آزمایا جاتا ہے۔"

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس کی سند میں ایک راوی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا۔

بیمار کو تسلی دینا مسنون ہے

۱۵۷۲: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ عَلَی الْمَرِیْضِ فَنَفِّسُوْا لَهٗ فِیْ اَجَلِهٖ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَا یَرُدُّ شَیْئًا وَّیُطَیِّبُ بِنَفْسِهٖ. (رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤١٢/٤ حديث رقم ٢٠٨٧۔ وابن ماجه ٤٦٢/١ حديث رقم ١٤٣٨۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت تم بیمار پر داخل ہو (یعنی عیادت کے لیے جاؤ) پس تم اس کے غم کو دور کرو۔ زندگی کے بارے میں یعنی کہو کہ غم نہ کھاؤ کوئی ڈر نہیں ہے شفا مل جائے گی اور عمر دراز ہوگی۔ اس لیے کہ ایسا کہنا مقدر شدہ چیز کو پھیر نہیں سکتا اور اس سے (عیادت کے یہ الفاظ کہنے سے) اس کا

دل خوش ہو جائے گا۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے اس کو نقل کیا ہے اور امام ترمذی کا یہ کہنا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **قوله: فنفسوا له في اجله**: یعنی اسے جو اپنی موت کے متعلق غم لاحق ہے وہ غم اس سے رفع کرنے کی کوشش کرو۔ مثلاً اس سے یہ کہو: ''کوئی بات نہیں اللہ تعالیٰ شفا دے دے گا''۔ یا ''اللہ آپ کی عمر لمبی فرمائے گا آپ کو شفا دے گا اور آپ کو تندرستی عافیت عطا فرمائے گا۔'' یا اسے زندگی کی امید دلاؤ اس سے اس کا غم ہلکا ہوگا۔ اور ''تنفیس'' تفریج کو کہتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اسے لمبی عمر کی طمع دلاؤ' اور لام تاکید کے لیے ہے۔

قوله: فان ذالك لا يرد شيئا: یعنی تمہارا اس کے لیے کشادگی پیدا کرنا قضاء وقدر کو رد نہیں کر سکتا اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ تنفیس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یطیب: بغیر شد کے ہے اور ایک نسخے میں تشدید کے ساتھ ہے۔

یعنی وہ اپنی تکلیف میں کمی محسوس کرے گا۔

امام طیبی نے کہا ہے کہ باء زائدہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ باء تعدیہ کے لیے ہو اور ''یطیب'' کا فاعل اس کی ضمیر ہو جو ''ان'' کے اسم کی طرف راجع ہے۔ اور مصابیح میں ''ویطیب نفسه'' کے الفاظ ہیں۔ اس سے پہلے احتمال کی تائید ان کی موت کے وقت کا فعل مروی ہے

ہارون الرشید سے اس کی بیماری کی حالت میں کہا گیا: تسلی رکھو اور خوش رہو۔ اس لیے کہ صحت فناء (یعنی موت) کو نہیں روک سکتی اور بیماری بقاء (یعنی زندگی) کے لیے مانع نہیں ہو سکتی تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! تو نے میرا جی خوش کر دیا اور میرے دل کو راحت پہنچا دی۔ کہا گیا ہے کہ مریض جب حالت نزع میں ہو تو اس کے لئے مسواک کرنا مستحب ہے اس کی دلیل صحیحین کی وہ روایت ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بارے میں مروی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس سے روح آسانی سے نکل جاتی ہے۔ اسی طرح فرشتوں کے لیے خوشبو وغیرہ لگانا مستحب ہے۔ جیسا کہ سلمان سے ان کی موت کے وقت کا فعل مروی ہے اسی طرح صاف ستھرے کپڑے پہننا بھی مستحب ہے۔ جیسا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اور اسی طرح موت کے وقت نماز پڑھنا بھی مستحب ہے' جیسا کہ حضرت خبیب نے کیا تھا۔

اور اسی طرح غسل کرنا جیسا کہ سیدہ فاطمہؓ کے بارے میں مروی ہے۔

پیٹ کی بیماری سے مرنے والا بھی شہید ہے

۱۵۷۳: وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَتَلَ بَطْنَهُ لَمْ يُعَذَّبْ فِيْ قَبْرِهِ۔

[رواه احمد والترمذی وقال هذاحديث غريب]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۷/۳ حدیث رقم ۱۰۶۴۔ واحمد فی المسند ۲۶۲/۴۔

ترجمہ : حضرت سلیمان بن صردؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو پیٹ کی بیماری سے مر گیا جیسے استقاء اور دستوں وغیرھا سے تو اس کو قبر میں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اس کو احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: صرد: صاد پر پیش اور راء پر فتحہ ہے

من قتله بطنه: اس میں مجازی نسبت ہے یعنی جو پیٹ کے درد کی وجہ سے فوت ہوا ہو۔ پیٹ کی بیماری سے اسہال استسقاء اور نفاس سب ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس نے اپنے پیٹ کو حرام اور شبہ حرام سے پاک رکھا۔ گویا کہ وہ ایسا ہے جس کو اس کے پیٹ نے قتل کر دیا ہو۔

لم يعذب في قبره: کیونکہ اس کی اپنے پیٹ پر سختی اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ان الشهيد يغفر له كل شيئي لا الدين آپ نے فرمایا: یقیناً شہید کے تمام گناہ ماسوائے قرض کے معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یعنی حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

تخریج : امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

غیر مسلم کی عیادت کرنا جائز ہے

۱۵۷۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ غُلَامٌ يَهُوْدِيٌّ يَخْدُمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهٗ فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَقَالَ لَهٗ اَسْلِمْ فَنَظَرَ اِلٰى اَبِيْهِ وَهُوَ عِنْدَهٗ فَقَالَ اَطِعْ اَبَا الْقَاسِمِ فَاَسْلَمَ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْقَذَهٗ مِنَ النَّارِ ۔

[رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱۹/۳۔ حدیث رقم ۱۳۵۶۔ وابوداؤد فی السنن ۴۷۴/۳ حدیث رقم ۳۰۹۵۔ واحمد فی المسند ۲۲۷/۳۔

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا حضور ﷺ کی خدمت کرتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوا تو نبی کریم ﷺ اس کی عیادت کرنے کے لیے تشریف لے گئے چنانچہ آپ ﷺ اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ مسلمان ہو جا۔ لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے پاس ہی تھا۔ اس کے باپ نے کہا ابوالقاسم (ﷺ) کی اطاعت کرو۔ وہ اسلام لے آیا چنانچہ نبی کریم ﷺ یہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے نکلے: میں اللہ کی تعریف بیان کرتا ہوں جس نے اس کو اسلام لانے کی وجہ سے آگ سے نجات عطا فرمائی۔ (بخاری)

تشریح: قوله: كان غلام يهودى [redacted] أسه:

فائدہ: کہا جاتا ہے کہ اس کا نام عبدالقدوس تھا۔

یخدم : دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔

فمرض فأتاه النبی ﷺ یعوده: اس میں ذمی کی عیادت کے جواز کی دلیل ہے۔خزانہ میں ہے کہ یہودی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں۔ مجوسی کی عیادت میں اختلاف ہے'اسی طرح فاسق کی عیادت میں بھی اختلاف ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فقعد عند رأسه: یہ عیادت کے مستحبات میں سے ہے۔

امام میرکؒ نے ہے کہ ابوداؤد اور اسماعیل کی روایت میں ہے: **وهو عندر أسه**۔ کہ آنحضرت ﷺ اس کے سر کے پاس تشریف فرما تھے۔

فاسلم: اور نسائی کی روایت میں ہے:**فقال : اشهد ان لا اله الاالله وان محمد ا رسول الله**۔(نقله میرك عن الشیخ) کہ اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔

یعنی اسے چھٹکارا دیا اور اسے نجات دے دی۔

قوله (من النار) یعنی

اگر وہ کفر کی حالت میں مرتا تو جہنم میں جاتا۔

میرکؒ نے الشیخ سے نقل کیا ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں "**انقذنی من النار**" کے الفاظ ہیں۔اھ۔اس صورت میں ضمیر متکلم بچے کی طرف راجع ہوگی۔ہاں اگر روایت میں اصل الفاظ اس طرح ہوں: "**انقذبی من النار**"یعنی باء کے ساتھ ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا:**انقذه الله بسببی** کہ اللہ تعالیٰ نے اسے میری وجہ سے نجات عطا فرمائی۔واللہ اعلم۔

حدیث کا ظاہر امام ابوحنیفہ ؒ کے مذہب کی تائید کرتا ہے کیونکہ ان کا موقف ہے کہ بچے کا اسلام لانا درست ہے اور ابن حجرؒ نے بہت عجیب بات کہی ہے کہ یہ اگرچہ حقیقت میں غیر بالغ کے بارے میں ہے لیکن یہاں مراد بالغ ہی ہے۔لہٰذا اس حدیث میں بچے کے اسلام لانے کے درست ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

پھر حافظ صاحب فرماتے ہیں: سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا بچپن میں اسلام لانا درست ہے کیونکہ ائمہ کرام نے ذکر کیا ہے کہ ہجرت سے پہلے اسلام کے لیے تمیز شرط تھی۔ میں کہتا ہوں کہ (اگر یہی بات ہے تو) ہجرت کے بعد اس کے منسوخ ہونے کی دلیل حدیث'علم کلام یا اجماع مسلمین میں کون سی ہے؟

پھر حافظ ابن حجرؒ نے "**انقذه من النار**" کے بارے میں کہا ہے کہ یہ بالغ ہونے کی شرط کے بارے میں صریح دلیل ہے کیونکہ صحیح مسلک وہی ہے جس پر اکثر علماء کرام ہیں اور وہ یہ ہے کہ مشرکین کے بچے جنت میں داخل ہوں گے اور آپ کا یہ فرمان: **وهم من آباء هم** کہ "وہ اپنے آباء کے دین پر ہوں گے" تو یہ اس وقت کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی خبر نہیں دی تھی۔جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس بات کی خبر دے دی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو یہ بتا دیا۔اھ۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ دلیل مدعی کے بارے میں واضح نہیں ہے کیونکہ مسئلہ اطفال ایک اختلافی مسئلہ ہے۔امام

اعظمؒ نے اس میں توقف کیا ہے۔اور یہ کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ حدیث کافروں کے بچوں کو جنتی قرار دینے سے پہلے کی ہے۔اس لیے کہ اس میں احتمال ہے کہ یہ پہلے کی بات ہو اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو "انقذه من النار" سے مراد یہ ہوگا: انقذه الله بی وبسببی لابسبب آخر۔ کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے خلاصی میرے سبب سے دی ہے نہ کہ کسی اور کے سبب سے۔اس لیے یہ کہ امت کی کثرت کی وجہ سے آپ ﷺ کو عظمت ملے گی اس میں اور زیادہ بلند درجات کے حصول کا سبب ہے۔

یا پھر یہاں پر "من نار" سے مراد کفر ہے "کفر" کو "نار" کہا گیا ہے کیونکہ یہ کفر ہی نار کا سبب ہے۔

اور یہ بات بھی ہے کہ ان دونوں افراد میں کس قدر فرق ہوگا کہ جن میں سے ایک سچا مؤمن ہے جو ہمیشہ جنت کے ایسے درجے میں رہے گا جو اس کے لائق ہوگا اور اس کی خدمت ہو رہی ہوگی اور دوسرا وہ شخص ہے جو دوسرے جنتیوں کے تابع ہوگا اور خدمت گار ہوگا۔

اور آپ کے فرمان: "ان اطفال المشركين في الجنة" میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے جو ان کے مسبوق فی النار ہونے سے مانع ہو۔پس یہ مسئلہ واضح نہیں ہے اور اس کے دلائل اطمینان بخش نہیں ہیں۔اس لیے علماء اس مسئلے میں حیران ہیں اور امام الفقہاء امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ ہی اشیاء کی حقیقت کو جاننے والا ہے۔

بیمار کی عیادت پر اللہ کی طرف سے خوشنودی کا اعلان

۱۵۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِيْضًا نَادٰى مُنَادٍ مِّنَ السَّمَاءِ طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّءْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلاً۔ [رواه ابن ماجة]

اخرجه الترمذى فى السنن ۳۲۰/٤۔ حديث رقم ۲۰۰۸۔ وابن ماجه ٤٦٤/١ حديث رقم ١٤٤٣۔ واحمد فى المسند ٣٥٤/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بیمار کی عیادت کی تو آسمان سے ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے خوشی سے جیو یعنی (زندہ رہو) دنیا اور آخرت میں اور تیرا چلنا بہتر ہو دنیا اور آخرت میں اور جنت میں ایک بلند مرتبہ پائے۔یہ ابن ماجہ نے نقل کی ہے۔

تشریح: ممشاك: مصدر ہے یا پھر ظرف مکان ہے یا ظرف زمان مبالغہ کے لیے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ برے اخلاق سے عاری ہو کر اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو کر سفر آخرت کی تیاری کی راہ پر گامزن ہے۔

تبوأت: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: (یہ آخری جملہ) اس کے لیے آخرت میں اچھی زندگی کی دعا ہے جس طرح "طبت" میں اس کے لئے دنیا کی اچھی زندگی کے لیے دعا ہے۔اور یہاں پر دعا کو خبر کے طور پر ظاہر فرمایا تاکہ اچھے لوگوں کی عیادت کی حرص کا اظہار ہو۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں اور اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور ان

حبان نے اسے اپنی صحیح میں ''حسن'' کہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کرنا اور اچھی خبر دینا

۱۵۷۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ عَلِیًّا خَرَجَ مِنْ عِنْدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ وَجَعِہِ الَّذِیْ تُوُفِّیَ فِیْہِ فَقَالَ النَّاسُ یَا اَبَا الْحَسَنِ کَیْفَ اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَصْبَحَ بِحَمْدِ اللّٰہِ بَارِءً ا۔ [رواہ البخاری]

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۱/۵۷۔ حدیث رقم ۶۲۶۶۔ واحمد فی المسند ۱/۳۲۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا اے ابوالحسن! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حال میں صبح کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں صبح کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری سے اچھے ہونے والے ہیں۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت بہتر ہے۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال: اصبح بحمد اللّٰہ: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) ای مقرونا بحمدہ 'أو متلبسا بموجب حمدہ وشکرہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف کے ساتھ یا ایسی حالت میں جو اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر کو واجب کرتی ہے۔

بارءً ا: البرء سے اسم فاعل کا صیغہ ہے خبر ثانی ہے۔ یا'' اصبح'' کی ضمیر سے حال ہے اس کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں: ① آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحت یاب ہونے کے قریب ہیں میرے گمان کے مطابق ② حضرت علیؓ نے یہ جملہ نیک فالی کے طور پر ارشاد فرمایا۔ ③ مریض کو جو قلق یا غفلت لاحق ہوتی ہے آپ اس سے بری ہیں۔

مرگی کی بیماری پر جنت کا وعدہ

۱۵۷۷: وَعَنْ عَطَاءِ ابْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ قَالَ قَالَ لِیْ اِبْنُ عَبَّاسٍ اَلَا اُرِیْکَ اِمْرَاَۃً مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ قُلْتُ بَلٰی قَالَ ھٰذِہِ الْمَرْاَۃُ السَّوْدَاءُ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اُصْرَعُ وَاِنِّیْ اَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ لِیْ فَقَالَ اِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَکِ الْجَنَّۃُ وَاِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰہَ اَنْ یُعَافِیَکِ فَقَالَتْ اَصْبِرُ فَقَالَتْ اِنِّیْ اَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ اَنْ لَّا اَتَکَشَّفَ فَدَعَا لَھَا۔ [متفق علیہ]

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۱۰/۱۱۴۔ حدیث رقم ۵۶۵۲۔ ومسلم فی صحیحہ ۴/۱۹۹۴ حدیث قم (۵۴۔۲۵۷۶) واحمد فی المسند ۱/۳۴۶۔

ترجمہ: حضرت عطا ابن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے کہا کہ کیا میں آپ کو ایک جنتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا ہاں یعنی دکھائیے۔ فرمایا کہ یہ کالی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! میں مرگی میں مبتلا ہو جاتی ہوں اور بے خودی (یعنی غشی) کی حالت میں ستر کھل جانے کا

خوف رہتا ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے میرے لیے دعا فرمائیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو صبر کرے گی تو تیرے لیے جنت ہوگی اور اگر تو چاہے کہ تیرے لیے میں شفا کی دعا کروں تو دعا کر دوں گا۔ تو عورت نے کہا میں صبر کروں گی۔ البتہ عورت نے کہا میں ستر کے کھلنے سے ڈرتی ہوں لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ ایسی حالت میں میرا ستر نہ کھلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے ستر نہ کھلنے کی دعا کر دی۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عطاء بن ابی رباح'' میں راء پر فتح ہے۔

اریك: ہمزہ پر پیش اور راء پر زیر ہے۔

قال: هذه المرأة السوداء: ابن حجرؒ فرماتے ہیں: بعض روایات میں ہے کہ اس کا نام ''شعیرۃ'' تھا تصغیر کے ساتھ' اور بعض روایات میں عین کی جگہ قاف ہے' اور ایک روایت میں کاف کے ساتھ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ سیدہ خدیجہ کی ماشطہ (کنگھی کرنے والی) تھیں۔

اتت النبیؐ: نیا کلام شروع ہو رہا ہے۔ اہل جنت میں سے ہونے کا بیان ہے۔

انی اصرع: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ ابہریؒ کہتے ہیں: صرع ایک بیماری ہے جس میں اعضاء رئیسہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں لیکن مکمل طور پر نہیں چھوڑتے۔ اس کا سبب وہ گندی بو ہوتی ہے جو دماغ کے منافذ میں محبوس ہوتی ہے یا (اس کا سبب) ایک قسم کے بخار ہیں جو بعض اعضاء سے دماغ کی طرف چڑھتے ہیں اور بعض اوقات ایسی حالت کے بعد اعضاء کا تشنج بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی گر جاتا ہے وہ اپنے سہارے بیٹھ نہیں سکتا اور اس کے منہ سے جھاگ جیسی غلیظ رطوبت خارج ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ صرع (دورے) جنوں کی وجہ سے بھی پڑتے ہیں اور یہ صرف جنوں ہی کی حرکتیں ہوتی ہیں اور اکثر طبیبوں نے اس بات کا انکار کیا ہے۔

اتکشف: تائے تنیہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے' یہ ''تکشف'' سے مشتق ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: یہ ''انکشاف'' سے مشتق ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اسے خوف لاحق ہوا کہ کہیں اس کی وجہ سے اس کا ستر نہ کھل جائے اور اسے معلوم بھی نہ ہو۔

قولہ: فقال: ان شئت صبرت و لك الجنة: اس میں اشارہ ہے کہ تکلیف پر صبر کرتے ہوئے رضا بالقضاء کے تحت علاج نہ کرنا جائز ہے۔ بلکہ اس کا ظاہر تو یہ ہے کہ دائمی بیماری پر صبر کرتے رہنا عافیت سے افضل ہے۔ لیکن وہ افراد کہ انہیں ان کی بیماری انہیں لوگوں کو نفع پہنچانے سے روک دے تو اس صورت میں علاج کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اگرچہ دوا نہ کرنا افضل ہے تاہم دوا کرنا بھی سنت ہے۔ اس کی دلیل ابوداؤد وغیرہ کی حدیث ہے: **قالو: أنتداوی فقال: تداووا فان الله لم يضع داء الا وضع له دواء غير الهرم**۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: کیا ہم اپنا علاج کریں؟ آپ نے فرمایا: علاج کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سوائے بڑھاپے کے ہر بیماری کا علاج بھی پیدا کیا ہے۔

اور دوا کرنا توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس میں اسباب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کے باوجود اختیار کرنا ہے اور اس لیے بھی کہ آپ نے ایسا کیا ہے اور آپؐ تو سید المتوکلین ہیں۔ اس کے باوجود ترک توکل جیسا کہ سیدنا ابوبکرؓ نے کیا افضل ہے۔

بیماری کے ساتھ مرنا افضل ہے اور گناہوں سے دوری کا سبب ہے

۱۵۷۸: وَعَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً جَاءَهُ الْمَوْتُ فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَجُلٌ هَنِيْئًا لَهُ مَاتَ وَلَمْ يُبْتَلَ بِمَرَضٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْحَكَ مَا يُدْرِيْكَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ ابْتَلَاهُ بِمَرَضٍ فَكَفَّرَ عَنْهُ مِنْ سَيِّئَاتِهِ۔ [رواه مالك مرسلا]

اخرجه مالك في الموطأ ۲/۹۴۲ حديث رقم ۸ من كتاب العين۔

ترجمہ: یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص کو اچانک موت آ گئی تو ایک شخص نے کہا کہ اس کو موت مبارک ہو کہ وہ بیماری کے اندر گرفتار نہیں ہوا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وائے! تجھے کیسے معلوم ہو گیا ہے؟ یعنی بیمار نہ ہونے کی تعریف مت کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو بیماری کے ساتھ موت دیتا تو اس کی برائیوں کو دور کر دیتا۔ اس کو مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

تشریح: **هنيئا له**: فعل محذوف کا مصدر ہے۔

مات: جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔ مبارکباد دینے کے سبب کا بیان ہے

ولم يبتل بمرض: واؤ حالیہ ہے۔

ويحك: نہایہ میں ہے: "ويح" کلمہ ترحم اور توجع ہے۔ یعنی تو عدم بیماری کی مدح نہ کر اور اس پر اظہار ترحم اس لیے فرمایا کہ آپؐ نے اسے معذور سمجھا کیونکہ اس کے گمان میں یہ تھا کہ عدم بیماری اچھی چیز ہے۔

مايدريك "ما" بمعنی "ای شیئ" ہے۔ یعنی تجھے کس نے کہا ہے کہ بیماری کا نہ ہونا اچھا شگون ہے۔

(**لو ان الله**: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "لو تمنی" کے لیے ہے کیونکہ اگر "لو" امتناعیہ ہوتا تو جواب میں فاء نہ لائی جاتی۔ یعنی تو اسے مبارک نہ دے کاش! اللہ تعالیٰ اسے کسی بیماری سے دوچار کرتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مقدر عبارت ہو: ای لو ابتلاه الله لكان خيرا له

پہلی ترکیب کے مطابق "مايدريك" کلام معترضہ ہوگا اور دوسری ترکیب کے مطابق مابعد کے ساتھ متصل سمجھا جائیگا۔

راوی حدیث:

یحییٰ بن سعید: یحییٰ بن سعید تابعی ہیں۔ حدیث و فقہ کے امام تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ خوف خدا رکھنے والے نیک انسان تھے۔ زاہد تھے۔ ثقاہت اور دین میں مشہور تھے۔ یہ بات مؤلف نے ذکر کی ہے۔

بیماری کے بعد مریض کے لیے گناہوں کے ختم ہونے کی بشارت

۱۵۷۹: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ وَالصُّنَابِحِيِّ اَنَّهُمَا دَخَلَا عَلٰى رَجُلٍ مَرِيْضٍ يَعُوْدَانِهِ فَقَالَا لَهُ كَيْفَ اَصْبَحْتَ بِنِعْمَةٍ قَالَ شَدَّادٌ اَبْشِرْ بِكَفَّارَاتِ السَّيِّئَاتِ وَحَطِّ الْخَطَايَا فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ

صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ إِذَا أَنَا ابْتَلَيْتُ عَبْدًا مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنًا فَحَمِدَنِيْ عَلٰى مَا ابْتَلَيْتُهُ فَإِنَّهُ يَقُوْمُ مِنْ مَضْجَعِهٖ ذٰلِكَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ مِنَ الْخَطَايَا وَيَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى أَنَا قَيَّدْتُ عَبْدِيْ وَابْتَلَيْتُهُ فَأَجْرُوْا لَهُ مَا كُنْتُمْ تُجْرُوْنَ لَهُ وَهُوَ صَحِيْحٌ. [رواه احمد]

اخرجه احمد في المسند ١٢٣/٤۔

ترجمہ: شداد بن اوس اور صنابحی سے روایت ہے کہ وہ دونوں ایک بیمار شخص کی عیادت کے لیے گئے انہوں نے اس سے پوچھا کہ تو نے کس طرح صبح کی؟ اس نے کہا میں نے صبح کی اللہ کی نعمت کے ساتھ (یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی نعمت کو تسلیم کرتے ہوئے میں نے صبح کی) شداد نے کہا تمہیں گناہوں کے جھڑنے اور خطاؤں کے دور ہونے کی خوشخبری ہو اس لیے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے کہ جب میں اپنے بندوں میں سے کسی مؤمن بندے کو مبتلا کرتا ہوں تو وہ مبتلا ہونے کی وجہ سے میری تعریف کرتا ہے وہ بیماری کے بعد اپنی خوابگاہ سے اٹھ کر اس طرح کھڑا ہوتا ہے (یعنی جس جگہ وہ بیمار پڑا تھا گناہوں سے پاک ہو کر) جس طرح اس کی ماں نے آج ہی اس کو جنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں نے اپنے بندے کو قید کیا اور آزمایا لہٰذا اس کے وہی اعمال لکھتے رہو جن کو تم اس کی تندرستی کی حالت میں لکھا کرتے تھے۔

راویٔ حدیث:

شداد بن اوس: یہ حسان بن ثابت کے بھتیجے تھے۔ عبادہ بن صامت اور ابو درداء فرماتے ہیں: شداد ان لوگوں میں سے تھے جن کو علم و حکمت عطا ہوا تھا مؤلف نے انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ''الصنابحی'' صاد مہملہ پر ضمہ ''نون مخفف'' اس کے بعد بائے موحدہ اور پھر حائے مہملہ ہے۔ صنابح بن زاہر کی طرف منسوب ہے۔ قبیلہ ''مراد'' کی ایک شاخ ہے۔ ان کا نام عبد اللہ تھا اور ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام ابو عبد اللہ ہے۔ اور ابن عبد البر فرماتے ہیں: میرے نزدیک درست بات یہ ہے کہ صنابحی (سے مراد) ابو عبد اللہ تابعی ہیں نا کہ عبد اللہ صحابی (مراد ہیں)۔ مزید کہتے ہیں: ابو عبد اللہ صنابحی صحابہ میں غیر معروف ہیں۔ اور امام مالک نے صنابحی سے موطا میں حدیث روایت کی ہے اور نسائی نے اپنی سنن میں (کذا ذکرہ مصنف)

تشریح: فقالا له: كيف اصبحت؟ سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت عیادت کرنا افضل ہے۔

قال: اصبحت بنعمة: (تقدیری عبارت ہے:) مصحوبا بنعمة عظمة الخ۔ یعنی میں نے بہت بڑی نعمت کے ساتھ صبح کی ہے اور یہ ''نعمت'' قضاء و قدر پر تسلیم و رضا ہے۔

الخطايا: سے مراد طاعات و عبادات میں ہونے والی تقصیرات ہیں۔

ان الله عزوجل يقول: اذا انا: اس کا فائدہ حکم کو مقدم لانا ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مزید توجہ دلانا مقصود ہے اور ایک بات یہ بھی ہے کہ بیماری پر راضی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے فائدے بڑے بڑے ہیں۔

مؤمناً: صفت ہے یا حال ہے۔

ذالك: ای الذی هو فیه یعنی وہ جس میں ہے اور یا اس سے مراد اس کی بیماری ہے اس کے غالب نتیجے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ معنوی طور گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔

کیوم ولدته امه: یوم کی میم مفتوح ہے۔ اور ایک نسخے میں مجرور ہے۔ یعنی جس طرح وہ اپنی پیدائش کے وقت کپڑوں سے آزاد ہوتا ہے۔

ابہریؒ کہتے ہیں: اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماری سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں جبکہ مریض اپنی بیماری میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔ لیکن جمہور علماء کرام نے اسے صغائر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ایک تو اس حدیث کی بنا پر جو "کتاب الصلاۃ" میں پہلے گزر چکی ہے کہ آپ کا فرمان ہے:۔۔۔ کفارات اذا جنبت الکبائر "(مذکورہ امور) گناہوں کے لیے کفارہ ہیں جبکہ کبائر سے بچا جائے"۔ چنانچہ جمہور علماء نے مطلق احادیث کو جو کفارے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں مقید پر محمول کیا ہے۔

وابتلیته: یعنی میں نے اس کا امتحان لیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ آیا وہ شکر کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔

فاجروا: "اجراء" سے فعل امر ہے۔

وهو صحیح: حال ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے منذریؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی نے کبیر اور اوسط میں نقل کیا ہے اور اس (حدیث) کے بہت سے شواہد ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے گناہوں کو ختم کرنے کا طریقہ

۱۵۸۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَثُرَتْ ذُنُوْبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ مَا يُكَفِّرُهَا مِنَ الْعَمَلِ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِالْحُزْنِ لِيُكَفِّرَهَا عَنْهُ۔ [رواه احمد]

اخرجه احمد فی المسند ٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور جب بندے کے گناہ زیادہ ہوجاتے ہیں اور اس کے پاس کوئی نیک عمل نہیں ہوتا جو اس کے گناہوں کو ختم کردے تو اللہ تعالیٰ اس کو غم میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو غم کی وجہ سے جھاڑ کر (ختم) کردے۔ یہ احمد نے نقل کی ہے۔

تشریح: "حُزْن" اور "حَزَن" دونوں جائز ہیں۔

روایت میں ہے ان الله تعالٰی یحب کل قلب حزین کہ اللہ تعالیٰ ہر غمگین دل کو پسند کرتا ہے۔

تخریج واسنادی حیثیت: یہ روایت امام طبرانی اور حاکم نے نقل کی ہے۔ امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں سوائے لیث بن سلیم کے۔

۱۵۸۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ مَرِيْضًا لَمْ يَزَلْ يَخُوْضُ

الرَّحْمَةَ حَتّٰى يَجْلِسَ فَإِذَا جَلَسَ اغْتَمَسَ فِيْهَا۔ [رواه مالك واحمد]

اخرجه مالك فى الموطأ ٩٤٦/٢ حديث رقم ١٧ من كتاب العين۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص بیمار کی عیادت کرتا ہے۔تو وہ مسلسل رحمت کے دریا میں رہتا ہے اور جب وہ بیمار کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو رحمت کے دریا میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ روایت امام احمد اور امام مالک نے نقل کی ہے۔

تشریح: فاذا جلس اغتمس: اور ایک روایت میں ہے: استغرق فیھا اس میں غرق ہو جاتا ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: رحمت کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یا تو وصف طہارت کی صفت میں یا پھر شیوع وشمول میں (پھیلنے اور شامل ہونے میں)۔

تخریج و اسنادی حیثیت: امام مالکؒ نے اس حدیث کو بطریق بلاغ اور امام احمدؒ نے مسنداً روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔اسے بزار نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔اور طبرانی نے اس کو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے' اس کے راوی ثقہ ہیں اور اس کا ایک شاہد کعب بن مالکؓ کی یہ حدیث ہے: قال: قال رسول الله ﷺ: من عاد مريضًا خاض فى الرحمة' فاذا جلس عنده استنقع فيها۔"فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو شخص کسی مریض کی عیادت کرتا ہے وہ رحمت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو گویا وہ رحمت میں غوطہ زن ہو جاتا ہے"۔اسے امام احمد نے بھی حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔اور طبرانی نے کبیر اور اوسط دونوں میں روایت کیا ہے۔
طبرانی نے کبیر اور اوسط دونوں میں عمرو بن حزم کی حدیث بھی زیادت کے ساتھ روایت کی ہے: واذا قام من عنده فلا يزال يخوض فيها حتى يرجع من حيث خرج۔"اور جب وہ اس کے پاس سے اُٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت میں غوطہ زن رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اسی جگہ لوٹ آئے جہاں سے وہ نکلا تھا"۔
اس کی سند بھی حسن کے قریب ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے: قال: سمعت رسول اللهؐ يقول: ايما رجل يعود مريضا فانما يخوض الرحمة' فاذا قعد عند المريض غمرته الرحمة ۔قال : فقلت: يارسول الله هذا للصحيح الذى يعود المريض فما للمريض؟ قال: تحط عنه ذنوبه۔"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ فرما رہے تھے: جس نے کسی مریض کی عیادت کی تو گویا وہ رحمت میں داخل ہو گیا اور جب مریض کے قریب بیٹھتا ہے تو رحمت اسے ڈھانپ لیتی ہے۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا اللہ کے رسول! یہ تو تندرست آدمی کے لیے اجر ہے جو مریض کی عیادت کرتا ہے۔ مریض کے لیے کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں"۔اسے احمد نے روایت کیا ہے
اس حدیث کو ابن ابی دنیا نے اور طبرانی نے صغیر اور اوسط میں روایت کیا ہے اور طبرانی نے یہ زیادتی بھی نقل کی ہے: فقال رسول اللهؐ اذا مرض العبد ثلاثة ايام خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه۔"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ تین دن بیمار رہے تو وہ اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک ہوتا ہے"۔میرک نے

اسی طرح تحریر کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا بخار کے لیے عمل

۱۵۸۲: وَعَنْ ثَوْبَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَصَابَ اَحَدُكُمُ الْحُمّٰى فَاِنَّ الْحُمّٰى قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ فَلْيُطْفِئْهَا عَنْهُ بِالْمَاءِ فَلْيَسْتَنْقِعْ فِيْ نَهْرٍ جَارٍ وَلْيَسْتَقْبِلْ جِرْيَتَهٗ فَيَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اشْفِ عَبْدَكَ وَصَدِّقْ رَسُوْلَكَ بَعْدَ صَلٰوةِ الصُّبْحِ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَلْيَنْغَمِسْ فِيْهِ ثَلَاثَ غَمَسَاتٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَاِنْ لَّمْ يَبْرَاْ فِيْ ثَلَاثٍ فَخَمْسٌ فَاِنْ لَّمْ يَبْرَاْ فِيْ خَمْسٍ فَسَبْعٌ فَاِنْ لَّمْ يَبْرَاْ فِيْ سَبْعٍ فَتِسْعٌ فَاِنَّهَا لَا تَكَادُ تُجَاوِزُ تِسْعًا بِاِذْنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ [رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٥٧/٤ حديث رقم ٢٠٨٤۔ واحمد فی المسند ٢٨١/٥۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کسی کو بخار پہنچ جائے (ہو جائے) اور تحقیق تپ (بخار) آگ کا ایک ٹکڑا ہے پس اس کو چاہیے کہ بخار کو پانی کے ساتھ بجھا دے تو وہ جاری نہر میں داخل ہو جائے اور پانی کے بہاؤ کے سامنے کھڑا ہو جائے اور کہے کہ میں اللہ کے نام کے ساتھ شفا طلب کرتا ہوں۔ یا الٰہی! اپنے بندے کو شفا دے اور اپنے رسول کے قول کو سچا کر دے اور مجھ کو شفا دے یہ فعل صبح کی نماز کے بعد آفتاب (سورج) کے نکلنے سے پہلے کرے اور اس میں تین دن تین تین غوطے مارے۔ پس اگر تین دن میں اچھا نہ ہو۔ تو پھر نو (۹) دن کرے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بخار نو دن سے تجاوز نہیں کرے گا۔ یعنی اس عمل کے بعد بخار جاتا رہے گا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: **فان الحمی قطعة من النار**: اس حرارت ظاہرہ و باطنہ کی شدت کی وجہ سے جو مریض بیماری کی حالت میں محسوس کرتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ''اذا'' کا جواب **''فليعلم انها كذالك''** ہے (**اى فليعلم ان الحمى قطعة من النار**)

فرماتے ہیں: اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''اذا'' کا جواب **''فليطفئها''** ہو اور **''فان الحمى الخ''** کلام معترضہ ہو۔

فليستنقع فى نهر جار: یہ ''اطفاء'' کا بیان ہے۔

و ليستقبل جريية: جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے: **''ما اشد جرية هذا الماء''** کسرہ کے ساتھ کہا جاتا ہے۔

اور شاید یہ بیماری کی بعض انواع کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ صفراوی بخار' کہ اہل حجاز اسے جانتے ہیں۔ کیونکہ بعض بخار ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اگر پانی استعمال کیا جائے تو مریض مر سکتا ہے۔ اس لیے ثقہ طبیب حاذق کے مشورہ کے بغیر بخار کا پانی کے ساتھ علاج نہیں کرنا چاہیے۔

صدق رسولك: یعنی مجھے شفا فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو سچا کر دکھائیے۔

بعد: "یستنقع" سے ظرف ہے اسی طرح "قبل طلوع الشمس" میں "قبل" ہے۔

ینغمس: اور ایک نسخے میں "ولیغمس" کے الفاظ ہیں یعنی یاء پر فتح اور میم پر کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور "فیہ" کی ضمیر مجرور "ماء" کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور "نہر" کی طرف بھی۔

غمسات: غین اور میم دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ولینغمس" یہ "فلسیتنقع" کا بیان ہے۔ اسے "ثلاث غمسات" کے تعلق کی بنا پر لایا گیا ہے۔

لم یبرء: راء پر فتحہ ہے۔

فخمس: رفع کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: (یہاں تقدیری عبارت یوں ہے:) ای فالأ یام التی ینبغی ان ینغمس فیھا خمس أو فالمرات۔ اھ۔ اور ایک نسخے میں جر کے ساتھ "ففی خمس"۔

قوله: فان لم یبرأ فی خمس فسبع: "فسبع" میں بھی دونوں اعراب ہیں۔

قوله: فان لم یبرأ فی سبع فتسع: مذکورہ بالا دونوں صورتیں ہیں۔

باذن اللّٰه: اللہ کے ارادے سے یا اس کے حکم سے ختم کرنے میں اور نہ لوٹانے میں۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد، ابن ابی دنیا، ابن السنی اور ابو نعیم نے بھی روایت کیا ہے۔

اور پھر فرماتے ہیں: ابن ابی شیبہ، احمد، بخاری، نسائی، ابن ابی دنیا، ابن حبان، ابن سنی، ابو نعیم اور حاکم نے ابوحمزہ سے روایت کیا ہے: قال: کنتادفع الناس عن ابن عباس فاحتسبت عنه ایاما فقال: ما حبسك؟ قلت: الحمی۔ فقال: قال رسول اللّٰه: الحمی من فیح جھنم فابر دوھا بالماء اوبما زمزم۔

وہ کہتے ہیں میں لوگوں کو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دور کرتا تھا۔ پھر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ان کے پاس کئی دن نہ گیا۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما مجھ سے پوچھنے لگے: اتنے دن کہاں رہے؟ میں نے کہا مجھے بخار تھا۔ وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخار جہنم کی لُو میں سے ہے اسے پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو یا یہ فرمایا زمزم کے پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔

"ابردوھا" کا مشہور ضبط یہی ہے یعنی ہمزہ وصلی ہے اور راء مضموم ہے۔ ای اسکنوا حرارتھا۔ یعنی اس کی گرمی کو سکون دلاؤ۔ "ابردوا" میں راء کا کسرہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور قاضی عیاض نے ہمزہ قطعی مفتوحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ "أبرد الشیئ" سے بنایا ہے جس کا معنی ہوتا ہے مریض کا علاج کرنا حتی کہ اس کا بخار ٹھنڈا پڑ جائے۔

جوہری فرماتے ہیں: یہ ردی لغت ہے اور مسلم وغیرہ کی روایت میں حضرت عائشہ سے مروی ہے: فاطفؤھابالماء "اسے پانی کے ذریعے بجھاؤ"۔ اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے: الحمی کیر من کیر جھنم فنحو ھا عنکم بالماء البارد۔ اور امام احمد وغیرہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: أتینا رسول اللّٰه فی نساء نعودہ فاذا سقاء معلقة یقطر ماؤ ھا علیه من شدة مایجد ہ من الحمی فقلت: یارسول اللّٰه لودعوت اللّٰه ان یکشف عنك فقال: ان أشد الناس بلاء الانبیاء ثم الذین یلونھم ثم الذین یلو نھم۔

وہ کہتی ہیں: ہم بہت سی عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کے لیے آئیں۔ ہم نے دیکھا کہ ایک مشک لٹکی ہوئی تھی جس کے قطرے آپ پر پڑ رہے تھے۔ کیونکہ آپ کو سخت بخار تھا۔ میں نے کہا: اے اللہ تعالیٰ کے رسول! آپ شفا کی دعا کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: سب سے زیادہ مصیبتیں انبیاء پر پڑتی ہیں۔ پھر سب سے نیک لوگوں پر پھر ان سے کم نیک لوگوں پر۔ اھ۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر مقام میں تین مراتب ہوتے ہیں: ① اعلیٰ ② اوسط ③ ادنیٰ اور اسی پر تمام لوگوں کے مراتب کا مدار ہے۔

مازریؒ فرماتے ہیں: یہ بھی احتمال ہے کہ بخار میں مبتلا آدمی کے لیے غسل مخصوص اوقات میں فائدہ مند ہو۔ اس صورت میں یہ آپؐ کے ان خواص میں سے ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطلع فرمایا ہے۔ اور اس وقت اطباء کے تمام اقوال مضمحل پڑ جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بخار کے مریض کے لیے پانی کے ساتھ غسل کرنا خطرناک ہے اور اس سے ہلاکت واقع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ مسام کو بند کر دیتا ہے اور بھڑکتے ہوئے بخار کو اندر ہی داخل کر دیتا ہے۔ چنانچہ جسم کے اندر گرمی منعکس ہوتی ہے جو ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔

(مازریؒ) فرماتے ہیں: یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا کرنا بعض بخاروں کے لیے درست ہو اور بعض کے لیے درست نہ ہو' اسی طرح بعض مقامات کے لیے درست ہو اور بعض کے لیے درست نہ ہو۔ بعض لوگوں کے لیے مناسب ہو اور بعض کے لیے مناسب نہ ہو۔

ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں: اگر اعضاء مضبوط ہوں' گرم بخار ہو' نبض معلوم ہو' پیٹ میں ورم بھی نہ ہو۔ اس حالت میں ٹھنڈا پانی پینا مفید ہے۔ پس اگر بیمار کا جسم صحیح ہو موسم گرم ہو اور وہ ٹھنڈے پانی غسل کا عادی ہو تو اسے اجازت دے دینی چاہیے۔ اور ابن قیمؒ ثوبانؓ کی حدیث کو ان قیود پر لائے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: یہ صفت موسم گرما میں گرم علاقوں میں نافع ہوتی ہے' بشرطیکہ اعراض ردیئہ اور مواد فاسرہ نہ ہوں۔ پس ایسی صورت میں پانی بخار کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بجھا دیتا ہے' چونکہ اس وقت پانی دھوپ نہ پڑنے کی وجہ سے ٹھنڈا ہوتا ہے' اور اس وقت قوی بھرپور ہوتے ہیں اس لئے کہ آدمی نیند کر چکا ہوتا ہے' حالت سکون میں ہوتا ہے' اور ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے فرمایا: اور جن ایام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ وہ ایام ہیں جن میں امراض حارہ عام طور پر واقع ہوتے ہیں خصوصاً گرم علاقوں میں۔ واللہ اعلم۔ خطابی فرماتے ہیں: علم کی طرف منسوب ایک شخص نے بہت ہی ناروا عمل کیا کہ جب ان کو بخار ہوا تو انہوں نے پانی میں غوطہ لگایا۔ چنانچہ حرارت اس کے جسم میں رک گئی' اور ایسی سخت بیمار لاحق ہوگئی کہ قریب تھا کہ جان لے لے گی۔ پس جب وہ بیماری سے صحت یاب ہوا تو بہت بری بات کہی جن کا ذکر کرنا اچھا نہیں ہے۔ اور اس شخص کو یہاں تک جو نوبت پہنچی وہ حدیث کے معنی سے جہالت کی بنا پر پہنچی۔

بخار کو برا مت کہو' یہ مسلمان کے لیے باعث رحمت ہے

۱۵۸۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ ذُكِرَتِ الْحُمّٰى عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَّهَا رَجُلٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم لَا تَسُبَّهَا فَاِنَّهَا تَنْفِی الذُّنُوْبَ كَمَا تَنْفِی النَّارُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔ [رواہ ابن ماجۃ]

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۱٤۹/۲ ۔ حديث رقم ۳٤٦۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بخار کا ذکر کیا گیا تو ایک شخص نے بخار کو برا کہا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بخار کو برا مت کہو۔ اس لیے کہ بخار گناہوں کو دور کرتا ہے جیسے کہ آگ لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ذکرت۔ بصیغہ مجہول ہے۔

لا تسبها: باء پر فتحہ ہے اور ایک نسخے میں باء پر ضمہ ہے۔ جان لیجئے! رُدَّهَا جیسی مثالوں میں بغیر کسی اختلاف کے فتحہ واجب ہے۔ نیشا پوری شرح الشافعیہ میں فرماتے ہیں: کیونکہ ھاء خفیف ہونے کے باعث نا ہونے کے برابر ہے۔ تو گویا کہ الف دال کے بعد واقع ہے۔ اھ۔ پس ضمہ کی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ "لا نافیه" نھی کے معنی میں ہے۔

فانها تنفي الذنوب: یہ تعبیر تمحو سے زیادہ بلیغ ہے۔

كما تنفي النار خبث الحديد: یہ گناہوں کے مٹانے میں مبالغہ سے کنایہ ہے۔

بیماری میں خدا کی حکمت

۱۵۸۴: وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادَ مَرِيْضًا فَقَالَ اَبْشِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ هِيَ نَارِىْ اُسَلِّطُهَا عَلٰى عَبْدِى الْمُؤْمِنِ فِى الدُّنْيَا لِتَكُوْنَ حَظَّهُ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

[رواه احمد وابن ماجة والبيهقي في شعب الايمان]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳٥۹/٤ حديث رقم ۲۰۸۸۔ مع اختلاف وابن ماجه فی السنن ۱۱٤۹/۲۔ حديث رقم ۳٤۷۰۔ واحمد فی المسند ٤٤۰/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمار کی عیادت کی اور اس سے فرمایا تمہیں خوشخبری ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ بخار میری آگ ہے میں اسے اپنے مؤمن بندے پر مسلط کرتا ہوں۔ تاکہ وہ بخار اس کے لئے قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے حصہ اور بدلہ ہو جائے اس کو احمدؒ، ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: فان الله تعالى يقول هي: مراد ہے بخار جیسا کہ سیاق سے پتہ چل رہا ہے۔

ناری اسلطها على عبدي المؤمن: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "نار" کی اضافت میں اشارہ ہے کہ یہ لطف و رحمت ہے۔ اسی لیے "عبدی" کے ساتھ تصریح کی کہ "میرا بندہ" ہے اور اسے "مؤمن" کہا ہے اور "اسلطها" خبر ہے یا پھر نئی بات شروع ہو رہی ہے۔

في الدنيا: یہ دوسری خبر ہے یا پھر "اسلطها" کے متعلق ہے۔

یعنی اس آگ کے بدلے میں جو اس کے لیے اس کے گناہوں کی وجہ سے آخرت میں تیار کی گئی تھی۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس حتمی آگ میں سے ہو جس کا اس کے لیے آیت میں فیصلہ کیا گیا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ [مریم: ۷۰] امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اور پہلا ظاہر معنی ہے۔ اور میرے نزدیک دوسرا معنی ظاہر معنی ہے اور اس بات کی تائید میں ابن ابی دنیا' ابن جریر' ابن منذر نے اور ابن ابی حاتم نے تفسیر میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں مجاہد سے نقل کیا جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے قال: الحمى في الدنيا حظ المؤمن من الورود في الآخرة ۔ وہ فرماتے ہیں: دنیا میں بخار ایک مؤمن کا آخرت کے دن جہنم میں وارد ہونے کا حصہ ہے اور حضرت حسنؒ سے مرفوع روایت ہے: ان لكل آدمي حظا من النار 'وحظا المؤمن منها الحمى تحرق جلده و لاتحرق جوفه وهي حظه منها اه۔ ''ہر آدمی کے لیے آگ کا حصہ ہے اور اس میں سے مؤمن کا حصہ اس کا بخار ہے۔ جو اس کی جلد کو تو جلاتا ہے لیکن پیٹ کو نہیں جلاتا۔ اور یہ اس میں سے حصہ ہے''۔ اھ۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ اس تفسیر کو کامل مؤمن کے ساتھ خاص کیا جائے کیونکہ بعض گناہ گار مؤمنین کو آگ کا عذاب ہوگا۔

تخریج و اسنادی حیثیت: اس حدیث کو ہناد بن سری اور ابن ابی دنیا نے' ابن جریر نے اپنی تفسیر میں' ابن عدی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ (ذکرہ سیوطی)

مصائب کے بدلے بخشش کا وعدہ

۱۵۸۵: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الرَّبَّ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ لَا اُخْرِجُ اَحَدًا مِنَ الدُّنْيَا اُرِيْدُ اَغْفِرَلَهٗ حَتّٰى اَسْتَوْفِیَ كُلَّ خَطِيْئَةٍ فِیْ عُنُقِهٖ بِسَقَمٍ فِیْ بَدَنِهٖ وَاِقْتَارٍ فِیْ رِزْقِهٖ۔

رواه رزین ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور برتر ہیں اپنی عزت وجلال کی قسم کھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں کسی بندے کو دنیا سے نہیں نکالوں گا۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ میں اس کو بخش دوں گا یہاں تک میں اس کے ہر گناہ کا بدلہ پورا دوں گا۔ اس کی بدنی بیماری کی وجہ سے اور اس کے رزق میں تنگی دے کر (اس کے گناہوں کو بخش دوں گا) اس روایت کو رزین نے نقل کیا ہے۔

تشریح: و عزتي: یعنی میرے غلبے اور قوت کی قسم۔

''جلال'' عظمت اور قدرت ہے۔

اغفرله: رفع کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: ای أرید أن أغفر' (یعنی میں چاہتا ہوں کہ معاف کروں۔) اس میں ''اَن'' محذوف ہے۔ اور پورا جملہ یا تو ''اخرج'' کے فاعل سے حال ہے یا مفعول کی صفت ہے۔

حتی استوفی کل خطیئة: یعنی ہر اس برائی کی جزا جو اس نے کی ہے۔ اور اس سے ''في عنقه'' کے ساتھ کنایہ کیا

گیا ہے۔

فی عنقه: دونوں حروف پر ضمہ ہے۔ ای فی ذمته۔ یعنی اس کے ذمہ میں ہے جس وقت تک کہ وہ باقی ماندہ خطاؤں سے توبہ نہ کرے۔

بسقمم: باء کے بعد دونوں حروف پر فتحہ ہے اور سین کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جار مجرور ''استوفی'' کے متعلق ہے اور باء سببیہ ہے اس لیے ''استبدال'' کے معنی کو متضمن کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے اس کو پسند کیا ہے۔

''فی بدنه'' میں اس کے دین کے سلامت ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

فی رزقه یعنی اس کے خرچ میں تنگی اور شاید یہی راز ہے کہ فقیر امیروں کی بنسبت پانچ سو (۵۰۰) سال پہلے جنت میں داخل ہونگے۔ میرک فرماتے ہیں: ''اقتار'' کا معنی ہے انسان پر اس کی روزی تنگ کر دینا۔ کہا جاتا ہے: اقتر الله رزقه' یعنی ضیقه و قلله۔ وقد اقتر الرجل فهو مقتر و قتر فهو مقتور (كذا فی امام طیبیؒ) پس اس بنا پر ''اقتار'' اپنے معنی کے جز کے لیے استعمال ہوا ہے تجرید کے طور پر۔ اھ۔ اور نکتہ اس وہم کو دور کرنا ہے کہ یہ تنگی اسکے سینے میں ہوتی ہے۔ کیونکہ مؤمن کا سینہ کشادہ ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے اسے غنائے قلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان فقیری کو امیری پر ترجیح دیتا ہے محنت اور مشقت پر شکر کرتا ہے اور وہ مشقت پر اس قدر شکر ادا کرتا ہے کہ جس قدر شکر کوئی دوسرا نعمت پر بھی ادا نہیں کرتا۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ میں نے یہ روایت ''اصول'' میں نہیں دیکھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنی بیماری پر اظہارِ افسوس

۱۵۸۶: وَعَنْ شَقِيْقٍ قَالَ مَرِضَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ فَعُدْنَاهُ فَجَعَلَ يَبْكِيْ فَعُوْتِبَ فَقَالَ اِنِّيْ لَا اَبْكِيْ لِاَجْلِ الْمَرَضِ لِاَنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْمَرَضُ كَفَّارَةٌ وَاِنَّمَا اَبْكِيْ اَنَّهُ اَصَابَنِيْ عَلٰى حَالِ فَتْرَةٍ وَلَمْ يُصِبْنِيْ فِيْ حَالِ اِجْتِهَادٍ لِاَنَّهُ يُكْتَبُ لِلْعَبْدِ مِنَ الْاَجْرِ اِذَا مَرِضَ مَا كَانَ يُكْتَبُ لَهُ قَبْلَ اَنْ يَمْرَضَ فَمَنَعَهُ مِنْهُ الْمَرَضُ۔

رواه رزين۔

ترجمہ: حضرت شقیقؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ پس ہم نے ان کی عیادت کی تو انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ بیماری یا زندگی کی محبت کی وجہ سے روتے ہیں۔ پس فرمانے لگے کہ میں بیماری کے سبب نہیں روتا اس لیے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ بیماری گناہ جھڑنے کا سبب ہے میں اس لیے روتا ہوں کہ مجھ کو بیماری (یعنی بڑھاپے کی حالت) سستی میں پہنچی ہے اور جوانی کی حالت میں مجھ کو بیماری نہیں پہنچی۔ اس لیے کہ جوانی میں بیماری پر بندے کے لیے ان تمام اعمال کا ثواب لکھا جاتا ہے جن کا بیماری سے پہلے لکھا

جا تا تھا اور اس بیماری نے اُسے اس سے باز (روکے) رکھا۔ یہ رزین نے نقل کی ہے۔

تشریح: فعوتب: کیونکہ وہ جزع فزع ظاہر کررہے تھے اور یہ اکابر کے اخلاق میں سے نہیں ہے۔

ابکی انه: ای لاجل انه اور ابن حجر کا قول: "انّ" کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا صحیح ہے" روایت اور درایت کے مخالف ہے۔

ولم یصبنی فی حال اجتهاد: یعنی اگر یہ مصیبت مجھے اس وقت پہنچتی جب میں بدنی عبادت کی طاقت رکھتا تھا تو یہ میرے ثواب میں زیادہ اضافہ کرنے والی ہوتی۔

لانه: شان ہے۔

فمنعه المرض: یعنی کوئی دوسری رکاوٹ جیسے نہ ہو مشغولیت یا بڑھاپا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عیادت کا طریقہ

۱۵۸۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَعُوْدُ مَرِیْضًا اِلَّا بَعْدَ ثَلَاثٍ۔

[رواہ ابن ماجة والبیهقی فی شعب الایمان]

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۴۶۲/۱ حدیث رقم ۱۴۳۷۔ والبیهقی فی شعب الایمان ۵۴۲/۶ حدیث رقم ۹۲۱۶۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن کے بعد مریض کی عیادت کرتے تھے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: یعنی تین دن بعد عیادت فرماتے تھے۔ یہی قول بغوی، غزالی اور کئی علماء کا ہے۔ اور جمہور علماء فرماتے ہیں کہ عیادت مریض کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مطلق ہے: عودوا المریض۔

اور جہاں تک بات ہے حضرت انس کی اس روایت کی تو یہ حدیث بہت ہی ضعیف ہے اسے مسلمہ بن علی نے تنہا روایت کیا ہے اور وہ متروک راوی ہیں۔ ابوحاتم سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ باطل حدیث ہے۔ طبرانی میں ابوہریرہؓ کے طریق سے مجھے اس کا ایک شاہد ملا ہے لیکن اس میں بھی ایک متروک راوی ہے۔ (کذا ذکرہ) عسقلانی۔

اور ابن حجرؒ نے جو اس حدیث کا موضوع ہونا نقل کیا ہے جیسا کہ امام ذہبیؒ وغیرہ نے کہا ہے تو یہ بات درست نہیں ہے یا یہ اس کی کسی خاص سند کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ کثرت طرق اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ حدیث کی اصل ضرور موجود ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو امام سیوطی نے جامع صغیر میں ذکر کیا ہے۔

اور "المقاصد" میں ہے: مریض کی عیادت تین دن کے بعد والی روایت کے بہت سے ضعیف طرق ہیں، جس سے سب طرق کو باہم تقویت مل رہی ہے۔ اسی لیے اس حدیث کے مضمون کو ایک جماعت نے قبول کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ آپ کسی غائب آدمی کے بارے میں تین دن کے بعد ہی پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ جب احوال

سے واقفیت ہو جاتی تو پھر عیادت کرتے تھے۔

اور یہ بھی امکان ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تین دن تک اپنی بیماری ظاہر نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ ''شرعة الاسلام'' میں ایک حدیث قدسی ہے: قال الله تعالىٰ: اذا اشتكى عبدی و أظهر ذلك قبل ثلاثة أيام فقد شكانی۔ ''جب میرا بندہ بیمار ہو جائے اور تین دن سے پہلے اس کا اظہار کر بیٹھے تو اس نے میری شکایت کی''۔

اس لیے ہر مریض پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیماری پر تین دن تک صبر کرے بایں طور کہ وہ تین دن سے پہلے اس کا اظہار نہ کرے۔ اھ۔

یا حدیث کو زمانۂ استحباب پر محمول کیا جائے گا

یا تین دن تک تاخیر کے جواز پر محمول کیا جائے گا اس امید پر کہ ہوسکتا ہے صحت یاب ہو جائے۔

اور مخصوصین اور متمرضین کا علیحدہ حکم ہے۔ اسی لیے ایک دن چھوڑ کر عیادت کرنا مستحب ہے جب کہ وہ صحیح العقل ہو اور جب بیماری غالب ہو جائے اور اس پر خوف محسوس ہو تو ہر روز دیکھ بھال کرلے۔

تخریج و اسنادی حیثیت: اس حدیث کو امام ابن ابی دنیا نے ''المرض و الكفارات'' میں ذکر کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک متروک راوی ہے۔ اور اسی طرح اس حدیث کو ابو یعلی نے جس سند کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں ایک راوی ضعیف ہے۔

مریض سے دُعا کروانے کا حکم

۱۵۸۸: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰى مَرِيْضٍ فَمُرْهُ يَدْعُوْلَكَ فَاِنَّ دُعَاءَهُ كَدُعَاءِ الْمَلَائِكَةِ ۔ [رواه ابن مالك]

اخرجه ابن ماجه ۱/٤٦٣ حديث رقم ۱٤٤۱۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو تم اس کو اپنے لیے دعا کا کہو کیونکہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہے۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: فمره يدعو لك: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اس سے فرمائش کرو کہ وہ تمہارے لیے دعا کرے کیونکہ وہ گناہوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے اور رہا ابن حجر کا قول کہ ''يدعو'' پر جزم (بھی) جائز ہے اس شخص کے مذہب کے مطابق جو حرف جازم کی وجہ سے حرف علت حذف نہ کرنے کا قائل ہے جواب امر میں اس آیت کے نہج پر: [قل للذين آمنوا يقيموا الصلاة] کہ اس آیت کا ایک اعراب یہ بھی ہے۔ تو ابن حجرؒ کا یہ قول بہت ہی بعید ہے بوجہ عدم ظہور کے سببیت ہے اور بعض نے اس آیت کے اعراب میں جزم صریح ہونے کی وجہ سے تکلف کیا ہے۔ اور رہا وہ تکلف وہ تکلف سبب عادی سے ہٹ کر ایک نئے سبب کے مکلّف پر ہو تو یہ صحیح نہیں ہے۔

قوله: فان دعاءه كدعاء الملائكة:

مریض کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہے کیونکہ مریض گناہوں سے پاک ہونے میں ملائکہ کے زیادہ مشابہ ہوتا ہے یا پھر دوام ذکر الٰہی، دعا، عاجزی اور التجا کی وجہ سے فرشتوں کے مشابہ ہوتا ہے اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی ثقہ اور مشہور ہیں سوائے میمون بن مہران کے۔ کہ ان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

مریض کے پاس اتنی اُونچی آواز میں بولنا منع ہے جس سے مریض کو تکلیف پہنچے

۱۵۸۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ تَخْفِيفُ الْجُلُوْسِ وَقِلَّةُ الصَّخَبِ فِي الْعِيَادَةِ عِنْدَ الْمَرِيْضِ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا كَثُرَ لَغَطُهُمْ وَاخْتِلَافُهُمْ قُوْمُوْا عَنِّيْ۔

رواہ رزین۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مریض کے پاس کم بیٹھنا اور عیادت کرتے وقت بیمار کے پاس شوروغل (اونچی) باتیں کرنا ممنوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب غل زیادہ ہوا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ یعنی کھڑے ہو جاؤ۔ یہ رزین نے نقل کی ہے۔

تشریح: قوله: من السنة تخفيف الجلوس و قلة الصخب في العيادة عند المريض: دونوں حروف مفتوح ہیں اور دوسرے کو ساکن بھی پڑھا گیا ہے یعنی آواز بلند کرنا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اضطراب اصوات (یعنی شور مچانا) تو سرے سے ممنوع ہے خصوصاً مریض کے پاس تو بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ پس یہاں پر قلت ''عدم'' کے معنی میں ہے۔

قال: یعنی ابن عباسؓ۔ عفیف کی اصل میں اسی طرح ہے اور اکثر نسخوں میں یہ موجود نہیں ہے۔

قوله: وقال رسول الله ﷺ لما كثر لغطهم و اختلافهم...... :

نہایہ میں ہے: ''اللغط'' اس آواز اور چیخ و پکار کو کہتے ہیں جس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یہ آپ کی وفات کے وقت کی بات ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: لما احتضر رسول الله ﷺ و في البيت رجال فيهم عمر بن الخطاب، قال النبيؐ هلموا اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده فقال عمر، وفي رواية فقال بعضهم: رسول اللهؐ قد غلب عليه الوجع و عندكم القرآن حسبكم كتاب الله، فاختلف اهل البيت، واختصموا فمنهم من يقول قربوا يكتب لكم رسول اللهؐ و منهم من يقول غير ذلك فلما اكثر واللغط والاختلاف قال رسول اللهؐ قوموا عني۔ (متفق علیہ) ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل قریب ہوئی گھر میں بہت سے افراد تھے ان میں عمر بن خطابؓ بھی تھے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاؤ میں تمہیں تحریر لکھ دیتا ہوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: ایک روایت میں ہے کہ بعض لوگوں نے کہا: آپؐ پر تکلیف کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے اور تمہیں اللہ کی کتاب کافی ہے چنانچہ گھر میں موجود لوگوں میں اختلاف ہو گیا اور جھگڑے کی صورت بن گئی ان میں سے کچھ کہہ رہے تھے کہ آپؐ کے پاس کاغذ وغیرہ لانے چاہئیں اور کچھ اس کا انکار کر رہے تھے۔ جب آواز اور اختلاف بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا: مجھ سے دور چلے جاؤ۔''

ابن حجر فرماتے ہیں: گویا کہ جب آپ نے کتابت کا ارادہ کیا تو اختلاف واقع ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ نہ لکھوایا جائے تو آپ نے اسے اختیار سے چھوڑ دیا۔ اور ایسا کیوں کر ممکن نہیں جب کہ آپ کسی چیز کا مصمم ارادہ کرتے تو عمر یا کسی اور کی کیا جرأت تھی کہ وہ آپ کے فیصلے میں کلام کرتا۔ آپ اس قضیے کے بعد تقریباً تین دن زندہ رہے اور ایسا وقت بھی آتا تھا جس میں نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوتے تھے اور نہ کوئی دوسرا ہوتا تھا سوائے اہل بیت کے یعنی علی اور عباس رضی اللہ عنہما کے سوا کوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلافت وغیرہ کے بارے میں لکھنے میں مصلحت سمجھتے تو لکھ دیتے اور بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے بارے میں ایک ایسی بات پر اکتفا کیا جو قریب تھا کہ نص جلی بن جاتی۔

اور وہ بات یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے ایام میں نماز پڑھانے کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آگے کیا۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرتے ہوئے لوگوں کے مجمع کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: آپ نے انہیں پسند کیا ہے' آپ نے ان کی طرف پیغام بھیجا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں حالانکہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا' آپ میری طرف دیکھ رہے تھے اور آپ میرے مکان کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اور حضرت علی جیسے شہسوار اسلام کی نسبت تقیہ کی طرف کرنا' حضرت علیؓ کے عظمت شان سے جہالت کے باعث ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ ان میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [المائدة ٥٤] ابوسفیان بن حرب نے کہا تھا: ان شئت لأملأ نها علی ابی بکر خیلا ور جالا۔ اس پر حضرت علیؓ نے ان کو سختی سے جھڑک دیا اور بہت ہی برا بھلا کہا' تاکہ ان کو دوسرے لوگوں کو علم ہو جائے کہ خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں' ان کی خلافت کے برحق میں ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

مریض کے پاس کم بیٹھنے کا حکم

۱۵۹۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيَادَةُ فَوَاقُ نَاقَةٍ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٥٤٣/٦ حديث رقم ٩٢٢٢۔

ترجمہ ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' عیادت کا افضل زمانہ اونٹنی کے دو مرتبہ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے بقدر ہے۔''

تشریح: فواق: فاء فتحہ کے ساتھ' اور فاء کا رفع کے ساتھ بھی درست ہے' اور ایک نسخے میں نصب کے ساتھ ہے مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے۔ ای افضل زمان العیادۃ مقدار فواقھا۔ اور فواق دو مرتبہ دودھ دوھنے کے درمیانی عرصے کے وقت کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اونٹنی کو ایک مرتبہ دوھ کر لحہ بھر کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اس لحہ میں اونٹنی کا بچہ دودھ پینے لگتا ہے (اور یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے) تاکہ دودھ زیادہ ہو جائے اور پھر دودھ دوہا جاتا ہے۔ (تو اس موقع پر) کہا جاتا ہے: ما اقام عندہ الا فواقا ''کہ وہ اس کے پاس صرف اتنا دیر ٹھہرا ہے جتنا کہ دودھ دوہنے کا درمیان وقفہ ہوتا ہے''۔

بہترین عبادت

١٥٩١: وَفِی روایة سعید بن المسیب مرسلا افضل العیادة سرعة القیام.

رواہ البیھقی فی شعب الایمان ٦/٥٤٢ حدیث رقم ٩٢٢١۔

ترجمہ: ''حضرت سعید ابن میّب کی ایک مرسل روایت میں ہے کہ ''بہترین عیادت وہی ہے جس میں عیادت کرنے والا جلد اٹھ کھڑا ہو۔'' (بیہقی)

تشریح: '' مرسلا'' کا مطلب یہ ہے کہ صحابی کا واسطہ حذف کر دیا ہے اور حدیث کی سند نبی کی طرف ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے: **افضل مایفعله العائد فی العیادة ان یقوم سریعا** کہ عیادت کرنے والے کے لیے عیادت میں افضل عمل یہ ہے کہ وہ جلدی چلا جائے میرکؒ کہتے ہیں: زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے: **افضل العیادة عیادة فیها سرعة القیام**۔ افضل ترین عیادت وہ ہے جس میں جلدی اٹھا جائے۔

اور شرح السنہ میں کہا گیا ہے: عیادت کے لیے تھوڑی دیر بیٹھنا بہترین عیادت ہے' اور ایک قول یہ ہے: عیادت لحہ ولحظہ کا نام ہے۔

حکایت: اور ان میں سے بعض سے روایت ہے کہ ہم نے السری السقطی کے مرض الموت میں ان کی عیادت کی۔ تو ہم ان کے پاس کافی دیر بیٹھے رہے۔ انہیں پیٹ کی تکلیف تھی۔ پھر ہم نے ان سے کہا: اب آپ ہمارے لیے دعا کریں تا کہ ہم آپ کے ہاں سے روانہ ہوں تو انہوں نے کہا: اے اللہ! انہیں سکھا کہ مریض کی عیادت کیسے کی جاتی ہے۔ دوسری حکایت ایک آدمی ایک مریض کی عیادت کرنے گیا اور کافی دیر بیٹھا رہا تو مریض نے کہا: لوگوں کی ہمارے پاس بکثرت آمدورفت کی وجہ سے ہم تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ تو وہ آدمی کہنے لگا۔ میں اُٹھوں اور دروازہ بند کر دوں؟ تو اس نے کہا ہاں لیکن باہر سے۔

اور بعض نے صرف اس قسم کے کنایات ہی استعمال نہیں کئے بلکہ واضح کہہ دیا۔

حکایت: مروی ہے کہ ایک ثقیل آدمی ایک مریض کے پاس آیا اور کافی دیر بیٹھ چکنے کے بعد پوچھنے لگا: آپ کیا تکلیف محسوس کر رہے ہیں؟ تو مریض نے جواب دیا تیرے بیٹھنے کی۔

حکایت: کچھ لوگ ایک مریض کے پاس آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے اور کہنے لگے: ہمیں وصیت کیجئے! وہ کہنے لگا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کبھی مریض کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرنا۔

اور اس سے وہ حالت استثناء ہوگی جس میں یہ گمان ہو کہ مریض اس شخص کے زیادہ بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے' مثلاً وہ اس کا دوست ہے یا اسے تبرک سمجھ رہا ہو یا وہ اس میں اپنی مصلحت سمجھتا ہے یا اسی طرح کوئی اور فائدہ ہو تو مریض کے پاس زیادہ دیر بیٹھنا کوئی حرج نہیں ہے۔

مریض کی خواہش کا احترام

۱۵۹۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادَ رَجُلًا فَقَالَ لَهُ مَا تَشْتَهِی قَالَ اَشْتَهِی خُبْزَ بُرٍّ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ خُبْزُ بُرٍّ فَلْيَبْعَثْ اِلٰی اَخِيْهِ ثُمَّ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَهٰی مَرِيْضُ اَحَدِكُمْ شَيْئًا فَلْيُطْعِمْهُ۔ [رواه ابن ماجة]

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/ ٤٦٣ حديث رقم ١٤٣٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی عیادت کی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کس چیز کے کھانے کو دل چاہتا ہے؟ اس نے کہا گیہوں (گندم) کی روٹی کھانے کو دل چاہتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس گیہوں (گندم) کی روٹی ہو پس چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف بھیج دے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت مریض کسی چیز کی خواہش کرے تو چاہیے کہ تم اس کو کھلا دو۔ اس روایت کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: من كان عنده خبز بر فليبعث الى اخيه اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ کی اور آپؐ کے بیشتر صحابہ کی گزران تنگ تھی۔ شمائل میں سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: انها قالت ماشبع آل محمد من خبز الشعير يومين متتابعين 'حتى قبض رسول الله'۔ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل نے کبھی دو دن متواتر جو کی روٹی بھی سیر ہو کر نہیں کھائی حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے۔"

اور ابو امامہؓ سے روایت ہے: ما كان يفضل عن أهل بيت رسول اللهؐ خبز الشعير۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے جو کی روٹی کبھی بچتی نہیں تھی۔"

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: قال: كان رسول اللهؐ يبيت الليالى المتتابعة طاويا هو واهله لايجدون عشاء وكان اكثر خبزهم خبز الشعير۔ "آپ اور آپؐ کے اہل بیت کئی کئی راتیں خالی پیٹ گزارتے تھے ان کے پاس شام کا کھانا نہیں ہوتا تھا اور ان کی زیادہ تر روٹی جو کی ہوتی تھی۔"

قوله: ثم قال النبی: اذا اشتهىٰ مريض احدكم شيئًا فليطعمه:

کیونکہ بعض اوقات وہ چیز اس کے لیے شفا بن جاتی ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ مریض کی خواہش اس کے لیے درست ثابت ہوتی ہے خاص طور پر اگر وہ چیز اس کی ان مانوس چیزوں میں سے ہو جو بیماری کی وجہ سے اس سے منقطع ہو چکی ہو۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اس (حکم) کی بنیاد توکل پر ہے کہ وہی شافی ہے یا اس لیے کہ مریض موت کے قریب ہوتا ہے۔

سفر جہاد کی موت گھر کی موت سے افضل ہے

۱۵۹۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ تُوُفِّیَ رَجُلٌ بِالْمَدِيْنَةِ مِمَّنْ وُلِدَ بِهَا فَصَلّٰی عَلَيْهِ النَّبِیُّ صَلّٰی

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَالَیْتَہٗ مَاتَ بِغَیْرِ مَوْلِدِہٖ قَالُوْا وَلِمَ ذَاکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا مَاتَ بِغَیْرِ مَوْلِدِہٖ قِیْسَ لَہٗ مِنْ مَوْلِدِہٖ اِلٰی مُنْقَطَعِ اَثَرِہٖ فِی الْجَنَّۃِ ۔ [رواہ النسائی وابن ماجۃ]

اخرجه النسائي في السنن ٧/٤ حديث رقم ١٨٣٢۔ وابن ماجه ١/٥١٥ حديث رقم ١٦١٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص کی مدینہ منورہ میں وفات ہوگئی اور وہ مدینہ میں ہی پیدا ہوا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی اور فرمایا کاش کہ یہ اپنی پیدائش کی جگہ سے باہر فوت ہوتا (یعنی سفر وغیرہ میں) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ کس لیے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت آدمی غیر وطن میں مرتا ہے اس کے وطن سے لے کر اس کے نقش قدم کے منقطع (ختم) ہونے تک ناپا جاتا ہے۔ (اس کو نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

تشریح: عبد اللہ بن عمرو: واؤ کے ساتھ ہے۔

رجل بالمدینۃ ممن ولد بھا: ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ای من اھلھا۔ (یعنی اہل مدینہ میں سے)۔ اور یہ محل نظر ہے چونکہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ اور بظاہر اہل مدینہ کو اس عموم سے خاص کیا گیا ہے جس (عموم) پر علماء نے اتفاق کیا ہے کہ مدینہ میں موت مکہ کی نسبت زیادہ افضل ہے۔ اگرچہ ان کا اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی مجاورت افضل ہے۔

الی منقطع اثرہ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ای الی موضع قطع اجلہ۔ یعنی اس کے فوت ہونے کی جگہ تک۔ اور ''اثر'' کو ''اجل'' کہا گیا ہے کیونکہ ''اجل'' عمر کے پیچھے چلتی ہے۔

زہیر شاعر نے کہا ہے:

والمرء ما عاش ممدود لہ اجل ☆ لا ینتھی العمر حتی ینتھی الاثر

''اور آدمی جب تک زندہ رہتا ہے اس کے لیے اجل آگے بڑھتی رہتی ہے۔ عمر اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک اثر ختم نہ ہو''

یہ اصل میں ''أثر مشیتہ'' سے ماخوذ ہے۔

کیونکہ جو آدمی مر جاتا ہے اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور اس کے قدموں کے نشانات نہیں دکھائی دیتے۔

میرکؒ نے کہا ہے کہ احتمال ہے کہ ''منقطع اثرہ'' سے مراد اس کے قدموں کے نشانات کا محل انقطاع ہو۔ (انتھی)۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ ''منقطع اثرہ'' سے مراد اس کی قبر ہے۔ یہ قول محل نظر ہے۔

فی الجنۃ: ''قیس'' کے متعلق ہے۔

یعنی جو غیر وطن میں مرتا ہے اس کی قبر وسیع کر دی جاتی ہے اور اس کی قبر سے جائے پیدائش تک کھول دی جاتی ہے اور اس کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

سفرِ جہاد بمنزلہ شہادت

۱۵۹۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَوْتُ غُرْبَۃٍ شَہَادَۃٌ۔

[رواه ابن ماجة]

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۱/ ۵۱۵ حديث رقم ۱۶۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسافرت کی موت (یعنی سفر کی حالت میں مرنا) شہادت ہے۔اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تخریج: امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداوٗدؒ نے اور امام بیہقی نے "موت الغريب شهادة" کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے

تشریح: اور ایک دوسری حدیث میں ہے: من مات غريبا مات شهيدا۔ "جو آدمی پردیسی ہونے کی حالت میں مرا وہ شہادت کی موت مرا"۔

اور ایک حدیث میں ہے الغريب شهيد۔ "پردیسی (ہونے) کی حالت میں فوت ہونے والا شہید ہے۔"

بیمار ہو کر مرنے پر شہادت کا ثواب

۱۵۹۵: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ مَرِيْضًا مَاتَ شَهِيْدًا وَوُقِىَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وغُدِىَ وَرِيْحَ عَلَيْهِ بِرِزْقِهِ مِنَ الْجَنَّةِ۔ [رواه ابن ماجة والبيهقى فى شعب الايمان]

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۱/ ۵۱۵ حديث رقم ۱۶۱۵۔ والبيهقى فى شعب الايمان ۷/ ۱۷۴ حديث رقم ۹۸۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص بیمار ہو کر فوت ہو جائے وہ شہید مرتا ہے اور اس کو قبر کے فتنے سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔اس کو جنت سے صبح وشام ہمیشہ روزی دی جاتی ہے۔اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں۔

تشریح: مقروءہ نسخوں میں "مريضا" کے الفاظ ہیں۔اور بعض نسخوں میں "غريبا" لیکن ابن ماجہ کی صحیح حدیث میں "مرابطًا مات شهيدًا" کے الفاظ ہیں۔

ابن حجر فرماتے ہیں: اسی میں ابن جوزی کا نزاع ہے ان کا قول کہ درست "من مات مرابطاً" ہے یہ مردود ہے اور اسی طرح ان کے علاوہ حضرات کا قول بھی مردود ہے۔اور "مریض" سے مراد وہ مریض ہے جسے پیٹ کی تکلیف ہوتا کہ ان احادیث کی موافقت ہو جائے جو مبطون کے بارے میں گزری ہیں۔اور یہ قول مردود اس لیے ہے کہ اس میں وہم کی وجہ سے احادیث کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ کسی ایک چیز کے بارے میں نہیں ہے کہ اس کے بارے میں تعارض کا دعویٰ کیا جا سکے یا تخصیص کی جا سکے اور حدیث مبطون خاص ہے اور "من مات مريضا شهيدًا" والی حدیث عام ہے۔

"پھر حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ قرطبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ تمام بیماریوں میں عام ہے لیکن اس کو ایک دوسری حدیث سے مقید کیا جائے گا: من قتله بطنه لم يعذب فى قبره کہ "جو پیٹ کی بیماری میں مرے گا اسے قبر کا عذاب نہیں ہوگا"۔ اسے [illegible] نے روایت کیا ہے۔اور اس سے مراد استسقاء ہے۔اور ایک قول یہ ہے کہ اسہال مراد ہے۔اور اس میں حکمت یہ ہے

کہ ایسا مریض باہوش وحواس مرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہوئے مرتا ہے اس لیے اس پر سوال دہرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ برخلاف ان کے جو دوسری بیماریوں میں مرتے ہیں کیونکہ ان کی عقل (بوقت موت) غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ (یعنی کام کرنا چھوڑ چکی ہوتی ہے۔)

میں کہتا ہوں کہ یہ قید لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ حفاظ کا اتفاق ہے کہ اس حدیث میں راوی نے غلطی کی ہے۔ اصل "من مات مرابطًا" کے الفاظ ہیں۔ اسی وجہ سے ابن جوزیؒ نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ اھ۔ پس ابن حجرؒ کا قول مردود در مردود ہے۔ غدی: پہلے غین معجمہ ہے اور پھر دال مہملہ ہے۔ ماضی مجہول کا صیغہ ہے "غدوۃ" سے مشتق ہے۔

ریح: یہ "رواح" سے مشتق ہے۔

"علیه" حال ہے۔ اور "برزقه" یہ نائب فاعل ہے ای جیئ له برزقه حال کو نه ناز لاعلیه یعنی اسکے لیے اس کے رزق کو لایا جاتا ہے دراں حالیکہ وہ اس پر نازل ہوتا ہے۔

من الجنة: اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف: بل احیاء عندربهم یرزقون۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ [مریم: ٦٢] کیونکہ "غدوۃ" اور "بکرۃ" دن کے پہلے حصے کو کہتے ہیں اور "رواح" اور "عشی" دن کے دوسرے حصے کو کہتے ہیں۔ اور ان دونوں سے مراد "دوام" ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أُكُلُهَا دَآئِمٌ﴾ [الرعد۔ ٣٥] اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دو مخصوص اوقات میں ان کے لیے خاص رزق ہو۔ پھر یہاں پر رزق حقیقی مراد ہے کیونکہ ایسا ہونا محال نہیں ہے۔ اور بعض احادیث میں آیا ہے کہ بعض مؤمنین کی روحیں خیموں میں اور بعض کی قندیلوں میں اور سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی اور اسی طرح ان کے باہر اور عرش کے نیچے ہوں گی۔ اور ان میں سے بعض کی روحیں پرندوں کی شکل میں ہوں گی جو درختوں پر رہتے ہوں گے اور جنت کے درختوں کے پھلوں میں سے جہاں سے چاہیں گے کھائیں گے۔

طاعون سے مرنے پر شہید کا حکم لگایا جائے گا

١٥٩٢: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَخْتَصِمُ الشُّهَدَاءُ وَالْمُتَوَفَّوْنَ عَلٰى فُرُشِهِمْ اِلٰى رَبِّنَا عَزَّوَجَلَّ فِى الَّذِيْنَ يَتَوَفَّوْنَ مِنَ الطَّاعُوْنِ فَيَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اِخْوَانُنَا قُتِلُوْا كَمَا قُتِلْنَا وَيَقُوْلُ الْمُتَوَفَّوْنَ اِخْوَانُنَا مَاتُوْا عَلٰى فُرُشِهِمْ كَمَا مُتْنَا فَيَقُوْلُ رَبُّنَا اُنْظُرُوْا اِلٰى جِرَاحَتِهِمْ فَاِنْ اَشْبَهَتْ جِرَاحُهُمْ جِرَاحَ الْمَقْتُوْلِيْنَ فَاِنَّهُمْ مِنْهُمْ وَمَعَهُمْ فَاِذَا جِرَاحُهُمْ قَدْ اَشْبَهَتْ جِرَاحَهُمْ۔ [رواه احمد والنسائی]

اخرجه النسائی فی السنن ٣٧/٦ حديث رقم ٣١٦٤۔ واحمد فی المسند ١٢٨/٤۔

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شہید اور وہ لوگ جو اپنے بستروں پر فوت ہوئے یعنی وہ حقیقی شہید نہیں، اپنے ربّ کے پاس ان لوگوں کے بارے میں جو طاعون (وبا) سے مرے

ہیں جھگڑا کریں گے۔ شہید ان لوگوں کے بارے میں کہیں گے یہ ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے مشابہ ہیں تو ان کو بھی مرتبے میں ہمارے برابر ہونا چاہیے۔ مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ یہ بھی قتل کیے گئے اور ہم بھی قتل کیے گئے اور طبعی وفات پانے والے کہیں گے کہ یہ ہمارے بھائی ہیں' یہ بھی اپنے بچھونوں پر فوت ہوئے جیسا کہ ہم بچھونوں پر فوت ہوئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان کے زخموں کی طرف دیکھو اگر ان کے زخم مقتولین (یعنی جو اللہ کے راستے میں شہید ہونے والوں) کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوں تو وہ ان میں سے ہیں یعنی ثواب میں ان کے ساتھ ملحق ہیں۔ یعنی حشر ونشر میں ان کے ساتھ ہوں گے اچانک دیکھیں گے تو ان کے زخم ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوں گے۔ امام احمد اور نسائی نے اس کو نقل کیا ہے۔

تشریح: العرباض: عین مکسور کے ساتھ ہے۔

یختصم: مذکر ومونث دونوں صیغے جائز ہیں۔

الشهداء: مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں شہید ہوئے۔ اور ابن حجر نے یہاں پر بے فائدہ بحث کی ہے۔

المتوفون: فاء مشدد ومفتوح ہے۔

على فرشهم: یہ زیادہ عام ہے حکمی شہداء وغیرہ سے۔

الى ربنا: معطوف اور معطوف علیہ سے حال ہے۔ ای منتهون و متوجهون ومتحاكمون الى ربنا (یعنی ہمارے رب کی طرف محاکمہ کرتے ہوئے اور متوجہ ہوتے ہوئے۔)

فى الذين يتوفون: یہ ''یختصم'' کے متعلق ہے۔

من امر الطاعون: (''من'' سببیہ ہے۔) ای بسببه

فيقول الشهداء: یہ اس اختصام کا بیان ہے۔

اخواننا: مبتدا کی خبر ہے اور مبتدا ''هم'' ہے یعنی طاعون سے مرنے والے ہمارے بھائی ہیں ہمارے مشابہ ہیں' پس وہ بھی ہمارے ساتھ ہونے چاہئیں۔

قتلوا كما اقتلنا: یہ مشابہت کا بیان ہے اور مناسبت کی دلیل ہے۔

متنا: میم مکسور اور مضموم دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔

فيقول ربنا: ایک نسخے میں ''تبارك و تعالیٰ'' کے الفاظ ہیں۔

انظروا: یعنی غور کرو تاکہ تمہارے لیے ان کا حکم واضح ہو جائے اور ان کے زخموں کو دیکھو۔ اور یہ خطاب فرشتوں سے ہوگا یا جھگڑنے والے فریقین سے ہوگا۔

الى جراحتهم: جیم پر کسرہ ہے اور فتحہ بھی درست ہے

جراحهم: یہ ''جراحة'' کی جمع ہے۔

فانهم منهم و معهم: یعنی حشر میں اور ان کے مقام ومرتبہ میں۔ اگرچہ ان کے مشابہ نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے بستروں پر فوت ہوئے ہیں۔

قد اشبهت جراحهم: اس میں قوت قیاس اور اعتبار کی طرف اشارہ ہے کہ صرف یہاں نہیں بلکہ کہ آخرت میں بھی ہوگا۔
امام میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث کا ایک شاہد عقبہ کی حدیث ہے' وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قال یأتی الشهداء والمتوفون بالطاعون فیقول اصحاب الطاعون: "نحن شهداء": فیقال انظروا' فان کانت جراحهم کجراح الشهداء تسیل دما کریح المسك فهم شهداء فیجد ونهم کذلك۔
"شہداء اور طاعون سے مرنے والے قیامت کے دن حاضر ہونگے اور طاعون والے کہیں گے ہم بھی شہید ہیں، تو کہا جائے گا تم دیکھو اگر ان کے زخم شہداء کے زخموں کی طرح ہیں اور ان سے خون بہہ رہا ہے اور اس سے مشک کی طرح خوشبو آ رہی ہے تو یہ بھی شہید ہیں۔ تو وہ (فرشتے) انہیں ایسے ہی پائیں گے"۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے "کبیر" میں درست سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

طاعون سے بھاگنے کی ممانعت اور جمے رہنے کی فضیلت

۱۵۹۷: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْفَارُّ مِنَ الطَّاعُوْنِ كَالْفَارِّ مِنَ الزَّحْفِ وَالصَّابِرُ فِيْهِ لَهٗ اَجْرُ شَهِيْدٍ - [رواه احمد]

اخرجه احمد في المسند ۳/ ۳۲٤۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے طاعون کی بیماری سے بھاگنے والا ایسا ہے جیسا کہ کفار کی لڑائی سے بھاگنے والا اور اس میں صبر کرنے والے کو شہید کا ثواب ملے گا۔ اس کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: کہا گیا ہے کہ اسے زحف سے شہادت کے اجر کو باطل کرنے میں تشبیہ دی گئی ہے نا کہ کبیرہ گناہ ہونے میں ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں: اسے کبیرہ گناہ کے مرتکب ہونے کی وجہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور زحف بہت بڑے لشکر کو کہتے ہیں جو اپنی کثرت کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے گھسٹ رہا ہو، یعنی رینگ رہا ہو۔ یہ "زحف الصبی" سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب بچہ اپنے جوتڑوں کے بل تھوڑا تھوڑا چلے۔ مصدر کو نام بنا دیا گیا ہے۔

له اجر شهید: خواہ طاعون سے مرے یا نہ مرے۔

تخریج واسنادی حیثیت: امام احمدؒ نے اس حدیث کو سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے' علاوہ ازیں اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ یہ بات میرکؒ نے منذریؒ سے نقل کی ہے۔

بَابُ تَمَنِّی الْمَوْتِ وَذِكْرِهٖ

موت کی آرزو کرنے کے اور اس کو یاد کرنے کا بیان

عرضِ مرتب:

موت کی آرزو کرنا دنیا کی تکلیف کی وجہ سے اور مرض اور محتاجی وغیرھما کی وجہ سے مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ بے صبری کی علامت ہے اور تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہونے کی نشانی ہے' جبکہ محبت الٰہی اور دیدار الٰہی کے شوق کی وجہ سے اور دنیا فانی سے خلاصی اور آخرت کی زندگی سے محبت اور اس کی نعمتوں کو پانے کی خاطر موت کی آرزو کرنا' یہ ایمان اور کمال ایمان کی مثال ہے اور اسی طرح دینی نقصان کے خوف کی وجہ سے یاد کرنا مکروہ نہیں ہے اور موت کو یاد کرنا کنایہ ہے کہ وہ خوفِ الٰہی رکھے اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرے اور توبہ واستغفار کرے اور آخرت کے نفع کو مقدم رکھے۔ ورنہ موت کو بغیر عمل کے یاد کرنا کچھ فائدہ نہیں ہے بلکہ یہ دل کی سختی کا باعث ہے جیسا کہ غفلت کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یاد کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے ہیں۔

الفصل الاول:

موت کی تمنا نہ کرو' نیکیوں کی زیادتی درازیٔ عمر کا باعث ہے

۱۵۹۸: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّزْدَادَ خَيْرًا وَاِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّسْتَعْتِبَ۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۱۲۷۔ حدیث رقم ۵۶۷۳۔ والنسائی فی السنن ۲/۴ حدیث رقم ۱۸۱۸۔ والدارمی ۲/۴۰۳ حدیث رقم ۲۷۵۸۔ واحمد فی المسند ۲/۲۶۳۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے اگر نیک ہے۔ ہوسکتا ہے کہ (درازیٔ عمر کی وجہ سے نیکیوں میں زیادتی کرے) اور اگر بدکار ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہے اور لوگوں کے حقوق ادا کرے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: قوله: لا يتمنى احدكم الموت:

نہی بصورت نفی ہے مبالغہ کے لیے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''لا يتمنى'' میں ''یاء'' حدیث کی کتابوں کے رسم الخط میں ثابت ہے۔ پس ممکن ہے یہ نہی ہو جو خبر کی صورت میں آئی ہے' یا اس سے مراد ''لا يتمنى'' ہے اس کو صیح کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہ ''رفع''

کے ساتھ ہے جیسا کہ کتب حدیث میں ہے۔ چنانچہ یہ ''امر'' کے معنی میں ''خبر'' ہے'' یہ (ان کے) قلم کا سہو ہوا اور درست یوں ہے: یہ ''خبر'' بمعنی ''نہی'' ہے۔

اور ان کا یہ کہنا ''جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ [الواقعة: ۷۹] یہ ایک قول ہے۔

اور ان کا یہ کہنا کہ ''جیسے یہ آیت: اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً [النور: ۳] ''بدکار مرد تو بدکار یا مشرک عورت کے سوا نکاح نہیں کرتا'' رفع کے ساتھ ہے تو یہ قول ضعیف پر مبنی ہے۔

شرح المصابیح میں ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ''لا يتمنين'' نون تاکید کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں نہ نون تاکید ہے اور نہ آخر میں یاء ہے اور بعض میں یاء کے ساتھ بھی۔ اس صورت میں یہ نہی بصیغہ خبر ہے۔ ای لايتمن احد كم الموت من ضر أصابه یعنی تم میں سے کوئی کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی خواہش نہ کرے۔ اور یہ اس لئے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے اور زندگی کے زوال کا مطالبہ اللہ کے حکم پر عدم رضا (کو ظاہر کرتا) ہے۔ اھ۔

اور ''نفی'' بمعنی ''نہی'' زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مؤمن کی شان یہ ہے کہ یہ اس سے منتفی ہے اور اس سے اس کا وقوع بالکل نہیں ہوتا۔

یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ جب مؤمن کو روک دیا جاتا ہے تو وہ رک جاتا ہے چنانچہ اس لیے اس کے بارے میں نفی کے ساتھ خبر دی گئی۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''اگر اس کو خبر محض ہی رہنے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے''۔ تو یہ قول درست نہیں ہے' کیونکہ خبر میں تخلف کا وہم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بکثرت تمنی وغیرہ پائی جاتی ہے اور اس لیے بھی درست نہیں کہ ایسی صورت میں ائمہ کرام کا اس کی کراہت پر استدلال کرنا درست نہیں ہوگا۔

تورپشتیؒ کہتے ہیں: اگرچہ یہاں پر موت کی خواہش کی ممانعت مطلق ہے لیکن اس سے مراد مقید ہے' کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: لايتمنين احدكم الموت من ضر أصابه ''تم میں سے کوئی مصیبت پہنچنے پر موت کی خواہش ہرگز نہ کرے''۔ اور آپ کا فرمان ہے: ''وتوفني اذا كانت الوفاة خيرًا لي'' چنانچہ اس بنا پر اگر آدمی کو جان مال میں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ موت کی تمنا نہ کرے' یہ تمنا مکروہ مکروہ ہے' کیونکہ یہ اللہ کی قضا پر عدم رضا کا اظہار ہے' اور اگر اپنے دین کے فساد کا خوف ہو تو موت کی تمنا کرنا مکروہ نہیں ہے۔

قوله: اما محسنا فلعله ان يزداد خيرا: اما محسنًا: ابن ملکؒ فرماتے ہیں: ہمزہ مکسور ہے۔ یہ اصل میں ''ان ما'' تھا۔ ادغام کر دیا گیا۔ ''ما'' زائدہ فعل محذوف کے عوض میں ہے یعنی اصل میں ''ان كان محسنا'' تھا۔

اور مالکیؒ فرماتے ہیں: تقدیری عبارت یوں تھی: ''اما ان يكون محسنا و اما أن يكون مسيئا'' چنانچہ ''یکون'' اپنے اسم سمیت دو مرتبہ محذوف ہے اور خبر کو باقی رکھا گیا ہے' اور یہ صورت اکثر اوقات ''إن'' اور ''لو'' کے بعد ہوتی ہے۔

زین العربؒ فرماتے ہیں: جیسا کہ آپ کا فرمان ہے: الناس مجزيون باعمالهم ان خيرا فخير وان شرا فشر'' فلعله: ''ان'' شرطیہ کا جواب ہے

ایک حدیث میں ہے: طوبی لمن طال عمرہ وحسن عملہ۔
خوشخبری ہے اس کے لیے جس کی عمر لمبی ہوگئی اور اس کے اعمال اچھے ہوئے۔
اور ایک روایت میں یوں ہے: خیار کم أطولکم أعمارا وأحسنکم أعمالا۔
''تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کی عمریں لمبی ہیں اور اعمال اچھے ہیں۔
پہلی حدیث کو امام طبرانی نے اور ابونعیم نے'' الحلیه'' میں اور دوسری حدیث حاکم نے روایت کی ہے اور ابن حجر کے نقل کردہ ان الفاظ: خیار کم من طال عمرہ و حسن عملہ'' کی کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ حدیثوں میں ''تلفیق'' کی گئی ہے۔ واللہ اعلم

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: یہاں پر ''لعل'' عسی کے معنی میں ہے اور مصابیح کے بعض شارحین نے کہا ہے: کہ معتمد روایت میں ''اما'' کا ہمزہ مکسور اور ''محسنا'' منصوب ہے' اور ہمزہ کو مفتوح اور ''محسن'' کو مرفوع بھی روایت کیا گیا ہے مبتدا محذوف کی صفت کے طور پر اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔

قوله: واما مسیئًا فلعله ان یستعتب: یعنی توبہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کر لے۔ قاضی نے کہا ہے کہ ''استعتاب'' کا معنی ہے ''عتبیٰ کا طلب کرنا'' یعنی ارضاء کو کہتے ہیں: اور ایک قول یہ ہے کہ ''استعتاب'' کا معنی ''ارضاء'' ہے۔

موت کی آرزو کرنا منع ہے

۱۵۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَتَمَنّٰی اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ وَلَا یَدْعُ بِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَهٗ اِنَّهٗ اِذَا مَاتَ انْقَطَعَ اَمَلُهٗ وَاِنَّهٗ لَا یَزِیْدُ الْمُؤْمِنَ عُمْرُهٗ اِلَّا خَیْرًا۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٠٦٥ حدیث رقم (١٣۔ ٢٦٨٢)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے اور نہ ہی موت آنے سے پہلے موت کی دعا کرے۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی (زیادہ نیکی کرنے کی) امید منقطع (ختم) ہو جاتی ہے کیونکہ مؤمن کی زندگی کی زیادتی نیکیوں کے بڑھنے کا باعث بنتی ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: لایتمنی احدکم ـــــ أن یأتیه:

لا یدع: ابن ملک فرماتے ہیں: آپ کا فرمان ''لایدع'' اکثر نسخوں میں حذف واؤ کے ساتھ ہے نہی ہونے کی بنا پر۔ زین العرب نے کہا ہے کہ اس کا عطف نفی پر درست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نفی نہی کے معنی میں ہے' اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ پہلا بھی نہی کا صیغہ ہے اور اس میں دو لغات جمع کی ہیں ایک لغت حرف علت کو حذف کرنے کی ہے اور دوسری لغت حرف علت کو ثابت رکھنے کی۔

قوله: انه اذامات انقطاع عمله: انه: ہمزہ مکسور ہے اور ضمیر شان ہے اور یہ جملہ مستانفہ ہے اس میں تعلیل کا معنی ہے اور ابن حجر کا قول کہ ''اس کا فتحہ تعلیل کے لحاظ سے اور کسرہ استیناف کے لحاظ سے صحیح ہے'' تو اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ان

کے پاس حدیث کے الفاظ ضبط نہیں ہیں۔

طیبی فرماتے ہیں: مسند حمیدی اور جامع الاصول میں (املہ) ہمزہ کے ساتھ ہے اور شرح السنۃ میں عین کے ساتھ (عملہ) ہے۔اھ۔ یہ امام بغوی پر اعتراض ہے۔ چنانچہ ابن حجرؒ کا قول صحیح ثابت نہ ہوا کہ "وفي رواية 'عملة'" اور پھر ان کا یہ کہنا کہ "دونوں قول قریب قریب ہیں" تو یہ بھی درست نہیں ہے دونوں قول ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

قوله: وانه لايزيد المؤمن عمره الاخيرا:

وانه: یہ ضمیر شان ہے۔

عمره: میم پر ضمہ اور سکون دونوں پڑھا جا سکتا ہے۔

اس کی بھلائی میں یہ اضافہ مصیبت پر صبر کرنے' نعمتوں پر شکر کرنے' اور تقدیر پر رضا مندی' اور اپنے آقا کی اطاعت کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

دُنیا کی تکالیف پر موت مانگنے سے ممانعت

۱۷۰۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهُ فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۱۲۸۔ حديث رقم ۵۶۷۱۔ ومسلم في صحيحه ۴/۲۰۶۴ حديث رقم (۱۰۔ ۲۶۸۰) وابوداؤد في السنن ۳/۴۸۰ حديث رقم ۳۱۰۸۔ والترمذي ۳/۳۰۲ حديث رقم ۹۷۱۔ والنسائي ۴/۳ حديث رقم ۱۸۲۱۔ وابن ماجه ۲/۱۴۲۵ حديث رقم ۴۲۶۵۔ واحمد في المسند ۳/۱۰۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ضرر (تکلیف) کی وجہ سے کوئی آدمی مرنے کی تمنا نہ کرے۔ خواہ وہ تکلیف مالی ہو یا بدنی ہو۔ پس اگر اس کو ضرور ہی موت کی آرزو (تمنا) کرنی ہے تو یہ دعا پڑھے: اے اللہ! مجھے زندہ رکھ۔ جب تک میری زندگی بہتر ہو اور مجھے موت دے دے جب موت میرے لئے جینے سے یعنی زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: لا يتمنين احدكم الموت من ضر اصابه:

ضر: ضاد پر پیش ہے اور فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی مالی یا بدنی نقصان کی وجہ سے موت کی آرزو نہ کرے کیونکہ یہ (آرزو کرنا) جزع فزع پر اور عدم رضاء بالقضاء پر دلالت کرتا ہے۔

ضروری اور یقینی طور پر موت کی تمنا کرنے کا ارادہ رکھتا ہی ہو تو مطلق موت طلب نہ کرے بلکہ اسے تسلیم و رضا کے ساتھ مقید کر دے کہ اے اللہ اگر اطاعت معصیت پر غالب ہو اور زمانہ فتنہ و آزمائش سے خالی ہو۔

(و توفني) یعنی مجھے موت دے۔

اذا كانت الوفاة: اور ایک صحیح نسخے میں "اذا كان الوفاة" کے الفاظ ہیں: ای الممات۔

(خیرًا لی) یعنی زندگی سے وہ اس طرح کے معاملہ اس کے الٹ ہو جس کے بارے میں بات گزر چکی ہے اور بعض روایات میں یہ زیادتی ہے: "واجعل الحياة زيادة لی فی كل خير واجعل الموت واحة لی من كل شر"۔

تخریج: امام میرک نے کہا ہے کہ اسے ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

امام نوویؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ جب دین کے خراب ہونے کا خوف ہو تو موت کی تمنا مکروہ نہیں ہے بلکہ انہوں نے اسے مندوب کہا ہے۔ اور امام شافعی اور عمرو بن عبدالعزیز وغیرھما سے نقل کیا ہے کہ "اور اسی طرح اللہ کے راستے میں شہادت کی موت کی تمنا کرنا مندوب ہے کیونکہ سیدنا حضرت عمرؓ وغیرہ سے شہادت کی تمنا کرنا صحیح روایت سے ثابت ہے" بلکہ سیدنا حضرت معاذؓ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے طاعون عمواس میں موت کی تمنا کی تھی اور اسی سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ شہادت کی تمنا کی جا سکتی ہے اگرچہ طاعون والی شہادت ہو اور صحیح مسلم میں روایت ہے: من طلب الشهادة صادقا أعطيها ولو لم تصبه۔ "جس نے صدق دل سے شہادت طلب کی اسے شہادت کا ثواب مل جائے گا' اگرچہ وہ شہید نہ بھی ہو۔"

اسی طرح مدینہ شریف میں مرنے کی خواہش کرنا بھی مندوب ہے کیونکہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللهم ارزقنی شهادة فی سبيلك واجعل موتی ببلا رسولك فقالت بنته حفصة انی يكون هذا ـ فقال: ياتی به الله اذا شاء۔ "اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت کی موت عطا فرما اور میری موت اپنے نبی کے شہر میں نصیب فرما۔ تو ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو آپؓ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ایسا کر دیگا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی کیا کیونکہ آپ کو ایک مجوسی کافر نے قتل کیا۔

نزع کے عالم میں ملاقات کی محبت

۱۶۰۱: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ فَقَالَتْ عَائِشَةُ اَوْبَعْضُ اَزْوَاجِهٖ اِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَكَرَامَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَهٗ فَاَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَاَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا حُضِرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰهِ وَعُقُوْبَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَهُ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَهٗ فَكَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَكَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحيحه ٣٥٧/١١۔ حديث رقم ٦٥٠٧۔ ومسلم فی صحيحه ٢٠٦٥/٤ حديث رقم (٢٦٨٤/١٥) والترمذی فی السنن ٤٨٠/٤ حديث رقم ٢٣٠٩۔ والنسائی ١٠/٤ حديث رقم ١٨٣٨۔ والدارمی ٤٠٢/٢ حديث رقم ٢٧٥٦۔ ومالك فی الموطأ ٢٤٠/١ حديث رقم ٥٠ من كتاب الجنائز واحمد فی المسند ١٠٧/٣۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص اللہ کی ملاقات کو دوست رکھے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو ناخوش رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناخوش رکھتا ہے۔۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کسی نے کہا کہ ہم مرنے کو ناپسند سمجھتے ہیں۔فرمایا ایسا نہیں ہے۔لیکن مؤمن کو جب موت آتی ہے تو اس کو خوشخبری دی جاتی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ عزت عطا فرماتے ہیں۔کوئی چیز دنیا اور زینت دنیا سے پیاری نہیں ہے۔(محبوب نہیں ہے) اس چیز کی بہ نسبت جو اس کے آگے ہے۔یعنی اللہ کے نزدیک مرتبہ اور بزرگی کے۔پس مؤمن اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور تحقیق کافر کو جب موت آتی ہے تو اس کو خدا کے عذاب کی خبر دی جاتی ہے۔یعنی اس کو قبر اور دوزخ کے عذاب کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو اس کے نزدیک (یعنی کافر کے نزدیک) اس سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں ہوتی۔پس کافر اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ اسکی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے یعنی اسکو اپنی رحمت سے اور مزید نعمتوں سے دور کر دیتا ہے۔اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔(متفق علیہ)

تشریح: قولہ: من احب لقاء اکثلہ احب اللہ لقاءہ اشرف فرماتے ہیں: یہاں پر محبت سے مراد وہ محبت ہے جس محبت کا تقاضا ایمان باللہ اور اس کے وعدہ کا یقین کرتا ہے نہ کہ وہ محبت جس کا تقاضا فطرتی حکم کرتا ہے۔اور نہایہ میں ہے: ''کہ اللہ کی ملاقات'' سے مراد ہے آخرت کی راہ کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے انعامات طلب کرنا۔

قولہ: من کرہ لقاء اللّٰہ کرہ اللّٰہ لقاءہ: طیبی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی لقاء سے مراد ''موت'' نہیں ہے کیونکہ ہر شخص موت کو ناپسند کرتا ہے پس جس نے دنیا کو چھوڑ دیا اور اس سے بغض رکھا گویا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کر لیا۔ اور جس نے دنیا کو ترجیح دی اور اس کی طرف میلان کیا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کیا ہے کیونکہ وہ اس تک موت ہی کے ذریعے پہنچ سکتا ہے۔اسی سے واضح ہوتا ہے کہ ''موت'' لقاء کے علاوہ ہے۔لیکن یہ غرض مطلوب کے لاحق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر صبر کیا جائے اور اس کی مشقت کو برداشت کیا جائے تاکہ اس کے بعد فی الفور رب تعالیٰ سے ملاقات ہو جائے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اور یہ اس لیے کہ دنیا میں نہ موت کے وقت اور نہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے اور اس پر اجماع ہے۔

قولہ: و قالت عائشۃ..... لیس ذلك:

فقالت عائشۃؓ او بعض ازواجہ: راوی کو شک ہے۔

ہم سارے بنی آدم طبیعت کی رو سے اور بعد میں جو کچھ ہوگا اس کے خوف کی وجہ سے موت کو ناپسند کرتے ہیں۔

ذالك: کاف پر کسرہ ہے اور ایک نسخے میں اس پر فتحہ ہے یعنی معاملہ ایسے نہیں ہے جیسے تم نے سمجھا ہے اے عائشہ! مؤمن اس لیے موت کو ناپسند نہیں کرتا کہ اسے اس کی شدت کا خوف ہوتا ہے یا وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا، بلکہ اس کراہت سے مراد وہ کراہت موت ہے کہ جب اسے موت کے وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب وعقاب کی خوشخبری دی جاتی ہے تو وہ آخرت پر

دنیا کو ترجیح دیتا ہے اور اس کے عارضی ساز و سامان کی طرف مائل ہوتا ہے۔

قولو: ولكن المؤمن اذا حضره الموت۔۔۔ وأجب الله لقاءة : لكن : مشدد و غیر مشدد دونوں طرح جائز ہے۔

حضره الموت یعنی موت کی علامات یا اس کا وقت یا اس کا فرشتے آتا ہے۔

رضوان: راء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔

وكرامته: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾[فصلت: ٣٠] ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا خوشی مناؤ''۔

فاحب لقاء الله: یعنی وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے۔

واحب الله لقاء ه: اپنی سابقہ ازلی محبت کے ساتھ جو اللہ کے لیے بندے کی محبت کو واجب کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يحبهم و يحبونه۔

قوله: وان الكافر اذا حضر بشر......:

حضر: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے یعنی موت، عذاب کے فرشتے اور انواع عذاب آتی ہیں۔ اور شاید یہاں پر فاعل کو حذف کر کے مجہول کا صیغہ لانا زیادتی تہویل کے لیے ہے تا کہ اس میں مذکورہ غیر مذکورہ تمام چیزیں شامل ہو جائیں۔

بشر: اس میں ''تهكم'' ہے جیسے [فبشرهم بعذاب اليم] میں ہے، یا اس میں مقابلے کے لیے مشاکلہ ہے، یا لغوی معنی مراد ہے یعنی خبر دی جائے گی۔

عقوبة: یہ جہنم میں سخت ترین عذاب ہے۔ اور ابن حجر نے بہت دور کی بات کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اس میں تہویل مزید کے لیے ''اطناب'' ہے یا ان دونوں میں سے ایک سے مراد ''غضب'' ہے اور دوسرے سے مراد ''عذاب'' ہے۔

مما امامه: بمعنی ''قدام'' ہے، یعنی اس کے آگے۔

كره الله لقاء ه: ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب ہے کہ اس کو اللہ کی رحمت اور نعمت وافرہ سے دور کر دیا جاتا ہے۔

توضیح: امام میرکؒ کہتے ہیں: حدیث کا پہلا حصہ ''كره الله لقاء ه'' تک حضرت عبادہؓ سے ''متفق علیہ'' ہے حضرت عبادہ کی حدیث کے اسی حصے کو نسائی اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ''فقالت عائشةؓ ......'' امام بخاریؒ نے عبادہ سے اکیلے روایت کیا ہے۔ ہاں البتہ بخاری اور مسلم میں سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع حدیث ہے: من احب لقاء الله أحب الله لقاء ة ومن كره لقاء ة كره الله لقاء ة فقلت: يا نبي الله اكراهية الموت فكلنا نكره الموت قال ليس كذلك ولكن المؤمن۔ فذكره ''جو اللہ کی لقاء کو پسند کرے گا اللہ اس کی ملاقات کو پسند کرے گا، اور جو اللہ کی ملاقات کو

ناپسند کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند نہیں کرے گا'' (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں) میں نے کہا: کیا اس سے مراد موت کو ناپسند کرنا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم سب تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ مطلب نہیں ہے اور لیکن مؤمن ......'' چنانچہ آپ نے پچھلی بات جیسی بات بیان فرمائی۔ پس اولیٰ یہی تھا کہ مصنف حدیث کے شروع میں ''عن عائشة'' کہتے تا کہ آخر میں ''متفق علیہ'' کہنا بہتر ہو۔

۱۶۰۲: وفی روایة عائشة والموت قبل لقاء اللّٰه۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٠٦٦/٤ حدیث رقم (١٦۔ ٢٦٨٤)۔

ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے: ''اور موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہے۔''

تشریح: (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:) ① یعنی موت سے پہلے رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں ہے بلکہ بعد میں ممکن ہے۔ ② اس سے مراد یہ ہے کہ جو اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے وہ موت کو بھی پسند کرتا ہے۔ کیونکہ اسے موت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہوتی ہے اور موت سے پہلے لقاء کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

اور اس میں اس پر دلالت ہے کہ ''ملاقات'' کا مطلب ''موت'' نہیں ہے۔ اور ابن حجرؒ کی اصل میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''والموت قبل ذالك'' تو یہ خطا ہے ''اصول'' کے خلاف ہے۔

موت انسان کی نجات کا ذریعہ ہے

۱۶۰۳: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرَّ عَلَيْهِ بِجَنَازَةٍ فَقَالَ مُسْتَرِيْحٌ اَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُسْتَرِيْحُ وَالْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ فَقَالَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيْحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَاَذَاهَا اِلٰى رَحْمَةِ اللّٰهِ وَالْعَبْدُ الْفَاجِرُ يَسْتَرِيْحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٦٢/١١ حدیث رقم ٦٥١٢۔ ومسلم فی صحیحه ٦٥٦/٢ حیث رقم (٦١۔ ٩٥٠) والنسائی فی السنن ٤٨/٤ حدیث رقم ١٩٣٠ ومالك فی الموطأ ٢٤١/١ حدیث رقم ٥٤ من كتاب الجنائز واحمد فی المسند ٢٩٦/٥۔

ترجمہ: حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنازہ لایا گیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: راحت پانے والا ہے۔ یا اوروں (یعنی دوسروں) کو اس سے راحت ہوئی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! راحت پانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جس سے دوسروں کو راحت ہوئی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مؤمن بندہ مرنے کی وجہ سے دنیا کے غم اور تکلیفوں سے راحت پاتا ہے اور اللہ کی رحمت میں داخل ہو جاتا ہے اور فاجر بندہ یعنی گنہگار اس سے بندے، شہر اور درخت اور تمام جانور اس کے شر سے راحت پاتے ہیں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: مرعلیه بجنازة ۔۔۔ والمستراح منه: مر: مجہول کا صیغہ ہے۔

بجنازۃ۔ صاحب کشافؒ نے کہا ہے جیم پر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔

فقال: مستریح: یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔) یعنی هو مستریح ۔

اومستراح منه: "او" تنویع یا تردید کے لیے ہے اور ابن حجر نے صرف تنویع کے لیے ہونا بیان ہے۔ یعنی میت ان دو اقسام سے خالی نہیں، پس اگر "او" تنویع کے لئے ہو تو اسطرادًا جنس میت مراد ہوگی اور اگر تردید کے لیے ہو تو اس سے حاضر شخص مراد ہوگا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: استراح الرجل و اراح۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب آدمی تھکنے کے بعد آرام حاصل کرے۔

فقالوا: یا رسول اللّٰه ما المستراح؟ وما المستراح منه؟: ای مامعنا ھا؟ یعنی ان دونوں کا کیا مطلب "ما" بمعنی "من" ہے۔ یعنی "مستراح" اور "مستراح منہ" کون ہے؟

قوله: فقال: العبد المؤمن یستریح۔۔۔ الی رحمة اللّٰه: یعنی مؤمن بندہ موت کے ذریعے سکون حاصل کر لیتا ہے۔

من نصب الدنیا: یعنی دنیا کے اعمال تکلیفہ فطری اور تقدیری حالات کے تعب سے۔

و اذاھا: سردی گرمی کی تکلیف سے یا اھل دنیا تکلیف سے۔

الی رحمت اللّٰه: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے۔) ای ذاھبا وواصلا الیھا۔ (یعنی اس تک پہنچتے ہوئے۔

مسروقؒ فرماتے ہیں: ما غبطت شیئا بشئی کمؤمن فی لحده، امن من عذاب اللّٰه واستراح من الدنیا: میں نے اتنا رشک کسی پر نہیں کیا جتنا میں نے ایک لحد میں پڑے مؤمن پر کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون ہو گیا اور دنیا سے راحت حاصل کر گیا۔

سیدنا حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں: أحب الموت اشتیا قا الی ربی ،وأحب المرض تکفیرا لخطیتی و أحب الفقر تواضعا لربی۔ میں اپنے رب کی ملاقات کے شوق کے لیے موت کو پسند کرتا ہوں اور بیماری کو اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے اور فقیری کو اللہ کے ہاں عاجزی اور مسکنت کے لیے پسند کرتا ہوں۔

قوله: والعبد الفاجر...... : یہ کافر سے زیادہ عام ہے۔

یہ راحت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ جب وہ کوئی غلط کام کرتا ہے تو اگر لوگ اسے روکتے ہیں تو وہ انہیں تکلیف دیتا ہے اور ان سے دشمنی رکھتا ہے اور اگر لوگ خاموش رہے تو یہ بات ان کے دین و دنیا کے لیے مضر ہے۔

والبلاد: یعنی عمارتیں اور کھلے میدان۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: بلاد واشجار راحت پاتے ہیں، کیونکہ اس (نافرمان) کے چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ موسلا دھار بارش برساتا ہے اور اس سے زمین زندہ کرتا ہے جبکہ پہلے اس کی نحوست کی وجہ سے رکی ہوتی ہیں اور حضرت انسؓ کی حدیث ہے [قوله: ان الحباری لتموت هزلا بذنب ابن آدم۔ کہ "حباری پرندہ ابن آدم کی گناہوں کی نحوست کی وجہ سے مرجاتا ہے۔" اور "حباری" کو اس لیے خاص کیا ہے کہ یہ رزق کی تلاش میں سب پرندوں سے زیادہ دور نکلتا ہے۔ یہ پرندہ بصرہ میں ذبح کیا جاتا ہے اور اس کے پوٹے میں سبز رنگ کے دانے پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ بصرہ اور اس اور سبز دانے کے اگنے کی جگہ کے درمیان کئی

دن کی مسافت کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ حیوانات گناہ گاروں کو لعنت کرتے ہیں کیونکہ ان کے گناہوں کی نحوست سے بارش بند ہو جاتی ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اسے نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

دُنیا میں ایسے رہو......

۱۶۰۴ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِي فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُوْلُ اِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ ۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۲۹/۱۱۔ حديث رقم ۶۴۱۴۔ والترمذی فی السنن ۴۹۰/۴ حديث رقم ۲۳۳۳۔ وابن ماجه ۱۳۷۸/۲ حديث رقم ۴۱۱۴۔ واحمد فی المسند ۲۴/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا کندھا (مونڈھا) اہتمام وآگاہ کرنے کے لئے پکڑا اور پھر فرمایا تو دنیا میں ایسے ہو جا جیسے مسافر ہے بلکہ راہ گزر یعنی راستے کو عبور کرنے والا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کر اور جب تو صبح کرے تو شام کا انتظار نہ کر اور اپنی تندرستی کو۔ اپنی بیماری سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت جان۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اخذ رسول اللہ بمنکبي: ایک نسخے میں یاء مشدد ہے۔ اور کندھے کو پکڑنا توجہ دلانے اور تنبیہ کرنے کے لیے تھا۔

قولہ: فقال: کن في الدنیا کانك غریب: یعنی دنیا کی طرف مائل نہ ہو' کیونکہ تو آخرت کا مسافر ہے اس لیے تو اس کو وطن نہ بنا اور اس دنیا کی لذتوں سے مالوف نہ ہو' لوگوں سے اور ان کے ساتھ مخالطت سے دور رہ کیونکہ تو انہیں ایک دن چھوڑ کر جانے والا ہے اور تو اپنے کام سے کام رکھ' دنیا میں ہمیشہ رہنے کے خیالات ترک کر دے' تو ان چیزوں سے تعلق نہ رکھ جن سے ایک مسافر پردیس میں تعلق نہیں رکھتا' اور اس میں مشغول نہ ہو جس میں وہ مسافر مشغول نہیں ہوتا جو اپنے اہل وعیال اور وطن جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اور رہی وہ حدیث کہ جس میں ہے: حب الوطن من الایمان کہ ''وطن کی محبت ایمان ہے'' تو یہ موضوع ہے اگرچہ اس حدیث کا معنی صحیح ہے' خاص طور پر جب اس کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ وطن سے مراد جنت ہے کیونکہ یہی پہلا مسکن ہے۔

او عابر سبیل: '' او'' اختیار اور اباحت کے لیے ہے اور احسن یہ ہے کہ یہ ''بل'' کے معنی میں ہو۔ آپ ؐ نے ''عبادت گزار سالک'' کو اس ''اجنبی'' سے تشبیہ دی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو پھر آپ نے ترقی اور اضراب کرتے ہوئے ''عابر سبیل'' فرمایا کیونکہ مسافر تو بسا اوقات پردیس میں سکونت اختیار کر لیتا ہے اور مقیم بھی ہو جاتا ہے برخلاف ''عابر سبیل'' کے جو اپنے دور دراز وطن کا ارادہ رکھتا ہو۔

قوله: اذا امسیت فلاتنتظر الصباح واذا اصبحت فلا تنتظر المساء:
یعنی صبح شام تیری موت تیرے سامنے ہو' تیری خواہشات کو مختصر کرنے والی ہو' تجھے اچھا عمل کرنے پر اکسانے والی ہو' رات کے کام کو دن تک اور دن کے کام کو رات تک مؤخر کرنے والی نہ ہو' اور ظاہر یہی ہے کہ یہ اور اس کا مابعد کلام ابن عمر کا ہے لیکن احیاء میں اسے بطریق مرفوع ذکر کیا ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: اور ایک دوسری روایت میں آپ سے یہ الفاظ مروی ہیں: "عد نفسك من اهل القبور" اس کا بھی یہی مطلب ہے۔اھ۔ان کے ظاہر کلام سے لگتا ہے کہ "وعد نفسك" کے الفاظ موقوف ہیں لیکن یہ بات درست نہیں ہے' کیونکہ امام سیوطی نے الجامع الصغیر میں کہا ہے: "کن فی الدنیا کانك غریب او عابر سبیل" ان الفاظ کو امام بخاریؒ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے' اور احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ زیادتی نقل کی ہے: "وعد نفسك من اهل القبور"۔

قوله: وخذ من صحتك لمرضك:
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی تیری عمر دو چیزوں بیماری سے یا صحت سے سے خالی نہیں ہوگی، چنانچہ اپنی صحت (کے زمانہ) میں اپنے اصلی مقصد کی طرف دھیان دے اور اسی پر قناعت نہ کر بلکہ اس سے زیادہ کمالے کہ ہوسکتا ہے بعد میں بیماری کی وجہ سے تجھ میں فتور آ جائے۔

ومن حیاتك لموتك: اس میں اشارہ ہے موت کا حصہ لینے کی طرف' اور بیماری کی وجہ سے ہونے والے فتور کی طرف یعنی بیماری میں مکمل طور پر بیٹھ نہ جا۔ بلکہ تجھ سے جتنا ہوسکے بیماری کی حالت میں بھی کوشش کرتا رہ' یہاں تک کہ تو اللہ سے ملاقات کرلے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذی اور امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان رکھنا

۱۶۰۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ مَوْتِهٖ بِثَلَاثَةِ اَيَّامٍ يَقُوْلُ لَا يَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۲۰۵/٤ حدیث رقم (۸۱۔ ۲۸۷۷)۔ وابوداوٗد فی السنن ۴۸٤/۳ حدیث رقم ۳۱۱۳۔ وابن ماجه ۱۳۹۵/۲ حدیث رقم ٤۱٦۷۔ واحمد فی المسند ۲۹۳/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کی وفات سے تین دن پہلے سنا۔ نہ مرے تم میں سے کوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان رکھتے ہوئے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: سمعت رسول اللّٰه ﷺ قبل موته ثلاثة ایام: ان الفاظ سے راوی کے کمال ضبط کا پتہ چلتا ہے احکام قوله: لا یموتن احدکم الا وهو یحسن الظن باللّٰه ای لایموتن احد کم فی حال من الاحوال الافی هذه الحالة وهی حسن الظن باللّٰه ان یغفر: یعنی تم میں سے کوئی کسی حال میں نہ مرے صرف اس حال میں مرے کہ وہ

اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو یعنی یہ گمان رکھے کہ اسے معاف کر دیا جائے گا"۔

نہی اگرچہ بہ ظاہر موت کے بارے میں ہے حالانکہ یہ آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن حقیقت میں اس حالت سے نہی ہے جس حالت میں برے اعمال کی وجہ سے امیدیں ختم ہو جاتی ہیں' تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے ایسی حالت میں موت آ جائے۔

اور حدیث میں ایسے اعمالِ صالحہ پر ابھارا گیا ہے جن سے حسن ظن پیدا ہوتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ انسان کو عفو کی امید رکھنی چاہیے اور اللہ کی رحمت کا یقین ہونا چاہئے۔ اور حدیث صحیح میں ہے: قوله: أنا عند ظن عبدي هي 'فلا يظن بي الا خيرا۔ "میں بندے سے وہی سلوک کرتا ہوں جو وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ اس لیے اسے میرے بارے میں اچھا گمان رکھنا چاہیے۔"

اور ایک روایت میں ہے: قوله: فليظن بي ماشاء۔ "تو اب اس کی مرضی ہے کہ وہ میرے بارے میں جیسا گمان رکھے۔"

امام نووی فرماتے ہیں: میں نے خوف و رجاء کے بارے میں صحیح احادیث کو تلاش کیا ہے تو میں نے رجاء کی احادیث خوف کی احادیث سے کئی گناہ پائی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ خوف والی احادیث میں بھی رجاء کا بھی ذکر ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر صرف ایک ہی حدیث ہوتی: (یعنی یہ سبقت او غلبت رحمتي على غضبي" تو اس بات کی دلیل کافی تھی کہ رجاء کو خوف پر ترجیح ہے' اور اسی کی تائید اس آیات سے ہوتی ہے: رحمتي وسعت كل شيئ۔

بلکہ یہ تو عالم وجود میں عام مشاہدہ ہے کہ خوف کے آثار پر امید کے آثار غالب نظر آتے ہیں۔ اور صوفیوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امید کی بنیاد پر عبادت کرنا خوف سے عبادت کرنے سے افضل ہے' اور پہلی (یعنی امید بنیاد پر عبادت) یہ آزاد لوگ کی عبادت ہے اور دوسری (وجہ سے عبادت کرنا) غلاموں کی طاعت ہے۔ اسی لیے تو آپ نے فرمایا تھا: أفلاأكون عبدا شكورا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اب آپ اپنے اعمال اچھے کر لو تاکہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہارا اچھا گمان ہو' کیونکہ موت سے پہلے جس کے اعمال برے ہوتے ہیں' موت کے وقت اس کا اللہ کے بارے میں گمان اچھا نہیں ہوتا۔

اشرفؒ کہتے ہیں: خوف اور رجاء دو پروں کے مثل ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف (لے کر) اُڑ رہے ہیں۔ لیکن صحت میں خوف کو غالب ہونا چاہیے تاکہ اعمال صالحہ میں خوب محنت کرے' اور جب اس کی موت (کا وقت قریب) آئے اور عمل کا سلسلہ ختم ہو جائے تو اس وقت رجاء کو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کو غالب ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت اس کی روانگی شہنشاہ و مہربان رؤف ورحیم ذات کی طرف ہوتی ہے۔

الفصل الثانی:

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے قیامت کے دن ملاقات کے بارے میں سوال

۱۶۰۶: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شِئْتُمْ اَنْبَأْتُكُمْ مَا اَوَّلُ مَا يَقُوْلُ اللّٰهُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَا اَوَّلُ مَايَقُوْلُوْنَ لَهُ قُلْنَا نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ هَلْ اَحْبَبْتُمْ لِقَائِيْ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ يَا رَبَّنَا فَيَقُوْلُ لِمَ فَيَقُوْلُوْنَ رَجَوْنَا عَفْوَكَ وَمَغْفِرَتَكَ فَيَقُوْلُ قَدْ وَجَبَتْ لَكُمْ مَغْفِرَتِيْ۔ [رواه فی شرح السنه وابو نعيم فی الحلية]

اخرجه احمد فی المسند ۲۳۸/۵۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم چاہو تو میں تم کو خبر دوں اس چیز کی کہ سب سے پہلے اللہ قیامت کے دن لوگوں سے کیا فرمائے گا اور اس چیز کی کہ مؤمن اللہ رب العزت کو کیا کہیں گے۔ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! جی ہاں بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تحقیق اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو فرمائیں گے کہ کیا تم میری ملاقات کو دوست رکھتے تھے؟ کہیں گے ہاں اے ہمارے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے میری ملاقات کو کیوں پسند کیا؟ وہ کہیں گے۔ ہم آپ سے درگزر کرنے کی امید رکھتے تھے اور آپ سے بخشش کی امید رکھتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری بخشش تمہارے لیے ثابت ہو چکی ہے اس کو شرح السنہ میں نقل کیا ہے اور ابونعیم نے حلیہ میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: وعن معاذ بن جبلؓ قال قال رسول الله ﷺ ان الله شئتم انبأتكم: یعنی تمہیں خبر دوں۔ یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑ دی ہے کیونکہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جس کا جاننا واجب ہو اور اس لیے بھی کہ وہ آپ کی بات کو سننے کے لیے متوجہ ہوں۔

(ما اول ما يقول الله) کونسی پہلی بات ہے۔ پہلا ما استفہامیہ اور دوسرا موصولہ ہے۔

(للمؤمنين) بغیر واسطے کے یا فرشتے اور رسول کے واسطے سے۔

(يوم القيامة وما اول ما يقولون) یعنی مؤمن لوگ۔

(له) یعنی اللہ تعالیٰ سے۔

قلنا نعم يا رسول الله: یہ کلام کی طرف مکمل توجہ کے لیے ایک تمہید ہے تاکہ مکمل ادراک حاصل ہو۔

(قال: ان الله يقول للمؤمنين: هل احببتم لقائى؟) ہوسکتا ہے لقاء سے مراد آخرت کا گھر ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھے اور دیدار کے معنی میں ہو اور یہ دونوں قول اور معانی درست ہیں۔ یہ بات ابہریؒ نے کہی ہے اور دوسرے معنی میں کچھ کلام ہے۔

(فيقولون نعم يا ربنا) اس میں اللہ تعالیٰ کے کسی مہربانی اور ر... کو مزید مانگنا ہے۔

(فيقول لم؟) ابن ملک فرماتے ہیں: یعنی تم نے ... جوں میں گناہ کیا ہے؟ اور صحیح یہ ہے کہ تم نے میری ملاقات کو کیوں

پسند کیا ہے۔

(فيقولون رجونا عفوك و مغفرتك) اس میں دلیل ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمان اچھا ہوتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کے لقاء کو پسند کرتا ہے اور شاید استفہام کی حکمت باوجود یکہ اللہ تعالیٰ ان کے باطن کو بھی جاننے والا ہے۔ یہ ہے کہ سننے والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کس بنا پر اللہ تعالیٰ کی لقاء کو پسند کرتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: (اولم تومن قال بلى) یا اس سے مراد زیادتی انبساط ہے اور وسیع پیمانے پر اپنے رب کے کلام کو سن کر لطف ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى﴾ [طٰہٰ:۱۷] ''اور موسیٰ یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟''

فيقول: قدوجبت لكم مغفرتي: یعنی ثابت ہو چکی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ہے (انا عند ظن عبدى بى فليظن بى ماشاء) اسے طبرانی اور حاکم نے واثلہؓ سے روایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اذا احب عبدى لقائى احببت لقاء ه واذا كره لقائى كرهت لقائما۔

اسے امام مالک، بخاری، ترمذی نے ابو ہریرۃؓ سے روایت کیا ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لقاء سے محبت اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ یہ معنی نہیں ہے کہ یہ اس کا سبب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اسی طرح اس کراہت کا حکم جس کا معنی عدم رضا ہے۔ بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے (رضى الله عنهم و رضوا عنه)

اور منذری نے کہا: اسے احمدؒ نے عبداللہ بن زجر کے طریق سے روایت کیا ہے۔ میرک نے کہا ہے: کہ اس میں اختلاف ہے، اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ کبیر میں روایت کیا ہے اور تصحیح میں بھی اسی طرح ہے۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

۱۶۰۷: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ۔

[رواه الترمذى والنسائى وابن ماجه]

اخرجه الترمذى فى السنن ٤٧٩/٤ حديث رقم ٢٣٠٧۔ والنسائى ٤/٤ حديث رقم ١٨٢٤۔ وابن ماجه ١٤٢٢/٢ حديث رقم ٤٢٥٨۔ واحمد فى المسند ٢٩٣/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ اس کو امام ترمذی' نسائی اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: هاذم اللذات: ذال کے ساتھ یعنی لذات کو کاٹنے والی اور ایک نسخے میں هادم کے الفاظ ہیں۔ میرک نے کہا: طیبی نے دال کو صحیح کہا ہے۔ کیونکہ انہوں نے کہا: فانی لذات اور عارضی خواہشات کو تشبیہ دی گئی ہے ان چیزوں کے زوال کو بلند عمارت جو خطرناک زلزلوں کی وجہ سے گر جاتی ہے، سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر ان لذات میں منہمک ہونے والے کو حکم دیا ہے هادم کو یاد کرنے کا تاکہ وہ ان کی طرف مائل نہ ہو۔ اور ان واجبات سے غافل نہ ہو جو اس پر آخرت کی تیاری کے لیے

لازمی ہیں اور اس بارے میں زین العابدین نے اشعار کہے ہیں۔

اے دنیا کو آباد کرنے والے اور اس کے لیے کوشش کرنے والے اور حادثات زمانہ سے بے خوف انسان! کیا تو جانتا ہے کہ اگر تو نے غفلت کی تو کس کس کو چیلنج کر رہا ہے؟ نہ یہ دنیا پوری ملے گی اور نہ یہ آباد ہوگی۔ آخر تک۔

لیکن اسنوی نے مہمات میں کہا ہے: ھاذم (ذال کے ساتھ) کا معنی ہے قطع کرنے والا، یہی بات جوہری نے بھی کہی ہے اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے اور روض الانف میں امام سہیلی نے وضاحت کی ہے کہ روایت کے الفاظ ذال کے ساتھ ہیں۔ یہ بات انہوں نے غزوۂ احد کے باب میں وحشی کے حمزہؓ کو قتل کرنے کی بحث میں ذکر کی ہے اور شیخ جزری نے کہا ہے: ہادم دال کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اس کا معنی ہے دفع کرنے اور نکالنے والا اور ذال کے ساتھ کا معنی ہے قطع کرنے والا اور اسی معنی کو ہمارے بعض مشائخ نے پسند کیا ہے اور یہ وہی معنی ہے کہ امام خطابی نے صرف اسی کو ہی درست کہا ہے اور انہوں نے پہلے معنی کو راوی کی غلطی کہا ہے۔ واللہ اعلم

(الموت) عطف بیان ہونے کی وجہ سے مجرور ہے اور مرفوع اس بنا پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور مبتدا محذوف "هُوَ" ہے۔ اور منصوب ہے اعنی کو مقدر مان کر۔ یعنی اسے یاد کرو اور بھلاؤ نہیں کہ قیامت سے غافل ہو جاؤ گے اور آخرت کے زادراہ کو غفلت کی بنا پر مت چھوڑو اور زیادہ کیا ہے۔

اور ترمذی نے کہا یہ روایت حسن غریب ہے۔ طبرانی نے اوسط میں حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں: فانه ماذكره احد في ضيق الا وسعه ولا ذكره في سعة الاضيقها عليه۔ "کوئی بھی آدمی اسے تنگی میں یاد نہیں کرتا مگر اس کے لیے وسعت کر رہی ہے اور کوئی آدمی اسے وسعت میں یاد نہیں کرتا مگر وہ اس پر تنگ کر دیتی ہے"۔ (ذکرہ میرک)

اور ایک صحیح روایت میں ہے: یارسول الله من أكيس الناس 'واحزم الناس؟ فقال اكثرهم ذكرًا اللموت واستعد ادا للموت اولئك الا كياس ذهبوا بشرف الدنيا و كرامة الاخرة۔ "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اللہ کے رسول! سب سے زیادہ سمجھدار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: جو موت کو زیادہ کرتا ہے اور موت کی زیادہ سے زیادہ تیاری کرتا ہے یہی لوگ ہیں سمجھدار۔ انہوں نے دنیا و آخرت کی عزتیں حاصل کر لی ہے۔"

حقیقتِ حیا

۱۶۰۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ لِاَصْحَابِهِ اسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ قَالُوْا اِنَّا نَسْتَحْيِيْ مِنَ اللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ وَلٰكِنْ مَنِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ فَلْيَحْفَظِ الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى وَلْيَحْفَظِ الْبَطْنَ وَمَا حَوٰى وَلْيَذْكُرِ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِيْنَةَ الدُّنْيَا فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ۔

[رواه الترمذي وقال هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٥٥٠ حدیث رقم ٢٤٥٧۔ واحمد فی المسند ٣٨٧/١۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے صحابہ کو ارشاد فرمایا کہ اللہ سے حیا کرو جیسے حیا کا حق ہے۔ یعنی جس طرح واجب اور لائق ہے اور اللہ سے ڈرو جیسے ڈرنے کا حق ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہم اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں اے اللہ کے نبی! ہم اللہ کے اوامر ونواہی بجالاتے ہیں اور تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ صرف کہنے سے حیا نہیں ہوتی کہ ہم حیا کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے صحیح حیا کا حق یہ ہے کہ سر اور سرین کی حفاظت کرے اور چاہیے کہ پیٹ کی حفاظت کرے اور جو پیٹ نے جمع کیا ہے اور چاہیے کہ وہ یاد کرے موت اور ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کو اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرتا ہے' اس کو چاہیے کہ وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے۔ پس تحقیق جس نے یہ مذکورہ کام کیا۔ اس نے اللہ سے حیا کی جیسے کہ حیا کرنے کا حق ہے۔ اس کو امام احمد نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: عن ابن مسعود ان : اور ایک نسخے میں '' قال ان'' کے الفاظ ہیں۔

ذات یوم: کہا گیا ہے کہ ''ذات'' زائد ہے اور ایک قول کہ یہ ''مدت'' کی صفت ہے اور ایک قول ہے کہ یہ مؤکدہ ہے جیسے ''ذات زید'' بولتے ہیں۔ مطلق زمانے کے ارادے کے وہم کو دور کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔''

قوله: قالوا انا نستحيي من الله: انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم حق ادا کرتے ہیں۔ اس میں اپنی عاجزی کا اعتراف ہے۔

یا نبی الله : یعنی آپ اس بات کو جانتے بھی ہیں۔ اللہ کی اس توفیق پر اللہ کا شکر ہے۔

قوله: قال ليس ذاك: یعنی حیاء کا حق ادا کرنا یہ نہیں ہے کہ اس طرح کہہ دو کہ ہم حیاء کرتے ہیں۔'' ذلك'' کی بجائے ''ذلکم'' کہنا چاہیے تھا۔ گویا کہ آپؐ نے انہیں بمنزلہ مفرد کے رکھا اس چیز میں جس میں ان کے لئے اتحاد ضروری ہے۔ قوله: لكنمن استحيى من الله حق الحيا۔۔۔وما حوى:

الحیا: اس کی اصل ہمزہ (کے ساتھ) ہے لیکن وقف کی بنا پر تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کر دیا گیا' اور سجع کی رعایت کے لیے یہی مناسب تھا۔

قوله: فليحفظ الرأس وما وعى: یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے علاوہ میں استعمال نہ کیا جائے۔ (مثلاً) کسی بت کو سجدہ نہ کرے یا کسی کی تعظیم کے لیے نہ جھکائے اور ریا کاری کے طور پر نماز نہ پڑھے' اور غیر اللہ کے سامنے نہ جھکائے اور نہ تکبر کی وجہ سے سر اوپر کو اُٹھائے۔

وما وعى: ای جمعه الرأس ،یعنی زبان' آنکھوں اور کان کو ممنوعہ چیزوں کے لیے استعمال نہ کرے۔

قوله: وليحفظ البطن وماحوى: پیٹ کی حفاظت یہ ہے کہ حرام کھانے سے بچے۔

''وما حوى: وہ اشیاء ہیں جو پیٹ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جیسے شرمگاہ، ٹانگیں' ہاتھ اور دل۔ کیونکہ یہ اعضاء پیٹ کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔

اوران کی حفاظت یہ ہے کہ انہیں معاصی میں استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں استعمال کیا جائے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اللہ تعالیٰ سے حیاء کا حق وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو' بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کا حق یہ ہے کہ اپنے نفس' تمام اعضاء وجوارح کو ان تمام چیزوں سے بچائے جنہیں اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ اور سر کے متعلقات سے مراد حواس ظاہرہ و باطنہ سمع' بصر اور زبان ہیں' کہ ان کی اس قدر حفاظت کی جائے کہ یہ حلال امور کے علاوہ میں استعمال ہی نہ ہوں۔ اور بطن اور اس کے متعلقات کو محفوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صرف حلال ہی داخل کرے۔

قوله: وليذكر الموت والبلى:

البلى: باء پر کسرہ ہے "بلى الشئ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے چیز کا بوسیدہ اور چورا چورا ہو جانا۔

یعنی وہ اس وقت کو یاد کرے جب قبر میں اس کی ہڈیاں بوسیدہ وریزہ ہو جائیں گی۔

قوله: ومن اراد الآخرة ترك زينة الدنيا: کیونکہ یہ دونوں مکمل طور پر ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ قوی ایمان والوں کے بھی (کامل طور پر ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں)۔

امام نوویؒ بعض اکابر سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں اس حدیث کو کثرت سے یاد کرنا مستحب ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی کے قریب قریب وہ حدیث ہے جسے حسن سند کے ساتھ امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے: أنه صلی اللہ علیہ وسلم أبصر جماعة يحفرون ضيرا فبكى حتى بل التراب بدموعه وقال: اخوانى لمثل هذا فاعدّوا۔ "آپ نے ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ قبر کھود رہے تھے تو آپ رو پڑے اور اتنا روئے کہ مٹی آپؐ کے آنسوؤں سے تر ہو گئی اور پھر فرمایا: میرے بھائیو! اسی جیسی چیز کے لیے تیاری کرو۔"

مؤمن کے لیے موت باعث نعمت ہے

۱۶۰۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ۔

(رواه البيهقى فى شعب الايمان)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۱۷۱/۷ حديث رقم ۹۸۸۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ موت مؤمن کا تحفہ ہے اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

"عمرو" واؤ کے ساتھ ہے۔

تشریح: تحفة المؤمن الموت: کیونکہ موت ہمیشہ کی سعادتوں کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ ہے اور محفل انس و محبت تک پہنچنے کا سبب ہے۔ چنانچہ نظر اپنے انجام کی طرف متوجہ ہے اور اپنے آغاز یعنی فناء زوال' ریزہ ریزہ ہونے اور بوسیدہ ہونے سے اعراض کئے ہوئے ہے۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ اعتبار روح کی روح کا ہے' اور جسم روح کے لیے ایک قید خانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

نہایہ میں ہے: "تحفہ" عمدہ پھل کو کہتے ہیں' اور حاء پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے پھر یہ پھلوں کے تحائف کے علاوہ میں بھی استعمال

ہونے لگا۔ازہری فرماتے ہیں: اس کی اصل "وحفة" ہے'واؤ کوتاء سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ بات طیبیؒ نے ذکر کی ہے۔
اور قاموس میں ہے: "التحفة" ضمہ کے ساتھ "طرفة" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع "تحف" آتی ہے۔
کہا جاتا ہے: "وقد اتحفه تحفة" یا پھر اس کی اصل "وحفة" ہے۔

اسنادی حیثیت و تخریج: امام طبرانیؒ نے اپنی معجم کبیر میں جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ بات میرکؒ نے منذریؒ سے نقل کی ہے۔

موت کے وقت پیشانی پر پسینہ آنا مؤمن کے لیے رحمت ہے

۱۶۱۰: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُوْمِنُ يَمُوْتُ بِعَرَقِ الْجَبِيْنِ.

[رواه الترمذی النسائی وابن ماجة]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۱۰/۳ حدیث رقم ۹۸۲۔ والنسائی ۶/۴ حدیث رقم ۱۸۲۹ وابن ماجه ۴۶۷/۱ حدیث رقم ۱۴۵۲۔ واحمد فی المسند ۳۵۷/۵۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ مؤمن کو پیشانی کے پسینے کے ساتھ موت آتی ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ' ابن ماجہ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: المؤمن یموت بعرق الجبین: اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں

① کہا گیا ہے کہ یہ موت کی سختی سے کنایہ ہے۔

② ایک قول یہ ہے کہ یہ موت کے وقت خیر کی علامت ہوتی ہے۔

③ ابن ملکؒ فرماتے ہیں: مؤمن پر موت سخت ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پیشانی سے پسینہ خارج ہونے لگ جاتا ہے اور یہ (یعنی موت کا سخت ہونا) اس کے گناہوں کو مٹانے کے لیے ہوتا ہے یا اس کے درجات کی بلندی کے لیے ہوتا ہے۔

④ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس میں دو صورتیں ہیں:

(ا) پہلی صورت یہ ہے کہ مؤمن موت کی سختی کو برداشت کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی پیشانی پر پسینہ اتر آتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مؤمن کے طلب حلال کی مشقت اور اسی طرح صوم وصلوٰۃ کی مشکل کو برداشت کرنے سے کنایہ ہے۔ پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔

اسنادی حیثیت: میرکؒ نے نقل کیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت حسن ہے۔

تخریج: اسے امام حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے شیخین کی شرط پر اور امام ذہبیؒ نے اسے برقرار رکھا ہے۔

۱۶۱۱: وَعَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَوْتُ الْفُجَاءَ ةِ اَخْذَةُ الْاَسَفِ۔ [رواه ابو داود وزاد البیهقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابه اخذة الا سف للکافرورحمة للمو من]

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۴۸۱/۳ حدیث رقم ۳۱۱۰ واحمد فی المسند ۴۲۴/۳۔

ترجمہ: حضرت عبید اللہ بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ناگہانی (اچانک) مرنا غضب کی پکڑ (یعنی غصے سے پکڑنا) ہے اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں اور رزین نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ غضب کا پکڑنا کافر کے لیے ہے اور مؤمن کے لیے رحمت ہے۔

تشریح: وعن عبيد الله: صحیح نسخے میں تصغیر کے ساتھ ہے اور ایک نسخے میں "عبداللہ" ہے اور امام میرکؒ نے اپنی کتاب کے حاشیے میں لکھا ہے: صحیح یہ ہے کہ ان کا نام "عبید بن خالد" تھا اور مصنفؒ نے اسماء رجال میں عبداللہ بن خالد سلمی مہاجری کا تذکرہ کیا ہے۔ جو کوفہ کا رہنے والا تھا اور تابعین کی ایک جماعت نے اس سے روایت کی ہے۔ اور مغنی میں "عبید بن خالد" کو درست کہا گیا ہے اور بعض کا کہنا کہ "یہ عبدۃ بن خالد" ہیں۔

الفجاءة: فاء کے ضمہ اور مد کے ساتھ ہے۔ علاوہ ازیں فاء کے فتحہ اور جیم کے سکوں کے ساتھ بالقصر بھی پڑھا گیا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: مد اور قصر کے ساتھ "فجئه الأمر" کا مصدر ہے یعنی جب کوئی چیز اچانک واقع ہو جائے اور اسی سے فعل فتحہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔

نہایہ میں ہے "فجئه الامر فجاءة" ضمہ اور مد کے ساتھ اور "فجاءة" فتحہ اور جزم کے ساتھ بغیر مد کے "فاجاء مفاجأة" یہ اس وقت بولتے ہیں جب اچانک آ جائے بغیر کسی پیشگی سبب کے۔

اور قاموس میں ہے: "فجئه" سمع اور منع کی طرح ہے فجأ و فجاءة۔ اى هجم عليه (غفلت کی حالت میں اچانک آنا) کسی پر دھاوا بولنا۔

اور ابن حجرؒ نے فاء کے ضمہ کے ساتھ بغیر مد کے پڑھنے کا کہا ہے۔ لیکن اس کی لغت میں کوئی اصل نہیں ہے اور یہ روایت کے بھی مخالف ہے۔

"موت" "قتل" کو بھی شامل ہے سوائے "شہادت" کے۔

اخذة الأسف: سین پر فتحہ بھی پڑھا گیا ہے اور کسرہ بھی پڑھا گیا ہے۔ قاموس میں ہے: "اسف" حرکت کے ساتھ شدید غم کو کہتے ہیں اور "اسف" "فرح" کی طرح ہے اور "اسف عليه" کا معنی ہے "غضب" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اچانک موت) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: راحة المؤمن وأخذة أسف للكافر یہ مؤمن کے لیے راحت ہے۔ اور کافر کے لیے شدید غم کا ہے" اور "اسف كنف کی طرح بھی مروی ہے جس کا معنی ہے اخذة سخط أو ساخط (ناراضگی کی پکڑ یا ناراض کی پکڑ)۔ اھ۔

اور فائق میں ہے کہ اس کا معنی ہے ناراضگی اور غصہ کی وجہ سے پکڑ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: فلما آسفونا۔ اى اغضبونا۔ کیونکہ غصہ کی حالت میں غم اور افسوس بھی ہوتا ہی ہے۔ پس یوں کہا جاتا تھا: "له اسف حتى كثر" پھر اس کا استعمال ان مواقع پر بھی ہونے لگا جس میں آدمی کو غم نہیں ہوتا (صرف غصہ ہوتا ہے) اور اضافت (یعنی "اخذة الاسف" میں جو اضافت ہے) یہ "من" کے معنی میں ہے جیسے: خاتم فضة، میں ہے۔

زین العربؒ فرماتے ہیں: "اخذة" پر غضب اطلاق کرتے ہیں جس طرح خاتم کو فضہ کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ...

حدیث میں لفظ "اسف" سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ اور اگر کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا "غضبان" (غصہ والا آدمی) اور اگر فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو غصہ کے معنی میں ہوگا۔ (چنانچہ مطلب یہ ہوگا) موت الفجاة أثر من آثار غضب الله یعنی اچانک موت اللہ تعالیٰ کے غصے کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے مہلت نہیں دیتا کہ وہ آخرت کے لیے توبہ کے ذریعے کچھ تیاری کر سکے یا زاد آخرت تیار کر سکے' اور اسے بیمار بھی نہیں کرتا کہ بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ﴾ [الاعراف۔ ٤٤] یہ کفار کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: موت الفجاة راحة للمؤمن' واحدة أسف للكافر۔ "اچانک موت مؤمن کے لیے راحت ہے اور کافر کے لیے افسوس کا مقام ہے" اور مفاتیح میں لکھتے ہیں کہ "آسف" بروزن "فاعل" روایت کیا گیا ہے" "غضبان" کو کہتے ہیں (كذا ذكره جزری)۔

تخریج اور اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ راوی نے ایک مرتبہ "عن عبید بن خالد رجل من اصحاب النبیؐ" کہا۔ کبھی مرفوعاً بیان کیا اور کبھی موقوفاً بیان کیا ہے' اور یہی حدیث ابن مسعود، انس' ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

منذری فرماتے ہیں: عبید کی حدیث کی سند کے رجال ثقہ ہیں' اور موقوف ہونا اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح کی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی مزید یہ کہ راوی نے اسے مرفوعاً بھی بیان کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

في كتابه اخذة الاسف: اور ان کی صحیح میں "اخذة الاسف" ہے۔ سین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

رحمة: رفع کے ساتھ ہے۔

نزع کے وقت بندۂ مؤمن کی قلبی کیفیت

۱۶۱۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَابٍّ وَهُوَ فِي الْمَوْتِ فَقَالَ كَيْفَ تَجِدُكَ قَالَ اَرْجُو اللّٰهَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنِّيْ اَخَافُ ذُنُوْبِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ قَلْبِ عَبْدٍ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مَا يَرْجُوْا وَاٰمَنَهٗ مِمَّا يَخَافُ۔

[رواه الترمذي وابن ماجة وقال الترى هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذي في السنن ٣١١/٣ حديث رقم ٩٨٣۔ وابن ماجه ١٤٢٣/٢ حديث رقم ٤٢٦١۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک جوان کے پاس تشریف لائے اس حالت میں کہ وہ جوان نزع کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تو اپنے آپ کو اس وقت کس طرح پاتا ہے؟ آیا تو خدا کی رحمت کی امید رکھتا ہے یا اس کے غضب سے ڈر رہا ہے کہنے لگا کہ میں اللہ سے رحمت کی امید رکھتا ہوں اور اس کے باوجود میں اپنے گناہوں سے ڈرتا بھی ہوں۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندے کے دل میں (اس وقت) دو چیزیں جمع نہیں ہوتیں۔

مگر اللہ تعالیٰ اس کو وہی چیز عطا کر دیتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے یعنی رحمت اور امن دے دیتا ہے اس چیز سے کہ جس چیز سے وہ ڈرتا ہے یعنی عذاب سے۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہ نے اور امام ترمذیؒ نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: دخل النبی علیه السلام علی شاب۔۔۔أخاف ذنوبی:

فقال کیف تجدك؟: یعنی کیا تو خوش ہے یا غمگین ہے؟ (قالہ زین العرب)

ابن ملک فرماتے ہیں: یعنی تو اپنے دل کو اور دنیا سے آخرت کی طرف اپنے نفس کو کیسا پاتا ہے کیا اللہ کی رحمت کا امید وار ہے یا اس کے غضب سے خائف ہے؟

قال ارجو الله: یعنی میں اپنے آپ کو اس کی رحمت کا امیدوار پاتا ہوں۔

اخاف ذنوبی: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: امید کو اللہ کے ساتھ اور خوف کو گناہوں سے جوڑا ہے' جملہ فعلیہ کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ رجاء عالم نزع میں پیدا ہوئی ہے اور جملہ اسمیہ کو ''انّ'' کے ساتھ مؤکد کرنے میں اشارہ ہے کہ خوف میرے دل میں مستمر و ثابت ہے۔

قوله: لایجتمان الخ: لا یجتمعان: مذکر کے صیغے کے ساتھ ہے۔ یعنی امید اور خوف جمع نہیں ہوتے جیسا کہ مفاتیح وغیرہ میں ہے' اور صیغۂ مونث کے ساتھ ہے جیسا کہ امام طیبیؒ نے کہا ہے ای هاتان الخصلتان لاتجتمعان یعنی یہ دوصفات اکٹھی نہیں ہوتیں۔

فی مثل هذا الموطن: ای فی هذا الوقت۔ اس سے مراد سکرات الموت کا وقت ہے اور اسی کے مثل وہ وقت جب آدمی حقیقی یا معنوی طور پر موت کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جیسے میدانِ کارزار میں کافر سے مقابلے کے وقت یا قصاص وغیرہ کے وقت۔ پس ''المثل'' کو زائدہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''مثل'' کا لفظ زائد ہے اور ''موطن'' یا تو ظرف زمان ہے یا ظرف مکان ہے۔ جیسے ''مقتل حسین''۔ اھ اور ابن حجر نے انہی کی متابعت کی ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ ''یا تو ظرف مکان ہے'' بے موقع محل ہے جیسا کہ واضح ہے۔

پھر ابن حجرؒ کی عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے ''مثل هذا الموطن'' کو ''مثلك لا یبخل'' اور ''کمثله شیئ'' کی طرح کر قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مثال میں '' مثل'' زائد نہیں ہے کیونکہ اس سے مبالغہ مراد ہے۔ ''مثلك لا یبخل'' سے مراد یہ ہوتا ہے کہ '' فانت اولی بان لا تبخل'' یا پھر اس سے مراد نفی ہے بطریق برہانی جیسا کہ: لیس کمثله شیئ کے جوابات میں ایک جواب یہ بھی ہے۔ یہ بہت دقیق مسلک ہے اور تاویل کا حقدار ہے اور ہم نے اس کو بقیہ جوابات کے ساتھ موزوں مقام پر لکھا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا: منذری سے نقل کیا ہے کہ اس کی سند حسن ہے' اور اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

موت کی تمنا کرنا منع ہے

۱۶۱۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمَنَّوُا الْمَوْتَ فَإِنَّ هَوْلَ الْمُطَّلَعِ شَدِيْدٌ وَإِنَّ مِنَ السَّعَادَةِ اَنْ يَطُوْلَ عُمْرُ الْعَبْدِ وَيَرْزُقُهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ الْإِنَابَةَ۔ [رواہ احمد]

اخرجه احمد في المسند ۳۳۲/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مرنے کی آرزو (تمنا) نہ کرو۔ کہ جانکنی (جان نکلنے) کا وقت سخت ہے اور تحقیق نیک بختی (خوش قسمتی) ہے کہ بندے کی عمر دراز (لمبی) ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی طرف رجوع نصیب فرمائے۔ (احمد)

تشریح: قوله: لاتمنوا الموت فان هول المطلع شديد: لا تمنوا: دو تاؤں میں سے ایک کو حذف کیا گیا ہے۔

المطلع: طاء پر شد ہے اور لام پر فتحہ ہے۔ ''اطلاع'' سے اسم مکان ہے یا زمان ہے یا مصدر میمی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ چیز جو نزع کے وقت مریض کو لاحق ہوتی ہے اور جس کو وہ دیکھ رہا ہوتا ہے بہت سخت ہے۔

قوله: وان من السعا دة ان يطول عمر العبد:

عمر: میم کو مضموم اور مجزوم دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قوله: ويرزقه الله عزوجل الانابة: ''انابت'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف رجوع ہے پہلے ''دوام حضور بالعصمۃ'' دیتا ہے (یعنی گناہوں سے بچنے کی دائمی توفیق عطا ہوتی ہے) اور انتہاء توبہ کی توفیق عطا کرتا ہے۔

نہایہ میں ہے: ''المطلع'' اطلاع سے ظرف مکان ہے۔ اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''مطلع هذا الجبل من موضع كذا'' ای مأتاه و مصعده یعنی اس پر آنے کی جگہ اور چڑھنے کی جگہ۔ (یہاں) اس سے مراد موت کی وہ سختیاں اور تنگیاں ہیں جو مریض پر واقع ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسی حالت کو ''مطلع'' کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے یعنی اونچے سے جھانکنے کی جگہ (کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔)

میں کہتا ہوں: موت کی تمنا کی نہی کی علت پہلے شدت مطلع بیان فرمائی' کیونکہ اس کی تمنا محض کم صبری کی بناء پر کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس کی تمنا بھر آتی ہے تو اس کی بے قراری پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ مزید غصے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اور (مذکورہ نہی کی) دوسری علت یہ بیان فرمائی کہ وہ لمبی عمر سے زیادہ سے زیادہ سعادت حاصل کرلے' کیونکہ انسان کو دائمی سعادت حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا رأس المال ''عمر'' ہے' تو کیا آپ نے کبھی کسی تاجر کو دیکھا ہے کہ وہ اپنا اصل مال ضائع کررہا ہو؟ تو جب وہ رأس المال کو ضائع کردے گا تو پھر وہ کیسے نفع کمائے گا؟ یہ بات امام طیبیؒ نے ذکر کی ہے۔

اور میرک نے لکھا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ ''مطلع'' سے مراد (زمانہ اطلاع ہو) ملک الموت یا منکر نکیر کا زمان اطلاع ہے یا اس سے مراد وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنی صفت غضب کی اطلاع دے گا۔ یا وہ وقت مراد ہے کہ جب موت پر مرتب ہونے والے امور کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اور شاید یہی توجیہ اوجہ' اقرب بالمقام اور زیادہ مناسب ہے۔

تخریج واسنادی حیثیت : امام میرکؒ نے کہا ہے کہ امام احمدؒ نے اس حدیث کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسے امام بیہقیؒ نے بھی (سند حسن کے ساتھ) روایت کیا ہے۔

فکرِ آخرت پر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا وعظ

۱۶۱۴: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ جَلَسْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَّرَنَا وَرَقَّقَنَا فَبَكٰی سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ فَاَكْثَرَ الْبُكَاءَ فَقَالَ يَالَيْتَنِیْ مِتُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاسَعْدُ اَعِنْدِیْ تَتَمَنَّی الْمَوْتَ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ يَا سَعْدُ اِنْ كُنْتَ خُلِقْتَ لِلْجَنَّةِ فَمَا طَالَ عُمْرُكَ وَحَسُنَ مِنْ عَمَلِكَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ۔ [رواہ احمد]

اخرجه احمد فی المسند ٥/٢٦٧۔

ترجمہ :حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے۔ پس آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہمیں نصیحت کی اور ہمارے دلوں کو فکرِ آخرت پر وعظ کر کے نرم کیا۔ پس سعد بن ابی وقاصؓ بہت روئے۔ پھر فرمایا کاش کہ میں لڑکپن (جوانی) میں مر جاتا اور گنہگار نہ ہوتا اور آخرت کے عذاب سے نجات پا لیتا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ اے سعد! کیا تو میرے سامنے مرنے کی تمنا کرتا ہے پھر اس کو تین بار دہرایا۔ پھر فرمایا اے سعد اگر تمہیں اللہ نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے تو جس قدر تمہاری عمر لمبی ہوگی اور تمہارے اعمال بھی اچھے ہوں گے تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ (احمد)

تشریح: قوله: جلسنا الی رسول الله۔۔۔۔فردد ذلك ثلاث

جلسنا الی رسول الله ﷺ۔

فذکرنا: شد کے ساتھ ای العواقب (یعنی عواقب یاد دلانے یا یہ ''وعظنا'' (وعظ ونصیحت کرنا) کے معنی میں ہے۔

ورققنا: یعنی دنیا میں زہد اور آخرت کی طرف رغبت دلائی اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی نصیحت کے ذریعے سے ہمارے دلوں کو نرم کیا۔

فقال: یا لیتنی مت: میم پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔

یعنی میں بچپن ہی میں مر جاتا یا اس سے پہلے مر جاتا کہ اپنے کئے دھرے سے راحت حاصل کر لیتا۔

فقال النبی ﷺ: اور ایک صحیح نسخے میں ''رسول الله ﷺ'' کے الفاظ ہیں۔

یا سعد اعندی: ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے۔

یعنی میرے بعد تم موت کی خواہش کرتے تو چلو (ایک) کوئی بات تھی' میرے ہوتے ہوئے تو تم کیسے عدم (یعنی موت) کو

طلب کر رہے ہو۔

ابن حجر فرماتے ہیں: یعنی تو موت کی خواہش کر رہا ہے حالانکہ میں نے موت کی خواہش کرنے سے روکا ہے' کیونکہ اس میں نقصان ہے اور اللہ پر عدم رضامندی کا اظہار ہے۔

یہ محل نظر ہے' چونکہ ان کا موت کی خواہش کرنا عدم رضاء کی بنا پر نہ تھا بلکہ اپنے آپ پر دین کے نقصان کا خوف تھا۔ اور یہ صورت مستثنیٰ ہے' جیسا کہ علمائے کرام نے اس کی صراحت کی ہے۔

ثلاث مرات: (تین مرتبہ ارشاد فرمائے) تاکید انکار کے لیے ہے یا استفہام کے لیے ہے۔

قوله: ثم قال: يا سعد! ان كنت...... : یعنی موت کی خواہش کا کوئی جواز نہیں' پس اگر تم......

فما طال عمرك: طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ما'' مصدریہ ہے اور ''وقت'' مقدر ہے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''ما'' موصولہ ہو اور مضاف محذوف ہو ای ''الزمان الذى طال فيه عمرك'' اھ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''ما'' شرطیہ ہو۔

وحسن من عملك: اور ایک نسخہ میں ''من'' محذوف ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''من'' اخفش کے مذہب پر زائد ہے۔ یا یہ ''من'' تبعیضیہ ہے۔ ای **حسن بعض عملك** اھ اور یہ بھی ممکن ہے کہ **حسن** کی ضمیر سے بیانیہ ہو۔

فهو: سے مراد مذکورہ طول عمر اور حسن عمل ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: خبر پر فاء داخل ہے چونکہ مبتدا ''شرط'' کے معنی کو متضمن ہے۔

دوسری شق کی تردید حذف فرمادی جو یہ ہے: **وان كنت خلقت للنار فلا خير فى موتك ولا يحسن الاسراع اليه** 'یعنی کہ اگر تو جہنم کے لیے پیدا ہوا ہے تو تیرے مرنے میں تجھے کوئی فائدہ نہیں ہے اور موت کی طرف میں جلدی کرنا اچھا نہیں ہے۔'' اور اس جملے کو حذف کرنے میں جو لطافت ہے وہ بالکل واضح ہے۔

اور پورا جملہ ''**ان كنت خلقت**'' کی جزاء ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: پس اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو عشرہ مبشرہ میں سے تھے تو آپ علیہ السلام نے یہ کیسے کہا کہ ''اگر تم جہنم کے لیے پیدا کئے گئے ہو...... تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ مقصود تعلیل ہے نہ کہ شک۔ یعنی تو میرے پاس کس طرح موت کی خواہش کر سکتا ہے حالانکہ میں نے تجھے جنت کی بشارت دی ہے۔ یعنی تو ایسی خواہش مت کر کیونکہ تو اہل جنت میں سے ہے اور تیری عمر جتنی زیادہ ہوگی تیرے درجات اتنے ہی بلند ہونگے اور ''تعلیل'' میں اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران - ۱۳۹] ''اور (دیکھو) بیدل نہ ہونا اور نہ کسی طرح غم کرنا اگر تم مؤمن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے''

چنانچہ ان سے کہا گیا: کہ شہادت آپ کے لیے اس سے بہتر ہے جو آپ طلب کر رہے ہیں اس لیے کہ یہ شہادت تو جہاد ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بات کی تائید وہ متفق علیہ حدیث کرتی ہے جو سعد سے مروی ہے: **قال: اخلف بعد اصحابى قال ﷺ: انك لن تخلف فتعمل عملا تبتغى وجه الله الا ازددت به درجه ورفعة ولعلك أن تخلف حتى ينتفع بك اقوام ويضربك آخرون۔** ''حضرت سعدؓ نے کہا: میں اپنے ساتھیوں کے بعد زندہ رہوں گا؟ تو آپ نے فرمایا:

اگر تو زندہ رہے گا تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اچھا کرے گا جس سے تیرے درجات اور بلند ہوں گے۔ اور سن! شاید کہ تو زندہ رہے تا کہ کچھ لوگ تجھ سے نفع اُٹھائیں گے اور کچھ نقصان اُٹھائیں گے''۔ اھ۔

اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ تردید فرضی اور تقدیری ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ بشارت مقید تھی اس حالت پر برقرار رہنے کے ساتھ کہ جس پر انہیں بشارت دی گئی تھی۔ اسی لیے تو اس بشارت کے باوجود ان کے دل سے سوء خاتمہ عذاب قبر قیامت کے دن کی سختیوں عذاب نار سے واسطہ پڑنے کا خوف ختم نہیں ہوا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم اور اس حدیث میں یہ امکان بھی ہے کہ یہ بشارت سے پہلے کی ہو۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا اپنی مالی حالت کو بیان کرنا

۱۶۱۵: وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ مُضَرِّبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی خَبَّابٍ وَقَدِ اكْتَوٰی سَبْعًا فَقَالَ لَوْلَا اَنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَتَمَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لَتَمَنَّيْتُهٗ وَلَقَدْ رَاَيْتُنِیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَمْلِكُ دِرْهَمًا وَاِنَّ فِیْ جَانِبِ بَيْتِیَ الْاٰنَ لَاَرْبَعِيْنَ اَلْفَ دِرْهَمٍ قَالَ ثُمَّ اُتِیَ بِكَفَنِهٖ فَلَمَّا رَاٰهُ بَكٰی وَقَالَ لٰكِنْ حَمْزَةُ لَمْ يُوْجَدْ لَهٗ كَفَنٌ اِلَّا بُرْدَةٌ مَلْحَاءُ اِذَا جُعِلَتْ عَلٰی رَاْسِهٖ قَلَصَتْ عَنْ قَدَمَيْهِ وَاِذَا جُعِلَتْ عَلٰی قَدَمَيْهِ قَلَصَتْ عَنْ رَاْسِهٖ حَتّٰی مُدَّتْ عَلٰی رَاْسِهٖ وَجُعِلَ عَلٰی قَدَمَيْهِ الْاِذْخِرُ۔ [رواه احمد والترمذی اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ ثُمَّ اُتِیَ بِكَفَنِهٖ اِلٰی اٰخِرِهٖ]

اخرجه احمد فی المسند ۱۱۱/۵۔

ترجمه: حضرت حارثہ بن مضربؒ سے روایت ہے کہ میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے پاس اس حال میں گیا کہ ان کے بدن پر سات جگہ داغ تھے کہنے لگے اگر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا کہ کوئی تم میں سے مرنے کی آرزو نہ کرے البتہ میں اس کی آرزو کرتا اور ایک وقت تھا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ کہ میں ایک درہم کا بھی مالک نہیں تھا اور اب میرے گھر میں چالیس ہزار درہم ہیں پھر حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے پاس کفن لایا گیا۔ بڑا نفیس کفن تھا۔ پس کفن کو دیکھ کر رونے لگے اور فرمانے لگے۔ اگر چہ ایسا کفن جائز ہے لیکن حمزہ رضی اللہ عنہ کا کفن صرف سیاہ سفید خطوں والی چادر تھی۔ جس وقت آپ کے سر پر ڈالی جاتی۔ تو آپ کے قدم ننگے ہو جاتے اور جس وقت قدموں پر ڈالی جاتی تو سر پر کم رہ جاتی یہاں تک کہ چادر کو کھینچ کر ان کے سر پر کر دیا گیا اور پاؤں پر اذخر گھاس رکھ دی گئی۔ اس کو امام احمد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔ لیکن ترمذی نے ثُمَّ اُتِیَ بِكَفَنِهٖ آخر تک ذکر نہیں کیا۔

راویٔ حدیث:

حارثہ بن مضرب: تضریب سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عبدی کوفی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کا سماع کیا ہے۔ یہ بات مؤلفؒ نے ذکر کی ہے۔

خباب: شد کے ساتھ ہے۔ یہ خباب بن ارت ہیں۔ ''ارت'' میں تاء مشدد ہے۔ یہ تمیمی ہیں۔ جاہلیت میں قید کر لئے گئے تھے مکہ میں فروخت ہوئے تھے۔ پھر بنو زہرہ کے حلیف بنے۔ چھٹے سال میں اسلام قبول کیا۔ یہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنا اسلام ظاہر کیا تھا اور اس وجہ سے انہیں سخت تکلیف دی گئی۔ غزوۂ بدر اور دوسرے تمام معرکوں میں شریک ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ صفین سے واپسی پر ۳۷ھ میں فوت ہوئے۔ حضرت علیؓ ان کی قبر کے پاس سے گزرے تو یوں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ خباب پر رحم فرمائے اپنی دلی رغبت کے ساتھ اسلام قبول کیا' اطاعت کی غرض سے ہجرت کی اور مجاہدانہ زندگی بسر کی' اور کئی سال جسمانی آزمائش میں مبتلا رہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہرگز ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔

تشریح: قوله: وقد اکتوی سبعا: (سبعا'') کی تمیز محذوف ہے۔ یعنی ان کے بدن کے سات مقامات پر۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''کی'' معروف علاج ہے بہت سی بیماریوں کا ''کی'' یعنی داغنے سے روکا گیا ہے۔ اس کی کئی توجیہات کی گئیں ہیں کہ نہی اس لیے تھی کہ ان کا خیال تھا کہ شفاء اس سے ملتی ہے اور جب یہ اعتقاد ہو کہ یہ تو ایک سبب ہے اور شفاء دینے والا اللہ ہی ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نہی توکل کے قبیل سے ہو' اور یہ جواز کے علاوہ ایک دوسرا درجہ ہے اور اس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جس میں بلایسترقون ولا یکتوون وعلی ربھم یتوکلون ''وہ دم نہیں کرواتے، اور نہ ہی داغ لگواتے ہیں بلکہ اللہ پر توکل کرتے ہیں۔

لایتمن: صیغۂ نہی کے ساتھ ہے۔

لتمنیته: یعنی تو میں ضرور موت کی تمنا کرتا تا کہ میں اس مرض کی شدت سے آرام حاصل کر لیتا جس کے بارے میں انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے اور اس پر صبر نہیں کرتا۔

قوله: ولقد رأیتنی مع رسول اللہ ﷺ املك درهما: یعنی اکثر صحابہ کی طرح میری مالی حالت بھی یہ تھی کہ میں ایک درہم کا مالک بھی نہیں تھا۔ کیونکہ بڑی بڑی فتوحات تو بعد ہی میں حاصل ہوئی تھیں۔ کیا آپ غور نہیں کرتے کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب عبداللہ بن ابی سرحؓ نے افریقہ فتح کیا تھا' اس میں ایک ایک شہسوار کا حصہ تین ہزار دینار تک ہو گیا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: واؤ قسمیہ ہے اور لام جواب قسم ہے۔ میں کہتا ہوں قسمیہ ہونے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ قاضیؒ اس آیت ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ﴾ [الواقعہ: ٦٢] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ لام موطئه للقسم میں لام قسم کے طور پر ہے۔ یہ بات شیخ زکریا نے اپنے حاشیے میں لکھی ہے۔ قاضی کے علاوہ حضرات نے کہا ہے کہ لام ابتدائیہ ہے۔

عصام الدینؒ نے کہا ہے: شاید کہ بیضاویؒ کا قول کسی ناسخ کا سہو ہے' اور درست بات یہ ہے کہ لام بتقدیر قسم ہے کہ اصل میں یوں تھا: واللہ لقد علمتم ' کیونکہ لام موطئہ اس شرط کے جواب پر داخل نہیں ہوتا جس کی جزاء میں قسم کا نزاع ہو جواب بنانے کے لئے۔ اھ۔ اور صاحب مغنی نے اس آیت: ﴿ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللّٰهَ ﴾ [الاحزاب: ١٥] کے بارے میں کہا ہے کہ یہاں اور اس کے مشابہ کلام میں قسم مقدر مانی جائے گی۔

اور پھر فرماتے ہیں جواب قسم کا احتمال رکھنے والے کلام کے قبیل سے یہ آیت ہے: وان منکم الا واردھا۔ اور یہ اس طرح کہ "ثم لنحن اعلم" پر واؤ عاطفہ مقدر مانی جائے' کیونکہ یہ اور اس سے ماقبل کلام اس آیت ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ﴾ [مریم:٦٨] کے جوابات ہیں۔ اور ابن عطیہ کے قول 'هو قسم والوا وتقتضيه'' کی مراد بھی یہی ہے یعنی کہ یہ جواب قسم ہے اور واؤ اس کے لیے مصلہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے عطف ڈالا گیا ہے۔

اور ابن حبان کو ایسا وہم ہوا ہے جو چھوٹے طلبہ کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ یہ ہے کہ 'واؤ حرف قسم ہے'۔ تو ان کے اس قول کا رد اس طرح ہے کہ اگر یہ حرف قسم ہے تو مجرور کا حذف اور حرف جار کا باقی رہنا لازم آتا ہے اور اسی طرح قسم کو حذف کرنا جب کہ جواب قسم "إن" کے ساتھ نفی میں ہو لام آتا ہے۔

بيتي: یاءِ متکلم پر فتحہ اور سکون دونوں جائز ہیں۔

لأربعين: لام زائدہ تاکید کے لیے ہے۔

اتي: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

بكي: امام طیبی فرماتے ہیں: گویا کہ وہ موت کی خواہش کرنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ (موت کی تمنا کی) یا تو اس تکلیف کی وجہ سے جو انہیں پہنچی تھی جس کے سبب سے داغ بھی لگوایا تھا یا پھر (موت کی آرزو کرنا) دولت کی فراوانی کے خوف سے تھا اور دوسرا زیادہ واضح ہے اسی لیے اس کے فوراً بعد جملہ قسمیہ لائے ہیں' اور اس میں اپنی دونوں حالتوں کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ حالت کہ جب وہ اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت میں تھے اور دوسری اس دن کی حالت۔ پھر اپنے عمدہ کفن کی حالت کا رسول اللہ ﷺ کے چچا کے کفن کی حالت کے ساتھ موازنہ کیا۔

وقال: لكن: اور ایک نسخے میں "ولكن" کے الفاظ ہیں۔

لم يوجد له كفن الا بردة: "بردة" بدل ہونے کی بناء مرفوع ہے۔

ملحاء: سفید اور سیاہ دھاری والی چادر۔

قلصت: دونوں حروف مفتوح ہیں یعنی چھوٹی پڑ جاتی اور میت کھل جاتی۔

یہ اکثر ان چیزوں میں بولتے ہیں جو اوپر کی طرف سکڑ جائیں۔

جعل على قدميه الاذخر: یہ ایک جنگلی بوٹی ہے جو خوشبودار ہوتی ہے یہ گھاس لکڑی پر ڈال کر چھت بنائی جاتی ہے۔ اس کا ہمزہ زائد ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ "لکن" تو دو کلاموں کے درمیان نفی اور اثبات میں لفظاً یا معنیً مخالفت چاہتا ہے تو یہاں پر وہ مخالفت کہاں ہے؟

میں کہتا ہوں کہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ 'میں نے اپنے ان بزرگوں کی پیروی چھوڑ دی' میں ان کے نقش قدم پر نہیں چلا' تبھی تو اتنا نفیس کفن تیار کروایا ہے' لیکن حمزہؓ تو ان بزرگوں کے طریقے پر چلے ہیں کہ ان کا کفن اتنا بھی نہیں تھا کہ جسم ڈھانپ سکے پس ان کے قدموں پر اذخر ڈالا گیا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صابر فقیر غنی شاکر سے افضل ہے' کیونکہ سعدؓ باوجود کہ وہ سابقین اولین کے طریقے پر تھے تاسف کا اظہار کیا۔ چونکہ فخر فقیری میں اور گزران پر اکتفا کرنے ہی میں ہے اور اس حالت کے علاوہ دوسری حالت (مثلاً) جیسی کہ ان کی حالت تھی وہ ان کے نزدیک غیر کامل تھی۔

قوله: الاانه: لم يذكر ثم اتى بكفنه الى آخره: اور ایک صحیح نسخہ میں ''والبیھقی فی شعب الایمان'' بھی مذکور ہے۔

بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ مَنْ حَضَرَهُ الْمَوْتُ

یہ باب اُس شخص کے پاس پڑھنے کے بیان میں ہے جس کو موت حاضر ہو جائے

عرضِ مرتب:

علماء نے لکھا ہے کہ موت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ پاؤں سست ہو جاتے ہیں ان کے اندر بالکل طاقت نہیں رہتی۔ اگر کھڑے کرنا چاہیں تو کھڑے نہیں ہو سکتے اور ناک کا بانسا مڑ جاتا ہے اور کن پٹیاں اندر کو دھنس جاتی ہیں اور خصیتین کا گوشت لٹک جاتا ہے اور جو چیزیں میت کے پاس پڑھی جائیں' ان میں سے چند چیزیں یہ ہیں: ① لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرنا۔ ② اناللہ پڑھنا۔ ③ دعائے خیر کرنا اور ④ سورۃ یٰسین کا پڑھنا یا اس کے مثل کوئی اور چیز جس کا تذکرہ حدیثوں کے اندر موجود ہے۔

الفصل الاول:

قریب المرگ کے لیے کلمہ طیبہ کی تلقین

۱۶۱۶: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ٦٣١/٢ حدیث رقم (١/٩١٦)۔ وابوداوٗد فی السنن ٤٨٧/٣ حدیث رقم ٣١١٧۔ والترمذی فی السنن ٣٠٦/٣ حدیث رقم ٩٧٦۔ والنسائی ٥/٤ حدیث رقم ١٨٢٦۔ وابن ماجه ٤٦٤/١ حدیث رقم ١٤٤٥۔ واحمد فی المسند ٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اشخاص مرنے کے قریب ہوں۔ ان کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی جس کی موت قریب ہو اسے کلمہ توحید یا کلمہ شہادت یاد دلاؤ۔ اس طرح کہ تم کلمہ توحید یا کلمہ شہادت اپنی زبان سے پڑھو۔ نہ یہ کہ تم اسے اس کا حکم دو۔

موتاکم طیبیؒ فرماتے ہیں یعنی "تم میں سے جس کی موت قریب ہو اور اس کو 'میت' کہنا باعتبار مایؤول کے طور پر ہے۔ آپ کا یہ فرمان: اقرؤوا علی موتاکم یس بھی اسی پر محمول ہے۔ اور کلمہ توحید اور سورۂ یس کی تخصیص کا فائدہ ان شاء اللہ عنقریب آ جائے گا۔ اھ۔

ایک قول یہ ہے کہ ممکن ہے سورۂ یس کی تلاوت کرنے کا حکم مرنے کے بعد سے تعلق رکھتا ہو۔ زین العربؒ فرماتے ہیں: اور اسی طرح تلقین کے حکم کو بعد از دفن پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ تلقین کا اطلاق "اس آدمی پر جس کے موت کا وقت قریب ہو" کی نسبت مردہ پر زیادہ مناسب ہے' کیونکہ اگر زندہ پر ہو تو وہ مجاز سے خالی نہیں' برخلاف بعد دفن کے' اور ان دونوں کا اطلاق کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (نقلہ میرک)

ان کا یہ کہنا "تلقین کا اطلاق......" محل نظر ہے چونکہ تلقین متعارف متقدمین میں متعارف نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک امر حادث (نیا معاملہ) ہے۔ پس رسول اللہؐ کے فرمان کو اس پر محمول نہیں کیا جائے گا' مزید یہ کہ تلقین لغوی "جس کی موت کا وقت قریب ہو" پر "حقیقت" ہے' اور "میت" پر "مجازی" اور اس لیے بھی کہ اول اقرب الی السماع ہے اور اقرب الی شفاع بھی ہے۔

اور ابن حبان وغیرہ نے کہا ہے کہ حدیث مذکور میں آپ کی مراد وہ شخص ہے جس کی موت قریب آ چکی ہو۔ اسی طرح انہوں نے کہا ہے کہ آپ کا فرمان: اقرؤوا علی موتاکم یس "اپنے مردوں پر سورۂ یٰسین پڑھو۔"

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس کی موت قریب ہو اس کے پاس پڑھو، یہ مراد نہیں کہ میت پر پڑھو۔ شرح الصدور میں سیوطیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں ابن عباس سے روایت نقل کی ہے: عن النبیؐ قال: افتحوا علی صبیانکم اول کلمة بلا الہ الا اللہ ولقنوهم عند الموت لا الہ الا اللہ فانه من کان اول کلامه لا الہ الا اللہ ثم عاش الف سنة ماسئل عن ذنب واحد۔ "آپ نے فرمایا: اپنے بچوں کو سب سے پہلے کلمہ توحید سکھاؤ اور اپنے مرنے والوں کو بھی موت کے وقت کلمۂ توحید کی تلقین کرو۔ کیونکہ جس کا پہلا کلام 'لا الہ الا اللہ ہو' پھر وہ ہزار سال بھی زندہ رہے تو اس سے ایک گناہ کے بارے میں بھی سوال نہیں ہوگا۔"

اس حدیث کو امام حاکمؒ نے اپنی تاریخ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور بیہقیؒ نے کہا ہے (سند کے لحاظ سے یہ حدیث) غریب ہے۔ سیوطی کی جمع الجوامع میں اسی طرح مذکور ہے اور آئندہ یہ حدیث بھی آئے گی من کان آخر کلامه لا الہ الا اللہ دخل الجنة "جس آدمی کا آخری کلام 'لا الہ الا اللہ' ہوا وہ جنت میں داخل ہوگا۔"

پھر جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ تلقین مندوب ہے اور حدیث کا ظاہر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور سب اس کی طرف مائل ہیں اور بعض مالکیہ نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔

تخریج امام میرکؒ فرماتے ہیں اس حدیث کو اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

مریض یا میّت کے پاس حاضری کے وقت اچھی دعا کرنا

۱۶۱۷: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَضَرْتُمُ الْمَرِيْضَ اَوِ الْمَيِّتَ فَقُوْلُوْا خَيْرًا فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُوْنَ عَلٰى مَا تَقُوْلُوْنَ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم فی صحيحه ۶۳۳/۲ حديث رقم (۶۔ ۹۱۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۸۶/۳ حديث رقم ۳۱۱۵۔ والترمذی فی السنن ۳۰۷/۳ حديث رقم ۹۷۷۔ والنسائی ۴/۴ حديث رقم ۱۸۲۵۔ وابن ماجه ۴۶۵/۱ حديث رقم ۱۴۴۷۔ واحمد فی المسند ۳۰۶/۶۔

ترجمہ: حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت تم مریض کے پاس یا قریب الموت کے پاس حاضر ہو تو اس کے لیے بھلائی کی بات کہو۔ اس لیے کہ فرشتے تمہارے کہنے پر آمین کہتے ہیں۔ یعنی تم جو بھلی (اچھی) دعا کرو یا بری دعا کرو۔ اس پر آمین کہتے ہیں۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضرتم المریض او المیت: ''میت'' سے مراد میت حکمی ہو تو ''او'' شک کے لیے ہے اور ''میت حقیقی'' مراد ہو تو ''او'' تنویع کے لیے ہوگا' اور ابن حجرؒ نے جس پر جزم ظاہر کیا ہے کہ ''یہ شک کے لیے ہے'' تو اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور دوسرے سے مراد بھی پہلا ہی ہے۔

فقولوا خیرًا: یعنی مریض سے بھلی بات کہو۔ (مثلاً) اللہ اسے شفا عطا فرما۔ اور میت کے قریب کہو' اللہ اسے معاف کردے''۔ یہ بات مظہرؒ نے ذکر کی ہے۔ یا یہ کہو کہ ''تمہارے لیے خیر ہے'' یا قریب المرگ کے پاس ''لا الله الا الله'' پڑھو کیونکہ یہ سب سے بہتر کلام ہے جو اسے کہا جائے۔ اسے ابن حجرؒ نے اختیار کیا ہے۔ لیکن (فان الملائکة یومنون) کہ فرشتے آمین کہتے ہیں اس سے مناسب نہیں رکھتا

یؤمنون: مشدد ہے' یعنی اچھی اور بری دعا پر آمین کہتے ہیں۔

اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی تمہاری اچھی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ پس دوسری صورت میں ترغیب ہے اور پہلی صورت میں ترہیب بھی ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

مصیبت پر صبر کرنے کا اچھا بدلہ

۱۶۱۸: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهٗ مُصِيْبَةٌ فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ بِهٖ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاَخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرًا مِنْهَا فَلَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلَمَةَ قُلْتُ اَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ مِنْ اَبِيْ سَلَمَةَ اَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اِنِّيْ قُلْتُهَا فَاَخْلَفَ اللّٰهُ لِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ [روہ مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ٦٣١/٢ حدیث رقم (٣-٩١٨)۔ وابوداؤد فی السنن ٤٨٨/٣ حدیث رقم ٣١١٩۔

ترجمہ :حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب بھی کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے تھوڑی ہو یا زیادہ پس اس کو وہ چیز پڑھنی چاہئے کہ جس کا اللہ نے اس کو حکم دیا ہے یعنی یوں کہنا چاہیے: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ یا اللہ! میری مصیبت کی وجہ سے مجھے ثواب عطا فرما اور میرے لیے اس سے بہتر بدلہ دے جو چیز میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس چیز سے بہتر بدلہ عطا فرماتے ہیں پس جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو میں نے کہا ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے کون مسلمان بہتر ہوگا کہ وہ سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے خاندان کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ پھر میں نے یہ کلمات کہے تو اللہ تعالیٰ مجھے ابوسلمہ کے عوض (بدلے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عطا کیے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ ئی۔

تشریح: تصيبه: مونث کے صیغے کے ساتھ ہے اور ایک نسخے میں مذکر کا صیغہ ہے۔

مصيبة: چھوٹی ہو یا بڑی مصیبت امر مکروہ ہے۔

انا" ها" سے بدل ہے یعنی ہماری ذات اور ہر وہ چیز جو ہماری طرف منسوب ہے ملکاً اور خلقاً اللہ ہی کے ہیں۔

[وانا اليه راجعون] طیبی فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ آیت میں ''حکم'' کہا ہے؟

تو میں کہوں گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بشارت کا حکم دیا ہے اور اس بشارت کو مطلق ہی رکھا ہے تا کہ یہ ہر ایں شخص یا چیز کو اپنے عموم میں لے لے جس کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اس کو خطاب کے صیغے کے ساتھ ذکر کیا' تا کہ یہ ہر شخص کو عام ہو تیم اس قول کی شان کی تعظیم پر متنبہ ہے۔ پس اس کے ذریعہ اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ قول مطلوب ہے حکم صرف طلب فعل ہی کے لیے ہے۔ اور یہ اس لیے کہ ''اِنَّا لِلّٰہ'' یہ اس بات کا تسلیم اور اقرار ہے کہ میں اور جس چیز کا میں مالک ہوں یا جو چیز میری طرف منسوب ہے یہ سب مستعار ہیں: یہ سب چیزیں واپس کی جائیں گی' اسی اللہ کی طرف سے ہماری ابتدا ہوئی تھی اور اسی کی طرف رجوع اور انتہا ہے' اور جب آدمی اپنے اور خود کو پہنچے والی مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اس کے لیے وہ مصیبت آسان ہو جاتی ہے' اور جہاں تک بات ہے یہ سب چیزیں جزع کے ساتھ کو زبان پر لانے کی تو یہ قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراض ہونے والی بات ہے۔ اھ۔

اور زیادہ قریب بات یہ ہے کہ ہر وہ خصلت جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مدح کی ہے وہ اس کے مامور بہ ہونے کو متضمن ہے اسی طرح ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالیٰ نے مذمت بیان کی ہو وہ نہی کی مقتضی ہے اور ان کا (یعنی طیبی کا) یہ قول مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ عمل صالح کو عمل سوء کے ساتھ خلط کرنے کے باب سے ہے' جیسا کہ گناہوں پر اصرار کے ساتھ استغفار بھی کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٢] ''اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں۔ انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا۔ قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے۔ بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اللھم: یہ ظاہراًان اوامر میں سے ہے۔ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور یہ اسی طرح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ادعونی استجب لکم یہ محل کلام ہے کیونکہ آیت میں مطلق دعا کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں خاص دعا کا حکم دیا گیا ہے۔ پس زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں پر حرف عطف محذوف ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: اور اس میں یہ احتمال بھی ہے بلکہ یہی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کہ آپ اپنی امت کو بتائیں کہ وہ الفاظ خصوصی طور پر کہیں۔ اس صورت میں اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے جو ان دونوں کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ اھ۔ اور احتمال تو مسلم ہے لیکن ان کا ظاہر کہنا ممنوع ہے۔

اجرنی: ہمزہ پر سکون اور جیم پر ضمہ ہے۔ ہمزہ کو ممدود اور جیم کو مکسور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

فی مصیبتی: ظاہراً "فی" "باء" "سببیہ" کے معنی میں ہے اور ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ "مع" کے معنی میں ہے جیسا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: اُدْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ [الاعراف:۳۸] میں "فی" بمعنی "مع" تو یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ مخفی نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "آجرہ یأجرہ" اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو بدلہ دیا جائے اور اجر عطا کیا جائے اور "أجرہ یأجرہ" بھی اسی طرح ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: میم پر ضمہ اور کسرہ دونوں درست ہیں یعنی بہر دو صورت مجرد سے ہے۔ اور قاموس میں بھی اسی طرح ہے اور زین العرب بھی اسی طرح ہی فرماتے ہیں: آجرہ اللہ یأجرہ یا جرہ" کسی کو ثواب عطا کرنا اور اس کو اجر دینا' لیکن کسرہ مع القصر کسی نسخے میں نہیں ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: اور جیم کے کسرہ کے ساتھ اور قصر مع ضم الجیم بھی منقول ہے۔ قاضی عیاضؒ نے اکثر اہل لغت سے نقل کیا ہے کہ یہ کلمہ مقصور ہے بغیر مد کے ہے۔ اور" اجرہ اللہ" کا معنی ہے اللہ نے اس کو اس کا اجر اور اس کے صبر کی جزا عطا فرمائی۔ اھ۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: یہ لفظ ہمزۂ وصل کے ساتھ ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ان کا سہو ہے' کیونکہ ہمزہ موجودہ یہ فاء کلمہ ہے اور ہمزۂ وصل درمیان کلام میں آنے کی وجہ سے ساقط ہو گیا ہے۔

قولہ: واخلف لی خیراً منھا: یعنی جو مجھ سے چھن گیا ہے اس کے بدلے میرے گھر میں ایک نائب بنا دے۔

"اخلف" کی لغوی تحقیق:

(طیبیؒ)۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس میں ہمزہ قطعی ہے اور لام مکسور ہے۔ یہ اس جانے والے کے لیے بولتے ہیں جس کے مثل کا ملنا متوقع نہ ہو۔ مثلاً جیسے کسی کا والد فوت ہو جائے (تو والد کا مثل کون ہے۔) "خلف اللہ علیك منه" یہ بغیر الف کے ہے۔ یعنی تجھ پر اس کی طرف سے خود اللہ ہی خلیفہ بن جائے اور "اخلف اللہ علیك" اس شخص کے لیے کہے جاتے ہیں جس کا مال واولاد یا ایسی چیز جس کی مثل حاصل کرنا متوقع ہو۔ یعنی اس کا معنی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس جیسی چیز واپس کر دے۔

قولہ: فلما مات ابوسلمۃ: مراد ان کے خاوند عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی ہیں۔ صحیح قول کے مطابق ۴ھ میں فوت

ہوئے ان زخموں کی وجہ سے جو انہیں احد کے دن پہنچے تھے۔ وہ سابقین اولین میں سے تھے۔ دس افراد کے بعد اسلام قبول کیا۔

قولہ: قلت: ای المسلمین خیر من أبی سلمة: طیبی فرماتے ہیں: ام سلمہ کو آپؐ کے اس فرمان ''اللہ تعالیٰ اس سے بہت عطا کرتے ہیں'' پر تعجب ہوا کیونکہ وہ ابوسلمہ کو بہت عظیم سمجھتی تھیں اس سے ابونعیم کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔ ابونعیمؒ فرماتے ہیں: یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی' اور اصحاب المغازی نے انہیں ان مہاجرین میں شمار کیا ہے جنہوں نے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ یہ آپؐ کے رضاعی بھائی تھے اور آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اھ۔

قولہ: اول بیت: نیا کلام ہے۔ اس میں تعجب اور اس کی علت کا بیان ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: فانہ اول بیت اھل بیت

(**فاخلف اللّٰہ لی رسول اللّٰہ:** اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول اللہ کی زوجہ بنا دیا اور آپؐ میرے لئے میرے شوہر ابوسلمہ جیسے خاوند سے اچھا عوض تھے۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا واقعہ

۱۶۱۹: وَعَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَبِيْ سَلَمَةَ وَقَدْ شَقَّ بَصَرَهُ فَاَغْمَضَهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الرُّوْحَ اِذَا قُبِضَ تَبِعَهُ الْبَصَرُ فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ اَهْلِهٖ فَقَالَ لَا تَدْعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِلَّا بِخَيْرٍ فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ يُؤَمِّنُوْنَ عَلٰى مَا تَقُوْلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَبِيْ سَلَمَةَ وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ وَاخْلُفْهُ فِيْ عَقِبِهٖ فِي الْغَابِرِيْنَ وَاغْفِرْلَنَا وَلَهُ يَارَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَافْسَحْ لَهُ فِيْ قَبْرِهٖ وَنَوِّرْ لَهُ فِيْهِ۔ [رواہ مسلم]

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ٦٣٤/٢ حدیث رقم (٧-٩٢٠)۔ وابوداوٗد فی السنن ٤٨٧/٣ حدیث رقم ٣١١٨۔ وابن ماجہ ٤٦٧/١ حدیث رقم ١٤٥٤۔

ترجمہ: انہیں سے روایت ہے یعنی اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ رضی اللہ عنہ پر اس حال میں داخل ہوئے کہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں کو بند کیا اور پھر فرمایا۔ جب روح قبض کی جاتی ہے تو بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ تو ان کے اہل وعیال ان کی وفات پر رونے لگے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نفسوں کے خلاف دعا نہ کرو مگر بھلائی کے ساتھ یعنی واویلا اور بددعا نہ کرو۔ اس لیے کہ فرشتے تمہارے کہنے پر آمین کہتے ہیں۔ خواہ تمہاری دعا بھلی ہو یا بری۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یا الٰہی! ابوسلمہ کی بخشش فرما اور اس کا درجہ بلند کردے' ہدایت یافتوں کے درمیان اور پس ماندوں (یعنی پیچھے رہنے والوں) کا کارساز ہو جا۔ اے جہانوں کے پروردگار ہماری بخشش فرما اور اس کی قبر کشادہ کردے اور روشن کردے۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: شق: شین اور راء دونوں پر فتحہ ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی چیز کی طرف دیکھے اور پھر اس کی نظر وہاں سے نہ ہٹے۔ اور شین پر ضمہ پڑھنا غیر مختار ہے یہ بات سید نے طیبیؒ سے نقل کی ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں: "شق بصرہ" شین کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ای بقی بصرہ مفتوحًا۔ ہم نے اسی طرح ضبط کیا ہے اور یہی مشہور ہے اور بعض نے راء کے فتحہ کے ساتھ ضبط کیا ہے' یہ بھی درست ہے' اور شین تو بلا اختلاف مفتوح ہے۔ یہ میرک نے نقل کیا ہے۔

اور جوہری نے ابن السکیت سے نقل کیا ہے کہ یوں "شق بصر المیت" کہا جاتا ہے: اور یوں نہیں کہا جاتا: "شق المیت بصرہ"۔ اور "میت" وہ ہے جس کو موت آ چکی ہو اور اس کی نظر ایک جگہ پر ٹھہر گئی ہو اور نظر واپس نہ لوٹے۔

(ذکرہ جزری وکذا صاحب قاموس)

فاغمضہ: "تغمیض" اور "تغطیہ" کے معنی میں ہے۔

قولہ: ان الروح اذا قبض تبعه البصر: امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ "اغماض" کی علت ہے' چنانچہ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ان کی آنکھیں بند کر دیں کیونکہ روح جب جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو نظر اس کے پیچھے جاتی ہے۔ پس آنکھیں کھلی رہنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یا یہ "شق" کی علت ہے۔ یعنی جس کی موت قریب ہوتی ہے اس کے سامنے موت کا وہ فرشتہ متمثل ہو کر آتا ہے جو اس کی روح قبض کرتا ہے تو وہ اس کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس سے نظر نہیں ہٹاتا حتیٰ کہ اس کی روح اس سے جدا ہو جائے یا آنکھ کی بقیہ قوت مضمحل ہو جائے اور نگاہ اسی حالت پر رہتی ہے اور اس بات کی تائید ابو ہریرہؓ کی حدیث سے ہوتی ہے:

قال رسول الله ﷺ الم تروا ان الانسان اذا مات شخص بصرہ قالو ا بلی قال: فذلك حتى يتبع بصرہ نفسه۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں؟ تو صحابہ نے کہا: کیوں نہیں! (بالکل ایسے ہی ہے) تو آپ نے فرمایا: یہ ایسے ہی رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی نگاہ اس کے روح کے پیچھے جاتی ہے"۔ اسے امام مسلمؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ اس کا پردہ اٹھا دے اور وہ ان چیزوں کو دیکھ لے جو ان کو نظر نہ آتی تھی میں کہتا ہوں! اس کی تائید اللہ کا یہ فرمان کرتا ہے: ﴿لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ [ق۔۲۲] "(یہ وہ دن ہے کہ) اس سے تو غافل ہو رہا تھا اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے"۔

فضبح: جیم مشددہ کے ساتھ ہے۔

قولہ: فقال لاتدعوا علی انفسکم الا بخیر: اور ایک روایت میں: نسکتھم، نون اور تاء کے ساتھ ہے' مظہر نے کہا ہے: یعنی تم بری بات نہ کہو اور واویلا نہ کرو اور "میری تباہی" جیسے الفاظ اور اس کے مشابہہ کلمات نہ کہو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ میت کے بارے میں ایسے کلمات بولتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا تو وہ کلمات لوٹا دیتا ہے اور وہ کلمات ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو گویا کہ انہوں نے اپنے خلاف بددعا کی ہے۔ اور اس کا معنی وہی ہوگا جو: لا

تقتلوا انفسكم۔ کا ہے یعنی ''بعض بعض کو قتل نہ کریں۔اھ'' اور پہلے معنی کی تائید یہ اگلا کلام کرتا ہے: فان الملائكه يؤمنون على ما تقولون۔ یعنی تم جو بھی اچھی یا بری دعا مانگتے ہو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔

قوله: قال: اللهم اغفر لابي سلمة الخ:

المهديين: پہلی یا مشدد ہے یعنی وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے اور پھر کائنات کے بہترین شخص کی طرف انہوں نے ہجرت کی۔

واخلفه: همزه وصل اور لام مضموم کے ساتھ' خلف يخلف سے مشتق ہے' یہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کے معاملات میں اور اس کے حفظ مصالح میں اس کے بعد اس کا قائم مقام ہو۔یعنی تو اس کا خلف بن جا' یا اس کا حلیفہ بن جا۔

عقبه: قاف مکسور ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اس کی اولاد میں۔اور زیادہ واضح معنی یہ ہے کہ جو بھی اسکے پیچھے ہیں اس کی اولاد وغیر اولاد۔اسی لیے ''في عقبه'' کا بدل ''في الغابرين'' اعادۂ جار کے ساتھ لایا گیا ہے اور طیبیؒ مزید فرماتے ہیں: یعنی باقی زندہ لوگوں میں پس ''في الغابرين'' یہ ''عقبه'' سے حال ہے ای أوقع خلافتك في عقبه كائنين في جملة لباقين من الناس (یعنی اپنی خلافت کو اس کے پسماندگان میں کر دے۔)

واغفرلنا: اور یہ درست ہے۔کہ جمع کی ضمیر اپنے مبارک نفس کی تعظیم کے لیے استعمال فرمائی ہو' یا ابوسلمہ اور دوسرے صحابہ کے لیے استعمال فرمائی ہو یا پوری امت کے لئے لائے ہوں۔

وله: یعنی ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو خصوصاً بخش۔تاکید کے لیے دوبارہ ذکر فرمایا ہے۔

في قبره: یہ عدم تنگی کی دعا ہے۔

ونورله فيه: یعنی ان کے لئے ان کی قبر میں روشنی کردے۔یا اس سے مراد تاریکی دور کرنا ہے۔

قوله: رواه مسلم: مصنفؒ اور مزید مختصر طور پر یوں بھی فرما سکتے تھے کہ چاروں احادیث کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

وصال کے بعد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر یمنی چادر کا ڈالنا

۱۶۲۰:وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّيَ سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبْرَةٍ۔

[متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۱۳/۳۔ حديث رقم ۱۲۴۱۔ ومسلم في صحيحه ۶۵۱/۲۔ حديث رقم (۴۸۔ ۹۴۲)۔ وابوداؤد في السنن ۴۸۹/۳ حديث رقم ۳۱۲۰۔ واحمد في المسند ۱۵۳/۶۔

ترجمه :حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یمنی چادر ڈالی گئی۔اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: توفي: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے' اور اسی طرح۔''سجي'' بھی بصغیۂ مجہول ہے۔

ببرد حبرة: اضافت کے ساتھ ہے اگر اضافت نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔اور "حبرة" بروزن "العنبة" ہے۔ یمانی چادر کو کہتے ہیں۔ جوہری نے اسی طرح ذکر کیا ہے'اور"غریبین" میں ہے۔ حبر ایسی چادر کو کہتے ہیں جس میں دھاریاں ہوں۔

توضیح واسنادی حیثیت: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ مسلم کی روایت میں "بثوب حبرة" کے الفاظ ہیں'اور اسی طرح اس حدیث کو امام ابوداؤد حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

الفصل الثانی:

۱۶۲۱: عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ کَانَ آخِرُ کَلَامِهٖ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

[رواه ابو داود]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۴۸۶ حدیث رقم ۳۱۱۶۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کی آخری کلام لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہو اوہ جنت میں داخل ہوگا۔اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال رسول اللّٰه: من کان آخر کلامه: لفظ "آخر" مرفوع ہے اور ایک قول کے مطابق منصوب ہے۔

"لا اله الا اللّٰه: اس کا محل اعراب نصب ہے'یا یہ خبر ہونے کے باعث یا (کان کا) اسم ہونے کے ناطے مرفوع ہے۔ میرکؒ نے کہا ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ" دوسرے جزء یعنی محمد رسول اللہ" سمیت مراد ہے کیونکہ یہ "کلمہ ایمان" کے لیے علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے خاتمے یعنی موت کے وقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ان کا یہ قول: "المراد مع قرینة" کا مطلب یہ ہے کہ وہ علم ظاہر کی حیثیت رکھتا ہے یا مطلق علم کی حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے اس صورت میں لفظی مفہوم پر اکتفاء جائز ہوگا اگر چہ معنی اور کا دوسرا جزء محمد رسول اللہ" مراد ہو اور یہ حدیث کا ظاہری اطلاق ہے۔

دخل الجنة (اس کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں:) ① عذاب سے پہلے خصوصی طور پر جنت میں داخل ہوگا۔ ② اپنے گناہوں کے بقدر عذاب جھیلنے کے بعد اور پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے تاکہ اس کی حالت اس مؤمنوں سے علیحدہ ہو جائے جن کا آخری کلام یہ کلمہ توحید نہ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پس اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ بہت سے مخالفین جیسے یہودی عیسائی کلمہ توحید کا تکلم کرتے ہیں' اس لیے اس کا دوسرا جزء "محمد رسول اللّٰه" کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ بے شک قرینہ'صدر رسالت سے صدور ہے۔اھ۔اس کی وجہ ظاہر نہیں ہے۔پس مناسب جواب یہ ہے کہ کلمہ توحید کے ساتھ دوسرا جزء یعنی" محمد رسول اللّٰه "تو مسلم کے لیے لازم ہے'اور رہے وہ مؤمن جن کے دل اللہ کے رسول کی محبت سے بھرے ہوتے ہیں۔اور آپؐ کی نبوت کے اعتراف سے لبریز ہوتے ہیں تو ان کے لیے آخری کلام میں ان کی طرف سے کلمہ توحید جو نبوت'اور آخرت پر

ایمان وغیرہ کو متضمن ہوتا ہے وہ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ مقاصد و مطالب کو خوب جاننے والا ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد شہادتیں ہیں اور'' لا الله الا الله ''تو ان کا ایک علم ہے اور ظاہر یہ ہے کہ کلام لسانی و قلبی دونوں کو شامل ہے' کیونکہ ایک روایت میں ''وهو يعلم'' کے الفاظ بھی ہیں' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جمع افضل ہے اور مراد یہ ہے کہ دل میں معرفت ہو۔

تخریج: امام سیوطی فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ اور حاکمؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

قریب المرگ کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنا

۱۶۲۲: وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِقْرَءُوْا سُوْرَةَ يٰسٓ عَلٰى مَوْتَاكُمْ۔ [رواه احمد وابو داود وابن ماجة]

اخرجه ابوداوٗد في السنن ٤٨٩/٣۔ حديث رقم ٣١٢١۔ وابن ماجه ٤٦٦/١ حديث رقم ١٤٢٨۔ واحمد في المسند ٢٦/٥۔

ترجمہ: حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سورۂ یٰسین اپنے مردوں پر پڑھو۔ اس کو ابوداؤد احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

تشریح: '' معقل ''میں میم پر فتحہ ہے اور قاف پر کسرہ ہے۔

'' موتاکم'' سے مراد قریب المرگ لوگ ہیں۔

سورۂ یٰسین پڑھنے کی حکمت:

شاید اس سورت کی تلاوت میں یہ حکمت یہ ہو کہ مرنے والا آدمی اس سورت سے مانوس ہو کیونکہ اس میں اللہ کا ذکر' قیامت وبعث کے حالات کا تذکرہ ہے۔

امام تورپشتی ؒ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ میت سے مراد وہ شخص ہو جس کی موت قریب ہو۔ گویا کہ اس کا حکم بھی مردوں کا سا ہو گیا ہے' اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حقیقی مردہ ہو جو (ابھی تک دفنایا نہ گیا ہو) اپنے گھر میں ہو یا اپنے مدفن کے پاس ہو۔

امام اپنی ''تفسیر کبیر'' میں فرماتے ہیں: قریب الوفات شخص پر سورۂ یٰسین پڑھنے کا حکم ہے' باوجودیکہ آپ کا یہ فرمان بھی ہے: لكل شيء قلب وقلب القران يٰسين'' کہ ہر چیز کا دل ہوتا ہے قرآن پاک کا دل سورۂ یٰسین ہے''۔ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ زبان اس وقت کمزور ہو چکی ہوتی ہے اور اس کی بولنے کی طاقت ختم ہو چکی ہوتی ہے لیکن دل مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے پاس وہ چیز (یعنی سورۂ یٰسین پڑھی جائے) جس سے اس کے دل کی قوت بڑھ جائے' اور وہ مدد حاصل کرتا ہے اس کی تصدیق کی اصول کے ساتھ چنانچہ یہ حالت ہی اس کا عمل اور کردار ہوتا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: ''اصل علم تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔ ہمیں اس میں جو راز معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سورت شروع سے آخر تک بڑے بڑے اہم اصول اور احکامات معتبرہ سے بھری ہوئی ہے' جو علمائے کرام نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیے

ہیں۔ جیسے آپ کی نبوت' دعوت وتبلیغ کی کیفیت' سابقہ امتوں کے احوال' تقدیر کا اثبات' مقابل وشریک کی نفی' علامات قیامت، حشر نشر کا بیان، عرفات، حساب کتاب' جزاء اور مرجع ومآب۔ اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ ایسے وقت میں یہ سورت تلاوت کی جائے۔

تخریج: امام سیوطی فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن ابی شیبہ، نسائی، حاکم اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے اور ابن ابی دنیا اور دیلمی نے ابودرداء سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مامن میت یقرأعند رأسه (سورة)یس الا هوّن الله علیه۔اه۔ ''جس میت کے سر کے پاس سورۂ یٰسین پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرمادیتے ہیں۔''اھ۔

اور ایک صحیح روایت میں ہے: **یس قلب القران لا یقرؤها عبدیر ید الدار الاخرة الا غفر الله ماتقدم من ذنبه فاقر ؤوها علی موتاکم**۔ ''یٰسین قرآن کا دل ہے اور جو بندہ بھی اس سورت کو آخرت کی کامیابی کے ارادے سے پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیتے ہیں۔ اس لیے اپنے مردوں پر اس کی تلاوت کیا کرو۔''

ابن حبانؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ شخص ہے جو قریب المرگ ہو۔ اس بات کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو ابن ابی دنیا اور مردویہ نے نقل کیا ہے: ''مامن میت یقرأ عنده یس الاهون الله علیه'' ''جس میت پر سورۂ یٰسین پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی پیدا فرماتے ہیں۔''

بعض متاخر محققینؒ نے اس (معنیٰ) کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہری الفاظ کو لیا ہے' چنانچہ وہ کہتے ہیں: آدمی کے مرجانے کے بعد یہ سورت اس وقت پڑھی جائے جب اسے کفن پہنا دیا گیا ہو۔

اور بعض کا موقف یہ ہے کہ یہ سورت اس کے قبر کے قریب پڑھی جائے۔ اس بات کی تائید ابن عدی وغیرہ کی روایت کرتی ہے: **من زار قبر والدیه او احدهما فی کل جمعة فقرا عندهما یس غفرله بعدد کل حرف منها**۔ ''جس نے ہر جمعہ اپنے والدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی قبر کی زیارت کی اور وہاں سورۂ یٰسین کی تلاوت کی تو اس کے ہر حرف کے بدلے اسے بخشا جائے گا۔''

میت کو بوسہ دینا جائز ہے

۱۶۲۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَ عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُوْنٍ وَهُوَ مَيِّتٌ وَهُوَ يَبْكِيْ حَتّٰى سَالَ دُمُوْعُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى وَجْهِ عُثْمَانَ۔

[رواه ابو داود والترمذی وابن ماجة]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۱۳/۳ حدیث رقم ۳۱۶۳۔ والترمذی ۳۱۴/۳ حدیث رقم ۹۸۹۔ وابن ماجه ۴۶۸/۱ حدیث رقم ۱۴۵۶۔ واحمد فی المسند ۴۳/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کی میت کو بوسہ دیا اور آپ ﷺ رو پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے آنسو حضرت عثمان بن مظعونؓ کے چہرے پر گرے۔ (ابوداؤد، ترمذی وابن ماجہ)

قبل: تشدید کے ساتھ ہے۔

راویٔ حدیث:

عثان بن مظعون: "مظعون" ظاء کے ساتھ، آپ کے رضاعی بھائی تھے۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ انہوں نے دونوں ہجرتیں کی ہیں۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے جاہلیت میں بھی اپنے اوپر شراب حرام کر رکھی تھی۔ یہ مدینہ میں فوت ہونے والے پہلے مہاجر ہیں۔ ہجرت کے تیسرے مہینے شعبان میں فوت ہوئے تھے۔ اور جب انہیں دفن کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: نعم السلف هولنا "وہ ہمارے لیے بہترین سلف ہیں"۔ ان کو بقیع الغرقد میں دفن کیا گیا۔ یہ بڑے عبادت گزار اور مجتہد صحابہ کرام میں سے تھے۔

تشریح: وهو ميت: مفعول سے حال ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: اس (حدیث) سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مرنے کے بعد اس کا بوسہ لیا جا سکتا ہے اور اس پر رویا بھی جا سکتا ہے۔

تخریج واسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام حاکمؒ نے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اور معنی ایک ہی ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

۱۶۲۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ قَبَّلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مَيِّتٌ۔

[رواه الترمذی وابن ماجة]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۶/۳۔ حدیث رقم ۱۲۴۲۔ والترمذی فی السنن ۳۱۵/۳ حدیث رقم ۹۸۹۔ والنسائی ۱۱/۴ حدیث رقم ۱۸۴۰۔ وابن ماجه ۴۶۸/۱ حدیث رقم ۱۴۵۷۔ واحمد فی المسند ۵۵/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو بوسہ دیا اس حال میں آپ ﷺ کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں سیدہ عائشہ اور ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے: کہ

"ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے فوت ہونے کے بعد آپؐ کا بوسہ لیا"۔

پس زیادہ بہتر یہی تھا کہ اس حدیث کو پہلی فصل میں لایا جاتا۔ اھ۔ اور حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث میں ہے جس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے: انه اتاه من قبل رأسه فحدرفاه فقبل جبهتة ثم قال: وانبياه ثم رفع راسه فحدرفاه وقبل جبهته ثم قال! واصفياه ثم رفع راسه فحدر فاه وقبل جبهته وقال واخليلاه۔

"ابوبکر صدیق آپؐ کے سر کی طرف سے آئے اور آپؐ کی پیشانی کا بوسہ لیا پھر فرمایا: ہائے اللہ کے نبی: پھر آپ کی پیشانی کا بوسہ لیا، پھر فرمایا: ہائے اللہ کے محبوب! پھر آپ اور فرمایا ہائے اللہ کے خلیل۔"

... ابن ابی شیبہ نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے فوضع فاہ علی جبین رسول اللہ ﷺ فجعل یقبله ویبکی

ویقول بابی انت وامی طبت حیا ومیتا۔ انہوں نے اپنا منہ رسول اللہ کی پیشانی پر رکھا اور پھر چومنے لگے اور رونے لگے اور کہہ رہے تھے: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ زندہ تھے تب بھی پاک تھے۔ آپ فوت ہو گئے تو تب بھی پاک ہیں۔'' مواہب میں بھی اسی طرح ہے۔

تکفین میں جلدی کرنے کا حکم

۱۶۲۵: وَعَنْ حُصَيْنِ بْنِ وَحْوَحٍ اَنَّ طَلْحَةَ بْنَ الْبَرَاءِ مَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهُ فَقَالَ اِنِّيْ لَآرٰى طَلْحَةَ اِلَّا قَدْ حَدَثَ بِهِ الْمَوْتُ فَآذِنُوْنِيْ بِهٖ وَعَجِّلُوْا فَاِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ لِجِيْفَةِ مُسْلِمٍ اَنْ تُحْبَسَ بَيْنَ ظَهْرَ انَيْ اَهْلِهٖ۔ [رواه ابو داود]

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳/ ۵۱۰ حديث رقم ۳۱۵۹۔

ترجمہ: حضرت حصین ابن وحوح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ طلحہ ابن براء رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور فرمایا کہ ''میرا خیال ہے کہ طلحہ کی موت قریب ہے لہٰذا جب ان کا انتقال ہو جائے تو مجھے ان کے انتقال کی اطلاع کر دینا (اور ایک روایت میں ہے کہ ''تا کہ میں ان کی نماز پڑھنے کے لئے آسکوں'') اور تم (غسل دینے' تجہیز و تکفین اور تدفین میں) جلدی کرنا کیونکہ مسلمان میّت کو اسکے اہل خانہ کے پاس روکے رکھنا مناسب نہیں۔ (ابوداوٗد)

راویٔ حدیث:

حصین بن وحوح: وحوح'' میں واؤ مفتوح حائے مہملہ ساکن اور اس کے بعد واؤ مفتوح ہے۔

طلحہ بن براء: مؤلف نے کہا ہے یہ وہ صحابی ہیں کہ ان کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اللهم الق طلحة وانت

تشریح: تضحك اليه ويضحك ''اے اللہ! طلحہ سے مسکراتے ہوئے ملاقات کرنا اس حال میں کہ یہ بھی مسکرا رہا ہو۔'' ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے ان سے حصین بن وحوح نے روایت نقل کی ہے۔

لا أری: ہمزہ مضموم ہے۔ یعنی میرا گمان نہیں ہے۔

الا قد حدث: ای ظهر به۔

فآذنونی: پہلے مد ہے پھر ذال مکسور ہے۔ اور (دوسرا ضبط یہ ہے کہ) ہمزہ ساکن ہے اور ذال مفتوح ہے۔

فانہ: یہ ضمیر شان ہے۔

قوله: فانه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس) یعنی مسلمان کے جسم کو روکا جائے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: ''جیفۃ مسلم'' کا وصف عدم جس کے حکم سے مناسبت رکھتا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ مؤمن محترم و مکرم ہوتا ہے تا کہ اس کا احترام باقی رہے۔ یہاں پر ''جیفة'' کا تذکرہ ایسے ہے جیسے قرآن پاک نے ''سوأة'' کا تذکرہ کیا ہے: ﴿كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْاَةَ اَخِيْهِ﴾ [المائدۃ۔ ۳۱] ''کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے''۔ ''سوأة'' رسوائی کو کہتے ہیں۔

میرکؒ نے کہا ہے: ''حيفة مسلم'' میں اس کے پلید ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔

بین ظهرانی أهله ای بین أهله: (یعنی گھر والوں کے درمیان) اور "ظهر" مقحم ہے۔ (پیٹھ کو کہتے ہیں)۔ اور عرب "تثنیہ" کو "جمع" کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

میرکؒ ازہار سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہا جاتا ہے "هو بین ظهرانی اهله" یعنی ان کے درمیان پیٹھ کر کے یا ٹیک لگا کر کھڑا ہے گویا کہ وہ ان کی پیٹھوں کے درمیان ہے یعنی وہ ان کی ایک طرف سے یا ہر طرف سے گھرا ہوا ہے۔ جب کہا جائے کہ "بین أظهرهم۔" قوم کے درمیان مطلق اقامت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور الف اور نون زائدہ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میت کو زیادہ دیر نہ رکھو کہ اس سے بدبو پھیل جائے اور اس سے پسماندگان کا غم اور بڑھ جائے"۔ اھ۔ اس معنوی تحقیق سے ابن حجرؒ کا یہ قول باطل ٹھہرا کہ "اس میں تثنیہ صرف لفظی طور پر ہے۔"

اسنادی حیثیت: اما میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت پر انہوں نے سکوت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

قریب المرگ شخص کے لیے کلمات کی تلقین

۱۶۲۶: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ لِلْاَحْيَاءِ قَالَ اَجْوَدُ وَاَجْوَدُ۔ [رواہ ابن ماجۃ]

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۴٦٥ حدیث رقم ۱۴۴٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے قریب المرگوں کو یہ کلمہ تلقین کرو: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ جو بردبار بزرگ ہے۔ اللہ بڑے عرش کا پروردگار ہے سب تعریفیں عالموں کے پروردگار کے واسطے ہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! تندرستوں کو سکھلانا کیسا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہتر اور بہتر ہے۔ یہ روایت ابن ماجہؒ نے نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن جعفر: یہ عبداللہ بن جعفر ابن ابی طالب ہیں۔ ارض حبشہ میں پیدا ہوئے تھے۔ حبشہ میں پیدا ہونے والے پہلے مسلمان ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ سخی، پاکدامن اور بردبار تھے۔ انہیں "بحر الجود" (سخاوت کا سمندر) کہا جاتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ اسلام میں ان سے زیادہ سخی کوئی نہیں تھا۔ ان سے خلق کثیر روایت کرتی ہے۔ یہ بات مؤلف نے ذکر کی ہے۔

تشریح: الکریم: وہ ذات جو بن مانگے عطا کرتی ہے۔

سبحان اللہ: ہر اس چیز سے جو تیرے دل میں خیال آئے۔ کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ دور ہے۔

رب العرش: اس میں اضافت تشریفی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکان وقید سے مبرا ہے۔

العظیم: یہ مضاف یا مضاف الیہ کی صفت ہے۔ اگر مضاف الیہ کی صفت ہو تو یہ زیادہ بلیغ ہے۔ عرش کا وصف ''العظیم'' لایا گیا ہے کیونکہ عرش تمام مخلوقات سے بڑا ہے اور پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہیں۔

الحمد للّٰہ: اور ایک نسخے میں (واؤ کے ساتھ) ''والحمد للّٰہ'' یعنی زندگی اور موت پر۔

رب العلمین: تمام جہانوں کا خالق ومربی ہے۔

قالوا یا رسول اللّٰہ کیف؟: یہ تلقین صحت مند لوگوں کے لیے درست ہے یا نہیں؟

قولہ: قال: اجود واجود: یعنی اچھا ہے اچھا ہے، تاکید اور مبالغے کے لیے مکرر لائے ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تکرار استمرار کے لیے ہے ای جودۃ مضمومۃ الی جودۃ۔ یعنی اچھائی اچھائی کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور یہ معنی اس جملہ میں مذکور واؤ کا ہے۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: ابن عساکرؒ نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے روایت نقل کی ہے: قال: سمعت من رسول اللّٰہ ﷺ کلمات من لھن عند وفاتہ دخل الجنۃ لا الہ الا اللّٰہ الحکیم الکریم ثلاث مرات الحمد اللّٰہ رب العالمین ثلاث مرات تبارك الذی بیدہ الملك یحیی ویمیت وھو علی کل شیٔ قدیر۔ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ کلمات سنے ہیں، جو آدمی اپنی وفات کے وقت وہ کلمات پڑھ لے وہ جنت میں داخل ہوگا اور وہ کلمات یہ ہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ تین مرتبہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ تین مرتبہ۔ اس کے بعد: تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔''

فاسق اور مؤمن کے آخری وقت میں فرق

۱۶۲۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوْا اُخْرُجِیْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِیْ حَمِيْدَةً وَّاَبْشِرِیْ بِرَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ وَّرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانٌ فَيُقَالُ مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ كَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُدْخُلِیْ حَمِيْدَةً وَّاَبْشِرِیْ بِرَوْحٍ وَّرَيْحَانٍ وَّرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَنْتَهِیَ اِلَى السَّمَاءِ الَّتِیْ فِيْهَا اللّٰهُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اُخْرُجِیْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ كَانَتْ فِی الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ اُخْرُجِیْ ذَمِيْمَةً وَّاَبْشِرِیْ بِحَمِيْمٍ وَّغَسَّاقٍ وَّاٰخَرَ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٍ فَمَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هٰذَا فَيُقَالُ فُلَانٌ فَيُقَالُ لَا مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الْخَبِيْثَةِ كَانَتْ فِی الْجَسَدِ الْخَبِيْثِ اِرْجِعِیْ ذَمِيْمَةً فَاِنَّهَا لَا تُفْتَحُ

لَكِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ فَتُرْسَلُ مِنَ السَّمَاءِ ثُمَّ تَصِيرُ اِلَى الْقَبْرِ۔ [رواه ابن ماجة]

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱۴۲۳/۲ حديث رقم ۴۲۶۲۔ واحمد في المسند ۳۶۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی قریب الموت ہوتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ جب آدمی نیک ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے کہتے ہیں اے پاک جان! پاک بدن سے نکل' اس حالت میں کہ خدا اور مخلوق کے سامنے تیری تعریف کی گئی ہے اور جنت میں راحت اور پاک رزق کی اور اپنے ربّ کی ملاقات کی جو تجھ سے ناراض نہیں ہے۔ پس اسے مسلسل یہی بات کہی جاتی ہے تو وہ خوش ہو کر باہر نکلتی ہے۔ پھر اس کو فرشتے آسمان کے کھلوانے کے بعد یا پہلے ہی سے کھولا جاتا ہے' لے جاتے ہیں۔ پھر آسمان کے دربان کہتے ہیں یہ شخص کون ہے؟ روح کو لے جانے والے فرشتے کہتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہے یعنی فلاں آدمی کی روح ہے۔ اس کا نام ونشان ذکر کرتے ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے خوش بختی ہے پاک جان کے لیے۔ کہ جو پاک بدن میں تھی۔ اس حالت میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کو راحت اور پاک رزق کی خوشخبری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ اس حالت میں کہ وہ غصے نہیں ہے۔ پھر جان کو بدستور اسی طرح کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔ جس آسمان میں خدا کی خاص رحمت ہوتی ہے' جب آدمی برا ہوتا ہے (یعنی کافر) ملک الموت کہتا ہے اے بری جان تو نکل جو برے بدن میں تھی۔ اس حال میں نکل کہ برائی کی گئی ہے اور خوشخبری ہو تجھے گرم پانی اور پیپ اور طرح طرح کے عذابوں کی جو مذکور ہو چکا ہے۔ پھر جان کو بدستور کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کراہت کے ساتھ نکلتی ہے۔ پھر فرشتے اس کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی ذلت کو ظاہر کرنے کے لیے آسمان کے دروازے اس کے لیے کھلوائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ناپاک جان کے لیے ناخوشخبری ہو۔ جو ناپاک بدن میں تھی۔ لوٹ جا اس حال میں کہ برائی کی گئی ہے۔ تیرے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے پس آسمان سے چھوڑ دی جاتی ہے اور قبر کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: الميت تحضره الملائكة:

الميت: اس سے مراد جنس ہے' قریب الوفات شخص مراد ہے۔

تحضره الملائكة: رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے مراد ہیں۔ (قالہ ابن حجرؒ) اور چونکہ زیادہ واضح یہ ہے کہ دونوں کے ملائکہ اکٹھے ہوتے ہیں' میت کی جنس مبہم ہے۔ پھر جب آخر میں صلاح و فجور کا علم ہو جاتا ہے تو اس کے مطابق ملائکہ اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔

قوله: فاذا كان الرجل صالحًا: یہاں ''صالح'' سے مراد مؤمن ہے۔ یا اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے والا مراد ہے' اور فاسق کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن وسنت کا اسلوب ہے' تا کہ وہ خوف وامید کے درمیان رہے اور اس بحث سے ابن حجرؒ کے اس قول کا دفعیہ بھی ہو جاتا ہے کہ ''اس کے مقابلہ میں ''کافر'' کو ذکر کرنا پہلے احتمال (یعنی مؤمن مراد ہو) کی تائید ہوتی ہے''۔ حالانکہ لفظ کافر اس حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ اس حدیث میں ''الرجل السوء''

کا ذکر ہے اور یہی مناسب ہے کہ ''صالح'' کے مقابلے میں لایا جائے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ''مؤمناً'' کے بجائے ''صالحًا'' کا لفظ لائے ہیں اور اگر برے آدمی سے مراد کافر ہے سیاق کلام اس پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔

اور ہم نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ فاسق کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے تو اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴾ [المؤمنون ۱۰۲۔۱۰۳] ''تو جن کے (عملوں کے) بوجھ بھاری ہوں گے وہ فلاح پانے والے ہیں اور جن کے بوجھ ہلکے ہوں گے وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے'' اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ﴾ [الحاقۃ:۱۹] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا﴾ [ھود: ۱۰۸] اور اسی طرح کی دوسری آیات اور احادیث۔

الطيبة: یعنی اعتقاد کے لحاظ سے یا اخلاق کے لحاظ سے یا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنے والی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والی۔

صوفیہ نے ''روح'' اور ''نفس'' کے درمیان جو فرق ذکر کیا ہے وہ ایک امر اعتباری ہے کیونکہ وہ ''نفس'' کو شر کے مظہر سے کنایہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ [یوسف: ۵۳] اور وہ روح کو خیر کے مظہر سے کنایہ کرتے ہیں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ [الاسراء: ۸۵] ''کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔''

قوله: كانت في الجسد الطيب: كانت: جملہ متانفہ ہے تعلیل کا بیان ہے۔

في الجسد الطيب: یعنی اعمال یا اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم کی تعمیل کرنے کے ساتھ۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر ''كانت'' کی بجائے ''كنت'' ہونا چاہیے تھا تاکہ ندا اور ''اخرجي'' کے ساتھ مطابقت ہو جاتی۔ لیکن لام موصولہ کا اعتبار کیا گیا ہے ای ''النفس التي طابت كائنة في الجسد'' اور ہو سکتا ہے کہ یہ ''نفس'' کی دوسری صفت ہو۔ کیونکہ اس سے کوئی معین نفس مراد نہیں ہے بلکہ مطلق جنس مراد ہے۔ اھ۔ ابن حجر نے اسی کی متابعت کی ہے۔ اور دونوں صورتوں میں مناقشہ ہے' کیونکہ جمہور کے نزدیک صفت مشبہ کا الف لام موصولہ نہیں ہوتا۔ اور نداء اور خطاب کے وقت ''نفس'' معین ہوتا ہے اگرچہ آپ کے خبر دینے کے وقت کوئی نفس معین نہیں تھا۔

اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''كانت'' اس سوال ما سبب طيبها؟ کہ اس کے پاکیزہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ روح ہمیشہ ایک ایسے پاک جسم میں رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت اور معاصی میں واقع ہونے سے سالم رہا ہے۔ ابن حجرؒ کا یہ قول درست نہیں ہے۔ بلکہ درست بات یہ ہے کہ اس سے مراد اس کا دل ہے۔) یعنی ابن حجر نے جو بیان کیا اس کا الٹ اور عکس ہے۔ کیونکہ روح کا پاکیزہ ہونا قالب کے پاکیزہ ہونے کے لیے سبب ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ جیسا کہ آپ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے: اذا أصلح القلب صلح الجسد كله۔

''جب دل صحیح ہو تو سارا جسم صحیح ہوتا ہے۔''

اور اس لیے بھی کہ دنیا میں معدن تکلیف اور منبع خطاب ہے۔ اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔ اور اسی (قبیل) سے ان کا یہ قول ہے: أخرجي۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ روح ایک لطیف جسم ہے جو دخول خروج' صعود و نزول سے موصوف ہوتا ہے۔ یہ دوسرا خطاب ہے یا پھر تاکید ہے اگلے قول کی۔

حميدة: یہ بمعنیٰ "محمودة" ہے یعنی اچھی تعریف کی ہوئی یا بمعنیٰ "حامدة" ہے حمد و شکر بیان کرنے والی۔

قوله: وأبشري بروح و ريحان و رب غير غضبان:

روح: راء کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنیٰ راحت

ریحان رزق یا خوشبو مراد ہے اور اس میں تنوین تعظیم و تکثیر کے لیے ہے۔

ورب: (اس سے پہلے مضاف حذوف ہے۔) ای بملاقاۃ۔

غير غضبان: منصرف ہے اور ایک نسخہ میں غیر منصرف ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "راضي" سے "غير غضبان" کی طرف عدول رعایت فاصلہ یعنی سجع کی رعایت کے پیش نظر ہے۔اھ۔ یہ محل نظر ہے: کیونکہ قطع نظر اس کے کہ "راضي" بنسبت "غير غضبان" زیادہ بلیغ ہے پس عدول کی بات یہ ہے کہ عدول نہیں ہے۔ فتامل۔

طیبی فرماتے ہیں: "روح" بمعنیٰ "استراحة" ہے اور اگر راء کے ضمہ کے ساتھ مروی ہوتا تو وہ "رحمت" کے معنی میں ہوتا۔ کیونکہ وہ "مرحوم" کے لیے "روح" کی مانند ہے۔ میں کہتا ہوں: "روح" فتحہ کے ساتھ بھی رحمت کے معنی میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ﴾[یوسف:۸۷] ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنیٰ "بقاء" ہے۔ یعنی یہ دونوں اس کے لیے اکٹھے ہیں یعنی خلود اور رزق اور "رب" یہ پہلے کے لیے طرد و عکس کی بنا پر تقریر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔: ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾[الفاتحہ۔۷] اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾[الفجر۔۲۸۔۲۷] اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا روایت کے مخالف ہے کہ "روح" راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قوله: فلا تزال يقال لها ذالك۔۔۔ الى السماء التي فيها الله: مراد انواع بشارۃ ہیں' جس کو سن کر اس کی خوشی دوبالا اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

يعرج: فعل مجہول ہے۔

فيفتح لها: یعنی دستک دینے کے بعد یا اس سے پہلے ہی کھول دیا جاتا ہے اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں روح کے ساتھ موجود فرشتے روح کے لئے آسمان کے دروازے کھلوانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ابن حجرؒ کے اس قول کی کوئی وجہ نہیں بنتی' گویا کہ انہیں وہم ہوا کہ "يفتح" کی بجائے "يستفتح" ہے۔

فيقولون: اور ایک صحیح نسخے میں "فيقال" ہے یعنی اس کے ساتھ والے رحمت کے فرشتے کہتے ہیں۔

فلان (یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔) ای هذا فلان۔ یعنی یہ فلاں ہے' مراد فلاں کی روح ہے۔

قوله : فیقال مرحباً بالنفس الطیبة کانت فی الجسد الطیب:

ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی ہے: کہ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے باوجودیکہ اوپر ہوتے ہیں، وہ ہر انسان کو اس کے نام اور اس کے عمل سمیت جانتے ہیں۔ اھ۔ ان کی خطاء مخفی نہیں' کیونکہ علوی فرشتے کو اس کا نام اس وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ رحمت والے فرشتوں سے سوال کرتے ہیں اور رحمت والے فرشتے اس کی روح کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور اس کے نیک عمل کی وجہ سے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔

أدخلي: ① یعنی بلند آسمانوں میں داخل ہو جا۔ ② میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ ③ میرے بندوں کی جائے ارواح میں داخل ہو جا۔

حمیدة: " محمودة یا "حامدة" کے معنی میں ہے۔

یقال لها ذلك: یہ اشارہ ہے جو کچھ ذکر ہے جیسے دخول کا حکم اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف چڑھنے کی بشارت کی طرف۔

إلی السماء التی فیها الله: جہاں اس کا امر اور حکم ہے۔ یعنی جہاں اس کی بادشاہت کا ظہور ہے اور وہ عرش ہے۔

امام طیبی کہتے ہیں یعنی اسی کی رحمت ہے' جنت کے معنی میں ہے۔ ابن حجر نے اس قول میں ان کی پیروی کی ہے۔ طیبی مزید فرماتے ہیں اسی کی مانند اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ...... ﴾[آل عمران۔۱۰۷] "اور جن لوگوں کے منہ سفید ہونگے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے" حدیث ان دو آیتوں کے موافق ہو جائے گی: ﴿ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴾[الفجر۔۳۰] ﴿وَجَنَّتُ نَعِيمٍ﴾[الواقعہ۔۸۹] ہم کہتے ہیں: اس کا اس جنت میں داخل ہونا جو آسمانوں پر ہے اور اسکی چھت رحمٰن کا عرش کا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ وہ بلند آسمان اور پاکیزہ مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے مناسب یہ حدیث ہے: بے شک مؤمنوں کی روحیں عرش کے نیچے قنادیل میں بسا کرتی ہیں' باوجودیکہ جنت کا کسی متعین آسمان میں ہونا کسی خبر اور اثر سے معروف نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾[آل عمران۔۱۳۳] "جس کا عرض آسمان وزمین کے برابر ہے۔"

قوله: فإذا کان الرجل۔۔۔۔ثم یعرج بها الی السماء:

الرجل: رفع کے ساتھ ایک قول میں نصب کے ساتھ بشرطیکہ "کَانَ" تامہ ہو یا ناقصہ۔

قوله السوء: سین کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ۔ یہ " رَجُلٌ " کی صفت ہے۔ ابن حجر کا پہلے کو مرفوع اور دوسرے کو منصوب جائز قرار دینا روایت کے مخالف ہے۔ اور ان کا قول اگر "کَانَ" تامہ ہے ای فاذا وجد ای وجده یعنی کافر یا فاسق' صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگلے اوصاف کافر کے متعلق ہیں جیسا کہ کتاب وسنت کی عادت ہے کہ مؤمن اور کافر کی حالت تو بیان کی جاتی ہے۔ فاجر کی حالت پر سکوت کیا جاتا ہے' یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور رحمت ہے تاکہ وہ خوف ورجاء کے درمیان رہے۔

قال: یعنی ملک الموت یا عذاب والے فرشتوں کا سردار یا ان میں سے ہر ایک کہے گا۔ چنانچہ یہ مطابق ہو جائے گا جمع کے

گذرے ہوئے صیغہ کے۔

أيتها النفس الخبيثة: یعنی اعتقادی لحاظ سے یا احوال کے اعتبار سے خبیث روح۔

كانت في الجسد الخبيث: اعمال کے لحاظ سے۔

ذميمة: " مذمومة" کے معنی میں ہے۔

أبشري: طیبیؒ کہتے ہیں: استعارہ "تھکیه" ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فبشرهم بعذاب اليم۔ یہ مشاکلت وازدواج ہے اور "حميم وغساق" یہ "روح وريحان" کے مقابل ہے۔

حميم: انتہا درجے کا گرم پانی۔

غساق: تخفیف اور تشدید کے ساتھ۔ جہنمیوں کے زخموں سے بہے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ ٹھنڈا بدبودار۔ اور کہا گیا ہے اگر اس کا ایک قطرہ مشرق میں پھینکا جائے تو اس کی بدبو مغرب والوں تک پہنچے گی اور اُسے بدبودار بنا دے گی۔ حسن سے روایت ہے کہ غساق عذاب کا نام ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

وآخر: (موصوف محذوف کی صفت ہے) اى بعذاب آخر یعنی اور دوسرے عذاب۔ ایک نسخہ میں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ (اس کی ترکیب بھی مثل سابق ہوگی)۔ اى بأنواع أخر من العذاب معنی یہ ہے کہ مختلف قسم کے عذاب۔ اور ابن حجر کے اس قول: "وضرب أخر مذ وقة ويصح فتح أوله أى ونوع آخر" میں سامحت ہے' چونکہ حق یہ تھا کہ وہ یوں کہتے کہ حرف اول کے مد کے ساتھ۔ پھر ان کا جمع کو اصل قرار دینا اور مفرد کو جائز قرار دینا معتمدہ اصول اور تصحیح شدہ نسخوں کے خلاف ہے۔

من شكله یعنی مذکورہ حرارت اور کڑواہٹ کی طرح۔

أزواج: جر کے ساتھ ہے۔ اقسام۔

طیبیؒ کہتے ہیں: قوله: وأخر اى مذوقات أخر یعنی غساق کی طرح کے شدید وفظیع انواع عذاب ہوں گے۔ اھ۔ ابن حجر نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ صرف "غساق" کی طرف ضمیر لوٹانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ قریب واقع ہے۔ پس صحیح بات وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ مفرد ضمیر باعتبار مذکور کے ہے۔

کہا ہے کہ "آخر" محلاً مجرور ہے اس کا "حميم" پر عطف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ محل جر میں نہیں ہے بلکہ غیر مصرف ہونے کی وجہ سے اس کا جر فتحہ کے ساتھ ہے۔ فرمایا کہ "ازواج" یہ "آخر" کی صفت ہے اگرچہ مفرد ہے' اس لیے کہ وہ "ضروب اور" اصناف" کی تاویل میں ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

ع معى جياعًا

ظاہر یہ ہے کہ وہ نوع کی تاویل میں ہے۔ ابو عمروؒ نے آیت میں "آخر" کو جمع کے صیغہ کیساتھ پڑھا ہے۔

حتى تخرج: ناچاہتے ہوئے نکلے گی۔

ثم يعرج بها إلى السماء: یعنی ذلت اور اہانت کا اظہار کرنے کے لئے۔

فیفتح لھا: ای یستفتح لھا یعنی دروازہ کھولنے کا کہا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ﴾[الاعراف: ٤٠] "ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔"

قولہ: فیقال من ھذا؟ فیقال: فلان: ظاہر یہ ہے کہ وہ صرف اس کو اس کے نام سے پہچانتے ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ "فلان" کنایہ ہوتا کہ دوسروں سے اس کا امتیاز ہو جائے۔ اور اس سے اس کا تمام معاملہ معلوم ہو جائے۔

ارجعی ذمیمۃ: ذمیمۃ" بمعنی "مذمومه" ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں اور مخلوق کے ہاں مذموم ہے۔

فانھا: ضمیر قصہ ہے۔

لا تفتح: بصیغہ مذکر و مؤنث اور تخفیف و تشدید کے ساتھ ہے۔

فترسل: یعنی اس کو لوٹا دیا جائے گا۔ اور عنقریب آگے آ رہا ہے کہ پھینک دیا جائے گا۔

تصیر: بمعنی "ترجع" ہے یعنی لوٹ آئے گی۔ اور اس کو ہمیشہ کے لیے اسفل السافلین میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ مؤمن کی روح کا معاملہ اس کے عکس ہے۔ کہ وہ آسمانوں اور زمین کی سیر کرتی ہے اور جنت میں جہاں چاہتی ہے جاتی ہے۔ عرشِ رحمٰن کے نیچے لگی قنادیل میں بسیرا کرتی ہیں۔ اس کا تعلق جسم کے ساتھ کلیاً ایسے ہوتا ہے' کہ وہ قبر میں قرآن پڑھتا ہے نماز ادا کرتا ہے' نعمتیں حاصل کرتا ہے۔ دلہن کی طرح سوتا ہے۔ اور جنت میں اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق اپنے درجات دیکھتا ہے۔ روح کا معاملہ اور برزخ اور آخرت کے تمام احوال خوارق عادات ہیں۔ آیات پر ایمان رکھنے والے مؤمن کو ان کے متعلق کوئی اشکال نہیں ہوتا۔

اسنادی حیثیت: امام میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی اسناد صحیح ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر کی روح کا ذکر کرتے ہوئے کراہت محسوس فرمائی

۱۶۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا خَرَجَتْ رُوْحُ الْمُؤْمِنِ تَلَقَّاهَا مَلَكَانِ یُصْعِدَ انِهَا قَالَ حَمَّادٌ فَذَكَرَ مِنْ طِیْبِ رِیْحِهَا وَذَكَرَ الْمِسْكَ قَالَ وَیَقُوْلُ اَهْلُ السَّمَاءِ رُوْحٌ طَیِّبَةٌ جَاءَ تْ مِنْ قِبَلِ الْاَرْضِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْكِ وَعَلٰى جَسَدٍ كُنْتِ تَعْمُرِیْنَهٗ فَیُنْطَلَقُ بِهٖ اِلٰى رَبِّهٖ ثُمَّ یَقُوْلُ اِنْطَلِقُوْبِهٖ اِلٰى اٰخِرِ الْاَجَلِ قَالَ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا خَرَجَتْ رُوْحُهٗ قَالَ حَمَّادٌ وَذَكَرَ مِنْ نَتْنِهَا وَذَكَرَ لَعْنًا وَیَقُوْلُ اَهْلُ السَّمَاءِ رُوْحٌ خَبِیْثَةٌ جَاءَ تْ مِنْ قِبَلِ الْاَرْضِ فَیُقَالُ اِنْطَلِقُوْا بِهٖ اِلٰى اٰخِرِ الْاَجَلِ قَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ فَرَدَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَیْطَةً كَانَتْ عَلَیْهِ عَلٰى اَنْفِهٖ هٰكَذَا۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٢٠٢ حدیث رقم (٧٥۔ ٢٨٧٢)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس وقت مؤمن کی روح نکلتی ہے اس کو دو فرشتے لے کر اوپر چڑھتے ہیں۔ (اس کو حمادؒ نے کہا ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کے راوی ہیں۔۔ پس

حضور ﷺ نے یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی خوشبو یا مشک کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس سے مشک کو بو آتی ہے۔ اس طرح اس لیے کہا کہ راوی کو الفاظ نبوی ﷺ بعینہٖ یاد نہ رہے ہوں) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور آسمان والے کہتے ہیں کہ پاک روح زمین کی طرف سے آتی ہے۔ اس کے بعد روح کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ تجھ پر اللہ کی رحمت ہو اور اس جسم پر بھی اللہ کی رحمت ہو کہ تو اس کو آباد رکھتی تھی پھر اس کو پروردگار کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو قیامت تک مہلت دے دی جائے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کافر کی روح نکلتی ہے حماد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کی بد بو کا ذکر کیا اور اس کی لعنت کا اور آسمان والے کہتے ہیں کہ ناپاک روح زمین کی طرف سے آئی ہے۔۔ پھر کہا جاتا ہے اس کو لے جاؤ اور قیامت تک مہلت دے دو۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ آپ ﷺ پر چادر تھی آپ ﷺ نے اپنی ناک پر اس طرح سے چادر کو رکھا۔ (مسلم)

تشریح: قوله: اذا خرجت روح المؤمن تلقاها ملكان يصعدانها:

تلقاها ملكان يصعدانها: یہ پچھلے مجمل کی تفصیل ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ معزز لکھنے والے دو فرشتے ہوں۔ اور پیچھے جو گذرا ہے یہ اس کے ساتھ جمع ہونے کے منافی نہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اقل جمع دو ہے۔ ان کے نزدیک تو یہ واضح ہے۔ اور دیگر قائلین کے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ اس موقع پر حاضر تو کئی فرشتے ہوتے ہیں اور جن کے سپرد یہ معاملہ ہوتا ہے وہ دو ہوتے ہیں اور باقی اس کی روح سے کہتے ہیں اے نفس! یا کہنے والا ایک ہوتا ہے اور تمام کی طرف نسبت مجازاً ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَعَقَرُوْهَا﴾ [هود: ٦٥] اور لوگوں کا یہ مقولہ: قتله بنو فلان۔ اس کی تائید حضرت براء کی اگلی حدیث سے ہوتی ہے۔

قوله: قال حماد فذكر: یہ حماد ابن زید ہیں جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں۔ یہ قول طیبیؒ کا ہے۔ اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یوں کہا جائے یہ وہ راوی ہے جس نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرۃ سے روایت کیا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ بمنزلہ تشبیہ ہے یا استعارہ یا اس کے علاوہ کچھ اور۔ ابہریؒ فرماتے ہیں زیادہ واضح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ وذكر ان طيب ريحها أطيب من ريح المسك یعنی یہ ذکر کیا کہ اس کی خوشبو کستوری کی خوشبو سے بھی اعلیٰ ہے۔

قوله: قال: ويقول أهل السماء ۔۔۔ انطلقوا به الى آخر الاجل: ويقول أهل السماء: جنس مراد ہے۔ ای اهل كل سماء۔

روح طيبة: یہ مبتدا ہے یا ''ھی'' محذوف کی خبر ہے۔

من قبل الأرض: ''قاف'' کے کسرہ اور ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ ''روح'' کی دوسری صفت ہے۔

عليك: طیبیؒ کہتے ہیں: ''عليك'' میں ''جاءت'' غائب سے حاضر کی طرف التفات ہے اس کا فائدہ اس پر مزید رحمت کا اختصاص ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ مزید ہم کلامی کی لذت بھی ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: غیر انبیاء وملائکہ پر ''صلوۃ'' استقلالاً مکروہ ہونے کا محل وہ صورت ہے جب فرشتوں اور انبیاء کے

علاوہ دوسروں سے صادر ہو ان سے صادر نہ ہو۔ چونکہ علماء نبی کریم ﷺ کے آل ابی اوفی پر درود بھیجنے کے بارے میں فرماتے ہیں: "إنه من تبرع صاحب الحق به"۔اھ۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ ان کی خصوصیات میں سے ہے' چونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔[التوبة: ۱۰۳] اور دوسری جگہ فرمایا: وهو الذي يصلي عليكم۔

[الاحزاب: ۴۳]

تعمرينه: میم کے ضمہ کے ساتھ۔

یعنی تیرے ظاہر اور باطن پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے۔

باطن کو اس کی اہمیت کی وجہ سے مقدم کیا ہے اور اس لئے بھی کہ باطن پر نظر اتم ہے۔

امام طیبی کہتے ہیں: یہ استعارہ ہے' بدن کو عمل صالح کے ساتھ تدبیر کو تشبیہ دی گئی اس آدمی کے ساتھ جو کسی شہر کو بنائے اور اس کو عدل اور احسان سے آباد کرے۔

فينطلق: مجہول کا صیغہ ہے۔ایک روایت میں جمع کے صیغہ کے ساتھ "فينظلقون" ہے۔

إلى ربه: حکم کی جگہ پر۔یا اپنے رب کے عرش کے پاس جو اس کے قرب کا مقام ہے (کے پاس لے جاتے ہیں) اور اگلی حدیث میں ہے کہ "الى اسماء السابعة" (یعنی ساتویں آسمان پر لے جاتے ہیں۔) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کو لے جاؤ' تاکہ اس کا ٹھکانا جنت میں ہو جائے یا اس کے پاس ہو جائے پھر اس کو ہماری طرف لوٹاتا ہے ہمارے حکم ازلی کی بدولت۔

یہاں "أجل" سے مراد برزخ کی مدت ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کے لیے دو اجل ہیں' اولاً اور آخراً۔اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے: ﴿ثُمَّ قَضٰى أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ﴾[الانعام۔۲] یعنی موت کی اَجل اور قیامت کی اُجل۔

من نتنها: تاء کے سکون کے ساتھ۔

و ذكر لعناً: اس بدبو کی وجہ سے۔بدبو سے دور بھاگنا لازم آتا ہے۔

قوله: فيقال: انطلقوا به الى آخر الأجل:

امام طیبیؒ کہتے ہیں: یہاں "يقال" فرمایا اور پہلے "يقول" فرمایا' حسن ادب کی رعایت کی وجہ سے ہے۔اس اعتبار سے کہ "رحمت" کی نسبت "اللہ" کی طرف ہے اور "غضب" کی نسبت "اللہ تعالیٰ" کی طرف نہیں ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ [الفاتحہ: ۵]

ريطة: راء کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ' چادر کا کنارہ۔

على أنفه: ردّ کے متعلق ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: گویا آپؐ پر کافر کی روح کشی کا منظر منکشف ہو گیا اور آپؐ کو اس کی روح کی بدبو محسوس ہوئی۔

ابن حجر کہتے ہیں: احتمال ہے کہ یہ تمثیل ہو۔یعنی اس میں تعفن اور قباحت اس قدر ہے کہ اگر تم میں سے کسی کے لیے ظاہر ہو جائے تو وہ اپنی ناک کو اس طرح ڈھانپ لے گا۔اھ۔یہ حدیث کے ظاہر سے خروج ہے جس کا کوئی باعث عقلی نقلی ہے اور نہ۔

مؤمنوں کی ارواح کا بعد میں آنے والی روحوں سے احوال پوچھنا

۱۶۲۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حُضِرَ الْمُؤْمِنُ اَتَتْ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ بِحَرِيْرَةٍ بَيْضَاءَ فَيَقُوْلُوْنَ اُخْرُجِیْ رَاضِيَةً مَّرْضِيًّا عَنْكِ اِلٰى رَوْحِ اللّٰهِ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَتَخْرُجُ كَاَطْيَبِ رِيْحِ الْمِسْكِ حَتّٰى اَنَّهٗ لَيُنَاوِلُهٗ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَاْتُوْا بِهٖ اَبْوَابَ السَّمَاءِ فَيَقُوْلُوْنَ مَا اَطْيَبَ هٰذِهِ الرِّيْحُ الَّتِیْ جَاءَ تْكُمْ مِنَ الْاَرْضِ فَيَاْتُوْنَ بِهٖ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَلَهُمْ اَشَدُّ فَرَحًا بِهٖ مِنْ اَحَدِكُمْ بِغَائِبِهٖ يَقْدُمُ عَلَيْهِ فَيَسْاَلُوْنَهٗ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ فَيَقُوْلُوْنَ دَعُوْهُ فَاِنَّهٗ كَانَ فِیْ غَمِّ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ قَدْ مَاتَ اَمَا اَتَاكُمْ فَيَقُوْلُوْنَ قَدْ ذُهِبَ بِهٖ اِلٰى اُمِّهِ الْهَاوِيَةِ فَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا احْتُضِرَ اَتَتْهُ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ بِمِسْحٍ فَيَقُوْلُوْنَ اُخْرُجِیْ سَاخِطَةً مَسْخُوْطًا عَلَيْكِ اِلٰى عَذَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَتَخْرُجُ كَاَنْتَنِ رِيْحِ جِيْفَةٍ حَتّٰى يَاْتُوْنَ بِهٖ اِلٰى بَابِ الْاَرْضِ فَيَقُوْلُوْنَ مَا اَنْتَنَ هٰذِهِ الرِّيْحُ حَتّٰى يَاْتُوْنَ بِهٖ اَرْوَاحَ الْكُفَّارِ ۔ [رواہ احمد والنسائی]

اخرجه النسائی فی السنن ۸/٤ حدیث رقم ۱۸۳۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت مؤمن کو موت آتی ہے تو رحمت کے فرشتے سفید کپڑا لے کر آتے ہیں۔ پھر روح کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔ تو نکل اس حال میں کہ تو راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی کیا گیا ہے۔ خدا کی رحمت اور خوب رزق کی طرف اور اپنے اس پروردگار کی طرف جو تجھ سے ناراض نہیں ہے۔ پس روح بہترین مشک کی خوشبو کی طرح نکلتی ہے یہاں تک کہ بعض فرشتے بعضوں سے بطور تعظیم وتکریم کے روح کو ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو آسمان کے دروازوں تک لے آتے ہیں پس فرشتے آپس میں کہتے ہیں کیا خوب خوشبو ہے جو تم کو زمین کی طرف سے پہنچی پھر اس کو مؤمنوں کی ارواح کی طرف لے جاتے ہیں جہاں مؤمنوں کی روحیں رہتی ہیں۔ علیین میں یا جنت میں یا جنت کے دروازے پر یا عرش کے نیچے ان کے مرتبے کے حساب سے پس وہ روحیں اس روح کے آنے کی وجہ سے بہت خوش ہوتی ہیں۔ جیسے تم میں سے کوئی غائب شخص سفر سے واپس آتا ہے اور اس کے گھر والے نہایت خوش ہوتے ہیں۔ اس طرح اس مؤمن کی روح جانے کی وجہ سے دوسری روحیں خوش ہوتی ہیں پھر مؤمنوں کی روحیں اس روح سے پوچھتی ہیں کہ فلاں آدمی نے کیا کیا؟ فلاں نے کیا کیا ہے؟ فلانے فلانے شخصوں کا کیا حال ہے؟ یعنی نام لے کر احوال پوچھتے ہیں ان آشناؤں کا کہ جن کو دنیا میں چھوڑ کر فوت ہو گئے تھے پھر روحیں آپس میں کہتی ہیں کہ ان کو چھوڑ دو۔ وہ تو دنیا کے غم میں ہیں۔ جب راحت حاصل کریں گے تب پوچھنا پس یہ روح راحت حاصل کرنے کے بعد کہتی ہے کہ فلاں آدمی مر گیا جس کے تم احوال پوچھتے تھے۔ کیا وہ تمہارے پاس نہیں آیا؟ پس روحیں کہتی ہیں کہ اس کو دوزخ کی آگ کی طرف لے گئے ہیں اور جب کافر کی موت آتی ہے تو فرشتے اس کے پاس عذاب کے ٹاٹ لے کر آتے ہیں پھر فرشتے کافر کی روح کو مخاطب کر کے کہتے ہیں نکل تو اللہ کے عذاب کی طرف ناخوش ہے اور ناخوشی یعنی

ناراضگی کی گئی تجھ پر پھر روح مردار بدبودار کی طرح نکلتی ہے پھر اس کو زمین کے دروازوں کی طرف لایا جاتا ہے پس فرشتے کہتے ہیں کس قدر بری ہے یہ بدبو' یہاں تک کہ اس کو کفار کی روحوں کی طرف لایا جاتا ہے۔ اس کو امام احمد اور امام نسائی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اذا حضر المؤمن: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے یعنی جب اس کو موت آتی ہے اور ایک دوسری روایت میں "إذا قبض" کے الفاظ ہیں۔

قوله : أتت ملائكة الرحمة بحريرة بيضاء: ممکن ہے کہ روح کو اس میں لپیٹ کر آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہوں اور دنیاوی کفن اس کے جسم صوری کے ساتھ رہ جاتا ہو۔

قوله: فيقولون أخرجي: گویا کہ وہ اس آیت کی عملی تصویر پیش کرتے ہیں: ﴿ يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ ...... ﴾ [الفجر: ۲۶ ۔ ۲۷] "اے اطمینان پانے والی روح۔ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی"۔

قوله: راضية: اللہ کی طرف لوٹنے اور ثواب پانے کی وجہ سے۔

قوله: مرضيا عنك: یعنی اول و آخر

إلى روح الله: "راء" کے فتحہ کے ساتھ۔ "روح" بمعنی رحمت ہے۔ ای الی رحمة الله۔ یعنی اس کی رحمت کی طرف یا "روح" بمعنی راحت ہے۔ ای الی راحة منه۔ یعنی اللہ کی طرف سے راحت۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر ہے ﴿ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ ﴾ [الفجر: ۲۷] "اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل"۔

وريحان: رزق کریم کے معنی میں ہے یا بہترین خوشبو مراد ہے۔

قوله : فتخرج كأطيب ريح المسك: امام طیبیؒ کہتے ہیں: "کاف" محذوف مصدر کی صفت ہے۔ ای "تخرج خروجا مثل ريح مسك" یہ مشک کی تمام انواع سے فائق ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول: "فتخرج حال کو نها مثل اطيب ريح المسك" اس کی روح نکلتی ہے اس حال میں کہ اس کی خوشبو کستوری کی خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔ اور ابن حجرؒ کا یہ دعویٰ "انه عند التامل أوضح من كلام الشارح" خود غیر واضح ہے' چہ جائیکہ "اوضح" ہو۔

حتى إنه: ضمیر مؤمن کی طرف راجع ہے اور اس کی روح کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے' مضاف کو مقدر مانیں یا نہ مانیں۔ کیونکہ یہ مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔ اور مطلب یہ ہے: حتى انه من طيب روحه و عظمة ريحه۔

قوله: ليناولہ بعضهم بعضاً: وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر لے کر اوپر چڑھتے ہیں۔ یہ اس کی تکریم' تعظیم اور تشریف کی بناء پر ہے نہ کہ سستی' تھکاوٹ اور تکلیف کے سبب سے۔ اسی لئے وہ ایک دوسرے کو سپرد کرتے ہیں' وگرنہ ایک فرشتہ بھی اس کو اُٹھانے سے عاجز نہیں۔

حتى يأتوا: ایک اور روایت میں "فيشونه" ہے' اور دوسری روایت میں "فيشمونه حتى يأتوا" ہے۔

به أبواب السماء: یعنی ایک کے بعد دوسرے دروازہ پر۔ اور ایک روایت میں "باب السماء" ہے' یہ منصوب بنزع

الخافض ہے۔ای''الی ان یأ توابه'' یہ مناولہ کی غایت ہے۔رہا ابن حجرؒ کا قول کہ یہ''لیخرج'' کی غایت ہے تو یہ خروج عن الظاہر بالغایہ ہے۔

فیقولون: یعنی اس کے انتہائی درجے اعلیٰ خوشبو کی وجہ سے بعض ملائکہ دوسرے بعض ملائکہ سماء سے تعجب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

التی جاء تكم من الأرض یعنی جو تمہارے پاس ابھی ابھی پہنچی ہے۔

فيأتون: اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: كلما اتوا سماء قالوا ذلك حتى ياتوا یعنی پہلے فرشتے یا استقبال کرنے والے فرشتے سوال کرتے ہیں۔

به: اس کی روح کو۔

ارواح المؤمنين: منصوب بینزع خافض'' ہے۔یعنی علیین میں جو روحیں ہیں۔یا جنت میں یا اس کے دروازے پر یا عرش کے نیچے اپنے درجے کے لحاظ سے ہے۔

فلهم) ''فاء'' تعقیب کے لیے ہے اور ضمیر''مؤمنین'' یا ان کی ارواح کی طرف لوٹ رہی ہے۔

أشد فرحا: دوسری روایت میں''فلهم أفرح'' کے الفاظ ہیں۔امام طیبی کہتے ہیں کہ لام ابتدا تاکید کے لیے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:''لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ'' [النحل: ۱۲٦] ''هُمْ'' مبتدا اور''أشد'' اس کی خبر ہے۔اس لام کا جارہ ہونا بھی بعید نہیں۔ای''هم أشد فرحًا'' وہ خوشی انتہا درجہ کی ہوگی۔

ماذا فعل فلان: یعنی اس کا کیا حال ہے؟ یعنی اگر وہ اطاعت میں ہے تو وہ خوش ہوں اور اس کے لیے استقامت کی دعا کریں اور اگر وہ مصیبت میں ہو تو وہ اس پر غمگین ہوں اور اس کے لیے استغفار کریں۔

ماذا فعل فلان: تاکید ہے یا کوئی دوسرا شخص مراد ہے۔یہی زیادہ واضح ہے۔

فيقولون: بعض دوسری روحیں ایک دوسرے سے کہتی ہیں۔ایک صحیح نسخہ میں''فیقول'' ہے ای بعضهم أو أحدهم۔

دعوه: اور ایک روایت میں''حتى يستريح'' کے الفاظ ہیں۔امام طیبی کہتے ہیں یعنی ان میں سے بعض بعض سے کہیں گے اس نو وارد کو چھوڑ دو وہ نیا نیا دنیا کی مصیبتوں سے تھکا ہوا آیا ہے۔

فإنه: ای القادم في غم الدنيا: ایک صحیح نسخہ میں یہ الفاظ ہیں:''فانه كان في غم الدنيا'' پس''کان'' زائدہ ہے یا''انه'' کی ضمیر زائد ہے کیونکہ یہ ضمیر شان ہے۔یعنی آنے والا اب تک دنیا کے غم میں تھا اب تک اس کو آرام نصیب نہیں ہوا۔

فيقول: یعنی قادم پہلے سوال کے جواب میں کہتا ہے۔ان دونوں کے درمیان کا جملہ معترضہ ہے۔

قدمات: یعنی فلاں جس کے متعلق پوچھا گیا یا دوسرا فلاں مر گیا ہے۔یہ احتمال قریب ہے۔

فيقولون: ایک دوسری روایت میں ہے''فاذا قال لهم ماأتاكم فإنه قدمات يقولون''یعنی مؤمنوں کی روحیں کہتی

قد ذهب به: بصیغۂ مجہول ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں۔ کہ یہاں ''فاء'' کو مقدر ماننا ضروری ہے۔ جیسا کہ شاعر کے قول میں ہے:

ع من يفعل الحسنات الله يشكرها

اى اذا كان الأمر كماقلت: انه مات ولم يلحق بنا فقدذهب به اھ یعنی اگر معاملہ ایسے ہی ہے جیسے تو کہتا ہے کہ وہ مر گیا ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں آیا تو اس کو لے جایا گیا ہے۔ یہ بلا وجہ کا تکلف ہے۔ اس پر روایت کے یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں: ''أوما أوتي عليكم فيقولون أو قد هلك فيقول : اى والله فيقولون نرا ہ قد ذهب به'' ۔ ''وہ کہتا ہے اللہ کی قسم وہ کہتے ہیں: ہم نے اس کو دیکھا ہے کہ وہ اسے کو لے کر چلے گئے ہیں''۔

أمه الها وية: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: ﴿ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ﴾ [القارعة: ۹] کیونکہ وہ مجرموں کے ٹھہرنے اور قرار پکڑنے کی جگہ ہے۔ جیسے ماں بچے کے لیے ہے اسی طرح یہ ہے۔ اور دوسری روایت کے یہ زائد الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں ''فبئست الأم وبئست المربية'' طیبی کہتے ہیں: ''ام'' کا اطلاق ''مأوی'' پر تشبیہاً ہے کیونکہ ماں بچے کی پناہ گاہ اور ٹھہرے کی جگہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ماواكم النار۔ [العنكبوت: ۲۵] ''الهاوية'' بدل ہے یا عطف بیان ہے اور آیت میں جو ''هاوية'' ہے وہ ''أمه'' کی خبر ہے۔ یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے گویا کہ یہ گہری آگ ہے جس میں اہل جہنم بہت دور جا کر گریں گے۔

احتضر: مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

مسح: جوہری کہتے ہیں: ''مسح'' کسرہ کے ساتھ ہے ''ٹاٹ'' کو کہتے ہیں۔

ساخطة: ناپسند کرنے والی جیتے جی اور مرنے کے بعد بھی۔ اللہ تعالیٰ سے ناخوش۔

مسخوطًا: ''مغضوبا'' کے معنی میں ہے۔

إلى عذاب الله: یہ ''أخرجي'' کے متعلق ہے۔

عز: یعنی اس کا کلمہ اور حکم غالب ہے۔

جل: یعنی اس کی قضاء اور اس کی تقدیر بڑی ہے۔

حتى يأتون: نون کے ثبوت اور رفع کے ساتھ یہ احوال ماضی کی حکایت ہے: [وزلزلوا حتى يقول الرسول] کی طرح ہے، نافع کی قراءت میں رفع کے ساتھ ہے۔ أى حتى أتوا'' یعنی ''حتى أتوابه'' جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

باب الأرض: دوسرے نسخہ میں ''إلى باب الارض'' ہے۔ ایک روایت میں ''فينطلقون به إلى باب الأرض'' ہے۔ امام طیبی کہتے ہیں: یعنی زمینی آسمان کا دروازہ۔ اس پر پچھلی حدیث دلالت کرتی ہے: ''ثم عرج بها إلى السماء''۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس دروازہ سے مراد زمین کا دروازہ ہو کہ اس کو اسفل السافلین میں لوٹا دیا جاتا ہو۔ میں کہتا ہوں: یہی درست ہے۔ کیونکہ اس باب میں اس کا صراحتاً ذکر آئے گا۔

فيقولون: ما أنتن هذه الريح حتى: دوسری روایت میں ہے: ''كلما أتوا على ارض قالوا ذلك'' پس یہ

متعین ہو جاتا ہے کہ ''حتی'' ان کے قول ''ذلك'' کی غایت ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا یہ قول کہ ''یا ان کے لے کر چلنے کی جس پر سیاق دلالت کرتا ہے'' یہ انتہائی بعید از کار ہے۔

قوله : حتى يأتون به أرواح الكفار: کفار کی روحوں کا محل ''سبجین'' ہے اور یہ جگہ جہنم کی گہرائی میں ہے۔

تخریج: امام میرکؒ نے کہا ہے کہ اس جیسی حدیث ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ اور امام سیوطیؒ فرماتے ہیں (اس حدیث کو) حاکم اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ اھ۔ اور جو روایات ہم نے ذکر کی ہیں یہ حاکم کے الفاظ ہیں۔

کافر اور مؤمن کی نزع کی کیفیت کا بیان

۱۶۳۰: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةِ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَانْتَهَيْنَا اِلَى الْقَبْرِ وَلَمَّا يُلْحَدْ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَجَلَسْنَا حَوْلَهٗ كَاَنَّ عَلٰى رُءُوْسِنَا الطَّيْرَ وَفِيْ يَدِهٖ عُوْدٌ يَنْكُتُ بِهٖ فِي الْاَرْضِ فَرَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ اسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ اِذَا كَانَ فِيْ انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَاِقْبَالٍ مِنَ الْاٰخِرَةِ نَزَلَ اِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ مِنَ السَّمَاءِ بِيْضُ الْوُجُوْهِ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الشَّمْسُ مَعَهُمْ كَفَنٌ مِنْ اَكْفَانِ الْجَنَّةِ وَحَنُوْطٌ مِنْ حَنُوْطِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَجْلِسُوْا مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَاْسِهٖ فَيَقُوْلُ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ قَالَ فَتَخْرُجُ تَسِيْلُ كَمَا تَسِيْلُ الْقَطْرَةُ مِنَ السِّقَاءِ فَيَاْخُذُهَا فَاِذَا اَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهٖ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَاْخُذُوْهَا فَيَجْعَلُوْهَا فِيْ ذٰلِكَ الْكَفَنِ وَفِيْ ذٰلِكَ الْحَنُوْطِ وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَاَطْيَبِ نَفْحَةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ قَالَ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا فَلَا يَمُرُّوْنَ يَعْنِيْ بِهَا عَلٰى مَلَاٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ اِلَّا قَالُوْا مَا هٰذَا الرُّوْحُ الطَّيِّبُ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِاَحْسَنِ اَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانُوْا يُسَمُّوْنَهٗ بِهَا فِي الدُّنْيَا حَتّٰى يَنْتَهُوْا بِهَا اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَسْتَفْتِحُوْنَ لَهٗ فَيُفْتَحُ لَهُمْ فَيُشَيِّعُهٗ مِنْ كُلِّ سَمَاءٍ مُقَرَّبُوْهَا اِلَى السَّمَاءِ الَّتِيْ تَلِيْهَا حَتّٰى يُنْتَهٰى بِهٖ اِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اُكْتُبُوْا كِتَابَ عَبْدِيْ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَاَعِيْدُوْهُ اِلَى الْاَرْضِ فَاِنِّيْ مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ وَفِيْهَا اُعِيْدُهُمْ وَمِنْهَا اُخْرِجُهُمْ تَارَةً اُخْرٰى قَالَ فَتُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ فَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ دِيْنِيَ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقُوْلَانِ لَهٗ وَمَا عِلْمُكَ فَيَقُوْلُ قَرَاْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَاٰمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَاَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ

وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا اِلَى الْجَنَّةِ قَالَ فَيَاْتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا فَيُفْسَحُ لَهُ فِيْ قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ قَالَ وَيَاْتِيْهِ رَجُلٌ حَسَنُ الْوَجْهِ حَسَنُ الثِّيَابِ طَيِّبُ الرِّيْحِ فَيَقُوْلُ اَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُرُّكَ هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ لَهُ مَنْ اَنْتَ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيْءُ بِالْخَيْرِ فَيَقُوْلُ اَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ فَيَقُوْلُ رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ رَبِّ اَقِمِ السَّاعَةَ حَتّٰى اَرْجِعَ اِلٰى اَهْلِيْ وَمَالِيْ قَالَ وَاِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ اِذَا كَانَ فِيْ اِنْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَاِقْبَالٍ مِنَ الْاٰخِرَةِ نَزَلَ اِلَيْهِ مِنَ السَّمَاءِ مَلَائِكَةٌ سُوْدُ الْوُجُوْهِ مَعَهُمُ الْمُسُوْحُ فَيَجْلِسُوْنَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ ثُمَّ يَجِيْءُ مَلَكُ الْمَوْتِ حَتّٰى يَجْلِسَ عِنْدَ رَاْسِهِ فَيَقُوْلُ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ اُخْرُجِيْ اِلٰى سَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ قَالَ فَتَفَرَّقُ فِيْ جَسَدِهِ فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُّوْدُ مِنَ الصُّوْفِ وَالْمَبْلُوْلِ فَيَاْخُذُهَا فَاِذَا اَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوْهَا فِيْ يَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتّٰى يَجْعَلُوْهَا فِيْ تِلْكَ الْمُسُوْحِ وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَاَنْتَنِ رِيْحِ جِيْفَةٍ وُجِدَتْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ فَيَصْعَدُوْنَ بِهَا فَلَا يَمُرُّوْنَ بِهَا عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ اِلَّا قَالُوْا مَا هٰذَا الرُّوْحُ الْخَبِيْثُ فَيَقُوْلُوْنَ فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ بِاَقْبَحِ اَسْمَائِهِ الَّتِيْ كَانَ يُسَمّٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا حَتّٰى يَنْتَهِيَ بِهِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيُسْتَفْتَحُ لَهُ فَلَا يُفْتَحُ لَهُ ثُمَّ قَرَاَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اُكْتُبُوْا كِتَابَهُ فِيْ سِجِّيْنٍ فِي الْاَرْضِ السُّفْلٰى فَتُطْرَحُ رُوْحُهُ طَرْحًا ثُمَّ قَرَاَ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ فَتُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهِ وَيَاْتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَنْ رَّبُّكَ فَيَقُوْلُ هَاهُ هَاهُ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَادِيْنُكَ فَيَقُوْلُ هَاهُ هَاهُ لَا اَدْرِيْ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ فَيَقُوْلُ هَاهُ هَاهُ لَا اَدْرِيْ فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ اَنْ كَذَبَ فَاَفْرِشُوْهُ مِنَ النَّارِ وَافْتَحُوْا لَهُ بَابًا اِلَى النَّارِ فَيَاْتِيْهِ مِنْ حَرِّهَا وَسَمُوْمِهَا وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتّٰى تَخْتَلِفَ فِيْهِ اَضْلَاعُهُ وَيَاْتِيْهِ رَجُلٌ قَبِيْحُ الْوَجْهِ قَبِيْحُ الثِّيَابِ مُنْتِنُ الرِّيْحِ فَيَقُوْلُ اَبْشِرْ بِالَّذِيْ يَسُوْءُكَ هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِيْ كُنْتَ تُوْعَدُ فَيَقُوْلُ مَنْ اَنْتَ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيْءُ بِالشَّرِّ فَيَقُوْلُ اَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيْثُ فَيَقُوْلُ رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ [وَفِيْ رواية نحوه وزاد فيه] اِذَا خَرَجَ رُوْحُهُ صَلّٰى عَلَيْهِ كُلُّ مَلَكٍ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَكُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ وَفُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ لَيْسَ مِنْ اَهْلِ بَابٍ اِلَّا وَهُمْ يَدْعُوْنَ اللّٰهَ اَنْ يُعْرَجَ بِرُوْحِهِ مِنْ قِبَلِهِمْ وَتُنْزَعُ نَفْسُهُ يَعْنِي الْكَافِرَ مَعَ الْعُرُوْقِ فَيَلْعَنُهُ كُلُّ مَلَكٍ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَكُلُّ مَلَكٍ فِي السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ اَبْوَابُ السَّمَاءِ لَيْسَ مِنْ اَهْلِ بَابٍ اِلَّا وَهُمْ يَدْعُوْنَ اللّٰهَ

اَنْ لَّا يُعْرَجَ رُوْحُهٗ مِنْ قِبَلِهِمْ - [رواه احمد]

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۵/۱۱٤ حدیث رقم ٤٧٥٣ - واحمد فی المسند ٤/٢٨٧ -

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ انصار کے ایک شخص کے جنازے کے لیے نکلے۔ ہم قبر کے پاس پہنچے اور (ابھی تک) ان کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ پس نبی کریم ﷺ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے گرد بیٹھ گئے۔ گویا کہ ہمارے سروں پر جانور بیٹھے ہوتے تھے۔ یعنی سر جھکا کر چپکے سے بیٹھے تھے اور دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے اور حضور ﷺ کے ہاتھوں میں ایک لکڑی تھی۔ اس کے ساتھ زمین کو کریدتے اور خط کھینچتے تھے جیسے متفکر (اور گہری سوچ میں ڈوبنے والے) کرتے ہیں پھر آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور دو یا تین مرتبہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ''لوگو! اللہ تعالیٰ سے عذابِ قبر سے پناہ مانگو'' پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مؤمن بندہ دنیا کے انقطاع (آخری وقت) میں پہنچتا ہے یعنی مرنے کے قریب پہنچتا ہے۔ تو اس کی طرف آسمان سے نہایت روشن فرشتے مثل آفتاب کے اُترتے ہیں۔ ان کے پاس جنت کے ریشمی کپڑوں میں سے کفن ہوتا ہے اور جنت کی خوشبوؤں میں سے خوشبو ہوتی ہے۔ یعنی جنت کا مشک عنبر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھ کر روح کے نکلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر ملک الموت علیہ السلام آتے ہیں یہاں تک کہ اس کے سر کے پاس بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں اے پاک جان تو اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی خوشنودی کی طرف نکل پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پھر جان لیٹی ہوئی نکلتی ہے۔ جیسے پانی کا قطرہ مشک میں سے بہتا ہے۔ یعنی سہولت و نرمی کے ساتھ۔ پس دوسرے فرشتے روح کو ملک الموت کے ہاتھ سے لے لیتے ہیں پلک جھپکتے ہوئے سب اشتیاق اور رغبت کے ساتھ اس کو لے لیتے ہیں اور کفن اور خوشبو میں رکھتے ہیں اور اس کی روح سے روئے زمین کی بہترین مشک کی خوشبوؤں کی طرح خوشبو نکلتی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پس فرشتے اس کو لے کر آسمان پر چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو فرشتوں کی جماعت پوچھتی ہے کہ یہ پاک روح کون ہے؟ چنانچہ روح کو لانے والے فرشتے کہتے ہیں فلاں بیٹا فلانے کا ہے۔ یعنی اس روح کے بہترین نام و لقب سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دنیا والے اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ آپس میں سوال و جواب کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ فرشتے اس کو لے کر پہلے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر فرشتے اس کے لیے دروازہ کھلواتے ہیں پھر اس کے ساتھ دوسرے آسمان کے مقرب مل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو ساتویں آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ عزت و بزرگی والے ارشاد فرماتے ہیں میرے بندے کا نامہ اعمال علیین میں رکھ دو۔ پھر اس کو زمین کی طرف لے جاؤ۔ یعنی اس کے بدن کی طرف جو کہ زمین میں مدفون ہے تاکہ وہ بدن کے ساتھ مل جائے اور سوال و جواب کے لیے تیار ہو جائے۔ اس لیے کہ میں نے بنی آدم کو زمین ہی سے پیدا کیا ہے اور پھر زمین کی طرف ان کے بدنوں اور روحوں کو بھیجتا ہوں اور اسی سے دوسری مرتبہ نکالوں گا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ پھر روح اس کے بدن میں دوبارہ داخل کر دی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے (منکر نکیر) آتے ہیں اور اس کو بٹھاتے ہیں پھر اس کو کہتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ پس وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے پھر اس سے پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے' پھر اس کو کہتے ہیں یہ شخص یعنی محمد ﷺ کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں پھر فرشتے پوچھتے ہیں کہ تو نے کیسے پہچانا کہ یہ اللہ کے

رسول ﷺ ہیں؟ پس وہ کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی ہے اور میں اس پر ایمان لایا ہوں اور دل سے تصدیق کی۔ اس سے حضور ﷺ کا رسول ہونا معلوم ہوگیا۔ پھر آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی زبانی کہ یہ میرا بندہ سچا ہے اس کے لیے جنت کے بچھونے بچھا دو اور اس کو جنت کے لباس پہناؤ اور اس کے لیے بہشت کی طرف دروازہ کھول دو۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کو جنت کی طرف سے ہوا اور خوشبو آتی ہے اور پھر اس کی قبر کو حد نگاہ تک کشادہ کر دیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پھر اس کے پاس ایک خوبرو (خوبصورت چہرے والا) اچھے کپڑے پہنے ہوئے خوشبو لگائے ہوئے ایک شخص آتا ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ خوشخبری ہے تیرے لیے اس چیز کے ساتھ جو تمہیں خوش کرے۔ یعنی تمہارے لیے وہ نعمتیں میسر ہیں کہ ان کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا۔ یہ وہ دن ہے کہ تجھ سے اس کے بارے میں دنیا میں وعدہ کیا گیا تھا۔ مرنے والا انسان اس سے پوچھتا ہے پھر تو کون ہے کہ تیرا چہرہ اتنا حسن و جمال والا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں جو خوبصورت شکل میں تیرے پاس آیا ہوں۔ پھر میّت کہتی ہے اے میرے رب! قیامت قائم کر دے اے میرے رب! قیامت قائم کر دے۔ تا کہ میں اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ جاؤں اور بے شک کافر بندہ جب دنیا کے ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور آخرت کی تیاری میں ہوتا ہے تو کالے چہروں والے عذاب کے فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے اس کے سامنے ٹاٹ بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آ کر اس کے سرہانے کی طرف بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خبیث جان اللہ کے عذاب کی طرف نکل۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پھر جان کافر کے بدن میں پھیل جاتی ہے' خدا کے خوف سے بھاگتی ہے اور نکلنا نہیں چاہتی اور عذاب کے آثار دیکھتی ہے۔ بخلاف مؤمن کی روح کے' کہ وہ اللہ کے انوار و کرم دیکھ کر خوشی سے جلدی نکل آتی ہے۔ پھر ملک الموت اس کی روح کو سختی کے ساتھ اور زور کے ساتھ کھینچتا (نکالتا) ہے جیسے ترصوف سے آنکڑہ کھینچا جاتا ہے۔ کھینچتے وقت ترصوف سے اس کو کچھ لگ جاتا ہے۔ تو اس طرح کافر کی روح کھینچی جاتی ہے رگوں کی انتہا سے سختی اور قوت کے ساتھ' تو ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے رگوں کے ساتھ کچھ نکل آیا ہے پس ملک الموت اس کو لے لیتا ہے پھر فرشتے اس کے ہاتھ میں ایک پلک جھپکنے کی مقدار بھی نہیں چھوڑتے یہاں تک کہ اس کو ان ٹاٹوں کے درمیان میں رکھتے ہیں اور روح سے نہایت گندی بدبو مردار کی طرح نکلتی ہے اس طرح کی بو روئے زمین پر نہیں پائی جاتی۔ پھر وہ اس کو لے کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں اور اس کو لے کر فرشتوں کی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں اور فرشتے کہتے ہیں یہ ناپاک روح کون ہے؟ پس روح کو قبض کرنے والے فرشتے کہتے ہیں یہ فلاں کا بیٹا فلاں ہے۔ بدترین وصفوں کے ساتھ جن ذکر کرتے ہیں۔ جس کا ذکر دنیا میں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کو آسمان دنیا تک پہنچا دیا جاتا تھا پس اس کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر آپ ﷺ نے بطور سند کے آیت تلاوت فرمائی۔ یعنی کافروں کے لیے آسمان کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا اور وہ جنت میں داخل نہیں ہونگے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جس طرح یہ امر مشکل ہے ایسے ہی کافر جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ بالکل محال ہے۔ اس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں پس اللہ عزت اور بزرگی والا ارشاد فرماتا ہے اس کا نامہ اعمال سجین میں لکھو۔ یہ ایک جگہ کا نام ہے جو ساتویں زمین کے نیچے کی زمین ہے۔ پھر اس کی روح کو پھینکا جاتا ہے اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ کہ جو شخص خدا کے ساتھ شریک کرے گویا کہ وہ آسمان سے منہ کے بل گرا۔ یعنی

ایمان وتوحید کی بلندی سے کفر وشرک کی پستی میں گر پڑا پس پرندے اس کو اچک لیتے ہیں یعنی ہلاک ہو جاتا ہے یا ہوا اس کو دور مکان میں پھینک دیتی ہے۔ یعنی وہ خدا کی رحمت سے دور ہوتا ہے پھر اس کے بدن میں روح ڈال دی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھاتے ہیں پھر اس کو کہتے ہیں۔ تیرا رب کون ہے؟ پس وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ......! میں نہیں جانتا۔ پھر اس کو کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ......! میں نہیں جانتا۔ پھر اس کو کہتے ہیں یہ شخص کون ہے جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے؟ پس وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ......! میں نہیں جانتا۔ پھر پکارنے والا آسمان کی طرف سے پکارتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اس کے لیے آگ کا بچھونا بچھا دو اور دوزخ کی طرف اس کا دروازہ کھول دو۔ پس اس کو گرمی اور اس کی گرم ہوا پہنچتی ہے اور اس پر اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں قبر میں ادھر اُدھر نکل آتی ہیں (یعنی ایک دوسرے میں دھنس جاتی ہیں) اور اس کے پاس ایک شخص بدشکل (بدصورت) برے کپڑے پہنے ہوئے آتا ہے اس سے بدبو آتی ہے پس وہ کہتا ہے۔ خوشخبری ہو۔ تجھے اس چیز کی جو راضی نہ کرے تجھ کو۔ آج وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ پس مردہ اس کو کہتا ہے کہ تو کون ہے؟ تیرا چہرہ نہایت برا ہے۔ تو برائی کے ساتھ آیا ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ میں تیرا عمل ہوں پھر مردہ کہتا ہے۔ اے میرے پروردگار تو قیامت قائم نہ کر اور ایک روایت میں اسی طرح کا مضمون اور اضافے کے ساتھ ہے کہ جس وقت مؤمن کی روح نکلتی ہے تو ہر فرشتہ جو آسمان وزمین کے درمیان میں ہے اور ہر فرشتہ جو آسمان میں ہے اس پر رحمت بھیجتا ہے۔ اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ہر دروازے والے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ اس کی روح کو ان کی طرف سے چڑھا دیا جائے۔ تاکہ وہ ان کے ساتھ چل کر عزت واکرام حاصل کریں اور کافر کی جان رگوں سے نکال لی جاتی ہے۔ پس تمام فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ آسمان اور زمین اور آسمان دنیا میں اور آسمان کے دروازے اس کے لیے بند کر دیئے جاتے ہیں اور آسمان دنیا کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ ایسا نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس کی روح کو آسمان کی طرف نہ چڑھایا جائے (یعنی ہماری طرف سے لے جایا جائے)۔ (احمد)

تشریح: جنازة رجل: جیم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔

لمايلحد: صیغہ مفعول کے ساتھ ہے۔ "لَمَّا" یہاں "لَمْ" کے معنی میں ہے۔ اور اس میں "توقع" کے معنی ہیں۔

كأن: مشدد نون کے ساتھ ہے' اور ایک روایت میں "وكأن" ہے۔

علی رؤوسنا الطیر: طیبیؒ کہتے ہیں: یہ ان کے سر جھکانے اور ان کے سکوت اور دائیں بائیں التفات نہ کرنے سے کنایہ ہے۔ امام میرکؒ فرماتے ہیں "طیر" کان کا اسم ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ای كأنّ علی رأس كل واحد الطير الخ۔ یعنی گویا ہر ایک کے سر پر پرندہ ہے وہ اس پرندہ کا شکار کرنا چاہتا ہے' اس لیے حرکت نہیں کرتا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس کی صفت تھی۔ جب آپ کلام کرتے تو بیٹھنے والے ایسے بیٹھتے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ خاموش رہتے تھے کلام نہ کرتے تھے' اور پرندہ ہمیشہ ساکن چیز ہی پر بیٹھتا ہے۔

جوہری کہتے ہیں: "گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں" جب وہ آپ کی ہیبت سے ساکن ہو جاتے۔ اس کی اصل یہ ہے

کہ جب کوا اونٹ پر بیٹھتا ہے تو اس کو ایک یا دو چونچ مارتا ہے۔ چنانچہ اونٹ حرکت نہیں کرتا تا کہ کوا بھاگ نہ جائے۔

ینکت: کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

لکڑی کے ایک سرے سے زمین کرید رہے تھے اس شخص کی طرح جو متفکر و مہموم ہو۔ (ذکر طیبیؒ)

فقال: استعیذوا باللّٰہ من عذاب القبر مرتین: "مرتین" یہ "قال" کا ظرف ہے۔

أو ثلاثا: راوی کو شک ہے۔

فی انقطاع: یہ بمعنی "ادبار" ہے۔

إقبال من الآخرۃ: بمعنی "اتصال" ہے۔

قولہ: نزل الیہ ملائکۃ من السماء بیض الوجوہ: خوبصورت چہروں والے فرشتوں کا نازل ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفقت و کرم نوازی کے طور پر ہوگا۔ یا اس صاحب ہدایت کے انوار سے انعکاس ہو رہا ہوگا۔

قولہ: کأن وجولھھم الشمس ای وجہ کل واحد منھم کا لشمس: یعنی ان میں سے ہر ایک کا چہرہ سورج کی طرح ہوگا۔ اور ابن حجرؒ کا یہ قول کہ جمع کی خبر "شمس" واحد لائی گئی ہے اس لئے کہ اصل میں وہ اسم جنس ہے۔ منطقی قول ہے۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

قولہ (معھم کفن من أکفان الجنۃ) یعنی جنت کے ریشم کے بنے ہوئے۔

حنوط: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حنوط ایک مرکب خوشبو ہے جو مردوں کے جسم اور کفن پر لگائی جاتی ہے۔

ثم یجئ ملك الموت علیہ السلام: تصحیح شدہ نسخوں میں اسی طرح ہے۔

حتی یجلس عندرأسہ فیقول: ابن حجرؒ کہتے ہیں: کہ یہ ماقبل میں گذری ہوئی بات کے منافی نہیں "کہ اس کا قائل (ملک الموت کے علاوہ) کوئی اور ہے۔ کیونکہ یہ بات ملک الموت کہے یا دوسرے فرشتے اس میں کوئی مانع نہیں۔

یہ محل کلام ہے۔ ماقبل میں یہ نہیں گزرا ہے کہ اس کا قائل ملک الموت کے علاوہ ہے' ماقبل میں تو یہ گزرا ہے کہ "فرشتے کہتے ہیں" اس میں احتمال ہے کہ سارے فرشتے کہتے ہیں۔ اور زیادہ واضح یہ ہے کہ قائل ان کا رئیس و سردار ہے جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اور اس سے اگلی متصل حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

أیتھا النفس الطیبۃ: ایک دوسری روایت میں "المطمئنۃ" ہے۔

رضوان: راء کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ۔

یعنی اب تیرے سامنے مغفرت اور رضوان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ یہ دونوں الفاظ لانے میں دفع عذاب اور کمال ثواب کی بشارت کی طرف اشارہ ہے۔ "إرجعی الی ربك" کا یہی معنی ہے۔ اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا: (الی مغفرۃ من اللّٰہ و رضوان) "ای الی محلھما وھو الجنۃ" بے محل ہے۔

تسیل: حال ہے۔

قولہ: فتخرج تسیل کما تسیل القطرۃ من السقاء: اس سے روح کے بارے میں اہلسنّت متکلمین کی رائے کی

تائید ہوتی ہے کہ روح لطیف جسم ہے' یہ سارے بدن میں اسی طرح چلتی ہے جیسے گلاب کا پانی گلاب میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "وإن كنتم ترون غير ذلك" یعنی شدت کو دیکھتے ہو۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اضطراب جسم اور روح کا آسانی سے نکل جانا ان میں کوئی منافات نہیں۔ بلکہ کبھی پہلا (یعنی اضطراب جسم) دوسرے (یعنی روح کا سہولت سے نکلنا) کے لیے سبب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نفس کی ریاضت' اور بدن کو کمزور کرنا صوفیاء کے ہاں روح کو عبادت و معرفت کے لئے قوی بنانے کا سبب ہے۔

رہا ابن حجرؒ کا یہ قول: کہ یہ پچھلے کلام کے منافی نہیں کہ "نزع کے وقت مؤمن پر سختی ہوتی ہے کسی اور وقت نہیں"۔ کیونکہ اس کا محل روح کے نکلنے سے پہلے کا ہے۔" اپنے محل میں نہیں ہے' چونکہ حالت نزع ہی روح کے نکلنے کا وقت ہے۔ پس ان کے دونوں اقوال میں واضح تناقض ہے۔

لم يدعوها: دال کے فتحہ کے ساتھ۔

قوله (في يده طرفة عين) ادب کی وجہ سے یا اس کی طرف اشتیاق کی وجہ سے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ ملک الموت روح قبض کرتا ہے تو اپنے دوسرے ساتھیوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ جو جنتی کفن اس کے لیے ہوتے ہیں۔

ويخرج: مذکر اور مؤنث دونوں صیغوں کے ساتھ (اور اس کا فاعل محذوف ہے۔) **اى يخرج منها اى من الروح ريح أو شئ۔**

كأطيب نفحة مسك: ("كاف" بمعنی "مثل" أطيبها۔ یعنی اس کی خوشبو کی مثل۔ کاف "مثلیہ" ہے۔ امام طیبی کہتے ہیں: یہ محذوف موصوف کی صفت ہے جو: "يخرج" کا فاعل ہے۔ **اى يخرج منها رائحة كا طيب نفحة مسك۔** یعنی اس سے کستوری کی خوشبو کی طرح خوشبو ہے۔

قوله: وجدت على وجه الارض: یعنی جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اور جب تک رہے گی۔

ملک الموت کے ساتھی یا انہی میں سے رحمت کے فرشتے انہیں یا ان کے علاوہ دوسرے رحمت کے فرشتے اس جان کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔

يعني بها: یہ صحابی کا کلام ہے یا راوی کا کلام ہے۔ سیوطی کی روایت میں یہ کلام موجود نہیں ہے۔

یعنی ایک بڑی جماعت۔

روح: راء کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنی "ریح"۔ اور راء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

إلى سماء الدنيا فيستفتحون له: ابن حجرؒ کہتے ہیں: "نسبت" کے اعتبار سے ضمیر مؤنث ("بها") لائی گئی ہے اور "شخص" کے اعتبار سے مذکر کی ضمیر (له) لائی گئی ہے۔ اھ۔ صحیح بات یہ ہے کہ "روح" مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے: **الروح بالضم' مابه حياة الانفس** کہ روح ضمہ کے ساتھ وہ چیز جس سے نفوس کی حیات ہے۔ اور یہ مؤنث بھی مستعمل ہے۔

فتفتح: تانیث کے ساتھ ضمیر ''سماء'' یعنی آسمان کی طرف راجع ہے۔ اور اس کو مذکر لانا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں جار نائب فاعل ہوگا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ ضمیر مفرد لائی گئی ہے اس لیے کہ استفتاح سے مقصود یہی ہے اور پھر ضمیر جمع اس طرح اشارہ ہے کہ وہ مستقل اس کے ساتھ رہتے ہیں اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اھ۔ یہ طیبیؒ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ ضمیر ''لَهُمْ'' ان فرشتوں کی طرف راجع ہے جو دروازہ کھولنے کا کہتے ہیں اور ''لَهٗ'' فعل کی علت اور اس کا صلہ ہے۔ اس کا مقصود میں کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ ان میں مطابقت واضح ہے' اور کوئی بعید نہیں کہ اس میں تغلیب کا اعتبار کیا جائے اور اگلے الفاظ ''فیشیعه'' میں استخدام کی رعایت ہو۔

فیشیعه: وہ اس کا استقبال کرتے ہیں اور آسمان میں داخل ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

حتی ینتهی به: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے' اور جار مجرور نائب فاعل ہے اور ایک نسخہ میں ''به'' کا لفظ ساقط ہے اور ''ینتهی'' صیغہ معروف ہے۔

إلی سماء السابعة: مراد جنت ہے چونکہ یہ اس سے ملا ہوا ہے اور زیادہ واضح یہ ہے کہ اس سے مراد سماوات علیٰ کی انتہا' اور اللہ تعالیٰ کے عرش وسدرۃ المنتہیٰ سے اقتراب ہے۔

فیقول الله عزوجل اکتبوا: ای اثبتوا' یعنی ثابت رکھو اور ابن حجرؒ کا یہ قول: ای اکتبوا الآن وان کتب فی سابق الزمان کہ ''اب لکھو اگر چہ پہلے لکھا جا چکا ہے'' نقل صریح اور صحیح دلیل ہے۔

کتاب عبدی: یہ اضافت تشریفیہ ہے اس لیے کافر کے متعلق یوں فرمایا: ''اکتبوا کتابه'' ''کتاب عبدی'' کی معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہوگی: ای اجعلوا کتاب عبدی بکتابة اسمه فی علیین میرے اس بندے کے اعمال نامہ پر اس کا نام لکھ کر علیین میں رکھ دو۔

فی علیین: یعنی مؤمنین اور مقربین کے دیوان میں لکھو۔

ایک قول ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں کتاب الابرار ہے پس ''بندے'' کی کتاب سے مراد اس کا نامۂ اعمال ہے' ابہری فرماتے ہیں: ای فی کتاب عبدی (میرے بندے کی کتاب میں) یعنی مآل کے اعتبار سے وہ علیین میں ہے یا جنت کے بالا خانہ میں لکھ دو۔

ابن حجر عسقلانیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: مؤمنین کی ارواح علیین میں اور کافروں کی ارواح سجین میں ہیں ہر روح کا اپنے جسم کے ساتھ معنوی طور پر ہے' یہ اتصال دنیاوی زندگی کے اتصال کے مشابہ نہیں ہے' بلکہ سوئے ہوئے آدمی کی حالت کے بہت زیادہ مشابہ ہے' اگر چہ یہ اتصال نائم کی حالت سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس قول کی بدولت اس حدیث میں: ''ان مقرها فی علیین أو سجیین'' اور ابن عبدالبر کے اس قول میں جو جمہور سے نقل کیا ہے: انها عند أفنية قبورها میں جمع ممکن ہو جاتا ہے اور کہا اس کے باوجود اس کو تصرف کی اجازت ہے اور وہ اپنی جائے قرار علیین یا سجین میں ٹھکانہ کرتی ہے مزید کہا: جب میت کو ایک قبر سے دوسری قبر میں منتقل کیا جاتا ہے تو یہ اتصال مذکور جاری رہتا ہے اور اسی طرح (یہ اتصال مذکور اس حالت میں

بھی برقرار رہتا ہے) اگر اس کے اعضاء الگ الگ ہو جائیں۔

ابن قیمؒ فرماتے ہیں: روح سریع الحرکت اور قبر سے آسمان کی طرف پلک جھپکنے کے برابر اوپر چڑھ جانے والی چیز ہے اور اس کی شاہد نائم کی روح ہے یہ بات ثابت ہے کہ نائم کی روح اوپر چڑھتی جاتی ہے' حتی کہ ساتویں آسمان کو پھاڑ کر عرش کے سامنے رحمٰن کو سجدہ کرتی ہے پھر انتہائی وقت سیر میں اپنے جسم میں لوٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: "اکتبوا کتاب مقر عبدی فی علیین"۔

وأعیدوه : یعنی اس جان کو ابھی ابھی زمین کی طرف واپس لے جاؤ۔

إلى الأرض: تاکہ بدن کے ساتھ اس کا کامل اتصال ہو جائے اور سوال و جواب کے لیے تیار ہو جائے۔

قوله (فیها اعیدهم)

قال: "قال" کا اعادہ کلام کی طوالت کی وجہ سے کیا ہے یا کسی دوسرے کے کلام سے فاصلہ آ جانے کی وجہ سے اعادہ کیا ہے وہ اس حدیث کے ان مواضع میں موجود نہیں جس کو سیوطی نے نقل کیا ہے۔

قوله: فتعاد روحه فی جسده: حدیث کا ظاہر سے لگتا ہے کہ روح کا لوٹ آنا بدن کے تمام اعضاء کی طرف ہوگا پس بعض لوگوں کے اس قول کی طرف التفات نہ کیا جائے کہ روح کا لوٹ آنا جسم کے بعض حصہ کی طرف ہوگا' اور نہ ابن حجرؒ کے اس قول کی طرف التفات کیا جائے کہ "نصف بدن کی طرف لوٹائی جائے گی' ان کا عقلاً یہ بات کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ نقل صحیح کا محتاج ہے۔

فیقولان له ما هذا الرجل الذی بعث فیکم؟: یعنی جو تمہاری طرف بھیجا گیا ان کی اس سے مراد محمد ﷺ ہیں اس عبارت میں مؤمن کی آزمائش ہے اور یقین رکھنے والے کا امتحان ہے۔ بایں طور کہ انہوں نے اس کو بصیغۂ مجہول ذکر کیا ہے' صفت نبوت و رسالت کا تذکرہ نہیں کیا' ممکن ہے کہ یہ بعض لوگوں کی نسبت سے ہو' چونکہ بعض احادیث میں وارد فرشتے اس سے کہیں گے: ومن نبیك؟

قوله : فیقول: هو رسول الله: ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: "نبی محمد وہ نبی محترم محمد ﷺ ہیں:

قوله: فیقولان لهٗ وما علمك: یعنی تجھے اپنی کہی ہوئی بات کا علم یا تمہیں ان کی رسالت کا علم کس سبب سے ہوا؟ یا تیرے اقرار کا سبب کیا ہے؟ کیا تصدیق صرف تقلید کی بدولت ہے یا کوئی دلیل اور برہان بھی ہے۔

قوله: فیقول قرأت کتاب الله و امنت به: یعنی ایمان لایا کتاب پر یا رسول پر اور اس پر جو کتاب میں ہے۔

صدقت: یعنی میں نے تصدیق قلبی کی ہے' صرف زبان کے اقرار پر اکتفاء نہیں کیا یہ تشریح ابن حجرؒ کے قول سے اولیٰ ہے۔ اور ارباب تائید کے ہاں تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے۔

قوله: فینادی مناد من السماء۔۔۔وافتحوا له بابا الی الجنة:

ان صدق عبدی: "أن" تفسیر یہ ہے کیونکہ نداء میں "قول" کے معنی ہیں۔ اور اس "ان" کو مصدر یہ ماننے سے معنی میں خلل آتا ہے۔ اور عبارت کی تقدیر یوں ہوگی ینادی مناد من السماء بصدق عبدی۔

فأفرشوه: ہمزہ قطعی کے ساتھ۔ای أعطوه فراشا (اس کو بستر دو) اور افرشوا له فراشا۔ ''اس کے لیے بستر بچھاؤ۔'' اس صورت میں ہمزہ تاکید۔تعدیہ کے لیے ہوگا۔چنانچہ قاموس میں ہے: ''أفرش فلانا بساطاً بسطه له کفرشه فرشا و فرشه تفریشا''۔اور رہا ابن حجرؒ کا یہ قول: اس کی قبر کو بچھا دو تو یہ صحیح نہیں بوجہ اس کے جو ہم نے ذکر کیا ہے اور جو قاموس میں ہے: فرشه فرشا و فراشا ای بسطه یعنی اس کو بچھا دیا۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ ''مفروش'' ''بچھونا'' ہوتا ہے اور قبر تو ''مفروش فیہ'' (یعنی جائے فراش) ہے۔موجودہ دور میں عرب میں یوں مستعمل ہے: أفرشوا البیت''۔پس کلام میں ''اتساع'' ہے۔اوران عرب کے قول ''البیت مفروش'' کا مطلب ہے: البیت مفروش فیه۔(کہ گھر جائے فراش ہے۔)

والبسوه: ہمزہ قطعی کے ساتھ۔

قوله : إلى الجنة: ابن حجرؒ کی اصلی کتاب میں ''من الجنة'' ہے یہ سہو قلم ہے۔

روحها: راء کے فتحہ کے ساتھ یعنی نسیم جنت۔

وطیبها: یعنی اس کی خوش بو۔اور ابن حجرؒ کا یہ قول: ''روحها مر بیانه''۔وہم پیدا کرتا ہے کہ راء پر ضمہ درست ہے حلانکہ ایسا نہیں ہے اور ''وطیبها'' کو تاکید قرار دینا' اس ثابت شدہ تحقیق سے غفلت ہے جس کو تائید حاصل ہے۔

فیسفح: تخفیف اور تشدید کے ساتھ۔

قوله (له فی قبره مد بصره) یہ نصر کے مراتب اور بصیرۃ کے مراتب میں اختلاف کی وجہ سے مختلف ہے۔

قوله: ویأتیه رجل۔

قوله :ای شی علی صورة رجل: یعنی کوئی چیز آئے گی جو آدمی کی صورت میں ہوگی۔

حسن الوجه، حسن الشیاب، طیب الریح: یہ اس کے حسن عمل وخلق سے کنایہ ہے۔

قوله: فیقول: ابشر بالذی یسرك: یعنی جو تجھ کو خوش کر دے گی' وہ چیز جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں' کسی کان نے سنی نہیں اور کسی بشر کے دل میں اس کا تصور نہیں آ سکتا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْكًا كَبِیْرًا﴾ (الانسان: ۲۰) ''اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے کثرت سے نعمت اور عظیم (الشان) سلطنت دیکھو گے'' ابن حجرؒ نے تقدیری عبارت نکالی ہے: ای ''یسرك ربك'' یہ ضمیر کے مرجع سے غفلت کے باعث ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس میں مقدر کی ضرورت ہے۔جب کلام بغیر مقدر مانے صحیح ہو تو تقدیر کی ضرورت نہیں ہے اور نسبت مجاز یہ کتاب وسنت اور لغت عربی میں غیر نادر ہے۔اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ [البقرة: ۶۹] ''کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں (کے دل) کو خوش کر دیتا ہو''۔

قوله: هذا یہ وقت۔

قوله: یومك الذی کنت توعد: وہ تیرا زمان محمود ہے جس کا اللہ نے اس دنیا میں تیرے ساتھ وعدہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یس: ۵۲] ''کہیں گے

اے ہے ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے (جگا) اٹھایا؟ یہ تو وہی ہے جس کا خدا نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا"۔

قوله: فيقول : من أنت: کہ جس نے پردیسی سے انس والا معاملہ کیا' اور عجیب خیر کی بشارت دی۔ طیبیؒ کہتے ہیں: جب اس کو بشارت سے خوش کرے گا تو وہ اس سے کہے گا میں تجھے نہیں پہچانتا یہاں تک کہ تیری ثناء اور مدح کے ذریعہ تجھے بدلہ وعوض دے سکوں۔

پھر کہا کہ "من انت" مدح کے معنی کو متضمن ہے۔ یہ محل نظر ہے الا یہ کہ یوں کہا جائے' یہ معونت مقام اور قرینۂ حال کی وجہ سے ہے

پھر کہا "فوجهك" میں فا تعقیب بیان کے لیے ہے۔

الوجه: یعنی تیرا چہرہ حسن و جمال میں کامل ہے اور کمال میں انتہاء کو پہنچا ہوا ہے' اس جیسے چہرے کے لیے یہی لائق ہے کہ وہ خیر کے ساتھ آئے اور اس جیسی بشارت کے ساتھ نوازے۔

قوله: يجئ بالخير: یہ جملہ استینا فیہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "موصول" مقدر ہے۔ تقدیری عبارت: وجهك الوجه الذی يجئ بالخير" ہے۔

فيقول: آدمی کی صورت میں آنے والا کہے گا۔

قوله: فيقول رب أقم الساعة! رب أقم الساعة: تکرار دعا میں الحاح کے لیے ہے۔

حتى أرجع الى هلی: یعنی حورعین اور خادموں کی طرف لوٹ جاؤں۔

ومالي: احتمال ہے کہ "ما" موصولہ ہو ای مالی من القصور ...... یعنی میرے لیے جو محلات، باغات اور ان کے علاوہ جو دوسرا الحسن مآل ہے۔ اور جس پر "مال" کا اطلاق ہوتا ہے۔

یا اہل سے مراد اس کے مؤمن اقارب ہوں گے۔ اور "ما" سے مراد وہ ہے جو حور و محلات کو شامل ہے۔

فقیہ ابولیث کہتے ہیں: یعنی الی الجنۃ۔ (مطلب یہ ہے کہ "اهلی مالی" سے مراد جنت ہے' کہ مجھے جنت لے چلو۔)

طیبیؒ کہتے ہیں: شاید کہ یہ طلب احیاء سے عبارت ہے تاکہ وہ دنیا کی طرف لوٹ جائے اور زیادہ سے زیادہ عمل صالح اور انفاق سبیل اللہ تعالیٰ کرے حتی کہ اس کا ثواب مزید بڑھ جائے اس کے درجات کا بلند ہوں۔

ابن حجرؒ نے بھی اس قول کو اختیار کیا ہے اس پر اشکال یہ ہے کہ "الساعة" کو غیر قیامت پر محمول کرنا انتہائی عجیب ہے۔ امام میرکؒ فرماتے ہیں: درست یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ وہ اقامت قیامت کا مطالبہ کرے گا' تاکہ اس کے لیے جو ثواب اور درجات تیار کئے گئے ہیں وہ اس تک پہنچ جائے۔ اس کی تائید کافر کے متعلق جو ذکر کی گئی حکایت کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: رب لاتقم الساعة" تاکہ وہ اپنے لئے تیار عقاب سے بھاگ سکے۔

قال: یہ تمام نسخوں میں موجود ہے اور تمام روایات میں بھی ہے۔ کیونکہ یہ دوسرے قصے کا آغاز ہے۔

قوله: قال: وإن العبد الكافر اذا كان في انقطاع من الدنيا۔۔۔۔ اخرجي الى سخط من الله:

سود الوجوه: یہ اظہار غضب کے لئے ہوگا جو اس کے عمل کے مناسب ہے یا اس کا انعکاس ہوگا۔

المسوح: "مسح" کی جمع ہے کسرہ کے ساتھ ہے۔اس کا مطلب ہے کھردرا لباس۔

فیجلسون منه مد البصر: اس کی روح نکلنے کا انتظار کرتے ہیں۔

فیقول ایتها النفس الخبیثة: خبیث خصلتوں والی اور ناپسندیدہ اعمال والی روح۔

أخرجی إلی سخط من اللّٰه: یعنی اللہ تعالیٰ کے انواع عقاب میں سے اس کے غضب کے آثار کی طرف

فتفرق: ایک تاء کے حذف کے ساتھ' اور اس کا فاعل "روح" ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں۔یعنی کافر کی روح جسم سے نکلنے کو ناپسند کرتی ہے کیونکہ اس عذاب الیم کا سامنا کرنا ہوگا جو اس کی آنکھوں کو گرم کردے گا' اس لئے وہ جسم میں پھیل جاتی ہے۔اور مؤمن کی روح ایسے نکلتی ہے جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ بہتا ہے۔چونکہ اس کی عزت وکرامت اس کی آنکھیں ٹھنڈی کردے گی جس کی اس کو خوشی ہوگی۔"تسخین العین" خوف سے کنایہ ہے' جیسے "قرة العین" خوشی سے کنایہ ہے۔اسی لیے کہنے والوں نے کہا ہے غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں اور خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

فینتزعها: یعنی ملک الموت اس کی روح کو سختی اور شدت کے ساتھ نکالتا ہے۔

کما ینزع: مبنی علی المجہول ہے۔ایک دوسری روایت میں کما ینتزع ہے۔

السفود: یہ بروزن "تنور" ہے۔کانٹا یا وہ لوہا جس سے گوشت بھونا جاتا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کافر کی روح کی تشبیہ نزع کے وقت لوگوں سے نکلتی ہے جیسا کہ اس کی ساتھی ہیں۔جیسا کہ دوسری روایت میں کہا ہے: و تنزع نفسه مع العروق بنزع السفود۔ تو وہ اس کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔جیسے روئی کانٹوں وغیرہ سے کھینچ کر اور قوت سے اتاری جاتی ہے۔اس کے برعکس مؤمن کی روح پانی کی طرح بہہ جاتی ہے جیسے بھرے ہوئے مشکیزے سے پانی آسانی سے بہہ جاتا ہے۔

فیأخذها: یعنی ملک الموت لے لیتا ہے۔

لم یدعوها فی یده طرفة عین: یعنی معاملے کی طرف جلدی کرتے ہوئے۔

یخرج: بصیغۂ مذکر ومؤنث کے ساتھ۔

منها: یعنی کافر کی روح جب اس کے جسم سے نکلتی ہے۔

فیصعدون بها: اس کی رسوائی اور بے عزتی کے اظہار کے لئے ہے۔

فیقولون فلان بن فلان بأقبح اسمائه: یعنی وہ اس کے قبیح ترین اوصاف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

التی کان یسمی: ایک نسخہ میں "کانوا" ہے۔یعنی آسمان والے اس کا نام لیتے ہیں۔اور سید کے نسخہ میں میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

بها: ان اسماء کے ساتھ۔

إلی السماء الدنیا) یعنی قریبی آسمان دنیا۔

ثم قرأ رسول اللّٰه: اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استشہاد کے لئے تلاوت فرمائی۔

تفتح: بصیغۂ تانیث' تشدید کے ساتھ جمہور کی قراءت ہے۔ اور بصری قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے حمزہ اور کسائی کی قراءت تذکیر کے ساتھ تخفیف کے ساتھ ہے۔

لهم: کفار کے لیے۔

أبواب السماء: اس میں سے کوئی بھی چیز۔

سم الخياط: سوراخ۔ طیبی کہتے ہیں۔ سوئی کا سوراخ ہے۔ اور اونٹ "عظیم الجثۃ" ہونے میں ضرب المثل ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں تو بس اسی طرح ان کا جنت میں داخل ہونا محال ہے۔ یہ قول صحیح نہیں کیونکہ ان کا جنت میں داخل ہونا لذاتہ محال نہیں ہے بلکہ محال لغیرہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے: "لایغفران یشرك به" [النساء: ٤٨] اور کافر جنت میں داخل نہیں ہوگا کبھی بھی۔ سو جہاں تک بات ہے عقل کی تو وہ جائز لغیرہ ہے اگر دلیل نقلی نہ ہوتی۔ ہاں عقل کامل بھی مؤمن اور کافر میں برابری کو جائز قرار نہیں دیتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے۔ ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ [الجاثیۃ: ٢١] "جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کردیں گے جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور انکی زندگی اور موت یکساں ہوگی یہ جو دعوے کرتے ہیں برے ہیں" دوسری آیات میں فرمایا: ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ﴾ [ص: ٢٨] "جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے کیا ان کو ہم انکی طرح کردیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں گے"۔

سجين: کہا گیا ہے کہ یہ فاجروں کی کتاب کا محل ہے جو جہنم کی گہرائی میں ہے۔

في الأرض حال لازمہ ہے یا جار کے ساتھ یہ بدل کل من البعض ہے۔

السفلى ساتویں زمین مراد ہے۔ کہ اس میں جہنم کی جگہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہی زیادہ مشہور ہے اگرچہ اس میں بہت طویل اختلاف ہے۔ بعض معقول و منقول کو جامع' محققین نے کہا ہے' اس میں سے کچھ بھی صحیح نہیں۔ پس ہمارے لیے اس سے رکنا ہی بہتر ہے۔

فتطرح روحه طرحا: سختی کے ساتھ پھینکتا ہے۔

ثم قرأ رسول اللّٰه ﷺ: اس بات کو مزید پختہ کرنے کے لیے [ومن يشرك بالله فكانما خر من السماء فتخطفه الطير أو تهوى] "او" نوع بیان کرنیا تمثیل میں تخییر کے لیے ہے۔

[به الريح في مكان سحيق] بعید یا عمیق مراد ہے۔ طیبی کہتے ہیں اسکو ہوا پھینک دے یعنی اس کو کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے۔

یہ محض آپ کے اس قول: "في سجين في الأرض السفلى فتطرح روحه طرحًا" کے لئے استشہاد ہے' یہ کافر کی حالت بیان کرنے کے لیے نہیں ہے چونکہ آیت میں اس شخص کو جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے آسمان سے گرنے والے شخص کے

ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس کی ان خواہشات کو چکنے والے پرندوں سے تشبیہ دی ہے اور شیطان کو کہ جو کسی شخص کو گمراہ کرتا ہے اور اس کو گمراہی کی وادی میں پھینک دیتا ہے اس ہوا کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو اس کو ہلاک کرنے کے لئے دور دراز جگہ پر لے جا کر پھینک دیتی ہے۔

فيقول هاه هاه: ان دونوں میں آخری هاء ساکن ہے۔ یہ ایسے شخص کا کلام ہے جو جواب میں مبہوت و متحیر ہو۔ اسی لئے اگلے جملہ (''لا أدری'' میں) اس کی صراحت کی ہے۔

فيقولان: دوسرے نسخہ میں ''له'' ہے۔

بعث فيكم (یہ ''فی'' بمعنی ''الی'' ہے۔) **ای أرسل اليكم** (یعنی جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔)

قوله: فيقول هاه هاه لا أدری فينادی منادٍ من السماء أ ن كذب: یعنی اپنے سے درایت کی مطلق نفی میں اس نے جھوٹ بولا ہے' بلکہ اس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا تھا' لیکن اس کے ساتھ شریک کیا' دین اس کے لیے واضح ہو گیا تھا لیکن اس نے اس کو اپنایا نہیں' اور معجزات کے ذریعہ نبی ﷺ کی رسالت واضح ہو گئی تھی لیکن آپ کی اطاعت نہیں کی۔ یا جھوٹ اس اعتبار سے ہے کہ ''لا أدری'' کا مطلب یہ ہے کہ ''مجھے مذکورہ امور کی درایت کی قابلیت حاصل نہیں تھی''۔ یہ ان کا کذب محض ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس علم کو اپنی مرضی سے چھوڑا تھا۔ واللہ اعلم

فأفرشوه من النار: سیوطیؒ کی راویت میں ہے: ''وألبسوه من النار''۔

فيأتيه من حرها: (یہ ''من'' تبعیضیہ ہے۔) **ای ياتيه بعض جرها** یعنی کچھ گرمی اس کی قبر میں آتی ہے' اور مکمل عذاب تو آخرت میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولعذاب الآخرة اشد وابقى**۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ويوم تقوم الساعة ادخلوا آل فرعون أشد العذاب**۔ ابن حجر فرماتے ہیں: **فياتيه عذاب عظيم**۔ (اس کے پاس بڑا عذاب آئے گا۔) ان کی یہ تقدیر بغیر تحریر اور تقریر کے ہے۔

سمومها: یعنی اس کی سخت حرارت۔ اور ظاہر مقابلہ کا تقاضا ہے کہ اس سموم کے ساتھ تعفن اور بدبو بھی ہوگی۔

يضيق: تشدید کے ساتھ ہے۔

تختلف فيه: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) **ای فی قبره أو فی بدنه**۔ یعنی اس کی قبر میں یا بدن میں۔

أضلاعه: یعنی اس کے پہلو کی ہڈیاں۔

قبر کا ضغطہ بعض مؤمنوں بلکہ اکابر موحدین کے لیے بھی (ثابت) ہے۔ جیسے سعد بن معاذ سید الانصاری کہ جن کا جنازہ ستر ہزار فرشتوں نے اُٹھایا ہوا تھا۔ ان کی موت سے رحمٰن کا عرش کانپ اُٹھا۔ مؤمنین کے لئے قبر کے ضغطہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمین اس طرح ملتی ہے جیسے اپنے بچے کی مشتاق ماں اپنے بچہ سے معانقہ کرتی ہے۔ رہا ابن حجر کا یہ ''قول کہ وہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا اور قبر کا یا تنگ ہونا اور مل جانا یہ دونوں کفار کے خصائص میں سے ہے''۔ یہ تحقیق سے بہت بعید ہے اور اکابر کی نسبت سے صحیح نہیں ہے۔ واللہ الموفق۔

فوجهك الوجه: قباحت میں کامل چہرہ۔

یجیٔ بالشر: اور ایک دوسری روایت میں ہے: "الذی یجیٔ بالشر"۔

قوله: فیقول أنا عملك الخبیث) یعنی میں تیرے خبیث عقائد، اعمال بد اور اخلاق بد کا مرکب ہوں۔ پس معانی مبانی کے جسد وصورت میں ظاہر ہوں گے۔

و فی روایة نحوه: یعنی اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔

وزاد: راوی نے الفاظ زیادہ کئے ہیں۔

فیه: اس جیسی روایت میں۔

إذا خرج روحه: مؤمن کی روح۔

صلی علیه: یعنی اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔

کل ملك: اس سے مراد جنس ہے۔

وفتحت: تخفیف اور تشدید کے ساتھ ای فتحت له جیسا کہ ایک دوسرے نسخہ میں ہے۔

ابواب السماء لیس من أهل باب ای من ابواب کل سماء۔

ان یعرج بروحه: صیغۂ مجہول ہے ای یعرج الملائکه به۔ یعنی فرشتے اس کو لے کر چڑھتے ہیں۔ اس کو مبنی علی الفاعل پڑھنا بھی صحیح ہے ای یعرج اللّٰه یعنی اللہ تعالیٰ اس کو چڑھنے کا حکم دیتا ہے۔

من قبلهم: قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ' یعنی ان کی جہت سے' یعنی تاکہ وہ اس کی بدولت برکت حاصل کریں اور شرف مشایعت حاصل کریں۔

تنزع: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

نفسه: یعنی اس کی روح۔

یعنی الکافر مع العروق: اشارہ ہے اس کی روح نکلتے وقت کی کراہت' نزع کے وقت اس کی روح سختی کے ساتھ کھینچنے اور اس جسم کے ساتھ روح کے شدت تعلق کی طرف۔

کل ملك فی السماء: آسمان دنیا مراد ہے۔

تغلق: یعنی اس کے ورے آسمان کے۔

أبواب السماء تمام دروازے۔

لیس من اهل باب: ای من ابواب سماء الدنیا یعنی آسمان دنیا کے دروازے۔ ابن حجرؒ کی اصل میں "اهل سماء" کے الفاظ ہیں یہ قلم کا سہو ہے۔

ان لا یعرج روحه: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ فاعل کے صیغہ کے ساتھ بھی درست ہے۔ ای لایصعد روحه یعنی اس کی روح اوپر نہیں چڑھتی۔

من قبلهم: اس کے ظاہر و باطن کی کراہت کی وجہ سے۔ اور ابن حجرؒ کا یہ قول:" ومر فی المؤمن بروحه والفرق

واضح ''از جہت معنی ہی صحیح ہے' تاکہ بطریق منی الایہ کہ بصیغۂ فاعل والی روایت صحیح ہو تو یہ اس کی وحدت کی طرف اشارہ ہوگا اور مؤمن کے متعلق اشارہ ہے کہ فرشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اسنادی حیثیت : امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تخریج: امام سیوطیؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں، امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں، بیہقی نے ''کتاب عذاب قبر'' میں، طیالسی اور عبد نے اپنی اپنی اور مسند میں، اور ہناد بن سری نے ''زہد'' میں روایت کیا ہے' ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے طرق صحیحہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور ''عبد'' سے مراد 'عبد بن حمید' ہیں۔ تفسیر کے بارے میں سب سے پہلے انہوں نے کتاب لکھی ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا آخری وقت اور اُمّ بشر رحمہا اللہ علیہا کا سوال و جواب

۱۶۳۱: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ لَمَّا حَضَرَتْ كَعْبًا الْوَفَاةُ اَتَتْهُ اُمُّ بِشْرٍ بِنْتُ الْبَرَاءِ بْنِ مَعْرُوْرٍ فَقَالَتْ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اِنْ لَقِيْتَ فُلَانًا فَاقْرَأْ عَلَيْهِ مِنِّيَ السَّلَامَ فَقَالَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ يَا اُمَّ بِشْرٍ نَحْنُ اَشْغَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَتْ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَمَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ طَيْرٍ خُضْرٍ تَعْلُقُ بِشَجَرِ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى قَالَتْ فَهُوَ ذَاكَ۔

[رواه ابن ماجة والبيهقى فى كتاب البعث والنشور]

اخرجه ابن ماجه ١/٤٦٦ حديث رقم ١٤٤٩۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن کعبؓ اپنے والد حضرت کعبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کے والد حضرت کعب کو موت آئی۔ تو ان کے پاس براء بن معرور کی بیٹی اُمّ بشر آئی اور کہنے لگی اے ابوعبدالرحمٰن (کعبؓ کی کنیت ہے) اگر تو مرنے کے بعد فلاں آدمی سے ملاقات کرے۔ تو اس کو میری طرف سے سلام کہنا۔ کعبؓ نے فرمایا۔ اے اُم بشر! اللہ تجھ کو بخشے (معاف فرمائے) ہم تو اس سے بہت زیادہ مشغول ہونگے۔ اُمّ بشر کہنے لگی اے ابوعبدالرحمٰن کیا تو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے نہیں سنا۔ تحقیق مؤمنوں کی روحیں سبز جانوروں (یعنی پرندوں) کے قالبوں (جسموں) کی طرح بہشت کے درختوں کے میوے کھائیں گی۔ فرمایا ہاں سنا ہے فرمانے لگی یہ وہ ہی ہے۔ یعنی یہ وہی فضل وعنایت ہے جس کی امید رکھی جاتی ہے۔ (اس کو ابن ماجہ اور بیہقی نے البعث والنشور کی کتاب میں روایت کیا ہے)۔

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن کعب: امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ کعب بن عمرو بن عوف مازنی وانصاری ہیں۔ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔

البراء بن معرور: انصاری خزرج سے تعلق رکھتے تھے' بیعت عقبہ ثانیہ میں سب سے پہلے انہوں نے بیعت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے ایک مہینہ پہلے۔ ''معرور'' میم کے فتحہ' عین مہملہ کے سکون اور پہلی راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: إن لقيت :فلاناً: ظاہر یہ ہے کہ انکی مراد ان کے والد براءؓ تھے۔ پھر میں نے (روایت میں) دیکھا کہ اس

سے مراد ان کا بیٹا ''بشر'' ہے جیسا کہ ابن ابی دنیا نے ابو لبیبہ سے نقل کیا ہے: قال: لما مات بشر بن البراء بن معرور وجدت أمه وجدا شديدا' فقالت يا رسول الله ! لا يزال الهالك يهلك من بني سلمة' فهل تتعارف الموتى؟ فأرسل إلى بشر بالسلام قال: نعم والذي نفسي بيده أنهم يتعارفون كما يتعارف الطير في رؤوس الاشجار- و كان لا يهلك هالك من بني سلمة إلا جاء ته أم بشر فقالت يا فلان عليك السلام فيقول و عليك فتقول اقرأ على بشر مني السلام۔

قوله: فاقرأ عليه السلام: دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: فاقرنه مني السلام۔

فقال: اى لها۔ جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے:

قوله: فيقول: إن ارواح المؤمنين في طير خضر: طیبیؒ کہتے ہیں یہ ان کے اس عذر ''نحن اشغل من ذلك'' کا جواب ہے۔ یعنی آپ ان میں سے نہیں ہیں جن کے ذمہ میرا یہ کام لگانا ان کو مشغول کر دے گا بلکہ آپ تو ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے کہ ان کا معاملہ اس اس طرح ہوگا۔

تعلق: لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

جنت کے درختوں پر بیٹھیں گے' اوران کے پھلوں سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ حدیث میں ہے: أن ارواح المؤمنين في حواصل طير خضر ترعى في الجنة وتاكل من ثمار ها وتشرب من ميا هها وتأ وى الى قناديل من ذهب تحت العرش مؤمنوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہوتی ہیں اور جنت میں چرتی ہیں جنت کے پھل کھاتی ہیں اور اس کے پانیوں سے سیراب ہوتی ہیں اور اللہ کے عرش کے نیچے لٹکی قنادیل میں بسیرا کرتی ہیں۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں بعض علماء کا مذہب ہے کہ تمام مؤمنوں کی روحیں جنت میں ہوتی ہیں یعنی یہ شہداء کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا نام ''جنة الماوىٰ'' ہے۔ چونکہ روحیں اس میں ٹھکانہ کرتی ہیں اور یہ عرش کے نیچے ہے۔ وہ (مؤمنین) اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ خوشبوئیں سونگھتے ہیں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: علقت الإبل العضاة تعلق ضمہ کے ساتھ (یہ اس وقت کہا جاتا ہے) جب وہ اپنی منہ کے ساتھ یہ کھاتے ہیں۔

اسی وجہ یہ حدیث: ''ارواح الشهداء في حواصل طير خضر تعلق من ورق الجنة''۔ اور شاید کہ یوں کہنا چاہئے تھا: تعلق من شجر الجنة ۔ ''باء'' کے ساتھ تعدیہ اتصال کا فائدہ دے رہا ہے۔ شاید یہ ''اكل'' سے کنایہ ہے کیونکہ جب وہ روحیں درختوں سے ملی ہوئی ہوتی ہیں تو وہ پھل کھا کر سیر ہوتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے ثابت ہوا کہ جنت پیدا کر دی گئی ہے اور موجود ہے یہ اہل سنت کا مذہب ہے اور قاضی عیاض کہتے ہیں اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ ارواح فنا نہیں ہوتیں' باقی رہتیں ہیں۔ نیک' نعمتوں میں اور بد' عذاب میں ہوتا ہے۔ قرآن و آثار میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا: أما سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن نسمة المؤمن تسرح في الجنة حيث شاء ت و نسمة الكافر في سجين''۔

فهو ذاك: ایک دوسرے نسخہ میں ''فهو ذلك'' الفاظ ہیں۔

اسنادي حيثيت: امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام طبرانیؒ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۱۶۳۲: وَعَنْهُ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَيْرٌ تَعْلُقُ فِيْ شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يُرْجِعَهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ يَوْمَ يَبْعَثُهُ.

[رواه مالك و النسائي والبيهقي في كتاب البعث والنشور]

اخرجه النسائي في السنن ١٠٨/٤ حديث رقم ٢٠٧٣۔ وابن ماجه ١٤٢٨/٢ حديث رقم ٤٢٧١۔ ومالك في الموطأ ٢٤٠/١ حديث رقم ٤٩ من كتاب الجنائز۔ واحمد في المسند ٤٥٥/٣۔

ترجمہ ''حضرت عبدالرحمٰن اپنے والد (کعب) سے نقل کرتے ہیں کہ وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ''عالم برزخ میں مؤمن کی روح پرندہ کے قالب میں جنت کے درختوں سے میوے کھاتی رہتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بعثت کے دن اسے اس کے بدن میں واپس بھیج دے گا۔'' (مالک' نسائی' بیہقی)

تشریح: قال انما نسمة المؤمنتعلق في شجر الجنة:

نوویؒ کہتے ہیں: ''نسمة'' کا اطلاق انسان پر جسم اور روح کے لحاظ سے ہوتا ہے اور ''نسمه'' کا اطلاق صرف روح پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے اور قرینہ ''حتي يرجعه الله في جسده'' کے الفاظ ہیں۔

طير: ایک دوسری روایت میں ''طائر'' ہے۔ امام طیبیؒ کہتے ہیں ایک روایت میں ''في جوف طير خضر'' ایک اور روایت میں ''كطير خضر'' ہے۔ ایک روایت میں ''بحواصل طير'' اور ایک روایت میں ''في صورة طير بيض'' کے الفاظ ہیں۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں اشبہ یا اصح قول: ''طيرا'' یا ''صورة طير'' ہے اور یہ اکثر روایات میں وارد ہوا ہے خصوصاً ابن مسعودؓ کی حدیث میں آپ کا فرمان ہے ''و تأوي إلى قناديل تحت العرش'' اور یہ بعید نہیں ہے چونکہ قیاسات اور عقول کو اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے تو ہو جا'' تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اور کہا گیا ہے **مُنعَم و معذَّب** بدن کا جزء ہے اس میں روح باقی رہتی ہے چنانچہ اسی کو الم وعذاب اور تلذذ و تنعم ہوتا اور وہ کہتی ہے اے میرے رب مجھے لوٹا دے'' وہ پرندے کے پوٹہ میں یا اپنی شکل میں جنت کے درختوں میں ہے اور عرش کے نیچے قنادیل میں بسیرا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ مستحیل نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ''نسمه المؤمن'' سے مراد شہداء کی ارواح ہیں۔ کیونکہ ان کا وصف ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ [آل عمران: ١٦٩] ''اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے'' اور ان کے علاوہ دوسری ارواح پر صبح وشام ان کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک قول ہے کہ حدیث کے عموم کی وجہ سے تمام مؤمن مراد ہیں جو جنت میں بغیر عذاب داخل ہوں گے۔

تعلق: بصیغۂ مذکر و مؤنث دونوں طرح ہے۔ سیوطی کہتے ہیں ''تعلق'' لام کے ضمہ کے ساتھ ہے ''اى تاكل العلقة''

مہملہ کے ضمہ کے ساتھ۔

حتى يرجعه الله في جسده یعنی اس کے جسم میں مکمل طور پر لوٹا دیتا ہے۔

تخریج: امام سیوطیؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو امام نسائیؒ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے "إن أرواح الشهداء في طير خضر تعلق من ثمر الجنة أو شجر الجنة"۔ قرطبیؒ حدیث کعب کے بارے میں کہتے ہیں: "نسمة المؤمن طائر" دلالت کرتا ہے کہ نفس نسمہ پرندہ بن جاتا ہے یعنی پرندے کی شکل میں بن جاتا ہے نہ یہ کہ "طائر" اس کا ظرف بن جاتا ہے۔

اور اسی طرح ابن ماجہ میں ابن مسعودؓ کی حدیث ہے: ارواح الشهداء عند الله كطير خضر۔

ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: تحول في طير خضر۔ اور ابن عمروؓ کے الفاظ اس طرح ہیں: في صور طير بيض۔ کعب کی حدیث میں "ارواح الشهداء في طير خضر" کے الفاظ ہیں۔

قرطبی کہتے ہیں یہ ساری روایات "جوف طير" والی روایت سے زیادہ صحیح ہیں۔ اور قابسیؒ کہتے ہیں علماء نے "في حواصل طير خضر" والی روایت کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں تو وہ ارواح محصور و مقید ہو کر رہ جائیں گی' لیکن اس پر رد کیا گیا ہے بایں طور کہ روایت ثابت ہے اور تاویل کا احتمال ہے کیونکہ اس بات سے کوئی مانع نہیں کہ وہ ارواح حقیقتاً پرندوں کے پیٹوں میں ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کے پوٹوں کو وسیع کر دے یہاں تک وہ فضا سے بھی وسیع ہو جائیں۔ سیوطی نے شرح الصدور میں اسی طرح نقل کیا ہے۔

میرے نزدیک یہ اعتراض سرے سے ساقط ہے۔ اس لیے کہ تضیق اور انحصار روح میں متصور نہیں ہو سکتے' یہ تو جسم میں متصور ہو سکتا ہے اور روح جب ایک جسم لطیف ہے تو جسم لطافت میں اس کے تابع ہوتا ہے' پس روح اپنے جسم کے ساتھ جہاں چاہتی ہے جاتی ہے اور جو چاہے فائدہ اُٹھاتی ہے' اور جو اللہ جہاں اس کے لئے چاہے وہاں بسیرا کرتی ہے۔ جیسے ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ معراج میں ہوا تھا۔ اور اولیائے سے تباعد نہیں' کہ ان کے لئے زمین لپیٹ دی جاتی ہے اور ان کے لیے مختلف اور متعدد ابدان کا حصول ہوتا ہے' لوگ ان کو بیک وقت مختلف جگہوں میں پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ معاملہ تو اس عالم کا ہے جو اکثر امر عادی پر مبنی ہے تو پھر کیسے ممکن نہیں جب کہ تمام آخرت کے اُحوال اور روح کا معاملہ خوارق عادات پر مبنی ہے' اور مدت برزخ میں ارواح لطیفہ کو اجسادِ کثیفہ اکل و شرب وغیرہ کی لذات حسیہ سے تمتع حاصل کرنے کے لئے وسیلہ ہوں گے تاکہ نعمتیں علی وجہ الکمال اور حالت اولیٰ کے مطابق حاصل ہوں۔ یہ مراد نہیں کہ مؤمنوں کی ارواح پرندوں کے پوٹوں میں دوسری ارواح کے مقابلہ میں۔ کہ اس سے۔ محذور عقلی لازم آتا ہے کہ وہ روحیں ایک ہی جسم میں ہوں۔

ابن دحیہ "تنویر" میں کہتے ہیں: متکلمین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ "یہ روایت منکر ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ دو روحیں ایک جسم میں نہیں ہو سکتیں' یہ محال ہے"۔ ان کا یہ قول حقائق سے ناواقفیت پر مبنی ہے اور ثابت شدہ سنت پر اعتراض ہے۔ چونکہ کلام کا معنی واضح ہے۔ اس لئے کہ شہید کی روح جو دنیا میں اس کے جسم کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ (آخرت میں) ایک دوسرے پیٹ میں رکھ دی جائے گی گویا کہ وہ پرندے کی شکل ہے۔ پس اس کی روح اس دوسرے جسم میں ہوگی جو پہلے جسم میں تھی۔ یہ

مدت برزخ ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اٹھائے'' (اسی طرح) جس طرح کہ اس کو پیدا کیا تھا۔ عقلاً جو چیز محال ہے وہ ایک ہی جوہر کے ساتھ دو زندگیوں کا قیام ہے۔ جوہر ان دونوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ دو روحوں کا ایک جسم میں ہونا محال نہیں چونکہ اجسام میں تداخل نہیں ہے چنانچہ جنین ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اور اس کی روح ماں کی روح کے علاوہ ہے حالانکہ ان دونوں پر ایک ہی جسم مشتمل ہے۔ یہ اعتراض تو تب لازم آتا جب ان سے کہا جائے کہ پرندے کی روح شہید کی روح کے علاوہ ہے اور وہ دونوں ایک جسم میں ہیں حالانکہ کہا یہ گیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتے ہیں' یعنی پرندے کی صورت میں۔ جیسے آپ کہتے ہیں: میں نے ایک فرشتہ انسان کی شکل میں دیکھا۔

١٦٣٣: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَهُوَ يَمُوْتُ فَقُلْتُ اِقْرَأْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّلَامَ۔ [رواه ابن ماجه]

اخرجه ابن ماجه في السنن ٤٦٦/١ حديث رقم ١٤٥٠۔

ترجمہ: حضرت محمد بن منکدرؒ سے روایت ہے کہ میں جابر بن عبداللہؓ کے پاس گیا اور وہ مرنے کے قریب تھے۔ پس میں نے کہا میرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہنا۔ یہ روایت ابن ماجہ نے نقل کی ہے۔

راوئ حدیث:

محمد بن منکدر: مؤلفؒ فرماتے ہیں: یہ بہت بڑے تابعی ہیں اور مشہور تابعین میں سے ہیں۔ علم، زہد اور عبادت کو جامع تھے۔

جابر بن عبداللہ: حضرت جابر اور ان کے والد دونوں اکابر صحابہ میں سے ہیں۔

تشریح: امام سیوطیؒ کہتے ہیں: امام بخاریؒ نے حدیث بیان کی ہے: عن خالدة بنت عبد الله بن أنيس قالت: جاء ت أم أنيس بنت أبى قتادة بعد موت أبيها بنصف شهر إلى عبد الله بن أنيس وهو مريض فقالت ياعم! اقرأ أبى السلام۔ ''شرح الصدور'' میں اسی طرح مذکور ہے۔

بَابُ غُسْلِ الْمَيِّتِ وَتَكْفِيْنِهٖ

یہ باب میّت کے غسل وکفن کے بارے میں ہے

عرضِ مرتب:

اس باب میں میّت کے نہلانے اور کفنانے کے آداب مذکور ہیں اور میّت کا نہلانا فرض کفایہ کا درجہ رکھتا ہے تمام علماء کے نزدیک اگر بعض آدمی نہلا دینگے تو سب آدمیوں کے ذمے سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ ورنہ سب گنہگار ہوں گے اور اس میں

اختلاف ہے۔ میت کے غسل میں نیت شرط ہے یا نہیں۔ شیخ ابن ہمام نے کہا ہے ظاہر تو یہی ہے کہ نیت شرط ہے۔

الفصل الاول:

میت کو غسل دینے کا طریقہ

۱۶۳۴: عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَغْسِلُ ابْنَتَهٗ فَقَالَ اِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا اَوْ خَمْسًا اَوْ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ اِنْ رَاَيْتُنَّ ذٰلِكَ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ وَاجْعَلْنَ فِي الْاٰخِرَةِ كَافُوْرًا اَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُوْرٍ فَاِذَا فَرَغْتُنَّ فَاٰذِنَّنِيْ فَلَمَّا فَرَغْنَا اٰذَنَّاهُ فَاَلْقٰى اِلَيْنَا حَقْوَهٗ فَقَالَ اَشْعِرْنَهَا اِيَّاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلَاثًا اَوْ خَمْسًا اَوْ سَبْعًا وَابْدَاْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوْءِ مِنْهَا وَقَالَتْ فَضَفَرْنَا شَعْرَهَا ثَلَاثَةَ قُرُوْنٍ فَاَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا۔ [متفق علیہ]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳۰/۳۔ حدیث رقم ۱۲۵۴۔ ومسلم فی صحیحه ۶۴۶/۲ حدیث رقم (۳۶۔۹۳۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۰۳/۳ حدیث رقم ۳۶۴۲۔ والترمذی ۳۱۵/۳ حدیث رقم ۹۹۰۔ والنسائی ۲۸/۴ حدیث رقم ۱۸۸۱۔ وابن ماجه ۴۶۸/۱ حدیث رقم ۱۴۵۸۔ ومالك فی الموطأ ۲۲۲/۱ حدیث رقم ۲ من كتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۸۴/۵۔

ترجمہ: حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہم آپ کی بیٹی حضرت زینبؓ کو غسل دے رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پردے کی اوٹ سے) ارشاد فرمایا کہ اس کو پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ تین مرتبہ نہلاؤ۔ یا پانچ مرتبہ یا اس سے زیادہ مرتبہ نہلاؤ۔ اگر ضرورت محسوس کرو۔ یعنی پانی میں پتوں کو جوش دلاؤ اور اس سے نہلاؤ کہ اس سے خوب پاکی اور صفائی ہوتی ہے اور فرمایا آخری مرتبہ کافور یا فرمایا کسی قدر کافور ڈال لو۔ پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے بتلاؤ پس جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہبند دیا کہ اس کو بدن سے لگا دو۔ یعنی اس کو کفن کے نیچے رکھ دو۔ اس طرح کہ بدن سے لگا رہے اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اس کو طاق بار (مرتبہ) غسل دو۔ تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ اور اس کے دائیں طرف شروع کرو اور وضو کے اعضاء سے اور اُمّ عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نے ان کے بالوں کی تین چوٹیاں گوندھیں (یعنی بٹیں) پھر ہم نے ان کو ان کے پیچھے ڈال دیا اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

اُمّ عطیہ: ان کا نام "نسیبہ" ہے نون کے ضمہ، سین مہملہ کے فتحہ، یاء کے سکون اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ یہ کعب کی بیٹی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ حارث بیٹی ہیں انصاریہ ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی تھیں۔ (مؤلف)

تشریح: **نحن نغتسل ابنته:** کہا گیا ہے کہ یہ ابوالعاص بن ربیع کی بیوی تھیں۔آپ کی اولاد میں سے آپ سب سے بڑی تھیں۔ہجری کے آٹھویں سال فوت ہوئیں۔ایک قول یہ ہے کہ یہ سیدہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔سیدنا حضرت عثمان بن عفان کی بیوی تھیں نو ہجری میں فوت ہوئیں۔اس کی تحقیق اس فصل کے آخر میں بیان ہوگی۔

قوله: فقال اغلسلنها ثلاثا او خمسا۔۔۔۔بماء وسدر: دوسری روایت میں جو آگے آرہی ہے "سبعًا" کے الفاظ ہیں۔یہاں "أو" ترتیب کے لیے ہے تخییر کے لیے نہیں' کیونکہ اگر صفائی پہلی مرتبہ میں حاصل ہو جائے تو تین دفعہ مستحب ہے اس سے تجاوز کرنا مکروہ ہے' جب دوسری یا تیسری دفعہ سے ہو تو پانچ مرتبہ مستحب ہے وگرنہ سات مرتبہ۔یہ تحقیق قاضی' ابن الملک وغیرہ نے بیان کی ہے۔

زین العرب فرماتے ہیں میں کہتا ہوں یہ بات محل نظر ہے کیونکہ ''او' یہاں تخییر کے لیے ہے اور جو شارح نے ذکر کیا ہے وہ مستفاد من خارج ہے جو تخییر کے منافی نہیں۔

ذلك: کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک دوسرے نسخہ میں کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے۔اس میں خطاب عام ہے یا اس حکم کی بجا آوری میں ام عطیہ کو آدمی کے قائم مقام قرار دیتے ہوئے بصیغۂ مذکر خطاب فرمایا ہے۔

قوله: إن رأيتن: طیبیؒ کہتے ہیں یہ خطاب ام عطیہؓ سے ہے۔اور ''رأیت'' الرأی سے ماخوذ ہے۔یعنی اگر تم ضرورت محسوس کرو تین یا پانچ مرتبہ صفائی کی تو اتنی مرتبہ تک غسل دے دینا) نہ کہ صرف اپنی چاہت کی خاطر کریں۔ان کا یہ کہنا کہ یہ خطاب ام عطیہؓ سے ہے تو یہ ظاہر ہے'' رأیتن" خطاب عورتوں سے ہے۔چنانچہ اس کا تعلق اس قبیل سے ہوگا:''**ذلك يوعظ به من كان منكم**" چونکہ وہ ان کی رئیس تھیں تو اس لئے انہیں خطاب کے ساتھ خاص کیا گیا اور پھر عام کیا گیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "رأیتن" میں خطاب تعظیم کی بنا پر ہو یا انہیں جماعت کے قائم قرار مقام دیا ہو کہ ان سب خواتین کی رائے کا مدار ان کی رائے پر تھا۔و **الله أعلم**۔

بماء و سدر: کا تعلق "اغسلنها" کے ساتھ ہے قاضی کہتے ہیں یہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ بیری کے پتوں کا استعمال تمام غسلوں میں کیا جائے پس اس کا استعمال پہلی مرتبہ میں مستحب ہے تاکہ گندگی اور میل کچیل دور ہو جائے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: حدیث اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ مطلوب تنظیف میں مبالغہ ہے نہ کہ تطہیر میں' وگرنہ تو اس میں پانی ہی کافی ہے۔اس میں شک نہیں کہ گرم پانی بھی اسی طرح ہے' تو گویا یہ مطلوب شرعی ہے۔امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ گرم نہیں کیا جائے گا۔کہا گیا ہے کہ سادہ پانی کے ساتھ ابتدا کی جائے تاکہ اولاً پانی کے ساتھ میل کچیل تر ہو جائے' پھر پانی اور بیری کے ساتھ اس کو مکمل طور پر دور کیا جائے پھر نظافت کے بعد تطیب بدن' ماء کافور کے ساتھ حاصل ہوگی' اولیٰ یہ ہے کہ پہلی دو مرتبہ بیری والے پانی کے ساتھ غسل دیا جائے جیسا کہ "هدايه" کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔امام ابوداؤد نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے:

انه كان يأخذ الغسل عن أم عطية يغسل باسدر مرتين والثالث بالماء والكافور۔اس کی سند صحیح ہے۔

في الآخرة (یہ موصوف محذوف کی صفت ہے) **اى المرة الآخرة** یعنی آخری مرتبہ۔)

كافورا أو شيئًا: راوی کو شک ہے۔

''کافور'' ''ہوام'' (زہریلے اور غیرزہریلے کیڑے وغیرہ) کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

فآذنني مدّ ذال کے کسرہ اور پہلے نون کی تشدید کے ساتھ۔ ''ایذان'' مصدر سے جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے' اس کا معنی ہے: اعلام (اطلاع دینا) پہلا نون اصلی ہے' ساکن ہے دوسرا نون ضمیر فاعل ہے' یہ مفتوح ہے' اور تیسرا نون وقایہ کا ہے۔ (میرك عن ازهار) اس میں ہمزہ پر سکون اور ذال پر فتحہ بھی جائز ہے لیکن ہم نے کسی نسخہ میں نہیں پایا۔

آذناه: مد کے ساتھ۔ (ہم نے آپ کو فراغت کی خبر دی۔)

حقوه: نہایہ میں ہے یعنی آپ نے اپنا بندھا ہوا تہبند دیا۔ ''الحقو'' اصل میں ''معقد ازار'' (شلوار باندھنے کی جگہ) کو کہتے ہیں۔ پھر ''مجاورت'' کی وجہ سے اس کا اطلاق ازار پر ہونے لگا۔

فقال اشعرنها إياه: یہ خطاب غسل دینے والی خواتین کو ہے۔ نہایہ میں ہے: یعنی اس ازار کو اس کا شعار بنا دینا۔ ''شعار'' وہ کپڑا ہے جو جسم کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔ اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے کہ یہ جسم کے بالوں کے ساتھ لگتا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ اسی چادر کو کفنوں کے نیچے اس طرح سے رکھنا کہ وہ اس کے جسم کے ساتھ مل جائے اس مراد ان کو برکت پہنچانا تھا۔

قوله: وفي رواية اغسلنها وترا ثلاثًا او خمسًا أو سبعًا:

حدیث کے ظاہر سے لگتا ہے کہ سات بار سے زیادہ غسل نہ دیا جائے کیونکہ مروی عدد تطہیر کی یہ انتہا ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول ''أو تسعا وهكذا'' اور سات پر اختصار فرمایا' چونکہ غالب یہی ہے کہ اس سے صفائی حاصل ہو جاتی ہے بلکہ اس سے کم سے بھی حاصل ہو جاتی ہے'' یہ محل بحث ہے۔

قوله: وأبدان بميا منها ومواضع الوضوء منها: یعنی پہلے داہاں ہاتھ دایاں پہلو اور دائیں ٹانگ پہلے دھونا۔

و مواضع الوضو منها: واؤ مطلق جمع کے لیے ہے چنانچہ ان اعضاء کو مقدم کیا جائے گا جن کو وضوء میں دھونا فرض ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک کلی اور استنشاق نہیں ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے مستحب قرار دیا ہے کہ غسل دینے والا اپنی انگلی پر کوئی لیر لپیٹ کر اس کے دانتوں کو ملے' ہونٹوں اور نتھنوں پر پھیرے۔ آج اس پر لوگوں کا عمل ہے۔ پسندیدہ یہ ہے کہ اس کے سر کا مسح کرے اور اس کے پاؤں دھونے کو مؤخر نہ کرے' ہاتھ دھونے کو مقدم نہ کرے' بلکہ چہرے سے شروع کرے برخلاف جنبی کے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پاکی حاصل کرتا ہے اور میت کو غسل کسی دوسرے کے ہاتھ سے دیا جاتا ہے۔

قوله: وقالت: فضفرنا الخ: وقالت: ام عطیہ اس حدیث میں کہتی ہیں۔

فضفرنا: تخفیف کے ساتھ ہے۔

شعرها: عین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔

''ضفر'' بالوں کو باندھنا طیبیؒ کہتے ہیں: ضفیرہ سے ہے اسی سے بالوں کو ایک دوسرے میں داخل کرنا ہے۔

ثلاثة قرون: ابن الملکؒ کہتے ہیں اقسام مراد ہیں (یعنی تین قسمیں بنالو) امام طیبیؒ کہتے ہیں: شاید کہ بالوں کی تین

چوٹیاں بنانا اسی وقت کی عورتوں کی عادت کی رعایت کے پیش نظر تھا۔ یا وتر عدد کی سنت کی رعایت کے پیش نظر تھا دیگر افعال کی طرح۔

ایک دوسری روایت میں ہے: فضفرنا نا ضیتحها وقرنها ثلاثة قرون۔ اسی طرح ایک روایت میں "فمشطناها ثلاثة قرون" ہے۔ یہ بھی تخفیف کے ساتھ ہے۔ اختلاف ائمہ میں ذکر کیا گیا ہے ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے بغیر باندھے ہوئے۔ قولہ: متفق علیہ: یہ مکمل حدیث متفق علیہ ہے مگر "فا لقينا ها خلفها" کے الفاظ صرف بخاری شریف کے ہیں۔ (میرک)

تخریج: اس حدیث کو اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (قالہ۔ میرکؒ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کا بیان

۱۶۳۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُفِّنَ فِيْ ثَلَاثَةِ اَثْوَابٍ يَمَانِيَّةٍ بِيْضٍ سُحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَلَا عَمَامَةٌ۔ [متفق علیہ]

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۳۵/۳۔ حديث رقم ۱۲٦٤۔ ومسلم فی صحيحه ٦٤٩/۲ حديث رقم (٤٥۔٩٤١)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۰٦/۳ حديث رقم ۳۱۵۱۔ والترمذی ۳۲۱/۳ حديث رقم ۹۹٦۔ والنسائی ۳۵/٤ حديث رقم ۱۸۹۸ وابن ماجه ٤۷۲/۱ حديث رقم ۱٤٦۹۔ ومالك فی الموطأ ۲۲۳/۱ حديث رقم ۵ من كتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۹۳/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا جو یمنی اور سحول کی بنی ہوئی روئی کے تھے اور ان میں سلا ہوا کرتا اور پگڑی نہیں تھی۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان رسول الله ﷺ كفن فى ثلاثه اثواب۔۔۔من كرسف:

یمانیة: یاء کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

قوله: سحولية: سین کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے ابن ہمامؒ کہتے ہیں سین کا فتحہ زیادہ مشہور ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ ضمہ کے ساتھ یہ یمن کی بستی ہے۔ نووی کہتے ہیں فتحہ زیادہ مشہور ہے اور اکثر سے یہی روایت ہے۔

فائق میں ہے کہ سین فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔ فتحہ کے ساتھ "سحول" کی طرف منسوب ہے یا سحول کی طرف منسوب ہے جو یمن کی بستی ہے

ضمہ کے ساتھ "سحل" کی جمع ہے سفید صاف ستھرا کپڑا اور یہ روئی ہی سے بنتا ہے۔ اس میں شذوذ ہے اس لیے کہ اس میں جمع کی طرف نسبت ہے۔ ایک قول ہے: ضمہ کے ساتھ بھی بستی کا نام ہے۔

كرسف: کاف اور سین کے ضمہ کے ساتھ یعنی روئی۔

قوله: ليس فيها قميص ولا عمامة: مواہب میں ہے: صحیح یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کفن میں اصلاً قمیص نہیں ہے ایک قول یہ ہے: انہیں تین کپڑوں میں کفن دیا گیا اس میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ اس میں اختلاف ہے کہ کفن میں

قمیص اور پگڑی مستحب ہے یا نہیں چنانچہ امام مالک احمد اور شافعی کہتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ تین ''لفائف'' میں کفن دیا جائے جس میں قمیص اور پگڑی نہیں ہوگی۔ حنفیہ کہتے ہیں: تین کپڑوں ازار، قمیص اور لفافہ میں کفن دیا جائے گا۔

بعض علماء نے پگڑی کو مستحب قرار دیا ہے۔ امام نووی کہتے ہیں: امام ابوحنیفہ اور مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں: قمیص اور پگڑی مستحب ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ قمیص اور پگڑی ان تینوں میں سے نہیں ہے یہ دونوں زائد ہیں۔ یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ بات ثابت نہیں ہے کہ آپ کو قمیص اور پگڑی میں کفن دیا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں: اور یہ بھی ثابت نہیں آپ کو ان دو کپڑوں میں کفن نہیں دیا تھا۔ پس مسئلہ میں نزاع ہے اور یہ حدیث محتمل ہے باوجودیکہ اس قول کی علی الاطلاق نسبت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف غیر صحیح ہے۔ کیونکہ ہمارے بعض مشائخ نے عمامہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔

نووی کہتے ہیں: حدیث میں دلیل ہے وہ قمیص کہ جس میں آپ کو غسل دیا گیا وہ آپ کی تکفین کے وقت اتار دی گئی تھی چونکہ اگر اسے اتارا نہ جاتا تو دونوں کفن رطوبت کی وجہ سے خراب ہو جاتے۔ میں کہتا ہوں حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل عقلی امر ہے جو خارج ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: اگر اس کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ مراد یہ ہے کہ ان تین میں قمیص نہیں تھی بلکہ اس سے خارج تھی۔ جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے تو لازم آتا ہے کہ سنت چار کپڑے ہیں۔ اور یہ مردود ہے اس روایت کی بدولت جو صحیح بخاری میں ہے:

''عن أبي بكر قال لعائشة: في كم ثوب كفن رسول الله ﷺ؟فقالت: في ثلاثه اثواب''۔

اگر اس کا معارضہ کیا جائے اس روایت سے جس کو ابن عدیؒ نے ''کامل'' میں روایت کیا ہے:

عن جابر بن سمرة قال: ''كفن النبي ﷺ في ثلاثة اثواب: قميص و ازار و لفافة'' سے

تو یہ ضعیف ہے۔

اور جو روایت محمد بن حسن نے بیان کی ہے: عن أبي حنيفه عن حماد بن أبي سليمان عن ابراهيم لنخعي أن النبي ﷺ كفن في حلة يمانية و قميص وہ مرسل ہے۔ اور اگرچہ مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے لیکن اس کو حدیث عائشہؓ پر مقدم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس اگر یہ ممکن ہو کہ حدیث عائشہ کو حدیث قمیص کے معاول قرار دیا جائے اس کے تعدد طرق کی وجہ سے اس کے طرق میں سے دو طریق وہ ہیں تو جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔ (اور ایک طریق وہ ہے جو) عبدالرزاق نے حسن بصری سے بطریق مرسل بیان کیا ہے۔

اور جو ابوداؤدؒ نے عن ابن عباسؓ روایت کی ہے: قال: ''كفن رسول الله ﷺ في ثلاثة اثواب قميصه الذى مات فيه وحلة نجرانية''

یزید بن زیادہ کی وجہ سے اس کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

معاملہ سے لوٹنے کے بعد اس بات کو ترجیح دی جائے گی بحث بھی مکمل ہوئی۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ آپ کو اس قمیص

میں غسل دیا گیا جس میں آپ فوت ہوئے تھے۔ وہ اس کے اوپر سے تو آپ کو کفن کیسے پہنا سکتے تھے حالانکہ اس میں رطوبت تھی۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے یوں کہا جائے کہ آپ کی صلی اللہ علیہ وسلم متعدد قمیص ہوں ایک غسل کے وقت اتار دی گئی ہو دوسری میں غسل دیا گیا پھر (اس کو اتار کر) آپ کو خشک قمیص میں کفن دیا گیا ہو۔ اس کی تائید عنقریب آگے آ رہی ہے کہ آپ نے عبداللہ بن ابی کو اپنی قمیص میں کفن دیا۔

فرمایا: ''حلہ'' ان کے عرف میں دو کپڑوں کے مجموعے کو کہتے ہیں: ازار اور تہہ بند۔ اور ہمارے نزدیک کفن میں پگڑی شامل نہیں ہے۔ بعض علماء نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ بوجہ اس کے جو ابن عمر سے روایت کیا گیا ہے ابن عمر انه كان يعمه ويجعل العذبة على وجهه کہ وہ اس عمامے باندھتے تھے اور اس کا ایک کنارہ اس کے چہرے پر ڈال لیتے دیتے تھے''۔

تخریج: امام ابن ہمام کہتے ہیں: اس حدیث کو اصحاب کتب ستہ نے روایت کیا ہے۔

کفن بہتر ہونا چاہیے

۱۶۳۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا كَفَّنَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُحَسِّنْ كَفَنَهُ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحيحه ٦٥١/٢ حديث رقم (٤٩۔ ٩٤٣)۔ وابوداوٗد فی السنن ٥٠٥/٣ حديث رقم ٣١٤٨۔ والترمذی ٣٢٠/٣ حديث رقم ٩٩٥۔ وابن ماجه ٤٧٣/١ حديث رقم ١٤٧٤۔ والنسائی فی السنن ٣٣/٤ حديث رقم ١٨٩٥۔ واحمد فی المسند ٢٩٥/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اس کو چاہیے اچھا کفن دے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: فليحسن: تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ سب سے صاف ستھرا مکمل اور سفید کپڑا اختیار کرے جیسا کہ اصحاب کتب ستہ نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس سے وہ مراد نہیں ہے جو کچھ کہ فضول خرچی کرنیوالے سمعہ اور ریا کاری کے لیے کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کی روایت میں عنقریب آ رہا ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں فضول خرچی کرنے والے جو اعلیٰ کپڑا استعمال کرتے ہیں شریعت میں اس سے منع کیا گیا ہے چونکہ یہ اضاعت مال ہے۔

ابن عدیؒ نے روایت کیا ہے: احسنوا اكفان موتاكم فانهم يتزاورون فی قبورهم۔ اپنے مردوں کو اچھے کفن پہناؤ کیونکہ ان کی قبروں میں فرشتے ان سے ملاقات کرتے ہیں۔

حدیث مذکورہ میں کفن کا حکم صرف اسی کے ساتھ خاص تھا عام نہیں تھا

۱۶۳۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا كَانَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَقَصَتْهُ نَاقَتُهُ

وَهُوَ مُحْرِمٌ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِغْسِلُوْهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ وَكَفِّنُوْهُ فِىْ ثَوْبَيْهِ وَلَا تَمَسُّوْهُ بِطِيْبٍ وَلَا تُخَمِّرُوْا رَأْسَهُ فَاِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا۔

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۳۷/۳ حديث رقم ۱۲۶۷۔ ومسلم في صحيحه ۸۶۵/۲ حديث رقم (۹۳۔ ۱۲۰۶)۔ والترمذي في السنن ۲۸۶/۳ حديث رقم ۹۵۱۔ والنسائي ۳۹/٤ حديث رقم ۱۹۰٤۔ وابن ماجه ۱۰۳۰/۲ حديث رقم ۳۰۸٤۔ والدارمي ۷۱/۲ حديث رقم ۱۸۵۲۔ واحمد في المسند ۲۱۵/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا پس اونٹنی نے اس کی گردن توڑ دی اور وہ حالت احرام میں تھا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کو پانی اور بیری کے ساتھ غسل دو اور اس کو اس کے دو کپڑوں میں کفن دو اور خوشبو نہ لگاؤ اور نہ اس کا سر ڈھانکو۔ پس وہ قیامت کے دن لبیک کہتا ہوا اُٹھایا جائے گا۔ یہ روایت بخاری اور مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: قوله: ان رجلا كان ـــــ وقصته : وقص کا معنی ہے گردن کا ٹوٹنا یعنی اونٹنی نے اسے گرایا تو اُس کی گردن ٹوٹ گئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں: محرم مذکور کا یہ واقعہ عرفہ کی پہاڑیوں میں پیش آیا تھا۔ (ذکرہ فی مواہب)

قوله: فقال رسول الله ﷺ ـــــ كفنوه في ثوبيه: ایک روایت میں "في ثوبين" کے الفاظ ہیں اور اسی طرح ایک نسخہ میں ہے۔ "اسی کے دونوں کپڑوں" سے مراد اس کا ازار اور تہہ بند ہے جو اُس نے احرام کی حالت میں پہنا ہوا تھا۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ کفن کفایہ دو کپڑے ہیں۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: کفن کفایہ وہ کم از کم کپڑے ہیں جو اختیار کے وقت دستیاب ہوں اور حالت ضرورت میں جو میسر ہو اور یہ حدیث حالت ضرورت پر محمول ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں اگر دو کپڑوں پر اقتصار کیا جائے تو جائز ہے۔

ابن ہمام لکھتے ہیں اور دلیل یہ روایت ہے: "عبد الرزاق انبانا معمر عن الزهري عن عروة عن عائشة قالت: قال ابو بكر لثوبيه اللذين كان يمرض فيهما اغسلوهما و كفنوني فيهما' فقالت عائشة ألانشتري لك جديدًا؟ قال: لا' الحي أحوج إلى الجديد من الميت" ایک دوسری روایت یہ الفاظ زائد ہیں: انما اهو للمهلة۔ میم پر تینوں حرکات درست ہے۔ "صديد الميت" (خاص مردہ کی پیپ) کو کہتے ہیں۔ اور فروع میں ہے کہ دھلے اور نئے کپڑے کفن میں برابر ہیں۔ (ذکرہ فی تحفہ)

ابن ہمام نے صاحب ہدایہ کے قول: "والازار من القرن الى القدم واللفافة كذلك" کے متعلق کہا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں کہ "لفافہ" قرن سے قدم تک ہوتا ہے۔ اور جہاں تک بات ہے ازار کے بھی اسی طرح ہونے کی تو اس میں میت اور زندہ کے ازار مسنون کے مختلف ہونے کی وجہ مجھے معلوم نہیں۔ نبی علیہ السلام نے اس محرم کے بارے میں فرمایا تھا: كفنوه في ثوبيه۔ وہ احرام کے دو کپڑے ازار اور چادر تھے اور یہ بات معلوم ہے کہ ازار "حقو" سے ہے اور اسی طرح حدیث ام عطیہ سے کہا گیا ہے کہ درست لیلیٰ بنت قائف ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں ان میں شامل تھی جو اُم کلثوم بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دی

رہی تھیں۔ سب سے پہلے ہمیں آپؐ نے حقاء دیا پھر قمیص پھر چادر پھر لحاف ملحفہ پھر ان کو ایک دوسرے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ اس کو امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

''حضور کے'' حقوہ کا ذکر زینبؓ کے غسل کی حدیث میں ہے پھر اور یہ اس مسئلہ میں واضح ہے کہ میت کا ازار زندہ کے ازار کی طرح ہے۔ پس مذکر میں بھی اس طرح ہونا واجب ہے کیونکہ اس میں کوئی فرق نہیں ہے نوویؒ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے' اگرچہ ابن قطان نے بعض رواۃ کی جہالت کی بناء پر حدیث کو معلول قرار دیا ہے اور یہ محل نظر ہے۔ جبکہ ام عطیہ کا زینبؓ کے بعد اُم کلثوم کے غسل کے موقع پر حاضر ہونے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

منذریؒ کا یہ قول کہ ''ام کلثومؓ جب فوت ہوئیں تو نبیؐ اس وقت موجود نہ تھے'' یہ ابن اثیرؒ کے قول کے معارض ہے جوانہوں نے ''كتاب الصحابه'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ زینب کے ۹ سال بعد فوت ہوئیں اور آپ نے ان کا جنازہ پڑھایا۔ اس کو مزید تقویت ابن ماجہ کی روایت سے ملتی ہے:

''**عن ام عطية قالت: دخل علينا رسول الله ﷺ و نحن نغسل ابنته ام كلثوم فقال اغسلنها**۔ یہ حدیث باب کے شروع میں ذکر کی گئی ہے۔ اس کی سند صحیح ہے' اور مسلم میں زینب کے بارے میں اس کے مثل جو قول ہے وہ اس کے منافی نہیں ہے جو ہم نے ابھی کہا ہے۔

ولا تمسوه: ''مس'' سے ماخوذ ہے اور ایک روایت میں ''إمساس'' سے ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: موجودہ تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور ہمارے اصل سماع میں تاء مثناہ فوقیہ کے فتحہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ ثلاثی مجرد سے ہے۔ لیکن شیخ ابن حجرؒ نے صحیح بخاری کی شرح میں تاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ از ''أمس'' (یعنی از باب افعال) ذکر کیا ہے اور قاموس میں ہے: **مسته بالكسر أمسه ومسته كنصرته**۔

ولا تخمروا: تشدید کے ساتھ ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: امام شافعی اور احمد کا مذہب یہ ہے کہ محرم کو اس کے لباس احرام میں کفن دیا جائے گا' اس کا سر نہیں چھپایا جائے گا اور اس کو خوشبو نہیں لگائی جائے گی۔

قوله: فانه يبعث يوم القيامة ملبيا: یعنی یہ لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے اٹھے گا' تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ وہ محرم ہونے کی حالت میں فوت ہوا تھا۔ فرمایا: امام ابوحنیفہ اور مالک رحمۃ اللہ علیہما کا مذہب یہ ہے اس کا حکم باقی مردوں والا حکم ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ائمہ اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

قوله: و سند كر حديث خباب......:

باء موحدہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

قتل: امام طیبیؒ کہتے ہیں: یہ بصیغۂ مجہول ہے۔ یہ حدیث کے لفظ کی حکایت ہے۔ ''حدیث خباب'' سے بدل ہے۔ اسی **سنذكر هذا اللفظ وهو قتل مصعب بن عمير الخ:**

یہاں اعتذار قولی بھی ہے۔ اور صاحب مصابیح پر اعتراض فعلی بھی ہے یہ مؤلفؒ کا زعم ہے کہ حدیث خبابؓ اس باب کے

زیادہ مناسب ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ طے شدہ بات ہے کہ تغییر تصنیف خلاف صواب ہے۔ لیجئے میں وہ حدیث ذکر کر رہا ہوں جو کتاب میں ہے: قال خباب بن الأرت : قتل مصعب بن عمير يوم احد' فلم نجد شيئا نكفنه فيه الانمرة اذا غطينا اى ستدنا بها راسه خرجت رجلاه واذا غطينا بها رجليه خرج راسه فقالؐ : ضعوها مما يلي اى يقرب رأسه واجعلوا على رجليه الاذخر۔ خباب بن الارتؓ فرماتے ہیں: ''مصعب بن عمیرؓ احد کے دن شہید کے گیے تو ہمیں ان کے کفن کے لیے سوائے ایک چادر کے کوئی چیز نہ ملی۔ ''نمرۃ'' نون کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ وہ چادر جو کالے رنگ کی ہو اور اس میں سفید دھاریاں ہوں) جب ہم ان کا سر ڈھانپتے تو ان کے پاؤں ننگے ہو جاتے اور جب ہم پاؤں ڈھانپتے تو سر نکل جاتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چادر سر کے قریب کر دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔''

یہ حدیث اس حدیث کی طرح ہے جو حضرت حمزہؓ کے بارے میں روایت کی گئی ہے۔ (بظاہر جارثہ بن مضرب کی حدیث مراد ہے ملاحظہ ہو حدیث: ۱۶۱۵ مرتب) یہ دونوں دلیل ہیں کہ ضرورت کے وقت کفن ایک کپڑا ہے اور پوری میت کو چھپانا ضروری ہے۔

الفصل الثانی:

سفید کپڑے کی دوسرے کپڑوں پر فضیلت و برتری

۱۶۳۸: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبِسُوْا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضَ فَاِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ وَمِنْ خَيْرِ اَكْحَالِكُمُ الْاِثْمِدُ فَاِنَّهٗ يُنْبِتُ الشَّعْرَ وَيَجْلُو الْبَصَرَ۔

[رواه ابو داود والترمذی وروى ابن ماجة الى مَوْتَاكُمْ]

اخرجه ابو داؤد في السنن ٣٣٢/٤ حديث رقم ٤٠٦١۔ والترمذی ٣١٩/٣ حديث رقم ٩٩٤ والنسائي ٣٤/٤ حديث رقم ١٨٩٦۔ وابن ماجه ٤٧٣/١ حديث رقم ١٤٧٢ واحمد في المسند ٢٤٧/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم سفید کپڑے پہنو اس لیے کہ وہ تمہارے کپڑوں میں سے بہتر کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑوں میں کفن دو اور اثمد تمہارے سرموں سے بہتر ہے اس لیے کہ پلکوں کے بالوں کو جماتا ہے اور بینائی کو روشن کرتا ہے اور اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے لفظ مَوْتَاكُمْ تک روایت کی ہے۔

تشریح: البسوا: باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ امر ندب کے لیے ہے۔

من ثيابكم: یہ ''من'' تبعیضیہ ہے یا بیانیہ ہے۔

البياض: سفید رنگ والے۔ اور ایک روایت ''البيض'' کے الفاظ ہیں۔

فإنها: ضمیر کا مرجع ''الثياب البياض'' (سفید کپڑے) ہے۔

من خير: ظاہر یہ ہے کہ ''مِن'' زائدہ ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: یہ اس لئے ہے کہ سفید رنگ تمام رنگوں سے افضل ہے۔ اس

پراشکال یہ ہے کہ ''سفید'' کو رنگ دار نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بیان جواز کے لئے' یا عدم دستیابی کے وقت سفید کے علاوہ بھی کپڑا بکثرت پہنا ہے۔

قولہ: و کفنوا فیھا موتاکم: یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں محبوب ترین سفید رنگ ہے اور آدمیوں کے لیے ''برد'' اور ''کتان'' میں کوئی حرج نہیں اور عورتوں کے لیے ریشم' مزعفر اور معصفر جائز ہے حالت حیات کے لباس کا اعتبار کرتے ہوئے۔

قولہ: و من خیر اکحالکم......:

الإثمد: ہمزہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ سرمے کا ایک پتھر ہے۔ قاموس میں ہے مشہور یہ ہے کہ یہ اصفہانی ہے۔

ینبت: ''یاء'' کے ضمہ اور ''با'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

الشعر: عین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔ (یہاں) پلکوں کے بال (مراد ہیں)

قولہ: و یجلوا البصر: یعنی آنکھ کے نور کو بڑھا دیتا ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع میں سوتے وقت لگایا جائے۔ اور اس لئے بھی کہ تاثیر اور سرایت کے لحاظ سے یہ بہت قوی ہے۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں: پہلی بات کو امر کی صورت میں ظاہر فرمایا اس کے اہتمام شان کی خاطر اور اس لئے کہ یہ سنت مندوبہ ہے۔ دوسری بات کو بصورت خبر ظاہر فرمایا یہ بتانے کے لیے کہ یہ لوگوں کی اچھی عادات میں سے ہے اور ان دونوں باتوں کو جمع کرنا زینت کی مناسبت سے ہے ان دونوں سے صلحاء مزین ہوتے ہیں۔

(امام طیبیؒ کے) اس (کلام) میں اشارہ ہے کہ سرمہ لگانا مندوب نہیں ہے شرح شمائل میں ''عصام الدین نے اسی کی پیروی کی ہے حالانکہ یہ قول مردود ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے اس پر ہمیشگی کی ہے آپؐ کے پاس سرمہ دانی تھی جس سے آپ ہر شب ہر آنکھ میں تین سلائی ڈالتے تھے۔ اور بہت سی احادیث میں اس کا حکم ہے کہ ''اکتحلوا'' اصحاب شافعی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ مستحب ہے' پس اس کو مباح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس پر ثواب نہیں ملتا۔

اور ابن حجرؒ کا یہ قول بھی محل نظر ہے: عطف علی جملة "البسوا" وغا یرمع ان کلا مأ موربه اهتما مابشأن الاول من حیث انه لاحظ فیه للمأمور بخلاف الأخیر۔

میرکؒ فرماتے ہیں: حدیث حسن صحیح ہے۔

وروی: ایک دوسرے نسخہ میں ''ورواہ'' کے الفاظ ہیں۔

کفن میں اسراف جائز نہیں ہے

۱۶۳۹: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُغَالُوْا فِي الْكَفَنِ فَإِنَّهُ يُسْلَبُ سَلْبًا سَرِيْعًا۔ [رواه ابو داود]

اخرجه ابو داؤد في السنن ٣/٥٠٨ حديث رقم ٣١٥٤۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کفن کو بہت مہنگا کپڑا نہ لگاؤ۔ کیونکہ وہ بہت جلد چھینا جاتا ہے یعنی بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: لا تغالوا: ایک ''تاء'' کو حذف کر دیا گیا ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ''تاء'' کے ضمہ اور لام کے ضمہ ساتھ ہے ای لا تبالغوا و لا تتجاوزوا الحد:

في اللكفن اي في كثرة ثمنه یعنی بہت مہنگا نہ خریدو۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ ''غلاء'' چیز میں اس کی مقدار سے تجاوز کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: غاليت الشئ بالشئ و غلوت فيه أغلوا' اذا جاوزت فيه الحد۔ اور حد کفن میں اوسط ہی اختیار کرنا ہے اور یہی مستحب و مستحسن ہے۔

قوله: فإنه يسلب :سلبًا سريعًا: امام طیبیؒ کہتے ہیں: ''سلب'' '' کپڑا پرانا ہونے سے استعارہ ہے مبالغہ کے طور پر۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ کہتے ہیں اس کی اسناد میں کلام ہے۔ اور امام نوویؒ اور منذریؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے قالہ (ابن ملقن)۔

قریب المرگ کے لیے نئے کپڑے پہننا

۱۶۴۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهُ لَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ دَعَا بِثِيَابٍ جُدُدٍ فَلَبِسَهَا ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَقُوْلُ اَلْمَيِّتُ يُبْعَثُ فِيْ ثِيَابِهِ الَّتِيْ يَمُوْتُ فِيْهَا۔ [رواه ابو داود]

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۳/۴۸۵ حديث رقم ۳۱۱۴۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے نئے کپڑے منگوائے۔ پھر ان کو پہنا اور فرمانے لگے کہ میں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میّت کو انہی کپڑوں میں اٹھایا جاتا ہے جن میں اس کو موت آتی ہے اس کو ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: جدد جیم اور دال کے ضمہ کے ساتھ ''جدید'' کی جمع ہے۔

نہایۃ میں ہے: خطابی فرماتے ہیں: ابوسعیدؓ نے حدیث کو اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے کفن کے متعلق کئی احادیث ہیں۔ بعض علماء نے اس کے معنی میں تاویل کی ہے اور انہوں نے اس سے مراد اس کی وہ حالت خیر و شر لی ہے جس پر اس کی موت ہوتی ہے اور اس کا وہ عمل جس پر اس کا اختتام ہے۔ کہا جاتا ہے فلان ظاهر الثياب جب لوگ اس کو طہارت نفس اور براءت از عیب کے ساتھ موصوف کریں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر: ٤] ''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو'' کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ''عملك فاصلح''۔ کہا جاتا ہے: فلان دنس الثياب جب وہ خبیث النفس ہو یہ (حدیث) ایک دوسری حدیث کی طرح ہے: يبعث العبد على مامات عليه۔ کہ ''بندے کی موت جس حالت میں ہوگی اُسی حالت پر زندہ کیا جائے گا''۔ ہروی کہتے ہیں: جس نے اس کی تفسیر کفن کے ساتھ کی کا قول کوئی چیز نہیں ہے' چونکہ انسان کو کفن موت کے بعد دیا جاتا ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحابہؓ میں سے بعض ایسے بھی تھے جن کی فہم بعض اوقات معنی مرادی سمجھنے سے قاصر تھی اور لوگ اس میں متفاوت ہیں۔ پس ان جیسی باتوں کو ان کی شان کے خلاف نہ شمار کیا جائے چنانچہ عدی بن حاتم نے جب یہ سنا: "حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الاسود" تو انہوں نے دو دھاگے سفید اور سیاہ لیے اور انہیں اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

طیبیؒ کہتے ہیں: بعض اہل علم نے دونوں حدیثوں میں تطبیق دی ہے۔ اور فرمایا کہ "بعث" حشر کے علاوہ ہے جب ایسا ہے تو جائز ہے کہ بعث کپڑوں کے ساتھ ہو اور "حشر" ننگے بدن اور ننگے پاؤں ہو۔ شیخ کہتے ہیں: اس قول کے قائل نے کچھ نہیں کہا چونکہ اس کا گمان ہے کہ اس نے سنت کی مدد کی ہے حالانکہ اس کے پاس جو کچھ محفوظ تھا اس نے اس کا اکثر حصہ ضائع کر دیا' چونکہ اس نے بہت ساری سنتوں میں تحریف کی کوشش کی ہے تاکہ صحابی کا کلام درست ہو جائے حالانکہ ہم کو سب سے افضل صحابیؓ سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے وصیت کی کہ "اُن کو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اور فرمایا کہ یہ دونوں پیپ اور مٹی کے لیے ہیں پھر اس حدیث میں آپ کا فرمان ہے: "المیت یبعث فی ثیابه التی یموت فیها" ان (علماء) کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کو اکفان پر محمول کریں چونکہ اکفان موت کے بعد ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ صدیق رضی اللہ عنہ کے کلام کو محمول کر لیا جائے ابتداءً پیپ کے لیے ہونے پر اور ابوسعیدؓ کے کلام کو "پرانا ہونے" پر انتہاءً محمول کیا جائے تو دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قاضی کہتے ہیں: عقل اس بات سے انکاری نہیں کہ اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے جو راوی نے اُس سے سمجھا ہے۔ کیونکہ پرانے کپڑوں کا اعادہ بعید نہیں ہے کیونکہ جو دلیل جواز اعادۂ معدوم پر دال ہے اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے' سوائے اس کے کہ تحشر الناس عرۃ اس قول نے جمہور اہل معانی کو ابھارا ہے کہ وہ ثیاب سے مراد وہ اعمال صالحہ وسیئہ لیں جن میں اس کی وفات ہوئی ہے چونکہ آدمی کی اعمال کے ساتھ ملابست اس طرح ہوتی ہے جس طرح اس کی ملابست کپڑوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے لفظ "ثیاب" استعارۃً لیا گیا ہے۔

زین العربؒ کہتے ہیں: جمع اس طرح ممکن ہے کہ "حشر" سے مراد غیر بعث ہو۔ پس ممکن ہے کہ یہ کپڑوں کے ساتھ ہو اور حشر برہنہ ہو یا اس وقت پہننا مراد ہے جب وہ حساب کتاب سے فارغ ہو جائے گا۔

زیادہ واضح یہ ہے کہ یوں کہا جائے: پہلے لوگ ننگے اٹھائے جائیں گے پھر ان کو لباس پہنائے جائیں گے جیسا کہ حدیث میں ہے: "أنه أول من یکسی ابراهیم ثم یبعثون إلی موقف الحساب" طیبی کہتے ہیں: صحابی کی طرف سے عذر یہ کیا جائے کہ اس نے کلام کے مغز کو سمجھا لیکن راوی نے ابہام والا راستہ اختیار کیا ہے اور کلام کو غیر مترقب پر محمول کیا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں: ﴿إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ [التوبہ: ۸۰] "تم ان کے لئے بخشش مانگو یا نہ مانگو (بات ایک ہی ہے) اگر (ان کے لئے) ستر دفعہ بھی بخشش مانگو گے تو بھی خدا ان کو نہیں بخشے گا۔ یہ اسلئے کہ انہوں نے خدا اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر کیا اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنی امت پر رحمت وشفقت کا اظہار تھا جن کی طرف آپ بھیجے گئے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ صحابی نے اس محل کو معنی پر محمول کیا ہو اور میلے کچیلے پرانے کپڑوں کو اتار کر صاف ستھرے نئے کپڑے پہننے کو اپنے جملہ اعمال صالحہ میں شمار کیا ہو۔ کیونکہ یہ مکرم فرشتوں کا استقبال ہے اور معظم ارواح کے پاس تشریف لے جانے کی تیاری ہے۔ اسی لیے اس کا حالت طہارت میں ہونا مستحب ہے۔

امام طبرانیؒ نے حضرت انس کی حدیث بیان کی ہے: "ان النبی ﷺ قال من اتاه ملك الموت وهو على وضوء أعطى الشهادة"۔ پس ظاہری طہارت باطنی طہارت کی تحصیل میں انتہائی مؤثر ہے۔ مزید یہ کہ ان کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے کہ اس کو اس کے اس عمل پر اُٹھایا جاتا ہے جس پر اس کا اختتام ہوا تھا' سوائے اس کے کہ اس کا اختتام عمل اطاعت پر رضاء بر قضاء رب کریم کے سامنے پیش ہونا اور اس کے عظیم فضل کے بارے میں حسن ظن پر ہوا ہو۔ اس کی تائید اس وصیت سے ہوتی ہے کہ ان کپڑوں کو ان کا کفن بنایا جائے' باوجود اس کے کہ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ "ملبوس" اولیٰ ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں ہمارا معتمد مذہب یہی ہے چونکہ اس نے مآل کار بوسیدہ ہو جانا ہے۔ اس کی تائید ابو بکرؓ کی روایت سے ہوتی ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے "کہ انہوں نے پرانے کفن (کپڑے) کو اختیار کیا اور کہا کہ زندہ کو مردہ کی نسبت اس کی زیادہ ضرورت ہے اور پھر آپؓ نے اس کی علت یہ بیان کی کہ کفن تو مردے کے خون اور پیپ کے لیے ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ آپؓ کی تواضع تھی اور اس بات کی طرف اشارہ کہ بوسیدہ (پرانا) کفن بھی جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اُعلم۔

اسنادی حیثیت میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس کا صرف مرفوع حصہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

۱۶۴۱: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ الْكَفَنِ الْحُلَّةُ وَخَيْرُ الْاُضْحِيَّةِ الْكَبْشُ الْاَقْرَنُ۔ [رواه ابو داود]

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵۰۹/۳ حديث رقم ۳۱۵۶۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین کفن حلہ ہے اور بہترین قربانی سینگوں والا دنبہ ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله: خير الكفن الحلة: یعنی قمیص کے اوپر ازار اور چادر جو ہے یہ سنت کفن ہے اور اس کے بغیر کفن کفایہ ہے نہایہ میں ہے "حلة" حلل کا واحد ہے یمنی چادروں کو کہتے ہیں اور "حلہ" اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک دو کپڑے ایک ہی جنس کے نہ ہوں۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: بعض ائمہ نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ کفن یمنی چادروں کا ہونا چاہئے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔ اور اصح یہ ہے کہ افضل کفن سفید کپڑا ہے دلیل حضرت عائشہ کی حدیث ہے "كفن فی السحولية" اور ابن عباسؓ کی حدیث ہے: "كفنوا فيها موتاكم" اھ۔

یہ محل نظر ہے' چونکہ قاموس میں ہے کہ "حلہ" ازار و چادر ہے' یا اس کے علاوہ اس احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال تام

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اکثر نے سفید رنگ کو پسند کیا ہے اور آپؐ نے ''حلہ'' کے بارے میں یہ اس لئے ارشاد فرمایا تھا کہ اُس وقت ان حضرات کے لئے حلہ آسان تھا۔

قوله: خير الأضيحة الأقرن: طیبیؒ کہتے ہیں: "كبش الأقرن" کی فضیلت دوسروں پر اس کے عظیم الجثہ ہونے کی بناء پر ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ عام طور پر موٹا ہوتا ہے۔

اسنادی حیثیت : امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ابوداؤد اور منذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

۱۶۴۲: وَرَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَابنُ مَاجَةَ عَن ابي امَامَةَ ۔

اخرجه الترمذي في السنن ٤/ ٨٣ حديث رقم ١٥١٧۔ وابن ماجه ١/ ٤٧٣ حديث رقم ١٤٧٣۔

ترجمہ اور ترمذی نے اور ابن ماجہ نے ابوامامہ سے نقل کیا ہے۔

شہداء کو غسل دینے کا بیان

۱۶۴۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلٰى اُحُدٍ اَنْ يُنْزَعَ عَنْهُمُ الْحَدِيْدُ وَالْجُلُوْدُ وَاَنْ يُدْفَنُوْا بِدِمَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ۔ [رواه ابو داود وابن ماجة]

اخرجه ابو داؤد في السنن ٣/ ٤٩٧ حديث رقم ٣١٣٤۔ وابن ماجه ١/ ٤٨٥ حديث رقم ١٥١٥۔

ترجمہ :حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ارشاد فرمایا کہ شہداء احد کے جسموں سے لوہا (یعنی زرہیں) اور ہتھیار اور چمڑے وغیرہ اتار دو اور انہیں ان کے خون اور خون میں بھرے ہوئے کپڑوں سمیت ہی دفن کر دو۔ اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بقتلى: "قتيل" کی جمع ہے۔ اور "با" "في" کے معنی میں ہے ای أمر في حقهم یعنی ان کے متعلق حکم دیا۔

الحديد: یہاں اس سے مراد اسلحہ اور درع وغیرہ ہے۔

شہید کو اس کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے نہ غسل دیا جائے گا اور نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی امام شافعی کے ہاں تو اس لئے کہ وہ مغفور ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں غسل نہیں دیا جائے گا البتہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی (ذکرہ طیبیؒ) لیکن ضعف تعلیل مخفی نہیں ہے۔

اسنادی حیثیت : امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس کی سند میں ابوعاصم واسطی ہے جس کو محدثین نے ضعیف کہا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: شہداء کے غسل ترک کے متعلق کئی ایک احادیث ہے ان احادیث میں سے ایک یہ ہے جس کو امام بخاری اور اصحاب سنن نے بیان کیا ہے ''عن ليث بن سعد عن الزهري عن عبد الرحمن بن كعب بن مالك عن جابر بن عبد الله أنه عليه الصلاة السلام كان يجمع بين الرجلين من قتلى أحد و يقول: أيهما أكثر اخذا للقرآن؟ فإذا أشير له إلى أحدهما قدمه في اللحد و قال: أنا شهيد على هوء لاء يوم القيامة أمر بد فنهم

فی دمائهم و لم یغسلهم......" ابن مقاتل، عبداللہ، لیث بن سعد، ابن شہاب، عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں رکھتے تھے پھر کہتے تھے کہ ان میں سے کس کو قرآن کا علم زیادہ ہے؟ جب کسی ایک طرف اشارہ کیا جاتا تو اس کو لحد میں پہلے رکھتے اور آپ نے فرمایا میں ان پر گواہ ہوں ان کو انکے خون کے ساتھ دفن کرنے کا حکم دیا اور نہ ان پر نماز پڑھی اور نہ انہیں غسل دلوایا اور اوزاعی نے زہری سے، انہوں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم احد کے دن شہداء کے متعلق فرماتے تھے کہ ان میں سے کس کو قرآن کا علم زیادہ ہے؟ جب کسی طرف اشارہ ہوتا تو اس کو اس کے ساتھی سے پہلے لحد میں رکھتے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میرے باپ اور میرے چچا کو آپ نے ایک کمبل میں رکھا اور سلیمان بن کثیر نے کہا کہ ہم میں سے زہری نے بیان کیا اور زہری نے کہا کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سنا۔"

امام بخاری نے یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں: "ولم یصل علیهم" امام نسائی کہتے ہیں میں اصحاب زہری میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے لیث کی متابعت کی ہو۔ مذکور اسناد کے ساتھ لیث کا تفرد امام بخاریؒ کے ہاں مؤثر نہیں ہے۔

اور پھر ابن ہمام فرماتے ہیں: امام شافعی کے ہاں معتمد صحیح بخاری کی یہ روایت ہے۔"عن جابر أنه علیه السلام لم یصل علی قتلی أحد" یہ حدیث عطا بن ابی رباح کی اس حدیث کے معارض ہے: "ان النبی ﷺ صلّی علی قتلی احد اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے مراسیل میں ذکر کیا ہے ہمارے نزدیک یہ حدیث جابر کے معارض ہے پھر اس کی ترجیح کی وجہ مثبت ہونا ہے اور حدیث جابر نفی پر مشتمل ہے، ہم اس کو اصل کے مخالف سمجھتے ہیں کیونکہ وہ مرسل ہونے کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ اگر صحیح ہوتی تو مرفوع ہونے کے لحاظ سے مضبوط ہوتی اور اسے قبول کیا جاتا۔

امام حاکمؒ نے حضرت جابر سے روایت بیان کی ہے:قال فقد رسول اللهؐ حمزة حین فاء الناس من القتال فقال رجل: رأیته عند تلك الشجرة فجاء رسول اللهؐ نحوه فلمارآه ورأی مامثل به شهق وبکی فقام رجل من الانصار فرمی علیه بثوب ثم جیئ یحمرة فصلی علیه ثم بالشهداء فیوضعون الی جانب حمزة فصلی علیه"ثم یرفعون و یترك حمزة حتی صلی علی الشهداء کلهم وقالؐ: حمزة سید الشهداء عند الله یوم القیامة۔"رسول اللہؐ نے حضرت حمزہ کو گم پایا جب لوگ قتال سے لوٹے تو ایک آدمی نے کہا میں نے انہیں اس درخت کے پاس دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے آپ نے دیکھا کہ ان کا مثلہ کیا گیا ہے تو آپ کے آنسو بہنے لگے (یعنی سینے سے سسکی لینے کی آواز آرہی تھی) انصار میں سے ایک شخص اُٹھا اس نے حضرت حمزہ پر کپڑا ڈال دیا پھر حمزہ کی لاش لائی گئی آپ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی پھر دوسرے شہداء کو لایا گیا اور حمزہ کو ایک جانب رکھ دیا پھر ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ یہ حدیث کا اختصار ہے۔ امام حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الأسناد ہے اس کی سند میں متکلم فیه راوی ہے لیکن (اس کے باوجود) یہ حسن کے درجے سے کم نہیں اور یہ مستقل حجت ہے اس کی صلاحیت عاضد لغیرہ سے کم نہیں ہے۔شهق: ای تر ددالبکاء فی صدره ازباب منع' ضرب وسمع(قاله فی القاموس)

امام احمدؒ نے ابن مسعودؓ سے مسنداً روایت کیا ہے: قال: کان النساء یوم أحد خلف المسلمین یجهزن علی

جرحی المشرکین إلی أن قال فوضع النبی حمزة وجیئ برجل من الأنصار فوضع فی جنبه فصلی علیه فرفع الانصاری و ترک حمزة ثم جیئ بآخر فوضع الی جنب حمزة فصلی علیه ثم رفع فصلی علیه یومئذ سبعین صلاۃ۔ یہ حدیث حسن سے کم درجہ نہیں ہے۔

اور دارقطنیؒ نے ابن عباس سے روایت کی ہے: لما انصرف المشرکون عن قتلی أحد إلی اَن قال: ثم قدم رسول اللہ ﷺ حمزة فکبر علیه عشرا ثم جعل یجاء بالرجل فیوضع و حمزة مکانه حتی صلی علیه سبعین صلاۃ و کانت القتلیٰ یومئذ سبعین۔ یہ روایت بھی حسن کے رتبہ سے کم کی نہیں ہے۔مزید یہ کہ اگر یہ تمام روایات ضعیف بھی ہوں تو تب بھی حسن کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔

الفصل الثالث:

جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کا مختصر کفن

۱۶۴۴: عَنْ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ عَوْفٍ اُتِیَ بِطَعَامٍ وَکَانَ صَائِمًا فَقَالَ قُتِلَ مُصْعَبُ بْنُ عُمَیْرٍ فَهُوَ خَیْرٌ مِّنِّیْ کُفِّنَ فِیْ بُرْدَةٍ اِنْ غُطِّیَ رَاْسُهٗ بَدَتْ رِجْلَاهُ وَاِنْ غُطِّیَ رِجْلَاهُ بَدَا رَاْسُهٗ وَاَرَاهُ قَالَ وَقُتِلَ حَمْزَةُ وَهُوَ خَیْرٌ مِّنِّیْ ثُمَّ بُسِطَ لَنَا مِنَ الدُّنْیَا مَا بُسِطَ اَوْ قَالَ اُعْطِیْنَا مِنَ الدُّنْیَا مَا اُعْطِیْنَا وَلَقَدْ خَشِیْنَا اَنْ تَکُوْنَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا ثُمَّ جَعَلَ یَبْکِیْ حَتّٰی تَرَکَ الطَّعَامَ۔

[رواہ البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۳/۷۔ حدیث رقم ۴۰۴۵۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابراہیمؒ سے روایت ہے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے پاس (افطار کے وقت) کھانا لایا گیا اور وہ روزے سے تھے۔ پس وہ کہنے لگے۔ حضرت مصعب بن عمر رضی اللہ عنہ مارے گئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے اور ایک چادر میں کفنائے گئے۔ اگر ان کا سر ڈھانکا جاتا۔ تو ان کے پاؤں کھل جاتے تھے۔ اگر پاؤں ڈھانکے جاتے تھے تو ان کا سر کھل جاتا تھا۔ تو پھر سر کو ڈھانک دیا گیا اور پاؤں پر اذخر رکھ دی گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے یوں بھی فرمایا: کہ حمزہؓ مارے گئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے۔ یعنی ان کا کفن بھی ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں مذکور ہوا ہے۔ پھر ہمارے لیے دنیا کشادہ کر دی گئی۔ اس قدر کشادہ کی گئی۔ یعنی ہمیں دنیا اس قدر دے دی گئی کہ ہم ڈرتے تھے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا ثواب جلدی نہ دے دیا گیا ہو۔ پھر اسی ڈر کی وجہ سے رونا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کھانا چھوڑ دیا۔ اس کو بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن سعد بن ابراهیم عن أبیه: "ابیه" ایک نسخہ میں (عن ابیه کے بعد "ابراہیم") ہے۔

قوله: فقال: قتل مصعب بن عمیر و هو خیر منی: یہ بطور تواضع فرمایا' یا اس وجہ سے فرمایا کہ انہوں نے فقر و صبر کو

اختیار کیا تھا وگرنہ علماء نے صراحت کی ہے کہ عشرہ مبشرہ باقی صحابہ سے افضل ہیں۔

كفن في بردة: جملہ مستانفہ معللہ ہے۔

إن غطي رجلاه بدا رأسه: جامع مناقب میں ان کے متعلق حدیث آئے گی کہ ان کا سر چادر سے ڈھانپ دیا گیا اور پاؤں پر گھاس ڈال دی گئی۔

قوله: وقتل حمزة وهو خير مني: چونکہ وہ آپ کی ہم رکابی میں شہید ہوئے اس لحاظ سے وہ بہتر ہیں یا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فقر کو پسند فرمایا تھا۔ دوسرے کی تائید اگلے الفاظ ''ثم بسط لنا'' سے ہوتی ہے۔

بسط لنا: اس سے ان کی مراد وہ خود اور دوسرے مال دار صحابہ تھے جن پر دنیا اموال غنیمت یا تجارت کی بدولت وسیع ہو گئی تھی۔

ما أعطينا: ایک دوسرے نسخہ میں ''ما أعطيناه'' ہے۔

أن تكون: مذکر اور مؤنث کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

حسناتنا: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای ثواب حسنا تنا یعنی ہماری نیکیوں کا ثواب۔

طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی ہم اس بات سے ڈر گئے کہ ان لوگوں کے زمرہ میں شامل نہ ہو جائیں جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ [الاسراء: ۱۸] ''جو شخص دنیا (کی آسودگی) کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں، پھر اس کیلئے جہنم کو (ٹھکانا) مقرر کر رکھا ہے، جس میں وہ نفرین سن کر اور (درگاہ خدا سے) راندہ ہو کر داخل ہوگا'' یا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ﴾ [الاحقاف: ۲۰] ''اور جس دن کافر دوزخ کے سامنے جائیں گے (اور کہا جائے گا) کہ تم اپنی دنیا کی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے اور ان سے متمتع ہو چکے تو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے (یہ) اس کی سزا (ہے) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے اور اسکی کہ بدکرداری کرتے تھے'' میں داخل نہ ہو جائیں۔ اسی طرح کا کلام سیدنا عمرؓ سے منقول ہے۔ انہوں نے یہ بات غلبہ خوف کی وجہ سے فرمائی وگرنہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو دنیا چاہتا ہے' اور اس کے علاوہ نہیں چاہتا تو ہم اس کو اپنے فضل سے جو چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں' نہ کہ وہ کچھ عطا کرتے ہیں جو وہ چاہتا ہے' اور ہم عطا اسی کو کرتے ہیں جسے ہم عطا کرنا چاہیں' نہ کہ ہر چاہنے والے شخص کو عطا کرتے ہیں۔ اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے جو طیبات لکھی گئی تھیں تم لے جا چکے' یعنی وہ تم اپنی دنیا میں حاصل کر چکے' پس اپنا پورا حق لے چکنے کے بعد تمہارا اس میں کوئی حصہ باقی نہیں ہے اور ''حصہ'' سے مراد استمتاع باللھو ہے اور وہ تنعم ہے جو انسان کو دین اور اس کی تکالیف سے لذت حاصل کرنے سے غافل کر دے یہاں تک کہ اس کی خواہش لذتیں حاصل کرنے میں دائمی طور پر لگی رہتی ہے' اور وہ زندہ محض اچھا کھانے نرم لباس پہننے' اور اپنے اوقات کو لہو و طرب میں گزارنے [illegible] رہتا ہے۔ اس کو علم و عمل کی پرواہ نہیں ہوتی' لے پنفسی کو علم و عمل کی مشقتوں پر نہیں ابھارتا اور جہاں تک بات ہے اللہ

تعالیٰ کی نعمتوں سے اور اس کے عطا کردہ طرح طرح کے رزق سے فائدہ اٹھانے کی کہ جس کو اس نے محض اس لئے پیدا کیا اے کہ اس سے اس کے بندے فائدہ اٹھائیں اور توجہ کے ساتھ علم حاصل کرنے اور عمل کے لئے کمربستہ ہونے میں تقویت حاصل کرے اور شکر کرے تو وہ بعید وجدگانہ ہے۔ایک حدیث میں ہے: ان النبی اکل هووا اصحابه ای تمرا وشربوا علیه ماء فقال الحمد الله اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔ نبی ﷺ سے روایت کیا گیا ہے: أكل هو أصحابه أي تمرا و شربوا عليه ماء فقال: " الحمد لله الذي أطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمين۔

حتي ترك الطعام : باوجود یہ کہ کھانے کی سخت احتیاج تھی۔ چونکہ خوف جب غالب ہو تو لذت کی طرف مائل ہونے سے روک دیتا ہے اور شہوت دور ہو جاتی ہے۔

میت کو قبر سے باہر نکالنے اور قمیص پہنانے کا بیان

۱۶۴۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ اُبَيٍّ بَعْدَ مَا اُدْخِلَ حُفْرَتَهٗ فَاَمَرَ بِهٖ فَاُخْرِجَ فَوَضَعَهٗ عَلٰی رُكْبَتَيْهِ فَنَفَثَ فِيْهِ مِنْ رِيْقِهٖ وَاَلْبَسَهٗ قَمِيْصَهٗ قَالَ وَكَانَ كَسَا عَبَّاسًا قَمِيْصًا۔ [متفق علیہ]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۶٦/۱۰ ـ حدیث رقم ۵۷۹۵ـ ومسلم فی صحیحه ۲۱٤۰/٤ حدیث رقم (۲ـ۲۷۷۳)۔ والنسائی فی السنن ۳۷/٤ حدیث رقم ۱۹۰۱ ـ واحمد فی المسند ۳۸۱/۳ـ

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ تشریف لائے اس وقت جب عبداللہ بن ابی کو قبر میں رکھ دیا گیا تھا (یعنی اتار دیا گیا تھا) آپ ﷺ نے اس کے نکالنے کا حکم صادر فرمایا چنانچہ اسے نکالا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے گھٹنوں پر رکھا اور اس کے منہ میں لعاب دھن ڈالا اور اس کو اپنا کرتہ پہنایا حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نے آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو کرتہ پہنایا تھا۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اس کے مؤمن بیٹے کی وجہ سے دعا کرنے کے لیے آئے' یا اس کی وصیت کی بنا پر آئے۔

یہ سب آپ کی مداوات وملاطفت' حسن معاشرت اور تالیف تھی اس میں یہ مخفی اشارہ بھی ہے کہ عقائد دنیہ اور اخلاق ردیہ کے ہوتے ہوئے یہ امور حسیہ فائدہ نہیں دیتے۔

حکایت: تاج العارفین ابو یزید بسطامی قدس اللہ سرہ کے ایک مرید نے ان سے ان کی پوشین مانگی تا کہ وہ اُسے کفن بنا سکیں۔ابو یزید نے فرمایا: اگر تو میری کھال میں داخل ہو جائے اور میرا جسم) تیرا احاطہ کرلے تو وہ تجھے نفع نہیں دے گا' اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تجھے وہاں سے عذاب دے گا جس کا مجھے بھی علم نہیں۔اے کاش! تو جان لیتا کہ میں تو اپنے نفس کا بھی مالک نہیں ہوں چہ جائیکہ اپنے علاوہ کسی اور کا مالک ہوتا۔بندہ کو نفع تو اعتقاد واجتہاد ہی دیتا ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

بغوی کی کتاب ''معالم التنزیل'' میں ہے قال سفیان: قال ابوهارون: وكان على رسول اللهؐ قمیصان' فقال له

ابن عبد الله البس قميصك الذى يلي جلدك سفیان کہتے ہیں: ابو ہارون نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (کے جسم) پر دو قمیصیں تھیں اُس کے بیٹے نے آپ سے کہا: آپ اپنے جسم کے ساتھ لگی ہوئی قمیص اسے پہنا دیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے: "لما كان يوم بدر وأتي بالعباس و لم يكن عليه ثوب فوجد وا قميص عبد الله بن ابى بقدر عليه فكساه النبيﷺ إياه فلذلك نزع النبي قميصه الذى ألبسه قال ابن عيينه: كانت له عند النبيﷺ يد فاحب ان يكافئه"۔

روایت کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ سے عیینہ عبداللہ بن ابی کے اس سلوک کے متعلق سوال کیا گیا جو اس نے کیا تھا تو آپ نے فرمایا: وما يغني عنه قميصه و صلاتي من الله والله إني كنت أرجو أن يسلم به ألف من قومه۔ مروی ہے کہ اس کی قوم کے سو (۱۰۰) آدمی آنحضرتؐ کی اس قمیص کے تبرک کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔

امام خطابیؒ کہتے ہیں: وہ منافق تھا اس کا نفاق بھی ظاہر تھا اس کے نفاق اور کفر کے متعلق قرآن پاک میں آیات نازل ہوئیں جن کی تلاوت ہوتی ہے سو اس بات کا احتمال ہے کہ آپ نے یہ فعل اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کیا ہو: ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ﴾ [التوبة: ۸٤] "اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کے جنازے پر نماز نہ پڑھنا نہ اس کی قبر پر جا کر کھڑے ہونا"۔

"اور یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے یہ کام اس کے بیٹے کی تالیف اور اکرام کے لیے کیا ہو کہ وہ مسلمان تھا اور نفاق سے بری تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہے یہ اس کا بدلہ چکانے کے لئے کیا ہو چونکہ اُس نے آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو قمیص پہنائی تھی آپ ﷺ کا ارادہ ہوا ہوگا کہ اُس کو اس کا بدلہ دے دیں تا کہ آپ پر کسی منافق کا کوئی ایسا احسان نہ ہو جس کا بدلہ نہ دیا ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قمیص بطور کفن پہنانا جائز ہے اور میت کو کسی سبب یا علت کی بنا پر قبر سے نکالا جا سکتا ہے (کذا ذکرہ طیبی) شاید ان کی مراد علت سے سبب متقدم اور سبب سے مراد حادثہ ہے۔ بغویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے مفسرین فرماتے ہیں: عبداللہ بن ابی بن سلول نے نبی ﷺ کو بلانے کے لیے کسی کو بھیجا در آنحالیکہ وہ مریض تھا آپ اس کے پاس تشریف لائے اور کہا: تجھ کو یہود کی محبت نے ہلاک کر دیا یعنی ان کے ہاں حبّ وجاہ نے اُس نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلوایا کہ آپ مجھے جھڑکیں یعنی تکلیف دیں یا عار دلائیں بلکہ میں نے آپ کو اس لئے بلوایا تھا کہ آپ میرے لیے استغفار کریں اور اس نے یہ سوال کیا کہ آپ مجھے اپنی قمیص میں کفن دیں اور اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔

أخبرنا عبدالواحد بن أحد المليحي، أخبرنا أحمد بن عبد الله النعيمي، أخبرنا محمد بن يوسف، حدثنا محمد بن إسماعيل يعني البخاري حدثنا يحى بن بكير حدثني الليث عن عقيل عن ابن شهاب عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس عن عمر بن الخطاب أنه قال: لما مات عبد الله بن أبى ابن سلول دعي رسول الله ﷺ فلما قام رسول الله ﷺ و ثبت عليه فقلت: يا رسول الله أتصل على ابن أبي؟ و قد قال يوم كذا و كذا كذا و كذا أعد دعليه قوله فتبسم رسول الله ﷺ وقال أخرعنّي يا عمر! فلما أكثرت عليه قال: أني خيرت فاخترت لو أعلم أني إن زدت على السبعين يغفرله لزدت عليه قال: فصلى رسول الله ﷺ ثم

انصرف فلم يمكث الا يسيرا حتى نزلت الآيتان من براءة [ولا تصل على أحد منهم مات ابدا] [التوبة:٨٤] إلى قوله [وهم فاسقون] [التوبة: ٨٤] قال أي عمر فعجبت من جرأتي على رسول الله ﷺ يومئذ ۔ والله و رسوله أعلم۔ اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ عبداللہ بن ابی نے کہا تھا: [لئن رجعنا إلى المدينة ليخرجن الأعز منها الأذل]۔ وقف له ولده على باب المدينه مسلا سيفه وقال: لئن لم تقل إنك الارذل و رسول الله ﷺ الأعز ضربت عنقك بهذا فقال ذلك فمكنه من دخولها" سبحان اللہ! وہ ذات پاک ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے اور عزیز کو ذلیل کرتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت جلیلہ پر دلالت ہے۔

بَابُ الْمَشْيِ بِالْجَنَازَةِ وَالصَّلٰوةِ عَلَيْهَا

جنازہ کے ساتھ چلنے (کے آداب) اور نمازِ جنازہ کا بیان

"الجنازۃ" سے مراد میت کی چارپائی ہے یا میت ہے۔ "المغرب" میں لکھا ہے کہ "جنازہ" جیم کے کسرہ کے ساتھ چارپائی کو اور فتحہ کے ساتھ "میت" کو کہتے ہیں ایک قول ہے کہ یہ دو لغتیں ہیں ایک قول یہ ہے کہ "جنازۃ" جیم کے کسرہ کے ساتھ میت کو اور اس چارپائی کو کہتے ہیں جس پر میت رکھی جاتی ہے اور فتحہ کے ساتھ صرف چارپائی کو کہتے ہیں۔

"والصلاۃ" کا "مشی" پر عطف ہے۔

الفصل الاول:

صالح اور غیر صالح کے جنازے کا حکم اور اس کو جلدی کرنے کی حکمت

١٦٤٦: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ فَاِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا اِلَيْهِ وَاِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهٗ عَنْ رِقَابِكُمْ ۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ١٨٢/٣۔ حديث رقم ١٣١٥۔ ومسلم في صحيحه ٦٥١/٢ حديث رقم (٥٠۔٩٤٤)۔ والترمذي في السنن ٣٣٥/٣ حديث رقم ١٠١٥ وابن ماجه ٤٧٤/١ حديث رقم ١٤٧٧۔ واحمد في المسند ٢٤٠/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنازے میں جلدی کرو۔ اگر میت نیک ہے تو اس کے لیے بھلائی اور بہتری ہے کہ اس کو بھلائی کی جانب جلد پہنچاؤ۔ اگر اس کے علاوہ ہے یعنی برا شخص ہے تو اس کو اپنی گردنوں سے جلدی اتارو۔

تشریح: قوله: اسرعوا بالجنازة: "الاسراع سے ہے" ضعیف خبر سے یہ ماخوذ ہے کہ نبی ﷺ نے جنازہ تیز چل کر لے جانے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: مادون الخبب یعنی عادت کی چال سے کم ہو۔ اور "دون الخبب" کا مطلب یہ ہے کہ

شدت مشی کے ساتھ قدم قریب قریب رکھنا امام شافعی ''اُلام'' میں فرماتے ہیں۔ اس کو لے کر چلنے کی تیز ترین حالت میں لے جایا جائے نہ کہ اس قدر تیز چلا جائے کہ جنازہ کی متابعت کرنے والوں پر شاق ہو الا یہ کہ میت میں تغیر یا اس کے پھٹ جانے کا خوف ہو تو جس قدر ہو سکے تیز لے جایا جائے۔

قولہ: فان تك صالحة فخیر تقد مونها الیه: یعنی اگر جنازہ صالح یا مؤمن کا ہو۔ مظہرؒ کہتے ہیں: ''جنازۃ'' جیم کسرہ کے ساتھ ''میت'' کو اور فتحہ کے ساتھ چارپائی کو کہتے ہیں۔ پس اس لیے فعل کی نسبت ''جنازہ'' کی طرف ہے اور مراد اس سے ''میت'' ہے۔

قولہ (فخیر) اس کی حالت یا فعل خیر۔

تقدمونها: تشدید کے ساتھ ہے۔

یعنی اگر اس میت کا حال نیک اور صالح ہے تو اسکو جلدی لے چلو' تاکہ وہ جلد از جلد اس حالت طیبہ تک پہنچ جائے۔

قولہ: وان تك سوی ذلك فشر تضعونه عن رقابكم:

طیبیؒ کہتے ہیں: جنازہ کو 'میت' اور اس کے اعمال صالحہ کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ پھر ''اعمال صالحہ'' کو 'خیر' کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ ''جنازہ'' جو کہ 'میت'' کی جگہ پر ہے اس کو اس ''خیر'' پر مقدمہ بنایا ہے۔ ''جنازہ'' کو 'عمل صالح'' سے کنایہ کمال معنی میں مبالغہ ہے اور جب جانب عمل صالح میں اس کا لحاظ کیا تو مقابلہ میں ''یوضع الشرعن الرقاب'' کو ذکر فرمایا اور گویا رجل صالح کے عمل کا اثر اُس کے لیے راحت ہے تو اس کو اس چیز کی طرف جلدی لے جانے کا حکم دیا جس سے اس کو راحت حاصل ہوگی اور غیر صالح آدمی کے عمل کا اثر اس پر مشقت ہے تو اُس کی لاش کو اپنی گردنوں سے اتارنے کا حکم دیا۔ 'الیه'' میں ضمیر''خیر'' کی طرف باعتبار ثواب و اکرام کے راجع ہے۔ اس کا مطلب مستریح أو مستراح منه کے قریب قریب ہے۔

مالکی ''توضیح'' میں فرماتے ہیں: ''إلیها'' تانیث کے ساتھ ہے اور کہا ہے کہ مونث کی ضمیر ''خیر'' کی طرف لوٹی ہے حالانکہ وہ مذکر ہے۔ پس مناسب تھا کہ یوں کہا جاتا ''فخیر قد متموها إلیه'' لیکن مذکر کو مؤنث لانا جائز ہے جب اس کی تاویل مؤنث کے ساتھ کی جائے۔ جیسے ''خیر'' کی تاویل (اس حدیث میں) رحمت' حسنیٰ' یا الیسری سے کی گئی ہے۔

کرمانیؒ کہتے ہیں: ''فخیر تقدمونها إلیه'' مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ ای فهی خیر تقدمونها إلیه۔ یا یہ مبتدا ہے' (اس کی خبر محذوف ہے۔) ای فثمه خیر تقدمون الجنازة الیه۔ یعنی قبر میں اس کی حالت اچھی ہوگی۔ پس میت کو لے جانے میں جلدی کرو تاکہ وہ اس حالت کو جلد پہنچ جائے۔ اور ''فشر تضعونه'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ رحمت سے بعید ہے اس کی مصاحبت میں تمہارے لئے کوئی مصلحت نہیں ہے اس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اہل باطل اور غیر صالحین کی ہم نشینی کو چھوڑ دینا چاہیے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں۔ اس حدیث کو چاروں اصحاب کتب نے بھی روایت کیا ہے۔

صالح اور غیر صالح میّت کی پکار

۱۶۴۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَتِ الْجَنَازَةُ فَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلٰی اَعْنَاقِهِمْ فَاِنْ كَانَتْ صَالِحَةً قَالَتْ قَدِّمُوْنِیْ وَاِنْ كَانَتْ غَیْرَ صَالِحَةٍ قَالَتْ لِاَ هْلِهَا یَا وَیْلَهَا اَیْنَ تَذْهَبُوْنَ بِهَا یَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَیْءٍ اِلَّا الْاِنْسَانُ وَلَوْ سَمِعَ الْاِنْسَانُ لَصَعِقَ۔

[رواه البخاري]

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۸۱/۳۔ حديث رقم ۱۳۱۴۔ والنسائي في السنن ۴۱/۴ حديث رقم ۱۹۰۹۔ واحمد في المسند ۴۱/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنازہ تیار ہو جاتا ہے اور لوگ اس کو اپنی گردنوں پر اٹھاتے ہیں اور اگر وہ نیک بخت ہوتا ہے تو کہتا ہے مجھے جلدی لے چلو۔ یعنی میری منزل کی طرف اور اگر برا ہوتا ہے یعنی بد بخت تو وہ اپنے لوگوں کو کہتا ہے ہائے مصیبت مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ اس کی یہ آواز ہر چیز سنتی ہے سوائے آدمی کے اگر اس آواز کو انسان سن لے تو وہ بیہوش ہو جائے۔

تشریح: **قوله: فإن كانت صالحة قالت قدموني**: یعنی مجھے میری منزل کی طرف جلدی لے چلو چونکہ وہ جنت عالیہ میں اپنے مراتب عالیہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ازھار میں ہے کہ چارپائی پر میت کا کلام کرنا حقیقتاً ہے' اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ اس کو قبر میں حیات بخشے گا تا کہ اُس سے سوال کیے سکیں۔ بلکہ آپ نے فرشتوں کے آنے سے پہلے سماع میت کو ثابت کیا ہے چنانچہ فرمایا: **إنه يسمع قرع نعالهم أتاه ملكان** یا مجاز پر محمول ہے"مایوول" کے اعتبار سے کہ قبر میں داخل کرنے کے بعد اس سے قبر میں سوالات کیے جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے احتمال کی توجیہ واضح نہیں ہے بس پہلا احتمال ہی معتمد ہے۔

احمد، طبرانی، ابن ابی دنیا، مروزی اور ابن مندہ نے ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے:

ان النبی ﷺ قال: إن الميت يعرف من يغسله و من يحمله و من يكفنه و من يدليه في حفرته۔

قوله: وإن كانت غير صالحة ۔۔۔ اين تذهبون بها:

يا ويلها: "ویل" کا معنی ہے "ہلاکت" اور ضمیر مجرور "جنازہ" کی طرف عائد ہے۔ امام طیبیؒ کہتے ہیں: **اى يا ويلى وهلاكي احضر فهذا أوانك** یعنی میری ہلاکت اور تباہی آ جا' پس یہ تیرا وقت ہے۔ اس میت کے قول کی حکایت ضمیر غائب کے ساتھ فرمائی "ویل" کی اضافت اپنے نفس کی طرف کرنے کو مکروہ سمجھنے کی وجہ سے۔

يسمع صوتها...... : ابن حجرؒ کی کتاب میں "يستمع" باب افتعال سے ہے' یہ درایت و روایت کے مخالف ہے۔ چنانچہ (ابن حجر) فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ یہ "یَسْمَعُ" کے معنی میں ہے۔

كل شيء: یہ صراحت ہے کہ (**قالت لاهلها** میں) قول حقیقی مراد ہے' الا یہ کہ سماع کو فہم پر محمول کیا جائے تو اس صورت

میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہوگا: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [الاسراء: ٤٤]

الانسان: استثناء کی بناء پر منصوب ہے۔

یعنی اگر انسان اس کو کما حقہ سن لے تو وہ مر جائے یا بے ہوش ہو جائے۔ انسان کے عدم سماع کی حکمت یہ ہے کہ نظام عالم میں خلل واقع ہوگا اور ایمان شہودی ہو جائے گا' ایمان بالغیب نہیں ہوگا اسی لیے کہا گیا ہے: لو لا الحمقی لخربت الدنیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: الغفلة مانعة من الرحلة۔

تکریم میّت ضروری ہے

۱۶۴۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا فَمَنْ تَبِعَهَا فَلَا يَقْعُدْ حَتّٰى تُوْضَعَ. [متفق عليه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۷۸/۳۔ حدیث رقم ۱۳۱۰۔ ومسلم فی صحیحه ۶۶۰/۲ حدیث رقم (۷۷۔۹۶۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۱۸/۳ حدیث رقم ۳۱۷۳ والترمذی ۳۶۰/۳ حدیث رقم ۱۰۴۳۔ وابن ماجه ۴۹۲/۱ حدیث رقم ۱۵۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ یعنی جو شخص جنازے کے ساتھ نماز کے لیے جائے تو اس کے لیے حکم یہ ہے جنازہ کے رکھنے سے پہلے زمین پر نہ بیٹھے۔ یعنی جب تک میّت لوگوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر نہ رکھ دی جائے یا جب تک قبر میں نہ اتاری جائے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ إذا رأیتم الجنازه فقوموا: قاضیؒ کہتے ہیں: کھڑے ہونے کا حکم یا میت کو خوش آمدید کہنے اور تعظیم کی بناء پر ہے یا موت کی وجہ سے کہ وہ گھبراہٹ خوف اور دہشت میں ڈالنے والی چیز ہے (اور اس حکم میں) اس پر تنبیہ ہے کہ یہ حالت ایسی ہے کہ میت کو دیکھنے والے انسان کو اضطراب و قلق ہونا چاہئے' اس پر رعب طاری ہو جانا چاہئے ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہ ٹس سے مس نہ ہو' پرواہ ہی نہ کرے اس کی تائید نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس فرمان سے ہوتی ہے: انما الموت فزع' فاذا رأیتم الجنازة فقوموا۔اھ۔ اس بات کا احتمال بھی ہے کہ کھڑے ہونے کا حکم اس کی نماز جنازہ کے لیے ہو اس پر آپ کا اگلا کلام دلالت کر رہا ہے۔

قوله: فمن تبعهافلا یقعد حتی توضع: بیٹھنے سے منع فرمایا' ایک تو اس وجہ سے کہ وہ فوری طور پر مدد کر سکے اور دوسری بات حق اخوت و مصاحبت کے قیام کے لیے اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص جنازہ کے ہمراہ جائے تو وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ میت لحد میں اتار نہ دیا جائے اس لیے کہ دفن میں لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس لئے بھی تا کہ امور کی انجام دہی سے اس کا ثواب کامل ہو جائے۔

پہلے مطلب کی تائید ترمذی کی اس روایت سے ہوتی ہے جو انہوں نے امام احمد اور اسحاق سے روایت کی ہے: قالا: من

تبع جنازة فلا يقعد حتى توضع عن أعناق الرجال۔ اس کی تائید ثوریؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے: ''حتى توضع بالأرض'' اوراس وجہ سے بھی کہ جب تک میت کندھوں پر رہے گی وہ کھڑے رہیں گے پس ان کا بیٹھنا جنازہ برداروں کی مخالفت اوران سے متمیز ہونے اوران سے بڑے ہونے کی خبر دیتا ہے۔ ہمارے بعض علماء کہتے ہیں: جب اس کے ساتھ جانے کا ارادہ نہ ہوتو قیام اکثر کے نزدیک مکروہ ہے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کو کھڑا ہونے اور بیٹھنے میں اختیار حاصل ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں مندوب ہیں۔

صاحب التتمہ کہتے ہیں: اس بارے میں واردشدہ صحیح احادیث کی بناء پر کھڑا ہونا مستحب ہے جمہور کہتے ہیں یہ احادیث حضرت علی کی آگے آنے والی حدیث سے منسوخ ہیں۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ترمذی اورنسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

موت کی ہولنا کی کی وجہ سے جنازے کی تکریم ضروری ہے

۱۶۴۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ مَرَّتْ جَنَازَةٌ فَقَامَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقُمْنَا مَعَهٗ فَقُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهَا يَهُوْدِيَّةٌ فَقَالَ اِنَّ الْمَوْتَ فَزَعٌ فَاِذَا رَاَيْتُمُ الْجَنَازَةَ فَقُوْمُوْا۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ١٧٩/٣۔ حديث رقم ١٣١١۔ ومسلم في صحيحه ٦٦٠/٢ حديث رقم (٧٨۔ ٩٦٠) وابوداوٗد في السنن ٥١٩/٣ حديث رقم ٣١٧٤۔ والنسائي ٤٥/٤ حديث رقم ١٩٢٢۔ وابن ماجه ٤٩٢/١۔ حديث رقم ١٥٤٣ واحمد في المسند ٣١٩/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک جنازہ گزرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہوئے پس ہم نے کہا اے رسول خدا! یہ تو یہودیہ کا جنازہ ہے یعنی یہ مسلمان کا جنازہ نہیں ہے جس کی تکریم وتعظیم کی جائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا موت ڈر اور گھبراہٹ کی جگہ ہے۔ پس جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اگرچہ کافر ہی کا جنازہ کیوں نہ ہو اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ (یہودیہ) وہ میت یہودی کی میت ہے۔

قولہ (فقال ان الموت فزع: فزع: فاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے مبالغہ کے لیے بطور وصف لایا گیا ہے۔ یا اس کی تقدیری عبارت ''ذو فزع'' ہے۔

قولہ: فإذا رأيتم الجنازة فقوموا: امر سے ظاہر ہے کہ حقیقی کھڑا ہونا مراد ہے محض جنازے کو دیکھ کر۔ ابن الملکؒ نے کہا ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا حکم اظہار فزع اور اپنے نفس کے خوف کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ بہت بڑا معاملہ ہے جو کھڑا نہ ہو تو یہ اس کے سخت دل ہونے اور اس کی غفلت عظیمہ کی علامت ہے پس قیام سے مراد اس کے دل کی اور ظاہر کی حالت کا بدل جانا ہے اس کی حقیقت مراد نہیں ہے۔ ابن الملکؒ کی یہ بات بے حقیقت ہے قولہ: متفق علیہ: امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ دو لحاظ سے محل نظر ہے ان میں سے ایک یہ کہ: ''إن الموت فزع'' یہ جملہ صرف امام مسلم کی روایت کا ہے دوسرا یہ کہ بخاری

کے الفاظ "إن جنازة یہودی" ہیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: أليست نفسا؟ اھ۔ اور بعض روایات میں ہے: إنكم لستم تقومون لها، إنما تقومون إعظاما للذى يقبض النفوس"

۱۶۵۰: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ رَأَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فَقُمْنَا وَقَعَدَ فَقَعَدْنَا يَعْنِيْ فِي الْجَنَازَةِ۔

[رواه مسلم وفي رواية مالك وابي داود قام في الجنازة ثم قعد بعد]

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۷۹/۳۔ حديث رقم ۱۳۱۱۔ ومسلم في صحيحه ۶۶۰/۲ حديث رقم (۷۸۔ ۹۶۰) وابوداوٗد في السنن ۵۱۹/۳ حديث رقم ۳۱۷۴۔ والنسائي ۴۵/۴ حديث رقم ۱۹۲۲۔ وابن ماجه ۴۹۲/۱۔ حديث رقم ۱۵۴۳ واحمد في المسند ۳۱۹/۳۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ کھڑے ہوئے تو ہم بھی کھڑے ہو گئے اور آپ ﷺ بیٹھے تو ہم بھی بیٹھ گئے۔ یعنی جنازے کو دیکھ کر۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور امام مالکؒ کی روایت کے مطابق کہ آپ ﷺ جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہوئے پھر اس کے بعد بیٹھ گئے۔

تشریح: مسلم کی روایت کے بارے میں امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس اصحاب کتب کو چاروں نے بھی روایت کیا ہے۔

قوله: وفي رواية مالك و أبي داود: قام في الجنازة ثم قعد بعد: میرکؒ فرماتے ہیں: گویا کہ انہوں نے صاحب المصابیح پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے صحاح (کی فصل) میں ابوداؤد اور مالک کے الفاظ ذکر کئے ہیں اور مسلم کے الفاظ ذکر نہیں کئے۔

صاحب المصابیح کی طرف سے جواب یہ ہے کہ احتمال ہے کہ انہوں نے ابوداؤد کے الفاظ کو اختیار کیا ہو چونکہ وہ نسخ میں مسلم کے الفاظ سے صریح ہیں جیسا کہ مخفی نہیں ہے اس کو انہوں نے محض اس لئے ذکر کیا ہے کہ جنازہ (میت) کے لیے کھڑے ہونا جو پچھلی حدیث سے سمجھ آ رہا تھا منسوخ ہے۔ نہ اس لیے کہ باب سے مقصود ہے۔

شرح السنہ میں امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ حدیث علیؓ ابوسعید کی حدیث کی ناسخ ہے: إذا رأيتم الجنازه فقوموا۔ امام احمدؒ اور اسحاقؒ کہتے ہیں اگر چاہے کھڑا ہو اور اگر نہ چاہے تو نہ کھڑا ہو اور نبی کریم ﷺ کے بعض اصحاب سے منقول ہے کہ وہ جنازے سے آگے جاتے تھے اور جنازہ اپنے تک پہنچنے سے پہلے تک بیٹھے رہتے تھے۔

قاضیؒ کہتے ہیں: حدیث دو معنوں کو محتمل ہے:

پہلا یہ کہ رسول اللہ ﷺ جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب وہ آپؐ کے پاس گزر جاتا پھر بیٹھ جاتے۔ ابن الملک فرماتے ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ اتباع جنازہ واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

دوسرا یہ کہ پہلے آپؐ کھڑے ہوتے تھے پھر اس کے بعد کھڑے نہیں ہوتے پس اس بنا پر آخری فعل قرینہ اور علامت ہے کہ یہاں دونوں احادیث میں امر ندب کے لیے ہے اور احتمال ہے کہ یہ نسخ ہو اس وجوب کے لئے جو ظاہر امر سے مستفاد ہو پہلا زیادہ راجح ہے چونکہ مجاز کا احتمال نسخ سے زیادہ قریب ہے۔

ابن ملکؒ نے یہ کہتے ہوئے اس کی پیروی کی ہے کہ مختار یہ ہے کہ یہ غیر منسوخ ہے پس امر قیام ندب کے لئے ہے اور آپ کا بیٹھنا بیان جواز کے لیے ہے کیونکہ جمع متعذر نہیں ہے۔

امام طحاویؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ منسوخ ہے اور اس کی ادلہ ذکر کی ہیں اور کہا ہے کہ ہم اسی کو لیتے ہیں اور ابن ہمامؒ کہتے ہیں: جو راستے میں بیٹھا ہو جب اس کے پاس سے جنازہ گزرے یا کوئی قبر پر بیٹھا ہو جب اس کے پاس لایا جائے تو وہ کھڑا نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ وہ کھڑا ہو اور پہلے قول کو اختیار کیا گیا ہے اس کی دلیل حضرت علی کی روایت ہے: كان رسول الله ﷺ أمرنا بالقيام في الجنازه ثم جلس بعد ذلك و أمرنا بالجلوس"۔ انہی الفاظ کے ساتھ امام احمدؒ نے روایت کی ہے ان کا کلام مکمل ہوا۔ بعینہٖ یہ حدیث تیسری فصل میں آئے گی' یہ اس دوسرے احتمال کے لیے نص ہے جس کو قاضی نے ذکر کیا ہے۔ اور صحابی کا قول "ہمیں بیٹھنے کا حکم دیا" یہ منافی ہے کہ نسخ کے بعد قیام مندوب ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں ہمارے ائمہ کہتے ہیں: یہ دونوں مندوب ہیں۔ نوویؒ کہتے ہیں امر قیام کی احادیث کی صحت کی بنا پر یہی مختار ہے اور بیٹھنے کے بارے میں حضرت علیؓ کی حدیث کے علاوہ کوئی چیز ثابت نہیں ہے' اور نسخ میں بھی صریح نہیں ہے کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ بیٹھنا بیان جواز کے لئے ہو۔

اس پر اشکال یہ ہے کہ اس میں مدعی اور دلیل میں مطابقت نہیں ہے۔

فرماتے ہیں: امام نووی پر اعتراض کیا گیا ہے کہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سمجھا ہے وہ ترک ہے مطلقا اور یہی واضح ہے' علاوہ ازیں صحابی کا فہم خصوصاً حضرت علی ؓ کا فہم کہ جو "باب مدينة العلم" ہیں کسی دوسرے کے فہم پر مقدم ہے۔ کیونکہ وہ خارجی قرائن اس کی تائید میں ہیں جن کا ادراک ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا ہے اسی لیے جس کو کھڑے دیکھا اس کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو مسلم میں ہے: "قام النبي ﷺ مع الجنازة حتى توضع و قام الناس معه ثم قعد بعد ذلك و أمرهم بالقعود"۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے: أنه رأى ناسًا قيامًا ينتظرون الجنازة أن توضع فا شار اليهم بدرة معه أوسوط أن أجلسوا فأتي رسول الله ﷺ ثم جلس بعد ما كان يقوم۔ اس سے امام شافعی کے قول کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ دونوں منسوخ ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں یہ حدیث اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ قیام منع ہے یہاں تک کہ جنازہ رکھ دیا جائے۔ کلام تو اس میں ہے کہ رؤیت جنازہ کے وقت قیام کرنا کیسا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دوسرا قضیہ ہے اور دوسرے حکم کے لئے ناسخ ہے اس کی تائید آپ کے اس آنے والے فرمان سے ہو رہی ہے: كان إذاتبع جنازة لم يقعد حتى توضع في اللحد' فعرض له حبر من اليهود' فقال له: إنا هكذا نصنع يا محمد قال فجلس رسول الله ﷺ وقال: خالفوهم۔

نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کرنے پر عظیم اجر

۱۶۵۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا وَكَانَ مَعَهٗ حَتّٰى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا وَيَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ

قِيْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ وَّ مَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّهٗ يَرْجِعُ بِقِيْرَاطٍ۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۷/٦۔ حدیث رقم ۳۲۰٤۔ ومسلم فی صحیحه ٦٥٦/۲ حدیث رقم (٦۲۔ ۹٥۱)۔ وابوداؤد فی السنن ٥٤۱/۳ حدیث رقم ۳۲۰٤۔ والترمذی ۳٤۲/۳ حدیث رقم ۱۰۲۲۔ والنسائی ۷۲/٤ حدیث رقم ۱۹۸۰ وابن ماجه ٤٦۰/۱ حدیث رقم ۱٥۳٤۔ ومالك فی الموطأ ۲۲٦/۱ حدیث رقم ۱٤ من كتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۲۸۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص مسلمان کے جنازے کے ساتھ ایمان اور ثواب کے طلب کرنے کی نیت سے جائے اور اس کے ساتھ نمازِ جنازہ تک رہے اور اس کو دفن کر کے فارغ ہونے تک ساتھ رہے۔ تحقیق وہ دو قیراط اجر لے کر واپس لوٹتا ہے۔ ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کرنے سے پہلے لوٹ جائے تو ایک قیراط ثواب لے کر لوٹتا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: من اتبع: اور ایک دوسرے صحیح نسخہ میں ''من تبع'' ہے۔

إيمانا: یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی وجہ سے۔ اور ابن حجر نے عجیب بات کہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں: تصديقاً بثوابه کہ ''اس کے ثواب کی تصدیق کی'' اور انہوں لفظ ''باللہ'' کو متن (کا حصہ) قرار دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ درایت و روایت کے مخالف ہے اور (درایت کے مخالف ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ) اگلے جملہ کی وجہ سے یہ تفسیر سے مستغنی ہے۔

واحتسابا: یعنی طلب ثواب کے لیے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (یعنی) ریاء یا کسی کا دل رکھنے کے لیے نہ ہو۔ یہ محل نظر ہے، چونکہ مؤمن کے دل میں خوشی داخل کرنا ثقلین کے عمل سے افضل ہے۔ حدیث میں ہے: ''من عزى مصابا فله مثل اجره''۔

یہ دونوں علت کی بنا پر منصوب ہیں اور ایک قول یہ ہے دونوں حال ہیں ای مؤمنا و محتسبا۔

قوله (و كان معه) یعنی جنازے کے ساتھ چلے۔

دونوں فعل مبنی علی المفعول ہیں۔

فإنه يرجع من الأجر: (جار مجرور محذوف کے متعلق ہو کر) حال ہے امام طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ای كائنا من الثواب یعنی ثواب کی حالت میں پس ''من'' بیانیہ ہے، مبین پر تقدم ہے۔

بقيراطين: یعنی ثواب کے دو بڑے عظیم الشان حصے۔ نہایہ میں ہے: ''قیراط'' دینار کے اجزاء میں سے ایک جز ہے، اور یہ اکثر بلاد میں دسویں حصہ کا نصف ہے اور اہل شام اس کو چوبیس (۲۴) کا جزء قرار دیتے ہیں (یعنی چوبیسواں حصہ)

قیراط: اس میں یاء ''راء'' کے عوض ہے، چونکہ اس کی اصل ''قراط'' ہے، کہا گیا ہے کہ اس کی جمع قراریط ہے اور یہ عام و مستمر ہے یہ کبھی مطلق بولا جاتا ہے اور اس سے مراد بعض چیز ہوتی ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ اس لیے کہ اس کی تفسیر ''کل قيراط مثل أحد'' کی گئی ہے یہ تفسیر کلام سے مقصود ہے نہ کہ لفظ قیراط سے حقیقتاً اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جنس اجر کے دو حصوں کے ساتھ لوٹتا ہے۔ پس معنی کو قیراط کے ساتھ واضح کیا جو کہ دینار کا حصہ ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: یعنی اگر اس (ثواب) کو جسم کی شکل دی جائے تو وہ اُحد پہاڑ کی مثل ہے۔ یہ اس روایت کے

منافی نہیں جس میں یہ الفاظ وارد ہیں: "أن أصغرهما كأحد" کیونکہ یہ متبعین کے احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔

قوله: متفق علیه: امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ الفاظ امام بخاریؒ کے ہیں۔

اور ایک متفق علیہ روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: "من شهد الجنازة حتى يصلى عليها فله قيراط' و من شهدها حتى تدفن فله قيرا طان' قيل: وما القيراطان؟ قال: مثل الجبلين العظيمين اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: أصغرهما كأحد اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں یوں ہے: حتى توضع في اللحد امام احمد نے اپنی مسند میں ایک دوسری روایت کچھ دوسری قیود کے ساتھ بیان کی ہے جو یہ ہیں: ① جنازے کو اٹھانا ② قبر میں دفن کرنا ③ ولی سے اجازت لینا ④ لوگوں سے آخر میں جانا' لیکن جمہور نے ان قیود کا اعتبار نہیں کیا کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں یا اس میں علت شذوذ ہے یا اس جیسی اور علتیں ہیں۔ اور امام طبرانیؒ نے مرفوع روایت بیان کی ہے: من تبع جنازة حتى يقضي دفنها كتب له ثلاثة قراريط" یعنی ایک قیراط نماز جنازہ پڑھنے پر ہے' اور دو دو قیراط مشایعت پر ہیں۔

آپ ﷺ کا نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا

۱۶۵۲: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعٰى لِلنَّاسِ النَّجَاشِیَّ الْيَوْمَ الَّذِیْ مَاتَ فِيْهِ وَخَرَجَ بِهِمْ اِلَى الْمُصَلّٰى فَصَفَّ بِهِمْ وَكَبَّرَ اَرْبَعَ تَكْبِيْرَاتٍ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٩٧/٦- حديث رقم ٣٢٠٤- ومسلم في صحيحه ٦٥٦/٢ حديث رقم (٦٢- ٩٥١)- وابوداوٗد في السنن ٥٤١/٣ حديث رقم ٣٢٠٤- والترمذي ٣٤٢/٣ حديث رقم ١٠٢٢- والنسائي ٧٢/٤ حديث رقم ١٩٨٠ وابن ماجه ٤٦٠/١ حديث رقم ١٥٣٤- ومالك في الموطأ ٢٢٦/١ حديث رقم ١٤ من كتاب الجنائز- واحمد في المسند ٢٨١/٢-

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دن نجاشی مرا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے مرنے کی خبر لوگوں تک پہنچائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر عیدگاہ کی طرف نکلے پھر ان کے ساتھ صف باندھی اور چار تکبیریں کہیں۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: أن النبیّ نعى للناس النجاشي: قاموس میں ہے: نعاه له نعوا و نعيا' یعنی اس کی موت کی خبر دی۔

نجاشی: تشدید کے ساتھ ہے اس صورت میں اس کی "یاء" نسبت کے لیے ہے اور تخفیف کے ساتھ ہو تو "یاء" اصلی ہے اور نون پر کسرہ پڑھنا فتحہ پڑھنے سے زیادہ فصیح ہے۔ یہ حبشہ کا بادشاہ تھا۔ لفظ "نجاشی" کو جیم کی تشدید کے ساتھ پڑھنا خطا ہے اور سین کے ساتھ پڑھنا تصحیف ہے۔ اس کا نام "أصحمہ" بروزن "اربع" ہے' حائے مہملہ کے ساتھ ہے' کہا گیا ہے نقطہ والی خاء کے ساتھ ہے' یہ ان لوگوں میں سے تھا جو آپؐ پر ایمان پر تو لائے مگر آپ کو نہیں دیکھا ہجرت کر کے حبشہ جانے والے مسلمانوں کا مددگار تھا' ان کے ساتھ انتہائی حسن سلوک کے ساتھ پیش آتا تھا۔

الیوم: "نعی" کاظرف ہے أي في الیوم۔

ایک جماعت نے کہا کہ نجاشی کی وفات رجب نویں سال میں ہوئی ایک قول یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ہوئی۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں نجاشی مسلمان تھا وہ اپنی کافر قوم سے اپنا ایمان چھپاتا تھا۔ یہ آپ کا معجزہ ہے اس لیے کہ مدینہ اور حبشہ کے درمیان مہینے کی مسافت تھی۔

قوله: وخرج بهم إلى المصلى: "هدایه" میں ہے کہ جماعت کی مسجد میں نماز جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی اس کی دلیل آپ کی یہ حدیث ہے:من صلى على ميت في المسجد فلا أجر له ایک دوسری روایت میں ہے: "فلاشئ له" اس حدیث کوابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

امام ابن ہمامؒ "خلاصہ" میں لکھتے ہیں: (مسجد میں نماز جنازہ) مکروہ ہے خواہ لوگ اور میت (دونوں) مسجد میں ہوں خواہ میت مسجد سے باہر ہو اور تمام کے تمام لوگ یا بعض لوگ مسجد میں ہوں۔

یہ مطلق کراہت اس بنا پر ہے کہ مسجد فرض نمازوں اور اس کے توابع نوافل، ذکر اور علم کی تدریس کے لیے ہوتی ہے۔

بعض کا کہنا ہے مکروہ نہیں ہے جب میت مسجد سے باہر ہو۔اس (کراہت) کی وجہ مسجد کے ناپاک ہونے کا احتمال ہے۔

کیا یہ کراہت تنزیہی ہے یا تحریمی؟اس میں دو روایات ہیں میرے نزدیک اس کی کراہت کا تنزیہی ہونا اولیٰ ہے کیونکہ حدیث میں مذکور حکم نہی غیر مصروف نہیں ہے اور نہ اس فعل پر وعید ظنی ہے بلکہ اجر کا سلب ہے اور اجر کا سلب سزا کے استحقاق کے ثبوت کو لازم نہیں کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس کی تائید "فلاشي عليه" کی روایت سے ہے کہ اس پر کوئی چیز نہیں یہ اگرچہ مشہور کے برابر نہیں ہے۔

وہ فرماتے ہیں اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نماز جنازہ بذات خود ثواب کا سبب موضوع ہے لہٰذا اس فعل (کی بجا آوری) کے ساتھ ثواب کا سلب ہونا اس گناہ کی وجہ سے ہے جو اس ثواب کے ساتھ ملا ہوا ہے: وہ اس ثواب کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

(شارح) فرماتے ہیں یہ محل نظر ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: زیادہ واضح یہ ہے کہ نفی کو کمال پر محمول کیا جائے جیسا کہ اس کی نظائر میں کیا جاتا ہے اور اس کی دلیل مسلم کی روایت ہے:عن عائشة: والله لقد صلى النبيؐ على ابني بيضاء في المسجد سهيل و أخيه"۔

خطابیؒ کہتے ہیں: یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں پر نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی اور یہ بات معلوم ہے کہ اکثر مہاجرین وانصار ان دونوں کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے۔ان کا ترک انکار دلیل جواز ہے اور یہ مکروہ تنزیہی کے منافی نہیں ہے۔

قوله: فصف بهم و كبر أربع تكبيرات:

امام شافعیؒ نے غائبانہ نماز جنازہ کو جائز قرار دیا ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ (یہاں) حاضر ہونے کا احتمال ہے اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اس کو حاضر کردے اور یہ آپ کے خصائص میں سے ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو [illegible] نے روایت کیا ہے۔

اسی طرح صحیح کی روایت میں نجاشی کی موت کی خبر کا بیان بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قد مات اليوم عبد صالح يقال له اصحمة فقوموا عليه ابن شاہین اور دارقطنی کی روایت میں ہے: أنه قال: قوموا فصلوا على أخيكم النجاشي فقال بعضهم: يأمرنا أن نصلي على علج من الحبشة' فانزل الله تعالىٰ: ﴿وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۹۹ ـ ۲۰۰] ''اور بعض اہل کتاب ایسے بھی ہیں جو خدا پر اور اس (کتاب) پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں۔ اور خدا کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں تیار ہے اور خدا جلد حساب لینے والا ہے۔ اے اہل ایمان (کفار کے مقابلوں میں) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور (مورچوں پر) جمے رہو اور خدا سے ڈرو تا کہ مراد حاصل کرو۔''

ابوہریرہ کی دوسری میں روایت ہے: أصبحنا ذات يوم عند رسول الله ﷺ فقال: إن أخاكم أصحمة النجاشي قد توفي فصلوا عليه قال فوثب رسول الله ﷺ فوثبنا معه حتى جاء المصلىٰ فقام فصففنا فكبر أربع تكبيرات۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: ان احادیث میں شافعیؒ کے لیے زیادہ واضح حجت ہے کہ وہ میت جو ملک اور قبرستان میں موجود نہ ہو اس پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اور یہ دعویٰ قابل التفات نہیں ہے کہ زمین لپیٹ دی گئی تھی اور جنازہ آپ کے سامنے آ گیا تھا۔ کیونکہ یہ حکم اس جیسے احتمال سے ثابت نہیں ہوسکتا اور اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو صحابہؓ کے لئے تو یہ نماز جنازہ قطعی طور غائبانہ تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ مضر نہیں ہے چونکہ یہ بات بالا تفاق جائز ہے کہ مقتدی میت کو نہ دیکھ رہا ہو جیسا کہ مسجد حرام میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جب پہلی بات ثابت ہوگئی تو اس سے دوسری کا ثبوت لازم آتا ہے۔ رہا احتمال تو اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جو اس استدلال پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک حدیث یہ ہے جس کو حافظ ابن حجر نے ''واحدی'' کے اسباب نزول سے بغیر اسناد کے نقل کیا ہے:

''عن ابن عباس قال: كشف للنبي ﷺ عن سرير النجاشي حتى راه و صلى عليه''۔

دوسری محقق امام ابن ہمام نے ذکر کی ہے جس کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے حدیث کے راوی عمران بن حصین ہیں: أنه ﷺ قال: إن أخاكم النجاشي توفي فقوموا و صلوا عليه، فقام عليه و صفوا خلفه فكبر أربعا و هم لا يظنون أن جنازة بين يديه''۔

یہ الفاظ اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ واقعہ ان کے ظن کے خلاف تھا۔ اس کا معتد یہ فائدہ ہے' پس یہ یا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا یا آپؐ کے لیے اس کی میت سامنے کردی گئی تھی یا یہ نجاشی کے ساتھ خاص ہے اس کے ساتھ کسی اور کو ملحق نہیں کیا جائے گا' اگر چہ وہ اس سے افضل ہی کیوں نہ ہو' جیسے حضرت خزیمہؓ کی شہادت حضرت صدیق کی شہادت کے مقابلہ میں۔

نجاشی کے علاوہ معاویہ بن معاویہ مزنی کی بھی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ معاویہ اللیثی تھے (وہ روایت یوں ہے): نزل جبريل بتبوك' فقال: يا رسول الله إن معاوية بن المزني مات بالمدينة، أتحب ان اطوى لك الأرض فتصلى عليه؟ قال: نعم فضرب بجناحه على الأرض فرفع له سر يره فصلى عليه و خلفه صفان من الملائكة في كل صف سبعون ألف ملك ثم رجع فقال عليه السلام: بم أدرك هذا؟ قال: بحبه: [قل هو الله أحد وقراء ته اياها جائياً و ذاهبا و قائما و قاعدا و على كل حال۔

اس حدیث کو امام طبرانی نے ابوامامہ سے اور ابن سعد نے طبقات میں حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اور (اسی طرح) زید اور حضرت جعفرؓ جب غزوہ موتہ میں شہید ہوئے تو ان پر بھی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جیسا کہ واقدی نے مغازی میں بیان کیا ہے:

حدثني محمد بن صالح عن عاصم بن عمر بن قتادة حدثني عبدالجبار بن عمارة عن عبد الله بن أبي بكر قال: لما التقى الناس بمؤتة جلس رسول الله ﷺ على المنبر' و كشف له ما بينه و بين الشام فهو ينظر الى معركتهم فقال عليه السلام أخذ الرأية زيد بن حارثه' فمضى حتى استشهد و صلى عليه و دعاله' و قال استغفرو اله دخل الجنة وهو يسعى' ثم أخذ الرأية جعفر بن أبي طالب فمضى حتى استشهد وصلى عليه رسول الله ﷺ و دعا له و قال استغفروا له دخل الجنة فهو يطير فيها بجناحين حيث شاء۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ خصوصیت کا ہے اس تقدیر کے ساتھ کہ آپؐ کے لیے نہ اُس کی چارپائی بلند کی گئی اور نہ وہ آپؐ کے لئے ''مرئی'' تھا اور جو اس کے خلاف ذکر کیا گیا ہے وہ طرق کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

چنانچہ جو مغازی میں ہے وہ طرفین سے مرسل ہے اور جو طبقات میں ہے وہ علاء بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے کہا جاتا ہے کہ محدثین ابن یزید کے ضعف پر متفق ہیں۔

طبرانی کی روایت میں بقیہ بن ولید ہے اور اس نے عنعنہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

پھر خصوصیت کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ان حضرت کے علاوہ کسی کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی نجاشی کے بارے میں صراحت ہے کہ اس کی میت بلند کی گئی اور آپؐ اس کی میت کو دیکھ رہے تھے حالانکہ آپؐ کے بہت سے صحابہ دیارِ غیر میں سفروں وغیرہ میں فوت ہوئے مثلاً سرزمین حبشہ اور غزوہ میں آپؐ کا معمول یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے اصحاب میں سے جو بھی فوت ہوتا تھا آپؐ اس کا جنازہ پڑھتے تھے آپؐ اس معاملہ میں بہت ہی حریص تھے یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: لا يموتن أحدكم إلا أذنتموني به فان صلاتي عليه رحمة له۔

نمازِ جنازہ میں تکبیرات کا مسئلہ

۱۶۵۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ كَانَ زَيْدُ بْنُ اَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلٰى جَنَائِزِنَا اَرْبَعًا وَاَنَّهٗ كَبَّرَ عَلٰى جَنَازَةٍ خَمْسًا فَسَأَلْنَاهُ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكَبِّرُهَا۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٥٩/٢ حديث رقم (٧٢-٩٥٧)- وابوداوٗد في السنن ٥٣٧/٣ حديث رقم ٣١٩٧- والترمذي في السنن ٣٤٣/٣ حديث رقم ١٠٢٣- والنسائي ٧٢/٤ حديث رقم ١٩٨٢-وابن ماجه ٤٨٢/١ حديث رقم ١٥٠٥- واحمد في المسند ٣٦٧/٤-

ترجمه: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ صحابی ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور ایک جنازے پر انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں۔ پس ہم نے پوچھا کہ آپ تو ہمیشہ چار تکبیریں کہتے تھے۔ آج پانچ کیوں کہیں تو وہ فرمانے لگے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

زید بن اُرقم: مؤلف فصل صحابہؓ میں فرماتے ہیں ان کی کنیت ابوعمرو ہے' یہ انصاری خزرجی ہیں ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا تھا وہ یہیں رہائش پذیر رہے اور یہیں فوت ہوئے ان سے عطاء وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله: فقال كان رسول الله ﷺ يكبر خمسًا: یعنی نبی کریم ﷺ کبھی کبھی یا شروع میں پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے امام نوویؒ کہتے ہیں اجماع اس حدیث کے منسوخ پر دلیل ہے اس لیے کہ ابن عبدالبر وغیرہ نے اجماع نقل کیا ہے کہ آج (یعنی اب) صرف چار تکبیریں کہیں جائیں گے یہ دلیل ہے کہ صحابہ نے زید بن اُرقم رضی اللہ عنہ کے بعد اجماع کیا تھا زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اجماع اختلاف کے ساتھ بھی صحیح ہے۔

اس بات کا احتمال بھی ہے کہ آپ بھول گئے اور پانچ تکبیریں کہہ دی ہوں اور ان کی نماز کی صحت پر اس بات سے استدلال کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے پانچ تکبیریں کہی تھیں' کیونکہ حدیث میں صراحت نہیں ہے کہ زید بن اُرقم نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں حذیفہ بھی اسی کے قائل ہیں' ائمہ میں سے کسی نے بھی اس پر عمل نہیں کیا لیکن اصح یہ ہے کہ اگر پانچ تکبیریں کہہ دیں تو اس کی نماز جنازہ باطل نہیں ہوگی۔ امام بغویؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یعنی اکثر کا اجماع ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث نسائی نے بھی بیان کی ہے۔

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ

١٦٥٤: وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ فَقَالَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّهَا سُنَّةٌ۔ [رواه البخاري]

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٠٣/٣- حديث رقم ١٣٣٥- وابوداوٗد في السنن حديث رقم ٣١٩٨ والترمذي في السنن ٣٤٥/٣ حديث رقم ١٠٢٦- النسائي ٧٥/٤ حديث رقم ١٩٨٨ وابن ماجه ٤٧٩/١ حديث رقم ١٤٩٥-

ترجمه: حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف تابعی سے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے جنازہ کی نماز پڑھی۔ تو

انہوں نے تکبیر اولیٰ کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ میں نے سورۃ فاتحہ پڑھی تا کہ تم جان لو کہ یہ سنت ہے۔اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی میں نے سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے اپنی آواز کو بلند کیا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔

قوله: لتعلموا أنها سنة: طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی یہ بدعت نہیں ہے اشرفؒ فرماتے ہیں: ضمیر مؤنث قراءتِ فاتحہ کی طرف راجع ہے۔اور "سنت" سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ واجب نہیں ہے' بلکہ یہاں سنت "بدعت" کے مقابل ہے یعنی یہ مروی طریقہ ہے یہ تاویل امام شافعیؒ اور احمدؒ کے مذہب پر ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ واجب نہیں۔یعنی فاتحہ کو اگر ثنا کی جگہ پڑھا جائے تو سنت کے قائم مقام ہو جائے گی۔

ابن ہمام کی شرح میں ہے کہ فقہاء فرماتے ہیں کہ فاتحہ نہ پڑھی جائے' الا یہ کہ اس کو ثناء کی نیت کے ساتھ پڑھا جائے' رسول اللہ سے قراءت فاتحہ ثابت نہیں ہے۔موطا مالک میں نافع عن ابن عمرؓ روایت ہے: **كان لايقر ؤها في الصلاة على الجنازة**۔ کہ "وہ نماز جنازہ میں سورت فاتحہ نہیں پڑھا کرتے تھے"۔اس سے اس قول کے ضعیف ہونے کا علم ہوتا ہے کہ "یہ مروی طریقہ ہے" اور جہاں تک بات ہے ابوامامہ کی حدیث کی جو شیخین کی شرط پر ہے: **السنة فى الصلاةعلى الجنازة أن يقرأفي التبكيرة الاولى بأم القرآن مخافة** کہ آپؐ نے فرمایا: نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھنا سنت ہے' سو اس کی تاویل گزر چکی ہے اور یہ قول صحابی کے قول "من السنة كذا" کے قبیل سے نہیں ہے کہ یہ مرفوع کے حکم میں ہے جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے۔آپ اس پر غور کریں۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداؤد، ترمذی' نسائی اور شافعی نے بھی روایت کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنازے کے موقع پر جامع دُعا

۱۶۵۵: وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَعَافِهٖ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهٗ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهٖ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهٖ وَاَهْلًا خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَزَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهٖ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَقِهٖ فِتْنَةَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ قَالَ حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَنَا ذٰلِكَ الْمَيِّتُ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٦٢/٢ حديث رقم (١٥ - ٩٦٣)۔ والنسائي في السنن ٨٣/٤ حديث رقم ١٩٨٣۔ وابن ماجه ٤٨١/١ حديث رقم ١٥٠٠۔

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی۔پس میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یاد کر لی۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیسری تکبیر کے بعد فرماتے تھے اے اللہ اس کے گناہوں کو بخش دے۔اس کی

نیکیوں کو قبول کر اور اس کو مکروہات سے نجات عطا فرما اور اس کی تقصیرات کو معاف فرما اور جنت میں اس کی مہمانی بہتر کر دے اور اس کی قبر کو کشادہ کر دے اس کو پانی' برف اور اولے کے ساتھ پاک اور اس کو گناہوں سے پاک کر دے جیسا کہ تو سفید کپڑے کو میل سے صاف کرتا ہے اور دنیا کے گھر سے بہتر گھر بدلہ میں اور بہتر اہل عطا فرما دنیا کے اہل والوں سے یعنی (خادموں) سے اور دنیا کی بیوی سے بہتر بیوی عنایت فرما اور اس کو جنت میں داخل کر دے (ابتداً) اور اس کو عذابِ قبر سے پناہ دے یا فرمایا دوزخ کے عذاب سے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کو قبر کے فتنہ سے بچا یعنی فرشتوں کے جواب میں پریشانی ہے اور آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے جب میں نے یہ دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس میّت کے بارے میں سنی تو مجھے رشک آنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں اس مرنے والے کی جگہ میں ہوتا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال: صلى رسول الله ﷺ على جنازة فحفظت من دعائه وهو يقول: یہ جملہ صرف تاکید کے لیے ہے یا بیان کے لیے ہے کہ انہوں نے یہ دعا آپ سے سن کر یاد کی ہے' آپؐ کے حوالہ سے کسی اور سے سن کر یاد نہیں کی۔ یہ "فقہ" کے اس اصول کے منافی نہیں کہ سری قراءت مندوب ہے۔ کیونکہ یہاں قراءت صرف اور صرف تعلیم کی غرض سے تھی۔

قوله: اللهم اغفرله ـــ واكرم نزله: اللهم اغفرله: اس کی سیئات کو مٹا کر اس کو بخش دے۔

وارحمه: طاعات کو قبول فرما کر' یہ ابن حجر کے اس قول سے احسن ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے یا اعم ہے۔

عافه: "معافات" سے ہے اور "ھاء" ضمیر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ھائے سکتہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ناپسندیدہ چیزوں سے نجات دے دے۔ امام طیبی کہتے ہیں: یعنی اس کو عذاب اور آزمائشوں سے محفوظ رکھ۔

واعف عنه: یعنی اس سے تقصیرات (کوتاہیاں سرزد ہوئیں ہیں انہیں معاف فرما اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں "عافہ" سے مراد یہ ہے کہ اس کو ہر تکلیف دینے والی چیز سے محفوظ رکھ اور "**واعف عنه**" تاکید کے لیے ہے یا اخص ہے۔ یعنی اس کو تمام گناہوں کے خطرات سے محفوظ رکھ اور نہایہ میں ہے: **العفو' العافية** اور **المعافاة** قریب المعنی ہیں۔ "عفو" سے مراد گناہوں کو مٹانا' "عافیہ" سے مراد اس کو بیماریوں اور آزمائشوں سے محفوظ رکھنا اور "معافات" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں سے اور لوگوں کو تجھ سے عافیت میں رکھے' اور ان کی تکلیف دہ چیزوں سے تجھ کو پھیر دے اور تیری تکلیف دہ چیزوں کو ان سے پھیر دے۔ (یہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔)

یہ بات مخفی نہیں کہ "عافیت" اور "معافاۃ" کا جو معنی ذکر کیا گیا ہے وہ میت کے لیے غیر مناسب ہے' بلکہ عافیت کی جو تعریف کی ہے وہ زندہ کے لئے بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ آپ اور آپ کے پیروکاروں نے عافیت کی دعا کی وہ لوگ اسقام و آزمائشوں سے محفوظ نہیں رہے' بلکہ سب سے سخت آزمائش انبیاء کی ہوئی ہے پھر ان کی جو ان کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں' اور عربوں کے ہاں اسقام سے سلامتی بڑے بڑے عیوب میں سے تھا۔ پس ضروری ہے کہ "اَسقام" "سيّ الاسقام" جیسے برص جنون اور جذام وغیرہ پر محمول کیا جائے' یا "عافیت" سے مراد یہ کہ وہ مصیبتوں میں جزع فزع نہ کرے' اور صبر و شکر کرے اور اللہ کی

رضا پر راضی رہے۔ اور اُس پر جو اُحکام واجب ہیں ان کو بجالائے۔ نزله: ''زاء'' کے ضمہ اور سکون کے ساتھ' اس کا رزق مراد ہے اور اصل میں وہ کھانا جو مہمان کی تشریف آوری پر پیش کیا جاتا ہے۔

قوله: ووسع مدخله: مدخله: میم کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مراد اس کی قبر ہے۔ میرکؒ فرماتے ہیں: یہ میم کے فتحہ کے ساتھ ہے' شیوخ کی زبانوں سے اس طرح سنا ہے اور ہمارے اصل سماع میں بھی اسی طرح ضبط ہے اور شیخ جزریؒ نے ''مفتاح الحصن'' میں میم کے ضمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ معنی کے لحاظ سے یہ دونوں صحیح ہیں۔ کیونکہ اس کا معنی ہے'' داخل ہونے کی جگہ'' یا'' داخل کرنے کی جگہ'' شیخ نے ضمہ کو اختیار کیا ہے کیونکہ جمہور قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں: وند خلکم مد خلا کریما۔ امام نافع فتحہ میں منفرد ہیں۔ معنی کے لحاظ سے ضمہ زیادہ مناسب ہے' چونکہ اس کا داخل ہونا بنفسہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا ہی اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

قوله: واغسبله بالماء والثلج والبرد: ''باء'' اور ''راء'' کے فتحہ کے ساتھ ذریعہ اس طرح مغفرت انواع کے پاک کردے جس طرح انواع مطہرات کی یہ اشیاء میل کچیل دور کرتی ہیں۔

نقه: ھائے ضمیر ہے' یا ھائے سکتہ ہے۔

من الخطایا: پہلے کی تاکید ہے۔

الدّنس: دال اور نون کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''معقول شئی'' کو تشبیہ محسوس چیز کے ساتھ دی ہے' یہ ماقبل کی تاکید ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے یا اُن دونوں میں سے ایک سے مراد صغائر ہیں اور دوسرے سے مراد کبائر ہیں۔ یا ان دونوں میں سے ایک سے مراد اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور دوسرے سے مراد بندوں کا حق ہے۔

قوله: وابدله دارا خیر۔۔۔۔ خیرا من زوجه: یعنی حوریں اور دنیا کی عورتیں بھی عطا فرما پس یہ اشکال نہ کیا جائے کہ دنیا کی عورتیں اپنی نمازوں اور اپنے روزوں کی وجہ سے جنت میں حوروں سے افضل ہوں گی جیسا کہ حدیث میں ہے۔

رہا ابن حجر کا قول: ''خَیرًا'' یہ اپنے باب یعنی افعل التفضیل کے باب سے نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں آخرت کی نسبت کچھ بھی خیر نہیں ہے' سو ابن حجرؒ کا یہ کلام خود اپنے باب سے نہیں ہے۔ کیونکہ کلام نسبت حقیقی کے بارے میں ہے نہ نسبت اضافی کے بارے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [والآخرة خیر و أبقی][الاعلی۔۱۷] اور دوسری جگہ فرمایا: و قال عزوجل والآخرة خیر لمن اتقی][النساء ۔۷۷]

واعذه من عذاب القبرأ ومن عذاب النار: ظاہر یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''اَوْ'' بمعنی ''واؤ'' کے ہو۔ اس کی تائید اس نسخہ سے ہوتی ہے جس میں واؤ ہے۔

قوله: وفی روایة وقه فتنة القبرو عذاب النار:

قه: ہائے ضمیر کے ساتھ ہے' یا ہائے سکتہ ہے۔

فتنة القبر: یعنی فرشتوں کے جواب میں حیران و سرگردان ہونے سے بچا' کہ جو تحیرّ عذاب قبر کی طرف دھکیلنے والا ہے۔

قوله حتی تمنیت لأن أکون أنا ذلك المیت:

"أنا" ضمیر متصل کی تاکید کے لیے ہے۔

"ذلك": خبر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور امام بخاریؒ وغیرہ کہتے ہیں: یہ دعا ان سب دعاؤں سے زیادہ صحیح ہے جو میت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنے کا ثبوت

۱۶۵۶: وَعَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّ عَائِشَةَ لَمَّا تُوُفِّیَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَتْ اُدْخُلُوْا بِهِ الْمَسْجِدَ حَتّٰی اُصَلِّیَ عَلَيْهِ فَاُنْكِرَ ذٰلِكَ عَلَيْهَا فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَقَدْ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی ابْنَیْ بَيْضَاءَ فِی الْمَسْجِدِ سُهَيْلٍ وَ اَخِيْهِ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحيحه ٦٦٩/٢ حديث رقم (١٠١۔ ٩٧٣)۔ وابوداؤد فی السنن ٥٣١/٣ حديث رقم ٣١٩٠۔

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰنؒ سے روایت ہے کہ جب سعد بن ابی وقاصؓ کی وفات ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں کہ ان کو مسجد میں داخل کرو۔تاکہ میں بھی نمازِ جنازہ میں شریک ہوسکوں۔تو لوگوں نے مسجد میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔تو پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں۔البتہ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی تھی یعنی سہل اور اس کے بھائی کی۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سعد بن اَبی وقاص: ان کی وفات ان کے محل میں ہوئی تھی جو عقیق میں مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر تھا بقیع میں دفن کرنے کے لوگ ان کا جنازہ اپنے کندھوں پر لے کر آئے۔ان کی وفات امیر معاویہؓ کی خلافت کے دور میں ہوئی۔

تشریح: قوله :قالت ادخلوا به المسجد حتی اصلی علیه: یعنی حضرت عائشہ نے ان سے کہا کہ وہ نماز جنازہ مسجد میں ادا کریں تاکہ وہ بھی ان کی نماز جنازہ پڑھ لیں۔

قوله: فقالت واللّٰه لقد صلی رسول اللّٰه ﷺ علی ابنی بیضاء الخ:

سهیل: تصغیر کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں "سهل" ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: اس (کے بھائی) کا نام سہل تھا۔دونوں نو (۹) ہجری میں فوت ہوئے تھے "بیضاء" ان دونوں کی ماں تھی اور اس کا نام "دعد بنت الجحدم" ہے اور ان دونوں کے باپ کا نام عمرو بن وہب ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں طیبی سے ان کے باپ کے نام کے متعلق غلطی ہوئی ہے۔کیونکہ ان دونوں کے باپ کا نام وہب بن ربیعہ تھا جیسا کہ استیعاب وغیرہ اسمائے رجال کی کتب میں مذکور ہے۔سہل قدیم الاسلام تھے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی پھر

مکہ واپس آ گئے تھے اور غزوۂ بدر میں شامل ہوئے اور ہجرت کے نویں سال فوت ہوئے۔

امام شافعی نے سیدہ عائشہ کا قول اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب اس کو مکروہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ کی بہت زیادہ تعداد تھی پس اگر انہیں نسخ کا علم نہ ہوتا تو وہ حدیث عائشہ کی مخالفت نہ کرتے' طیبی کا کلام اختتام پذیر ہوا۔ حدیث کو انہوں نے بارش جیسے عذر یا خصوصیت یا جواز پر محمول کیا ہے اور سعد کے معاملہ میں افضل پر عمل کیا' خصوصاً جب کہ مسجد نبوی کے ملوث ہونے کا بھی اندیشہ تھا' چونکہ وہ مسافت بعیدہ سے لایا گیا تھا' اور اعناق سعید پر حرکت کی تا ہوا آیا تھا۔

رہا ابن حجرؒ کا یہ قول کہ اس میں امام شافعی کے قول کی واضح حجت ہے کہ ''میت کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں داخل کرنا افضل ہے'' تو یہ قول مردود ہے۔ کیوں کہ اگر یہ افضل ہوتا تو آپ نماز جنازہ اکثر مسجد میں پڑھتے' اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اس سے نہ رکتے۔ حدیث فی الجملہ جواز کا فائدہ دے رہی ہے اور میرا یہ گمان نہیں ہے کہ امام شافعیؒ اس کو افضل قرار دیں گے' جب ہم اس میں امام اکمل کی مخالفت بھی ہے۔ متأخرین شافعیہ کی ایک جماعت نے اس کے استحباب میں نزاع کیا ہے کہ جنازہ کے لیے مسجد سے باہر معروف جگہ تھی اور آپؐ عام طور پر نماز جنازہ وہ ہیں ادا فرماتے تھے ابن حجر نے اس کا دفاع کیا ہے جو نقلاً اور عقلاً درست نہیں اور پھر مناقضہ و معارضہ بھی کیا ہے جو درج ذیل ہے:

ابوداؤد وغیرہ کی یہ حدیث: ''جس نے میت پر نماز جنازہ مسجد میں پڑھی اس کے لئے کوئی شئی نہیں''۔ یہ روایت محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہے اور ابوداؤد کے تمام معتمد اصول میں '' فلاشي علیه'' ہے' اور اگر وہ صحیح ہو تو تمام روایات میں جمع کرنے کی خاطر اس کو اس پر محمول کرنا واجب ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے لئے اُجر کامل نہیں ہے۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں: اس روایت کو امام ابوداؤدؒ نے بھی بیان کیا ہے۔

نمازِ جنازہ پڑھاتے وقت امام کہاں کھڑا ہو اس کے تعین کے بارے میں

ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا اختلاف

۱۶۵۷: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ صَلَّيْتُ وَرَاءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِمْرَاَةٍ مَا تَتْ فِيْ نِفَاسِهَا فَقَامَ وَسْطَهَا۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۱/۳۔ حدیث رقم ۱۳۳۱۔ ومسلم فی صحیحه ۶۶۴/۲ حدیث رقم (۸۷۔ ۹۶۴)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۳۶/۳ حدیث رقم ۳۱۹۵۔ والترمذی ۳۵۳/۳ حدیث رقم ۱۰۳۵۔ والنسائی ۷۰/۴ حدیث رقم ۱۹۷۶۔ وابن ماجه ۴۷۹/۱ حدیث رقم ۱۴۹۳۔ واحمد فی المسند ۱۴/۵۔

ترجمہ: حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت کے جنازے کے موقع پر جو نفاس کی وجہ سے فوت ہوگئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں کھڑے ہوئے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: '' جندب'' دال کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔

لفظ ''وسط'' کی تحقیق:

وسطها: سین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے' طیبیؒ کہتے ہیں: ''وسط'' سکون کے ساتھ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے اجزاء الگ الگ ہوں جیسے ''الناس'' ''دواب'' وغیرہ اور جس کے اجزاء متصل ہوں جیسے ''دار'' اور'' رأس'' وغیرہ وہ فتحہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک قول ہے دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں' صاحب ''المغوب'' کہتے ہیں: ''وسط'' فتحہ کے ساتھ جیسے دائرے کا مرکز اور سکون کے ساتھ داخل دائرہ ایک قول ہے ہر وہ چیز جس میں ''بین'' کی صلاحیت ہو وہ فتحہ کے ساتھ ہے اور جو ایسا نہ ہو وہ سکون کے ساتھ ہے۔

ہمارے نزدیک امام میت کے سینے کے برابر کھڑا ہوگا' خواہ (میت) آدمی ہو یا عورت امام شافعیؒ کے نزدیک امام آدمی کے سر کے پاس کھڑا ہو اور عورت کی سرین کے محاذی کھڑا ہوگا نافع ابو غالب سے مروی ہے کہتے ہیں: میں مربد کی گلی میں تھا ایک جنازہ گزرا اُس کے ساتھ بہت زیادہ لوگ تھے لوگوں نے کہا کہ یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ ہے پس میں بھی ان کے پیچھے چلا اچانک میرا سامنا ایک شخص سے ہوا جس کے جسم پر باریک چادر تھی' اور سورج سے بچنے کے لیے سر پر ایک کپڑا رکھا ہوا تھا میں نے کہا: یہ دہقان کون ہے؟ ''دہقان'' کسرہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ اقلیم کے رئیس کو کہا جاتا ہے لوگوں نے۔ کہا: یہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں فرماتے ہیں جب میت نیچے رکھ دی گئی تو انس کھڑے ہوئے اور ان کی نماز جنازہ پڑھائی میں ان کے پیچھے تھا میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ تھی وہ ان کے سر کے پاس کھڑے ہوئے اور چار تکبیرات کہیں' نہ طویل کیا اور نہ جلدی کی پھر وہ بیٹھنے لگے تو لوگوں نے کہا اے ابوحمزہ! انصاری عورت کا جنازہ بھی ہے انہوں نے جنازہ قریب کیا اُس پر سبز چادر تھی آپ اس کی سرین کے قریب کھڑے ہوئے' آپؓ نے آدمی کی طرح اس کی نماز جنازہ پڑھائی پھر بیٹھ گئے علاء بن زیادہ نے کہا: اے ابوحمزہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح نماز جنازہ پڑھاتے تھے جیسے تو نے نماز جنازہ پڑھائی چار تکبیریں کہتے تھے کیا آپ آدمی کے سر کے پاس اور عورت کی سرین کے پاس کھڑے ہوتے تھے؟ انہوں نے کہا جی ہاں یہاں تک کہ ابو غالب نے کہا میں نے سیدنا اُنس رضی اللہ عنہ کے اس طرح کرنے عورت کی سرین کے پاس کھڑے ہونے کے متعلق پوچھا تو لوگوں نے مجھے بیان کیا' یہ ابوداؤد کی روایت کا اختصار ہے اور اس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس کو امام احمد نے روایت کیا ہے: **ان اباغالب قال: صليت خلف انس على جنازة فقام حيال صدره** ابو غالب کہتے ہیں کہ میں نے انس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی وہ سینے کے پاس کھڑے ہوئے اور صحیحین کی اس روایت کے بھی معارض ہے: **انه عليه الصلوٰة والسلام صلى امرأة ماتت فى نفاسها فقام وسطها۔** آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کی نماز جنازہ پڑھائی جو نفاس میں فوت ہوئی تھی آپؐ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے یہ اس کے منافی نہیں کہ سینہ وسط ہے بلکہ سینہ اعضاء کے اعتبار سے وسط میں ہے' چونکہ اس کے اوپر اس کے دونوں ہاتھ اور اس کا سر ہے' اور اس کے نیچے اس کا پیٹ اور اس کی ٹانگیں ہیں۔

اور اس بات کا بھی احتمال ہے وہ اسی طرح کھڑے ہوئے ہوں جس طرح ہم نے کہا کیونکہ ان کے پیش نظر اس کی ستر پوشی

تھی تو راوی نے تقارب محلین کی وجہ سے یہ گمان کیا۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا

۱۶۵۸:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرٍ دُفِنَ لَيْلاً فَقَالَ مَتٰى دُفِنَ هٰذَا قَالُوا الْبَارِحَةَ قَالَ اَفَلَا آذَنْتُمُوْنِىْ قَالُوْا دَفَنَّاهُ فِىْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ فَكَرِهْنَا اَنْ نُّوْقِظَكَ فَقَامَ فَصَفَفْنَا خَلْفَهٗ فَصَلّٰى عَلَيْهِ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۷۱/۳۔ حدیث رقم ۱۲۴۷۔ ومسلم فی صحیحه ۶۵۸/۲ حدیث رقم (۶۹۔۹۵۴)۔ وابن ماجه ۴۹۰/۱ حدیث رقم ۱۵۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا گزر ایک قبر پر سے ہوا جس میں مردے کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ پس آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کب دفن کیا گیا تھا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا آج۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: پس تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ کہ ہم نے اسکو اندھیری رات میں دفن کیا تھا۔ پس ہم نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جگانا ناپسند سمجھا۔ پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کھڑے ہوئے اور ہم نے آپ کے پیچھے صف باندھی پھر اس پر نماز پڑھی۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: آذنتمونی: مد کے ساتھ ای أدفنتموہ فلاأعلمتمو نی (یعنی تم نے اس کو دفن کر دیا اور مجھے خبر نہیں دی)۔

فکرھنا: اور ایک دوسرے نسخہ میں ''و کرھنا'' ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں:

① رات کو دفن کرنا جائز ہے اس پر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ''تقریر'' ثابت ہے۔

② قبر پر دعا کرنا جائز ہے دفن کے بعد۔

③ نمازِ جنازہ جماعت کے ساتھ ادا کرنا مستحب ہے۔

طرفین (یعنی اول آخر) میں مذکور دو مسئلوں میں اختلاف نہیں مگر حسن بصری نے شذوذ اختیار کیا ہے۔ اور بعض شافعیہ نے اس کی پیروی کی ہے اور ان کی تردید اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے: ان ناسا راؤ فی المقبرۃ نارا فاتوھا فاذا رسول اللہ ﷺ فی القبر 'واذا ھویقول ناو لونی صاحبحکم فاذا ھو الرجل الذی کان یرفع صوتہ بالذکر۔ ''لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی تو وہ قبرستان آئے دیکھا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قبر میں (اترے ہوئے) تھے اور آپؐ فرما رہے تھے: ''ناولونی صاحبکم'' اپنے ساتھی کی میت مجھے پکڑا دو وہ آدمی تھا جو باآواز بلند ذکر کرتا تھا۔''

مسلم کی حدیث ہے زجر رسول اللہ ان یقبر الرجل باللیل حتی یصلی علیہ الا ان یضطر انسان الی

ذلك۔ ''رسول اللہ ﷺ نے رات کو آدمی دفن کرنے پر ڈانٹا یہاں تک کہ اُس کی نماز جنازہ پڑھی جائے الایہ کہ انسان اس کی طرف مجبور ہو اس حدیث میں'' ممانعت نماز جنازہ ادا کرنے سے قبل رات کو دفن کرنے کی ہے۔

دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: صحیحین میں ہے: **عن الشعبی قال: أخبرنی من شهد النبی ﷺ أنه أتی علی قبر منبوذ و صفهم فكبر أربعًا** ۔ شیبانی نے کہا: یہ حدیث تجھے کس نے بیان کی؟ اس نے کہا: ابن عباسؓ نے اس حدیث میں صف کا ذکر دلیل ہے کہ جو شخص نماز جنازہ نہ پڑھ سکا ہو وہ قبر پر نماز جنازہ پڑھ سکتا ہے اگر چہ ولی نہ ہو یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے اس دعوی کے سوا چھٹکارا نہیں کہ اس کی نماز جنازہ سرے سے ہی نہیں پڑھی گئی تھی اور یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت ہی بعید ہے۔ اُقرب یہ ہے کہ اس کو نبی ﷺ کے ساتھ اختصاص پر محمول کیا جائے' اور یہ کہ آپ کے علاوہ دوسروں نے (اس موقع پر جو نماز پڑھی سو وہ) آپؐ کی اتباع میں پڑھی تھی یا ان لوگوں نے پہلے نہیں پڑھی تھی۔

پھر میں نے دیکھا کہ سیوطی نے ''**انموذج اللبيب**'' میں ذکر کیا ہے کہ بعض اُحناف نے ذکر کیا ہے کہ آپ کے دور میں فرض جنازہ آپ کے ادا کیے بغیر ساقط نہیں ہوتا تھا۔ تو اس کی تاویل یہ ہے آپ کے حق میں نماز جنازہ فرض عین تھی اور دوسروں کے لیے فرض کفایہ تھی۔ واللہ ولی الہدایۃ۔ اس (تفصیل) سے اس حدیث صحیحہ کی توجیہ واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے ایک غریب عورت کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی اس رات کے علاوہ جس دن اُسے دفن کیا گیا تھا۔

سعید بن میبؒ سے ایک صحیح مرسل روایت ہے ان کی مرسل موصول کے حکم میں ہوتی ہے حتی کہ امام شافعیؒ کے ہاں بھی: آپ نے ام سعد کی نماز جنازہ ایک مہینے بعد پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپؐ موجود نہ تھے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: قبر والے کا نام طلحہ بن براء بن عمیر علوی تھا یہ انصار کے حلیف تھے ابوداؤد نے انکی حدیث کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اور طبرانی نے تفصیلاً ذکر کیا ہے ان کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: **فجاء حتی وقف علیٰ قبره فصف الناس معه ثم رفع یدیه فقال: اللهم الق طلحة یضحك إلیك و تضحك إلیه** اور ''**ضحك**'' رضا سے کنایہ ہے۔ واللہ اعلم۔

قبر کو منور کرنے کے لیے آپ ﷺ کا قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا

۱۶۵۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ اِمْرَاَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تُقِمَّ الْمَسْجِدَ اَوْ شَابٌّ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَ عَنْهَا اَوْ عَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ قَا لَ اَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِیْ قَالَ فَكَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهٗ فَقَالَ دُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِهٖ فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوَّةٌ ظُلْمَةً عَلٰی اَهْلِهَا وَاِنَّ اللّٰهَ یُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِیْ عَلَیْهِمْ۔ [متفق علیه ولفظه لمسلم]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۴/۳۔ حدیث رقم ۱۳۳۷۔ ومسلم فی صحیحه ۶۵۹/۲ حدیث رقم (۷۱۔۹۵۶)۔ وابن ماجه ۴۹۰/۱ حدیث رقم ۱۵۳۳۔ واحمد فی المسند ۳۸۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک کالے رنگ کی عورت مسجد (نبویؐ) میں جھاڑو دیتی تھی یا ایک نوجوان تھا جو جھاڑو دیا کرتا تھا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو موجود نہ پایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے اس عورت یا جوان کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں گیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا مر گئی یا مر گیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آپ لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا تاکہ میں بھی نمازِ جنازہ پڑھتا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ صحابہؓ نے حقیر جانا (کم جانا) اس عورت کو یا اس شخص کو کہ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس شخص کے لیے آپ کو تکلیف دیں۔ حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم مقصود تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر کے بارے میں بتادو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قبر کے بارے میں بتایا گیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قبر پر نماز پڑھی اور ارشاد فرمایا کہ قبر تاریکیوں سے بھری ہوتی ہے میرے نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مردوں کے لیے قبر کو روشن کر دیتا ہے۔ جو اس پر میں نے نماز پڑھی۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ اس کے لفظ مسلم کے ہیں۔

تشریح: أن امرأة: "ان" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے' اور بعض کا کہنا ہے کہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

تقم: قاف کے ضمہ اور تشدید کے ساتھ ہے "قمامة" سے مشتق ہے۔

أو شاب: یہ مرفوع ہے اور اس کا عطف "إن" کے اسم کے محل پر ہے بشرطیکہ مروی ہو وگرنہ مجموع پر عطف ہے' اور مصابیح میں "ان اسود کان یقم" ہے ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس (شاب) سے مراد کوئی سیاہ فام عرب ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آدمی کا نام ہے۔

ففقدها: دوسرے نسخہ میں "ففقده" ہے۔

سال عنه او عنها: یہ درحقیقت پہلے شک پر مبنی ہے۔

فقالوا: میرکؒ فرماتے ہیں: بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ کے سوال کا جواب دینے والے لوگوں میں ایک صاحب ابوبکرؓ تھے۔

أفلا كنتم أذنتمونى

قال: "أفلا" کے جواب کی حکایت ہے۔

دلونى: "دلالت" مصدر سے امر کا صیغہ ہے

فدلوه: لام کے ضمہ اور تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله: قال ان هذه القبور...... : ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ان قبروں کی طرف اشارہ ہے جن پر آپ کے لئے نماز جنازہ پڑھنا ممکن تھا۔

ظلمة: تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں حکیمانہ اسلوب کی طرح ہے یعنی نماز جنازہ میں نظر میت کے حقیر الشان یا رفیع الشان ہونے پر نہیں بلکہ یہ تو ہمیشہ شفاعت کے ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کی بناء پر امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ نماز جنازہ دوبارہ پڑھی جا سکتی ہے ہم کہتے ہیں کہ آپ کا اس کی نماز جنازہ پڑھنا اس کی قبر کو منور کرنے کے لئے تھا' اور یہ (خاصیت) آپؐ کے علاوہ کسی دوسرے کی نماز جنازہ میں نہیں پائی جا سکتی' پس اس میں تکرار مشروع نہیں ہے کیونکہ فرض صرف ایک دفعہ ہی ادا پایا جاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

توضیح: امام میرکؒ فرماتے ہیں: جان لیجئے کہ ''إن هذه القبور'' سے آخر حدیث تک کے الفاظ میں امام مسلم منفرد ہیں۔

چالیس موحد آدمیوں کے جنازے میں حاضر ہونے کی فضیلت

۱۶۲۰:وَعَنْ كُرَيْبٍ مَّوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ مَاتَ لَهُ ابْنٌ بِقُدَيْدٍ اَوْ بِعُسْفَانَ فَقَالَ يَاكُرَيْبُ اُنْظُرْ مَا اجْتَمَعَ لَهُ مِنَ النَّاسِ قَالَ فَخَرَجْتُ فَاِذَا اُنَاسٌ قَدِ اجْتَمَعُوْا لَهُ فَاَخْبَرْتُهُ فَقَالَ تَقُوْلُ هُمْ اَرْبَعُوْنَ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَخْرِجُوْهُ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَّمُوْتُ فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهٖ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا لَا يُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيْهِ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٥٥/٢ حديث رقم (٥٩۔ ٩٤٨)۔ وابن ماجه ٤٧٧/١ حديث رقم ١٤٨٩۔ واحمد في المسند ٢٧٧/١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام حضرت کریبؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا مقام قدید میں یا عسفان میں فوت ہو گیا۔ یہ دونوں جگہوں کے نام ہیں اور مکہ کے قریب ہیں پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دیکھو اس کی نماز جنازہ کے لیے کس قدر لوگ جمع ہیں۔ کریبؒ نے کہا میں نکلا تو دیکھا بہت زیادہ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں نے آ کر ان کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ کیا تیرے گمان کے مطابق چالیس آدمی ہو گئے۔ کہا ہاں۔ ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا جنازہ کو نکالو۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جب کوئی مسلمان مر جائے اور اس کی نماز جنازہ میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ میت کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرماتے ہیں۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: کریب: تصغیر کے ساتھ ہے۔

قدید: تصغیر کے ساتھ ہے یہ عسفان کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے۔

او بعسفان: عین کے ضمہ کے ساتھ ہے' راوی کو جگہ کے متعلق شک ہے یہ بات ابن حجرؒ کے قول سے اولیٰ ہے کہ ''شک کریب کی طرف سے ہے'' یہ دونوں جگہیں حرمین کے درمیان ہیں۔

ما اجتمع له: ''ما'' موصولہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''ما'' بمعنی ''من'' ہو۔

تقول: خطاب کے صیغہ کے ساتھ ہے' بمعنی "تظن" اور ابن حجر کا یہ کہنا: "فقال کریب: یقول لی ابن عباس" روایت و درایت کے مخالف ہے۔

قال نعم: ظاہر کلام کا تقاضا ہے کہ وہ "قلت نعم" کہتے چنانچہ موجودہ تعبیر میں تجرید ہے۔

قولہ: ما من مسلم...... :

کہا گیا ہے کہ اس عدد کو خاص کرنے کی حکمت کہ چالیس افراد کبھی بھی اکٹھے نہیں ہوئے مگر ان میں ایک اللہ کا ولی تو ہوتا ہی ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمدؒ ابوداؤدؒ اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

۱۶۶۱: وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ مَيِّتٍ تُصَلِّيْ عَلَيْهِ اُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَبْلُغُوْنَ مِائَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُوْنَ لَهٗ اِلَّا شُفِّعُوْا فِيْهِ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٢٨/٣۔ حديث رقم ١٣٦٧۔ ومسلم في صحيحه ٦٥٥/٢ حديث رقم (٦٠۔ ٩٤٩)۔ والترمذي في السنن ٣٧٣/٣۔ حديث رقم ١٠٥٩۔ والنسائي ٤٩/٤ حديث رقم ١٩٣٢۔ واحمد في المسند ٢٨١/٣۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں جب میت کی نماز جنازہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پڑھے جن کی تعداد سو کو پہنچ جائے۔ تو سب اس کے لیے شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت میت کے حق میں قبول ہو جائے گی۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن النبی: اور ایک صحیح نسخہ میں "أن النبی" ہے۔

ما من میت: مسلم کی قید بھی ہے' جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔

شفعوا: مبنی للمجہول ہونے کی بنا پر "فاء" پر تشدید ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیث عائشہ اور حدیث کریب میں کوئی تضاد نہیں اس جیسے مقام میں (تطبیق کا) راستہ یہ ہے کہ عدد اقل' عدد اکثر سے مؤخر ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی وجہ سے مغفرت کا وعدہ کرتا ہے تو سنت اللہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے بعد فضل موعود میں کمی کرے' بلکہ وہ بطور تفضل اپنا فضل زیادہ ہی کرتا ہے یہ دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بندوں پر بہت زیادہ ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد کثرت ہو چونکہ عدد کا کوئی مفہوم نہیں ہے ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے: "ما من مسلم یموت فیصلی علیه ثلاثة صفوف من المسلمین إلا أوجب" یعنی اس کو بخش دیا جائے گا جیسا کہ ایک روایت میں ("غفرلہ") ہے۔

حدیث میں دلالت ہے کہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم مردوں کے لئے تاکیدی ہے آپ کا جنازہ صحابہ کرامؓ میں سے پہلے مردوں نے پڑھا حتی کہ جب وہ فارغ ہو گئے تو پھر بچوں نے پڑھا پھر اسی طرح عورتوں نے پڑھا' اس کے بعد غلاموں نے اسی

طرح پڑھا۔ جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

ابن عبدالبرؒ نے اہل سیر کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ آپ کی نماز جنازہ افراداً ادا کی گئی تھی اس سے ابن دحیہ کے انکار کارد بھی ہوجاتا ہے‘ امام شافعیؒ نے کہا ہے: لعظيم امره وتنا فسهم فى أن لاينوى الامامة فى الصلاة عليه احدامام شافعی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے کہ اس لئے قوم کی امامت کے لئے امام کا تعین نہ ہوا کہ اگر کوئی ایک نماز کے لیے آگے ہوجاتا بطور امام تو وہ ہر چیز میں مقدم ہوجاتا اور خلافت کے لیے اُس کی تعیین ہوجاتی۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ بصورت جماعت نماز جنازہ پڑھی تھی اور ان کی امامت حضرت ابوبکر صدیق نے کروائی تھی۔

ایک قول یہ ہے کہ کئی جماعتیں ہوئی تھیں‘ چونکہ مسلم کی روایت میں ہے: انهم صلوا عليه افذ اذًا اى جماعات بعد جماعات۔ کئی ایک جماعتوں نے علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ پڑھی یعنی ایک کے بعد دوسری جماعت نے پڑھی "افذاذ" ذال معجمہ کے ساتھ ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں مسلمؒ کے علاوہ کی روایت میں ''افراد'' راء کے ساتھ ہے یا ''اِرسالاً'' ہے ان میں سے ہر ایک یہ بیان کررہا ہے کہ "افذاذا" سے مراد ہے ''جماعات'' ہے۔

اس کا دفاع اس طرح ممکن ہے کہ ''افراد'' اور ''اِرسال'' سے مراد "افذاذ" کا معنی ہے کہ منفرد جماعت نہیں تھی بلکہ کئی منفرد جماعتیں تھیں چونکہ "رسل" سے مراد ہر چیز کا یا اونٹ اور بکری کا گلہ ہوتا ہے‘ اس کی جمع ''ارسال'' ہے جیسا کہ قاموس میں ہے اور نھایہ میں ہے ''ارسالا'' بمعنی ا''فواج'' (جماعت گروہ)

لوگوں کے تذکرے کی بنا پر میّت کے ساتھ سلوک (جنت یا دوزخ)

۱۶۶۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرُّوْا بِجَنَازَةٍ فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا خَيْرًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَبَتْ ثُمَّ مَرُّوْا بِاُخْرٰى فَاَثْنَوْا عَلَيْهَا شَرًّا فَقَالَ وَجَبَتْ فَقَالَ عُمَرُ مَا وَجَبَتْ فَقَالَ هٰذَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْرًا فَوَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَهٰذَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرًّا فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ (متفق عليه وفى روائة) اَلْمُؤْمِنُوْنَ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ۔ [متفق عليه]

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک جنازے پر گزرے۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا واجب ہوئی۔ پھر وہ دوسرے جنازے پر گزرے پس انہوں نے اس کا برائی کے ساتھ تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا واجب ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا واجب ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کی تم نے تعریف کی اس کے لیے جنت اور جس شخص کا تم نے برائی کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کے لیے دوزخ واجب ہوچکی ہے۔ پس تم زمین میں اللہ کے گواہ ہوجاؤ۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ مؤمن زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔

تشریح: قوله :بجنازة فاثنو عليها: یعنی اس کے اوصاف حمیدہ اور خوش اخلاقی کا ذکر کیا چنانچہ ''خیرا'' تاکید ہے

'یا توھم کا دفعیہ ہے۔

قوله :فقال النبی ﷺ وجبت: اس کے لیے جنت ثابت ہوگئی'یعنی بشرطیکہ جوانہوں نے اس کی تعریف کی وہ صحیح ہو یا اس کی وفات اسی پر ہوئی ہے۔

فاثنوا علیها شرا: ''شر'' میں ''ثنا'' کا استعمال مشاکلت یا تہکم کے طور پر ہے اور ممکن کہ ''اثنوا'' دونوں جگہوں میں ''وصفوا'' کے معنی میں ہو'تو اس وقت قید کی ضرورت ہوگی چنانچہ قاموس میں ہے کہ ثناء مدح وصف ذم کو کہتے ہیں یا مدح کے ساتھ خاص ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں: اگر کہا جائے کہ ثناء بالشر کو کیسے ممکن بنایا حالانکہ صحیح حدیث ہے بخاری شریف میں جس میں مردوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں: نہی غیر منافقین و کفار اور ان کے حق میں ہے جن کا فسق و بدعت ظاہر نہ ہو اور جہاں تک بات ہے ان کی تو ان کو برا بھلا کہنا حرام نہیں ہے تا کہ ان کی پیروی کرنے سے لوگ بچیں وہ فاسق اور بدعتی کہ جن کا فسق و بدعت واضح ہو'محل کلام ہیں'چونکہ ان کی مذمت کا جواز ان کی زندگی کے ساتھ ہے تا کہ وہ باز آ جائیں یا لوگ ان سے احتراز کریں ان کی موت کے بعد کوئی فائدہ نہیں جب کے احتمال ہے کہ ان کی موت توبہ کے بعد واقع ہوئی ہو اسی وجہ سے جمہور نے یزید' حجاج اور مخصوص متعین بدعتیوں پر لعنت کرنے سے منع کیا ہے مزید یہ کہ حدیث میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے جو ان ان کو برا بھلا کہنے پر دلالت کرے۔

اولیٰ یہ ہے کہ اس کو آپؐ کے اس فرمان کے معارض قرار دیا جائے: لا تذكروا هلكاكم إلا بخير اور اگر اس مذمت کو کفار اور منافقین پر محمول کیا جائے تو تعارض باقی نہیں رہتا۔

ابن الملک فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ یہ حکم ورود نہی سے پہلے کا ہو۔

قوله فقال وجبت: یعنی اُس کے لیے آگ ثابت ہوگئی۔

مظہرؒ فرماتے ہیں یہ حکم عام نہیں ہے کہ جس کے بارے میں کوئی جماعت خیر وشر کی شہادت دے (وہ اسی حکم میں ہے) بلکہ اول کے لئے جنت کی امید رکھی جائے گی اور ثانی کے بارے میں جہنم کا اندیشہ ہوگا رسول اللہ ﷺ نے جو یقین کے ساتھ جنت اور جہنم کا حکم لگایا اس کی بنیاد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس پر مطلع کر دیا تھا۔

قوله: فقال عمر ما وجبت: یعنی ''وجبت'' فرمانے سے آپ کی کیا مراد ہے دونوں جگہوں میں ''وَجَبَتْ'' کہنے سے حضرت عمرؓ اس بات کی تصریح کروانا چاہتے تھے جو قیام قرینہ سے سمجھ آ رہی ہے۔

فقال: اور ایک صحیح نسخہ میں ''قال'' ہے۔

قوله: هذا أمنيتم عليه خيرا ـــــ

زین العرب فرماتے ہیں: ثنائے خیر وشر کے ساتھ جنت اور جہنم واجب نہیں ہوتی بلکہ یہ علامت ہے کہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے (یعنی اہل جنت یا اہل جہنم میں سے ہے)

قوله أنتم شهداء الله فى الأرض: یہ خطاب صحابہ سے ہے یا مؤمنین سے ہے) یہ اضافت تشریفی ہے ان کا مقام و

مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بلند ہے یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کی امت کے لیے تزکیہ ہے صاحب جنازہ کے لیے گواہی دینے کے بعد ان کی عدالت کا اظہار ہے پس ضروری ہے کہ اس کے حق میں کوئی اثر اور نفع ہو اور اللہ تعالیٰ ان کی شہادت کو قبول کرتا ہے اور جس کی تعریف کی گئی ہے اس کے حق میں ان کے اس ظنون کو سچ ثابت کرتا ہے بطور ان پر کرامت اور تفضل کے جیسا کہ دعا اور شفاعت پس ان کے لیے وعدہ یا وعید کے پر یق پر جنت یا جہنم واجب کرتا ہے اس کا وعدہ حق ہے وہ ضرور پورا ہوگا' وہ واجب کی طرح ہے چونکہ عمل اور شہادت کا وجوب میں کوئی اثر نہیں ہے حدیث کے مطلب کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اشارہ کر رہا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

[البقرہ:۱۴۳]

''یعنی ہم نے تم کو بہترین عادل اور چنے ہوئے گواہ بنایا ہے تاکہ تم دوسروں پر گواہی دو اور رسول تمہارے لیے نگہبان تمہارا تزکیہ کرنے والا اور تمہاری عدالت بیان کرنے والا ہے۔''

ابن الملک فرماتے ہیں: اس حدیث سے یہ مستفاد ہو رہا ہے کہ ان کی شہادت کا ان کے نفع میں دخل ہے وگرنہ ثناء کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس کی تائید اس مروی حدیث سے ہوتی ہے: **انه صلى الله عليه وسلم قال حين اثنوا على جنازة جاء جبريل وقال: يا محمد ان صاحبكم ليس كما يقولون انه كان يعلن كذا وليسر كذا ولكن الله صدقهم فيما يقولون وغفرله مالا يعلمون** ''کہ جب صحابہ نے ایک میت کی تعریف کی تو جبریل امین آئے اور کہا: اے محمد! بلاشبہ تمہارا یہ ساتھی ویسا نہیں ہے جیسا وہ کہہ رہے ہیں وہ اعلانیہ ایسا تھا اور باطن میں ایسا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُس میں انہیں سچا کر دیا جو وہ کہہ رہے تھے اور اس میت کی خطاؤں کو معاف کر دیا ہے جو وہ نہیں جانتے تھے۔''

میں کہتا ہوں گویا یہ نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندہ کی پردہ پوشی کا اور اسی وجہ سے ہم گناہوں کو چھپانے پر مامور ہیں اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ معاملہ اکثری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زبانوں سے ہر شخص کے بارے میں اس کی وہ پوشیدہ باتیں کہلواتا ہے جن پر اس کے علاوہ کوئی اور مطلع نہیں اسی لیے کہا گیا ہے: ''مخلوق کی زبانیں حق کے اقلام ہیں'' یہ مراد نہیں کہ جو جنت کے لیے پیدا کیا گیا وہ ان کے قول کی بدولت جہنم میں چلا جائے گا اور نہ ہی اس کے برعکس ہے کیونکہ کبھی بندہ کی تعریف ہوتی ہے اور کبھی برائی بیان کی جاتی ہے حالانکہ باطنی معاملہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ثناء اکثر واقع کے مطابق ہونے کی علامت ہے واللہ اعلم۔

مظہر فرماتے ہیں: آپ کے اس قول ''**انتم شهداء الله**'' کا معنی یہ نہیں کہ ہے صحابہ اور مؤمنین جس شخص کے متعلق اس کے جہنم یا جنت کے مستحق ہونا کا کہہ دیں گے وہ ان کے قول کی بدولت جنت یا جہنم کا مستحق ہو جائے گا۔ (یعنی ان کے کہنے سے جنتی جہنم والوں میں سے نہیں ہو جائے گا اور جہنمی جنتی نہیں ہو جائے گا) بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اُس کی جو تعریف کی ہے انہوں نے اس کی زندگی میں اس کی صلاح اور نیکیوں کو دیکھا ہے اور خیرات وصلاح آدمی کے اہل جنت میں سے ہونے کی علامت ہے اور جس کی انہوں نے برائی بیان کی ہے اس سے انہوں نے شر اور فساد دیکھا ہے اور شر وفساد اہل نار کی علامت ہے' کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ کسی کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ جنتی ہے یا جہنمی ہے اگرچہ ایک بڑی

جماعت اس کے لیے گواہی دے بلکہ جنت کی امید کی جا سکتی ہے جس کے متعلق خیر کی گواہی دی گئی ہے اور اس اس شخص کے بارے میں نار کا اندیشہ ہے جس کے متعلق جماعت نے شر کی گواہی دی ہے۔

تخریج و توضح: امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ الفاظ بخاری کے ہیں امام ابوداؤد اور نسائی نے اسی طرح کی حدیث حضرت ابوہرہؓ کے حوالہ سے بیان کی ہے۔

قوله: وفي رواية المؤمنون ...... : احتمال ہے کہ (المؤمنین میں) لام عہد کے لیے ہو اور مراد ان سے صحابہ ہوں چنانچہ یہ سابقہ قول ''انتم'' کے موافق ہو جائے گا اور ایک احتمال یہ ہے کہ جنس کے لیے ہو اور ''انتم'' میں خطاب امت موجودہ ولا حقہ سے ہو۔

شهداء الله: اضافت تشریفیہ ہے اس میں اشارہ ہے کہ قبول شہادت میں ان کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص رتبہ ہے۔

في الأرض: اس میں اشارہ ہے کہ مؤمنین بمنزلہ مقربین فرشتوں کے ہیں جو بندوں کے اعمال پر آسمان میں مطلع ہوتے ہیں۔

مؤمنوں کی گواہی پر جنت کا فیصلہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانی

۱۶۶۳: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّمَا مُسْلِمٍ شَهِدَ لَهٗ أَرْبَعَةٌ بِخَيْرٍ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ قُلْنَا وَثَلَاثَةٌ قَالَ وَثَلَاثَةٌ قُلْنَا وَاثْنَانِ قَالَ وَاثْنَانِ ثُمَّ لَمْ نَسْأَلْهُ عَنِ الْوَاحِدِ۔

[رواه البخاري]

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۲۹/۳ حديث رقم ۱۳٦۸۔ والنسائي في السنن ٥۰/٤ حديث رقم ۱۹۳٤۔ واحمد في المسند ۲۲/۱۔

ترجمه: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا جس مسلمان کے حق میں چار شخص بھلائی کی گواہی دیں اللہ تعالیٰ اس کو بہشت (جنت) میں داخل کرے گا۔ ہم نے کہا اگر تین شخص گواہی دیں تو پھر بھی جنت میں داخل کرے گا؟ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا اگر تین آدمی بھی گواہی دیں تب بھی داخل کریگا اور ہم نے کہا اگر دو آدمی گواہی دیں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا دو بھی پھر ہم نے ایک شخص کی گواہی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: أيما مسلم شهد له اربعة بخير ادخله الله الجنة: یعنی اس کی اچھی تعریف کی۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: کہا گیا ہے: احتمال ہے کہ آپؐ کی مراد گواہی دینے سے یہ ہو کہ چار آدمی اس کی نماز جنازہ ادا کریں اس کے لئے دعا کریں اور اس کی شفاعت کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو قبول فرمائے گا۔

أدخله الله الجنة: یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اس کی خیر وصلاح کے سبب سے اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

اور کبھی بندے کے ذمہ گناہ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اُس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور مؤمن بندوں کا اس کے بارے میں

صالح ہونے کا جو گمان ہوتا ہے وہ اس گمان کو سچ کرتے ہوئے اُس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے: السنة الخلق أقلام الحق قصہ مختصر کہ یہ حدیث ترغیب وترہیب کو متضمن ہے۔

قوله: قال و ثلاثة: ای و كذالك ثلثة یعنی تین بھی اسی طرح ہیں کہا گیا ہے کہ یہاں اور اس کے ماقبل میں عطف ''تلقین'' کے لیے ہے۔

قوله: ثم لم نسأله عن الواحد: یہ تائید ہے اس بات کی جو ہم نے پہلے بیان کی ہے پھر دو پر اقتصار کی حکمت شاید یہ ہے کہ دو شہادت کا عام نصاب ہے (گواہی کے لیے کم از کم دو آدمی ہوں) اور اس میں اشارہ ہے اس بات کے رد کی طرف کہ ''شہادت'' سے مراد ''نماز جنازہ'' ہے کیونکہ ایک شخص کے نماز جنازہ پڑھنے سے فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہے۔

میت کو برا مت کہو

۱۶۶۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰى مَا قَدَّمُوْا۔ [رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۵۸/۳۔ حدیث رقم ۱۳۹۳۔ والنسائی فی السنن ۵۳/۴ حدیث رقم ۱۹۳۶۔ والدارمی ۳۱۱/۲ حدیث رقم ۲۵۱۱۔ واحمد فی المسند ۱۸۰/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مردوں کو برا مت کہو۔ تحقیق وہ اس چیز کا بدلہ پالیں گے جو انہوں نے آگے بھیجی ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی مردوں پر لعن طعن مت کرو اور برا بھلا مت کہو اگرچہ وہ فاجر ہوں الا یہ کہ وہ کافر ہوں اور ان کی موت قطعی طور پر کفر کی حالت میں ہوئی ہو جیسے فرعون ابوجہل اور ابولہب وغیرہ۔

إلى ما قدموا: ایک دوسرے نسخہ میں "إلى ما قدموه" کے الفاظ ہیں یعنی وہ اپنے اعمال کی جزاء کو پہنچ چکے ہیں یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے خیر وشر کے جو عمل کیے کئے تھے ان کی مجازات کو پہنچ چکے ہیں اور ''جازی'' (یعنی جزاء دینے والا) اللہ ہی ہے پس اللہ تعالیٰ اگر چاہئے تو ان کو معاف کر دے اگر وہ مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو ان کو عذاب دے بسبب اس کے کہ وہ کافر تھے یا فاجر تھے تمہیں اس سے کیا واسطہ (جب کہ) ومن حسن إسلام المرء تركه مالا يعنيه" اور کبھی بعض زندوں کی مذمت بھی جائز ہے اگر اُس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث امام نسائیؒ نے بھی روایت کی ہے۔

تدفین کے وقت قاریٔ قرآن کا اکرام

۱۶۶۵: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى اُحُدٍ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اَيُّهُمْ اَكْثَرُ اَخْذًا لِلْقُرْاٰنِ فَاِذَا اُشِيْرَ لَهٗ اِلٰى اَحَدِهِمَا قَدَّمَهٗ فِي اللَّحْدِ وَقَالَ

اَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَائِهِمْ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُغَسَّلُوْا۔

[رواه البخاری]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱۲/۳۔ حدیث رقم ۱۳۴۷۔ والترمذی فی السنن ۳۵٤/۳ حدیث رقم ۱۰۳٦۔ والنسائی ٦۲/٤ حدیث رقم ۱۹۵۵۔ وابن ماجه ٤۸۵/۱ حدیث رقم ۱۰۳٦۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہدائے اُحد میں سے دو شخصوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر فرماتے تھے کہ ان میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد ہے؟ جب اشارے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کے بارے میں بتا دیا جاتا تو اس کو قبر میں آگے کر دیتے یعنی قبلہ کی جانب گویا کہ وہ قاری ہونے کی وجہ سے امام ہو جاتا اور فرماتے کہ میں قیامت کے دن گواہی دوں گا کہ یا اللہ تیرے راستے میں مارے گئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم فرمایا اور نہ ان پر نماز پڑھی اور نہ ہی ان کو غسل دیا۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قتلی: "قتیل" کی جمع ہے۔

فی ثوب واحد: ایسا کرنا ضرورت کی بنا تھا اس سے ان کے جسموں کا (برہنہ طور پر) ملنا لازم نہیں آتا کیونکہ ممکن ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل کر دی ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی ایک قبر میں نہ کہ ایک کپڑے میں کیونکہ دونوں کو برہنہ کرنا بایں طور کہ ان کے جسم باہم ملتے یہ درست نہیں تھا بلکہ ان کے جسم پر خون سے لتھڑے ہوئے یا بغیر لتھڑے ہوئے کپڑے ہوں گے لیکن ان میں ایک کو ایک ہی قبر میں دوسرے کے پہلو میں لٹا دیا گیا ہو۔

خطابی فرماتے ہیں: دو یا دو سے زیادہ میتوں کو ایک کپڑے میں دفن کرنا ضرورت کے وقت جائز ہے جس طرح کہ ان کو ایک قبر میں دفن کرنا جائز ہے میرکؒ نے یہ "ازھار" سے نقل کیا ہے۔

پھر زیادہ واضح بات یہ ہے کہ "فی ثوب واحد" حال ہے ای کان یجمع بین الرجلین حال کونهما ای کل واحد منهما فی ثوب واحد الخ۔ یعنی دو آدمیوں کو جمع کر رہے تھے اس حال میں کہ وہ دونوں یعنی ان میں سے ہر ایک ایک کپڑے میں تھا اور یہ وہ کپڑا تھا جو صرف اس کے جسم پر پورا آتا تھا اس سے زائد نہ تھا۔

رہا ان دونوں کو ایک قبر میں جمع کرنا تو یہ اگلے کلام "ثم یقول ایهم......" سے مستفاد ہو رہا ہے۔

اللحد: لام کے فتحہ وضمہ اور حاء کے سکون کے ساتھ قبلہ کی جانب چوڑائی میں کھودی گئی قبر۔

چونکہ قرآن ہر مسلمان کے لیے امام ہے اور اس طرح قاری قرآن بھی امام ہے دنیا اور آخرت میں تقدم کا حقدار ہے اور جنت ماویٰ میں بلند درجات کا حقدار ہوگا۔

قوله: أنا شهيد على هؤلاء يوم القيامة:

یعنی قیامت کے دن میں ان کی سفارش کروں گا اور ان کی تعریف کروں گا مظہرؒ فرماتے ہیں: یعنی میں ان کی شفاعت کروں گا اور میں گواہی دوں گا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا تھا۔

اس بات کی طرف بھی (شارح) نے اشارہ کیا ہے کہ "على" لام کے معنی میں ہے امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا "على" کے ساتھ متعدی کرنا اس معنی کا رد کر رہا ہے لیکن اس کو تضمین کے ذریعہ سے رد کرنا ممکن ہے اور اسی قبیل سے اللہ جل شانہ کے یہ ارشادات گرامی ہیں: [والله على كل شئ شهيد] [المجادلة:٦] [كنت أنت الرقيب عليهم وأنت على كل شئ شهيد] [المائدة:١١٧] چنانچہ مراد یہ ہے کہ "أنا حفيظ عليهم...... میں ان کے احوال پر نگہبان ہوں اور ان کو "مکارہ" سے بچاتا ہوں طیبیؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے لیکن یہ کلام شہداء کی نسبت سے از روئے معنی صحیح نہیں جیسا کہ مخفی نہیں۔

وأمر بد فنهم بد مائهم: دوسری "باء" مصاحبت کے معنی کے لیے ہے۔

ولم يصل عليهم: اصول معتمدہ میں لام کے کسرہ کے ساتھ ہے' اور یہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا عطف "أمر" پر ہے رہا ابن حجر کا یہ قول کہ "بخاری کی روایت میں اسی طرح لام کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے" تو اس کی صحت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔

امام طیبی کہتے ہیں: پس معلوم ہوا کہ شہید کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو پیچھے گذر چکی ہے اور ترجیح نماز جنازہ کو دی گئی ہے یا تو اس کے اثبات کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس میں احتیاط کا پہلو ہے یا اصل کی طرف رجوع کی وجہ سے' کہ تساقط کے وقت اصل کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ البتہ آپ کا حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھنا مزید رأفت کے لئے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ (دعوی) فی الجملہ اس طرح مکمل ہوتا ہے کہ یہ نماز صرف حضرت حمزہؓ پر ہی ہوتی حالانکہ آپ نے تمام شہداء کی نماز جنازہ پڑھی تھی' جیسا کہ ماقبل میں گذر چکی ہے اور حضرت حمزہؓ کی خصوصیت آنحضرتؐ کی بہت ہی شفقت و رحمت تھی کہ آپؐ نے ان کی نماز جنازہ ان کے تئیس کی نمازہ جنازہ ستر مرتبہ پڑھی۔

اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے آٹھ سال کے بعد دوبارہ اُسی طرح نماز جنازہ پڑھی جیسے میت پر پڑھتے تھے اور گویا کہ آپؐ نے ان کو الوداع کیا۔

اور "صلوٰۃ" کی تاویل "دعا" کرنا صحیح نہیں ہے' اور دلیل یہ الفاظ ہیں "صلاته على الميت" یہ معنی مجازی مراد ہونے پر رد ہے چنانچہ ابن حجرؒ کا یہ قول رد ہو جاتا ہے کہ "اس کو دعا پر محمول کرنا متعین ہے' جیسے میت کے لیے دعا کی جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک تین دن کے بعد قبر پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور ہمارے نزدیک یہ آپ کے خصائص پر محمول ہے۔

قوله: ولم يغسلوا: اس پر علماء کا اتفاق ہے اس کی موافقت امام احمدؒ کی ذکر کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے: **أنه نهى عن تغسيلهم** اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ ہر زخم، رگڑ اور خون سے قیامت کے دن کستوری کی خوشبو مہک رہی ہو گی اور یہ (حدیث) بھی صحیح ہے کہ حضرت حنظلہ اس حال میں شہید ہوئے تھے کہ وہ جنبی تھے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غسل نہیں دیا اور آپ نے فرمایا میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ انہیں غسل دے رہے تھے اگر غسل دینا واجب تھا تو ہمارے کرانے ساقط ہوتا۔

جنازے کے ساتھ پیدل چلنا

۱۶۶۶: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِفَرَسٍ مَّعْرُوْرٍ فَرَكِبَهُ حِيْنَ انْصَرَفَ مِنْ جَنَازَةِ ابْنِ الدَّحْدَاحِ وَنَحْنُ نَمْشِي حَوْلَهُ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۶۶۴ حدیث رقم (۸۹۔ ۹۶۵)۔ وابوداؤد فی السنن ۳/۵۲۱ حدیث رقم ۳۱۷۸۔ والترمذی ۳/۳۳۴ حدیث رقم ۱۰۱۳۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بغیر زین کے گھوڑا لایا گیا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سوار ہوئے اس وقت کہ جب ابن دحداح کے جنازے سے لوٹے اور ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد چل رہے تھے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: أتي النبيُّ بفرس معرور:

أتي: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

فرس معروز: ای عارمن السرج وغیرہ بلازین کے گھوڑا' امام طیبی کہتے ہیں: "اعروری الفرس" یعنی اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوا "فارس" کو معرور "فرس" کو معروری" کہتے ہیں' یہ قیاس ہے' لیکن روایت کسرہ کے ساتھ صحیح ہے۔ مختصر نہایہ میں ہے کہ "فرس معروری" بصیغۂ مفعول ہے' جس پر زین وغیرہ نہ ہو اعروری الفرس اعروريته ركبته عريانا لازم اور متعدی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تقدیری عبادت یوں ہو: فهو ايا لاتى بالفرس معرور' امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ راء کے فتحہ اور تنوین کے ساتھ ہے' بہر حال ابن حجرؒ کا یہ قول مردود ہے کہ "یہ رد ہے ان پر جو کہتے ہیں کہ روایت کسرہ کے ساتھ ہے اور قیاس کے لحاظ سے فتحہ ہے" ارباب طبع معقول وذوق مقبول کے ہاں اس کی وجہ رد مخفی نہیں۔

قوله: فركبه حين انصرف...... :

راوی حدیث:

ابن دحداح: "دحداح" دال کے فتحہ کے ساتھ ہے شعبہ اور عبد بن حمید کے طرق سے مروی امام ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں "ابن الدحداح" ہے امام احمدؒ کی روایت میں "ابی الدحداح" ہے دوسری روایت میں "ام الدحداح" اور "ابو الدحداح" ہے ان کا نام ونسب معروف نہیں ہے صرف اتنی بات معلوم ہے کہ یہ انصار کے حلیف تھے ابی الدحداح کی مذکورہ روایت پر اس روایت سے اشکال لازم آتا ہے جس کو ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ "وہ امیر معاویہ کے زمانے تک زندہ رہے" ہاں "ثابت بن الدحداح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فوت ہوئے تھے ان کی کنیت "ابوالدحداح" تھی لیکن "الاصابہ" میں ہے: حق بات یہ ہے کہ وہ ان کے علاوہ کوئی اور تھے۔

ابن الملک فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ جنازے سے واپسی پر سوار ہونا جائز ہے اس پر اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے آپ عذر کی وجہ سے سوار ہوئے ہوں لیکن آگے آنے والی دلیل قولی مطلق جواز پر دلالت کرتی ہے علماء کہتے ہیں: جنازہ سے

واپسی پر سوار ہونا مکروہ نہیں اس پر علماء کا اتفاق ہے (عدم کراہت کی وجہ یہ ہے) چونکہ عبادت (یعنی نماز جنازہ اور تدفین وغیرہ) کی ادائیگی ہو چکی ہے۔

قولہ: و نحن نمشی حولہ: یعنی ہم میں بعض آپ کے آگے، بعض آپ کے پیچھے، بعض آپ کے دائیں اور بعض آپ کے بائیں تھے۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے۔

الفصل الثانی:

جنازے کے ساتھ چلنے کا طریقہ

۱۶۶۷: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ ابْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلرَّاكِبُ يَسِيْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ يَمْشِيْ خَلْفَهَا وَاَمَامَهَا وَعَنْ يَّمِيْنِهَا وَعَنْ يَّسَارِهَا قَرِيْبًا مِنْهَا وَالسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَيُدْعٰى لِوَالِدَيْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ (رواه ابو داود وفى رواية احمد والترمذى والنسائى وابن ماجة) قَالَ الرَّاكِبُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ حَيْثُ شَاءَ مِنْهَا وَالطِّفْلُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَفِى الْمَصَابِيْحِ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ زِيَادٍ۔

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٥٢٢/٣ حديث رقم ٣١٨٠۔ والترمذى فى السنن٣٤٩ حديث رقم ١٠٣١۔ والنسائى ٥٥/٤ حديث رقم ١٩٤٢۔ وابن ماجه ٤٧٥/١ حديث رقم ١٤٨١۔ واحمد فى المسند ٢٤٧/٤۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سوار جنازے کے پیچھے چلے اور پیدل چلنے والا اس کے پیچھے چلے اور آگے چلے اور اس کے دائیں بائیں چلے اور کچے بچے (یعنی ناتمام بچے) کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اس کے ماں باپ کے لیے اگر دونوں مسلمان ہوں، بخشش و رحمت کی دعا کی جائے۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ احمد، ترمذی اور نسائی، ابن ماجہؒ کی ایک روایت کے اندر اس طرح ہے فرمایا سوار جنازے کے پیچھے چلے اور پیادہ (پیدل چلنے والا) جس طرف چاہے چلے اور لڑکا مر جائے تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور مصابیح میں روایت مغیرہ بن زیاد سے ہے۔

راویٔ حدیث:

المغیرۃ بن شعبہ: یہ ثقفی غزوہ خندق والے سال مسلمان ہوئے مہاجر ہو کر آئے اور کوفہ میں قیام کیا، اور یہیں سن ۵۰ھ میں فوت ہوئے ان کی عمر ستر (۷۰) سال تھی اور یہ معاویہ بن ابوسفیانؓ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے ان سے بہت سے افراد روایت کرتے ہیں مؤلفؒ نے انہیں صحابہ میں ذکر کیا ہے اور ان کے علاوہ کسی دوسرے مغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔

تشریح: **قولہ:** ان النبی ﷺ قال: الراکب یسیر خلف الجنازۃ: یہ عذر پر محمول ہے یا یہ واپسی کے ساتھ

مفید ہوگا جیسا کہ عنقریب آگے آرہا ہے۔

قولہ: والماشي يمشي خلفها۔۔۔قريبا منها: پیچھے چلنا ہمارے نزدیک افضل ہے۔

اور امام شافعیؒ کے نزدیک آگے چلنا اور دائیں بائیں چلنا بھی جائز ہے اور آگے چلنا اُفضل ہے۔

اس کی چاروں جانب اُس کے قریب رہنا یہ افضل ہے تاکہ میت کو ضرورت کے وقت اُٹھانے میں مدد کر سکے گا اور اس لئے بھی افضل ہے کہ اس میں آخرت کے معاملے کی زیادہ یاددہانی ہے۔

قولہ: والسقط يصلى عليه: والسقط سین کی تثلیث کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے قاموس میں ہے: ''سقط'' مثلثہ ہے ایسا بچہ جو نامکمل ہو۔ اس کی تائید اگلے الفاظ ''یصلی علیہ'' سے ہورہی ہے مظہر فرماتے ہیں: اس پر نماز جنازہ اس وقت پڑھی جائے گی جب وہ چیخے چلائے اور پھر مرجائے یہ موقف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی کا ہے امام احمد فرماتے ہیں: جب وہ پیٹ میں چار مہینے اور دس دن کا ہو جائے اور اس میں روح پڑ جائے اگرچہ وہ چیخا چلایا نہ بھی ہو۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: ''استہلال'' وہ ہے جس سے زندگی پر دلالت ہو (مثلاً) عضو کو حرکت دینا یا آواز بلند کرنا اس میں اعتبار اس بات کا ہے کہ اس کے اکثر حصہ کا خروج بحالت حیات ہوا ہو یہاں تک کہ اگر اکثر حصہ نکل آیا اور وہ حرکت کر رہا تھا تو اُس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اگر کم حصہ خارج ہونے تک زندہ تھا تو نہیں پڑھی جائے گی امام نسائی نے روایت بیان کی ہے:

عن المغيرة بن مسلم عن أبي الزبير عن جابر: اذا استهل الصبي صلى عليه وورث ۔''جب بچہ چلائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وہ وارث بھی بنے گا''۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں: ''وللمغيرة بن مسلم غير حديث منكر''۔

اور امام حاکم نے اس کو عن سفیان عن ابی الزبیر روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اسناد صحیح ہے۔

اور جابرؓ سے بطریق مرفوع مروی ہے۔ ''الطفل لايصلى عليه ولا يورث حتى يستهل'' اس حدیث کو ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے امام ترمذیؒ کہتے ہیں: یہ موقوف اور مرفوع دونوں طرح روایت کی گئی ہے اور موقوف زیادہ صحیح ہے آپ نے بہت مرتبہ سنا ہے کہ وقف پر رفع کو مقدم کرتے ہیں نہ کہ احفظ و اکثر کی بناء پر ترجیح دیتے ہیں اصل ضبط وعدالت کے وجود کے بعد اور جہاں تعلق ہے اس حدیث کے معارضہ کا اس حدیث سے جس کو ترمذی نے مغیرہ سے نقل ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''السقط يصلى عليه'' تو یہ معارضہ ساقط ہے کیونکہ حصر تعارض کے وقت اطلاق پر مقدم ہوگا۔

قولہ: يدعى لوالديه ...... : اگر وہ دونوں مسلمان ہوں۔

بالمغفرة: دوسری روایت میں ''بالعافية'' کے الفاظ ہیں۔

میرکؒ نے ازھار سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اس پر اقتصار نہیں ہے بلکہ اس کے لیے (یہ دعا کرنا) واجب ہے اور ان دونوں کے لیے یہ (دعا کرنا) مستحب ہے: ''اللهم اجعله شفيعًا لأبويه و سلفا و ذخرا وعظة واعتبارا و ثقل به موازينهما وافرغ الصبر على قلوبهما ولا تفتنهما بعده واغفر لهما وله''۔

ہمارے نزدیک پہلی تکبیر کے بعد یہ پڑھنا اولیٰ ہے: سبحانك اللهم و بحمدك...... دوسری تکبیر کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے' وہ درود جو نماز میں تشہد کی حالت میں پڑھا جاتا ہے تیسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھے: اللهم اغفر لحينا...... جیسا کہ عنقریب آگے رہا ہے اگر (جنازہ) بچہ کا ہو تو یہ دعا پڑھے: اللّٰهم اجعله لنا فرطا و اجعله لنا ذخرا' و اجعله لنا شافعا مشفعا۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

قوله: قال: الراكب خلف الجنازة: یعنی چلتا ہے۔

اس کی اسناد صحیح ہونے کی بنا پر رافعی نے شرح مسند میں' خطابی کی طرح اس بات پر اتفاق نقل کیا ہے کہ سوار کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ جنازے کے پیچھے چلے اور امام نوویؒ کا یہ قول عجیب ہے جو انہوں نے ''الروضۃ'' اور ''مجموع'' میں جمہور علماء سے نقل کیا ہے کہ افضل یہ ہے کہ وہ آگے چلے اگرچہ سوار ہو' خواہ عذر کی وجہ سے سوار ہو یا بغیر عذر کے سوار ہو کیونکہ آپ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپؐ جنازے کے آگے چلتے تھے غرابت کی وجہ ظاہر ہے اس لیے کہ یہ وارد نہیں ہوا ہے کہ ''آپ سواری کی حالت میں جنازے سے آگے تھے''۔ اگر یہ وارد ہوا ہے' اور صحیح ہے تو معارض ہوگا اور مرجح کا محتاج ہوگا۔

قوله: والطفل يصلى عليه: قاموس میں ہے: ''طفل'' کسرہ کے ساتھ' ہر چیز کا چھوٹا' مولود۔

قوله: و فى المصابيح عن المغيرة بن زياده:

قاضی اور تورپشتی فرماتے ہیں کہ ''عن المغيرة بن زياده'' یہ سہو ہے شاید یہ کاتب کی غلطی ہے چونکہ طبقہ صحابہ اور تابعین میں اس نام اور نسب کا کوئی بھی نہیں ہے امام میرکؒ فرماتے ہیں یہ ابوداؤد میں حدیث سنن ابی داؤد میں عن زياد بن جبير عن أبيه عن المغيرة بن شعبة روایت کی گئی ہے چنانچہ مصابیح میں جو (سند) مروی ہے وہ کتابت کا ضبط ہے۔

جنازے سے آگے چلنے پر شیخین کا عمل

۱۶۶۸: وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ يَمْشُوْنَ اَمَامَ الْجَنَازَةِ ۔ (رواه احمد وابوداد وابن ماجة وقال الترمذى واهل الحديث كانهم يرونه مرسلا)

اخرجه ابوداوٗد فى السنن ۵۲۲/۳۔ حديث رقم ۳۱۷۹۔ والترمذى فى السنن ۳۲۹/۳ حديث رقم ۱۰۰۷۔ والنسائى ۵۶/۴ حديث رقم ۱۹۴۴۔ وابن ماجه ۴۷۵/۱ حديث رقم ۱۴۸۲۔ ومالك فى الموطأ ۲۲۵/۱ حديث رقم ۸ من كتاب الجنائز۔ واحمد فى المسند ۸/۲۔

ترجمه: زہری سے روایت ہے کہ سالم نے نقل کی اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا۔ یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جنازے کے آگے چلتے تھے۔ اس کو امام احمد ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ اور نسائی' ابن ماجہؒ اور امام ترمذی اور اہل حدیث اس کو مرسل جانتے ہیں۔

تشریح: وعن الزهری عن سالم عن أبیه: (عبداللہ بن عمر) رضی اللہ عنہما۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے امام شافعیؒ اور اُحمدؒ نے استدلال کیا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال اگلی حدیث سے ہے۔ جنازے کے پیچھے چلنے کی علت یہ ہے کہ لوگ (غفلت سے) بیدار ہوں اور میت کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں اور جنازہ کے آگے چلنے کی علت یہ ہے کہ وہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف میت کے سفارشی ہیں' اور سفارش کرنے والا اس سے آگے ہوتا ہے۔ جس کی سفارش کی جائے گی۔

میں کہتا ہوں پہلی بات میں اس بات کا اضافہ کر لیا جائے تا کہ بوقت ضرورت جنازہ کو اٹھانے کے لئے وہ مساعدت و معاونت کے لئے تیار رہے اور اس میں اشارہ ہے کہ وہ اس کو وداع کر رہے ہیں اور اشارہ ہے کہ وہ سابقین میں سے ہے اور یہ لاحقین میں سے ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں افضل یہ ہے کہ جنازہ کے ہمراہ جانے والے جنازہ کے پیچھے چلیں اور آگے چلنا بھی جائز ہے' الا یہ کہ اس سے دور ہو یا تمام سے آگے ہو تو مکروہ ہے اور جنازہ کے دائیں بائیں نہ چلا جائے آواز بلند ذکر اور قراءت کرنا مکروہ ہے اور دل ہی دل میں ذکر کر لے' امام شافعیؒ کے ہاں جنازہ کے آگے چلنا افضل ہے سلف کا فعل دو طرح منقول ہے وہ فرماتے ہیں: کہ وہ سفارشی ہیں اور سفارش کنندہ آگے ہوتا ہے تا کہ مقصد کی تمہید باندھ سکے اور ہم کہتے ہیں: کہ لوگ تو جنازہ کے ہمراہ جانے والے ہیں' لہٰذا وہ پیچھے رہیں اور سفارش کرنے والا آگے ہوتا ہے وہ شفاعت کے وقت ''مشفوع لہ'' کے ساتھ نہیں ہوتا اور ہم جس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں وہ اس کے خلاف ہے' بلکہ شرعاً ثابت ہے کہ اس کو مقدم کرنا لازم ہے حالت سفارش میں ''حالت'' سے میری مراد نماز کی حالت ہے پس شرعاً اس کا عدم اعتبار ثابت ہوا جس کا انہوں نے اعتبار کیا ہے۔

قال: ایک دوسرے نسخہ میں ''وقال'' ہے۔

قوله: وقال الترمذی: و أهل الحدیث کأنهم یرونه مرسلاً:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس کی اسناد قوی نہیں ہیں حالانکہ صحیح نہیں اس لیے کہ میرک نے کہا ہے: ترمذی کی عبارت یوں ہے: واهل الحدیث کأنهم یرون ان الحدیث مرسل فی ذلك أصح اور ان دونوں عبارتوں میں بون بعید ہے امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں متصل سند کے ساتھ ابن عیینہ وغیرہ کے طریق سے ''عن الزهری'' روایت بیان کی ہے' اور مرسل سند کے ساتھ ''معمر عن الزهری'' بیان کیا ہے: کان النبیﷺ و ابو بکر و عمر یمشون امام الجنازة۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما جنازے کے آگے چلا کرتے تھے۔''

امام ترمذی نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ مرسل اصح ہے امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ یہ خطاء ہے' اور درست مرسل ہونا ہے ابن الملکؒ فرماتے ہیں: حدیث زہری اس میں مرسل ہے اور ابن عیینہ کی مرفوع حدیث سے اصح ہے: سفیان بن عیینہ حفاظ واثبات میں سے ہیں' انہوں نے مرسل پر کچھ زیادہ بیان کیا ہے اس کو قبول کرنا واجب ہے ابن عیینہ کے وصل کی ابن جریج اور زیاد بن سعد وغیرہ نے متابعت کی ہے بیہقی کہتے ہیں: اور جس نے اس کو وصلا بیان کیا ہے' اور اس کے موصول ہونے کو برقرار رکھا ہے اور ... نے بھی اس سے اختلاف بھی نہیں کیا وہ سفیان بن عیینہ ہیں وہ ''حجۃ ثقۃ'' ہیں۔ (کذا فی التصحیح)

جنازے کے پیچھے چلنا چاہیے کیوں کہ وہ تابع نہیں ہے

۱۶۶۹:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْجَنَازَۃُ مَتْبُوْعَۃٌ وَّلَا تَتْبَعُ لَیْسَ مَعَھَا مَنْ تَقَدَّمَھَا ۔ رواہ الترمذی وابو داود وابن ماجۃ قال الترمذی وابو ماجد الراوی رجل مجھول

اخرجہ ابوداوٗد فی السنن ۵۲۵/۳ حدیث رقم ۳۱۸۴۔ والترمذی ۳۳۲/۳ حدیث رقم ۱۰۱۱۔ وابن ماجہ ۴۷۶/۱ حدیث رقم ۱۴۸۴۔ واحمد فی المسند ۴۱۵/۱۔

ترجمہ :حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جنازہ تابع کیا گیا ہے کہ لوگ اس کے پیچھے چلیں اور وہ خود تابع نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے پیچھے رہے۔ وہ شخص جنازے کے ساتھ نہیں جو آگے بڑھ جائے۔ (یعنی اس کو ساتھ چلنے کا ثواب نہیں ملتا) اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤداور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے امام ترمذیؒ نے کہا ہے۔ ابو ماجد راوی مجہول ہے۔

تشریح: قولہ: الجنازۃ متبوعۃ: یعنی جنازہ حقیقتاً اور حکماً متبوع ہے' چنانچہ اس کے پیچھے چلا جائے گا' اس سے آگے نہیں چلا جائے گا۔

قولہ: ولا تتبع : تاء اور باء کے فتحہ اور عین کے رفع کے ساتھ بصیغۂ نفی' اور عین کے سکون کے ساتھ بصیغہ نہی ہے ایک دوسرے نسخہ میں دوسری تاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ''لاتتبع ھی الناس فلا تکون عقیبھم'' یہ اس بات کی صراحت ہے جو ضمناً معلوم ہو چکی ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے: ''امشوا خلف الجنازۃ'' طیبی کہتے ہیں: یہ ماقبل کی تاکید ہے' یعنی جنازہ متبوع ہے' تابع نہیں ہے۔

قولہ: لیس معھا من تقدمھا: تقریر کے بعد تقریر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اجر نہیں ہے۔ یعنی کامل اجر نہیں ملے گا پس یہ اس مذہب کی منصوص تائید ہے: ''أن المشی ورائھا أفضل'' پیچھے چلنا اُفضل ہے۔

اور جو پچھلی حدیث میں جنازہ کے آگے چلنا مذکور ہے' سو وہ واقعۂ حال ہے جس میں احتمال ہے کہ انہوں نے اس کو افضلیت کی وجہ سے کیا ہو' یا بیان جواز یا اس زمانے کے مقتضی کسی عارض کی وجہ سے کیا ہو۔ واللّٰہ المستعان۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: تمام نے (اس حدیث کو) ابو ماجد عن ابن مسعود نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں

راوی کی جہالت مجتہد کے لیے مضر نہیں کیونکہ کہ اس کے نزدیک حدیث ثابت ہے اور اس نے اس کو بیان کیا ہے۔

میت کو کندھا دینے پر حقوق کی ادائیگی

۱۶۷۰:وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَبِعَ جَنَازَۃً وَحَمَلَھَا ثَلَاثَ مِرَارٍ فَقَدْ قَضٰی مَا عَلَیْہِ مِنْ حَقِّھَا ۔ [رَوَاہُ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/ ۳۵۹ حدیث رقم ۱۰۴۱۔

ترجمہ ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص جنازہ کے ساتھ ہو اور وہ تین مرتبہ جنازہ کو اٹھائے تو اس نے اس کا حق ادا کر دیا جو اس کے ذمہ تھا''۔

اسنادی حیثیت: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ابن الملکؒ فرماتے ہیں یعنی راستے میں جنازہ اُٹھانے والوں کے ساتھ تعاون کرتا ہے' پھر آرام حاصل کرنے کے لئے اس کو چھوڑ دیتا ہے پھر راستے میں اُٹھالیتا ہے' وہ اس طرح تین مرتبہ کرتا ہے......۔

'' من حقها'' یہ ما علیه کا بیان ہے' میرکؒ نے کہا ہے: یعنی معاونت کے لحاظ سے اس نے اس کا حق کر دیا' نہ کہ دین اور غیبت وغیرہ جیسی چیزوں سے کتاب الجنائز کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ مؤمن کے جملہ حقوق میں جو ایک مسلمان کے دوسرے مؤمن پر ہیں یہ بھی ہے کہ اس کے جنازہ کے ساتھ چلے' علمائے متاخرین میں سے متعدد علماء نے کہا ہے کہ اس (حدیث باب) کا محل بدعتی اور اعلانیہ فاسق مثل ظالم و مکاس کے علاوہ ہے' تاکہ لوگوں کو اس کی قبیح حالت سے نفرت ہو۔

۱۶۷۱: وَقَدْ رَوٰى فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَمَلَ جَنَازَةَ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ بَيْنَ الْعَمُوْدَيْنِ۔

شرح السنة۔

ترجمہ ''شرح السنۃ میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن معاذ کا جنازہ دو لکڑیوں کے درمیان اٹھایا''

وقد روی: (بصیغہ معروف ہے' اور مطلب یہ ہے کہ) یعنی مصنفؒ نے روایت کیا ہے اور صحیح نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

تشریح: العمودین: عین کے فتحہ کے ساتھ ہے ای عمودی الجنازة (قالہ طیبیؒ) میرکؒ نے ''الازھار'' سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ اُس کو تین افراد اٹھائیں' بایں طور کہ ان میں سے ایک دونوں لکڑیوں کے آگے ہوگا اور دو پیچھے ہوں گے ان دونوں میں سے ہر ایک ایک' لکڑی کو اپنے کندھے پر رکھے گا یہ طریقہ جنازہ کو زمین سے اُٹھاتے وقت کا ہے اس کے بعد کوئی حرج نہیں کہ اُن کے ساتھ جو چاہے جیسے چاہے تعاون کرے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ''تربیع'' افضل ہے' کہ اُس کو چار بندے اُٹھائیں' ہر ایک شخص ایک لکڑی اپنے کندھے پر رکھے۔

ابن سعد نے طبقات میں ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے: انهٔ حمل جنازة سعد بن معاذ من بيته بين العمودين خرج به من الدار آپ نے سعد بن معاذؓ کا جنازہ ان کے گھر سے دو لکڑیوں پر اُٹھایا اس کو لے کر گھر سے نکلے واقدی کہتے ہیں: والدار یکون ثلاثین ذراعا گھر تیس (۳۰) ذراع کا ہوتا ہے' نوویؒ خلاصہ میں کہتے ہیں: اس روایت کو شافعیؒ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مگر اس باب میں صحابہ وغیرہ سے آثار ثابت ہیں۔

امام ابن ہمامؒ ان آثار کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ہم کہتے ہیں یہ تمام موقوفات ہیں ان میں سے جو مرفوع ہیں وہ ضعیف ہیں مزید یہ کہ یہ حال کے واقعات ہیں سو احتمال کے ساتھ کہ انہوں نے یہ کلام اس لئے کیا ہو کہ یہ سنت ہے یا کسی عارض

کی وجہ سے جوان خصوصی اوقات میں متقاضی تھا ابن مسعود کہتے ہیں: من اتبع الجنازة فليأخذ بجوانب السرير الاربعة جو جنازے میں شریک ہو وہ چارپائی کی چاروں جانب پکڑے محمد بن حسن نے روایت کیا أنبأنا ابو حنيفة 'حدثنا منصور بن المعتبر۔ ہمیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے خبر دی ہمیں منصور بن معتمر نے کہا: ''من السنة حمل الجنازة بجوانب السرير الأربعة'' اس روایت کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے' اور الفاظ یہ ہیں: من اتبع الجنازة فليأخذ بجوانب السرير كلها فإنه السنة۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ یہی سنت ہے اور اس کے خلاف اگر بعض سلف سے ثابت ہے تو عارض کی وجہ سے ہے اور مناظر پر اس کی تعیین واجب نہیں۔

جنازے کے ساتھ پیدل چلنا افضل ہے

۱۶۷۲: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةٍ فَرَاٰى نَاسًا رُكْبَانًا فَقَالَ اَلَا تَسْتَحْيُوْنَ اَنَّ مَلٰئِكَةَ اللّٰهِ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ وَاَنْتُمْ عَلٰى ظُهُوْرِ الدَّوَابِّ۔

[رواه الترمذى وابن ماجة وروى ابوداود نحوه وقال الترمذى وقد روى عن ثوبان موقوفا]

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۳/۵۲۱۔ حديث رقم ۳۱۷۷۔ والترمذى ۳/۳۳۳ حديث رقم ۱۰۱۲۔ ابن ماجه ۱/۴۷۵ حديث رقم ۱۴۸۰۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے میں شریک ہوئے۔ پس لوگوں کو سوار دیکھا تو فرمایا۔ کیا تم حیا نہیں کرتے کہ خدا کے فرشتے اپنے قدموں پر ہیں۔ (یعنی پیدل چل رہے ہیں) اور تم جانوروں کی پیٹھوں (یعنی پشتوں) پر سوار ہو۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہؒ اور اسی طرح کی روایت ابو داؤد سے بھی ہے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے۔ ثوبانؓ سے یہ موقوف روایت کی گئی ہے۔

تشریح: خرجنا مع النبی ﷺ: ایک دوسرے نسخہ میں ''مع رسول اللّٰه۔

فرأى ناسا ركبانا'': اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ وہ جنازے سے آگے تھے یا اس کی کسی جانب تھے' تاکہ آپ کی اس حدیث کے منافی نہ ہو جو پیچھے گزری ہے: ''يسير الراكب خلف الجنازة'' یعنی واپسی میں جنازہ کے پیچھے چلے۔

قوله: (فقال ألا تستحيون۔

إن: کسرہ کے ساتھ۔

وأنتم على ظهور الدواب: '' ازھار'' میں ہے کہ جنازے کے پیچھے سوار ہو کر چلنا مکروہ ہے کیونکہ یہ تنعم وتلذذ ہے جو اس حالت میں غیر مناسب ہے میں کہتا ہوں فعل صحابہ کو اسی پر محمول کیا جائے خصوصاً جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چل رہے تھے' تو ان سے یہ بہت ہی مستبعد ہے۔

فرمایا: اس حدیث اور پچھلی حدیث: ''يسير الراكب خلف الجنازة'' کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ وہ سابقہ اس معذور کے حق میں ہے جو کسی بیماری میں ہو' ساکن الاعضاء یا لنگڑا وغیرہ ہو اور یہ حدیث غیر معذور کے بارے میں ہے۔ اور

ہماری جمع سابق ان کی جمع لاحق سے زیادہ جامع ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ حدیث ثوبان دلالت کرتی ہے کہ فرشتے جنازے میں حاضر ہوتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ یہ عام ہے مسلمانوں کے ساتھ رحمت بن کر اور کافروں کے ساتھ لعنت کا باعث ہے۔

''قال انس: مهرت جنازة برسول ﷺ فقام فقيل انها جنازة يهودى فقال انا قمنا للملائكه انسؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے پاس سے جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے آپ سے کہا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے تو آپ نے فرمایا: ہم فرشتوں کے لیے کھڑے ہوئے ہیں'': اس حدیث کو نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

اس میں اشارہ ہے کہ اکابر وفضلاء کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا مندوب ہے۔

قوله: وروى ابوداؤد نحوه: یعنی اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے جو یہ ہے: انهٗ أتى بد ابة وهو مع جنازة فأبى أن يركب فلما انصرف أتى بدابة فركب فقيل له فقال: ان الملائكه كانت تمشى فلم اكن لأركب وهم يمشون 'فلما ذهبوا ركبت۔ آپ کے پاس جانور لایا گیا درآنحالیکہ آپؐ جنازہ کے ساتھ تھے تو آپ نے سوار ہونے سے انکار فرمایا پھر جب آپؐ لوٹے تو آپ کے پاس جانور لایا گیا آپؐ اس پر سوار ہو گئے آپ سے کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ فرشتے اُس جنازے کے ساتھ چل رہے تھے میں سوار نہیں ہوا کہ وہ پیدل چل رہے ہوں جب وہ چلے گئے تو میں سوار ہو گیا۔

قوله: قال الترمذى: وقد روى عن ثوبان موقوفا: یہ حدیث حضرت ثوبانؓ سے اگرچہ موقوفاً بھی مروی ہے لیکن مرفوع کو ترجیح ہے جیسا کہ گزر چکا ہے مزید یہ کہ یہ موقوف مرفوع کے حکم میں ہے چونکہ اس جیسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔

۱۶۷۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَرَاَ عَلَی الْجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ۔

[رواه الترمذى وابو داود وابن ماجة]

اخرجه الترمذى فى السنن ۳۴۵/۳ حديث رقم ۱۰۲۶۔ وابن ماجه ۴۷۹/۱ حديث رقم ۱۴۹۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے جنازے پر سورت فاتحہ پڑھی۔ اس کو امام ترمذی ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں: امام شافعیؒ بھی یہی کہتے ہیں میں کہتا ہوں (اولاتو) قراءت کی عدم تعیین ہے کہ اس قراءت کا تعلق میت سے ہے یا نماز جنازہ سے ہے یا اس کے بعد سے ہے کہ اس کی تکبیرات میں سے کسی تکبیر کے بعد یہ ہے (ثانیا) یہ حدیث ضعیف ہے اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

اسنادی حیثیت: اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس طریق سے اس کی اسناد قوی نہیں' میرکؒ فرماتے ہیں یہ اشارہ ہے کہ اس کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان واسطی منکر الحدیث اور ضعیف ہے۔

میرکؒ (ابوداؤد کی روایت کے بارے میں) فرماتے ہیں: اس کے الفاظ طلحہ بن عبداللہ بن عوف سے یوں مروی ہیں: قال صليت على الجنازة مع ابن عباس فقرابفاتحة الكتاب فقال: انها من السنة فرماتے ہیں: ''میں نے ابن

عباس کے ساتھ نماز جنازہ پڑھی انہوں نے فاتحۃ الکتاب کی قراءت کی اور کہا کہ یہ سنت ہے'' پس حدیث کے مرفوع کی نسبت ابوداؤد کی طرف صحیح نہیں ہے۔

میت کے لئے دُعا کرنے کا حکم

۱۶۷۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَ ةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ۔ [رواہ ابو داود وابن ماجۃ]

اخرجہ ابو داوٗد فی السنن ۵۳۸/۳ حدیث رقم ۳۱۹۹۔ وابن ماجہ ۴۸۰/۱ حدیث رقم ۱۴۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت میت پر نماز پڑھو تو خالص اس کے لیے دعا کرو۔ یعنی کسی کے دکھاوے کے لیے نہ ہو اور خالصتاً اللہ کی خوشنودی مقصود ہو اور دل سے دعا کرو۔ اس کو ابو داوٗد اور ابن ماجہ نے نقل کیا۔

تشریح: یعنی نماز جنازہ میں میت کے لیے اعتقاد اور اخلاص کے ساتھ دعا کرو۔

ممکن ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اس کے لئے اپنے دل میں خلوص کے ساتھ کرو' اگرچہ لفظوں میں عام ہو' صاحب ازہار نے عجیب بات کہی ہے جیسا کہ میرک نے ان سے نقل کیا ہے: یہ دلیل ہے کہ میت کے لئے خصوصی دعا واجب ہے' اور تعمیم کافی نہیں' اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا کرنا رکن ہے لیکن اس کا رد یوں ہو جاتا ہے کہ اکثر احادیث صحیحہ عموم کے ساتھ وارد ہوئی ہیں' علاوہ ازیں وجوب دعا مطلقاً ہمارے نزدیک غیر ثابت ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ابو داوٗدؒ نے اس پر سکوت کیا ہے' ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس کو امام ابن حبانؒ نے صحیح قرار دیا ہے۔

میت کے لیے دُعا

۱۶۷۵: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی عَلَی الْجَنَازَةِ قَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَكَبِیْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَهٗ مِنَّا فَاَحْیِهٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَی الْاِیْمَانِ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ۔ (رواہ احمد وابو داود والترمذی وابن ماجۃ)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۳۴۴/۳ حدیث رقم ۱۰۲۴۔ وابن ماجہ ۴۸۰/۱ حدیث رقم ۱۴۹۸۔ واحمد فی المسند ۳۶۸/۲۔

ترجمہ ''حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز جنازہ پڑھتے تو یہ دعا فرماتے: اے

اللہ! ہمارے زندوں' ہمارے مردوں' ہمارے حاضرین' ہمارے غائبین' ہمارے چھوٹوں' ہمارے بڑوں' ہمارے مردوں اور ہماری عورتوں کی بخشش فرمایا۔ اے اللہ! جس کو تو ہم میں سے زندہ رکھے تو اس کو اسلام پر زندہ رکھ اور جس کو تو ہم میں سے موت دے تو اسے ایمان پر موت دے۔ اے اللہ! ہمیں اس کے ثواب سے محروم نہ رکھنا' اور ہمیں اس کے بعد فتنہ سے دو چار نہ کرنا۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: قال: اللهم اغفر لحينا و ميتنا و شاهدنا و غائبنا...و أنثانا:

میرک فرماتے ہیں: اس حدیث کی تعمیم اور حدیث سابق میں تخصیص کی توجیہ یہ ہے کہ دو دعاؤں کو جمع کیا ہے میت کے لیے خاص ہے اور مسلمانوں کے لیے عام ہے۔ میں کوئی مانع نہیں لیکن کلام ورود میں ہے اگر وارد ہو تو وجوب ہے۔

وصغيرنا و كبيرنا: ابن حجر کہتے ہیں چھوٹوں کے حق میں دعا درجات کی بلندی کے لیے ہے لیکن ابن حجر کی اس بات کو یہ حدیث رد کر رہی ہے: **انه صلى على طفل لم يعمل خطيئة قط فقال اللهم قه عذاب القبر و ضيقه۔**

ممکن ہے کہ ''صغیر'' اور ''کبیر'' سے مراد ''نوجوان'' اور بوڑھے ہوں اس صورت میں کوئی اشکال نہیں رہتا اور ابن الملک وغیرہ نے تکلف کیا ہے تو رپشتی نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کو بچوں کے لئے استغفار کرنے کا کیا مطلب ہے' باوجود یکہ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے انہوں نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا جائے کہ اُس کے ان گناہوں کو معاف کر دیا جائے جو لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں کہ وہ بالغ ہونے کے بعد یہ گناہ کرے گا۔ حتی کہ جب وہ کرے گا تو بخش دیا جائے گا' وگرنہ چھوٹا بچہ غیر مکلّف ہے' اس کو استغفار کی ضرورت نہیں اس بحث کی تحقیق اسی باب کی تیسری فصل کے آخر میں آئے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

طیبی کہتے ہیں: قرائن اربعہ سے مقصود شمول واستیعاب ہے' لہٰذا ترکیب مفردات کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو تخصیص پر محمول نہ کیا جائے گا گویا کہ یوں کہا گیا ہے: **اللّهم اغفر للمسلمين والمسلمات كلهم أجمعين** پس یہ کنایہ زبدیہ ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اگلے جملہ **اللهم من احيته ......** میں یکجا طور پر ذکر فرمایا ہے **قوله: اللهم من أحييته منا فأحيه على الإسلام:** اوامر ونواہی کے لیے اطاعت وفرمانبرداری کرنا مراد ہے۔

قوله: ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان: ''ایمان'' سے مراد تصدیق قلبی ہے چونکہ اسوقت اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز نافع نہیں ہے۔

قوله: اللّهم لا تحرمنا اجره: ابن حجر کہتے ہیں: ''لاتحرمنا'' تاء کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ ہے۔ میں کہتا ہوں فتحہ ہی صحیح ہے۔ تصحیح شدہ نسخوں میں یہی (ضبط) موجود ہے اور قاموس میں ہے ضمہ ایک لغت ہے۔

أجره: ابن الملک فرماتے ہیں ایمان کا اجر مراد ہے میں کہتا ہوں درست بات یہ ہے کہ میت کا ثواب مراد ہے یا مؤمن کا اجر مراد ہے۔

قوله: ولا تفتنا بعده: یعنی میت کے بعد ہمیں آزمائش میں نہ ڈالنا بلکہ ہمیں اسکی موت سے اپنی موت کے لئے نصیحت حاصل کرنے والا بنا اور ہمیں سفر کوچ کے لیے تیاری کرنے والا بنا۔

مصابیح میں "ولا تضلنا" الفاظ ہیں۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں بعض نسخوں میں "ولا تفتنا" ہے یعنی ہم پر ایمان کے بعد آزمائش نہ ڈالنا اور یہاں مراد وہ چیز ہے جو ایمان کے مقتضی کے خلاف ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: امام ترمذیؒ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

۱۶۷۶: ورواه النسائی عَنْ اَبِی اِبْرَاهِیْمَ الْاَشْهَلِیِّ عَنْ ابیه وانتهت روایته عند قوله وَاُنْثَانَا وَفِی روایة ابی داؤد فَاَحْیِهٖ عَلَی الْاِ یْمَانِ وَتَوَفَّهٗ عَلٰی اِسْلَامٍ وَفِی اُخْرِهٖ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهٗ.

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۳۹/۳ حدیث رقم ۳۲۰۱۔ والترمذی ۷۴۰/۴ حدیث رقم ۱۹۸۶۔

ترجمہ: اور امام نسائی نے ابوابراہیم اشہلی عن ابیہ سے روایت کی ہے اور نسائی کی روایت "وانثانا" تک ختم ہو جاتی ہے اور امام ابوداؤد کی روایت میں ہے: "اسے ایمان پر زندہ رکھ اور اسلام پر وفات دے" اور ان کی اس حدیث کے آخر میں یوں ہے: "اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔"

تشریح: قوله: وفی روایةابی داود: فأحیه علی الإیمان و توفه علی الإسلام: اور ابن حجرؒ نے یہ کہہ کر راحت حاصل کر لی کہ ان دونوں کا معنی بھی صحیح ہے۔ اگرچہ وہ دونوں روایات مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن مصداق کے اعتبار سے متحد ہیں۔ گویا کہ انہوں نے طیبی کی تحقیق اور اگلی تدقیق کو سمجھا ہی نہیں ہے۔

امام طیبی کہتے ہیں: پہلی روایت میں اگر آپ کہیں کہ "ایمان" کو "اسلام" سے موخر کرنے کی ہے اور دوسری روایت میں اس کو مقدم کرنے کی کیا حکمت ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس میں تنبیہ ہے کہ ان دونوں کو دین کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سلف صالحین کا مذہب ہے۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اسلام دو معنوں کے لیے وارد ہے ان میں سے ایک معنی اطاعت و فرمانبرداری اور اعمال صالح کا اظہار ہے اور یہ ایمان کے علاوہ ہے اور پہلی روایت میں زندگی میں اعمال کو اور موت کے وقت ایمان کو ترجیح دینے کی طرف اشارہ ہے۔

میں کہتا ہوں عبارت میں مناقشہ ہے جو مخفی نہیں فرمایا یہ مرتبہ عوام کا ہے دوسرا معنی اخلاص عمل اور فرمانبرداری ہے اور یہ مرتبہ خواص کا ہے اور دوسری روایت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

یہ کہنا زیادہ واضح ہے کہ "اسلام" ایمانی ثمرات یعنی اقوال، افعال اور احوال کا نام ہے پس حالت حیات کے مناسب تکالیف اثقال کا قیام ہے اور "ایمان" حقیقت میں تصدیق علی وجہ التحقیق کا نام ہے پس حالت ممات کے مناسب حال یہی ہے چونکہ یہ ارکان اسلام کی بجا آوری سے عاجز ہے واللہ أعلم بحقیقة المرام"۔

پس مشہور روایت ہی اعلیٰ و عمدہ ہے اور دوسری روایت رواۃ کے تصرفات کا نتیجہ ہے جو رواۃ سے نسیاناً ہوئے ہیں یا اس زعم کی بنا پر کہ تقدم و تاخر میں کوئی فرق نہیں اور بالمعنی نقل جائز ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ: فأحيه على الإيمان میں ''ایمان'' سے مراد اس کے توابع یعنی ارکان ہیں ''وتوفه على الإسلام'' میں ''اسلام'' سے مراد انقیاد و تسلیم ہے کیونکہ موت مقدمہ ہے (اس دن کا جس کا ذکر اس آیت میں ہے:)۔ ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ [الشعراء: ۸۸-۹۸] ''جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا)''۔ ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [النساء: ۱۷۶] ''اور خدا ہر چیز سے پاک ہے''

آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا میّت کے لیے مغفرت ورحمت کی دُعا کرنا

۱۶۷۷: وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جَوَارِكَ فَقِهِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ وَاَنْتَ اَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

[رواه ابو داود وابن ماجة]

اخرجه ابو داؤد في السنن ۳/ ۵۴۰ حديث رقم ۳۲۰۲۔ وابن ماجه ۱/ ۴۸۰ حديث رقم ۱۴۹۹۔

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ ایک مسلمان شخص پر نماز پڑھی۔ پس میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اے اللہ فلان ابن فلان (یعنی فلاں کا بیٹا فلاں) تیری امان میں ہے اس لیے کہ تجھ پر ایمان رکھتا تھا اور قرآن کو چنگل مار کر پکڑنے والا ہے۔ (مضبوطی سے پکڑنے والا ہے) کیونکہ وہ امن دینے والا ہے اس کو قبر کے فتنہ سے بچا (یعنی قبر کے عذاب سے) اور آگ کے عذاب سے۔ تو وفا والا ہے یعنی جو بندوں کے ساتھ وعدہ کرتا ہے۔ تو پورا کرتا ہے اور تو حق والا ہے جو کہتا ہے پورا کرتا ہے اے اللہ تو اس کی بخشش کر دے اور اس پر رحم فرما۔ تحقیق تو بخشنے والا مہربان ہے' اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم ان فلان بن فلان في ذمتك: یعنی وہ تیری امان میں ہے اس لیے کہ تجھ پر ایمان رکھتا ہے۔

قوله: وحبل جوارك: جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے کہا گیا ہے کہ یہ عطف تفسیری ہے بعض کا کہنا ہے کہ ''حبل'' سے مراد عہد ہے یعنی تیری حفاظت میں اور تیری طاعت کے عہد میں ہے۔

بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے: اى في سبيل قربك' یعنی تیری قربت کے راستے میں ہے اور وہ ایمان ہے اظہر یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''قرآن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] ''یعنی چنگل مارو اللہ کی کتاب کے ساتھ'' اور جواز کے لفظ سے مراد قرآن کریم ہے اور ''جوار'' سے مراد ''امان'' ہے اور اضافت بیانیہ ہے یعنی وہ رسّی جس کو مضبوطی سے تھامنا امن و امان' اسلام و ایمان، معرفت و اتقان اور اس کے علاوہ دیگر احسان کے مراتب اور منازل جنت کی مورث ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فقد استمسك بالعروة الوثقى الا

انفصام لها۔

نہایہ میں ہے کہ عربوں کی عادت تھی کہ بعض بعض پر ظلم کرتے تھا جب آدمی سفر کا ارادہ کرتا تو وہ ہر قبیلے کے سردار سے عہد لیتا کہ چنانچہ وہ مأمون رہتا تھا جب تک وہ اس کی سرزمین میں رہتا تھا یہاں تک کہ آخر تک پہنچ جاتا وہ اس کی مثل عہد لیتا پس یہ (وہی) ''حبل جوار'' یا یہ (جوار بمعنی) اجارہ امان ونصرت سے (ماخوذ) ہے اور ''حبل'' سے مراد امان وعہد ہے۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں: دوسرا قول واضح ہے اور ''حبل جوارك'' بیان ہے ''في ذمتك'' کے لئے' جیسے: أعجبني زيد وكرمه۔ اصل یہ ہے: ان فلانا في عهدك کہ ''فلاں تیرے عہد میں ہے پس اس کی نسبت ''جوار'' کی طرف کردی جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے چنانچہ ''جوار'' کو عہد قرار دینا اس کی کمال حمایت میں مبالغہ ہے لہٰذا ''حبل'' عہد کے لیے مستعار ہے' چونکہ اس میں توثیق ہے' اور قول کو ایمان مؤکدہ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

قوله: فقه: ''فقه'': میں یہ ہائے ضمیر ہے' یا یہ ہائے سکتہ ہے۔

من فتنة القبر وعذاب النار: فتنہ قبر سے مراد قبر میں سوال وجواب کا امتحان ہے یا عذاب کی اقسام بھیجا جانا' قبر کا اندھیرا اور اس قسم کے دوسرے عذاب ہیں۔

قوله: وأنت أهل الوفاء والحق: یعنی تو وعدہ وفا کرنے کا اہل ہے' کیونکہ تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں ''تجرید'' ہے کہ ''حبل'' استعارہ ہے عہد کے لئے' کیونکہ وفا ''عہد'' کے مناسب ہے۔

والحق: یعنی تو اس بات کا اہل ہے کہ تو حق کو حق ثابت کرنے مضاف مقدر ہے ای ''أنت اهل الحق او أنت اهل الثبوت بما ثبت عنك'' اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾ [المدثر: ٥٦] ''وہی ڈرنے کے لائق اور بخشش کا مالک ہے'' یعنی وہ اس کا اہل ہے کہ اس کو شرک سے بچایا جائے اور اس کی بخشش کی امید رکھی جائے۔

قوله (اللهم اغفرله وارحمه......: نماز جنازہ سے مقصودمیت کے لئے خصوصی دُعا ہے خواہ عموم کے ضمن میں حاصل ہو یا غیر عموم سے حاصل ہو۔

الغفور: یعنی برائیوں کو بہت زیادہ معاف کرنے والا۔

الرحيم: نیکی کے کاموں کو قبول کر کے اور نیکیوں کو بڑھا کر بہت رحم کرنے والا۔

اسنادی حیثیت: امام میرک فرماتے ہیں: اس پر امام ابوداؤدؒ نے سکوت کیا ہے' اور منذریؒ نے اس (سکوت) کو برقرار رکھا ہے۔

مُردوں کو اچھے الفاظ سے یاد کرو یعنی ان کی خوبیاں بیان کرو

۱۶۷۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ وَ كُفُّوْا عَنْ مُسَاوِيْهِمْ۔ [رواه ابو داود والترمذی]

اخرجه ابوداؤد في السنن ٢٠٦/٥ حديث رقم ٤٩٠٠۔ واخرجه الترمذي ٣٣٩/٣ حديث رقم ١٠١٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنے مردوں کی نیکیوں کو یاد کرو اور ان کی برائیاں کرنے سے باز رہو۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: قال رسول الله ﷺ: اذكروا محاسن موتاكم**: امام میرکؒ فرماتے ہیں یہ امر ندب کے لیے ہے۔

محاسن: حسن کی جمع غیر قیاسی ہے۔

موتاکم: "میت" کی جمع ہے۔

نیک لوگوں کے ذکر کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے۔

قوله: وكفوا عن مساويهم: یہ امر وجوب کے لیے ہے۔

مساويهم: خلاف قیاس "سوء" کی جمع ہے۔

امام طیبیؒ نے کہا ہے: ماقبل میں گذر چکا ہے کہ نیک لوگوں کا ذکر یعنی نیک مردہ کے محاسن اور اس کی برائیوں کا ذکر اس کے حالت پر اثر انداز ہوتا ہے' پس مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر کو نفع پہنچائیں' اور دوسروں کو ضرر پہنچانے سے منع کیا ہے جو نیک نہیں ان کا نفع اور ضرر خود ان ہی کی طرف لوٹتا ہے پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کے نفع کے لیے اور اپنے سے ضرر کو دفع کرنے کی کوشش کریں یہ کہنا کہ "انہیں دوسروں کو ضرر پہنچانے سے منع کیا ہے" آپ کے قول سابق کے مناقض ہے الا یہ کہ اس حدیث کا زمانہ محفوظ ہو کہ یہ حدیث اس سے مؤخر ہے۔

لیکن جمع یوں بھی ممکن ہے کہ پہلی کو موت کے قریب وقت پر اور دوسری تحقیق موت کے بعد پر محمول کر لیا جائے۔

یا پہلی نیک لوگوں کے اس کی مذمت کے اجتماع محمول ہے اور نہی انفراد پر محمول ہے' اس کی نظیر چار کی گواہی ہے' اور اگر کم ہوگی تو حد قذف ہوگی۔ واللہ اعلم۔

حجۃ الاسلام کہتے ہیں: میت کی غیبت کرنا زندہ کی غیبت کرنے سے زیادہ سخت ہے' چونکہ زندہ معاف کر سکتا ہے اور اس سے معافی مانگنا ممکن ہے اور دنیا میں متوقع ہے' بخلاف میت کے "ازھار" میں علماء فرماتے ہیں: جب غسل دینے والا میت میں ایسی بات دیکھے جو اس کو تعجب میں ڈال دیتی ہو' مثلاً اس کے چہرہ کا روشن ہو، اچھی خوشبو کا آنا' تو ان باتوں کو بیان کرنا مستحب ہے اور اگر ناپسندیدہ بات دیکھے' مثلاً اس کے چہرہ یا بدن کا سیاہ ہو جانا' یا بدن بھی سیاہ اور اس کی صورت کا بدل جانا تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا حرام ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

مرد اور عورت کے جنازے پر امام کے کھڑا ہونے کا بیان

۱۶۷۹: وَعَنْ نَافِعٍ اَبِي غَالِبٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَلٰى جَنَازَةِ رَجُلٍ فَقَامَ حِيَالَ رَأْسِهٖ ثُمَّ جَاءُوْا بِجَنَازَةِ امْرَاَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالُوْا يَا اَبَا حَمْزَةَ صَلِّ عَلَيْهَا فَقَامَ حِيَالَ وَسَطِ السَّرِيْرِ فَقَالَ لَهٗ

الْعَلَاءُ ابْنُ زِيَادٍ هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْجَنَازَةِ مَقَا مَكَ مِنْهَا وَمِنَ الرَّجُلِ مَقَامَكَ مِنْهُ قَالَ نَعَمْ. [رواه الترمذی وابن ماجة وفی روایة ابی داود نحوهمع زیارة فقام عند عجیزة المراة]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۳۳/۳ حدیث رقم ۳۱۹۴۔ والترمذی ۳۵۲/۳ حدیث رقم ۱۰۳۴۔ وابن ماجه ۴۷۹/۱۔ حدیث رقم ۱۴۹۴۔

ترجمہ: حضرت نافع رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابی غالب ہے کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس کے سر کے مقابل کھڑے ہوئے۔ پھر لوگ قریش کی ایک عورت کا جنازہ لے کر آئے اور کہنے لگے اے ابوحمزہ! (انس رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) اس عورت کی بھی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ پس آپ تخت کے درمیان کھڑے ہوئے اس پر حضرت علاء بن زیاد نے کہا کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح جنازے پر کھڑے ہوئے دیکھا ہے یعنی جس طرح آپ عورت کے جنازے کے درمیان میں کھڑے ہوئے اور مرد کے جنازے کے سر کے مقابل کھڑے ہوئے اس کو ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں بھی اسی طرح مذکور ہے لیکن اس میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورت کے کولہے کے پاس کھڑے ہوئے۔

تشریح: **قوله: وعن نافع ابی غالب ـــ فقام حیال رأسه: أبی غالب**: عطف بیان ہے طیبیؒ کہتے ہیں: گو یا کہ ان کی کنیت زیادہ مشہور و معروف تھی اس لئے کنیت "ابی غالب" کو "نافع" کے لیے بطور بیان لایا گیا ہے۔

جنازة رجل: وہ آدمی حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

حیال: حاء کے کسرہ کے ساتھ بالمقابل۔

قوله: ثم جاؤوابجنازة امرأة ـــ حیال وسط السریر: پیچھے گزر گیا ہے کہ وہ انصاری عورت تھی' پس یہ مختلف واقعات ہیں یا ایک ہی قضیہ ہے' اگر ایک ہی واقعہ ہے تو پھر قریشی انصاری عورت مراد ہوگی۔

یاأباحمزة: حضرت انسؓ کی کنیت ہے۔

وسط: وسط کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

قوله: فقال له العلاء بن زیاد: هکذا ـــ قال: نعم:

هکذا: اس میں حرف استفہام محذوف ہے۔

"ازھار" میں ہے: امام شافعیؒ نے اس حدیث کو لیا ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میت مرد ہو یا عورت امام اس کے سینے کے پاس کھڑا ہوگا امام مالک کہتے ہیں: آدمی کے وسط میں اور عورت کے کندھوں کے پاس کھڑا ہوگا' اس حدیث کے برعکس یہ قول میرک نے نقل کیا ہے یہ حدیث اس سے زیادہ بسط کے ساتھ گذر چکی ہے اور ابن ہمام کا مکمل کلام بھی گذر چکا ہے۔ ازھار کی نقل سے مستفاد ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ تناقض و تدافع کے طرفین پر ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حد وسط اور تمانع پر ہیں' جمع اس طرح ممکن ہے کہ مقصود سینہ ہے جو وسط ہے یہ اندازاً ہے تحقیق کی بنیاد پر نہیں ہے چنانچہ بعض سلف سے منقول ہے کہ وہ کبھی سر کے پاس' کبھی پاؤں کے پاس کھڑے ہوئے ہیں' پس یہ خلاف اختلاف کا مقتضی ہے۔

امام نوویؒ کا یہ قول: ''وزعم انه وقف عند صدره غلط صريح'' مردود ہے۔ کیونکہ امام احمد نے اس کو صراحتاً بیان کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے اگر صحیح نہ بھی ہو۔

قوله: وفي رواية أبي داؤد ......:

اس زیادت کا ذکر ابن ہمام کی بحث میں گزر چکا ہے۔

عجيزة: عین مہملہ کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ امام طیبیؒ کہتے ہیں: ''عجيزة'' یہ عورت کے ساتھ خاص ہے۔ اور ''عجز'' ''موخر الشئ'' (پچھلا حصہ) کو کہتے ہیں۔

الفصل الثالث:

جنازے کے احترام میں کھڑے ہونا

۱۶۸۰: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَيْلٰی قَالَ كَانَ سَهْلُ بْنُ حُنَيْفٍ وَقَيْسُ بْنُ سَعْدٍ قَاعِدَيْنِ بِالْقَادِسِيَّةِ فَمَرَّ عَلَيْهِمَا بِجَنَازَةٍ فَقَا مَا فَقِيْلَ لَهُمَا اَنَّهَا مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اَیْ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَقَالَا اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّتْ بِهٖ جَنَازَةٌ فَقَامَ فَقِيْلَ لَهٗ اِنَّهَا جَنَازَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ اَلَيْسَتْ نَفْسًا۔ [متفق عليه]

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۱٤/۳ حديث رقم ۱۳۱۲۔ والبخاري في صحيحه ۲۱٤/۳۔ حديث رقم ۱۳۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سہل بن حنیف اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہما قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو دونوں حضرات کھڑے ہو گئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ جنازہ ذمی کا ہے۔ پس دونوں صحابیوں نے کہا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا یہ جاندار نہیں ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راوئ حدیث:

عبدالرحمٰن اَبی لیلیٰ: مؤلفؒ فرماتے ہیں: یہ کوفہ کے تابعین میں سے پہلے طبقہ کے تابعی ہیں۔

تشریح: ''حنيف'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

سہل بن حنیف اور قیس بن سعدؓ یہ دونوں جلیل القدر انصاری صحابی ہیں۔ (ابن حجرؒ)

القادسية: دال کے کسرہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے کوفہ اور اس کے درمیان پندرہ میل کا فاصلہ ہے۔

من أهل الأرض: امام طیبی فرماتے ہیں: ''ارض'' یہاں رذالت وسفالت سے کنایہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه أخلد إلى الارض۔ یعنی پستی کی طرف مائل ہوا اسی لیے کسی ایک راوی نے تفسیر کرتے ہوئے ''ای من

اهل الذمة'' کہا ہے۔

یعنی یہ ان میں سے ہے جن کی روح آسمان پر نہیں چڑھتی' زمین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔

قوله: فقالا إن رسول اللّٰه ﷺ مرت به جنازة ......:

فقيل له إنها جنازة يهودى احتمال ہے کہ جنس مراد ہو پس یہ اس روایت کے منافی نہیں جس میں ہے کہ انها يهودية کہ یہودیہ کا جنازہ گزرا یا یہ دو واقعات ہیں' کہ بعض روایات میں'' يهودى'' اور بعض میں ''يهودية'' کے الفاظ ہیں۔

فقال: أليست نفسا: امام طیبیؒ کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ موت گھبراہٹ ہے جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں گزر چکا ہے یا مطلب یہ ہے کہ نفس کے خالق کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا ہوں یا فرشتوں کی وجہ سے جو اس جنازے کے ساتھ ہیں کھڑے ہونے کا نسخ حضرت علی کریم اللہ وجہہ کی روایت سے ثابت ہے ممکن ہے کہ ان کا عذر نسخ کا عدم علم ہو یا علم کے بعد جواز اً عمل ہو۔

یہودیوں کی مخالفت کرنے کا حکم

١٦٨١:وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَبِعَ جَنَازَةً لَمْ يَقْعُدْ حَتّٰى تُوْضَعَ فِي اللَّحْدِ فَعَرَضَ لَهٗ حِبْرٌ مِنَ الْيَهُوْدِ فَقَالَ لَهٗ اِنَّا هٰكَذَا نَصْنَعُ يَا مُحَمَّدُ قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ خَالِفُوْهُمْ۔

[رواه الترمذى وابو داود وابن ماجة وقال الترمذى هذا حديث غريب وبشر بن رافع الراوى ليس بالقوى]

اخرجه ابوداوٗد فى السنن ٥٢٠/٣ حديث رقم ٣١٧٦۔ والترمذى ٣٤٠/٣ حديث رقم ١٠٢٠۔ وابن ماجه ٤٩٣/١ حديث رقم ١٥٤٥۔

ترجمہ :حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت کسی جنازے کے ساتھ جاتے تو اس وقت تک نہیں بیٹھتے تھے جب تک اس کو قبر میں نہیں اتار دیا جاتا تھا۔ پس آپ ﷺ کے سامنے یہودیوں کا ایک عالم آیا اور اس نے آپ ﷺ سے کہا کہ اے محمد! ہم بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت تک ہم بھی کھڑے رہتے ہیں۔ جب تک مردے کو قبر میں نہ رکھا جائے۔ پس راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیٹھ گئے اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہودیوں کی مخالفت کرو۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے اور بشر بن رافع اس حدیث کا راوی قوی نہیں ہے۔

تشریح: اللحد: لام کے فتحہ وضمہ اور حاء کے سکون کے ساتھ قبلہ کی جانب بغلی قبر۔

حبر: ''حاء'' کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ' یہودیوں کا عالم۔

قوله: فجلس رسول اللّٰه ﷺ.

وقال خالفوهم: اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فعلی اور قولی دلیل کو جمع فرمایا۔

باقی یہ کہ نہ بیٹھے جب تک کہ جنازہ آدمیوں کے کندھوں سے نیچے رکھ دیا تو یہی صحیح ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر وہ طریقہ جو

اہل بدعت کا شعار ہو اس کو چھوڑنا اولیٰ ہے۔
''بشر'': الراوی: ''باء'' کے سکون کے ساتھ ہے۔

جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہونے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے

۱۶۸۲: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنَا بِالْقِيَامِ فِي الْجَنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَاَمَرَنَا بِالْجُلُوْسِ۔ [رواہ احمد]

اخرجه احمد فی المسند ۱/۸۲۔

ترجمه: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم فرمایا پھر بعد میں بیٹھے رہے (یعنی پھر جنازے کو دیکھ کر قیام فرمانا چھوڑ دیا) اور ہمیں بیٹھ رہنے کا حکم فرمایا۔ اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ أمرنا بالقيام في الجنازة: یہ امر ندب یا وجوب کے لیے ہے۔ دیکھنے کی حالت میں یا دفن کرنے سے پہلے کھڑے رہنے کا حکم دیا کرتے تھے اس سے ابن حجر کے قول کا رد ہو جاتا ہے کہ ''یہ نسخ میں صریح ہے' تاویل کو قبول نہیں کرتا:

قوله: ثم جلس بعد ذلك وأمرنا بالجلوس:
اس کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کھڑے ہونا مکروہ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ امر اباحت کے لیے ہے۔

۱۶۸۳: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ اِنَّ جَنَازَةً مَرَّتْ بِالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ فَقَامَ الْحَسَنُ وَلَمْ يَقُمْ اِبْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ الْحَسَنُ اَلَيْسَ قَدْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجَنَازَةِ يَهُوْدِيٍّ قَالَ نَعَمْ ثُمَّ جَلَسَ۔ [رواہ النسائی]

يخرجه النسائي في السنن ٤/٤٦ حديث رقم ١٩٢٤۔

ترجمه: محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک جنازہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس سے گزرا۔ پس حضرت حسنؓ کھڑے ہوئے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کھڑے نہ ہوئے اس پر حضرت حسنؓ نے کہا کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کے جنازے کے لئے کھڑے نہیں ہوئے تھے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بیٹھ گئے تھے۔ اس کو امام نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: سیرین: یاء اور نون زائدتان کا مطلق اعتبار کرتے ہوئے یہ غیر منصرف ہے۔
قوله: فقام الحسن ولم يقم: حضرت حسنؓ کھڑے ہو گئے اس وجہ سے کہ آپؓ کو نسخ والی روایت نہ نہیں پہنچی تھی یا آپؓ نے نسخ کو وجوب پر محمول کیا اور استحباب کو جائز قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ نسخ پر عمل کرتے ہوئے' اور امر بالجلوس کو ندب یا اباحت پر عمل کرتے ہوئے کھڑے نہیں ہوئے۔

قولہ: فقال الحسن أليس قد قام رسول الله ﷺ...... :

دوسرا فعل پہلے کے لیے ناسخ ہے خصوصاً جب کہ بیٹھنے کا حکم تاکیداً ہے جیسا کہ پیچھے گزر گیا ہے' یہ متعین معنی ہے اس کے علاوہ کوئی معنی صحیح نہیں ہے۔

طیبیؒ کے قول کی کوئی توجیہ نہیں بنتی کہ ''ظاہر یہ ہے کہ ''ثم جلس ابن عباسؓ کا کلام ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے دونوں کام کئے' لیکن آپ کا بیٹھنے بعد میں تھے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں گزر چکا ہے۔

ظاہر کے مقابل مقتضی یہ ہے کہ ''جلس'' ابن سیرین کا کلام ہے اور ضمیر حضرت حسن کی طرف راجع ہے حالانکہ یہ مستحسن نہیں چونکہ ابن عباسؓ سے جواب نہیں ملا مصادفہ وموافقہ ہوگا' اور اس صورت میں ''ثم جلس'' فرمانے کا کوئی فائدہ نہیں رہتا اگر ''جَلَسَ'' کی ضمیر ابن عباس کے لیے قرار دی جائے اس لیے کہ وہ (لفظاً) قریب ہیں تو تحصیل حاصل ہو جو کہ درست نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: حسنؓ نے یہ بات اس لئے کہی کہ انہیں نسخ والی روایت نہیں پہنچی تھی' اسی لیے انہوں نے ابن عباسؓ کی روایت کا انکار کیا جس میں ترک قیام کا حکم تھا جب ابن عباس نے نسخ پر دلالت کرنے والی روایت بیان کی تو حسنؓ نے انکار ترک کر دیا جیسا کہ کاملین کی شان ہے ان کا مقصد صرف حق واضح کرنا تھا یا ان کے والد (حضرت علی) کا کلام یاد دلانا مقصود تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زبانی یہودی کے جنازے پر کھڑے ہونے کا سبب

۱۶۸۴: وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ كَانَ جَالِسًا فَمُرَّ عَلَيْهِ بِجَنَازَةٍ فَقَامَ النَّاسُ حَتّٰى جَاوَزَتِ الْجَنَازَةُ فَقَالَ الْحَسَنُ اِنَّمَا مُرَّ بِجَنَازَةِ يَهُوْدِيٍّ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى طَرِيْقِهَا جَالِسًا وَكَرِهَ اَنْ تَعْلُوَ رَأْسَهُ جَنَازَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَامَ۔ [رواه النسائي]

اخرجه النسائي في السنن ٤٧/٤ حديث رقم ١٩٢٧۔

ترجمہ: حضرت جعفر بن محمدؒ سے (یعنی جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے) روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ محمد بن باقرؒ سے نقل کیا ہے کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے قریب سے ایک جنازہ گزرا۔ پس لوگ کھڑے ہوئے یعنی وہ لوگ جن کو منسوخی کا علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ جنازہ گزر گیا۔ پس حضرت حسنؓ نے کہا۔ کہ جب یہودی کا جنازہ گزر رہا تھا۔ تو آپ ﷺ راستے میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ یہودی کا جنازہ آپ ﷺ کے سر سے بلند ہو۔ اس لیے آپ ﷺ کھڑے ہوئے اس کو امام نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قولہ: فمر عليه بجنازة فقام الناس**: کھڑے ہونے والے یہ وہ بعض لوگ تھے جن تک نسخ کی روایت نہیں پہنچی تھی یا یہ وہ لوگ تھے جو کھڑے ہونے کے مستحب یا جائز ہونے کے قائل تھے

قولہ: كره أن تعلوا رأسه جنازة يهودي: اس بات کی طرف اشارہ ہے: الاسلام يعلو ولا يعلى عليه۔

قولہ: فقام: اس وجہ سے راستے سے کھڑے ہوگئے یہ آپ ﷺ کی طرف سے لوگوں کی اس بات کا انکار تھا کہ جنازہ کو دیکھ کر

کھڑا ہوا جائے' جب کہ پچھلی حدیث میں اس کے برعکس گذرا کہ انہوں نے ابن عباس کے عدم قیام پر انکار کیا ممکن یہ متاخر ہو جب کہ ان کو مسئلہ کی تحقیق ہوگئی ہو کہ آپ کا کھڑا ہونا اس علت کی بنا پر تھا اس لیے کہ قیام کی علتیں مختلف ہیں' کبھی ''فزع'' کی وجہ سے کبھی فرشتوں کی تکریم کے لیے اور کبھی اس لیے کہ یہودی کا جنازہ آپ کے سر سے بلند نہ ہو اور کبھی مقامات کے اختلاف کی وجہ سے ان کا کچھ اعتبار نہیں کیا۔

ایک معلول کے لئے کئی علل کا جمع ہونا ممکن ہے کیونکہ عمل کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

یا ان کا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر انکار کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ راستے پر تھے اور لوگوں پر انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ راستے پر نہیں تھے واللہ اعلم۔

فرشتوں کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونا

۱۶۸۵: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَامَرَّتْ بِكَ جَنَازَةُ یَهُوْدِیٍّ اَوْ نَصْرَانِیٍّ اَوْ مُسْلِمٍ فَقُوْمُوْا لَهَا فَلَسْتُمْ لَهَا تَقُوْمُوْنَ اِنَّمَا تَقُوْمُوْنَ لِمَنْ مَّعَهَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ۔

[رواه احمد]

اخرجه احمد في المسند ٤/ ٣٩١۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تجھ پر (تیرے پاس سے) یہودی یا نصرانی کا جنازہ گزرے تو کھڑے ہو جاؤ۔ اس لیے کہ تم اس جنازے کے لیے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ تم فرشتوں کے لیے کھڑے ہوتے ہو جو جنازہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال اذا مرت ---فقوموالها

جنازة یهودی: (''یہودی'' کا ذکر مقدم کرنے کی وجہ) ان کی ملت کے مقدم ہونے کی وجہ سے ہے' یا برائے ترقی ہے یہی زیادہ واضح ہے۔

أو نصرانی أو مسلم: دونوں ''أو'' نوع بیان کرنے کے لیے ہیں۔

قوله (فقوموا لها: اس میں ابوموسیٰؓ کی تعظیم کی طرف اشارہ ہے اور عموم حکم طرف اشارہ ہے اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ......﴾[الطلاق : ١] ''اے پیغمبر (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور خدا سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرو۔ (نہ تو تم ہی) انکو (ایام عدت میں) انکے گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں ہاں اگر وہ صریح بےحیائی کریں (تو نکال دینا چاہیے) اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدوں سے تجاوز کریگا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ (اے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے'' جمع تعظیم کے لیے یا کاف خطاب ہے مخاطب کے عموم کے ارادے کے ساتھ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ﴾ [البقرة:٢٣٢]

قوله: فلستم لها تقومون...... :

کہا جاتا ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کیونکہ مردہ کے لیے قیام کو ثابت فرمایا اور پھر مردے کے لئے قیام کی نفی فرمادی۔
جواب یہ دیا گیا ہے کہ اُس کے لیے قیام کا اثبات صورت کے اعتبار سے ہے اور نفی باطن امر اور حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اعتبارات وحیثیات کی رعایت پر انکار بلیغ عام ہے اور اسی قبیل سے یہ قضیہ ہے: قضاء پر رضا واجب ہے اور رضا بر کفر کفر ہے باوجودیکہ کفر بھی من جملہ قضاء ہے اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ...... ﴾ [الانفال: ۱۷] ''تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا۔ اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جس وقت تم نے (کنکریاں) پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ اس سے یہ غرض تھی کہ مؤمنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے۔ بیشک خدا سنتا جانتا ہے۔''

یہ حدیث قیام کی سابقہ علت مذکورہ کے منافی نہیں ہے کہ قیام اس وجہ سے کیا تھا کہ موت فزع کی چیز ہے یہودی کے جنازے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر سے بلند ہونے کی وجہ ہے اور کہیں کسی بھی علت کا اعتبار نہیں فرمایا چونکہ اس بات سے کوئی مانع نہیں کہ ایک ہی چیز کی کئی علتیں ہوں ہر مقام پر اس مقام کے مناسب حال کلام ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۶۸۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ جَنَازَةً مَرَّتْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ فَقِيْلَ اِنَّهَا جَنَازَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ اِنَّمَا قُمْتُ لِلْمَلَآئِكَةِ ۔ [رواه النسائی]

هذا الحديث ساقط من مخطوطة المشكاة و كذلك من المرقاة۔ ولذا لم يشرحه الامام ملاعلی۔ وقد اثبت فی نسخة المشكاة المطبوعة [مشكاة المصابيح ۵۳۰/۱ طبعه المكتب الاسلامی۔ تحقيق ناصر الدين الالبانی] وقد اثبت الحديث اتمامًا للفائدة۔ وحافظ علی ترتيبه كما جاء فی النسخة المطبوعه۔ فهو مثبت فی المتن فقط دون الشرح۔ وهو فی معنی الحديث السابق [۱۶۸۵] والله تعالی اعلم۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ملائکہ کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔

عرضِ مرتب:

یہ حدیث مشکوٰۃ کے مخطوطہ اور اسی طرح مرقات سے بھی ساقط ہے اسی وجہ سے امام ملا علی قاریؒ نے اس کی شرح نہیں کی ہے یہ حدیث مطبوعہ مشکوٰۃ کے نسخہ میں موجود ہے اتمام فائدہ کی خاطر اس حدیث کو ذکر کر دیا ہے اور اسی لئے بھی تاکہ مطبوعہ نسخہ کی ترتیب برقرار ہے چنانچہ اسی وجہ سے اس حدیث کو متن میں ذکر کیا ہے شرح میں ذکر نہیں کیا یہ حدیث پچھلی حدیث کے ہم معنی ہے۔ واللہ اعلم۔

جنازے کی تین صفوں پر بہشت کا وعدہ

۱۶۸۷: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ هُبَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ

يَمُوْتُ فَيُصَلِّىْ عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلاَّ اَوْجَبَ فَكَانَ مَالِكٌ اِذَا اسْتَقَلَّ اَهْلَ الْجَنَازَةِ جَزَّاَهُمْ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ [رواه ابوا داؤدوفي رواية الترمذي قال كان مالك ابن هبيرة اذا صلى على جنازة] فَتَقَالَّ النَّاسَ عَلَيْهَا جَزَّاَهُمْ ثَلَاثَةَ اَجْزَاءٍ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ اَوْجَبَ وَرَوى ابن ماجة نحوه .

اخرجه ابوداؤد في السنن ۵۱۴/۳ حديث رقم ۳۱۶۶ والترمذي في السنن ۳۴۷/۳ حديث رقم ۱۰۲۸۔ وابن ماجه ۴۷۸/۱ حديث رقم ۱۴۹۰۔

ترجمہ :مالک بن ھبیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی مسلمان فوت ہو جائے اور اس پر مسلمانوں کی تین صفیں نمازِ جنازہ پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بہشت (جنت) اور مغفرت واجب کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت مالک رحمہ اللہ جب اہل جنازہ کو کم خیال کرتے تو اس حدیث کی وجہ سے لوگوں کو تین صفوں میں تقسیم کر دیتے تھے اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت مالک بن ھبیرہؓ جب کوئی نمازِ جنازہ پڑھاتے اور لوگوں کو کم خیال کرتے تو ان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیتے اور فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جس شخص کے جنازے میں تین صفیں شامل ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت واجب کر دیتے ہیں۔ ابن ماجہ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

تشریح: قوله:"هبيرة" تصغیر کے ساتھ ہے۔

قوله: مامن مسلم يموت فيصلى عليه ثلاثة صفوف من المسلمين إلا أوجب:

ایک دوسری روایت میں ہے:"الا غفر الله له" کہ مگر اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا" ایجاب کی تعبیر اس بات کی طرف نظر کرتے ہوئے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا پس یہ واجب لغیرہ ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں کہ ہر شخص پر لازم ہے وہ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی واجب نہیں ہے ﴿ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا...... ﴾ [المائدہ:۱۷] "کہہ دو کہ اگر خدا عیسیٰ بن مریم اور ان کی والدہ کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو اس کے آگے کس کی پیش چل سکتی ہے؟ اور آسمان اور اور جو کچھ ان دونوں میں ہیں سب پر خدا ہی کی بادشاہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔"

"الا اوجب" یہ "ما" کی خبر ہے مستثنیٰ منہ عام احوال سے اعم ہے' اس میں واضح دلالت ہے اس بات پر کہ ثناء بالمغفرت کی تاثیر ہے طیبیؒ کہتے ہیں یہ محل بحث ہے چونکہ میت کی ثناخوانی میں اور اس کے لئے دعا میں واضح فرق ہے۔

قوله: فكان مالك..... رواه ابو داؤد۔ استقل قلیل سمجھا۔

جزأهم: تشدید کے ساتھ متعدد صفین بناتے اس میں انفراد کی کراہت کی طرف اشارہ ہے' ابن الملکؒ "شرح وقایہ" میں لکھتے ہیں کہ کرمانی نے ذکر کیا ہے کہ نماز جنازہ میں صفوں میں سے بہترین صف آخری صف ہے اور اس کے علاوہ دوسری نمازوں میں پہلی صف ہے۔ چونکہ اس میں اظہار تواضع ہے' اور اس لئے بھی کہ اس کی سفارش قبول کے درجے کو پہنچ جائے اور

نماز جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیادت کے مشابہ ہے۔

روایة الترمذی: اضافت کے ساتھ ہے۔

فتقال الناس علیھا: (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) ای المنتظرین باب تفاعل سے ہے "قلت" سے ماخوذ ہے ای رآھم قلیلا اور مطلب یہ ہے کہ ان کو تھوڑا دیکھا ایک دوسرے نسخہ میں "الناس" رفع کے ساتھ ہے ای صار الناس قلیلا یعنی لوگ تھوڑے ہو گئے۔

قولہ: جزأھم ثلاثة: یعنی لوگوں کو تین اقسام میں تقسیم کر دیتے: ① شیوخ ② کہول، ③ نوجوان یا ① فضلاء ② طالب علم ③ اور عوام۔

قولہ: قال رسول اللہ ﷺ: من صلی علیه ثلاثة صفوف: صحیح ترین موقف یہ ہے کہ ہر صف میں کم از کم دو آدمی ہوں

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا میّت کے لئے جامع دُعا کرنا

۱۶۸۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الصَّلَاةِ عَلَی الْجَنَازَةِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبُّهَا وَاَنْتَ خَلَقْتَهَا وَاَنْتَ هَدَیْتَهَا اِلَی الْاِسْلَامِ وَاَنْتَ قَبَضْتَ رُوْحَهَا وَاَنْتَ اَعْلَمُ بِسِرِّهَا وَعَلَانِیَتِهَا جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْلَهٗ۔ [رواہ ابو داود]

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۳۸/۳ حدیث رقم ۳۲۰۰۔ واحمد فی المسند ۴۵۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نمازِ جنازہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اے اللہ! تو اس کو پالنے والا ہے اور تو نے اس کو پیدا کیا ہے اور تو نے اس کو اسلام کی طرف ہدایت دی ہے اور تو نے ہی اس کی روح کو قبض کیا ہے اور تو اس کے باطن کو خوب جانتا ہے اور ہم سفارش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اے اللہ! تو اس کو بخش دے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللھم أنت ربھا: اس کا سردار مالک مربی اور مصلح ہے۔

قولہ: وأنت ھدیتھا إلی الإسلام: جو انتہاءً ایمان پر مشتمل ہے۔

قولہ: وأنت قبضت روحھا: یعنی تو نے اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیا' بعض عارفین کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف قبض کی نسبت حقیقتاً ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اللہ یتوفی الأنفس حین موتھا۔ اور ملک الموت کی طرف نسبت مجازی ہے جیسے اللہ عزوجل کا فرمان ہے: قل یتوفاکم ملك الموت الذی وکل بکم۔

قولہ: وأنت أعلم بسرھا وعلا نیتھا: یاء کی تخفیف کے ساتھ یعنی اس کا ظاہر اور باطن۔

قولہ: جئنا: شفعاء فاغفر له: ہم حاضر ہوئے تیرے سامنے اسکی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

تو اس کی بخشش فرما دے' چونکہ تو ہی دعاؤں کو قبول کرنے والا اور حاجات کو پورا کرنے والا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے ان کی روایت میں: "فاغفر لها" کے الفاظ ہیں۔

نابالغ کے لیے عذابِ قبر سے پناہ مانگنا حدیث سے ثابت ہے

۱۶۸۹: وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَبِي هُرَيْرَةَ عَلَى صَبِيٍّ لَمْ يَعْمَلْ خَطِيئَةً قَطُّ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ اَللّٰهُمَّ اَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ [رواه مالك]

اخرجه مالك في الموطأ ۲۲۸/۱ حديث رقم ۱۸ من كتاب الجنائز۔

ترجمہ: حضرت سعید بن المسیبؒ سے روایت ہے کہ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے ایک ایسے لڑکے کی نمازِ جنازہ پڑھی کہ جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پس میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نماز میں کہتے ہوئے سنا۔ کہ یا الٰہی اس کو عذاب قبر سے پناہ عطا فرما۔ اس کو امام مالکؒ نے نقل کیا ہے۔

سعید بن مسیّب:

"مسیب" یاء کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔ ہے سادات تابعین میں سے ہیں۔

تشریح: لم يعمل خطيئة قط: ابن حجر کہتے ہیں: یہ صفت کاشفہ ہے' چونکہ غیر بالغ سے تو گناہ کے کام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو خطیہ کی نفی میں مبالغہ پر محمول کیا جائے اگر چہ صورتاً ہو۔

قوله: اللهم اعذه من عذاب القبر: قاضیؒ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا اعتقاد رسول اللہ سے سنی ہوئی کسی بات کی بناء پر ہو کہ عذاب قبر صغیر و کبیر ہر دو کے لئے ہے اور آزمائش بچے سے اس لیے ساقط ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں مکلّف نہیں ہے۔

ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: عذاب قبر فتنہ قبر کے علاوہ ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کو عذاب دے تو وہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی اس کے عمل کی دلیل نہیں طلب کی جائے گی کیونکہ "اللہ جو کرے کوئی اُس کو کوئی پوچھنے والا نہیں" فرمایا: بعض علماء کہتے ہیں کہ یہاں عذاب قبر سے مراد عقوبت اور سوال نہیں ہے بلکہ محض درد و غم، حسرت، وحشت، اور ضغطہ مراد ہے اور یہ اطفال و غیر اطفال سب کو شامل ہے جیسا کہ سیوطی نے مؤطا کے حاشیہ میں ذکر کیا ہے۔

نمازِ جنازہ میں سورت فاتحہ پڑھنا اور نابالغ بچے کے لیے دُعا کرنا

۱۶۹۰: وَعَنِ الْبُخَارِيِّ تَعْلِيقًا قَالَ يَقْرَأُ الْحَسَنُ عَلَى الطِّفْلِ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَيَقُولُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا سَلَفًا وَفَرَطًا وَذُخْرًا وَاَجْرًا۔ [بخاری تعلیقًا]

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۰۳/۳ تعليق باب قراءة الفاتحة من كتاب الجنائز۔

ترجمہ: حضرت امام بخاریؒ سے تعلیقاً روایت ہے یعنی حدیث کے ترجمۃ الباب میں یہ حدیث بغیر سند کے مذکور ہے کہ حسن بصریؒ بچے کے جنازے پر سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے یعنی تکبیر اولیٰ کے بعد ثنا تک اللھم کی جگہ اور تیسری تکبیر کے بعد

کہتے تھے یا الٰہی تو اس کو ہمارے لیے پیشوا (امام) اور پیش رو (اور آگے بڑھنے والا) اور باعث ثواب اور ذخیرہ بنا۔

تشریح: تعلیقًا: طیبی فرماتے ہیں کہ "ارشاد" میں لکھا ہے: "تعلیق" وہ ہے جس کی سند کے شروع سے ایک راوی یا زیادہ حذف ہوں اور بعض نے کل سند کے حذف کے لئے استعمال کیا ہے: **قال رسول اللّٰہ ﷺ : كذا قال ابن عباس : كذا قال سعيد بن المسيب : كذا عن أبي هريرة كذا۔**

یہ حدیث قطع نظر اس کی تاویل کے امام شافعی کی حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی چونکہ حسنؒ مجتہدین میں سے ہیں اور اس کی غایت موافقت ہے۔

"سلفا" سین اور لام کے فتحہ کے ساتھ نہایہ میں ہے کہا گیا ہے کہ یہ "سلف المال" سے (ماخوذ) ہے گویا کہ یہ وہ مال ہے جو آگے بھیجا جا چکا ہے اور اس کو "اجر" کا اور اس ثواب کا جو اس پر صبر کرنے کے بدلہ میں دیا جائے کا ثمن قرار دیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ "سلف" وہ انسان ہے جو کسی شخص کے آباء اور قرابت داروں میں سے ہو اور پہلے فوت ہو جائے اسی لئے صدر اول کے تابعین" کو سلف صالحین کہا جاتا ہے۔

فرطا: نہایہ میں ہے: وہ اجر جو ہم سے متقدم ہو صحاح میں ہے: "فرط" حرکت کے ساتھ ہے، وہ شخص جو قوم سے آگے بڑھے اور رسیاں اور ڈول تیار کر کے حوض پر جائے اور ان کے لئے پانی بھر کر لائے۔

وذخرا: ذال کے ضمہ اور خاء کے سکون کے ساتھ یعنی ذخیرہ۔

وأجرا: مکمل ثواب۔

توضح :

میرکؒ فرماتے ہیں: صحیح بخاری کی عبارت اسی طرح ہے **وقال الحسن : يقرأ اى المصلى على الطفل بفاتحة الكتاب ويقول: اللهم اجعلنه لنا فرطا و سلفا وأجرا** پس مصنفؒ پر لازم تھا کہ وہ یوں فرماتے: **و عن الحسن أنه قال......:** اور پھر آخر میں یوں فرماتے: **رواه البخاری عنه تعيقا** کیونکہ امام بخاریؒ متخرجین میں سے ہیں تا کہ ان جملہ رواۃ میں سے جن کے ذکر کرنے کا مصنف نے التزام کیا ہے۔

اسی طرح بخاری کی روایت سے یہ مفہوم سمجھا جا رہا ہے کہ حسن اس کا حکم دیا کرتے تھے اور مصنفؒ کے ذکر سے یوں سمجھا جا رہا ہے کہ وہ یہ کرتے تھے دونوں عبارتوں میں فرق واضح ہے۔

اور اسی طرح لفظ "ذخرا" بخاری کی روایت میں نہیں ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا۔

اس کے ساتھ ساتھ مصنف کی عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے آپ غور کریں۔

شاید مصنفؒ کے پیش نظر بخاری کے نسخہ میں الفاظ اس طرح ہوں: "**وكان الحسن يقرأ على الطفل** اور تصحیف کی وجہ سے "کان" قال سے بدل گیا ہو اس لئے یہ سب کچھ ہوا ہو **فوقع فيما وقع**"۔

''کچے'' بچے کی نماز نہ پڑھنے کا بیان

۱۶۹۱: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الطِّفْلُ لَا يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ حَتّٰى يَسْتَهِلَّ۔ [رواه الترمذی و ابن ماجة الا انه لم يذكر ولا يورث]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۵۰/۳ حدیث رقم ۱۰۳۲۔ وابن ماجه ۴۸۳/۱ حدیث رقم ۱۰۳۲۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نا تمام بچے پر نماز نہ پڑھی جائے اور نہ وہ کسی کا وارث ہو اور نہ ہی اس کو وارث بنایا جائے جب تک کہ پیدائش کے وقت کوئی آواز نہ آئے۔ یعنی جب تک زندگی کی علامت ظاہر نہ ہو۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے مگر ابن ماجہ نے وَلَا يُوْرَثُ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

تشریح: یستھل: نھایہ میں ہے ''استھلال الصبی'' کا مطلب ہے بچہ کا ولادت کے وقت آواز نکالنا یہ مثال ہے اور اس کا مدار اُس چیز پر ہے جس سے اس کی زندگی کا پتہ چلتا ہے ابن ہمامؒ کا کلام پہلے گزر چکا ہے جو آپ کو اس جگہ فائدہ دے گا۔

اسنادی حیثیت: ابن حبانؒ اور حاکمؒ نے اس کو صحیح کہا ہے امام حاکمؒ نے کہا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے اور ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: اذا استھل السقط صلی علیه وورث لیکن ''شرح المھذب'' میں امام نوویؒ نے ان دونوں روایات کے صحیح ہونے پر اعتراض کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

۱۶۹۲: وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقُوْمَ الْاِمَامُ فَوْقَ شَیْءٍ وَّالنَّاسُ خَلْفَهٗ يَعْنِیْ اَسْفَلَ مِنْهُ۔ [رواه الدار قطنی فی المجتبیٰ فی کتاب الجنائز]

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳۹۹/۲ حدیث رقم ۵۹۷۔ والدار قطنی ۸۸/۲ حدیث رقم ۱ من باب نھی رسول اللّٰه ان یقوم الامام فوق شیٔ۔

ترجمہ: حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو تنہا کسی چیز کے اوپر کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے جبکہ اور لوگ اس کے پیچھے ہوں یعنی اس سے نیچے ہوں۔ اس حدیث کو دار قطنی نے مجتبیٰ میں کتاب الجنائز میں روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو مسعود الانصاری: عقبہ بن بدر بصری ہیں عقبہ ثانیہ میں حاضر ہوئے جمہور اہل سیر علماء کے نزدیک وہ بدر میں حاضر نہیں ہوئے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ غزوہ بدر میں شامل ہوئے ہیں ذکر کردہ پہلا قول ہی صحیح ہے۔ (ذکرہ المصنف)

یعنی اسفل منہ اور اس کے عکس کی نہی اس سے بطریق اولیٰ سمجھی جا رہی ہے۔

تشریح: قوله رواه الدارقطنی فی المجتبیٰ فی کتاب الجنائز: اس میں اشارہ ہے اس باب میں ذکر کرنے کی عدم مناسبت کی طرف۔ حالانکہ اس کا ذکر اس کتاب کے ''باب الامامة'' کے زیادہ مناسب تھا۔

امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: نماز جنازہ جائزہ نہیں اس حال میں کہ میت جانور پر رکھی ہوئی ہو یا لوگوں کے ہاتھوں میں ہو اس لئے کہ وہ امام کی طرح ہے' اور اختلاف مکان اقتداء سے مانع ہے اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: اس کی صحت کی شرط میت کا مسلمان ہونا، اس کا ظاہر ہونا اور امام کے آگے رکھا ہونا ہے پس اس قید کی وجہ سے غائب پر نماز جنازہ جائز نہیں' اور نہ اس میت پر جو سواری وغیرہ پر ہو اور نہ ہی ایسی جگہ پر ہو کہ کچھ مقتدی اس سے آگے ہوں کیونکہ وہ من وجہ امام کی طرح ہے۔

بَابُ دَفْنِ الْمَيِّتِ

میت کی تدفین کا بیان

الفصل الاول:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا مرتے وقت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا شوق

۱۶۹۳: عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ فِیْ مَرَضِهِ الَّذِیْ هَلَكَ فِیْهِ اِلْحَدُوْا لِیْ لَحْدًا وَّانْصِبُوْا عَلَیَّ اللَّبِنَ نَصْبًا كَمَا صُنِعَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

[رواه مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٢/٦٦٥ حديث رقم (٩٠۔ ٩٦٦)۔ والنسائي ٤/٨٠ حديث رقم ٢٠٠٧۔ وابن ماجه ١/٤٩٦ حديث رقم ١٥٥٦۔

ترجمہ: حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ مجھے دفن کرنے کے لیے لحد بناؤ اور میرے اوپر کچی اینٹیں کھڑی کرو۔ جیسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یعنی جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کیا گیا تھا۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اِلحدوا: ھمزہ وصل کے کسرہ اور حاء کے فتحہ کے ساتھ۔ یا ھمزہ قطعی (کے فتحہ) اور حاء کے کسرہ کے ساتھ۔

لی: ای لاجلی۔

لحدا: مفعول مطلق اپنے باب سے ہے' یا غیر باب سے ہے یا ''تجرید'' کی بناء پر مفعول بہ ہے ای اجعلوا لی لحدًا۔

نہایہ میں ہے: لحد اُس ''شق'' کو کہتے ہیں جو قبر کی ایک جانب میت رکھنے کے لیے کھودی جاتی ہے کیونکہ وہ وسط قبر سے ایک جانب مائل ہوتی ہے کہا جاتا ہے: لحدت وألحدت: ''الحاد'' کا اصل معنیٰ ''المیل'' (مائل ہونا) ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں: ''الحدوا'' ھمزہ وصلی اور حاء کے فتحہ کے ساتھ ہے (علاوہ ازیں) ھمزہ قطعی اور حاء کے کسرہ کے

ساتھ بھی جائز ہے' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لحد بنانا اور اینٹوں کا گاڑنا (کھڑا کرنا) مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں یہ معاملہ صحابہ کے باہمی اتفاق سے ہوا انہوں نے نقل کیا ہے کہ اس کی اینٹوں کی تعداد نو (۹) تھی' اس حدیث میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک قسم کا معجزہ ہے' یا صحابہؓ کی ایک قسم کی کرامت ہے۔ کیونکہ آپؐ نے اپنے لئے صحابہ کو لحد کا حکم دیا تھا پھر صحابہ میں اختلاف ہو گیا اور ان کا اتفاق اس رائے پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے "لحد" کو پسند کیا جیسا کہ عنقریب آگے آئے گا نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اَللَّحْدُ لَنَا وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا ۔ لحد ہمارے لیے ہے اور شق (یعنی درمیان سے کھودنا) ہمارے غیر کے لیے ہے۔

"لحد" لام کے فتحہ کے ساتھ ہے' جیسا کہ "اصول" میں ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: لام کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے' اور تحقیق یہ ہے کہ مصدری معنی میں پہلا قول متعین ہے البتہ اسمی معنی دونوں کے لیے مشترک ہے اور فتحہ زیادہ فصیح ہے جیسا کہ اس طرف صاحب قاموس نے اشارہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں: اللحد ویضم' لحد وہ شق ہے جو قبر کی عرض میں ہوتی ہے' "لحد القبر" باب منع سے ہے اور "الحدہ" کا معنی ہے اس نے اس کے لیے لحد بنائی' اور "الحد المیت" کا معنی ہے میت کو دفن کرنا۔

وانصبوا: صاد کے کسرہ کے ساتھ۔

اللبن: باء کے کسرہ کے ساتھ ہے قاموس میں ہے: اللبن بروزن "کتف" مٹی سے مربع شکل میں بنائی گئی چیز اس لفظ کو کسرہ اور دو کسروں کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے نصباً گاڑنا جیسا کہ معروف ہے۔

اس حدیث کو نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے بھی روایت کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: ابن سعد کی روایت ہے انه عليه الصلوة والسلام الحد کہ "آپ کے لیے لحد بنائی گئی۔"

ابن حبان نے اپنی صحیح میں "حضرت جابر سے روایت کیا ہے" ان کے لیے لحد بنائی گئی اور اس پر اینٹیں لگائی گئیں اور ان کی قبر زمین سے اونچی تھی ایک بالشت کے برابر۔

پھر فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک سنت لحد ہے' مگر جب زمین نرم ہو اور ڈر ہو کہ لحد گر پڑے گی تو "شق" بنائی جائے گی بلکہ مجھے بتایا گیا کہ بعض ریتلی زمین ایسی ہیں جہاں بعض اعرابی رہتے ہیں کہ وہاں شق بنانا بھی ممکن نہیں بلکہ میت کو رکھا جاتا ہے اور اس پر مٹی ڈال دی جاتی ہے۔

قبر میں بطور بستر کے چادر بچھانا ممنوع ہے

۱۶۹۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جُعِلَ فِيْ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطِيْفَةٌ حَمْرَاءُ۔

[رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحيحه ٦٦٥/٢ حديث رقم (٩١۔ ٩٦٧)۔ والترمذی فی السنن ٣٦٥/٣ حديث رقم ١٠٤٨۔ والنسائی ٨١/٤ حديث رقم ٢٠١٢۔ واحمد فی المسند ٣٥٥/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں (لوئی) سرخ چادر ڈالی گئی تھی۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قطیفة: (پھودار چادر) نہایہ میں ہے: **القطيفة هى كساء له خمل وهو المهذب**۔ کہ قطیفہ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر رواں ہو اس کو "مہذب" بھی کہتے ہیں اسی سے حدیث میں ہے: **تعس عبد القطيفة** یعنی ہلاک ہو جائے وہ شخص جو اس کے لیے کام کرتا ہے اور اس کے حصول کی فکر کرتا ہے امام نوویؒ کہتے ہیں: یہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک غلام "شقران" نے ڈالی تھی اور کہا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ اس چادر کو آپ کے بعد کوئی پہنے۔ امام شافعیؒ اور دوسرے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ قطیفہ اور مخدہ وغیرہ کو میت کے نیچے قبر میں رکھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ آپ کے خواص میں سے ہے اور کسی کو زیبا نہیں۔

دار قطنیؒ نے وکیعؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آپ کے خصائص میں سے ہے تورپشتی نے کہا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے بعض احکام میں اہل دنیا سے جدا تھے اسی طرح آپ اپنی وفات کے بعض احکامات میں اہل دنیا سے جدا ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام کو زمین پر حرام کیا ہے اور ان کے جسد کو اللہ تعالیٰ نے بوسیدہ ہونے اور استحالہ سے بچایا ہے اس جسم کا حق یہ ہے کہ ان کے لیے قبر میں کچھ بچھایا جائے جس غرض سے زندہ کے لیے بچھونا وغیرہ بچھایا جاتا ہے وہ غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے باعث آپؐ سے زائل نہیں ہوئی آپؐ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا معاملہ اس طریقہ پر نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں: حضرت علی اور عباس میں جھگڑا ہوا تھا شقران نے یہ چادر قبر اطہر میں رکھ کر اس تنازع کو ختم کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے یہ بہت بعید ہے۔ شیخ عراقیؒ اپنی الفیہ سیرت میں فرماتے ہیں:

وفرشت فى قبره قطيفة ☆ قيل أخرجت و هذا أثبت

"آپ کی قبر میں چادر بچھائی گئی' کہا گیا ہے کہ وہ نکال لی گئی تھی اور یہی اثبت ہے۔"

گویا انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابن عبد البرؒ نے "الاستیعاب" میں کہی ہے کہ "مٹی ڈالنے سے پہلے وہ نکال لی گئی"۔ واللہ اعلم بالصواب

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کوہان نما تھی

۱۶۹۵: وَعَنْ سُفْيَانَ التَّمَّارِ اَنَّهُ رَاٰى قَبْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسَنَّمًا۔ [رواه البخارى]

اخرجه البخارى فى صحيحه ۳/ ۳۰۰ حديث رقم ۱۳۹۰۔

ترجمہ: حضرت سفیان تمارؒ (یعنی کھجور فروش) سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو دیکھا جو اونٹ کے کوہان کی طرح تھی۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سفیان: یہ ابن دینار کوفی ہیں اور تبع تابعی ہیں۔

تشریح: التمار : میم کی تشدید کے ساتھ کھجور کی بیع کرنے والا۔

مسنما: نون مشدد پر فتحہ ہے طیبیؒ فرماتے ہیں: وہ کوہان کی طرح تھی مسطح کے خلاف اور یہ مربع شکل ہوتی ہے۔

ازہار میں کہا ہے کہ امام مالک، ابوحنیفہ اور احمد رحمہم اللہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ قبر کو اونٹ کے کوہان کی طرح (اٹھی ہوئی) بنانا "مسطح" بنانے سے افضل ہے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ برابر سطح والی افضل ہے اس لیے کہ قاسم بن محمد فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی قبریں دیکھیں ان پر "عرصہ" نامی وادی کے سرخ سنگ ریزے بچھائے گئے تھے اور یہ تبھی ہوسکتا ہے جب کہ قبر مسطح ہو۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی قبر برابر سطح والی بنائی اور اس پر پانی چھڑکا سیدؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ آپ کی قبر قدیم رواج سے (ہٹ کر) تبدیل کر دی گئی تھی اور کوہان کی طرح بنائی گئی تھی کیونکہ اس کی دیوار ولید بن عبدالملک کے زمانے میں گر گئی تھی اور بعض کا کہنا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے میں گری تھی' ابن حجر نے اس کی پیروی کی ہے حالانکہ یہ واضح نہیں ہے ان حضرت کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا۔

ابن ہمام کی شرح ہدایہ میں ہے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **حدثنا شیخ لنا یرفعه الی النبیؐ انه نهی عن تربیع القبور وتحصیصها** ہمارے شیخ نے ہمیں مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو مربع شکل بنانے اور انہیں پختہ کرنے سے منع کیا ہے۔

ابن الحسن نے روایت کیا ہے:

أخبرنا ابوحنیفة عن حماد بن أبی سلیمان عن ابراهیم قال: أخبرنی من رأی قبر النبی ﷺ وقبر أبی بکر و عمر' نا شزة من الأرض و علیها فلق من مدر أبیض۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے' سفیان سے اس کے الفاظ یوں ہیں: **دخلت البیت الذی فیه قبر النبیؐ وقبر ابی بکر وعمر مسنمة:** "میں اُس گھر میں داخل ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی قبریں تھیں جو کوہان کی طرح تھیں۔"

روایات متعارضہ میں سے ایک روایت ابوداؤد کی بھی ہے جو انہوں نے قاسم بن محمد سے روایت کی ہے: **قال: دخلت علی عائشة فقلت: یا امت اکشفی لی عن قبر رسول اللهؐ وصاحبیه فکشفت لی عن ثلاثة قبور 'لامشرفة ولا لاطئته مبطوحة ببطحاء العر صة الحمراء** میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دو ساتھیوں کی قبر دکھلایئے انہوں نے تین قبریں دکھائیں جو نہ بلند تھیں' نہ زمین کے برابر تھیں' "عرصہ" نامی وادی کے سرخ سنگ ریزوں کے ساتھ ڈھانپی ہوئیں تھیں۔

لیکن یہ حدیث یہ اس کے معارض نہیں ہے کہ جمع کی ضرورت پڑے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ قاسم کی مراد یہ تھی کہ وہ قبریں کوہان کی طرح تھیں جیسا کہ ابوحفص بن شاہین نے کتاب الجنائز میں اپنی سند کے ساتھ حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے: **سألت ثلاثة کلهم له فی قبر رسول الله ﷺ اب سألت**

أبا جعفر محمد بن علي وسألت القاسم بن محمد بن أبي بکر و سألت سالم بن عبد الله أخبرونی عن قبور آبائکم في بیت عائشة' فکلهم قالوا: إنها مستمة ان کی قبر مسنم تھی' ہمارے اس مذہب کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ قبر کی سطح کا برابر کرنا روافض کا شعار ہے گویا کہ انہوں نے حضرت علی کی اگلی حدیث سے یہ اخذ کیا ہے حالانکہ اس میں کوئی دلالت نہیں' نہ "تسطیح" پر ہے جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے' اور نہ "تسنیم" پر ہے جیسا کہ ان کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے اُس میں تو بناء پر ڈانٹ ہے' وگرنہ تو حقیقتاً زمین کے برابر کرنا جائز نہیں کیونکہ سنت یہ ہے کہ قبر کی پہچان ہوتی ہو' اور ایک بالشت اونچی ہو کہ جیسی آپ کی قبر تھی' جیسا کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

تصویر اور بلند قبر بنانے کی ممانعت

۱۶۹۶: وَعَنْ اَبِی الْهَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیٌّ اَلَا اَبْعَثُكَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَّا تَدَعَ تِمْثَالاً اِلَّا طَمَسْتَهٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَهٗ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٦٦/٢ حديث رقم (٩٣۔ ٩٦٩)۔ وابن داؤد في السنن ٥٤٨/٣ حديث رقم ٣٢١٨۔ والترمذي في السنن ٣٦٦/٣ حديث رقم ١٠٤٩۔ واحمد في المسند ٩٦/١۔

ترجمہ: ابوالہیاج اسدی تابعی سے روایت ہے کہ مجھ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا میں تجھ کو اس کام کے لئے نہ بھیجوں جس کام کے لیے مجھے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے بھیجا تھا' وہ کام یہ ہے کہ تو کسی تصویر کو نہ چھوڑ بلکہ اس کو مٹا دے اور تو کسی بلند قبر کو نہ چھوڑ مگر اس کو برابر کر دے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: "الهياج" یاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور "الاسدی" سین کے فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

ألا: لام کی تشدید کے ساتھ' رغبت دلانے کے لیے ہے' اور بعض کا کہنا ہے کہ فتحہ کے ساتھ ہے تنبیہ کے لیے ہے۔

علی ما بعثنی علیه: ای ارسلنی الی تغیرہ (مجھے اُس کی تغییر کے لیے بھیجا تھا) اسی لیے "علی" کے ساتھ متعدی کیا ہے تورپشتی فرماتے ہیں: ای الا ارسلك للأمر الذی أرسلنی له یعنی: کیا میں تجھے اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے رسول اللہ نے مجھے بھیجا۔

اس کو "علی" کے ساتھ متعدی بنایا چونکہ "بعث" میں استعلاء و تأمیر کا معنی ہے ای هلا أجعلك امیر اعلی ذلك کما أمرنی رسول الله' یعنی میں تجھے اس پر امیر کیوں نہ بنادوں جیسا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر بنایا تھا۔

أن لا تدع: "أن" مصدریہ" لا نافیہ ہے' (بتاویل مصدر کے) خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے ای هو ان لا تدع اور بعض کا کہنا ہے "أن" تفسیریہ ہے اور "لا ناهیه" ہے۔

قوله (تمثالا) صورت کے معنی میں ہے۔

قوله (إلا طمسته) یعنی اُس کو مٹا دے اور ختم کر دے استثناء عام احوال سے ہے "ازہار" میں علماء کا قول ہے تصویر حرام ہے۔ اس کا مٹانا واجب ہے یہاں تک کہ اس کے مشاہدے کے لیے بیٹھنا جائز نہیں۔

قوله (ولا قبرًا مشرفا) جس پر عمارت بنائی جائی نہ کہ وہ قبر جس پر ریت کے ٹیلے وغیرہ سے نشانی بنائی گئی ہو یا نشان زدہ پتھروں کے ساتھ تاکہ اس کی پہچان ہو اور اُس کو کوئی نہ روندے۔

قوله (إلا سوتيه) ''ازھار'' میں علماء کا قول ہے قبر کو ایک بالشت بلند کرنا مستحب ہے اس سے زیادہ مکروہ ہے اور زائد کو گرانا مستحب ہے اس کی مقدار میں اختلاف ہے بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تغلیظاً زمین کے برابر کردو' یہ مطلب اقرب الی اللفظ ہے' یعنی حدیث میں موجود ''سویتہٗ'' کے معنی کے قریب ہے ابن ہمام کہتے ہیں: یہ حدیث محمول ہے کہ وہ جو بلند وبالا عمارتیں تعمیر کرتے تھے ہماری مراد قبر کی کوہان نہیں ہے' بلکہ وہ مقدار جو زمین سے ظاہر ہوتی ہے اور اس سے الگ تھلگ ہو واللہ سبحانہ اُعلم۔ میرک فرماتے ہیں اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

قبر پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے کی ممانعت

١٦٩٧: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ۔ [رواه مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٦٧/٢۔ حديث رقم (٩٤۔ ٩٧٠)۔ والترمذي ٣٦٨/٣ حديث رقم ١٠٥٢۔ والنسائي ٨٦/٤ حديث رقم ٢٠٢٧۔ وابن ماجه ٤٩٨/١ حديث رقم ١٥٦٢۔ واحمد في المسند ٢٩٩/٦۔

ترجمہ :حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو گچ کرنے سے اور قبر پر عمارت بنانے سے اور قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کو مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح : ''ازہار' میں ہے قبروں کو چونا گچ کرنے کی ممانعت کراہیت کے لیے ہے' یہ اس پر بناء کو بھی شامل ہے اور عمارت بنانے کی ممانعت کراہت کے لیے اگر اس کی ملک میں ہو اور حرمت کے لیے ہے اگر عام قبرستان میں ہو۔ اس کو گرانا واجب ہے اگر چہ مسجد ہو تورپشتی فرماتے ہیں: دو صورتوں کو متحمل ہے ایک صورت یہ ہے کہ قبر پر پتھروں کے قائم مقام ہے۔ دوسری وجہ اُس پر خیمہ وغیرہ لگانا ہے اور ان دونوں سے منع کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں میں کہتا ہوں اس سے استفادہ کیا جائے کہ مثلاً اُس کے نیچے قراء بیٹھیں گے تو پھر ممانعت نہیں ہے' قاریوں کے بیٹھنے اور ان کی قبر پر قراءت کے بارے میں اختلاف ہے مختار عدم کراہت ہے۔

پھر تورپشتی کہتا ہے: چونکہ اہل جاہلیت کے کاموں میں سے ہے کہ وہ میت پر سایہ کرتے تھے ایک سال تک' ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر بانس دیکھا انہوں نے اپنے غلام سے کہا اس کو اُکھاڑ دے اس کا عمل اس پر سایہ کرے گا ہمارے علماء میں سے بعض شراح کہتے ہیں: مال کے ضیاع کی وجہ سے ممانعت سلف نے جائز قرار دیا ہے کہ مشائخ اور مشہور علماء کی قبر پر عمارت بنادی جائے تاکہ لوگ ان کی زیارت کریں اور اس کے نیچے بیٹھ کر آرام حاصل کریں۔

قوله :وأن يقعد عليه مبنی علی المفعول جیسے پیچھے دو فعل ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ممانعت: بول و براز اور باتیں کرنے کے لیے ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ممانعت سوگ کے لیے بیٹھنے سے ہے کہ وہ قبر سے چمٹ جائے اور وہاں سے واپس نہ لوٹے

ایک قول ہے کہ مطلق ہے کیونکہ اس میں اپنے مسلمان بھائی کے حق اور اس کی حرمت کی بنا پر تخفیف ہے جیسا کہ یہ قول ہمارے بعض علماء نے کہا ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: قعود سے مراد جلوس ہے۔اس سے منع کیا ہے اپنے مسلمان بھائی کے حق میں نرمی کے لیے ایک جماعت نے اُسے قضائے حاجت پر محمول کیا ہے اور اسکی نسبت زید بن ثابت کی طرف کی ہے پہلا ہی صحیح ہے اس کو طبرانی نے بیان کیا ہے۔

عمارہ بن حزم سے روایت ہے: **قال رأنی رسول الله ﷺ جالسًا علی قبر فقال یا صاحب القبر انزل من علی البقر لا تؤذی صاحب القبر و لا یؤذیك"**

سعید بن منصور نے ابن مسعود سے بیان کی ہے۔

انه سئل عن الوط علی القبر' قال : کما اکره اذی المؤمن فی حیاته فانی اکره اذاه بعد موته۔

ان سے قبر کو روندنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں مؤمن کو اس کی زندگی میں تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں اور اس کی موت کے بعد بھی اس کو تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں۔

۱۶۹۸:وَعَنْ اَبِیْ مَرْثَدِ الْغَنَوِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَجْلِسُوْا عَلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَیْهَا۔

[رواه مسلم]

اخرجه مسلم فی صحیحه ٦٦٨/٢ حدیث رقم (٩٧- ٩٧٢)۔ وابوداوٗد فی السنن ٥٥٤/٣ حدیث رقم ٣٢٢٩۔ والترمذی ٣٦٧/٣۔ حدیث رقم ١٠٥٠۔ والنسائی ٦٧/٢ حدیث رقم ٧٦٠۔

ترجمہ :حضرت ابومرثد غنویؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قبروں پر مت بیٹھو اور نہ قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **ابی مرثد** میم اور''ثاء'' کے فتحہ کے ساتھ۔

قوله (الغنوی) غین اور نون کے فتحہ کے ساتھ۔

قوله (قال :قال رسول الله ﷺ لا تجلسوا علی القبور)۔ابن ہمام کہتے ہیں: انہوں نے قبر پر بیٹھنے اور اسے روندنے کو ناپسند کیا ہے۔اور اس وقت جو لوگ اپنے اقارب کو دفن کرنے کرتے ہیں پھر اس کے اردگرد لوگوں کو دفن کرتے ہیں اور قبروں کو روندتے ہیں تا کہ وہ اپنے رشتے دار کی قبر تک پہنچ جائیں یہ مکروہ ہے ان کے نزدیک قبر کے پاس سونا اور قضائے حاجت مکروہ ہے بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ ہر وہ کام مکروہ ہے جو مسنون و معہود نہ ہو سوائے قبروں کی زیارت اور دعا جو کہ کھڑے ہونے کی حالت میں ہو جیسے رسول اللہ ﷺ جنت البقیع تشریف لے جا کر کیا کرتے تھے اور دعا پڑھتے **السلام علیکم دار قوم مؤمنین وإنا ان شاء الله بکم لا حقون أسال الله لی ولکم العافیة۔**

قوله (و لا تصلوا) یعنی اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے۔

إلیها کیونکہ اس میں وہ انتہائی تعظیم ہے جو معبود کے لیے ہوتی ہے کہ وہی اس تعظیم کے مستحق ہیں یہ قول طیبیؒ کا ہے یہ تعظیم

اگر حقیقتاً قبر یا صاحب قبر کے لیے ہو تو یہ بہت بڑا کفر ہے اس لیے تشبہ بھی مکروہ ہے اور زیادہ مناسب ہے کہ کراہت تحریمی ہے اس کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ جنازہ کو سامنے رکھنا' اس کے ساتھ اہل مکہ کی آزمائش کی گئی وہ جنازے کو کعبہ کے پاس رکھتے تھے پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول: مستقبلین إلیها و عندها یہ حدیث سے غیر ظاہر ہے بلکہ جو اس کا مفہوم ہے اُس کے بھی منافی ہے آپ اس میں غور کریں۔

میرکؒ نے کہا ہے: اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

قبر پر بیٹھنا کس قدر ناپسندیدہ عمل ہے

۱۶۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يَّجْلِسَ اَحَدُ كُمْ عَلٰى جَمْرَةٍ فَتُحْرِقَ ثِيَابَهٗ فَتَخْلُصَ اِلٰى جِلْدِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّجْلِسَ عَلٰى قَبْرٍ۔ [رواہ مسلم]

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٦٧/٢ حديث رقم (٩٦- ٩٧١)- وابوداؤد في السنن ٥٥٣/٣ حديث رقم ٣٢٢٨- والنسائي ٩٥/٤ حديث رقم ٢٠٤٤- وابن ماجه ٤٩٩/١ حديث رقم ١٥٦٦-

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم میں کوئی شخص آگ کے انگارے پر بیٹھے اور وہ آگ اس کے کپڑے جلا دے اور وہ آگ جلد تک پہنچ جائے بہ نسبت اس کے کہ کوئی قبر پر بیٹھے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله (فتحرق) تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے فتخلص لام کے ضمہ کے ساتھ بمعنی "تصل"۔

قوله (إلى جلده) قبر پر بیٹھنا اور اس کے مضر اثرات کا دل تک سرایت کر جانا یہ ایسا ہے جیسے کپڑوں سے سرایت کر کے بدن تک پہنچ جانے اور اسے خبر بھی نہ ہو۔

قوله (خیر له) اُس کے لیے اچھا اور آسان ہے۔

قوله (من أن یجلس علیٰ قبر) عموم ظاہر ہے ابن حجر کا قول کہ مسلم کی قبر مراد ہے اگر اس کو خاص کرنا جائز ہوتا تو اس اختصاص کی دلیل کی ضرورت تھی باوجودیکہ وہ منقوض ہے جیسا کہ اس کے کلام میں آگے آ رہا ہے میت کی روح جو اس کے ساتھ کیا جاتا ہے اُس کو محسوس کرتی ہے اور زندہ بھی درد محسوس کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ جو جسم روح کے متعلق ہے وہ بوسیدہ نہیں ہوتا۔ "ازہار" میں بعض علماء سے منقول ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ وہ احادیث میں بیٹھنے اور باتیں کرنے کی سختی پر انہیں محمول کیا جائے۔ وہ حرام ہے۔ مطلق بیٹھنے پر ناراضگی نہیں ہے وہ کدوہ ہے یہ تفصل حسن ہے۔ مطلق بیٹھنے کی طرح ٹیک لگانا ہے اس کو سید جمال الدین نے نقل کیا ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: اس کے ظاہر سے معلوم ہے کہ اس پر بیٹھنے کی حرمت ہے اس کی مثل اس تکیہ لگانا اور ٹیک لگانا ہے مسلم کی شرح میں اصحاب سے ایک بحث ہے لیکن اس مذہب میں شافعی اور جمہور اس کو تنزیہی کراہت کہتے ہیں شرح مسلم میں جو قول ہے وہ صحیح نہیں بعض نے اس کو کسی دوسری حدیث کی وجہ سے صحیح اور مختار رکھا ہے حالانکہ ایسا نہیں جس طرح اُس نے کیا۔ کیونکہ

ابو ہریرہ حدیث کے راوی ہیں راوی کی تفسیر دوسری کی تفسیر پر مقدم ہوتی ہے انہوں نے حدیث میں تفسیر کی ہے بول و براز کے لیے بیٹھنے والے کے متعلق ہے اسی پر ابن وہب نے اس کو اپنی مسند میں روایت کیا ہے (نبیؐ سے ان الفاظ کے ساتھ)۔

من جلس علی قبر یبول علیه أو یتغوط

یہ حرام ہے اس پر اجماع ہے اس میں کوئی کلام نہیں مزید کہا چٹائی بچھانا کسی ضرورت یا قراءت کے لیے مکروہ نہیں ہے اگرچہ یہ وضاحت طلب ہے اس کو ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اس لئے بھی کہ حاجت کی صورت میں میت کی بے حرمتی نہیں ہے' بخلاف عدم حاجت کی صورت کے' یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے کہ جب تک میت بوسیدہ نہ ہوئی ہو البتہ بوسیدگی کے بعد حرمت ہے اور نہ کسی قسم کی کوئی کراہت ہے عدم احترام کی وجہ سے کھدائی کے علاوہ میں اعتبار حاجت کھلم کھلا محل نظر ہے اور اسی طرح اس کو قبل از بوسیدگی کی قید کے ساتھ مقید کرنا بھی محل نظر ہے کیونکہ یہ نصوص کے ظاہر کے معارض ہے' واللہ اعلم۔

میرکؒ نے کہا ہے: اس کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے

الفصل الثانی:

بغلی قبر مسنون ہے

۱۷۰۰: وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا يَلْحَدُ وَالْاٰخَرُ لَا يَلْحَدُ فَقَالُوْا اَيُّهُمَا جَاءَ اَوَّلًا عَمِلَ عَمَلَهٗ فَجَاءَ الَّذِيْ يَلْحَدُ فَلَحَدَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواه في شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۳۸۸/۵ حدیث رقم ۱۵۱۰۔

ترجمہ: عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ میں دو شخص (قبر کھودنے والے تھے ایک ان میں سے ابوطلحہ انصاریؓ تھے جو لحد بناتے تھے یعنی بغلی قبر اور دوسرے ابوعبیدہ بن الجراح جو لحد نہیں کرتے تھے بلکہ شق کرتے تھے۔ جیسے یہاں قبریں بنتی ہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہؓ نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ان میں سے جونسا پہلے آ جائے اپنا کام کرے یعنی اگر لحد والا پہلے آئے تو لحد کھودے اور شق والا پہلے آئے تو شق کھودے۔ پس وہ شخص آیا جو لحد کھودا کرتا تھا۔ تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لحد کھودی گی شرح السنہ میں یہ روایت موجود ہے۔

تشریح: یلحد: یاء اور ''حاء'' کے فتحہ کے ساتھ یعنی لحد کھودتا تھا ان کا نام ابوطلحہ زید بن سہل انصاری ہے اور صندوقی قبر کھودنے والے صاحب کا نام ابوعبیدۃ الجراح ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ''وہ ضریح'' (شق) کا کام کرتے تھے جو قبر کے درمیان میں ہوتی ہے۔

قولہ (قالوا) صحابہ نے آپ کی موت کے بعد اتفاق کیا۔

قولہ (ایھما جاء اولاً) تنوین کے ساتھ منسوب ہے' ایک نسخہ میں ''اول'' فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ ایک قول ہے کہ اول ضمہ کے ساتھ ''قبل'' کی طرح مبنی ہے اس پر فتحہ اور نصب جائز ہے۔

قولہ (عمل عمله) نبی کی قبر میں لحد یا شق کا کام۔

قولہ (فجاء الذی یلحد) دوسرے سے پہلے جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اس نے اپنے نبی کے لیے کس کو چنا۔

قولہ (فلحد) فاء کے فتحہ کے ساتھ۔

قولہ (لرسول اللہ ﷺ) یعنی آپ کی قبر کے لیے یا آپؐ کی وجہ سے قبر لحد بنائی۔

اسنادی حیثیت : ''سید'' کہتے ہیں اس کا مرسل ہونا ظاہر ہے چونکہ عروہ تابعی ہے وہ اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسروں سے روایت کرتے ہیں اور اس نے ''ازھار'' میں کہا ہے: ابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف نسبت کرتے ہوئے روایت کی ہے مصنف کو ابن ماجہ میں نہیں ملی و گرنہ وہ یوں نہ کہتے اس نے شرح السنہ میں اس کو روایت کیا۔ ممکن ہے کہ ابن ماجہ کے الفاظ مذکورہ الفاظ سے مختلف ہوں اسی لیے ان کی طرف نسبت نہیں کی گئی۔

لحد نکالنا مسنون ہے

۱۷۰۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّحْدُ لَنَا وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا ۔

[رواه الترمذی وابو داود والنساء وابن ماجة]

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵۴٤/۳ حدیث رقم ۳۲۰۸۔ والترمذی فی السنن ۳٦۳/۳ حدیث رقم ۱۰٤۵ والنسائی ۸۰/٤ حدیث رقم ۲۰۰۹۔ وابن ماجه ٤۹٦/۱ حدیث رقم ۱۵۵٤۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لحد ہمارے لیے ہے اور شق ہمارے غیروں کے لئے ہے۔ اس کو امام ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح : زین العرب تورپشتی کی پیروی کرتے ہوئے کہتا ہے لحد ہمارے لیے زیادہ اچھی اور اولیٰ ہے اور شق دوسروں کے لیے اُولیٰ ہے' یعنی اہل ایمان جو ہم سے پہلے تھے انہوں نے اس کو اختیار کیا ہے اس میں لحد کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن ''شق'' کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوعبیدہؓ دین میں جلیل القدر اور امین تھے پھر بھی وہ ''شق'' بناتے تھے۔ اگر اس سے روکا ہوتا تو صحابہ کیوں کہتے الیھا جاء اولیٰ عمل عمله اور کبھی کبھار زمین نرم ہونے کی وجہ سے اضطراری حالت میں ''شق'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: ممکن ہے نبی ﷺ نے ضمیر جمع سے اپنے آپ کو مراد لیا ہو۔ اثر او ثر لی اللحد یہ ایسی خبر ہے جو معجزہ ہے۔

سید کہتا ہے: یہ توجیہ بہت بعید ہے آپؐ کے اس قول کی وجہ سے الشق لغیرنا' غور کریں غور کرنے کی وجہ یوں کہا جائے بعید نہیں کہ معنی یہ ہو شق انہوں نے اختیار کی جو ہمارے علاوہ ہیں اور ہم سے پہلے تھے۔ زیادہ واضح یہ ہے کہ جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے میرے لیے لحد پسند کی گئی اور بعد میں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا اور شق ہمارے علاوہ کے لیے خواہ وہ ہم سے پہلے ہو یا ہمارے بعد یہ لحد ہم انبیاء کی جماعت کے لیے ہے اور شق ہمارے علاوہ دوسروں کے لیے ہے یہ توجیہ پچھلی توجیہ سے زیادہ

مناسب ہے کیونکہ اس توجیہہ کے ظاہر سے "شق" کی کراہت معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے کہا: "شق" کو ہم سے پہلے والے ادیان کے لوگوں نے اختیار کیا۔

اسنادی حیثیت: سیدؒ نے کہا: ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ تمام سے جو مراد ہیں وہ بھی قلم بند ہیں۔

۱۷۰۲: وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدُ اللّٰهِ۔

اخرجه ابن ماجه فى السنن ۱/ ۴۹۶ حديث رقم ۱۵۵۵۔ واحمد فى المسند ۴/ ۳۵۷۔

ترجمه اور امام احمدؒ نے اس روایت کو جریر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: نوویؒ نے کہا: ضعیف ہے ابن سکن نے اس پر اعتراض کیا ہے اور اس کو اپنی صحاح میں روایت کیا ہے۔

قبر گہری اور صاف ہونی چاہیے

۱۷۰۳: وَعَنْ هِشَامِ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمَ اُحُدٍ احْفِرُوْا وَاَوْسِعُوْا وَاَعْمِقُوْا وَاَحْسِنُوْا وَادْفِنُوا الْاِثْنَيْنِ وَالثَّلَاثَةَ فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ وَقَدِّمُوْا اَكْثَرَهُمْ قُرْاٰنًا۔

[رواه احمد والترمذى وابو داود والنسائى وروى ابن ماجة الى قوله واحسنوا]

اخرجه ابو داوٗد فى السنن ۳/ ۵۴۷ حديث رقم ۳۲۱۵۔ والترمذى ۴/ ۱۸۵ حديث رقم ۱۷۱۳۔ والنسائى۔

ترجمه :حضرت ہشام بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قبریں کھودو اور فراخ کرو اور گہرا کرو اور قبروں کو اچھا کرو۔ یعنی ہموار اور کوڑے کرکٹ سے صاف کرو اور (مردوں کو) دفن کرو دو آدمیوں کو اور تین کو ایک قبر میں۔ قبلے کی جانب سب سے پہلے اس شخص کو رکھو جس کو قرآن زیادہ یاد ہو۔ یہ احمدؒ اور ترمذیؒ اور نسائیؒ نے روایت کی ہے اور ابن ماجہؒ نے لفظ اَحْسِنُوْا تک روایت کی ہے۔

تشریح: ھشام بن عامر: ابن امیہ بن خشخاش البخاری الانصاری جاہلیت میں ان کا نام شہاب تھا نبیؐ نے ان کا نام تبدیل کر کے ہشام رکھ دیا ان کے باپ عامر غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے ہشام بصرہ میں رہتے تھے اور وہیں فوت ہوئے یہ قول سیدؒ نے ذکر کیا ہے۔

قوله (أن النبی ﷺ قال يوم أحد) غزوہ کے اختتام کے وقت جب شہداء کو دفن کرنے کا ارادہ کیا۔

قوله (إحفروا) ھمزہ وصل کے ساتھ بعض شافعیہ نے اس سے دلیل لی ہے کہ انہوں نے "فساقی" میں دفن کرنے سے منع کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ اس میں مفاسد ہیں جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔

قوله (وأسعوا) ھمزہ قطعی کے ساتھ قوله (واعمقوا) اس طرح قاموس میں ہے "اعمق البر جعلها عميقة" اس نے کنواں کھودا اور اس کو گہرا کیا مظہر کہتا ہے: یعنی انہوں نے آدمیوں کی قامت کے برابر گہرا کیا ابن حجرؒ کہتے ہیں: اعمقوا "عین" کے ساتھ ایک قول یہ بھی ہے کہ "غین" کے ساتھ ہے میں کہتا ہوں جو کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں یہاں یہ روایت اور درایت کے مخالف ہے۔ نا قابل صاحب قاموس نے ذکر کیا ہے کہ غمق نمی والی زمین کو کہتے ہیں یہ جو پانیوں کے قریب ہو نہایہ میں ہے

نمی والی زمین جو پانیوں اور ابھری ہوئی جگہ کے قریب ہو۔

قولہ (وأحسنوا) میت کو دفن کرنے میں احسن انداز اختیار کرو شارح نے ''ازھار'' میں یہ کہا ہے زین العرب نے مظہر کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے: قبر کو اچھے انداز میں بناؤ اس کی برابری بلندی اور پستی حساب سے رکھو اور اس کو مٹی اور گندگی وغیرہ سے بچانا ہے۔

قولہ (وادفنوا الاثنین) ہمزہ وصل کے ساتھ نہ کہ قطعی کے ساتھ جس طرح ان کا وہم ہے قابل اصلاح۔

قولہ (والثلاثۃ) نصب کے ساتھ یعنی مردوں سے۔

قولہ (في قبر واحد) امر اس میں ضرورت کے تحت اباحت کے لیے ہے اس کے علاوہ جائز نہیں' پہلے صیغہ میں امر وجوب کے لیے اور باقیوں میں مندوب کے لیے ہے۔

قولہ (وقدموا أکثرھم قرأنا) لحد کی دیوار کی طرف تاکہ وہ کعبہ کے قریب ہو جائے ''ازھار'' میں ہے امر مندوب کے لیے ہے اس میں ارشاد عالم باعمل کی عظمت پر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ زندہ اور مردہ وہ ہمیشہ آگے (امام) ہوگا۔ ابن ہمام نے کہا کہ جان لیں ایک نماز (جنازہ) جیسا کہ ایک میت پر ہے اسی طرح سب پر ہو جائے گی اگر کئی جنازے جمع ہو جائیں اگر چاہے تو ہر ایک کے لیے الگ نماز جنازہ پڑھے یا تمام پر ایک جگہ رکھ کر ایک ہی نماز جنازہ پڑھ دے اور رکھنے کی کیفیت میں اختیار ہے اگر چاہے تو ایک ہی قطار میں لمبائی رکھ دیں اور جو ان میں افضل ہو اس کے قریب امام کھڑا ہو جائے یا پھر ایک کے پیچھے ایک قبلہ کی سمت میں رکھ دے اور امام کی طرف ترتیب کی نسبت جیسے ان کی ترتیب زندگی میں امام کے پیچھے تھی چنانچہ جو سب سے افضل ہوگا وہ قریب پھر اس کے بعد جو اس سے کم ہے جو اُس سے (امام سے) دور ہوگا وہ قبلہ کے قریب ہوگا اگر ان کے لیے ایک قبر ہو تو ان کے قبر میں اتارنے کی ترتیب اس کے برعکس ہوگی۔ جس طرح آپؐ نے اُحد میں شہداء کے ساتھ کیا اور ظاہر یہ ہے کہ یہاں ''اقربیت'' اپنے باب پر ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا اس حدیث کو حدیث امامت پر قیاس کرنا' قیاس فاسد ہے کیونکہ وہاں دو قرائن صارفہ عن الظاہر ہیں ان میں سے پہلا ہے صدیق کو امامت کے لئے مقدم کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''اقرؤ کم ابی'' کے ساتھ ہے اور دوسرا علماء کی تعلیل کہ مسائل نماز کی زیادہ سمجھ رکھنے والا اولیٰ ہے۔

کیونکہ مسائل کی امام کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے قراءت تو نماز کا ایک رکن ہے۔

اور حسن صحیح کہا ہے یہ قول میرکؒ نے منقول ہے۔

شہیدوں کی آخری آرام گاہیں ان کی شہید ہونے کی جگہیں ہیں

۱۷۰۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ اُحُدٍ جَاءَ تْ عَمَّتِي بِاَبِي لِتَدْفِنَهُ فِي مَقَابِرِ نَا فَنَادٰى مُنَادِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوا الْقَتْلٰى اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداود والنسائی والدارمی ولفظہ للترمذی)

اخرجہ ابوداوٗد فی السنن ۵۱۴/۳ حدیث رقم ۳۱۶۵۔ والترمذی ۱۸۷/۴۰ حدیث رقم ۱۷۱۷۔ والنسائی

۷۹/٤ حديث رقم ٢٠٠٤۔ وابن ماجه ٤٨٦/١ حديث رقم ١٥١٦۔ والدارمی ۳٥/۱ حديث رقم ٤٥۔ واحمد فی المسند ۲۹۷/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ احد کا دن ہوا تو میری پھوپھی میرے باپ کو لائیں۔ تا کہ ان کو ہمارے مقبرے میں دفن کریں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نداد ینے والے نے ندا دی۔ یعنی پکارنے والے نے پکارا کہ شہیدوں کو ان کے شہید ہونے کی جگہ کی طرف لے جاؤ۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابوداؤد اور نسائیؒ اور دارمی نے روایت کیا اور اس کے الفاظ ترمذی کے ہیں۔

تشریح: قال لما كان يوم احد جاء ت عمتی۔ ازھار میں ہے: جابر کی پھوپھی فاطمہ بنت عمرو بن حرام الانصاری ہیں' اس کو سید نے ذکر کیا ہے۔

قولہ (بأبی) باء متعدی بنانے کے لیے ہے۔

قولہ (لتدفنه فی مقابرنا) مدینہ میں۔

القتلی : قتیل کی جمع ہے وہ مقتول ہے یعنی شہداء۔

قولہ (إلی مضاجعهم) یعنی ان کی شہید ہونے کی جگہوں کی طرف' معنی یہ ہے کہ شہداء کو ان کی جگہوں سے دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے بلکہ ان کو وہیں دفن کرو جہاں پر شہید ہو جائیں اس لیے جو کسی جگہ فوت ہو جائے اس کو کسی دوسرے شہر منتقل نہ کیا جائے یہ قول ہمارے بعض علماء کا ہے اس نے ازھار میں کہا ہے حکم جو آپؐ کے قول میں (ردو القتلی) وجوب کے لیے میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اس سے اغلب طور پر تغیر آئے گا اس لیے حرام ہے یہ دلیل زیادہ واضح ہے اور حجت زیادہ قوی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے حرام ہونے کی یہ صحیح ہے یہ قول سید نے نقل کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ منتقل کرنا شہداء کے ساتھ خاص ہے۔ اس لیے کہ ابن أبی وقاص کو ان کے محل سے مدینہ کی طرف صحابہ کی جماعت کی موجودگی میں منتقل کیا گیا اور انہوں نے اس پر انکار نہیں کیا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ نہی کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ منتقل کرنا دفن کے بعد بغیر عذر کے ہے اس کی تائید لفظ "مضاجعهم" سے ہے شاید کہ شہداء کے ساتھ تخصیص کی وجہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [آل عمران۔ ١٥٤] "کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے اس سے غرض یہ تھی کہ خدا تمہارے سینوں کی باتوں کو آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کر دے اور خدا دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے"۔

اس میں دوسری حکمت بھی ہے ان کا اجتماع ایک جگہ پر زندگی، موت، بعث اور حشر کے لحاظ سے اور ان کی زیارت کے لحاظ سے ہے یہ جبل کی زیارت کا وسیلہ ہے جیسا کہ آپؐ کا قول ہے: أحد جبل یحبنا و نحبه" مظہر کہتا ہے' اس میں دلالت ہے کہ میت اس جگہ سے جہاں اس کی وفات ہوئی ہو دوسری جگہ منتقل نہ کی جائے۔

اشرف کہتا ہے: یہ ابتدا میں تھا یعنی اُحد کے شروع میں اس کے بعد نہیں روایت کیا گیا ہے کہ جابرؓ نے اپنے باپ عبداللہ کو چھ ماہ بعد جو احد میں شہید ہوئے تھے بقیع منتقل کیا اور وہاں دفن کیا۔

طیبیؒ کہتے ہیں: ظاہر ہے جب منتقل کرنے کی ضرورت ہو تو کیا جا سکتا ہے وگرنہ نہیں ہم نے روایت کیا ہے عن مالك عن عبد الرحمٰن بن عبد الله بن صعصعه انہیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ عبداللہ بن عمرو اور عمرو بن جموح انصاری صحابی تھے ان دونوں کی قبریں سیلاب نے اکھاڑ پھینکی تھیں اور ان کی قبریں سیلاب کے پاس ہی تھیں ان دونوں کی ایک ہی قبر تھی اور دونوں غزوۂ احد میں شہید ہوئے ان کے لیے دوسری جگہ قبریں کھودی گئیں ان کے جسم ایسے تھے جیسے کل کی موت ہوئی ہے ان میں ایک کو زخم لگا تھا اور ان کا ہاتھ زخم پر تھا۔ جب ان کو دفن کیا گیا تھا وہ اب تک اسی طرح تھا پھر ان کے ہاتھ کو زخم سے ہٹایا گیا وہ اسی جگہ واپس چلا گیا جب اُس کو چھوڑا گیا۔ احد اور اس نیا گڑھا کھودنے کے درمیان ۴۶ سال کا فاصلہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول ان کا قول ہے اس لیے کہ جابرؓ کے متعلق گمان نہیں ہے کہ وہ نہی کے بعد منتقل کریں ابن ہمام کہتے ہیں کہ قبر طویل مدت کے بعد مٹی ڈال دینے کے بعد نہ کھودی جائے تجنیس میں ہے عذر یہ کہ پتا چلا زمین مغصوب ہے یا اس کو لینے والا شفیع ہے۔ اس لیے بہت سے صحابہ کی قبریں تبدیل نہیں کی گئی، انہیں ارض حرب میں دفن کیا گیا جب کوئی عذر نہ تھا عذر میں سے یہ بھی ہے کہ لحد میں کپڑے کے ساتھ شال یا درہم گر جائے جو کسی کی ملکیت ہوں۔

مشائخ اس عورت کے بارے میں اس پر متفق ہیں کہ ایک کا بیٹا دفن کر دیا گیا اور وہ کسی دوسرے شہر میں تھی۔ وہ تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ اس نے اُسے منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ إنه لا سعها ذلك یہ جواز شاذ ہے جو بعض متاخرین سے ہے وہ اس کی جانب متوجہ نہیں ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا کوئی علم مشائخ میں قبر کو دوبارہ اکھاڑنے کے بارے میں۔ اور بغیر غسل اور نماز جنازہ کے دفن کر دیا گیا۔ انہوں نے اس فرض کے تدارک کو جائز نہیں کہا اگر انہوں نے دفن سے پہلے یا اینٹیں لگانے سے پہلے ایک میل یا دو میل منتقل کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تجنیس میں کہا ہے قبرستان کی طرف مسافت کی مقدار اس مقدار کے برابر ہو جاتی ہے سرخسی کہتے ہیں: محمد بن سلمہ کا قول اس پر دلیل ہے کہ اُسے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنا مکروہ ہے اور مستحب یہ ہے کہ اس کو اُس شہر کے قبرستان میں دفن کیا جائے جہاں اس کی موت واقع ہوئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ جب وہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت کے لیے گئیں جو کہ شام میں فوت ہوئے تھے اور ان کا جنازہ وہاں سے لایا گیا تھا' تو آپؐ نے فرمایا: ولو كان الأمر فيك اليّ ما نقلتك ولد فنتك حيث مت "التجنیس" میں ہے کہ ایک شہر سے یا ملک سے دوسرے شہر یا ملک منتقل منتقل کرنے پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ یعقوبؑ مصر میں فوت ہوئے اور انہیں شام میں منتقل کر دیا تا کہ وہ اپنے آباء کے ساتھ شامل ہو جائیں...... یہ بات مخفی نہیں کہ ہم سے پہلے (پہلی امتوں کے لیے) مشروع تھا اس میں کوئی ایسی شرط نہیں جو ہمارے لیے مشروع ہونے پر دلالت کرے مگر سعد بن ابی وقاصؓ کی لاش کو منتقل کیا گیا وہ مدینہ سے چار فرسخ کے فاصلہ پر کسی علاقے میں فوت ہوئے انہیں مدینہ کی طرف کندھوں پر لایا گیا ... کے بعد اس میں معاملے پر کوئی دلالت نہیں۔

ممکن ہے کہ یعقوب اور یوسف علیہ السلام کے جسموں کو کسی عذر کی وجہ سے منتقل کرنے پر محمول کیا جائے اسی طرح گناہ اور کراہت میں کوئی منافات نہیں کراہت تنزیہی ہے وہ خلاف اَولیٰ ہے صاحب ہدایہ نے کہا ہے: کہ جو کسی شہر میں مرجائے اُسے دوسرے میں منتقل کرنا مکروہ ہے چونکہ یہ ایسا کام ہے جو اس دفن میں تاخیر کا سبب ہے اور اس کو کراہت پر کفایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حرمین میں سے ایک کی طرف منتقل کرنے میں فائدہ مترتب ہوتا ہے یا انبیاء یا اولیاء میں سے کسی ایک کی قبر کے پاس یا اس کے عزیز و اقارب اس شہر میں اس کی زیارت کریں اس میں کراہت نہیں ہے مگر جو اس کے خلاف شہدائے احد والی حدیث ہے یا جو اس کے معنی میں ہے وہ مطلق شہداء کے متعلق ہے۔ واللہ اُعلم۔

یعنی حدیث کے لفظ مراد ''هذا الفظ'' ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے یہ قول میرکؒ نے نقل کیا ہے ترمذی کے لفظ اور اس کو صحیح کہا ہے: عن جابر أمرنا رسول الله ﷺ بقتلی أحد ان یردوا إلی مضاجعهم و کانوا نقلوا إلی المدینة۔ ابن حجر کہتے ہیں اس صحیح حدیث کے ساتھ ان کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں پہلا مرتبہ انہیں لوٹنے کا حکم دیا اس کے بعد نہیں: جیسا کہ روایت کیا گیا ہے: أن جابرا جاء بأبیه إلی البقیع بعد ستة أشهر۔ وہ مردود ہے چونکہ یہ جمع مقبول ہے بلکہ فقہاء کے نزدیک متعین ہے۔

میت کو قبر میں کیسے اُتارا جائے

۱۷۰۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سُلَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهِ۔ (رواه الشافعی)

البیهقی فی السنن و الشافعی فی مسنده ص ۳٦۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو سر کی طرف سے قبر میں اتارا گیا۔

سل: لام کی تشدید کے ساتھ بصیغہ مجہول ہے نہایہ میں کہ کسی چیز کو آہستہ آہستہ تدریجاً نکالنا۔

تشریح: قبل: قاف کے کسرہ اور ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ یعنی سر اور پہلو کی جہت سے ضمیر آپ کی طرف راجح ہے ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے عن عمرو بن عطاء عن عکرمة عن ابن عباس بیہقی نے بھی اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے یہ قول سید سے منقول ہے اس میں ضعف کے شائبہ کی طرف اشارہ ہے۔ ابن حجرؒ کا قول کہ سید کی سند صحیح ہے یہ تصحیح کی محتاج ہے وہ تو حسن بھی ثابت نہیں صحیح کیسے ہوگی؟ صاحب ہدایہ کہتے ہیں امام شافعیؒ کے ہاں ''یسل سلا'' ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں چار پائی قبر کے انتہائی آخری حصے کے پاس رکھی جاتی ہے یہاں تک کہ میت کا سر قبر سے قدم والی جگہ کے برابر ہوتا ہے جو میت کا سر قبر میں داخل کیا جاتا ہے یا اس کے پاؤں سر کی جگہ پر ہوتے ہیں پھر اُس کے پاؤں کو داخل کیا جاتا ہے۔ ایک قول ہے۔ وہ دونوں میں۔ امام شافعی سے پہلا قول روایت کیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں: أخبرنا الثقه عن عمرو بن عطاء عن عکرمة عن ابن عباس قال: سل رسول الله ﷺ من قبل را سه و قال أخبرنا بعض أصحابنا عن أبی الزناد و ربیعة و أبی النضر لاختلاف بینهم فی ذلك ان النبی ﷺ سل من قبل رأسه و کذلك ابوبکر و عمر۔ ابوداؤد کی اسناد صحیح ہیں۔ جو انہوں نے ابو اسحاق السبیعی سے نقل

کی ہے۔ انہوں نے کہا: أوصانی الحرث أن یصی علیه عبد الله بن یزید هو الخطمی فصلی علیه ثم أدخله القبر من قبل رجل القبر و قال هذا من السنة۔ اسی طرح ضعیف طرق سے بیان کیا ہے ہم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کو قبر میں داخل کرنے کی کیفیت میں اضطراب ہے جیسا کہ روایت کیا گیا ہے وہ اُس کے خلاف ہے۔

ابوداوٗد نے مراسیل میں بیان کیا ہے: عن حماد بن سیلمان عن ابراهیم هو النحغی۔ ان النبی ﷺ أدخل القبر من قبل القبلة و لم یسل سلا۔ ابن ماجہ نے سنن میں روایت نقل کیا ہے۔ عن أبی سعید أنه علیه الصلاة السلام أخذ من قبل القبلة و استقبل استقبالا۔ اس وقت ہم کہیں گے کہ ان کے روایت کردہ اور ہمارے روایت کردہ میں تعارض ہو گیا ہے پس وہ دونوں ساقط ہو گئے۔ اگر پہلے کو ترجیح دیں تو ضرورت کی وجہ سے تھی جیسا کہ ہم نے کہا: اور اس کو غایت کوئی اور ہے۔ صحابی کے سنت کے مطابق گمان کیا ہے۔ میم آپ کی منقول شدہ تشریح پائی ہے جو اس کے خلاف ہے اور اس طرح اکابر صحابہ کرام سے۔

ان میں سے جو ابن ابی شیبہ نے بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ نے یزید بن مکفف پر چار تکبیرات کہیں اور اس کو قبلہ کی جانب سے داخل کیا گیا۔

ابن حنیفہ سے مروی ہے: ولی ابن عباس فکبر علیه اربعًا اور اس کو قبلہ کی جانب سے داخل کیا دوسری حدیث پر عمل کرنا اولیٰ ہے۔ یہ مصنف کا قول ہے۔

میت کو قبلہ کی جانب سے قبر میں اُتارنا مسنون ہے

۱۷۰۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ قَبْرًا لَیْلاً فَاُسْرِجَ لَهٗ بِسِرَاجٍ فَاَخَذَ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَةِ وَقَالَ رَحِمَكَ اللّٰهُ اِنْ كُنْتَ لَاَوَّاهًا تَلَّاءً لِلْقُرْاٰنِ۔ (رواہ الترمذی وقال فی شرح السنة اسنادہ ضعیف)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۷۳/۳ حدیث رقم ۱۰۵۷۔ والبغوی فی شرح السنن ۳۹۸/۵ حدیث رقم ۱۵۱۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو ایک شخص کو دفن کرنے کے لیے قبر میں داخل ہوئے پس آپ ﷺ کے لیے چراغ روشن کیا گیا آپ ﷺ نے میت کو قبلہ کی جانب سے لیا اور فرمایا۔ تجھ پر اللہ رحمت کرے تحقیق تو اللہ کے خوف کی وجہ سے بہت رونے والا تھا اور قرآن کریم کی بہت زیادہ تلاوت کرنے والا تھا۔ یعنی ان دونوں چیزوں کی وجہ سے رحمت و مغفرت کا مستحق ہوگا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور شرح السنہ میں کہا گیا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے یعنی اس کی اسناد ضعیف ہیں۔

تشریح: قوله: أن النبی ﷺ دخل قبرا: میت کی قبر میں اس کو دفن کرنے کے لیے۔ فاخذ من قبل القبلة۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ اس پر دلالت ہے کہ میت کو رات کے وقت دفن کرنا مکروہ نہیں۔

فاسرج: ماضی مجہول ہے۔

له: میت کے لیے یا آپ ﷺ کے لیے۔

بسراج فاعل کی جگہ پر ہے اور ''باء'' زائدہ ہے۔

''ازھار'' میں ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ میت کو قبر کے عرض میں قبلہ کی جانب رکھا جائے بایں طور کہ چارپائی کا پچھلا حصہ قبر کے پچھلے حصہ کی طرف ہو پھر میت کو قبر میں داخل کیا جائے شافعیؒ کہتے ہیں: سر کی جانب سے رکھتے ہیں چونکہ میت کا سر قبر کے آخر میں ہے اس پر اجماع ہے' پھر میت کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے میں کہتا ہوں شاید ان کی اجماع سے مراد کسی ایک شہر کے علماء یا ایک کسی مذہب کے علماء ہیں۔

قوله وقال: نبی صلی اللہ علیہ وسلم میت کے حق میں کہا

رحمك الله: دعا ہے یا اخبار ہے۔

إن یہ مخفه من المثقلہ ہے۔ اسی لیے افعال مبتدا میں سے حرف داخل ہے۔ یالام لازمی ہے جو اس کے اور نافیہ کے درمیان فرق کے لیے ہے۔ یعنی ''لانك كنت''

لأواها : واؤ کی تشدید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خشیت کے باعث' بہت توبہ کرنے والا۔

اللہ تعالیٰ کی محبت میں بہت زیادہ تضرع کرنے والا۔

یا اللہ تعالیٰ کے خوف سے بہت زیادہ روتا ہے یا اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی حصول کے لیے' بہت دُعا کرتا ہے نہایہ میں ہے اواہ جو بہت زیادہ انکسار، گڑگرانے والا ہوا ایک قول ہے کہ بہت زیادہ رونے والا یا دعا کرنے والا **قوله (تلاء)** لام کی تشدید کے ساتھ یعنی کثرت سے تلاوت کرنے والا یا کثرت سے متابعت کرنے والا۔

قوله (لقرآن) اس کا معنی ہے کہ وہ مکمل رحمت اور مغفرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

قوله :وقال في شرح السنة اسناده ضعيف: شیخ جزری کہتے ہیں: گویا ان کا اشارہ سند میں موجود منہال بن خلیفہ کی طرف ہے اس کو ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے ترمذیؒ کہتے ہیں: حدیث حسن ہے۔ حجاج بن اَرطاۃ اور منہال بن خلیفہ ان دونوں کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے یہ حدیث صحیح کے درجہ سے کم ہے نا کہ حسن کے درجہ سے۔

حافظ ابونعیم اصفہانی حلیۃ الأولیاء میں کہتے ہیں: عبداللہ ذوالبجادین قبول آدمی ہے اس قول کو سید نے نقل کیا ہے قاموس میں ہے البجاد کتاب کی طرح ہے جیسے مخطوطہ ہوتا ہے اسی سے عبداللہ ذوالبجادین ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے سیوطیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ''ذوالبجادین'' والی حدیث متعدد طرق کے ساتھ ہے یہ متعدد طرق حدیث کے ثابت ہونے کا تقاضا کرتے ہیں اس سے ابن حجر کے قول کا ضعف واضح ہو جاتا ہے وہ امام ترمذی کی حسن نہیں مانتے اور اس میں ذکر ہے کہ محدثین اس کے ضعف پر متفق نہیں امام شافعی اور ان کے اصحاب کہتے ہیں: اس کو قبلہ کی طرف سے داخل کرنا ممکن نہیں چونکہ ان کی قبر مبارک کھودی گئی جو قبلہ کی جانب دیوار سے ملی ہوئی ہے اور اس کی لحد قبر کے نیچے ہے۔ وہ کافی جگہ نہیں جہاں اس کو رکھا جائے۔ اس وقت امام حنیفہ رحمہ اللہ کا تعلق اس حدیث کے ساتھ ساقط ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ قطع نظر حدیث میں مطابقت سے کہ دلیل ہے کہ آپؐ نے ''سل'' کیا اور یہ ضرورت کے تھا۔ آپ اس پر غور کرتے ہوئے اس کو اپنائیں اور متعسف کی پیروی نہ کریں۔ سیوطیؒ کہتے ہیں: اس کی سب سے غالب سند یہ ہے: عن ابن

مسعود قال: والله لكأني ارى رسول الله ﷺ في غزوه تبوك وهو في قبر عبد الله ذى البجادين و ابوبكر و عمر يقول: أدنيامني أخاكما وأخذه من قبل القبلة حتى اسنده في لحد ثم خرج رسول الله ﷺ وو لا هما العمل فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعًا يديه يقول: اللهم اني أمسيت عنه راضيا فارض عنه وكان ذلك ليلا" فوالله لقد رأيتني ولوددت أني مكانه۔ اللہ کی قسم جب میں نے دیکھا تو میں نے خواہش کی کاش اس کی جگہ میں ہوتا۔

میت کو قبر میں اُتارتے وقت کی دُعا

۱۷۰۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اُدْخِلَ الْمَيِّتَ الْقَبْرَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

[رواه احمد والترمذى وابن ماجة وروى ابو داود الثانية]

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۵۴۶/۳ حديث رقم ۳۲۱۳۔ والترمذى في السنن ۳۶۴/۳ حديث رقم ۱۰۴۶۔ وابن ماجه ۴۹۴/۱ حديث رقم ۱۵۵۰۔ واحمد في المسند ۲۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جس وقت آپ ﷺ میّت کو قبر میں رکھا کرتے تھے تو ارشاد فرماتے تھے۔ میں اللہ کے نام کے ساتھ رکھتا ہوں اور اللہ کے حکم کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے ساتھ اور ایک روایت میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر رکھتا ہوں اس کو احمد اور ترمذی اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد نے دوسری روایت کی ہے۔

تشریح: أدخل: معلوم اور مجہول دونوں صیغوں کے ساتھ۔

المیت: رفع اور نصب کے ساتھ۔

القبر: دوسرا مفعول۔

نبی ﷺ نے فرمایا عمل کے لیے یا تعلیم کے لیے۔

بسم الله: اس کو میں نے رکھا یا اس نے رکھا قبر میں یا میں نے اس کو (قبر میں) داخل کیا۔

وبالله: اس کے امر اور حکم کے ساتھ یا اس کی مدد اور قدرت کے ساتھ۔

علی ملة رسول الله اس کے جامع طریقے پر اور اس کے دین اور شریعت کاملہ کے ساتھ۔ طیبیؒ کہتے ہیں آپ کا قول أدخل معلوم اور مجہول کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے دوسرا غالب ہے مجہول پر دوام کا معنی ہے اور معلوم کے صیغہ سے اس کے خلاف ہے ابوداؤد نے جابرؓ سے روایت کیا ہے قال: رای ناس نارا في المقربة فاتوها فاذا رسول الله ﷺ في القبر وهو يقول ناولوني صاحبكم فاذا هو بالرجل الذي يرفع صوته بالذكر۔ "لوگوں نے قبرستان میں آگ دیکھی وہ آئے تو رسول اللہ ﷺ قبر میں تھے اور کہہ رہے تھے ناولوني صاحبكم یہ وہ آدمی تھا جو اپنی آواز کو ذکر کے ساتھ بلند

کرتا تھا۔"

میرکؒ نے کہا ہے: طیبیؒ کا قول محل نظر ہے کیونکہ معلوم کا صیغہ ماننے سے دوام ہے اور مجہول کا صیغہ ماننے سے اس کے برعکس ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں نبی ﷺ کا میت کو داخل کرنا اپنے اشرف نفس کے ساتھ دائمی نہ تھا بلکہ نادر تھا لیکن آپ کا قول "بسم الله" ممکن ہے دائمی ہو خواہ آپؐ نے داخل کیا ہو یا کسی دوسرے نے

قوله (وفي روايه أحمد وعلى سنة رسول الله) یعنی آپ کی شریعت اور آپؐ کے طریقے کے مطابق یہی آپؐ کے قول کا اولیٰ معنی ہے۔

اور امام ترمذی نے اس حدیث کو اس سند کے ساتھ حسن غریب کہا ہے اور مرفوع و موقوف بھی روایت کی گئی ہے یہ قول میرک نے بیان کیا ہے

دوسری روایت اور نسائی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے اس قول کے قائل میرک ہیں ابن ہمام کہتے ہیں: ان ماجہ نے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: (بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَلٰى سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ) ترمذی نے "بسم الله" کے بعد "وبالله" کے الفاظ زائد بیان کیے ہیں ابوداؤد نے دوسری سند کے ساتھ ان الفاظ سے ہٹ کر اور دوسرے الفاظ زائد بیان کیے ہیں امام حاکم نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے إذا وضعتم موتاكم في قبورهم فقولوا بسم الله على ملة رسول الله۔ اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور اس کے متعدد طرق ہیں۔

قبر پر پانی چھڑکنے اور (بطور نشانی کے) سنگریزے رکھنے کا ثبوت

۱۷۰۸: وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ مُرْسَلاً اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَثٰى عَلَى الْمَيِّتِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ بِيَدَيْهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّهٗ رَشَّ عَلٰى قَبْرِ اِبْنِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَوَضَعَ عَلَيْهِ حَصْبَاءَ۔

[رواه في شرح السنة وروى الشافعي من قوله رش]

اخرجه البغوی فی شرح السنة ٥/ ٤٠١ حديث رقم ١٥١٥۔

ترجمہ: امام جعفر صادقؒ جو امام محمدؒ کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے اپنے باپ سے یعنی امام باقرؒ سے بطریق ارسال کے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اکٹھا کر کے تین لپیں (مٹھیاں) ڈالیں اور آپ ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی قبر پر پانی چھڑکا اور نشانی کے طور پر سنگریزے رکھے۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور امام شافعیؒ نے لفظ رش سے روایت کیا ہے (یعنی لفظ رَش سے لے کر آخر تک روایت امام شافعیؒ کی ہے)۔

تشریح: یہ روایت مرسل ہے چونکہ انہوں نے نبی ﷺ کو نہیں دیکھا۔ صحابی کا واسطہ حذف کیا گیا ہے اور عام طور پر ان کی روایت حضرت جابر سے ہے۔

حثی "رمی" کے وزن پر یعنی مٹی کو پکڑا اور پھینک دیا۔

علی المیت : اس سے مراد جنس ہے۔

ثلاث حثیات : امام احمد نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آپؐ پہلے لپ کے ساتھ منها خلقنکم [طٰهٰ : ۵۵] (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا) اور دوسرے کے ساتھ و فیها نعیدکم [طٰهٰ : ۵۵] (اور اسی میں ہم تم کو اُٹھائیں گے) اور تیسرے کے ساتھ و منها نخرجکم تارة اخری [طٰهٰ : ۵۵] (اور اس سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے) پڑھا کرتے تھے۔

قوله (بیدیه جمعیا) ابن الملک کہتے ہیں: جو آدمی میت کے دفن کے وقت موجود ہو اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ مٹی کے لپ لے اور اینٹیں نصب ہونے کے بعد اس کو قبر میں پھینکے اور قشیری کی تحبیر میں ہے کہ کسی کو نیند میں کہا گیا: اللہ نے تیرے ساتھ کیا کیا تو اس نے جواب دیا۔ میری نیکیوں کا وزن ہوا تو میری برائیاں نیکیوں پر بھاری تھیں پھر اچانک نیکیوں کے پلڑے میں ایک تھیلی کو رکھا گیا تو وہ پلڑا بھاری ہو گیا جب اس تھیلی کو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں وہ مٹی تھی جو میں نے مسلمان کی قبر میں پھینکی تھی اس کو مواہب میں ذکر کیا ہے۔

قوله (وانه) یعنی نبی ﷺ۔

(رش) یعنی پانی کو۔

علی قبر ابنه ابرهیم : ابن الملک کہتے ہیں: جہاں بارش نہ ہو وہاں مسنون یہ ہے کہ ٹھنڈے اور پاک پانی کو قبر پر چھڑکا جائے اور یہ فال کہتے ہوئے پانی گرایا جائے کہ اللہ اس کی قبر کو ٹھنڈا کر دے گا۔

قوله : ووضع علیه حصبآء : اور یہ مد کے ساتھ ہے چھوٹی کنکریوں پر بولا جاتا ہے قاموس میں ہے: الحصباء، الضی کو کہتے ہیں اور اس سے مراد چھوٹی کنکریاں ہیں اور نہایہ میں ہے: الحصبآء الصغار یعنی چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔

ابن الملک کہتے ہیں: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قبر پر کنکریاں بچھانا سنت ہے تاکہ کوئی درندہ اسے نہ اکھاڑے اور وہ ایک علامت بھی بن جائیں اور پہلی علت میں ایک بحث ہے۔

قوله (رواہ) یعنی صاحب المصابیح۔

قوله : و روی الشافعی من قوله "رش" : شیخ جزری کہتے ہیں: اس کو امام شافعیؒ نے ابراہیم بن محمد سے روایت کیا انہوں نے جعفر صادق سے اور وہ اپنے باپ باقر سے دونوں حدیثوں کو مرسل بیان کرتے ہیں: ان میں سے ایک جمیعا تک اور دوسری "انه رش" تک ہے اور "رش" والی حدیث کو "حثی" والی حدیث پر مقدم کیا گیا ہے۔

اور اس کو امام بیہقی نے عامر بن ربیعہ کی حدیث سے بیان کیا ہے وہ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون کو دفن کیا اور اس پر اپنے ہاتھوں سے تین لپ مٹی ڈالی یہ حدیث ضعیف ہے میرک کہتے ہیں: اسی طرح تصحیح میں ہے اور یہ مصنف کی نقل کردہ بات کے الٹ ہے پس تو غور و فکر کر اور بزار نے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے عثمان بن مظعون کی قبر پر پانی چھڑکنے کا حکم دیا اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے سعد بن معاذ کی قبر پر بھی اسکا حکم دیا تھا' ابن حجر کہتے ہیں: مٹی ڈالنے والی دلیل عمدہ ہے اور کنکریاں بچھانے والی دلیل ضعیف ہے لیکن اس پر عمل کیا جاتا ہے لہٰذا ان کا بچھانا مسنون ہے۔

اس پر دو اشکال ہیں ایک تو یہ کہ مٹی ڈالنے اور پانی چھڑکنے کی حدیث ایک ہے اور صرف پانی چھڑکنے کی حدیث ضعیف

ہے اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مذہب شافعی میں مقررہ قاعدہ ہے کہ ضعیف حدیث پر صرف فضائل اعمال کے باب میں عمل کیا جائے گا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس قبیل سے نہیں ہے۔

قبر کو گچ یعنی چونا کرنا منع ہے

۱۷۰۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۶۸/۳ حدیث رقم ۱۰۵۲۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو گچ کرنے، ان پر لکھنے اور ان کو روندنے سے منع فرمایا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یجصص: مذکر اور مؤنث کے صیغے کے ساتھ۔

کہا گیا ہے: کہ شاید یہ نہی اس لیے ہے کہ اس میں زینت ہے اور اس لیے بعض نے گارے کے ساتھ لپائی کرنے کی اجازت دی ہے ان میں سے ایک حسن بصری بھی ہے امام شافعیؒ کہتے ہیں: قبر کی لپائی کرنے میں کوئی حرج نہیں اس کو طیبی نے ذکر کیا۔

قولہ: وان یکتب علیھا: مظہر کہتے ہیں: قبر پر اللہ، رسول اور قرآن کے نام کی کتابت مکروہ ہے وہ اس لیے تاکہ قبر پر بیٹھنے سے ان کی توہین نہ ہو اور قبر کے منہدم ہونے سے یہ مٹی میں نہ مل جایں اور ہمارے بعض علماء نے کہا ہے اسی طرح مسجد کی دیوار پر بھی اللہ کا نام اور قرآن کی کتابت مکروہ ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: اور ہمارے علماء نے اخذ کیا ہے کہ قبر پر لکھائی مکروہ ہے خواہ اس صاحب قبر کا نام ہو یا کسی اور کا وہ تختی اس کے سر کے پاس ہو یا کسی اور جگہ اور کہا گیا ہے کہ میت کے نام کی لکھائی مسنون ہے خاص طور پر جب وہ نیک ہوتا کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ لوگوں میں معروف رہے کیونکہ کتابت کی نہی منسوخ ہے جس طرح امام حاکم نے ذکر کیا ہے یا اس کو زائد تسلیم کیا جائے گا اس حکم پر جس سے میت کے حالات کی پہچان ہوتی ہے اور ان کا یہ قول کہ ''مسنون ہے'' محل بحث ہے صحیح بات یہ ہے کہ یہ جائز ہے

قولہ (وان توطا) یعنی پاؤں کے ساتھ کیونکہ اس میں اہانت کا پہلو ہے ازھار میں ہے پختہ کرنے، کتابت اور روندنے کی نہی کو کراہت پر محمول کریں گے اور ضرورت کی وجہ سے روندنا مکروہ نہیں ہے۔ جس طرح زیارت اور میت کو دفن کرنا ضرورت ہے اس کو سید نے نقل کیا ہے اور زیارت کے بارے ان کا مؤقف محل نظر ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور یہ روایت ایک اور سند سے حضرت جابر سے بھی منقول ہے۔ اس کو میرکؒ نے بیان کیا۔

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کرنا

۱۷۱۰: وَعَنْهُ قَالَ رُشَّ قَبْرُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الَّذِىْ رَشَّ الْمَاءَ عَلٰى قَبْرِهٖ بِلَالُ بْنُ رَبَاحٍ بِقِرْبَةٍ بَدَأَ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى رِجْلَيْهِ۔ (رواه البيهقى فى دلائل النبوة)

رواه البيهقى فى دلائل النبوة

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر پانی چھڑکا گیا۔ وہ شخص جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پانی چھڑکاؤ کیا وہ حضرت بلال بن رباح تھے انہوں نے مشک کے ساتھ سرہانے کی طرف سے چھڑکنا شروع کر دیا اور پاؤں تک چھڑکا۔ اس کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔

تشریح: وعنہ: یعنی جابرؓ سے۔

رش: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

قوله (قبر النبیؐ) طیبی کہتے ہیں: شاید کہ یہ رحمت الٰہی اور لطف ربانی کے اترنے کی طرف اشارہ ہے جس طرح دعا میں ہے اللهم اغسل خطاياه بالماء والثلج والبرد :اے اللہ! اس کے گناہوں کو پانی، برف اور اولوں کے ساتھ دھودے اور لوگ کہتے ہیں: اللہ اس کی مٹی کو سیراب کرے اور اس کی قبر کو ٹھنڈا کرے یا پھر یہ طراوت وعدم دروس کی دعا کی طرف اشارہ ہے۔

میرکؒ کہتے ہیں: شاید اس میں حکمت یہ ہے کہ قبر پر جب پانی چھڑکا جائے تو وہ زیادہ دیر باقی رہتی ہے اور جلدی زمین بوس بھی نہیں ہوتی میں کہتا ہوں: یہ ایک ظاہر اور حسی بات ہے جسے نقل کرنے کی ضرورت نہیں یہ تو عبارت سے ماخوذ ہے البتہ جو امام طیبی نے ذکر کیا ہے تو وہ غایت درجے کی لطافت اور انتہاء کی تکریم ہے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ کسی مرید نے گھر بنایا پھر اپنے شیخ کی دعوت کی شیخ نے اس سے پوچھا: تو نے یہ روشن دان کیوں کھولا ہے؟ اس نے کہا: تاکہ ہوا اور روشنی آئے تو شیخ نے کہا: یہ تو ایسی ظاہری بات ہے جو لامحالہ حاصل ہونے والی ہے لیکن اصل لائق ستائش یہ بات تھی کہ تو اس روشن دان کو رکھنے کا مقصد سماع اذان کو بنالیتا اور باقی سب چیزیں اس کے تابع ہو جاتیں۔

قوله وكان الذى رش على قبره بلال بن رباح :"بلال" رفع کے ساتھ اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔

حتى انتهى الى رجليه : اس کا ظاہر تو ایک مرتبہ پر دلالت کرتا ہے لیکن اس میں کئی دفعہ (چھڑکنے) کا بھی احتمال ہے۔

قبر پر پتھر رکھنا بطور علامت کے مسنون ہے

۱۷۱۱: وَعَنِ الْمُطَّلِبِ بْنِ اَبِىْ وَدَاعَةَ قَالَ لَمَّا مَاتَ عُثْمَانُ بْنُ مَظْعُوْنٍ اُخْرِجَ بِجَنَازَتِهٖ فَدُفِنَ اَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا اَنْ يَّاْتِيَهٗ بِحَجَرٍ فَلَمْ يَسْتَطِعْ حَمْلَهَا فَقَامَ اِلَيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَسَرَ عَنْ ذِرَاعَيْهِ قَالَ الْمُطَّلِبُ قَالَ الَّذِىْ يُخْبِرُنِىْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِ ذِرَاعَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ حَسَرَ عَنْهُمَا ثُمَّ حَمَلَهَا فَوَضَعَهَا عِنْدَ رَأْسِهِ وَقَالَ أَعْلَمُ بِهَا قَبْرَ أَخِيْ وَأَدْفِنُ إِلَيْهِ مَنْ مَّاتَ مِنْ أَهْلِيْ۔ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۵۴۳/۳ حديث رقم ۳۲۰۶۔

ترجمہ: حضرت مطلب بن ابی وداعہؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعونؓ کا جنازہ نکالا گیا (یعنی اٹھایا گیا) اور ان کو دفن کیا تو نبی علیہ السلام نے ایک شخص کو حکم دیا کہ ایک بڑا پتھر لے کر آؤ تا کہ بطور علامت (نشانی) کے رکھا جائے۔ پس وہ شخص اس پتھر کو نہ اٹھا سکا پھر اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور دونوں آستینیں اوپر چڑھائیں۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس شخص نے مجھے بتایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں کی سفیدی کو دیکھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کو کھولا۔ پھر پتھر کو اٹھایا اور حضرت عثمانؓ کی قبر کے سرہانے رکھ دیا اور فرمایا کہ میں نے اس کے ساتھ اپنے بھائی کی قبر کا نشان کیا ہے اور میں اپنے گھر والوں میں سے جو وفات پائے گا اسے اس کے قریب دفن کروں گا۔ اس کو ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: المطلب بن ابی وداعۃ واؤ کے فتح کے ساتھ طیبی کہتے ہیں: یہ قرشی ہیں اور فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے۔ اسی طرح مؤلف نے ذکر کیا ہے میرکؒ کہتے ہیں: اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی مطلب کی نسبت بیان نہیں کی اسی طرح مصابیح میں بھی غیر منسوب واقع ہے اور مصنف نے اس کو اپنی طرف سے ابوداؤد کی طرف منسوب کیا ہے اور اس میں غلطی کی ہے۔

تصحیح المصابیح میں امام جزری اور سلمی اپنی تخریج میں کہتے ہیں: اس حدیث کو امام ابوداؤد نے مطلب بن عبداللہ المدنی کی حدیث سے بیان کیا ہے اور یہ مطلب بن عبد اللہ بن حطب المخزومی ہیں یہ تابعی ہیں اور ابوہریرہ، عائشہ، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں حدیث میں ارسال ہے اور وہ سیاق سے ہی ظاہر ہے جیسا کہ مطلب نے کہا: اس آدمی نے کہا جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر دے رہا ہے۔......

اور مصنف کی غلطی پر دلیل یہ ہے کہ ابن سعد نے طبقات میں بیان کیا ہے کہ ہمیں محمد بن عمر نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کثیر بن یزید نے مطلب بن عبداللہ بن حطب سے بیان کیا کہ جب عثمان بن مظعون فوت ہوئے اور ان کو بقیع میں دفنایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا حکم دیا جو ان کے سر کے پاس رکھی گئی اور فرمایا① : یہ اس کی قبر کی علامت ہے جو بھی اس کے بعد فوت ہوگا اس کے پاس دفن کیا جائے گا۔

مظعون: ظاء نقطے والی کے ساتھ۔

اخرج بجنازته: گویا کہ عاطف کو حذف کرنے کے باب سے ہے: ای واخرج جنازتہ امر النبیؐ یہ حرف لَمَّا کا جواب ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ لَمَّا کا جواب أخرج ہے چونکہ یہ اس کے عمل میں واقع ہے اور ''امر'' سے عاطف کو حذف کیا گیا ہے اور اس پر حاشیہ سابقہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ لَمَّا مات عثمان ابن مظعون و دفن بالبقیع فامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

رجلا ان یأتیه بحجر یعنی بڑا پتھر تا کہ بطور علامت رکھا جائے اور روایت میں ہے کہ چٹان لانے کا حکم دیا۔

حملها : ابن الملکؒ کہتے ہیں: ضمیر کی تانیث حجر کو صخرۃ کی تاویل میں کرنے کی وجہ سے ہے۔

قوله :فقام الیها رسول الله ﷺ وحسر : یعنی ہٹایا اور اپنی آستین کو دور کیا۔

عن ذراعیه : اپنے بازوؤں سے اور نہایہ میں ہے اس کو اپنی آستینوں سے نکالا اور یہ حاصل المعنی ہے اور ازھار میں ہے کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ کسی ضرورت کے تحت بازو سے کپڑا اہٹانا مکروہ نہیں ہے اور نہ ترکِ ادب ہے کیونکہ اس میں کپڑے کو گندگی سے بچانا ہے۔

اعلم : یہ باب افعال سے مضارع متکلم ہے۔

قوله (قبر اخی : اور میں اپنے بھائی کی قبر پر پتھر کو بطور علامت رکھوں گا اور اس کو بھائی اس کو شرف دینے کی غرض سے کہا یا اس وجہ سے کہ وہ قریشی تھے یا وہ آپ کا رضاعی بھائی تھا اور یہی صحیح بات ہے کہا گیا ہے: یہ بارہ آدمیوں کے بعد مسلمان ہوئے دومرتبہ ہجرت کی اور بدر میں شرکت کی اور مدینہ میں فوت ہونے والے سب سے پہلے مہاجر بھی ہیں۔

قوله من مات من اهلی: امام طیبی فرماتے ہیں: ای اضم الیه فی الدفن۔ ازھار میں ہے: مستحب یہ ہے کہ قبر پر کوئی چیز بطور علامت رکھی جائے تا کہ اس کے ساتھ اس کے پہچانا جا سکے کیونکہ نبیؐ نے فرمایا: اعلم بها قبرا کہا اور مستحب ہے کہ سب عزیز واقارب کو ایک جگہ جمع کیا جائے کیونکہ نبیؐ کا فرمان ہے وادفن الیه من مات من اهلی میرے خاندان سے جو بھی فوت ہوگا میں اسے یہیں دفن کروں گا عثمانؓ آپؐ کے رضاعی بھائی تھے اور آپؐ نے اس کے پاس سب سے پہلے اپنے بیٹے ابراہیم کو دفن کیا۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں آپ نے قرابت کی وجہ سے ان کو اپنا بھائی کہا کیونکہ وہ قرشی تھا اور وہ عثمان بن مظعون بن حبیب بن وھب قرشی جمحی ہیں اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے جاہلیت میں اپنے اوپر شراب حرام کیا ہوا تھا اور کہا میں ایسی چیز نہیں پیوں گا جو مجھ سے کم رتبہ آدمی کو بھی مجھ پر ہنسا دیتی ہے اور سلمی کہتے ہیں: عثمان اہل صفہ میں سے تھا' یہ سب سے پہلے جنت البقیع میں دفن ہوئے اور سب سے پہلے ہجرت مدینہ کی اور کہا گیا ہے: ان کے بعد نبیؐ کے خاندان سے جو سب سے پہلے فوت ہوا وہ آپ کا بیٹا ابراہیم تھا اور آپؐ نے اپنی بیٹی زینب کو فوت ہونے کے بعد کہا: الحقی بسلفنا الخیر عثمان بن مظعون: ہمارے بہترین سلف عثمان بن مظعون کے ساتھ مل جا البتہ جو ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ نبیؐ نے ابراہیم اور اپنی بیٹی زینب کو ان کے وفات پانے کے بعد کہا: الحقا بسلفنا الصالح عثمان بن مظعون ہمارے بہترین گزرے ہوئے عثمان بن مظعون کے ساتھ مل جاؤ تو ابراہیم کے حوالہ سے یہ روایت غیر محفوظ ہے۔

پھر کہا: ہمارے بعض متقدم ائمہ نے کہا ہے: دوسرے پتھر کو پاؤں کے نزدیک رکھنا مسنون ہے کیونکہ نبی ﷺ نے عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر دو پتھر رکھے تھے اور اس حدیث کو رد کر دیا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو بات محفوظ ہے وہ ایک ہی پتھر ہے اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ مذکور حدیث میں کوئی دلالت نہیں کہ ایک تھا یا متعدد تو اس آدمی کا رد کیسے درست ہے جس نے تعدد کو ثابت کیا جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب تعارض کے وقت ایک ثبوت تسلیم کرلیا جائے کہ ثقہ کی زیادتی مقبول ہے اور

مثبت نافی پر مقدم ہوتا ہے اور جس نے یاد کیا وہ حجت ہے اس پر جس نے یاد نہیں رکھا۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس سند میں کثیر بن زید مولی الاسلمیین ہے اس پر کئی ایک نے کلام کیا ہے پس جو ابن حجر نے کہا کہ اس کی سند جید ہے وہ بھی نقد کی محتاج ہے کیونکہ وہ ناقدین کے قول کے مخالف ہے۔

قبر کی اُونچائی بالشت کی بقدر اُونچی ہونی چاہیے

۱۷۱۲ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ يَا اُمَّاهُ اُكْشِفِيْ لِيْ عَنْ قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَاحِبَيْهِ فَكَشَفَتْ لِيْ عَنْ ثَلَاثَةِ قُبُوْرٍ لَا مُشْرِفَةٍ وَّلَا لَا طِئَةٍ مَبْطُوْحَةٍ بِبَطْحَآءِ الْعَرْصَةِ الْحَمْرَاءِ۔

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۵۴۹/۳ حدیث رقم ۳۲۲۰۔

ترجمہ: حضرت قاسم بن محمدؒ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا۔ میں نے کہا۔ اے میری ماں! رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیاروں (یعنی ابوبکر وعمر) کی قبر میرے لئے کھول دیجئے۔ پس انہوں نے میرے لیے تینوں قبریں کھول دیں۔ نہ تو بہت بلند تھیں اور نہ ہی وہ زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ بلکہ بقدر بالشت بلند تھیں۔ میدان کی سرخ کنکریاں ان پر بچھی ہوئی تھیں جو مدینہ منورہ کے اردگرد ہیں۔ اس کو ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن القاسم بن محمد یعنی ابن ابی بکر الصدیق۔ رضی اللہ عنہما

قوله: فقلت یا اماه اکشفی لی عن قبر النبی و صاحبیه: اماه: ہاء کے سکون کے ساتھ اور یہ ان کی خالہ ہیں لیکن ماں اس لیے کہا کہ خالہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے یا اس وجہ سے کہا کہ وہ ام المؤمنین ہیں۔ رضی اللہ عنہا

عن قبر النبیؐ: اور ایک نسخہ میں رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔

وصاحبیهؓ: یعنی آپؐ کے ساتھ مدفون اور ان سے مراد ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو کہ روشن چاند اور چمکتے سورج کے پہلو میں مدفون ہیں۔

قوله: فکشفت لی...... ای لأجلی أو لرؤیتی۔ یعنی میری خاطر یا مجھے دکھلانے کی خاطر۔

لا مشرفة: یعنی بلند، نہایت بلند اور کہا گیا ہے کہ ایک بالشت سے زیادہ بلند ہوں۔

قوله (ولا طئة) ہمزہ اور یآء کے ساتھ یعنی زمین پر برابر کہا جاتا ہے لطأ بالارض وہ زمین کے ساتھ مل گیا۔

مبطوحة: یہ قبور کی صفت ہے ابن الملک کہتے ہیں جو زمین پر برابر اور پھیلی ہوئی تو اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ یہ اس وقت طاطئة کے معنی میں ہے حالانکہ اس سے پہلے اس کی نفی گزر چکی ہے اور درست بات یہ ہے کہ اس میں کنکریاں ڈالی گئیں قاموس میں ہے تبطیح المسجد کا مطلب ہے اس میں کنکریاں ڈالنا نہایہ میں ہے بطحالمکان کا مطلب ہے اس کو برابر کرنا اور بطح المسجد کا مطلب ہے کہ اس میں کنکریاں ڈالنا اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قبر کو برابر کرنے میں شافعیہ کے لئے اس میں کوئی دلیل نہیں اور ابن حجر کا قول بھی باطل ہو گیا اور یہ صریح ہے کہ تین قبریں مسطحہ تھی بہت بلند نہیں تھیں

اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ نبی کی قبر ایک بالشت بلند تھی۔ان قبرہ کان مرتفعا شبرًا۔

میں کہتا ہوں: اس کا ایک بالشت بلند ہونا اس کے مسنم ہونے (اونچائی) کے منافی نہیں ہے اور سفیان کی تصریح گزر چکی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر بلند دیکھی۔

ببطحآ العرصة : یعنی "عرصہ" کے پتھروں کے ساتھ اور یہ جگہ کا نام ہے طیبیؒ کہتے ہیں: عرصہ کی جمع عرصات ہے اور یہ ایسی وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی عمارت نہ ہو اور بطحاء ایسی وسیع وادی کو کہتے ہیں جس میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوں اور یہاں اس سے مراد کنکریاں ہیں کیونکہ اس کی اضافت عرصہ کی طرف ہے۔

الحمراء یہ بطحآء یا عرصہ کی صفت ہے: طیبی کہتے ہیں: انہوں نے میرے لیے تین قبروں سے پردہ اُٹھایا جو نہ بلند تھیں نہ پست تھیں کہ زمین سے ملی ہوئی ہوں اور بطح کہتے ہیں کہ زمین سے مرتفع جگہ کی سطح ایک کی جائے یہاں تک کہ وہ برابر ہو جائے اور تفاوت اور اونچ نیچ ختم ہو جائے سید کہتے ہیں: اس میں بحث ہے شاید اس کی مراد وہی ہے جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یا اس کے کلام سے لازم آتا ہے کہ قبروں کی زمین سے ایک جدا صورت تھی اور یہ اجماع کے خلاف ہے اختلاف اس میں ہے کہ وہ اوپر اونٹ کی کوہان کی طرح تھیں یا مربع شکل میں اور اس سے پہلے ابن الہمام کا کلام گزر چکا ہے پھر سید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اولیٰ یہ ہے کہ کہا جائے اس کا مطلب یہ ہے: **القی فیها بطحاء العرصة الحمراء** : "کہ اس میں عرصہ کے سرخ سنگریزے ڈالے گئے۔" قولہ سید کہتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور ایک قول حسن کا بھی ہے۔

۱۷۱۳: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جَنَازَةِ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَانْتَهَيْنَا اِلَى الْقَبْرِ وَلَمَّا يُلْحَدْ بَعْدُ فَجَلَسَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ وَجَلَسْنَا مَعَهُ۔ (رواه ابو داود والنسائي وابن ماجة وزادفي اخره كان على رؤسنا الطير)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٥٤٦/٣ حديث رقم ٣٢١٢۔ والنسائي ٧٨/٤ حديث رقم ٢٠٠١۔ وابن ماجه ٤٩٤/١ حديث رقم ١٥٤٩۔ واحمد في المسند ٢٨٧/٤۔

ترجمہ :حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انصار میں سے ایک شخص کے جنازے کے لیے نکلے۔ہم قبر کے پاس پہنچے اور ابھی تک اس کو دفن نہیں کیا گیا تھا یعنی ابھی تک اس کی قبر نہیں کھدی تھی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ کی طرف بیٹھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد۔اس کو ابوداؤد۔نسائی ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے اس کے آخر میں یہ بات بھی زیادہ کی ہے کہ ہم اس طرح بیٹھے جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔یعنی نہایت خاموش اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔

تشریح: **یلحد بعد** (اس کا مضاف الیہ محذوف معنوی ہے تقدیری عبارت یوں ہے) **ای لم یفرغ من حفر اللحد بعد مجیئنا** یعنی ہماری آمد کے بعد بھی وہ لحد کھودنے سے فارغ نہیں ہوا تھا۔

قولہ :فجلس النبیؐ مستقبل القبلة: کیونکہ نبیؐ کا ارشاد ہے: **اشرف المجالس ما استقبل به القبلة** سب سے اچھی مجلس وہ ہے جو قبلہ رو ہو اس کو طبرانی نے ابن عباس سے ہے روایت کیا ہے۔

قولہ و جلسنا معه : یعنی آپ کے اردگرد جیسا کہ روایت میں ہے ہمارے بعض علماء کہتے ہیں: میت کی زیارت کرنے والا قبلہ رو ہی بیٹھے یا کھڑا ہو گا قولہ میرک کہتے ہیں: اس پر امام ابوداؤد اور منذری نے سکوت اختیار کیا ہے۔

قولہ وزاد فی آخره كان علی رؤوسنا الطير : یہ خاموشی کی طرف اشارہ ہے سید کہتے ہیں: **باب ما يقال عند من حضره الموت**، فصل ثالث میں یہ حدیث مطول گزر چکی ہے گویا کہ مصنف اس بات سے بے خبر ہے کہ صاحب المصابیح نے اس باب میں ذکر کیا ہے تو وہاں اس نے فصل ثالث میں اس کو بیان کیا اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ اس کو مطول وارد کرنے میں کئی فوائد ہیں ان میں سے ایک یہی ہے اور اسی طرح انہوں نے متغایر الفاظ کے ساتھ اس کو وارد کیا ہے لہٰذا یہ حقیقت میں تکرار نہیں ہے۔

نوٹ: اس حدیث کی مکمل تفصیل بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ مَنْ حَضَرَهُ الْمَوْتُ کی تیسری فصل میں گزر چکی ہے اور وہ اس سے لمبی حدیث ہے۔

میت کی بے اکرامی ممنوع ہے

۱۷۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهٖ حَيًّا۔

(رواه مالك وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵۴۳/۳ حدیث رقم ۳۲۰۷ وابن ماجه ۵۱۶/۱ حدیث رقم ۱۶۱۶۔ ومالك فی الموطأ ۲۳۸/۱ حدیث رقم ۴۰ من كتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۱۶۸/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مردے کی ہڈی کو توڑنا زندہ کی ہڈی کو توڑنے کی طرح ہے۔ یعنی توڑنا گناہ ہے۔ اس کو امام مالک ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی گناہ میں، جیسا کہ روایت میں ہے طیبیؒ کہتے ہیں. اس میں اشارہ ہے کہ میت کی اس طرح توہین نہیں کی جائے گی جس طرح زندہ کی نہیں کی جاتی ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ دکھ تکلیف محسوس کرتی ہے ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ میت بھی ان چیزوں سے لذت محسوس کرتی ہے جن سے زندہ انسان محسوس کرتا ہے۔

اور ابن ابی شیبہ نے ابن مسعود سے روایت کی ہے۔ قال : **أذى المؤمن فی موته، كأذاه فی حياته** کہ میت کو حالت مرگ میں اذیت دینا اسے حالت حیات میں تکلیف دینے کے مترادف ہے۔ **قولہ** میرک کہتے ہیں: ابوداؤد نے اس پر سکون کیا **قولہ** میرک کہتے ہیں: ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اسے نقل کیا ہے اور ابن القطان کہتے ہیں: اس کی سند حسن ہے۔

الفصل الثالث:

حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کی تدفین کا بیان

۱۷۱۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ شَهِدْنَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُدْفَنُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ عَلَى الْقَبْرِ فَرَاَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ لَّمْ يُقَارِفِ اللَّيْلَةَ فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَنَا قَالَ فَانْزِلْ فِيْ قَبْرِهَا فَنَزَلَ فِيْ قَبْرِهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵۱/۳ حدیث رقم ۱۲۸۵۔ واحمد فی المسند ۱۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اس وقت حاضر تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور حضرت عثمانؓ کی بیوی امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو دفن کیا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں دیکھیں کہ آنسو بہا رہی تھیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے کہ جس نے آج رات اپنی بیوی سے صحبت نہ کی ہو۔ پس ابوطلحہؓ نے کہا کہ میں ہوں۔ فرمایا پس تو ان کی قبر میں اترو۔ پھر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ قبر میں اترے۔ اس کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :قال :شهدنا ...... فرأيت عينيه تدمعان:

ورسول الله ﷺ جالس: یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله :فقال هل فيكم من احد لم يقارت الليلة: یہ مِنْ زائدہ ہے۔

لم يقارف : نہایہ میں ہے: قارف الذنب یعنی اس نے اس گناہ کا ارتکاب کر لیا اور قارف امرأته اس وقت کہتے ہیں جب آدمی اس سے جماع کر لے اور جامع الاصول میں ہے لم يقارف یعنی اس نے کوئی گناہ نہیں کیا اور جائز ہے کہ اس سے مراد جماع ہو اور یہ اس سے کنایہ ہو اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا۔

الليلة : سوال کے قرینہ سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ رات مراد ہے میرکؒ نے نقل کیا راوی کہتے ہیں: یعنی اس نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اهل اللغة کہتے ہیں: قرف علی نفسه ذنوبا کا مطلب ہے اس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور قارف فلان الشئ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس کے قریب ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: كان يصبح جنبا من قواف یعنی جماع سے جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے اور ہر وہ چیز جس کے تم قریب ہوئے اس پر لفظ قارفت بولتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ نبیؐ نے یہ اس لیے کہا تا کہ یہ بات معلوم ہو سکے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہ جن کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں جن کا انتقال ہوا تھا' نے اس رات اپنی دوسری بیوی سے جماع کیا ہے تو عثمان نے یہ بات نہیں کہی کہ میں نے جماع نہیں کیا اسی طرح امام اصفہانیؒ کی شرح البخاری میں ہے اور اس کا ضعف ظاہر ہے۔

قوله :فقال ابو طلحة انا : اس کا ظاہر یہ ہے کہ مقارفت سے مراد جماع ہے اگر چہ اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں قطعی یہ کہنا کہ اکابر سے گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا بعید سی بات ہے۔

قولہ :قال: فانزل فی قبرھا، فنزل فی قبرھا ظاہر یہ ہے کہ وہ اس کو دفن کرے تو یہ ان کی خصوصیات میں سے ہے یا پھر بیان جواز کی خاطر ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا اترنا مدد کے لیے ہو اور محرم نے ان کو دفن کیا ہو ابن الہمام کہتے ہیں: مردوں کے علاوہ کسی بھی عورت کو کوئی قبر میں داخل کر سکتا ہے اور نہ نکال سکتا ہے کیونکہ اس عورت کی زندگی میں پردہ اور رکاوٹ کی موجودگی میں ضرورت کے تحت اس کو چھونا جائز ہے تو اس کی موت کے بعد بھی جائز ہے جب وہ فوت ہو جائے اور کوئی محرم نہ ہو تو اس کے پڑوسیوں میں نیک لوگ اس کو دفن کریں گے اگر وہ نہ ہوں گے تو نیک نوجوان اس کو دفن کریں گے اور اگر اس کا محرم ہوگا خواہ وہ رضاعی ہو یا سسرال ہو تو وہ اس کو لحد میں اتارے گا۔

امام نووی کہتے ہیں: ان کے قول کے مطابق حدیث پر اشکال نہیں ہے کہ اجنبی صالح لوگوں کی بہ نسبت محارم اور خاوند زیادہ حقدار ہے کیونکہ احتمال موجود ہے کہ نبیؐ اور حضرت عثمان کو کوئی ایسا عذر لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ قبر میں نہ اتر سکتے ہوں ہاں البتہ حدیث سے یہ بات اخذ کی جائے گی کہ اگر وہاں نیک لوگ ہوں اور ان میں سے کوئی جماع سے دور ہو تو اسی کو مقدم کیا جائے گا امام احمد نے روایت نقل کی ہے: **ان رقية لما ماتت قال عليه الصلاة والسلام لا يدخل القبر رجل قارف الليلة فلم يدخل عثمان** تو نبیؐ نے فرمایا کہ قبر میں وہ آدمی داخل نہ ہو جس نے رات جماع کیا ہے تو عثمان داخل نہ ہوئے۔

ابن حجر کہتے ہیں: گزشتہ حدیث سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حضرت عثمان کے ساتھ اپنی دونوں بیویوں کے معاملہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ اصل حدیث میں یہ دلالت نہیں ہے کہ وہ ام کلثوم تھیں لہٰذا مجمل کو مبین پر محمول کیا جائے گا اور اس کی یہ علت نکالنا کہ نبی ﷺ کو حضرت عثمان کے اس رات کے جماع کے بارے خبر مل چکی تھی چنانچہ آپ نے اس کو روکنے کی خاطر کنایہ کیا جب وہ خاموش رہے تو نبی ﷺ کو خبر کی تصدیق ہو گئی تو آپ نے ابوطلحہ کو حکم دیا اور ان کو قبر میں داخل ہونے سے منع کیا کیونکہ انہوں نے فرطِ شہوت کی وجہ سے جماع کیا تو آپؐ ڈر گئے کہ اگر وہ قبر میں اتریں گے تو ان کو کوئی چیز یاد آ جائے گی تو وہ ان مستحبات کو کمال طریقے سے ادا نہیں کر سکے گا جو میت کے ساتھ قبر میں کرنے چاہیے اس کے صحیح ماننے پر یہ اس بات کے منافی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعدد واقع ہوا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا نزع کی حالت میں بیٹے کو نصیحت کرنا

۱۷۱۶: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ لِا بْنِهٖ وَهُوَ فِیْ سِيَاقِ الْمَوْتِ اِذَا اَنَا مِتُّ فَلَا تَصْحَبْنِیْ نَائِحَةٌ وَّلَا نَارٌ فَاِذَا دَفَنْتُمُوْنِیْ فَشُنُّوْا عَلَیَّ التُّرَابَ شَنًّا ثُمَّ اَقِيْمُوْا حَوْلَ قَبْرِیْ قَدْرَ مَا يُنْحَرُ جَزُوْرٌ وَّيُقَسَّمُ لَحْمُهَا حَتّٰی اَسْتَاْنِسَ بِكُمْ وَاَعْلَمَ مَاذَا اُرَاجِعُ بِهٖ رُسُلَ رَبِّیْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١١٢/١ حديث رقم (١٩٢ ـ ١٢١)۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نزع کی حالت میں اپنے بیٹے عبداللہ کو کہا کہ جس وقت میری موت آ جائے۔ میرے پاس کوئی نوحہ کرنی والی نہ ہو اور نہ ہی میرے پاس آگ ہو اور جب میرے دفن کا ارادہ کرو۔ تو مجھ پر سہولت کے ساتھ (آرام کے ساتھ) مٹی ڈالو پھر میری قبر کے پاس دعا کے لیے اتنا وقت کھڑے رہو کہ اونٹ کو

ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جائے یہاں تک کہ میں تمہارے ٹھہرنے کی وجہ سے آرام حاصل کروں اور میں جان لوں کہ میں اپنے پروردگار کے فرشتوں کو کیسے جوابات کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن عمرو بن العاص قال لابنه یعنی عبداللہ۔

قوله (وهو) یعنی عمرو۔

في سياق الموت: اى صدده امام طیبیؒ کہتے ہیں: سیاق سے مراد حالت نزع ہے اور اس کی اصل سواق ہے۔

قوله (اذا انامت) میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔

قوله (فلا تصحبني) یعنی میرے جنازے کے ساتھ نہ ہو۔

نائحة: یعنی رونے کے ساتھ چیخ و پکار کرنے والی اور نہ ندبہ کرنے والی ہو کیونکہ وہ زندہ اور مردہ پر دونوں کو تکلیف دیتی ہے اور جنازے کے ساتھ چلنے والے کو موت کو یاد کرنے اور دنیا کے فانی ہونے سے مشغول کر دیتا ہے۔

قوله (و لانار) یعنی فخر و ریا کاری کے لیے جیسا کہ جاہلیت کی عادت تھی اور مکہ میں ابھی تک اس کے اثرات تھے ابن حجرؒ کہتے ہیں: اور اس لیے بھی کہ یہ ایک بدشگون ہے اور اس میں یہ بھی ہے یہ بری فال کا سبب ہے یہ بات نہیں کہ یہ اس بری فال کا حصہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

قوله (فشنوا) نقطوں والی شین کے ضمہ اور نون مشدد کے ساتھ یعنی تمام بہاؤ۔

نہایہ میں ہے: ''شن'' کا مطلب ہے نرمی سے پانی بہانا۔

قوله ثم اقيموا حول قبرى: شاید کہ اس سے مراد ثابت قدمی کی دعاء ہے۔

ينحر جزورو: یعنی اونٹ اور یہ مؤنث لفظ ہے اگر چہ اس سے مراد مذکر ہو تو نحر کو مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال کرنا جائز ہے۔

حتى استأنس بكم: یعنی تمہاری دعاؤں، اذکار، تلاوت اور استغفار کے ساتھ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: انه ﷺ كان اذا فرغ من دفن الرجل يقف عليه و يقول استغفروا الله لأخيكم واسألوا له التثبت۔ '' کہ نبی کریم ﷺ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہوتے اور کہتے اپنے بھائی کے لیے بخشش مانگو اور اس کے ثابت قدم رہنے کا سوال کرو اس سے اب سوال کیا جا رہا ہے''۔ اور ایک روایت میں ہے: التثبت فانه الآن يسأل۔ ابن حجر نے انوکھی بات کی اور کہا: اس حدیث اور حضرت عمرؓ کے قول سے تلقین والی مشہور حدیث مضبوط ہو جاتی ہے اس لیے انہوں نے اس پر عمل کیا اگر چہ وہ حدیث ضعیف ہے تو ابن عبدالسلام کا یہ قول کہ تلقین بدعت ہے اپنے محل میں نہیں ہے۔ (ملا علی قاری لکھتے ہیں) وهو ليس في محله لان المعتضد ينبغي ان يكون في معنى المعتضد وليس هنا كذلك۔ (یہ واقعی اپنے محل میں نہیں ہے کیونکہ معتضیف کو معتضد کے معنی میں ہونا چاہئے حالانکہ یہاں پر ایسے نہیں ہے پھر ان کا قول کہ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا اگر چہ اس کو تقویت نہ بھی ملے یہ بات اجماعی ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کا محل وہ فضائل ہیں جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور یہ حدیث ''لقنوا موتاكم'' اس کی تحقیق بھی گزر چکی ہے۔

میت کو جلدی دفن کرنے کا حکم

۱۷۱۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ فَلَا تَحْبِسُوْهُ وَاَسْرِعُوْا بِهِ إِلٰى قَبْرِهٖ وَلْيُقْرَأْ عِنْدَ رَأْسِهٖ فَاتِحَةُ الْبَقَرَةِ وَعِنْدَ رِجْلَيْهِ بِخَاتِمَةِ الْبَقَرَةِ۔

(رواه البيهقي في شعب الايمان والصحيح انه موقوف عليه)

رواه البيهقي في شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے ہیں جس وقت کوئی آدمی تم میں سے فوت ہو جائے پس اس کو روکے نہ رکھو اور اس کو اس کی قبر کی طرف جلدی پہنچاؤ اور اس کے سر کے قریب یعنی سرہانے کھڑے ہو کر سورۃ بقرہ کا ابتدائی حصہ مفلحون تک تلاوت کرو اور اس کے پاؤں کے پاس کھڑے ہو کر سورۃ بقرہ کا آخری حصہ یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ آخر تک پڑھو۔ بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن عمر پر موقوف ہے۔

تشریح: **اذا مات احدکم فلا تحبسوہ**: یعنی اس کے دفن کو بغیر عذر کے مؤخر نہ کرو' ابن ہمام کہتے ہیں: اس کے مرنے کے بعد اس کے سارے کام جلدی کرنا مستحب ہے۔

قولہ: واسرعوا بہ الی قبرہ: یہ تاکید اور اشارہ ہے کہ جنازہ میں جلدی کرنا سنت ہے' صاحب ہدایہ کہتے ہیں: دُ بکی چال سے کم ابن ہمام کہتے ہیں: یہ بھی دوڑنے کی ایک قسم ہے جو عنق سے کم ہوتی ہے اور عنق لمبے لمبے قدموں کی چال ہے تو وہ عنق سے کم چال چلتے تھے اور اگر وہ دبکی چال چلیں تو مکروہ ہے کیونکہ یہ میت کی توہین ہے ابوداؤد اور ترمذی نے ابن مسعود سے بیان کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کے ساتھ چلنے کے بارے سوال کیا تو فرمایا: **مادون الخبب** دبکی چال سے کم چلو یہ حدیث ضعیف ہے اور اصحاب ستہ نے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جنازے کو لے کر جلدی چلو اگر تو وہ نیک ہے تو بہتر چیز کی طرف تم اس کو بھیج رہے ہو اگر وہ نیک نہیں ہے تو وہ شر ہے اسے اپنے کندھوں سے اتارنے میں جلدی کرو **ولیقرأ**: مذکر اور مونث کے صیغہ کے ساتھ اور لام کے سکون اور کسرہ کے ساتھ۔

اور ایک نسخہ میں "خاتمة" ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: سورۂ بقرہ کی ابتدا کی تخصیص شاید اس لیے کی کہ وہ کتاب کی مدح اور ان متقین کی صفات پر مشتمل ہے جو اوصاف حمیدہ جیسے ایمان بالغیب، نماز اور زکوۃ سے متصف ہیں اور اس کے خاتمہ کو اس لیے خاص کیا کیونکہ وہ اللہ، فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان، عجز وانکساری کے اظہار، طلبِ بخشش ورحمت اور ذات باری تعالیٰ کی حمایت پر مشتمل ہے۔

قولہ (وقال والصحیح انہ موقوف علیہ) یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما پر امام نووی کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں: محمد بن احمد المروزی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل کو فرماتے ہوئے سنا جب تم قبرستان میں داخل ہو جاؤ تو فاتحۃ الکتاب، معوذتین اور سورۃ الاخلاص پڑھا کرو اور اس کا ثواب اہل مقابر کے حق میں کر دیا کرو تو یہ ان تک پہنچ جائے گا' اور قبروں کی زیارت سے مقصد

یہ ہے کہ زیارت کرنے والے کو عبرت حاصل ہو اور جس کی زیارت کی جارہی ہے اس کو اس کی دعاء سے فائدہ ہو۔

اور امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور العاقبۃ عبدالحق کی کتاب میں بھی امام احمد سے اسی طرح مروی ہے اور خلال نے جامع میں امام شعبی سے بیان کیا ہے کہ انصار میں سے جب کوئی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر باری باری جاتے اور قرآن پڑھتے۔

ابو محمد سمرقندی نے سورۃ اخلاص کے فضائل میں حضرت علی سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ جو کسی قبرستان کے پاس سے گزرا اور اس نے سورۃ اخلاص گیارہ مرتبہ پڑھی پھر اس کا اجر مردوں کو ہبہ کر دیا تو مردوں کی تعداد کے مطابق اجر دیا جاتا ہے۔

من مر على المقابر قرأ(قل هو الله احد) إحدى عشرة مرة، ثم وهب أجره الأموات أعطى من الأجر بعددالأموات۔

ابو قاسم سعد بن علی الزنجانی نے اپنی کتاب الفوائد میں حضرت ابو ہریرۃ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو قبرستان میں داخل ہوا اور سورۃ فاتحہ، سورۃ اخلاق اور تکاثر کو پڑھا پھر اس نے کہا جو میں نے پڑھا اس کا ثواب اس قبرستان کے مؤمنین اور مؤمنات کے نام کرتا ہوں تو وہ سارے اللہ کے ہاں اس کے سفارشی بن جائیں گے۔

من دخل المقابر ثم قرأ فاتحه الكتاب، و قل هو الله احد، والهكم التاثر ثم قال إني جعلت ثواب ما قراء ت من كلامك لأهل المقابر من المؤمنين و المؤمنات كانوا شفعاءً له إلى الله تعالى ۔

قاضی ابوبکر بن عبدالباقی الانصاری نے مشیخته میں سلمہ بن عبید سے نقل کیا ہے کہ حماد مکی نے کہا: میں ایک رات مکہ کے قبرستان کی طرف نکلا میں نے اپنا سر ایک قبر پر رکھا اور سو گیا تو میں نے اھل قبرستان کے گروہ دیکھے تو میں نے کہا: کیا قیامت ہو گئی ہے، انہوں نے جواب دیا نہیں لیکن ہمارے ایک بھائی نے سورۃ اخلاص پڑھی ہے اور اس کا ثواب ہمارے نام کیا ہے ہم اس ثواب کو ایک سال سے تقسیم کر رہے ہیں۔

عبدالعزیز صاحب الخلال نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: **من دخل المقابر فقرائی سورة ليس خفف الله عنهم و كان له بعد ومن فيها حسنات۔** جو قبرستان میں داخل ہوا اور سورۃ لیس پڑھی تو اللہ ان سے عذاب ہلکا کر دے گا اور قبرستان میں جتنے مدفون ہیں اتنی نیکیاں اس کو مل جائیں گی۔

امام قرطبی اس حدیث کے بارے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ تلاوت میت کے پاس اس کی زندگی کی حالت میں ہو اور ممکن ہے کہ اس کی قبر کے پاس ہو امام سیوطیؒ نے شرح الصدور میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

پھر کہا: میت کو قرآن کا ثواب پہنچنے میں علماء کا اختلاف ہے جمہور سلف اور ائمہ ثلاثہ پہنچنے کے قائل ہیں اور اس میں ہمارے امام شافعی نے اختلاف کیا ہے اور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بنائی ہے۔ کہ: ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [النجم:٣٩] "انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ سعی اور کوشش کرتا ہے" اور پہلے گروہ نے اس آیت کا جواب کئی وجوہ سے دیا ہے۔

اول: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ منسوخ ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ

ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾ [الطور : ۲۱] ''اور جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد بھی (راہِ) ایمان میں ان کے پیچھے چلی ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے اوران کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنے اعمال میں پھنسا ہوا ہے'' کہ جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی تو ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔ آبآء کی نیکی کی وجہ سے ابنآء کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

الثانی! یہ ابراہیم اور موسیٰ کی قوم کے ساتھ ہی خاص ہے اور رہی یہ امت تو اس کے لیے وہ ہے جس کی اس نے خود کوشش کی یا جو اس کے لیے کوشش کی گئی یہ بات عکرمۃ نے کہی ہے۔

الثالث یہاں انسان سے مراد کافر ہے البتہ مؤمن کو اس کا ثواب پہنچتا ہے جس کی وہ خود کوشش کرتا ہے یا جو اس کے لیے سعی کی جاتی ہے۔ یہ بات ربیع بن انس نے کہی ہے۔

الرابع (عادلانہ بات یہی ہے کہ: ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [النجم: ۳۹] "انسان کو وہی ملے گا جو اس نے کوشش کی'' البتہ فضل واحسان کرتے ہوئے اللہ جو چاہے اسکو زیادہ بھی دے سکتا ہے یہ بات حسین بن فضیل نے کہی ہے اورانہوں نے اس کو دعاء صدقہ، روزہ، حج اور عتق پر قیاس کیا ہے تو ثواب کے منتقل ہونے میں تو کوئی فرق نہیں خواہ وہ حج، روزے یا صدقہ کا ہو یا قرأۃ کا اور مذکورہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں لیکن وہ ساری اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ہے اور مسلمان ہمیشہ سے ہر زمانے اور ہر شہر میں جمع ہوتے اور اپنے مردوں کے لیے قرآن کی تلاوت کرتے تو یہ ایک اجماع کی شکل ہے یہ ساری بات حافظ شمس الدین بن عبدالواحد المقدسی الحنبلی نے اپنے اس رسالے میں ذکر کی ہے جو انہوں نے اس مسئلہ میں تحریر کیا ہے۔

پھر سیوطی کہتے ہیں: قبر پر تلاوت کرنا اس کی مشروعیت ہمارے اصحاب نے بالجزم بیان کی ہے۔

امام نووی شرح المہذب میں کہتے ہیں: قبر کی زیارت کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ جتنا اسے میسر ہو اتنا قرآن پڑھے اور پھر اس کے بعد اس کے لیے دعا کرے اس پر امام شافعی نے نصاً کہا ہے اور اس پر سارے اصحاب کا اتفاق ہے اور ایک دوسرے جگہ فرمایا: اگر لوگ قبر پر قرآن ختم کریں تو افضل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا میّت کے منتقل کرنے کو ناپسند کرنا

۱۷۱۸: وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ لَمَّا تُوُفِّیَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ بِالْحُبْشِیِّ وَهُوَ مَوْضِعٌ فَحُمِلَ اِلٰی مَکَّةَ فَدُفِنَ بِهَا فَلَمَّا قَدِمَتْ عَائِشَةُ اَتَتْ قَبْرَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَتْ :

وکنا کندمانی جذیمة حقبةً ☆ من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کانی ومالکاً ☆ لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

ثُمَّ قَالَتْ وَاللّٰهِ لَوْ حَضَرْتُكَ مَا دُفِنْتَ اِلَّا حَیْثُ مُتَّ وَلَوْ شَهِدْتُكَ مَا زُرْتُكَ۔ [رواه الترمذی]

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۱/۳ حدیث رقم ۱۰۵۵۔

ترجمہ: ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی وفات حبشی کے مقام پر ہوئی تو ان کو مکہ کی طرف لایا گیا اور مکہ میں دفن کیا گیا۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کے لیے (مکہ) تشریف لائیں تو عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی قبر کے پاس آئیں وہاں یہ اشعار پڑھے۔

''ہم دونوں جزیمہ کے دو ہم نشینوں کی طرح تھے۔ جو ایک لمبی مدت تک آپس میں جدا نہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ کہا گیا۔ وہ دونوں ہرگز جدا نہ ہونگے پس جب ہم دونوں جدا ہوئے گویا میں اور مالک باوجود لمبا عرصہ ساتھ رہنے کے پھر ہم نے ایک رات بھی اکھٹے نہیں گزاری۔''

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اللہ کی قسم! اگر میں تیرے مرنے کے وقت حاضر ہوتی تو تو وہاں ہی دفن ہوتا جس جگہ تجھے موت آئی تھی موت کی جگہ پر دفن کرنا سنت اور افضل ہے اور اگر میں تیرے پاس تیرے مرنے کے وقت حاضر ہوتی تو میں تیری زیارت نہ کرتی۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ابی ملیکۃ: تصغیر کے ساتھ ہے۔

الحبشی: نہایہ میں ہے حاء کے ضمہ، باء کے سکون، شین کے کسرہ اور یاء مشدد کے ساتھ یہ مکہ کے قریب جگہ کا نام ہے جوہری کہتے ہیں: یہ مکہ کے نشیب میں ایک پہاڑ ہے۔

قولہ: وھو موضع: یہ جملہ راوی کی بیان کردہ تفسیر ہے اس میں دونوں اقوال کا احتمال ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گویا اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اگلے اشعار پڑھے۔

''دنیا میں ہونے والا طویل اجتماع' زوال کے بعد دنیا کا انتہائی مختصر ترین زمانہ انتہائی تیزی سے گزرا ہوا پل لگتا ہے۔

جس طرح کہ فانی اشیاء کی شان میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [الاحقاف: ۳۵]

''پس (اے محمد) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو اور ان کے لئے (عذاب) جلدی نہ مانگو جس دن یہ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (خیال کریں گے کہ) گویا (دنیا میں) رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک ہوں گے جو نافرمان تھے'' اسی لیے کہا جاتا ہے: دنیا ایک گھڑی ہے اس کو اطاعت اور فرمانبرداری والی گھڑی بنا۔

قولہ وکنا کندمانی جذیمۃ ...... لن یتصدعا یعنی میں اور تم تیری زندگی میں تو دونوں ایک دوسرے کے قریب، ساتھی اور محبت کرنے والے تھے۔

کندمانی جذیمۃ: جیم کے فتحہ اور ذال نقطے والے کے کسرہ کے ساتھ ایک نسخہ میں تصغیر کے ساتھ بھی ہے طیبیؒ کہتے ہیں: یہ جذمہ عراق اور جزیرہ کا بادشاہ تھا اور عرب بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے اور وہ زباء کا شوہر تھا قاموس میں ہے زباء جزیرہ کی ملکہ تھی اور اسے ملوک الطوائف میں شمار کیا جاتا ہے۔

یعنی اس کے دونوں دوستوں اور غم خواروں کی طرح کہا گیا ہے اس سے مراد وہ قطبی ستارے ہیں۔

حقبة : کسرہ کے ساتھ ہے ایسی مدت جس کا کوئی وقت نہ ہو۔

حتی قیل: یعنی یہاں تک کہ لوگ کہیں وہ کبھی جدا نہیں ہونگے یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ اس اجتماع کی درازی ہمیشہ رہے گی۔

قولہ (فلما تفرقنا) یعنی موت کے ساتھ۔

کانی و مالکا: یہ مردہ شاعر کا بھائی ہے۔

چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ فانی جب منقطع ہوگیا تو گویا کہ وہ تھا ہی نہیں جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ﴾ [یونس : ٢٤] اور کہا گیا ہے کہ "طول" میں "لام" مع یا "بعد" کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اقم الصلاة لدلوك الشمس۔ اور اسی سے ہے صوموا لرؤیتہ یعنی اس رؤیت کے بعد شمنی، مغنی کی شرح میں فرماتے ہیں: یہ اشعار تمیم بن نویرہ کے ہیں اس میں وہ اپنے بھائی مالک کا مرثیہ کہتا ہے جس کو خالد بن ولید نے قتل کر دیا تھا۔

قولہ (ثم قالت) یعنی عائشہ۔

لو حضرتك: یعنی اگر میں تمہارے دفن کے وقت' اور میرکؒ کہتے ہیں: میں تیری وفات کے وقت حاضر ہوتی اور طیبیؒ کہتے ہیں: اور دفن کے وقت بھی حاضر ہوتی۔

مادفنت : مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

یعنی میں تجھے منتقل ہونے سے روک دیتی اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے گویا کہ حضرت عائشہؓ کا موقف منتقل کرنے میں مطلقاً منع کا ہے ابن حجر کہتے ہیں: کیونکہ نبیؐ نے دعا کی تھی کہ جس نے بھی مکہ سے ہجرت کی ہے اللہ تعالیٰ اس کو مکہ میں فوت نہیں کرے گا یہ کمزور علت ہے۔

قولہ :ولو شهدتك: یعنی تیری وفات کے وقت حاضر ہوتی۔

مازرتك : یعنی دوسری مرتبہ۔ طیبیؒ کہتے ہیں: کیونکہ نبیؐ نے قبروں کی بکثرت زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے اب حجرؒ کہتے ہیں: اسی طرح کہا گیا ہے لیکن اس کی یہ توجیہ کی جائے گی کہ ان کو اس کے منسوخ ہونے کا علم نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں: ناسخ نبی کا یہ فرمان ہے: كنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها اور بعض نے کہا کہ رخصت صرف مردوں کے لیے ہے شاید حضرت عائشہ کا بھی یہی مؤقف ہو اور اس کی تائید وہ بات بھی کرتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عورتوں کے مساجد کی طرف جانے کو جائز نہیں کہا حالانکہ نبیؐ نے اس کی اجازت دی ہے اور وہ یہ علت نکالتی تھیں کہ اگر نبیؐ اس زمانے کی عورتوں کی خرابی کو جان لیتے تو ان کو منع کر دیتے کیونکہ امہات المؤمنین کو ہمیشہ قابل توجہ سمجھا گیا ہے اور کسی ضرورت کے بغیر ان کا گھر سے نکلنا جائز نہیں جیسے حج وغیرہ اور صرف زیارت اس قبیل سے نہیں ہے' اس میں بحث موجود ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میّت کو قبر میں اتارنے کا طریقہ

۱۷۱۹: وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ قَالَ سَلَّ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْدًا وَّرَشَّ عَلٰى قَبْرِهٖ مَاءً۔

[رواه ابن ماجة]

اخرجه ابن ماجه في السنن ٤٩٥/١ حديث رقم ١٥٥١۔

ترجمہ: حضرت ابو رافعؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے سعد کو جنازے (میت کی چارپائی) سے سر کی طرف سے نکالا اور ان کی قبر پر پانی چھڑکا اس کو ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: یہ امام شافعی کے نزدیک ہے ہمارے نزدیک اس کو ضرورت یا جواز پر محمول کیا جائے گا۔

قوله: (ورش) یعنی اس کا حکم دیا۔

قبر پر مٹی ڈالنے کا مسنون طریقہ

۱۷۲۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ ثُمَّ اَتَى الْقَبْرَ فَحَثٰى عَلَيْهِ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهٖ ثَلَاثًا . (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ٤٩٩/١ حديث رقم ١٥٦٥۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنازے پر نماز پڑھی۔ پھر قبر کے پاس تشریف لائے۔ پھر آپ ﷺ نے تین لپیں (تین مٹھیاں) اس پر سر کی طرف سے ڈالیں۔ اس کو ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ثلاثا: (اس کی تمیز محذوف ہے) ای ثلاث حثیات یعنی تین لپ اور یہ نیکی کے کاموں میں اعانت کے باب سے ہے۔

قبر پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کی ممانعت

۱۷۲۱: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ قَالَ رَاٰنِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلٰى قَبْرٍ فَقَالَ لَا تُؤْذِ صَاحِبَ هٰذَا الْقَبْرِ اَوْلَا تُؤْذِهٖ۔ (رواه احمد)

رواه احمد

ترجمہ: عمرو بن حزمؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ کو قبر پر تکیہ لگائے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ قبر والے کو تکلیف نہ دو یا فرمایا اس کو ایذا نہ دو۔ یہ امام احمدؒ نے روایت کی ہے۔

تشریح: "حزم" حاء کے فتحہ اور زاء کے سکون کے ساتھ۔

قوله فقال: لاتؤذ صاحب القبر: یعنی اس کی توہین نہ کر۔

قوله: اولا تؤذه۔ اسم ظاہر کی جگہ ضمیر کو لایا گیا ہے اور یہ راوی کی طرف سے شک ہے۔

بَابُ الْبُكَاءِ عَلَى الْمَيِّتِ

میت پر رونے کا بیان

عرضِ مرتب:

فائدہ : ① مردے پر بغیر نوحہ اور چلانے کے رونا جائز ہے نوحہ اور چلانا مکروہ ہے اور میت کی بڑھ چڑھ کر تعریف کرنا مکروہ ہے۔ جیسے کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا۔ میت کی خوبیوں کا ذکر کرنا اور تعریف کرنا مکروہ نہیں ہے اور تعزیت کرنا مستحب ہے اور تعزیت کے معنی ہیں کہ مصیبت زدہ کو صبر کی تلقین کرے اور تسلی دے اور تعزیت ایک سے زیادہ بار نہیں کرنی چاہیے اور تیسرے روز رشتہ داروں وغیرہ کا جمع ہونا اور تکلفات کرنا اور ناحق مال ضائع کرنا اور یتیموں کا مال وصیت کے بغیر کھانا بدعت ہے اور حرام ہے اور قاموس کے مصنف مجدالدینؒ نے اپنی کتاب سفر السعادۃ میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جنازے کے علاوہ جمع ہونے کی عادت نہیں تھی کہ جمع ہو کر قرآن پڑھیں اور ختمات پڑھیں۔ نہ قبر پر اور نہ قبر کے علاوہ پر یہ سب بدعت ہیں انتہی۔ گھر میں یا مسجد میں بیٹھنا جائز ہے اس لیے کہ جب آپ ﷺ کو جعفرؓ زید اور ابن رواحہ کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ مسجد میں غمگین بیٹھے اور لوگ تعزیت کے لئے آتے تھے لیکن اس طرح سے تعزیت نہ کرتے تھے جس طرح اب متعارف ہے انتہی اور اکثر علماء کے نزدیک میت والے کے نزدیک جمع ہونا مکروہ ہے اور سخت مکروہ ہے کہ گھر کے باہر بیٹھ جائیں اور لوگ جمع ہو کر تعزیت کریں اس لیے کہ یہ جاہلیت کا فعل ہے بلکہ جب دفن سے فارغ ہو جائیں تو متفرق ہو جائیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو جائیں اور صاحب میّت کو بھی چاہیے کہ اپنے کام میں مشغول ہو جائے اور قبر کے گرد حلقہ باندھ کر قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔ (حق فی الترجمۃ سفر السعادۃ)

فائدہ : ② میّت زدہ کی تعزیت کرنا اچھی بات ہے اور تعزیت کا وقت مرنے سے تین دن تک ہے اور اس کے بعد مکروہ ہے اگر تعزیت کرنے والا غائب ہو یا مصیبت زدہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے جب ملے تعزیت کر لے۔ دفن کے بعد تعزیت کرنا اولیٰ ہے۔ یہ تب ہے اگر وہ بہت زیادہ جزع وفزع نہ کریں۔ اگر دیکھیں کہ وہ بہت زیادہ جزع وفزع کرتے ہیں تو دفن کرنے سے پہلے ہی تعزیت متاخرین کے نزدیک بہتر ہے اور مستحب ہے کہ عام تعزیت کرے۔ میت کے تمام چھوٹوں اور بڑوں سے مردوں اور عورتوں سے تعزیت کرے۔ اگر عورت جوان ہو تو اس سے تعزیت صرف محرم ہی کرے۔

اور تعزیت کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ یوں کہے اللہ تعالیٰ تیری میت کو بخشے اور اس سے درگزر کرے اور اس کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور اس کی مصیبت پر تمہیں صبر نصیب کرے اور اس کے مرنے پر تجھے ثواب عطا فرمائے اور تعزیت کے بہترین الفاظ یہ ہیں جو آپ ﷺ نے بیان فرمائے ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں: ((ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی و کل شیء عندہ باجل مسمی)) ”یعنی اللہ کی ہی کی مِلک ہے وہ چیز جو اس نے لی اور اسی کی لیے وہ چیز ہے جو اس نے عطاء کی اور ہر چیز کا اس کے

پاس وقت مقرر ہے''۔ اگر کافر مر جائے اور قریبی اس کا مسلمان ہو تو وہ یوں تعزیت کرے۔ اللہ تجھے بہت ثواب عطا فرمائے اور تجھے اچھی تسلی دے اور تیری میت کو بخشے اور اگر میت مسلمان ہو اور اس کا قریبی غیر مسلم ہو تو یوں تعزیت کرے اللہ تعالیٰ میت کی بخشش فرمائے اور تمہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو بہت ثواب دے اور عجم کے شہروں میں جو رسم و رواج ہے کہ سڑکوں اور بازاروں میں بچھونے بیٹھتے ہیں اور راستے بند کر دیے جاتے ہیں راہ گیروں کو تکلیف ہوتی ہے یہ بہت بری رسم ہے اور مصیبت کے لیے تین دن تک بیٹھنا جائز ہے اور اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے اور مردوں کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے اور چہرہ کالا کرنا اور گریبان چاک کرنا اور منہ کا نوچنا اور بالوں کا بکھیرنا اور سر پر مٹی ڈالنا اور ہاتھوں اور سینے کا پیٹنا اور قبروں پر آگ روشن کرنا۔ جاہلیت کی رسوم ہیں اور کھانا پکا کر میت والے کے گھر بھیجنا مکروہ نہیں ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری)

فائدہ: (۳) لوگ جو تیسرے دن تکلفات کرتے ہیں' بچھونے بچھاتے ہیں' خیمے کھڑے کرتے ہیں اور خوشبوئیں تقسیم کرتے ہیں یہ سب بدعت کے کام ہیں اور نامشروع ہیں کذا نقلہ الشیخ عن مطالب المؤمنین اور نصاب میں لکھا ہے کہ لوگوں نے جو تیسرے روز خوشبو لگانے کی عادت مقرر کر رکھی ہے اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے کہ وہ تیسرے روز سوگ اتارنے کے لیے خوشبو لگاتی ہیں اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ پرہیز خوشبو کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہے کہ عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اور تعزیت کے آداب یہ ہیں کہ صاحب مصیبت سے مصافحہ کرے اور تواضع اختیار کرے اور زیادہ کلام نہ کرے اور نہ ہی مسکرائے۔

الفصل الاول:

غم کی وجہ سے آنسوؤں کا جاری ہو جانا نبوت کے منافی نہیں ہے

۱۷۲۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَبِىْ سَيْفِ الْقَيْنِ وَكَانَ ظِئْرًا لِاِبْرَاهِيْمَ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِبْرَاهِيْمَ فَقَبَّلَهٗ وَشَمَّهٗ ثُمَّ دَخَلْنَا عَلَيْهِ بَعْدَ ذٰلِكَ وَ اِبْرَاهِيْمُ يَجُوْدُ بِنَفْسِهٖ فَجَعَلَتْ عَيْنَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَذْرِفَانِ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَّاَنْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا ابْنَ عَوْفٍ اِنَّهَا رَحْمَةٌ ثُمَّ اَتْبَعَهَا بِاُخْرٰى فَقَالَ اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۷۲/۳ حديث رقم ۱۳۰۳۔ ومسلم في صحيحه ۱۸۰۷/٤ حديث رقم (٦۲۔ ۲۳۱۵)۔ وابوداوٗد في السنن ۲۹۳/۳ حديث رقم ۳۱۲٦۔ وابن ماجه ٥٥٦/۱ حديث رقم ۱٥۸۹۔ واحمد في المسند ۱۹٤/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے گھر گئے۔ (جو کہ ابراہیم

ﷺ کی دایہ کا شوہر تھا) پس نبی کریم ﷺ نے ابراہیم کو لیا ان کا بوسہ لیا اور ان کو سونگھا یعنی اپنی ناک رکھی اور اپنا منہ ان کے منہ پر رکھا۔ جیسے کوئی بو سونگھتا ہے اور پھر ہم ان کے پاس چند روز کے بعد گئے اس حال میں کہ ابراہیم نزع کی حالت میں تھے پس حضور ﷺ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے نبی آپ ﷺ رو رہے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عوف کے بیٹے یہ رحمت ہے پھر اس رونے کے بعد پھر روئے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہے اور ہم باوجود اس کے نہیں کہتے مگر وہ چیز کہ جس سے ہمارا رب راضی ہو جائے۔ اے ابراہیم! ہم تیری جدائی کے غم سے روتے ہیں اس کو بخاری اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: قولہ: **دخلنا مع رسول اللہ ﷺ ...... وکان ظئرا لابراھیم: أبی سیف :** ان کا نام براء تھا۔ ان کی بیوی ام سیف کا نام خولہ بنت منذر انصاریہ تھا' ایسے ہی تخریج میں ذکر ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اُس کا نام ریان ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم کو دودھ پلانے والی تھیں۔

القین : قاف کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ یعنی زلف تراش۔

ظئرا : ظاء کے کسرہ مہموز کے ساتھ اس کا بدل بھی جائز ہے اور یہ کہتے ہیں دودھ پلانے والی کو۔

(لابراھیم) اس کا حدیث میں مطلب یہ ہے کہ ابراہیم کو دودھ پلانے والی کا خاوند۔ ابراہیم فوت ہوئے اور وہ سولہ یا سترہ مہینہ کے تھے ایسے ہی کتب تخریج میں ہے اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ وہ آٹھ مہینوں کے تھے واللہ اعلم!

یہ بھی کہا گیا ہے کہ (الظئر) مربی کو کہتے ہیں اور "مرضع" میں مذکر و مونث برابر ہے درحقیقت اس میں عطف ہے اور دودھ پلانے والی کے خاوند کا نام (ظھر) اس لیے رکھا گیا ہے کہ چونکہ دودھ اُسی کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا وہ باپ کے مقام پر ہوتا ہے نرمی کرنے میں۔

النہایہ میں ہے کہ (الظئر) اُس دودھ پلانے والی کو کہتے ہیں جو اپنے بچوں کے علاوہ کو دودھ پلائے یہ مذکر کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

فأخذ رسول اللہ ﷺ ابراھیم فقبلہ وشمہ : یعنی اپنی ناک اور چہرہ اُس کے چہرے پر رکھا جیسے آپ خوشبو سونگھ رہے ہوں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں سے محبت اور نرمی برتنا سنت ہے۔ ابن ملکؒ فرماتے ہیں: بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے کہا میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لاأملك لك إن كان الله نزع الرحمة من قلبك** "میں اس چیز کا مالک نہیں اگر اللہ تعالیٰ ہی نے تیرے دل سے رحم کو کھینچ لیا ہے۔

وابراھیم یجود بنفسہ : یعنی فوت ہو رہے تھے یہ کہا گیا ہے کہ حرکت کر رہے تھے اور بستر پر کانپ رہے تھے کیونکہ وہ حالت نزع میں تھے۔

تذرفان: راء کے کسرہ اور ذال معجمہ کے سکون کے ساتھ یعنی آنسو بہانے لگیں النہایہ میں ہے: "**ذرفت العین**" جب اس سے آنسو جاری ہو جائیں۔

وأنت : اس کا عطف کلام مقدر پر ہے یعنی لوگ تو روتے ہیں اور یا رسول اللہ آپ بھی رو رہے ہیں جیسے ہم روتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''آپ ایسے کر رہے ہیں'' ''مصیبتوں پر رو رہے ہیں جیسے لوگ کرتے ہیں'' تو اس کو بعید جانا کہ عجز پر دلالت کرتا ہے مصیبت پر صبر کرنے کی بجائے تو پھر آپ نے جواب دیا کہ وہ حالت جسے تم مشاہدہ کر رہے ہو رقت اور رحمت کی وجہ سے ہے اس چیز پر جو قبض کر لی گئی ہے نہ کہ یہ قلت صبر کی وجہ سے ہے (تو فرمایا اے ابن عوف) یعنی آنسو اور وہ حالت جس کا تو مشاہدہ کر رہا ہے (رحمة) یعنی رحمت کا اثر ہے۔

ثم اتبعها : یعنی یہ رونے کی وجہ سے تھی۔ (باخری) یعنی دوسری دفعہ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی پہلے آنسوؤں نے دوسرے آنسوؤں کی پیروی کی یا پھر یہ کہ پہلے کلمہ نے دوسرے کلمہ کی پیروی کی اور وہ یہ ہے کہ ''یہ رحمت ہے۔''
نصب کے ساتھ اور رفع کے ساتھ بھی۔

ویحزن: زاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بعض نسخوں میں زاء کے ضمہ کے ساتھ ہے جو کہ فاحش غلطی ہے کیونکہ یہ ضمہ کے ساتھ تو متعدی ہے اور فتحہ کے ساتھ لازم۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ ان دونوں کی خصوصیت ہے اور جس چیز کے لیے یہ پیدا کی گئی ہیں اس سے اُن کو روکا نہیں جا سکتا خصوصی طور پر جب رحمت کی وجہ سے ہو تو پھر اس پر ثواب ہوگا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قول ''انها رحمة'' یہ کلمہ مجمل ہے پھر اس کے بعد تفصیل سے بیان کیا اور وہ یہ قول ہے ''ان العين تدمع والقلب يحزن'' اس تاویل کی تائید اس حدیث میں ہے کہ: هذه رحمة جعلها الله في قلوب عباده ''یہ رحمت ہے اللہ نے اسے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالا ہے۔''

یرضی ربنا: ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ اور ربنا کے نصب کے ساتھ ہے۔

وانا بفراقك (فاء سببیہ ہے اور مصدر کی اضافت ہے فاعل کی طرف اور مفعول محذوف ہے) ای بسبب مفارقتك ايانا (تیری ہم سے جدائی کے سبب)۔

(یا ابراهيم لمحزونون) یعنی طبعی اور شرعی طور پر اور اس میں اشارہ ہے کہ جو غمگین نہ ہوا تو یہ دل کی سختی کی وجہ سے ہے اور جو آنسو نہ بہائے تو یہ رحمت کی کمی کی وجہ سے ہے یہ حالت زیادہ محبوب ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں اُس شخص کی نسبت جس کا بچہ فوت ہوا اور وہ ہنس دیا عدل یہ ہے کہ ہر چیز کو اُس کا حق دیا جائے میرکؒ فرماتے ہیں: اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے ایک اور روایت میں ہے کہ ''اے اللہ کے رسول کیا آپ بھی روتے ہیں آپ تو اس سے منع نہیں فرماتے ہیں کہ رویا جائے تو فرمایا: لا ولكني نهيت عن النوح نہیں میں نے تو نوحہ کرنے سے منع فرمایا تھا۔''

غم کی وجہ سے آنسوؤں کا نکلنا

۱۷۲۳: وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اَرْسَلَتِ ابْنَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْهِ اَنَّ ابْنًا لِّيْ قُبِضَ فَاْتِنَا فَاَرْسَلَ يَقْرَأُ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهُ مَا اَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ

وَلْتَحْتَسِبْ فَاَرْسَلَتْ اِلَيْهِ تُقْسِمُ عَلَيْهِ لَيَأْتِيَنَّهَا فَقَامَ وَمَعَهُ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَاُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَّرِجَالٌ فَرُفِعَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّبِيُّ وَنَفْسُهُ تَتَقَعْقَعُ فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ فَقَالَ سَعْدٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذَا فَقَالَ هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ فَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۵۱/۳۔ حديث رقم ۱۲۸۴۔ ومسلم فی صحيحه ۶۳۵/۲ حديث رقم (۱۱۔ ۹۲۳)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۹۲/۳ حديث رقم ۳۱۲۵۔ والنسائی ۲۱/۴ حديث رقم ۱۸۶۸۔ واحمد فی المسند ۲۰۴/۵۔

ترجمہ: حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بیٹی یعنی حضرت زینب ؓ نے حضور ﷺ کو اپنے بیٹے کی وفات کی خبر بھیجی' آپ نے اس کو سلام بھیجا اور کہلا بھیجا کہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ جو چیز اس نے لی اور اس کی ہے جو چیز اس نے دی یعنی اولاد وغیرہ ان کے ہلاک ہونے کی وجہ سے جزع فزع نہیں ہونی چاہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی امانت لے لیتا ہے اور ہر چیز اس کے نزدیک مدت معین کے ساتھ ہے۔ یعنی تیرے بیٹے کی زندگی بھی اتنی ہی ہے جتنی اس کے مقدر میں تھی پس چاہیے کہ تو صبر کرے اور ثواب پائے۔ پھر دوبارہ حضور ﷺ کی بیٹی نے آدمی بھیجا اور حضور ﷺ کو قسم دی کہ ضرور تشریف لائیں چنانچہ حضور ﷺ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہ' معاذ بن جبل' ابی کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہو لئے۔ پس لڑکے کو آپ ﷺ کی گود میں دے دیا گیا جو نزع کی کیفیت سے دوچار تھا۔ پس حضور ﷺ کی دونوں آنکھیں بہنے لگیں پھر سعدؓ فرمانے لگے اے اللہ کے نبی ﷺ یہ کیا ہے۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں پر رحمت کرتا ہے جو اس کے بندوں پر رحم کرتے ہیں۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا۔

تشریح: **قوله :أرسلت ابنة النبی ﷺ...... فأتنا:**

نبی کریم ﷺ کی یہ صاحبزادی حضرت زینب تھیں جیسا کہ اس کی تصریح ابن ابی شیبہ اور دیگر نے کی ہے۔

قبض : یعنی اس کی موت قریب آ چکی ہے اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی وہ حالت قبض ونزع میں داخل ہو چکا ہے النہایہ میں ہے کہ 'قبض المریض' جب مریض فوت ہو جائے اور جب موت پر جھانکنے لگے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علی بن ابی العاص تھے اور یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ یہ بلوغت تک زندہ رہے تھے پھر فوت ہو گئے عرف عام میں اس جیسے کو بچہ نہیں کہا جاتا بلکہ لغت میں کہا جاتا ہے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وضع لغوی یہاں کافی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ امامۃ بنت ابی العاص تھیں جیسا کہ مسند احمد میں ذکر ہے۔

قوله :فا رسل يقراء السلام ويقول فلتصبر ولتحتسب :

وله : اور حصن میں ہے کہ "وَلِلّٰهِ" یہ قیاس کے مخالف ہے اور اصول کی روایت کے بھی مخالف ہے۔

(ما أعطی) ''ما'' دونوں جگہوں پر مصدریہ ہے یا پھر موصولہ ہے اور ضمیر راجع محذوف ہے پہلی وجہ پر تقدیر یوں ہوگئی ''لله الاخذ و الاعطاء'' اور دوسری وجہ سے ''لله الذی أخذہ من الاولا د۔ولہ ما أعطی منھم'' یا پھر اس سے بھی زیادہ عام معنی رکھتا ہے اور حرف جار کو مقدم لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ملک الجبار کے ساتھ خاص ہے اور اخذ کو اعطاء پر مقدم کیا گیا ہے حالانکہ اخذ متاخر ہے فی الحقیقت اور معنی اور مقام بھی اسی کا تقاضہ کرتے ہیں۔

اس صورت میں معنی ہوگا'' کہ اللہ جس چیز کو لینے کا ارادہ کرتے ہیں: وہ اُسی کی عطا ہی ہوتی ہے جو اُس نے دی تھی اگر وہ اُسے واپس لے لے تو وہ اُسی کی دی ہوئی ہے تو جائز نہ ہے کہ جزع وفزع کیا جائے کیونکہ جو امانت کسی کو واپس کرتا ہے وہ روتا پیٹتا نہیں ہے جب وہ امانت واپس کرتا ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ اعطاء سے مراد زندگی عطا کرنا ہو بقیہ لوگوں کے لیے جو میت کے علاوہ باقی بچے ہیں اور انہیں مصیبت پر ثواب دینا یا پھر اس سے بھی عام مطلب مراد ہے

و کل عندہ باجل مسمی: میرکؒ فرماتے ہیں: یعنی ہر ایک چیز اخذ اور عطاء سے دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مقرر اندازے کے ساتھ ہے میرکؒ فرماتے ہیں: کل پر نصب پڑھنا بھی جائز ہے ان کے اسم پر عطف ڈالتے ہوئے اس سے تاکید بھی ہو جائے گی۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: ''میں کہتا ہوں اس کی تائید رسم اور روایت نہیں کرتی فرمایا: اور ''عندیہ'' کا مطلب علم ہے اور یہ مجاز ملازمتہ سے ہے اور اجل کا اطلاق حد اخیر پر ہوتا ہے اور مجموعی عمر پر ہوتا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ جائز ہے کہ یہ امر مؤنث غائب ہو یا حاضر ہو اُس قراءت پر جس پر اسے پڑھا جاتا ہے۔ فبذلك فلتفرحوا اس پیغام پر جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دیا گیا ہے اور جو غائب میں تلفظ کیا گیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ صبر کے بدلے میں ثواب ہے۔ اور جزع کرنے سے یہ ثواب فوت ہو جاتا ہے اور یہ حدیث دراصل تعزیت کے بارے میں ہے اسی لیے امام جزری نے حصن میں فرمایا ہے: جب کوئی آدمی تعزیت کرے تو سب سے پہلے سلام کہے اور پھر ''انا لله وانا الیه راجعون'' پڑھے۔ اور ان لله ماأخذ و له ما اعطی ...... اھا پڑھے۔

فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ کی طرف خط لکھا جس میں تعزیت کی تھی اُن کے بیٹے کی کہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: محمد رسول اللہ کی طرف سے معاذ بن جبل کی طرف السلام علیکم! میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اجر کو بڑھائے اور آپ کو صبر کی توفیق دے اور ہمیں اور آپ کو شکر عطا کرے کیونکہ ہماری جانیں اور ہمارے اموال اور ہمارے اہل اور ہماری اولادیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اُس کی عاریتاً دی ہوئی ہیں اور ایک مقررہ مدت تک فائدہ اُٹھانے کے لیے ہیں وہ انہیں ایک مقررہ وقت کے بعد قبض کرے گا پھر اُس نے ہم پر شکر فرض کیا ہے جب وہ ہمیں کوئی چیز عنایت کرے اور صبر جب وہ آزمائے آپ کا بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ، عاریتاً دی ہوئی واپس کرنے کی چیزوں میں سے تھا اور آپ کا متاع تھا رشک میں اور سرور میں اور اُس نے اُسے واپس لے لیا ہے بہت زیادہ اجر کے ساتھ نماز اور رحمت کے ساتھ اور ہدایت کے ساتھ اگر تو صبر کرے تو صبر کر اور جزع سے اپنے اجر کو ضائع مت کر پھر تو نادم ہوگا اور یہ بھی جان لے کہ جزع کرنے سے کچھ بھی واپس نہیں آئے گا اور نہ ہی غم کم ہوگا جو نازل ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا والسلام، اسے امام حاکم نے روایت کیا ہے اور

ابن مردویہ نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے۔

امام حاکم فرماتے ہیں یہ روایت حسن غریب ہے عجیب باتوں اور فیصلوں میں سے یہ ہے کہ میرا اس کتاب کو لکھنے کے دوران اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے بیٹا فوت ہوگیا اُس کا نام حسن تھا صورت اور سیرت میں فاضل تھا اور جامع الفضائل تھا اللہ تعالیٰ اُس کا ٹھکانہ اچھا کرے اور اُس کے آرام گاہ کو مزین کرے تو مجھے بھی اس حدیث سے بہت ہی کامل تعزیت اور اچھی تسلی مل گئی ہم بھی اللہ سے مکمل ثواب کے ساتھ اچھا خاتمہ کی امید کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد رسول اللّٰہ (ﷺ) إلى معاذ بن جبل سلام عليكم، فإني احمد اللّٰه اليك الذى لا اله هو أما بعد فاعظم اللّٰه لك الأجر والهمك الصبر، ورزقناوإيا ك الشكر فإنَّ أنفسنا وأموالنا وأهلينا وأولادنا من مواهب الله عزوجل الهنيئة و عواريه المستودعة متع بها الى اجل معدود' ويقبضها لوقت معلوم' ثم افترض علينا الشكر اذا أعطى' والصبر اذا ابتلى فكان ابنك من مواهب الله الهنئية و عواريه المستودعة متعك به فى غبطة و سرور' و قبضه منك باجر كثير الصلاة والرحمة والهدى' ان احتسبت فاصبر' ولا يحبط جزعك أجرك فتندم واعلم ان الجزع لا يرد شيئا ولا يدفع حزنا وما هو نازل فكانوالسلام۔

یہ نون مذکورہ کے ساتھ ہے۔

قوله (فقام و معه سعد بن عبادة و معاذ بن جبل وابى بن كعب و زيد بن ثابت) بڑے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین تھے۔

فرفع: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

بظاہر یوں لگتا ہے کہ بچہ کسی ایک کے ہاتھوں سے اُٹھایا گیا: امام ابن ملک فرماتے ہیں: کسی نے آپ ﷺ کی گود میں رکھا۔

ونفسه: یعنی اُس کی روح۔ **تقعقع:** مضطرب تھی اور حرکت کر رہی تھی ایک حالت پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ (کذا فی النہایہ)

قوله (ففاضت) عيناه۔

یہ نسبت مجازی ہے معنی یہ ہے کہ آنسو رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔

قوله (فقال سعد) یعنی مذکورہ سعد بن عبادۃ مراد ہیں۔

قوله (يا رسول الله ما هذا) یہ رونا آپ کا کیسا ہے۔

قوله (فقال هذه) یعنی یہ آنسو جو ہیں۔

قوله (رحمة) یعنی یہ اُس غم کے اثرات میں سے ایک اثر ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: کہ رونا رقتِ قلبی سے تھا۔

قوله (جعلها) یعنی یہ رحمت ہے اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: سعدؓ کا گمان تھا کہ ہر قسم کا رونا حرام ہے اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ بھول گئے ہیں تو رسول اللہ ﷺ

نے انہیں بتلایا کہ صرف رونا اور آنکھوں سے آنسو حرام نہیں اور نہ ہی مکروہ ہیں بلکہ رحمت اور فضیلت ہے اور جو چیز حرام ہے وہ نوحہ اور ندب اور گریبان چاک کرنا اور سینہ کوبی کرنا ہے۔

قولہ (فانما) ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ ہے۔

یرحم اللہ من عبادہ الرحماء : یہ رحیم کی جمع ہے راحم کے معنی میں ہے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے اپنے بندوں پر جو ان اخلاق کے ساتھ متصف ہوں اور وہ اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے اور مِنْ "من عبادہ" میں جو موجود ہے یہ بیانیہ ہے اور مفعول سے حال بن رہا ہے اور وہ "رحماء" ہے اسے اجمالاً مقدم کیا گیا ہے تا کہ زیادہ مناسب معلوم ہو یہ طیبی کا کلام ہے اور جو چیز ظاہر ہے وہ یہ کہ مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی وہ اپنے تمام بندوں پر رحم کرتا ہے جو رحم نہیں کرتا ہے اُس پر وہ کبھی رحم نہیں کرتا ہے۔

میرک فرماتے ہیں: ابوداؤد، احمد اور نسائی، ابن ماجہ نے اسے ذکر کیا ہے نیز ایک مشہور حدیث میں بھی آیا ہے:

الراحمون یرحمهم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

"کہ رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرے گا تم زمین والوں پر رحم کرو جو آسمانوں پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔"

اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے اور ارباب الکمال ذوالجلال کے اخلاق سے پیدا ہوئے ہیں وہ رحمت کی صفت سے متصف ہیں اور رحمت عام کو شامل ہیں اور رحمت خاص سے فاضل ہیں۔

نامعلوم بیماری پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پریشان ہو کر آنسوؤں کا جاری ہو جانا

۱۷۲۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اِشْتَكٰى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ شَكْوًى لَهٗ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهٗ مَعَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَسَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ وَعَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهِ وَجَدَهٗ فِيْ غَاشِيَةٍ فَقَالَ قَدْ قُضِيَ قَالُوْا لَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَاَ الْقَوْمُ بُكَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكَوْا فَقَالَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ وَلٰكِنْ يُعَذِّبُ بِهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى لِسَانِهٖ اَوْ يَرْحَمُ وَاِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ۔ [متفق علیه]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۷۵/۳۔ حدیث رقم ۱۳۰۴۔ ومسلم فی صحیحه ۶۳۶/۲ حدیث رقم (۱۲۔ ۹۲٤)۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے معلوم نہیں کہ کونسی بیماری تھی پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی معیت میں ان کی عیادت کرنے کو آئے تو جب ان کے پاس گئے۔ تو ان کو بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ارشاد فرمایا کہ کیا وہ فوت ہو گئے ہیں صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! نہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر از راہ مہربانی کے رو ئے اس پر

صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رو پڑے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں کے ساتھ اور دل کے غم کی وجہ سے عذاب نہیں کرتا۔ لیکن اس چیز کے ساتھ اللہ عذاب دیتا ہے اور اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا اور تحقیق مردے کو لوگوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ یہ بخاری اور مسلمؒ نے روایت کی ہے۔

تشریح: **قوله :قال ' اشتكى سعد بن عبادة ...... فبكى النبي ﷺ۔**

شکوی : مصدر ہے یا مفعول بہ ہے۔

فاء تاه النبي ﷺ يعوده : یہ فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے یا پھر مفعول ہے یعنی وہ عیادت کا قصد کر رہے تھے' قولہ **(مع عبد الرحمن بن عوف و سعد بن ابی وقاص و عبد الله بن مسعود)** یہ جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین میں سے ہیں۔

في غاشية : یعنی بیماری کی شدت میں یا پھر غشی اور غنودگی میں بیماری کی وجہ سے یہاں تک کہ آپ نے گمان کیا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔

فقال: کلمہ استفہام کے حذف کے ساتھ۔

قدقضى : مجہول ہے یعنی فوت ہو گئے ہیں' ایک اور نسخہ صحیحیہ میں معروف ذکر ہے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غشی ایک شر ہے مکروہ یا پھر یہ مرض ہے اور یہاں سے مراد وہ غشی ہے جو درد کی سختی کی وجہ سے ہو جس سے لامحالہ موت واقع ہوتی ہے کیونکہ وہ مرض سے بری ہو چکا ہوتا ہے ابن ملکؒ فرماتے ہیں: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تک زندہ رہے اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں فوت ہوئے۔

خطابی فرماتے ہیں: غاشیہ سے مراد وہ لوگ تھے جو اُن کے اردگرد اُن کو ڈھانپے ہوئے تھے یعنی خدمت وغیرہ کے لیے یا زیارت کے لیے میرکؒ فرماتے ہیں: ایسے ہی دونوں سے نقل کیا گیا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ احتمال بھی ہے کہ "غاشیہ" سے مراد وہ کپڑا ہو جو مریض یا مردے پر ڈالا جاتا ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا فوت ہو چکا ہے؟

فبكى النبي ﷺ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ رونا رقت قلبی اور ان کی خدمت گاری کی یاد میں تھا۔

قوله :فلما رأى القوم بكاء......او يرحم۔

فلما رأى القوم بكاء النبي ﷺ ۔

رونے کی نسبت رؤیت کی طرف کرنے میں اشارہ ہے کہ صرف آنسو تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے صرف آنسو ہی بہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اور ارشاد نہیں فرمایا تھا۔

ألا تسمعون : ابن ملک فرماتے ہیں: **أي أو ما سمعتعم أو ما علمتم۔** یعنی فرمایا: کیا تم سنتے نہیں ہو یا کیا تم جانتے نہیں ہو لیکن ظاہر یہ ہوتا ہے کہ کیا تم سنتے نہیں جو میں کہتا ہوں۔

إِن الله: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ یہ یا تو مستانفہ ہے یا پھر مقول مقدر کے لیے بیان ہے ایک نسخہ میں ھمزہ کے فتحہ کے ساتھ

ہے اس صورت میں یہ مفعول بہ ہوگا۔

ولکن يعذب بهذا : یعنی جب کوئی ایسی بات کہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسندیدہ ہو جیسے یہ کہ کچھ بولے جزع فزع اور نوحہ کرتے ہوئے۔

واشار الى لسانه : یعنی مشار الیہ سے یہاں مراد زبان جس کے ساتھ انسان تکلیف دیا جائے گا۔

أو یرحم : یعنی زبان کے ساتھ اگر اُس نے کلمہ خیر کہا مثال کے طور پر انا للہ وانا الیہ راجعون کہا یا استغفر اللہ کہا یا رحم کی دعاء کی اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ رویا جا سکتا ہے اگر چہ موت کے بعد ہی کیوں نہ ہو لیکن بغیر نوحہ کے ہو اور بغیر اونچی آواز کے ہو ایک جماعت نے اس میں اجماع نقل کیا ہے ابن حجرؒ فرماتے ہیں: رونا چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے ایک صحیح حدیث کی وجہ سے: فإذا وجبت فلا تبكين باكية شافعیؒ اور ان کے اصحاب سے مروی ہے کہ رونا موت کے بعد مکروہ ہے اس حدیث کی وجہ سے بلکہ ایک جماعت کا موقف ہے کہ یہ حدیث اُس کی حرمت کا فائدہ دیتی ہے لیکن ان سب اقوال کو وہ چیز رد کرتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے: أنه صلى الله عليه وسلم زار قبر ابنه فبكى و أبكى من حوله کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے کی قبر کی زیارت کی تو رو پڑے اور جو آپ کے ساتھ تھے وہ بھی رو پڑے اور جو حدیث بخاری نے روایت کی ہے:

کہ آپ اپنی بیٹی کی قبر پر روئے انه بكى على قبر بنت له۔ تو مناسب ہوگا کہ نہی کو خاص کر لیا جائے ظاہرہ مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

شاید قید کا فائدہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پچھلی چیزیں معاف کر دیں ہیں واللہ اعلم ...... اور جس سے یہ تائید حاصل ہوتی ہے کہ آنسوؤں کے ساتھ رونا کوئی اختیاری امر نہ ہے اور اوامر اور نواہی اور جبلیۃ اضطرار (جو طاقت میں نہ ہوں) میں سے نہیں ہیں جیسا کہ قواعد دینیہ سے معلوم ہے۔ قوله (وأن الميت يعذب ببكاء أهله) بلند آواز کے ساتھ رونے کی وجہ سے۔

امام نووی فرماتے ہیں: ایک روایت میں ہے: ببعض بكاء اهله ۔

اور ایک روایت میں ہے: يعذب في قبره ما نيح عليه۔

اسے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے اُس نوحہ کی وجہ سے"

اور ایک اور روایت میں ہے: من يبك عليه يعذب جس پر رویا جائے گا اس کو عذاب دیا جائے گا۔

یہ تمام روایات حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا انکار کیا ہے کہ یہ ساری روایات انہی دونوں سے ہیں اور اسے بھول اشتباہ کی طرف منسوب کیا ہے اور اس سے بھی انکار کیا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال ہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے دلیل پکڑی ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤] "اور کوئی دوسرا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔" فرماتی ہیں: یہ تو رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی عورت کے بارے میں فرمایا تھا:

انها تعذب وهم يبكون عليها کہ اُسے عذاب دیا جائے گا اور وہ لوگ اُس پر رو رہے ہوں گے یعنی اُس کے کفر کی وجہ

سے نہ کہ اُس پر رونے کی وجہ سے۔

علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے جمہور اس بات کی طرف رجحان رکھتے ہیں کہ وعید اُس کے بارے میں ہے کہ جو وصیت کرے کہ اُس کے لیے رویا جائے اور اُس پر نوحہ کیا جائے اُس کی موت کے بعد تو اُس کی وصیت نافذ ہو جائے گویا اسے رونے اور نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہوگا کیونکہ اُس نے انہیں مقرر کیا تھا اور جس پر رویا گیا اور نوحہ کیا گیا بغیر وصیت کے تو اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴾ [الانعام: ۱٦٤] ''اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔'' خطابی فرماتے ہیں: شبہ یہی ہوتا ہے کہ یہ تب ہے جب وہ وصیت کرے کہ اُس کے لیے رویا جائے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: میت سے مراد وہ ہے جو موت کے بالکل قریب ہو کیونکہ اُس کی حالت رونے، چلانے اور نوحہ کی وجہ سے سخت ہوتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بعض اموات کے بارے میں ہے جو رونے کی وجہ سے عذاب دی جاتی تھیں صرف اپنے رونے کی وقت ہی یہ توجیہ ضعیف ہے کیونکہ حدیث میں ہے: کہ **يعذب في قبره بما نيح عليه۔** ''اسے قبر میں عذاب دیا جائے جس پر نوحہ کیا گیا ہے''

اور دوسری حدیث میں ہے کہ: **الميت يعذب ببكاء الحيي۔** ''میت زندہ لوگوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دی جائے گی۔''

جب نوحہ کرنے والی کہیں: ''ہماری طاقت، اور ہماری مدد کرنے اور ہمیں کپڑے دینے والا'' میت کے لیے کہے تو اس کے لیے کہا جائے گا تو اس کی ہمت تھا تو اس کا مددگار تھا تو اسے کپڑے پہنا تا تھا یہ چیز بالکل واضح ہے کہ اُسے عذاب تب دیا جائے گا جب اُس نے وصیت کی ہوگی یا اُن کے اس فعل سے راضی ہوگا اسی لیے تو داؤد علیہ السلام نے اور ان کے پیروکاروں نے رونے اور نوحہ کرنے سے ممانعت فرمائی تھی اس وجہ سے یہ دلیل زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور جمہور کا مؤقف بھی مضبوط ہے۔

اور امام شافعی کے قول کے ضعف کی توجیہ اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ جو حضرت عائشہؓ نے کہا ہے وہ کتاب وسنہ کی دلیل کے زیادہ قریب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لتجزى كل نفس بما تسعٰى۔** جو اُس نے کمایا یہ بات یاد رکھو کہ تمام کا اس پر اتفاق ہے کہ رونے سے یہاں مراد آواز اور نوحہ کے ساتھ ہے صرف آنسوؤں کے ساتھ رونا مراد نہ ہے عنقریب اسی باب کے آخر میں اور اقوال تیسری فصل میں آئیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مصیبت پر واویلا کرنا ممنوع ہے

۱۷۲۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱٦۳/۳۔ حديث رقم ۱۲۹٤۔ ومسلم في صحيحه ۹۹/۱ حديث رقم (۱٦٥۔ ۱۰۳)۔ والترمذي في السنن ۳۲٤/۳ حديث رقم ۹۹۹۔ والنسائي ۲۰/٤ حديث رقم ۱۸٦۲۔ وابن ماجه ٥۰٤/۱ حديث رقم ۱٥۸٤۔ واحمد في المسند ٤۳۲/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو رخسار کو پیٹے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی طرح پکارے یعنی رونے کے وقت ایسے الفاظ کہے جو واویلا اور نوحہ کی طرز پر ہوں وہ شرعاً جائز نہیں ہیں۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: لیس منا : یعنی وہ ہماری سنت اور طریقے پر نہیں ہے یا پھر ہمارے ائمہ میں سے نہیں ہے اور ہمارے اصل ملت سے نہیں ہے مراد صرف وعید اور سختی سے روکنا ہے۔

قولہ (من ضرب الخدود) جمع با لجمع کے مقابلہ کے لیے اسے بھی جمع لایا گیا ہے اور ایک مفرد لفظ سے جمع کا مطلب لیا گیا ہے۔

قولہ :وشق الجیوب : جیم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے اس معنی میں ہے کہ ''پگڑی کو پھینکنا اور سر کو مارنا دیواروں پر اور بال نوچنا۔

قولہ :ودعا بدعوی الجاھلیة۔ یعنی اُن کے پکارنے کی طرح یعنی رونے کے وقت غیر شرعی باتیں منہ سے نکالنا جو کہ جاہلیت میں لوگ کہتے تھے جیسے دعا کرنا ہلاکت کی، عذاب کے اور پہاڑ وغیرہ۔

تخریج:امام میرکؒ نے فرمایا:اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔

مصیبت کے وقت بے صبری کا مظاہرہ کرنا ممنوع ہے

۱۷۲۶:وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ قَالَ اُغْمِیَ عَلٰی اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ اُمُّ عَبْدِاللّٰهِ تَصِیْحُ بِرَنَّةٍ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَلَمْ تَعْلَمِیْ وَکَانَ یُحَدِّثُهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّنْ حَلَقَ وَصَلَقَ وَخَرَقَ ۔ (متفق علیه ولفظه لمسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۵/۳۔ حدیث رقم ۱۲۹۶۔ ومسلم فی صحیحه ۱۰۰/۱ حدیث رقم (۱۶۷۔ ۱۰۴)۔ والنسائی فی السنن ۲۰/۴ حدیث رقم ۱۸۶۳ وابن ماجه ۵۰۵/۱ حدیث رقم ۱۵۸۶۔

ترجمہ: حضرت ابی بردہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیہوش ہوگئے۔تو ان کی بیوی اُمّ عبداللہ نے چلا کر رونا شروع کردیا۔پھر ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ہوش میں آئے پس فرمایا کیا تو نے نہیں جانا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس شخص سے بیزار ہوں کہ جو مصیبت کے وقت سر کے بال منڈائے' چلا کر روئے اور اپنے کپڑے پھاڑے۔اس کو بخاری اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور اس کے واسطے مسلمؒ کے لفظ ہیں۔

تشریح: ابی بردة : یہ عامر بن عبداللہ بن قیس ابوموسیٰ اشعری ہیں مکثرین اور مشہور مکثر تابعین میں سے ہیں انہوں نے اپنے باپ اور حضرت علیؓ وغیرہما سے سماع کیا ہے۔شریح کے بعد یہ کوفہ کے قاضی بھی رہے ہیں شریح بن ھانی کے بعد انہیں حجاج نے برطرف کردیا یہ مؤلف کا قول ہے۔

برنة : امام نووی فرماتے ہیں یہ راء کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ ہے رونے کے ساتھ ایسی آواز ہے جو رونے سے

پیدا ہوا اور اُس میں درد ہو۔

قوله :فقال :الم تعلمي ۔

وكان يحدثها ان رسول الله ﷺ قال أنا بریٔ : طیبی فرماتے ہیں:"وکان یحدثها" حال ہے اور عامل "قال" ہے اور "ألم تعلمي" مفعول ہے کہنے والے کا یعنی کیا تو نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اُس سے بری ہوں۔

ممن حلق: بال اور سر کو مصیبت کی وجہ سے لغت

صلق : مصابیح میں سین کے ساتھ ہے اور یہ ایک لغت ہے نہایہ میں بھی ہے یعنی اپنی رونے اور نوحہ کو بلند کرنا یا فرمایا جو شرعاً جائز نہ ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "الصلق" چہرے پر تھپڑ مارنے کو کہتے ہیں اور جسم نوچنے کو کہتے ہیں۔

قوله (وخرق) تخفیف کے ساتھ ہے یعنی اپنا کپڑا مصیبت سے پھاڑنا اور یہ تمام امور جاہلیت کے امور میں سے ہیں اور یہ تمام احوال عام عورتوں میں پائے جاتے تھے ابن ملک فرماتے ہیں: عرب کی عادت میں سے تھا کہ جب اُن کی کوئی قریبی فوت ہو جاتا تو اپنا سر مونڈا لیتے تھے جیسا کہ بعض عجم کی بھی عادت ہے کہ اپنے بعض بال کاٹ لیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو اپنے چہرے کو زینت کے لیے حلق کروائے۔ ملا قاریؒ فرماتے ہیں: یہ آخری توجیہ بعید از مقام ہے۔ (یہ مسلم کے الفاظ ہیں)

حسب و نسب میں فخر کرنا ممنوع ہے

۱۷۲۷: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ فِيْ اُمَّتِيْ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يَتْرُكُوْنَهُنَّ الْفَخْرُ فِي الْاَحْسَابِ وَالطَّعْنُ فِي الْاَنْسَابِ وَالْاِسْتِسْقَاءُ بِالنُّجُوْمِ وَالنِّيَاحَةُ وَقَالَ النَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٤٤/٢ حديث رقم (٢٩ ـ ٩٣٤)۔ واحمد في المسند ٣٤٢/٥۔

ترجمہ :حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا چار چیزیں میری امت میں جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں یعنی اکثر لوگ ان کو نہیں چھوڑیں گے: ① حسب میں فخر کرنا۔ ② نسب میں طعن کرنا۔ ③ ستاروں کے ذریعے پانی طلب کرنا۔ ④ اور نوحہ کرنا اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نوحہ کرنے کی والی عورت جس وقت وہ مرنے سے پہلے توبہ نہیں کرے گی تو قیامت کے دن موقف (میدان حشر) میں کھڑی کی جائے گی اور اس پر قطران کا کرتہ ہوگا اور خارش کا کرتہ ہوگا۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله : اربع في امتي من ...... والنياحة : اربع : (یہ موصوف محذوف کی صفت ہے) ای خصال اربع۔

في أمتي (جار مجرور محذوف کے متعلق ہو کر "خصال" کی دوسری صفت ہے ای كائنة في امتي۔

من أمر الجاهلية : یعنی جاہلیت کے امور اور اُن کی خصلتوں میں سے ہیں جو امت کے کثیر افراد میں طبعاً پائی جاتی تھیں۔

لایترکونهن : اکثر ایسا ہوگا طیبیؒ فرماتے ہیں: معنی یہ ہے کہ ہمیشہ یہ خصلتیں امت میں پائی جائیں گی کوئی بھی اسے نہ چھوڑے گا حالانکہ یہ جاہلیت کے طریقوں میں سے ہے اگر ایک گروہ چھوڑے گا تو دوسرا اسے پکڑ لے گا۔

في الاحساب : یعنی ان کے شان میں اور اس کے سبب اور حسب ایک ایسی چیز ہے جسے انسان شجاعت اور فصاحت اور دوسری چیزوں کے لیے شمار کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "حسب وہ ہے جسے انسان اپنے آباء کے فخر کے طور پر یاد کرتا ہے ابن السکیت فرماتے ہیں: حسب اور کرم دونوں آدمی میں موجود ہوتے ہیں اگرچہ اس کے آباء میں شرف نہ بھی ہو شرف اور بزرگی صرف اپنے آباء کے ساتھ ہوتی ہے اس سے یہ حدیث ہے کہ جس کا حسب فوت ہوگیا وہ اپنے باپ کے حسب سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے گا۔ یعنی اُن کی عظمت، بڑائی بیان کرنا لوگوں میں تاکہ دوسروں کو حقیر جانے۔

والطعن في الانساب : یعنی لوگوں کے انساب میں طعن کا داخل کرنا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے آباء وغیرہ کی تحقیر کرے اور اپنے آباء کی فضیلت بیان کرے دوسروں پر یہ جائز نہیں ہے مظہر کہتا ہے: ہاں مگر اسلام اور کفر کہنا گو جائز ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ جب کسی مسلمان کی اذیت کا ارادہ ہو تب یہ حکم ہے: طیبی فرماتے ہیں: کہ غیر کے انساب میں طعن کرنا جائز ہے فخر کے ساتھ اپنی طرف سے تاکہ اُس کے لیے حسن ونسب جمع ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے حمل کیا جائے اپنے نسب کی طرف لیکن ان سب کو توجیہات میں کچھ نظر ہے۔

پہلی توجیہ میں یہ ہے کہ یہ تب صحیح ہے جب اس کے ذریعہ کسی غیر کو صراحتاً یا کنایۃً اذیت دینا مراد ہو یا پھر اس کو ثابت کرنا جھوٹا اصل معاملہ میں؛ برخلاف اس کے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرے۔

دوسری توجیہ: کہ اس کی نسبت نفس الامر میں ہو اور پھر طعن کیا جائے تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کی نعت کی وعید میں ہوگی اس سے خارج نہیں سب کے ہوگا اور داخل نیز نسب کے ہوگا۔ ہاں اگر دوسرے لوگ ان سب کو گناہ میں استعمال کرتے ہوں تو اُن کے مقابلے میں حق کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ تاکہ حق واضح ہو اور باطل ختم ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

الاستسقاء : یعنی اُس نے بارش طلب کی۔

بالنجوم : یعنی ان کے سبب سے طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اُس نے بارش طلب کی اور یہ امید لگائی کہ فضا میں ستاروں کی وجہ سے بارش ملتی ہے جیسا کہ وہ کہتے تھے ہم فلاں ستارے کی وجہ سے بارش دیئے گئے معنی یہ ہے کہ آدمی کا یہ عقیدہ رکھنا کہ بارش ستاروں کی وجہ سے ہے یہ حرام ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ کہے ہمیں اللہ کے فضل سے بارش ملی ہے۔

النياحة : رفع کے ساتھ ہے چوتھی چیز ہے حرام کردہ میں سے اور یہ قول ہے اوہ افسوس اوہ ہلاکت اور چیخنا میت کے پاس جیسا کہ اوہ بہادر اوہ شیر اور اوہ پہاڑ۔

قوله : وقال : یعنی رسول اللہ ﷺ نے۔

النائحة : یعنی جو نوحہ کرتی ہیں۔

اذالم تتب قبل موتها: یعنی موت آنے سے پہلے توریشتی فرماتے ہیں: اسے مقید اس لیے کیا گیا ہے تا کہ جانا جائے کہ توبہ کی شرائط میں سے ہے کہ توبہ کی جائے اس حال میں کہ جینے کی امید بھی ہو اور جس کام سے توبہ کر رہا ہو اُسے کرنے کی طاقت بھی ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق ہے: ﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ [النساء: ۱۸] ''اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) برے کام کرتے رہے''۔

اسی کی بناء پر ہمارے بعض ائمہ کا قول ہے کہ نا امید کافر کی توبہ قبول نہ ہوگی لیکن مؤمن سے قبول ہوگی اُس کے ایمان کی کرامت کی وجہ سے اور اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ: **ان الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر۔** ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ موت کے قریب نہ پہنچ جائے۔'' اسے احمد اور ترمذی اور نسائی نے اور ان کے علاوہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

تقام: یہ ''الاقامة'' سے مجہول ہے اور یہ ٹھہرنا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جمع کیے جائیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اصل موقف کے ساتھ اسی حالت میں جہنم کے درمیان میں کھڑی رہے گی یہ اُسے نوحہ کرنے کی سزا دی جائے گی۔

قطران: قاف کے فتحہ اور طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے طلا یطلی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ **دهن يدهن** اس کے ساتھ خارش والے اونٹ کو تیل لگائے جاتے ہیں اور جس چیز کو ہم نے ذکر کیا ہے وہ حدیث میں محفوظ ہے اور اسی پر آیات کی قراءت ہے۔

قوله (ودرع) یہ ''سربال'' پر عطف ہے طیبیؒ فرماتے ہیں: لوہے کا دوپٹہ اور عورت کے دوپٹہ اس کی قمیص ہے اور سربال اور قمیص مطلقاً ہے **قوله (من جرب)** یعنی خارش کی وجہ سے جو ہوگی، طیبیؒ فرماتے ہیں: اُس کے اعضاء پر مسلط کر دی جائے گی خارش اور چنبل جو اُس کی جلد کو دوپٹے کی طرح ڈھانپ لے گی تو اُسے لیپ دیا جائے گا قطران کے ساتھ تا کہ دواء کی جائے تو یہ دواء ہوگی بیماری سے بھی زیادہ سخت کیونکہ اس میں قطران ہوگی اور آگ بھی جلدی جلد کو چھوئے گی اور وحشی رنگ کو۔

توریشتی فرماتے ہیں: خارش والی (چادر) کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ جلے ہوئے مقامات کو مزید بھڑکاتی ہے اور مصیبت زدہ دلوں کو تو یہ اپنی جلدوں سے رگڑیں گے۔ تو انہیں یہ سزا دی گئی جو صورت میں بھی متماثل تھی اور ایسے ہی قطران کی شلواروں کے ساتھ بھی اسی لیے خاص کیا گیا کیونکہ اپنے کئے کا وبال چکھیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ چار خصلتیں بیان کی ہیں لیکن وعید مرتب نہ کی ہے نوحہ کے سوا تو میں جواب دوں گا: کہ نوحہ صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہے وہ اپنے کام سے باز نہیں آتی تو انہیں مزید وعید سنائی گئی مردوں کی نسبت سے میرکؒ فرماتے ہیں: اور اسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن حبان نے نوحہ کرنے والی کے قول سے آخر تک ابن حجر فرماتے ہیں: ہمارے ائمہ نے ان احادیث سے نوحہ کی حرمت کی دلیل اخذ کی ہے اور مردے کی خوبیاں بیان کرنا اس آواز کے ساتھ اور رونے کے ساتھ اور چہرے پر تھپڑ مارنا اور گریبان پھاڑنا اور بال بکھیرنا اور منڈوا لینے اور کھینچے لینے کے ساتھ اور چہرے پر مٹی پھینکنا اور ہلاکت کی دعائیں کرنا امام الحرمین نے فرمایا: کہ وہ تمام کام حرام ہیں جن سے جزع ثابت ہو کیونکہ یہ تعلیم اور فرمانبرداری کے خلاف ہے اللہ کی رضا پر اور ایسے ہی رہن سہن اور لباس کا تبدیل کر لینا اور خاص لباس پہننا اگرچہ مصیبت میں اس کا پہننا عادت کیوں نہ ہوگئی ہو۔

عرضِ مرتب:

آپ ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں چار چیزوں کو زمانہ جاہلیت میں سے شمار کیا ہے: ① حسب کہتے ہیں آدمی اپنے اندر موجود خوبیوں کو اچھا سمجھے جیسے بہادری اور فصاحت وغیرہ۔ ② لوگوں کے نسب میں طعن کرے کہ فلانے آدمی کا باپ برا تھا دادا برا تھا ان دونوں چیزوں میں اپنی تعظیم اور لوگوں کی حقارت لازم آتی ہے اس لیے یہ دونوں مذموم ہیں مگر اسلام کی وجہ سے اپنے آپ کو اچھا سمجھے اور کفر کی وجہ سے دوسرے کو حقیر جانے یہ تو جائز ہے اور باقی ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا کہ اگر فلاں ستارہ فلاں جگہ پر ہوگا تو بارش برسے گی۔ الحاصل یہ اعتقاد رکھنا حرام ہے اور بندے پر واجب ہے کہ وہ اعتقاد رکھے کہ بارش اللہ تعالیٰ ہی نازل کرتے ہیں اور نوحہ کرنے سے بھی ممانعت ہے۔ جس کی تفصیل پہلی حدیثوں میں گزر چکی ہے اور میّت کو اچھی خوبیوں کے ساتھ یاد کرنا کہ بڑا بہادر تھا اور ایسا ایسا تھا جب نوحہ کرنے والی نے مرنے سے پہلے توبہ نہ کی تو حدیث پاک میں بڑی سخت وعید نازل ہوئی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو قطران کا لباس پہنائے گا۔

قطران ایک بدبو والی لیس دار دوا ہے۔ جو ''ابہل'' نامی درخت سے نکلتی ہے' ہندی میں اس کو ہوبیر کہتے ہیں اور یہ خارشی اونٹوں کو ملا کرتے ہیں آگ اس کو بہت جلد پکڑتی ہے اسی سے فرنیچر کے لئے ''وارنش'' اور ''گوند'' بھی تیار کی جاتی ہے یہ لوہے کو زنگ سے بچانے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں بھی آیا ہے: ﴿سَرَابِیۡلُهُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ......﴾ [ابراهیم: ۵۰] پس اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس پر خارش مسلط ہوگی اور اس پر قطران ملیں گے تاکہ تکلیف زیادہ پہنچے والعیاذ باللہ۔ (مجم)

آپ ﷺ کا ایک عورت کو مصیبت و پریشانی کے وقت صبر کی تلقین کرنا

۱۷۲۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِامْرَأَةٍ تَبْکِیْ عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ اتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ قَالَتْ اِلَیْكَ عَنِّیْ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِیْبَتِیْ وَلَمْ تَعْرِفْهُ فَقِیْلَ لَهَا اِنَّهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْ بَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِیْنَ فَقَالَتْ لَمْ اَعْرِفْكَ فَقَالَ اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱٤۸/۳۔ حدیث رقم ۱۲۸۳۔ ومسلم فی صحیحه ٦۳۷/۲ حدیث رقم (۱۵۔ ۹۲٦)۔ وابوداؤد فی السنن ٤۹۱/۳ حدیث رقم ۳۱۲٤۔ والنسائی ۲۲/٤ حدیث رقم ۱۸٦۹۔ والترمذی ۳۱۳/۳ حدیث رقم ۹۸۷۔ وابن ماجه ۵۰۹/۱ حدیث رقم ۱۵۹٦۔ واحمد فی المسند ۱۳۰/۳۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے کہ وہ آواز نکال کر رو رہی تھی۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے عذاب سے ڈرو اور نوحہ مت کرو۔ ورنہ عذاب ہوگا اور صبر کرو اور عورت نے کہا تو ایک طرف ہو جا اس لیے کہ تو مجھ جیسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا اور اس عورت نے آپ ﷺ کو نہ پہچانا۔ پھر اس کو بتایا گیا [illegible] نبی کریم ﷺ تھے پھر وہ نبی کریم ﷺ کے دروازے پر آئی۔ پس اس نے آپ ﷺ کے دروازے پر کسی دربان کو نہ

پایا جیسا کہ بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر دربان ہوتے ہیں۔ پس اس نے کہا کہ میں نے آپ ﷺ کو نہیں پہچانا تھا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ صبر تو پہلے صدمہ کے وقت ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله (قال مر النبی ﷺ بامرأة تبکی) یعنی بلند آواز کے ساتھ۔

قوله (عند قبر فقال اتقی الله) یعنی اللہ سے ڈرتی رہے اور انجام سے ڈرتی رہے یا پھر نوحہ چھوڑنے کے ساتھ۔

واصبری : یہاں تک تو اجر دی جائے۔

قالت : یہ سمجھتے ہوئے اور نہ پہچانتے ہوئے کہ کون بات کر رہا ہے اور کیا بات کر رہا ہے۔

الیك : اسم فعل ہے یعنی دور ہو جا مجھ سے۔

عنی : مجھے ملامت مت کرو اور ابن حجر کی تقدیر اور تحریر کس قدر دور ہے جہاں وہ فرماتے ہیں: کہ مجھ سے دور ہو جا دور ہو جا کیونکہ میں عورت ہوں اور تو اجنبی مرد ہے اور تیرا حال بھی میرے حال جیسا نہیں ہے۔

فانك لم تصب : مبنی علی المجہول ہے یعنی تو مبتلا نہیں ہوا۔

بمصیبتی : یعنی اس جیسی یا اس جیسی مثل اُس کے گمان کے مطابق۔

ولم تعرفه : اور نبی ﷺ کو انہوں نے نہیں پہنچانا یا پھر اُس نے نہیں پہچانا کہ یہ نبی ﷺ ہیں۔

فقیل له : یعنی جب رسول اللہ ﷺ چلے گئے۔

انه النبی ﷺ فندمت : جو اُس نے رسول اللہ ﷺ کو جواب دیئے تھا اس کی وجہ سے۔

فقالت لم أعرفك : یعنی میرا مواخذہ مت کریں طیبی فرماتے ہیں: گویا جب اُس نے یہ سنا کہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو اُسے خیال آیا کہ وہ بھی بادشاہوں جیسے ہوں گے تو اُس نے معذرتاً یہ کہا میں نے آپ کو نہیں پہچانا تھا۔

فقال انما الصبر : یعنی کامل رضا اور جس پر ثواب بھی ہو۔

عند الصدمة : یعنی مصیبت و آزمائش کے شروع میں اور مشقت کے شروع میں و گرنہ بعد میں تو ہر ایک ہی صبر کرتا ہے طیبیؒ فرماتے ہیں: اس صورت میں صبر کرنے پر ثواب بھی ملتا ہے لیکن بعد میں مصیبت کی سختی بھی ٹوٹ جاتی ہے اور ثواب بھی ختم ہو جاتا ہے پھر وہ طبعا صبر کرنے لگتا ہے تو پھر اس پر ثواب نہیں ہوتا ہے ہاں جب وہ صبر طبعی طور پر ہمیشگی نہ کر سکا اور پھر دوبارہ مصیبت کو یاد کرنے لگ گیا پھر صبر کیا اگرچہ کافی عرصہ ہی کیوں نہ گزر گیا اُسے ثواب ملے گا جیسا اگلی حدیث میں آئے گا لیکن اعلیٰ درجہ مصیبت کے ابتداء میں صبر کرنے پر ہے۔

تین بیٹوں کے فوت ہونے پر ملنے والا اجر

۱۷۲۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَمُوْتُ لِمُسْلِمٍ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَيَلِجُ النَّارَ اِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ ۵٤۱۔ حدیث رقم ٦٦٥٦۔ ومسلم فی صحیحه ٤/ ۲۰۲۸ حدیث رقم (۱۵۰۔

۲۶۳۲) والترمذی فی السنن ۳۷٤/۳۔ حدیث رقم ۱۰۶۰۔ اخرجه النسائی ۲۵/٤ حدیث رقم ۱۸۷۵۔ وابن ماجه ۵۱۲/۱ حدیث رقم ۱۶۰۳۔ ومالك فی الموطأ ۲۳۵/۱ حدیث رقم ۳۸ من كتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۲۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے کہ اس کے تین بیٹے فوت ہو جائیں اور وہ جہنم میں داخل ہو۔ مگر قسم پوری کرنے کے لیے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ثلاثه من الولد : مذکر یا مونث چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں۔

فیلج : نصب کے ساتھ اور رفع کے ساتھ ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں: داخل نہیں ہوگا معنی یہ ہوگا کہ اجتماع کی نفی ہے سبب کا اعتبار نہیں ہے اشرف فرماتے ہیں: فعل مضارع کو فاء نصب اس وقت دیتا ہے جب اُس کے ماقبل اور مابعد کے درمیان کوئی سبب ہو اور یہاں تو کوئی سبب بھی نہیں ہے تو جائز نہیں ہے کہ جس کی اولاد فوت نہ ہو یا سرے سے ہوئی نہ تو وہ جہنم میں داخل ہوں گے اس لیے فاء کو واؤ جمع کے معنی پر محمول کریں گے یعنی جس کے تین بچے فوت ہوئے وہ اور آگ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

إلا تحلة القسم : یہ "فیلج" سے استثناء ہے طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر چہ روایات نصب کے ساتھ ہے لیکن یہ بھی اس سے بالغ نہیں ہے اور رفع دلالت کرتا ہے کہ اولاد کے فوت ہو جانے کے بعد جہنم میں داخلہ اگر ہو تو بھی تھوڑی دیر کے لیے ہوگا۔ اور فاء تعقیب کا مطلب ماضی میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ [الاعراف: ۴۴] "اور پکاریں گے اصحاب جنت اصحاب نار کو"۔

اس میں دلیل ہے کہ "ما" کائن کے مرتبہ میں ہوگا اور جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے مستقبل کے بارے میں وہ ہو کر رہے گی۔ ابن حجرؒ نے بعید جانا ہے فرماتے ہیں: سببیت منع نہیں ہے بلکہ یہ صحیح ہے اور اس کا ممنوع ہونا تو محل نظر ہے کیونکہ داخل مطلق بھی ہو سکتا ہے اور یہ غفلت مابعد سے جو مطلق نہ ہے لیکن ولوج مقید ہے۔ کیونکہ قسم کے تحلیہ پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی موت سے سبب ہے۔ تو فاء کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے۔ لیکن تعجب ہے شارح پر کہ اُس پر یہ چیز کیسی مخفی رہی۔

اور طیبیؒ کا قول کہ اگر چہ روایت نصب کے ساتھ بھی ہو تو یہ چیز مانع نہ رہے یہ بہت ہی عجیب ہے صحیح بات یہ ہے کہ استثناء قید نہیں ہے بلکہ استدراک ہے تاکہ حدیث کا مطلب قرآن کے منافی نہ ہو جب یہ حکم امر مقتضی ہوگا اور دینی حکم معلوم ہوگا تو اس کو اگلی حدیث میں بیان نہ کیا جائے گا اس میں صریح دلالت اور صریح اشارہ ہے کہ استثناء حکم کے لیے قید نہ ہے اصل میں یہ وہ چیز ہے جسے اصل عربی ورصلاً وفصلاً سمجھے ہیں۔ اگر چہ وہ عجم سے ہی ہیں اور عرب میں سے ان پر اعتراض کرنے والے نسباً اور اصلاً انتہار کے بارے میں انہوں نے تحلۃ قسم کا ارادہ کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] "اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا۔ یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے"۔

۔۔۔ فرماتے ہیں عبور کے ذکر میں کہ یہ ایک پل ہے جہنم کے اوپر بنا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے عافیت میں رکھے

النہایہ میں ہے: ای لا یدخل النار الا أن یمر علیھا من غیر لحوق ضرر۔ کہ جہنم داخل نہیں ہوگا لیکن اس پر سے ضرور گزرے گا تو استثناء منقطع ہے۔ ہمارے علماء میں سے کچھ شراح کا کہنا ہے کہ ''التحلة'' حاء کے کسرہ کے ساتھ مصدر ہے جیسا کہ تحلیل ہے اور قسم کی تحلیل کا مطلب ہے اسے سچا کر دکھایا ہے تو معنی یہ ہوا کہ ''مگر تحلہ قسم کے ساتھ'' کہا گیا ہے کہ اتنی مقدار جتنی اللہ اپنی قسم پوری کرے گا اس قول میں کہ ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] ''اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا۔ یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔'' یعنی جہنم میں داخل نہ ہوگا لیکن گزرے گا ضرور بغیر کسی تکلیف کے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تھوڑا سا وقت جس میں قسم پوری ہو جائے تو استثناء متصل ہے جیسا کہ اصل میں ہے تو پھر اسے ہر ایک چیز کے لیے مثال بنا دیا ہے جس میں وقت کم ہو۔ جیسا کہ عرب سمجھتے ہیں: ''میں نے اسے قسم کے پورا کرنے کے لیے کہا ہے۔'' یعنی میں نے صرف اتنی مقدار میں کیا ہے جس میں میں اپنی قسم پوری کرلوں مبالغہ نہیں کرتا۔

اشکال: حدیث میں اشکال ہے کہ آیت میں ظاہری طور پر کوئی قسم نہیں ہے شاید یہ قسم مابعد آنے والی آیت سے ماخوذ ہے ''یہ تیرے رب پر حتمی اور فیصلہ کن ہے'' یعنی اُس نے حتمی کر رکھی ہے اور فیصلہ کر رکھا ہے اپنے نفس پر پختہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جس سے رکنا ممکن نہیں ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر قسم اُٹھا رکھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قسم صدر کلام میں مضمر ہے یعنی اس طرح سے کہ ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] ''اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا۔ یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔''

اس مقام کے متعلق ہم کلام پیش کر چکے ہیں صحیح مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے صحیح بات یہ ہے کہ غیر مقسم علیہ پر معطوف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''اور تیرے رب کی قسم ہے ہم ان سب کو ضرور جمع کریں گے۔'' پھر دیکھیں تور پشتی کہتے ہیں: کہ قسم مضمر ہے اس قول کے بعد: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قسم کی جگہ لوٹ رہی ہے اس قول کی طرف فوربك لنحشرنهم والشياطين۔ طیبی فرماتے ہیں: شاید قسم سے مراد قطعی اور حتمی کلام ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ''کان علی ربك حتمًا مقصيًا'' یہ تقریر ہے اس قول کی ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] ''اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر گزرنا ہوگا۔ یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔'' تو یہ قسم کے مرتبہ میں ہے بلکہ یہ استثناء کے لیے اور نفی اور اثبات کے لیے زیادہ بلیغ ہے۔ کان اور علی کے ساتھ اور تاکید کر دینا حتم بالمقصی کے ساتھ۔

۱۷۳۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنِسْوَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ لَا يَمُوْتُ لِاِحْدَا كُنَّ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَحْتَسِبُهُ اِلَّا دَخَلَتِ الْجَنَّةَ فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ اَوْ اِثْنَانِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَوِاثْنَانِ۔

[رواه مسلم وفی روایة لهما ثلا یة لم یبلغو الحنث]

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۸۸/۳ حدیث رقم ۱۳۸۱ ومسلم فی صحیحه ۲۰۲۸/۴ حدیث رقم (۱۵۱۔ ۲۶۳۲)۔ والترمذی فی السنن ۳۷۳/۳ حدیث رقم ۱۰۵۹۔ والنسائی ۲۵/۴ حدیث رقم ۱۸۷۳۔ وابن ماجه ۵۱۲/۱ حدیث رقم ۱۶۰۴۔ ومالك فی الموطأ ۲۳۵/۱ حدیث رقم ۳۹ من کتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۵۱۰/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی عورتوں سے ارشاد فرمایا: تم میں سے جس کے تین بیٹے فوت ہو جائیں تو وہ ثواب پائے گی اور جنت میں داخل ہو گی۔ ایک عورت نے ان میں سے کہا اے اللہ کے رسول! اگر دو بیٹے فوت ہو جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین کی خصوصیت نہیں ہے اگر دو بھی فوت ہو جائیں تو یہی بشارت ہے۔ اس کو امام بخاری مسلمؒ نے روایت کیا ہے اور ایک روایت بخاری اور مسلمؒ کی میں یوں ہے کہ اگر تین بیٹے فوت ہو جائیں اور وہ بلوغ تک نہ پہنچے ہوں۔ تو وہ بھی مذکورہ ثواب حاصل کریں گے۔

تشریح: یعنی حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی روایت ہے۔

نسوۃ) یہ اسم جمع ہے۔

من الانصار یعنی اُن کی عورتوں میں سے اور ذکر کرنے کا مقصد فیصلہ کا استحضار ہے وگرنہ کوئی خصوصیت نہ ہے۔

الولد دو فتحوں کے ساتھ اسم جنس ہے واؤ مضمومہ اور لام ساکن کے ساتھ بھی درست ہے۔

فتحتسبہ: رفع کے ساتھ ہے یعنی تم میں سے ایک ثواب طلب کرے اُس کی موت کا اللہ سے صبر کرنے کے ساتھ اور اسے آخرت میں ذخیرہ شمار کرے طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی صبر کرے اور اللہ کی رحمت اور بخشش کی امید کرے اور یہ فاء "فیلج" والی فاء نہ ہے بلکہ موت کے لیے سبب بن رہی ہے اور حرف نفی سبب اور مسبب دونوں نصب دے رہا ہے۔

الادخلت الجنۃ: اُس کا دخول جنت میں زیادہ قریب ہے اور یہ ولوج کے منافی نہ ہے تحلۃ القسم ہے اور استثناء عام احوال سے ہے۔

قولہ فقالت امراۃ منھن...... قال أو اثنان: یہ تلقینی پر عطف ہے۔ یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ تو کہے کہ یا پھر دو عورتوں نے کہا۔

قولہ (یارسول اللہ قال أو اثنان) ابن حجر فرماتے ہیں: یہ موحد کے لیے ہے۔ فرمایا: پہلی مثال ٹھیک ہے اور دوسری روایۃً ودرایۃً غلط ہے۔ پہلی مثال کا بیان کہ یہ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے امن کیا۔ یا پھر اس کا عطف "من آمن" پر ہے۔ یعنی جو رزق من کفر یا پھر مبتدا ہے اور معنی شرط کا متضمن ہے۔ دوسری مثال کا بیان کہ تلقین اور عرض کرنا وہ کم نسبت کا اعلیٰ نسبت کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ وہ بلند ذات ہے قولہ (وفی رویۃ لھما) یعنی بخاری و مسلم کے لیے ہے اس میں ذکر کرنے سے قبل کچھ اضمار ہے مگر وہ مسلم کے لیے قرینہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں قریب قریب ہیں۔

ثلاثۃ لم یبلغوا الجنت: گزشتہ لفظ میں "ثلاثۃ" مطلق ہے لیکن بخاری و مسلم کی روایت میں ثلاثۃ اس وصف کے ساتھ مقید ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: عبارت کا حق تو یہ تھا کہ یوں کہا جائے متفق علیہ اور لفظ مسلم کے ہیں۔ بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اصل حدیث بخاری میں تو ایسے ہی نقل ہے لیکن ابو سعید کی روایت سے ہے۔ خلاصہ ختم ہوا۔ اور حدیث کے درمیان میں جہاں مصنف نے فرمایا ہے کہ "وعن ابی ہریرۃ" تو کیسے متفق علیہ کہا جا سکتا ہے۔

نہایہ میں ہے کہ آدمیوں کی تعداد اتنی نہیں پہنچ سکتی کہ اُن کے بارے میں کچھ لکھا جائے اور پھر اُن کے بارے میں گناہ اور

غلطی لکھی جائے۔ خلاصہ ختم ہوا۔ بعض نے بحث کو بلوغت کیا تو تفسیر کیا ہے۔ بعض نے گناہ کہا تو اور یہ زیادہ واضح ہے۔
ابن ملک فرماتے ہیں: یعنی وہ حد جہاں اُن پر گناہ اور زیادتی لکھی جائے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ قید احترازی نہیں بلکہ اکمالی ہے کیونکہ ان کی شفاعت کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے۔ اور صبر ان پر کرنا زیادہ قوی ہے۔

اپنے پیارے کی وفات پر جنت کی ضمانت

۱۷۳۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ مَا لِعَبْدِي الْمُؤْمِنِ عِنْدِيْ جَزَاءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهُ اِلَّا الْجَنَّةَ۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲٤۱/۱۱۔ حديث رقم ٦٤٢٢۔ والنسائي ۲۳/٤ حديث رقم ۱۸۷۱۔ واحمد في المسند ٤۱۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مؤمن بندے کے لیے میرے پاس بدلہ ہے۔ جس وقت اس کے پیارے کی دنیا سے روح قبض کر لیتا ہوں۔ پھر وہ ثواب کا طالب رہے تو بہشت عطا کروں گا۔

تشریح: صفية: یعنی اُس کی محبوب چیز اور پسندیدہ چیز اولاد یا والدین سے یا ان دونوں کے علاوہ سے۔ النہایہ میں ہے کہ "صفي الرجل" یعنی جس کے ساتھ وہ خاص محبت کرتا ہے۔ اور "صفي" فعیل کے وزن پر فاعل یا مفعول کے وزن پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُس بچے کو کہتے ہیں جس کے علاوہ اور بچہ نہ ہو۔ یعنی اکلوتا بچہ یا اس جیسا۔

من أهل الدنيا: ظاہری طور پر یہ عموم کا فائدہ دیتی ہے اور خاص اولاد کی تخصیص نہیں ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اسے اہل دنیا کے ساتھ خاص اس لیے کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ محبوب چیز اہل آخرت میں سے ہوگئی تو جزا بھی آخرت میں دی جائے گی۔ اور وہ اللہ کی رضامندی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔ خلاصہ ختم ہوا۔ اور اس کا تعاقب ابن حجر نے کیا ہے: لیکن کسی بغیر دلیل کے کیا ہے اور اسے واقع کے لیے بیان قرار دیا ہے۔

ثم احتسبه: یعنی اس پر صبر کیا ثواب طلب کرنے کی نیت سے اور مفعول کی ضمیر اسی کی طرح کے لیے ہے۔ یہ ابن ملک کا قول ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ضمیر مصدر سے سمجھ آتی ہے "قبضت" سے ماخوذ ہے۔ یعنی اُس نے اپنے پسندیدہ کے قبض ہونے پر صبر کیا" اور محبوب کی موت پر صبر کیا ثواب طلب کرتے ہوئے صبر جمیل کرتے ہوئے اور رب جلیل کے فیصلہ پر رضا کرتے ہوئے۔

الا الجنة: نصب اور رفع کے ساتھ ہے۔ یعنی اُس کی جزا جنت کے علاوہ اور کچھ نہ ہے اور اس حدیث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ جو ثواب دو یا تین (بچوں کے لیے یا دو یا تین افراد کے لیے) ہے وہی ثواب ایک کے لیے بھی ہے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔

الفصل الثانی:

نوحہ سننا اور کرنا دونوں ممنوع ہیں

۱۷۳۲: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلنَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداود فی السنن ۴۹۴/۳ حديث رقم ۳۱۲۸۔ واحمد فی المسند ۱۶۵/۳۔

ترجمه: حضرت ابوخدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت کی ہے۔ اس کو ابوداوٗدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی عورت میت پر نوحہ کرے جب اُسے پکارے اور اُس پر روئے اور اس کے محاسن شمار کرے اور کہا گیا ہے کہ نوحہ آواز کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں اور مراد ہے میت پر رونا یا پھر جو دنیوی اسباب میں سے کچھ ضائع ہو جائے تو پھر اُس پر رونا۔ اس سے حدیث میں ممانعت ہے اور جو اپنے گناہوں پر روئے اور نوحہ کرے تو یہ عبادت کی قسم ہوگی اور نوحہ کرنے والی عورت کو خاص کیا ہے کیونکہ اکثر نوحہ عورتوں ہی سے ہوتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ تاء مبالغہ کے لیے ہو۔ تو پھر اسے مراد ہوگا کہ اکثر انہی سے ہوتا ہے اور جن سے کبھی کبھار ہوتا ہے تو اس کا شمار کرنا کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ جھوٹ اور اس جیسے چیزوں میں ہوتا ہے۔ تو یہ لعنت کا محل نہیں بنتا جن کا پتہ بھی ہو کہ یہ کبائر گناہوں میں سے ہے ہاں مگر تشدید اور ڈانٹنے کے لیے ہو سکتا ہے۔

المستمعة: یعنی جو سننے کا ارادہ رکھے اور اُسے پسند بھی آئے جیسا کہ غیبت سننے والی اور کرنے والی دونوں گناہ میں شریک ہیں اور تلاوت سننے والا اور کرنے والا دونوں اجر میں شریک ہیں۔

اس کی سند میں محمد بن حسن ہیں اور ابن عطیہ عوفی ہیں وہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے یہ تینوں ضعیف ہیں۔

پریشانی اور خوشی کے وقت مؤمن کی قلبی کیفیت

۱۷۳۳: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبٌ لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَهٗ خَيْرٌ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَشَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ مُصِيْبَةٌ حَمِدَ اللّٰهَ وَصَبَرَ فَالْمُؤْمِنُ يُؤْجَرُ فِیْ كُلِّ اَمْرِهٖ حَتّٰى فِی اللُّقْمَةِ يَرْفَعُهَا اِلٰى فِیْ امْرَاَتِهٖ۔ (رواه البيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه احمد فی المسند ۱۸۲/۱ والبيهقی فی شعب الايمان ۱۸۹/۹ حديث رقم ۹۹۵۱۔

ترجمه: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے مؤمن کا عجب حال ہے کہ اگر اس کو کوئی نیکی پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر ادا کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے پس مؤمن کو اس کے ہر کام پر ثواب ملتا ہے۔ یعنی صبر و شکر وغیرہ کے یہاں تک کہ لقمہ اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں [illegible] ہے (اس پر بھی اسے ثواب ملتا ہے)۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: قال رسول الله ﷺ عجب : یعنی عجب امر ہے اور عجیب وغریب معاملہ ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ ''اُس کے لیے خوشخبری ہے۔'' اور طیبیؒ نے فرمایا: اصل میں یوں ہے کہ ''میں تعجب کرتا ہوں۔'' تو یہ نصب سے رفع کی طرف پھیر دیا گیا ہے اثبات کے لیے جیسا کہ آپ کا قول: ''سلام علیک'' اور سلام علی ابراہیم کی مثال اللہ تعالیٰ کے قول میں: ﴿قالوا سلاما قال سلام﴾ [هود: ٦٩] کہ انہوں نے سلام کیا تو پھر تعجب میں سلام کہا۔'' تو ان کا سلام کہنا زیادہ ابلغ تھا پھر اپنا تعجب بیان کیا اس طرح

قوله :ان اصابه خير حمد الله: یعنی اُس کی تعریف کرتا ہے اور صاف جملہ کہا تو اور پورے کمال کے ساتھ۔ خیر و بھلائی کی نعمتوں پر اور برائی کو دور کرنے پر۔

قوله :و ان اصابته مصيبة ۔ حمد الله : اللہ تعالیٰ کی صفت کبریاء اور جلالت کے ساتھ۔

وصبر : اپنے بلند و بالا رب کے حکم پر۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ ایمان کا نصف شکر ہے اور نصف صبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ [ابراهیم: ٥] ''اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو صابر و شاکر ہیں (قدرت خدا کی) نشانیاں ہیں۔'' اور شکر کرنے کے بارے میں احادیث میں اشارہ ہے کہ کثرت سے نعمتیں ملتی ہیں اور سبقت لے جاتے ہیں اور صبر میں مقدم ہونے پر آیات میں اشارہ ہے کہ انسان کو صبر کی طرف .... اور یہ کہ صبر کی تین اقسام ہیں۔ اطاعت پر صبر کرنا اور نافرمانی پر صبر کرنا اور مصیبت میں صبر کرنا۔ اور فعل کو مسند کرنا خیر اور شر کی طرف اس میں کچھ مخفی نقطہ ہے۔ اور اشارہ ہے کہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے دیتا ہے اپنے بندوں میں سے تو فرمانبرداری کرنا سب سے بہتر ہے۔ واللہ اعلم

ابن ملک فرماتے ہیں: ''ان اصابه مصيبة حمد الله'' کا مطلب ہے کہ وہ پھر بھی تعریف کرتا ہے کیونکہ اُسے پتہ ہوتا ہے کہ اُسے پھر بھی ثواب عظیم ملے گا۔ اور ثواب اللہ کی نعمت ہے تو اس کے لیے تعریف کرنا یہ دلالت کرتا ہے کہ حمد کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں محمود ہے نعمت کے وقت اور مصیبت کے وقت۔ اور بسا اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اُس کی ساری نعمتوں پر تعریف کی ہے۔ لہٰذا اسے دونوں حالتوں میں ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ [ابراهیم: ٣٤] ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔'' یا پھر اُس کی تعریف کرنا کہ مصیبت اُس کے دین میں سے نہ ہے اور یہ کہ جو چیز واقع ہوئی ہے وہ بہت ہی بڑی ہے یا اس سے کہیں زیادہ ہے۔

وکم لله من لطف خفی ☆ یدق خفاه عن فهم الذکی

مظہر فرماتے ہیں حمد کا حق اس لیے بنتا ہے کیونکہ مصیبت کے بدلہ میں ثواب عظیم حاصل ہوتا ہے۔ اور نعمت عظیم حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ نعمت ہے جس کے بدلہ میں شکر لازم ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی وضاحت اس قول سے بھی ہوتی ہے۔

فان مس بالنعماء عم سرورها ☆ وان مس بالضراء اعقبه الاجر

اور یہ بھی احتمال ہے کہ حمد سے مراد اللہ کی ثناء بیان کرنا ہو اس قول کے ساتھ ''انا لله وانا اليه راجعون'' اور ابن حجر تحقیق سے کس قدر دور چلے گئے ہیں جہاں وہ فرماتے ہیں: یہ باب عطف المرادف سے ہے حالانکہ یہ اعتراف بھی کر چکے ہیں کہ شکر حمد

سے خاص ہے لغتاً بھی اور اصطلاحاً بھی۔

قولہ (فالمؤمن یؤجر) ہمزہ کے ساتھ۔ یعنی کامل مؤمن کو ثواب دیا جائے گا۔

قولہ (فی کل أمرہ) یعنی اُس کے ہر حال میں شکر میں یا صبر میں یا ان کے علاوہ میں حتی کہ امور مباح میں بھی۔ کہا گیا ہے کہ "أمر" سے یہاں مراد بھلائی ہے۔ تو مباح امور نیت کے ساتھ اور قصد کے ساتھ بھلائی کی طرف پھر جاتے ہیں۔

قولہ (حتی فی اللقمة یرفعها الی فی أمرته) یعنی بیوی کے منہ میں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء شرط مقدر کی جزاء ہے۔

ای اذا اصابته نعمته فحمد أجر واذا أصابته مصیبة فصبر أجر فهو ماجور فی جمیع اموره حتی فی الشهوانیه...... یعنی جب اُسے نعمت ملتی ہے تو تعریف کرتا ہے اور اجر پاتا ہے اور جب مصیبت آتی ہے تو صبر کرتا ہے اور اجر پاتا ہے۔ تو وہ ہر معاملہ اور ہر حال میں اجر پاتا ہے۔ حتی کہ اپنے ایمان کی برکت کی وجہ سے شہوت میں بھی اور جب وہ نیند کا قصد کرتا ہے تا کہ عبادت، قیام کے لیے اپنی تھکاوٹ دور کرے تو بھی اجر ہے اور نیند اطاعت ہے۔ اور کھانے پر اور تمام مباح چیزوں پر اجر ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اسی سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔" اور بعض کا یہ کہنا کہ عالم کا سونا بھی عبادت ہے۔ اور دوسروں کا یہ قول بھی ہے کہ علماء کا سونا بھی عبادت ہے۔

قولہ میرکؒ کہتے ہیں: اسے نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ "یوم اور لیلۃ" میں عمرو بن سعد بن ابی وقاص کے طریق سے مرفوع۔ ابن معین کہتے ہیں: عمرو بن سعد کے بارے میں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کے باوجود وہ کیسے ثقہ ہیں۔ (ملا علی قاری فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں: جس نے منصف قرار دیا ہے اُن پر اللہ رحم کرے اور تعجب اُن پر ہے جنہوں نے اِن کی حدیث کو ایسی کتب میں ذکر کیا ہے یہ جاننے کے باوجود کہ اُن کا کیا حال ہے۔ میرکؒ کا کلام ختم ہوا۔ اور اس میں کہا گیا ہے کہ وہ اس قتل میں شریک نہ تھے شاید وہ لشکر کے ساتھ موجود ضرور تھے اور ایسا کسی مجبوری کی وجہ سے تھا۔

مؤمن کے فوت ہونے پر آسمان وزمین بھی روتے ہیں

۱۷۳۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَلَهٗ بَابَانِ بَابٌ يَّصْعَدُ مِنْهُ عَمَلُهٗ وَبَابٌ يَّنْزِلُ مِنْهُ رِزْقُهٗ فَاِذَا مَاتَ بَكَيَا عَلَيْهِ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٣٥٤ حدیث رقم ٣٢٥٥۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مؤمن کے لیے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے اس کے اعمال چڑھتے ہیں اور ایک دروازے سے روزی اترتی ہے پس جب وہ آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس پر دونوں دروازے روتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے سمجھی جا سکتی ہے۔ پس کافروں پر آسمان وزمین نہ روئے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :مامن مؤمن الاوله باب ينزل منه ر زقه:

(بابان) نسخہ میں "من السماء" (کا اضافہ بھی) ہے۔

یاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ چڑھتے ہیں اور بلند ہوتے ہیں۔

"عمله" یعنی نیک اعمال اپنے مستقل ٹھکانے کی طرف اور یہی ان اعمال کی کتابت کا آسمان میں محل ہے زمین میں لکھے جانے کے بعد اور ان پر عمل کا اطلاق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سارے نیک اعمال ہیں۔

ینزل : فاعل یا مفعول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

رزقه : حسی یا معنوی رزق کی جگہ پر زمین میں۔

قوله (فاذا مات بکیا) یعنی دونوں دروازے۔

اس کی جدائی پر کیونکہ اس نے بھلائی کو ختم کر دیا ہے ان دونوں سے۔ بخلاف کافر کے کیونکہ وہ تو انہیں اپنی شر کے ساتھ اذیت دیتا تھا تو وہ اُس پر نہیں روتے۔ ابن ملکؒ فرماتے ہیں: ظاہراً یہ اہل سنت کے مذہب کے موافق ہے جس کو امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کا علم رکھتی ہیں اور اُس کی تسبیح کرتی ہیں اور اس سے ڈرتی ہیں اور دوسری چیزیں بھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُس پر اُن کا اہل روتا ہے۔ طیبی کشاف میں فرماتے ہیں: کہ یہ تمثیل اور تخیل ہے اور مبالغہ ہے کہ اس کی بھلائی منقطع ہو جاتی ہے اور اعمال درج ہونا بند ہو جاتے ہیں۔

اور ایسے ہی جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ "جو مؤمن کے نماز میں رویا اور اُس کے آثار زمین میں ہوتے ہیں اور اُس کے عمل اور رزق چڑھنے کی جگہ آسمان میں ہوتی ہے"۔ یہ مثال ہے اور اس کی نفی اس اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے۔ "فما بكت عليهم السماء والارض" نہ اُن پر آسمان رویا نہ زمین" اُن کی حکایت بیان کی ہے اور اُن کے منافی حال کو بیان کیا ہے ایسے حال کے ساتھ جس کا بہت زیادہ فقدان ہے۔ تو اس کے بارے میں فرمایا: "نہ رویا اُن پر آسمان اور نہ ہی زمین" اور یہ ظاہر آیت کے خلاف ہے اور حدیث کے بھی اور کوئی ایسی چیز نہ ہے کہ مجرد مخالفت کی وجہ سے ظاہراً عقلی چیز سے عدول کیا جائے۔

قوله تعالیٰ : فمابکت علیهم۔ یعنی کفار پر۔السماء والارض :یعنی اُس کا خاص مقام کیونکہ آسمان پر نیک اعمال کے نہ چڑھنے کی وجہ سے اور برے اعمال کے زمین میں ظاہر ہونے کی وجہ سے۔ اور اس میں تعریض ہے کہ کفار کے برخلاف مؤمنین پر وہ روتے ہیں۔

ثواب مصیبت ومشقت کے بقدر ہوتا ہے

۱۷۳۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهُ فَرَطَانِ مِنْ اُمَّتِي ... لَهُ اللّٰهُ بِهِمَا الْجَنَّةَ فَقَالَتْ عَائِشَةُ فَمَنْ كَانَ لَهُ فَرَطٌ مِنْ اُمَّتِكَ قَالَ وَمَنْ كَانَ لَهُ فَرَطٌ مُوَفَّقَةٌ فَقَالَتْ فَمَنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ فَرَطٌ مِنْ اُمَّتِكَ قَالَ فَاَنَا فَرَطُ اُمَّتِي لَنْ يُّصَابُوْا بِمِثْلِي۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷٦/۳ حديث رقم ۱۰٦۲۔ واحمد فی المسند ۳۳٤/۱۔

ترجمہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے وہ شخص جس کے دو بیٹے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو چکے ہوں اللہ تعالیٰ اس کو ان دونوں کی وجہ سے بہشت میں داخل کرے گا پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جس کا ایک بیٹا فوت ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک بیٹا فوت ہونے پر بھی وہی حکم ہے۔ اے مُوَفَّقَۃْ! اے توفیق دی گئی پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ وہ شخص جس کا ایک بھی بیٹا نہ ہوا ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی امت کا میر منزل ہوں۔ ان کو میری مصیبت کی طرح کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا دنیا سے رحلت فرما جانا ہی ان کے لیے بڑی مصیبت ہوگی۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله من كان له فرطان : دو فتحوں کے ساتھ۔ یعنی دو ایسے بچے جو ابھی بلوغت تک نہ پہنچے ہوں بلکہ بلوغت سے قبل ہی فوت ہو گئے ہوں۔ **قوله (من أمتى)** فارط کا بیان ہے کس کو فارط کہا جاتا ہے جو پہلے چلا جائے اور سبقت لے جائے وہ فارط ہے۔ اور فرط سے یہاں مراد وہ بچہ ہے جو اُس سے پہلے مر جائے۔ وہ استقبال کرے گا اور اپنے والدین کو مبارکباد دے گا مہمانی کے طور پر جنت میں۔ جیسا کہ قافلہ کے آگے ایک فرط ہوتا ہے وہ منزل پر پہنچ کر ضروریات کی چیزیں پوری کرتا ہے پانی، گھاس اور دوسری چیزیں۔

ادخله الله بهما الجنة : نجات پانے والوں کے ساتھ پہلے پہل صبر کرنے کی وجہ سے یا پھر اُن دونوں کی شفاعت کی وجہ سے جیسا کہ گزر چکا ہے کہ وہ نا تمام بچہ ہمیشہ جنت کے دروازے پر اپنے والدین کا انتظار کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ میرا ہاتھ پکڑو اپنے والدین کا ہاتھ پکڑو اور ان کو جنت میں لے چلو۔ نہایہ میں ہے **مجنطئ** ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور اسے متغضب نے مستبطئ کہا ہے یعنی کسی طلب سے رکنے والا۔

قوله :فقالت عائشة فمن كان له فرط ...... فرط موفقة ۔

يا موفقة: قوله :فقالت فمن لم يكن له فرط ......

قوله :قال :فانا فرط أمتى : یعنی پھر میں تو اپنی امت کا میر منزل ہوں ہی اور میرے امتی میری وفات کی مصیبت جیسی کسی اور مصیبت سے دوچار نہ ہوئے ہوں گے۔ انہیں جنت کی طرف لے جاؤں گا اپنی شفاعت کے ذریعے تو بلکہ میں تو تمام فرط سے بڑا ہوں گا اور اجر مشقت کے مطابق ملے گا۔

قوله (لن يصابوا) یعنی میری امت۔

قوله (بمثلی) یعنی میری مصیبت کے مثل۔ کیونکہ میری مصیبت اُن کی ساری تمام مصیبتوں سے زیادہ ہے تو میں اُن سب کا فرط ہوں گا۔ یا تو اس نسبت سے کہ جنہوں نے آپ کو مصیبت میں مبتلا دیکھا ہو۔ جیسا کہ حضرت فاطمہ زہراءؓ نے یہ شعر

ماذا علی من شم تربة أحمد ☆ ان لا يشم مدى الزمان غواميا

صبت علی مصائب لو أنها ☆ صبت علی الايام صرت لياليا

یا پھر اس نسبت سے کہ جو بعد میں آنے والے ہیں تو مصیبت بھی بڑی ہے اور مشقت بھی بڑی ہے اور وجد بھی بغیر حلاوت کے ہے۔ اسی لیے تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی موت سے تمام محبوبوں کی موت سے تسلی حاصل ہوتی ہے اور ہر محبوب کے بچھڑ جانے سے اور بہت اچھا ہے جو کہا ہے کسی کہنے والے نے:

اگر دنیا میں کسی کے لیے بقا ہوتا تو تو رسول اللہ اس سے زیادہ حقدار تھے کہ ہمیشہ رہتے۔

اور کوئی بھی ایسا نہیں جو موت سے بچا ہو اور موت کا تیر تو حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بھی لگ گیا تھا۔

اور تحقیق تسلی دی تھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی رحلت سے قبل ہی اور آپ کے جمال کے سورج کے غروب ہونے کا اس قول کے ساتھ۔ ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ [آل عمران: ١٨٥] ''کہ ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' اور یہ قول کہ ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ [الزمر: ٣٠] ''آپ کو بھی موت آنی ہے ان سب کو بھی موت آنی ہے۔'' یہ صراحت ہے کہ یہ اُس کا حتمی فیصلہ ہے اور اُس کی تقدیر ہے تقسیم کی ہوئی تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات عام مصیبت تھی اور مکمل مشقت تھی جس نے دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور کلیجوں کو کاٹ ڈالا اور بندوں اور شہروں کو وحشت ناک بنا دیا لیکن ہم اللہ کی قضاء پر راضی ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرہ: ١٥٦]

۱۷۳۶: وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَاتَ وَلَدُ الْعَبْدِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمَلَائِكَتِهٖ قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِيْ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيَقُوْلُ قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهٖ فَيَقُوْلُوْنَ نَعَمْ فَيَقُوْلُ مَاذَا قَالَ عَبْدِيْ فَيَقُوْلُوْنَ حَمِدَكَ وَاسْتَرْجَعَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ ابْنُوْا لِعَبْدِيْ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَسَمُّوْهُ بَيْتَ الْحَمْدِ. (رواہ احمد و الترمذی)

اخرجه الترمذي في السنن ٣٤١/٣ حديث رقم ١٠٢١۔ واحمد في المسند ٤١٥/٤۔

ترجمہ ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب کسی مؤمن بندہ کا کوئی بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ ''تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کی ہے۔'' وہ عرض کرتے ہیں کہ ''ہاں!'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا'' وہ عرض کرتے ہیں کہ ''جی ہاں!'' پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے کیا کہا؟'' وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے آپ کی تعریف کی اور استرجاع یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔'' اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے کے لئے جنت میں ایک بڑا گھر بنا دو اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔'' (احمد و ترمذی)

تشریح: قوله اذا مات ولد العبد) مؤمن خود ہی فرد الاکمل ہے۔

قوله (قال الله تعالىٰ ملائكته) ملک الموت اور اُس کے مددگار ساتھیوں سے۔

استفہام مقدر ہے۔ یہ تجاہل عارفانہ کی نظیر ہے۔

دوسری مرتبہ کمال رحمت کی وجہ سے جیسا کہ والد مہربان سوال کرتا ہے کہ کیا تو نے میرے بچے کو قید کیا ہے۔ حالانکہ وہ اُس کے حکم اور رضا اور حکم کا پابند ہوتا ہے۔

قوله (قبضتم ثمرة فؤاده) کہا گیا ہے کہ بچہ کو دل کا پھل اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ باپ کے لیے ایسے ہیں جیسا کہ درخت کے لیے پھل ہوتا ہے۔

قول :فيقول ماذا قال عبدی: معنی جو اُس کے جزع اور صبر پر اور اُس کے کفر اور شکر یہ۔

یعنی اُس آزمائش پر جو تیری طرف سے تھی اور اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ ساری مخلوق کا رجوع آپ کا حکم آپ کے فیصلہ اور قدرت کے ساتھ ہے اور کہا کہ: ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ [البقرة : ١٥٦] اور حکم کی غایت یہ ہے کہ ہمارے بعض سابق ہیں اور بقیہ لوگ لاحق ہیں۔

قوله :فيقول الله ابنو ...... یعنی اس کے لیے۔

بيت الحمد : اضافت کی ہے بیت کی حمد کی طرف۔ جسے اُس نے مصیبت کے وقت کہا۔ کیونکہ یہ اُس حمد کی جزاء ہے۔ طیبیؒ نے کہا: سوال کو دہرانے کا مقصد یہ تھا کہ فرشتوں کو متنبہ کرنا تھا جو اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے ہیں اپنے بندوں پر افضل کا صبر کرنے کی وجہ سے مصیبتوں پر یا پھر اس کے شک نہ کرنے کی وجہ سے بلکہ تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شمار کیا اور شکر کو واجب سمجھا پھر استرجاع کیا اور یہ سمجھا کہ اُس کا نفس اللہ کی ملکیت ہے اور آخرت میں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ فرمایا: ''ولد عبدی'' اُس کے درخت کی شاخ'' پھر اُسے ترقی دی دِل کے پھل کی طرف یعنی اُس کے خلاصہ کا نچوڑ کیونکہ انسان کا خلاصہ اُس کا دل ہے اور دل ہی کی وجہ سے وہ ہے۔ اور یہ ایک نہایت نازک مکان ہے جس کے ساتھ کی تخلیق ہوئی۔ اور اسی کی وجہ سے اس کی کرامت ہوئی اور شرف ملا اور اسی لیے خطرناک چیزوں کو بھی نعمت کہا گیا تا کہ وہ محمود بن جائے اور جس مکان میں رہ رہے اُسے بیت الحمد کا نام دیا گیا۔

اور فرمایا: حسن غریب ہے۔ اسے میرک نے نقل کیا ہے۔

تسلی دینے والے کو اجر ملنا

١٧٣٧ :وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَزّٰى مُصَابًا فَلَهٗ مِثْلَ اَجْرِهٖ (رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب لا نعرفه مرفوعا الا من حديث علی ابن عاصم الراوی وقال وراه بعضهم عن محمد بن سوقة بهذا الا سناد مو قوفا)۔

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٨٥ حديث رقم ١٠٧٣۔ وابن ماجه ٥١١/١ حديث رقم ١٦٠٢۔

ترجمہ :حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو شخص مصیبت زدہ کو تسلی دے تو اس کو بھی اس کی طرح (یعنی مصیبت زدہ کی طرح) ثواب ملتا ہے اس کو ابن ماجہؒ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے ہم اس کو مرفوع نہیں جانتے مگر علی بن عاصم کی حدیث سے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے اس کو بعض محدثوں

نے محمد بن سوقہ سے روایت کیا ہے۔ یہ روایت اسی سند کے ساتھ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔

تشریح: مصیبت خواہ موت کی ہو یا غیر موت کی' خواہ تسلی دینے کے لئے ہو یا اُس کے پاس چل کر آئے یا کتابت کے ساتھ جو اُس کی مصیبت کو کم کر دیں اور اُسے تسلی دیں اجر کے وعدہ کے ساتھ یا دعا کے ساتھ۔ جیسے اللہ آپ کا اجر زیادہ کرے اور آپ کا صبر کم کرے اور آپ کو شکر عطا کرے۔

یعنی تعزیت کرنے والے کے لیے۔

جتنا اُسے مصیبت پر صبر کا اجر ملتا ہے کیونکہ بھلائی پر راہنمائی کرنے والا بھی اُسی کی مثل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے اسے تعزیت پر آمادہ کیا اور وہ صبر ہے تو اس کے لیے اس تعزیت پر ثواب ہے جیسا کہ مصیبت آنے والے کے لیے ہے صبر کرنے کی وجہ سے مصیبت پر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تعزیت افسوس ناک ہونا اور صبر کرنا ہے مصیبت کے وقت یعنی وہ یہ کہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون اور تعزیت کرنے والا کہے کہ: اعظم الله اجرك و احسن عزاك بالمد و غفر لميتك۔ قوله : میرک فرماتے ہیں: اسے میرک نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔

قوله: وقال الترمذی هذا حديث غريب لا نعرفه مرفوعاً الا من حديث علی بن عاصم الراوی: یاء کے سکون کے ساتھ۔

سوقة : سین کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔

قوله (بهذا الاسناد موقوفًا) یعنی ابن مسعود پر لیکن اس کا حکم مرفوع کا ہے۔ اور اس کو ابن ماجہ کا یہ حکم مزید مضبوط کر دیتا ہے۔ مسند حسین مرفوع کے ساتھ کہ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ يُعَزِّيْ أَخَاهُ بِمُصِيْبَةٍ إِلَّا كَسَاهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ [ابن ماجه : ح : ١٦٠١] ''جو کوئی مسلمان اپنے بھائی کی تعزیت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن بزرگی کے جوڑے پہنائے گا'' اور رسول اللہ کا فرمان: قوموا إلى أخينا نعزيه۔ اپنے بھائی کی طرف کھڑے ہوئے تا کہ ہم تعزیت کریں۔

بیٹے کی وفات پر عورت کو تسلی دینے کے باعث جنت کا لباس پہنایا جائے گا

۱۷۳۸ وَعَنْ اَبِيْ بَرْزَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَزّٰى ثَكْلٰى كُسِيَ بُرْدًا فِي الْجَنَّةِ۔ [رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب]

اخرجه الترمذى فى السنن ٣٨٨/٣ حديث رقم ١٠٧٦۔

ترجمہ :حضرت ابو برزہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اس عورت کو تسلی دے جس کا بیٹا فوت ہو چکا ہو اس کو جنت میں اچھا لباس پہنایا جائے گا۔ اس کو ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ثكلى : گمشدہ، گم شدہ بچے والے ہے اور وہ آدمی جو گمشدہ ہوتا ہے۔ یعنی جس نے کسی عورت سے تعزیت کی جس کا بچہ فوت ہو گیا ہو یعنی جس کا بچہ زندہ نہ ہو۔

كسى : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

بردا : یعنی بہت عظیم کپڑا پہنایا جائے گا۔

قولہ :رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب۔ میرکؒ فرماتے ہیں:اس کی سند قوی نہیں ہے ایسے ہی ترمذی کے آغاز میں ہے۔

میت کے اہل والوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا

۱۷۳۹:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِصْنَعُوْا لِاٰلِ جَعْفَرٍ طَعَامًا فَقَدْ اَتَاهُمْ مَايَشْغُلُهُمْ۔ (رواه الترمذی وابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۴۹۷/۳ حدیث رقم ۳۱۳۲۔ والترمذی ۳۲۳/۳ حدیث رقم ۹۹۸۔ وابن ماجه ۵۱۴/۱ حدیث رقم ۱۶۱۰۔

ترجمه :حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ جب جعفرؓ کے مرنے کی خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کو ارشاد فرمایا کہ حضرت جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو۔ تحقیق ان کے پاس وہ چیز آئی ہے۔ جو کھانا پکانے سے روک دیتی ہے۔(یعنی حضرت جعفرؓ کے مرنے کی خبر)۔اس کو امام ترمذی ابوداؤد ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: (وعن عبد الله بن جعفر) یعنی ابن ابی طالب ہیں۔

قولہ (قال لما جاء نعي جعفر) نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ۔کہا گیا ہے "انعی" اور نعی موت کی خبر کو کہتے ہیں اور نعی ناعی بھی ہوتی ہے۔قاموس میں ہے "نعاہ لہ فنعواً ونعیًا" یعنی اُسے موت کی خبر دی۔اور نعی ناعی کے گانے کی طرح ہے یا اُس معنی میں ہے۔

قولہ (قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اہل بیت النبوۃ سے فرمایا:قولہ (اصنعوا لآل جعفر طعامًا) یعنی آپ اس کے ساتھ تقویت پہنچا رہے تھے اب ان کا نام اہل مکہ ہے اور یہ عظمت ہے راء کے ضمہ کے ساتھ اور وہ یہ کام صرف دفن کے بعد کرتے تھے رات ہوئے وقت۔

قولہ (فقد اتاهم) یعنی جعفر کی موت کی شکل میں۔

قولہ (ما یشغلهم) یاء اور غین کے فتحہ کے ساتھ۔بعض نے کہا ہے کہ اول کے ضمہ اور تیسرے کے کسرہ کے ساتھ اور شغلہ روکنے کی طرح ہے کام سے اور اشغلہ یا تو نئی لغت ہے یا پھر نایاب اور ردی لغت ہے۔معنی یہ ہے کہ انہیں وہ چیز آ پہنچی ہے جو انہیں کھانا تیار کرنے سے روکتی ہے۔تو پھر اُن کے لیے ضرر حاصل ہوتا ہے اور وہ شعور بھی نہیں رکھتے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دلالت کرتی ہے کہ اہل بیت کے لیے اقارب اور ہمسائیوں کا کھانا تیار کرنا عام طور پر غم کھانا کھانے سے مشغول رکھتا ہے اور ایک دن سے زیادہ بھی بڑھ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تین دن تک کھانا کھلانا چاہیے تعزیت کے موت تک پھر جب کھانا تیار ہو جائے تو سنت طریقہ ہے کہ کھانا کھلایا جائے خود تا کہ وہ کمزور نہ ہو جائیں یا پھر شرم کی وجہ سے چھوڑ دیں یا پھر رونے پیٹنے کی کثرت کی وجہ سے

اور روکنا اُن کو دور یا قریب سے نوحہ کرنے سے کیونکہ اس کی حرمت شدید ہے اور یہ مصیبت پر مدد کرنا ہے اور اہل بیت کے لیے کھانے کا انتظام کرنا انہی کے مال سے یہ سخت بدعت اور مکروہ ہے۔ بلکہ حضرت جریرؓ سے ہے کہ ہم اسے نوحہ سے شمار کرتے ہیں اور یہ واضح حرام ہے۔غزالی فرماتے ہیں: اس سے کھانا حرام ہے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: جب یہ یتیم اور غائب کے مال میں سے نہ ہو وگرنہ حرام ہے بلا اختلاف۔

قولہ: فرمایا حسن صحیح ہے میرکؒ نے یہ نقل کیا ہے **قولہ** میرکؒ فرماتے ہیں: اور اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

نوحہ کرنے پر عذاب کی وعید

۱۷۴۰: عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ نِيْحَ عَلَيْهِ فَإِنَّهٗ يُعَذَّبُ بِمَا نِيْحَ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۰/۳۔ حدیث رقم ۱۲۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۶۴۳/۲ حدیث رقم (۲۸۔ ۹۳۳)۔ والترمذی فی السنن ۳۲۴/۳ حدیث رقم ۱۰۰۰۔ واحمد فی المسند ۶۱/۲۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جس پر نوحہ کیا جاتا ہے اس کو قیامت کے دن نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: نیح علیه: اور یہ ناح کا مجہول ہے۔

قولہ: (فانه یعذب بما نیح علیه یوم القیامة) طیبیؒ فرماتے ہیں: باء سببیہ ہے اور ما مصدریہ ہے یعنی نوحہ کے سبب یا ماموصولہ ہے تو باء آلہ کے لیے ہے۔ یعنی جس کا اُس پر نوحہ کیا گیا۔ جیسا و اجبلاہ جیسا کہ آگے آئے گا۔

میت کو زندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے

۱۷۴۱: وَعَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ عَائِشَةَ وَذُكِرَ لَهَا اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ الْحَيِّ عَلَيْهِ تَقُوْلُ يَغْفِرُ اللّٰهُ لِاَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَمَا اِنَّهٗ لَمْ يَكْذِبْ وَلٰكِنَّهٗ نَسِيَ اَوْ اَخْطَاَ اِنَّمَا مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى يَهُوْدِيَّةٍ يُبْكٰى عَلَيْهَا فَقَالَ اِنَّهُمْ لَيَبْكُوْنَ عَلَيْهَا وَاِنَّهَا لَتُعَذَّبُ فِيْ قَبْرِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵۲/۳۔ حدیث رقم ۱۲۸۹۔ ومسلم فی صحیحه ۶۴۳/۲ حدیث رقم (۲۷۔ ۹۳۲)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۹۴/۳ حدیث رقم ۳۱۲۹۔ والترمذی ۳۲۸/۳ حدیث رقم ۱۰۰۶۔ والنسائی ۱۷۱/۴ حدیث رقم ۱۸۵۶۔ وابن ماجه ۵۰۸/۱ حدیث رقم ۱۵۹۵۔ ومالك فی الموطأ ۲۳۴/۱ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الجنائز۔ واحمد فی المسند ۳۸/۲۔

ترجمہ: عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے' فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سنا جبکہ ان سے ذکر کیا گیا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میت کو زندہ کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ اللہ ابوعبدالرحمٰن کی مغفرت فرمائے۔ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن وہ بھول گئے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ خاص صورت میں فرمایا تھا یا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے غلطی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر یہودیہ کی قبر کے پاس سے ہوا۔ اس پر رویا جا رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب عزیز واقارب اس پر روتے ہیں تو اس کو اپنی قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: "عمرۃ" عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قولہ :تقول :...... ولکنہ نسي أو أخطأ۔

یہ حال بن رہا ہے عائشہ سے۔ کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی ہے کہ "میں نے سنا" اور ان دونوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ طیبیؒ نے جائز قرار دیا ہے کہ یہ فاعل سے حال بنے یا مفعول بنے۔

یغفر اللّٰہ لا بی عبد الرحمٰن : یہ عبداللہ کی کنیت ہے اور یہ آدابِ حسنہ میں سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے: عفا اللہ عنك لم أذنت لھم۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا کہ آپ نے انہیں کیوں اجازت دی۔"

اما: تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لیے ہے یا پھر افتتاح کے لیے ہے اور مجرد تاکید کے لیے آتا ہے۔ **قولہ (انہ)** یعنی ابن عمر **قولہ (لم یکذب)** یعنی اللہ کی پناہ وہ تو سچائی میں بہت ہی زیادہ ہیں۔ **قولہ (ولکن نسی)** یعنی صرف اس مقام پر۔ **قولہ (أو اخطأ)** عام خیال میں۔ ابن حجر فرماتے ہیں: لیکن اُس سے روایت کرنے والا بھول گیا ہے تمام بات سے اور وہ بات چھوڑ دی اور اُن کے غیر سے غلطی ہوئی۔ تو فرق یہ ہے کہ اصل میں اس کا شعور نہیں ہے اور یہ بات شعور کے ساتھ پتہ چل سکتی ہے۔ اور ذہن اس سے اس کے غیر کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ اور مابعد سے واضح ہونے پر ملامت باقی نہیں رہتی۔

قولہ :انما مر رسول اللّٰہ ﷺ علی یھودیة یبکی علیھا فقال انھم) یعنی یہودی لوگ۔

قولہ (لیبکون علیھا و انھا) یعنی یہودی عورت۔ یعنی اپنے کفر یا رونے کی وجہ سے۔ اور اسی معنی میں ہے کہ ہر کافر اور فاجر کو عذاب دیا جاتا ہے۔ اور یہ چیز مخفی نہ ہے کہ یہ اعتراض وارد ہوتا اگر یہ حدیث نہ سنی ہوتی اس جگہ پر۔ مختلف الفاظ اور مختلف روایات سے ان سے اور دیگر راویوں سے روایات ملتی ہیں اور وہ مطلق ہیں مقید بھی نہیں ہیں تو یہ خصوص اس عدم کے تحت ہوگئی۔ تو ان دونوں روایات میں کوئی تعارض نہ ہوگا تو اُن کا اعتراض اُن کا اجتہاد ہوگا۔ میرک فرماتے ہیں: صحیح سے نقل کرتے ہوئے کہ اختلاف ہے میت کے عذاب کے بارے میں اُس کے اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب میت اس کے وصیت کرے تو اسے اس کی وصیت کے برابر عذاب دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ خاص میت کے حق میں ہے جو یہودی تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رونے پیٹنے کو یاد کیا کرتے تھے واقعات میں اور اس طرح کے شرعی مذموم کام کرتے تھے۔ تو معنی یہ ہوا کہ جو رونے کے دوران الفاظ واقع ہوتے ہیں اُس کی وجہ سے عذاب ہوگا۔ اور کہا کہ یہ ... پاس ہے واللہ اعلم عذاب سے مراد غم ہو جو میت کو پہنچتا ہے جب وہ رونے والوں کی آواز سنتا ہو۔ یا اُسے سنائی جاتی ہوں تو

اُسے اس کے بدلے میں تکلیف اور غم ملتا ہو۔ واللہ اعلم۔

اور ہم ہی نے روایت کیا ہے کہ اہل عراق میں سے ایک عورت کا بچہ فوت ہو گیا تو اُس نے اُس پر خوب واویلا کیا پھر وہ سفر میں آ گئی تو وہ ہر عید کے روز قبرستان جاتی اور اپنے بچے کی قبر پر روتی۔ لیکن جب وہ اپنے شہر میں نہ ہوتی تو اُس علاقہ کے قبرستان میں جاتی اور ویسے ہی واویلا کرتی جیسا کہ وہ اپنے شہر کے قبرستان میں کرتی تھی بلکہ مزید کثرت سے روتی اور واویلا کرتی۔ پھر وہ سوگئی تو اُس نے خواب میں دیکھا کہ اہل مقبرہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے ہیں کہ کیا ہمارے پاس اس عورت کا بچہ ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا کہ یہ پھر کیوں ہمارے پاس آ جاتی ہے اور ہمیں اپنے رونے کی وجہ سے تکلیف دیتی ہے۔ تو پھر وہ اُٹھے اور اُسے بہت مارنے لگ گئے۔ جب وہ عورت بیدار ہوئی تو اُس نے اُس مارنے کی تکلیف کو محسوس کیا۔

کوئی شک نہیں ہے کہ مردوں کی ارواح تکلیف دہ چیزوں سے درد محسوس کرتی ہیں اور لذت والی چیزوں سے خوش ہوتی ہیں برزخ میں جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے اور یہ بھی وارد ہوا ہے کہ مردے زندوں کا حال جانتے ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ سختی اور نرمی ہوتی ہے اور یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ وہ مردے لوگوں کی زیارات کرنے کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں اور نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ جب زندہ ہوتے وقت رونے اور واویلا کرنے سے روح کو تکلیف پہنچتی ہے تو پھر موت کے بعد بھی ہوتا ہے اور عذاب سے نفی جس کی طرف حضرت عائشہؓ نے اشارہ کیا ہے وہ اُس آیت سے استدلال ہے ”ھو عذاب الآخرۃ“۔ واللہ اعلم

ملا علی قاری فرماتے ہیں: کہ کوئی شک نہیں ہے کہ روحوں کو بھی تکلیف ملتی ہے جس چیز سے زندہ جانوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ یہ اچھا احتمال ہے اور اچھی تاویل ہے۔ اگر چہ یہ اُس کے برخلاف ہے جو سابقہ حدیث میں گزر چکا ہے جو متفق علیہ ہے کہ عذاب کو مقید کیا جائے آخرت کے ساتھ باوجود اس کے کہ کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اس روایت اور سابقہ روایت کے درمیان تطبیق دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اُونچی آواز سے رونے کو ناپسند کرنا

۱۷۴۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ تُوُفِّيَتْ بِنْتٌ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ بِمَکَّةَ فَجِئْنَا لِنَشْهَدَهَا وَحَضَرَهَا ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنِّیْ لَجَالِسٌ بَیْنَهُمَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِعَمْرِو بْنِ عُثْمَانَ وَهُوَ مُوَاجِهُهٗ اَلَاتَنْهٰی عَنِ الْبُکَاءِ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمَیِّتَ لَیُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَهْلِهٖ عَلَیْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَدْ کَانَ عُمَرُ یَقُوْلُ بَعْضَ ذٰلِكَ ثُمَّ حَدَّثَ فَقَالَ صَدَرْتُ مَعَ عُمَرَ مِنْ مَّکَّةَ حَتّٰی اِذَا کُنَّا بِالْبَیْدَآءِ فَاِذَا هُوَ بِرَکْبٍ تَحْتَ ظِلِّ سَمُرَةٍ فَقَالَ اذْهَبْ فَانْظُرْ مَنْ هٰؤُلَاءِ الرَّکْبُ فَنَظَرْتُ فَاِذَا هُوَ صُهَیْبٌ قَالَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اُدْعُهٗ فَرَجَعْتُ اِلٰی صُهَیْبٍ فَقُلْتُ ارْتَحِلْ فَالْحَقْ اَمِیْرَالْمُؤْمِنِیْنَ عُمَرَ فَلَمَّا اَنْ اُصِیْبَ عُمَرُ دَخَلَ صُهَیْبٌ یَبْکِیْ یَقُوْلُ وَااَخَاهُ وَاصَاحِبَاهُ

فَقَالَ عُمَرُ يَا صُهَيْبُ اَتَبْكِي عَلَيَّ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبَعْضِ بُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَلَمَّا مَاتَ عُمَرُ ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَ فَقَالَتْ يَرْحَمُ اللّٰهُ عُمَرَ لَا وَاللّٰهِ مَا حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ وَلٰكِنْ اِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ الْكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ اَهْلِهٖ عَلَيْهِ وَقَالَتْ عَائِشَةُ حَسْبُكُمُ الْقُرْاٰنُ وَلَا تَزِرُوَا زِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى قَالَ بْنُ عَبَّاسٍ عِنْدَ ذٰلِكَ وَاللّٰهُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى قَالَ ابْنُ اَبِي مُلَيْكَةَ فَمَا قَالَ ابْنُ عُمَرَ شَيْئًا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵۱/۳۔ ۱۲۸۶ ومسلم فی صحیحه ۶۴۱/۲ حدیث رقم (۲۳۔ ۹۲۷)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہؒ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ کی بیٹی مکہ میں وفات پا گئی۔ ہم اس کے نمازِ جنازہ اور دفن میں حاضر ہونے کے لیے آئے اور جنازے میں حاضر ہونے کے لیے عبداللہ بن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی تشریف لائے۔ پس میں ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ پس عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن عثمانؓ کو کہا جو ان کے سامنے تھے۔ کیا تم اپنے گھر والوں کو رونے سے منع نہیں کرتے ہو؟ اس لیے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس میں عام رونا معلوم ہوتا ہے اور وہ خاص رونے کو منع کرتے تھے جو آواز اور نوحہ کے ساتھ ہو۔ پھر ابن عباسؓ نے حدیث بیان کی کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے لوٹا۔ یہاں تک کہ ہم بیداء مقام پر پہنچے۔ جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ پس اچانک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کیکر کے درخت کے نیچے قافلے سے ملے پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا۔ جا کر دیکھو اس قافلہ میں کون ہیں؟ پس میں نے دیکھا کہ وہ صہیبؓ امیر تھے اور ان کے ہمراہی تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے ان کو خبر دی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اس کو بلاؤ' میں صہیبؓ کے پاس گیا اور کہا کہ چلیے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کرو۔ جب عمر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو حضرت صہیبؓ روتے ہوئے داخل ہوئے اور کہنے لگے اے میرے بھائی! اے میرے صاحب! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے صہیبؓ! کیا تو مجھ پر آواز کے ساتھ رویا ہے اور پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا تحقیق مردہ یا قریب المرگ کو اس کے اہل والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے جو آواز اور نوحہ کے ساتھ ہو۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی میں نے ان کا یہ قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش کیا پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ کہ خدا کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں فرمایا کہ میّت کو اہل والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ نہ مطلق رونے سے اور نہ بعض رونے سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے کافر کو عذاب زیادہ دیتا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قرآن تم کو کافی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس آیت کے قریب یہ مضمون بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہنساتا اور رلاتا ہے۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کچھ نہیں کہا۔ اس کو امام بخاری اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ملیکة : تصغیر کے ساتھ ہے۔

عفان : کہا گیا ہے کہ یہ منصرف ہے۔

قوله (وحضوها ابن عمر و ابن عباس) یعنی وہ بھی اس میں شریک تھے۔

فانی لجالس بینهما : طیبیؒ فرماتے ہیں: ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یوں کہا جائے "فانی لجالس" تا کہ یہ حال بنے اور حَضَرَ عام ہو۔ اور فاء تقاضا کرتی ہے اتصال کا اس قول کی وجہ سے "فجئنا لنشهدها" اسے سید جمال الدین نے نقل کیا ہے۔ میرک فرماتے ہیں: بخاری میں واؤ کے ساتھ ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: طیبی کے کلام کے پیروی میں کہ یہ قول "فانی جالس" یہ فجئنا پر عطف ہے۔ اور عدم اتصال کا ظاہر ہونا مخفی بھی نہیں ہے۔ اس قول میں "فجئنا لنشهدها" وگرنہ معاملہ آسان تھا کہ یوں کہہ دیا جاتا کہ حَضَرَهَا جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ فاء مقدر پر داخل ہے۔ تو تقدیر یوں ہوگی۔ "فبعد حضورها انی لجالس" بینهما"۔ یہ نقل کرتے ہوئے مکمل تفصیل کے ساتھ جو کچھ وہاں واقع ہوا۔

قوله :فقال عبد الله بن عمرو ...... یقول بعض ذلك۔

قوله (فان رسول الله ﷺ قال: ان المیت یعذب ببکاء اهله علیه فقال ابن عباس) یعنی عبداللہ بن عمر پر اعتراض کرتے ہوئے کہ انہوں نے اپنے باپ کی طرح حضرت عائشہ ؓ کی مخالفت کی ہے۔ اور رونا بسا اوقات ضروری بھی ہوتا ہے وہ تو اس سے مکلّف نہ ہوگا اسے ابن حجر نے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ دوسرا اس بحث سے مکمل طور پر خارج ہے اور حضرت عائشہ ؓ کا اختلاف وہاں ذکر نہیں ہے اور ان کا ناپ ان سے موافقت کرتا تھا مکمل طور پر یا بعض جگہوں میں اس قول کی وجہ سے

(قد کان عمرؓ یقول بعض ذلك) یعنی عمومی طور پر کہ آواز کے ساتھ یا پکار کے ساتھ موت پر مطلع ہوتے وقت۔ یعنی کچھ اس طرح کا کلام۔ کیونکہ ان کی روایت میں ہے۔ "ببعض بکاء اهله" جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

(ثم حدث) یعنی روایت کیا ابن عباسؓ نے جو کچھ انہوں نے حضرت عمرؓ سے سنا۔

قوله (فقال صدرت) یعنی مکہ سے عمرؓ کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔

بیداء :باء موحدۃ کے فتحہ اور تحتانیہ کے سکون کے ساتھ۔ یہ ذی الحلیفہ کے قریب ایک مقام کا نام ہے۔

فاذا هو :یعنی حضرت عمرؓ تھے۔

برکب :یعنی سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ۔

سمرة : سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ایک درخت کی قسم ہے۔

ادعه : ھاء کے ضمہ کے ساتھ اور اس کا سکون بھی جائز ہے یعنی صہیب کو طلب کیا۔

فالحق : حاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی اہل جاء۔

قوله (أمیر المؤمنین) یعنی انہوں نے حکم دیا جمع ہو جائیں۔ یہ خاص دوستی اور خالص اخوت کا نتیجہ تھا جو حضرت عمر ؓ اور صہیب کے درمیان تھی چونکہ وہ اکابر صحابہ میں سے تھے اس لیے یہ فرمایا۔

فلما ان۔ "ان" زائدہ ہے۔

أصیب عمر : یعنی محراب میں زخمی ہوگئے تو انہیں گھر کی طرف منتقل کیا گیا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ میں تھوڑی دیر داخلہ کے بعد۔ ایک مجوسی کے خنجر کے ساتھ متعدد وار کرنے کی وجہ سے آپ اس وقت لوگوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے تو آپ گر پڑے تو آپ کو اُٹھا کر گھر لے جایا گیا اور اُس نے کئی ایک لوگوں کو اُس خنجر کے ساتھ مارا وہ صف چیر کر باہر نکلنا چاہتا تھا یہاں تک کہ اُس پر ایک برنس بھی ڈال دیا گیا۔ تو جب اُس ملعون نے یہ محسوس کیا کہ اب وہ مارا جائے گا تو اُس نے اپنے آپ کو خود ہی قتل کر لیا اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نماز مکمل کی اور لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آنے لگے اور خبر دریافت کرنے لگے۔

یبکی : حال ہے۔

یقول : یہ یبکی سے بدل اشتمال ہے۔

وأخاہ و اصاحباہ : یہ نوحہ نہیں ہے۔ یہ تو اُس کی مثال ہے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے سرزد ہوا تھا کہ: اے میرے باپ جنت الفردوس جس کا ٹھکانہ ہے اے میرے باپ جبرائیل کی طرف" اور نوحہ کے لیے ایک شرط ضروری ہے کہ وہ بلند آواز کے ساتھ ہو۔

قولہ (وقد قال رسول اللہ ﷺ ان المیت) مطلق طور پر۔ یا جو موت کے قریب ہو۔

علی ملا قاری کہتے ہیں: میں کہتا ہوں یہ سب سے بہتر ہے جو بھی اس سلسلے میں وارد ہوا ہے۔ جتنی بھی احادیث اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے سب سے عمدہ ہے کیونکہ یہ تمام قسم کی روایات میں تطبیق دینے کے لیے ٹھیک ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا تھا جو پکار کے ساتھ رونا ہو اور میت پر نوحہ کرنا حکماً یا حقیقتاً یہ روایت اس قابل ہے کہ اس سے مراد لی جائے کہ بعض سے مراد وہ ہیں جو اس کی وصیت کریں یا پھر یہودی عورت جیسے لوگ مراد ہیں۔ کیونکہ اعتبار عمومی الفاظ کا ہوتا کسی خاص سبب کا نہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے وصیت کی اُن لوگوں کے علاوہ جنہوں نے وصیت نہ کی تھی۔ اور یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اہل خانہ کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے اُس سے بھی متعارض نہ ہے۔ کیونکہ یہ محمول ہے کہ یہ تب ہوگا جب اُس نے ساروں کو اس کی وصیت کی ہوگی۔ تو تاویل کی جائے گی دونوں روایات کی ایک چیز کی طرف تو اُس وقت پھر کوئی اعتراض باقی نہ رہے گا ابن عمرؓ پر کیونکہ انہوں نے اور اُن کے والدؓ نے دونوں نے وہ الفاظ بیان کیے ہیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنے تھے۔ اور اس میں ہے کہ مفہوم کو محمول کرنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو سمجھا تھا اُس کے خلاف ہے۔ پھر اہل بیت سے مراد تمام رشتہ دار اور ساتھی ہیں۔ جیسا کہ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مفہوم دلالت کرتا ہے۔ تو زیادہ واضح بات یہ ہے کہ میت سے مراد حالت نزع والا آدمی لیا جائے اور عذاب سے مراد اس کے اردگرد کے لوگوں کے احوال ہو جو بغیر ذکر اللہ کے بیٹھے ہوتے ہیں جیسا کہ عام عادت ہے۔ کیونکہ وہ اُس وقت آخرت کے مراقبت میں ہوتا ہے اسی لیے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ کاش میں گونگا ہوتا۔ مگر صرف اللہ کے ذکر کے لیے۔ زبان چلتی ہوتی تو مناسب ہے کہ اُس وقت دعا اور اذکار کیے جائیں آسانی کے لیے یا پھر تلقین کی جائے۔ واللہ اعلم

قوله :فقال ابن عباس فلما مات عمرؓ ذكرت ذلك : یہ کلام یا یہ حدیث قوله (لعائشة) رضی اللہ عنہا سے۔

يرحم الله عمر : اس میں اشارہ ہے کہ یہ بات اُن سے غلطی سے ہوئی تھی اور اس میں عفو کی ضرورت تھی۔ اور اچھی عادات میں سے ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ﴾[التوبة :۴۳]طیبیؒ فرماتے ہیں: مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قول پر تعجب ہوا تو اس قول "يرحم الله عمر " کو تمہید اور غلطی کی معافی کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

ان الميت : ہمزہ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔

ليعذب ببكاء اهله عليه : یعنی نہ ہی مطلق اور نہ ہی مقید بعض کے ساتھ۔ اور یہ نفی قسم کے ساتھ مؤکد ہے۔ اُن کے ظن اور گمان کی بنیاد پر ہے۔ اور اُن کے سماع کے ساتھ مقید ہے۔ مگر وگرنہ جس نے حجت کو حفظ رکھا اور جس نے یاد نہ رکھا اور مثبت نفی پر مقدم ہے اور یہ کیسے ممکن ہے حالانکہ حدیث صحیح طریق سے مروی ہے اور صریح الفاظ کے ساتھ ہے باوجود اس کے کہ وہ اپنی عمومیت کے باوجود خصوصیت کے منافی نہ رہے۔

ولكن : یعنی جو جملہ بیان کیا ہے "ان الله" کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں ہے "ولكن قال"۔

ان الله يزيد الكافر عذابا ببكاء أهله عليه : اس میں ہے کہ یہاں نفی اُس سے متناقض ہے جو انہوں نے پچھلی حدیث میں فرمایا تھا کہ ایک یہودیہ پر اس کے اہل خانہ رو رہے تھے تو فرمایا کہ یہ اپنی قبر میں عذاب دی جا رہی ہے۔

قوله (قالت) یعنی اپنے پہلے قول کی تاکید کرتے ہوئے۔

قوله (حسبكم القرآن) سین کے سکون کے ساتھ یعنی تمہیں قرآن ہی کافی ہے۔ اُس کی تائید میں جس کے ساتھ خبر ہے۔

أخرى : جملہ بدل کل ہے یا بدل بعض ہے قرآن سے یا پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ طیبیؒ نے کہا ہے: وزر اور وقر ایک ہی چیز ہے۔ اور کسی چیز کا وزر تب ہوتا ہے جب وہ اُسے اُٹھاتا ہے۔ اور وازرۃ نفس کی صفت ہے۔ معنی یہ ہے کہ "ہر نفس قیامت کے دن صرف اپنا بوجھ اُٹھائے گا۔ جس کا اُس نے ارتکاب کیا ہو گا کسی نفس کا کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ دنیا کے ظالم کرتے ہیں کہ ولی کو ولی کے بدلے میں پکڑ لیتے ہیں اور ہمسایہ کو ہمسائے کے بدلے اور یہ چیز مخفی نہ ہے کہ آیت ظاہری طور پر اس کے خلاف ہے کہ کافر اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔

قوله (قال ابن عباس عند ذلك) یعنی حضرت عائشہؓ کے اس قول کے بعد یا پھر اس قول کے نقل کرنے کے بعد اس کی تائید میں اور اُن کے کلام کی تصدیق کے لیے۔

والله : رفع کے ساتھ ہے اور واؤ کے ساتھ ہے اور آیت کا لفظی معنی ہے۔ واللہ ھو۔

اضحك وابكىٰ : میرک کہتے ہیں: کہ ابن آدم کا مالک نہ اور اُس کا اس میں کوئی سبب بھی نہیں ہے تو پھر وہ کیسے سزا دیا جائے گا میت کی بجائے۔ اور اس کی اتباع ابن حجر نے کی ہے کہ اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ عام رونا جائز ہے اور یہ خلاف اجماع ہے اور اس قول سے مخالف ہے جو ابن عباسؓ سے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ﴾[الكهف :۴۹] "نہ چھوٹی غلطی نہ بڑی غلطی مگر وہ شمار کی جاتی ہے"۔ اور یہ کہ چھوٹی چیز تبسم ہے اور بڑی چیز قہقہہ ہے۔ جو بغوی نے

اُن سے نقل کیا ہے معالم السنن میں۔ پھر میرک فرماتے ہیں نووی نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمیل میں رونے کی اجازت دے رکھی ہے تو وہ اجازت دینے پر عذاب نہیں دیتا ہے۔ اور یہ بحث سے خارج ہے۔

پھر فرماتے ہیں طیبیؒ نے فرمایا: اس کا مقصد ابن عمر کے قول کی نفی کرنا ہے کہ میت اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے عذاب دی جاتی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کا رونا اور ہنسنا اور غمزدہ ہونا اور خوش ہونا اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بندہ کا اس میں کوئی اثر نہیں ہوتا اور یہ بھی ہے کہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور بندے کی طرف سے اپنے کسب اور اختیار سے کی ہوئی چیزیں ہیں جیسا کہ یہ مقرر ہے۔ اور شریعت نے اعتبار کیا ہے ان چیزوں کا بھی جو انسان پر وارد ہوتی ہیں دوسرے بشری افعال کی طرح۔ کیا خیال ہے کہ ہنسنا اور مسکرانا مؤمن کے چہرے پر نیکیاں ہیں اور مؤمن کے چہرے پر مذاق اور غم اور سرور گناہوں میں سے ہے۔ ایسے ہی حزن اور سرور کبھی کبھار تو احوال آخرت سے ہوتے ہیں تو ثواب دیا جاتا ہے اور کبھی کبھار افعال دلیویہ سے ہوتے ہیں جن پر سزا دی جائے گی۔ جیسا کہ یہ علم الاخلاق اور تصوف میں تحقیق شدہ ہے۔

پھر طیبیؒ نے فرمایا: اگر تم کہو کہ یہ مؤمن کے حق میں کیسے موثر نہ ہے حالانکہ کافر کے حق میں مؤثر ہے۔ تو میں کہوں گا کیونکہ مؤمن کامل نافرمانی پر راضی نہیں ہوتا' چاہے وہ اُس سے سرزد ہو یا کسی دوسرے سے بخلاف کافر کے۔ اور پھر حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے کہ تمہیں قرآن کافی ہے یعنی اے مؤمنو! تمہیں کافی ہے اس قرآن سے یہ آیت: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [الانعام: ۱٦٤] ''کہ کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہ اُٹھائے گا۔'' یہ تمہارے بارے میں ہے اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے کہ: ان الله یزید الکافر عذابا ببکاء أهله علیه۔ ''اللہ تعالیٰ کافر کو مزید عذاب زیادہ دیتا ہے اُس کے اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے'' تو یہ کفار کے بارے میں ہے۔ میں کہتا ہوں کوئی دلالت اس قول پر اس دعویٰ کے بارے میں نہ ہے۔ باوجود اس کے کہ عبرت اور اعتبار عام الفاظ کا کیا جاتا ہے آیات اور احادیث کے معنی میں کسی خاص سبب نہیں کیا جاتا۔

اور ابن حجر نے عجیب جانا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان اختلاف کو لفظی قرار دیا ہے باوجود اس کے کہ اُن کے اقوال مختلف معانی رکھتے ہیں اور پھر ممکن نہیں کہ انہیں ایک معنی میں جمع کیا جائے۔ پھر فرماتے ہیں: اور میں عذر دیتا ہوں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُن پر غالب خوف تھا تو انہوں نے اپنے سوءظن کی بنیاد پر اپنی جان کے بارے میں کہا تھا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا امید اور حسن ظن کے مقام پر تھیں اس لیے اس کے بارے میں فرمایا: ولکل وجهة هو مولیها۔ یہ صوفیہ کے لطائف اشاروں کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے۔ اور کلام مشکاء صدر نبوت سے اور متعلقہ شہری احکام سے ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله (قال ابن ابی ملیکه فما قال ابن عمر شیأً) یعنی کچھ بات نہ کی یا کچھ اور چیز۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اُس وقت ابن عمر رضی اللہ عنہما خاموش ہو گئے اور کان دھر لیے۔ میں کہتا ہوں: کہ سکوت میں کان دھرنے کی دلالت نہ ہے بلکہ بحث ترک کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ داناؤں کا وطیرہ ہے۔ قوله ابن حجر فرماتے ہیں: اس میں ہے کہ مجتہد دلیل کا پابند ہے۔ اور اس کے لیے اسی بنا پر دوسرا غلطہ پر ہوتا ہے اور وہ اپنی غلطی پر حلف بھی اٹھاتا ہے۔ اگرچہ وہ اُس سے زیادہ عالم ہو۔ اور ایسا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھا۔

اور اس میں دلیل صریح طور پر ہے اور صحیح بات نقل ہے جو رد کرنے سے صحیح ہو یا بعض اُن لوگوں کو جو ہمارے زمانے میں

اپنے آپ کو فقہ شافعی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔اور ہمارے اوپر اعتراض کرتے ہیں۔جو کہ ابھی تک تقلید کے پھندوں سے نہیں نکلے ہیں اور قید کی حدود سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔اور تحقیق کے میدان میں بھی نہیں آئے ہیں۔اور ہماری تائید ابن حجر پر اعتراض کرتے ہوئے یہ ہوتی کہ جب وہ کلام غیر سدید کرتے ہیں لیکن آپ جیسے کے لیے یہ لائق نہ ہے کہ وہ شیخ الاسلام لوگوں کے مفتی ابن حجر پر اعتراض کریں جو کہ علم کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہیں بڑے ائمہ علم کے نزدیک۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے میّت پر بلند آواز سے رونے کو سختی سے منع کیا ہے

۱۷۴۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا جَاءَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلُ ابْنِ حَارِثَةَ وَجَعْفَرٍ وَّابْنِ رَوَاحَةَ جَلَسَ يُعْرَفُ فِيهِ الْحُزْنُ وَاَنَا اَنْظُرُ مِنْ صَائِرِ الْبَابِ تَعْنِيْ شَقَّ الْبَابِ فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ نِسَاءَ جَعْفَرٍ وَّذَكَرَ بُكَاءَ هُنَّ فَاَمَرَهُ اَنْ يَّنْهَاهُنَّ فَذَهَبَ ثُمَّ اَتَاهُ الثَّانِيَةَ لَمْ يُطِعْنَهُ فَقَالَ انْهَهُنَّ فَاَتَاهُ الثَّالِثَةَ قَالَ وَاللّٰهِ غَلَبْنَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَزَعَمَتْ اَنَّهُ قَالَ فَاحْثُ فِيْ اَفْوَاهِهِنَّ التُّرَابَ فَقُلْتُ اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَكَ لَمْ تَفْعَلْ مَا اَمَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ تَتْرُكْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْعَنَاءِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۶/۳ حدیث رقم ۱۲۹۹۔ ومسلم فی صحیحه ۶۴۴/۲ حدیث رقم (۳۰۔ ۹۳۵)۔ والنسائی فی السنن ۱۴/۴ حدیث رقم ۱۸۴۷۔ واحمد فی المسند ۵۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زید ابن حارثہ اور جعفرؓ اور ابن رواحہ کی غزوہ موتہ میں شہادت کی خبر آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر غم تھا۔میں دروازے کے سوراخ سے دیکھ رہی تھی۔پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت جعفرؓ کی عورتیں ایسے ایسے کر رہی ہیں ہیں اور ان کے رونے کا ذکر کیا۔پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان کو منع کرو۔وہ شخص پھر گیا اور پھر دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ عورتوں نے کہنا نہیں مانا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کو منع کرو۔پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تیسری مرتبہ آیا۔یعنی گیا اور منع کیا اور انہوں نے نہ مانا۔پھر تیسری بار آکر کہا کہ اللہ کی قسم عورتوں نے ہم پر غلبہ پالیا ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ان کے منہ میں مٹی ڈالو۔پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا خاک آلود ہو تیری ناک۔تو کیوں نہیں حکم مانتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم کرتے ہیں اور تو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله (وعن عائشهؓ قال لماء جاء النبی ﷺ قتل ابن حارثه) یعنی زید کو

الحزن : یعنی اس کے آثار اور یہ حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔''محبوب کا فوت ہونا ہے۔''اور جملہ حال بن رہا ہے یعنی پریشان۔جو کہ بشری تقاضہ بھی ہے۔اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ اُن کا مسجد میں بیٹھنا تعزیت کی خاطر تھا۔لیکن ابن ہمام فرماتے ہیں مصیبت کی خاطر تین دن بیٹھنا جائز ہے۔اور یہ پہلی بات کے خلاف ہے اور مسجد میں

بیٹھنا پسندیدہ ہے۔شاید کہ اسے اختصاص پر محمول کیا یا پھر بیان جواز کے لیے ہے یا پھر اُن کا بیٹھنا اتفاقی تھا۔

شق : شین کے فتحہ کے ساتھ یعنی اسے پھاڑ دیا۔اور یہ راوی کی تفسیر ہے۔

قوله (فاتاه رجل فقال) یعنی آدمی نے

قوله (ان نساء جعفر) یعنی اهل جعفرَ و ذکر۔ یعنی اُس آدمی نے۔

بکاء هن : یہ جملہ نصب کی جگہ میں ہے اور حال بن رہا ہے اور خبر سے مطلق ہے۔طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حال ہے مستتر سے اور فرمایا: کہ عائشہؓ نے اُس قول سے ان کی خبر کو حذف کر دیا تھا حکایت کرتے ہوئے نساء جعفر کی۔حال کی دلالت کے ساتھ۔ یعنی ''ان ذلك الرجل قال ان نساء جعفر فعلن كذا و كذا'' یعنی جن چیزوں سے شریعت نے روکا ہے رونے اور گفت وشنید اور نوحہ کرنے سے۔

(یہ موصوف محذوف کی صفت ہے) ای المرة الثانية۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حکایت ہے آدمی کے قول کی کہ ''وہ گئے اور انہیں منع کیا پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آیا تو کہا میں نے انہیں روکا ہے لیکن وہ میری بات نہیں مانیں۔اس پر دوسرا قول دلالت کرتا ہے کہ یا رسول اللہ وہ ہم پر غالب آ گئیں۔

انهن : ہمزہ وصل مکسورہ کے ساتھ ہے اور ھاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔اور منع کرنے کا حکم تھا رونے سے۔

فاتاه الثالثة : یعنی پھر گئے اُن کے پاس اور انہیں روکا لیکن وہ باز نہ آئیں تو پھر تیسری مرتبہ آئے۔

قال و الله غلبننا يا رسول الله : جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ وہ غالب آ گئی تھیں۔

قوله : فزعمت۔ غیب سے ہی یعنی عمرۃ فرماتی ہیں جو عائشہ ؓ نے گمان کیا۔طیبیؒ نے فرمایا: یعنی گمان کیا۔ابن حجر فرماتے ہیں: وہ خبر دی گئی تھیں۔نووی فرماتے ہیں: گمان قول محقق پر دلالت کرتا ہے اور جھوٹ اور مشکوک پر اور ہر اُس چیز میں جس کے وہ لائق ہوتا ہے۔لیکن میرا گمان ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ سے گمان کے مطلب میں ہے اور اس کی تائید اُس نسخہ سے ہوتی ہے جس میں یوں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: پس یہ اُن کا گمان ہے یعنی اُن کا زعم ہے۔

فاحث : ثاء کے ضمہ کے ساتھ اور یہ ''الحثی'' سے امر ہے اور یہ پھینکنے کو کہتے ہیں۔

النہایہ میں ہے کہ ''مٹی پھینکو تعریف کرنے والوں کے مونہوں پر'' اور یہ رسوا کرنے سے کنایہ ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حقیقت ہے۔تو مراد یہ ہوئی کہ ''اگر تم قدرت رکھو اس پر تو'' اور ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ یہاں کنایہ ہے اس سے کہ انہیں اُن کے حال پر چھوڑا جائے۔کیونکہ انہیں نصیحت فائدہ نہیں دیتی جزع فزع کرنے کے وقت۔

أرغم الله أنفك : النہایہ میں ہے کہ ''رغم انفه'' کہ وہ دھول سے بھر جائے اور یہ مٹی ہے اسے ذلت اور عجز میں استعمال کیا جاتا ہے کسی چیز کے مطیع کرنے کے لیے اور وہ بھی کسی مکروہ امر میں۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: حضرت عائشہؓ نے فرمایا ایک آدمی سے کہ اللہ تجھے ذلیل کرے تو نے اللہ کے رسول کو تکلیف دی تھی اور عورتوں کو رونے سے نہیں روکا۔اور یہ حضرت عائشہؓ کے قول کا مطلب ہے۔قوله (لم تفعل مأامرك رسول الله ﷺ) یعنی ڈانٹنے میں کمال کرنا وگرنہ حکم کی تابعداری کرنا جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔اور ابن حجر کا قول کتنا بعید ہے جہاں انہوں نے حکم

کو اُن کے مونہوں میں مٹی پھینکنے کی طرف پھیر دیا ہے۔

قولہ :ولم تترك رسول الله ﷺ من العناء) عین کے فتحہ کے ساتھ۔یعنی سمع خراشی کر کے رسول اللہ ﷺ کو رنجیدہ خاطر کر رہے ہو کہ وہ رونے جیسے گناہ کبیرہ یا صغیرہ کا ارتکاب کر رہی ہیں اور بار بار کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود نہیں رک رہی ہیں۔

نوحہ کرنا شیطانی عمل ہے

۱۷۴۴:وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلَمَةَ قُلْتُ غَرِيْبٌ وَّفِيْ اَرْضِ غُرْبَةٍ لَاَ بْكِيَنَّهُ بُكَاءً يُتَحَدَّثُ عَنْهُ فَكُنْتُ قَدْ تَهَيَّاْتُ لِلْبُكَاءِ عَلَيْهِ اِذَا اَقْبَلَتِ امْرَاَةٌ تُرِيْدُ اَنْ تُسْعِدَنِيْ فَاسْتَقْبَلَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُرِيْدِيْنَ اَنْ تُدْخِلِي الشَّيْطَانَ بَيْتًا اَخْرَجَهُ اللّٰهُ مِنْهُ مَرَّتَيْنِ وَكَفَفْتُ عَنِ الْبُكَاءِ فَلَمْ اَبْكِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٣٥/٢ حديث رقم (١٠۔ ٩٢٢)۔

ترجمہ :حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ جب ابوسلمہ کی وفات ہوئی (جو اُمّ سلمہؓ کے خاوند اول تھے)۔میں نے کہا کہ ابوسلمہ مسافر اور مسافرت کی زمین میں تھے البتہ میں ان پر رونا روؤں گی ایسا رونا کہ میرا رونا (بطور مثال کے) نقل کیا جائے گا۔پس میں نے ان پر رونے کی تیاری کی اچانک ایک عورت آئی جو میرے ساتھ رونے کا ارادہ رکھتی تھی۔(یعنی میرے رونے میں شریک ہونا چاہتی تھی) پس اس کے سامنے نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو شیطان کو اس گھر میں داخل کرنا چاہتی ہے کہ جس کو اللہ نے اس گھر سے دو مرتبہ نکالا ہے تو میں رونے سے باز آ گئی اور نوحہ کر کے نہ روئی۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: لما مات أبو سلمه ...... يتحدث عنه:

قلت :غریب :یعنی وہ تو پردیس میں فوت ہوئے تھے۔مکی تھے اور اصحاب ہجرت میں سے تھے۔

أرض غربة: اضافت کیساتھ ہے اور یہ تاکید ہے یا پھر اُس قول سے مراد ''غریب'' یہ ہے کہ اُن کا کوئی عزیز و اقارب نہ تھا۔یا پھر یہ لفظ مجاز ہے یا پھر تشبیہ بلیغ ہے۔

قولہ (لا بكينه) نون کے تشدید کے ساتھ یعنی اللہ کی قسم میں اس پر ضرور روؤں گی۔

يتحدث عنه : صیغہ مجہول کے ساتھ یعنی لوگ اس کے بارے میں باتیں کریں گے اور لوگ تعجب کریں گے،اس کے کمال شدت کی وجہ سے۔شاید یہ بھی اُسی سے ہو اور نوحہ کی حرمت کے علم سے پہلے کی بات ہو۔

قولہ :فكنت قد تهيأت للبكاء عليه) یعنی قصد اور عزیمت کے ساتھ اور غم کے سامان کے ساتھ تیاری کی یعنی کالے کپڑے وغیرہ۔طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء اس قول میں قلت کے ساتھ متصل ہے یعنی ''میں نے کہا رونے کی تیاری کرنے کے بعد اور جائز نہ ہے کہ کسی قول کو متصل کیا جائے مگر واؤ کے ساتھ تاکہ وہ حال بن سکے۔ابن حجر اس تحقیق سے غافل رہے۔فرماتے ہیں یہ

''قلت'' پر عطف ہے۔ یعنی میرے اس قول کے بعد کہ میں نے ساری تیاری کر لی تھی۔

اذا أقبلت امرأة: یہ ''تہیات'' کے لیے ظرف ہے اور ابن حجر بہت بعید ہیں جہاں وہ فرماتے ہیں: کہ یہ قلت کے لیے ظرف ہے۔ یعنی میرے پاس عورت آئی۔

قوله :تريد أن تسعدني :یعنی رونے میں میری مدد کرے اور پکارنے میں۔

فقال :أتريدين :اے عورت کیا تو نافرمانی پر مدد کرے گی۔

اور کیا تم شیطان کے دخول کا سبب بننا چاہتی ہو۔

قوله :بيتا أخرجه الله :یعنی شیطان کو۔ قوله (منه) یعنی اُس گھر سے اور اسے دور رکھا ہے کہ وہ اس کے اہل کو ورغلا سکے۔

مرتين :سید جمال الدین فرماتے ہیں: کہ یہ احتمال بھی ہے کہ پہلے دن سے مراد اُن کا اسلام میں داخلہ ہو اور دوسری مرتبہ سے مراد اُن کا دنیا سے نکلنا مسلمان ہو کر ہو۔ یا پھر اس سے مراد تکرار ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایک دفعہ نکالنے کے بعد پھر نکالا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ ﴾ [الملك: ٤] اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿الطلاق مرتان﴾ [البقرة:٢٢٩] یعنی ایک دفعہ کے بعد دوبارہ پھر طیبیؒ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں یہ احتمال رکھتا ہے کہ پہلی دفعہ سے مراد وہ دن ہے جس دن انہوں نے ہجرت کی تھی مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف اور دوسری مرتبہ سے مراد جس دن انہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اس وجہ سے وہ دو مرتبہ ہجرت کرنے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مرتین کا تعلق قال کے ساتھ ہے۔ یعنی یہ بات دوہرائی اہتمام کی تکمیل کے لیے دو مرتبہ واللہ اعلم!

وكففت :یہ مقصد پر عطف ہے۔ یعنی اُس نے جھڑکا اور مجھے روک دیا۔ ای فانزجرت ومنعت نفسي۔

خوبیاں بیان کرنے سے ممانعت

۱۷۴۵:وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اُغْمِيَ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ رَوَاحَةَ فَجَعَلَتْ اُخْتُهٗ عَمْرَةُ تَبْكِيْ وَاجَبَلَاهُ وَاكَذَا وَاكَذَا وَتُعَدِّدُ عَلَيْهِ فَقَالَ حِيْنَ اَفَاقَ مَا قُلْتِ شَيْئًا اِلَّا قِيْلَ لِيْ اَنْتَ كَذٰلِكَ زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ فَلَمَّا مَاتَ لَمْ تَبْكِ عَلَيْهِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥١٦/٧ حديث رقم ٤٢٦٧۔

ترجمہ :حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن رواحہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کی بہن عمرہ نے رونا شروع کر دیا اور یہ کہنا شروع کیا افسوس! اے ایسے اور ایسے اور گنتی شروع کر دی یعنی ان کی خوبیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ جب عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ہوش آئی تو انہوں نے کہا کہ جو کچھ تو نے میرے لئے کہا وہ مجھے بطورِ تنبیہ کے کہا گیا ہے کہ کیا تو ایسا ہی ہے (یعنی اگر تو نے واجبلاہ کہا ہے تو مجھے کہا گیا کہ کیا تو پہاڑ ہے کہ تیرے ساتھ پناہ پکڑتے ہیں) اور اور ایک روایت میں زیادہ کیا گیا ہے پس جب عبداللہ بن رواحہ فوت ہوئے تو یہ نہیں روئی۔ اس کو بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: نعمان نون کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

یہ دونوں صحابی ہیں۔

عبد الله بن رواحة : یہ نقباء اور جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں۔

قوله : فجعلت أخته عمرة تبكى و اجبلاه : طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں قال یا قول محذوف ہے۔ ای قائلة واجبلاه کا اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول کا: ﴿لِّسَانًا عَرَبِيًّا﴾ [الاحقاف:۱۲]

قوله :وا كذاوا كذا : یہ سیداہ اور سنداہ سے کنایہ ہیں۔

تعدد عليه :یعنی روتے ہوئے اُس کے اوصاف جمیلہ بیان کرنے لگی یہ بدل ہے یا پھر بیان ہے۔

قوله :فقال حين أفاق ما قلت شياءً الاقيل لى) استثناء مفرغ ہے۔

قوله (كذلك) یعنی آپ اور ایک نسخہ میں ہے كذاك لام کے بغیر یعنی جو آپ نے کہا واجبلاہ۔ کہا گیا ہے کہ "أنت جبل" یعنی کہف ہے۔ یعنی آپ کی طرف التجا کی جاتی ہے۔۔ اور وعید شدید کے ساتھ۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حضرت عمرؓ کے مذہب کی تائید کرتی ہے۔ ابن ابی ملیکہ والی حدیث میں اور ابن حجر نے اس کا تعاقب تو کیا ہے لیکن بغیر کسی ٹھوس دلیل کے اور وہ یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ وہ اس حدیث کو ظاہری معنی کے ساتھ لیتا ہو اور ان تاویلات سے جن کو میں نے ذکر کیا ہے وہ ان کے ساتھ مطابقت کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں سیوطی کے کلام میں اس کا تذکرہ دوبارہ آئے گا۔ جو سیوطی کے مؤقف کو مضبوط کرے گا۔ پھر ابن حجر فرماتے ہیں اگر تو کہے کہ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اُس کو جھڑکا یا حالانکہ وہ خود اس کام سے راضی نہ تھے اور نہ ہی اس کا حکم دیا تھا۔ اس کی خبر کم ہوگئی تھی یہاں تک کہ لوگ اسے کرنے سے باز آ گئے۔ اور جواب نہ دینے کی صلاحیت مخفی نہ ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میت پر اس کی خوبیاں بیان کر کے رونا سخت منع ہے

۱۷۴۶: وَعَنْ اَبِي مُوسٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ مَيِّتٍ يَمُوْتُ فَيَقُوْمُ بَاكِيْهِمْ فَيَقُوْلُ وَاجَبَلَاهُ وَاسَيِّدَاهُ وَنَحْوَ ذٰلِكَ اِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكَيْنِ يَلْهَزَانِهٖ وَيَقُوْلَانِ اَهٰكَذَا كُنْتَ۔ (رواه الترمذى قال هذا حديث غريب حسن)

اخرجه الترمذى فى السنن ۳۲۶/۳ حديث رقم ۱۰۰۳۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ جب کوئی میت دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ تو ان میں سے اس پر کھڑا ہو کر رونے والا کہتا ہے کہ اے پہاڑ کی طرح اور اے سردار! اللہ تعالیٰ اس کے کہنے کی وجہ سے میت پر دو فرشتے متعین کر دیتا ہے وہ فرشتے اس کے سینے پر مکے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تو ایسا ہی تھا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث غریب حسن ہے۔

تشریح: قوله :سمعت رسول الله ﷺ يقول ما من ميت :یعنی حقیقی یا پھر موت کے قریب۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی طرح ہے کہ مریض بیمار ہوتا ہے یا گمشدہ ہو جاتا ہے تو موت کے قریب ہونے والا اور مریض اور گمشدہ کو میت ہی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ حالتیں تھیں جو عبداللہ بن ابی رواحۃ پر ظاہر ہوئی تھیں، لیکن ابن حجر نے اس کا تعاقب کیا ہے لیکن بغیر کسی دلیل کے ہے۔

قولہ (باکیھم فیقول واجبلاہ واسیداہ و نحو ذلك) جیسا کہ سنداہ اور معتداہ ہے۔

یلھزانه : ھاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی اُسے مارتے ہیں اور اُسے دھکیلتے ہیں۔ النہایۃ میں ہے کہ "الھز" کا مطلب مارنا ہے ہاتھ کے ساتھ سینے پر کہا جاتا ہے اُس نے تیر کے ساتھ مارا۔ یعنی اُس نے سینے میں تیر مارا۔

امام سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں کافی احادیث بیان کرنے کے بعد میت کو بعض زندہ لوگوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں کئی ایک مذاہب ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ظاہری طور پر مطلقاً ہے اور یہ حضرت عمرؓ بن خطاب کی رائے ہے اور اُن کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے ہے دوسرا کہ مطلق نہیں ہے۔ تیسرا یہ کہ باء حال کے لیے ہے یعنی جس وقت وہ رو رہے ہوتے ہیں اُس وقت عذاب دیا جاتا ہے نہ کہ رونے کی وجہ سے بلکہ عذاب گناہوں کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ پانچواں یہ اُس کے لیے خاص ہے جس کی سند اور طریقہ میں نوحہ ہے اور یہ امام بخاری کا موقف ہے۔ چھٹا: یہ اُس کے لیے جس نے اس کی وصیت کی جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے

اذا مت فانعيني بما أنا أهله ☆ وشقي علي الحبيب يا ابنت معبد

ساتواں: یہ اُس کے لیے جس نے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت نہ کی حالانکہ وصیت اُس پر واجب تھی جب اُسے پتہ تھا کہ اُس کے گھر والے ایسا کریں گے۔ آٹھویں: عذاب اُن صفات پر ہوگا جن پر وہ لوگ رہ رہے ہوں گے۔ اور شرعی طور پر یہ مذموم ہے جیسا کہ جاہلیت میں لوگ کرتے تھے کہ وہ کہتے تھے اے............ اے اولاد کو مارنے والے اے گھروں کو خراب کرنے والے۔ نواں: عذاب سے مراد فرشتوں کا ڈانٹنا ہے جن پر اُس کے گھر والے اُس کو پکار رہے ہوں گے۔ دسواں: جس کو بخاری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ سے اُس کے الفاظ یوں ہیں: الميت يعذب بالنياحة عليه في قبره۔ "میت کو نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے اُس کی قبر میں"۔

ایک اور قول بھی گزر چکا ہے کہ: عذاب سے مراد میت کو تکلیف دینا ہے رونے کی وجہ سے مذموم وجہ سے جیسا کہ دیگر نافرمانیوں سے ہوتا ہے کہ نیک اعمال سے خوش ہوتا ہے۔ اور حاصل کلام یہ ہے کہ میت کا جب نافرمانی کرنے میں کوئی سبب ہو اگرچہ اس نے وصیت کرنے میں کوتاہی ہی کیوں نہ کی ہو یا پھر اُس فیصلہ پر راضی ہو۔ تو عذاب اپنی حقیقت پر ہوگا۔ وگرنہ تکلیف پر چاہے وہ نزع کے وقت یا پھر موت کے وقت ہو اور اس میں کافر اور مؤمن برابر ہیں۔ اور اسے جمع کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الانعام: ١٦٤] "کہ کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہ اُٹھائے گا" اور اس عظیم آزمائش کے بارے میں متعلقہ احادیث کے درمیان تطبیق دینا آسان ہے۔

عرضِ مرتب:

تشریح ۞ اوپر حدیث میں: إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ میں علماء نے جو اختلاف کیا ہے اس کی تشریح میں اس اختلاف کو بیان کیا گیا ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ میّت کو رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے اس میں کئی مذاہب ہیں:

❶ ایک مذہب تو یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہے مطلق ہے مقید نہیں ہے یعنی اس میں وصیت یا کافر وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے اور بہر کیف پکار کر رونے اور نوحہ کرنے کی وجہ سے میّت کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ مذہب عمر اور ابن عمر کا ہے۔ رضی اللہ عنہم

❷ رونے سے مطلقاً عذاب نہیں ہوتا۔

❸ عذاب کا تعلق مردے کی حالت ہوتا ہے۔ یعنی رونے کی وجہ سے اس پر عذاب نہیں ہوتا۔ گناہوں کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

❹ یہ کافر کے حق میں ہے اور یہ دونوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول ہیں۔

❺ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جس کے یہاں نوحہ کا رسم ورواج ہو اور یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

❻ یہ اس شخص کے حق میں ہے جو وصیت کر کے جائے کہ میرے بعد نوحہ کرنا' رونا۔ اس کو بھی عذاب ہوگا۔ کیونکہ یہ اس کا فعل ہے۔

❼ یہ اس شخص کے حق میں ہے جو مرتے وقت وصیت نہ کرے اور اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ میرے بعد نوحہ کریں گے پھر بھی ان کو نوحہ سے منع نہ کرے۔

❽ میّت کو ان کی باتوں کے بیان کر کے رونے کی وجہ سے بھی عذاب ہوتا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کہتے تھے اے عورتوں کو بیوہ کرنے والے اور اے اولاد کو یتیم کرنے والے! اے گھروں کو خراب کرنے والے!

❾ عذاب ہونے کا معنی ملائکہ کا غصہ کرنا ہے جب اس کے گھر والے بین کر کے بیان کرتے ہیں جو اوپر مذکور ہوا ہے۔

❿ نوحہ کرنے کی وجہ سے میّت کو عذاب ہوتا ہے۔ انتہیٰ اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کے برا رونے کی وجہ سے میّت رنج وغم میں مبتلا ہو جاتی ہے' ان کی گناہوں کی باتیں سننے کی وجہ سے اس کو رنج ہوتا ہے اور اچھے اعمال سننے کی وجہ سے خوشی ہوتی ہے۔

الحاصل یہ ہے اگر میّت اس گناہ کا سبب ہے یعنی اس نے نوحہ کرنے کی وصیت کی ہے یا وہ اس پر راضی ہوگا۔ تو عذاب حقیقت پر محمول ہوگا۔ ورنہ وہ نزع کے وقت یا مرنے کے بعد رنج وغم میں مبتلا ہوگا اور اس میں کافر اور مؤمن برابر ہیں اور اس بات سے آیت: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ [الانعام: ١٦٤] ''کہ کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہ اُٹھائے گا۔'' سے احادیث مطلقہ سے تطبیق حاصل ہو جاتی ہے جو اس باب میں مذکور ہوئی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عورتوں کے بین کرنے کو منع کرنا

۱۷۴۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَاتَ مَيِّتٌ مِّنْ اٰلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجْتَمَعَ النِّسَاءُ يَبْكِيْنَ عَلَيْهِ فَقَامَ عُمَرُ يَنْهَاهُنَّ وَيَطْرُدُهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُنَّ يَا عُمَرُ فَاِنَّ الْعَيْنَ دَامِعَةٌ وَالْقَلْبُ مُصَابٌ وَالْعَهْدُ قَرِيْبٌ۔ (رواه احمد والنسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۱۹/٤ حديث رقم ۱۸۵۹۔ وابن ماجه ۵۰۵/۱ حديث رقم ۱۵۸۷ واحمد فی المسند ٤٤٤/۲۔ (۰) راجع الحديث رقم (۱۷۲۲)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں کوئی (یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا) فوت ہوگئیں (جیسا کہ مابعد والی روایت میں ان کا نام صراحتاً مذکور ہے) پس اس پر عورتیں جمع ہو کر رونے لگیں۔ حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور ان کو (یعنی اجنبیوں کو) منع کرتے اور مارتے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عمر! ان کو چھوڑ دو اس لیے کہ آنکھیں روتی ہیں اور دل مصیبت زدہ ہے اور مرنے کا وقت نزدیک ہے۔ اس کو امام احمدؒ اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :مات ميت من آل رسول الله ﷺ : یہ حضرت زینب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں۔ جیسا کہ اگلی حدیث میں ذکر آئے گا۔

ویطردھن: یعنی ان کو مار مار کر دور کر رہے تھے۔ جیسا کہ ذکر آئے گا۔

قوله :فقال رسول الله ﷺ دعهن ۔ یعنی چھوڑ دو انہیں۔

قوله (يا عمر فان العين دامعة) یعنی طبعاً ہوتا ہے اور شریعت بھی اس کی موافقت کرتی ہے۔

والقلب :نصب اور رفع کے ساتھ ہے۔

یعنی انہیں مصیبت پہنچی ہے تو ضروری ہے کہ غم کی طرف انسان پلٹ جائے جیسا کہ نعمت کے ملنے کے وقت خوشی ملتی ہے تو یہ سبب ہوتا ہے آنکھ کے رونے اور ہنسنے کا۔

والعھد :یعنی مصیبت ان پر زمانہ قریب میں گزری ہے۔

صبر ان پر مشکل ہے۔ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصبر (ای الکامل) عند الصدمة الأولى۔ کامل صبر مصیبت کے ابتداء ہی میں ہے'' واؤ مطلق جمع کے لیے ہے۔ اور ترتیب طبعی اس کے برخلاف ہے۔ کیونکہ قربت کے زمانہ میں غم کی شدت زیادہ ہوتی ہے دل کے لیے اور اس کے بدلے میں آنکھ کو آنسو وراثت میں ملتے ہیں۔ قربانی دیتے ہوئی اُس چیز کے لیے جو ظاہر ہوتی ہے اور جو چیز پوشیدگی سے معلوم ہو۔ پھر ظاہر ہے کہ اُن عورتوں کا رونا آواز کے ساتھ تھا وہ بلند نہ کر رہی تھیں تو حضرت عمرؓ نے ذریعہ کا ہی سدباب کرنا چاہا تا کہ یہ مذموم نوحہ کی طرف نہ بڑھ جائیں اور خصوصی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم دیا کہ انہیں چھوڑ دو اور اُن کے اس کام پر عذر بھی ظاہر کر دیا اور ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔۔

حضرت عمر کو اس وجہ سے روکا ہو کہ حضرت عمرؓ انہیں مار رہے تھے جیسا کہ اگلی حدیث میں ہے۔ آپ کی ممانعت ظاہر ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہ محمول ہے اس پر کہ وہ عورتیں صرف رو رہی تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جب علم ہو جائے تب نہ روئیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے رو کنے کا حکم دے دیا اور عذر بھی ذکر کر دیا جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کراہت وہاں پر ہے جہاں غم کا غلبہ نہ ہو لیکن جہاں غم کا غلبہ ہو تو وہاں پر مکروہ نہیں ہے۔

اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ صرف رونا مکروہ نہیں ہے اجماعاً اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی رونا صادر ہو چکا ہے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر۔ جہاں آپ نے فرمایا: العين تدمع، و القلب يحزن۔ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہوتا ہے اور جو ممانعت حدیث میں ہے وہ مذموم رونے پر ہے۔ اور اُس مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جو اتفاقی ہو یا کبھی کبھار ہو واللہ اعلم۔ اس پر مزید تفصیل اور مزید تحریر اُس حدیث میں آئے گی جو اس کی تائید میں آئے گی۔ قولہ ۔۔۔ نسخہ میں بھی ایسے ہی ہے۔

نرمی کے ساتھ برائی سے منع کرو

۱۷۴۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَاتَتْ زَيْنَبُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَكَتِ النِّسَاءُ فَجَعَلَ عُمَرُ يَضْرِبُهُنَّ بِسَوْطِهٖ فَاَخَّرَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ وَقَالَ مَهْلًا يَّاعُمَرُ ثُمَّ قَالَ اِيَّاكُنَّ وَنَعِيْقَ الشَّيْطَانِ ثُمَّ قَالَ اِنَّهٗ مَهْمَا كَانَ مِنَ الْعَيْنِ وَمِنَ الْقَلْبِ فَمِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَمِنَ الرَّحْمَةِ وَمَا كَانَ مِنَ الْيَدِ وَمِنَ اللِّسَانِ فَمِنَ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد في المسند ۱/ ۳۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی زینبؓ کی وفات ہوئی تو عورتیں رونے لگیں۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے کوڑے کے ساتھ مارنا شروع کیا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہاتھ سے پیچھے کیا اور فرمایا: اے عمرؓ! نرمی اختیار کرو۔ پھر عورتوں کو ارشاد فرمایا اپنے آپ کو شیطان کی آواز سے دور رکھو۔ یعنی چلا کر اور بین کر کے نہ روئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آنکھ اور زبان سے ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (یعنی آنسو اور غم) اور جو ہاتھ اور زبان سے ہو۔ وہ شیطان کی طرف سے ہے اس کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :فاخره رسول الله ﷺ بيده و قال :لا يا عمر۔ یعنی عورتوں سے اس میں اشارہ ہے کہ نوحہ کرنے پر مارنا درست نہیں۔ بلکہ نصیحت کرنا ضروری ہے اس لیے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہٹایا۔

لفظ ''مهلا'' کی تحقیق:

مهلا : ہاء کے سکون کے ساتھ۔ یعنی انہیں چھوڑ دو چھوڑ نا۔ یا پھر انہیں رخصت دے دو۔ سید فرماتے ہیں: مهلاً مصدر ہے۔ اس کا عامل محذوف ہے۔ ایسا ہی طیبی نے بھی کہا ہے: نہایہ میں فرماتے ہیں: علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ جب تم دشمن کی طرف نکلو تو آرام اور سکون کے ساتھ نکلو۔ اور جب آنکھ آنکھ پر واقع ہو تو بھی آہستہ آہستہ کر۔ نرمی ساکن ہے اور پیش قدمی تقدیم ہے۔ یعنی جب تم حملہ کے لیے چلو تو آہستگی سے چلو لیکن جب سامنا ہو جائے تو شدت سے حملہ کر دو۔ جوہری فرماتے ہیں: المهل حرکت کے ساتھ ہے یعنی آزادی دینا اور مہلت دینا کہا جاتا ہے میں نے اُسے چھوڑ دیا یعنی اُسے مہلت دی۔ یعنی اُسے وقت دیا۔ اور مهلاً میں واحد، تثنیہ اور جمع برابر ہیں اور مذکر ومونث بھی برابر ہیں۔ قاموس میں ہے۔ المهل حرکت دی گئی ہے اور ضمہ کے ساتھ سکون اور نرمی کا مطلب ہے۔ اسی کے ساتھ واضح ہوتا ہے کہ ''المهل'' میں کئی لغتیں ہیں۔ سکون اور یہ اصل ہے اور قاموس میں اسی کی طرف اشارہ ہے اس قول کے ساتھ ''ويحرك'' اور النہایہ والے صاحب نے تو صرف سکون پر اکتفا کیا ہے روایت حدیث کے پیش نظر۔ لیکن ابن حجر کا اقتصار کرنا حرکت پر روایت اور درایت کے خلاف ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جلدی نہ کر یہاں تک کہ ان کے لیے حکم واضح ہو جائے۔ اور اس میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ [النحل: ۱۲۵] ''کہ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے''۔

قوله (ثم قال اياكن و نعيق الشيطان) یعنی اُس کی چیخیں اور نوحہ کرنا اور اسے مضاف بنایا گیا ہے تا کہ یہ اپنے معنی پر عمل کرے۔ جس نے بکریوں کو بلانے کے لیے آواز لگائی تا کہ بکریاں واپس آ جائیں۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

كمثل الذى ينعق۔

قاموس میں ہے کہ مهلاً بسیط ہے مرکب نہیں ہے مہ سے اور نہ ہی ما سے۔ گمان کرنے والوں کے خلاف اور اس میں یہ اختلاف بھی کیا گیا ہے کہ یہ اسم شرط ہے یا پھر حرف شرط ہے اور اسی جگہ اور فعل کے لیے شرط ہے۔

فمن الله عز و جل: یعنی تعریف اور رضامندی اللہ کی طرف سے اور یہ مخلوق سے صادر ہوتی ہیں۔

ومن الرحمة: یعنی اُس کے صاحب کی رحمت سے ہے۔

وما كان: ما بھی شرطیہ ہے۔

من اليد ہتھیلی پر مارنا اور کپڑے پھاڑنا اور بال نوچنا۔

من اللسان: یعنی چیخ و پکار کے ساتھ اور نوحہ کر کے یا پھر اس طرح بات کر کے کہ جو اللہ کو پسند نہ ہوں۔

فمن الشيطان: یعنی اُس کی تباہ کاریوں میں سے ہے یا اُس کی رضامندی سے ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: ''مها'' حرف شرط ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ''مهما نفعل أفعل'' اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل ماما ہے الف کو ھاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کا محل رفع ہے ''أيما شئ كان من العين فمن الله'' اگر تو کہے کہ آنسوؤں کی نسبت آنکھ سے اور بات کی --

زبان کی طرف اور مارنے کی ہاتھ کی طرف ہے اگر یہ کبھی ہے تو یہ ساری چیزیں انسان کی طرف سے ہیں۔ لیکن اگر یہ ساری چیزیں جب تقدیری طور پر ہیں تو اللہ کی طرف سے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ رونے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ میں کہوں گا کہ رونے میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ مجبوراً ہوتا ہے تو لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے۔ بخلاف گریبان پھاڑنے اور ہاتھوں سے مارنے کے مصیبت کے وقت یہ چیزیں مذموم ہیں۔ اس کی متابعت ابن حجر نے کی ہے کہ میرکؒ فرماتے ہیں شاید رونے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہیں۔ بخلاف زبان اور ہاتھ کے کیونکہ مصیبت کے وقت شیطان راضی ہوتا ہے اور رحمٰن مؤاخذہ کرتا ہے اور حدیث میں کہیں بھی رونے کی نسبت بندے کی طرف نہیں ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی ہے تو پھر بندے کی طرف ہے۔ اگر تقدیراً ہے تو پھر یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

یہ بڑا ہی عجیب مناقشہ اور جھگڑا ہے۔ اور یہ بیان کہ طیبیؒ کا تردید کرنا کوئی حقیقت پر مبنی نہ ہے۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں پھر بندے کی طرف سے کیسی ہیں۔ تو سوال کا محل اور اشکال کا مورد یہ ہے کہ کس طرح بعض کی نسبت رحمٰن اور بعض کی شیطان کی طرف کی گئی ہے؟ تو اس کا جواب یوں دیا جائے گا کہ اس کا بعض مباح ہے اور محمود ہے تو ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ اُسی کی رضا سے ہے اور اس پر ثواب بھی ملتا ہے۔ اور بعض چیزیں نافرمانی میں تو ان کی شیطان کی طرف نسبت کی گئی۔ جو کہ اُس کے ورغلانے کا سبب ہے اور اس سے اُس کی رضا بھی حاصل ہوتی ہے تو اس پر عذاب ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آنکھوں کے آنسو اور دل کا غم یہ امتیازی افعال میں سے نہ ہیں تو پھر ان کی صفات الٰہیہ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی اشکال نہ ہے۔ اللہ ہی تمام حقائق جانتا ہے۔

حسن رضی اللہ عنہ کی بیوی کا اظہارِ افسوس کے لیے خیمہ کھڑا کرنا

۱۷۴۹: وَعَنِ الْبُخَارِيِّ تَعْلِيقًا قَالَ لَمَّا مَاتَ الْحَسَنُ بْنُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ ضَرَبَتِ امْرَأَتُهُ الْقُبَّةَ عَلٰى قَبْرِهٖ سَنَةً ثُمَّ رَفَعَتْ فَسَمِعَتْ صَائِحًا يَقُوْلُ اَلَا هَلْ وَجَدُوْا مَا فَقَدُوْا فَاَجَابَهٗ اٰخَرُ بَلْ يَئِسُوْا فَانْقَلَبُوْا۔

اخرجه احمد في المسند ۱/۳۳۵۔

ترجمہ: یہ روایت امام بخاریؒ سے بطریق تعلیق (یعنی بغیر سند کے منقول ہے) کہ جب حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کی وفات ہوئی جن کا نام بھی حسن ہی تھا۔ ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک برس تک خیمہ کھڑا کیا پھر اس کے بعد اٹھا لیا تو اس نے غیب سے آواز سنی۔ کہ کیا انہوں نے گمشدہ چیز کو پا لیا ہے؟ دوسرے ہاتف غیبی نے جواب دیا بلکہ وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ گئی۔

تشریح: علی قبرہ سنة : ظاہر یہ ہے کہ تاکہ دوست واحباب اکٹھے ہو سکیں اور ذکر ہو سکے اور دعا مغفرت اور رحمت ہو سکے یا پھر اسے محمول کیا جائے بے ہودہ اور مکروہ پر جیسا کہ ابن حجر نے کیا ہے۔ لیکن ایسا کرنا اہل بیت سے بعید ہے۔

رفعت : مبنی بر فاعل بناتے ہوئے پھر اُسے اُکھاڑ دیا۔ اور اسے مفعول بنانا بھی جائز ہے کہ خیمہ اُکھاڑ دیا گیا۔

الاء تخفیف مع التنبیہ ہے۔

بل یئسوا: ظاہراً یہ ہے کہ یہ ناامید لوٹے ہیں لیکن جب یہ ناامیدی کے معنی میں ہے ناکام لوٹے ہیں۔

قولہ (فانقلبوا) یعنی واپس لوٹے ہیں۔سیوطی فرماتے ہیں: ابن ابی دنیا نے سواد بن مصعب ہمدانی سے وہ ان کے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ دو بھائی تھے اور اُن کی دو لڑکیاں تھیں اور دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے بڑا بھائی اصفہان چلا گیا اور چھوٹا فوت ہو گیا تو وہ اُس کی قبر پر سات ماہ تک جاتا رہا اچانک اُس نے ایک اپنے پیچھے سے آواز سنی۔

''اے دوسرے پر رونے والے اپنے نفس کی اصلاح کر اور نہ رو۔ کیونکہ جس کی وجہ سے تو رو رہا ہے شاید عنقریب تو بھی اُس کے رستے پر چل پڑے۔''

جب اُس نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا تو وہ کپکپایا اور اسے بخار ہو گیا اور تین دن بعد فوت ہو گیا۔ اور اُسے چھوٹے بھائی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

بُری رسموں کے اپنانے پر وعید

۱۷۵۰: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ وَّاَبِىْ بَرْزَةَ قَالَا خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ جَنَازَةٍ فَرَاٰى قَوْمًا قَدْ طَرَحُوْا اَرْدِيَتَهُمْ يَمْشُوْنَ فِىْ قُمُصٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبِفِعْلِ الْجَاهِلِيَّةِ تَاْخُذُوْنَ اَوْ بِصَنِيْعِ الْجَاهِلِيَّةِ تَشَبَّهُوْنَ لَقَدْهَمَمْتُ اَنْ اَدْعُوَ عَلَيْكُمْ دَعْوَةً تَرْجِعُوْنَ فِىْ غَيْرِ صُوَرِكُمْ قَالَ فَاَخَذُوا اَرْدِيَتَهُمْ وَلَمْ يَعُوْدُوْا لِذٰلِكَ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱/ ٤٧٦ حديث رقم ١٤٨٥۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین اور ابو برزہ سے روایت ہے کہ دونوں نے کہا۔ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے کے لیے نکلے ہم نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی چادریں پھینک دی تھیں اور اپنے کرتوں میں چل رہے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم جاہلیت کے فعل پر عمل کرتے ہو یا جاہلیت کے کام کے ساتھ مشابہت رکھتے ہو؟ میں نے ارادہ کیا کہ تم پر بددعا کروں تاکہ تم اپنے گھروں کو اپنی صورتوں کے علاوہ یعنی بندر اور سور وغیرہ بن کر جاؤ۔ راوی کہتا ہے کہ انہوں نے اپنی چادریں لے لیں اور دوبارہ ایسا کام نہیں کیا۔ اس کو ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: خرجنا مع رسول اللہ ﷺ فی جنازة فرأى قومًا) یعنی میت والوں میں سے کچھ لوگ۔

قولہ (قد طرحوا أردیتهم) یعنی اپنی چادریں اپنے کاندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔

قولہ (یمشون) یہ فاعل سے حال بن رہا ہے طرح سے یا یہ صفت بن رہی ہے قوماً کے لیے۔

قولہ (فی قمص) دو ضموں کے ساتھ ہے اور قمیص کی جمع ہے۔ اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ عام طریقہ اُس زمانے میں بھی یہی تھا کہ قمیص پر چادر ہوتی تھی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حال متداخلہ ہے کیونکہ یمشون حال ہے واؤ سے طرحوا بیانیہ یمشون میں واؤ سے حال ہے۔ سید فرماتے ہیں: یہ احتمال بھی ہے کہ احوال مترادفہ ہو مفعول رای سے۔ کیونکہ فرمان

ہے "قدطر حوا" یہ حال ہے اور یمشون دوسرا حال ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قوم نکرہ ہے اور حال کی شرط ہے کہ وہ معرفہ ہو یا نکرہ موصوفہ ہو چنانچہ یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فقال رسول الله ﷺ أبفعل الجاهلية : زاء کے تغیہ سے ہے۔

فاخذون : ہمزۃ انکار کے لیے ہے۔ اس کا محل فعل ہے اور حرف جارہ کو انکار میں پختگی کے لیے لایا گیا ہے۔

قوله (أو بصنيع الجاهلية) اَوتنویع کے لیے ہے یا پھر شک کے لیے ہے۔

تشبهون : یعنی تم مشابہت رکھتے ہو۔ دو تاؤوں میں سے ایک کو حذف کر دیا گیا۔

لقد هممت : ایک نسخہ میں لقد هممت ہے یعنی میں نے قصد کیا ہے۔

دعوة : مفعول مطلق ہے۔

تر جعون : مبنی علی الفاعل ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ہے۔ یعنی تم لوٹا دئے جاؤ اس دعا کی وجہ سے۔

في غير صور كم : یعنی مسخ کرنے کے ساتھ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ رجوع کے معنی کو شامل ہے اور صاء کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے۔ ﴿ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ﴾ (الأعراف: ۸۸) اور اس میں یہ دلیل ہے صیر ورۃ رجوع کے معنی میں ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (التغابن: ۳)۔

ظاہر یہ ہے کہ رجوع لوٹ آنے کے معنی کو شامل ہے۔ اور ترجع تصیر کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت میں ہے۔ کیونکہ عود حقیقت ہے اور وہ اس جگہ مناسب نہیں ہے۔ کلام میں غور کرو۔ یہ قدموں کو پھیلانے والی ہے اور قدموں کو ڈگمگانے والی ہے۔

فرمایا: یا پھر یہ صفت کے معنی کو شامل ہے یعنی تم غیر فطرت کی طرف لوٹ رہے ہو یا جس پر تم پہلے تھے اور کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی دو قولوں کو آپس میں توجیہ دینے کی صرف یہ کہ اَن الی کے معنی میں ہے۔ لیکن صورت کے لیے کوئی دخل نہ ہوگا کہ یہ صفت کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ قول مقابل ہے تو پھر کہا جائے گا کہ مسخ وہ ظاہری ہے یا پھر معنوی ہے:

میرکؒ فرماتے ہیں: تر جعون کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم اپنے گھروں میں دوسری تبدیل شدہ شکلوں سے داخل ہو۔ اور "غير صور كم" حال ہے۔ تو دو وجہیں بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ اچھی توجیہ ہے۔ اور مستحسن تقدیر ہے۔

قوله : قال : راوی نے کہا یہ احتمال ہے کہ راوی دو تھے یا پھر یہ احتمال ہے کہ دونوں نے کہا اور یہ بھی احتمال ہے کہ راوی نے کہا کہ دونوں کو شامل ہے یا پھر کسی ایک کو شامل ہے۔

ولم يعودوا : یعنی اس کے بعد انہوں نے ایسا نہ کیا۔ ای لم یرجعوا بعد ذلك الى ذلك الفعل (یعنی اس کے بعد وہ اس کام کی طرف نہیں لوٹے) أو لم يرجعوا في ذلك الفعل لاجل ذلك القول الصادر منه۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: جب تھوڑی سی مخالفت یعنی چادر کو کاندھوں پر رکھنے پر اتنی بڑی وعید سنائی ہے تو پھر بڑے کاموں پر کیا ہوگا؟ ابن حجر فرماتے ہیں یہ حدیث اُن کے خلاف دلیل ہے جو فقہاء کی رسموں پر عمل کرتے ہیں اہل مکہ میں سے کہ جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو رومال جو کاندھوں پر ہوتے ہیں اتار دیتے ہیں تو یہ بھی اُسی مرتبہ میں ہیں جس میں وہ پہلے زمانے کے لوگ تھے جیسے وہ سخت وعید کے حقدار ٹھہرتے تھے تو یہ لوگ بھی مستحق ٹھہرے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چادر پہننا سنت ہے

رومال کی بجائے کاندھوں پر۔ یہ یا تو بدعت ہے یا پھر کم از کم مباح ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ تو اسے رکھنا مکروہ نہ ہے الا یہ کہ اس پر کوئی سخت وعید نہ ہو۔ لیکن اہل مکہ کے پہننے میں کچھ تاویل ہوگی۔ اس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہ اُن کی علامت ہے کہ مصیبت آئی ہے۔ اور جب لوگ کسی تعزیت میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ اور یہ رومال ہمیشہ ان کے کندھوں پر رہتا ہے بخلاف کہ اگر رش میں نیچے گر جائے اور خاص طور پر میرے ساتھ ایسا ہوا تھا جب سہرا والا محترم اور سہ گوشہ جگر فوت ہوئے تھے۔ تو میں نے اپنا رومال اپنے بعض نوکروں کو دے دیا تھا۔ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہے۔

نوحہ کرنے والی کا جنازے کے ساتھ جانا منع ہے

۱۷۵۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُتْبَعَ جَنَازَةٌ مَعَهَا رَانَّةٌ۔

(رواه احمد وابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ٥٠٤/١ حديث رقم ١٥٨٣۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنازے کے ساتھ جانے سے منع فرمایا ہے جس کے ساتھ نوحہ کرنے والی ہو۔ اس کو امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: أن تتبع) تخفیف کے ساتھ ہے اور مشدد بناء علی المجهول ہے۔ یعنی پیروی کرنا۔

قوله (جنازة معها رانة) نون کی تشدید کے ساتھ ہے۔ نوحہ کرنے والی اور چلانے والی اور اس جیسی دوسری مراد ہیں۔ جب اس کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے بھی منکر امور ہوں اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اُس مجلس میں نہ بیٹھا جائے جس میں کوئی خلاف شرع کام ہو۔

چھوٹے بچوں کا فوت ہو جانا والدین کے لیے دخولِ جنت کا باعث ہے

۱۷۵۲: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لَهٗ مَاتَ ابْنٌ لِّىْ فَوَجَدْتُّ عَلَيْهِ هَلْ سَمِعْتَ مِنْ خَلِيْلِكَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَامُهٗ شَيْئًا يُّطِيْبُ بِاَنْفُسِنَا عَنْ مَوْتَانَا قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صِغَارُهُمْ دَعَامِيْصُ الْجَنَّةِ يَلْقٰى اَحَدُهُمْ اَبَاهُ فَيَاْخُذُ بِنَاحِيَةِ ثَوْبِهٖ فَلَا يُفَارِقُهٗ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ۔

(رواه مسلم واحمد واللفظ له)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٠٢٩/٤ حديث رقم (١٥٤۔ ٢٦٣٥)۔ واحمد في المسند ٤٨٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میرا چھوٹا بیٹا مر گیا پس میں نے اس پر غم کیا ہے کیا تم نے اپنے دوست (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم) سے اللہ کی رحمتیں اور اللہ کا سلام ان پر ہو کوئی ایسی چیز سنی ہے کہ جو ہمارے دلوں کو ہمارے مردوں کی طرف سے خوش کر دے یعنی جو ہماری اولاد سے چھوٹے بچے مر گئے کہ آیا وہ کچھ کام آئیں گے یا نہیں؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے لڑکے دریا کے

جانور کی طرح ہونگے۔ بہشت میں وہ اپنے باپ سے ملیں گے اور اس کے کپڑے کا کونا پکڑیں گے اور اس سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اس کو بہشت میں داخل کر دیں گے۔ اس کو مسلمؒ اور احمدؒ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ انہی کے ہیں۔

تشریح: (وعن أبي هريرة أن رجلاً قال له) یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا۔

قوله (مات ابن لي) یعنی چھوٹا۔

قوله (فوجدت) غمگین ہوا۔

قوله :عليه اس پر۔

قوله (هل سمعت من خليلك صلوات الله عليه) ایک نسخہ میں ہے کہ اور اُس کی سلامتی ہو۔

قوله (شيئا لطيب بانفسنا) تخفیف کے ساتھ ہے اور اول کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ تو باء تعدیت کے لیے ہے اور تشدید کے ساتھ ہے تو باء تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں ہے۔ "ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة" [البقرة: ۱۹۵] اور یہ قول "وهذى عليك بحذع النخلة" [مریم: ۲۵] اور یہ باء کی زیادتی مفعول میں یہ عربی دانوں کے ہاں مطرد ہے جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن حجر کا کہنا ہے کہ باء زائدہ ہے جو اس کے زیادتی کو اثبات میں سمجھتا ہے جیسا کہ اخفش ہیں یہ اُن کا وہم ہے۔

قوله (قال نعم سمعته ﷺ قال صغارهم) یعنی مسلمانوں کے چھوٹے بچے۔

قوله (دعا ميص الجنة) نہایہ میں ہے کہ یہ دعموص کی جمع ہے یہ جو کہ پانی میں غوطہ لگاتی ہے اور دعموص کسی کام میں دخل اندازی کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ جنت میں یوں سیر کریں گے کہ کوئی انہیں کسی جگہ داخل ہونے سے نہیں روکے گا۔ جیسا کہ بچے دنیا میں ہر محرم و نامحرم پر داخل ہوتے ہیں اور کوئی بھی اُن سے پردہ نہیں کرتا۔

قوله (أباه) کہ اُس کی ماں کیسی ہے۔ شاید یہ اقتصار ہو حضرت ابو ہریرہؓ کا موقع کی مناسبت سے یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی دلیل کے ساتھ ہو۔

قوله (فياخذ بناحية ثوبه) یعنی اُس کے کپڑے کے ایک طرف تو۔

شاید مصنف نے سند احمد کا تذکرہ اس لیے کیا ہو کہ یہ لازم تھا کیونکہ جب کوئی حدیث شیخین میں نہ ہو تو اُس حدیث کے لیے وہ کسی دوسرے کا تذکرہ نہیں کرتے۔

دو یا تین بچوں کی وفات پر جنت کا وعدہ

۱۷۵۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَ تِ امْرَاَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِیْثِكَ فَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ نَّفْسِكَ یَوْمًا نَّاْتِیْكَ فِیْهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ فَقَالَ اجْتَمِعْنَ فِیْ یَوْمِ كَذَا وَكَذَا فِیْ مَكَانِ كَذَا وَكَذَا فَاجْتَمَعْنَ فَاَتَاهُنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللّٰهُ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْكُنَّ امْرَاَةٌ تُقَدِّمُ بَیْنَ یَدَیْهَا مِنْ وَّلَدِهَا ثَلَاثَةً اِلَّا كَانَ لَهَا

حِجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِنْهُنَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِ اثْنَيْنِ فَاَعَادَتْهَا مَرَّتَيْنِ ثُمَّ قَالَ وَاثْنَيْنِ وَاثْنَيْنِ وَاثْنَيْنِ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۵/۱۔ حدیث رقم ۱۰۱۔ ومسلم فی صحیحه ۲۰۲۸/٤ حدیث رقم (۱۵۲۔ ۲٦۳۳)۔ واحمد فی المسند ۷۲/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم کے پاس آئی کہنے لگی اے اللہ کے نبی ﷺ! مرد حضرات آپ ﷺ کی حدیثوں سے فیض یاب ہوتے ہیں تو ایک دن ہمارے لیے بھی مقرر کر دیجئے ہم آپ ﷺ کے پاس اس دن حاضر ہو جائیں۔ تاکہ آپ ﷺ ہم کو وہ علم سکھائیں جو اللہ نے آپ ﷺ کو سکھایا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم فلاں دن میں فلاں جگہ جمع ہو جاؤ یعنی مسجد میں یا گھر میں اور فلانی جگہ میں یا مکان کے آگے کی جانب حضور ﷺ نے فرمایا پھر عورتیں جمع ہوئیں۔ پس آپ ﷺ نے ان کو سکھایا جو اللہ پاک نے آپ کو سکھایا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا جب کسی عورت کی اولاد میں سے تین لڑکے یا لڑکیاں فوت ہو جائیں تو اس کے لیے آگ سے پردہ ہوگا۔ پس ایک عورت نے ان میں سے کہا۔ اے اللہ کے رسول! اگر دو بچے ہوں تو......! یہ بات دو بار کہی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا دو بچے ہوں یا دو یا دو۔

تشریح: قولہ :ذهب الرجال بحديثك: یعنی وہ کامیاب ہو گئے اور نجات پا گئے اور ہم اس سے محروم ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: کہ انہوں نے کہ مرد بہت سارا حصہ لے گئے ہیں آپ کی نصیحت کا۔

قولہ فاجعل لنا من نفسك : فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ یعنی آپ کی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے اور آپ کے کلمات کی برکات کی خاطر۔ اگر روایت فاء کے فتحہ کے ساتھ ہوتی تو یہ وجہ بن سکتی تھی اور مقصود پر تنبیہ بھی ہوتی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے بھی ایک دن مقرر فرمائیں تاکہ ہم بھی آپ کی احادیث سنیں اور آپ کی اچھی، نصیحت آمیز باتیں سن سکیں۔ قولہ (یومًا) یعنی وقت اپنے اوقات میں سے یا پھر ایک وقت ہفتہ میں سے یا ایک مہینہ میں سے یا سال میں سے یا پھر ایک دن لیکن اس سے کم نہیں۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں: یومًا کا مطلب ہے کہ اطلاق کیا ہے محل کے لیے حال پر و من نفسك حال ہے۔ من یومًا میں مِنْ ابتدائیہ ہے۔ یعنی ہمارے لیے اپنی ذات سے کچھ حصہ نکالیں کچھ دنوں سے۔

قولہ :ناتيك فيه تعلمنامما علمك الله : میں کہتا ہوں کہ اس کا تعلق ماقبل سے ہے یا مابعد سے ہے یا پھر دونوں میں تنازع ہے۔ میرک کہتے ہیں: یہ قول "ناتيك فيه" یعنی ہم دن کو نصیب پر محمول کریں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دن کا اندازہ لگانا ہے بعض دنوں میں لیکن ابن حجر نے اس کا دفاع کیا ہے کہ اس میں خدمت طلب کرنے کی بات ہے کیونکہ دن سے مراد وہ ہے جو گزر چکا ہو لیکن یہاں صرف زمانہ کی حقیقت مراد ہے۔

پھر میرک ؒ فرماتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا نصف علم ہے؟ اور اس کا دوسرا نصف کیا ہے؟ کہ جانا جائے کہ کوئی معنی نہیں ہے ظاہر کے مطابق اس قول کی وجہ سے "اجعل لنا یومًا من نفسك" تو اس کی کوئی نہ کوئی تاویل ضروری تھی تو میں اس کی تاویل ظاہر پر کرتا ہوں جیسا کہ اس کی تاویل دوسروں نے کی ہے جیسا کہ اُن کے لیے ظاہر

ہوا ہے۔

پھر فرمایا: صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے لیے ہفتہ میں ایک دن مقرر فرمائیں تا کہ ہم اُس میں آ کر آپ سے کچھ سنا کریں آپ کی احادیث میں سے۔ میں کہتا ہوں: کہ نفس کا استعمال عند کے معنی میں غیر معروف ہے۔ لغتاً اور اصطلاحاً تو یہ صحیح نہیں ہے ہاں البتہ حاصل معنی ہے لیکن پھر بھی کچھ تو مراعات ہونی چاہیں۔ اسی لیے امام کرمانی فرماتے ہیں:

جیسے میرک نے نقل فرمایا ہے۔ جعل صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوسکتا ہے۔ فعل کے معنی میں اور صَیَّرَ کے معنی میں دو مفعولوں کی طرف۔ لیکن یہاں مراد لازم ہے اور یہ متعین ہے اور یوماً مفعول بہ ہے مفعول فیہ نہیں ہے اور ''مِنْ نَفسكَ'' میں مِنْ ابتدائیہ ہے اور با جعل کے متعلق ہے۔ یعنی ''هذا الجعل منشوۃ اختيارك يا رسول الله'' ہمارے اختیار میں نہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''من وقت نفسك'' سے مراد ہو پوشیدہ وقت اور ظرف یہاں یوماً کی صفت ہے اور یہ ظرف مستقر ہے اس احتمال پر۔

اسکی بعض میں سے یہ بھی ہے کہ ہمارے لیے عورتوں کی جماعت کے لیے اپنی ذات کے لیے مخصوص وقت میں سے کچھ وقت خاص کریں۔ کیونکہ جیسا کہ ترمذی نے شمائل میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے اپنے اوقات کار کو تقسیم کیا ہوا تھا ایک جزء اللہ تعالیٰ کے لیے اور ایک جزء اپنے اہل کے لیے اور ایک جزء اپنی ذات کے لیے اور ایک جزء لوگوں کے لیے یہ معنی سب سے زیادہ واضح ہیں۔ واللہ اعلم

اجتمعن: میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

في يوم كذا و كذا: پہلا ''كذا'' دن سے اور دوسرا ''كذا'' وقت سے کنایہ ہے یا اس کے برعکس ہے۔

في مكان كذا و كذا: پہلا ''كذا'' جگہ سے کنایہ ہے یعنی مسجد یا گھر سے کنایہ ہے اور دوسرا ''كذا'' اس جگہ کے وصف سے کنایہ ہے کہ فلاں جگہ کے پیچھے یا اس کے آگے۔

فاجتمعن: میم کے فتحہ کے ساتھ۔

شاید اُن کا رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا عذر تھا تو آپ نے وقت اور مکان کی تعیین کردی تو وہ آپ کے پاس آتی تھی۔ تو اب علماء کے اس قول کا کوئی منافی نہیں ہے کہ کے لیے خود آنا چاہیے نہ کہ وہ آپ کے پاس آئے۔ یا پھر مکان اور زمانہ کی تعیین اس لیے کردی تا کہ وہ علم حاصل کرسکیں۔

دو فتحوں کے ساتھ ہے۔ پہلے کے ضمہ اور دوسرے کے ساکن ہے یعنی اُس کی اولاد میں سے بیٹوں اور بیٹیوں میں سے۔

ثلاثه الاكان: (ضمیر عائد ہے ان کے تقدم اور موت کی طرف) یعنی اُن کا آگے بڑھنا اور اُن کی موت۔ اور ابن حجر کا قول کہ مگر جن کا بچہ ہو۔ تو یہ تین کے معنی میں ہے یہ غیر ظاہر ہے اور غیر معنی ہے۔

يا رسول الله اَوْ اثنين: یہ عطف تلقینی ہے۔

قوله: اعادتها: یعنی اُس عورت نے اس کلمہ کو دہرایا۔

مرتين: یا پھر اُس نے کہا اے اللہ کے رسول۔ ''قل اثنين'' ہے یا ''قل واثنين'' ہے۔

قولہ (واثنین و اثنین و اثنین) تین مرتبہ فرمانا کید کے لیے اور واؤ معنی میں اَوْ کے لیے ہے۔اور شاید رسول اللہ ﷺ کا توقف کرنا وحی کا انتظار کرنا تھا یا الہام یا ادلہ احکام کی طرف نظر کرنا تھا۔

ناتمام بچے کی پیدائش کی وجہ سے بھی ماں باپ کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا

۱۷۵۴:وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمَيْنَ يَتَوَفّٰى لَهُمَا ثَلَاثَةٌ اِلَّا اَدْخَلَهُمَا اللّٰهُ الْجَنَّةَ بِفَضْلِ رَحْمَتِهٖ اِيَّاهُمَا فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوِ اثْنَانِ قَالَ اَوِ اثْنَانِ قَالُوْا اَوْ وَاحِدٌ قَالَ اَوْوَاحِدٌ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ السِّقْطَ لَيَجُرُّ اُمَّهٗ بِسَرَرِهٖ اِلَى الْجَنَّةِ اِذَا احْتَسَبَتْهُ۔

(رواہ احمد وروی ابن ماجۃ من قولہ والذی نفسی بیدہ)

اخرجہ ابن ماجہ ۵۱۲/۱ حدیث رقم ۱۶۰۵۔ واحمد فی المسند ۲۴۱/۵۔

ترجمہ :حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب دو مسلمانوں یعنی ماں اور باپ کے تین فرزند یعنی تین بیٹے فوت ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی رحمت کے ساتھ بہشت میں داخل کرے گا۔ پس صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ فرمائیے۔ یا دو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں دو اور عرض کیا یا ایک آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایک بھی پھر آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تحقیق کچا حمل یعنی ناتمام بچہ گرتا ہے۔البتہ وہ اپنی ماں کو بہشت کی طرف انول نال کے ذریعے کھینچے گا۔جب کہ وہ اس کی ماں اس کے مرنے کو اپنے حق میں ثواب سمجھے۔اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے جو روایت کیا ہے وہ: قولہ والذی نفس بیدہ ہے۔

تشریح: ما من مسلمین ......بفضل رحمۃ ایاھما......۔

یہ اولاد کے سبب بننے کے منافی نہیں ہے۔طیبی نے فرمایا: أیاھما تاکید ہے ضمیر منصوب کے لیے أدخلھما میں ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ مفعول مصدر کے لیے ہے۔

اَوْ اثنان :عطف التماس ہے۔

قولہ :فقالوا یا رسول اللہ ...... أو احد: شاید تین کے ساتھ مقید کرنے میں حکمت یہ تھی پہلی چیز کہ یہ مکمل احوال ہے اور امید ہے ناقص کے پورا کرنے میں کامل کے ساتھ سوال کو پورا کرنے میں۔

قولہ :ثم قال: تتمہ اور مبالغہ کے لیے اولاد کے ثواب میں قسم کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے۔

والذی نفسی بیدہ :یعنی میری روح یا میری زندگی تمام تصرفات ارادہ کے ساتھ اور قبض قدرت کے ساتھ۔

السقط: کسرہ کے ساتھ ہے۔یہ نام تمام بچہ کو کہتے ہیں۔

بسرر: دو فتحوں کے ساتھ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اور یہ سین میں ایک لغت ہے۔اور یہ ناف کے ساتھ جو چیز جڑی ہوتی ہے اُسے کہتے ہیں جو قاموس میں لکھا ہے اُس کے مطابق اور النہایہ میں ہے کہ ''جو اُسے کاٹ دینے کے بعد ہوتا ہے۔'' پہلی بات زیادہ واضح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ میت کے تمام اجزاء کو دوبارہ واپس لائے گا جیسے ناخن سے تراشہ ہوا اور کاٹے ہوئے بال

اور.......... دیگر دوسری چیزیں۔

اس (آخری جملہ) میں اشارہ ہے کہ جس بچہ کا دل بھی نہیں ہے۔ اُس کا اتنا ثواب ہے تو جس کا دل ہے تو اُس بچے کا کتنا عظیم ثواب ہوگا۔ جو اُس کے نفس کو بہت عزیز ہونے لگا تھا۔ اور جو ابن حجر کی تفسیر ہے کہ السرر وہ آنت ہے جو ناف سے جڑی ہوتی ہے ماں کے پیٹ سے اور یہ بات بہت عجیب ہے اور علت کے مخالف ہے۔

قولہ : یعنی پہلی حدیث سے

چھوٹے فوت شدہ بچے اپنے والدین کے لیے آگ سے نجات کا ذریعہ ہونگے

۱۷۵۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَدَّمَ ثَلَاثَةً مِّنَ الْوَلَدِ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ كَانُوْا لَهٗ حِصْنًا حَصِيْنًا مِنَ النَّارِ فَقَالَ اَبُوْذَرٍّ قَدَّمْتُ اثْنَيْنِ قَالَ وَاثْنَيْنِ قَالَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ اَبُو الْمُنْذِرِ سَيِّدُ الْقُرَّاءِ قَدَّمْتُ وَاحِدًا قَالَ وَوَاحِدًا۔

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۵/۳ حديث رقم ۱۰۶۱۔ وابن ماجه ۵۱۲/۱ حديث رقم ۱۶۰۶۔ واحمد فی المسند ۳۷۵/۱۔

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے تین بچے اپنی اولاد میں سے آگے بھیجے ہوں (یعنی وہ حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں اور اس کے مرنے سے پہلے مر گئے ہوں) اس کے لیے دوزخ کی آگ سے مضبوط پناہ ہونگے۔ پس ابوذرؓ نے فرمایا میں نے دو آگے بھیجے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دو کے لیے بھی یہی بشارت ہے۔ ابی بن کعبؓ جن کی کنیت ابوالمنذر ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بھیجا ہے یہ قاریوں کے سردار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک کے لیے بھی یہی حکم ہے (یعنی ایک بھی آگ سے پناہ ہوگا)۔ اس کو امام ترمذیؒ ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح : **قولہ : من قدم ثلاثة من الولد** : ابن حجر فرماتے ہیں: یعنی جس نے اپنے آگے تین بچے بھیجے۔ اور تقدیم کی نسبت مجازی طور پر ہے کیونکہ یہ اُس کا سبب بھی ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ باپ اور ماں دونوں اُس کے وجود کے لیے سبب ہیں نہ کہ اُسے موت کے ساتھ آگے بھیجنا کا۔ تو ظاہر یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے تین بچوں کو آگے بھیج کر صبر کیا اور اُن کا ثواب طلب کیا' رب سے۔ یا پھر تقدیم سے وارد لازم ہے یعنی مؤخر ہونا۔ یعنی جو انہی تین بچوں سے موت میں مؤخر ہوا۔

لم يبلغوا الحنث : یعنی گناہوں کو یا بلوغت کو۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ قید کمال کے لیے ہے۔ کیونکہ غالب بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے بارے میں دل نرم ہوتا ہے اور ان کے بارے میں صبر کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی شفاعت کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے اور زیادہ سبقت لے جانے والی ہے۔

کانوا له حصناً حصيناً : یعنی ایسی رکاوٹ جو محکم اور مانع اور حاجز ہو۔

فقال أبو ذر قدمت اثنين : یعنی اُن کا کیا حکم ہے؟

قال واثنين : یعنی ہاں جس نے دو بھی بھیجے ہوں وہ بھی۔ ابن حجر نے بہت زیادہ طوالت سے کام لیا ہے تقدیر میں جہاں فرماتے ہیں کہ ابوذر نے کہا کہ یارسول کیا جس نے دو بچے بھیجے اُسے بھی یہ بشارت حاصل ہوگئی۔ میں نے بھی دو بھیجے ہیں۔ فرمایاں ہاں تجھے بھی یہ حاصل اگرچہ تو نے بھی دو بھیجے ہیں۔ یہ عموم اور خصوص کے لحاظ سے سوال جواب کے مطابق نہیں ہے۔

قال أبي بن كعب ابو المنذر : یہ بدل ہے یا عطف بیان ہے یا خبر ہے مبتداء محذوف کے لیے۔

سيد القراء : رسول اللہ ﷺ کی گواہی کی وجہ سے جب آپ نے فرمایا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ پڑھنے والا اُبی ہے۔

۱۷۵۶: وَعَنْ قُرَّةَ الْمُزَنِيِّ اَنَّ رَجُلاً كَانَ يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهُ ابْنٌ لَهُ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُحِبُّهُ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَبَّكَ اللّٰهُ كَمَا اُحِبُّهُ فَفَقَدَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا فَعَلَ ابْنُ فُلَانٍ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تُحِبُّ اَنْ لَّا تَاْتِيَ بَابًا مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ اِلَّا وَجَدْتَّهُ يَنْتَظِرُكَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُ خَاصَّةً اَمْ لِكُلِّنَا قَالَ بَلْ لِكُلِّكُمْ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد في المسند ۳۵/۵۔

ترجمہ : ''اور حضرت قرہ مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص تھا جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا کرتا تھا اور اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ''کیا تم اسے عزیز رکھتے ہو؟'' اس نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ سے ایسی محبت کرے جیسا کہ میں اپنے اس بچہ سے کرتا ہوں۔'' کچھ عرصہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے اس بچہ کو نہیں پایا تو پوچھا کہ ''فلاں شخص کے بیٹے کو کیا ہوا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! اس کا لڑکا مر گیا۔'' اس کے بعد جب وہ شخص حاضر ہوا تو اس سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ کل قیامت کے روز تم جنت کے جس دروازے پر بھی جاؤ وہاں اپنے بچے کو اپنا منتظر پاؤ ایک شخص نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! یہ بشارت بطور خاص اسی شخص کے لئے ہے یا سب کے لئے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا سب کے لئے۔'' (احمد)

تشریح : أتحبه : بہت زیادہ محبت کہ یہ تیرے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔

قوله (فقال يا رسول الله أحبك الله كما أحبه) اس میں مبالغہ کرنے میں حد درجہ غایت ہے اپنے بچے سے محبت کرنے میں جہاں انہوں نے اس کو اللہ سے محبت کے مشابہ قرار دیا اور صیغہ دعا کے ساتھ ذکر کیا۔

مافعل : صیغہ فاعل کے ساتھ ہے۔

وہ تیرے انتظار میں ہوگا تا کہ تیری سفارش کرے اور تجھے اپنے ساتھ جنت میں داخل کرے۔ اور اس میں فرق عادہ کا اشارہ ہے کہ ایک جسم متعدد جسموں میں ہوگا کہ جنت کے ہر دروازے پر موجود ہوگا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: انتظار کا مطلب ہے کہ دروازے کھولنے کے لیے اور خوش آمدید کہنے کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ﴾

[ص:۵۰] ''ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوں گے'' انتظار کو کھولنے کے لیے مبالغہ کے طور پر لایا گیا ہے۔ اب معاملہ مخفی نہیں رہتا۔

قال : اور ایک نسخہ میں ہے۔ فقال ۔

۱۷۵۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ السِّقْطَ لَيُرَاغِمُ رَبَّهُ اِذَا اَدْخَلَ اَبَوَيْهِ النَّارَ فَيُقَالُ اَيُّهَا السِّقْطُ الْمُرَاغِمُ رَبَّهُ اَدْخِلْ اَبَوَيْكَ الْجَنَّةَ فَيَجُرُّ هُمَا بِسَرَرِهٖ حَتّٰى يُدْخِلَهُمَا الْجَنَّةَ۔

(رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱/ ۵۰۹ حديث رقم ۱۵۹۷۔

ترجمہ : ''اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جب اللہ تعالیٰ'' سقط کے والدین کو دوزخ میں داخل کرے گا تو وہ اپنے پروردگار سے جھگڑے گا چنانچہ اس سے کہا جائے گا کہ'' پروردگار سے جھگڑنے والے اے ناتمام بچے اپنے والدین کو جنت میں لے جاؤ۔'' لہٰذا وہ ناتمام بچہ اپنے والدین کو اپنی آنول نال کے ذریعہ کھینچے گا' یہاں تک کہ انہیں جنت میں لے جا کر ہی چھوڑے گا۔'' (ابن ماجہ)

تشریح: السقط : کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ بچہ جو چھ مہینے سے پہلے گر گیا ہو۔

ليراغم : یعنی جھگڑا اور مباحثہ کرے گا۔ قوله (ربه) طیبی فرماتے ہیں: یہ اُس خیال پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان الله تعالٰى خلق الخلق حتى إذا فرغ منهم قامت الرحم فأخذت بحقو الرحمن، فقال مه: فقالت هذا المقام العائذبك من القطيعة: قال: نعم أما ترضين أن أصل من وصلك وأقطع من قطعك؟ فقالت بلى الحديث ...... اھ۔'' کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا تو جب تخلیق سے فارغ ہو گئے تو رحم رشتہ داری اور کھڑی ہوئی اور رحمن کے حقوہ کو پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے پوچھا ایسا کیوں کر رہی ہو اُس نے کہا کہ یہ مقام ہے کہ قطع رحمی سے میں تیری پناہ چاہتی ہوں۔ تو فرمایا: ہاں کیا تو اس بات پر راضی نہ ہے کہ میں بھی اُس پر راضی ہوں جو صلہ رحمی کرے اور میں قطع رحمی کروں اس کے ساتھ جو قطعہ رحمی کرے۔ تو رشتہ داری کہنے لگی، کیوں نہیں ......۔'' (الحدیث)

اور اس میں ہے کہ تخیل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس امکان کے ساتھ اس حدیث کو تحقیق پر حمل کیا جائے بلا مانع اور صارف کے دلیل عقلی سے یا دلیل نقلی سے۔ اور جو رحم کی حدیث ہے وہ احادیث صفات میں سے ہے اور رحم بھی ایک معنی ہے معانی میں سے یا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی تصرف نہ کیا جائے جیسا کہ سلف کا طریقہ ہے یا پھر اس کی تاویل کی جائے خلف کے برخلاف اس بات کی تحقیق کے باوجود کہ معانی بھی علم اللہ میں حقائق ثابتہ ہیں اور اللہ ان کی صورتیں اور اجسام بنائے گا اور انہیں بولنے والے اور سوال کرنے والے اور جواب دینے والے اور اس قسم کی دوسری مثالیں ہیں۔

اذا أدخل : یعنی جب داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ اور جو ابن حجر کا قول ہے یا اس کے ظاہر پر۔ اس قول ''آلاتی أدكل أبويك'' کے مناسب نہیں۔

أدخل أبويك : یعنی اپنے والدین کے دخول جنت کا سبب بنے گا۔

صدمے کے ابتداء میں صبر کرنا دخول جنت کا باعث ہے

۱۷۵۸: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ۔ (رواہ ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۵۱۳/۱ حدیث رقم ۱۶۰۸۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے آدم کے بیٹے! اگر تو مصیبت پر صبر کرلے اور پہلے صدمہ کے وقت ثواب طلب کرے تو میں تیرے لیے جنت کے علاوہ کسی ثواب پر راضی نہیں ہوتا۔ (یعنی میں اس کے بدلے بہشت میں داخل کروں گا)۔ اس کو ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ابن آدم: حرف نداء محذوف کے نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں یا ابن آدم ہے۔

ابن حجر نے اس چیز کو بہت غریب جانا ہے جہاں وہ فرماتے ہیں کہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ عطف تفسیری ہے کیونکہ یہ صبر محمود پر لازم ہوتا ہے ثواب طلب کرتے ہوئے اور ابن حجر کا اس پر تعجب کرنا کسی اہل عقل کے لیے نئی چیز نہیں ہے۔

قولہ (عند الصدمة) یعنی حملہ کے وقت۔

مصیبت کا وقت یاد آنے پر کلمہ استرجاع پر ملنے والا ثواب

۱۷۵۹: وَعَنِ الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ وَلَا مُسْلِمَةٍ یُصَابُ بِمُصِیْبَةٍ فَیَذْكُرُهَا وَاِنْ طَالَ عَهْدُهَا فَیُحْدِثُ لِذَالِكَ اِسْتِرْجَاعًا اِلَّا جَدَّدَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی لَهٗ عِنْدَ ذٰلِكَ فَاَعْطَاهُ مِثْلَ اَجْرِهَا یَوْمَ اُصِیْبَ بِهَا۔ (رواہ احمد والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه احمد فی المسند ۲۰۱/۱۔

ترجمہ: حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ کوئی مسلمان مرد اور کوئی مسلمان عورت ایسی نہیں کہ اس کو مصیبت پہنچے اگرچہ مصیبت کا وقت طویل ہو چکا ہو پھر وہ مصیبت کو یاد کر کے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہی ثواب عطا کر دیتا ہے جتنا ثواب مصیبت کے وقت دیا گیا تھا۔ اس کو امام احمدؒ اور بیہقی نے شعب ایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: وان: یہ وصلیہ ہے۔ اگرچہ کے معنی میں۔

قولہ (فیحدث) دوبارہ تازہ کرتا ہے۔

لذلك ۔ ای لاجل ذلك الابتلاء: یعنی اس مصیبت کی وجہ سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام توقیت کے لیے ہے۔

عند ذلك: یعنی ہر دفعہ استرجاع کرنے کا نیا ثواب دے گا۔

ادنیٰ مصیبت و پریشانی کے وقت بھی کلمہ استرجاع کی تلقین

۱۷۶۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ اَحَدِكُمْ فَلْيَسْتَرْجِعْ فَاِنَّهٗ مِنَ الْمَصَائِبِ۔

رواهما البيهقي في شعب الايمان

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کسی ایک کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو چاہیے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھے۔ اس لیے کہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ہے۔

تشریح: **شسع**: شین کے کسرہ کے ساتھ۔ اور سین کے سکون کے ساتھ۔ جوئے کا ''سیور'' وہ ہوتا ہے جو دو انگلیوں کے درمیان میں ہوتا ہے اور اُس کا ایک حصہ جوتے کے درمیان میں دو پٹیوں کے ساتھ باندھا ہوتا ہے۔ اور سیر کا پٹہ وہ ہوتا ہے۔ جس میں تسمہ ہوتا ہے۔

فليسترجع: یہ ندب سے اُمر ہے۔

قوله (من المصائب) یعنی تمام قسم کے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ: **انه صلى الله عليه وسلم استرجع حين انطفأ سراج له۔** آپ نے **انا لله وانا اليه راجعون** کہا جب آپ کا چراغ بجھ گیا۔ شاید تسمہ ٹوٹ جانے سے مراد مصیبت کا کم سے کم ہونا مراد ہے۔ اور ابن حجر کا قول ہے کہ تسمہ تنبیہ ہے اُس پر جو اس سے بڑی چیز ہے۔ یا پھر جو اس کے علاوہ دوسری مساوی چیزیں ہیں۔ سنت ہے **انا لله وانا اليه راجعون** کہنا تمام کاموں میں کیونکہ کسی چیز کا مساوی ہونا اُس کے علاوہ کو ثابت نہیں کرتا۔

اُمتِ محمد یہ کی فضیلت

۱۷۶۱: وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ سَمِعْتُ اَبَا الدَّرْدَاءِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ يَا عِيْسٰى اِنِّيْ بَاعِثٌ مِنْ بَعْدِكَ اُمَّةً اِذَا اَصَابَهُمْ مَا يُحِبُّوْنَ حَمِدُوا اللّٰهَ وَاِنْ اَصَابَهُمْ مَا يَكْرَهُوْنَ احْتَسَبُوْا وَصَبَرُوْا وَلَا حِلْمَ وَلَا عَقْلَ فَقَالَ يَارَبِّ كَيْفَ يَكُوْنُ هٰذَا لَهُمْ وَلَا حِلْمَ وَلَا عَقْلَ قَالَ اُعْطِيْهِمْ مِّنْ حِلْمِيْ وَعِلْمِيْ۔ (رواهما البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۹/ ۱۹۰ حديث رقم ۹۹۵۳۔

ترجمہ: اُمّ درداءؓ سے روایت ہے کہ میں نے ابو درداءؓ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا۔ میں تیرے پیچھے ایک امت کو پیدا کروں گا۔ جس وقت ان کو کوئی نعمت پہنچے گی وہ خدا کا شکر ادا کریں گے اور اگر ان کو کوئی برائی پہنچے گی یعنی کوئی مصیبت پہنچے گی تو وہ ثواب کی امید رکھیں گے اور صبر کریں گے اور اس حال میں کہ نہ بردباری ہوگی نہ عقل ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے اے میرے

ربّ ! کیسے ہوگا؟ جب کہ ان کے لیے حلم وعقل نہیں ہوگی۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا میں ان کو اپنے حلم میں سے دونگا اور اپنے علم میں سے دونگا۔ بیہقی نے یہ دونوں شعب الایمان میں روایت کی ہیں۔

تشریح: **انی باعث** : یعنی پیدا کرنے لگا ہوں یا ظاہر کرنے والا ہوں۔

قولہ (من بعدك أمة) یعنی ایک بہت بڑی جماعت یا کسی نبی کے لیے ایک امت اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے امت کے صلحاء تھے۔

ولا حلم ولا عقل : اور ابن قیم کے نزدیک وہ علم دونوں جگہوں میں لا عقل کا بدل ہے۔

قولہ : فقال : یعنی عیسیٰ علیہ السلام نے۔

قولہ (یا رب کیف یکون هذا) یعنی جو کچھ کمال بتایا ہے۔

ولا حلم ولا عقل : کیونکہ بردباری ہی ایسا مادہ ہوتی ہے جو انسان کو جلد بازی سے روکتی ہے۔ اور اسے سوچ وفکر پر آمادہ کرتی ہے۔ احکام اور فیصلہ جات میں یہاں تک کہ کھڑا ہوا جائے شکر کے مقام پر۔ انعام کا شکریہ ادا کرنا چاہئے اور انعام سے منہ گردانی نہیں کرنی چاہیے اور چاہیئے آزمائش پر صبر کیا جائے اور مصیبت کے وقت جزع وفزع نہ کیا جائے اور عقل چونکہ آدمی کو ایسے کاموں سے روکتی ہے جو لائق نہیں ہوتے تو یہ کفر سے مانع ہوتی ہے اور حمد اپنے محسن مالک کے لیے اس پر اُبھارتی ہے اور اسی کے ساتھ انسان پہچانتا ہے کہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور خیر وبھلائی بھی اُسی میں ہے جسے اللہ پسند کرے تو اس کے فیصلوں اور تقدیر پر صبر کرتا ہے۔ لیکن جب ان کے پاس عقل ہی نہ ہو تو یہ معاملہ اُن کا بہت عجیب ہے اور حال بھی اُن کا عجیب ہے۔

قولہ : قال أعطیهم من حلمی و علمی : یعنی دونوں چیزیں آزمائش کے وقت عطا کروں گا۔ تاکہ وہ آزمائش پر شکر ادا کرسکیں اور تنگی میں صبر کرسکیں مکمل طور پر اور مکمل نمونہ ہوں جمال اور جلال کا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: **لا حلم ولا عقل** کہا گیا ہے کہ یہ **احتسبوا واصبروا** کے لیے تاکید کا مفہوم ہے۔ کیونکہ احتساب کو تو چاہیے کہ حمل کیا جائے عمل اور اخلاص پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر نہ کہ حلم اور عقل پر۔ اور اُس وقت یہ سوال متوجہ ہوتا ہے کہ کیسے صبر کیا جائے اور کیسے احتساب کیا جائے جس کے پاس نہ حلم ہو نہ عقل ہو تو اُسے جواب دیا جائے گا کہ اگر اُس کے حکم اور عقل دونوں فنا ہو جائیں تو وہ اللہ کے حلم وعقل سے حلم وعقل لے گا اور علم کو عقل کی جگہ دینے کے بعد یہ اشارہ ہے کہ عقل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز نہیں ہے مخلوقین کی صفات میں سے وہ اس سے بہت بلند وبالا ہے۔ یہ علم قبول کرنے کے لیے ایک قوت ہے۔ یا پھر ایسا ملکہ ہے جو اس کے صاحب کو اخلاق حسنہ پر آمادہ کرتا ہے اور گھٹیا حرکات واحوال سے منع کرتا ہے اور علماء میں اس کی ماہیت اور تعارف میں کچھ عبارتیں ہیں جن کا اختصار یہ ہے کہ یہ یا تو صفت ہے یا پھر قوت ہے جس کے ساتھ ضروریات کا ادراک کیا جاسکتا ہے یا پھر آلات سے بچنے کے لیے نظریات ہیں۔

بَابُ زِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ

یہ باب قبروں کی زیارت کرنے کے بیان میں ہے۔اس کے عنوان کے تحت وہ احادیث مبارکہ لائی جائیں گی جن کے اندر قبروں پر جانے کے فضائل اوران کے آداب اور مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔

الفصل الاوّل:

ابتدائے اسلام میں تین چیزوں کی ممانعت کرنے اور پھر رخصت دینے کا بیان

۱۷۶۲: عَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْھَا وَنَھَیْتُکُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْاَضَاحِیِّ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَاَمْسِکُوْا مَابَدَا لَکُمْ وَنَھَیْتُکُمْ عَنِ النَّبِیْذِ اِلَّا فِیْ سِقَاءٍ فَاشْرَبُوْا فِی الْاَسْقِیَۃِ کُلِّھَا وَلَا تَشْرَبُوْا مُسْکِرًا۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۶۷۲/۲ حدیث رقم (۱۰۶۔ ۹۷۷)۔ واخرجه ابوداوٗد فی السنن ۹۸/۴ حدیث رقم ۳۶۹۸۔ والنسائی فی السنن ۸۹/۴ حدیث رقم ۲۰۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۴۵/۱۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم کو قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا۔ پس ان کی زیارت کرواور میں نے تم کو منع کیا تھا تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے۔اب رکھو جب تک تم چاہو۔میں نے تم کو مشک کے علاوہ دیگر برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا اور اب تم تمام برتنوں میں پیو لیکن نشہ آور چیز نہ ہو۔اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ابن حصیب الاسلمی غزوہ بدر سے قبل اسلام لائے لیکن بیعت رضوان میں نہ تھے۔اور مرو میں فوت ہوئے۔ ... بدن کے ساتھ مہم شریک تھے۔طیبیؒ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

قولہ (قال قال رسول اللہ ﷺ نھیتکم) یعنی اس سے قبل اور اصل میں ابن حجر کے پاس ہے:"کنت نھتکم" یہ اصل مشکوٰۃ میں نہیں ہے بلکہ یہ مسلم کی کچھ روایات میں ہے۔جیسا کہ ہم اسے ذکر کر رہے ہیں۔

قولہ (عن زیارۃ القبور فزورھا) یہ امر رخصت یا استحباب کے لیے ہے جمہور اسی بات کے قائل ہیں۔بلکہ کچھ لوگوں نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔اور ابن عبدالبر نے حکایت کیا ہے کہ بعض نے اس کے وجوب کا دعویٰ کیا ہے۔وہ اپنی شرح میں فرماتے ہیں: کہ قبروں کی زیارت کا حکم صرف مردوں کے لیے خاص ہے عام اہل علم کے نزدیک اور جو عورتیں ہیں تو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: انہ ﷺ لعن زوّرات القبور۔کہ آپ نے اُن عورتوں پر لعنت فرمائی تھی جو قبروں کی زیارت کرتی ہیں۔بعض اہل علم کی رائے ہے کہ یہ رخصت سے قبل ہے جب رخصت ملی تو پھر رخصت بھی عورتوں کے لیے عام ہوگئی۔ میں (ملاعلی قاریؒ) کہتا ہوں یہ بحث تاریخ پر موقوف ہے وگرنہ یہ خطاب منع کرنے کا مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی

عام ہے۔ اغلب طور پر۔ اور زیارت کرنے کے حکم میں بھی ایسا ہی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ کہا گیا ہے کہ اور لعنت رخصت سے قبل اور احتمال پر مبنی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیارت عورتوں کے لیے مکروہ ہے ان کی قلت صبر اور جزع کی وجہ سے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: اور جو جنازہ کی پیروی کرنا ہے اس میں بھی عورتوں کے لیے اجازت نہیں ہے۔ میرکؒ فرماتے ہیں: یہ وہ احادیث ہیں جن میں ناسخ اور منسوخ جمع ہیں۔ اور یہ احادیث واضح صراحت کے ساتھ ہیں مردوں کی زیارت کرنے کے بارے میں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اور ان لوگوں کا اجماع ہے کہ قبروں کی زیارت سنت ہے اور کیا عورتوں کے لیے یہ مکروہ ہے اس میں دو قول ہیں۔ اکثر نے تو مکروہ جانا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے جب فتنے کا خدشہ نہ ہو اور زیارت کرنے والوں کے لیے لائق ہے کہ وہ قبر کے اتنے قریب ہوں۔ جتنے وہ زندگی میں اُس کے قریب ہوتے تھے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء محذوف کے متعلق ہے یعنی میں تمہیں زیارت قبور سے منع کرتا تھا۔ کیونکہ یہ جاہلیت کے کاموں سے تھا موت کی کثرت کی وجہ سے مباحات اور اب اسلام کا دور دورہ ہو گیا ہے اور شرک کی بنیادیں مٹ چکے ہیں تو اب زیارت کر لو کیونکہ یہ دل کو نرم کرتی ہے اور موت اور آزمائش کو یاد دلاتی ہے اور اس کے علاوہ بھی یاد دلاتی ہے۔ اسی طریقہ پر فاء کو اور فاشر بوھا کی فاء میں ہیں۔ اور جو چیز اس کی تائید کرتی ہیں وہ یہ حدیث ہے "**كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد في الدنيا وتذكر آخرة**"۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ابن مسعودؓ سے۔

اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے:

كنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها فإنها ترق القلوب۔ و تدمع العين، وتذكر الآخرة، ولا تقولوا هجرا۔

اور اسی کے یہ الفاظ ہیں **نهيتكم عن زيادة القبور فزوروها فانها تذكر كم الموت۔**

اور طبرانی، ام سلمہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

نهيتكم عن زياره القبور فزوروها فان لكم فيها عبرة۔

یہ تمام احادیث اپنی تعلیلات کے ساتھ ساتھ اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قبروں کی زیارت کے مسئلہ میں عورتیں مردوں کی مثال ہیں جبکہ وہ اپنے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے شروط معتبرہ کے ساتھ زیارت کریں۔ اور اس کی تائید گزشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اسے صبر کا حکم دیا اس کو زیارت قبور سے منع نہیں کیا۔

اور رہی یہ حدیث کہ **لعن الله زوّوارات القبور** تو یہ ان کی نحرم کے لیے زیارت پر محمول ہوگی۔ نوحہ وغیرہ کی طرح اور اس جیسی دیگر بدعات۔ اور آپ کے اس قول "**فانها تدمع العين**" میں جو کہ مذکور بالا حدیث میں ہے دلیل موجود ہے۔

نهيتكم: یعنی شروع شروع میں

عن لحوم الأضاحيي: ی کی تشدید اور تخفیف دونوں طرح۔ یعنی اس کو ذخیرہ کرنے اور روکنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ ممانعت فقراء کی وجہ سے تھی کیونکہ اس وقت دیہات میں قحط پڑ گیا تھا اور دیہاتی شہر میں آ گئے تھے۔

فوق ثلاث : یعنی راتیں ابن حجر فرماتے ہیں۔ یعنی دن مراد ہیں شاید کہ ان کو وہم ہو گیا کہ روایت تاء کے ساتھ ہے۔ حالانکہ اس طرح نہیں ہے۔

فامسکوا : یعنی مطلق طور پر روک لو یعنی ان کے گوشتوں کو اور یہ حکم رخصت کے لیے ہے اور یہ حدیث کے اطلاق سے بھی ظاہر ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ کہ ثلث / تیسرا حصہ فقراً کو اور اس کا تیسرا حصہ اغنیاء کو ہدیہ کرنے کے بعد باقی ماندہ گوشت استحباب کے طور پر روک سکتے ہو۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ قربانیوں کا باقی ماندہ گوشت جس کو صدقہ کرنا واجب ہے اس کے علاوہ جو ان (قربانیوں) کا گوشت بچ جائے اور وہ اس کا اندازہ ہے اور مقدار ہے اس میں صدقہ واجب ہو جاتا ہے اور یہ عام ضرورت ہوتی ہے اور یہ قول کسی خارجی دلیل کا محتاج ہے۔

بدا : الف کے ساتھ یعنی ظھر قولہ (لکم) یعنی گوشت وغیرہ ذخیرہ رکھنے کی مدت۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ علیہ السلام نے ان کو قربانیوں کا باقی ماندہ گوشت تین راتوں سے اوپر زیادہ کھانے سے منع کیا ہے اور ان پر صدقہ کرنا واجب و ضروری قرار دیا اور ان کو روک رکھنے میں رخصت بھی دی ہے جتنا چاہیں رکھ لیں۔

قولہ : ونھیتکم عن النبیذ...... : یعنی کھجور اور انگور اور دیگر میٹھی چیز کو پانی میں ڈالنا۔

سقا : یعنی مشکیزہ پر ایک باریک / رکز موری جلد ہوتی ہے جو پانی کو گرم نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ پانی کو گرم کر دیتا ہے / ردیتی ہے تو نبیذ / نشہ بن جاتا ہے تو ان کو نبیذ کے مشروب میں رخصت دے دی ہر قسم کے برتن سے جب تک کہ وہ نشہ آور نہ ہو تو فرمایا: قولا (فاشربوا فی الاسقیۃ) یعنی برتن و مشکیزے وغیرہ قولہ سقاء کی جو تعریف کی گئی ہے اس سے اس میں تغلیب / اغلبیت ہے

قولہ: ولا تشربوا مسکرا : طیبیؒ فرماتے ہیں اور یہ اس طرح ہے کہ سقاء پانی کو ٹھنڈا کرتا ہے گرمی سے اُسے وہ گرمی نہیں دیتا جو عام برتنوں میں ہوتی ہے۔ تو وہ عمدہ مشروب ہو جاتا ہے اور حاصل کلام یہ ہے کہ۔ ممانعت نشہ آور چیز کے بارے ہے نہ کہ بعینہ برتنوں کے بارے میں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگنا

۱۷۶۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ زَارَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَبْرَ اُمِّهٖ فَبَكٰى وَاَبْكٰى مَنْ حَوْلَهٗ فَقَالَ اسْتَاْذَنْتُ رَبِّیْ فِیْ اَنْ اَسْتَغْفِرَ لَهَا فَلَمْ یُؤْذَنْ لِیْ وَاسْتَاْذَنْتُهٗ فِیْ اَنْ اَزُوْرَ قَبْرَهَا فَاُذِنَ لِیْ فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ٦٧١/٢ حدیث رقم (١٠٨ـ ٩٧٦)۔ وابوداوٗد فی السنن ٥٥٧/٣ حدیث رقم ٣٢٣٤۔ والنسائی ٩٠/٤ حدیث رقم ٢٠٣٤۔ وابن ماجه ٥٠١/١ حدیث رقم ١٥٧٢۔ واحمد فی المسند ٤٤١/٢۔

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اور خود بھی روئے اور ان لوگوں کو بھی رلایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد تھے پھر فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے اجازت مانگی تھی۔ کہ میں اس کے لئے

بخشش کی دعا کروں۔ پس مجھے اجازت نہ دی گئی اور میں نے پروانگی (اجازت) مانگی تھی کہ اس کی قبر کی زیارت کروں تو مجھے اجازت دے دی گئی۔ پس قبروں کی زیارت کرو کیونکہ قبروں کی زیارت کرنا موت کو یاد دلاتا ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: زار النبی ﷺ قبر امه : یعنی مقام ابواء میں جو کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔

فبکی : یہ رونا ان کی جدائی وجہ سے تھا' یا ان کے عذاب کی وجہ سے یا اس مقام پر اپنی والدہ کی موت پر کی یاد۔ ابن ملک فرماتے ہیں: کہ یہ حدیث قبروں پر حاضری کے وقت رونے کے جواز پر دلیل ہے۔

کہا گیا ہے کہ آپؐ کی کا والدہ کی زیارت کرنے سے باوجود اس کے کہ وہ کافرہ تھیں ماں کے حقوق کی تعلیم مقصود تھی کہ والدین اور اقارب کے حقوق کا خیال رکھا جائے کہ ان کے کفر پر ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق سے غفلت نہ برتی جائے۔

قوله :فقال :استأذنت ربی فی أن استغفر لها فلم یؤذن لی:

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کیونکہ وہ کافرہ تھیں اور کفار کے لیے استغفار کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ ان کو کبھی بھی نہیں بخشے گا۔

قوله (واستأذنته فی أن أزور قبرها فأذن لی) مجہول کا صیغہ ہے آپ کے قول "فلم یوذن لی" کا خیال رکھتے ہوئے۔ اس کو فاعل کے صیغے کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ یعنی فعل معروف۔

ابن الجوزی نے کتاب الوفاء میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے والد کی وفات کے بعد اپنی ماں آمنہ کے ساتھ رہتے تھے جب چھ سال کی عمر کو پہنچے تو آمنہ ان کو لے کر اپنے ماموں بنی عدی بن نجار کے پاس مدینہ گئیں کہ ان کی ملاقات کریں اور ان میں سے ابوایوب بھی تھے پھر آپؐ کو لیکر واپس مکہ پلٹیں۔ جب ابواء کے مقام پر قافلہ پہنچا تو آمنہ فوت ہوگئیں اور وہیں ان کی قبر ہے اور ایک روایت میں ہے جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کے لیے ابواء پہنچے پھر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: إنی استأذ نت وبی فی زیارة قبرا می، فأذن لی واستأذنته، جااستغفار لها فلم یوذن ونزل ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ [التوبة:۱۱۳] "پیغمبر اور مسلمانوں کو شایاں نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہوگیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں۔ تو ان کے لئے بخشش مانگیں گو وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔"

اور ابن حجر نے تو نہایت ہی عجیب بات کی انہوں نے کہا کہ آپ کی والدہ کے بارے میں استغفار کی عدم اجازت کی حکمت شاید یہ ہو کہ ان کی زندگی میں ہی نعمت کو ختم کر دیا تاکہ وہ اکابرین مؤمنین میں سے نہ ہو جائیں گی۔ حتی کہ وہ اکابر مؤمنین میں سے ہوئیں یا ان کو زندہ کرنے کی مہلت تک دینا ہوتا کہ وہ آپ پر ایمان لے آتیں اور تب استغفار کامل کی مستحق بن جاتیں۔ اھ۔ اور اس میں یہ ہے کہ ایمان پہلے مطلقاً استغفار کی مستحق نہیں ہوسکتیں۔ پھر جمہور کا قول رمذہب کے آپ علیہ السلام کے والدین حالت کفر میں دنیا سے گئے۔ اور یہ حدیث اس سے زیادہ صحیح ہے جو ان کے حق میں وارد ہوئی ہے۔

اور رہا ابن حجر کا قول اور آپ کے والدین کو دوبارہ زندہ کرنے والی حدیث کہ ان کو زندہ کیا گیا کہ آپ پر ایمان لے آئیں چنانچہ وہ زندہ ہوئے اور پھر فوت ہوگئے صحیح حدیث ہے۔ اور ان میں سے جن روایات کو امام قرطبی اور حافظ ابن جریر نے صحیح کہا

ہے تو اس کی صحت کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ وہ مسلم کی حدیث کے معارض ہو باوجود اس کے کہ علماء جرح و تعدیل / حفاظ نے اس کی سند میں طعن اور جرح کی ہے اور اس کے جواز سے بھی منع کیا ہے کیونکہ ایمان الیأس (ناامیدی کے وقت ایمان لانے) کے غیر مقبول ہونے پر اجماع ہے۔ جیسا کہ کتاب و سنت کی نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں اور اس لیے بھی کہ مکلّف سے جو ایمان مطلوب ہے وہ غیبی ایمان / ایمان بالغیب ہے جیسے کہ باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾ [الانعام: ۲۸] ”ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہو گیا ہے اور اگر یہ (دنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں سے ان) کو منع کیا گیا تھا وہی پھر کرنے لگیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔“ اور یہ حدیث صحیح ہے اسی طرح بعض کی رد میں کہ آپؐ کے والدین اہل فترت میں سے تھے دعا میں اختلاف کر کے باوجود ان پر عذابِ الیم نہیں ہے۔ اور علامہ سیوطی نے تین رسائل تصنیف کیے جو کہ آپؐ کے والدین کی نجات کے بارے میں ہیں اور انہوں نے دونوں طرف کے اقوال والوں کے دلائل ذکر کیے ہیں اگر آپ اس میں مزید تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو ان کا مطالعہ کیجئے۔

قولہ (فزور و القبور فانها) ھا کا مرجع اقبور ہے یا زیادۃ۔

قولہ (تذکر الموت) یعنی موت کو یاد کرنا دنیا سے بے رغبت کرتا ہے اور آخرت کی تیاری کی ترغیب دلاتا ہے اس کو ابوداوٗد، نسائی، ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ میرک فرماتے ہیں: نبی ﷺ کی زیارت کرنے والی حدیث جس کو الحافظ الکبیر نے ذکر کیا ہے اور ابوالحجاج مزی نے اس کو اطراف میں ذکر کیا ہے ہمارے ہاں جو صحیح مشرقی نسخے ہیں ان کی روایات میں نہیں ہے۔ امام نووی اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ یہ روایت اہل مغرب کے ہاں ابوالعلا بن ہامان کی روایت میں مل سکتی ہے پر ہمارے ہاں کے نسخوں میں عبدالغافر بن محمد الفارسی کی سند / طریق سے نہیں مل سکتی۔ اھ۔ اسی طرح اس روایت کو محی السنہ نے عبدالغافر کی سند سے بیان کیا ہے صحیح مسلم سے۔ شاید کہ بعض نسخوں میں اس طرح ہو اگر اس طرح نہ ہو تو امام مزی اس کو اطراف میں ذکر ہی نہ کرتے اور آپ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کی قبر ابواء کے مقام پر ہے وہ اپنے ماموؤں بنی نجار کے جو کہ مدینہ میں تھے ہاں سے واپس آ رہی تھیں کہ وہ فوت ہو گئیں۔ اور اس وقت آپ علیہ السلام کی عمر مبارک ۶ سال تھی اور نبی علیہ السلام حدیبیہ کے سال جو کہ ہجرت کا بھی چھٹا سال بنتا ہے اس قبر کے پاس سے گزرے اور آپ نے قبر کی زیارت کی۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے ہزار نعت یا ہزار نفس میں زیارت کی اسلحہ لپیٹے ہوئے اور اسی طرح الشیخ جزری نے تصحیح المصابیح میں کہا ہے۔

زیارتِ قبور کے وقت آپ ﷺ کا مسلمانوں کو دعا سکھانا

۱۷۶۴: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى الْمَقَابِرِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٧١/٢ حديث رقم (١٠٤ـ ٩٥٧)۔ وابن ماجه في السنن ٤٩٤/١ حديث رقم

۱۵۴۷۔ واحمد فی المسند ۳۵۳/۵۔

ترجمہ :حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو سکھاتے تھے کہ جب قبرستان کی طرف نکلیں تو کہیں اے مؤمنوں اور مسلمانوں کے گھر والوتم پر سلام ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم تمہارے ساتھ ملیں گے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت مانگتے ہیں (یعنی مکروہات (ناپسندیدہ) کاموں سے خلاصی مانگتے ہیں)۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله : **السلام عليكم**: اور احمد کی روایت میں سلام علیکم کے الفاظ ہیں طیبیؒ کہتے ہیں کہ السلام علیکم کا اعراب نصبی ہے کہ یہ یعلم کے مفعولوں میں سے دوسرا مفعول ہے۔ یعنی **يعلمهم كيفية التسليم عليهم**۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو سلام کرنا زندوں کو سلام کرنے کی طرح ہے دعا کو اسم پر مقدم کرنے میں۔ خلاف اس طریقہ کے جو جاہلیت میں مرواج تھا کہ دعا پر نام کو مقدم کرتے تھے۔ حماسی کہتا ہے:

عليك سلام الله قيس بن عاصم،

و رحمته ما شاء ان يترحما۔

تجھ پر سلام ہو اے قیس بن عاصم اور اس کی مشیت کے مطابق رحمتوں کا نزول بھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ ﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ [هود : ۷۳] اور اسی طرح باری تعالیٰ کا فرمان **سلام علی الیاسین**۔ اور اسی طرح کی دیگر آیات اس کی تائید کرتی ہیں۔ اور اس میں ہدایت بلیغ ترین رد ہے بلکہ بعض شافعیہ وغیرہ پر بھی جو کہتے ہیں کہ بہتر علیکم السلام ہے کیونکہ وہ ان کی تعلیل کے طلان کے باوجود وہ خطاب کے اہل نہیں ہیں اور اس میں تقدیم وتاخیر میں خطاب کی۔ حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دوست یا شاید ہے کہ میت مطلق طور پر خطاب کی اہل ہے جس طرح کہ پیچھے حدیث گزر چکی ہے کہ "**مامن احديمر بقبرأخيه المؤمن، يعرفه في الدنيا فيسلم عليه إلا عرفه ورد عليه السلام**" اور رہا آپ کا فرمان اس شخص کے لیے جس نے کہا تھا **عليك السلام** [ان عليك السلام] کہ **تحية الموتى**۔ تو یہ ان کی سابقہ علاقوں کے بارے خبر دینا تھا۔ یا موتی سے مراد جاہلیت کے دور کے کفار تھے یعنی **تحية موتى القلوب لا تفعلوه**۔ یعنی دلوں کے مردوں کا تحفہ ہے۔ تو اس طرح نہ کرو۔

قوله : **اهل الديار من المؤمنين و المسلمين**: **اهل الديار** : منادی مضاف ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور آنے والی روایت اس کی تائید کرتی ہے جس میں ہے کہ **يا اهل القبور**۔ یعنی یا حرف ندا اس میں مذکور ہے۔ اور ابن حجر فرماتے ہیں کہ اختصاص کی وجہ سے نصب زیادہ فصیح ہے اور اگر جر دیں گے تو ما قبل ضمیر سے بدل بن جائے گا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں آپ علیہ السلام نے قبرستان کی قبروں کی جگہ کو دار یعنی گھر اس لیے کہا کہ جس طرح زندہ لوگ گھروں میں جمع ہوتے ہیں اسی طرح مردے بھی اس میں رہتے اور جمع ہوتے ہیں۔

من المؤمنين :"**اهل الديار**" کی تفصیل اور بیان ہے۔

والمسلمين : دونوں وصفوں کی معایرت کی وجہ سے تاکید کے لیے ذکر کیا ہے یا مسلمین سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا کے

لیے خالص ہونے والے ہیں۔

قولہ (وإنا ان شاء الله بكم للاحقون) ایک نسخے میں لاحقون کے لفظ ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ (یعنی اگر اس نے چاہا تو ایک قول یہ بھی ہے کہ ان شرطیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ لاحقون بكم في المواخاة على ايمان کہ مواخاۃ میں ہم تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں ایک دوسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ تبرک اور تفویض کی غرض سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ......﴾ [الفتح: ۲۷] ''کہ تم خدا نے چاہا تو مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن وامان سے داخل ہو گے......'' احمد بن یحیٰی سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ تادیب اور ادب سکھلانے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے استثناء کر دیا ہے جو وہ جانتا ہے اس میں تا کہ مخلوق بھی ان شاء اللہ کہے ان امور کے بارے میں جن کے بارے میں انہیں علم نہیں ہے۔ اور اسی چیز کا حکم بھی دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ...... [الكهف: ۲۳-۲۴] ''اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا۔ مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) خدا چاہے تو (کر دوں گا) اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو اور کہہ دو کہ امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کی باتیں بتائے۔''

ایک قول یہ بھی ہے کہ ملنے کے اعتبار سے جو تعلیق ہے یہ اہل مقبرہ اور قبرستان والوں کے ساتھ خاص ہے یہ قول بھی طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

قولہ : نساء ل الله لنا ولكم العافية: یعنی مکارہ اور ناپسندیدہ حالات سے خلاصی اور چھٹکارے کا سوال کرتے ہیں۔

تخریج: امام میرکؒ فرماتے ہیں' اس حدیث کو امام نسائی اور ابن ماجد نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: "وإنا بكم للاحقون اللهم لا تحرمنا أجرهم، ولا تفتنا بعد هم۔ اور واغفرلنا ولهم کا اضافہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور ایک روایت میں یہ اضافہ بھی منقول ہے "انتم لنا فرط ونحن لكم تبع" زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ کلمات بیٹھنے سے پہلے میت کے چہرے والی جانب سامنے کہے جائیں جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

الفصل الثانی:

قبرستان سے گزرتے وقت کی مسنون دُعا

۱۷۶۵: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقُبُوْرٍ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذي في السنن ۳/۶۹ حديث رقم ۱۰۵۳۔

ترجمہ : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قبرستان کے پاس سے گزرے پس

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرے کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے اے قبروں والو! تم پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی بخش دے اور تمہیں بھی بخش دے تم ہم سے پہلے پہنچ چکے ہو اور ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله :مر النبی ﷺ بقبور بالمدينة فأقبل عليهم۔

اس کے استحباب کی صورت ہے کہ آدمی جب میت کا سلام کہے تو اس کو چہرہ میت کے چہرے کی طرف ہو اور یہ کہ دعا میں بھی اس طرح رہے۔ اسی حال میں دعا بھی جاری رکھے اور عام مسلمانوں کا عمل بھی اسی پر ہے۔ ابن حجر کے اس قول کے برعکس جو انہوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک سنت طریقہ یہ ہے کہ دعا کے دوران قبلہ رخ ہوا جائے جیسا مطلق دعا کے بارے دوسری احادیث میں مروی ہے۔ اھ۔

اور اس میں یہ بھی ہے کہ دعا کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جن میں قبلہ رخ کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ جس حالت میں ہم ہیں اور اسی طرح طواف اور سعی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت اور کھانے، پینے کے وقت اور مریض کی عیادت کے وقت اور اسی طرح کی دیگر کئی مثالیں موجود ہیں۔ تو یہ استقبال قبلہ کے اقتصار کی تعیین کرتی ہیں اور عدم استقبال مورد پر ہے اگر ایسا پایا جائے۔ تو پھر جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: خير المجالس مااستقبل القبلة کہ بہترین مجالس وہ ہیں جو قبلہ رخ ہوں۔

اور رہا یہ کہ بعض سلف صالحین سے یہ منقول ہے کہ وہ زیارت نبویہ کے بعد دعا کے لیے قبلہ رخ ہو جاتے۔ یہ ایک زائد امر ہے اس میں ائمہ کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔

مظہر کہتے ہیں کہ اچھی طرح جان لو کہ میت کی زیارت اس کی زندگی میں زیارت کی طرح ہے کہ وہ اس کے چہرے سامنے یعنی اس کی طرف چہرہ کر کے بیٹھے اور اگر زندگی میں اس کے عظیم المرتبہ ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہوئے دور بیٹھتا تھا تو دور ہو کر بیٹھے اور اسی طرح اس کی زیارت کے وقت اس کے سامنے کھڑا رہتا تھا تو کھڑا رہے اور اگر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھتا تھا تو بیٹھ جائے اور اگر اس کے زمانہ حیات میں اس وقت ملاقات کے نزدیک بیٹھتا تھا تو اس وقت بھی نزدیک بیٹھے۔

اور جب اس کی زیارت کو جائے تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھ کر اس کے لیے دعا کرے اور اس کی قبر کو نہ چھوئے اور نہ یہ اس کو بوسہ دے کیونکہ یہ عیسائیوں کا وطیرہ ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ والدین کی قبر کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله :فقال :السلام عليكم يا أهل القبور يغفر الله لناولكم۔

اپنے لیے بخشش کی دعا کو میت کے لیے بخشش کی دعا پر مقدم کیا ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ زندہ کی دعا زندہ آدمی کے لیے دعا کو مردہ کی دعا پر اور حاضر کو غائب پر مقدم پر رکھنا چاہئے۔

قوله(انتم سلفنا) دونوں نے ختم کے شکف ہایہ میں ہے کہ شکف دونوں کا فتحہ ہے اور یہ سلف المال سے ہے یعنی اس ... لوں اس کے صبر پر اجرت عطا کر دی۔

ایک قول یہ ہے کہ سلف سے مراد آدمی کے پیش رو اس کے آباء واجداد اور قرابت دار ہیں جو دنیا سے چلے گئے ہوں اور اسی لیے صدر اول کے تابعین کو السلف الصالح کہا گیا ہے اور ابن حجر نے اس کا تعاقب کیا ہے فرماتے ہیں کہ صدر اول صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ میں سے جو ہیں وہ السلف الصالح ہیں حالانکہ ابن حجر کا یہ قول درست نہیں مردود ہے۔ کیونکہ یہ صحابہ کے موافق نہیں ہے۔ اور صحابہ بہترین نسبت میں مخصوص ہیں اور سلف صالح کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ وہ تابعین اور خلف صالح سے مراد تبع تابعین اور مصنف نے کتاب کے شروع میں صحابہ سے ایک عبارت نقل کی ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں سلف ہیں اور خلف سے مراد ان کے بعد والے ہیں یعنی تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ اور ابن جریر کو یہاں وہم ہو گیا تو میں ان کو متنبہ کرتا ہوں۔

قولہ: ونحن بالأثر: اَثر دونوں کے فتحہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ ثائے مثلثہ ساکنہ کے ساتھ ہے۔ یعنی تمہارے بعد آنے والے۔ تمہارے بعد تمہارے پیچھے آنے والے اور تم سے ملنے والے۔

الفصل الثالث:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر شب میں قبرستان جانا

۱۷۶۲: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلَّمَا كَانَ لَيْلَتُهَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ اِلَى الْبَقِيْعِ فَيَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاَتَاكُمْ مَّا تُوْعَدُوْنَ غَدًا مُّؤَجَّلُوْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَا حِقُوْنَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَهْلِ بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٦٦٩/٢ حديث رقم (١٠٢۔ ٩٧٤)۔ والنسائي في السنن ٩٣/٤ حديث رقم ٢٠٣٩۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رات کو ان کی باری ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخر شب میں مدینہ کے قبرستان کی طرف نکلتے۔ پھر فرماتے سلام ہو تم پر اے مؤمنین کی قوم اور تمہارے پاس وہ چیز آئی ہے جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا (یعنی ثواب وعذاب کا) قیامت کے دن تک تمہیں ڈھیل دی گئی ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اے اللہ بقیع غرقد والوں کو بخش دے۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: کان رسول اللہ ﷺ کلما کان لیلتها من رسول اللہ ﷺ) مِنْ جار مجرور ملکر لیلۃ کے متعلق ہوگا۔ نصیب کے معنی میں ہوگا یا محذوف ہوگا یعنی وہ جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص کر لیا۔ طیبی فرماتے ہیں کلما ظرف ہے جو کہ شرط کے معنی میں ہے اور اس کا جواب یخرج اور وہ اس میں عامل ہے اور یہ حضرت عائشہ کے قول کے معنی سے حکایت ہے نہ کہ آپ ؐ کے لفظ سے یعنی آپ علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب بھی آپ علیہ السلام حضرت عائشہ کے ہاں رات گزارتے تو باہر نکلا کرتے تھے۔

قولہ (من آخر اللیل الی البقیع) یعنی بقیع الغرقد میں اور یہ مدینہ سے باہر ایک مقام ہے جہاں اہل مدینہ والوں کی

قبریں تھیں۔ النہایہ میں ہے کہ یہ ایک وسیع مکان کی جگہ ہے اور اس کا نام وہاں پر موجود ایک درخت کی وجہ سے پڑ گیا یا اس کی جڑوں کی وجہ سے اور عرقد ایک درخت تھا اور اب درخت کے علاوہ محض نسبت اور اضافت باقی رہ گئی ہے۔

فيقول السلام عليكم دارقوم : کہا جاتا ہے کہ دار مضموم ہے۔ یا عبارت مقدر ہے یعنی یا أہل دار قوم۔

مؤمنين و أتاكم : الف مقصورہ کے ساتھ یعنی تمہارے پاس آ چکا ہے یعنی جاء کم۔ ابن الملک فرماتے ہیں: آپ علیہ السلام نے أتاکم اس لیے کہا کیونکہ مشہور ہے جو چیز بھی آنے والی ہے وہ گویا کہ حاضر ہے۔ اھ یا اس کی حقانیت مراد ہے گویا کہ واقع ہو چکا ہے۔ اور ایک نسخہ میں آتاکم مد کے ساتھ آتاکم ہے یعنی اعطاکم اس نے تمہیں عطا کر دیا۔ اللہ کے اس قول کی تحقیق کے لیے ثابت ہونے کے لیے ﴿ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا﴾ [آل عمران:١٩٤]

ما توعدون : یعنی ما کنتم توعدون به من الثواب یعنی اس کے بدلے ثواب کا جو تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

غدا : یہ اپنے ماقبل کے متعلق ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اپنے مابعد کا متعلق ہو جو کہ آگے آ رہا ہے

موجلون : یعنی انتم مؤخرون و ممهلون إلى غدباعتبا رأجوركم۔ یعنی تم مؤخر کیے جاتے ہو اور کل تک تم مہلت دیے جاتے ہو اپنے اپنے اجر وثوب کے اعتبار سے استیفاء اور استقصا ہیں۔ جملہ متانفہ مبینہ ہے کہ جو بھی ان کے پاس لوٹ کر آنے والا ہے اجمالی امور سے نہ کہ تفصیلی امور سے طیبی فرماتے ہیں: اس کا اعراب مشکل ہے اگر اس کو حال پر واؤ سے موکد کیا جائے۔ جو کہ توعدون کی واؤ ہے واؤ کو حذف کرنے کے ساتھ۔ اور مبتدا کہ اس میں شذوذ ہے۔ اگر ابن حجر کہیں اور وہ اس پر سیاق دلالت کرتا ہے جیسا کہ یہاں ہے اور اس میں بحث ہے طیبی فرماتے ہیں اس کو ماتوعدون سے بدل پر محمول کرنا جائز ہے یعنی أتاکم موتؤجلونه انتم اور اجل سے مراد اور مستقبل میں کیونکہ جو چیز آنے والی ہی ہے وہ بمنزلہ حاضر کے ہے۔ اھ اور وہ کہ جس طرح ابن حجر نے کہا ہے کہ وہ بہت ہی تکلف ہے بلکہ سیاق بھی اس سے دور ہے۔

قوله (وإنا إن شاء الله بكم) یعنی بالخصوص اے قبروں والو!

قوله (لاحقون) اللہ کے اس قول کی طرح: "وما تدرى نفس بأى أرض تموت [لقمان:٣٤] ایک قول یہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کہاں دفن ہوگا۔

اللهم اغفرلا هل بقيع الغرقد : یعنی مقبرۂ مدینہ والوں کو اور اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اجمالی دعا علی وجہ العموم کافی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا زیارتِ قبور کے لیے دُعا کا پوچھنا

۱۷۶۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَيْفَ اَقُوْلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ تَعْنِيْ فِيْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ قَالَ قُوْلِيْ اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ۔

اخرجه مسلم فى صحيحه ٦٦٩/٢ حديث رقم (١٠٣ ـ ٩٧٤)۔ واخرجه النسائى ٩٣/٤ حديث رقم ٢٠٣٨۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! میں کس طرح کہوں؟ یعنی میں قبروں کی زیارت کو جاؤں تو کیا کہوں؟ (یعنی میں کیا دعا کروں؟) فرمایا کہو کہ مؤمنوں کے گھر والوں اور مسلمانوں کے گھر والوں کو سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سے پہل کرنے والوں اور پیچھے رہنے والوں پر رحم کرے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: تعنی فی زیارة القبور: یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کلمات کی کیفیت کے بارے استفسار کر رہی تھیں۔

السلام عليكم على أهل الديار من المؤمنين و المسلمين) اور اس میں عورتوں پر مردوں کی اغلبیت ہے۔

قوله (ويرحم الله المستقدمين) یعنی جو لوگ ہم سے پہلے گزر چکے۔

قوله (بالموت منا) ہم میں سے یعنی مؤمنوں کے گروہ میں سے

والمستأخرين: یعنی موت میں ہم سے متاخر اور مستقدمین اور متاخرین میں ''سین'' صرف تاکید کے لیے آئی ہے یعنی ہم سے فوت شدگان اور زندہ لوگ۔ اور یہاں مردوں کو زندوں پر مقدم ان کے مقام کا تقاضا ملوظ رکھتے ہوئے کیا اور کلام یا عبارت کے نظم و نسق کو ملحوظ حاضر رکھتے ہوئے یا پھر اللہ علام الغیوب کے کلام میں جو مذکور ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اگرچہ آیت کے معنی سے عام ہی کیوں نہ مراد ہو: ﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ﴾ [الحجر: ٢٤]
''اور جو لوگ تم میں پہلے گزر چکے ہیں ہم کو معلوم ہیں۔ اور جو پیچھے آنے والے ہیں وہ بھی ہم کو معلوم ہیں۔''

قوله (إنا إن شاء الله بكم) یعنی اے ہمارے پیشرو۔

للاحقون: دو لام ہیں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں: عقیلی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں قال ابو زرين: يا رسول الله ﷺ إن طريقي على الموتى فهل من كلام اتكلم به إذا مررت عليهم؟ قال: قل السلام عليكم يا اهل القبور من المسلمين والمؤمنين۔ انتم لنا سلف و نحن لكم تبع و إنا إن شاء الله بكم لاحقون۔ ابورزین فرماتے ہیں وہ سنتے ہیں کہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ فرمایا اے ابورزین ألا ترضى أن يرد عليك بعد دهم من الملائكة؟ اھ۔

اور آپ کا قول ''لا يستطيعون أن يجيبوا'' یعنی جواب کی طاقت نہیں رکھتے کہ زندہ اس کو ان کا جواب سن لے اور یا پھر وہ اس طرح جواب دیتے ہیں کہ ہمیں سنائی نہیں دیتا۔

عبدالبر نے الاستذکار اور تمہید میں ابن عباسؓ سے مروی روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''مامن احد يمر بقبر اخيه المؤمن، كان يعرفه في الدنيا فيسلم عليه إلا عرفه و رد عليه السلام'' عبدالحق نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

اور ابن ابی الدنیا نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: قال: ''إذا مر الرجل بقبر، يعرفه فسلم عليه رد عليه السلام وعرفه و إذا مر بقبر لا يعرفه فسلم عليه رد عليه السلام وإن ولم يعرفه''۔

۱۷۶۸: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ النُّعْمَانِ يَرْفَعُ الْحَدِيْثَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ زَارَ قَبْرَ اَبَوَيْهِ اَوْ اَحَدِهِمَا فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ غُفِرَلَهٗ وَكُتِبَ بَرًّا ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان مرسلا)

رواه البيهقي في شعب الايمان

ترجمہ: حضرت محمد بن نعمانؒ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی طرف پہنچاتے تھے (یعنی نسبت کرتے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر جمعہ کے دن اپنے والدین کی قبر کی زیارت کرے یا ان میں سے ایک کی قبر کی زیارت کرے اس کی بخشش کردی جاتی ہے۔ اعمالنامے میں اس کو ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والا لکھا جاتا ہے۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں بطریق ارسال روایت کیا ہے۔

تشریح: محمد بن النعمان: تابعی ہیں۔

أو أحدهما: احدهما کا ابویہ پر عطف ہے۔

في كل جمعة یعنی ہر جمعہ کے دن یا ہر ہفتے۔

غفرله: یعنی اس کے گناہ وعصیان معاف کردیئے جاتے ہیں ہے۔

قوله (وكتب برّا) با کے فتحہ کے ساتھ یعنی بارا في طاعته۔ اس کے معنی کی حدیث پیچھے گزر چکی ہے۔

قبروں کی زیارت کرنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے

۱۷۶۹: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْاٰخِرَةَ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه ۱/۱ ۵۰ حديث رقم ۱۵۷۱۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تمہیں قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا۔ پس تم قبروں کی زیارت کیا کرو۔ پس بے شک قبروں کی زیارت کرنا تمہیں دنیا سے بے رغبت کر دے گا اور آخرت کو یاد دلائے گا۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: فزوروا: ایک دوسرے نسخہ میں فزوروہا ہے۔

فانها: یعنی قبروں کی زیارت یا قبریں یعنی ان کو دیکھنا

قوله (تزهد في الدنيا) آپ نے فرمایا: "ذكر الموت هادما للذات، و مهون الكدورات"۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب تم کاروبارِ زندگی کے جھمیلوں میں الجھ کر پریشان ہوتو قبروں والوں کے ذریعے استعانت حاصل کرو۔ یہ اس کے دو معنی میں سے ایک مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں جا کر دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کا شوق تمہیں دنیا کے قلیل نقصان کے غم سے نجات بخشے گا۔

قوله (وتذكر الآخرة) اور اس کی تیاری کے لیے تعاون کرتی ہے مدد کرتی ہے۔

قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت

۱۷۷۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح وقال قدارأی بعض اهل العلم ان هذا کان قبل ان یرخص النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فی زیارة القبور فلما رخص دخل فی رخصته الرجال والنساء وقال بعضهم انما کره زیارة القبور للنساء لقله صبر هن و کثرة جز عهن تم کلامه)۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۷۱/۳ حدیث رقم ۱۰۵۶۔ والنسائی ۹۴/٤ حدیث رقم ۲۰۴۳۔ وابن ماجه ۵۰۲/۱ حدیث رقم ۱۵۷۵۔ واحمد فی المسند ۴۴۲/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان عورتوں پر جو قبروں کی بہت زیادہ زیارت کرنے والی ہیں۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ بعض اہل علم اس طرف گئے ہیں یہ لعنت کا کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت دینے سے قبل تھا۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی تو اس میں مرد اور عورت دونوں داخل ہو گئے اور بعض علماء نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنے کو بے صبری اور بہت زیادہ جزع وفزع کرنے کی وجہ سے ناپسند قرار دیا ہے۔ امام ترمذیؒ کا کلام پورا ہوا۔

تشریح: أن رسول الله ﷺ لعن زوارات القبور ۔ شاید کہ اس سے مراد بہت زیادہ زیارتیں کرنے والی ہیں۔
قوله (وقال بعضهم إنما کره) یعنی نبی علیہ السلام نے ناپسندیدہ کہا ہے اور کُرہ مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی مروی ہے
قوله (زیارة القبور للنساء لقلة صبر هن، وکثرة جزعهن) اور ایک نسخہ میں (وکثرة عجز هن) کے الفاظ ہیں طیبی فرماتے ہیں: صحیح اور درست لفظ وکثرة جزعهن ہیں۔

زیارت کرتے وقت میّت کا لحاظ کرنا ضروری ہے

۱۷۷۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کُنْتُ اَدْخُلُ بَیْتِی الَّذِیْ فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاِنِّیْ وَاضِعٌ ثَوْبِیْ وَاَقُوْلُ اِنَّمَا هُوَ زَوْجِیْ وَاَبِیْ فَلَمَّا دُفِنَ عُمَرُ مَعَهُمْ فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلْتُهٗ اِلَّا وَاَنَا مَشْدُوْدَةٌ عَلَیَّ ثِیَابِیْ حَیَاءً مِنْ عُمَرَ۔ (رواه احمد)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۷/۳۔ حدیث رقم ۱۴۹۶۔ ومسلم فی صحیحه ۵۰/۱ حدیث رقم (۲۹۔ ۱۹)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲۴۲/۲ حدیث رقم ۱۵۸۴۔ والترمذی فی السنن ۲۱/۳ حدیث رقم ۶۲۵۔ والنسائی ۵۵/۵ حدیث رقم ۲۵۲۲۔ وابن ماجه ۵۶۸/۱ حدیث رقم ۱۷۸۳۔ والدارمی فی السنن ۴۶۱/۱ حدیث رقم ۱۶۱۴۔ واحمد فی المسند ۲۳۳/۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں داخل ہوتی تھی کہ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ بھی مدفون تھے۔اس حالت میں کہ میں اپنا کپڑا (یعنی چادر) اُتار دیتی تھی اور میں اپنے دل میں کہتی تھی کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس میں میرے خاوند (صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مدفون ہیں۔ یہ دونوں میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ پس جب عمر رضی اللہ عنہ کو میرے گھر میں ان کے ساتھ دفن کر دیا گیا تو خدا کی قسم پھر میں اس مکان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حیاء کی وجہ سے کپڑا اوڑھے بغیر داخل نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ (میرے لئے) اجنبی تھے۔اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: بیتی الذی فیه رسول الله: یعنی اُن کی قبر ہے یا آپ اُس میں دفن ہیں۔

وانی واضع : تنوین کے ساتھ۔ظاہر یہ ہے کہ یہ واضعہ ہے کأنہ کی طرح ہے۔گویا کہ وہ حائفہ کی طرح ہوتی تھیں۔ یا تذکیر ہے باعتبار شخص کے تو پھر اس کی اضافت قولہا کی طرف صحیح ہے۔

ثوبی : یعنی اپنے بعض کپڑے۔اسی لیے یہاں مفرد ہے اور آگے جمع ہے جیسا کہ آئے گا۔

قوله (وأقول) یعنی میرے نفس میں تھا۔تاکہ یہ عذر کے لیے بیان ہو۔طیبیؒ کہتے ہیں: قول اعتقاد کے معنی میں ہے۔یہ تعلیل ہے کپڑے اتارنے کی۔

قوله (انما هو) کہ صرف۔

زوجی وأبی : کہ ایک میرے خاوند تھے اور دوسرے میرے باپ تھے۔یا ضمیر شان کے لیے ہے۔یعنی حالت یہ تھی کہ میرے خاوند اور میرے باپ وہاں دفن تھے۔یا ضمیر گھر کی طرف ہے کہ وہ میرے شوہر کا مدفن ہے اور باپ علی تقدیر مضاف ہو۔

قوله :فلما دفن عمر معهم :اس میں دلیل ہے کہ جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے۔

حیاء من عمر :طیبی فرماتے ہیں اس میں احترام ہے مردوں کے لیے جیسا کہ زندوں کے لیے ہے۔

سیوطی کی شرح الصدور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے عقبہ بن عامر صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے قال : لأن أطأ علی جمرة أو علی حد سیف، حتی تخطف رجلی أحب الی من أن أمشی علی قبر رجل وما أبالی أفی القبور تضیت حاجتی أی من البول والغائط أم فی السوق بین ظهر انیه والناس ینظرون۔ کہ ''میں دہکتے کوئلوں پر چلوں یا تلوار کی دھار پر پاؤں رکھوں حتی کہ تلوار سے میری ٹانگیں اُچک لی جائیں یہ زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں کسی کی قبر پر چلوں، وہاں قضائے حاجت کروں یا پھر بھرے بازار میں لوگوں کے درمیان پھر واور لوگ مجھے دیکھ رہے ہوں۔''

اور ابن ابی دنیا نے کتاب القبور میں سلیم بن غفرانہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک قبرستان کے قریب سے گزرے اور انہیں بہت شدید پیشاب آیا ہوا تھا۔تو ان سے کہا گیا: اتر کر پیشاب کیوں نہیں کر لیتے؟ تو انہوں نے کہا: سبحان اللہ، اللہ کی قسم میں مُردوں سے بھی ویسے ہی حیا کرتا ہوں جیسے زندوں سے حیا کرتا ہوں۔

الحمدللہ ''کِتَابُ الْجِنَائِز'' ختم ہوئی

كِتَابُ الزَّكٰوة

زکوٰۃ کا بیان

''زکوٰۃ'' لغت میں طہارت کو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ [الاعلیٰ: ۱۴] تحقیق وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اپنا تزکیہ کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ [البقرہ: ۴۳] اور زکوٰۃ ادا کرو'' اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ ایتاء کا متعلق مال ہے اور فقہاء کے عرف میں یہ نفس ایتاء فعل کا نام ہے کیونکہ وہ اس کو وجوب کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور احکام شرعیہ کا متعلق وہ افعال المکلفین ہیں۔

لغوی مناسبت:

اور لغوی مناسبت یہ ہے کہ یہ اُس کا سبب ہے چونکہ اس سے بڑھوتری ہوتی ہے بایں طور کہ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں اس کا بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَمَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ﴾ [السبا: ۳۹] ''تم جو بھی چیز خرچ کرو گے وہ اُس کا خلف ضرور دے گا'' اور نفس کی طہارت یہ ہے کہ بخل کی میل اور مخالفت کی میل کچیل دور ہو جائے اور (طہارتِ مال کا سبب بھی ہے بایں طور کہ) دوسروں کا حق نکال کر اں کے مستحقین کو دیا جاتا ہے یعنی فقراء کو پھر یہ ایک محکم فریضہ بھی ہے۔

اس کے وجوب کا سبب مال مخصوص کا ہونا ہے یعنی نصاب نامی خواہ تحقیقی طور پر باقی ہو یا تقدیری طور پر نامی ہو اس لئے اس کو اس طرف مضاف کر کے ''زکوٰۃ المال'' کہا جاتا ہے۔

شرائط زکوٰۃ:

اس کی شرائط یہ ہیں: ① اسلام ② آزادی، ③ عقل، ④ دین سے فراغت۔

سن فرضیت:

پھر یہ کہا گیا ہے کہ سن آٹھویں ہجری میں روزوں کی فرضیت کے ساتھ زکوٰۃ الفطر بھی نازل کی گئی تھی اور دوسری چیزیں بھی

فرض کی گئی تھیں اور قابل اعتماد بات یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں اجمالی طور پر فرض ہوئی پھر اس کی تفصیل مدینہ میں بیان ہوئی اس توجیہ سے مکہ میں فرضیت پر دلالت کرنے والی آیات اور دیگر آیات وادلہ میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

عرض مرتب:

❶ زکوٰۃ کا ثبوت:

زکوٰۃ کا حکم قرآن پاک میں نماز کے حکم کے ساتھ بیاسی (۸۲) جگہ پر مذکور ہے۔ یہ نماز اور زکوٰۃ دونوں کے کمال اتصال کی دلیل ہے۔

❷ زکوٰۃ کی فرضیت کب ہوئی؟

زکوٰۃ ہجرت کے دو سال بعد فرض کی گئی رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو اور روزہ بھی ہجرت کے دوسرے سال فرض کیا گیا۔ لیکن ملا علی قاریؒ کے مطابق زکوٰۃ پہلے فرض ہوئی اور روزہ بعد میں۔ ملا علی قاریؒ زکوٰۃ کی فرضیت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ اجمالاً مکہ میں فرض ہوئی اور اس کا نصاب اور مقادیر کی تفصیل مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

❸ کیا انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض ہے؟

انبیاء علیہم السلام پر بالا جماع زکوٰۃ فرض نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کے میل کچیل کے ازالے کے لیے مشروع ہوئی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام میل وکدورت سے پاک ہیں اور جو قرآن میں آیا ہے: وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ...... (مریم: ۳۱) اس زکوٰۃ سے مراد زکوٰۃ النفس ہے۔

❹ زکوٰۃ کی لغوی تشریح اور وجہ تسمیہ:

زکوٰۃ کا لغوی معنی بڑھنا اور پاک کرنا اور زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ادا کرنے سے مال بڑھتا ہے اور پاک ہوتا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے والے کے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور زکوٰۃ پر لفظ صدقہ کا بھی اطلاق ہوتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کے صدق ایمان پر دلیل ہے۔

❺ زکوٰۃ کا حکم:

زکوٰۃ کا منکر کافر ہوتا ہے اور اس کو ترک کرنے والا سخت گنہگار ہوتا ہے اور منکر زکوٰۃ کو قتل کرنے کا حکم ہے یہ محیط السرخسی میں مذکور ہے اور یہ فی الفور سال کے اختتام پر واجب ہوتی ہے اور اس کو جان بوجھ کر مؤخر کرنے والا بھی گنہگار ہوتا ہے اور امام رازیؒ کی روایت کے مطابق زکوٰۃ علی التراخی واجب ہوتی ہے اس لیے مؤخر کرنے والا موت کے نزدیک گنہگار ہوگا۔

❻ زکوٰۃ کن لوگوں پر فرض ہے؟

زکوٰۃ مسلمان، عاقل بالغ آزاد پر فرض ہے وہ مال اس کی ملکیت میں ایک سال تک رہا ہو اور اس کی ضرورت اصلیہ سے --

زائد ہو اور مال نامی یعنی بڑھنے والا ہو۔ غیر نامی نہ ہو۔ خواہ مال نامی حقیقۃً ہو یا تقدیراً ہو اور مِلک اس میں کامل ہونی چاہیے۔ پس کافر پر اور غلام و دیوانے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

زکوٰۃ قرض دار پر فرض نہیں ہے مال قرض سے زیادہ ہو اور نصاب کو پہنچ جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو گی اور قرض میں یہ بھی قید ہے کہ بندوں میں سے اس کا کوئی مطالب ہو۔ پس نذر اور کفارات اور فطرہ اور ان کی مانند جو چیزیں ہیں وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان میں بندوں کی طرف سے کوئی مطالب نہیں ہے اور زکوٰۃ کا جو قرض ہے حاکم اس کا ظاہری مال میں مطالبہ کر سکتا ہے یعنی مویشی اور مال تجارت میں خواہ وہ مال شہر میں لے آئے یا لے کر جائے دوسرا نقدی اور مال تجارت میں کہ شہر میں تجارت کرتا ہے تو کوئی مطالبہ نہیں ہے پہلی صورت مانع وجوب زکوٰۃ ہے اور دوسری صورت مانع نہیں ہے اگر عورت مہر کا تقاضا کرتی ہے تو زکوٰۃ مانع ہے ورنہ نہیں اور بحرالرائق وغیرہ میں ہے۔

معتمد مذہب کے مطابق دین (قرض) زکوٰۃ اور صدقۂ فطر کے لیے مانع ہے۔

اور مطلق قرض مانع ہے خواہ وہ قرض معجّل ہو یا مؤجل اگرچہ وہ بیوی کا طلاق تک یا موت تک مہر مؤجل ہو اور بعضوں نے کہا کہ مہر مؤجل مانع نہیں ہے کہ اس کا کوئی عادۃً مطالبہ نہیں کرتا بخلاف مہر معجّل کے اور بعض حضرات نے کہا کہ اگر خاوند ادا کا ارادہ رکھتا ہے تو مانع زکوٰۃ ہے ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ قرض شمار نہیں ہوتا۔ کذا فی غایۃ البیان اور عورت کو مہر کی وجہ سے غنیہ شمار کیا جاتا ہے۔ جب خاوند مالدار ہو تو یہ صاحبین کے نزدیک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مہر کی وجہ سے غنیہ شمار نہیں ہوتی۔ یہ اختلاف مہر معجّل کی صورت میں ہے اور مہر موجل کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے بالاتفاق غنیہ شمار کی جاتی ہے

۷ نصاب کی تفصیل:

نصاب کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ وہ مال حوائج اصلیہ سے فارغ ہو۔ یعنی ضروریات زندگی سے خالی ہو جیسے اصلی گھر جو اپنی رہائش کے لیے ہوتا ہے اور بدن کے کپڑے اور گھر کا سامان اور سواری کا جانور اور خدمت کے لیے غلام اور استعمال کا ہتھیار اور اہل علم کی کتابیں اور صنعت و حرفت کے اوزار۔ مثلاً اگر کسی نے تجارت کی نیت سے مکان خریدا اور پھر اس میں رہنے لگا۔ تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور اگر مکان تجارت کی نیت سے لے اور رہائش سے فارغ ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح اور چیزوں کو سمجھ لیجئے گا۔ اگر مکان یا غلام وغیرہ اس کی حاجت اصلیہ سے فارغ ہوں اور ان میں تجارت کی نیت بھی نہ ہو تو زکوٰۃ اس میں واجب نہیں ہے۔

اور یہ جو ملکیت کے کامل ہونے کی شرط لگائی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اصل میں اس چیز کا مالک بھی ہو اور اس مال میں حق تصرف بھی رکھتا ہو۔ اس وجہ سے مکاتب پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

۸ ضمار کی تفصیل! مال ضمار اس کو کہتے کہ جس تک آدمی نہ پہنچ سکے اور ایسے مال کی کئی اقسام ہیں:

① ایک تو وہ مال جو ضائع ہو جائے۔ ② دوسرا وہ جس کو آدمی جنگل میں رکھ کر بھول جائے۔ ③ تیسرا یہ کہ وہ دریا میں ڈوب جائے۔ ④ چوتھا یہ کہ کوئی اس کو غصب کر لے اور اس پر کوئی گواہ موجود نہ ہو اور۔ ⑤ نمبر یہ ہے کہ ظالم نے ظلماً لے لیا

ہو۔ ﴿۶﴾ اور چھٹا یہ کہ وہ کوئی قرض لے کر منکر ہو گیا ہو اور کوئی گواہ نہ ہو۔ اگر ان مالوں میں کسی قسم کا مال مل جائے۔ تو اس پر سابقہ ایام کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے بخلاف اس مال کے جو گھر میں دفن کر کے بھول گیا تھا اس پر اس کو بقیہ ایام کی زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ بخلاف اس قرض کے کہ قرض لینے والا اقرار کرتا ہو۔ خواہ لینے والا مالدار ہو یا مفلس یا انکار کرتا ہو۔ لیکن اس کے گواہ موجود ہوں اور قاضی اس کو جانتا ہو تو اسے مال میں زکوٰۃ دینا ہوگی۔ اس تفصیل کے تحت کہ اگر وہ قرض مال تجارت کے بدلے ہو تو جب وہ مال نصاب کے پانچویں حصے کو پہنچے گا تو بقیہ ایام کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔

اگر قرض مال تجارت کے بدلے نہ ہو تو جیسے گھر میں پہننے والے کپڑے بیچے یا خدمت کا غلام بیچا یا رہنے والا گھر بیچا اور خریدنے والے کے ذمے قرض ہے پس اس میں پچھلے ایام کی زکوٰۃ دینا اسی وقت واجب ہوگا جب بقدرِ نصاب وصول ہو جائے۔

اور جو قرض ایسا ہو کہ مال کے بدلے میں نہ ہو جیسے مہر وصیت اور بدل خلع وغیرہ۔ جب اس میں زکوٰۃ دینی ہوگی تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ بقدر نصاب کے ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو سابقہ ایام کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ اسی سال کی جس سال اس کا قبضہ رہا ہوگا اور یہ حکم تب ہے کہ وہ پہلے سے صاحب نصاب نہ ہو اور اگر وہ پہلے سے صاحب نصاب ہو تو اس کے حق میں یہ مال مال مستفاد ہے تو پہلے مال کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ دے گا۔ اس میں سال کا گزرنا شرط نہیں ہے۔

❾ زکوٰۃ کی شرائط:

زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ ادا کرتے وقت یہ نیت کرے کہ میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں یا مال سے زکوٰۃ نکالتے وقت نیت کرے اور اگر سارا مال اللہ کے راستے میں دے دے اور زکوٰۃ کی نیت نہ کرے۔ تو زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے۔

بشرطیکہ کسی اور واجب کی نیت سے نہ دے۔ اگر تھوڑا مال دیا ہے تو جتنا دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ امام محمدؒ کے نزدیک ادا ہو جائے گی اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ادا نہیں ہوگی اور زکوٰۃ کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ کرنا مکروہ ہے۔ اگر تجارت کے لیے غلام خریدا پھر خدمت لینے کی نیت کی تو وہ تجارت کا نہ رہا بلکہ خدمت کے لیے ہو گیا۔ تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر خدمت کی نیت سے خریدا اور پھر تجارت کی نیت کی تو تجارت کے لیے نہیں ہوگا۔ جب تک اس کو بیچے نہیں۔ جب بیچے گا تو اسی قیمت میں زکوٰۃ دینی ہوگی اور زکوٰۃ کا نصاب اسقدر مال کو کہتے ہیں کہ اس میں زکوٰۃ دینا واجب ہو جائے اور اس سے کم میں نہ ہو۔ مثلاً چاندی یا مال تجارت ۲۰۰ دوسو درہم کی بقدر ہو چنانچہ آگے سب کے نصاب حدیثوں میں مذکور ہیں اور نصاب کی دو قسمیں ہیں:
❶ نامی اور ❷ غیر نامی۔

نامی کہتے ہیں بڑھنے والے مال کو اور غیر نامی نہ بڑھنے والا مال۔ پھر نامی دو قسم پر ہے: ﴿۱﴾ حقیقی اور ﴿۲﴾ تقدیری۔

﴿۱﴾ حقیقی مال یہ ہے کہ نفع سے بڑھتا ہے اور جانور بچوں کی وجہ سے بڑھتے ہیں۔ ﴿۲﴾ اور مال تقدیری وہ ہے جو ظاہر میں بڑھتا نہیں ہے لیکن بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور غیر نامی جیسے مکان اسباب وغیرہ جو اصل ضرورت کے علاوہ ہوں۔

نصاب نامی اور غیر نامی میں فرق یہ ہے کہ نصاب نامی کے مالک پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس کے لیے زکوٰۃ لینا نذر کا صورت: صدقات واجبہ کا لینا درست نہیں ہوتا اور صدقۂ فطر اور قربانی کرنی واجب ہو جاتی ہے اور نصاب غیر نامی کے

مالک پر صرف زکوۃ فرض نہیں ہوتی بقیہ احکام اس کے نصاب نامی کے مالک والے ہیں۔

الفصل الاول:

زکوۃ کے بنیادی احکام

۱۷۷۲: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ اِنَّكَ تَأْتِيْ قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ اَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳ حدیث رقم ۱٤۰۲ قسما منه۔ واخرجه مسلم کاملاً فی صحیحه ۲/ ٦٨٠ حدیث رقم (۲٤۔ ۹۸۷)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲/ ۳۰۲ حدیث رقم ۱٦۵٨۔ والدارمی فی السنن ۱/ ٤٦۲ حدیث رقم ۱٦۱۷۔ واحمد فی المسند ۲/ ٤٨۹۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف امیر یا قاضی بنا کر بھیجا اور فرمایا تم اہل کتاب کی ایک قوم یعنی یہود و نصاریٰ کے پاس جا رہے ہو پس ان کو اس بات کی طرف دعوت دو کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اگر انہوں نے یہ بات مان لی تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر دن و رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر انہوں نے اس بات کو مان لیا تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے۔ جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں کو دی جائے پس اگر وہ یہ بات مان لیں تو تم ان کے اچھے مال لینے سے بچو۔ یعنی چھانٹ کر مال نہ لو۔ بلکہ ان کے مال کے تین حصے کرو۔ اچھا برا اور درمیانہ اور زکوۃ میں درمیان کا مال وصول کرو اور مظلوم کی بددعا سے بچو اور زکوۃ میں وہ چیز وصول نہ کرو جو اس پر واجب نہیں ہے یا اس کو زبان سے تکلیف نہ دو۔ تاکہ وہ بددعا نہ کرے۔ کیونکہ مظلوم کی دعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله: ان رسول الله ﷺ بعث ...... محمد رسول الله۔**

معاذًا: میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی بھیجا۔

قوما اهل کتاب: اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: اس ''قوما'' کو مقید کیا ''اہل کتاب'' کے ساتھ حالانکہ ان میں کچھ اہل ذمہ بھی تھے اور کچھ دوسرے مشرکین بھی تھے۔ ان کی فضیلت کے پیش نظر کہا یا پھر غلبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

فادعهم الى شهادة ان لا اله الا الله: کیونکہ اس میں کچھ مشرکین بھی تھے۔

وان محمد رسول الله: کیونکہ ان کے موحد بھی آپ کی رسالت کے منکر تھے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے کہ قبل از قتال کفار کو اسلام کی دعوت دینا واجب ہے لیکن یہ تب ہے جب اُن تک دعوت نہ پہنچی ہو۔ لیکن جب دعوت پہنچ جائے تو پھر ضروری نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے بنی مصطلق پر حملہ کیا تھا اور وہ غافل تھے۔

قوله فان هم أطاعوا لذلك: یعنی اسلام کے لیے گردن جھکا دیں۔

فاعلمهم ان الله قد فرض عليهم خمس صلوات في اليوم والليلة) اشرف زین العرب کی پیروی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فروعات کے مخاطب کفار نہیں ہیں جیسا کہ بعض اصولیوں کا مذہب ہے۔ بلکہ صرف اصول میں مخاطب ہیں۔ جیسا کہ اس پر دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا قول "**فويل للمشركين**" **الذين لا يؤتون الزكوة** [فصلت: ٦-٧] "**وقالو لم نك من المصلين**" [المدثر: ٤٤] اسے ابن حجر نے ذکر کیا ہے اور یہ اچھا کلام ہے لیکن یہ قول کہ اس میں دلیل ہے کہ وتر اور عیدین یہ واجب نہیں ہیں کیونکہ حدیث میں کوئی ایسی دلالت نہیں ہے جو نفی یا اثبات پر دلالت کرے حالانکہ وتر اور عیدین کی فرضیت کے بارے میں کسی نے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ بلکہ مفہوم ہمارے ہاں غیر معتبر ہے اور مفہوم عدد ساقط الاعتبار ہوتا ہے اتفاقی طور پر باوجود اس کے کہ مقام احکام کے بیان کا تقاضا کرتا ہے اجماع کے طور پر۔ لہٰذا مومن بندے سے تقاضہ ہے کہ شہادتین کا اقرار کرے اور پانچوں نمازوں پر اقتصار کیا ہے' حالانکہ نماز جنازہ بھی فرض ہے' بعض صورتوں میں فرض کفایہ ہے اور بعض صورتوں میں فرض عین ہے بالاتفاق اور ایسے ہی نماز وتر ہے۔ جو عشاء کی نماز کے بعد ہے۔ تو اسے اس کے ساتھ ہی ذکر کیا گیا تاکہ اس کا تذکرہ بھی ساتھ ہی ہو جائے اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ نماز عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد فرض ہوتی ہے یا پھر اس لیے ذکر نہیں کیا کہ جیسا کہ روزوں کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ یہ زکوٰۃ سے قبل کے فرض تھے۔ واللہ اعلم!

قوله: فان هم أطاعوا لذلك:...... **فترد على فقرائهم**۔

فاعلمهم: تاکہ حکم بھی ویسے ہی تدریجاً ہو جیسے کہ تکلیف نازل ہوئی ہے کہ مالی عبادت سے بدنی عبادت آسان ہے۔ یعنی انہیں خبر دو۔

ان الله قد فرض عليهم: یعنی سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی اور اسی کی مخصوص شروط ہیں۔

توخذ من اغنيائهم: طیبی فرماتے ہیں اس میں دلیل ہے کہ بچے کے مال میں بھی زکوٰۃ لازم ہے اور ابن حجر نے مجنون کا اضافہ کیا ہے اور یہ کہ ضمیر مکلفین کی طرف ہے اور یہ لوگ اس میں داخل نہیں ہیں۔

فترد على فقرائهم: یعنی اگر وہ یہ مال پائے اور ایک جگہ کا مال کسی دوسری جگہ دینا منع ہے اور ساقط بالاجماع ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ برأت ساحتہ ہے اور توھم کو دور کرنے کے لیے کیونکہ یہ کرم کے آداب کے خلاف ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں یہ دلیل ہے کہ مدفوع زکوٰۃ کا عین ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہے اگر مستحقین اُس میں موجود ہیں۔ بلکہ ہر ایک جگہ کا صدقہ اُس جگہ کے لیے ہی لائق ہے۔ اور [illegible] اتفاق ہے کہ جب زکوٰۃ منتقل ہو جائے اور ادا ہو جائے تو فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ماسوائے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

کے انہوں نے صدقہ رد کر دیا جو کہ خراساں سے شام کی طرف منتقل کیا گیا تھا۔ اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ اُن کا یہ فعل اجماع کی مخالفت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ عدل کے اظہار کے کمال میں اور اجماع میں قطعی ہے۔ پھر ظاہر حدیث یہ ہے کہ مال کا ایک صنف میں دینا جائز ہے۔ جیسا کہ یہ ہمارا مذہب ہے۔ بلکہ ایک ہی شخص پر اقتصار کرنا بھی درست۔ تو یہ حدیث مقابلۃ الجمع بالجمع پر محمول ہے۔

اور ہدایہ میں ہے کہ اگر حدیث معاذ نہ ہوتی تو ہم ذمی کو بھی زکوۃ دینے کا جواز لیتے جیسا کہ ہم نے صدقہ انہیں دینے کا کہا ہے اُس روایت کی وجہ سے جسے ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تصدقوا علی أهل الادیان کلها)) کہ تمام "اہل ادیان پر صدقہ کرو"۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: یہ حدیث غنی کے لیے صدقہ کو حلال نہیں کرتی۔ حدیث معاذ سمیت جیسا کہ یہ فائدہ دیتی ہے غزاۃ اور غارمین سے اور یہ حجت ہے شافعی کی تجویز پر کہ غنی غازی کے لیے صدقہ جائز ہے جب کہ اُسے دیوان اور مال فئی سے کچھ نہ ملا ہو اور پھر زکوۃ میں دوسری چیز معتبر زکوۃ کی جگہ ہے اور صدقہ فطر میں مکان الرس ہے۔ جو کہ اس سے نکالا گیا ہوتا کہ حکم کی رعایت کی جا سکے۔ جب کہ اُس کا سبب پایا جائے۔ تو اس کا منتقل کرنا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف یہ جائز نہیں ہے۔ مگر جب کہ یہ قریب ہی کسی جگہ ہو۔ یا پھر کسی سبب سے ضرورت والی جگہ کی طرف ہو۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: کہ اس کی توجیہ جسے ہم نے روایت کیا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قول سے کہ اہل یمن سے فرمایا: کپڑے بھی میرے پاس لے آؤ اور یا کوئی لباس بھی لے آؤ۔ صدقہ میں جو اور دانوں کے بجائے اور یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہیں اور اصحاب رسول اللہ ﷺ کے لیے مدینہ میں بھی مفید ہیں اور یہ چیز لازم کرتی ہے کہ اُس وقت مدینہ اس کا زیادہ حقدار محتاج تھا یا پھر جو تقسیم کے بعد باقی بچا تھا فقیروں میں تقسیم کرنے کے بعد اور جو قریبی لوگوں کو دینا ہے تو جب صلہ رحمی مطلوب ہو تو یہ قریبی لوگوں کو زکوۃ دینے سے بہتر ہے۔

قوله: فان هم أطاعوا الذلك فاياك و كرائم أموالهم: یہ "کریمہ" کی جمع ہے۔ یعنی اعلی اصناف کے مال لینے سے احتراز کرو۔ مال مگر انصاف کے ساتھ یہ امیر کے لیے انصاف ہے اور فقیروں کے حق میں ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ مال کا تلف کرنا زکوۃ ساقط کر دیتا ہے جب تک کہ ادا کرنے میں کمی نہ کی ہو فرض ہو جانے کے بعد۔

قوله: واتق دعوة المظلوم...... یعنی اس معاملہ میں یا دوسرے معاملہ میں یا پھر ایسی چیز تو لے لے کہ جس کا حق نہ ہو یا پھر تو اپنی زبان سے کسی کو نقصان دے۔

یہ ضمیر شان ہے۔

لیس بینها: یعنی اس کی قبولیت میں۔ کوئی بھی مانع بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں پیش کی جاتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ جلد قبول ہونے سے کنایہ ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ یہ ڈرانے کے لیے علت ہے اور دعا کی مثال پیش کرتا ہے یعنی جو مظلوم ہو اور بادشاہ کے پاس جائے تو اُس کو روکنا نہ چاہیے۔ باقی چاروں ائمہ نے بھی روایت کیا ہے۔

زکوٰۃ نہ دینے والوں کے لیے سخت وعید

۱۷۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ وَّلَا فِضَّةٍ لَا يُؤَدِّیْ مِنْهَا حَقَّهَا اِلَّا اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صُفِّحَتْ لَهٗ صَفَائِحُ مِنْ نَّارٍ فَاُحْمِیَ عَلَيْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَيُكْوٰی بِهَا جَنْبُهٗ وَجَبِيْنُهٗ وَظَهْرُهٗ كُلَّمَا رُدَّتْ اُعِيْدَتْ لَهٗ فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی يُقْضٰی بَيْنَ الْعِبَادِ فَيَرٰی سَبِيْلَهٗ اِمَّا اِلَى الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَى النَّارِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَالْاِبِلُ قَالَ وَلَا صَاحِبُ اِبِلٍ لَا يُؤَدِّیْ مِنْهَا حَقَّهَا وَمِنْ حَقِّهَا حَلْبُهَا يَوْمَ وِرْدِهَا اِلَّا اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بُطِحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ اَوْفَرَ مَا كَانَتْ لَا يَفْقِدُ مِنْهَا فَصِيْلًا وَّاحِدًا تَطَؤُهٗ بِاَخْفَافِهَا وَتَعَضُّهٗ بِاَفْوَاهِهَا كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ اُوْلَاهَا رُدَّ عَلَيْهِ اُخْرَاهَا فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی يُقْضٰی بَيْنَ الْعِبَادِ فَيَرٰی سَبِيْلَهٗ اِمَّا اِلَى الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَى النَّارِ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَالْبَقَرُ وَالْغَنَمُ قَالَ وَلَا صَاحِبُ بَقَرٍ وَّلَا غَنَمٍ لَا يُؤَدِّیْ مِنْهَا حَقَّهَا اِلَّا اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ بُطِحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ لَّا يَفْقِدُ مِنْهَا شَيْئًا لَيْسَ فِيْهَا عَقْصَاءُ وَلَا جَلْحَاءُ وَلَا عَضْبَاءُ تَنْطَحُهٗ بِقُرُوْنِهَا وَتَطَؤُهٗ بِاَظْلَافِهَا كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ اُوْلَاهَا رُدَّ عَلَيْهِ اُخْرَاهَا فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰی يُقْضٰی بَيْنَ الْعِبَادِ فَيَرٰی سَبِيْلَهٗ اِمَّا اِلَى الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَى النَّارِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَالْخَيْلُ قَالَ ثَلَاثَةٌ هِیَ لِرَجُلٍ وِزْرٌ وَّهِیَ لِرَجُلٍ سِتْرٌ وَّهِیَ لِرَجُلٍ اَجْرٌ فَاَمَّا الَّتِیْ هِیَ لَهٗ وِزْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا رِيَآءً وَفَخْرًا وَّنِوَاءً عَلٰی اَهْلِ الْاِسْلَامِ فَهِیَ لَهٗ وِزْرٌ وَاَمَّا الَّتِیْ هِیَ لَهٗ سِتْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَمْ يَنْسَ حَقَّ اللّٰهِ فِیْ ظُهُوْرِهَا وَلَا رِكَابِهَا فَهِیَ لَهٗ سِتْرٌ اَمَّا الَّتِیْ هِیَ لَهٗ اَجْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ فِیْ مَرْجٍ وَّرَوْضَةٍ فَمَا اَكَلَتْ مِنْ ذٰلِكَ الْمَرْجِ اَوِ الرَّوْضَةِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا كُتِبَ لَهٗ عَدَدَ مَا اَكَلَتْ حَسَنَاتٌ وَكُتِبَ لَهٗ عَدَدَ اَرْوَاثِهَا وَاَبْوَالِهَا حَسَنَاتٌ وَلَا تَقْطَعُ طِوَلَهَا فَاسْتَنَّتْ شَرَفًا اَوْ شَرَفَيْنِ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ عَدَدَ اٰثَارِهَا وَاَرْوَاثِهَا حَسَنَاتٍ وَلَا مَرَّبِهَا صَاحِبُهَا عَلٰی نَهْرٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ وَلَا يُرِيْدُ اَنْ يَّسْقِيَهَا اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ عَدَدَ مَا شَرِبَتْ حَسَنَاتٍ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَالْحُمُرُ قَالَ مَا اُنْزِلَ عَلَیَّ فِی الْحُمُرِ شَیْءٌ اِلَّا هٰذِهِ الْاٰيَةُ الْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (رواہ مسلم)

[illegible]رجه البخاری فی صحيحه ٣ حديث رقم ١٤٠٢ قسما منه۔ واخرجه مسلم كاملاً فی صحيحه ٦٨٠/٢ [illegible]ث رقم (٢٤۔ ٩٨٧)۔ وابوداوٗد فی السنن ٣٠٢/٢ حديث رقم ١٦٥٨۔ والدارمی فی السنن ٤٦٢/١

حديث رقم ١٦١٧ـ واحمد في المسند ٤٨٩/٢ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی سونا اور چاندی رکھنے والا اس کا حق ادا نہ کرے یعنی زکوٰۃ ادا نہ کرے۔تو جب قیامت کا دن ہوگا۔ان کے لیے آگ کے تختے بنائیں جائیں گے۔ یعنی وہ تختے سونے چاندی کے ہوں گے۔لیکن آگ میں گرم کیے جائیں گے۔گویا کہ وہ آگ کے ہوں گے۔پس ان کو دوزخ کی آگ سے گرم کیا جائے گا اور ان تختوں کے ساتھ اس کے پہلو اس کی پیشانی اور اس کی پیٹھ کو داغ دیا جائے گا۔ جب وہ تختے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔تو گرم کرنے کے لیے آگ میں ڈالیں جائیں گے اور نکال کر پھر داغ دیے جائیں گے ہمیشہ یوں ہی کرتے رہیں گے۔اس دن تک جس دن کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔اس کو بندوں کے سامنے حکم کیا جائے گا۔پس وہ اپنا راستہ جنت یا دوزخ کی طرف دیکھ لے گا۔کہا گیا اے اللہ کے رسول! یہ حکم تو نقدی کا ہے اور اونٹوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو کیا عذاب ہوگا۔فرمایا جب کسی اونٹ کے مالک نے ان کا حق ادا نہ کیا یعنی زکوٰۃ نہ دی۔تو قیامت کے دن اس کو منہ کے بل اونٹوں کے سامنے ہموار میدان میں ڈالا جائے گا۔اس حالت میں کہ اونٹ گنتی میں بھی مکمل ہونگے اور موٹا ہونے میں بھی تا کہ ان کے روندنے میں تکلیف زیادہ ہو اور اس کو اپنے پاؤں کے ساتھ کچلیں گے اور اس کو اپنے دانتوں سے کاٹیں گے اور اونٹوں کی ایک جماعت ان پر گزرے گی تو وہ دوسری جماعت بھی ان کے پیچھے آئے گی۔یعنی اس طرح سے اس کو کچلا جائے گا۔ایک قطار کے بعد دوسری قطار اونٹوں کی کچلے گی اس دن جس دن کی مقدار پچاس ہزار برس ہے یہاں تک کہ اس کو بندوں کے سامنے حکم کیا جائے گا۔پس وہ بہشت (جنت) یا دوزخ کی طرف اپنا راستہ دیکھے گا۔پوچھا گیا اے اللہ کے رسول! گاؤں کے مالک اور بکریوں کے مالک کا کیا حال ہوگا؟ تو ارشاد فرمایا: جب گاؤں اور بکریوں کا مالک ان کا حق ادا نہیں کریگا تو قیامت کے دن اس کو ہموار میدان میں ڈالا جائے گا اور اس سے کوئی چیز کم نہیں ہوگی اور ان میں کوئی گائیں بکری ایسی نہیں ہوگی جن کے مڑے ہوئے سینگ ہوں نہ منڈی ہوئی اور نہ سینگ ٹوٹی ہوئی۔یعنی تمام کے سینگ سلامت ہونگے۔پھر ان کو اپنے سینگوں کے ساتھ خوب سینگ ماریں گے اور اس کو اپنے کھروں کے ساتھ کچلیں گے۔جب ایک جماعت گزر جائیگی تو دوسری جماعت لائی جائے گی۔اس دن کہ جس دن کی مقدار پچاس ہزار برس کے برابر ہوگی یہاں تک کہ اس کو بندوں کے سامنے حکم دیا جائے گا۔پس وہ اپنا راستہ جنت یا دوزخ کی طرف دیکھ لے گا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھوڑوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ گھوڑوں کا کیا حکم ہے؟ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو آدمی کے لیے گناہ کا سبب ہوتے ہیں اور دوسرے آدمی کے لیے پردہ ہوتے ہیں اور تیسرے آدمی کے لیے بطور ثواب کے ہوتے ہیں۔پس وہ گھوڑے جو گناہ کا سبب بنتے ہیں۔اور وہ گھوڑے جو اس کے لئے پردہ ہیں وہ جن کو فخر و ریا کاری کے لیے اور اہل اسلام سے دشمنی کے لئے باندھا گیا ہے۔پس یہ گھوڑے اس کے لیے گناہ کا سبب بنتے ہیں وہ ہیں پس وہ گھوڑے اس شخص کے ہیں جنہیں آدمی نے اللہ کے راستے میں باندھا پھر وہ ان کی پیٹھوں (یعنی پشتوں) پر سوار ہو کر اور گردنوں پر سوار ہو کر اللہ رب العزت کی اطاعت کو نہیں بھولا۔تو وہ گھوڑے اس کے لیے پردہ ہیں اور وہ گھوڑے جو باعث ثواب ہیں تو وہ گھوڑے اس شخص کے ہیں کہ جس نے ان کو سرسبز چراگاہ میں اہل اسلام کے لیے خدا کے راستے میں باندھا ہے۔تو جب بھی وہ اس چراگاہ اور سبزے سے کھاتے ہیں۔اس کے لیے ان چیزوں کے کھانے کی بقدر نیکیاں لکھی جاتی ہیں یعنی گھاس دانہ وغیرہ۔اس کے لیے ان کی لید اور پیشاب کی بقدر نیکیاں لکھی

جاتی ہیں۔ جب وہ گھوڑے اپنی رسی کو توڑتے ہیں پھر وہ ایک یا دو میدانوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان کے نقش قدم کے برابر اور ان کی لید کے برابر نیکیاں لکھ لیتا ہے۔ جو اس حالت میں کرتے ہیں اور جب ان کا مالک ان کو نہر پر سے لے کر گزرتا ہے تو وہ اس سے پیتے ہیں حالانکہ اس کا پانی پلانے کا ارادہ نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے پانی پینے کی بقدر نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ پھر آپ سے پوچھا گیا اللہ کے رسول گدھوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ فرمایا گدھوں کے بارے میں مجھ پر کچھ نازل نہیں ہوا۔ مگر ایک جامع آیت جو سب نیکیوں اور بندگیوں کے لیے جامع ہے جو شخص ایک ذرے کے برابر بھلائی کرے گا اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ایک ذرہ کے برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ما من صاحب ذهب ولا فضة لايودى منها حقها :تورپشتی فرماتے ہیں کہ ضمیر سونے اور چاندی کی طرح معناً لوٹتی ہے اور الفاظ سے نہیں جبکہ ان دونوں پر کوئی حقیر چیز وارد نہیں ہوئی بلکہ دیناروں اور درہموں سے کافی ہو۔ یا پھر یہ ضمیر تاویل کے ساتھ ہے مال کی تاویل کرنے کے ساتھ یا پھر یہ ضمیر چاندی کی طرف لوٹتی ہے۔ کیونکہ یہ زیادہ قریب ہے اور اس سے سونے کی حالت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر ایک چیز کا ارادہ فرمایا ہے دونوں میں سے اور سونا مؤنث ہے کیونکہ یہ عین کے معنی میں ہے حدیث میں آیا ہے قرآن مجید کے مطابق ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [التوبہ: ٣٤] ''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو'' تو اس میں صرف اس کے صاحب کی حالت پر اکتفا کیا گیا ہے سونے والے صاحب کی حالت کی بجائے۔ یا پھر شاید اس لیے کہ چاندی سے زیادہ نفع حاصل کیا جاتا ہے سونے کی نسبت اور زیادہ مشہور ہے اجناس کی قیمتوں میں اسی لیے اسی پر اکتفاء کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں کہ ''جو پانچ اوقیہ سے زیادہ ہو چاندی اُس میں صدقہ نہیں ہے۔ اور یہ اس قول کا معنی ہے۔

الا اذا كان يوم القيامة : یہ تمام احوال سے استثناء ہے۔

صفحت : فاء کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی چاندی کو بھی ایسے ہی بنایا گیا ہے۔ اور اس جیسی دوسری چیزیں۔

صفائح : سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ یہ عریض کے تابع ہے اور یہ مرفوع بھی قراءت کی گئی ہے اس بنیاد پر کہ یہ مفعول مالم ليسمح فاعله ہے۔ اس قول صفحت کی وجہ سے اور منصوب بھی ہے اس بناء پر کہ یہ مفعول ثانی ہے اور فعل میں ضمیر ہے سونے اور چاندی کی طرف اور اسے مؤنث قرار دیا گیا ہے سابقہ تاویل کے ساتھ یا پھر اس اور مفعول ثانی کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے۔ اور یہ آخری کلام ہے اور یہ کلام بالکل اُس جیسا ہے۔

من نار :اى يجعل له صفائح من نار أو يجعل الذهب والفضة صفائح من نار۔ یا پھر سونے اور چاندی ہی صفائح بنا دیئے جائیں گے۔ یعنی وہ کٹرے اس طرح سے بنا دیئے جائیں گے گویا کہ وہ آگ ہیں یا پھر گویا کہ وہ آگ سے بنائے گئے ہیں۔ یعنی وہ کٹرے ہوں گے تو سونے اور چاندی سے لیکن اپنی شدت حرارت کی وجہ سے وہ آگ کے کٹرے بن جائیں گے اور پھر ان کے ساتھ اُن کے چہروں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا یہ تاویل ہے اس آیت سے ہاں اللہ تعالیٰ

نے فرمایا ہے:﴿ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ [التوبہ:۳۵] "یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا اپنی جانوں کے لیے تو اُسے چکھو" تو سونے اور چاندی کو وہ داغنے کا سبب بنایا گیا ہے اور اس کا یہی معنی ہے۔

فاحمی علیها : صیغہ مجہول کے ساتھ اور جار مجرور نائب فاعل ہیں یعنی "أی علیها ذات حمی و حر شدید" اس قول ﴿ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴾ [القارعۃ:۱۱] سے اور اس میں مبالغہ ہے جو فاء حمیت فی نار میں نہیں ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ علیہا میں ضمیر فضتہ کی طرف راجع ہے۔ اور فا تفسیر یہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "الصفائح الناریہ" کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی دوسری مرتبہ بھی اُن کے لیے گرم کی جائے گی۔

فی نار جهنم : تا کہ اُس کی گرمی شدت پکڑے اور فاء تعقیبیہ ہے۔

بها : یعنی اس چاندی کے ساتھ یا پھر اس کڑے کے ساتھ۔

کیونکہ فقیر ان کے سامنے ہوتے تھے اور یہ اعراض کرتے تھے تو اس کا چہرہ اور پیٹھ اس سے بے رغبتی کرتے تھے۔ تو اس کے مال کے ساتھ اُس کے اعضا کو گرم داغا جائے گا۔ جس کے ساتھ اس نے فقیر کو تکالیف دی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کیونکہ یہ سب سے زیادہ معزز اعضاء ہیں ظاہری طور پر اور یہ تمام بڑے اعضاء پر مشتمل ہیں اور یہ دماغ اور دل اور جگر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد چاروں سمتیں ہیں جو کہ بدن کے سامنے والا حصہ پیچھے والا اور پہلو ہے۔

قوله : کلماردت ای کلما ردت عن بدنه الی النار أعیدت ای اشد ما کانت۔ یعنی اُس کا بدن آگ کی طرف۔

أعیدت) یعنی وہ حالت مزید سخت کر دی جائے گی۔ طیبی نے کہا جب وہ ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر دوبارہ جہنم کی آگ لوٹا دی جائے گی۔ تا کہ اُسے داغا جائے اور اس سے مراد ہیشگی ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں: جب وہ اوزار بدن سے لگائے جائیں گے اول سے آخر تک تو پھر دوبارہ وہ اوزار واپس لوٹا دیے جائیں گے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "ردت" میں ضمیر اعضاء کی طرف راجع ہو۔ یعنی جب وہ اعضاء دوبارہ دیے جائیں گے جل جانے کے بعد اور ختم ہو جانے کے قریب ہوں گے تو وہ کھڑے دوبارہ اُن پر لوٹا دیے جائیں گے۔ تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے قول سے موافق بھی ہو جائے گا۔ "جب ہم اُن کی جلدوں کو داغیں گے تو وہ پھر ہم وہ تبدیل کر دیں گے دوسری جلدوں کے ساتھ تا کہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔"

فی یوم کان مقداره خمسین ألف سنة : یعنی کافروں کے لیے اور دیگر نافرمانوں پر بھی یہ ایسے ہی لمبا ہوگا اُن کے گناہوں کے مطابق۔ مگر جو مؤمنین ہوں گے کامل تو اُن کے لیے بعض کے لیے فجر کی دو رکعت کے برابر ہوگا اور اس کی طرف اللہ تعالیٰ کے فرمان میں اشارہ ہے:﴿ يَوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴾ [المدثر: ۹، ۱۰] "وہ دن آسان ہوگا لیکن کافروں پر آسان نہ ہوگا۔"

یقضی : مبنی علی المفعول کی بنا پر یعنی اللہ فیصلہ کرے گا۔

اور اس میں اشارہ ہے کہ حساب اور بقیہ عذاب میں گزرے گا اسی لیے کہا گیا ہے: الدنیا حلالها حساب و حرامها عقاب۔ ''کہ دنیا کی حلال چیزوں کا حساب ہوگا اور حرام کا عذاب ہوگا''۔

فیری صیغہ مجہول کے ساتھ۔ رؤیہ سے یا "الارائة" سے ماخوذ ہے۔

سبیله : اول سے مرفوع اور دوم سے نصب کے ساتھ ہے اور دوسرے مفعول پر ایک نسخہ میں ''فیری'' صیغہ معلوم کے ساتھ ہے۔ رؤیۃ سے ہے یعنی اُس کا راستہ۔ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے یا کے فتحہ کے ساتھ درج کیا ہے اور رفع کے ساتھ بھی اور سبیلہ کا لام فتحہ کے ساتھ۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ اسلوب اختیاری ہے اور یو میئذ مقہور ہے تو جائز نہیں ہے کہ اس کی آگ کی طرف نسبت کی جائے۔ جنت کی بجائے دونوں میں سے ایک کا تعیین کرنے سے پہلے۔

إما الى الجنة : اگر اُس کے گناہ نہ ہونگے وگرنہ عذاب اُن سے کفارہ ہوگا۔

واما الى النار : اگر اس کے خلاف ہوں گے اور اس میں رد ہے اُس کا جو کہتا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تائید قاعدہ اصولیہ سے ہوتی ہے کہ عبرت الفاظ سے عموم کی ہوتی ہے نہ کہ خصوصی واقعہ کے ساتھ خاص ہے۔ باوجود اس کے کہ حدیث میں کوئی دلالت موجود نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اسی سے ابن حجر کے قول کا ضعف ثابت ہوتا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائے گا اگر مؤمن ہوگا کہ وہ نہ ترک زکوٰۃ کو حلال جانے اور یا پھر جہنم میں جائے گا اگر اُس نے کفر کیا کہ وہ ترک زکوٰۃ کو حلال جانتا ہو۔

قیل یا رسول الله! فالابل ای هذا حکم النقود فالإبل ما حکمها ؟ أو عرفنا حکم النقدین فما حکم الابل؟

یعنی یہ تو نقدی کا حکم ہے تو اونٹ کا کیا حکم ہے یا پھر ہم نے دو نقدی چیزوں کا حکم تو جان لیا ہے تو اونٹ کا کیا حکم ہے فاء محذوف کے ساتھ متصل ہے۔

ولا صاحب : رفع کے ساتھ۔ یعنی اُسے بھی حاضر کیا جائے اور جر کے ساتھ بھی کہا گیا ہے ''صاحب ذہب'' پر عطف کرتے ہوئے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ سوال کا جواب نہیں ہے لفظی طور پر کیونکہ واؤ موجود ہے بلکہ اس کا جواب ہے کیونکہ یہ تلقین العطف کے باب سے ہے لیکن معناً ہے لفظاً نہیں ہے۔

لایودی : صفت ہے یعنی اونٹ والے بھی اگر زکوٰۃ نہ ادا کرتے ہوں گے۔

ومن حقها : یہ مندوب ہے اور من تبعیضیہ ہے۔

حلبها : نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: لام کے فتحہ کے ساتھ اور یہ مشہور لغت ہے اور اس کا سکون بھی حکایت کیا گیا ہے لیکن بہت ضعیف ہے اگرچہ یہ قیاس ہے۔

یوم وردها : کہا گیا ہے کہ ''ورد پانی کی طرف آنے کو کہتے ہیں'' اور پانی کی طرف باری کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اونٹ پانی کی طرف ہر دوسرے اور تیسرے اور چوتھے دن آتے ہیں بسا اوقات آٹھ دنوں کے بعد آتے ہیں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: دودھ دوہنے کا مقصد اُس کے وارد ہونے کا دن ہے یعنی وہ گزرنے والے کو جس دن اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی

نہی ہے۔رات کے وقت کیا جائے بلکہ دن کے وقت کا حکم دیا تا کہ فقراء لوگ بھی حاضر ہو سکیں۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ ورد کے دن کا حصر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ اکثر اونٹ پانی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور یہ استحباب کے طریقے پر ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ حق یہ ہے کہ اسے پانی پینے کے دنوں میں ہی دودہ لیا جائے کہ پیاس کا احساس نہ ہو۔اور دودھ دوہنے کی مشقت نہ ہو۔اور یہ بات جان لے کہ اس کا ذکر سرسری طور پر ہوا ہے اور کہا کہ جو چیز مناسب ہے اُس کا پتہ چل جائے وگرنہ اس پر عذاب مرتب نہیں ہوتا۔کیونکہ یہ بات تو حتمی ہے کہ عذاب واجب کام کے چھوڑنے پر ہوتا ہے یا پھر حرام کام کے کرنے پر ہوتا ہے یا پھر انہیں قحط کے وقت پر محمول کیا جائے یا مجبوری کی حالت میں یا پھر مال کی ضیافت کی وجوب میں اور یہ ہے اُس کا مطلب جو کچھ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا پہلا حق دوسرے سے زیادہ حام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عذاب دونوں پر سختی کے ساتھ ہوگا۔

الا اذا کان یوم القیامۃ: استثناء مفرغ ہے تمام حالات سے۔

بطح: کہ اونٹ کا مالک اپنے چہرے پر بل الٹا ہوگا۔

لھا: یعنی ان اونٹوں کے لیے اور ایک نسخہ میں ہے کہ اپنے اونٹوں کے لیے یا اپنے فعل کی وجہ سے یا پھر اسے فاعل کے قائم مقام لایا گیا ہے۔تورپشتی فرماتے ہیں: کہ بعض نسخوں میں مذکر کے ساتھ ہے اور یہ خطا ہے روایتاً اور درایتاً کیونکہ ضمیر مرفوع فعل میں اونٹ کے مالک کے لیے ہے۔اور مجرور بھی اہل کے لیے ہے تا کہ وہ ٹھیک رہے اور روندے جانے والا مالک ہوگا نہ کہ اونٹ ہوگا۔طیبی فرماتے ہیں کہ اگر روایت کا معنی لیا جائے تو ٹھیک ہے اگر ویسے معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پھر یہ جائز کیوں نہیں ہے کہ مذکر ضمیر لائی جائے جنس کے ارادہ سے یا پھر تاویل کے ارادہ سے اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر صاحب اہل کی طرف لوٹے تو پھر جارا مجرور فاعل کے قائم مقام ہوں گے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے:﴿ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ [النور: ۳۶] اُسی کی تسبیح کرتے ہیں صبح وشام۔

بقاع: یعنی وسیع ہموار زمین میں۔

قرقر: یعنی ہموار برابر تو یہ صفت ہوگئی۔

أوفر ما کانت: یعنی تعداد میں بھی زیادہ اور بہت زیادہ موٹے اور بہت زیادہ قوت والے شرح سنہ میں ہے کہ دراصل اونٹ کی حالت بتانا مقصود ہے۔جو کہ اپنے مالک کو روندے گا قوت سے اور موٹا اس لیے تا کہ زیادہ وزنی ہو روندنے میں۔طیبی فرماتے ہیں: کہ اُوفر ما مصدر یہ کی طرف مضاف ہے اور وقت مقدر ہے اور یہ مطلب؟ منصوب حال پر مجرور سے لھا میں اور عامل سطح ہے۔

لا یفقد: یعنی مالک کو۔

منھا: یعنی اونٹ سے۔

فصیلا: یعنی اونٹ کا بچہ۔

واحدًا تاکید ہے اور یہ جملہ اُوفر کے لیے مؤکدہ ہے۔

تطئوه: حال ہے یا پھر جملہ مستانفہ ہے اس چیز کا بیان ہے کہ اُسے مارے گا اور روندے گا۔
اونٹ کے پاؤں۔
و تعضه: عین کے فتحہ کے ساتھ یعنی اُسے کاٹے گا اور اُس کی جلد کاٹے گا۔
بافواهها: مراد دانت ہیں یعنی وہ اپنے دانتوں کے ساتھ۔
كلما مر عليه أولاها: یعنی اونٹوں کا پہلا۔
رد عليه أخراها: ظاہر یہ ہے کہ یہ عکس کہا گیا ہے جیسا کہ مسلم کی بعض روایات میں ہے کہ جب پہلا اونٹ گزرے گا تو دوسرا آجائے گا۔اور جو اس کتاب میں ہے اس کی توجیہہ یہ ہے کہ پہلا ہی کئی مرتبہ آئے گا جب یہ انتہائی غایت تک پہنچے گا تو پھر دوسرا شروع ہو جائے گا۔تو یہ کام مسلسل ہوتا رہے گا اور بار بار آنے سے یہ بطریق طرد ہے یا عکس ہے لیکن یہ عکس سے زیادہ اولی ہے۔حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کام مسلسل ایک کے بعد دوبارہ ہوگا۔
حتى يقضى بين العباد: گویا کہ یہ بندے ہی نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے فقیروں پر رحم نہیں کیا زاہدوں اور عابدوں میں سے۔
قيل يا رسول الله فالبقروا لغنم: یعنی ان کا کیا حال ہوگا
لا يودى منها: "من" تعليليه ہے۔اى من أجلها۔ پس یعنی اس وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ بھی اُسی کی جنس سے ہیں۔
ایک نسخہ میں "له" ہے۔
بقاع قر قر لا يفقد منها: یعنی اُس کی ذات اور صفات۔
شيئا: طیبی فرماتے ہیں: یعنی ان کے سینگ صحیح و سالم ہوں گے۔
اور تینوں کی نفی اس لیے کی ہے کہ یہ عبارت ہے سینگ باقی ہونے سے تا کہ زیادہ زخمی کرے۔لیکن ظاہر حدیث یہ ہے کہ یہ صفات معدوم ہیں عقبی (آخرت) میں اگرچہ یہ دنیا میں موجود ہیں اور ظاہر طور پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جو دنیا میں موجود ہیں ظاہر طور پر واپس لوٹا دے گا جیسا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔شاید پہلے انہیں پیدا کرے گا پھر انہیں سینگ عطا کرے گا۔تا کہ عذاب دینے میں شدت آسکے۔واللہ اعلم۔
تنطحه: طاء کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ۔قاموس میں ہے۔نطحہ اسے روکنے کی طرح ہے اور سینگوں۔ سے مارنا مراد ہے۔
بقرونها: یا تو تاکید ہے یا پھر تجرید ہے۔
وتطؤه باظلافها: ظلفٌ کی جمع ہے یہ بکری اور گائے کے لیے گھوڑے کی کھر کی مانند ہے۔
كلما مر عليه أولا هارد عليه أخراها في يوم كان مقداره خمسين ألف سنة يقضى بين العباد فيرى سبله إما الى الجنة واما الى النار قيل يا رسول الله فالخيل قال فالخيل: طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حکیم کے اسلوب پر

جواب ہے اس کی دو توجیہ ہیں مذہب شافعی کے مطابق اس کا مطلب ہے کہ وجوب کے بارے میں سوال چھوڑ دو کیونکہ اس میں مقرر حق فرض نہیں ہے۔ لیکن میرا سوال اس کے بارے میں ہے جو منفعت اور نقصان میں اپنے صاحب کی طرف لوٹے گا اور ایک مذہب کے مطابق اس کا معنی ہے کہ جن میں حقوق واجب ہیں اُن کے بارے میں سوال نہ کرے بلکہ اُن چیزوں کے بارے میں سوال کرے جن میں منفعت اور نقصان چلا ہوا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث سے وجوب پر دلیل کیسے لی جا سکتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ رقاب کو عطف دیا جائے ظہور پر کیونکہ رقاب سے مراد ذوات ہیں کیونکہ رقاب میں تو دوسرے کے لیے فائدہ نہیں ہے جیسا کہ ظہور میں ہے اور آنے والے جواب کے مفہوم سے جو گدھے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: **ثم لم ینس حق الله فی رقابها أداء زکاة تجارتها۔** میرے اوپر گدھے کے بارے میں کچھ نازل نہیں ہوا۔'' قاضی نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہ قول: **ما أنزل علی فی الحمر شیئ۔** ''پھر اللہ کے حق کو بھی نہ بھولنا'' یہ اس کے تجارت میں زکوۃ ہی ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ گھوڑے کا کیا حکم ہے کیا اس میں بھی زکوۃ فرض ہے اور نہ دینے والے کو سزا ہے؟ یا پھر نہیں ہے؟ تو گھوڑے کے تین مختلف احکام میں یعنی جو گزر چکے ہیں اس کے علاوہ ان میں زکوۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس کے نہ دینے والے کو سزا دی جائیگی۔ سیاق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے عین ممکن ہے کہ صریح کے بھی قریب ہو لیکن اُس کے لیے جو ادنیٰ سا بھی انصاف رکھتا ہو۔ ہمارے جملہ مذاہب میں سے ہے کہ اس میں زکوۃ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو کچھ سیاق سے ذکر کیا ہے تو یہ مکابرہ میں سے ہے حذاق کے ہاں کیونکہ سیاق کلام اس مقام پر ہے بلکہ محض مقصود اور مراد وہ یہ ہے کہ زکوۃ نقدی اور حیوانات میں بھی ہے چونکہ اس کا جواب دلیل کے مطابق نہ تھا تو اس لیے محققین نے اسے حکیموں کے جواب پر حمل کیا ہے۔ اور اسے پر مذہب کے مطابق اتارا ہے جس کا تقاضہ طبع سلیم کرتی ہے۔ پھر فرمایا: جو تائطین کے اقوال ہیں اس کے وجوب کے بارے میں تو اس میں تقدیر ہے اس کے بھی تین احکام ہیں زکوۃ کے علاوہ اور اسی سے الفاظ نکلتے ہیں لیکن سنے نہیں جا سکتے۔ اور کہا یہ مناقضہ ہے کلامیہ اور مدافعہ کے درمیان دو تقدیروں کے درمیان کیونکہ دوسری تقدیر وہ اول کی عین ہے جس کے پاس سماعت اور دل ہے اور غور و فکر کر سکتا ہو۔ اور جو یہ قول ہے کہ اس میں کچھ زکوۃ نہیں ہے تو یہ باطل ہے جس کے پاس اپنے مذہب کی کوئی تقویت والی چیز ہے۔ پھر ایک ایسی چیز کا تذکرہ کیا ہے جس میں زلل اور خطل کی احناف میں سے کچھ چیزیں تھیں، ہم نے ہلاکت اور ملامت کے خوف سے اُن کا ذکر نہیں کیا۔

ثلاثة فالخیل :ای ربطها علی ثلاثة انحاء:

وهی لرجل : یعنی اُس کی معیشت میں اسے محتاجی اور سوال سے محفوظ رکھتی ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ اس قول ''**فالخیل ثلاثة**'' میں کہ اس میں جمع تفریق و تقسیم ہے جمع یہ ہے کہ ثلاثۃ اور تفریق یہ قول ہے۔

فاما التی هی له و زر فرجل...... فی له وزر : ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جاتا کہ وہ گھوڑا جسے باندھا گیا تھا یا پھر کہا جاتا ہے: **واما الذی له وزر فرجل۔** کہ جس کے لیے بوجھ ہے وہ گھوڑا ہے لیکن زیادہ واضح یہ ہے کہ تقدیر یوں ہے ''فخل

رجل"۔

ربطهار یاء: ہمزہ کے ساتھ۔اور یہ بدل ہے تا کہ لوگ اس کی عظمت دیکھیں سواری میں اور حشمت میں۔

فخرًا: یعنی زبان کے ساتھ دوسرے لوگوں پر فخر کرے۔

ونواء: نون کے کسرہ کے ساتھ مد اور واؤ کے ساتھ اُو کے معنی میں یعنی لڑائی اور دشمنی کے لیے۔

قوله علی أهل الاسلام: ابن ملک فرماتے ہیں: **ربطها تغنیا و تغففا۔** یعنی تا کہ وہ اس پر اکتفاء کرے اور اس سے بچہ جنوائے اور سوال سے بچا رہے یعنی ضرورت کے وقت سواری کر سکے۔آپ پر یہ مخفی نہ رہے گی کہ جو چیز ذکر کی ہے وہ بوجھ کو واجب نہیں کرتی بلکہ ستر کو واضح کرتی ہے۔ بلا اختلاف۔تو صحیح بات یہ ہے کہ اس روایت کا محل دوسرے آدمی کے بارے میں ہے۔جیسا کہ آگے آئے گا۔

فهي: له وزر: یہ جملہ مؤکدہ ہے۔

واما التی هی له ستر فرجل ربطها فی سبیل الله...... فهي له ستر: ابن ملک فرماتے ہیں: کہ تا کہ جہاد کر سکے اور صحیح بات وہ ہے جسے طیبی نے کہا ہے جہاد کا تذکرہ تو نہیں ہے بلکہ نیک نیت' کیونکہ یہ تکرار کو لازم کرتی ہے۔اور اسی طرح جب جہاد کا ارادہ کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے اجر ہوگا تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُس کے لیے ستر ہے۔طیبیؒ فرماتے ہیں: اسے دوسری روایت مضبوط کرتی ہے "**ورجل ربطها تغنیًا و تعففًا**" یعنی بے نیازی اور سوال سے بچنے کے لیے کہ اس کے ساتھ عفت اور عنابت کو حاصل کر سکے۔ یا پھر اس کے ذریعہ تجارت اور زراعت کر سکے تو پھر یہ اُس کے لیے ستر ہوگا۔ جو اسے فاقہ سے بچائے رکھے گا۔

ثم لم ینس حق الله فی ظهورها: یعنی عاریتاً سواری یا جفتی کے لیے۔

ولا رقابها: طیبیؒ فرماتے ہیں: یا تو تاکید ہے اور ظہور کے لیے تتمہ ہے یا پھر دلیل ہے زکوٰۃ کے وجوب پر۔دوسری چیز یہ کہ اسے حمل کیا ہے پہلی کی بنیاد پر تاکید سے کیونکہ عطف میں اصل مغایرت ہے تو یہ اونٹ کی طرح ہو جائے گا۔

فهي له ستر: یعنی پردہ جو اسے لوگوں سے حاجت سے روکے گا۔

قوله: وأما التی هی له أجر فرجل ...... عدد ما شربت حسنات: ربطها فی سبیل الله لاهل الاسلام۔
اس میں اشارہ ہے کہ اس سے مراد جہاد ہے اور اس کا فائدہ اہل اسلام کو پہنچتا ہے۔

فی مرج: میم کے فتحہ کے ساتھ اور راء کے سکون کے ساتھ یعنی مرعی۔النہایہ میں ہے کہ یہ ایسی وسیع زمین کو کہتے ہیں: جو بہت ساری چیزیں اُگائے جانور بھی اس میں سے گزرتے ہوں' اور جار ربط کے ساتھ متعلق ہے۔

وروضة: عطف تفسیر ہے یا پھر روضہ خاص ہے مرعی سے اور مصابیح کے ایک نسخہ میں ہے ان الفاظ کے ساتھ یا ابن ملک نے فرمایا: راوی کا شک ہے۔

من ذلك المرج: یہ بیان مقدم ہے۔

من شیئ: یعنی گھاس پھوس سے کم ہو یا زیادہ ہو۔

حسنات : رفع کے ساتھ نائب فاعل ہے اور عدد کا نصب ہے نزع الخافض پر یعنی جس قدر وہ کھائے گا۔ وکتب له عدد أرواثها و ابوا لها حسنات۔ کیونکہ اس میں اُس کی زندگی کی بقاء ہے باوجود اس کے کہ اس کی اصل استحالہ سے قبل ہے غالباً اس کے مالک کے مال سے۔

طولها: طاء کے کسرہ کے ساتھ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی اُس کی وہ لمبی رسی جس کی ایک طرف گھوڑے کے پاؤں کے ساتھ باندھی ہوئی ہے تاکہ وہ اس میں گھوم سکے اور اردگرد سے چر سکے اور کہیں اور نہ جائے۔

فاستنت: نون کی تشدید کے ساتھ۔

ولا راکب علیها شرفا: یعنی کچھ قدم یا میدان یا زمین میں کچھ جگہ بلند یا پھر کسی چراگاہ میں نکل جائے۔ یا پھر کسی اور جگہ چلا جائے۔

اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جانور چھوٹ جاتا ہے اور زمین میں کسی اونچی جگہ چلا جاتا ہے وہاں کھڑا ہوتا ہے اور پھر وہاں سے کھاتا ہے۔

ولا مربها: یعنی عبور کیا۔

صاحبها علی نهر...... عدد ما شربت حسنات ۔

نهر : ہاء کے فتحہ کے ساتھ اور سکون کے ساتھ۔

ولا یرید: یعنی اس کی حالت یہ ہے کہ اُس کا صاحب کا اگرچہ ارادہ نہ بھی ہو۔ (یہ جملہ حالیہ ہے) ای والحال ان صاحبها لاینوی۔

أن یسقیها : یاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ۔

طیبیؒ کہتے ہیں: کہ اس میں ثواب کے نفرت ہوتی ہے اور طبیعت متنفر ہوتی ہے تو پھر کیسے اُن چیزوں کے بارے میں کیا ہوگا جو ان کے علاوہ ہیں اور ایسے ہی جب ایسی چیز کا بھی شمار ہو جس کی نیت بھی نہ کی ہو اور یہ بھی وارد ہوا کہ ''ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی وہ نیت کرے گا۔'' تو پھر کیا ہوگا جب وہ قصداً کرے گا احتساب کا۔

ابن ملک فرماتے ہیں: حاصل کلام یہ ہے کہ اُس کے مالک کے لیے تمام حرکات وسکنات اور مفضلات کے لیے بھی نیکی لکھ دی گئی ہے۔

قیل یا رسول الله فالحمر......: دوضموں کے ساتھ۔ یہ حمار کی جمع ہے یعنی اس کا کیا حکم ہے ابن ملک فرماتے ہیں کیا اس میں زکوۃ فرض ہے؟

الاهذه الآیة رفع اور نصب دونوں کے ساتھ ہے۔

الفاذة: ذال معجمہ کے ساتھ مشددہ جو اپنے معنی میں منفرد ہو۔

الجامعة: تمام بھلائیوں کے لیے۔ ابن ملک فرماتے ہیں: یعنی قرآن مجید میں کوئی آیت نہیں ہے۔ قلت الفاظ اور جمع معانی خیر اور شر میں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: جامعہ اس لیے نام دیا گیا ہے کیونکہ خیر کا اطلاق طاعات کی تمام انواع فرائض، نوافل پر

ہوتا ہے۔ یا شر کا نام جو چیزیں اس سے مقابل ہیں کفر اور اور نافرمانی چھوٹی اور بڑی۔ اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ جامعہ یا منفردہ یہ غلطی پر مبنی ہے۔ اصل میں سقوط ہے لفظ جامعہ سے متن حدیث سے اور یہ اصول کے بھی مخالف ہے۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷] "جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ: یعنی چونٹی جتنا یا پھر ہوا میں اڑنے والے ذرے جتنا۔

خیراً یرہ: یعنی اُس کا جزا وثواب دیکھے گا۔

ومن یعمل مثقال ذرہ شر ایرہ: اگر اُس نے کسی ایک کی نیکی میں سواری کے ساتھ مدد کی تو ثواب ملے گا اور اگر کسی ایک کی برائی میں سواری کرنے کے ساتھ مدد کی تو سزا دیا جائے گا۔ اصفہانی نے روایت کیا ہے ابن عباس سے مرفوعاً کہ نادم اللہ کی جانب سے نظر رحمت سے دیکھا جائے گا اور تعجب کرنے والا لنظر ناراضگی سے دیکھا جائے گا۔ اے اللہ کے بندو عمل کرو کیونکہ ہر عمل کرنے والا عنقریب ضرور نادم ہوگا اور وہ دنیا سے نہ جائے گا یہاں تک کہ اپنے اچھے اعمال دیکھ لے گا اور برے اعمال دیکھ لے گا اور اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے دن اور رات جلدی سے چل رہے ہیں ان پر اچھے طریقے سے چلتے ہوئے آخرت کی طرف بڑھو اور تسویف سے بچو کیونکہ موت اچانک آئے گی تمہیں اللہ کا حکم دھوکے میں نہ رکھے اور جنت اور جہنم تمہارے جوتے کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہیں جو نیک اعمال کرے گا وہ بھلائی دیا جائے گا اور جو برے اعمال کرے گا وہ اُس کا برا بدلہ دیا جائے گا۔

زکوۃ ادا نہ کرنے والے کے لیے وعید

۱۷۷۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا لاً فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهٗ مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ يَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَعْنِىْ شِدْقَيْهِ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ ثُمَّ تَلَا وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۔ حدیث رقم ۱۴۰۳۔ والنسائی ۳۸/۵ حدیث رقم ۲۴۸۱۔ ومالك فی الموطأ ۲۵۶/۱ حدیث رقم ۲۲ من کتاب الزکاۃ واحمد فی المسند ۳۵۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو اللہ نے مال دیا ہو۔ پس اس نے زکوۃ ادا نہ کی پس اس کے لیے اس کا مال گنجا سانپ بنا دیا جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں دو سیاہ نقطے ہونگے' قیامت کے دن وہ سانپ بطور طوق کے اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا پھر اس کے منہ کی دونوں طرفوں کو (یعنی اس کی دونوں باچھوں کو) پکڑے گا۔ پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں۔ تیرا گنج ہوں۔ (یعنی خزانہ ہوں) پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اور وہ لوگ گمان نہ کریں جو بخل کرتے ہیں۔ آخر آیت تک۔ اس کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: مثل: تشدید کے ساتھ اور صیغہ مجہول کے ساتھ بمعنی صور وجعل۔

مالہ یوم القیامۃ شجاعًا: شین کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ یعنی سانپ کی شکل میں۔ طیبی فرماتے ہیں یہ

مفعول کی جگہ پر ہے یعنی سانپ کی شکل میں یا پھر تصییر کے معنی میں ہے کہ: ای صیر ماله علی صورة شجاع: اُس کا مال سانپ جیسا ہوگا۔

أقرع : یعنی جس کے سر پر بال نہ ہوں زیادہ زہر اور طول عمر کی وجہ سے۔

زبیتان: یعنی دو نقطے آنکھوں کے اوپر یہ سانپوں میں سب سے زیادہ خبیث ہے کہا گیا ہے کہ زبیتان کا مطلب ہے: الزبدان فی الشدقین: جبڑوں میں سوراخ۔

یطوقه : مبنی بر مجہول ہے یعنی وہ سانپ طوق بنایا جائے گا اُس کی گردن میں یا پھر وہ اُس آدمی کا طوق بن جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے موافق ہے کہ ﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِه﴾ [آل عمران: ۱۸۰]

لهزمتیة : لام کے کسرہ کے ساتھ اور ھاء کے سکون کے ساتھ۔

یعنی شدقیه: یہ راوی کی تفسیر ہے یہ شین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور دال کے سکون کے ساتھ ہے یعنی اسے منہ کے ایک طرف سے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اللهزمة جبڑے کو کہتے ہیں اور جو اس کے ساتھ ملحق ہوتا ہے تھوڑھی اور منہ کے قریب کا حصہ یہ اس سے معنی میں قریب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ہڈیاں ہیں کانوں کے نیچے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو گوشت کے لوتھڑے ہیں۔

قوله :ثم یقول أنا مالك انا کنزك۔

میں تیرے خزانہ کی جزاء ہوں یا تیرے خزانہ کا منقلب ہوں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں ایک قسم ہے بے عزتی کی غصہ کو مزید زیادہ کرنے کے لیے اور پریشانی کو کیونکہ یہ شر تھا اور ایسی جگہ سے یا تھا جہاں سے وہ بھلائی کی امید رکھتے تھے۔

آیت یوں ہے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال: ۷-۸] ''تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا''۔

ثم تلا : یعنی رسول اللہ ﷺ نے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ (ال عمران : ۱۸۰) ''جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں اپنی کنجوسی کو اپنے لئے بہتر خیال نہ کریں بلکہ وہ ان کے لئے بدتر ہے عنقریب قیامت والے دن یہ اپنی کنجوسی کی ہوئی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔''

صیغہ غائب اور خطاب کے ساتھ اور سین کے کسرہ اور فتحہ مع الاول اور ثانی کے ساتھ۔

زکوۃ کی ادائیگی نہ کرنے والے پر سخت وعید

۱۷۷۵: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ رَجُلٍ یَكُوْنُ لَهٗ اِبِلٌ اَوْ بَقَرٌ اَوْ غَنَمٌ لَّا یُؤَدِّیْ حَقَّهَا اِلَّآ اُتِیَ بِهَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَعْظَمَ مَا تَكُوْنُ وَاَسْمَنَهٗ تَطَأُهٗ بِاَخْفَافِهَا وَتَنْطَحُهٗ بِقُرُوْنِهَا كُلَّمَا جَازَتْ اُخْرَاهَا رُدَّتْ عَلَیْهِ اُوْلَاهَا حَتّٰی یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۳۔ حدیث رقم ۱۴۶۰۔ ومسلم فی صحیحه ۶۸۶/۲ حدیث رقم (۳۰۔ ۹۹۰)۔ والنسائی فی السنن ۲۹/۵ حدیث رقم ۲۴۵۶۔ وابن ماجه ۵۶۹/۱ حدیث رقم ۱۷۸۵۔ واحمد فی المسند ۳۲۱/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے فرمایا جب کسی شخص کے پاس اونٹ' گائے یا بکری ہوں اور وہ ان کا حق (زکوۃ) ادا نہ کرے قیامت کے دن ان کو لایا جائیگا اس حال میں کہ وہ بہت بڑے ہوں گے اور بہت زیادہ موٹے ہونگے اور وہ اپنے پاؤں سے اپنے مالک کو کچلیں گے اور اس کو اپنے سینگوں کے ساتھ ماریںگے۔ جب ان کی آخری جماعت گزر جائے گی تو ان کی پہلی جماعت کو دوبارہ لایا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کو آدمیوں کے سامنے لایا جائے گا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔

تشریح: بقر أو غنم :أو تقسیم کے لیے ہے۔

أتی بها : صیغہ مجہول کے ساتھ۔

أعظم ماتکون : صیغہ تانیث کے ساتھ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تذکیر کے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے بڑا حال اور ما مصدر یہ ہے اور اضافت غیر محضہ ہے۔

وأسمنه : اور ضمیر لفظ مال کی طرف لوٹ رہی ہے اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ یہ عطف مراد ہے یا خاص ہے تو یہ تحقیق سے دوری ہے۔ ان کے درمیان بہت باریک مباینہ ہے۔

تطوء ہ باخفافها : یعنی اُسے اپنی ٹانگوں سے روند ڈالیں گے یہ اُس کے تکبر کی سزا ہے۔

وتنطحه : یعنی اُسے ماریں گے۔

یہ جزا ہے کیونکہ اُس نے روک رکھا تھا اور یہ غالب طور پر اونٹوں کے بارے میں ہے لیکن یہ تینوں میں سب سے معزز ہے اس لیے اس کے تذکرہ سے شروع کیا اور غالب طور پر آخری دونوں میں کثرت کی وجہ سے۔

پھر یا تو جنت والوں کے ساتھ ہوگا یا جہنم والوں کے ساتھ ہوگا۔

عاملین زکوۃ کو خوش کر کے بھیجو

۱۷۷۶: وَعَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاكُمُ الْمُصَدِّقُ

فَلْيَصْدُرْ عَنْكُمْ وَهُوَ عَنْكُمْ رَاضٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٨٦/٢۔ حديث رقم (٢٩۔ ٩٨٩)۔ والترمذي في السنن ٣٩/٣ حديث رقم ٦٤٧۔ وابن ماجه ٥٧٦/١ حديث رقم ١٨٠٢۔ والدارمي ٤٨٤/١ حديث رقم ١٦٧٠۔ واحمد في المسند ٣٦٥/٤۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تمہارے پاس کوئی (امام کی طرف سے) زکوٰۃ لینے والا آئے جس کو ساعی اور عامل کہتے ہیں وہ تم سے اس حالت میں لوٹ کر جائے کہ وہ تم سے راضی ہو۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ (رواہ مسلم)

تشریح: المصدق: صاد کی تخفیف کے ساتھ یعنی صدقہ لینے والا اور وہ عامل ہے۔

فليصدر عنكم: دال کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ لوٹے۔

وهو عنكم راض: یہ جملہ حال بن رہا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: مسبب کو ذکر کر کے سبب کا ارادہ کیا ہے کیونکہ یہ عامل کے لیے حکم ہے۔ اور حقیقت میں یہ تزکیہ کرنے والے کے لیے حکم ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم اُسے مرحبا کہتے ہوئے چلو خوشی سے اور زکوٰۃ کا مال ادا کرو تا کہ وہ خوشی سے واپس لوٹ جائے اور یہ صفت مبالغہ ہے عامل کو رضا مند کرنے میں اگرچہ وہ ظلم ہی کرے جیسا کہ اگلی حدیث میں آئے گا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے والوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دُعا کرنا

١٧٧٧: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ فُلَانٍ فَاَتَاهُ اَبِيْ بِصَدَقَتِهٖ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِيْ اَوْفٰى (متفق عليه)

وفي رواية اذا اتى الرجل النبي ﷺ بصدقته قال اللهم صل عليه۔

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٦٨٣/٣۔ حديث رقم ١٤٩٧۔ ومسلم في صحيحه ٧٥٦/٢ حديث رقم (١٧٦۔ ١٠٧٨) وابوداؤد في السنن ٢٤٦/٢ حديث رقم ١٥٩٠ والنسائي في السنن ٣١/٥ حديث رقم ٢٤٥٩۔ وابن ماجه ٥٧٢/١ حديث رقم ١٧٩٦ واحمد في المسند ٣٥٥/٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جب کوئی قوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زکوٰۃ لے کر آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ اے اللہ! فلاں شخص پر رحمت بھیج۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس میرا باپ زکوٰۃ لے کر آیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ابو اوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح بھی آیا ہے کہ جب آپؐ کے پاس کوئی شخص زکوٰۃ لے کر آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اے اللہ! اس پر رحمت بھیج۔ (متفق علیہ)

تشریح: كان النبي ﷺ اذا أتاه قوم بصد قتهم: تا کہ آپ اُسے تقسیم کر دیں۔

اللهم صل على آل أبي أوفى: ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہاں صلاۃ دعا کے معنی میں ہے اور تبرک کے معنی میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ غیر نبی کے لیے بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَصَلِّ عَلَيْهِم ﴾ [التوبة: ١٠٣] زکوٰۃ ادا کرنے میں کہ ان پر درود بھیجیں۔ اور جو صلاۃ ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے وہ تعظیم اور تکریم کے معنی میں ہے یہ آپ ہی کے لیے

خاص ہے اور یہ طیبی کے قول سے ماخوذ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ صلاۃ کو غیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جائز نہیں ہے۔ لیکن اس معنی میں دعا دینا جائز ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: دعاء میں اختلاف کیا ہے اُن کے لیے اور آپ کے لیے لفظ صلاۃ کے ساتھ بعض نے کہا ہے کہ مکروہ ہے اگر اس سے مراد مطلق رحمت ہو بعض نے کہا ہے کہ حرام ہے اور پہلے کے خلاف بھی کہا گیا ہے بعض نے سنت قرار دیا ہے اور بعض نے مباح قرار دیا ہے اگر صلاۃ سے مطلق رحمت مراد ہو اگر تعظیم مراد ہو تو مکروہ ہے۔ جو مانعین ہیں وہ اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے شمار کرتے ہیں لیکن۔ ظاہر یہ ہے کہ آل عام ہے اس پر آنے والی روایت دلالت کرتی ہے کہ "اے اللہ ان پر رحمت بھیج" یا پھر مراد آل سے خود آپ اور آپ کا اہل خانہ ہے تو دعا عام ہو جائے گی۔ جب آپ اپنے اصل کے لیے دعا کریں گے تو وہ اس وجہ سے اس میں شامل ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [غافر: ٤٦] داخل ہو جاوالے آل فرعون سخت عذاب میں" اور اسے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے اسے میرک نے بیان کیا ہے وفی روایۃ) میرک کہتے ہیں: یہ روایت افراد بخاری میں سے ہے۔

قوله: اذا أتى الرجل النبي ﷺ بصدقة قال: اللهم صل عليه:

ابن ملک فرماتے ہیں: یہ دلالت کرتی ہے کہ عامل زکوۃ دینے والے کو پکارے اور اللہ تجھے جو تو نے دیا ہے اس کا اجر دے اور جو باقی ہے اُس میں برکت دے اور اُسے تیرے لیے پاکیزگی کا ذریعہ بنا دے۔ اور یہ قول کہ اللہ تجھے اجر دے اور مد اور ضمہ کے ساتھ یہ زیادہ عمدہ ہے اور صحیح روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی تھی جو آپ کے پاس صدقہ لے کر آیا تو اُس میں اور اُس کے اہل میں برکت کی دعا کی تھی۔ اللّٰھم بارك فيه وفي اهله۔

عاملِ زکوۃ کے لیے نصیحت

١٧٧٨: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ فَقِيْلَ مَنَعَ ابْنُ جَمِيْلٍ وَخَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ وَالْعَبَّاسُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَنْقِمُ ابْنُ جَمِيْلٍ اِلَّا اَنَّهٗ كَانَ فَقِيْرًا فَاَغْنَاهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَاَمَّا خَالِدٌ فَاِنَّكُمْ تَظْلِمُوْنَ خَالِدًا قَدِ احْتَبَسَ اَدْرَاعَهٗ وَاَعْتَدَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَمَّا الْعَبَّاسُ فَهِيَ عَلَيَّ وَمِثْلُهَا مَعَهَا ثُمَّ قَالَ يَا عُمَرُ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّ عَمَّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٣١/٣۔ حديث رقم ١٤٦٨۔ ومسلم في صحيحه ٦٨٦/٢ حديث رقم (١١۔ ٩٨٣)۔ وابوداؤد في السنن ٣٧٣/٢ حديث رقم ١٦٢٣۔ والنسائي ٣٣/٥ حديث رقم ٢٤٦٤۔ واحمد في المسند ٣٢٢/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عامل زکوۃ بنا کر بھیجا پس کسی نے بتایا ابن جمیل اور خالد بن ولید اور حضرت عباس نے زکوۃ نہیں دی۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابن جمیل نے خدا کی

نعمت کا انکار نہیں کیا۔ کیونکہ وہ فقیر تھا پس اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے غنی کر دیا اور خالد بن ولیدؓ پر تم ظلم کرتے ہو یعنی اس لیے نہیں کہ اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنی زر ہیں اور لڑائی کا سامان (یعنی ہتھیار اور جانور اور لڑائی کا سامان اللہ کے راستے میں) وقف کر رکھا ہے اور تم اس کو مال تجارت سمجھتے ہو اور حضرت عباس ؓ کی زکوۃ میرے ذمے ہے۔ اس کی مثل اس کے ساتھ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عمرؓ کیا تم نہیں جانتے آدمی کا چچا اس کے باپ کی مانند ہوتا ہے پس حضرت عباسؓ کو میرے باپ کے مقام پر سمجھ کر ان کی تعظیم کرو اور ان کو تکلیف مت دو۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **بعث رسول اللہ ﷺ عمر** : یعنی اُسے عامل بنا کر بھیجا۔

فقیل : یعنی اکیلے ہی آئے اور کہا۔

یہاں اصل عبارت گویا یوں ہے: **ای فجاء واحد الی رسول اللہ ﷺ و قال لہ :منع ابن جمیل۔**

جمیل : فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔ مؤلف فرماتے ہیں: صحابہ کے فضائل میں کہ ابن جمیل کا ذکر کتاب الزکاۃ میں تو ہے لیکن اس کا نام کا علم نہیں ہے۔ مشہور بات یہ ہے کہ یہ منافق ہے صحابہ میں سے نہ تھا۔ پھر یہ بات مقدر ذکر ہے کہ ابن جمیل نے زکوۃ روک دی اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ اُس نے اپنی عطا سے منع کر دیا تھا۔ تو یہ معنی کا حل ہے لیکن بنیاد کے لیے مخل ہے۔

ما ینقم : قاف کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ **ای ما ینکر ابن جمیل نعمۃ اللہ لانہٗ کان فقیر**...... یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کا انکار نہیں کرتا۔

فاغناہ اللہ ورسولہ : یہ اُن چیزوں میں سے تھا جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا اور نا ہی اچھا سمجھتا تھا مگر یہ کہ یہ کفران نعمت کے لیے علت ہو تو پھر اس سے مراد مبالغہ ہوگا حد درجہ پر۔

ولا عیب فیھم غیران سیوفھم ☆ بھن فلول من ضراب الکتائب

اسی لیے کہا گیا ہے کہ تقدیر وہ ہے جو کچھ لے کر آئے۔ مگر اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو صدقہ کے طلب کرنے والے کو غصہ دلا دے۔ مگر اس کا انکار کرنا کہ وہ فقیر تھا تو اس کو اللہ نے غنی کر دیا اور اس کے رسول نے۔ اور غنی ہونے نسبت اللہ کے رسول ہونے کی نسبت اس لیے کی کیونکہ آپ اس کے دخول اسلام کا سبب بنے تھے اور غنیمت پانے کا۔

امام طیبی فرماتے ہیں: کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ زکوۃ دینے سے منع نہیں کیا۔ مگر غنی ہونے میں اور یہ نعمت کا کفر ہے۔ زین العرب نے کہا کہا جاتا ہے۔ **نعمت علی الرجل ۔ انقم** کسرہ کے ساتھ ہے اور نقمۃ فتح اور کسرہ کے ساتھ ہے اور مغرب اس سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب اسے معیوب سمجھا جائے اور مکروہ سمجھا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کا مطلب جو بندہ کنجوسی کرے اور غصہ کرے زکوۃ نہ دینے سے اور مکروہ جانے یہ کہ وہ فقیر تھا اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے غنی کر دیا۔

واما خالد فانکم تظلمون ...... فی سبیل اللہ : "خالد" اسم ظاہر کو موضع ضمیر تاکید مبالغہ کی جگہ پر رکھا ہے۔ یعنی کہ تم اس پر ظلم کرتے ہو۔ زکوۃ طلب کر کے جب کہ اس پر زکوۃ فرض نہیں ہے۔

ادراعه : یہ "درع" کی جمع ہے۔

واعتده تا کے ضمہ کے ساتھ ہے اور یہ اعتاد کی جمع ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو اسلحہ، جنگی آلات اور چوپاؤں میں سے ہیں جنہیں آدمی تیار کر کے رکھتا ہے۔

فی سبیل الله : اور تم اس پر ظلم کرتے ہو کہ تم انہیں شمار کرتے ہو تجارت کے اشیاء میں سے اور اس سے زکوٰۃ طلب کرتے ہو اور اس میں دلیل ہے کہ جائز ہے جنگی آلات کا روک رکھنا' یہاں تک کہ گھوڑا، اونٹ کپڑے اور دوسری چیزیں اور منقولات کو وقف کرنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ محمد نے کہا اور اسی پر ہے کہ اس سے اخراج بھی صحیح ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں اور اس میں دلیل ہے زکوٰۃ کے واجب ہونے پر مال تجارت میں۔ وگرنہ جب عذر دیا تھا رسولؐ نے مالِ تجارت میں زکوٰۃ کے مطالبے پر اس قول کے ساتھ اور ابن حجر نے اس کا تعاقب کیا ہے۔ بغیر کسی دلیل کے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ تم اس پر ظلم کرتے ہو۔ اس پر مانع زکوٰۃ کا دعویٰ کر کے اور حالت یہ ہے کہ اس نے تو اپنے اسلحے کو اللہ کی راہ میں وقف کر رکھا ہے یا جہاد کے لیے روک رکھا ہے تجارت کی بجائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم اس پر ظلم کرتے ہو فرضی چیزوں کے علاوہ۔ کیونکہ اس نے تو اپنا سارا سامان روک رکھا ہے اللہ کی راہ میں تو پھر وہ کیسے زکوٰۃ سے روک سکتا ہے۔ حالانکہ وہ تو اللہ کے فرائض مؤکدہ میں سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دعویٰ غنی ہونے کا۔ اس نے اپنا اسلحہ اس لیے روک رکھا ہے۔ کہ تا کہ وہ اللہ کی راہ میں اس کی ضرورت محسوس کرے۔ یا اللہ کی رضا کے لیے۔

قوله :وما العباس فهي : یعنی کہ عباس کا صدقہ پچھلے طریقے پر ہے۔

علی ومثلها معها :ای مثل تلك الصدقة فی کونها فریضة عام آخر : (یعنی دوسرے سال کا فریضہ ہونے میں اس صدقہ کے مثل اس طرح سے کہ یہ سال کے آخر پر فرض ہوگا کئی سالوں میں نہیں اور کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ کو اس سے مؤخر کیا ہے دو سالوں کے لیے۔ کیونکہ عباس کو اس کی ضرورت تھی۔ اور وہ اس کے کفیل بھی بنے تھے اور اس کو وہ بات مضبوط کرتی ہے۔ جو جامع الاصول میں ہے کہ آپ نے اس پر واجب قرار دیا تھا اور اس اکیلے کو ضامن قرار دیا تھا۔ اور اگر تو یہ کہے کہ یہ سائی پر ممتنع ہے تو میں کہوں گا کہ یہ رسولؐ کے خصائص میں سے تھا۔ دوسرے کو اس پر قیاس نہ کیا جائے گا اور کوئی ممانعت نہیں ہے جب خلیفہ اپنی رعایات میں اس طرح کی کوئی مثال پائے تا کہ اس کا مال فوت نہ ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ آپؐ نے اس سے دو سال سے زکوٰۃ لی تھی ایڈوانس۔ اور عامل کو اس میں شک ہوا۔ اور اس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ ہم عباس سے دو سالوں کا صدقہ لیتے ہیں اور یہ بھی روایت ہے کہ ہم جلدی لے لیتے ہیں۔ اور دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہوتی ہے کہ روایت کو حمل کیا جائے اور دو واقعوں پر۔

اما شعرت : عین کے فتح کے ساتھ اور ہمزہ کے ساتھ اور ما نافیہ ہے۔ یعنی کیا تو نہیں جانتا۔

صنو : صاد کے کسرہ کے ساتھ ہے اور نون کے سکون کے ساتھ اور اس کی مثال یوں ہے کہ کہا جائے دو کھجوروں کے لیے جو ایک ہی گچھے سے اگی ہوں تو ان میں سے ایک کو صنو کہا جائے گا۔ معنی یہ ہے کہ تجھے یہ خبر نہیں ہے۔ کہ وہ اس کا چچا ہے۔ تو پھر تو اسے کیوں الزام دیتا ہے۔ اور شاید کہ اس کی طرف سے یہ [illegible] اور تو اسے ملامت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا

مطلب ہے کہ تو اپنے دو طرف کے رشتہ دار کو تکلیف نہ دے۔
میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔

عامل زکوٰۃ کا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے

۱۷۷۹: وَعَنْ اَبِیْ حُمَیْدٍ السَّاعِدِیِّ قَالَ اسْتَعْمَلَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلاً مِّنَ الْاَزْدِ يُقَالُ لَهُ ابْنُ اللُّتْبِيَّةِ عَلَى الصَّدَقَةِ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ هٰذَا لَكُمْ وَهٰذَا اُهْدِیَ لِیْ فَخَطَبَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَسْتَعْمِلُ رِجَالاً مِنْكُمْ عَلٰى اُمُوْرٍ مِّمَّا وَلاَّنِیَ اللّٰهُ فَيَاْتِیْ اَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ هٰذَا لَكُمْ وَهٰذِهٖ هَدِيَّةٌ اُهْدِيَتْ لِیْ فَهَلاَّ جَلَسَ فِیْ بَيْتِ اَبِيْهِ اَوْ بَيْتِ اُمِّهٖ فَيَنْظُرَ اَيُهْدٰى لَهٗ اَمْ لَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يَاْخُذُ اَحَدٌ مِّنْهُ شَيْئًا اِلاَّ جَاءَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهٗ عَلٰى رَقَبَتِهٖ اِنْ كَانَ بَعِيْرًا لَّهٗ رُغَاءٌ اَوْبَقَرًا لَّهٗ خُوَارٌ اَوْ شَاةٌ تَيْعَرُ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى رَاَيْنَا عُفْرَةَ اِبْطَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ (متفق عليه) قَالَ الْخِطَابِیُّ وَفِیْ قَوْلِهٖ هَلاَّ جَلَسَ فِیْ بَيْتِ اُمِّهٖ اَوْ اَبِيْهِ فَيَنْظُرَ اَيُهْدٰى اِلَيْهِ اَمْ لَا دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ كُلَّ اَمْرٍ يَتَذَرَّعُ بِهٖ اِلٰى مَحْظُوْرٍ فَهُوَ مَحْظُوْرٌ وَكُلُّ دَخِيْلٍ فِی الْعُقُوْدِ يُنْظَرُ هَلْ يَكُوْنُ حُكْمُهٗ عِنْدَ الْاِنْفِرَادِ كَحُكْمِهٖ عِنْدَ الْاِقْتِرَانِ اَمْ لَا هٰكَذَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ.

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٢٠/٥۔ حديث رقم ٢٥٩٧۔ ومسلم في صحيحه ١٤٦٣/٣ حديث رقم (٢٦۔ ١٨٣٢)۔ وابو داؤد في السنن ٣٥٤/٣ حديث رقم ٢٩٤٦۔ واحمد في المسند ٤٢٣/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم ازد کے ایک شخص کو عامل مقرر کیا اس کا نام ابن لُتبیہ تھا جب ابن لتبیہ مدینہ میں آیا اور کہا کہ اتنی مقدار میں زکوٰۃ کا مال تمہارے لیے ہے یعنی تم اس کے مستحق ہو اور اتنی مقدار میں مجھے بطور تحفہ کے دیا گیا ہے پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور اس کی تعریف کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں تم میں سے کسی شخص کو عامل مقرر کرتا ہوں ان کاموں کے اوپر جن کاموں پر اللہ نے مجھے حاکم کیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک شخص آتا ہے اس کام سے اور کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ہے اور یہ مجھ کو تحفہ دیا گیا ہے پس وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا۔ پھر دیکھتے کہ اس کو ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر اس میں سے کوئی لے گا۔ تو اس کو قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اگر اونٹ ہوگا تو اس کے لیے بھی ایک آواز ہوگی۔ اگر بیل ہوگا تو اس کے لیے بھی ایک آواز ہوگی۔ اگر بکری ہوگی تو اس کے لیے بھی ایک آواز ہوگی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں دست مبارک اٹھائے۔ یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغلوں کی سفیدی دیکھی۔ یعنی بہت اونچے اٹھائے پھر فرمایا: اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا ہے جو آپ نے فرمایا تھا۔ اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا۔

تشریح: قوله :عن ابی حمید ......أيهدى له أم لا؟

حمید: تصغیر کے ساتھ۔

الازد :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ یہ قحطان میں ایک قبیلہ ہے۔

يقال له ابن للتبية: لام کے ضمہ کے ساتھ اور تاء کے سکون کے ساتھ جس پر دو نقطے ہیں اور کبھی کبھار اسے فتحہ دیا جاتا ہے بنی لتب معروف قبیلہ کی طرف نسبت دینے کے لیے۔اور ان کا نام عبداللہ ہے۔نوری فرماتے ہیں: یہ لام کے ضمہ کے ساتھ اور ہے تاء کے سکون کے ساتھ ہے۔اور بعض لوگوں نے اسے فتحہ دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غلطی ہے اور صحیح چیز سکون ہے۔ابن اثیر فرماتے ہیں جامع میں لام کے ضمہ کے ساتھ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی اُسے عامل بنایا۔

ثم قال أما بعد: یعنی حمد اور ثناء کے بعد۔

فيا ء تي أحد هم :یعنی یہ عمال میں سے اور اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور اُس کی اصل حقیقت بیان نہیں کرتا ہے۔

فيقول هذا لكم و هذه :اسے مؤنث بنایا گیا ہے خبر کی تانیث کے لیے اور وہ ہے۔

هدية أهديت لها :یعنی مجھے عطا کیا گیا ہے یا میری طرف ہدیہ بھیجا گیا ہے۔

في بيت أبيه أو بيت أمه :یا پھر یہ قسم بیان کرنے کے لیے ہے۔یا شک کے لیے یہ اُس کی شان میں تغیر اور تحقیر اُس کی ذات کے لیے ہے یعنی اُس کی تعظیم اُس کے اس کام کی وجہ سے کی گئی ہے۔

فينظر :نصب کے ساتھ ہے قولہ کے جواب میں یعنی وہ کیوں نہیں بیٹھا پھر وہ دیکھتا یا انتظار کرتا۔

أم لا: کیونکہ کوئی وجہ نہ تھی۔ابن ملک فرماتے ہیں کہ عامل کے لیے جائز نہیں ہے کہ کوئی ہدیہ قبول کرے کیونکہ ہر کوئی اُسے صرف اس لیے دیتا ہے تاکہ اصل مال سے زکوۃ کم کردے اور یہ کام جائز نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس غرض سے نہ دیتے ہوں کیونکہ اس عامل کے لیے اس کام پر اُجرت تو ہے ہی تو دو طرف سے لینا جائز نہیں ہے۔اور جو کچھ دیا جاتا ہے وہ تمام مال میں شامل ہے۔

والذی نفسی :یعنی میری ذات اور میری روح۔بیدہ ...... حل بلغت:بیدہ۔ یعنی اُس کے قبضہ اور تصرف میں ہے۔

الا جاء به يوم القيامة۔ یعنی یہ سبب بنے گا اُس کے آنے کا۔

يحمله: یہ حال ہے یا جملہ متانفہ ہے۔

على رقبة :یعنی تشہیر کے لیے اور رسوائی کے لیے اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ پیٹھ اور اس کے ساتھ والا حصہ بھی اس میں شامل ہے یا پھر یہ آیت کفار کے بوجھوں کے بارے میں ہے اور یہ فجار کے بوجھوں کے بارے میں ہے مزید قباحت کے لیے کیونکہ اس میں حق اللہ اور حق العباد ہوتا ہے۔

رغاء :راء کے ضمہ کے ساتھ یہ اونٹ کی آواز ہوتی ہے۔طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی اس کے لیے آواز ہوتی ہے تو فاء کو حذف کر دیا گیا جملہ اسمیہ سے اور یہ شائع ہے لیکن غیر شائع ہے۔

خوار : خاء کے ضمہ کے ساتھ اور گائے کی آواز۔

أو شاة : نصب کے ساتھ ہے۔

تیعر : تاء کے فتحہ کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور فتحہ کے ساتھ۔ یعنی یہ تصیح ہے تا کہ اہل عرصات کو پہچانا جا سکے تا کہ یہ رسوائی میں زیادہ مشہور ہوں اور زیادہ ملامت ہو۔

عفرة أبطیه : یعنی بغلوں کی سفیدی۔ اور عفرۃ ضمہ کے ساتھ اور ایسی سفیدی کو کہتے ہیں جو بالکل سفید نہ ہو بلکہ ہلکی ہلکی پیلاہٹ بھی ہو۔ یعنی مٹی جیسی یعنی بال اگنے کی جگہ بغلوں میں کیونکہ یہ کالی جلد سے کالے بال ملے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ مخفی نہیں ہے کہ یہ تب ہوتا ہے جب بال اکھاڑے جاتے ہیں یا پھر منڈوائے جاتے ہیں یا بعد کا اعتبار کرتے ہوئے۔

قوله :ثم قال اللهم هل بلغت : یعنی وعید ہے یا پھر جو حکم تو نے دیا تھا۔

قوله:اللهم هل بلغت : اسے بار بار اس لیے دہرایا تا کہ حجت قائم ہو جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استفہام تقریر کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ھل قد کے معنی میں ہے۔

قوله :قال الخطابی :و فی قوله ...... فهو محظور : اصل میں ایسے ہی ہے یا تو روایت میں ایسے ہے یا پھر بالمعنی نقل کیا گیا ہے۔ لیکن مقام کا تقاضہ یہ ہے کہ باپ کو مقدم کیا جائے کیونکہ یہ عزت کا زیادہ حقدار ہے تو یہ قول حدیث میں کہ ''اُس کی ماں کے گھر میں'' یہ محمول ہے تنزل پر یا تقدیر پر کیونکہ اُس کا باپ معروف نہ تھا تو اُس کی حالت بیان کی ہے فینظر أیهدی الیه) یہ بھی لہ کی تفسیر ہے یا پھر معنوی یا روایۃ نقل ہے۔

یتذرع :ذال کے ساتھ مفعول ہونے کی بنا پر یعنی وہ اُس تک پہنچتا ہے۔

به الی محظور فهو محظور : یعنی ممنوع ہو اور حرام ہو اور اس میں تو قرض بھی داخل ہے جو نفع حاصل کرتا ہے اور رہن رکھا ہو گھر جس میں مرتہن رہتا ہے بغیر کرائے کے اور وہ جانور جو رہن رکھا گیا ہو وہ اُس پر سواری کرتا ہے بغیر کرائے کے۔

و کل دخیل: رفع کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نصب کے ساتھ یعنی ہر عقد کے ساتھ۔

هل یکون حکمه عند الا نفراد کحکمه عند الاقتران أم لا: تو پہلی وجہ پر یہ صحیح ہے اور دوسری وجہ پر صحیح نہیں ہے جیسا کہ اگر کوئی سامان بیچے جو کہ اپنا منافع اس قیمت میں ڈال دیتا ہے اور جس نے ایک گھر کو رہن رکھا کافی رقم کے عوض اور کچھ اجرت بھی دی یہ بھی گناہ کا مرتکب ہوگا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جان لی کہ اُس کی امت کے بعض لوگ اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس معاملہ میں مبالغہ سے کام لیا کہ ''اللهم هل بلغت'' دو مرتبہ فرمایا۔

فی شرح السنه : امام مالک اسی موقف پر ہیں اور اس اصل پر فرع رکھتے ہیں مؤطا میں کافی ساری مثالیں ہیں کہ کچھ متوسط سونا کبھی لیے لیتا ہے اسی مقدار میں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اُس نے کچھ اضافی لیا ہے جس کے بارے میں ردی سے وہ اُسے بیچ ہی کیوں نہیں لیتا۔

اور جو کچھ پہلے اصول میں ہے وہ ہمارے مذہب کے موافق ہے اور مذہب شافعی کے موافق ہے کیونکہ مقرر قواعد میں سے ہے کہ رسائل کے لیے مقاصد کا حکم ہوتا ہے اور طاعت کا وسیلہ بھی طاعت ہے اور نافرمانی کا وسیلہ بھی نافرمانی ہے۔ اور جو

دوسرے کلیہ میں ہے وہ ہے کہ حیلہ نہیں کیا جا سکتا سود سے نکلنے کے لیے یا دوسری چیزوں کے لیے جیسے مالک، ابوحنیفہ، شافعی ہیں یا دوسرے جو جائز سمجھتے ہیں حیلہ کو اسے دھوکہ نہیں سمجھتے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عامل کو جانتے تھے جو خیبر میں تھا کہ وہ ردی کھجور کے بدلے میں جید کھجور لیتا ہے حیلہ سے تاکہ سود سے بچے۔ اور یہ کہ ردی چیز کی بیع دراہم کے ساتھ اور پھر ان کے ساتھ وہ اچھی کھجور خریدے۔

یہ بات سمجھ لے کہ ہر توسط کا عقد اس معاملہ میں ہوتا ہے جو اُسے معاملہ سے نکال دے جو سود تک پہنچاتا ہو جائز ہے۔ اسے غزالی نے بھی حکایت کیا ہے کہ جو اپنے غیر کو کچھ عنایت کرے اور اُس کا باعث لوگوں سے حیاء کے علاوہ کچھ نہ ہو کہ اُن کے سامنے سوال کرے وہ اُسے دے دیں اگر وہ اکیلا ہوگا تو اُسے کچھ نہ دیا جائے گا یہ لینے سے حرام ہے اس پر اجماع ہے اور اس جیسی مثل کیونکہ یہ اُس کی ملکیت سے کبھی نہیں نکلی اور یہ حقیقت میں مکروہ ہے حیاء کے سبب یہ تلوار کے ساتھ مجبور کے گئے جیسا ہے۔ اس کے علاوہ کا کہنا ہے کہ جو کسی کو کچھ عطا کرتا ہے اُس کی عزت کی وجہ سے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اور جو حاکم ساعی یا امیر کو کچھ دیتا ہے کہ وہ دینے والا جانتا ہے کہ اس کے بغیر وہ فیصلہ نہ کرے گا تو یہ لینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ عمان کے ہدیات وہ چوری کے ہیں۔ اور عطا کے ضعف کی وجہ سے ملکیت پر قصد کے اثرات ہیں اور یہ عقد کے خلاف ہیں یہ قوی دلالت ہے ملکیت پر اس میں قصد کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ قصد یہاں صالح ہے اور وہ ہے سود سے بچنا اور یہ تمام صورتیں فاسد ہیں اس طریقے سے مال اخذ کرنا ناحق ہے۔

عامل زکوٰۃ کے لیے دیانتداری کی ترغیب

۱۷۸۰: وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ عُمَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ مِنْكُمْ عَلٰى عَمَلٍ فَكَتَمَنَا مِخْيَطًا فَمَا فَوْقَهٗ كَانَ غُلُوْلًا يَّاْتِيْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۴۶۵/۳ حدیث رقم (۳۰- ۱۸۳۳)- وابوداوٗد فی السنن ۳۵۳/۳ حدیث رقم ۲۹۴۳- واحمد فی المسند ۱۹۲/۴-

ترجمہ: حضرت عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کو تم میں سے ہم کسی کام پر عامل بنائیں پھر وہ سوئی کی مقدار کے برابر کوئی چیز چھپالے اور وہ چیز سوئی سے چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ یہ چھپانا خیانت ہوگا اور قیامت کے دن اس کو ازراہِ فضیحت کے (یعنی شرمندگی کے) لائے گا۔ (مسلم)

تشریح: عمیرۃ: فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

قولہ: مخیطًا: میم کے کسرہ کے ساتھ اور خاء کے سکون کے ساتھ۔

فما فوقها: یعنی کچھ بھی ہو یعنی اس سے چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: فما فوقه میں فاء تعقیب کے لیے توالی پر اور وما فوقه احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد اعلیٰ یا ادنیٰ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: بعوضة فما فوقها۔ اور یہ حدیث زکوٰۃ کے باب میں بھی ذکر اس لیے کی گئی ہے کہ پچھلی حدیث سے مناسبت رکھتی ہے۔ عمل اور خیانت کے تذکرہ میں۔

غلولاً : غین کے ضمہ کے ساتھ یعنی غنیمت میں خیانت کرنا۔

یوم القیامة :اُس کی رسوائی کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ [آل عمران: ۱٦۱] ''جو غلو کرے گا قیامت کے روز جو غلو کیا ہوگا ساتھ لے کر آئے گا۔''

الفصل الثانی:

زکوٰۃ مال کو پاک کرنے کا سبب ہے

۱۷۸۱:عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كَبُرَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ عُمَرُ اَنَا اُفَرِّجُ عَنْكُمْ فَا نْطَلَقَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّهٗ كَبُرَ عَلٰى اَصْحَابِكَ هٰذِهِ الْاٰيَةُ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَفْرُضِ الزَّكٰوةَ اِلَّا لِيُطَيِّبَ مَابَقِيَ مِنْ اَمْوَالِكُمْ وَاِنَّمَا فَرَضَ الْمَوَارِيْثَ وَذَكَرَ كَلِمَةً لِتَكُوْنَ لِمَنْ بَعْدَكُمْ فَقَالَ فَكَبَّرَ عُمَرُ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اَلَا اُخْبِرُكَ بِخَيْرِ مَّا يَكْنِزُ الْمَرْءُ الْمَرْاَةُ الصَّالِحَةُ اِذَا نَظَرَ اِلَيْهَا سَرَّتْهُ وَاِذَا اَمَرَهَا اَطَاعَتْهُ وَاِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/ ۳۰۵ حدیث رقم ۱٦٦٤۔

ترجمہ:حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور جو لوگ کہ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں...... مسلمانوں پر یہ آیت بہت بھاری ہوئی (یعنی گراں گزری) عمرؓ نے کہا میں تم سے اس فکر کو کھول دونگا۔ پس عمر آئے اور عرض کرنے لگے اے اللہ کے نبی! آپ کے صحابہ پر یہ آیت بھاری ہوگئی ہے۔فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے تاکہ تمہارے مال میں سے جو چیز باقی ہے اس کو پاک کردے اور اللہ نے میراث مقرر کی ہے اور ایک کلمہ ذکر کیا تاکہ میراث اس شخص کے لیے ہوجائے جو تمہارے پیچھے ہے۔ پس ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے اس مشکل کے حل ہونے کی وجہ سے خوشی کے باعث اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے لیے فرمایا کہ کیا میں تم کو نہ بتاؤں ایسی بہترین چیز کے بارے میں جس کو آدمی جمع کرے؟ وہ نیک بخت عورت ہے۔ جب دیکھے اس کی طرف وہ اس کو خوش کرے جب اس کو حکم کرے تو اس کی فرمانبرداری کرے۔ جب اس سے غائب ہو تو اس کی حفاظت کرے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :لما نزلت هذه الآية ...... هذه الآية:

يكنزون :یعنی اسے جمع کرتے ہیں یا چھپاتے ہیں۔

قوله :ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب أليم۔ كبر) باء کے ضمہ کے ساتھ یعنی یہ مشقت اور تنگی سے ہے۔

ذلك :یعنی آیت عموم سے ظاہر ہے۔

کیونکہ وہ گمان کرتے تھے کہ مطلقاً مال جمع کرنے سے منع فرمایا ہے جو کوئی بھی تھوڑا ہو یا زیادہ مال جمع کرے گا تو اُس کے لیے بھی یہ وعید لاحق ہوگی۔

افرج راء کی تشدید کے ساتھ۔ یعنی غم کو اور پریشانی کو زائل کرتا ہوں۔
تمہارے لیے کشادگی پیدا کرنے کے لیے کیونکہ ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہوتی ہے۔ اور تمہارے لیے دین میں کوئی مشکل نہیں ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ بلا یکطرفہ جو افراط اور تفریط کے درمیان متوسط ہو۔

قوله :فانطلق :یعنی عمرؓ رسولؐ کے پاس گئے۔

کبر علی أصحابك هذه الآية:

علی اصحا بك هذاه الآيه :یعنی کہ اس کا حکم اور اس پر عمل کرنا کیونکہ اس میں جمع کرنے سے عمومی طور پر منع ہے۔

فقال :یعنی نبی نے فرمایا:

قوله :ان الله لم يفرض الزكاة الا ليطيب :مذکر، مؤنث کے ساتھ تا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ وہ تمہارے مالوں کو پاک کر دے۔

مابقي من اموالكم :اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾[التوبۃ : ۱۰۳] کہ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو تا کہ انہیں پاک رکھے اور ان کا تزکیہ کرے اور تطییب کا مطلب ہے ''زکوٰۃ ادا کرنا'' کہ جو باقی مال بچ جائے وہ فقراء کے مال کے ساتھ مل کر پاک ہو جائے گا۔ یا پھر وہ اس طرح سے پاک ہوگا کہ جو اس کے ساتھ گناہ ملے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔ حاصل جواب یہ ہے کہ کنز سے مراد زکوٰۃ کا روکنا ہے۔ صرف جمع کرنا نہیں۔

وانما فرض المواريث :یہ عطف ہے اس قول پر کہ اللہ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی۔ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: یہ اضافہ مصابیح میں نہیں ہے۔ لیکن سنن ابی داؤد میں موجود ہے۔ گویا کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی مگر صرف اس وجہ سے اور وراثت فرض کی تا کہ یہ مال پاک ہو جائے بعد والوں کے لیے اور معنی یہ ہے کہ مال جمع کرنا مطلقاً منع ہوتا ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ زکوٰۃ اور وراثت کو فرض نہ کرتے۔

قوله :وذكر كلمةً :یہ راوی کے کلام میں سے ہے یعنی ابن عباس سے کہ وہ رسول اللہ نے اس جگہ ایک اور کلمہ ذکر کیا ہے اس جگہ پر جیسے میں یاد نہیں رکھ سکتا۔ اور یہ جملہ معترضہ ہے دو جملوں کے درمیان۔ فعل اور اس کی علت کے درمیان

فكبر عمر :یعنی خوشی سے اللہ اکبر کہا حال منکشف ہو جانے کی وجہ سے اور اشکال دور ہونے کی وجہ سے۔

قوله :ألا أخبرك...... له :یعنی عمر رضی اللہ عنہ کے لیے

الا أخبرك :یہ احتمال رکھتا ہے کہ ''الا'' تنبیہ کے لیے ہوگا اور ہمزہ استفہامیہ ہوگا اور لا نافیہ ہوگا۔

بخير ما يكنز المرء :یعنی سب سے بہتر جسے وہ جمع کرتے ہیں اور اُسے آخرت کے لیے جمع کرتی ہے لیکن جب بیان کیا کہ کوئی بوجھ نہیں ہے زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد تو اُن کی خوشی بھی دیکھی تو پھر اس سے بھی بہتر چیز کی طرف رغبت دی اور زیادہ دیر رہنے والی ہو وہ تقلیل اور اکتفاء کرنا ہے۔

المرأة الصالحة :یعنی ظاہری اور باطنی طور پر خوبصورت ہو۔ طیبی فرماتے ہیں المراۃ مبتدا ہے اور جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور جملہ شرطیہ ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ موت سب سے

نفع مند خزانہ ہے۔ یہ سب سے بہتر چیز ہے جسے آدمی ذخیرہ کرتا ہے اور اس میں نفع بھی بہت زیادہ ہے۔

قولہ :اذا نظر :

اور یہ مرفوع روایت ہے کہ جس نے نکاح کیا اس نے اپنا تہائی دین محفوظ کر لیا اور کبھی کبھی یہ چیز حسن صورت پہنچا دیتی ہے۔ تجلیات الٰہی کا مشاہدہ کی طرف جو کہ صوفیت کے اعلیٰ مقاصد میں سے ہے اسی لیے جب جنید سے کہا گیا کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے تو اس نے کہا کہ عورت اس کے لیے ٹھیک ہے جو اس میں اللہ کے جمال کو دیکھے۔

و اذا امرھا: یعنی کسی شرعی یا عرفی حکم کا۔

و اذا غاب عنھا حفظتہ: ایک روایت میں یہ اضافہ ہے فی نفسہ۔ یعنی اپنے خاوند کے حق کا اور اس کے انعامات کا اس پر اور اس کے گھر کا اور اس کے مال کا اور اس کی اولاد کا کیونکہ یہ بہت ہی نفع مند چیزیں ہیں

قاضی فرماتے ہیں کہ جب ان کے لیے یہ بیان کیا رسولؐ نے کہ ان پر کوئی حرج نہیں ہے مال کے جمع کرنے پر جب تک وہ اس سے زکوٰۃ دیتے رہیں اور ان کی اس میں رغبت بھی دیکھی تو انہیں اس سے بہتر اور ہمیشگی والی چیز کی طرف رغبت دی اور وہ نیک اور خوبصورت عورت ہے۔ کیونکہ سونا آپ کو نفع نہیں دے گا مگر چلے جانے کے بعد۔ جب تک وہ آپ کے ساتھ ہے آپ کو خوش لگے گا اور آپ کی ضرورت پوری کرے گا تنگی کے وقت اور تو اس کے ساتھ مدد کرے گا اپنی۔ وہ تیری حفاظت کرے گا تیری خوشی پر اور تیری ضروریات پوری کرے گا۔ لیکن جو عورت ہے وہ تیرے حکم کی اطاعت بھی کرے گی اور جب تو غائب ہو گا تو تیرے مال کی حفاظت بھی کرے گی اور تیرے اہل وعیال کا خیال بھی رکھے گی مگر یہ ہے وہ تیرے لیے ایک کھیتی ہے۔ تیرے لیے اس کے سبب اولاد بھی ہو گی جو تیرے لیے زندگی میں وزیر ہو گی اور تیری وفات کے بعد خلیفہ ہو گی تو یہ تیرے لیے بہت زیادہ فضل ہے۔

یہ بہت اچھا کلام ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ جب یہ کہا کہ مال کو جمع کرنا مباح ہے تو یہ بھی ذکر کیا کہ اس کا خرچ کرنا دین کے کام میں وہ زیادہ بہتر ہے اور اس کے اندر ایک خفیہ اشارہ بھی ہے کہ مال کو جمع کرنا مکروہ ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا گھر ہے اس کے لیے جس کا کوئی گھر نہیں ہے اور مال کو وہ جمع کرتا ہے جس کو کوئی عقل نہیں ہوتی اور حاصل کلام یہ ہے کہ اکثر علماء نے کہا ہے کہ کنز سے مراد مذموم چیز ہے جس کی زکوٰۃ نہ ادا کی گئی ہو اگرچہ وہ چھپائی بھی نہ گئی ہو۔ اگر اس کی زکوٰۃ دے دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتی اگرچہ اسے چھپا بھی دیا جائے کیونکہ ایک حدیث کی سند حسن ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے کنز نہیں رہتی۔ بخاری میں روایت ابن عمرؓ سے ہے کہ سند متصل کے ساتھ کہ وعید کنز پر ہے۔ اور یہ زکوٰۃ کے واجب ہونے سے پہلے ہے نووی فرماتے ہیں: اور جب ابن جریر کا قول ہے کہ کنز آیت میں وہ ہے جسے خرچ نہ کیا جائے غزوات میں۔ اور ابوداؤد کا قول کہ یہ چھپا ہوا خزانہ ہے یہ غلط ہے واللہ اعلم قولہ

سند صحیح کے ساتھ میرک نے کہا کہ منذری نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا...... ﴾ [التوبۃ: ۱۰۳] ''ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کر لو کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا ان

کے لیے موجب تسکین ہے۔ اور خدا سُننے والا اور جاننے والا ہے۔"

عاملین زکوٰۃ کو خوش کرنے کا حکم

۱۷۸۲: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَتِيكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَأْتِيكُمْ رُكَيْبٌ مُبَغَّضُوْنَ فَإِنْ جَاءُوْكُمْ فَرَحِّبُوْا بِهِمْ وَخَلُّوْا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَبْتَغُوْنَ فَإِنْ عَدَلُوْا فَلِاَ نْفُسِهِمْ وَإِنْ ظَلَمُوْا فَعَلَيْهِمْ وَاَرْضُوْهُمْ فَإِنَّ تَمَامَ زَكَاتِكُمْ رِضَاهُمْ وَلْيَدْعُوْا لَكُمْ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/ ۲٤٥ حديث رقم ۱٥۸۸

ترجمہ: حضرت جابر بن عتیکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہارے پاس ایک چھوٹا قافلہ آئے گا (یعنی زکوٰۃ لینے کے لیے عامل آئیں گے) ان کے ساتھ دشمنی کی جائے گی۔ (یعنی لوگ اپنی طبیعت کے مطابق ان سے دشمنی رکھیں گے۔ اس لیے کہ وہ مال لینے کو آتے ہیں) پس جو جس وقت وہ تمہارے پاس آئیں۔ تو تم ان کو مرحبا کہو اور ان کے آنے پر خوش ہو جاؤ اور زکوٰۃ کا مال ان کے سامنے پیش کر دو۔ کوئی چیز مال اور ان کے درمیان حائل نہ رکھو۔ اگر وہ زکوٰۃ لینے میں عدل کریں گے تو اس کا ثواب پائیں گے اور اگر تم پر ظلم کریں گے تو ظلم کا وبال ان پر پڑے گا اور زکوٰۃ لینے والوں کو راضی کرو۔ اس لیے کہ تمہاری پوری زکوٰۃ ان کی رضامندی ہے اور چاہیے کہ عامل تمہارے لیے دعا کریں۔ اس کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن جابر بن عتیك : عین کے فتحہ اور تاؤ فوقیہ کے کسرہ کے ساتھ۔

رکیب : یہ رکب کی تصغیر ہے یہ اسم جمع راکب کے لیے اسی لیے تصغیر ذکر کیا ہے اگر جمع ہوئی راکب کے لیے تو رویکبون ہوئی یعنی زکوٰۃ کے عمال۔

مبغضون : غین مشددہ کے فتحہ کے ساتھ یعنی وہ طبعاً غصہ کریں گے شرعاً نہیں کہ وہ دل کی محبوب چیز لے گئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ بعض عمال برے اخلاق کے ہوتے ہیں اور پہلی چیز زیادہ واضح ہے۔

بھم : یعنی ان سے مرحبا کہو اور اُن کے استقبال میں خوشی کا اظہار کرو۔

وخلوا : یعنی چھوڑ دو۔

بینھم و بین ما یبتغون : یعنی جو وہ زکوٰۃ طلب کرتے ہیں ابن ملک فرماتے ہیں: کہ یعنی انہیں مت روکو اگر چہ وہ تم پر ظلم کریں کیونکہ اُن کی مخالفت بادشاہ کی مخالفت ہے کیونکہ وہ بھی انہی کی طرف سے مقرر کردہ ہوتے ہیں اور بادشاہ کی مخالفت فتنہ کی طرف بڑھاتی ہے۔ یہ ظاہر کلام ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ حکم تمام زمانوں کے لیے ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: اور اس میں ایک بحث ہے کیونکہ علت اگر مخالف ہوئی تو اسے چھپانا، جائز تھا لیکن یہ اب جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ: انکتم من اموالنا بقدر ما یعتدون؟ قال : لا کیا ہم چھپالیں اپنے مالوں میں سے اس قدر جو وہ زیادتی کرتے ہیں تو فرمایا نہیں۔

قولہ :فان عدلوا۔

فلا نفسهم: یعنی ان کے لیے ثواب ہے۔

وان ظلموا: زکوٰۃ لینے میں اس سے زیادہ جوتم پر فرض ہے۔یا جو زیادہ بہترین ہے یعنی تمہارے گمانوں کے مطابق۔

فعليهم: مصابیح میں ہے یعنی ان کے نفسوں پر ہے۔اس کا گناہ ہے اور تمہارے لیے ان کے ظلم کو سہنے کا ثواب ہے۔

وأرضوهم: یعنی ان کی رضامندی میں کوشش کرو جتنا ممکن ہو یعنی انکو فرض چیز دے دو بغیر کمی، بغیر دھوکے اور بغیر خیانت کے۔

فان تمام زكاتكم رضاهم:

رضاهم: کسر کے ساتھ اور کبھی مد کے ساتھ یعنی ان کے رضا کا حصول۔

وليدعو :لام کے سکون اور کسرہ کے ساتھ۔

یہ امر برائے ندب ہے زکوٰۃ لینے والے کے لیے کہ وہ زکوٰۃ دینے والے کو پکارے اور یہ بھی صحیح ہے کہ لام مفتوحہ تعلیل کے لیے ہو۔اس صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی: **ارضوهم لتتم زكاتكم وليدعوا**۔ان کو راضی کرو تا کہ تمہاری زکوٰۃ تام ہو جائے اور انہیں چاہیے کہ وہ دعا کریں۔تو پھر مقدر یوں ہوگا کہ اپنی زکوٰۃ کو پوری کرنے کے لیے ان پر پورے ہو جائیں اور اس میں اشارہ ہے کہ رضامندی طلب کرنا یہ دعا کے اصول کے لیے سبب ہے۔اور تحفے قبول کرنے کے لیے۔

طیبی فرماتے ہیں جو کچھ مبغوضون کے معنی میں بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ واضح ہے کیونکہ یہ قول **وسياتيكم** اس میں اشارہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کے عمال ہیں اور وہ قوم کی شکایات کی مذمت بھی کرتے ہیں اور اس سے اگلی حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسولؐ ظالم کو عامل نہیں بناتے تھے۔تو معنی یہ ہوگا کہ تم پر کچھ ایسے عمال آئیں گے جو تم سے زکوٰۃ طلب کریں گے کیونکہ نفس مال کی محبت کو پسند کرتا ہے اور تم اسے ناپسند کرتے ہو اور تم خیال کرتے ہو۔کہ وہ ظلم کر رہے ہیں حالانکہ ایسے نہیں ہوتا اور اگر وہ انصاف کریں اور اگر وہ ظلم کریں تو وہ اس گمان پر مبنی ہوتا اگر چہ وہ حقیقت میں ظالم ہی کیوں نہ ہو۔تو پھر وہ انہیں دعا کا کیسے حکم دیں گے اور وہ تمہارے لیے دعا کریں۔

اسنادی حیثیت :امام میرک فرماتے ہیں: اس کی سند میں ثابت میں قیس غفاری ہیں۔ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے اور احمد نے کہا ہے کہ یہ ثقہ ہے۔

زکوٰۃ لینے والوں کو ناراض نہ کرو اگر چہ وہ ظلم کریں

۱۷۸۳:عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ جَاءَ نَاسٌ يَّعْنِيْ مِنَ الْاَعْرَابِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اِنَّ نَاسًا مِّنَ الْمُصَدِّقِيْنَ يَاْتُوْنَا فَيَظْلِمُوْنَا فَقَالَ اَرْضُوْا مُصَدِّقِيْكُمْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاِنْ ظَلَمُوْنَا قَالَ اَرْضُوْا مُصَدِّقِيْكُمْ وَاِنْ ظُلِمْتُمْ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٦٨٥/٢ حديث رقم (٢٩۔ ٩٨٩)۔ وابوداوٗد فى السنن ٢٤٦/٢ حديث رقم

۱۵۸۹۔ والنسائی ۳۱/۵ حدیث رقم ۲٤٦۰۔ واحمد فی المسند ۳٦۲/٤۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ گنواروں (دیہاتیوں) میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے لوگ زکوٰۃ لینے والوں میں سے ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا زکوٰۃ لینے والوں کو راضی کرو۔ انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگر چہ وہ ہم پر ظلم کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے زکوٰۃ لینے والوں کو راضی کرو اگر چہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :جاء ناس ...... فیظلمونا یعنی من الاعراب : یہ راوی جریر کی طرف سے تفسیر ہے۔

المصدقین : صاد کی تخفیف کے ساتھ اور دال مشددہ کے کسرہ کے ساتھ یعنی کہ عامل زکوٰۃ۔

یا تونا فیظلمونا : نون کی تخفیف اور دونوں کی تشدید کے ساتھ۔

قولہ :فقال ارضوا مصدقیکم...... فقال أرضوا :ہمزہ قطعی کے ساتھ۔

مصدقیکم قالوا یا رسول اللہ وان ظلمونا :یعنی ہم اُسے راضی رکھیں اگر چہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔

قال ارضوا مصدقیکم وان ظلمتم : مبنی بر مجہول۔ یعنی اگر تم عقیدہ رکھو تو مظلوم ہو تمہارے مال سے محبت کی وجہ اور یہ چیز وارد نہیں ہوئی کہ وہ حقیقت میں بھی مظلوم ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ مستحب ہے اُن کی رضامندی اگر چہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: فان تمام زکوتکم رضاھم۔ کہ تمہاری زکوٰۃ میں اُن کی رضامندی ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: کیونکہ ان شرطیہ یہاں فرض اور تقدیر پر دلالت کرتا ہے حقیقت پر نہیں اور ایسے ہی رسول اللہ کا فرمان ہے: اسمعوا واطیعوا وإن استعمل علیکم عبد حبشی۔ ''سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر کوئی حبشی بھی عامل مقرر کر دیا جائے''۔ قولہ میرک کہتے ہیں اس کی اصل ابوداؤد میں ہے۔

مالِ زکوٰۃ سے چھپانا ممنوع ہے

۱۷۸۴: وَعَنْ بَشِيْرِ بْنِ الْخَصَاصِيَّةِ قَالَ قُلْنَا اِنَّ اَهْلَ الصَّدَقَةِ يَعْتَدُوْنَ عَلَيْنَا اَفَنَكْتُمُ مِنْ اَمْوَالِنَا بِقَدْرِمَا يَعْتَدُوْنَ قَالَ لَا۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲٤٤/۲ حدیث رقم ۱۵۸٦۔

ترجمہ: بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ زکوٰۃ لینے والے ہم پر زیادتی کرتے ہیں۔ (یعنی واجب مقدار سے زیادہ وصول کرتے ہیں) کیا ہم اپنے مالوں کو ان سے چھپالیں جس قدر کہ وہ زیادتی کرتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن بشیر بن لخصاصیة: یا کی تشدید کے ساتھ جس کے نیچے دو نقطے ہیں جامع الاصول میں بھی ایسے ہی ہے طیبی فرماتے ہیں کہ اسے تخفیف کے ساتھ بھی کہا گیا ہے اور وہ بشیر بن معبد ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بشیر بن یزید ہیں۔ جو کہ ابن خصاصیۃ کے نام سے مشہور ہیں۔ یا کی تشدید کے ساتھ اور یہ ان کی ماں ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خصاص اور ازد قبیلہ ... کی طرف منسوب ہیں۔

قال قلنا ان اهل الصدقه: یعنی کہ صدقہ لینے والے عمالوں میں سے۔

یعتدون علینا : یعنی ہم پر ظلم کرتے ہیں اور تجاوز کرتے ہیں اور فرض سے زیادہ لیتے ہیں۔

قوله :افنکتم من اموالنا بقدر ما یعتدون؟ قال :لا : یعنی ابن ملک فرماتے ہیں انہیں رخصت نہیں دی گئی کیونکہ بعض مال کو چھپانا خیانت اور مکر ہے اور اس لیے بھی اگر ان کے لیے رخصت دے دی جاتی تو وہ بعض لوگ اپنے مال غیر ظالم عامل سے بھی چھپا لیتے۔

۱۷۸۵: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَامِلُ عَلَى الصَّدَقَةِ بِالْحَقِّ كَالْغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلٰى بَيْتِهٖ (رواه ابو داود والترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳۴۸/۳ حدیث رقم ۲۹۳۶۔ والترمذی ۳۷/۳ حدیث رقم ٦٤٥ وابن ماجه ۵۷۸/۱ حدیث رقم ۱۸۰۹۔ واحمد فی المسند ۱٤۳/٤۔

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عامل زکوٰۃ غازی کی طرح ہے وہ خدا کے راستے میں ہے یہاں تک کہ لوٹ کر اپنے گھر کی طرف آئے۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: العامل علی الصدقة بالحق : یہ عامل کے ساتھ متعلق ہے یعنی کہ جو سچائی کے ساتھ کام کرتا ہے اور اخلاص واحتساب کے ساتھ۔

کالغازی فی سبیل الله : یعنی بیت المال کے حصول میں ثواب طلب کرنے میں دونوں جہانوں میں۔

اسنادی حیثیت :امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ (ذکرہ میرک)

عامل زکوٰۃ کے لیے نصیحت یا ہدایت

۱۷۸۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ اِلَّا فِيْ دُوْرِهِمْ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۵۰/۲ حدیث رقم ۱۵۹۱۔ واحمد فی المسند ۲۱۵/۲۔

ترجمہ: عمرو بن شعیبؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے۔ اس نے اپنے دادا سے نقل کی ہے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عامل زکوٰۃ مویشیوں کو منگوائے اور نہ ہی مویشیوں والا مکانوں سے دور جا کر رہے اور وہ یعنی عامل مویشیوں کی زکوٰۃ مکانوں سے دور وصول نہ کرے۔

تشریح: عن أبيه عن جده : کہا گیا ہے کہ مراد اُن کے دادا تھے محمد اور حدیث مرسل ہے کیونکہ محمد نے نبیؐ سے ملاقات نہیں کی تھی اور انہوں نے اپنے دادا شعیب کا ارادہ کیا تھا اور وہ عبداللہ ہیں۔ تو شعیب نے اپنے دادا عبداللہ کو نہیں پایا تھا۔ تو اسی علت کی بنا پر اسے صحیح بخاری اور مسلم کی حدیث میں ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ اسی طرح اپنے باپ اور پھر دادا سے روایت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شعیب نے اپنے دادا کو پایا تھا اسے طیبی نے ذکر کیا ہے اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور جو ابن حجر کا قول

ہے عن جدہ یعنی جدابیہ یہ عبداللہ ہیں انہوں نے عمرو کو پایا تھا تو حدیث مرسل ہوئی اور ہر احتمال رکھتی ہے مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔اس کی بنیاد قول ضعیف پر ہے۔جو کہ اتصال کا فائدہ دیتی ہے۔وگرنہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی حدیث کا حکم انقطاع ہے۔

قولہ :عن النبی ﷺ قال لا جلب :دوفتحوں کے ساتھ یعنی نہ تو عامل لوگوں کے مال کے قریب آئے گا کیونکہ اس کے اندر مشقت ہے لوگوں کے لیے کہ عامل اور کسی مکان میں بیٹھ جائے جانوروں سے پھر وہ لوگوں کو بلائے حالانکہ اس کے لیے لائق تھا کہ وہ ان کے پانیوں پر بیٹھ جاتا یا کسی ایسی جگہ پر جہاں ان کے مویشی ہوتے ہیں۔تاکہ وہ آسانی سے وصول کرلے اور جلب کا اطلاق بھی ایسی ہی چیز پر ہوتا ہے۔

قولہ :ولا جنب :دوفتحوں کے ساتھ یعنی کہ صاحب مال بھی دور نہ جائے کہ عامل پر وہاں پہنچنے پر کوئی مشقت ہو۔ابن حجر فرماتے ہیں:یعنی کہ عامل کسی ایسی جگہ پر نہ بیٹھ جائے کہ وہ اہل صدقہ کو حکم دے کہ وہ اپنے مال وہاں پر لے کر آئیں۔اور یہ جلب ہی کی قسموں میں سے ایک قسم ہے جو کہ مخفی نہیں ہے۔تو اسے اس معنی پر حمل کرنا جائز نہیں ہے اور بہت اجنبی بات ہے جہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ معنی قیل کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔طیبی کی پیروی کرتے ہوئے پھر فرماتے ہیں کہ منع کرنے کی وجہ یہ ہے وہ بالکل واضح ہے۔شاید کہ اس کا کمزور ہونا لغوی حیثیت سے ہو کسی اور وجہ سے نہ ہو اور یہ بھی شک نہیں ہے کہ لغوی معنی زیادہ منسوب ہے اور سیاق پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ ایک گھوڑے سے دوسرے گھوڑے پر اطلاق کیا جائے جس کے ساتھ مطابقت کی جاتی ہے۔تو جب وہ سواری کرنے والا تھک جاتا ہے تو اسے باڑے کی طرف پھیر دیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس کے اختیار کرنے کا بیان ہے اور اس فعل کے ساتھ کوئی کسی ایک کی قوت کو دو گھوڑوں میں سے نہیں پہچان سکتا۔بسا اوقات ایک گھوڑا شروع میں یا درمیان میں پیچھے ہوتا ہے لیکن وہ سبقت لے جاتا ہے۔پھر طیبی فرماتے ہیں کہ دونوں الفاظ مشترک ہیں سیاق اور زکوۃ کے معنی میں۔

ولا توخذ : تانیث اور تذکیر کے ساتھ۔

قولہ :لا تؤخذ صدقات الا فی دورھم :یعنی ان کے گھر ان کی جگہ،ان کے پانیوں پر اور ان کے قبائل میں یہ تمام حصر کے لیے ہے۔کیونکہ اس کے ساتھ کنایہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ ان کے گھروں سے صدقہ لے گا تو لازم ہے دوسرے صدقہ لینے والے کے لیے کہ وہ انہیں باہر لے کر آئے اور اس طرح زکوۃ دینے والے کے لیے بھی جب ان سے دور ہوگا۔اور اس کی مطابعت ابن حجر نے کی ہے اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ دوسری حدیث پہلی کے لیے تاکید ہے یا اس کے اجمال کی تفصیل ہے لیکن قاعدہ مقررہ یہ ہے کہ پہلی چیز کی تاکید یہ فائدہ دیتی ہے کہ نفی حدیث کے درمیان میں ہے اور اس کا تعلق سباق کے ساتھ ہے پھر دو مسئلوں میں جمع کرتے ہوئے مناسبت لغویہ اور معنویہ کے لحاظ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ضرر بھی نہیں ہے اور اضرار بھی ملت حنفیہ سے۔واللہ اعلم۔اسرار نبویہ کو۔

مالِ مستفاد کا حکم

۱۷۸۷:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً فَلَا زَكٰوةَ فِيْهِ

حَتّٰی یَحُوْلَ عَلَیْہِ الْحَوْلُ۔ (روہ الترمذی و ذکر جماعۃ انھم وقفوہ علی ابن عمر)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۲۶/۳ حدیث رقم ۶۳۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جوشخص مال حاصل کرے تو اس مال میں زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر جائے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے ایک جماعت کو ذکر کیا ہے کہ تحقیق انہوں نے اس حدیث کو ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف کیا ہے۔

تشریح: **قولہ :استفاد مالاً :ای وجدہ حصلہ واکتسبہ ابتداء:**

ابن ملک فرماتے ہیں یعنی جس نے مال پایا اور اس کے پاس نصاب بھی تھا اس جنس کا مثال کے طور پر اس کی ۸۰ بکریاں تھیں اور ان پر ۶ مہینے گزر گئے اور پھر اسے ۴۱ بکریاں اور مل گئیں۔ خریدنے کے ساتھ یا وراثت میں یا اس کے علاوہ۔ تو اس کے لیے ۴۱ بکریوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان پر سال گزر جائے خریدنے کے وقت سے لے کر۔ کیونکہ فائدہ حاصل کرنا موجودہ مال کے تابع نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ شافعی نے کہا ہے اور احمد نے اور ابوحنیفہؒ نے اور مالکؒ نے۔ کہ استفادہ حاصل کرنا مال کے تابع ہوتا ہے۔ جب ایک سال گزر جائے ۸۰ بکریوں پر تو ۲ بکریاں فرض ہو جاتی ہیں ہر ایک میں۔ جیسا کہ ان کے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کے تابع ہوتے ہیں۔

جماعۃ انھم : یہ بدل اشتمال ہے۔ **ای ذکر ان جماعۃ عددھم۔**

یعنی اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان نہیں کیا جیسا کہ متن میں ہے۔ بلکہ موقوف بیان کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ **من استفاد مالا......**

اور مصابیح میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما پر وقف زیادہ بہتر ہے۔ میرک فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اسے ترمذی نے بھی مرفوع بیان کیا ہے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم عن ابیہ عن ابن عمر قال کے واسطے سے اور اسے موقوف بیان کیا ہے عبدالرحمٰن بن زید علی' ابن عمر سے موقوف طریقے پر اور موقوف زیادہ صحیح ہے اور عبدالرحمٰن بن زید ضعیف ہے حدیث میں اور اسے احمد بن حنبل نے اور ابن مدینی نے ضعیف قرار دیا ہے یہ کثیر الغلط ہیں اور ترمذی کی عبارت بھی اسی طرح ہے۔ اور جسے مصنف نے نقل کیا ہے اس میں کوئی تعمل نہیں ہے اور جو اس ابن حجر کا قول ہے۔ وتفوہٗ لیکن قاعدہ حدیثیہ اصولیہ یہ ہے کہ حکم مرفوع کے لیے ہے کیونکہ اس کے ساتھ علم کی زیادتی بھی ہے اور اسے زیادہ قوت پہنچائی ہے اور جب کسی چیز میں دو طریقے صحیح ہوں اور حدیث ایسے نہیں ہے اور یہ قول کہ اسے ــ۔ نے زیادہ عمدہ جانا ہے اور اسے دلیل بنایا ہے اور اس پر اتفاق کیا ہے۔ کہ سال گزرنے کے لیے کچھ شرائط ہیں کہ جب زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ یعنی اس کی ملکیت سے کب نکلی ہے۔ اور کب اس سے لوٹی ہے۔ یعنی کہ اس پر سال گزرتا ہے اور دوسرا سال آتا ہے۔ تو وہ اس وقت اس حدیث کے معنی سے نکل جائے گا۔ پس تو غور کر۔

ابن حمام کہتے ہیں: مالک اور نسائی نے بیان کیا ہے نافع سے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: **من استفاد مالا فلا زکوٰۃ علیہ حتی یحول علیہ الحول۔** جس نے کسی مال سے استفادہ حاصل کیا تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر جائے اور ابوداؤد نے عاصم بن زمرہ سے بیان کیا ہے اور حارث الاعور سے اور وہ حضرت علی سے، وہ رسول اللہ

ﷺ سے کہ جب تیرے لیے ۲۲۰ درہم ہوں اوران پر ایک سال گزر جائے تو ان کے اندر ۵ درہم زکوٰۃ ہے۔ اور حدیث کو مزید آگے بیان کیا ہے:

إذا كانت لك مائتادرهم و حال عليها الحول ففيها خمسة دراهم ۔

ففيها نصف دينار کے بعد ہے فما زاد فبحساب ذٰلك فلا أدري علي يقول فبحساب أو رفعه الى النبي وليس في مال زكٰوة حتى يحول عليه الحول۔ کہ جو اس کے زیادہ ہوگا اس کا اس کے مطابق حساب ہوگا میں نہیں جانتا کہ اپنی طرف سے کہا یا رسول اللہ ﷺ تک اسے مرفوع بیان کیا ہے اور مال زکوٰۃ میں صدقہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایک سال گزر جائے۔ اور حادث اگر چہ ضعیف ہے لیکن عاصم ثقہ میں اور ثقہ سے یہ روایت کرنے میں کہ یہ اُن سے مرفوع ہے تو اس کا مرفوع ہونا واجب ہے اور اس کے تصحیح کو رد کیا ہے اور اس معنی میں حدیث انس اور عائشہ رضی اللہ عنھم ہیں۔

پھر شافعی فرماتے ہیں کہ استفادہ حاصل کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ ایک سال گزرنا اس میں معتبر ہے جب سال گزر جائے تو وہ زکوٰۃ واجب ہوگی کم ہو یا پھر زیادہ ہو اور باوجود اس کے اُس کے پاس اُس نصاب کی جنس موجود ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من استفاد.......... ۔ اور آپ کا فرمان جب تک ایک سال مال پر نہ گزر جائے صدقہ، زکوٰۃ نہیں ہے۔ مگر بچے وہ بھی اپنے ماں باپ کے حکم میں ہیں کیونکہ وہ بھی اصل سے ہیں۔ اور جس پر یہ شرائط نہ پوری ہوں وہ ایسے نہیں ہیں۔ ہم نے کہا اگر ہم تسلیم کرلیں اس کے تسلیم کے ثبوت تو اس کی عموم اتفاقی طور پر مراد نہیں ہے اور خصوص کی دلیل ان چیزوں میں ہے جو علت والی ہیں اور دوسری مرتبہ وہ اس علت سے نکل جاتی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اولاد کا اس سے علیحدہ کرنا اور اسے حول الاصل کے ساتھ ملانا یہ اس کے خاص کے لیے ہے۔ صرف اولاد کی وجہ سے نہیں ہے تو واجب ہے کہ جس سے استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے وہ بوجوہ مجانس بھی ہو تو اُسے اُس کی جنس سے ملا دیا جائے۔ تو ہمارا اعتبار اولیٰ ہوتا کیونکہ یہ حرج کو زیادہ دفعہ کرنے والا ہوتا ہے اس تقدیر پر کہ اصحاب غلۃ جو ہر دن ایک درہم غلہ خرچ کرتے ہیں یا اس سے کم یا زیادہ کیونکہ سال کے اعتبار کرنے میں ہر فائدہ حاصل کرنے والے کے لیے ایک درہم ہے اور اسی طرح بہت بڑا حرج ہے تو اس کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اور اس بنیاد پر کوئی ضرورت نہ ہے کہ حول میں لام کو لام مھور قرار دیا جائے کیونکہ اصل میں ایسا ہے جیسا کہ نہایہ میں ہے بلکہ یہ معہوم کے لیے ہے اس لحاظ سے کہ بارہ مہینے ہوں جیسا کہ امام شافعی نے کہا ہے کہ مگر اس نے کچھ خاص کیا ہے۔ کیونکہ جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے وہ ابتداً عام ہوتا ہے نصاب اصلی سے میری مراد ہے کہ سب سے پہلے جس سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور تخصیص اس کے غیر میں واقع ہوتی ہے اور وہ ہے ایک جنس کا ہونا اور بقیہ عموم اصلی کے تحت ہوں گے۔ اور اصل میں صدقہ نہ ہوگا۔ ہاں مگر جب ایک سال گزر جائے۔

مدت پوری ہونے سے پہلے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے

۱۷۸۸: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ الْعَبَّاسَ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ تَعْجِيْلِ صَدَقَةٍ قَبْلَ اَنْ تَحِلَّ فَرَخَّصَ لَهٗ فِيْ ذٰلِكَ۔ (رواه ابو داو د والترمذي وابن ماجة والدارمي)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/۲۷۵ حدیث رقم ۱۶۲۴۔ والترمذی ۳/۶۳ حدیث رقم ۶۷۸۔ وابن ماجه ۱/۵۷۲ حدیث رقم ۱۷۹۵۔ والدارمی ۱/۴۷۰ حدیث رقم ۱۶۳۶ واحمد فی المسند ۱/۱۰۴۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سال پورا ہونے سے پہلے زکوۃ ادا کرنے کے بارے میں پوچھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔ اس کو ابوداؤد ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والدارمی)

تشریح: تحل: حاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی زکوۃ کے فرض ہونے سے قبل۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک سال مکمل ہونے سے قبل۔ اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے وہ حاصل المعنی ہے وہ مبنی بر تحقیق نہیں ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کرتا ہے کہ صدقہ جلدی بھی دیا جاسکتا ہے نصاب پورے ہونے کے بعد سال پورا ہونے سے قبل اور ایسے ہی جائز ہے صدقہ فطر جلدی دینا جائز ہے کہ دخول رمضان کے بعد کیونکہ قانون یہ ہے کہ مال ہونا دونوں میں سب سے ایک دوسرے پر مقدم کہا جاسکتا ہے اور مال زکوۃ میں نصاب شرط ہے اور سال کا گزرنا اور زکوۃ الفطر میں سبب دخول رمضان ہے اور عید کا پہلا حصہ پانا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس میں مالک کا اختلاف ہے۔ کہ زکوۃ واجب کو ساقط کر دیتی ہے اور وجوب سے قبل سقوط نہیں ہے۔ اور یہ نماز کی طرح ہے وقت سے پہلے کیونکہ یہ ادا کی جاتی ہے سبب کے پورا ہونے پر تو۔ سبب نصاب کا پورا ہونا ہے اور وہ پورا نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم مجرد نصاب پر زائد کا اعتبار نہیں کرتے اور سال سے پہلے جلدی کرنا اصل فرض ہونے کے بعد ہے تو یہ قرض مؤجل کی طرح ہے اور تعجیل مؤجل صحیح ہے تو نصاب پورا ہونے کے بعد زکوۃ ٹھیک ہے کہ جیسا کہ اول وقت میں نماز پڑھنا اور مسافر کا رمضان کے روزے رکھنا سبب پورا ہونے کے بعد اور یہ حدیث اس اعتبار کی صحت پر دلالت کرتی ہے جو ابوداؤد میں ہے اور ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے کہ حضرت عباسؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا زکوۃ جلدی دینے میں سال گزرنے سے قبل بھلائی کی طرف جلدی کرنے کی وجہ سے تو آپ نے اُسے اجازت دی تھی۔

یتیم کے مال کی حفاظتی تدبیر

۱۷۸۹: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ اَلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيْمًا لَهٗ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكْهُ حَتّٰى تَاْكُلَهُ الصَّدَقَةُ

(رواه الترمذی وقال فی اسناده مقال لا ن المثنی ابن الصباح ضعيف)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۳۲ حدیث رقم ۶۴۱۔

ترجمہ: حضرت عمرو شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ (یعنی شعیب سے) سے نقل کی اور انہوں نے اپنے دادا (یعنی عبداللہ) سے نقل کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا خبردار جو شخص کسی یتیم کا والی ہو اور یتیم کے لیے بقدرِ نصاب مال ہو۔ پس چاہیے کہ وہ اس کے مال کی تجارت کرے اور اس کو بغیر تجارت کے نہ چھوڑے کہ کہیں اس کے مال کی زکوۃ دیتے دیتے مال ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ألا: تنبیہ کے لیے ہے۔

واؤ کے فتحہ کے اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں واؤ کے ضمہ اور لام مشدود کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی کہ جو یتیم کا والی بنا۔

له مالٌ: (تنوین برائے تعظیم ہے) ای مال عظیم۔ یعنی بہت بڑا۔ یعنی کہ وہ نصاب ہوگا اور اسے ابن حجر نے مطلق مال پر حمل کیا ہے۔ وہ اپنے قول میں کہتے ہیں۔ کہ یہاں تک کہ وہ اسے کھالے۔ یعنی جو نصاب کے علاوہ ہو۔ تو اس سے صدقہ کھانا ممکن نہیں ہے۔

فلیتجر: فوقیہ کے تشدید کے ساتھ یعنی خریدنا اور فروخت کر دینا۔

طیبی فرماتے ہیں فلیتجر به کا مطلب ہے جیسے آپ کا قول کہ میں نے قلم کے ساتھ لکھا۔ اور اس لیے بھی کہ یہ تجارت کے لیے شمار کرنا ہے تو اسے ظرف مستقر بنا دیا تجارت کے لیے۔ اور مال کو تجارت مقرر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے اصل سے خرچ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ اس کے منافع سے خرچ کرے گا اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول کا اشارہ ہے۔ کہ تم نا سمجھوں کو ان کا مال نہ دو۔

ولا یتر که: نہیں کے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفی کے ساتھ ہے۔

حتی تاکله الصدقة: یعنی کہ اس کو کم کرے گا اور اس کو ختم کرے گا۔ کیونکہ کھانا یہ فنا کر دینے کا سبب ہوتا ہے ابن ملک فرماتے ہیں: یعنی زکوۃ لینے کے ساتھ تو وہ اس سے کچھ نہ کچھ کم کرتا رہے گا۔ اور یہ دلالت کرتی ہے بچوں کے مال میں زکوہ کے واجب ہونے پر اور اسی میں شافعی، مالک، ابوحنیفہ اور احمد نے کہا کہ اس میں زکوۃ نہیں ہے اور اس کا جواب ابھی آئے گا۔

قوله: رواہ الترمذی ...... :الصباح: تشدید موحدہ کے ساتھ ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کیونکہ اس روایت کے اندر تدلیس ہے۔ اور کچھ الہام میں اور یہ احتمال رکھتی ہے۔ کہ اسے شعیب سے روایت کیا ہے اور شعیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ عبداللہ شعیب کے دادا سے روایت کرتے ہیں وہ رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ عمر شعیب سے روایت کرتے ہیں اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں تو یہ متصل نہ ہوگا اور جو ابن حجر کا قول ہے۔ وہ رد کرتا ہے کہ اس ضعف وصل کا ہونا ہے اور جو اس کا مرسل ہونا ہے تو اس کی سند صحیح نہیں ہے بلکہ مردود ہے کیونکہ کسی بھی حدیث کے لیے دو طریق ایسے نہیں ہو سکتے کہ ایک صحیح ہو اور ایک ضعیف ہو۔ تاکہ اس قول کی تصحیح کر سکے۔ بلکہ یہ حدیث ضعیف ہے اتصال اور ارسال کے احتمال سے اور ارسال یہ ہوتا ہے کہ راوی حدیث کے اندر تدلیس کرے اتصال کے احتمال سے باوجود اس کے کہ ضعف کی علت وہ ہے جسے ترمذی نے ذکر کیا ہے یہ کہ مثنیٰ ضعیف ہے اور یہ حدیث اسی وجہ سے منحصر ہے۔ اور امام احمد نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے وگرنہ حدیث جب ٹھیک ہو تو ہمارے نزدیک حجت ہے اور جمہور کے ہاں بھی لیکن شوافع کے خلاف اور ان کا جو یہ قول ہے کہ وقد اعتضدوا اعتضد بعموم صحیح قبروں کے بارے میں ہے: توخذ من اغنیاء هم۔ ایک وہ خبر جو اغنیاء سے لی جاتی ہے۔ اور دوسری: فرضها رسول الله علی المسلمین۔ وہ جسے اللہ کے رسول نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے تو یہ ممنوع ہے کیونکہ عام احکام وہ مکلفین پر ممنوع

ہوتے ہیں اجماع امت کے ساتھ۔

ابن ہمام فرماتے ہیں حدیث تو ضعیف ہے ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث اسی وجہ سے بیان کی گئی ہے لیکن اس کی سند میں کچھ کلام ہے۔ کیونکہ مثنیٰ اس حدیث کے اندر ضعیف ہیں۔ صاحب التنقیح کہتے ہیں میں نے احمد بن حنبل سے سوال کیا اس حدیث کے بارے میں تو انہوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے البتہ اس حدیث کے دو اور طریق بھی ہیں۔ دار القطنی کے ہاں اس کے اعتراف کے ساتھ دونوں ضعیف ہیں۔ اور اللہ کے رسول نے فرمایا ہے: رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتى يستيقظ و عن الصبى حتى يحتلم و عن المجنون حتى يعقل۔ کہ تین آدمیوں سے قلم اُٹھالی گئی ہے۔ سوئے ہوئے سے یہاں تک کہ وہ جاگ جائے اور بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے اور مجنوں سے یہاں تک کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ تو ممکن نہیں ہے اس کے اندر کوئی رائے دینا تو حاصل کلام یہ ہے کہ یہ صحابی کا قول ہے اس کے اپنے اجتہاد سے۔

محمد بن حسن اپنی کتاب کتاب الآثار میں فرماتے ہیں کہ ہمیں ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے خبر دی وہ کہتے ہیں کہ ہمیں لیث بن سلیم نے حدیث میں بیان کیا ہے مجاہد سے اور انہوں نے ابن مسعود سے فرمایا: ليس فى مال اليتيم زكوٰة۔ کہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور لیث عبادت گزار علماء میں سے ایک تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی آخری عمر میں اس کا حافظہ ختم ہو گیا تھا لیکن یہ بات بھی معلوم ہے کہ ابوحنیفہ اس کے اختلاط کے باوجود اس سے حدیث نہیں لی ہوگی۔ وہ تو اس معاملے میں بہت سخت ہیں جتنا کہ دوسرے نہیں ہیں اور ابن مسعود کے قول کے مثل ابن عباس سے روایت کیا گیا لیکن اس میں ابن لھیعۃ متفرد ہیں اور ہم نے اسے کئی مرتبہ بیان کر دیا ہے۔

الفصل الثالث:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منکرین زکوٰۃ کے ساتھ لڑائی کرنے کا ارادہ

۱۷۹۰: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَمَّا تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاسْتُخْلِفَ اَبُوْبَكْرٍ بَعْدَهٗ وَكَفَرَ مَنْ كَفَرَ مِنَ الْعَرَبِ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِاَبِىْ بَكْرٍ كَيْفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمَ مِنِّىْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَّاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكَاةِ فَاِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ الْمَالِ وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِىْ عَنَاقًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهَا قَالَ عُمَرُ فَوَاللّٰهِ مَاهُوَ اِلَّا رَاَيْتُ اَنَّ اللّٰهَ شَرَحَ صَدْرَ اَبِىْ بَكْرٍ لِلْقِتَالِ فَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۲۶۲/۳۔ حديث رقم ۱۳۹۹۔ وابوداؤد فى السنن ۱۹۸/۳ حديث رقم ۱۵۵۶۔ والنسائى ۵/٦ حديث رقم ۳۰۹۱۔ واحمد فى المسند ۱۹/۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے اور کچھ لوگوں نے اہل عرب میں سے کفر اختیار کیا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کافروں کے ساتھ لڑنے کا ارادہ کیا۔ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تم اہل ایمان سے کیسے لڑو گے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑائی کروں جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں۔ یعنی اسلام لے آئیں پھر جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ اس نے مجھ سے اپنا مال اور جان بچالی۔ مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور اس کا حساب اللہ پر ہے پس ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم! میں لڑوں گا' اس شخص سے جو نماز اور زکوۃ میں فرق کرے گا۔ اس لیے کہ زکوۃ مال کا حق ہے جیسے نماز نفس کا حق ہے پس اللہ کی قسم اگر مجھ کو بکری کا بچہ نہیں دینگے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کیا کرتے تھے میں ان کے نہ دینے کی وجہ سے لڑائی کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دل لڑائی کے لئے کھول دیا ہے۔ پس میں نے جانا کہ لڑنا برحق ہے۔

تشریح: توفی : صیغہ مفعول کے ساتھ یعنی جب فوت ہوئے۔

استخلف : صیغہ مفعول علی الصحیح پر۔ یعنی انہیں خلیفہ بنایا گیا۔

وکفر من کفر : یا تو یہ تغلیب کے ساتھ ہے۔ یا اس وجہ سے کہ انہوں نے زکوۃ کے وجود کا انکار کر دیا تھا۔ اور اس پر جمع ہونے کا انکار کر دیا تھا حالانکہ یہ ضروریات دین میں سے ہے اور اس سے انکار کفار اتفاقیہ ہے بلکہ ایک جماعت نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اس کا انکار کرنا کفر ہے۔ اگرچہ معلوم نہ بھی ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ یہ کفر کے مشابہ ہے یا نعمت کا انکار کرنا۔

من العرب : طیبی فرماتے ہیں اس سے مراد غطفان، فزارتہ، اور بنی سلیم اور دوسرے دیگر قبیلے تھے جو زکوۃ سے رک گئے تھے۔ تو حضرت ابوبکر نے ان سے لڑنے کا ارادہ کر لیا ان کو قتل کرنے کا تو عمر نے ان پر اعتراض کیا کہ ابوبکر نے انہیں کافر بنا دیا ہے اس لیے کہ انہوں نے زکوۃ کے فرض ہونے سے انکار کر دیا ہے تو یہ بہت سختی تھی تو حضرت عمر نے انہیں اس کے ظاہر معنی پر سمجھا اور حضرت ابوبکر سے اس کا انکار کر دیا۔

اور دوسرے مطلب پہ وہ روایت دلالت کرتی ہے کہ: قالوا انما کنا نؤدی زکوتنا لمن کانت صلاته سکنا لنا' والآن قد ذهب ذلك بوفاته علیه السلام فلا نؤدیها لغیره۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان سے قتال کا ارادہ کر چکے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم زکوۃ ادا کیا کرتے تھے کیونکہ ہماری نمازیں ہمیں سکون پہنچایا کرتی تھیں۔ لیکن اب تو رسول فوت ہو چکے ہیں تو ہم اب کسی اور کو زکوۃ نہیں دیں گے۔ جب ان سے لڑنے کا فیصلہ کیا تو۔

کیف تقاتل الناس : یعنی اہل ایمان سے

حتی یقولوا لا اله الا الله : یہ اسلام سے کنایہ ہے۔ یا لوگوں سے مراد مشرکین ہیں۔

فمن قال لا اله الا الله : یعنی کلمہ توحید کہا اور وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ صرف اسی کے ساتھ اسلام میں شمار نہیں ہوگا۔

عصم صاد کے فتحہ کے ساتھ یعنی محفوظ کریں اور روک لیا۔

منی : یعنی مجھ سے اور میرے پیروکاروں سے

ماله و نفسه الا بحقه :ای بحق الاسلام: یعنی حق اسلام کے ساتھ جیسا کہ روایت میں ہے۔طیبی فرماتے ہیں:ای **لا یحل لاحد أن یتعرض لماله و نفسه بوجه من الوجوه الا بحقه......** یعنی کسی کے لیے حلال نہیں؟ کہ وہ کسی کے مال یا نفس پر حملہ کرے کسی بھی وجہ سے مگر کسی حق کے ساتھ۔یا مذکورہ حقوق میں سے کسی حق کے ساتھ۔

حسابه : یعنی اس کی جزا اور اس کا محاسبہ ہے یا نہیں ہے۔طیبی فرماتے ہیں یعنی جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا کہ اسلام ظاہر کر دیا تو ہم اس سے لڑائی کرنا چھوڑ دیں گے۔ہم اس کی پوشیدگی کی تفتیش نہیں کریں گے کہ وہ مخلص ہے کہ نہیں یہ سارا کچھ اللہ پر ہے اور اس کا حساب بھی۔

فرق : تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔

بین الصلاة والزکاة : یعنی کہ جو قرآن کے اندر ذکر ہیں یا حدیث میں ذکر ہیں: **حتی یقولوا لا اله الا الله' و یقیموا الصلوٰة و یؤتوا الزکاة۔** کہ جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے رہیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں اور یہ سب سے واضح ہے حضرت ابوبکر کے استدلال میں۔

قوله :فان الزکوة حق المال : یعنی کہ جس طرح نماز نفس کا حق ہے۔طیبی فرماتے ہیں کہ جو مذکورہ حق ہے وہ مال کے حق ہونے یا وہ عام ہے۔طیبی فرماتے ہیں گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس قول کو حمل کیا تھا زکوٰۃ کے علاوہ پر اسی وجہ سے اس کا استدلال صحیح تھا حدیث سے تو ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ زکوٰۃ کو بھی شامل ہے۔یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وہم ہوا تھا کہ یہ لڑائی کفر کی وجہ سے ہے تو ان کو جواب دیا تھا کہ یہ لڑائی زکوٰۃ نہ دینے والے کے لیے ہے۔تو یہ شافعیہ کے لیے دلیل نہیں بنتی کہ نماز کے تارک کو قتل کیا جا سکتا ہے۔کیونکہ یہاں پر فرق ظاہر ہے کیونکہ ایک قوم نے اسلام کے اشعار کو چھوڑا تھا اور یہ ایک رکن کو چھوڑ رہے ہیں کیا تو نہیں دیکھتا ہے امام احمد نے اذان کو چھوڑنے والوں کے لیے لڑائی کو جائز قرار دیا تھا۔واللہ المستعان۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس قول میں ظاہر یہ ہے **خذمن اموالهم صدقة تطهرهم** ۔[التوبة : ۱۰۳] کہ امام کے لیے زکوٰۃ لینا مطلقاً واجب ہے۔اور اسی بنیاد پر اللہ کے رسول اور دونوں خلیفہ لیتے رہے۔پس جب حضرت عثمان ولی مقرر ہوئے اور لوگوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی تو لوگوں سے تفتیش نہ کی تو بادشاہوں کی طرف اس معاملے کو سپرد کر دیا تو اس پر کسی صحابہ نے بھی آپؓ پر اختلاف نہیں کیا۔تو یہ امام کے طلب کو ساقط نہیں کرتا اگر وہ جان لے کہ اہل علاقہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔

والله لو منعونی...... لقاتلتهم علی منعها:

عناقاً : عین کے فتحہ کے ساتھ۔یعنی کہ اس کا وہ مؤنث بچہ جو بھی ایک سال کا نہ ہوا ونٹ کا اور اسے مبالغہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔نووی فرماتے ہیں کہ ایک آیت میں عقالاً ہے اور اس کی کئی وجوہات بھی بیان کی ہیں جن میں سے سب سے بہتر صاحب تحریر کی ہے کہ یہ مبالغہ کے طور پر آیا ہے کیونکہ کلام تنگی کی جگہ پر نکلا ہے۔تو یہ قلت اور حقارت کا تقاضہ کرتا ہے۔تو میں دفاع کرتا ہوں جو ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کے وجوب کی دلیل حضرت ابوبکرؓ کی دلیل ہے۔کہ اللہ کی قسم اگر وہ مجھ سے ایک عناق بھی روک لیں تو اس پر صحابہ نے بھی اس کی مطوفقت کی تو گویا کہ یہ اجماع ہو گیا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس کی نفی پر دلالت کرتی ہے وہ روایت کہ جو ابوداؤد اور نسائی میں ہے: **عن سوید بن غفلة قال**

اتانی مصدق رسول اللّٰه فأتیته فجلست الیه فسمعته یقول فی یعنی کتابی ان لا آخذ راضع لبن۔ سوید بن غفلہ سے روایت ہے کہ میرے پاس اللہ کے رسول ﷺ کا صدقہ لینے والا آیا تو میں اس کے پاس بیٹھا تو میں نے اس سے سنا کہ میں کوئی دودھ والا بچہ زکوٰۃ میں نہیں لوں گا اور فرماتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس سے معارض نہیں ہے۔ کیونکہ عناق کا لینا چھوٹے بچے کو لینے کو لازم نہیں کرتا۔ کیونکہ ہم ذکر کر چکے ہیں بکریوں کے صدقہ میں کہ عناق جزمۃ اور ثنیۃ کو بھی کہا جاتا ہے۔ تو تعارض کے لیے اسے اس پر حمل کرنا جائز ہے اور اسے قیمت سے لینا بھی جائز ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ مبالغہ کے طریقہ پر ہے بلکہ تحقیق پر نہیں کیونکہ دوسری روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عقالاً کی بجائے عناقاً ہے۔

لقاتلتهم علی منعها: یعنی کہ اسے نہ روکنے پر یا منع کرنے پر اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جو شافعی کہتے ہیں کہ امام پر واجب ہے کہ وہ زکوٰۃ ان سے جبراً لے لے۔ کیونکہ حدیث میں تو زکوٰۃ روکنے والوں کے لیے قتال ہے یا جو اس کے وجوب میں تکبر کرتا ہے اس کے لیے ہے یہاں تک کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئے۔ یا وہ جو تسلیم کرتا اسلام کے احکام کو نماز کوٰہ میں سے اور اس طرح دوسری چیزیں تو اس کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس کے فعل اور ترک میں۔ باوجود اس کے عبادات کے اندر نیت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

یہ ضمیر ''ضمیر شان'' ہے۔

قولہ: هو الحق : یہ انصاف تھا ان کا اور ان کا حق کی طرف لوٹنا تھا۔ جب حق ان پر واضح ہو گیا۔ کیونکہ وہ تو حق کہنے والے تھے اور سچائی کے سرچشمہ تھے اور اس کے ساتھ صدیق کا کمال واضح ہوتا ہے اور ان کے اور فاروق کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے۔ جبکہ صدیق بہت ہی گہرا اور تحقیق والا راستے پر چل رہے تھے توفیق کے ذریعے طیبی فرماتے ہیں اس سے جو ثنی ہے وہ واضح نہیں ہے۔ ای لیس الأمر شیئا من الاشیئا الا علمی بأن أبا بکر محق۔ پس اس ضمیر کی تفسیر اس کا مابعد کلام کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ﴿اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا﴾ [الانعام:۲۹] ''اور کہتے ہیں ہماری جو دنیا کی زندگی ہے۔''

اگر جمع شدہ مال پر زکوٰۃ ادا نہ کی گئی تو وہ قیامت کے دن گنجا سانپ بن جائے گا

۱۷۹۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ کَنْزُ اَحَدِکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شُجَاعًا اَقْرَعَ یَفِرُّ مِنْهُ صَاحِبُهٗ وَیَطْلُبُهٗ حَتّٰی یُلْقِمَهٗ اَصَابِعَهٗ۔ (رواه احمد)

اخرجه أحمد فی المسند ۲/ ۵۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تم میں سے ایک آدمی کا گنج (خزانہ) قیامت کے دن گنجا سانپ بن جائے گا۔ اس کا مالک اسے اس سے بھاگے گا اور وہ (سانپ) اس کو ڈھونڈتا ہو گا۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیوں کو لقمہ بنالے گا۔ اس کو احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''کنز'' سے مراد جمع کیا ہوا مال یا وہ چھپایا ہوا مال جس سے زکوٰۃ نہ دی گئی ہو اور اسی کے معنی میں ہے ہر

شجاعًا : یعنی وہ سانپ بن جائے گا یعنی کہ اس کا بدلہ اسے سانپ کی صورت میں دیا جائے گا۔

صاحبه : یعنی کہ خزانے والا صاحب یا وہ سانپ والا صاحب۔

یلقمه :"القام" مصدر سے اور وہ اژدھا اس کی انگلیوں کو لقمہ بنائے گا۔

اصابعه : کیونکہ زکوۃ روکنے والا اپنا مال اپنے ہاتھ سے کماتا ہے سید جمال الدین کہتے ہیں کہ یہ دو احتمال رکھتا ہے ایک یہ ہے کہ سانپ اس کی انگلیوں کو کھائے گا اور دوسرا یہ کہ صاحب مال خود اپنی انگلیوں کو سانپ کا لقمہ بنائے گا۔ غور کرو، شاید کہ غور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جسے طیبی نے بیان کیا ہے۔ جہاں وہ فرماتے ہیں کہ وہ سانپ اپنی داڑھوں کے ساتھ اور اپنے جبڑوں کے ساتھ پکڑ لے گا۔ ظاہر یہ ہے کہ اسے ہر طرح سے عذاب دیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ زکوۃ نہ دینے والے کو ہر طرح سے عذاب دیا جائے گا۔ بسا اوقات مال کو تختہ کی صورت دے کر اس سے داغا جائے گا' کبھی اس کا مال گنجا اژدھا بنا کر اس کے گلے میں طوق کی صورت میں ڈال دیا جائے گا اور بسا اوقات وہ اس کے پیچھے بھاگے گا اور وہ اس کی انگلیوں کو چبائے گا۔ واللہ اعلم

۱۷۹۲:وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ رَّجُلٍ لَا يُؤَدِّيْ زَكَاةَ مَالِهٖ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ عُنُقِهٖ شُجَاعًا ثُمَّ قَرَأَ مِصْدَاقَهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ الْاٰيَةَ ـ (رواه الترمذی والنسائی وابن ماجه)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۱٦/۵ حدیث رقم ۳۰۱۲۔ والنسائی ۱۱/۵ حدیث رقم ۲٤٤۱۔ وابن ماجه ٥٦٨/۱ حدیث رقم ۱۷۸٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے مال کی زکوۃ ادا نہ کرے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی گردن میں سانپ لٹکائے گا۔ پھر کتاب اللہ سے اس کی مصداق آیت پڑھی کہ وہ لوگ گمان نہ کریں جو بخیلی کرتے ہیں' جن کو اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے آخر آیت تک۔ اس کو ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: مصداقه من كتاب الله : ظاہر یہ ہے کہ یہ مصداقہ سے حال ہے یا اس کا بیان ہے اور جو اس کے بعد ہے وہ بدل بعض ہے کل سے۔ اور جو ابن حجر نے بتایا ہے کہ من تبعیض کے لیے وہ ظاہر نہیں ہے۔

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ ......﴾ [ال عمران : ۱۸۰] میں نے اس میں ذکر کیا ہے کہ عنقریب جو وہ بخل کرتے ہیں طوق پہنائے جائیں گے قیامت کے روز۔

اسنادی حیثیت :امام میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں سند صحیح کے ساتھ ہے ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

زکوۃ کے مال کو دوسرے مال کے ساتھ نہ ملاؤ

۱۷۹۳:وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا خَالَطَتِ الزَّكَاةُ مَالاً قَطُّ اِلَّا اَهْلَكَتْهُ. (رواه الشافعی والبخاری فی تاریخه والحمیدی وزاد قال یکون قد وجب

علیك صدقة فلا تخرجها فیهلك الحرام الحلال وقد احتج به من یری تعلق الزکاۃ بالعین هکذا فی المنتقی وروی البیهقی فی شعب الایمان عن احمد بن حنبل باسناده الی عائشة وقال احمد فی خالطت تفسیره ان الرجل یا خذ الزکاۃ وهو مو سر او غنی وانما هی للفقراء۔)

اخرجه الشافعی فی مسنده ص۹۹۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا ہے جب زکوۃ کسی مال میں مل جاتی ہے تو وہ اس کو ہلاکت کر دیتی ہے یہ امام شافعیؒ نے روایت کی ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے اور حمیدی نے مزید کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے فرمایا کہ جب تجھ پر زکوۃ واجب ہوتی ہے اور نہیں نکالتا اور زکوۃ مال کے ساتھ ملی رہے تو حرام مال حلال کو بھی ہلاک کر دیتا ہے۔ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ زکوۃ کا تعلق عین مال سے ہے انہوں نے اس حدیث کو مذکورہ تفسیر کے ساتھ اپنی دلیل بنایا ہے اسی طرح منتقی میں ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اپنی اسناد کے ساتھ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچتی ہے اور امام احمدؒ نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ ایک شخص زکوۃ وصول کرتا ہے اور وہ دولت مند غنی ہے۔ حالانکہ زکوۃ فقیروں کے لیے ہے۔

تشریح: قول :ما خالطت الزکاۃ مالا قط :الا أهلکته :یعنی یہ کہ صاحب مال پر نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے زکوۃ لے لی جائے یا یہ کہ اس نے زکوۃ نہ نکالی ہو۔

الا اهلکته : یعنی اسے کم کر دے گی یا اسے ختم کر دے گی یا اس سے برکت ختم کر دے گی۔ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ احتمال رکھتی ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔ کیونکہ زکوۃ اس کے لیے ایک محفوظ دیوار ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ اس سے نفع اُٹھاتا ہے اور حرام چیز سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی حمیدی نے

قوله :و زاد و قال...... هکذا فی لمنتقی:قال: یعنی بخاری نے کہا یا حدیث کی تفسیر میں ہے۔

یکون قدوجب علیك صدقة فلا تخرجها فیهلك الحرام الحلال : گویا کہ وہ اس کے ساتھ مل جاتی ہے۔

قوله :وقد احتج به من یری تعلق الزکوٰۃ بالعین : عین کے ذمہ کے ساتھ نہیں اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ کوئی تعلق نہیں استدلال کا احتمال حقیقی کا اور مجازی حال کے ملنے میں حلال کے ساتھ اور حلال جو ہے یا تو وہ حقیقت پر محمل ہے اور جب ممکن ہو تو کوئی دوسرا احتمال بھی جائز نہیں ہے اور ان دونوں کے درمیان جمع کرنا بھی ارباب کمال کے ہاں منع ہے اس لیے طیبی فرماتے ہیں کہ اگر تو کہے کہ یہ حدیث ظاہری طور پر مخالطۃ کے معنی میں ہے تو یہ معناً اور مبناً دو چیزوں کا مطالبہ کرتی ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے تو یہ مطلب کہاں سے آئے گا اور جو اس کی تفسیر حرام اور حلال کے ہلاک کرنے کے ساتھ کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب زکوۃ کو مال کے عین کے ساتھ لازم کر دیا گیا تو زکوۃ کو نصاب کے اندر معین کر دیا گیا تو میں کہتا ہوں کہ یہ کلام اپنے مصادر کے ساتھ کسی ذی العقل پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

هکذا فی المنتقی : ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے اس قول کا ارادہ کیا تھا کہ قد احتج۔

قوله :و قال احمد فی خالطت : یعنی لفظ خالطت حدیث کے درمیان میں واقع ہے۔

تفسیرہ : یعنی اس کا معنی یا اس کی تفسیر یا اس کی تاویل طیبی فرماتے ہیں یہ احمد بن حنبل کا قول ہے۔

وھو موسر أو غنی : راوی کو شک ہے ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ محتاج ہے بیان اور دلیل کی طرف اور برھان کی طرف

وانما ھی : یعنی زکوٰۃ۔

للفقراء : یعنی اور ان کے مثل اور وہ غالب آ گئے کیونکہ وہ بقیہ سے اکثر تھے یا کیونکہ فقر شرط ہے اور ابن حجر کی بھی یہاں کچھ بحث تھی لیکن بغیر دلیل کے تھی تو میں نے اس سے اعراض کیا ہے۔

بَابُ مَا تَجِبُ فِيْهِ الزَّكٰوةُ

یہ باب وجوب زکوٰۃ کے بارے میں ہے

تمام ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بارے میں چار پایوں میں یعنی اونٹ گائیں اور بکری اور بھینس خواہ نر ہوں یا مادہ ہوں اور ان کے علاوہ جانوروں میں زکوٰۃ نہیں ہے لیکن گھوڑے میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زکوٰۃ ہے اور آئندہ اس کی تحقیق آ جائے گی۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بارے میں ائمہ کرام کا اتفاق ہے اور جو چیز تجارت کے لیے ہو اور اختلاف ہے ساگون اور سبزیوں اور پھلوں میں جو پک رہیں دیگر ائمہ کے نزدیک ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور کھجور اور کشمش میں زکوٰۃ واجب ہے جب کہ وہ پانچ وسق جو پہنچ جائیں اس سے کم میں نہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عشر یعنی دسواں حصہ واجب ہے ہر چیز میں سے جو زمین کی پیداوار سے ہو اور وسق کے معنی آئندہ حدیث کے فائدہ میں لکھیں گے اور زمین کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں جو عشر ہے ان میں سال گزرنے کی قید نہیں ہے جب پیداوار ہوگی تو دینا ہوگا اور اموال میں جب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب مال نصاب کو پہنچ جائے گا اور اس پر ایک سال بھی گزر جائے گا۔ ما اخرجۃ الارض ففیہ العشر۔

الفصل الاول:

مختلف نصابوں کی مقدار

۱۷۹۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ مِّنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ وَّلَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِّنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ وَّلَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِّنَ الْاِبِلِ صَدَقَةٌ. (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۳۲۳/۳۔ حدیث رقم ۱۴۵۹۔ ومسلم فی صحیحہ ۶۷۳/۲ حدیث رقم (۹۷۹/۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۲۰۸/۳ حدیث رقم ۱۵۵۸ والترمذی ۲۲/۳ حدیث رقم ۶۲۶۔ والنسائی ۱۷/۵ حدیث رقم ۲۴۴۵۔ وابن ماجہ ۵۷۱/۱۔ حدیث رقم ۱۷۹۳۔ والدارمی ۴۶۹/۱ حدیث رقم ۱۶۳۳۔

ومالك في الموطأ ١/ ٢٤٤ حديث رقم ٢ من كتاب الزكاة، واحمد في المسند ٣/ ٦٠۔

ترجمه: حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھجوروں میں پانچ وسق سے کم میں زکوۃ نہیں ہے اور چاندی کے پانچ اوقیہ سے کم میں زکوۃ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں زکوۃ نہیں ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :قال رسول الله ﷺ ليس فيما دون خمسة أوسق من التمر صدقة**: یہ وسق کی جمع ہے واؤ کے فتحہ کے ساتھ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔ جو نہایہ اور قاموس میں ہے۔ اور جو ابن حجر کا قول ہے اول کے فتحہ کے ساتھ زیادہ فصیح ہے کسرہ کے بجائے اور غیر مشہور ہے واللہ اعلم!

" أوسق" ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور ہر صاع چار امداد کا ہوتا ہے اور ہر مد ایک رطل اور ایک تہائی رطل کا حجازیوں کے ہاں اور یہ شافعی کا قول ہے اور ابو یوسف کا اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے ہاں ہر مد دو رطل کا ہوتا ہے اور رطل ایک سو تین درہم کا ہوتا ہے ابن ملک نے بھی ایسے ہی ذکر کیا ہے۔ طیبی نے کہا: وسق بھی اونٹ کا بوجھ ہے جیسا کہ وقر اونٹ یا خچر کا بوجھ ہے تقریباً ساٹھ صاع کے برابر۔ اس کی تائید کرتی ہے کہ حدیث میں بھی ساٹھ صاع کا ذکر ہوا ہے۔ جسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور منذری نے اُسے حسن قرار دیا ہے لیکن نووی نے ضعیف کہا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ہمارے بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ یار ہا او ستو آٹھ سو درہم کے برابر ہے۔

من التمر : تاء المثناۃ کے ساتھ ہے مسلم کی روایت میں مثلثۃ کے ساتھ ہے ابن ہمام نے بھی اسے ایسے ہی ثابت کیا ہے۔

صدقة : مظہر فرماتے ہیں یہ مذہب شافعی کے لیے دلیل ہے اور میرہ جات میں بھی ایسے ہی ہے اور ابو حنیفہ سے مال کھجور کم ہو یا زیادہ واجب کھجور اور میوہ جات میں اور دوسری پیداوار میں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ ان تین چیزوں کو اس سے خاص کیا گیا ہے کیونکہ عرب کے ملکوں میں پائی جاتی ہیں اور دوسری چیزیں عام ہیں۔

ابن ملک فرماتے ہیں اس میں حجت ہے ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے لیے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے پانچ وسق سے پہلے تو اس کی تاویل کی ہے ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہ اس سے مراد تجارت کی زکوۃ ہے کیونکہ لوگ خرید و فروخت اوساق سے کرتے تھے اور وسق کی قیمت چالیس درہم ہے اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ ہمارے اصحاب نے اس سے دلیل پکڑ لی وہ اس حدیث کے مطابق نہیں ہے اور وہ مردود ہے ہم اُسے عنقریب ذکر کریں گے۔

وليس فيما دون خمسة أواق :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ اوقیہ کی جمع ہے ہمزہ مضمومہ کے ساتھ یاء مشدد کے ساتھ اور جمع کے ساتھ اور بسا اوقات اسے تشدید بھی دی جاتی ہے اوقیہ بخاتی کی طرح ہے یہ بختیة کی جمع ہے بسا اوقات تخفیف سے پڑھا جاتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اُواق چالیس درہموں کو کہتے ہیں شرع میں اور یہ حجاز اور اہل مکہ کا اوقیہ ہے۔ ابن ملک نے بھی ایسے ہی ذکر کیا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں: کہ پرانے اوقیہ چالیس درہم ہی سے ہوتے تھے اور یہ حدیث کے علاوہ رطل کے نصف تہائی ہوتے

تھے یہ بارہواں حصہ ہوتے ہیں اور ملکوں کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور ہمزہ زائدہ ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: یہ وقایہ سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ ضرورت سے محفوظ کرتا ہے۔

عسقلانی کہتے ہیں اواق تنوین کے ساتھ ہے اور تحتانیہ کے اثبات کے ساتھ ہے۔ مشدد اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ یہ اوقیہ کی جمع ہے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ بعض نے وقیۃ الف کے حذف اور واؤ کے فتحہ کے حذف سے روایت کیا ہے۔ اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ اس کا ہمزہ زائدہ ہے اور حدیث میں بھی وقیہ آیا ہے تو ظاہر یہ ہے کہ یہ غیر ثابت ہے کسی بھی دلیل کے ساتھ کیونکہ عسقلانی نے اسے حکایت کیا ہے اور پھر وقیہ کی اس حدیث میں مقدار چالیس درہم ہے اتفاق کے ساتھ۔

الورق : راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور اس کے سکون کے ساتھ ہے۔ یعنی ڈھالا ہوا چاندی۔

اور اس پر اقتصار کیا ہے کیونکہ وہ اغلب ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہیں اس سے کم پر زکاۃ نہیں ہے۔

وليس فيما دون خمس ذود من الابل صدقة: یہ اضافت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ اور تنوین کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے تو خمس کے لیے ذود بدل ہوگا لیکن رویت مشہورہ وہ پہلی روایت ہے اور اس سے مراد پانچ اونٹ ہیں ایسے ہی شرح المشارق میں ہے۔ ابن ملک کی۔ طیبی فرماتے ہیں ذود اونٹوں میں سے وہ ہے جو دو سال سے نو سال تک یا تین سے دس تک ہو اور یہ مؤنث ہے اس کا واحد نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: یہ یہاں واحد استعمال ہوا ہے رھط کی مثال پر اللہ تعالیٰ کے فرمان میں 'تسعة رهط'' طیبی فرماتے ہیں: ابوعبد ذود فرماتے ہیں: مؤنث مذکر کے علاوہ ہے۔ اور حدیث بھی عام ہے کیونکہ زکوٰۃ دونوں میں واجب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پانچ کی اضافت ذود کی طرف ہے۔ تو اس کا حق ہے کہ اسے جمع کی طرف مضاف کیا جائے کیونکہ اس میں جميعة کے معنی ہیں اور خمس بھی روایت کیا گیا ہے تنوین کے ساتھ تو پھر ذود اس سے بدل ہوگا اور اونٹوں کے لیے صفت مؤکدہ ہوگی ورق کے خلاف اور کھجوروں کے وہ اس سے علیحدہ ہیں۔

تخریج: امام میرک فرماتے ہیں: اسے چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں: اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ طویل حدیث میں اور مسلم نے بھی اُس کے الفاظ ہیں: **ليس في حب و تمر صدقة حتى يبلغ خمسة اوسق**۔ کہ کھجور اور حب میں صدقہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پانچ وسق تک ہوں پھر اسے دوسرے طریق سے دوبارہ بیان کیا ہے۔ اُس کے آخر میں فرماتے ہیں: کہ یہ بدل کھجور کے ہے۔ ابوداؤد نے اضافہ کیا ہے کہ وسق ساٹھ مختوم کا ہوتا ہے۔ اور ابن ماجہ نے کہا ہے کہ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔

ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل وہ ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے کہ: ''**فيما سقت السماء والعيون أو كان عثر يا العشر و فيما سقي بالنضح نصف العشر**'' اور امام مسلمؒ نے بھی روایت کیا ہے: **فيما سقت الانهار والغيم العشر وفيما سقي بالنضح نصف العشر**۔ جسے آسمان سیراب کرے یا چشمے تو اس میں دسواں حصہ ہے جو کنویں سے پلایا جائے اس میں نصف عشر ہے'' اور اس بارے میں اور بھی کچھ آثار ہیں جسے عبدالرزاق سے عمر بن عبدالعزیز نے روایت کیا ہے کہ قال : **فيما انبت الارض من قليل و كثير العشر**۔ جو زمین سے اُگے تھوڑا یا زیادہ اس میں دسواں حصہ ہے اور ایسی ہی ایک

روایت بیان کی ہے کہ مجاہد، ابراہیم نخعی سے اُس کا حاصل یہ ہے کہ وہ تعارض عام اور خاص ہے کچھ خاص کو مقدم کرتے ہیں جیسے شافعی ہیں وہ حدیث اور سیاق کو واجب کرنے میں جو عام کو مقدم کرنے میں یا پھر دونوں کے تعارض کے بارے میں کہتے ہیں اور ترجیح طلب کرتے ہیں اگر وہ تاریخ نہیں جانتا۔ اگر جانتا ہے تو آخرت حدیث ناسخ ہے اگر عام ہے جیسا کہ ہم نے کہا ہے تو پھر اس عام کے فرض کے بارے میں کہنا چاہیے کیونکہ جب یہ اوساق کی حدیث سے متعارض ہوگئی تو ایجاب اولیٰ ہوگا احتیاط کی رو سے جس کے لیے مطلوب پورا ہوا اصل میں اُس کے لیے یہ پورا ہوگا۔ اگر خروج کا ذر نہ ہوتا تو ہم اُس کی صحت کو ضرور واضح کرتے اور یہ اس طریقے پر بحث صاحبین پر ختم ہوتی ہے کیونکہ وہ اصل کو پکڑتے ہیں اور جو انہوں نے روایت کو تجارت کی زکوٰۃ پر حمل کیا ہے وہ دو حدیثوں کو جمع کیا ہے یہ محقق ابن الہمام کا کلام تھا، واللہ اعلم!

گھوڑے اور غلام کے بارے میں زکوٰۃ کے احکامات

۱۷۹۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَ عَلَی الْمُسْلِمِ صَدَقَةٌ فِیْ عَبْدِهٖ وَلَا فِیْ فَرَسِهٖ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ لَیْسَ فِیْ عَبْدِهٖ صَدَقَةٌ اِلَّا صَدَقَةُ الْفِطْرِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۷/۳۔ حدیث رقم ۱٤٦٤۔ ومسلم فی صحیحه ٦٧٥/٢ حدیث رقم (٨۔٩٨٢)۔ وابوداؤد فی السنن ۲۰۱/۳ حدیث رقم ۱۰۹۰۔ والترمذی ۲۳/۳ حدیث رقم ٦٢٨۔ والنسائی ۳۰/۰ حدیث رقم ۲٤٦٧۔ وابن ماجه ۰۷۹/۱ حدیث رقم ۱۸۱۲۔ والدارمی ٤٦٩/١ حدیث رقم ۱٦۳۲۔ ومالك فی الموطأ ۲۷۷/۱ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الزکاة واحمد فی المسند ۲٤۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کے غلام پر زکوٰۃ فرض نہیں اور نہ اس کے گھوڑے میں زکوٰۃ فرض ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کے غلام میں زکوٰۃ نہیں ہے مگر صدقہ فطر اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔

تشریح ۞ ان کی زکوٰۃ کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔

تشریح: قوله :لیس علی المسلم صدقة فی عبده ولا فی فرسه: ابن حجر کہتے ہیں کہ اس سے یہ سمجھ آتی ہے کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کی دلیل اسلام کی مختلف قسموں سے ہے اس کی موافقت صدیق رضی اللہ عنہ کے قول سے ہوتی ہے جو مسلمانوں کو کتاب لکھی تھی۔ میں کہتا ہوں یہ حجت ہے اُن پر جو کہتے ہیں کہ دنیا میں کفار بھی شریعت سے مخاطب ہیں اُس کے خلاف جو کہتے ہیں کہ کفار شریعت کی فروع میں بھی مخاطب ہیں کیونکہ انہیں آخرت میں اس کی نسبت عذاب ہوگا۔ اسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان واضح کرتا ہے: فویل للمشرکین الذین لا یؤتون الزکاة کہ اُن مشرکوں کے لیے ہلاکت ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے وہ: لم نك نطعم المسکین کہتے ہیں ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔'' اس پر ہمارے اصحاب کا اتفاق ہے اور شافعیہ بھی اسی مسلک پر ہیں۔

یعنی وہ لوگ جو انہیں تجارت کے لیے شمار نہیں کرتے۔ شافعی' مالک اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ نے اس کو واجب قرار دیا ہے کہ گھوڑوں میں ایک دینار ہے ہر گھوڑے میں یا اس کے قائم مقام اُس کا حاصب اور ہر سو درہم سے پانچ درہم ہیں ابن حجر نے بھی

ایسا ہی ذکر کیا ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: یہ ابو یوسف اور محمد رحمۃ اللہ علیہما کے لیے حجت ہے کہ زکوۃ گھوڑوں میں فرض نہیں ہے اور شافعی کے لیے گھوڑوں میں اور غلاموں میں مطلقاً پرانے قول کے مطابق اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ گھوڑوں اور غلاموں میں زکوۃ کے وجوب کی طرف گئے ہیں جب وہ خدمت کے لیے نہ ہوں اور غلام بھی اور نمازی کا گھوڑا۔

اور فتاوی قاضی خان میں ہے کہ فتویٰ دونوں قولوں پر ہے۔ یہاں اور بھی کچھ ابحاث ہیں جن کو ابن ہمام نے ذکر کیا ہے اگر تحقیق چاہتے ہو تو وہاں رجوع کرلو۔ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ ''وفی روایة قال'' ایسے ہی صحیح نسخہ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

قوله: لیس فی عبده صدقه الا صدقة الفطر: مرفوع علی البدلیۃ ہے۔ اور نصب علی الاستثناء ہے۔

قوله: متفق علیه: امام میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں مگر یہ قول کہ صدقہ فطر یہ مسلم کے افراد سے ہے۔

زکوۃ کے نصاب کی تفصیل

۱۷۹۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ اَبَا بَكْرٍ كَتَبَ لَهُ هٰذَا الْكِتٰبَ لَمَّا وَجَّهَهُ اِلَى الْبَحْرَيْنِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هٰذِهٖ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِيْ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَالَّتِيْ اَمَرَ اللّٰهُ بِهَا رَسُوْلَهٗ فَمَنْ سُئِلَهَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى وَجْهِهَا فَلْيُعْطِهَا وَمَنْ سُئِلَ فَوْقَهَا فَلَا يُعْطِ فِيْ اَرْبَعٍ وَّعِشْرِيْنَ مِنَ الْاِبِلِ فَمَا دُوْنَهَا مِنَ الْغَنَمِ مِنْ كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ فَاِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّثَلَاثِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ مَخَاضٍ اُنْثٰى فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّثَلَاثِيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّاَرْبَعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُوْنٍ اُنْثٰى فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّاَرْبَعِيْنَ اِلٰى سِتِّيْنَ فَفِيْهَا حِقَّةٌ طَرُوْقَةُ الْجَمَلِ فَاِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَّسِتِّيْنَ اِلٰى خَمْسٍ وَّسَبْعِيْنَ فَفِيْهَا جَذَعَةٌ فَاِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَّسَبْعِيْنَ اِلٰى تِسْعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتَا لَبُوْنٍ فَاِذَا بَلَغَتْ اِحْدٰى وَتِسْعِيْنَ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَفِيْهَا حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الْجَمَلِ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَفِيْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ وَفِيْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهٗ اِلَّا اَرْبَعٌ مِّنَ الْاِبِلِ فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا فَاِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا فَفِيْهَا شَاةٌ وَّمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ مِنَ الْاِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهٗ جَذَعَةٌ وَّعِنْدَهٗ حِقَّةٌ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ وَيُجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ اِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهٗ اَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ صَدَقَةُ الْحِقَّةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الْحِقَّةُ وَعِنْدَهُ الْجَذَعَةُ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْجَذَعَةُ وَيُعْطِيْهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا اَوْ شَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهٗ صَدَقَةُ الْحِقَّةِ وَلَيْسَتْ عِنْدَهٗ اِلَّا بِنْتُ لَبُوْنٍ فَاِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ بِنْتُ لَبُوْنٍ وَيُعْطِيْ شَاتَيْنِ اَوْ

عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا وَمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهُ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ وَيُعْطِيهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا أَوْ شَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهُ بِنْتَ لَبُوْنٍ وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ وَعِنْدَهُ بِنْتُ مَخَاضٍ فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ بِنْتُ مَخَاضٍ وَيُعْطِي مَعَهَا عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا أَوْ شَاتَيْنِ وَمَنْ بَلَغَتْ صَدَقَتُهُ بِنْتَ مَخَاضٍ وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ وَعِنْدَهُ بِنْتُ لَبُوْنٍ فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ وَيُعْطِيهِ الْمُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا أَوْ شَاتَيْنِ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ عِنْدَهُ بِنْتُ مَخَاضٍ عَلٰى وَجْهِهَا وَعِنْدَهُ ابْنُ لَبُوْنٍ فَإِنَّهُ يُقْبَلُ مِنْهُ وَلَيْسَ مَعَهُ شَيْءٌ وَفِيْ صَدَقَةِ الْغَنَمِ فِيْ سَائِمَتِهَا إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِيْنَ إِلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ شَاةٌ فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ إِلٰى مِائَتَيْنِ فَفِيْهَا شَاتَانِ فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى مِائَتَيْنِ إِلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيْهَا ثَلَاثُ شِيَاهٍ فَإِذَا زَادَتْ عَلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً مِّنْ أَرْبَعِيْنَ شَاةً وَّاحِدَةً فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا وَلَا تُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ وَّلَا ذَاتُ عَوَارٍ وَّلَا تَيْسٌ إِلَّا مَا شَاءَ الْمُصَدِّقُ وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ وَفِي الرِّقَّةِ رُبُعُ الْعُشْرِ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ إِلَّا تِسْعِيْنَ وَمِائَةً فَلَيْسَ فِيْهَا شَيْءٌ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا۔

اخرجه البخاری مقطعًا فی ثمان امكنة فی الجزء الثالث فی الاماكن التالية۔ الحديث رقم ١٤٥٤۔ الحديث رقم ١٤٥٣۔ والحديث رقم ١٤٤٨ والحديث رقم ١٤٥٥ و ١٤٥٠۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ان کو بحرین کی طرف بھیجا تو ایک حکم نامہ ان کے نام لکھا۔ بحرین ایک جگہ کا نام ہے جو بصرہ کے قریب ہے میں اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ صدقہ فرض کا بیان ہے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور اس صدقے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہے اور جس مسلمان سے قاعدہ کے مطابق زکوٰۃ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ ادا کرے اور جس سے زیادہ کا مطالبہ ہو وہ ادا نہ کرے اور زکوٰۃ چوبیس اونٹوں یا چوبیس سے کم اونٹوں میں بکریاں ہیں۔ اس طرح کہ ہر پانچ میں ایک بکری واجب ہے۔ جب ان کی تعداد پچیس سے پینتیس تک پہنچ جائے تو اس میں ایک بنت مخاض واجب ہوگی۔ جو ایک سال کی ہو اور جس وقت تعداد ۳۶ سے پینتالیس (۴۵) تک پہنچ جائے تو اس میں مادہ بنت لبون ہوگی۔ جس کی عمر دو سال ہوگی اور جس وقت ان کی تعداد چھیالیس (۴۶) سے ساٹھ (۶۰) تک پہنچ جائے۔ تو ان میں ایک حقہ یعنی تین برس کی اونٹنی ہے۔ اونٹ سے جفتی کے قابل ہو۔ جس وقت اونٹوں کی تعداد اکسٹھ سے پچھتر تک پہنچ جائے۔ تو ان میں ایک جذعہ ہے جس کی عمر چار برس ہوتی ہے اور پانچویں برس میں لگی ہو اور جس وقت ان کی تعداد پچھتر (۷۶) سے نوے (۹۰) تک پہنچ جائے۔ ان میں دو بنت لبون ہیں دو برس کی۔ اور جس وقت ۹۱ سے ۱۲۰ تک پہنچ جائے۔ تو ان میں دو اونٹنیاں دینی ہوں گی جو تین تین برس کی ہوں اور اونٹ سے جفتی کے قابل ہوں اور جس وقت وہ ۱۲۰ سے زیادہ ہو جائیں۔ تو ہر چالیس میں دو برس کی اونٹنی ہے اور ہر پچاس (۵۰) اونٹوں میں تین سال کی اونٹنی دینی ہوگی۔ اور وہ شخص کہ جس کے پاس

صرف چار اونٹ ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے مگر اس کا مالک بطور نفل کے دے سکتا ہے پس جس وقت پانچ اونٹ ہوں تو ان میں ایک بکری ہے اور وہ آدمی جس کے پاس اونٹ ہیں اتنی مقدار میں کہ ان میں ایک اونٹنی چار برس کی دینی آتی ہے اور وہ پانچویں میں لگی ہو اور یہ اکسٹھ سے پچھتر (۷۵) میں دینی آتی ہے اور اس کے پاس چار برس کی اونٹنی نہ ہو اور اس کے پاس صرف تین برس کی اونٹنی ہو۔ تو اس سے تین برس کی ہی قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ دینے والا اس کے ساتھ دو بکریاں دے اگر اس کو میسر ہوں ورنہ ۲۰ درہم دے دے۔ اور جس شخص کے پاس اس قدر اونٹ ہوں کہ اس شخص پر تین برس کی اونٹنی واجب ہو یعنی چھیالیس (۴۶) سے ساٹھ تک میں دینی آتی ہو اور اس کے پاس تین برس کی اونٹنی کے علاوہ نہ ہو اور اس کے پاس چار برس کی اونٹنی ہو تو اس سے چار برس کی ہی قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ لینے والا اس کو دو بکریاں یا بیس (۲۰) درہم دے۔ یعنی واپس کرے اور جس کے پاس اس قدر اونٹ ہوں کہ ان میں تین برس کی اونٹنی ہو اور اس کے پاس دو برس کی ہو۔ تو اس سے دو برس کی قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ دینے والی دو بکریاں یا بیس (۲۰) درہم دے اور جس شخص کے پاس اس قدر اونٹ ہوں کہ ان میں دو برس کی اونٹنی واجب ہو چھتیس (۳۶) سے پینتالیس (۴۵) اور اس کے پاس تین برس کی اونٹنی میسر ہو تو اس سے تین برس کی قبول کی جائے اور زکوٰۃ دینے والا اس کو بیس درہم یا دو بکریاں دے اور جس شخص کے پاس اس قدر اونٹ ہوں کہ ان میں دو برس کی اونٹنی واجب ہے اور اس کے پاس ایک سال کی اونٹنی ہو تو اس سے ایک سال کی اونٹنی قبول کی جائے اور زکوٰۃ دینے والا اس کو بیس (۲۰) درہم یا دو بکریاں دے جس کے پاس اس قدر اونٹ ہوں کہ ان میں ایک برس کی اونٹنی واجب ہو جو پچیس (۲۵) سے پینتیس (۳۵) تک میں دینی آتی ہے اور اس کے پاس دو برس کے علاوہ نہیں ہے تو اس سے دو برس کی قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ دینے والا اس کو بیس (۲۰) درہم یا دو بکریاں دے اور اگر اس کے پاس ایک برس کی اونٹنی دینے والا نہ ہو اور اس کے پاس دو برس کا اونٹ ہو پس اس کو قبول کر لیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی چیز واجب نہیں ہے نہ لینی اور نہ دینی اور چرنے والی بکریوں کی زکوٰۃ کا نصاب یہ ہے کہ ان کی تعداد چالیس (۴۰) سے ۱۲۰ تک ہو۔ تو ایک بکری واجب ہوتی ہے اور جس وقت ۱۲۰ سے زیادہ ہو جائیں اور دو سو (۲۰۰) تک پہنچ جائیں۔ تو ان میں بکریاں دینی ہوں گی۔ اگر دو سو سے بڑھ کر تین سو (۳۰۰) تک ہو جائیں تو تین بکریاں دینی ہوں گی اور اگر تین سو (۳۰۰) سے بڑھ جائیں تو پھر سو (۱۰۰) میں ایک بکری دینی ہوگی اور جب چرنے والی بکریوں کی تعداد چالیس (۴۰) سے کم ہو۔ یعنی اگر ایک بھی کم ہو تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے مگر اس کا مالک بطور نفل دے اور زکوٰۃ میں نہ دے بڑھیا عمدہ اور نہ ہی عیب والی خواہ اونٹنی ہو یا بکری ہو یا گائے ہو اور نہ بوک لے ہاں اگر زکوٰۃ لینے والا کسی مصلحت کی خاطر بوک لے تو درست ہے اور نہ متفرق جانوروں کو جمع کیا جائے اور نہ اکٹھوں کو جدا کیا جائے زکوٰۃ کے خوف سے اور جس نصاب میں دو آدمی شریک ہوں پس وہ برابری میں ایک دوسرے کے ساتھ رجوع کریں اور چاندی میں چالیسواں (۴۰) حصہ دینا فرض ہے اور اگر اس کے پاس ۱۹۰ درہم کے علاوہ نہیں ہے تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہوگی مگر اس کا مالک بطور نفل کے دے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **هذا الكتاب**: یعنی اشارہ اگلے مکتوب کی طرف ہے۔

البحرين: یہ بصرہ سے قریب ایک جگہ ہے نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ دو سمندروں کے درمیان ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم: یہ کتاب سے بدل ہے۔ اور اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ اور یہ واضح ہے کیونکہ مراد یہ ہے

کہ یہ نقش وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... ہے۔

هذه: یعنی یہ ذہنی معانی جس پر یہ نقوش دلالت کرتے ہیں۔

فريضة الصدقة: اضافت کے ساتھ ہے یعنی فرض صدقہ۔

التي فرض رسول الله ﷺ على المسلمين: یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرض کیا۔ طیبی فرماتے ہیں: یعنی وضاحت کی اور تفصیل بیان کی۔ اور اس میں اشارہ ہے اُس کی طرف جسے بعض محققوں نے کہا ہے کہ زکوۃ ایک دفعہ مکہ میں فرض ہوئی اور مدینہ میں تفصیل بیان ہوئی ہے کیونکہ بعض مکی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

والتي: یہ عطف تفسیر ہے التی پر یعنی وہ صدقہ۔

أمر الله بها:

رسول الله ﷺ: اور اس میں ارشاد ہے کہ پہلی چیز فائدہ حاصل کرنے والا اجتہاد سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے حکم سے تھا اور یہ تفصیل اپنے اجتہاد سے نہ تھی بلکہ وحی تھی اور جیسے حج اور روزوں میں اور نماز میں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے واضح ہے: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ [النحل: ٤٤] طیبی بھی اسی معنی کا لحاظ کیا کرتے تھے اور فرض کا مطلب تفصیل اور وضاحت کیا ہے۔ لیکن ابن حجر اس نقطہ سے غافل رہے اُنہوں نے دو تفسیروں کو خلط ملط کر دیا یعنی اسے فرض کیا واضح کیا اور تفصیل سے بیان کیا پھر کلام کی تقدیر ہر تقدیر اور تحریر اور تقریر پر ہے تو صدقہ واجب اللہ کے حکم سے ہوا لیکن یہاں اللہ کے رسول ﷺ نے کہا تھا۔

سئلها: مبنی بر مفعول ہے یعنی طلب کیا۔

على وجهها: یہ دوسرے مفعول کا حال ہے سئلھا میں یعنی بغیر کسی روک کے مسلمانوں میں۔

ومن سئلها فوقها: یعنی حق سے زائد۔ طیبی فرماتے ہیں: جو کمیت اور کنیت میں زائد ہو اور اجماعی مسئلہ بن جائے اجمالی طور پر نہ کہ اجتہادی طور پر یہ اُس وقت ساعی سے مقدم ہوگا۔

فلايعط: یعنی کچھ اضافہ یا ساعی ہو کچھ نہ دیتا ہو بلکہ فقراء کو دیتا ہو کیونکہ اس کے ساتھ وہ خائن ہو جاتا ہے۔ تو اطاعت ختم ہو جاتی ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ جب صدقہ لینے والا دینے والے پر ظلم کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کا انکار کر دے رضا مندی اختیار نہ کرے اور جریر کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ "ارضوا مصدقيكم" اگر چہ وہ ظلم ہی کریں تو یہ ظلم کی نسبت مزکی کی زعم پر ہے یا پھر مبالغہ کے طور پر ہے تو دونوں میں کوئی منافاۃ نہیں ہے اور یہ بھی جواب دیا جاتا ہے کہ پہلا استحباب پر محمول ہے اور یہ رخصت پر محمول ہے اور جواز پر یا پھر پہلا یہ ہے کہ جب وہ تہمت سے ڈرتا ہو اور فتنہ سے ڈرتا ہو یہ شرح السنہ میں ہے۔ اور اس میں دلیل ہے کہ اپنا مال جب ظلم سے لیا جا رہا ہو تو دفاع کیا جا سکتا ہے اور امام کی اجازت کے بغیر بھی صدقہ دیا جا سکتا ہے اور اگر وہ دونوں فاسق ہو جائیں تو اُن کی اطاعت سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے اور آخر میں یہ ہے کہ اگر وہ واجب سے زائد کا مطالبہ کرے تو صرف وہی دیا جائے اور زائد مال نہ دیا جائے۔

مسئلہ اخیرہ محل نظر ہے چونکہ حدیث میں اس بات سے زائد پر کوئی دلالت نہیں ہے کہ جب اس مقدار سے جو واجب ہے

زیادہ کا مطالبہ کیا جائے تو زائد از اواجب نہ دیا جائے بلکہ واجب دیا جائے اور یہ ان کی ولایت کے باقی ہونے میں صریح ہے۔ اگر چہ یہ لوگ غیر واجب کو طلب کرنے کی وجہ سے فاسق ہو گئے ہیں۔

قولہ :في أربع و عشرين...... من كل خمس شاة: طیبی کہتے ہیں یہ مستانفہ بیان ہے ابن ملک فرماتے ہیں: اُربع خبر ہے مبتدا محذوف کی یعنی فرض کردہ یا جو چوبیس میں فرض ہے۔

من الابل: یہ تمیز ہے ابن ہمام فرماتے ہیں: اس کے ساتھ ابتداء کی ہے کیونکہ یہ اُن کے مالوں کی میل ہوتی ہے۔

فما دونها من الغنم : یہ الواجب میں لام کا بیان ہے کیونکہ یہ لذی کے معنی میں ہے۔

من كل خمس شاة :یعنی جو فرض ہے بکریوں سے چوبیس کے اندر کہ یہ پانچ اونٹوں میں ایک بکری ہے۔طیبی فرماتے ہیں: پہلا ظرف مستقر ہے اور کیونکہ یہ شاۃ کے لیے بیان ہے جیسا کہ فرمان میں ہے "**خمس ذود من الابل**" اور دوسرا لغو ابتدائی ہے اور فعل محذوف کے ساتھ متصل ہے۔یعنی کہ چوبیس بکریوں میں ایک بکری ہے اور ہر پانچ اونٹوں میں ایک بکری ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غنم خبر ہے مبتدا محذوف کی یعنی کہ ہر چوبیس میں صدقہ ایک بکری ہے اور یہ قول "**من كل خمس شاة**" مبتداء ہے اور پچھلے جملہ کے لیے بیان کی خبر ہے۔

عسقلانی فرماتے ہیں بخاری کی شرح میں کہ یہ قول "**من الغنم**" اکثر کے ہاں ایسے ہی ہے۔ابن سکن کی روایت میں ہے من کے ساقط ہونے کے ساتھ ہے بعض نے سے صحیح قرار دیا ہے قاضی عیاض فرماتے ہیں: جس نے اسے ثابت رکھا ہے اس نے معنی یہ کیا ہے کہ اس کی زکوۃ یعنی اونٹوں اور بکریوں سے اور من بیان کے لیے ہے تبعیض کے لیے نہیں ہے تو جس نے اسے حذف کیا ہے تو غنم مبتدا ہے اور خبر مضمر ہے اس قول چوبیس میں اور خبر کو مقدم کیا ہے کیونکہ غرض مقادیر کو بیان کرنا تھا جس پر زکوۃ فرض ہوتی ہے اور یہ نصاب کے پورا ہونے پر واجب ہوتی ہے تو تقدیم اچھی ہے جیسا کہ سید جمال الدین نے بیان کیا ہے۔

فاذا بلغت: یعنی اونٹ یا پھر چوبیس۔

خمساو عشرين الى خمس و ثلاثين ففيها بنت مخاض۔

بنت مخاض : کہا گیا ہے کہ یہ وہ ہے جس پر ایک سال مکمل ہو جائے اس کا نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ماں حاملہ ہوتی ہے اور یہ مخاض حاملہ ہوتی ہے فوق سے اس کی واحد ہے۔اس کی اضافت کی گئی ہے مخاض کی طرف اور واحدۃ بنت نوق نہیں ہوتی کیونکہ اس کی ماں وہ نوق سے حاملہ ہوتی ہے وہ وضع حمل کے قریب ہوتی ہے اسے طیبی نے ایسے ہی ثابت کیا ہے اور جسے ابن ملک نے ذکر کیا ہے کہ اُس کی ماں مخاض بن جاتی ہے دوسرے حمل کے ساتھ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ہاں مگر مخاض کی موجودگی کے ساتھ اور تقدیر ذات مخاض ہوگئی اور کہا گیا ہے۔

أنثى : تو کید أجیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**نفخة واحدة**﴾ [الحاقة : ۱۳] اور تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ بنت یہاں پر ہے اور ابن ابن لبون میں ہے بنت کی طرح اور ابن بنت طبق میں ہے اور یہ سب اس میں مشترک ہے مذکر اور مؤنث میں اسے طیبی نے بھی ایسے ہی ذکر کیا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ بنت کا وصف مؤنث کے ساتھ ہے تا کہ وھم نہ ہو کہ اس سے مراد جنس ہے جو

شامل ہے مذکر اور مؤنث کے لیے بچے کی طرح جب وہ غیر آدمی سے ہو اور کبھی کبھار بنت اور ابن کا اطلاق کیا جاتا ہے اور مراد جنس ہوتی ہے جیسا کہ ابن عرس نہیں ہوتا ہے اور بنت طبق میں اور کچھوے میں جو کہ ننانوے انڈے دیتا ہے جو کچھ قاموس میں اُس کے مطابق پھر یہ حکم اس پر سب کا اتفاق ہے اور جسے حضرت علی سے روایت کی گئی خبر کی طرح صحیح نہ ہے۔

فاذا بلغت ستاً و ثلاثين الى خمس واربعين ففيها بنت لبون أنثى : یعنی جو دو سال کی ہو جائے طیبی فرماتے ہیں: یعنی دو تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو اس کا نام اس لیے رکھا ہے کہ اس کی ماں دودھ پلانے والی ہوتی ہے۔

حقة :حاء کے کسرہ کے ساتھ اور قاف کی تشدید کے ساتھ یعنی جو تین سال کی ہو۔

طروقة الجمل : طاء کے فتحہ کے ساتھ فعولة ہے مفعولة کے وزن پر یعنی جو اونٹ کی جفتی کے لیے صحیح ہو۔

النہایہ میں ہے کہ جو چوتھے سال میں داخل ہو رہی ہو۔ اس کا نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ حقدار ہے کہ اس پر سواری کی جائے اور اونٹ سے جفتی کر سکے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں دلالت ہے کہ اوقاص میں کچھ نہیں ہے یعنی جو دو فرضوں کے درمیان ہو۔

فاذا بلغت واحدة وستين الى خمس و سبعين ففيها جذعة : جیم کے فتحہ کے ساتھ اور ذال کے ساتھ یعنی جو چار سال کی ہو کیونکہ وہ اپنے دانت گرا چکی ہوتی ہے اور جزع ابھی باقی ہوتے ہیں۔ تورپشتی فرماتے ہیں: اونٹ کو پانچویں سال میں اجزع کہتے ہیں اور جزع اُس وقت کہتے ہیں جب نہ دانت ہوتے ہیں کہ اگیں اور نہ گرتے ہیں اور مؤنث کو جزعہ کہتے ہیں۔

فاذا بلغت ستاو سبعين الى تسعين ففيها بنتا لبون) اور حدیث میں دلیل ہے کہ اوقاص میں کچھ نہیں ہے۔

فاذا بلغت احدى وتسعين الى عشرين ومائة ففيها حقتان طروقتا الجمل : ابن ہمام فرماتے ہیں: نصاب کی تقدیر یوں ہے کہ واجب اُمر توقیفی ہے پھر فرمایا: کہ جان لے اونٹوں میں واجب وہ مؤنث ہے یا قیمت گائیوں اور بکریوں کے برخلاف اُن میں مذکر اور مؤنث برابر ہیں۔

فاذا زادت على عشرين و مائة ففي كل أربعين بنت لبون و في كل خمسين حقة:

قاضی فرماتے ہیں حدیث دلالت کرتی ہے حساب کے استقراء پر تعداد کے تجاوز کرنے کے بعد یعنی جب اونٹ ایک سو بیس سے زائد ہوں تو فرض باقی نہیں رہتا اور یہ اکثر علماء کا موقف ہے نخعی ثوریؒ اور ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس میں استیناف ہوگا کہ اگر ایک سو بیس سے زائد ہوں تو دو حقے ہوں گے اور ایک بکری ہے اور ایسے ہی بنت مخاض اور بنت لبو ہے سابقہ ترتیب پر انہوں نے حجت پکڑی ہے جسے روایت کیا ہے عاصم بن ضمرۃ نے حضرت علیؓ سے صدقہ کی حدیث میں کہ جب اونٹ ایک سو دس سے زیادہ ہو جائیں تو فرض واپس آ جائے گا پہلے کی طرف۔ اور جو روایت کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک خط لکھا کہا عمرو بن حزم کی طرف صدقات اور دیات میں اور اس کے علاوہ اور اس میں ذکر کیا ہے کہ اونٹ جب ایک سو بیس سے بڑھ جائیں تو فریضہ ختم ہو

ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ ہدایہ کی شرح میں صدقات کی کتابوں کا ذکر اور ابوبکر صدیق کے خط کا بھی ذکر کیا ہے اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف خط جسے ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ذکر کیا ہے اور ان میں سے ایک عمرو بن حزم کی کتاب ہے جسے نسائی نے کتاب الدیات میں ذکر کیا ہے اور ابوداؤد نے مراسیل میں اور ابن الہمام نے کلام کو مزید لبسیط کیا ہے اُس کی طرف رجوع کریں اگر تمام مقصد پانا چاہتے ہوں اور پھر فرماتے ہیں کنز کی شرح میں کہ اس میں کافی نصوص وارد ہوئی ہیں کہ ایک سو بیس کے بعد ایک بری ہے۔ اسے غایہ میں ذکر کیا ہے اور اسی کے ساتھ دفاع کیا جا سکتا ہے جسے ابن حجر نے کہا ہے کہ یہ روایت بخاری کی روایت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو ہم کہتے ہیں کہ حدیث کے جب طرق مختلف ہوں اور صحیح ہوں اسناد تو اُسے بخاری پر ترجیح دی جا سکتی ہے اگر چہ اُس کا تعلق اجتہاد سے ہو اور مجتہد سے اور یہ بخاری کے پیدا ہونے سے پہلے کا ہے تو اس کا کسی منصف کے ہاں کوئی اعتبار نہ ہے۔

و من لم يكن معه الأربع من الابل فليس فيها صدقة الا أن يشاء ربها: یعنی اُس کا مالک کہ اسے نفلی صدقہ کرنا چاہے یہ نفی وجوب میں مبالغہ ہے اور استثناء منقطع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ متصل ہے صدقہ کا وجوب پر اطلاق کرنے کے لیے اس کے سابقہ کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

و من بلغت عنده من الابل: یہ متعین کرتی ہے کہ من زائدہ ہے اُخفش کے مذہب کے مطابق اور فاعل پر داخل ہے یعنی جس کے اونٹ پہنچ جائیں۔

صدقة الجذعة: نصب اضافی کے ساتھ طیبی فرماتے ہیں: **اى بلغت الابل نصاباً يجب فيه الجذعة**۔ یعنی اونٹ اس نصاب کو پہنچ جائیں جس میں جزعہ فرض ہوتا ہے ایک نسخہ میں صدقۃ کے رفع کے ساتھ ہے اور تنوین کے ساتھ اور جزعۃ کے نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے۔

فانها: یعنی یہ قصہ یا حقہ یا ضمیر مبہم ہے۔

تقبل منه الحقة: تفسیر ہے۔

يجعل: اس کی ضمیر من کی طرف لوٹتی ہے۔

شاتين: ابن حجر فرماتے ہیں کہ دو مذکر یا دو مؤنث یا ایک مذکر یا مؤنث اور یا ایک سال کا یا دو سال کا معز۔

أو عشرين درهمًا: طیبی فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ سنن واجب سے صعود اور نزول جائز ہے جب وہ نہ ہو کسی اور سنت کی طرف اور بکریوں کے بدلے میں درہم اور دینے والے کو اختیار ہے درہم اور بکریوں کے درمیان۔

قوله: ومن بلغت عنده صدقة الحقة: کہ وہ چھیالیس ہو جائیں۔

فانها تقبل منه الجذعة: یہ ضمیر سے بدل ہے جو کہ اسم ہے ان کا یا فاعل ہے تو ضمیر قصہ کے لیے ہے۔

ويعطيه المصدق: یعنی عامل یا مستحق اگر اپنے لیے رکھ لے۔

من بلغت عنده صدقة الحقة ...... شاتين أو عشرين درهما: اس کا اعراب بھی ویسے ہی ہے جیسے گزر چکا ہے۔

ابن حجر نے کہا اصل میں یوں ہے: **فانها اى بنت اللبون تقبل منه۔ اهـ** ۔ یہ مخالف ہے اصول میں موجود الفاظ کے کہ اصول میں بنت لبون کا ذکر "**تقبل منه**" کے بعد ہے۔

ویعطی: یعنی مالک۔

شاتین او عشرین درهما: طیبی فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ صعود اور نزول میں اختیار وہ سنن واجب سے زائد کی طرف سے اور یہ علت بیان کی ہے کہ یہ شرعی تخفیف ہے تو معاملہ اختیاری کر دیا گیا۔

قوله: ومن بلغت صدقته بنت لبون ...... عشرين درهما أو شاة وليست:

معها: یعنی بنت مخاض کے ساتھ اور اس حال کے ساتھ کہ یہ ماقبل کی صفت ہے۔

قوله: عشرين درهما: طیبی کہتے ہیں یعنی عشرين درهما كائنة مع بنت المخاض موجب ایسا ہوگا تو یہ حال بن جائے گا۔

قوله: و من بلغت صدقة بنت فخاض وليست: یعنی بنت مخاض نہ ہو۔

عنده و عنده ...... وليس معه شيء۔

لم تكن: تانیث اور تذکیر کے ساتھ ہے۔

عنده بنت مخاض علی وجهها: کہ حسی اور شرعی طور پر انہیں گم پائے ابن ملک فرماتے ہیں: اس کا معنی تین وجوں کا احتمال رکھتا ہے یہ کہ اُس کے پاس بنت مخاض نہ ہو یا یہ کہ ہو لیکن مریض ہو تو یہ نہ ہونے کی طرح ہے یا پھر اُس کے پاس بنت مخاض درمیانے درجہ کی نہ ہو بلکہ اعلیٰ قسم کی ہو۔

فانه يقبل منه: یعنی بنت مخاض کی جگہ مجبوری کی بنا پر۔

وليس معه شيء: یعنی اس کے ساتھ اور کچھ نہیں دینا ہوگا۔ ابن ملک طیبی کی متابعت میں کہتے ہیں مؤنث زیادہ افضل ہے عمر سے بڑی والوں سے بھی۔

قوله: وفي صدقة الغنم...... الی عشرين ومائة شاة: ابن ہمام فرماتے ہیں: اس کا نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کے لیے دفاع کا ذریعہ نہیں ہوتا تو یہ ہر طالب کے لیے غنیمت ہوتی ہے۔ پھر ضأن اور ماعز میں یہ خبر حکم مقدم حکم میں تمام برابر ہیں خر مقدم ہے۔

فی سائمتها: یہ بدل ہے جار کے اعادہ کے ساتھ یا پھر حال ہے یا پھر سائمہ جو سال بھر گھاس کھاتی ہیں۔ ابن ہمام فرماتے ہیں: سائمہ وہ ہے جو پھرتی ہے اور گھر میں نہیں رہتی اور فقہ کی رو سے یہ صرف گائے کے لیے ہے اونٹ وغیرہ اگر سواری کے لیے استعمال بھی ہوں تو وہ سائمہ نہ ہوں گے شرعاً کیونکہ ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر سائمہ ہوں گے تو ان میں تجارت پر زکوٰۃ ہوگی۔

اور شرح السنہ میں ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ بکریوں میں زکوٰۃ تب ہے جب وہ سائمہ ہوں مالک نے واجب قرار دیا ہے گائیوں کے بارے میں اور اونٹوں کے بارے میں ابن حجر فرماتے ہیں: ابوداؤد کی حدیث جس کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور ترمذی نے حسن وہ دلیل ہے کہ اونٹوں میں بھی سائم ہوتے ہیں اور صحیح حدیث میں ہے کہ عوامل البقر میں صدقہ نہیں

شاۃ : مبتدا ہے۔

فاذا زادت علی ثلثمائۃ: یعنی چار سو تک پہنچ جائے اسے طیبی نے ذکر کیا ہے۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ کہا جائے کہ ایک کا اضافہ کیا جائے تو چار دینی پڑیں گی۔ شرح السنۃ میں ہے کہ اگر مزید چار سو میں سو کا اضافہ کیا اور وہ چار سو ہوئیں تو چار دینا ہوں گی بکریاں اور یہ عام اہل علم کا قول ہے۔ حسن بن صالح فرماتے ہیں کہ جب تین سو پر ایک اضافہ کرے گا تو چار بکریاں ہو گئیں۔ نخعی بھی یہی فرماتے ہیں۔

فاذا کانت سائمۃ الرجل...... الا أن یشاء ربھا:

أربعین شاۃ : یہ تمیز ہے۔

قولہ : واحدۃ : نصب کے ساتھ ہے نزع خافض کی بنیاد پر یعنی ایک پر یا مفعول ناقص ہے یا پھر اُس کے لیے عطف بیان ہے اور رفع علی التقدیر ہے۔ ای ھی واحدۃ من أربعین شاۃ۔ یہ چالیس بکریوں پر ایک ہے۔

الا اَنْ یشاء : یعنی نفلی طور پر۔

قولہ :ولا تخرج۔

فی الصدقۃ :...... الا ما شاء المصدق :

ھرمۃ : راء کے کسرہ کے ساتھ یعنی جو بڑی عمر کی ہوتی ہے ابن ملک کہتے ہیں یہ مریضہ کی طرح ہے۔

ولاذات عوار : عین کے فتحہ کے ساتھ اور ضمہ کے ساتھ یعنی عیب والی چیز اور نقص والی ایسے ہی نہایہ میں ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: یہ عطف عام سے ہے کیونکہ عیب مرض کو شامل ہے اور کمزوری اور بڑھاپے کو اور جس نے اس کی تفسیر نقص کے ساتھ کی ہے اور عیب کے ساتھ اُس نے تاکید کا ارادہ کیا ہے کیونکہ عیب اور نقص ایک ہی چیز ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ عیب نقص سے عام ہے باوجود اس کے کہ بڑھاپا لغت میں عیب دار نہیں ہے۔ اگر چہ شرع میں عیب دار ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں: یہ تب ہے جب اُس کا مکمل مال ثابت ہو جب سارا عیب دار ہو تو ایک اُس سے لے لیا جائے گا۔

ولا تیس یعنی فحل بکرا۔ شراح فرماتے ہیں: یعنی جب تمام مال میں زیادہ مؤنث ہوں تو مذکر نہیں لیا جائے گا۔ مگر ان مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ پہلی جگہ کہ کسی کے تابع اور دوسری ابن لبون لیا جائے گا پچیس اونٹوں سے بنت مخاض کی جگہ پر جب یہ نہ ہو جب ماشیہ ہوں اور تمام مذکر ہوں تو مذکر لیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تیس نہیں لیا جائے گا کیونکہ مالک اس سے فحل کا کام لیتا ہے۔ تو اسے نقصان ہوگا بعض نے کہا کہ اُس کے گوشت کے مرغوب ہونے کی وجہ سے ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: کیونکہ واجب مؤنث ہی ہے۔

الا ماشاء المصدق : صاد کی تخفیف کے ساتھ اور دال کی تشدید کے ساتھ ابو عبید نے دال کے فتحہ سے روایت کیا ہے یعنی مالک مراد ہے اور جمہور محدثین اس کے کسرہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ عامل ہے پہلی وجہ پر استثناء کو خاص کہا گیا ہے۔ ''ولا تیس'' کے قول کے ساتھ۔ یعنی مالک کے لیے لائق نہیں ہے کہ کوئی عیب دار صدقہ کے لیے دے۔ دوسرا معنی یوں ہے کہ عامل جسے جب چاہے لے لے جسے وہ زیادہ نفع والا دیکھے مستحقین کے لیے کیونکہ یہ اُن کا وکیل ہوتا ہے لیکن یہ تب ہے

جب تمام مویشی عیب دار ہوں یہ شراح کا کلام ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: یہ تب ہے جب استثناء متصل ہو اور انقطاع کا احتمال رکھے معنی یہ ہے کہ نکالنے والا کسی عیب دار چیز کو صدقہ کے لیے نہ نکالے بلکہ صحیح سلامت دے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: کہ اس کی تشدید کے ساتھ بھی کہا گیا ہے یعنی جس کے تمام جانور یا تو عیب دار ہوں یا پھر وہ مذکر ہوں تو استثناء متصل ہر ایک کے لیے راجع ہوگی۔ عجیب بات ہے جس نے اسے مالک اور تیس کی طرف راجع کہا ہے صرف اور صرف وہ تحقیق سے واقف نہیں ہے اور اللہ سے ہی توفیق ہے۔

قولہ: ولا یجمع: نفی مجہول ہے۔

بین متفرق ولا یفرق: تشدید اور تخفیف کے ساتھ۔

بین مجتمع خشیۃ الصدقۃ: یہ علت میر نصب ہے تقلیل اور تکثیر کے خوف سے اسے طیبی نے کہا ہے۔ یا صدقہ کے فوت ہونے کے ڈر سے۔ بعض نے کہا ہے کہ حاصل کلام یہ ہے کہ مقدر صدقہ کے وجوب کا خدشہ ہے یا اس کی کثرت ہے اگر یہ مالک کی طرف لوٹتی ہو تو صدقہ کے سقوط کا ڈر اگر ساعی کی طرف ضمیر لوٹی ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ ساعی کے لیے یوں ہے کہ متفرق کو جمع نہ کرے کہ دو آدمیوں کے لیے چالیس بکریاں صدقہ کے لیے اور مجتمع میں تفریق یوں ہے کہ ایک سو بیس میں تفریق کرے اور یہ کہ ایک آدمی کے لیے چالیس چالیس کر دے تا کہ تین بکریاں لے سکے۔ یہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور نہی مالک کے لیے ہے وہ چالیس اکٹھی نہ کرے یعنی کسی کے ساتھ ملا کر تا کہ صدقہ کم ہو اور بیس کم کر دے چالیس میں سے تا کہ صدقہ ساقط ہو جائے یہ شافعی کا قول ہے۔

شرح السنۃ میں ہے کہ یہ نہی مالک اور عامل دونوں کے لیے ہے۔ مالک کو جمع اور تفریق سے منع کیا ہے کہ صدقہ زیادہ ہو جائے۔ طیبی فرماتے ہیں یہ چار صورتوں میں ہو سکتا ہے اس کی طرف قاضی نے اشارہ کیا ہے کہ مالک کو روکا گیا ہے جمع اور تفریق سے زکوٰۃ ساقط کرنے کے ڈر سے یا اس سے کم کرنا جیسا کہ اُس کی چالیس بکریاں تھیں تو اُسے ملا دیا دوسرے آدمی کی چالیس بکریوں کے ساتھ تا کہ اس کا حصہ نصف بکری ہو جائے جیسا کہ اگر اس کے لیے بیس بکریاں ہوں دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی تو اُسے علیحدہ کر لے تا کہ نصاب تک نہ پہنچ جائیں تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا یہی اکثر علماء کا قول ہے اور عامل کو بھی روکا گیا ہے کہ وہ مویشی کو مالک پر تفریق نہ کرے کہ واجب زیادہ ہو جائے جیسا کہ اُس کی ایک سو بیس بکریاں ہیں تو اُس کے ذمہ ایک بکری ہے تو عامل اُسے چالیس چالیس میں تقسیم کر دے تا کہ تین بکریاں لے لے یا پھر متفرق ہو اور اُن کو اکٹھی کر دے تا کہ زکوٰۃ فرض ہو سکے یا پھر اگر دو آدمیوں کی چالیس بکریاں ہوں تو عامل انہیں اکٹھی کر دے تا کہ زکوٰۃ لے سکے یا پھر ان میں سے ہر ایک کی ایک سو بیس بکریاں ہو تو وہ جمع کر دے تا کہ فرض تین بکریاں ہو جائے یہ اُن کا قول ہے جو خلط کا اعتبار نہیں کرتے اور اس کی تاثیر نہیں مانتے جیسے امام ثوری میں اور ابوحنیفہ، طیبی فرماتے ہیں اسی قول کا ظاہر۔

قولہ: وما کان من خلیطین فانھما یترا جعان بینھمابالسویۃ: یہ توجیہ اول کو مضبوط کرتی ہے اور یہ دفاع کرتی ہے کہ مشارکۃ بھی عدالت کے ساتھ توجیہ کا مطالبہ کرتی ہے تو یہ مشارکت کی بہت ساری انواع پر مشتمل ہے اور یہ محتاج نہیں ہے جیسے ابن حجر نے فرمایا ہے کہ وہ مخرج غالب سے نکل جائے گا کیونکہ حصہ داروں میں بسا اوقات اختلاف کا سبب بنتی

ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں: اگر اُن کے پانچ اونٹ ہوں تو ساعی لیے لے اور اُن کے پاس ایک بکری بھی ہو تو وہ دوسرے حصہ دار کو قیمت میں ادا کرنا پڑے گی برابری پر۔ اور اس میں دلیل ہے کہ عامل جب ظلم کرے اور زیادہ لینا چاہے فرض سے تو وہ دوسرے شریک پر واپس نہ لوٹے گا۔ ہمارے کچھ شراح علماء نے کہا ہے کہ یہ قول "ما کان" یعنی فرض جسے عامل نے لیا ہے دونوں حصہ داروں سے تو وہ دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا۔ یا تو مذہب ابوحنیفہ پر کہ حصہ دار کا صدقہ میں حکم کوئی اثر نہیں رکھتا اور معتبر ملک ہے۔ شافعی کے برخلاف مثال کے طور پر کہ عامل دو بکریاں لے لے ایک سو بیس سے دو آدمیوں سے تقسیم کرنے سے قبل ہی تو صاحب ثلثین سے ایک بکری اور ثلث لی جائے گی اور اسی میں ایک بکری ہوگئی اور تہائی والے سے ایک بکری کا ثلث لیا جائے گا اور چالیس میں اُس پر ایک بکری ہوگئی تو دو تہائی والے صاحب برابری پر اپنے ساتھی سے ایک ثلث لے گا۔ یا پھر شافعی کے مذہب پر مثال کے طور پر یہ کہ دو حصے داروں میں سے ایک کے لیے تین گائے ہوں اور دوسرے کے لیے چالیس اور عامل ایک سے مسند اور دو تہائی لے لے۔ تو پہلے کو چار اسباع ملیں گے اور دوسرے کو تین اسباع ملیں گے اگر اس سے برعکس لے تو واپس بھی اس کے برعکس ہوگا۔ اگر اُس نے ایک سے لیا تو دوسرے پر بھی وہ حصہ لوٹایا جائے گا اگرچہ یہ جنس مال سے نہ بھی لیا گیا ہو وگرنہ نہیں خلاصہ ختم ہوا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: ابوبکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کی کتاب مشتمل تھی ان الفاظ پر کہ دونوں حصہ داروں پر برابر تقسیم ہوگی۔ جمع میں تفریق نہ ہوگی اور تفریق میں جمع نہ ہوگی صدقہ کے ڈر سے اور مراد بیان کرنے کا کوئی حرج نہیں جب اختلاف بیان مقصود ہو اور جب نصاب شرکاء کے درمیان ہو اور حصہ داری بھی ٹھیک ہو ان کے درمیان مسرح اور مراح کے اتحاد کے ساتھ راعی اور فحل اور محلب میں تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی۔

یعنی شافعی کے ہاں اس قول کی وجہ سے کہ "**ولا لجمع بین متفرق**......" اور جمع کو متفرق کرنے میں کچھ فرض نہیں ہے ہمارے ہاں بھی فرض نہیں ہے اور ہمارے لیے یہ حدیث واجب کرتی ہے املاک کے درمیان جمع کرنے میں مراد جمع اور تفریق ہے املاک میں امکنہ میں نہیں اگر املاک متفرق ہوں تو بھی زکوۃ فرض ہوتی ہے اور جس کی اسی بکریاں ہوں تو عامل اُسے دو نصاب نہیں بنا سکتا کہ انہیں دو جگہوں میں تقسیم کر دے تو معنی یہ ہے کہ متفرق میں جمع نہیں ہے تو ساعی اسی میں تفریق بھی نہیں کر سکتا یا پھر ایک سو بیس کو دو نصاب نہیں بنا سکتا یا تین نصاب اور جمع نہ کرے متفرق میں کہ چالیس میں تفرقہ کرے کہ وہ مشترک ہوں تو اُن کو ایک نصاب بنا دے حالانکہ ہر ایک کی صرف بیس بیس تھیں۔

فرمایا: "**وما کان بین الخلیطین**......" اسی سے ارادہ کیا ہے کہ جب دو آدمیوں کے درمیان اکٹھ اونٹ ہوں ایک کے چھتیس اور دوسرے کے پچیس تو عامل اس سے بنت لبون اور بنت مخاض لے لے ہر ایک دوسرے حصہ دار حصہ کے تقسیم ہوگا عامل اُس سے اُس کے شریک کی زکاۃ نہیں لے سکتا۔ واللہ اعلم۔

تو اس قول سے مراد "**مخافة الصدقة**" یہ ہے کہ صدقہ ثابت ہونے کے ڈر سے جن میں صدقہ نہیں ہے۔ یعنی وہ یہ تفریق نہ کرے کہ جس میں صدقہ واجب نہ ہو اُس میں واجب کر دے کہ اسی میں تقسیم کر دے تو دو واجب ہونگی ایک کی بجائے

یا بیس بیس میں جمع کر دے تو یہ واجب واقع نہ ہوگی۔

وفی الورقة ربع العشر ......

الورقة: راء کے کسرہ اور قاف کی تخفیف کے ساتھ یعنی دراہم جس کی اصل چاندی ہوتی ہے اس سے واؤ حذف کر دی گئی ہے اس کے عوض تاء لائی گئی ہے جیسا کہ عدۃ اور دیۃ میں ہے۔

ربع العشر: اول کے ضمہ کے ساتھ دوسرے کے سکون کے ساتھ یعنی جب چاندی دوسو درہم ہو دسویں کا چوتھائی پانچ درہم ہیں اور اس پر اکثر اقتصار کیا گیا ہے زرکشی نے ابن عبدالبر سے کہا ہے کہ دینار کا تبادلہ درست نہیں ہے یعنی چوبیس قیراط کے مثقال کے ساتھ اگر چہ صحیح نہیں ہے لیکن ایک علماء کی جماعت کا موقف ہے اور اجماع ہے لوگوں کا اس پر جو سند سے بے نیاز ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: مثقال بہتر دانوں کے برابر ہوتا ہے جو سے اور درہم پچاس دانوں کے برابر ہوتا ہے اور پانچ دانوں کے تو اس اور مثقال کے درمیان فرق تین اعتبار کا فرق ہے۔ اور جر ہمارے علماء نے کہا ہے کہ دس درہم سات مثاقیل کے مثل ہوتے ہیں اور مثقال بیس قیراط کا ہوتا ہے اور قیراط پانچ متوسط شعیرات کے برابر ہوتا ہے۔

فان لم تکن: یعنی وہ چاندی جو اُس کے پاس ہے۔

ومائة: فلیس فیها شئ :الا ان یشاء ربها : یعنی اگر وہ نفلی طور پر کچھ دینا چاہے تو پھر اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ شرح السنۃ میں ہے یہ وہم کرتی ہے کہ جب وہ اسی پر کچھ اضافہ کرے گا دوسو سے قبل تو اس میں صدقہ ہوگا حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے اور نوے کا ذکر اس لیے کیا ہے کیونکہ یہ سو کی فصلوں میں سے آخری فصل ہے حساب جس سو سے زائد ہو تو اُس کی ترکیب فصول، عشرات، مات اور الوف پر ہوتی ہے۔ تو نوے کو ذکر کیا تا کہ یہ دلالت کرے کہ دوسو سے کم میں صدقہ نہیں ہے کیونکہ آپؐ کا قول ہے: کہ پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں صدقہ نہیں ہے اس کا نام اصول میں نص مفارق ہے دوسری نص کے ساتھ اس کی تائید اگلی حدیث کرتی ہے جو حضرت علیؓ سے ہے کہ ایک سو نوے میں کچھ نہیں ہے جب دوسو درہم ہوں تو پانچ درہم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ [الحقاف:۱۵] کہ کم از کم مدت حمل چھ مہینے ہے لیکن جب یہ قول ساتھ ملالیں ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ [البقرہ:۲۳۳] کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل دودھ پلائیں' یہ دس جگہوں میں تقسیم ہے یہ کتاب مستفیض مشہور ہے روایت کیا اس کو امام بخاری نے اور ابن ہمام فرماتے ہیں اسے بخاری نے تین ابواب میں روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں صرف ایک حدیث میں بیان کیا ہے اور یہ اضافہ ہے کہ اگر دو سے زائد حصہ دار ہیں تو اُن میں برابری پر تقسیم ہوگی بعض دفعہ اس میں انقطاع کا وہم ہوتا ہے لیکن یہ صحیح ہے طیبی کہتے ہیں دارقطنی نے حدیث عائشہ سے اور ابن عمرؓ سے کہ وہ ہر بیس دینار سے نصف دینار اور ہر چالیس سے ایک دینار لیتے تھے۔

عُشر کے احکام

۱۷۹۷: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بَالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ۔ (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۴۷/۳۔ حديث رقم ۱۴۸۳۔ وابوداوٗد في السنن ۲۵۲/۲۔ حديث رقم ۱۵۹۶۔ والترمذي ۳۱/۳ حديث رقم ۶۳۹۔ والنسائي ۴۱/۵ حديث رقم ۲۴۸۸۔ وابن ماجه ۵۸۰/۱ حديث رقم ۱۸۱۶۔ ومالك في الموطأ ۲۷۰/۱ حديث رقم ۳۳ من كتاب الزكاة۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس چیز کو آسمان نے یعنی بارش نے اور چشموں نے پانی پلا دیا ہو یا خود زمین تر و تازہ ہو تو دسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور وہ زمین کہ جس کو بیل یا اونٹ کے ساتھ کنوئیں کے پانی سے پلایا گیا ہو تو اس میں بیسواں حصہ ہوگا۔ اس کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **فيما سقت السماء والعيون او كان عثر يا العشر**: یعنی بارش سیلاب یا نہروں سے۔

والعيون: ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔

عثريًا: عین کے فتحہ کے ساتھ اور مثلثہ مفتوحہ مخففہ کے ساتھ ہے بعض نے تشدید کے ساتھ بھی کہا ہے لیکن وہ غلط ہے بعض نے سکون کے ساتھ کہا ہے یہ النہایۃ میں ضعیف ہے کہ وہ کھجور مراد ہے جو اپنی جڑوں سے پانی بارش کا پیتی ہے یہ ایک حفیرۃ میں جمع ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وہ کھیتی ہے جو بارش کے پانی کے علاوہ نہ بھرتی ہو۔

قاضی کہتے ہیں پہلا مطلب یہاں زیادہ بہتر ہے تاکہ تکرار لازم نہ آئے اور کسی چیز کا عطف اُسی پر ہو یہی مشہور ہے اور تورپشتی بھی اسی کی طرف گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ جو زمین میں بویا جاتا ہے اور اُس سے زمین تر رہتی ہے کیونکہ اُس سے قریب کچھ پانی جمع رہتا ہے کسی گڑھے میں تو اسے بھی عشرۃ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

وما سقي بالنضح نصف العشر: یعنی جو اونٹ یا بیل سے پلایا جائے یا پھر کسی نہر یا کسی کنویں سے یا کسی چشمہ سے یہ اصل میں مصدر ہے سقی کے معنی میں النہایۃ میں ہے کہ نواضح وہ اونٹ ہے جس کے ذریعے سے پانی نکالا جاتا ہے اس کی واحد ناضح ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: مؤنث ناضحہ ہے اس میں کچھ بحثیں ہیں اور اس حیوان کا نام سانیۃ ہے۔

کیونکہ اس میں کچھ محنت ہے قولہ میرکؒ فرماتے ہیں: اسے چاروں نے روایت کیا ہے مسلم کی حدیث میں سند صحیح کے ساتھ ہے کہ "**فيما سقت السماء والأنهار والعيون او كان بعلاً**" یعنی جو محنت کے ساتھ قریبی پانی سے سیراب ہوتی ہیں ان میں دسواں حصہ ہوتا ہے اور جو ڈول کھینچ کر یا رہٹ سے سیراب ہو اس میں نصف العشر ہے۔

رکاز کا حکم

جُبَارٌ وَّالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَّفِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۳٦٤۔حدیث رقم ۱٤۹۹ومسلم فی صحیحه ۳/۱۳۳٤ حدیث رقم (٤٥۔۱۷۱۰)۔ وابوداوٗد فی السنن ٤/۷۱٥ حدیث رقم ٤٥۹۲۔ والترمذی ۳/۳٤ حدیث رقم ٦٤۲۔ والنسائی ٥/٤٤ حدیث رقم ۲٤۹٥ وابن ماجه ۲/۸۹۱ حدیث رقم ۲٦۷۳۔ والدارمی ۱/٤۸۳ حدیث رقم ۱۱٦۸ ومالك فی الموطأ ۲/۸٦۸ حدیث رقم ۱۲ من کتاب العقول۔ واحمد فی المسند ۲/۲۲۸۔

ترجمه:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جانور کا کسی کو زخمی کر دینا معاف ہے کنواں کھودتے وقت کوئی گر کر مر جائے تو وہ معاف ہے کان کھدواتے وقت اگر کوئی مر جائے تو وہ معاف ہے اور رکاز میں پانچواں حصہ ہوتا ہے اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **قوله :قال رسول الله ﷺ العجماء جرحها جبار** : یہ جانور ہے اعاجم کی تانیث ہے یعنی وہ جو کلام پر قدرت نہ رکھتی ہو اس کا نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ کلام کرتی ہیں۔

جرحها: جیم کے ضمہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ اور یہ مفہوم الازھری سے منقول ہے کہ یہ فتحہ کے ساتھ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ الجراحۃ ہے اور مراد اس کا تلف کرنا ہے عیاض فرماتے ہیں: جرح کو لایا گیا ہے کیونکہ اغلب معنی ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تنبیہ ہے اس کے ماسواء کے لیے۔

جبار : جیم کے ضمہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ اور نہایۃ میں الازہری نے مفہوم بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صرف فتحہ کے ساتھ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ جراحۃ کا مراد اس کا تلف ہونا ہے طیبی فرماتے ہیں: ضروری ہے کہ مضاف کیا جائے تا کہ صحیح ہو حمل کرنا مبتدأ کو خبر پر یعنی عجماء کے فعل پر یہ رائیگاں اور باطل ہے یہ زخم اُس کی غفلت کی وجہ سے ہے یہ دونوں جملوں کے جو متاخر ہیں اور محتاج ہیں تقدیر کی طرف جیسا کہ مخفی نہیں ہے یعنی جب جانور کوئی نقصان کر دے اُس کے ساتھ اُس کا قائد نہ ہو تو دن کا وقت ہو تو کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر کوئی ساتھ تھا تو پھر وہ ذمہ دار ہوگا کیونکہ نقصان اُس کی غفلت سے ہوا ہے اور اگر رات کا وقت تھا تو مالک بھی اُس کی حفاظت سے قاصر ہوتا ہے اور جانوروں کی عادت ہوتی ہے کہ رات کو جانوروں کو باندھ دیا جاتا ہے اور دن کے وقت چھوڑ دیا جاتا ہے طیبی اور ابن ملک نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔

والبئر : ہمزہ اور بدل کے ساتھ۔

جبار : یعنی کھودا ہوا کنواں بغیر رکاوٹ کے جب کوئی اس میں گر جائے یا کسی نہر میں تو کھودنے والے پر کوئی ضمان نہ ہوگا البتہ ایک قول کے مطابق حکم دینے والے کے لیے ہوگا۔

قوله : والمعدن جبار : کنویں کی طرح ہے دونوں وجہوں میں ابن ملک فرماتے ہیں: جب اپنی زمین میں کنواں کھودے اور اُس میں کوئی گر جائے تو کوئی ضمان نہ ہوگا ہاں اگر کسی راستے پر کھدوائے یا کسی اور کی ملکیت میں بغیر اجازت کے تو کھدوانے والے پر تمام نقصان ہوگا ایسے ہی جب کسی ایک نے کوئی جگہ کھودی اور اُس میں سونا یا چاندی تھی تا کہ وہ نکالے تو اُس میں کوئی آدمی یا جانور گر گیا اُس نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ.........

ایسے ہی فیروز اور مٹی ہے اور دوسری چیزیں ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: جب وہ کھودنے والے کو کرائے پر حاصل کیا کنواں

کھودنے کے لیے یا معدن (کان) نکالنے کے لیے تو کوئی اُس میں گر گیا تو اُس پر کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور ایسے ہی جب اُس میں کوئی انسان گر گیا اور وہ ہلاک ہو گیا اگر تو وہ دشمن ہے تو نقصان ذمہ میں ہوگا وگرنہ نہیں ہے اور اختلاف ہے۔

قوله :وفي الركاز :الخمس:

الرکاز: واؤ کے کسرہ کے ساتھ۔

الخمس : طیبی فرماتے ہیں: رکاز معدن کو کہتے ہیں اہل عراق کے ہاں ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں سے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے راویت ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا تو فرمایا: **فقال الذهب الذى خلقه الله فى الارض يوم خلقت۔** ''سونے کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تھا زمین میں جس دن پیدا کی گئ'' لیکن اہل حجاز کے ہاں یہ جاہلیت کی دفن کردہ چیزیں ہوتی ہیں یہ عرب کے استعمال کے موافق ہے اور وجوب خمس کے بھی موافق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلا معنی کانوں کے ذکر میں زیادہ مناسب ہے۔

ابن ملک نے فرمایا ہے کہ لغت ان دونوں کا احتما [illegible] کہتا ہے کیونکہ دونوں زمین میں چھپے ہوتے ہیں یعنی ثابت ہوتے ہیں۔ اور ''رکزہ'' کہتے ہیں مراد ہوئی ہے دفنہ۔ اور یہ بھی [illegible] کہ یہ حدیث اہل حجاز کی رائے کے مطابق ہے اس میں خمس ہے کثرت نفع کی وجہ سے اور آسانی سے دستیابی کی وجہ سے [illegible] مراد چھپا ہوا ہے یہ اس کے پیدا کرنے والے کے چھپائے ہونے سے زیادہ عام ہے۔ تو اس میں یہ فرض کر دیا گیا تاکہ [illegible] نہ ہو کہ جس طرح اس کے نقصان کا ذمہ نہیں ہے اسی طرح اس میں کچھ صدقہ نہیں ہے تو فوراً بیان کیا گیا۔ وگرنہ تناقض ہو جاتا یونکہ حکم معدن کے ساتھ معلق تھا تو وہ رکاز سے معلق نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو سلب اور ایجاب سے مختلف ہو جاتا ہے جب اس [illegible] ہے کہ نقصان کا ذمہ دار اس کے کھدوانے والا ہے اور کھودنے والے پر نہیں ہے کیونکہ اصل میں تو اس کے لیے کچھ [illegible] میں اختلاف ہے اور اختلاف بھی کمیت میں ہے اصل میں نہیں ہے اور جو حضرت ابوہریرہؓ سے رکاز کے خمس ہو [illegible] ہے تو پوچھا گیا کہ: **فى الركاز الخمس قيل وما الركاز يا رسول الله؟ قال الذهب الذى خلقه الله** [illegible] **خلقت الارض۔** رکاز کیا ہے؟ فرمایا: سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اُس وقت پیدا کیا تھا جس دن زمین کو پیدا [illegible] نے روایت کیا ہے اور اسے امام میں ذکر کیا ہے اگرچہ امام میں اس سے سکوت اختیار کیا ہے عبداللہ بن شعیب بن [illegible] کے ضعیف ہونے کی وجہ سے پھر جان لو کہ کان سے نکلنے والی چیز تین قسموں پر ہے جامد بالکل جو جذب نہ کرے اور [illegible] اس جیسی چیزیں اور جو جامد نہیں ہیں پانی، تیل اور گھلے مادے اور وہ جامد جو ایک حالت میں نہیں رہتے تانبا، پیتل اور سارے پتھر یاقوت، نمک صرف پہلی قسم میں خمس ہے اور شافعی کے ہاں صرف نقدین میں ہے۔

قولہ میرکؒ فرماتے ہیں: اسے چاروں نے روایت کیا ہے:

الفصل الثانی:

گھوڑوں اور غلاموں میں جب وہ تجارت کیلئے نہ ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہے

۱۷۹۹: عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ عَفَوْتُ عَنِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ فَهَاتُوْا صَدَقَةَ الرِّقَةِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَّلَيْسَ فِيْ تِسْعِيْنَ وَمِائَةٍ شَيْءٌ فَاِذَا بَلَغَتْ مِائَتَيْنِ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ. رواہ الترمذی وابو داود وفی روایة لابی داود عن الحارث الاعور عن علی قال زهیر احسبه عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ هَاتُوْا رُبُعَ الْعُشْرِ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ وَّلَيْسَ عَلَيْكُمْ شَيْءٌ حَتّٰى تَتِمَّ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَاِذَا كَانَتْ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ فَمَا زَادَ فَعَلٰى حِسَابِ ذٰلِكَ وَفِي الْغَنَمِ فِيْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ شَاةٍ شَاةٌ اِلٰى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ فَاِنْ زَادَتْ وَاحِدَةٌ فَشَاتَانِ اِلٰى مِائَتَيْنِ فَاِنْ زَادَتْ فَثَلَاثُ شِيَاهٍ اِلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَاِذَا زَادَتْ عَلٰى ثَلَاثِ مِائَةٍ فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ شَاةٌ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ اِلَّا تِسْعٌ وَّثَلَاثُوْنَ فَلَيْسَ عَلَيْكَ فِيْهَا شَيْءٌ وَفِي الْبَقَرِ فِيْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ تَبِيْعٌ وَفِي الْاَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةٌ وَلَيْسَ عَلَى الْعَوَامِلِ شَيْءٌ۔

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۳۲/۲ حدیث رقم ۱۵۷۴۔ والترمذی ۱۶/۳۔ حدیث رقم ۶۲۰۔ والنسائی ۳۷/۵ حدیث رقم ۲۴۷۷۔ وابن ماجه ۵۷۰/۱ حدیث رقم ۱۷۹۰ والدارمی ۴۶۷/۱ حدیث رقم ۱۶۲۹۔ واحمد فی المسند ۹۲/۱۔ واخرجه ابوداوٗد الروایة الثانیة ۲۲۸/۲ حدیث رقم ۱۵۷۲۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو گھوڑے اور غلام تجارت کے لئے نہ ہوں' اُن سے زکوٰۃ معاف کر دی ہے جو اور گھوڑوں کے بارے میں اوپر اختلاف بیان ہو چکا ہے اور چاندی کے ہر چالیس درہم میں زکوٰۃ ادا کرو۔ جب وہ مقدار نصاب کو پہنچ جائیں۔ اس کا نصاب دوسو (۲۰۰) درہم ہیں اور ایک سو نوے (۱۹۰) میں زکوٰۃ نہیں ہے یعنی دوسو (۲۰۰) سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جب نصاب دوسو درہم کو پہنچ جائے تو ان میں پانچ درہم دینے ہونگے۔ اس کو ترمذیؒ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ایک روایت ابوداؤد شریف میں حارث اعور سے ہے' جو حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ زہیر نے کہا اس کے راوی میرے گمان کے مطابق حارث ہیں' حارث نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر سال چالیس حصے دو۔ ہر چالیس (۴۰) درہم میں سے ایک درہم اور اس وقت تک تم پر کوئی چیز نہیں ہے جب تک درہموں کی تعداد دوسو (۲۰۰) درہم نہ ہو جائے۔ جب ان کی تعداد دوسو (۲۰۰) درہموں تک پہنچ جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہوگی اور بکریوں میں ہر چالیس (۴۰) بکریوں میں ایک بکری ہے ایک سو بیس تک جب ان پر ایک بھی زیادہ ہو جائے پس دو بکریاں دینی ہوں گی۔ دوسو (۲۰۰) تک اور جس وقت دوسو (۲۰۰) پر ایک بھی زیادہ ہو جائے۔ تو پھر تین بکریاں دینی ہوں گی تین سو (۳۰۰) تک جب تین سو (۳۰۰) سے زیادہ ہو جائیں چار سو (۴۰۰) تک تو پھر ہر سو میں ایک بکری دینی ہوگی۔ اگر بکریاں انتالیس (۳۹) ہوں تو ان پر کچھ واجب نہیں

ہوگا۔اور تیس گائے (۳۰) میں ایک سال کا ایک بیل دینا ہوگا اور چالیس (۴۰) گائے میں دوسال کی گائے دینی ہوگی اور کام کرنے والے بیل وغیرہ جس سے کھیتی باڑی کرتے ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہیں۔

تشریح: قولہ : قد عفوت عن الخیل الرقیق : یعنی جب یہ تجارت کے لیے نہ ہوں اور سائمہ گھوڑے میں اختلاف گزر چکا ہے۔طیبی فرماتے ہیں: کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے میں کتنا گناہ ہے مال روک رکھنے نہیں اور اسے خرچ نہ کرنے میں یعنی میں نے چھوڑ دیا ہے اور تجاوز کیا ہے ان سے زکوٰۃ لینے میں اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہر چیز میں مداخل زکوٰۃ ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ معاملہ آپ ﷺ کے سپرد ہے معنی یہ ہے کہ جب میں نے معاف کر دیا ہے ان کی مثل اور بھی بہت سارے اموال ہیں۔

فھاتوا صدقة الرقة : چاندی کی زکوٰۃ حالانکہ یہ تھوڑی ہے۔

قولہ :ولیس فی تسعین و مائة شئ : یہ نصاب کا بیان ہے۔

قولہ :فاذا بلغت :یعنی چاندی۔

ماتین ففیھما : یعنی سال گزرنے کے بعد فرض۔

خمسة دراھم قولہ :وفی روایة لابی داوٗد عن الحارث الاعور...... انه قال: یعنی ابن عبداللہ الہمد انی مراد ہیں۔طیبی کہتے ہیں یہ ابوزھیر ہے یہ وہ ہیں جو حضرت علی کی صحبت سے مشہور ہیں اور انہوں نے صرف ان سے چار حدیث سنی ہیں۔ائمہ نے اس میں کچھ کلام کیا ہے۔

زھیر : تصغیر کے ساتھ یہ حدیث کے ایک راوی ہیں۔

انه قال : یعنی حضرت علی نے یا رسول اللہ نے۔ابن ہمام فرماتے ہیں: ابوداوٗد نے عاصم بن ضمرۃ سے اور حارث وہ زہیر سے اور کہا میں گمان کرتا ہوں۔اسے دارقطنی نے مجزوم بیان کیا ہے اس میں قال زہیر نہیں ہے۔ابن قطان کہتے ہیں: یہ سند صحیح ہے۔

ھاتوا :ربع العشر ...... حتی تتم مائتی درھم:

حتی تتم : تانیث وتذکیر کے ساتھ ہے یعنی چاندی پہنچ جائے۔

مائتی درھم : طیبی فرماتے ہیں: اس کا نصب حال پر ہے یعنی دوسو کو پہنچ جائے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:﴿ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ﴾ [الاعراف:۱٤٢] ''تو اس کے پروردگار کی چالیس رات کی میعاد پوری ہوگئی۔''

قولہ :فاذا کانت...... فعلی حساب ذٰلك :یعنی رقۃ یا چاندی۔ماتی درھم :ابن ہمام فرماتے ہیں: برابر ہے کہ پگھلی ہوئی ہو یا نہ ہو سونے اور چاندی کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں ہے جب تک اُس کی قیمت نصاب تک نہ پہنچ جائے کیونکہ اس کی بنیاد تقوم اور عرف پر ہے کہ سکوک کو قائم کیا جاسکے اور ایسے ہی چوری اک نصاب ہے احتیاطی طور پر۔

فعلی حساب ذٰلك :یعنی اُس کی زکوٰۃ دی جائے گی جیسا کہ پہلے سے معلوم ہے اور یہاں اعادہ تاکید کے لیے کیا گیا ہے کیونکہ نفسوں میں لالچ اور زکوٰۃ سے رکنا رکھا گیا ہے اس میں دلیل ہے کہ دراہم میں بھی معافی نہیں ہے ابن ملک فرماتے ہیں:

کہ نصاب سے زائد پر بھی زکوۃ ہے اُسی قدر کم ہو یا زیادہ اور امام محمد اور امام یوسف رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زائد پر زکوۃ نہ ہوگی یہاں تک کہ چالیس درہم نہ ہوں اور حدیث کو حمل کیا ہے کہ یہ تب ہے جب دوسو سے زائد ہو اور چالیس تو دو حدیثوں کے درمیان تطبیق دینے کے لیے ہے۔

امام میرک فرماتے ہیں: کہ اپنی روایت جسے حضرت علی سے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ نے عاصم بن ضمرۃ کے واسطے سے بیان کیا ہے شیخ جزری فرماتے ہیں: عاصم میں کلام ہے۔ لیکن ابن حجر فرماتے ہیں: اس کی سند حسن ہے اور دوسری روایت اُسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے مذکورہ عاصم سے اور حارث میں بھی کلام کیا ہے۔ اور ابوداود نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث موقوف روایت کی گئی ہے۔

(ملا علی قاری کہتے ہی) میں کہتا ہوں۔ مذکورہ عاصم ثقہ ہے۔ ابن معین، ابن معینی عجلی، احمد بن حنبل اور نسائی نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے سچا کہا ہے ذہبی نے وسط کہا ہے۔ لیکن حارث کے بارے میں اکثر نے اُسے ضعیف کہا ہے اور بعض نے تو اس معاملے کو قوی جانا ہے لیکن اُس کی حدیث کے شواہد اور دوسری صحیح احادیث سے ملتے ہیں۔ اور اس میں ثقات کی حدیث کی مخالفت بھی نہیں ہے۔ مگر صرف یہ قول "فعلي حساب ذلك"۔ طیبی فرماتے ہیں: اعور اور حارث کی روایت مصابیح میں نہیں ہے اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے ترمذی میں نہیں ہے۔ اور ابوداؤد نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ "فعلي حساب ذلك"۔

قوله :وفي الغنم ...... فليس عليك فيها شئ۔

في كل أربعين : جار کے اعادہ سے غنم میں من کوفی سے تبدیل کیا گیا ہے۔

شاة : یہ تاکید کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے۔ ﴿ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ﴾ [الحاقة: ۳۲]

طیبی فرماتے ہیں: یہاں شاۃ تمیز نہیں ہے جیسا کہ اس قول میں في كل أربعين درهمًا۔ درہم میں ہے۔ چونکہ درہم مقدار کو بیان کرنا ہے یہ رقہ سے معلوم نہیں ہے اور بکری کا تذکرہ یہاں مزید وضاحت کے لیے ہے۔ اور ابن حجر نے اس میں کچھ اختلاف کیا ہے۔

شاة: مبتداء مؤخر ہے اور غنم میں اس کی خبر ہے پھر ظاہر ہے کہ یہ کل لفظ زائدہ ہے یا پھر اس سے مراد چالیس افراد کا استغراق ہے تا کہ یہ فائدہ دے سکے زکوۃ کے تعلق کا چالیس میں یا واجب مبہم بکری ہے۔ ابن صلاح فرماتے ہیں: ظاہراً حدیث دوسرے پر دلالت کرتی ہے اور حاصل کلام یہ ہے کہ یہ " في كل اربعين درهما درهم" کی طرح نہیں ہے۔ وگرنہ معنی فاسد ہو جائے گا یہ کہ زکوۃ مقرر نہ ہوگی معنی کے تکرار کے ساتھ اجماعاً پھر چالیس پر اضافہ بھی نہ ہوگا۔

فاذا: اور ایک نسخہ میں ہے: " فان"۔

بصیغۂ تانیث اور تذکیر کے ساتھ ہے۔

كل ثلاثين : یعنی گائیں (اس کی تمیز محذوف ہے) اي في كل ثلاثين بقرا۔

تبيع : یعنی جو ایک سال کا ہو کیونکہ یہ ماں کا تابعدار ہوتا ہے اور مؤنث "تبيعة" آتی ہے۔

مسنة : جو دو سال کا ہو۔ ابن ہمام فرماتے ہیں: اس باب میں مؤنث کا تعین نہیں ہے اور نہ ہی بکریوں میں اونٹوں کے

خلاف کیونکہ یہ شمار نہیں ہوتے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: کچھ بھی چالیس سے زائد نہیں ہے یہاں تک کہ ساتھ نہ ہو جائیں تو پھر دو تبیعہ ہونگے پھر فرض تبدیل ہو جائے گا دس کے اضافہ سے تو ہر چالیس میں ایک مسنہ ہے اور ہر تیس میں ایک تبیع ہے اور یہ اسد بن عمرو کی روایت ہے۔ یہ ابو یوسف کا قول ہے اور امام محمد کا اور معاذ کا قول گائیوں میں یہ ہے کہ اوقاص میں کچھ نہیں ہے یہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور جو امام کا قول ہے وہ ساٹھ سے زائد کا ہے اور وہ ضعیف ہے کہ تیس میں ایک ہے اور اس بنیاد پر کہ اس میں کچھ نص نہیں ہے اور نا جائز ہے یہ بات ہمارے مذہب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے صاحب ہدایہ کے ہاں اور اُن کے پیروکاروں کے ہاں۔

قولہ :ولیس علی العوامل شیئ: اگر چہ نصاب کو پہنچ جائیں۔

شیئ : فعلی یہ فی کے معنی میں ہے یا صاحب عوامل پر تقدیر ہے۔ یہ عاملۃ کی جمع ہے گائیوں سے اونٹوں سے کھیتی والے اور کنویں والے یہ مسئلہ مالک کے خلاف ہے اسے طیبی نے ذکر کیا ہے ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ مخفی نہیں ہے کہ پھر عوامل ہی حوامل پر صدقہ کرتے ہیں تو ان سے نفی ان سے نفی ہے۔ اور خاص بیل کے نام میں ایک ضعیف حدیث بیان کی گئی ہے۔ دار قطنی میں کہ (لیس فی المثیرۃ صدقۃ) طیبی فرماتے ہیں یہ صحیح موقوف ہے اور مثیرۃ گائیوں میں ہوتے ہیں جو زمین میں ہل چلاتے ہیں۔ پھر حدیث صحیح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مثیرۃ کا حکم عوامل کا ہے اور اس کی طرح ہی اونٹ ہیں اگر چہ ان کا مالک سارا سال ان سے ہل چلواتا رہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: کام کرنے کی مدت اثر انداز ہوگی کہ سال میں تین دن بھی۔ اس میں بھی کافی بحث ہے لیکن ظاہر ہے اغلبیت کو معتبر سمجھا جائے گا۔

امیر کا عامل زکوۃ کو ہدایات دینا

۱۸۰۰: وَعَنْ مُعَاذٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَجَّھَہٗ اِلَی الْیَمَنِ اَمَرَہٗ اَنْ یَّاْخُذَ مِنَ الْبَقَرِ مِنْ کُلِّ ثَلَاثِیْنَ تَبِیْعًا اَوْ تَبِیْعَۃً وَمِنْ کُلِّ اَرْبَعِیْنَ مُسِنَّۃً۔ (رواہ ابو داود والترمذی والنسائی والدارمی)

اخرجہ ابوداوٗد فی السنن ۲۲۶/۲ حدیث رقم ۱۵۷۸۔ والترمذی ۲۰/۳ حدیث رقم ۶۲۳۔ والنسائی ۲۶/۵ حدیث رقم ۴۵۰۔ وابن ماجہ ۵۷۶/۱ حدیث رقم ۱۸۰۳۔ والدارمی ۴۶۵/۱ حدیث رقم ۱۶۲۴۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو یمن کی طرف عامل بنا کر بھیجا تو ان کو حکم کیا کہ ہر تیس (۳۰) گایوں میں سے ایک سال کا بیل یا ایک سال کی گائے بطور زکوۃ لیں اور ہر چالیس گایوں میں سے ایک دو سال کی گائے یا دو سال کا بیل لیں۔ اس کو ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ اور دارمیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: معاذ : ضمہ کے ساتھ ہے۔

من البقر : ایک نسخہ میں بقرۃ کے الفاظ میں مراد جنس ہے ابن ہمام فرماتے ہیں: "البقر" بقر سے ہے جب مشتق ہو اس کا نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ زمین میں مشقت کرتی ہے یہ اسم جنس ہے اور بقرۃ میں تاء وحدۃ کے لیے ہے یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے ہے تانیث کے لیے نہیں ہے۔

تخریج و اسنادی حیثیت :امام میرک فرماتے ہیں:اور ابن ماجہ اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں ترمذی فرماتے ہیں حسن ہے بعض نے ذکر کیا ہے کہ اسے مرسل بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سب سے زیادہ صحیح ہے شیخ جزری فرماتے ہیں ابن حجر فرماتے ہیں:ابن بطال نے گمان کیا ہے کہ حدیث معاذ متصل ہے صحیح ہے اس میں کچھ نظر ہے کیونکہ معاذ سے روایت کرنے والا مسروق اُن سے ملا نہیں ہے۔اسے ترمذی نے کچھ شواہد کی وجہ سے حسن قرار دیا ہے۔مؤطا میں طاؤس عن معاذ کے طریق سے ہے اور طاؤس عن معاذ یہ منقطع ہے۔ابوداؤد میں اسی باب میں حضرت علی سے بھی ہے گویا کہ اُس میں ماقبل کی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے

ابن ہمام فرماتے ہیں:اصحاب سنن اربعہ نے یہ روایت نقل کی ہے:"**عن مسروق عن معاذ بن جبل كان رسول الله ﷺ لما وجهه الى اليمن أمره ان ياخذ من كل ثلاثين بقرة تبيعا او تبيعة ومن كل اربعين مسنة ومن كل حالم يعني محتلمًا دينارا او عدله من المغافر ثياب تكون باليمن**۔ مسروق عن معاذ سے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جب معاذ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو اُسے حکم دیا کہ ہر تیس گائے پر ایک تبیعہ لے اور ہر چالیس پر ایک مسنہ اور ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے بدلے میں کپڑے جو یمنی ہوں۔اسے ترمذی نے حسن کہا ہے بعض نے مرسل کہا ہے اور یہ سب سے صحیح ہے یعنی بالغ سے دینار جزیہ لینا ہے۔اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں حاکم نے کہا یہ شیخین کی شرائط میں ہیں اور اسے ذکر نہیں کیا اور عبدالحق نے یہ علت بیان کی ہے کہ مسروق معاذ سے نہیں ملا اور ابن عبدالبر نے صراحت کی ہے کہ یہ متصل ہے۔

اور ابن حزم نے اپنے کلام کے آغاز میں کہا ہے کہ یہ منقطع ہے اور مسروق معاذ کو نہیں ملا ہے اور آخر میں فرماتے ہیں کہ حدیث معاذ میں حضرت معاذ کا فعل یمن میں بیان کیا ہے گائیوں کی زکوۃ میں اور مسروق نے ہمارے ہاں بلا شک معاذ کو پایا ہے اپنی عمر اور عقل میں اور احکام کا یقینی مشاہدہ کیا ہے اور یہ حضرت عمر کے زمانے میں فتویٰ دیتے رہے ہیں اور انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا ہے۔یہ یمن کا رہنے والا ایک آدمی تھا اور حضرت معاذ کے ساتھ رہا ہے۔اور کچھ باتیں بھی ان سے اخذ کی ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی۔اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ کچھ فاصلہ کرتے ہیں اپنے اور معاذ کے درمیان حالانکہ وہ ایک شہر میں رہتے تھے کہ معاذ نے "اخذ كذا كذا" اور حق بات ابن قطان کا قول ہے کہ اس کی حدیث پر جمہور کے قول پر حکم معاصرة کا لگانا چاہے جب تک کہ عدم لقاء ثابت نہ ہو جائے یا پھر بخاری کے شروط پر اور ابن مدینی کے شروط پر کہ دونوں کا ملنا ضروری ہے اگرچہ ایک دفعہ ہی ہو۔ابن حزم فرماتے ہیں حق بات اس کے خلاف ہے دونوں طرح سے حجت قائم ہوتی۔ابن حزم نے توجیہ پیش کی ہے یہ محقق کا کلام ہے واللہ الموفق۔

اور اس تحقیق کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کا پختہ اظہار ابن حجر نے کیا ہے کہ یہ صحیح ہے یہ غیر صحیح ہے اطلاق ہونے پر۔اور پھر فرمایا اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور بزار نے بقیہ کی حدیث مسعودی سے وہ حکم سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں فرمایا:**عن ابن عباس قال بعث رسول الله ﷺ معاذا الى اليمن فامرا ان ياخذ من كل ثلاثين لبقر تبيعا او تبيعة وعن كل اربعين مسنة قالوا فالأوقاص قال اما أمرني رسول الله ﷺ فيها بشي وسأسأله اذا قدمت عليه فلما قدم على رسول الله ﷺ سأله ليس فيها شيء**۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن کی طرف

بھیجا تو اُسے حکم دیا کہ ہر تیس گائے میں ایک تبیع لے اور ہر چالیس میں ایک مسنۃ لے۔ تو انہوں نے پوچھا اوقاص میں کیا حکم ہے تو فرمایا: مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی حکم دیا ہے میں اس کے بارے میں ضرور سوال کروں گا جب جاؤں گا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس میں کچھ بھی زکوۃ نہیں ہے۔

مسعود فرماتے ہیں: اوقاص وہ ہے جو تیس سے چالیس کے درمیان ہے اور چالیس سے ساٹھ کے درمیان ہے۔ اور سند میں ضعف ہے اور متن میں ہے کہ انہوں نے رجوع کیا تھا تو اُسے زندہ پایا یہ معجم طبرانی کے موافق ہے اور اس کی سند میں مجہول ہے اور معجم طبرانی میں ہے دوسری حدیث کہ معاذ فرماتے ہیں: "بعثنی رسول الله ﷺ اصدق اهل اليمن فأمرني ان أخذ من البقر من كل ثلاثين تبيعا ومن كل اربعين مسنة وفي الستين مسنة و تبيعا وأمرني أن لا أخذ فيما بين ذلك شياء الا ان تبلغ مسنة او جذعا۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا عامل بنا کر یمن میں بھیجا اور کہا کہ ہر تیس گائے میں ایک تبیع لوں اور ہر چالیس میں ایک مسنۃ لوں اور ہر ساٹھ میں مسنۃ اور تبیعہ لوں اور مجھے حکم دیا کہ اس کے درمیان کچھ نہ لوں ہاں اگر مسنۃ یا جزعہ ہو یہ مرسل ہے۔

اور یہ اعتراض بھی دیا گیا ہے کہ معاذ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا تھا اور موطا میں طاؤس سے ہے کہ "اَنَّ معاذًا......" اور اس میں ہے کہ معاذ کے آنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے تھے اور طاؤس نے بھی معاذ کو نہ پایا تھا اور مستدرک میں ذکر کیا ہے ابن مسعود سے کہ معاذ بن جبل نوجوان تھے خوبصورت تھے بردبار صحت مند اور اپنی قوم کے سبب سے نوجوان تھے اور کبھی کچھ اپنے پاس نہ رکھا تھا اور ہمیشہ قرض رہے یہاں تک کہ سارا مال غرق ہو گیا تو قرضدار پیچھے پڑ گئے تو کچھ دنوں کے لیے گھر میں چھپ گئے۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ کو بلایا گیا اس کے ساتھ آپ کے قرضدار تھے تو حدیث بیان کی یہاں تک کہ فرمایا: تو پھر اُسے یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا: شاید اللہ تعالیٰ مجھے آسانی دے اور تیرا قرض دور کردے تو حضرت معاذ یمن گئے اور وہیں رہے یہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے۔ پھر معاذ واپس آ گئے۔ یہ حدیث اپنی طوالت کے ساتھ مذکور ہے۔

حاکم فرماتے ہیں: یہ شیخین کی شرائط پر صحیح ہے۔ مسند ابویعلی میں ہے: انه قدم فسجد للنبي ﷺ فقال له النبي يا معاذ ما هذا؟ قال: وجدت اليهود والنصارىٰ باليمن يسجدون لعظما ئهم وقالوا هذه تحية الانبياء۔ فقال عليه الصلاة والسلام۔ وہ آئے تو انہوں نے سجدہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو اُس نے کہا یہود و نصاریٰ کو دیکھا ہے وہ اپنے بڑوں کو سجدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ انبیاء کا سلام ہے۔ تو آپ نے فرمایا: كذبوا على انبياء هم لو كنت آمرا احدا ان يسجد لغير الله لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها۔

انہوں نے انبیاء پر جھوٹ بولا ہے اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو دیتا کہ وہ اپنے مرد کو سجدہ کرے۔ اس حدیث میں ذکر ہے کہ حضرت معاذ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حیات پایا تھا۔ شاید یہ سارا کچھ متعدد واقعات کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

زکوٰۃ میں واجب مقدار وصول کرنی چاہیے

۱۸۰۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ كَمَا نِعِهَا۔

(رواہ ابو داود والترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۴۳/۲ حدیث رقم ۱۵۸۵۔ والترمذی فی السنن ۳۸/۳ حدیث رقم ٦٤٦۔ وابن ماجه ۵۷۸/۱ حدیث رقم ۱۸۰۸۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا زکوٰۃ لینے میں زیادتی کرنے والا یعنی جو مقدار واجب سے زیادہ وصول کرے۔ زکوٰۃ نہ دینے والے کی طرح ہے یعنی جیسے زکوٰۃ نہ دینے والا گناہ گار ہوتا ہے ایسے ہی مقدار واجب سے زیادہ لینے والا بھی گنہگار ہے۔ یہ ابوداوٗد اور ترمذی نے نقل کی ہے۔

تشریح: المعتدی: یعنی عامل حد سے تجاوز کرتا ہو۔

کما نعھا: یعنی گناہ میں اور کہا گیا ہے کہ مالک بھی زیادتی کرتا ہے کچھ مال چھپا کر عامل سے یا کم دکھا کر کہ وہ بالکل چھوڑ دے تو یہ مال روکنے کی مانند ہے گناہ میں اصل کے اندر اور اس میں ہے کہ زیادتی کرنے والا ابن مانع حقیقت ہوتا ہے کہ تشبیہ کیسے صحیح ہوگی اور یہ دفاع ہے کہ یہ دھوکہ کیسا ہے عطا کرنے کی صورت میں بھی اور عرفا اس کا اطلاق نہیں ہے کہ یہ مانع ہے تو اس کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے تاکہ جان لیا جائے کہ قباحت کس چیز پر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیادتی کرنے والا وہ ہے جو غیر مستحق کو دیتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ساعی مراد ہے جب وہ پسندیدہ مال لے کیونکہ مالک بسا اوقات دوسرے سال کے لیے روکے رکھتا ہے تو یہ فقراء پر ظلم ہے تو یہ گناہ میں روکنے کی مانند ہوگا اور یہ کہا گیا ہے کہ جو صدقہ میں حد کو تجاوز کرے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ باقی نہ چھوڑے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو دے اور احسان جتلائے اور تکلیف دے تو دینے کے ساتھ تکلیف دیتا ہے تو روکنے کی مانند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ﴾ [البقرہ:۲۶۳] کہ بات کہے خیر کی اور مغفرت کی صدقہ سے بہتر ہے۔ ''جس کے پیچھے احسان جتلانا ہو۔''

شرح السنۃ میں ہے کہ حدیث کا مطلب ہے کہ صدقہ پر زیادتی کرنے والے پر وہی گناہ ہے جو روکنے والے پر ہے تو مالک کے لیے جائز نہیں ہے کہ مال کو چھپائے اور اگرچہ اس پر زیادتی کرے عامل۔ طیبی فرماتے ہیں: ارادہ کیا ہے کہ مشبہ بہ حدیث میں مطلق نہیں ہے بلکہ مقید ہے قید استمرار کے ساتھ روکنے میں جب قید ختم ہوگئی تو تشبیہ بھی ختم ہوگئی۔

میرک فرماتے ہیں: اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ سارا کچھ سعد بھی سنان کے واسطے سے ہے۔ ترمذی فرماتے ہیں یہ اس طریق سے غریب ہے اور امام احمد نے بھی سعد بن سنان میں کلام کیا ہے۔ یہ کندی بصری ہیں کئی ایک نے اس میں کلام کیا ہے امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس سے کسی اور نے روایت نہیں کی اور یہ ضعیف ہے۔

۱۸۰۲: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ فِیْ حَبٍّ وَّلَا تَمْرٍ صَدَقَةٌ حَتّٰى يَبْلُغَ خَمْسَةَ اَوْسُقٍ۔ (رواہ النسائی)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٦٧٤/٢ حدیث رقم ٩٧٩/٥ والنسائی فی السنن ٤٠/٤ حدیث رقم ٢٤٨٥۔

واحمد فی المسند ۳/۲۰۵۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غلہ اور کھجور میں زکوٰۃ نہیں ہے جب تک وہ پانچ وسق کو نہ پہنچ جائیں۔اس کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ملاحظہ ہو: اس حدیث کی شرح ما قابل میں گزر چکی ہے۔

تخریج و توضیح: امام میرک فرماتے ہیں: بلکہ اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے تو لائق ہے کہ اسے پہلی فصل میں رکھا جاتا۔

زمینی پیداوار میں زکوٰۃ واجب ہے

۱۸۰۳: وَعَنْ مُوسَى بْنِ طَلْحَةَ قَالَ عِنْدَ نَا كِتَابُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّمَا اَمَرَهٗ اَنْ يَّأْخُذَ الصَّدَقَةَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالزَّبِيْبِ وَالتَّمْرِ مُرْسَلٌ۔ (رواه فی شرح السنة)

اخرجه احمد فی المسند ۵/۲۲۸۔ والدارقطنی فی السنن ۲/۹۶ حدیث رقم ۸۔

ترجمہ: حضرت موسیٰ بن طلحہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا خط ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے یہ کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ گیہوں (یعنی گندم) جو اور انگور اور کھجور میں سے زکوٰۃ لیں۔یہ حدیث مرسل ہے اس کو شرح السنۃ میں روایت کیا گیا ہے۔

تشریح: موسیٰ: یہ ابو عیسیٰ ہیں۔

قوله: طلحة: ابن عبداللہ التیمی قرشی عشرۃ مبشرہ میں سے ایک ہیں تابعی ہیں اپنے باپ سے بھی سن رکھا ہے اور صحابہ کی ایک جماعت سے۔

قوله: قال: عند نا كتاب معاذ بن جبل عن النبی ﷺ: بعض نے طیبی کے کلام سے دلیل پکڑتے ہوئے کہا ہے کہ اگر اس قول کا تعلق رسول اللہ سے ہے تو یہ مرسل ہوگئی کیونکہ یہ تابعی ہیں اور یہ قول "عند نا كتاب معاذ بن جبل معترضًا" اس کا کوئی معنی نہ ہوگا۔میں کہتا ہوں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ یہ اس مضمون کے ساتھ اس روایت کے موافق ہے لفظی اور معنوی طور پر اور اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے۔اور فرمایا: اسے اس کتاب کے مصنف کا قول بھی قوی کرتا ہے کہ یہ مرسل ہے اگر اس کا تعلق عندنا کے ساتھ ہو کتاب معاذ حال ہوگا اُس ضمیر سے جو خبر ہے یعنی "أی صادر "عن النبی ﷺ" تو یہ حدیث مرسل نہ ہوگئی بلکہ یہ وجادۃ ہوگئی۔تو اس کے وجادۃ ہونے پر توقف کیا جائے گا اس ثبوت پر کہ کتاب حضرت معاذ کے خط پر ہے اور اس میں روایت بالا جازت کی شرط ہے۔تو اُس وقت یہ مرسل باب سے ہوگئی لیکن اس میں اتصال کا ثبوت رہے گا ربط کے لیے اور یہ ثبوت نسبت کے لیے مفید ہے جملہ میں اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر یہ شرط ہے وجہ کمال پر اتصال کے لیے جیسے صحیحین ہیں اور دوسری کتب ہیں تو یہ وجادۃ ہوگئی تو مرسل نہ ہوگئی۔غور کرو۔

پھر طیبی کو دیکھ کر اُس نے کہا ہے کہ یہ وجادہ کے باب سے ہے کیونکہ یہ دوسری کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔بغیر اجازت اور سماع کے اور قراءت کے تو اس صورت میں یہ مرسل ہونے کے خلاف ہوگئی وجادہ کے صحت کے نہ ہونے کی وجہ سے تو اس پر

وجادۃ کا اطلاق لغوی اعتبار سے ہے اصطلاحی سے نہیں ہے تو کوئی تعارض نہیں ہے واللہ اعلم! ابن ہمام فرماتے ہیں: اور جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ موسیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے ثابت نہیں ہے۔

قوله :انما أمره :یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو۔

ان یاخذ الصدقة من الحنطه والشعیر والزبیب والتمر :ابن ملکؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ زکوٰۃ صرف اس چار میں ہی فرض ہے بلکہ شافعی کے ہاں زمین کی تمام پیداوار میں ہے جب یہ قوت والی ہوں۔ ہمارے ہاں جب جو کچھ زمین اگاتی ہے قوت والی ہوں یا نا ہوں تو حکم صرف انہی چار سے زکوٰۃ لینے کا ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: اگر یہ صحیح نقل ہے تو کوئی کلام نہیں ہے۔ اگر یہ فرض ہے کہ ان چاروں کے علاوہ میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے تو معنی یہ ہے کہ اُسے حکم دیا کہ ان سے عشر وصول کرے ان اجناس سے اس میں غالب طور پر گندم اور جو ہیں۔ کیونکہ یہ کثرت سے موجود ہیں اور اختلاف کیا گیا ہے جو زمین سے نکلتی ہیں کیا اُن میں زکوٰۃ ہے کہ نہیں؟ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تمام میں زکوٰۃ کے قائل ہیں قوت ہوں یا غیر قوت کھجور اور کشمش اغلبیت کے بنا پر ہیں۔

مرسل: میرک فرماتے ہیں: اس میں اتصال کا شائبہ ہے وجادۃ کے طریقے پر اگر یہ کتاب حضرت معاذ کے خط کے ساتھ محفوظ ہے تو قوله اسی معنی میں خبر صحیح ہے کہ صدقہ نہ لیا جائے گا مگر صرف ان چاروں سے جو کھجور، کشمش، گندم سے ان میں حصر اضافی ہے حاکم کی حدیث کی وجہ سے اور اسے صحیح قرار دیا ہے: فیما سقت السماء والسیل والبعل العشر' وفیما سقی بالنضح نصف العشر۔ اور ابن حجر کا قول ککڑی، خربوزہ، اور نار کے لیے وغیرہ یہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر کیا ہے تو یہ دلیل، برھان، توضیح اور بیان کی طرف محتاج ہیں۔

انگوروں کی زکوٰۃ کا بیان

۱۸۰۴: وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ اُسَیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ زَكَاةِ الْكُرُوْمِ اَنَّهَا تُخْرَصُ كَمَا تُخْرَصُ النَّخْلُ ثُمَّ تُؤَدّٰی زَكٰوتُهٗ زَبِیْبًا كَمَا تُؤَدّٰی زَكَاةُ النَّخْلِ تَمْرًا۔ (رواه الترمذی وابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲/ ۲۵۷۔ والترمذی فی السنن ۳/ ۳٦ حدیث رقم ٦٤٤۔ والنسائی فی السنن ۵/ ۱۰۹ حدیث رقم ۲٦۱۸۔ وابن ماجه ۱/ ۵۸۲ حدیث رقم ۱۸۱۹۔

ترجمہ: حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوروں کی زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد فرمایا: انگوروں کا اندازہ کیا جائے گا جیسا کہ کھجوروں کا اندازہ کیا جاتا ہے پھر ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے اس حال میں کہ انگور خشک ہوں جیسے کہ کھجوروں کی زکوٰۃ دی جاتی ہے اس حال میں کہ کھجوریں خشک ہوں۔ یہ ترمذی اور ابوداؤدؒ نے روایت کی ہے۔

تشریح: عتاب: عین کے فتحہ کے ساتھ اور فوقیہ کی تشدید کے ساتھ۔

اسید: ہمزہ کے فتحہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامل بنایا تھا مکہ پر اور ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی یہ ابوبکر کی وفات تک ان کے ساتھ رہے یہ قریش کے سرداروں میں سے تھے اور یہ معنی

ہے اُس آیت کا کہ: ﴿وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا﴾ [النساء: ۷۵] ''اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما''۔

الکروم : یعنی اُس کی زکوٰۃ کی کیفیت میں اور یہ دوضموں کے ساتھ ہے جمع ہے کرم کی۔ یہ انگور کا درخت ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: عنب کا نام کرم ہونے میں کوئی منافی نہیں ہے کیونکہ شیخین کی خبر ہے: **لا تسموا العنب كرما فان الكرم هو المسلم**۔ کہ عنب کا نام کرم نہ رکھو کیونکہ کرم مسلم ہوتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ کرم مؤمن کا دل ہوتا ہے۔ اور یہ نہی تنزیہی ہے۔ اور یہ نام راوی کی طرف سے ہے۔ شاید نہی اُس تک نہ پہنچی ہو۔ علماء فرماتے ہیں: عرب عنب کا نام کرم اس لیے رکھتے ہیں کیونکہ اس میں آسانی، نرمی اور کثرت منفعت ہے کیونکہ یہ پھل بھی ہے اور قوت والا بھی ہے۔ اس سے سرکہ بنایا جاتا ہے۔ اور اس کی طرف نفس شوق کرتا ہے اور کرم کا نام مومن کے ساتھ ہے اور اس کے دل کے ساتھ لائق اور مناسب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے نہی کا مقصد وہ دو احتمالوں کا گمان ہے جو راوی کا قول ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے خلاف ہے کہ یہ کروم کے بارے میں ہے۔

تخرص یعنی اندازہ کیا گیا ہے اور تخمینہ لگایا گیا ہے۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی متابعت کی ہے ابن ملک نے کہ جب یہ انگور اور کھجور میں ہو کہ جب یہ انگور زبیب بن جائیں تو پھر اس میں زکوٰۃ کی حد ہوگی اور نصاب ہوگا۔

تخریج و اسنادی حیثیت: امام میرکؒ فرماتے ہیں: نسائی اور ابن ماجہ نے بھی تمام سعید بن مسیب کے واسطے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ معاذ سے ابوداؤد فرماتے ہیں: یہ تو معاذ نے سنا ہے اور نہ ہی سماع کیا ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: اس حدیث کو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے اور اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور ابن ماجہ نے لیکن نووی نے بیان کیا ہے اپنے مجموعہ میں کہ ابن مسیّب کے مراسیل میں سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ حدیث مرسل اور صحیح ہو لیکن اختلاف تو دلیل لینے میں ہے۔ اگر صحیح اور حسن ہو۔ جمہور مرسل کو حجت مانتے ہیں اور شافعی حجت نہیں بناتے مگر جب وہ بہت قوی ہو۔

پھر امام نوویؒ فرماتے ہیں اور صحیح ترین بات یہ ہے کہ اُس وقت شمار کی جائے گی جب یہ اس کی دیگر احادیث سے تقویت ملے گی۔ یا بعض صحابہ کے اقوال کے ساتھ یا اکثر علماء کے اقوال کے ساتھ یہ چیزیں یہاں موجود ہیں پھر فرمایا: جس کا حاصل کلام یہ ہے کہ کھجور کو اصل بنانے میں حکمت یہ ہے کہ مقیس علیہ بنانا ہے۔ کیونکہ خیبر پہلی مرتبہ سن سات ہجری میں فتح ہوا تھا اور اُس میں کھجوریں تھیں اور ان کی طرف رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن رواحۃ کو بھیجا تھا تو انہوں نے پیوند کی تو جب طائف فتح ہوا تو اُن کے ساتھ بہت سارے انگور تھے تو انہیں بھی کھجوروں کی طرح خرص کا حکم دیا گیا۔ اسے صاحب بیان نے ذکر کیا ہے یہ سب سے اَحسن ہے یا ان کے پاس کھجوریں جو سب سے زیادہ ہیں یا سب سے مشہور ہیں۔

کھجور اور انگور کا اندازہ لگا کر زکوٰۃ دینا جائز ہے

۱۸۰۵: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ حَدَّثَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوْا وَدَعُوا الثُّلُثَ فَاِنْ لَّمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ فَدَعُوا الرُّبُعَ۔ (روہ الترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/ ۲۵۸ حدیث رقم ۱۶۰۵۔ والترمذی ۳/ ۳۵ حدیث رقم ۶۴۳۔ والنسائی ۵/ ۴۲ حدیث رقم ۲۴۹۱۔ والدارمی ۲/ ۳۵۱ حدیث رقم ۳۶۱۹ واحمد فی المسند ۳/ ۴۴۸۔

ترجمہ: حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جس وقت کھجور اور انگور کا اندازہ کرو تو دو تہائی اندازے سے لے لو اور دو تہائی کی بقدر چھوڑ دو۔ اگر دو تہائی نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھائی چھوڑ دو۔ یہ ترمذی' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

تشریح: حاء مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے سکون مثلثہ کے ساتھ ہے۔

قولہ: فخذوا یعنی مخروص کی زکوٰۃ اگر وہ مخروص آفات سے سالم رہیں۔

الثلث: لام کے ضمہ کے ساتھ اور سکون کے ساتھ۔

طیبی فرماتے ہیں: فخذوا جواب ہے شرط کا۔ اور دعویٰ اس پر عطف ہے۔ یعنی تم جب تخمینہ لگاؤ تو زکوٰۃ کی مقدار بیان کرو۔ یہاں تک کہ وہ صدقہ کریں۔ مصابیح میں ہے کہ مخذوا حذف ہے اور جعل کی فدعوا کے لیے جواب بنایا گیا ہے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خطاب مصدقین کے ساتھ ہے اُنہیں حکم دیا ہے کہ مالک کے لیے ثلث یا ربع چھوڑ دیں یہاں تک کہ اُس کا صدقہ کریں یا اُس کے ہمسائیوں پر ہے یہ قول قدیم ہے۔ شافعی کے لیے ہے اور عام اہلحدیث کے ہاں اور اصحاب رائے کے ہاں خرص کے ساتھ کوئی عبرت نہیں ہے کیونکہ یہ سود کی طرف بڑھاتی ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ سود کی حرمت سے قبل کی احادیث ہیں اس کو عتاب کی حدیث رد کرتی ہے جو کہ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے اور سود کی حرمت اس سے قبل تھی اور حدیث جابرؓ بھی اس بات میں واضح ہے کہ سود کی حرمت حجۃ الوداع میں تھی۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اس کے ساتھ ہی شافعی نے دلیل پکڑی ہے قدیم قول کے مطابق اسے جماعت علماء نے اختیار کیا ہے کہا گیا ہے کہ عامل چھوڑ دے کھجوروں کو اُس کے اہل والے کے لیے تاکہ وہ کھائیں پھر اس سے رجوع کریں۔ کہ کہ منہ چھوڑا جائے۔ اور حدیث کا جواب یہ دیا کہ اس سے مراد ہے کہ اُسے اپنے اقارب کے لیے تقسیم کر دے اور ہمسائیوں پر تاکہ وہ کھائیں۔

قولہ: فان لم تدعوا۔

الثلث فدعوا الربع: ابن ملک فرماتے ہیں: اسی کے ساتھ شافعی نے قول قدیم میں کہا ہے اور ابوحنیفہؒ نے اور شافعیؒ نے قول جدید میں مالک زکاۃ میں کچھ نہیں چھوڑنے کے قائل ہیں۔ اور حدیث کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ خیبر کے یہود کے بارے میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا تھا کہ اُن کے لیے نصف پھل ہوگا اور نصف رسول اللہ کے لیے نصف ہوگا تو خارص کو حکم دیا کہ وہ ثلث یا ربع مسلمانوں کے لیے چھوڑ دے اور باقی نصف تقسیم کر دیا جائے۔ قولہ میرک فرماتے ہیں: اس سے منذری خاموش

ہیں اس کی اسناد صحیح ہیں اس کے رجال ثقات ہیں قولہ میرکؒ فرماتے ہیں: اور ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں اور حاکم نے اور کہا صحیح سند والی ہے۔

حدیثِ پاک سے کھجوروں کے اندازہ کرنے کا ثبوت

۱۸۰۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْعَثُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ رَوَاحَةَ اِلٰى يَهُوْدَ فَيَخْرُصُ النَّخْلَ حِيْنَ تَطِيْبُ قَبْلَ اَنْ يُؤْكَلَ مِنْهُ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۶۰/۲ حدیث رقم ۱۶۰۶۔ وابن ماجه ۵۸۲/۱ حدیث رقم ۱۸۲۰۔ ومالك فی فی الموطأ ۷۰۳/۲ حدیث رقم ۱ من کتاب المساقاة واحمد فی المسند ۲۴/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کی طرف بھیجتے پس وہ کھجوروں میں مٹھاس پیدا ہونے اور کھانے کے لائق ہونے سے قبل سے پہلے کھجوروں کا اندازہ کرتے تھے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔ (رواہ ابوداؤد)

تشریح: فیخرص: راء کے ضمہ کے ساتھ۔

یطیب: تذکیر و تانیث کے ساتھ۔

قبل اُن یوکل منه: طیبی فرماتے ہیں: دوسری روایت میں ہے کہ ابوداؤد میں کہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن رواحۃ کو بھیجتے تھے وہ خود خرص کرتے تھے جب پھل پکنا شروع ہو جاتا کھانے سے قبل پھر یہود کو اختیار دیتے تھے کہ وہ بھی لے لیں۔ یا پھر زکوۃ کے لیے دے دیں۔ یہ مسلمانوں کے مالوں کی زکوۃ ہوتی تھی جو یہودیوں کے ہاتھوں میں تھیں وہ اس میں اجرت پر کام کرتے تھے۔ یہ اُس کے خلاف دلیل ہے کہ کافر کے پاس جو مسلمانوں کا مال ہے اُس میں زکوۃ نہیں ہے تو اس میں ذکر ہے کہ وہ اُس میں خرص کرتے تھے۔ اور وہ اُن کا حصہ متعین کرنے کے لیے کرتے تھے۔ قولہ یعنی کتاب الزکوۃ میں اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے لیکن اسے کتاب البیوع میں ذکر کیا ہے۔ اس کا شاہد حدیث جابر میں ہے اس کے رجال ثقات ہیں اور جو ابن حجر کا قول ہے کہ اس کی سند حسن ہے یہ غیر صحیح ہے مگر حسن لغیرہ ضرور ہے۔

شہد کی زکوۃ مختلف فیہ مسئلہ ہے

۱۸۰۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْعَسَلِ فِيْ كُلِّ عَشَرَةِ اَزُقٍّ زِقٌّ ۔

(رواه الترمذی وقال فی اسناده مقال ولا یصح عن النبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فی هذا الباب کثیر شیء)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۴/۳ حدیث رقم ۶۲۹۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کی زکوۃ کے بارے میں بیان فرمایا کہ شہد کی دس (۱۰) مشکوں میں سے ایک مشک بطور زکوۃ دینی ہوگی۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور فرمایا کہ اس کی اسناد میں کلام ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب کے بارے میں زیادہ روایات نہیں ملتیں اور نہ ہی وہ درست ہیں۔

تشریح: وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ فی العسل فی کل عشرة أزق: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور راء کے ضمہ کے ساتھ اور قاف کی تشدید کے ساتھ اُفعل جمع قلت ہے۔

زق : زاء کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ اُس چمڑے کی ظرف ہے جس میں کچھ گھی اور شہد ہوتا ہے اور اس میں دلیل ہے کہ شہد میں بھی عشر ہے ابوحنیفہ اور شافعی نے قدیم قول اور احمد نے جدید قول میں کہا ہے اور جدید میں اس کی نفی کی ہے اسی پر مالک ہیں۔ ابن ملک نے ذکر کیا ہے۔

قال : یعنی ترمذی نے۔

قوله فی اسناده مقال : یعنی قول کا محل ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ محدثین کے قول کی جگہ ہے۔ یعنی انہوں نے اس میں کلام کیا ہے اور طعن کیا ہے۔

ولا یصح عن النبی ﷺ فی هذا الباب: یعنی شہد کے باب میں۔

کثیر شیٔ : طیبی فرماتے ہیں: یعنی جس پر وہ لوٹتا ہے۔ ابن ہمام ان ساری احادیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ شہد میں عشر ہے اور ان جیسی احادیث میں سے ایک حدیث جس کو ابن ماجہ نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے شہد کا عشر لیا تھا اور عام الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ شہد سے عشر لیا کرتے تھے اور کوئی دلیل نہ ہے۔ اس کے نصاب کے معتبر ہونے میں اور قریب کی حدیث میں کہ اُن کے برتن قریب ہوتے تھے۔ یا پھر اگر وہ قریب سے کم ہو تو اس کے بارے میں کوئی دلیل نہ ہے۔ اور ترمذی کی حدیث خلاف ہے۔

عورتوں کو زیورات سے زکوۃ نکالنے کا حکم

۱۸۰۸: وَعَنْ زَيْنَبَ اِمْرَأَةِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَتْ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ فَاِنَّكُنَّ اَكْثَرُ اَهْلِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۸/۳۔ حدیث رقم ۱٤٦٦۔ والترمذی فی السنن ۲۸/۳ حدیث رقم ٦۳۵۔ والنسائی ۹۲/۵ حدیث رقم ۲۵۸۳۔ والدارمی ٤۷۷/۱ حدیث رقم ۱٦۵٤۔ واخرجه احمد المسند ۵۰۲/۳۔

ترجمہ: حضرت زینب رضی اللہ عنہا جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا اے عورتو! مال کی زکوۃ نکالو اگرچہ وہ اپنے زیور سے ہو۔ اس لیے کہ قیامت کے دن تم میں سے اکثر دوزخ میں جاؤ گی۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: فقال یا معشر النساء تصدقن : یعنی زکوۃ دیا کرو اپنے مالوں سے۔

ولو من حلیکن : حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور کسرہ کے ساتھ اور (یاء) تحتیہ کے تشدید کے ساتھ اس کی واحد حلی ہے فتحہ کے ساتھ۔ اس حدیث کا ظاہر زیور میں زکاۃ پر دلالت کرتا ہے اسی لیے آنے والی حدیث میں اس کی زکاۃ کا کہا گیا ہے۔ ابن حجر کا قول کہ حدیث میں اس بات کہ زکاۃ واجب ہے کی تصریح نہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ یہی قول امام ابوحنیفہ نے کہا ہے اور امام

شافعی کا بھی قدم قوم یہی ہے اور احمد فرماتے ہیں: زیور میں زکاۃ نہیں ہے۔ یہ شافعی کا جدید قول ہے۔

قوله :فانكن اكثر اهل جهنم يوم القيامة :یعنی دنیا کی محبت کی وجہ سے جو کہ زکوٰۃ کے ترک کا سبب ہے اور صدقہ جو آخرت کے لیے ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: اس کے رجال ثقہ ہیں۔

زیورات میں زکوٰۃ دینے کا حکم

۱۸۰۹: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَاَتَيْنِ اَتَتَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ اَيْدِيْهِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَقَالَ لَهُمَا تُؤَدِّيَانِ زَكَاتَهٗ قَالَتَا لَا فَقَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتُحِبَّانِ اَنْ يُّسَوِّرَكُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَّارٍ قَالَتَا لَا قَالَ فَاَدِّيَا زَكَاتَهٗ رواه الترمذی وقال هذا حديث قد روى المثنى بن الصباح عن عمرو بن شعيب نحو هذا والمثنى بن الصباح وابن لهيعة يضعفان فى الحديث ولا يصح فى هذا الباب عن النبى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شیء۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۱۲/۲ حدیث رقم ۱۵۶۳۔ والترمذی ۲۹/۳ حدیث رقم ۶۳۷ والنسائی فی السنن ۳۸/۵ حدیث رقم ۲۴۷۹۔ واخرجه احمد فی المسند ۱۷۸/۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو عورتیں آئیں اور ان کے ہاتھوں میں سونے کے دو کڑے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو کہا کیا تم ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ دونوں نے کہا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو کہا۔ کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے دو کڑے پہنائے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کی (یعنی سونے کی) زکوٰۃ دو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث مثنی بن صباح کی روایت ہے۔ جو انہوں نے عمرو بن شعیب سے اس طرح روایت کی ہے اور مثنی بن صباح اور لہیعہ وہ بھی اس حدیث کا راوی ہے حدیث کی روایات میں یہ دونوں ضعیف شمار ہوتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں درست روایات مروی نہیں ہیں۔

تشریح: سواران۔ امام طیبی فرماتے ہیں ظاہراً یہ اسورۃ ید کی جمع ہے معنی یہ ہے کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کنگن تھا۔

زکاتہ: امام طیبی فرماتے ہیں: اس میں ضمیر اسم اشارہ کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: لا فارض ولا بكر عوان بين ذلك۔

قالتا..... فاديا زكاته ابن ملک فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے کہ زکاۃ زیور پر بھی فرض ہے۔

اشرف فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صدقہ سے مراد نفلی صدقہ یا زکوٰۃ سے مراد اعارہ ہے۔ یہ تو بہت دور کی وعید ہے اور نفلی کو چھوڑتے ہیں اور ادھار والے کو کوئی وعید نہ ہے باوجود اس کے کہ زکاۃ کا اطلاق عاریۃً والے پر نہیں ہوسکتا نہ ہی حقیقی اور نہ ہی مجازی طور پر۔ فرمایا: یا شاید اس کے کہ وہ بہت زیادہ خرچ کرنے والی تیں یا سونا یا چاندی لیتی تھی تو

اُس میں زکاۃ فرض تھی۔ یہ پہلے قول سے بہت بعید ہے۔

طیبی فرماتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ صدقہ سے مراد نفلی صدقہ ہو۔ اس پر عید والی حدیث دلالت کرتی ہے کیونکہ انہوں نے ربع العشر زیور سے نہیں نکالا تھا بلکہ وہ تو سارا زیور بلال کی طرف پھینکنے لگی تھیں۔ اور یہ کہ یہ صدقہ فرض صدقہ کے منافی نہیں ہے۔ چاہے برابر ہو فرض کے یا زائد ہو۔ اگر تسلیم کر لیا جائے تو ''لو'' مبالغہ کے لیے ہے کہ: **تصدقن من کل ما یجب فیه الصدقة، حتی مما یجب فیه من الحلی**......... **فانکن اکثر اهل النار**۔ ہر فرض چیز سے صدقہ کیا کرو یہاں تک کہ زیورات سے بھی اس کی علت بیان کی کہ تم اکثر اہل جہنم ہو۔ اس کے مثل کے بعد یہ مخفی نہیں رہتا کہ کلام شارع مبالغہ پر محمل ہے حقیقت پر نہیں اور ظاہر یہ ہے کہ ''لو'' اس قول کی طرح ہے ''**اتقوا النار ولو بشق تمرة**'' کہ اس سے حسب طاقت بچو اگرچہ کم از کم کھجور کے ساتھ۔ یا اس سے زیادہ کے ساتھ اور اس کی تائید اس تعلیل سے ہوتی ہے کہ تمہاری اکثریت اہل جہنم میں سے ہے۔ تو طیبی کی علت کا ضعف اب مخفی نہ ہے۔

المثنی بن الصباح عن عمرو بن شعیب نحو هذا: طیبی فرماتے ہیں: اسم اشارہ کو ضمیر کی جگہ لایا گیا ہے اور بنحو هذا سے معنی مراد ہے۔

والمثنی بن صباح وابن لهیمة: دونوں حدیث میں ضعیف ہیں۔ میرک فرماتے ہیں ترمذی نے اپنی جامع میں یہ حدیث ذکر کی ہے پہلی مرتبہ **قتیبه عن ابن لهیعة عن عمر بن شعیب عن أبیه عن جده** کے واسطے سے۔ پھر فرماتے ہیں اسے روایت کیا ہے مثنی بن جناح نے عمرو بن شعیب سے آخر تک۔ اس وجہ سے ابن لہیعۃ کی ذکر کی تقریب اس کی تضعیف بھی واضح ہو جاتی ہے اور اُس کی تضعیف اجمالی اور اغلاق صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے۔

ولا یصح فی هذا الباب عن النبی ﷺ شئ۔

ابن ملقن فرماتے ہیں: بلکہ اسے ابوداؤد نے بھی اپنی سنن میں سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اس کو میرک نے بیان کیا ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں: صاحب ہدایہ کے قول میں کہ دونوں زیوروں سونے اور چاندی میں زکاۃ فرض ہے مباح ہوں یا نا ہو یہاں تک کہ سونے کی انگوٹھی اور تلوار کی گرفت اور مصحف اور جس پر بھی اسم منقولات کا اطلاق عموم یا خصوص سے ہوتا ہے اور جس کی صراحت کی گئی ہے اور ان میں سے حدیث علی رضی اللہ عنہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **هاتوا صدقة الرقة من کل اربعین درهما درهم**۔ چاندی کا صدقہ ہر چالیس درہم سے ایک درہم لاؤ۔ اسے (صحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی اور کئی ایک نے۔ اور جس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے: **إن امرأة أتت النبی ﷺ و معها ابنة لها و فی ید بنتها مسکتان غلیظتان من ذهب، فقال لها أتعطین زکاة هذا؟ قالت لا قال أیسرك أن یسورك الله بهما یوم القیامة سوارین من نار قال فخلعتهما فالقتهما إلی النبی ﷺ فقالت هما لله ولرسوله**۔ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور اُس کے ساتھ اُس کی بیٹی تھی اور اُس کے ہاتھ میں دو موٹے کنگن تھے سونے کے تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس کی زکاۃ دیتی ہو؟ اس نے کہا نہیں فرمایا: کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ تمہیں اللہ قیامت کے روز اس کے بدلے میں سونے کے کنگن پہنائے۔ تو اُس نے وہ دونوں کنگن اتار پھینکے اور رسول اللہ ﷺ کو دیئے اور کہا یہ دونوں اللہ اور اُس کے رسول کے لیے

ہیں۔ابوحسن قطان اپنی کتاب میں کہتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔

منذر رنے اپنی مختصر میں کہا ہے کہ اس کی سند میں کوئی کلام نہیں پھر انہوں نے سند کے ہر ایک راوی کو ذکر کیا اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے "أتت امراتان" اور یہ قول کہ اس باب میں کچھ بھی صحیح نہ ہے یہ مؤول ہے یا پھر یہ غلطی ہے۔منذری کہتے ہیں شاید ترمذی نے دو طریق کا ارادہ کیا ہو وگرنہ ابوداؤد والا طریق میں مقال نہ ہے۔ابن مطان اس کی تصحیح کے بعد فرماتے ہیں کہ اسے ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اُس کے ہاں دو راوی ابن لہیعۃ اور ابن صباح ضعیف ہیں۔

اور ایک روایت جسے ابوداؤد نے عبداللہ بن شداد سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے وہ فرماتی ہیں کہ: **قالت دخلا علی رسول اللہ ﷺ فرأی فی یدی فتخات ورق فقال ما هذا یا عائشه، فقلت صنعتهن أتزین لك بهن یا رسول الله قال أتودین زکاتهن؟ فقلت لا قال هن حسبك من النار** ۔مجھ پر رسول اللہ ﷺ داخل ہوئے تو میرے ہاتھ میں کچھ چاندی کی انگوٹیاں دیکھی پوچھا اے عائشہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا میں نے خوبصورتی کے لیے بنوائی ہیں یارسول اللہ! تو آپ نے فرمایا کیا اس کی زکاۃ دیتی ہو؟ میں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا: تجھے جہنم کے لیے کافی ہیں۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔اور اس کو صحیح کہا ہے اور ایک روایت جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جیسا کہ آگے آئے گی۔پھر فرمایا کہ مقصود تھا کافی ساری مرفوع احادیث وگرنہ اور بھی کافی آثار ہیں جن کی صحت میں شک نہ ہے اور مخالفین کی تاویلات میں جن سے نقش میں کچھ پیدا ہوتا ہے اور کچھ الفاظ ان کو رد کر دیتے ہیں۔یہ محقق کے کلام کا خلاصہ تھا۔

اور اُن تمام تاویلات میں سے جسے ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ زیور اول اسلام میں حرام تھا تو اس کی حرمت کی وجہ سے اس کی زکوۃ واجب ہوئی۔پھر اس کی حلت نازل ہوگئی تو زکاۃ زائل ہوگئی۔

سونے چاندی کے زیورات میں زکوۃ دینے کی تاکید

۱۸۱۰: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كُنْتُ أَلْبَسُ اَوْ ضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَكَنْزٌ هُوَ فَقَالَ مَا بَلَغَ اَنْ تُؤَدِّىَ زَكَاتَهٗ فَزُكِّيَ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ (رواه مالك وابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۱۲/۲ حدیث رقم ۱۵۶۴۔ ومالك فی الموطأ ۲۴۸/۱ حدیث رقم ۸ من کتاب الزکاۃ۔ والدار قطنی ۱۰۵:۲ حدیث رقم ۱ من باب من ادی زکاته فلیس بکنز۔

ترجمہ: حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں سونے کی ایک وضح پہنتی تھی۔جو ایک زیور کا نام ہے۔پس میں نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا یہ خزانہ ہے؟ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اس مقدار کو پہنچے کہ اس میں زکوۃ دی گئی ہو۔ یعنی حد نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی زکوۃ ادا کر دی گئی ہو پس وہ گنج (خزانہ) نہیں ہے اس کو امام ابوداؤد اور امام مالک نے روایت کیا ہے۔

تشریح: أوضاحًا:: نہایۃ میں ہے کہ یہ وضح کی جمع ہے دو فتحوں کے ساتھ یہ زیور کی قسم ہے یہ چاندی سے تیار ہوتی ہے اس کی چمک کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔

اکنز هو؟ یعنی زیور کا استعمال کرنا بھی کنز ہے کنوز میں سے جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے یا نہیں؟

فقال مابلغ: یعنی جو کچھ پہنچا۔

أن تودی زکاۃ: یعنی نصاب کے مطابق۔

فزکی: صیغہ مجہول کے ساتھ۔

میرک فرماتے ہیں: اس کی سند جید ہے۔ شیخ جزری نے فرمایا ہے۔ اور ابن عربی نے فرمایا ہے اس کی رجال بخاری کے رجال ہیں۔ میں کہتا ہوں اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور ابن قطان نے صحیح قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث صحیح ہے اور مقصد میں صریح ہے۔ واللہ الموفق۔

سامانِ تجارت میں زکوۃ کا حکم

۱۸۱۱: وَعَنْ سَمُرَةَ بِنِ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْمُرُنَا اَنْ نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِیْ نُعِدُّ لِلْبَيْعِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲/ ۲۱۱ حدیث رقم ۱۵٦۲۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم کیا کرتے تھے کہ ہم اس چیز کی زکوۃ نکالیں جس کو ہم نے بیچنے کا ارادہ کیا ہو۔ یعنی (مالِ تجارت) وغیرہ۔ اس کو ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: تجارت کے مال کو خاص اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ اغلب ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ جس میں قنیہ (محنت مزدوری) کا ارادہ ہو اُس میں زکوۃ نہ ہے۔ قولہ ابن ہمام فرماتے ہیں: کہ وہ اور منذری اس سے خاموش ہیں یہ ان کی طرف سے اس حدیث کی تحسین ہے۔ ابن عبدالبر نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند حسن ہے اور اس میں ظاہری دلالت ہے کہ مال تجارت میں بھی زکوۃ ہے۔ اس پر حاکم کی ایک اور صحیح خبر دلالت کرتی ہے جو کہ شیخین کے طریق پر ہے ابوذر سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فی الابل صدقتها و فی البقر صدقتها، وفی الغنم صدقتها و فی البز صدقته البز امتعة البزاء والسلاح ولیس فیه زکاة عین فصدقته زکاة التجارة۔ اونٹوں میں بھی صدقہ ہے گائیوں میں بھی اور بکریوں میں بھی اور اسلحہ میں بھی صدقہ ہے اور اسلحہ کا روک رکھنا ہے۔ اس میں زکاۃ نہ ہے بلکہ تجارت کا صدقہ ہی ہے اور حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ ادم کو بیچنے کا کہ اس کی زکاۃ دی جا سکے اُن کے بیٹے سے صحیح روایت ہے کہ: لیس فی العروض زکاة إلا ما کان للتجارة۔ عروض میں زکوۃ نہیں مگر وہ جو تجارت کے لیے ہوں اور زکاۃ نہ دینے کی دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف ہے۔ اور وہ روایت جس میں ہے لا زکاة فیها جو کہ ابن عباس سے مروی ہے ضعیف ہے۔

کانوں کی پیداوار پر نصاب

۱۸۱۲: وَعَنْ رَبِیْعَةَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ غَیْرِ وَاحِدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ

لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِيِّ مَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةِ وَهِيَ مِنْ نَاحِيَةِ الْفُرْعِ فَتِلْكَ الْمَعَادِنُ لَا تُؤْخَذُ مِنْهَا اِلَّا الزَّكَاةَ اِلَى الْيَوْمِ۔

اخرجه ابو داؤد في السنن ۳/ ٤٤٣ حديث رقم ٣٠٦١۔

ترجمہ: حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰنؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث مزنیؓ کو قبلیہ کی کانیں بطور جاگیر دے دی تھیں اور یہ قبلیہ فرع کی جانب ہے پس ان کانوں سے زکوۃ کے علاوہ آج تک کچھ نہیں لیا جاتا۔ اس کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: لقبلية : قاف کی فتحہ کے ساتھ اور باء مجرورہ کے ساتھ اضافت کے ساتھ یہ ایک جگہ کا نام ہے اُس کی طرف منسوب ہے۔ نووی فرماتے ہیں: اصحاب الحدیث سے نزدیک قاف اور باء کے فتحہ کے ساتھ تو محفوظ ہے۔ شاید قاف کا کسرہ اور باء کا سکون غیر محفوظ ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: اقطاع یہ ہے کہ امام بعض چیزوں کے لیے اجتہاد اور متنذ قدیا زمین کے کسی حصہ میں چوتھائی پر مقرر کرے۔ نہایہ میں ہے کہ اقطاع بطور ملکیت کے بھی ہوگا ہے اور بغیر ملکیت کے بھی اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ انہوں نے ایک زمین کا مطالبہ کیا تھا منفرد اپنے لیے۔ ابن ملک فرماتے ہیں: اس کو وہ زمین دیں تاکہ وہ اُس میں کام کر سکے اور سونا اور چاندی اپنے لیے حاصل کر سکے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ معاون بطور اقطاع کے دیئے جا سکتے ہیں۔ شاید یہ یہ معارن زین کے اندر چھپے ہوئے تھے اور اگر زمین اوپر معاون' اہر ہوں تو ان کا اقطاع جائز نہیں۔

الفرع : فاء کے ضمہ کے ساتھ اور راء کے سکون کے ساتھ اور عین کے ساتھ۔ اس کے خلاف ہے جس نے اس میں وہم کیا ہے۔ یہ بھی ایک وسیع جگہ ہے مدینہ اور اس کے درمیان پانچ روز کا فاصلہ ہے یا کم ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مساجد ہیں اور کافی گاؤں ہیں یہ مدینہ کا اعلیٰ حصہ ہے حرمین سے درب الماشی تک۔ ابن ملک اور ان کے علاوہ نے اسے ایسے ہی ذکر کیا ہے۔

فتلك المعادن لا یوخذ : تذکیر اور تانیث کے ساتھ ہے۔

امام مظہر فرماتے ہیں: یعنی عشر کا ربع جیسے نقدی کی زکاۃ ہے اور یہ مالک کا مذہب ہے اور شافعی کا ایک قول ہے اور جو ابو حنیفہ کا قول ہے اور شافعی کا یہ معدن میں خمس واجب کرتے ہیں اور شافعی کا تیسرا قول کہ اگر محنت و مشقت سے ملا ہے تو ربع عشر ہے وگرنہ خمس ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں: اسے مالک نے موطا میں بھی ذکر کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ موطا میں منقطع ہے اور ابوعبید نے کتاب الاموال میں فرمایا ہے۔

الفصل الثالث:

عاریت کی چیزوں اور سبزیوں میں زکوۃ نہیں ہے

۱۸۱۳: عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ فِي الْخَضْرَ اوَاتِ صَدَقَةٌ وَلَا فِي الْعَرَايَا

صَدَقَةٌ وَلَا فِيْ اَقَلَّ مِنْ خَمْسَةِ اَوْ سُقٍ صَدَقَةٌ وَّلَا فِي الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ وَّلَا فِي الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ قَالَ الصَّقْرُ الْجَبْهَةُ الْخَيْلُ وَالْبِغَالُ وَ الْعَبِيْدُ ۔ (رواهما الدارقطني)

اخرجه الدارقطني في السنن ۲/ ۹۴ حديث رقم ۱ من باب ليس في الخضراوات صدقة۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ترکاریوں (سبزیوں) میں اور عاریت کے درختوں میں زکوٰۃ نہیں ہے اور پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور کام کرنے والے جانوروں میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے اور جبہہ میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ صقر راوی نے کہا ہے کہ جبہہ سے مراد گھوڑا انچر اور غلام مراد ہے اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قولہ :قال ليس في الخضراوات صدقة:

الخضراوات : خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں: ریاحین اور اوراد کی طرح ہے۔ بقول اور خیار اور ککڑی، تربوز، بینگن اور دوسری چیزیں مراد ہیں۔

کیونکہ یہ ترکاری نہ ہیں۔ زکاۃ قوت کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ گزر گیا ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ قوت وہ ہے جس کے ساتھ انسان کا جسم قائم رہے۔ کیونکہ اقتیات ضروریات زندگی میں سے ہے جن کے بغیر زندگی ناممکن ہے اور تو اس میں رب اور باب کا حق بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

قولہ :ولا في العرايا صدقة:

العرايا: یہ عرية کی جمع ہے۔ فعيلة فاعلة کے معنی میں ہے یا مفعولة کے معنی میں ہے یہ وہ کھجور ہوتی ہے جو مالک کسی دوسرے کو پھل کھانے کے لیے عطا کر دیتا ہے ایک سال کے لیے یا اس سے زیادہ۔ قاموس میں ہے اس نے کھجور کو ہبہ کیا'' کہ اُس کا پھل ایک سال کے لیے ہبہ کر دیا۔ معراۃ کھجور کھجور کی فروخت کے وقت اس پھل سے مستثناء ہوتی ہے۔

صدقة کیونکہ یہ غالب طور پر نصاب کے بغیر ہوتی ہے یا اس لیے کہ یہ مالک کے نصاب سے نکل جاتی ہے وجوب سے قبل طریق صحیحہ کے ساتھ۔

قولہ :ولا في أقل من خمسة أوسق صدقة : جیسا کہ گزر چکا ہے کہ یہ بہت تھوڑا ہوتا ہے تو فقراء کے درمیان تقسیم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

قولہ :ولا في : گائے یا اونٹ میں۔

العوامل : مالک کے علاوہ۔

صدقة : کیونکہ یہ عمل کرنے سے غیر کفایت مشدہ ہو جاتا ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

ولا في الجبهة صدقة قال: ابوسعید نے

الصقر الجبهة الخيل والبغال والعبيد: اور جو قاموس میں ہے وہ ہے کہ یہ گھوڑا ہے۔ فائق میں فرماتے ہیں: اس کا نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ کیونکہ یہ پسندیدہ جانور ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''وجه السلعة بحيارها'' اور قوم کے چہرے یعنی ان کے سرداروں کے لیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ پسندیدہ گھوڑا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ صاحب نہایۃ نے

اشارہ کیا ہے جو اتمام صقر نے کہا وہ بہت بعید اور پر تکلف ہے۔۔۔

زکوۃ کے بارے میں وقص کا حکم

۱۸۱۴: وَعَنْ طَاءُوْسٍ اَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ اُتِیَ بِوَقْصِ الْبَقَرِ فَقَالَ لَمْ يَأْمُرْنِیْ فِيْهِ النَّبِیُّ ﷺ بِشَیْءٍ۔

(رواه الدار قطنی و الشافعی و قال الوقص ما لم يبلغ الفريضة)

اخرجه الدارقطنی فی السنن ۹۹/۲ حديث رقم ۲۱ من باب ليس فی الخضراوات صدقة۔

ترجمہ: حضرت طاؤسؒ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس وقص گائیں لائی گئیں تا کہ آپ ان کی زکوۃ وصول کرلیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کے بارے میں کسی چیز کا یعنی ان میں زکوۃ وصول کرنے کا کا حکم نہیں دیا۔ روایت کیا ہے اس کو دار قطنیؒ نے اور شافعیؒ نے اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ وقص وہ جانور ہے جو فرض نصاب کو نہ پہنچے یعنی نہ پہلے نصاب کو اور نہ ہی دوسرے نصاب کو۔

تشریح: وقص : قاف کے فتحہ کے ساتھ۔

قوله :الوقص مالم يبلغ الفريضة : یعنی جس میں ابتداءً کچھ واجب نہ ہو۔ جیسے چار اونٹ، تیس سے کم گائے، چالیس بکریاں، یا درمیان میں جیسے پہلے میں پانچ اور دس کے درمیان اور دوسرے میں تیس اور چالیس کے درمیان اور چالیس سوا ایک سے اکیس کے درمیان تیسری میں۔ عام طور پر اس کا اطلاق دوسری مثال پر ہوتا ہے جیسا کہ ابوبکرؓ کی حدیث میں بھی گزر چکا ہے اور اُس میں وقص کی اکثر تعداد متن کا تذکرہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے وقص گائے کے ساتھ خاص ہے۔ واللہ اعلم!

بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

صدقۃ الفطر کا بیان

''صدقۃ الفطر'' ''زکوۃ الفطر'' یا زکوۃ الوفطرۃ بھی کہا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ وہی فطرت ہے جس پر پیدائش ہے، اس کا وجوب آدمی کے تزکیہ نفس کے لیے ہے۔ یعنی یہ اس کو پاک کرنے اور میل کچیل سے اس کے عمل کو پاک صاف کرنے کی غرض سے ہے۔

اور کہا جاتا ہے یہاں جو پیسے نکالے جاتے ہیں اس کو فطرۃ کہتے ہیں فاء کی کسرہ (زیر) کے ساتھ، ایک اصطلاح ہے جسے فقہاء نے اختیار کی ہے نہ تو یہ عربی ہے اور نہ ہی معرب ہے اور یہ فرض ہے جیسے نماز اور زکوۃ۔ ماہ رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئے رمضان کے روزے شعبان میں فرض ہوئے اور فطرانہ بلا شبہ یہ ہجرت کے دوسرے سال ہی فرض ہوئے اور بعض نے کہا کہ یہ فطرۃ کا صدقہ عید سے دو دن پیشتر فرض ہوا ہے اور اہل بغداد میں سے ہمارے کئی اصحاب نے کہا ''بے شک زکاۃ الفطر واجب ہے اس کی وجہ جو اموال کی زکوۃ کو واجب کرنے والی ہے اس کے بارے میں کتاب وسنت کی

نصوص کے عمومی ثبوت ہیں۔ بصرہ کے اہل علم میں سے بعض نے کہا۔ اس کا وجوب اموال کی زکوٰۃ سے سبقت رکھتا ہے اور بعض حفاظ سے اس بارے میں حد سے تجاوز کیا ہے اور کہا گیا ہے بے شک احوال کی زکوۃ فرض ہوئی تھی ہجرت سے پہلے اور کی فرضیت کے بارے میں کہ صدقہ فطر زکوٰۃ سے پہلے فرض ہوا اور قیس بن سعد بن عبادہ کی اس خبر کو دلیل بناتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں:

امرنا رسول الله ﷺ بصدقة الفطر قبل أن تنزل الزكاة فلما انزلت الزكاة فلم يأمرنا ولم ينهانا۔

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر کا حکم دیا، زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے، پھر جب اس کا حکم نازل ہوگیا تب نہ تو آپ نے ہمیں اس بارے میں کچھ حکم دیا اور نہ ہی ہمیں منع فرمایا۔ یعنی کہ آپ نے گزشتہ حکم کو ہی کافی سمجھا۔ اس لیے انہوں نے کہا ''ہم ایسے ہی کرتے ہیں یعنی صدقہ نکالتے ہیں اور اس کے واجب ہونے کی حکمت یہ ہے روزے کی حالت میں آدمی کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو یہ اس کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ اس کے وجوب پر اجماع ہے جیسا کہ ابن المنذرؒ اور بیہقیؒ نے بیان فرمایا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک جم غفیر صحابہ کرام اور دوسرے میں اختلاف سے اس بارے میں اختلاف نقل کرتے ہیں۔ اس کی متابعت ابن للبان جو ہمارے ہم عصروں میں سے ہیں کرتے ہیں لیکن الروضۃ میں ہے کہ جو ایسے کہتا ہے وہ صریح غلط کہتا ہے اور مجموع جو اسم کا قول ہے اس کی تو اجماع میں کچھ حیثیت ہی نہیں ہے۔

الفصل الاول:

صدقہ فطر کے احکام

۱۸۱۵: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِيْرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيْرِ وَالْكَبِيْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَمَرَ بِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلٰوةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۶۷/۳۔ حديث رقم ۱۵۰۳۔ ومسلم فی صحيحه ۶۷۷/۲ حديث رقم (۱۲۔ ۹۸۴)۔ وابوداؤد فی السنن ۲۶۳/۲۔ حديث رقم ۱۶۱۲۔ والترمذی ۶۱/۳ حديث رقم ۶۷۶۔ والنسائی ۴۸/۵ حديث رقم ۲۵۰۴۔ وابن ماجه ۵۸۴/۱ حديث رقم ۱۸۲۶۔ والدارمی ۴۸۰/۱ حديث رقم ۱۶۶۱۔ ومالك فی الموطأ ۲۸۴/۱ حديث رقم ۵۲ من كتاب الزكاة۔ واحمد فی المسند ۱۰۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فطر کی زکوٰۃ کھجور کے ایک صاع سے فرض کی۔ یا جو کے ایک صاع سے غلام پر اور آزاد مرد و عورت پر اور چھوٹے اور بڑے پر۔ اس حال میں کہ وہ مسلمان ہوں اور عید الفطر کے صدقہ کا حکم فرمایا کہ لوگوں کے نماز کی طرف نکلنے سے پہلے دیا جائے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: لفظ فرض کا معنی لفظ امر کا معنی ہے اور وہ امر جو ثابت ہو ظن کے ساتھ بے شک یہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے اور معنی میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ جس فرض کو وہ ثابت کرتے ہیں وہ فرض اس طور پر نہیں کہ اس کا انکار کرنے والا کافر ہو جائے یہی معنی وجوب کے بھی ہے۔ جس کے ہم قائل ہیں ایک کی غایت یہی ہے کہ ان کی اصطلاح میں فرض واجب سے زیادہ

عام ہے ہمارے عرف کے لحاظ سے۔ پس ہم نے اس کا اطلاق اس کی (فرض) جزء پر کیا ہے۔

اس میں ہمارے مذہب کی دلیل ہے اور جب حنفیہ نے فرض اور واجب میں فرق دیکھا پس پہلا موقف قطعی طور پر ثابت ہے اور جو دوسرا موقف ہے۔ ظنی طور یہ ثابت ہے انہوں نے کہا'' بے شک یہاں فرض واجب کے معنی میں ہے اور یہ محل نظر'' ہے اس لیے کہ جہاں تک میں جانتا ہوں کہ بلا شبہ اس پر اجماع ہو چکا، پس فرض اپنے حال پر باقی ہے یہاں تک کہ ان کے اپنے قواعد کے بنیاد پر بھی یہاں ان کا فرض کو واجب کے ساتھ تاویل کرنے کی کوئی ضروری نہیں۔ اور اس میں یہ کہ اجماع اپنے ثبوت میں مقدر ہے بے شک وہ اس فعل میں لازمی حیثیت رکھتا ہے اور اگر وہ فرض یا واجب سمجھا جاتا تو متاخرین فقہا کی اصطلاحات کی بنیاد پر ہے پس ایسا غیر تسلیم شدہ معاملہ ہے لازمی ہے کہ خصوصاً جب احادیث ہو فرض اور واجب کی تعبیر میں متعارض ہیں۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اس کے واجب ہونے پر اجماع ہے جیسا کہ منذری اور بیہقی کا قول ہے یہ قول صحیح نہیں چونکہ بعض صحابہ اور تابعین وغیرہ سے اس کے خلاف نقل کیا گیا ہے۔ ان کے قول کی تائید کرنے والوں میں ''ابن اللبان'' شافعی بھی ہیں۔ اس طرف پہل کی الاصم نے اور، ابن مسیب اور حسن بصری کا مذہب یہ ہے کہ صدقہ فطر صرف اس پر واجب ہے جس نے روزے رکھے اور نمازیں ادا کیں۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ یہ صرف اس پر واجب ہے جس کے پاس روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کی استطاعت ہے۔ علماء ربیعہ اور زہری کا موقف یہ ہے کہ صرف اهل البادية والوں پر فرض ہے۔ یہ نزاع (جھگڑا) عدم صحت اجماع پر ثبوت ہے۔ حدیث ظنی ہے اور اس کا مدلول قطعی نہیں ہے۔

صاعا من تمر أو صاعا من شعير : خیر میں ہے (کتاب کا نام) کہ صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ یہی موقف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ کسی صحیح سند سے امام ابو یوسف کا رجوع امام مالک کے قول کی طرف ثابت نہیں ہے۔ امام شافعی اور ان کے علاوہ بعض لوگوں کا موقف بھی امام مالک والا ہی ہے۔ امام بیہقی نے اس موقف کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کی بنیاد ضعیف خبر پر واقع ہے اور یہ اجتہاد اور مجتہد کے متعلق کے بعد ہوا ہے جو نقصان دہ نہیں ہے یا پھر دونوں قسموں کے درمیان اختیار ہے۔ اور ان دونوں کے حق میں ان دونوں کا ذکر اعطاء کو حصر کرنے کے ساتھ نہیں ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: کہ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ مطلق طور پر نصاب شرط نہیں ہے۔ ورنہ نہ نفی پر دلالت ہے اور نہ اثبات پر امام شافعی کہتے ہیں کہ صدقہ فطر تب فرض ہے جب اس کے اور اس کے اہل وعیال سے عید کے دن اور رات کو صدقہ فطر کی مقدار سے قوت بڑھ جائے۔ میں کہتا ہوں: اور یہ اس نصاب کی ہی مقدار جو کہ مخفی نہیں ہے ہمارے علماء نے اس مطلق کو ان احادیث کی وجہ سے مقید کیا ہے اور غنی کی قید لگائی۔۔ جو قید کا فائدہ دیتے ہیں اور علماء نے اسے شرعی اور عرفی معنی کی طرف لوٹایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جو نصاب کا مالک ہو۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ ''لا صدقة الا عن ظهر غنى'' صدقہ نہیں مگر جب (مال) ضرورت سے زائد ہو۔ امام احمد نے اسے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ اور ان کی تعلیقات پختہ ہیں اور ان پر صحیح کا حکم ہے۔ اور انہوں نے ایک مرتبہ روایت کو اس لفظ کے بغیر روایت کیا ہے لفظ ظہر (زائد ہے) جیسے ظہر القلب اور ظہر الغیب میں ہے۔ ''مغرب'' میں ہے اور وہ امام شافعی کے اس قول کے خلاف

حجت ہے کہ صدقہ فطر اس پر واجب ہے جو ایک دن کی قوت کا اپنے نفس اور اہل وعیال کے لیے زیادہ کا مالک ہو۔

امام احمد ابو ثعلبہ بن ابو صغیر سے روایت کرتے ہیں انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ادوا صاعا من قمح او صاعا من بر" ایک صاع گیہوں سے ادا کرو یا گندم سے ادا کرو۔ حماد راوی کو شک ہے کہ قمح یا بر کا لفظ بولا۔ (عن كل اثنين صغير او كبير، ذكر او انثى حر او مملوك۔ غني او فقير أما غنيكم فيز كيه الله وأما فقيركم فيرد الله عليه اكثر مما يعطى) ہر دو سے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، مذکر ہو یا مؤنث آزاد ہو یا غلام۔ جو تمہارے غنی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا تزکیہ کرے گا اور جو تمہارے فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر زیادہ لوٹائے گا جو اس نے دیا ہے۔ (امام احمد نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے) اگر حدیث صحیح ہوتی تو جو ہم نے روایت کیا ہے وہ قابل صحت ہے اس کی مخالفت نہ کی جاتی باوجود اس کے کہ وہ روایات جن میں مذکورہ تقسیم ہے فقیر کے لفظ نہیں ہے اور وہ بے شمار ہیں۔ ان کے مقابلہ میں یہ روایت اگر درست ہوتی تو شاذ کہلاتی اور قبول نہ کی جاتی بالخصوص جب وہ قواعد صدقات میں کوتاہی کس سبب بنے۔ اور صحیح حدیث اس کے خلاف حجت ہے۔

قوله على العبد والحر۔ طیبی فرماتے ہیں: صدقہ فطر سید پر اسی طرح واجب کیا گیا ہے جس طرح غلام پر ہے۔ ابن ہمام صاحب ہدایہ کے قول کے متعلق کہتے ہیں: آزادی کی شرط کا تعلق تملیک کے ساتھ ہے۔ تملیک مالک کے پاس ہوتی ہے اور مالک صرف آزاد شخص ہی ہوسکتا ہے۔ پس اس سے رکن ثابت نہیں ہوگا۔ امام شافعی کا قول کہ صدقہ فطر غلام پر ہے اور سید پر اس کو ادا کرے گا حالانکہ ایسا نہیں ہے تکلیف حکم کا اصل مقصد یہ کہ مکلّف اپنی ذاتی منفعت اپنے مالک تک پہنچائے اور وہ رب تعالیٰ ہے بطور امتحان کے تاکہ اس کی (بندہ کی) اطاعت نافرمانی سے ظاہرہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تکلیف کا تعلق مکلّف کے فعل کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ شرعی طور پر مکلّف اس کا پابند نہیں ہے تو جس منفعت کے بارے میں ہم بحث کررہے ہیں وہ (اعطاء) دینے کا فعل ہے بلکہ وہ دوسرے شخص پر لازم ہوتو اس آزمائش کی نفی لازم آتی ہے جو اس مکلّف کے حق میں تکلیف کا مقصد ہے اور وہ دوسرے انسان بہ نسبت منفعت کا ثبوت پہلے پر واجب کرنے پر موقوف نہیں ہے کیونکہ جس کے لیے ایجاد اور اعدام کی نسبت ہے تو ممکن ہے کہ اس کا غلام پر مالک ہونا ابتدائے تکلیف ہے اور اس کے زائل مال سے ہے۔

پس اس عقلی دلیل کی وجہ سے واجب ہے کہ علی کل حر وعبد میں وارد لفظ علی کو عن کے پر محمول کیا جائے جس طرح شاعر کا قول ہے

اذا رضيت على بنو قشير ☆ لعمر الله اعجبني رضاها

جیسا بنو قشیر میرے متعلق راضی ہوتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ان کا میرے ساتھ راضی ہونا مجھے بہت خوشی دیتا ہے۔

ان روایات کی تعداد زیادہ ہے جن میں لفظ عَنْ نہیں ہے۔ اور عقلی دلیل بھی اس کی نفی کررہی ہے۔ اس روایت کو کیسے قابل حجت تسلیم کیا جائے چونکہ ہم نے جو روایت اس سے پہلے پیش کی ہے ان میں علیٰ کی صراحت ہے (**والذكر والنثى والصغير والكبيرى**) یہ عام ہے چاہے حاضر ہو یا غائب یہ ان کے حالات پر موقوف ہے۔ (**من المسلمين**) طیبی فرماتے ہیں یہ عبد سے حال ہے اور جو اس پر عطف ڈالا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان پر کافر غلام کا صدقہ فطر واجب نہیں

ہے۔ صاحب ہدایہ کہتے ہیں: مطلق طور پر واجب ہے۔ ان کی دلیل دارقطنی کی وہ حدیث جو انہوں نے ابن عباسؓ سے مرفوعاً ذکر کیا ہے:

ادوا صدقة الفطر عن كل صغير وكبير، ذكر أوانثى، يهودى اونصرانى، حرا او مملوك نصف صاع من براوصاعًا من تمرا اوشعير۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ دوسری بات جو صحیح حدیث میں اطلاق ہے وہ کافر پر صدقہ فطر واجب کرتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں من المسلمین کی قید بھی ہے۔ یہ روایات ایک دوسرے کے معارض نہیں ہیں چونکہ یہ بات جان لی گئی ہے کہ اسباب مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ یعنی دونوں سے حجت پکڑنا ممکن ہے۔ پس یہ دونوں روایتیں الگ الگ سبب بنیں گی بخلاف اس صورت کے جب مطلق اور مقید ایک ہی حکم کے بارے میں وارد ہوں۔ ہمارے نزدیک خود بیوی پر صدقہ فطر واجب ہے۔ اس کا صدقہ فطر خاوند پر نہیں اور اسی موقف کو امام ثوری نے اختیار کیا ہے جو کہ امام شافعی کے موقف کے برعکس ہے۔

(وامر بها ان تودى قبل خروج الناس الى الصلوة) طیبی فرماتے ہیں۔ جمہور کے نزدیک اسے غروبِ شمس تک مؤخر کرنا مستحب ہے۔ یعنی خروج سے لے کر غروب تک۔ ایک دن سے زیادہ موخر کرنے کے جواز میں اختلاف ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: خبر حسن ہے حکم کے مندوب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ جس نے اس کو نماز عید سے پہلے ادا کیا تو یہ صدقہ فطر مقبول ہے اور جس نے اسے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ عام صدقات میں سے ایک صدقہ ہے۔ اس روایت سے ہمارے بعض سلف کا مذہب رد ہو جاتا ہے کہ یہاں امر وجوب کے لیے ہے۔ اگرچہ ہمارے ائمہ میں سے ایک جماعت نے اس مذہب کو قوی کر دیا ہے۔ یہ بات مخفی نہ رہے کہ خبر حسن وجوب کا فائدہ دیتی ہے لیکن ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کرنا افضل ہے۔ پھر جو چیز اس بات کی تائید کرتا ہے کہ یہاں امر ندب کے لئے ہے وہ ہے صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کرنے کا جواز۔ ابن ہمام صاحب ہدایہ کے قول کے بعد کہتے ہیں۔ ان کا یوم فطر سے پہلے ادا کا موقف اختیار جائز ہے کیونکہ اس نے سبب پائے جانے کے بعد اس کو ادا کر دیا ہے یعنی اس نے کسی کا بوجھ اُٹھایا ہے تو یہ زکوٰۃ کے جلدی ادا کرنے کے مشابہ ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابن عمرؓ کی حدیث ہے:

فرض رسول الله ﷺ صدقة الفطر الى ان قال فى آخره و كانوا يعطون قبل الفطر بيوم اويومين: یہ ان صحابہ کرام کا صدقہ فطر عید سے پہلے ادا کرنا نبی علیہ علیہ السلام سے پوشیدہ نہیں تھا۔ بلکہ ضروری ہے یہ سابقہ حکم سے ہو بلا شبہ وجوب سے پہلے ہی کسی حکم کو ساقط کرنا غیر معقول المعنی ہے لہٰذا صحابہ کرام اس کو کسی صحیح دلیل کو سننے کی بناء پر مقدم کیا کرتے۔ اس قول کے متعلق کہا صحیح بات یہ ہے کہ خلف کے قول کے متعلق محتاط رہنا چاہیے۔ امام شافعی نے رمضان شروع ہونے کے بعد جلدی ادا کرنے کو جائز کہا ہے۔ رمضان سے پہلے نہیں چونکہ یہ صدقہ فطر ہے۔ اور یہ روزے شروع ہونے سے پہلے نہیں ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ آخری نصف میں واجب ہے اس سے پہلے نہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ آخری عشرہ میں ادا کیا جائے اس سے پہلے درست نہیں۔ حسن بن زیاد نے کہا: اصلاً اس کو جلدی ادا کرنا جائز نہیں۔ گویا کہ انہوں نے اس حدیث کے ظاہر سے یہ حکم لگایا

ہے۔

''علوم الحدیث'' میں امام حاکم نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے:

امرنا رسول اللہ ﷺ ان نخرج الصدقة الفطر عن کل صغیر و کبیر حراو عبد، صاعًا من تمر او صاعًا من شعیر اوصاعًا من قمح و کان یأمرنا ان یجرجها قبل الصلوة و کان رسول اللہ ﷺ یقسهما قبل ان ینصرف الی المصلی و یقول اغنوهم عن الطواف فی هذا الیوم۔

روایت میں جو یہ الفظ ہیں ''**اغنو هم عن الطلب فی هذا الیوم**'' آپ نے اغنیاء کا حکم دیا ہے تا کہ فقیر مانگنے کی وجہ سے نماز سے نہ رہ جائیں۔ جمہور نے آپ کے اس حکم کو اور فعل کو استحباب پر محمول کیا ہے جو پیچھے گزر چکا ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: چاروں یعنی ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو ''**من المسلمین**'' تک روایت کیا ہے۔

کون کونسی چیزیں بطور فطرانہ کے دے سکتے ہیں؟

۱۸۱۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ٍالْخُدْرِیِّ قَالَ کُنَّا نُخْرِجُ زَکَاۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ اَوْصَاعًا مِّنْ شَعِیْرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ اَقِطٍ اَوْصَاعًا مِّنْ زَبِیْبٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۱/۳۔ حدیث رقم ۱۵۰۶۔ ومسلم فی صحیحه ۶۷۸/۲ حدیث رقم (۹۸۵/۱۷)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲۶۶/۲ حدیث رقم ۱۶۱٤۔ والترمذی فی السنن ۵۹/۳ حدیث رقم ۶۷۳۔ والنسائی ۵۱/۵ حدیث رقم ۲۵۱۲۔ وابن ماجه ۵۸۵/۱ حدیث رقم ۱۸۲۹۔ والدارمی ٤۸۱/۱ حدیث رقم ۱۶۶٤۔ ومالك فی الموطأ ۲۸٤/۱ حدیث رقم ۵۳ من کتاب الزکاة۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم صدقۂ فطر ایک صاع کھانے سے یا ایک صاع جو سے یا ایک صاع کھجور سے یا ایک صاع قروط سے یا ایک صاع خشک انگور سے نکالا کرتے تھے۔ یہ امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کی ہے۔

تشریح: (**قال کنا نخرج زکاة الفطر صاعا من طعام**) طیبی فرماتے ہیں یعنی گندم سے۔ اس کی دلیل یہ قرینہ ہے **صاعًا من شعیر**) ہمارے علماء کہتے ہیں کھانے سے مراد عام کھانا ہے۔ اور مابعد کا اس پر عطف کرنا یہ اس باب سے ہے کہ عطف خاص کا عطف کا عام پر عطف کے قبیل سے ہے اگر آپ کا ارادہ مقصد اور مطلوب کی تحقیق کا ہے تو آپ ابن ہمام کی شرح کا ضرور مطالعہ کریں یہاں پر اس کا ذکر کلام کو طویل ہی کرنا ہے۔

او صاعًا من تمر: میرک نے ازھار سے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں اشیاء کے ادا کرنے میں اختیار کے لیے جو لفظ ''اَوْ'' ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کیا یہ ایک چیز کی تعیین کے لیے ان تمام اشیاء میں ہے تو غالب قول تو یہی ہے۔ اس میں دو قول ہیں: ① کہ وہ تخییر کے لیے ہے اس قول کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ ② ان چیزوں میں ایک چیز کی تعیین کے

لیے ہے غلبہ طور پر اور صحیح قول کے مطابق یہ شہر یا اس مقام کی غالب خوراک و غلہ ہے اور جمہور کا یہی موقف ہے۔اور اس کا معنی یہ ہوا کہ ہم اپنی قوت (غلہ) کے حساب اور حالات کے مطابق اسے ادا کرتے تھے۔اھ

ابن مالک کہتے ہیں: "اَوْ" تنویع (اقسام) کے لیے ہے تخییر کے لیے نہیں غالب کو قوت کو نہیں چھوڑا جائے گا یعنی قوت غالب اگر ادنیٰ ہو تو اس کو چھوڑ کر اعلیٰ چیز نہیں دی جائے گی اور یہ مذہب کے خلاف ہے۔

او صاعًا من اقط: اقط ہمزہ کے فتحہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ لکھن کو کہتے ہیں۔ جب یہ دودھ سے بنا ہو۔ ثوری اور بعض کا یہ قول ہے: وہ خشک دودھ ہے جس سے جھاگ الگ نہ کی گئی ہو۔بعض نے اقط کو تثلیث ہمزہ اور قاف کو ساکن کر کے پڑھا ہے۔ابن الملک کہتے ہیں کہ اقط میں اختلاف ہے اور حدیث کا ظاہر اس کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

أو صاعًا من زبيب: ایک روایت میں نصف صاع ہے یہ روایت حسن نے امام ابوحنیفہؒ سے بیان کی ہے اور ابو یسر نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ایک روایت میں نصف صاع ہے۔

الفصل الثاني:

صدقہ فطر کھجور، جو، گندم وغیرہ سے دیں

۱۸۱۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فِيْ اٰخِرِ رَمَضَانَ اَخْرِجُوْا صَدَقَةَ صَوْمِكُمْ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ اَوْ شَعِيْرًا اَوْ نِصْفَ صَاعٍ مِنْ قَمْحٍ عَلٰى كُلِّ حُرٍّ اَوْ مَمْلُوْكٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى صَغِيْرٍ اَوْكَبِيْرٍ . (رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۲۷۲/۲ حديث رقم ۱۶۲۲۔ والنسائي ۵۰/۵ حديث رقم ۲۵۰۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رمضان کے آخر میں روزے کی زکوٰۃ نکالو۔یعنی فطرانہ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صدقہ ایک صاع کھجور سے یا جو سے یا آدھا صاع گندم سے ہر آزاد مرد و عورت پر غلام ہو یا لونڈی چھوٹا ہو یا بڑا پر واجب کیا ہے۔یہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

تشریح: **عن ابن عباس قال**: یعنی ابن عباسؓ اور اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں سے کہا۔

فی آخر رمضان: قال کا ظرف ہے۔اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ ظرف ہوا گلے جملے (**اخرجوا صدقة صومكم ، فرض رسول الله ﷺ هذه الصدقة صاعًا من ثمه او شعد أو نصف صاع**) کے لئے **من قمح**: قمح سے مراد گندم ہے۔یہی قول امام ابوحنیفہ کا ہے اور باقی تینوں ائمہ کا موقف اس کے برعکس ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید حدیث معاویہؓ سے ہے جو انہوں نے مدینہ منورہ میں خطبہ کے دوران بیان کی کہ "میرے رائے کے مطابق گندم کا نصف صاع کھجور کے صاع کے برابر ہے" ظاہر یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ شاید یہ ان کا اجتہاد ہو۔واللہ اعلم

علی كل حر أومملوك ذكر أوانثى صغير أو كبير) میرک فرماتے ہیں کہ دونوں نے یہ حدیث حسن عن ابن

عباسؓ سے روایت کی ہے۔اور حسن کہتا ہے کہ ان سے یہ حدیث سماع نہیں ہے۔تو حدیث مرسل ہوئی اور مرسل حدیث جمہور کے ہاں قابل حجت ہے۔باقی ابن حجر کا اس حدیث کو ضعیف کہنا ان کے اپنے مذہب کے قواعد پر مبنی ہے اور امام ابوداؤد نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد سکوت اختیار کیا ہے جو اسناد کے حسن ہونے پر دلالت ہے۔

صدقہ فطر کے فوائد

۱۸۱۸: وَعَنْهُ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرَ الصِّيَا مِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۲۶۲ حدیث رقم ۱۶۰۹۔ وابن ماجه ۱/۵۸۵ حدیث رقم ۱۸۲۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ﷺ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (زکوۃ فطر) یعنی صدقہ فطر کو بیہودہ اور برے کلمات سے روزے کو پاک کرنے کے لئے اور مسکینوں کو کھلانے کے لیے لازم قرار دیا ہے۔اس کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: عنه یعنی ابن عباسؓ سے۔

فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر طهر الصيام) یعنی روزوں کی تطہیر (پاکیزگی) ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ صیام صائم کی جمع ہے جس طرح قائم کی جمع قیام ہوتی ہے۔مصابیح میں ہے **طهرة الصائم** یعنی اس کی گناہوں سے پاکیزگی ہے۔

من اللغو : بے مقصد چیز کو کہتے ہیں ایک قول یہ بھی ہے کہ باطل کام کو کہتے ہیں۔طیبی فرماتے ہیں اس سے مراد قبیح (برے) کام ہیں۔

والرفث : یعنی فحش کلام۔طیبی فرماتے ہیں: اصلاً یہ لفظ اس کلام پر بولا جاتا ہے جو میاں بیوی کے درمیان بستر پر ہوتی ہے پھر ہر قبیح کلام پر اس کا استعمال ہونے لگا۔لغو کی تفسیر میں اس کے قول کو قبیح فعل پر محمول کیا جائے گا یا عطف تفسیری پر۔ابن الملک فرماتے ہیں: اور یہ اس لیے ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔اس حدیث سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے۔جو کہتے ہیں کہ بچوں پر صدقہ فطر واجب نہیں ہے چونکہ ان پر روزے فرض نہیں ہیں لہٰذا ان کی طہارت بھی ضروری نہیں۔اکثر کا یہی موقف ہے کہ بچوں پر بھی فطرانہ واجب ہے۔شاید کہ انہوں نے جو اس کے واجب ہونے کی علت جو طہارت اور کھانے سے مرکب ہے مساکین کی رعایت کرتے ہوئے اس کو ملحوظ رکھ کر یہ موقف اختیار کیا ہے۔

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ آدمی کے پاس اپنے اور اپنے اہل وعیال کی ایک دن کی ضرورت سے غلہ زیادہ ہو۔طہرہ میں غنی اور فقیر کے برابر ہونے کی وجہ سے ان کا یہ مسلک ہے۔میں کہتا ہوں: کہ غنی شرط ہے اور جو ہم نے نصاب کی شرط ذکر کی ہے وہ پچھلے گزری ہوئی تمام احادیث کو ممکن حد تک جمع کر کے بیان کی ہے۔اور اس میں فقراء کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ان کے اعمال پاک ہوتے ہیں اور ان کے گناہ بغیر صدقہ کے مغفور ہیں۔اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ لغو اور فضول کام اکثر اغنیاء سے سرزد ہوتے ہیں۔

قولہ : وطعمة للمساكين : یعنی تا کہ عید کے دن فقیر اور غنی کے درمیان وجدان قوت (غلہ) کی حالت برابر ہو جائے اور اس میں واضح دلالت ہے کہ "طھرۃ" اغنیاء روزے داروں کے لیے ہے۔ اور طعمة (کھانا) فقراء اور مساکین کے لیے ہے جس طرح کہ تقسیم کا تقاضا ہے۔ مسکین کی تعریف میں امام شافعی کا مذہب بھی اسی طرح ہے۔ میرک فرماتے ہیں اس حدیث پر امام ابوداؤد اور امام منذری نے سکوت اختیار کیا ہے یعنی اس کی سند حسن ہے بلکہ امام حاکم نے اسے امام بخاری کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔

صدقہ فطر کا سبب:

ابن ہمام کہتے ہیں: یہ بات مخفی نہیں کہ صدقة الفطر رکن ہے معرف تک پہنچانا اور اس کے مشروع ہونے کا سبب ابوداؤد اور ابن ماجہ کی وہ روایت ہے جو انہوں نے سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے بیان کی ہے:

فرض رسول الله ﷺ زكاة الفطر طهرة للصائم من اللغو أو الرفث و طعمة للمساكين۔ من اداها قبل الصلوة فهي زكوة مقبولة و من ادا ها بعد الصلوة فهي صدقة من الصدقات۔

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے روزہ دار کو لغو اور بے ہودہ باتوں سے پاک کرنے کے لئے اور مساکین کو کھلانے کے لئے صدقہ فطر مقرر فرمایا۔ لہٰذا جو نماز عید سے قبل ادا کرے اس کا صدقہ مقبول ہوا اور جو نماز کے بعد ادا کرے تو عام صدقوں میں سے ایک صدقہ ہے۔"

اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس حدیث پر کوئی جرح نہیں ہے۔ اور "خبر" میں حسن غریب روایت ہے۔

شهر رمضان معلق بين السماء والارض لا يرفع الا بزكاة الفطر : رمضان کا مہینہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق رہتا ہے اور اس کو زکوۃ فطر کے ساتھ اوپر لے جاتا ہے۔

الفصل الثالث:

صدقہ فطر کی وجوبیت کا مسئلہ

۱۸۱۹: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ مُنَادِيًا فِيْ فِجَاجِ مَكَّةَ اَلَا اِنَّ صَدَقَةَ الْفِطْرِ وَاجِبَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى حُرٍّ اَوْ عَبْدٍ صَغِيْرٍ اَوْ كَبِيْرٍ مُدَّانِ مِنْ قَمْحٍ اَوْ سِوَاهُ اَوْ صَاعٌ مِّنْ طَعَامٍ ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٠/٣ حديث رقم ٦٧٤۔ والدارقطنی فی السنن ١٤١/٢ حديث رقم ١٤ من باب زكاة الفطر۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کی کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ کے کوچوں (گلیوں) میں ڈھنڈورچی (آواز لگانے والے) کو بھیجا تا کہ وہ کہے خبردار صدقہ فطر ہر

مسلمان مرد ہو یا عورت' آزاد ہو یا غلام' چھوٹا ہو یا بڑا' پر واجب ہے۔ گندم یا اس کے علاوہ مثلاً کشمش کے دو مد یا ایک صاع کھانے سے ہو۔

تشریح: فی فجاج: فاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی مکہ کے راستوں اور اس کا تعلق بعث کے ساتھ ہے۔

مدان: یعنی "هي مدان" اصل عبارت ہے۔ مدان مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور جملہ صدقہ کے بیان کے لیے ہے۔ یا خبر کے بعد خبر۔

من قمح: یہ تمیز ہے۔

أو سواه: یعنی گندم کے علاوہ۔

"أو" تخییر کے لیے ہے یا بیان اقسام کے لیے ہے۔

أو صاع: راوی کو شک ہے۔

من طعام: یعنی گندم کے علاوہ۔ یہ اس تاویل کی تائید کرتی ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے کہ طعام سے عام معنی مراد ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: راوی کو شک ہے دونوں لفظوں میں سے کون سا سنا؟ اور یہ بھی احتمال ہے کہ "مدان أو سواه" سے بدل ہو۔

تخریج: (رواه الترمذی) اور اسے غریب قرار دیا۔ اس کو میرک نے نقل کیا ہے۔ پھر جان لیں کہ احادیث اور آثار متعارض ہیں گندم کے مقدار کے متعلق۔ بعض میں دو مد ہیں اور بعض میں صاع کا ذکر ہے اور بعض میں نصف صاع ہے۔ اگر آپ کلام کی تحقیق چاہتے ہیں تو آپ ابن ہمام کی شرح ہدایہ کا مطالعہ کریں۔

صدقہ فطر گھر کے تمام افراد کی طرف سے دینا ہوگا' چھوٹے بڑے کی قید نہیں

۱۸۲۰: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ ثَعْلَبَةَ اَوْ ثَعْلَبَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ صُعَیْرٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَاعٌ مِّنْ بُرٍّ اَوْقَمْحٍ عَنْ كُلِّ اثْنَیْنِ صَغِیْرٍ اَوْ كَبِیْرٍ حُرٍّ اَوْعَبْدٍ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی اَمَّا غَنِیُّكُمْ فَیُزَكِّیْهِ اللّٰهُ وَاَمَّا فَقِیْرُكُمْ فَیَرُدُّ عَلَیْهِ اَكْثَرَ مِمَّا اَعْطَاهُ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲/ ۲۷۰ حدیث رقم ۱۶۱۹۔

ترجمہ: عبد اللہ بن ثعلبہ یا ثعلبہ بن عبد اللہ بن ابی صعیر نے اپنے باپ سے نقل کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک صاع بر سے (یعنی گندم سے) یا قمح سے یعنی دونوں سے آدھا صاع یعنی ہر ایک کی طرف سے آدھا صاع دو۔ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ آزاد ہوں یا غلام مرد ہوں یا عورت رہا تمہارا غنی تو اللہ تعالیٰ اس کو پاک کرتا ہے اور بہر کیف تمہارا فقیر تو اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ دیتا ہے اس چیز سے کہ جو اس نے صدقہ کے طور پر دی۔

تشریح: عن عبد الله بن ثعلبة أو ثعلبة بن أبي صعير: صعیر تصغیر ہے۔

عن أبيه: ذہبی نے کاشف میں کر دیں گے عبد اللہ بن ثعلبہ بن صعیر یعنی اُبی کے بغیر ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مزی نے

تہذیب الکمال میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے اس کو ابن ابی صعیر، ابومحمد المدنی شاعر حلیف بنوزہرہ کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے سر اور چہرے پر فتح مکہ کے زمانے میں ہاتھ پھیرا۔

ابن حجر تقریب میں کہتے ہیں عین مہملۃ کے متعلق۔ عبداللہ بن ثعلبۃ بن صعیر مہملتین ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ابن ابی صعیر نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے لیکن سماع ثابت نہیں ہے۔ ستاسی یا نواسی ہجری میں فوت ہوئے اور وہ نوے سال کے قریب قریب تھے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ حرف ثاء مثلثہ کے ساتھ ثعلبہ بن صعیر ہے یا ابن ابی صعیر مہملتین مصغو ہے۔ العذری مہملۃ کے ضمہ اور معجمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ ثعلبہ بن عبداللہ بن صعیر اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن ثعلبہ بن صعیر اور اس کے صحابی ہونے کے متعلق اختلاف ہے واللہ اعلم۔

یہ قول میرکؒ کا ہے۔ پھر میرک فرماتے ہیں یہ حدیث مضطرب ہے اس کی سند میں نعمان بن راشد ہے اور وہ اس روایت کے ساتھ منفرد ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں: اس کو وہم بہت زیادہ ہوتا تھا۔ پھر کہا۔ میں نے امام احمد کے سامنے حدیث ثعلبہ بن صعیر ذکر کی تو انہوں نے کہا: یہ روایت صحیح نہیں بلکہ مرسل ہے اس کو معمر اور ابن جریج زہری سے مرسل روایت کرتے ہیں۔

مؤلف کہتا ہے: وہ عبداللہ بن ثعلبہ مازنی العذری ہے۔ ہجرت سے چار سال قبل پیدا ہوا اور سن نواسی ہجری میں فوت ہوا۔ نبی ﷺ نے اُسے فتح مکہ کے سال دیکھا اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ثعلبہ سے اس کا بیٹا عبداللہ اور زہری روایت کرتے ہیں۔ صحابہ کے فضائل میں حروف تہجی کے اعتبار سے اس کا عین میں ذکر ہے حرف ''ثاء'' میں ذکر نہیں ہے۔

قوله :قال:قال رسول الله ﷺ صاع من بر: یعنی صدقہ فطر ایک صاع ہے جو ''بر'' کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔

او قمح : راوی کو شک ہے۔

عن کل اثنين : یعنی جو کفایت کرے۔

صغير أو كبير حرأ اوعبد ، ذكر أو انثى، أما غنيكم: یعنی ان پر واجب ہے۔

اما غنيكم فيزكيه الله : تزکیہ تطہیر کے معنی میں ہے (یعنی خوب پاکیزگی وطہارت) یا تنمیۃ (بڑھوتری) کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کی حالت پاک ہو جائے گی اور اس کے مال واعمال اس کے سبب سے بڑھ جائیں گے۔

وأما فقيركم : اکابر اغنیاء کے اعتبار سے یہ ہمارا مذہب ہے۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ جو عید کے دن اور رات اپنے نفس اور اہل وعیال کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنے کے بعد زیادہ قوت (غلہ) کا مالک ہے۔ وہ فقیر اور مسکین میں فرق کر کے ان پر ہو نائے گا۔

فيرد : یعنی اللہ تعالیٰ کو لوٹائے گا اور ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ پہلا قول راجح ہے وہ تسلیہ کے ساتھ اکثر ہے۔ اس میں قلیل مال والے کے لیے تسلی ہے کہ اس کو اس کا عوض (بدلا) ملے گا اور مال میں بڑھوتری ہوگی۔ امام ابوداؤد کے سکوت کی وجہ سے یہ روایت حسن ہے ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف منکر ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں۔ حدیث سنن ابوداؤد دار قطنی اور مسند عبدالرزاق میں مروی ہے اور اس کے اسم نسبت اور متن میں اختلاف ہے۔

پہلا اختلاف: کیا وہ ثعلبہ بن اُبی صعیر ہے یا ثعلبہ بن عبداللہ بن اُبی صعیر ہے۔ یا عبداللہ بن ثعلبہ بن صعیر عن اُبیہ ہے۔

دوسرا اختلاف: کیا وہ عدوی ہے یا عذری ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ عدوی ہے جد اعلیٰ عدی کی طرف منسوب ہے۔
دوسرا قول یہ ہے کہ وہ عذری ہے اور یہی صحیح ہے اس کو ''مغرب'' اور اس کے علاوہ میں ذکر کیا ہے۔ ابوعلی نسائی تقیدالمہمل میں کہتا ہے: العذری ذال معجمہ کے ضمہ اور ''راء'' کے ساتھ عبداللہ بن ثعلبہ بن صعیر۔ ابومحمد بنوزہرہ کے خلیف ہیں۔ اس نے نبی ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ابھی بچہ تھا۔ العدوی تصحیف (یعنی نقطہ آگے پیچھے ہو گیا) ہے۔
تیسرا اختلاف: کیا وہ صدقہ فطر صاع کھجوروں اور گندم پر ایک جنس سے کریں گے۔ یا صدقہ فطر صاع ''بر'' اور ''قمح'' دونوں سے ادا کرے گا؟ امام میں کہا: ہر ایک کو دونوں کی طرف پھیرنا ممکن ہے۔ لیکن ''بین اثنین'' والی روایت اس اختلاف کو دور کرتی ہے جو صحیح طرق کے ساتھ ''مسند عبدالرزاق'' میں ہے:

أخبرنا ابن جريج عن ابن شهاب عن عبد الله بن ثعلبة قال: خطب رسول الله ﷺ الناس قبل يوم الفطر بيوم أو يومين فقال: أدوا صاعا من برأو قمح بين اثنين أو صاعا من تمر أو شعير عن كل حر و عبد صغير أو كبير) اس کی سند صحیح ہے۔

بَابُ مَنْ لَّا تَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ

وہ لوگ جن کے لئے زکوۃ کا مال حلال نہیں

صدقہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ آخرت کے ثواب کا عطیہ ہے اور ہدیہ کے ذریعے آدمی کسی کا قرب حاصل کرتا ہے یا اس کی عزت و تکریم مقصود ہوتی ہے۔ اور صدقہ ترحم کی قسم ہے اور اس کو لینے والا ذلیل (کم تر) سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے صدقہ نبی ﷺ پر حرام کیا گیا ہے جبکہ ہدیہ جائز ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ صدقات کا حکم کرتے تھے اور نیکیوں کی ترغیب دلاتے تھے اور صدقہ کو لینے سے رسول اللہ ﷺ بہت بچتے تھے جو اسی بات پر دلالت تھی کہ یہ آپ کا صدقہ قبول کرنے سے براءت کا اظہار ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (**تؤخذ من اغنياء هم وترد علی فقرائهم**) ان کے مالداروں سے لے کر فقراء پر لوٹایا جائے گا۔ اس طرف طرف اشارہ ہے کہ مصلحت ان کی طرف لوٹنے والی ہے۔ آپ ﷺ صرف اللہ کا پیغام پہنچانے والے تھے اور لوگوں پر شفقت کرنے والے تھے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا یا پھر آپ کے قلب اطہر کا اجتہاد تھا۔

عرضِ مرتب:

(۱) مسائل زکوۃ

آدمی زکوۃ اپنی اصل کو نہ دے یعنی ماں اور باپ دادا اور دادی نانا اور نانی اسی طرح ان کے اوپر کے بزرگ۔ خواہ وہ ماں کی طرف سے ہوں یا باپ کی طرف سے۔ ان میں سے کسی کو بھی زکوۃ کا مال دینا درست نہیں ہے۔

② اور اپنی فروع کو بھی زکوٰۃ ادا نہ کرے:

یعنی بیٹا اور بیٹی۔ پوتا اور پوتی اور پردتا اور پردتی اور نواسا اور نواسی اور نہ ہی ان کی اولاد کو دے اور میاں اپنی بیوی کو زکوٰۃ نہ دے اور نہ بیوی اپنے میاں کو زکوٰۃ دے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور صاحبینؒ کے نزدیک اگر بیوی اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے تو جائز ہے اور باقی رشتے داروں کو زکوٰۃ دینی درست ہے بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوں۔ یعنی غنی' سید' ہاشمی اور کافر نہ ہوں بلکہ بہتر ہے کہ زکوٰۃ کا مال بنسبت غیروں کے اپنے مستحق رشتہ داروں کو دیں۔

③ اپنے رشتے داروں کو دینے کی ترتیب:

اس کی بہتر ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے بہن بھائی کو دے۔ پھر ان کے بعد ان کی اولاد کو پھر چچا اور پھوپھی کو۔ پھر ان کی اولاد کو پھر ماموں خالہ کو۔ پھر ان کی اولاد کو پھر جو خونی رشتہ ہو۔ پھر ہمسائے کو جو اجنبی ہو۔ پھر اپنے ہم پیشہ کو اور پھر ہم وطنوں کو اور اسی طرح صدقۂ فطر اور زکوٰۃ کا حکم ہے کہ ترتیب مذکورہ سے دینا افضل ہے اگر اجنبی کو دے تو تب بھی درست ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اپنے رشتے داروں کو دے۔

④ اپنی لونڈی اور غلام کو زکوٰۃ دینی درست نہیں ہے:

اور یہ ان ہی کے حکم میں ہے اور ام ولد۔ یعنی جس سے اولاد پیدا ہوئی ہے مالک کا اس کو بھی زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے۔

⑤ جو رشتے سسرال کی طرف سے ہوں ان کو زکوٰۃ دینا درست ہے:

اسی طرح ساس' سسر' سالہ سالی اور جو ان کے رشتے دار ہوں اور اسی طرح سے داماد' بہو کو زکوٰۃ دینا درست ہے اور اسی طرح سوتیلی دادی کو بھی زکوٰۃ دینا درست ہے۔

⑥ زکوٰۃ کا مال غیر کو دینا درست نہیں ہے:

جو بقدر نصاب مال کا مالک ہو۔ خواہ مال نامی ہو یا غیر نامی۔ نامی مال اُسے کہتے ہیں جو مال تجارت سے بڑھتا ہو اور نقدی روپیہ پیسہ وغیرہ سونا چاندی اور سونا' چاندی کا زیور' یہ شارع کے حکم مطابق بڑھوتری کا حکم رکھتے ہیں اور تجارت کے لیے مویشی ہوں یا نسل کو بڑھانے کے لیے یہ تمام حقیقۃً مال نامی ہے۔

اور غیر نامی وہ مال ہوتا ہے جو بڑھتا نہ ہو۔ جیسے حویلی اور کپڑا اور برتن وغیرہ اگر یہ چیزیں ضرورت اصلیہ سے زائد ہوں اور نصاب کی بقدر ہوں اور قرض سے فارغ ہوں تو بھی زکوٰۃ لینی جائز نہیں ہے اور رہنے کے لیے حویلی ہو اور پہننے کے لیے کپڑے ہوں اور پکانے کے برتن ہوں اور پڑھنے کے لیے کتابیں ہوں اور سپاہی کے ہتھیار ہوں اور کاریگروں کے اوزار ہوں یہ سب حوائج اصلیہ میں شمار ہوتے ہیں۔

⑦ ہاشمی کو زکوٰۃ دینا درست نہیں اور ہاشمی پانچ شخصوں کی اولاد ہے:

① ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد۔ ② دوسری جعفر رضی اللہ عنہ کی اولاد۔ ③ تیسری عقیل کی اولاد۔ ④ اور چوتھی حضرت

عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد۔ ⑤ اور پانچویں حارث بن عبدالمطلب کی اولاد ان حضرات کے غلاموں اور لونڈیوں کو بھی زکوۃ دینی درست نہیں ہے جب ان کے غلام اور لونڈیاں آزاد ہوجائیں تو پھر بھی ان کو زکوۃ دینا درست نہیں ہے۔

⑧ کافر کو بھی زکوۃ دینا درست نہیں ہے خواہ وہ حربی ہو یا ذمی۔

⑨ اگر غلطی سے کسی ہاشمی یا غنی کو یا کافر کو زکوۃ دے دی یا اپنے باپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنی بیوی کو زکوۃ دیدی پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تو یہ صورتحال ہے تو زکوۃ مالک کے ذمہ سے ادا ہوگئی۔

⑩ زکوۃ کا مال مسجد کو دینا یا کفن میت کے لیے یا میت کا قرض اتارنے کے لیے دینا جائز نہیں ہے۔

مستحقین زکوۃ:

زکوۃ کے مستحق فقیر ہیں اور فقیر کی حد یہ ہے کہ وہ نصاب سے کم مال کا مالک ہو اور زکوۃ کا مستحق مسکین بھی ہے اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور زکوۃ کا مستحق وہ بھی ہے کہ وہ حاکم کی طرف سے زکوۃ لینے پر عامل ہو۔ اگرچہ وہ خود غنی ہو اور ہاشمی کو زکوۃ کے مال کا پیسہ لینا درست نہیں ہے اور زکوۃ کے مستحق وہ بھی ہیں جو جہاد کے لیے یا حج کے لیے جائیں اور ان کے پاس پیسہ ختم ہوگیا ہوں اگرچہ اس کے پاس حضر میں مال موجود ہے۔ اسی طرح کسی مسافر کو بھی زکوۃ دینی درست ہے اگرچہ اس کے پاس وطن میں مال ہو اور جس شخص کے پاس ایک دن کی خوراک ہو اس کے لیے سوال کرنا درست نہیں ہے۔

الفصل الاول:

بنو ہاشم کے لیے صدقہ کھانے کی ممانعت

۱۸۲۱: عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرَةٍ فِي الطَّرِيْقِ فَقَالَ لَوْلَآ اَنِّيْ اَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ لَاَ كَلْتُهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۹۳/٤ ـ حديث رقم ۲۰۵۵ ـ ومسلم في صحيحه ۷۵۲/۲ حديث رقم (۱٦٤ ـ ۱۰۷۱) ـ وابوداؤد في السنن ۳۰۰/۲ حديث رقم ۱٦٥۲ ـ واحمد في المسند ۲۹۱/۳ ـ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر کھجور کے ایک دانہ کے پاس سے ہوا جو راستے میں پڑا ہوا تھا پس فرمایا کہ اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا یہ زکوۃ کی کھجور ہے تو میں اس کو (اللہ کی نعمت کی تعظیم کی خاطر) کھالیتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله: فقال: لولا أني اخاف ان تكون من الصدقة ـ لاكلتها: یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ راستے میں کوئی معمولی چیز کھانے کو ملے تو اس کا کھانا جائز ہے جس کو مالک اس کا تلاش نہ کرتا ہو اور یہ کہ اولیٰ بات یہ ہے کہ متقی اس چیز سے بچے جس میں شک ہو۔ ''احیاء میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا کہ ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان تھے تو آپ کی بعض بیویوں نے کہا کہ کیا آپ پریشان ہیں؟ کہا ہاں (وجدت تمرة فخشيت ان تكون من الصدقة) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں

(فاكلتها فخشيت) ۔

جہاں تک تعلق ہے حضرت عمرؓ سے مروی روایت گی کہ: ان عمرؓ رای رجلا ینادی علی عنبة التقطها فضربه بالدرة و قال ان من الورع ما یمقت الله علیه۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا جو انگوروں پر بلا رہا تھا جو اس نے اُٹھائے تھے تو اس کو درہ کے ساتھ مارا اور کہا: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑ کر ورع کو اختیار کر۔ تو اس بات پر اس کو محمول کیا جائے گا کہ اس کا مقصد ریاکاری اور نمود و نمائش تھا وہاں پر ورع کا ظاہر کرنا تھا۔ اور اپنے اس فعل کی بناء پر صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے نکل کی وجہ سے کہ ان کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے پیچھے پڑے بغیر وہ وضو کرتے تھے اور ننگے پاؤں چلتے تھے۔ وہ راستے میں نماز پڑھتے تھے قطع نظر اس کے کہ وہاں نجاست ہے یا نہیں۔ نبی ﷺ کے پاس مشرکین کی طرف سے حلوہ وغیرہ اور جبہ لایا گیا، آپ ﷺ نے اس کو کھایا اور جبہ پہنا اگر کوئی دور کے احتمالات سوچنا شروع کر دے تو روئے زمین کی ہر کوئی چیز حلال کی نہ پائے گا۔ اس لیے بعض نے کہا: حلال کا یقینی تصور آسمان سے نازل ہونے والے پانی سے ہوتا ہے جو انسان کے ہاتھ کو بھی پہنچتا ہے۔

آپ ﷺ کا صدقہ کھانے سے اجتناب کرنا

۱۸۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ تَمْرَةً مِّنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ فَجَعَلَهَا فِیْ فِيْهِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَخْ كَخْ لِيَطْرَحَهَا ثُمَّ قَالَ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵٤/۳۔ حدیث رقم ۱٤۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۷۵۱/۲ حدیث رقم (۱٦۱۔ ۱۰٦۹)۔ والدارمی فی السنن ٤۵۲/۱ حدیث رقم ۱۵۹۱۔ واحمد فی المسند ۲۰۰/۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے زکوٰۃ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دور کر، دور کر یعنی نکال دو۔ یعنی اس کو پھینک دو۔ پھر فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ ہم بنو ہاشم صدقہ نہیں کھاتے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: (فقالوا النبی ﷺ كخ كخ) کاف کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اور خاء ساکن ہے۔ دوسرا قول: کاف کے کسرہ اور خاء کے تنوین کے ساتھ یہ لفظ فارسی سے عربی بنایا گیا ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے جس کے ساتھ بچوں کو تکلیف دہ چیزوں سے ڈانٹا (روکا) جاتا ہے۔ یعنی بمعنی اترك وارم۔ چھوڑ دے۔ پھینک۔ لفظ کو مکرر لانا تاکید کے لیے ہے۔

لیطرحها: یعنی کھجور کو نکال کر پھینک دے۔

قوله: قال اما شعرت: کیا تجھے معلوم نہیں جیسے دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔

لا ناکل الصدقة: ابن حجرؒ کہتے ہیں: ایسا جملہ کسی واضح حکم پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ مخاطب کو اس کا علم نہ ہو۔ یعنی یہ واضح ہونے کے باوجود تجھ پر کیسے مخفی ہے۔ یہ ڈانٹنے کا بلیغ طریقہ ہے کہ ایسا نہ کر۔ اس کے ذریعے ایسے شخص کو مخاطب کیا گیا ہے جس کو ابھی تمیز نہیں ہے۔ (چیزوں کی پہچان نہیں ہے) اس پر یہ جملہ بھی دلالت کرتا ہے كخ كخ۔ یہ جملہ اس کو کہا جاتا ہے جس کو شعور

نہ ہو۔ حاضرین کے لیے اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس حکم کو عام کردیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں: یہ فعل رسول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ باپ پر اولاد کو اس چیز سے روکنا واجب ہے جو شرعاً جائز نہیں۔ اس لیے ہمارے علماء کہتے ہیں: ماں باپ کا بچے کو ریشمی لباس پہنانا حرام ہے۔ اسی طرح سونے چاندی کے زیورات پہنانا بھی حرام ہے۔ امام شافعی کا مسلک اس کے برعکس ہے۔ غزالی نے اس حدیث کو ''احیاء'' میں متقین کے زہد و ورع میں ذکر کیا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ پر فرض اور نفلی دونوں صدقات حرام ہیں اور آپ کی آل پر فرض صدقہ حرام ہے اس کے علاوہ نہیں۔ ہمارے ائمہ کا کلام (ان کا بیان) ابھی آگے آرہا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور آلِ محمد ﷺ کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے

۱۸۲۳: وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِيَ اَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ۔ (روه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٧٥٣/٢ حديث رقم (١٦٧ - ١٠٧٢)۔ والنسائي في السنن ١٠٥/٥ حديث رقم ٢٦٠٩۔ واحمد في المسند ١٦٦/٤۔

ترجمہ: حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ یعنی زکوۃ آدمیوں کی میل ہے اور محمد ﷺ کے لیے اور محمد ﷺ کی اولاد کے لیے یعنی بنی ہاشم کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: **إن هذه الصدقات** :یعنی زکوۃ کی اقسام اور صدقات کی انواع۔ **انما هي اوساخ الناس** : یہ جملہ "هذه کے لئے" خبر کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا﴾ [الكهف: ٣٠] ''(اور) جو ایمان لائے اور کام بھی نیک کرتے رہے تو ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے'' خبر کو مقدر ماننے کی ضرورت نہیں اسی قول کو ابن حجر نے اختیار کیا ہے۔ اور نہ ہی اس کو ماقبل سے بدل بنانے کی ضروری ہے۔ یا اسی طرح کہ وہ زائدہ یا اس جیسی کوئی اور تقدیر تاویل ماننے کی ضرورت نہیں۔ اس کا نام لوگوں کی میل کچیل اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے مال اور جانوں کو پاک کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ [التوبة: ١٠٣] یہی دھلنے کی میل کی طرح ہے اور اس میں تشبیہ بلیغ ہے۔

قوله :وانها لا تحل لمحمد ولا لال محمد :ایک لا دوسرے لائے نافیہ کی تاکید کے لیے ہے اسی طرح دوسرا لام بھی ہے۔ میرک فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ صدقہ آپ اور آپ کی آل پر حرام ہے خواہ کسی نام کی وجہ سے ہو یا فقیر اور مسکین کی وجہ سے ہو یا ان کے علاوہ ہو۔ یہی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ ابن الملک کہتے ہیں صدقہ خواہ نفلی ہو یا فرضی نبی ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے۔ اسی طرح فرض صدقہ آپ کی آل اور اقربا کے لئے حرام ہے۔ رہا نفلی صدقہ تو یہ ان کے حلال ہے۔ ابن ہمام صاحب ہدایہ کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: صدقہ بنو ہاشم کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا اور یہی ظاہری روایت کا معنی

ہے۔

ابوعصمہ نے ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے: ہمارے اس دور میں یہ جائز ہے اور رسول اللہ کے زمانے میں منع تھا۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ بنو ہاشم ایک دوسرے کو زکوۃ دے سکتے ہیں۔ شمنی فرماتے ہیں: بنو ہاشم میں آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے بیٹیوں میں سے حارث کی اولاد آپ کے چچا ابو طالب کے بیٹیوں میں سے حضرت علیؓ حضرت جعفر اور عقیل کی اولاد شامل ہیں۔ بنو ابی لہب اس میں شامل نہیں ہیں۔ صدقہ سب سے پہلے آباء میں حرام ہوتا ہے یہ ان کی عزت و تکریم کی وجہ سے ہے۔ پھر اس کے بعد بیٹوں کی باری ہے۔ ابولہب کے لیے کوئی عزت و تکریم نہیں۔ میرک ایک طویل قصہ میں کہتا ہے۔ آل نبی پر صدقہ حرام والی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: مسلمؒ نے عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث سے روایت کیا ہے:

قال اجتمع ابن ربيعة والعباس بن عبدالمطلب' فقالا لو بعثنا هذين الغلامين والفضل ابن عباس الى رسول الله ﷺ فا مرهما على هذه الصدقة فاصابا منها يصيب الناس. فقال على لا ترسلوها فانطلقنا حتى دخلنا زينب بنت جحش فقلنا على رسول الله وهو يومئذ عند يا رسول ﷺ قد بلغنا النكاح وأنت أبر الناس وأوصل الناس وجئناك لتوء مرنا على هذه الصدقات فنؤدى اليك كما يؤدى الناس' ونصيب كما يصيبون قال :فسكت طويلا :ثم قال :ان الصدقة لا تنبغى لآل محمد انما هى اوساخ الناس' ادعوا الىّ محمية بن جزء رجلاً من بنى أسد كان رسول الله ﷺ يستعمله على الأخماس و نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب فأتياه فقال لمحمية أصدق عنهما من الخمس كذا و كذا۔

کہا ابن ربیعہ اور عباس بن عبدالمطلب اکھٹے ہوئے اور کہا: میرے لیے اگر آپ یہ غلام بھیج دیں اور ابن عباسؓ کی رسول اللہ کے ہاں فضیلت بھی ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو اس کے صدقہ کا حکم دیا تو ان کو اس سے وہی ملا جو لوگوں کو ملتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا: تم ان دونوں کو نہ بھیجو۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور آپ کے پاس پہنچے تو اس آپ زینب بنت جحش کے پاس تھے۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم بالغ ہو چکے ہیں اور آپ لوگوں میں سب سے زیادہ نیکی اور صلح رحمی کرنے والے ہیں ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں تا کہ آپ ہمیں ان صدقات پر امیر بنا دیں۔ ہم آپ کو دوسری لوگوں کی طرح ادا کریں گے جیسے دوسرے لوگوں کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی کچھ حاصل ہو۔ آپ زیادہ دیر خاموش رہے پھر کہا: **ان الصدقة لا تنبغى لآل محمد انما هى او ساخ الناس أدعوا إلى محمية بن جزء......** صدقہ آل محمد کے لیے جائز نہیں یہ لوگوں کی میل کچیل ہے۔ محمیہ بن جزء کو بلا و یہ بنو اسد کا ایک آدمی تھا اور رسول اللہ نے اخماس (مال خمس) پر مسئول بنایا تھا اسی طرح اس کے ساتھ نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو بھی بلایا وہ دونوں آئے تو آپ نے ان سے کہا: **اصدق عنهما من الخمس۔** ان دونوں کو اتنا اتنا صدقہ خمس میں سے دے دو۔

ابن ہمام کہتے ہیں: یہ وہ دلیل ہے جس کا ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا اور یہ اس بات پر دال ہے کہ ہاشمی عامل کے لیے صدقہ لینا درست نہیں اس نص کے الفاظ طبرانی کے ہیں۔ (**لا يحل لكم اهل البيت من الصدقات شئ انما هى**

غسالة ايدى الناس وان لكم فى خمس الخمس مايغنيكم) اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ان کا آپس میں ایک دوسرے پر صدقہ کرنا حرام ہے۔ اسی طرح بخاریؒ نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے۔ **قوله : (نحن اهل البيت لا تحل لنا الصدقة)** ۔

اس میں کوئی خفا نہیں کہ یہ سارے عمومات نفلی اور فرضی صدقہ کو شامل ہیں۔ لہٰذا صدقہ واجبہ میں تو ان عمومات کے موجب کے مطابق حرمت ہی کو اختیار کیا۔ اور یہ کہا کہ قسم کا کفارہ، ظہار، قتل شکار کی جزاء، زمین کا عشر اور وقف شدہ غلہ بھی ان کی طرف پھیرنا (لوٹانا) جائز نہیں۔ رہا نفلی صدقہ تو نہایہ میں ابن ہمام کا قول ہے۔ نفلی صدقہ کے جائز ہونے پر اجماع ہے۔ اس طرح غنی کے لیے بھی نفلی صدقہ جائز ہے، جس طرح کہ اس کا ثبوت فتاویٰ عتابیہ میں ہے۔

''کافی'' میں اس بات کی صراحت ہے کہ ان کو وقف صدقہ دینا جائز ہے اختلاف ذکر کہ بغیر بطور مذہب کے اس کو بیان فرمایا۔ اس میں ہے کہ فرضی صدقہ دینے والا اپنے نفس کی تطہیر کرتا ہے اور اس سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اور ادا کرنے میں کچیل سے بھرا ہوتا ہے، جس طرح ماءِ مستعمل ہے۔ اور نفلی میں وہ بے مانگے صدقہ کرتا ہے جو اس پر فرض نہیں ہے۔ اور اس میں صدقہ دینے والا غلاظت میں ایسے نہیں ہوتا کہ وہ پانی سے پاک ہو۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ صدقہ وقف نفل کی طرح ہے۔ اگر نفلی صدقہ دینے کا ثبوت ہے تو اسی طرح وقف بھی جائز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وقف کرنے والا بے مانگے صدقہ وقف کرنے والا ہے جبکہ اس پر یہ خرچ کرنا فرض نہیں۔ اور یہ صدقہ مالک پر زبردستی کر کے واجب نہیں کیا گیا۔ بلکہ غایۃ الامر یہ ہے کہ ناظر پر واقف کرنے والے کی شرط ماننا ضروری ہے۔ واجب کو ادا کرنا اس وجوب کا خود تقاضا ہے۔ ہم نفلی صدقہ پر کلام کریں گے۔

شرح کنز میں ہے نفلی اور فرضی صدقہ میں کوئی فرق نہیں پھر کہا کہ بعض لوگوں کا موقف ہے کہ ان (بنو ہاشم) کے لیے نفلی صدقہ جائز ہ انہوں نے اختلاف اس طریقے سے ثابت کیا کہ اس سے حرمت کی جانب کو ترجیح ہوتی ہے جو کہ عمومات دلائل کے موافق ہے۔ اس کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں نفلی صدقہ بھی نہیں دیا جائے گا۔ سوائے ہبہ و ہدیہ وغیرہ کے اور یہ ادب کا تقاضا بھی ہے۔ کہ آپ کے اہل بیت کے لیے عزت وتکریم کا پہلو نمایاں ہونا چاہیے۔ اس حدیث پر عمل کریں اور اسے لازم پکڑیں۔ بریرہؓ پر گوشت صدقہ کیا گیا آپ نے نہیں کھایا۔ یہاں تک کہ اُسے ہدیہ قرار دیا فرمایا (**هو عليها صدقة ولنا هدية**) اور یہ بات ظاہر ہے کہ وہ نفلی صدقہ تھا۔

آپ ﷺ صدقہ نہیں کھاتے تھے ہدیہ کھالیا کرتے تھے

۱۸۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِطَعَامٍ سَأَلَ عَنْهُ اَهَدِيَّةٌ اَمْ صَدَقَةٌ فَاِنْ قِيْلَ صَدَقَةٌ قَالَ لِاَ صْحَابِهٖ كُلُوْا وَلَمْ يَاْ كُلْ وَاِنْ قِيْلَ هَدِيَّةٌ ضَرَبَ بِيَدِهٖ فَاَ كَلَ مَعَهُمْ ۔

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٢٠٣/٥۔ حدیث رقم ٢٥٧٦۔ ومسلم فی صحیحه ٧٥٦/٢ حدیث رقم (١٧٥۔

۱۰۷۷)۔ والترمذی فی السنن ۴۵/۳ حدیث رقم ٦٥٦۔ والنسائی ۱۰۷/۵ حدیث رقم ۲٦۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کھانا لایا جاتا۔ تو آپ اس کے بارے میں پوچھتے کہ آیا یہ ہدیہ ہے یعنی تحفہ ہے یا صدقہ؟ اگر کہا جاتا ہے کہ صدقہ ہے تو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرماتے کہ کھاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود نہ کھاتے اور اگر کہا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے تو دراز کرتے یعنی اپنا ہاتھ بڑھاتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ کھاتے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔

تشریح: أهدية: کیا یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے؟

ام صدقة :ای أهو هدية أم صدقة؟ ای هو صدقة۔

ضرب بيده : باء متعدی بنانے کے لیے ہے۔ یعنی اپنے ہاتھ سے جلدی جلدی لے لیتے بغیر کسی تمام (رکاوٹ) کے۔

فاكل معهم : صدقہ اور ہدیہ الگ الگ ہیں۔ جب صدقہ حرام کیا گیا تو ہدیہ حلال قرار دیا گیا۔ صدقہ سے آخرت کے ثواب کی نیت ہوتی ہے اور یہ دینے والے کی عزت کی بنیاد ہے اور ضرورت کے لحاظ سے لینے والے کی نیت ہے اور اس پر رحم و شفقت کا پہلو ہوتا ہے۔ اور ہدیہ جس کو دیا جائے اس کا تقرب اور عزت و تکریم مقصود ہوتی ہے۔ اور اس میں انتہا درجہ کی عزت اور نرمی اس کے لیے ہوتی ہے اور دنیا میں ہی اس کا بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ اسی لیے آپؐ ہدیہ لے لیتے تھے اور اس کے بدلے آپؐ بھی ہدیہ دیتے۔ اس میں کوئی احسان کا پہلو نہیں ہے بلکہ صرف محبت کے لیے ہے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے (تهادوا تحابوا) صدقہ کا بدلا آخرت میں ہے۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں احکام

۱۸۲۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ فِيْ بَرِيْرَةَ ثَلَاثُ سُنَنٍ اِحْدَى السُّنَنِ اَنَّهَا عَتَقَتْ فَخُيِّرَتْ فِيْ زَوْجِهَا وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ وَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْبُرْمَةُ تَفُوْرُ بِلَحْمٍ فَقُرِّبَ اِلَيْهِ خُبْزٌ وَاُدْمٌ مِنْ اُدْمِ الْبَيْتِ فَقَالَ اَلَمْ اَرَ بُرْمَةً فِيْهَا لَحْمٌ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّ ذٰلِكَ لَحْمٌ تُصُدِّقَ بِهٖ عَلٰى بَرِيْرَةَ وَاَنْتَ لَا تَأْكُلُ الصَّدَقَةَ قَالَ هُوَ عَلَيْهَا صَدَقَةٌ وَّلَنَا هَدِيَّةٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤٠٤/٩۔ حديث رقم ٥٢٧٩۔ ومسلم فی صحيحه ١١٤٤/٢ حديث رقم (١٤۔ ١٥٠٤)۔ والنسائی فی السنن ١٠٧/٥ حديث رقم ٢٦١٤۔ وابن ماجه ٦٧١/١ حديث رقم ٢٠٧٦۔ والدارمی ٢٢٢/٢ حديث رقم ٢٢٨٩۔ ومالك فی الموطأ ٥٦٢/٢ حديث رقم ٢٥ من كتاب الطلاق۔ واحمد فی المسند ٢٨١/١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت بریرہؓ کے لیے تین احکام ہیں۔ ایک حکم یہ ہے کہ جب وہ آزاد ہوئیں تو ان کو اپنے خاوند کے ساتھ نکاح کو برقرار رکھنے کا اختیار دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آزادی کا حق اس شخص کے لیے جس نے آزاد کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے۔ ہانڈی گوشت کے پکنے کے ساتھ جوش مار رہی تھی۔ پس حضور

ﷺ کے سامنے گھر کے سالنوں میں سے ایک سالن لایا گیا پس فرمایا کہ میں نے ہانڈی میں گوشت دیکھا ہے۔ گھر والوں نے عرض کیا کہ ایسے ہی ہے لیکن ہانڈی میں جو گوشت کے طور پر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ دیا گیا ہے اور آپ ﷺ صدقہ نہیں کھاتے فرمایا کہ وہ گوشت اس پر صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: کان فی بریرہ : بریرہ کی وجہ سے حاصل ہوئے۔

ثلاث سنن : یعنی شرعی احکام مسائل یعنی ان مسائل کو ان کی جگہ پر۔۔ کر دیا۔ کیونکہ وہ مسائل ان کے وجہ سے وجود میں آئے۔ بریرۃ ایک باندی کا نام ہے۔ عائشہؓ نے اُسے خرید کر آزاد کر دیا تھا اور جنہوں نے اُسے بیچا ان کا دعویٰ تھا کہ ولاء کی نسبت ان کی طرف ہوگی۔ جس وقت وہ آزاد ہوئیں۔ وہ مغیث نامی غلام کی بیوی تھیں۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے اور ابن حجر نے اس کو ذکر کیا ہے۔

عتقت : ''تاء'' اور عین کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی وہ معتوقہ (آزاد) ہوگئیں۔

فخیرت فی زوجھا : یعنی نکاح کو فسخ کرنے یا باقی رکھنے میں عورت جب لونڈی ہو اور اس کا خاوند بھی غلام ہو اور عورت پہلے آزاد ہو جائے تو اس کو اختیار مل جاتا ہے اگر چاہے نکاح فسخ کر دے اگر چاہے اس نکاح کو باقی رکھے۔ یہ ان مسائل میں سے پہلا مسئلہ ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ : یعنی اس کا فیصلہ کیا۔ یہ مشہور قصہ ہے۔

الولاء : واؤ کے فتح کے ساتھ۔

لمن اعتق : اس کے لیے نہیں جس نے بیچا اگر چہ وہ بیچتے وقت یہ شرط لگا لے کہ ''ولاء'' کی نسبت اس کی طرف ہوگی۔ جس نے کسی غلام یا لونڈی کو آزاد کیا ولاء کی نسبت اس کی طرف ہوگی۔ اور یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

قولہ : ودخل رسول اللہ ﷺ : یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔

والبرمۃ : پتھر کی ہنڈیا اور پھر مطلق ہنڈیا پر بولا جانے لگا۔

تفور بلحم: جملہ حالیہ ہے۔ ای تفور ملتبسۃ بلحم۔

فقرب : صیغہ مجہول اور تشدید کے ساتھ فَقُرِّبَ۔

قولھا (إلیہ خبز وأدم) ھمزہ کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ۔ اور ضمہ کے ساتھ ادام کے معنی میں ہے۔ وہ چیز جس کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے۔ یعنی کھانے کا لطف اور مزہ اُدُم کے سبب سے ہے۔

قولھا : من ادم : دو ضموں کے ساتھ ''ادام'' کی جمع ہے۔ جب ہنڈیا میں سے آپ علیہ السلام پر کچھ پیش نہ کیا گیا تو آپؐ نے کہا:

الم ار برمۃ فیھا لحم ؟ استفہام تقریری ہے۔

قولھا : قال : ھو علیھا صدقہ ولنا ھدیۃ۔

امام طیبی فرماتے ہیں: جب کسی پر کوئی صدقہ کیا جائے اور وہ محتاج ہو تو وہ اس چیز کا مالک بن جاتا ہے اب وہ کسی دوسرے کو ہدیہ دے سکتا ہے۔ اور یہی معنی بن الملک کے قول کا ہے۔ جس پر صدقہ حرام ہوا اس کو صدقہ ہدیۃً دیا جاسکتا ہے۔ یہ تیسرا مسئلہ ہے۔ میرک فرماتے ہیں یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحفہ کا بدلہ دیا کرتے تھے

۱۸۲۶: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَيُثِيْبُ عَلَيْهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥ حديث رقم ٢٥٨٥۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تحفہ قبول کرتے تھے اور اس کا بدلہ دیتے تھے۔ یہ امام بخاریؒ نے روایت کی ہے۔

تشریح: يثيب عليها : آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کے بدلے میں یعنی جو کوئی آپ کو چیز دیتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بدلا اور عوض دیتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم قیمت کے ہدیے کو بھی قبول کر لیتے تھے

۱۸۲۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْدُعِيْتُ اِلٰى كُرَاعٍ لَاَجَبْتُ وَلَوْ اُهْدِیَ اِلَیَّ ذِرَاعٌ لَقَبِلْتُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٩٩/٥۔ حديث رقم ٢٥٦٧۔ واحمد فی المسند ٤٢٤/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے بکری کی کراع (یعنی پنڈلی) کی طرف بلایا جائے تو میں قبول کروں۔ اگر میری طرف بکری کا ایک دست بھیجا جائے تو بھی قبول کرلوں گا۔ اس کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قال رسول الله ﷺ لودعيت الى كراع : یعنی کراع غنم یا اس کے قریب کسی جگہ پر دعوت کے لیے بلایا جاتا

لأجبت ولو أهدى إلیّ ذراع لقبلت :

ذراع : اس سے مراد "ذراع کرباس" (انگریزی گز) ہے یا بکری کا بازو اور دستہ ہے۔

طیبی فرماتے ہیں: کراع بکری یا گائے کی پنڈلی کے باریک حصے کو کہتے ہیں جو گھوڑے یا اونٹ کی ہنڈل کے قائم مقام ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جگہ کا نام ہے۔ پہلے قول میں اس کے کم ہونے کے باوجود قبول کرنے میں مبالغہ ہے۔ اور دوسرا دوری کی وجہ سے مبالغہ ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں: اگر کوئی کراع غنم بکری کی پنڈلی پر میری ضیافت کرتا تو میں اس کی دعوت قبول کرتا۔ یہ تواضع، قبولِ دعوت اور حسنِ معاشرت پر رغبت دلاتا ہے۔

قاضی کہتا ہے: جس نے اسے کراع الغمیم پر محمول کیا ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان جگہ کا نام ہے وہ غلطی پر ہے۔ ابن حجر اس سے بے خبر ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا کہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد کراع الغمیم جو عسفان کے آگے ہے ہو اور کواع الغمیم عسفان اور قدید کے درمیان جگہ ہے۔

زین العرب کہتا ہے ذراع سے مراد بکری یا کسی اور جانور کا ذراع ہے۔ ذراع کر باس (انگریزی گز ز) مراد ہے اور یہ ہدیہ قبول کرنے پر ترغیب ہے۔

سید جمال الدین کہتا ہے: اس حدیث کو "باب من لا تحل له الصدقة" میں داخل کرنا اس میں ایک مخفی علت ہے اس پر غور کریں۔ ہم نے غور کیا تو ہمیں پتا چلا کہ پچھلی حدیث میں صدقہ اور ہدیہ کا ذکر ہے چونکہ اس حدیث کا تعلق ہدیہ کے ساتھ ہے اس لیے اس کو ذکر کیا۔ جیسے کہتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے اور اس کا نام استطاد رکھا جاتا ہے۔

امام میرک ؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

مسکین کی تعریف

۱۸۲۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْمِسْكِیْنُ الَّذِیْ یَطُوْفُ عَلَی النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰكِنَّ الْمِسْكِیْنَ الَّذِیْ لَا یَجِدُ غِنًی یُّغْنِیْهِ وَلَا یُفْطَنُ بِهٖ فَیَتَصَدَّقُ عَلَیْهِ وَلَا یَقُوْمُ فَیَسْأَلُ النَّاسَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۴۱/۳۔ حدیث رقم ۱۴۷۹۔ واخرجه مسلم فی صحیحه ۷۱۹/۲ حدیث رقم (۱۰۱۔ ۱۰۳۹)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲۸۳/۲ حدیث رقم ۱۶۳۱۔ والنسائی فی السنن ۸۴/۵ حدیث رقم ۲۵۷۱۔ والدارمی فی السنن ۴۶۲/۱ حدیث رقم ۱۶۱۵۔ ومالك فی الموطأ ۹۲۳/۲ حدیث رقم ۷ من کتاب صفة النبی ﷺ۔ واحمد فی المسند ۳۸۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسکین وہ شخص نہیں ہے کہ جو لوگوں کے پاس ایک لقمے یا دو لقموں یا ایک کھجور یا دو کھجوروں کے لئے جاتا ہے لیکن مسکین وہ شخص ہے کہ اس کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ جو اس کو مستغنی کردے اور اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ وہ محتاج ہے یا نہیں (یعنی حال کے ظاہر نہ ہونے کی بنا پر اس کی احتیاج کا پتہ نہیں چلتا کہ اس پر صدقہ کیا جائے) اور لوگوں سے مانگنے کے لیے گھر سے نہیں نکلتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: قال رسول اللّٰہ ﷺ لیس المسکین الذی یطوف علی الناس...... والتمرتان: یعنی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ...... ﴾ [التوبة: ۶۰] "صدقات (یعنی زکوۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے۔ اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہئے یہ حقوق) خدا کی طرف

سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے" شرعی لحاظ سے مسکین کا معنی وہ نہیں جو عرف میں ہے اور وہ:

علی الناس : ابن حجر کی اصل (فتح الباری) میں اس طرح ابواب ہیں۔

ترده اللقمة واللقمتان والتمرة والتمرتان : جملہ حالیہ ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں: وہ مسکین نہیں ہے جو بار بار دروازہ پر آتا ہے وہ روٹی مانگتا ہے جو یہ کام کرے وہ مسکین نہیں ہے۔ کیونکہ قوت (غلہ) حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور جو یہ کام اضطراری حالت کے بغیر کرے اس کی مذمت کی جائے گی۔ طیبی فرماتے ہیں: وہ زکوۃ کا مستحق نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اس کے استحقاق کی نفی مقصود نہیں بلکہ اس متعارف مسکین کے علاوہ کے لئے مسکینی ثابت کرنا مقصود ہے اور یہ کہ وہ غیر متعارف مسکین بھی مستحق ہے۔

اور یہ قبیل کے ساتھ مذکورہ قول ہی صحیح ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک مصرف زکوۃ ہے جب ان دونوں کے پاس کچھ نہ ہو لیکن دوسرے (غیر متعارف مسکین) کو زکوۃ دینا افضل ہے اور یہی معنی اگلے جملہ کا ہے۔

نكن : اور ایک نسخہ میں نون کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی جو مسکینی میں کامل ہو۔

لا يفطن : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

فيتصدق : رفع کے ساتھ اور نصب کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے۔

فيسأل الناس : الناس رفع کے ساتھ اور نصب کے ساتھ یعنی وہ آدمی تو معلوم ہوتا ہے سب لوگ اس کو جانتے ہیں لیکن اس کی حالت مخفی ہوتی ہے اور حدیث میں پیچھے گزرے ہوئے کلام کی طرف اشارہ ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة:۲۷۳] "(اور ہاں تم جو خرچ کرو گے) تو ان حاجتمندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے (اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو (کہ حاجتمند ہیں اور شرم کے سبب) لوگوں سے (منہ پھوڑ کر اور) لپٹ کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ خدا اس کو جانتا ہے" یعنی اصلاً اس میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کی دلیل ہے اور جنہوں نے ان دونوں کے مسلک کو اختیار کیا ہے کہ مسکین وہ ہے جو کہ کسی چیز کا مالک نہ ہو۔ اور اس کی حالت فقیر سے بدتر ہوتی ہے اور بعض شافعیہ نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقیری سے پناہ مانگتے تھے یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے۔

ترمذی کی روایات میں ہے کہ مسکینی کا سوال کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ترمذی کی حدیث ضعیف ہے بلکہ بیہقی نے روایت بیان کی ہے کہ آپ مسکینی سے بھی پناہ مانگتے تھے پھر اس کو اس پر محمول کیا گیا کہ آپ نے فقر اور مسکینی کے فتنہ سے پناہ مانگی ہے یہ دونوں چیزیں ان کا معنی انتہا درجے کی قلت کی طرف لوٹتا ہے جس طرح کہ حدیث میں وارد ہے: "كاد الفقران يكون كفرا" قریب ہے کہ فقیری کفر میں لے جائے۔ یا اس سے مراد دل کا فقر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ فقیری کی حالت سے پہلے پہلے فقیری کے فتنہ سے پناہ مانگنی چاہیے۔ جس طرح کہ آپ نے غنی کے فتنہ سے پناہ مانگی ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی عطا شدہ نعمتوں

ہے۔ترمذی میں مذکورہ مسکینی سوال کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکینی بطور تواضع ''جو مسکینی کا خاصہ'' مانگا تھا۔تا کہ قیامت دن آپ کا حشر اغنیاء اور مالدار متکبرین لوگوں کے ساتھ نہ ہو۔اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔

الفصل الثانی:

بنو ہاشم کے غلاموں کے لیے زکوۃ کا مال حلال نہیں ہے

۱۸۲۹:عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ رَجُلاً مِّنْ بَنِیْ مَخْزُوْمٍ عَلَى الصَّدَقَةِ فَقَالَ لِاَبِیْ رَافِعٍ اَصْحِبْنِیْ كَیْ مَا تُصِیْبَ مِنْهَا فَقَالَ لَا حَتّٰی اٰتِیَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْاَلَهٗ فَانْطَلَقَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ اِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لَنَا وَاِنَّ مَوَالِی الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواه الترمذی وابو داود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۹۸/۲ حدیث رقم ۱۶۵۰۔ والترمذی ۴۶/۳ حدیث رقم ۶۵۷۔ والنسائی ۱۰۷/۵ حدیث رقم ۲۶۱۲۔ واحمد فی المسند ۱۰/۶۔

ترجمہ:''حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنومخزوم کے ایک شخص کو زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا۔اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو تا کہ اس میں سے تمہیں بھی کچھ حصہ مل جائے ابو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھتا ہوں کہ میں اس شخص کے ساتھ زکوٰۃ لینے جاؤں یا نہیں! چنانچہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے جانے کے بارے میں پوچھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ ہمارے لئے حلال نہیں ہے اور مولیٰ اسی آزاد کرنے والی قوم کے حکم میں ہے۔''

(ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

راوی حدیث:

ابی رافع: ان کا نام اسلم ہے ان سے روایت کرنے والا ان کا بیٹا عبداللہ ہے اور وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کاتب تھے یعنی ان کے آزاد کردہ غلام تھے۔

تشریح: أن رسول الله ﷺ بعث رجلا من بنی مخزوم علی الصدقة :یعنی اس کو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیجا تا کہ وہ اکٹھا کر کے آپ کے پاس لے آئے ابن الملک کہتے ہیں کہ جب وہ راستے میں ابورافع سے ملا۔

(قوله فقال لابی رافع اصحبنی) یعنی میرے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چل۔

کیما تصیب: یعنی حق اور ماء زائدہ ہے یعنی تا کہ تو لے۔

صدقہ سے مال میرے ساتھ جانے کی وجہ سے لے یا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو تیرا حصہ زکوٰۃ ۔۔۔ ہیں اور ظاہری معنی یہ ہے کہ اس نے ابورافع سے مرافقت، مصاحبت اور معاونت سفر میں مطالبہ کیا ہے لوٹنے کے بعد

نہیں۔جس طرح کہ ابورافع کا جواب دلالت کررہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فاسأله : یعنی آپؐ سے اجازت مانگوں گا یا سوال کروں گا کہ یہ میرے لیے جائز ہے یا نہیں۔

قوله :فقال ان الصدقة لاتحل لنا وان موالی القوم) یعنی ان کے آزاد کردہ غلام۔

من انفسهم: یعنی ان کا حکم ان کے آزاد کرنے والوں کے حکم جیسا ہے ولاء کی وجہ سے ان کی رشتہ داری نسب کی رشتہ داری کی طرح ہے۔یہ دلیل ہے ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ ان آزاد کردہ غلاموں پر صدقہ حرام ہے جن کے آزاد کرنے والوں پر صدقہ حرام ہے یہ مشہور مذہب ہے۔ابن مالک کا یہ قول عجیب ہے۔کہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے موالی (آزاد کردہ غلاموں) پر صدقہ حرام نہیں سبب نہ ہونے کی وجہ سے۔(موالی اور ان کے آقاؤں کے درمیان جمع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: چونکہ ان کے لیے اپنے قوم کے سرداروں کے ساتھ مشابہت ہے اس لیے ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔گویا کہ وہ (ابن الملک) مذہب سے غافل ہے۔طیبی نے مسلک کی پیروی کی ہے اور طیبی کی بات بہت زبردست ہے جب اُس نے کہا: حدیث کے ظاہر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صدقہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے موال کے لیے جائز نہیں۔علامہ خطابی کہتے ہیں: یہ نہی اس کی تنزیہہ کے لیے ہو اس بات کا بھی امکان ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے اخراجات برداشت کرتے تھے اور یہ ایسی تاویل ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔میرک فرماتے ہیں اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔امام احمد نے اپنی مسند اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ابن ہمام اور شمنی کی نقل میں ہے کہ: فقال مولی القوم من انفسهم، وأنا لاتحل لنا الصدقة۔کسی قوم کے موالی انہی میں سے ہیں اور ہمارے لیے صدقہ حلال نہیں۔

امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی طرح امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

بنی ہاشم کے غلاموں کے لئے بھی صدقہ کے مال کی حرمت

۱۸۳۰:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَّلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ۔ (رواه الترمذی وابوداود والدارمی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۸۵/۲ حدیث رقم ۱۶۳۴۔ والترمذی ۴۲/۳ حدیث رقم ۶۵۲۔ والدارمی ۴۷۲/۱ حدیث رقم ۱۶۳۹۔ واحمد فی المسند ۳۸۹/۲۔

ترجمہ:"اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہ تو غنی کے لئے زکوۃ کا مال لینا حلال ہے اور نہ تندرست وتوانا کے لئے۔ (ترمذی ابوداؤد دارمی)

تشریح: قوله :قال رسول الله ﷺ لا تحل الصدقة لغنی: محیط میں ہے۔غنی کی تین اقسام ہیں:

① وہ جس پر زکوۃ واجب ہے جب وہ صاحب نصاب ہو اور دگرد کے لوگوں سے۔

② جس پر صدقہ (نفلی) حرام ہے اور صدقہ فطر اور قربانی واجب اور اس کا مال ضروری حاجات پوری کرنے کے بعد زائد مال نصاب کی قیمت کو پہنچتا ہے۔

۳ وہ غنی جس کے لیے صدقہ کا سوال کرنا حرام ہے یعنی اس کے پاس ایک دن کی قوت (غلہ) ہے اور وہ اس کے پاس اتنا کپڑا ہو کہ اس کے ستر کو ڈھانپ لے۔

ولا لذی مرۃ : میم کے کسرہ اور راء کی شد کے ساتھ یعنی قوت جو کمانے کی طاقت رکھتا ہے اس کے لیے بھی مانگنا جائز نہیں۔

ابن الملک فرماتے ہیں: جس کے اعضاء صحیح ہوں اُن کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں اس کے پاس اتنا مال کمانے کی طاقت ہے جو اس کے اہل و عیال کے لیے کافی ہو اور یہی قول امام شافعی کا بھی ہے۔ طیبی فرماتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ ایک معنی یہ ہے عقل اور قوت اور یہ کنایہ ہے اُس سے جو کمانے کی قدرت رکھتا ہے اور یہ شافعی اور حنفیہ کا مذہب ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اگر اس لیے صدقہ حلال ہو جاتا ہے۔ میرک فرماتے ہیں اور اس کو حسن کہا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ شعبہ نے اس مرفوع بیان نہیں کیا اور سفیان اس کو مرفوع روایت کرتا ہے۔

۱۸۳۱:وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنِّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

اخرجه النسائی فی السنن ۹۹/۵ حدیث رقم ۲۵۹۷۔ وابن ماجه ۵۸۹/۱ حدیث رقم ۱۸۳۹۔ واحمد فی المسند ۱٦٤/۲۔

ترجمہ:اور احمد' نسائی' وابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ہمام کہتے ہیں۔ اس حدیث کے صحابہ کی جماعت کے بہت سے طرق ہیں اور سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔

صحت مند کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں ہے

۱۸۳۲:وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْخِيَارِ قَالَ اَخْبَرَنِيْ رَجُلَانِ اَنَّهُمَا اَتَيَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَهُوَ يَقْسِمُ الصَّدَقَةَ فَسَأَلَاهُ مِنْهَا فَرَفَعَ فِيْنَا النَّظَرَ وَخَفَضَهُ فَرَاٰنَا جَلْدَيْنِ فَقَالَ اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا وَلَا حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ وَّلَا لِقَوِيٍّ مُّكْتَسِبٍ۔ (رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲۸۵/۲ حدیث رقم ۱٦۳۳۔ والنسائی ۹۹/۵ حدیث رقم ۲۵۹۸۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار کہتے ہیں کہ مجھے دو آدمیوں نے بتایا کہ وہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کو زکوٰۃ کا مال تقسیم فرما رہے تھے ان دونوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس مال میں سے کچھ لینے کی خواہش کا اظہار کیا' وہ دونوں کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر سر سے پاؤں تک نظر دوڑائی اور ہمیں تندرست و توانا دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم زکوٰۃ لینا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں دیدوں لیکن یاد رکھو کہ صدقات و زکوٰۃ میں سے نہ تو غنی کا کوئی حصہ ہے اور نہ اس شخص کا جو تندرست و توانا ہو اور کمانے پر قادر ہو۔'' (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله :وعن عبيد الله بن عدى الخيار: ایک نسخہ میں ''ابن الخیار'' ہے طیبی فرماتے ہیں: قرشی نوفلی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیدا ہوئے۔ بعض انہیں تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت

عثمان اور عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

الوداع : ''واؤ'' کے فتحہ کے ساتھ اور سننے میں یہی مشہور ہے۔

فسألاه منها : یعنی ان دونوں نے مطالبہ کیا کہ صدقہ میں سے کچھ انہیں دیا جائے۔

النظر : یعنی دیکھا جیسا کہ روایت میں ہے۔

فرآنا جلدین لام کے سکون اور کسرہ کے ساتھ یعنی طاقت ور۔

قوله :فقال ان شئتما اعطیتکما : یعنی اس صدقہ سے۔ اور معاملے کی سپرد داری تم دونوں کی دیانت داری پر ہے اگر بغیر حق کے لو گے تو تمہارا معاملہ بہت سنگین ہے اگر تم قوی (طاقتور) ہوئے جس طرح تمہاری حالت سے ظاہر ہے یا پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں: یعنی میں تمہیں نہیں دوں گا۔ چونکہ صدقہ میں ذلت و رسوائی ہے اگر تم اس پر راضی ہو میں تم کو دے دیتا ہوں۔ یا تم کو نہیں دوں گا کیونکہ جو کمانے کی طاقت رکھتا ہے اس پر حرام ہے اگر تم حرام کھانے کے لیے رضامند ہو تو میں تم کو دے دیتا ہوں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توبیخاً کہا۔ ابن ہمام کہتے ہیں: حدیث اس پر دال ہے کہ ان دونوں کا سوال کرنا حرام تھا آپؐ کے اس قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے ''وإن شئتما اعطیتکما''۔ اگر صدقہ لینا حرام تھا اور صاحب مال سے صدقہ کی ادئیگی ساقط نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے۔

رواہ ابوداؤد یعنی عن هشام بن عروة عن أبیه عن عبد الله بن عدی فی شرح ابن الهمام۔ صاحب تنقیح کہتا ہے: حدیث اصل کتاب میں بھی اسی طرح ہے اس کے آگے کچھ نہیں۔

امام احمد کہتے ہیں: اس طرح اچھی سند والی حدیث مجھے نہیں ملی۔ تو یہ حدیث معاذؓ سے مروی حدیث کے ساتھ مل کر فائدہ دیتی ہے کہ غزوہ کرنے والوں میں سے اور لڑنے والوں جو غنی ہیں ان سے بھی صدقہ روکا جائے گا۔ یہ امام شافعی کے خلاف حجت ہے جس قول میں انہوں نے غنی غزاۃ کے لیے صدقہ جائز قرار دیا ہے جب نہ اس کا وظیفہ بیت المال میں مقرر ہو اور نہ وہ مال فئی سے لیتا ہو۔

پانچ صورتوں میں غنی کے لئے بھی زکوٰۃ کا مال حلال ہو جاتا ہے

۱۸۳۳: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلَّا لِخَمْسَةٍ لِغَازٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا اَوْ لِغَارِمٍ اَوْ لِرَجُلٍ اِشْتَرَاهَا بِمَالِهِ اَوْلِرَجُلٍ كَانَ لَهٗ جَارٌ مِّسْكِيْنٌ فَتُصُدِّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاَهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ ۔ (رواه مالك وابو داؤد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۸۶/۲ حدیث رقم ۱۶۳۵ وابن ماجه ۵۹۰/۱ حدیث رقم ۱۸۴۱۔ ومالك فی الموطأ ۲۶۸/۱ حدیث رقم ۲۹ من کتاب الزکاة۔ واحمد فی المسند ۵۶/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت عطاء ابن یسار بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ غنی کے لئے

زکوٰۃ کا مال حلال نہیں ہے ہاں پانچ صورتوں میں غنی کے لئے بھی زکوٰۃ کا مال حلال ہوجاتا ہے۔ ① خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے غنی کے لئے جب کہ اس کے پاس سامان جہاد نہ ہو۔ ② زکوٰۃ وصول کرنے والے غنی کے لئے ③ تاوان بھرنے والے غنی کے لئے ④ زکوٰۃ کا مال اپنے مال کے بدلے میں خریدنے والے غنی کے لئے یعنی کسی شخص نے ایک مفلس کو زکوٰۃ کا کوئی مال دیا اور غنی اس مفلس سے زکوٰۃ کے مال کو خریدے اور اسے اس کا بدلہ دے دے تو اس صورت میں غنی کے لئے وہ مال حلال ہوگا ⑤ اور اس غنی کے لئے کہ جس کے پڑوس میں کوئی مفلس رہتا ہو اور کسی شخص نے اسے زکوٰۃ کا کوئی مال دیا اور وہ مفلس اپنے پڑوسی مال دار غنی کو اس میں سے کچھ حصہ تحفہ کے طور پر بھیجے تو وہ غنی کے لئے جائز وحلال ہو گا۔" (مالک، ابوداؤد)

تشریح: مرسلاً: یعنی سند میں سے صحابی حذف ہے۔

قوله: قال رسول الله ﷺ: لا تحل الصدقة لغني الا لخمسة: لغاز في سبيل الله: یعنی اس مجاہد کے لیے جو جہاد سے منقطع ہوگیا ہو۔ یہ حاجی حج سے یا حاجی کے لیے۔ اس کی تائید امام احمد کی تفسیر سے ہوتی ہے جو انہوں نے آیت "سبیل اللہ" میں کی ہے صحیح حدیث کی بناء پر کہ۔ **ان الحج سبيل الله۔** یقیناً حج اللہ کا راستہ ہے۔" ہمارے اصحاب میں سے امام احمد نے اس کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اس مذکورہ استدلال کے متعلق جمہور نے بحث کی ہے۔

قال: أولعامل عليها: یعنی جو صدقہ اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا جائے۔ جیسے عشر لینے والا، حساب کرنے والا، اور لکھنے والا۔

قال: أولغارم: یعنی وہ شخص جس نے کسی سے قرض لیا تا کہ وہ جماعتوں کے درمیان دیت یا قرض کے فتنہ کو مٹائے اگر چہ وہ مانگنے والا غنی ہو۔

قال: أولرجل: اشتراها بما له۔ یعنی زکوٰۃ کا قال فقیر سے خرید لے۔

قوله: رواه مالك وأبو داؤد: یعنی زید بن اسلم کے واسطے سے۔ اسی طرح مرسل ہے۔ اسی طرح امام ابوداؤد نے عطاء عن ابی سعید سے اس کے ہم معنی مرفوع روایت بیان کی ہے۔ ابن ماجہ نے اس حدیث کو مکمل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: ایک جماعت نے اس حدیث کو زید بن اسلم سے موصولاً روایت کیا ہے۔ اس کو میرک نے ذکر کیا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں یہ روایت صحیح ہے یا حسن ہے۔

۱۸۳۴: **وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوٗدَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَوِ ابْنِ السَّبِيْلِ۔**

اخرجه ابوداؤد في السنن ۲/۲۸۸ حديث رقم ۱۶۳۷۔

تشریح: ابوداؤد کی ایک روایت جو ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں "ابن السبیل" یعنی مسافر منقول ہے (یعنی اس مالدار کے لیے بھی زکوٰۃ کا مال حلال ہے جو حالت سفر میں ہو)۔

عن ابی سعید اَوْابن السبیل: یہ بات جان لیجئے کہ میں نے ابوداؤد کی روایت کی بہت چھان بین کی ہے وہ تین روایات ہیں: ان میں پہلی **حدثنا عبد الله بن سلمة عن مالك عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار أن رسول الله ﷺ قال:** الحدیث پھر حدیث ذکر کی۔

دوسری حدیث: حدثنا الحسن بن علی حدثنا عبد الرزاق أخبرنا معمر عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار عن ابی سعید الخدری قال: قال رسول اللہ ﷺ بمعنا۔

اس کے ہم معنی روایت بیان کی رواہ ابن عیینه عن زید قال ما لك و رواہ الثوری عن زید قال حدثنی اللیث عن النبی ﷺ۔

تیسری حدیث: حدثنا محمد بن عوف الطائی۔ حدثنا الفریابی، حدثنا سفیان عن عمران البارقی عن عطیة عن ابی سعید قال: قال رسول اللہ ﷺ: لاتحل الصدقة لغنی الافی سبیل اللہ عزوجل أوابن السبیل، أوجار فقیر بتصدق علیه فیهدی لك أویدعولك۔

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں مگر جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہو' مسافر ہو' ہمسایہ فقیر پر صدقہ کیا گیا وہ ہدیۃً دے دے یا دعوت میں بُلا لے۔

اس وضاحت سے مصنف کے کلام میں ابہام واضح ہو جاتا ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں: یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں۔ اگر ثابت ہے تو اتنی قوی نہیں کہ اسے حدیث معاذ پر ترجیح دی جائے۔ اس روایت (معاذ والی) کو صحاح ستہ والوں نے روایت کیا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث بطور قرینہ موجود ہے۔ یعنی لا تحل الصدقة لغنی: اور اگر یہ روایت قوی ہوئی تو حدیث معاذ کو ترجیح ہوگی کیونکہ وہ مانع اور محترم ہے۔ جنہوں نے اس کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس کی تاویل کی ہے۔ انہوں نے صدقہ لینے کے لیے یہ قید لگائی ہے کہ اس کے لیے بیت المال میں کوئی چیز نہ ہو اور نہ مال فیٔ سے لے سکتا ہے اور یہ اس سے عام ہے۔ جنہوں نے اس کی تاویل نہیں کی ان کی دلالت کی نسبت کے لحاظ سے کمزور ہے۔

قرآن کی رُو سے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف

۱۸۳۵: وَعَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِيِّ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْتُهُ فَذَكَرَ حَدِيْثًا طَوِيْلًا فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ اَعْطِنِيْ مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَّلَا غَيْرِهِ فِي الصَّدَقَاتِ حَتّٰى حَكَمَ فِيْهَا هُوَ فَجَزَّاَهَا ثَمَانِيَةَ اَجْزَاءٍ فَاِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَاءِ اَعْطَيْتُكَ۔

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۸۱/۲ حدیث رقم ۱۶۳۰۔ والدارقطنی ۱۳۷/۲ حدیث رقم ۹ من باب الحث عن اخراج الصدقة۔

ترجمہ: ''اور حضرت زیاد ابن حارث صدائی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اس کے بعد زیاد رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے زکوٰۃ کا مال عطا فرمائیں آپ ﷺ نے زکوٰۃ تقسیم کرنے کے بارے میں کہ کسے کسے زکوٰۃ دی جائے۔ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نہ تو کسی نبی کے حکم پر راضی ہوا اور نہ اس کے علاوہ کسی اور کے حکم پر راضی ہوا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے آٹھ مصرف ذکر کیے ہیں اگر تم ان آٹھ میں سے ہو گے تم میں تمہیں زکوۃ کا مال دوں گا۔‘‘ (ابوداؤد)

تشریح: الصدائی : صاد کے ضمہ کے ساتھ اور الف ممدودہ کے ساتھ۔

هو : تاکید کے لیے ہے۔

فجزاها : ’’زاء‘‘ کی تشدید اور ہمزہ کے ساتھ یعنی اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔

ثمانية اجزاء : یعنی آٹھ قسم کے لوگوں میں۔

قوله :فان كنت من تلك الاجزاء) یعنی تو بھی ان مستحقین میں ہے۔ یا ان اصحاب کی کسی قسم میں سے ہے؟ یعنی جو آٹھ مصارف ہیں۔

اعطيتك : یعنی تیرا حق دے دوں گا۔ طیبی فرماتے ہیں: حصہ دینے میں دلالت ہے کہ تمام اقسام کو دینا واجب ہے۔ ابن الملک نے کیا ہی عجیب غریب بات کہی ہے وہ یہ کہ حصہ داروں پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ یہ قول مذہب کے خلاف ہونے کے ساتھ یہ روایت صرف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ زکوۃ ان آٹھ مصارف میں تسیم کی جائی گی۔ نہ کہ ان تمام آٹھ اقسام میں۔ اسی لیے ہمارے علماء کہتے ہیں: یا تو تمام مصارف میں یا بعض میں زکوۃ تقسیم کی جائے گی۔

شمنی فرماتے ہیں: اس کو طبری نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ ابن عباسؓ، عمرؓ، خذیفہ، سعید بن جبیر، عطاء، بن ابی رباح، ابو العالیہ، ابراہیم نخعی، میمون بن مہران، اور یہی موقف امام مالک اور احمد کا ہے اور ان کی دلیل نبی ﷺ کی وہ حدیث ہے جس کے راوی حضرت معاذؓ ہیں۔ (فاعلمهم أن الله افترض عليهم صدقة في اموالهم توخذ من اغنيائهم فترد على فقرائهم) اس بات کی ان کی خبر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال پر صدقہ فرض قرار دیا ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لیا جائے گا اور ان کے فقیروں پر لوٹایا جائے گا۔ اور اس لیے کہ آپؐ نے سلمہ بن صخر کو اپنی قوم سے صدقہ لینے کا حکم دیا تھا۔ اس موضوع پر ابن ہمام نے طویل بحث کی ہے اور فخر رازی نے اسی سے استفادہ کیا ہے اور ابن حجر نے ’’لانظام له فى المرام‘‘ میں اس کا جواب دیا ہے۔ میرک فرماتے ہیں اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیادہ بن انعم افریقی ہے جو متکلم فیہ ہے۔

الفصل الثالث:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل

۱۸۳۷: عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا فَاَعْجَبَهُ فَسَأَلَ الَّذِىْ سَقَاهُ مِنْ اَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ فَاَخْبَرَهُ اَنَّهُ وَرَدَ عَلٰى مَاءٍ قَدْ سَمَّاهُ فَاِذَا نَعَمٌ مِنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا مِنْ اَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهُ فِىْ سِقَائِىْ فَهُوَ هٰذَا! فَاَدْخَلَ عُمَرُ يَدَهُ فَاسْتَقَاءَ۔ (رواه مالك والبيهقي في شعب الايمان)

اخرجه مالك في الموطأ ۲۶۹/۱ حديث رقم ۳۱ من كتاب الزكاة۔ والبيهقي في شعب الايمان ۶۰/۵ حديث رقم ۵۷۷۱۔

ترجمہ: ''حضرت زید ابن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دودھ نوش فرمایا تو انہیں اچھا لگا' جس شخص نے انہیں دودھ پلایا تھا اس سے انہوں نے پوچھا کہ یہ دودھ کہاں کا ہے' اس نے انہیں بتایا کہ ایک پانی پر میں گیا' وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ زکوٰۃ کے بہت سے اونٹ موجود ہیں اور انہیں پانی پلایا جارہا ہے' پھر اونٹ والوں نے اونٹوں کا تھوڑا سا دودھ نکالا اس میں سے تھوڑا سا دودھ میں نے مشک میں ڈال لیا یہ وہی دودھ ہے یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ اپنے منہ میں ڈالا اور قے کر دی۔'' (مالک' بیہقی)

تشریح: قوله : قال: شرب عمر بن الخطابؓ لبناً فاعجبه : یعنی اپنی خواہش کے موافق پایا۔ اس کا قلبی استدلال یا غیبی الہام کے ساتھ انکار کیا امام غزالی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سوال کیا پرورش کا۔ یہ شک کے اسباب میں سے ہے اور اس کو ورع پر محمول کیا جائے۔

قوله :فأخبره أنه ورد :یعنی گزرے۔

علی ماء :یعنی پانی کی جگہ کے پاس سے گزرے۔ ابن حجر نے بہت ہی غریب بات کہی ہے کہ ایسی جگہ سے گزرے جس میں پانی تھا۔ اسی طرح شارح نے کہا ہے اور اس کی ضرورت نہیں۔ مانع کیا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو پانی پر وارد کیا ہے اگرچہ اس جگہ پر جانا لازم تھا۔ اس وہم کی وجہ مخفی نہیں۔

فاء ذا: مفاجات کے لیے ہے۔

نعم : ''نون'' اور عین پر فتح کے ساتھ۔

سقائی : سین کے کسرہ کے ساتھ۔

من نعم الصدقة وهم: یعنی عمر عا یا نعمتوں والے۔ فهو هذا فأدخل عمر يده) یعنی اپنے منہ اور حلق میں انگلی داخل کی۔

فاستقاء ہ :یعنی قے کی اور اپنے پیٹ سے نکال دیا۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ انتہا درجہ کا زہد و ورع اور شبہ والی چیزوں سے بچنا ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: کہ شارح کو اپنے ائمہ کا قول مستحضر نہیں رہا۔ جو بھی کھانا یا پینا حرام کا ہو اس کو قے کر کے پیٹ سے نکالنا ضروری ہے۔ اگرچہ اس کو کھانے میں اس کو معذور سمجھا جائے گا۔ اس روایت میں اس بات پر دلالت نہیں۔ کہ وہ دودھ حرام کا تھا۔ اس لیے کہ جب لینے والا بطور استحقاق صدقہ کا مال لیتا ہے اور پھر آگے وہ غیر مستحق کو ہدیہ کر دیتا ہے (اگر یہ فرض کر لیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس صدقے کا مستحق نہیں تھا) تو اس دوسرے آدمی کے لئے اس کے حلال ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں۔ جیسے بریرہؓ کی حدیث پہلے گزری ہے۔ ''انه لها صدقة ولنا هدية'' اعتراض کرنے والا اس حدیث کو نہیں سمجھ سکا اس نے سمجھا شاید کہ دودھ حرام ہے۔ اور قے کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ چونکہ اس کو اس کے مالک کی طرف لوٹانا بھی ممکن نہیں۔ صرف پیٹ کو حرام اور مشتبہ چیزوں سے پاک کرنا ہے۔ اور اس کے ورع ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

امام غزالی ''الاحیاء'' میں کہتے ہیں: لاعلمی میں پینے کے باوجود قے کی تاکہ اس سے ایسا گوشت پیدا نہ ہو جو دین پر

ثابت قدم نہ رہ سکے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں کہ جب ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حرام ہے تو اس کے لئے نقصان دہ بھی نہیں گا۔ جب حرام کھایا تو اس کے معدہ سے قساوت قلبی کا اثر حاصل ہوتا ہے اگر چہ وہ یہ نہ جانتا ہو۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے قے کی چونکہ انہوں نے لاعلمی میں پیا تھا۔ اگر ہم یہ فتویٰ دیں کہ یہ فقیر کے لئے حلال ہے تو وہ صرف حاجت کی وجہ سے ہوگا۔ جیسا کہ اضطراری حالت میں خنزیر اور شراب حلال ہوتے ہیں۔ جب ہم نے ضرورت کی وجہ سے ان کو حلال قرار دیا تو پاکیزہ چیزوں کے ساتھ ملحق نہیں ہوگی۔

بَابُ مَنْ لَّا تَحِلُّ لَهُ الْمَسْئَلَةُ وَمَنْ تَحِلُّ لَهٗ

جن لوگوں کو سوال کرنا جائز ہے اور جن کو جائز نہیں اُن کا بیان

علماء لکھتے ہیں کہ جس شخص کے پاس ایک دن کے بقدر بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر کپڑا ہو تو اسے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ بغیر ضرورت و حاجت مانگنا حرام ہے ہاں جس شخص کے پاس ایک دن کی بھی غذا اور ستر چھپانے کے بقدر بھی کپڑا نہ ہو تو اس کے لئے دست سوال دراز کرنا حلال ہے۔ جو محتاج و فقیر ایک دن کی غذا کا مالک ہو اور وہ کمانے کی قدرت رکھتا ہو اس کے لئے زکوٰۃ لینا تو حلال ہے مگر لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا حرام ہے جس مسکین محتاج کو ایک دن کی غذا بھی میسر نہ ہو اور وہ کمانے کی قدرت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے سوال کرنا حلال ہے۔

نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بغیر ضرورت و احتیاج کے لوگوں سے مانگنا ممنوع ہے البتہ جو شخص کمانے کی قدرت رکھتا ہو اس کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں چنانچہ زیادہ صحیح قول تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو کہ جو کما کر اپنا گزارا کر سکتا ہو لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے حرام ہے لیکن بعض حضرات مکروہ کہتے ہیں وہ بھی تین شرطوں کو ساتھ' اول یہ کہ دست سوال دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ ہونے دے' دوم الحاح یعنی مانگنے میں مبالغہ سے کام نہ لے' سوم یہ کہ جس شخص کے آگے دست سوال دراز کر رہا ہے اسے تکلیف و ایذاء نہ پہنچائے اگر ان تین شرطوں میں سے ایک بھی پوری نہ ہو تو پھر سوال کرنا بالاتفاق حرام ہوگا۔

ابن مبارکؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "جو سائل" لوجہ اللہ کہہ کر سوال کرے تو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اسے کچھ دیا جائے کیونکہ دنیا اور دنیا کی چیزیں کمتر و حقیر ہیں' جب اس نے دنیا کی کسی چیز کے لئے "لوجہ اللہ" کہہ کر سوال کیا تو گویا اس نے چیز کی تعظیم و توقیر کی جسے اللہ تعالیٰ نے کمتر و حقیر قرار دیا ہے' لہٰذا ایسے شخص کو از راہِ زجر و تنبیہ کچھ نہ دیا جائے اور اگر کوئی شخص یہ کہہ کر سوال کرے کہ "بحق خدا یا بحق محمد" تو اسے کچھ دینا واجب نہیں ہوتا اگر کوئی شخص اپنی کوئی غلط اور جھوٹی حاجت و ضرورت ظاہر کر کے کسی سے کوئی چیز لے تو وہ اس چیز کا مالک نہیں ہوتا (گویا وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے) اسی طرح کوئی شخص [illegible] یہ کہے کہ میں سید ہوں اور مجھے فلاں چیز کی یا اتنے پیسے کی ضرورت ہے اور وہ شخص سائل کو سید سمجھ کر اس کا سوال پورا کر

دے مگر حقیقت میں وہ سید نہ ہو تو وہ بھی (اس مانگی ہوئی چیز) کا مالک نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں وہ چیز اس کے حق میں ناجائز و حرام ہوتی ہے۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص کسی سائل کو نیک بخت و صالح سمجھ کر کوئی چیز دے دے حالانکہ وہ سائل باطنی طور پر ایسا گنہگار ہے کہ اگر دینے والے کو اس کے گناہ کا پتہ چل جاتا تو اسے وہ چیز نہ دیتا تو اس صورت میں بھی سائل اس چیز کا مالک نہیں ہوتا وہ چیز اس کے لئے حرام ہے اور اس چیز کو اس کے مالک کو واپس کر دینا اس پر واجب ہوگا اگر کوئی شخص کسی کو اس کی بدزبانی یا اس کی چغل خوری کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے کوئی چیز دے تو وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔

اگر کوئی فقیر کسی شخص کے پاس مانگنے کے لئے آئے اور وہ اس کے ہاتھ پیر چومے تاکہ وہ اس کی وجہ سے اس کا سوال پورا کر دے تو یہ مکروہ ہے بلکہ اس شخص کو چاہیے کہ وہ فقیر کو ہاتھ پیر نہ چومنے دے۔

ان سائل اور فقیروں کو کچھ بھی نہ دینا چاہئے جو نقارہ' ڈھول یا ہارمونیم وغیرہ بجاتے ہوئے دروازوں پر مانگتے پھرتے ہیں اور مطرب یعنی ڈوم تو سب سے بدتر ہے۔

الفصل الاول:

اشد ضرورت کے تحت سوال کرنا جائز ہے

۱۸۳۷: عَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ قَالَ تَحَمَّلْتُ حَمَّالَةً فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْأَلُهُ فِيْهَا فَقَالَ اَقِمْ حَتّٰى تَاْتِيَنَا الصَّدَقَةُ فَنَاْمُرَلَكَ بِهَا ثُمَّ قَالَ يَا قَبِيْصَةَ اَنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ اِلَّا لِاَحَدِ ثَلَاثَةٍ رَّجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَّالَةً فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَهَا ثُمَّ يُمْسِكُ وَرَجُلٍ اَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اِجْتَاحَتْ مَالَهُ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ اَوْ قَالَ سِدَادًا مِّنْ عَيْشٍ وَرَجُلٍ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتّٰى يَقُوْمَ ثَلَاثَةٌ مِّنْ ذَوِى الْحِجٰى مِنْ قَوْمِهٖ لَقَدْ اَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيْبَ قِوَامًا مِّنْ عَيْشٍ اَوْ قَالَ سِدَادًا مِّنْ عَيْشٍ فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيْصَةُ سُحْتٌ يَاْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحْتًا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى فى صحيحه ۷۲۲/۲ حديث رقم (۱۰۹۔ ۱۰۴۴)۔ وابوداؤد فى السنن ۲۹۰/۲ حديث رقم ۱۶۴۰۔ والنسائى ۸۹/۵ حديث رقم ۲۵۸۰۔ والدارمى ۴۸۷/۱ حديث رقم ۱۶۷۸۔ واحمد فى المسند ۴۷۷/۳۔

ترجمہ: ''حضرت قبیصہ ابن مخارق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے قرضہ کی ضمانت لی جو دیت کی وجہ سے تھا چنانچہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادائیگی قرض کے لئے کچھ رقم یا مال کا سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کچھ دن ٹھہرے رہو جب ہمارے پاس زکوۃ کا مال آئے گا تو اس میں سے تمہیں دینے کے

لئے کہہ دیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قبیصہ! تین طرح کے لوگوں کے لئے سوال کرنا جائز ہے' ایک تو اس شخص کے لئے جو کسی کے قرض کا ضامن بن گیا ہو بشرطیکہ مانگنے میں مبالغہ نہ کرے بلکہ اتنے ہی مال یا رقم کا سوال کرے کہ اس سے قرضہ کو ادا کر دے اور اس کے بعد پھر نہ مانگے' دوسرے اس شخص کے لئے جو کسی آفت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے اور اس کا تمام مال ہلاک و ضائع ہو جائے' چنانچہ اس کے لئے اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے یا فرمایا کہ اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اس کی زندگی کے لئے سہارا ہو جائے' تیسرے اس شخص کے لئے جو غنی ہو مگر اس کو کوئی ایسی سخت حاجت پیش آ جائے جسے اہل محلہ بھی جانتے ہوں مثلاً گھر کا تمام مال و اسباب چوری ہو جائے یا اور کسی مصیبت و حادثے سے دوچار ہونے کی وجہ سے ضرورت مند بن جائے اور قوم کے تین صاحب عقل و فراست لوگ اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اسے سخت حاجت پیش آ گئی ہے تو اس کے لئے اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے یا فرمایا کہ اس کی وجہ سے اس کی محتاجگی دور ہو جائے اور اسکی زندگی کا سہارا ہو جائے۔ قبیصہ! ان تین کے علاوہ کسی اور کو سوال کرنا حرام ہے اگر کوئی شخص ان تین مجبوریوں کے علاوہ دست سوال دراز کر کے کسی سے کچھ لے کر کھاتا ہے تو وہ حرام کھاتا ہے۔'' (مسلم)

تشریح: قبیصة : ''یا'' کے کسرہ اور ''قاف'' کے فتحہ کے ساتھ۔

مخارق : میم کے ضمہ اور ''را'' کے کسرہ کے ساتھ۔

حمالة بحاء کے فتحہ اور میم کے تخفیف کے ساتھ۔ حمالہ کہتے ہیں کہ دو فریقین کے درمیان جنگ کی وجہ سے بہنے والے خون کو روکنے کے لئے کسی کی طرف سے دیت یا قرض اپنے ذمہ لینا۔ اس قول کو ابن الملک اور ہمارے دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں اس کو انسان کے مال سے محمول کیا جائے گا۔ یعنی وہ قرض مانگے گا اور اُسے رشتہ داروں میں صلح کے لیے استعمال کرے گا۔ ایسے شخص کے لیے صدقہ حلال ہے جب تک وہ اُسے نافرمانی کے کام میں نہ لگائے۔

اساله فیها :(''فی'') تعلیلہ ہے۔ ای لأجل الحمالة۔ یعنی اس وجہ سے۔

فقال أقم : یہ حکم ثابت قدمی اور صبر کو اختیار کرنے کے لیے ہے۔

تأتينا الصدقة: یعنی جب ہمارے پاس صدقہ کا مال آئے گا۔

ثم قال یا قبیصة إن المسألة: یعنی سوال کرنا اور بھیک مانگنا۔

قوله :لا تحل الا لاحد ثلاثة :ابن الملک کی شرح میں ہے کہ انہوں نے کہا: یہ بحث زکوۃ کے مانگنے کے متعلق ہے۔ اور رہا نفلی صدقہ کا سوال کرنا اپاہج ہونے کی وجہ سے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا یا کوئی اور بیماری ہو تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ وہ اتنا مانگ سکتا ہے جسے سے ایک دن گزر جائے اُسے ذخیرہ نہ کرے۔ اگر کمانے کی قدرت ہے لیکن علم میں مشغول ہونے کی وجہ سے کمانے کو ترک کر دیا ہے۔ تو اس کے لیے فرضی اور نفلی صدقہ جائز ہو جاتا ہے۔ اگر نفلی نماز اور نفلی روزہ کی وجہ سے کمانے کو چھوڑا ہے تو اس کے لیے زکوۃ اور نفلی صدقہ جائز نہیں۔ اگر کوئی ایک شخص یا جماعت کسی خاص جگہ پر ٹھہر جائیں تا کہ اپنے آپ کو اطاعت، دل کی طہارت نفسوں کو اللہ کی اطاعت کی مشق میں مصروف کر لیں تو ان میں سے ایک کے لیے مستحب ہے وہ ان کے لیے نفلی صدقہ، کھانا اور لباس کی وجہ سے نفلی صدقہ کا سوال کرے۔

قولہ : رجل : اَحَدٍ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: ثلاثۃ سے بدل ہے مرفوع ہے تو مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے۔

ثم عبيلك: جب وہ اتنے صدقات لے لے جو اس کی قرض کو ادا کر دیں تو اس کے بعد مزید اور لینا جائز نہیں۔ اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے اور محل نظر ہے۔

ورجل : دو وجہوں سے یعنی مجرور اور مرفوع

جائحة : یعنی کوئی آفت اور حادثہ جو اس کو اچانک کسی مصیبت سے پہنچا ہے۔ یہ آفت پھلوں اور اموال کو ہلاک کر دیتی ہے۔

أو قال : راوی کو شک ہے۔

سداداً من عيش: کسرہ کے ساتھ پڑھنا ہی درست ہے۔ جس کے ساتھ اس کا فقر چلا جائے اور اس کی ضرورت کے مطابق کفایت کرے۔

ورجل : دو وجہوں سے (دو وجہوں سے مراد رجل کو مکسور یا مرفوع پڑھیں) یعنی غنی

فاقة : یعنی سخت ضرورت جو لوگوں میں مشہور ہو جائے۔

ذوی الحجی : ''حاء'' کے کسرہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔ کامل عقل والا

من قومه لقد اصابت فلانا فاقة : ای یقوم ثلاثة قائلین هذا القول : ثبوت فاقہ میں مبالغہ مراد ہے۔ یہ بات کہنے والے تین ہوں اور مراد یہ ہے کہ فاقہ کا مکمل ثبوت دیں۔

صغانی فرماتے ہیں: اس طرح امام مسلم کی کتاب میں واقع ہے یقوم کے ساتھ اور صحیح یہ ہے کہ اس کو لام کے ساتھ یقول کہا جائے۔ اسی طرح امام ابوداؤد نے اس حدیث کو اپنی سنن میں ذکر کیا ہے اور مصابیح میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس قول کا جواب دیا گیا ہے کہ قول کے تقدیر کے ساتھ کھڑے ہونے کی تاکید ہے۔ ابن حجر نے عجیب بات کہی ہے کہ یقوم کا معنی کسی کے ساتھ مقرر کیا جائے یہ بات صغانی کے قول کا رد کرتی ہے۔ اور اس قول کے عجیب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صغانی کا کلام روایت کی تصحیح میں ہے نہ کہ درایت کی تصحیح میں باوجود اس کے کہ قیاس کی ضرورت نہیں چونکہ عبارت ظاہر ہونے کی وجہ سے وضاحت کے حمل پر ہے۔ یہ بات عقل سے بہت دور ہے کہ یقوم بمعنی یقول کہا جائے اور ابن حجر نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس بعد کی وجہ یہ ہے کہ قول کبھی کبھی بمعنی فعل آتا ہے اس کے برعکس نہیں کہ فعل بمعنی قول ہو جس طرح اس جگہ میں ہے اس پر غور کریں۔

ابن الملک فرماتے ہیں: یہ استحباب اور احتیاط کا راستہ ہے تاکہ سائل کے دعویٰ میں تہمت سے براءت پر دلالت ہو جائے اور لوگ اس کی بات کو قبول کرنے میں جلدی کریں۔ اس کی قوم کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی حالت کو جاننے والے ہیں یہ تعارف اور بیان کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ ائمہ میں سے کسی کے ہاں بھی شہادت میں آدمیوں کے لیے تین کے عدد کا کوئی دخل نہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تنگ دستی (فقیری) بعض کے نزدیک تین آدمیوں کی گواہی سے ہی ثابت ہوتی ہے چونکہ یہ نفی پر شہادت ہے اس لئے اس میں تثلیث ہوگی بخلاف اثبات کے۔ سید جمال الدین نے تخریج سے روایت نقل کی ہے۔ کہ

حدیث کے ظاہر سے بعض ہمارے اصحاب نے دلیل کی ہے۔ جمہور کہتے ہیں: دو صاحب عدل سے گواہی قبول کی جائے گی اور حدیث کو انہوں نے استحباب پر محمول کیا ہے اور یہ محمول اس پر ہے کہ جس کے پاس مال کا ہونا معروف ہے اس کا قول مال کے ضائع ہونے یا تنگ دست ہونے پر دلیل کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اور جس کا مالدار ہونا معلوم نہ ہو تو بغیر دلیل کے اس کا قول قبول ہوگا۔

فحلت له المسألة: یعنی یہ قرائن اس کے سوال کرنے میں سچا ہونے پر دلالت کرتے ہیں: اس کے لیے سوال کرنا حلال (جائز) ہے۔

حتی یصیب قواما من عیش أوقال سدادًا من عیش) فاعل میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف شک ہونے کی وجہ سے ہے آپ اس پر غور کریں۔

سحت: سین اور ''حاء'' کے ضمہ یا ''حاء'' کے سکون کے ساتھ۔ یہی کثیر الاستعمال ہے۔ سحت وہ حرام جس کا کمانا جائز نہیں کیونکہ وہ برکت کو ختم کر دیتے ہیں۔

یأکلها: یعنی جو سوال کرنے سے اس کو ملا اسے کھاتا ہے۔ اس قول کے قائل طیبی ہیں۔ حاصل مراد یہ ہے کہ جو اس کو حاصل ہوا وہ کھاتا ہے۔

سحتًا: تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا یاکلھا میں جو ضمیر ہے اس سے بدل ہے۔ ابن حجر اسے حال بناتے ہیں ابن الملک فرماتے ہیں: مؤنث کی ضمیر صدقہ اور مانگنے کے معنی میں ہے۔

اپنے حال میں اضافہ کے لئے مانگنے پر وعید

۱۸۳۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاَلَ النَّاسَ اَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا فَاِنَّمَا يَسْاَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ اَوْ لِيَسْتَكْثِرْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۲۰/۲ حدیث رقم (۱۰۵۔ ۱۰۴۱)۔ وابن ماجه فی السنن ۵۸۹/۱ حدیث رقم ۱۸۳۸۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص مال میں اضافہ کی خاطر لوگوں کے مال میں سے کچھ مانگتا ہے تو وہ گویا آگ کا انگارا مانگتا ہے اب وہ چاہے کم مانگے یا زیادہ مانگے۔'' (مسلم)

تشریح: **من سال الناس اموالهم**: یعنی ان کے اموال میں سے کچھ مانگتا ہے۔ سألته الشئ و عن الشی یہ قول طیبی کا ہے۔ اموالھم صرف جر کو محذوف کرنے کی وجہ سے منصوب ہے یا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدل اشتمال ہے۔

تکثرا: مفعول لہ یعنی مال کو زیادہ کرے حالانکہ وہ ضرورت کی وجہ سے نہیں مانگتا۔

فانما یسأل جمرا: یعنی جہنم کی آگ کا ٹکڑا۔ جو وہ (لوگوں سے لے رہا ہے وہ جہنم کی آگ کی سزا کا سبب ہے۔

جمرًا کو مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾ [النساء: ١٠] یعنی ایسی چیز جو قیامت کے دن آگ کو واجب کر دے گی اور دنیا میں عار کا سبب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ حقیقۃً جمرا ہو جس کے ساتھ عذاب دیا جائے۔ جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کے لیے ثابت ہے۔

فليستقل: یعنی سوال کو یا جمرا کو۔

ليستكثر: یعنی زیادہ مانگے یا کم۔ یہ توبیخ اور ڈانٹ ہے یعنی وبال ایک ہی ہے چاہیے زیادہ مانگے یا کم۔

بلاضرورت مانگنے والوں کا قیامت کے دن حشر

١٨٣٩: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٣٨/٣۔ حديث رقم ١٤٧٤۔ ومسلم في صحيحه ٧٢٠/٢ حديث رقم (١٠٤۔ ١٠٤٠)۔ والنسائي في السنن ٩٤/٥ حديث رقم ٢٥٨٥۔ واحمد في المسند ١٥/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہمیشہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا رہے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: مزعة لحم: میم کے ضمہ اور کسرہ اور ''زا'' کے سکون کے ساتھ اس کے بعد عین مھملہ ہے اس طرح میم پر فتحہ کا بھی ایک قول ہے۔ ضمہ کے ساتھ زیادہ ہے اور یہ موقف محدثین کا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا اس کی کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی بلکہ لوگوں میں اعلانیہ اس کی رسوائی ہوگی یا اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا یہ اس کی سزا کی وجہ سے ہے یا اس عمل کے اعلان کی وجہ سے یہ اس کی علامت (نشانی) ہوگی جس کی وجہ سے لوگ اُسے پہچان لیں گے اور یہ حالت اس کی رسوائی کا سبب ہوگی اس کے مال کی شہرت کی وجہ سے اس کے لیے ذلت ہوگی۔ جس طرح اس نے اپنے آپ دنیا میں ذلیل کیا اور اپنا پسینہ مانگنے میں بہایا۔ امام احمد کی دعا ہے:

اللهم كما صنت وجهي عن سجود غيرك فصن وجهي عن مسألة غيرك۔

اے اللہ! جس طرح تو نے میرے چہرے کو غیر کے آگے جھکنے سے محفوظ رکھا ہے اس طرح میرے چہرے کو غیر سے مانگنے سے بھی محفوظ رکھ۔

سوال ضرورت کے تحت کیا جائے

١٨٤٠: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا تُلْحِفُوْا فِي الْمَسْأَلَةِ فَوَاللّٰهِ لَا يَسْأَلُنِيْ اَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا فَتُخْرِجُ لَهٗ مَسْأَلَتُهٗ مِنِّيْ شَيْئًا وَاَنَا لَهٗ كَارِهٌ فَيُبَارَكُ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتُهٗ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٧١٨/٢ حديث رقم (٩٩۔ ١٠٣٨)۔ والنسائي في السنن ٩٧/٥ حديث رقم ٢٥٩٣۔ والدارمي في السنن ٤٧٤/١ حديث رقم ١٦٤٤۔ واحمد في المسند ٩٨/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مانگنے میں مبالغہ نہ کرو خدا کی قسم! تم میں سے جو بھی شخص مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے اس حال میں کچھ نکال کر دیتا ہوں کہ میں اسے دینا برا سمجھتا ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ جو چیز میں نے اسے دی ہے اس میں برکت ہو۔'' (مسلم)

تشریح: لا تلحفوا في المسالة : مصدر ہے سوال کے معنی میں ہے یعنی نہ تم مبالغہ کرو اور نہ اصرار وضد کر کے اور نہ چمٹ کے سوال کرو۔

فتخرج : مذکر ومؤنث اور منصوب ومرفوع ہے۔ اخراج مجازی نسبت ہے۔

وأنا له : یعنی اس چیز کی وجہ سے یعنی اعطاء کرنے یا اس کے نکالنا کو جس طرح کے یخرج اس پر دلالت کر رہا ہے۔

کارۃ : جملہ حالیہ ہے۔

فیبارك : مجہول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا اگر برکت دیا جائے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جمعیت کا معنی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی میر ناپسندیدگی کے ساتھ دینا برکت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا ایک نسخہ میں مرفوع ہے۔ ھو ضمیر اس میں مقدر ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہوگا۔

﴿ولا یؤذن لهم فیعتذرون﴾ [المرسلات:٣٦] امام غزالیؒ کہتے ہیں جو کوئی صدقہ اس لیے لیتا ہے کہ وہ جانتا ہے دینے والا اس سے شرم وحیا کی وجہ سے یا حاضرین سے شرم وحیا کی وجہ سے دے دے گا۔ اگر ایسے وہ لے لیتا ہے تو اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حرام ہے۔ اس پر لازم ہے اُسے واپس کرے یا اس کے بدلے میں کوئی چیز اس مالک کو یا اس کے ورثا کو لوٹائے۔

نووی اس کی شرح میں کہتے ہیں: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بغیر ضرورت کے مانگنا منع ہے۔ ہمارے اصحاب کا اس آدمی کے سوال میں کہ جو کمانے پر قادر ہے اختلاف ہے۔ ① ان میں درست اور صحیح یہ ہے کہ حدیث کے ظواہر سے وہ حرام ہے۔ ② تین شروط کے ساتھ مع الکراہۃ حلال ہے۔ اپنے نفس کو ذلیل ورسوا نہ کرے۔ چمٹ کر سوال نہ کرے۔ مانگنے کی وجہ سے تکلیف نہ دے اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی کم ہوئی تو بالاتفاق حرام ہے۔

محنت مزدوری کرنا دستِ سوال دراز کرنے سے بہتر ہے

١٨٤١: وَعَنِ الزُّبَیْرِ بْنِ الْعَوَّامِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَاخُذَ اَحَدُکُمْ حَبْلَهٗ فَیَأْتِیَ بِحُزْمَةِ حَطَبٍ عَلٰی ظَهْرِهٖ فَیَبِیْعُهَا فَیَکُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهٗ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّسْاَلَ النَّاسَ اَعْطَوْهُ اَوْ مَنَعُوْهُ.

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٣٥/٣۔ حدیث رقم ١٤٧١۔ والنسائی فی السنن ٩٣/٥ حدیث رقم ٢٥٨٤۔ وابن ماجه ٥٨٨/١ حدیث رقم ١٨٣٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ایک رسی اور لکڑیوں کا ایک گٹھا پشت پر لاد کر آئے اور اسے فروخت کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی عزت وآبرو کو

برقرار رکھے جو مانگنے سے جاتی تھی تو یہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور لوگ اسے دیں یا نہ دیں۔" (بخاری)

تشریح: العوام :عین کے فتحہ اور واؤ کے تشدید کے ساتھ عشرہ مبشرہ میں سے ایک یہ بھی ہیں۔

فیاتی بحزمه حطب علی ظهره: ابن الملک فرماتے ہیں: "حاء" کے ضمہ کے ساتھ۔ اتنی مقدار جو دونوں بازوں اور سینہ کے درمیان آسکے۔ اور اس کا استعمال کیا جاتا ہے لکڑیوں پر جو کمر پر اُٹھائی جاتی ہیں۔

فیبیعها : اس طرح بھی منقول ہے کہ یہ "أن" کو مقدر ماننے کے ساتھ منصوب ہے یعنی "ان یبع تلك الحزمة" یہ لکڑیوں کا گھٹا بیچے یعنی لکڑیاں بیچ کر قیمت حاصل کرے۔

دونوں کام (دینا اور روکنا) برابر ہیں اور وہ (لکڑیوں والا) کام اس کے لیے بہتر ہے۔ اس سے زیادہ بلیغ حدیث یہ ہے۔

من تواضع لغنی لاجل غناه ذهب ثلثا دینه۔

دینے والا ہاتھ مانگنے والے ہاتھ سے بہتر ہے

۱۸۴۲: وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَعْطَانِيْ ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَاَعْطَانِيْ ثُمَّ قَالَ لِيْ يَا حَكِيْمُ اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرٌ حُلْوٌ فَمَنْ اَخَذَهُ بِسَخَاوَةِ نَفْسٍ بُوْرِكَ لَهُ فِيْهِ وَمَنْ اَخَذَهُ بِاِشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارِكْ لَهُ فِيْهِ وَكَانَ كَالَّذِيْ يَاْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى قَالَ حَكِيْمٌ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَرْزَأُ اَحَدًا بَعْدَكَ شَيْئًا حَتّٰى اُفَارِقَ الدُّنْيَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۳۵/۳۔ حدیث رقم ۱٤۷۲۔ ومسلم فی صحیحه ۷۱۷/۲ حدیث رقم (۵٦۔ ۱۰۳۵)۔ والترمذی فی السنن ۵۵۳/٤ حدیث رقم ۲٤٦۳۔ والنسائی ۱۰۰/۵ حدیث رقم ۲٦۰۱۔ والدارمی ٤۷۵/۱ حدیث رقم ۱٤۷۲ واحمد فی المسند ٤۳٤/۳۔

ترجمہ: "اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرما دیا' میں نے پھر دوبارہ مانگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بھی عطا کیا اور پھر مجھ سے فرمایا کہ حکیم! یہ مال سبز و شیریں ہے لہٰذا جو شخص اس مال کو بے پروائی سے حاصل کرتا ہے تو اس میں برکت عطا فرمائی جاتی ہے اور جو شخص اسے نفس کے طمع و حرص کے ساتھ حاصل کرتا ہے تو اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس کی حالت اس شخص کی مانند ہوتی ہے جو کھانا تو کھاتا ہے مگر اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور یاد رکھو کہ اوپر کا ہاتھ یعنی دوسروں کا دینے والا ہاتھ نیچے کے ہاتھ یعنی دوسروں سے مانگنے والے سے بہتر ہوتا ہے حکیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میں اب کسی کے مال میں سے کچھ کم نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں اس دنیا سے جدا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن حکیم بن حزام : "حاء" کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے بعد "زا" ہے۔

قال: سألت رسول الله ﷺ: یعنی کسی چیز کا۔

فاعطاني، ثم سالته فأعطاني، ثم قال لي : تیسری دفعہ سوال کرنے کے بعد یا مال ختم ہونے کے بعد یا بغیر سوال (مانگنے) کے کہا۔

یا حکیم! ان هذ المال : یعنی جولوگوں کے ہاتھ میں ہے یا اس کی جنس یا نوع میں سے جو بغیر محنت اور مشقت کے حاصل ہو۔

خضر : ''خاء'' کے فتحہ اور ''ضاد'' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی ایسی خوش دل اور تر و تازہ چیز ہے جس میں انتہا درجے کی رغبت ہوتی ہے۔

حلو : یعنی نفس کے لیے مزیدار، طبیعت اس کی طرف انتہا درجے کی مائل ہوتی ہے یہ بھی کہا گیا ہے آنکھ کی رنگینی کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ اور خلو میٹھی چیز منہ کے ذائقہ میں عمدہ ہوتی ہے کیونکہ آنکھ سرسبز دیکھنے سے نہیں اکتاتی۔ بلکہ اس کی طرف دیکھنا قوت بصر کو بڑھاتی ہے اور منہ میٹھا کھانے سے نہیں تھکتا اسی طرح مال جمع کرنے کی حرص ہے انسان کا نفس اس سے نہیں اکتاتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مال کی رنگینی و تازگی کی وجہ سے تشبیہ بلیغ ہے۔

فمن اخذه : یعنی جس نے مال لیا۔

بسخاوة نفس : یعنی بغیر سوال اشراف اور لالچ کے لیا یا کھلے دل اور نفس کی سخاوت کے ساتھ دینے والے نے دیا۔

بورك له فيه : چونکہ وہ مال لیتے وقت اپنے مالک کو دیکھنے والا ہے وہ اس کا مطیع اس کا شکر ادا کرنے والا اور اس کی فرمانبرداری میں سرگرم ہے۔ اس کے لیے قبولیت میں کوئی حصہ نہیں، سوائے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ۲۔۳] اس حالت پر اس حدیث کو بھی محمول کیا جائے گا (نعم المال الصالح للرجل الصالح) اچھا مال نیک آدمی کا نیک آدمی کے لیے ہے اور ایک حدیث ہے (ذهب اهل الدثور با لاجور) چادروں والے جو:

ومن أخذه باشراف نفس : دو وجوہ پر اس کو محمول کیا جائے یعنی طمع، حرص اور مطلع ہونے کی وجہ سے۔

لم يبارك فيه : اشراف سے مراد چیز کو کراہیت کی نگاہ سے دیکھنا اور نہ چاہتے ہوئے دینا۔ ابن الملک کہتے ہیں اس سے مراد بذات خود دینے والا ہے اور اس کا اختیار کرنا سائل کی طرف سے بغیر تعریض کیے کہ اگر وہ اس کو نہ دے تو وہ اسے چھوڑ دے اور اس سے سوال نہ کرے یا اس سے مراد سائل ہے کہ یہ نہ دینے سے کنایہ ہے یا پھر یہ صدقہ کو خرچ کرنے اور اس کے عدم امساک سے کنایہ ہے۔

وکان : یعنی سائل صدقہ لینے والا اس صورت میں عدم برکت، کثرت حرص اور خواہش اس پر مسلط کی جاتی ہیں۔

کالذی یا کل ولا یشبع : اس بیماری کی طرح جو کھانے سے بڑھتی جاتی ہے اور اس کی تعبیر گائے کی بھوک سے کی جاتی ہے۔ اسی معنی میں مرض استسقاء (پانی پیتے جانا) ہے۔

والید العلیا : یعنی دینے والا اور یا نہ مانگنے والا۔

الید السفلی : یہ لینے والا ہاتھ یا مانگنے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ روکنے والا۔

قال حکیم : مانگنے کے بارے میں سننے کے بعد کہ حالت میں نقص آ جاتا ہے اور مال بے برکت ہو جاتا ہے تو تب حکیم نے کہا۔

لا ارزأ : راء کے سکون کے ساتھ جو''زا'' سے پہلے ہے۔ یعنی میں اس میں کمی نہیں کروں گا۔

احدًا :یعنی کسی سے مال کے لیے سوال نہیں کروں گا اور نہ اُس سے لوں گا۔

بعدك : یعنی آپ سے اس سوال کے بعد یا آپ کے اس قول کے بعد۔

شیئا : دوسرا مفعول ہے ارزأ کا بمعنی انقص

۱۸۴۳:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَذْكُرُ الصَّدَقَةَ وَالتَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ الْيَدِ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَلْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ وَالسُّفْلٰى هِيَ السَّائِلَةُ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹٤/۳۔ حدیث رقم ۱٤۲۹۔ ومسلم فی صحیحه ۷۱۷/۲ حدیث رقم (۹٤۔ ۱۰۳۳)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲۹۷/۲ حدیث رقم ۱٦٤۸۔ والنسائی ٦۱/۵ حدیث رقم ۲۵۳۳۔ ومالك فی الموطأ ۹۹۸/۲۔ حدیث رقم ۸ من کتاب الصدقة واحمد فی المسند ٦۷/۲۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تھے اور صدقہ کا ذکر بیان کر رہے تھے اور سوال سے بچنے کے بارے میں خطبہ دے رہے تھے یہ ارشاد فرمایا کہ اوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے' اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا اور لوگوں کو دینے والا ہاتھ ہے اور نیچے کا ہاتھ مانگنے والا یعنی سائل کا ہاتھ ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: وهو على المنبر وهو يذكر الصدقة: (یہ جملہ حالیہ ہے) ای والحال أنه يذكر الصدقة: یعنی اس کی فضیلت اور اس پر رغبت دلانا' اس کو لینے کا حکم یا اس کا مانگنا کیسا ہے؟

والتعفف عن المسألة : طیبی کہتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ حرام اور لوگوں سے مانگنے (سوال کرنے) سے رک جانا۔

واليد العليا هي المنفقة: یعنی عطا کرنے والا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں صحیح بخاری اور مسلم میں اسی طرح ہے اور امام ابوداوٗد نے اپنی اکثر روایات میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے: ابن عمرؓ نے کہا: المتعففة یہ العفة سے ہے۔ یہ روایت راجح ہے کیونکہ کلام (بحث) تعفف اور سوال کے متعلق ہے اور معنی دونوں روایتوں کے لحاظ سے صحیح ہے۔ خرچ کرنے والا ہاتھ لینے والے سے اعلیٰ ہے نا مانگنے والا ہاتھ مانگنے والے سے اعلیٰ ہے۔ شیخین (بخاری و مسلم) کی روایت اولیٰ اور روایت و درایت کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے۔

اس کی تفسیر میں مرفوع اور موقوف دونوں کا احتمال ہے دوسری بات کی تائید ابن حجر کے قول سے ہوتی ہے۔ امام ابوداوٗد نے اکثر راویوں سے یہ تفسیر بیان کی ہے۔ خطابی کہتا ہے۔ راجح بات وہی ہے جو سنن ابی داوٗد میں ہے:

عن ابن عمر ان العليا هي المتعففة والسفلى هي السائلة : کیونکہ کلام کا سیاق مسألہ اور تعفف کے متعلق

ہے۔ابن حجرؒ نے اپنے قول میں مردود والی غریب (نامانوس) بات کی ہے۔راجح قول جمہور کا ہے اور وہ پہلی روایت ہے جس طرح کے امام نووی کا یہ موقف ہے۔کیونکہ ان دونوں کے درمیان تعارض نہیں ہے اس لیے کہ دونوں حالتوں جمع ممکن ہے اور یہ دونوں جماعتوں کا موقف ہے۔باوجود اس کے انہوں نے متعفقہ والی روایت کو منفقۃ والی روایت پر کتاب **هذا المقام لنظام المرام لالما يترتب عليه احكام ائمة الانام** میں ترجیح دی ہے۔

شیخ ابونجیب سہروردی "**آداب المريدين**" میں کہتے ہیں: صوفیاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ فقر غنی سے افضل ہے جب رضا حاصل کرنا مقصود ہو۔اگر دلیل پکڑنے والا نبی ﷺ کے فرمان سے دلیل پکڑے۔(**اليد العليا خير من اليد السفلى**) اس سے جواب میں کہا جائے گا۔کہ ید علیا وہ دینے والا ہے اور ید سفلیٰ مانگنے والا ہے۔اسی سے کہا جائے۔بلند ہاتھ (اوپر والا ہاتھ) اللہ کے راہ میں نکالنے کی وجہ سے فضیلت پالیتا ہے اور نیچے والا ہاتھ اس چیز کے حصول کی وجہ سے (صدقہ کی وجہ سے) نشیب (کمی) کو پاتا ہے۔

اس قول کی وضاحت اس طرح کہ غنی مال دینے سے بہ نسبت فقیر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور فقیر مال لینے کی غرض سے کسی غنی کے پاس جاتا ہے تو اس کی حالت میں کمی واقع ہوتی ہے (اس کا رتبہ کم ہو جاتا ہے) یہ بہت بڑا مبالغہ ہے اور بڑی عظیم دلالت جو فقیر کی افضلیت پر جو صبر کرنے والا ہے غنی شاکر پر دی جارہی ہے۔چونکہ سائل کی یہ حالت تب ہے جب ثواب کی نیت ہے۔تو متعفف اور مال لینے والے کی ضرورت اور فاقہ کے وقت کیسے ہوگی؟ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائل جب اضطراری حالت میں نہ ہو۔اور جب اس پر سوال کرنا واجب ہو اور اسکا حال اس پر غالب ہو تو مثال بدل جائے گی اسے لیے بعض عارفین کہتے ہیں: میری مراد خواجہ عبیداللہ سمرقندی قدس اللہ سرہ ہیں جب ان سے سوال کیا گیا ہے کہ صبر کرنے والا فقیر یا شکر کرنے والا غنی افضل ہے؟ انہوں نے کہا: بلکہ فقیر جو مصائب میں مبتلا ہے اور اپنی شکایات اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔اور انہوں نے یہ مراد لی ہے کہ جو انتہا کو پہنچی ہو یا ضروری شکوہ کرنے والا ہو یا ان کا اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف ہے: ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [يوسف: ٨٦] "انہوں نے کہا کہ میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔اور خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

اللہ تعالیٰ سوال نہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے

۱۸۴۴: وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ اِنَّ اُنَاسًا مِّنَ الْاَنْصَارِ سَاَلُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَعْطَاهُمْ ثُمَّ سَاَلُوْهُ فَاَعْطَاهُمْ حَتّٰى نَفِدَ مَا عِنْدَهٗ فَقَالَ مَا يَكُوْنُ عِنْدِيْ مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ اَدَّخِرَهٗ عَنْكُمْ وَمَنْ يَّسْتَعِفَّ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰهُ وَمَا اُعْطِيَ اَحَدٌ عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ وَّاَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۳۵/۳ حديث رقم ۱۴۶۹۔ ومسلم في صحيحه ۷۲۹/۲ حديث رقم (۱۲۴۔ ۱۰۵۳)۔ وابوداؤد في السنن ۲۹۵/۲ حديث [redacted] والترمذي ۳۷۸/۴ حديث رقم ۲۰۲۴۔ والنسائي

۹۵/۵ حدیث رقم ۲۵۸۸۔ والدارمی ۴۷٤/۱ حدیث رقم ۱٦٤٦۔ ومالك فی الموطأ ۹۹۷/۲ حدیث رقم ۷ من كتاب الصدقة واحمد فی المسند ۱۲/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن انصار میں سے چند لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا فرما دیا۔ انہوں نے پھر مانگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی دے دیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ تھا سب ختم ہو گیا' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال بھی ہوگا میں تم سے بچا کر اس کا ذخیرہ نہیں کروں گا اور یاد رکھو کہ جو شخص لوگوں سے سوال کرنے سے بچتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بری باتوں سے بچاتا ہے اور اسے لوگوں کا محتاج نہیں کرتا اس طرح اس کی خودداری کو باقی رکھتا ہے' نیز جو شخص انتہائی معمولی چیز پر بھی قناعت کرتا ہے اور کسی سے سوال نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے قناعت آسان کر دیتا ہے اور جو شخص بے پروائی ظاہر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بے پرواہ بنا دیتا ہے یعنی جو شخص دوسروں کے مال وزر سے بے پروا ہوتا ہے اور ہاتھ پھیلانے سے بچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اور جو شخص صبر کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا فرماتا ہے یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے صبر آسان کر دیتا ہے اور یاد رکھو کہ صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع کوئی دوسری چیز عطا نہیں کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام عطاء و بخشش میں صبر سب سے بہتر عطا ہے۔''

تشریح: اناسا : ایک نسخہ میں بغیر ہمزہ کے ہے یعنی ایک جماعت۔

حتی نفد : فاء کے کسرہ اور دال کے مہملہ کے ساتھ یعنی ختم ہو گیا۔

ما عنده فقال ما یكون عندی من خیر : یعنی مال ''مِنْ'' بیانیہ ہے اور خبر یہ ہے اور شرط کو متضمن ہے یعنی مال میں سے ہر چیز جو میرے پاس موجود ہے تمہیں دوں گا۔

ومن یستعف : اور بعض نسخوں میں ''بالفك'' ہے یعنی جو سوال کرنے سے اپنے نفس کو بچاتا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے عفت کا سوال کرتا ہے تو یہاں سین صرف تاکید کے لیے نہیں ہے جیسا کہ ابن حجر کا قول ہے۔

یعفه الله : اللہ تعالیٰ اس کو پاک دامن رکھے گا (مانگنے سے بچائے گا) عفت عطا کرے گا سے مراد اُسے ممنوعات شرعیہ سے حفاظت میں رکھے گا۔ یعنی جس معمولی چیز پر قناعت کی اور سوال (مانگنا) چھوڑ دیا اس کے لیے قناعت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور یہ ایسا خزانہ ہے جو ختم نہیں ہوگا۔

ومن یستغن : یعنی لوگوں کے اموال سے مستغنی رہنا اور سوال کرنے سے بچ جانا۔ یعنی غنی کو ظاہر کرتا ہے اور لاعلم لوگ اس کو سوال نہ کرنے کی وجہ سے غنی سمجھتے ہیں۔

یغفه الله : یعنی اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دے گا۔ حدیث شریف میں ہے۔ (لیس الغنی عن كثرة المعرض إنما الغنی عن النفس : غنی کثرت مال سے نہیں بلکہ نفس کا غنی ہونا ہی اصل غنی ہے۔

ومن یتصبر : یعنی صبر کی توفیق اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: واصبرو وما صبرك الا بالله [العلق: ۱۲۷] یا وہ اپنے نفس کو باندھ کر اُسے تکلیف و مشقت اُٹھانے پر ابھارتا ہے۔ یہ عموم کے بعد تخصیص ہے۔ کیونکہ صبر اس کو اطاعت، معصیت اور آزمائش پر ڈٹ جانے پر کوستا ہے۔ یا جو سوال کرنے سے یا جو لوگوں کے پاس مال ہے اس کی طرف رغبت

رکھنے سے اپنے آپ کو صابر بنالے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے اپنی حالت کا شکوہ نہ کرے۔

یصبرہ : تشدید کے ساتھ یعنی اس پر صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پس تمام جملے موکدات (تاکید کے لیے) ہیں۔ جس سے عموم کے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

وما اعطى احد عطاء : یعنی انعام یا کوئی چیز۔

هو خير : افضل ہے کیونکہ سالک تمام مقامات میں اس کا محتاج ہوتا ہے۔

وأوسع : یعنی اشرح للصدر یعنی سینہ کے کھلنے کے لیے۔

صبر کا مقام تمام مقامات سے اعلیٰ ہے کیونکہ یہ تمام مکارم اخلاق' صفات اور حالات کو جمع کرنے والا ہے۔ اسی لیے اس کو نماز پر مقدم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿واستعينوا بالصبر والصلوٰة﴾ [البقرہ: ٤٥] اَوْسَعُ کا معنی یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کو معارف، مشاہدات، اعمال اور مقاصد میں وسعت اور کشادگی مل جاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رضا افضل ہے جیسے کہ انہوں نے صراحت کی ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رضا کی غایت صبر کے ساتھ ہی معتبر ہے اس لیے یہ (غیر مانوس) اجنبی نہیں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان اسی طرح راہنمائی کر رہا ہے۔ (إنا وجدناه صابرا) [ص:٤٤] اس سے مراد اس کے حق میں یا اس جیسے کے حق میں جب اس کے ساتھ اللہ کی رضا نہ ہو تو یہ بہت ناقص رتبہ ہے۔ اس رضا کے معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ فاصبر كما صبر اولوا العزم من الرسل۔ [الاحقاف: ٣٥]

﴿واصبر لحكم ربك فانك باعيننا﴾ [الطور: ٤٧]

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [النحل: ١٢٧]

طیبی فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں عطا خير ہے یعنی وہ بہتر ہے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے۔ ایک روایت میں خَيْرًا منصوب ہے اور عَطَاءً کی صفت ہے۔ میرک فرماتے ہیں: مشکوٰۃ کے موجودہ نسخوں میں اسی طرح ہے۔ مسلم شریف کے نسخوں میں اس طرح ہے۔ "ما اعطى أحد عطاء خير" "وهو" کے بغیر ہے اور ھو مقدر ہے۔ ایک روایت میں خیرًا منصوب ہے۔ جیسے شرح مسلم للنووی سے سمجھ آتا ہے اور صاحب مشکوٰۃ کا قول جو حدیث کے آخر میں ہے (متفق علیہ) تساہل ہے واللہ اعلم۔

جو چیز بغیر لالچ اور خواہش کے ملے قبول کرنی چاہیے

١٨٤٥: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِيْنِي الْعَطَاءَ فَاَقُوْلُ اَعْطِهِ اَفْقَرَ اِلَيْهِ مِنِّي فَقَالَ خُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ وَتَصَدَّقْ بِهِ فَمَا جَآءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَاَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَآئِلٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٣٧/٣۔ حديث رقم ١٤٧٣۔ ومسلم في صحيحه ٧٢٣/٢ حديث رقم (١١٠۔ ١٠٤٥)۔ والنسائي في السنن ١٠٥/٥ حديث رقم ٢٦٠٧۔ واحمد في المسند ١٧/١۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کی اجرت عطا فرماتے تو میں عرض کرتا کہ یہ اس شخص کو دے دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں فرماتے کہ اگر تمہیں حاجت وضرورت ہو تو اسے لے کر اپنے مال میں شامل کرلو اور اگر حاجت وضرورت سے زیادہ ہو تو خدا کی راہ میں خیرات کردو نیز یہ بھی فرماتے کہ جو چیز تمہیں بغیر طمع وحرص اور بغیر مانگے حاصل ہو اسے قبول کرلو اور جو چیز اس طرح یعنی بغیر طمع وحرص اور بغیر سوال کے ہاتھ نہ لگے تو اس کے پیچھے مت پڑو۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: کان النبی ﷺ یعطینی العطاء : کہا گیا ہے۔ کہ یہ عطا صدقہ جمع کرنے کی اجرت ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ فصل ثالث میں ابن ساعدی کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

اعطہ : ضمیر عطاء کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یا سکتہ کے لئے ہے۔

فتمولہ : یعنی اس کو قبول کر کے اپنے مال میں شامل کرلے یعنی اگر تو ضرورت مند ہے۔

فما جاء ك من هذا المال : یہ جنس مال کی طرف اشارہ ہے یا وہ مال جو اس کو دیا ہے۔

غیر مشرف : طیبی فرماتے ہیں: اشراف سے مراد کسی چیز پر علم ہونا اور اس کے درپے ہونا یعنی اس کا لالچ کرنا۔ تو اس کا حریص نہ ہو۔ خواہش کرنے والا نہ ہو۔

ومالا : ای وما لا یکون کذلك...... یعنی جو ایسا نہ ہو بایں طور کہ وہ تجھ کو نہیں ملے گا الّا یہ کہ تجھے طمع وحرص ہو اور تو اس کو طلب کرے تو اپنے نفس کو اس کے پیچھے نہ لگا اور اس کی طلب میں مشقت نہ اُٹھا۔

ایک سبق آموز واقعہ:

ایک حکایت ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے بازار سے کوئی چیز خریدی اور اس کو مزدور کے سر پر رکھا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ روٹی ٹھنڈا کرنے کے لیے کھول کر رکھی ہوئی ہے۔ تو انہوں نے اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ بنان (مزدور) کو روٹی دے۔ اس نے اُسے کھانا پیش کیا۔ وہ مزدور رک گیا اس نے وہ روٹی نہ لی۔ جب وہ گھر سے نکلا تو امام صاحب نے بیٹے سے کہا کہ وہ اُس کے پیچھے جا کر اسے کھانا دے دے۔ تو تب اُس نے کھانا لے لیا۔ بیٹے نے پہلی مرتبہ اس کے نہ لینے اور دوسری دفعہ لینے پر تعجب کا اظہار کیا اور اپنے والد امام احمدؒ سے اُس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو بشری طبیعت کی بنا پر اس کے دل میں حرص پیدا ہوا تو اس کو لینے سے رک گیا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو اس وقت روٹی اس کے طمع کے بغیر لائی گئی تو اس حالت میں اس نے لے لی۔ ایک حدیث میں ہے (من أتاه من هذا المال شي من غير سؤال ولا اشراف نفس فرده فكانما رده على الله) ''جس کے پاس یہ مال (صدقہ وغیرہ کا) بغیر مانگے اور بغیر طمع نفس کے آئے اور وہ اس کو واپس کردے گویا کہ اُس نے اُسے اللہ پر لوٹا دیا''۔ اس وجہ سے کہا گیا کہ اس کا قبول کرنا واجب ہے۔

الفصل الثانی:

سوال کرنے والوں کو تنبیہ

۱۸۴۶: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَسَآئِلُ كُدُوْحٌ يَكْدَحُ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ فَمَنْ شَآءَ اَبْقٰى عَلٰى وَجْهِهٖ وَمَنْ شَآءَ تَرَكَهٗ اِلَّآ اَنْ يَّسْاَلَ الرَّجُلُ ذَا سُلْطَانٍ اَوْفِىْ اَمْرٍ لَّا يَجِدُ مِنْهُ بُدًّا۔ (رواه ابوداود والترمذی والنسائی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۸۹/۲ حدیث رقم ۱۶۳۹۔ والترمذی ۶۵/۳۔ حدیث رقم ۶۸۱۔ والنسائی ۱۰۰/۵ حدیث رقم ۲۵۹۹۔ واحمد فی المسند ۲۲/۵۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ ابن جندب روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سوال کرنا ایک زخم ہے جس کے ذریعے انسان اپنا منہ زخمی کرتا ہے بایں طور کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی عزت وآبرو کو خاک میں ملاتا ہے کہ یہ اپنے منہ کو زخمی کرنے ہی کے مترادف ہے لہٰذا جو شخص اپنی عزت وآبرو باقی رکھنا چاہے' اس کو چاہیے کہ وہ سوال سے شرم کرے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا کر اپنی عزت وآبرو کو باقی رکھے اور کوئی شخص اپنی آبرو باقی رکھنا ہی نہیں چاہتا تو وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی عزت خاک میں ملالے یعنی اسے باقی نہ رکھے یہ گویا سوال کرنے والے کے لئے تہدید اور تنبیہ ہے کہ کسی سے سوال نہ کرنا چاہیے۔ ہاں! اگر سوال ہی کرنا ہے تو پھر حاکم سے سوال کرے یا ایسی صورت میں سوال کرے کہ اس کے لئے کوئی واقعی ضرورت اور مجبوری ہو۔'' (ابوداؤد' ترمذی' نسائی)

تشریح: المسائل: ''مسألة کی جمع ہے۔ مختلف انواع کی وجہ سے جمع لائی گئی۔ یہاں مراد لوگوں کے اموال کے متعلق سوال کرنا ہے۔

کدوح: صبور کی طرح یعنی اس کے وزن پر ہے۔ اور ''کدح'' سے مبالغہ کے لیے ہے اور اس کا معنی ہے زخم۔ مسائل کے متعلق جو اخبار ہیں وہ اس اعتبار سے ہیں کہ جو ان مسائل کو اختیار کرے۔ یعنی لوگوں سے مال مانگنے والا وہ ان لوگوں کو زخمی کرنے والا اور تکلیف دینے والا ہے۔ اس قول کو ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے چہرے کو زخمی کرنے والا ہے یہ معنی زیادہ واضح ہے آپ اس پر غور کریں۔ کدوح کا فا کے ضمہ کے ساتھ ''کدح'' کی جمع ہے۔ کوئی ناپسندیدہ نشان جو خراش لگنے یا کٹنے کی وجہ سے ہو۔ یہاں اس کو جمع لانا مناسب ہے تاکہ مسائل کے مطابق ہو جائے۔

یکدح بها الرجل: یعنی زخمی کرتا ہے اور عیب دار کرتا ہے مسائل (مانگنے) کی وجہ سے۔

کدح کا اطلاق کبھی کبھی بغیر زخم کے بھی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴾ [الانشقاق: ٦] ''اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا۔''

ابقٰی علٰی وجهه: یعنی پسینہ بہانا حیاء کی وجہ سے سوال مانگنے کو ترک کر کے اور تعفف کو اختیار کر کے۔

ومن شاء: یعنی باقی نہ رکھنا۔

قولہ: إلا ان جیسال الرجل ذا سلطان...... یعنی حاکم اور بادشاہ جس کے پاس بیت المال کا اختیار ہے۔ وہ اس سے اپنا حق مانگے اگر یہ مستحق ہے تو سلطان اس کو دے دے۔ طیبی فرماتے ہیں: سلطان کے عطاء میں اختلاف ہے ایک گروہ اس سے روکتا ہے دوسرے گروہ نے جائز قرار دیا ہے۔

منہ: یعنی اس کی وجہ سے۔

بدًا: یعنی مانگنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ (حل) نہ ہو یا مانگنے سے خلاصی پانا ممکن نہ ہو جیسا کہ فاقہ اور کوئی اچانک مصیبت وغیرہ میں بلکہ حالت اضطرار جیسے ننگا پن یا بھوک اس میں سوال کرنا واجب ہے۔

امام غزالی کہتے ہیں: اسی طرح جو حج کی استطاعت رکھتا تھا اور اس نے سستی کی یہاں تک اس کے پاس مال ختم ہو گیا۔ اور وہ تنگ دست ہو گیا تو ایسے شخص پر بھی سوال کرنا واجب ہے۔ ہو گیا۔

ابن حجر کہتے ہیں: اگر وہ حج سے پہلے فوت ہو گیا تو اُس نے اپنے آپ کو فسق کے گڑھے میں گرا دیا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اس لغزش سے نکالے جو اس کو فسق کی طرف لے جا رہی ہے اس کا حل یہ ہے کہ وہ اغنیاء سے صرف اتنا سوال کرے وہ واجب کو ادا کر سکے یا اور اسی سے بعض لوگوں اور امام غزالی سے درمیان وجوب کے متعلق نزاع ختم ہو جاتا ہے۔

بلاضرورت مانگنے والوں کا حشر

۱۸۴۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ وَلَهُ مَا يُغْنِيْهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَسْأَلَتُهُ فِي وَجْهِهٖ خُمُوْشٌ اَوْخُدُوْشٌ اَوْ كُدُوْحٌ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا يُغْنِيْهِ قَالَ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا اَوْقِيْمَتُهَا مِنَ الذَّهَبِ۔ (رواه ابو داود والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۷۷/۲۳ حدیث رقم ۱۶۲۶۔ والترمذی فی السنن ۴۰/۳ حدیث رقم ۶۵۰۔ والنسائی ۹۷/۵ حدیث رقم ۲۵۹۲۔ وابن ماجه ۵۸۹/۱ حدیث رقم ۱۸۴۰۔ والدارمی ۴۷۲/۱ حدیث رقم ۱۶۴۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص لوگوں سے ایسی چیز کی موجودگی میں سوال کرے جو اسے مستغنی بنا دینے والی ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں پیش ہوگا کہ اس کے منہ پر اس کا سوال بصورت خموش یا خدوش یا کدوح ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مستغنی بنانے والی کیا چیز ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پچاس درہم یا اس قیمت کا سونا۔'' (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' داری)

تشریح: خموش: یعنی زخم۔

أو خدوش أو كدوح: پہلے دو حرفوں کے ضمہ کے ساتھ۔ اور دونوں الفاظ معانی میں قریب قریب ہیں۔ أو یہاں راوی کے شک کے لیے ہے۔ وہ نشان جو جلد اور گوشت پر ہوتا ہے جسم کا ایسی چی کے ساتھ لگنے کی وجہ سے جو جلد سے چھلکا اتار دے یا زخمی کر دے شاید اس سے مراد وہ ناپسندیدہ نشان جو چہرے پر ہوں یا اس سے مراد نشانیاں ہیں تا کہ قیامت اس کے ذریعے اس کی

پہچان ہو اور اس کی شہرت ہو۔ یا یہاں ''اَوْ'' سائل کے مراتب کے تقسیم کے لئے ہے۔ کہ ان میں سے بعض سائل کم مانگنے والے ہوتے ہیں اور بعض زیادہ مانگنے والے ہوتے ہیں اور بعض مانگنے میں افراط تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔ یہاں اس کے مطابق اقسام کا ذکر ہے۔ ''خمش'' بہ نسبت ''خدش'' کے معنی میں زیادہ بلیغ ہے اور خدش بہ نسبت ''کدح'' کے بلیغ ہے۔ خمش چہرے میں ہوتا ہے۔ خدش جلد میں اور کدح جلد کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ ''خدش'' لکڑی کے ساتھ جلد کو چھیل دیتا ہے۔ خمش ناخنوں کے ساتھ جلد کو چھیل دیتا ہے اور کدح کاٹنے کے ساتھ جلد کو چھیل دیتا ہے اور یہ مصادر ہیں۔ لیکن جب آثار (نشانات) کے لیے ان کو اسم بنایا گیا تو ان کی جمع لائی گئی ہے۔

قوله: قال خمسون درهما أو قيمتها: یعنی پچاس درہم کی قیمت کا سونا۔ طیبی فرماتے ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو پچاس درہم کا مالک ہو یا اس کے برابر قیمت کا کوئی دوسرا جنس ہو وہ آدمی غنی ہے اُس کے لئے مانگنا اور صدقہ لینا حرام ہے اور یہی قول ابن مبارک، احمد، اسحاق کا ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ جس کے پاس صبح وشام کا کھانا اس نے زیادہ ہمہ وقت ہوتا ہے تو وہ آدمی غنی ہے جس طرح کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے۔ برابر ہے کہ وہ ہاتھ سے کمائے ہوں یا تجارت سے لیکن جب اُن میں تجارت کا رجحان زیادہ تھا اور یہ مقدار یعنی پچاس درہم رأس المال کے لئے کافی تھے۔ تو انہی کے ساتھ تخمینہ لگایا گیا۔ یا جو اس کے قریب ہے اس کے ساتھ تخمینہ لگایا گیا۔ جیسا کہ اس کا ذکر تیسری حدیث میں ہے۔ میری مراد ''اوقیہ'' ان دنوں یہ چالیس درہم ہوتے تھے۔ تو ان احادیث میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''حديث ما يغنيه'' حدیث اوقیہ کی وجہ سے منسوخ ہے اور حدیث اوقیہ منسوخ ہے حدیث خمسین کی وجہ سے اور حدیث خمسین منسوخ ہے مرسل روایت ''من سال الناس وعنده خمس أواق فقد ساص الحافًا'' کی وجہ سے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اس پر فتویٰ ہے۔

پیچھے یہ بات گزر گئی ہے کہ امام صاحب کا مسلک ہے کہ جس کے پاس ۲۰۰ درہم ہوں اس کے لئے صدقہ لینا حرام ہے۔ جو ایک دن کے غلے کا مالک ہے اس کے لئے سوال کرنا حرام ہے تو امام صاحب لینے اور سوال کرنے میں فرق کیا ہے۔ پس جو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ مسئلہ مانگنے کی حرمت کی نسبت اس کا منسوخ ہونا اور کے عکس کے سبب سے ہے۔ چونکہ اکثر نسخ وہ اس مقرر کی وجہ سے ہے کہ جو اس کے پاس صبح وشام کا کھانا ہے جس کی وجہ سے اس پر سوال کرنا (مانگنا) حرام ہے۔ حکمت کے تقاضے کے تحت حکم تدریجاً جس طرح شراب کے حرام ہونے میں حکم ہے۔ رہی عبادات تو اس میں تدریج میں زیادتی اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے تقاضے کے مطابق اور بشری طبائع کے موافق ہوگی۔

غنی کون کہلا سکتا ہے

۱۸۴۸: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَأَلَ وَعِنْدَهُ مَا يُغْنِيْهِ فَإِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنَ النَّارِ قَالَ النُّفَيْلِيُّ وَهُوَ اَحَدُ رُوَاتِهٖ فِيْ مَوْضِعٍ اٰخَرَ وَمَا الْغِنَى الَّذِىْ لَا تَنْبَغِيْ مَعَهُ الْمَسْاَلَةُ قَالَ قَدْرَمَا يُغَدِّيْهِ وَيُعَشِّيْهِ وَقَالَ فِيْ مَوْضِعٍ اٰخَرَ اَنْ يَكُوْنَ لَهٗ شِبْعُ يَوْمٍ اَوْ لَيْلَةٍ وَّيَوْمٍ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۸۰/۲ حدیث رقم ۱۶۲۹۔ واحمد فی المسند ۱۸۰/۴۔

ترجمہ: ''اور حضرت سہل ابن حنظلیہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس اتنا مال ہو جو اس کو مستغنی کر دے مگر وہ اس کے باوجود لوگوں سے سوال کرتا ہے تو گویا وہ زیادہ آگ مانگتا ہے یعنی جو شخص بغیر ضرورت وحاجت کے لوگوں سے مانگ مانگ کر مال وزر جمع کرتا ہے تو وہ گویا دوزخ کی آگ جمع کرتا ہے۔ نفیلیؒ نے ایک اور جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب اس طرح نقل کیا ہے کہ اس کے پاس ایک دن یا ایک رات کے بقدر خوراک ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک دن فرمایا ہے یا ایک رات اور ایک رات فرمایا ہے۔'' (ابوداؤد)

تشریح: نفیلی کہتا ہے۔ نون کے ضمہ اور ''فاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ وہ عبداللہ بن محمد، ابوداؤد سجستانی کے شیخ ہیں۔ یہ ان کی نسبت اپنے آباء میں سے کسی ایک کی طرف ہے۔

لا تنبغی : مذکر اور مؤنث دونوں طرح ہے۔

قال : یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے۔

قدر مایغدیه و یعشیه : یعنی اتنی مقدار مال یا کمانا جو اس کے لیے دو وقت کافی ہے اور علم حاصل کرنے سے نہ روکے۔ یا ''یعد یہ'' سے مراد صبح کا کھانا اور تغشیہ رات کا کھانا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: یعنی جس کے پاس دو وقت کی قوت (غلہ) موجود ہو اس کے لیے اس دن نفلی صدقہ مانگنا جائز نہیں۔ رہا فرض صدقہ (زکوۃ) وغیرہ تو مستحق کے لیے جائز ہے کہ وہ اتنی مقدار کا سوال کر جس سے وہ سال کا خرچ اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے نکال لے اس طرح لباس بھی ہے۔ کیونکہ اس کی تقسیم سال میں ایک مرتبہ ہے۔

فی موضع آخر : اس سوال کے جواب میں جو اس کو غنی کر دے۔

شبع : شین کے کسرہ ''باء'' کے سکون اور فتحہ کے ساتھ اکثر کا یہی موقف ہے۔ یعنی جو کھانا دن کے شروع اور آخر میں اس کو سیر کر دے۔ ابن الملک کہتے ہیں کہ ''باء'' کے سکون کے ساتھ ''یشبع کے معنی میں الور'' باء'' کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے۔ قاموس میں ہے: ''شبع'' فتحہ کے ساتھ ''عنب'' کے وزن پر ہے اور یہ بھوک (جُوْعٌ) کی ضد ہے۔ اور کسرہ کے ساتھ عنب کی طرح اسم ہے جو آپ کو سیر کر دے۔

أو لیلة ویوم : راوی کو شک ہے۔

لوگوں سے بطریق الحاح نہ مانگا جائے

۱۸۴۹: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ رَّجُلٍ مِّنْ بَنِیْ اَسَدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَأَلَ مِنْكُمْ وَلَهٗ اُوْقِيَّةٌ اَوْعَدْلُهَا فَقَدْ سَأَلَ اِلْحَافًا۔ (رواہ مالک وابو داؤد والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۷۸/۲ حدیث رقم ۱۶۲۷۔ والنسائی ۹۸/۵ حدیث رقم ۲۵۹۶ واحمد فی المسند ۴۳۰/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت عطاء ابن یسار قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: تم میں سے جو شخص ایک اوقیہ کا یا اس کے قیمت کے بقدر سونا وغیرہ کا مالک ہو اور اس کے باوجود وہ لوگوں سے مانگے تو اس نے گویا بطریق الحاح سوال کیا۔'' (مالک' ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله :عن عطاء بن يسار عن رجل من نبی اسد:

پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ صحابی کا ابہام کوئی نقصان دہ نہیں کیونکہ صحیح اور درست قول یہ ہے کہ أن الصحابه كلهم عدول سارے کے سارے عادل ہیں۔ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کو سچی توبہ کرنے کی توفیق دی۔

قال رسول الله ﷺ من سال منكم وله اوقية : ہمزہ کے ضمہ اور ''یاء'' کی تشدید کے ساتھ ہے یعنی چاندی کے چالیس درہم۔

أو عدلها : عین کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ یعنی جو سونے یا اور کسی مال سے اس کے برابر ہو۔

فقد سأل الحافًا : یعنی چمٹ کر اور اسراف کرتے ہوئے بغیر کسی مجبوری کے مانگنا۔ میرک فرماتے ہیں: امام ابوداؤد نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے اور امام منذری نے اس کو صحیح کہا ہے اور حدیث میں ایک حصہ ہے۔ اس حدیث کا شاہد امام نسائی کے پاس ہے اور اس حدیث کے راوی ابوسعید ہیں۔

انتہائی ضرورت کے علاوہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے

۱۸۵۰: وَعَنْ حُبْشِيِّ بْنِ جُنَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ إِلَّا لِذِيْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ غُرْمٍ مُّفْظِعٍ وَّمَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهِ مَالَهُ كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَضْفًا يَّاكُلُهُ مِنْ جَهَنَّمَ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُقِلَّ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُكْثِرْ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۳/۳ حدیث رقم ۶۵۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت حبشی ابن جنادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا نہ تو غنی کے لئے اور نہ تندرست وتوانا اور صحیح الاعضاء کے لئے مانگنا حلال ہے' ہاں فقیر کے لئے مانگنا حلال ہے جسے زمین پر ڈال دیا گیا ہو' اسی طرح اس قرض دار کے لئے بھی مانگنا حلال ہے جو بھاری قرض کے نیچے دبا ہو جو شخص صرف اس لئے لوگوں سے مانگے کہ اپنے مال و زر میں زیادتی ہو تو قیامت کے دن اس کا مانگنا اس کے منہ پر زخم کی صورت میں ہوگا۔ نیز دوزخ میں اسے گرم پتھر اپنی خوراک بنائے گا' اب چاہے کوئی کم سوال کرے چاہے کوئی زیادہ سوال کرے۔'' (ترمذی)

تشریح: وعن حبشي: ''حاء'' کے ضمہ اور ''با'' کے سکون کے ساتھ۔

ابن جنادة: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ طیبی فرماتے ہیں: وہ ابوجنوب قبیلہ بنوبکر بن ہوازن سے ہے انہوں نے نبی ﷺ کو حجۃ الوداع میں دیکھا اور ان کی صحبت ثابت ہے۔ اور ان کا شمار اہل کوفہ میں سے ہوتا ہے۔

قال قال رسول الله ﷺ إن المسألة لا تحل لغني : یعنی جس کے پاس اتنا ہو کہ جو ایک دن کے لیے کافی ہو۔

الذی مرة: میم کے کسرہ کے ساتھ یعنی جو مضبوط ہو اس کو کوئی بیماری یا سبب نہ ہو۔

سوی: یعنی جس کے سارے اعضاء صحیح و سالم ہوں اور وہ کمانے پر قادر ہو۔

الا لِذی فقر: یہ مالداروں سے استثناء ہے۔

مدقع: یعنی جو شدید محتاج اور فقیر ہے۔ یہ اُدقع بمعنی لصق بالدقعاء سے ہے۔ یعنی زمین کے ساتھ چمٹنا۔

غرم: غین کے ضمہ کے ساتھ یعنی قرض۔

مفظع: یعنی بہت بری حالت۔ طیبی فرماتے ہیں اس سے مراد جو شخص جائز کام کے لئے اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے قرض مانگے۔ یا ہے کہ مانے تو نافرمانی کے لئے لیکن اس کو جائز میں خرچ کرے اور توبہ کرے اور یہ بھی ممکن ہے اس سے مراد وہ قرض ہو جو اس کے ذمہ لازم ہو گیا ہو۔ جیسے دیت اور کفارہ وغیرہ۔

به: یعنی سوال کرنے اور صدقہ لینے سے۔

ماله: لام کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ یعنی وہ اپنا مال زیادہ کرے اور یہ بعض شارحین کا قول ہے۔ نہایہ میں ہے۔ الثری سے مال۔ اثری القوم کثروا۔ یعنی ان کے اموال بڑھ گئے۔ قاموس میں ہے ثروۃ کثرت عدد کو کہتے ہیں یعنی جو لوگ مال میں زیادہ ہوں۔ آپ لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور نمو پا رہے ہیں۔ اسی طرح مال کی مثال ہے۔ ثری کی طرح ہے اس کا مال بڑھ گیا میرا مال کی طرح جب آپ کو پہچان ہو جائے۔ اکثر نسخوں میں "ماله" لام کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ اس لغت کے خلاف ہے اثری باب لازم ہے اور اس کے لیے رفع لازم ہے مگر یہ کہا جائے کہ "ما" موصولہ ہے اس کے لیے جار مجرور ہے۔ بعض نسخوں میں ثری تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے ہے اس کو لازم پر محمول کیا جائے۔ گا اور بعض نے قیاسی طور پر اس کو متعدی کیا ہے اور عربوں سے یہ نہیں سنا گیا۔ واللہ اعلم

کان: (ضمیر کے مرجع میں تین احتمال ہیں: ① السوال۔ ② المال۔ ③ عقاب ذلک الحال۔

خموشًا: ضمہ کے ساتھ یعنی چہرہ بگاڑنا۔

ورضفًا: فتحہ اور سکون کے ساتھ یعنی گرم پتھر

یا کله من جهنم: یعنی جہنم میں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد جلانا اور عذاب دینا ہے۔ اور شاید اس کے چہرے میں داغ اور زخم اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی دوسری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پتھر کھانے کا عذاب اس کی زبان اور منہ کی جو مخلوق سے سوال کرنے کی وجہ سے جو کہ اپنے رب کی شکایت تو لازم ہے اس لیے حدیث میں ہے کہ "کاد الفقر ان یکون کفرا"۔ "قریب ہے کہ فقیری آدمی کو کفر میں لے جائے"۔

فمن شاء فلیقل: یعنی مانگنا یا جو اس پر عبرت مرتب ہوتی ہے۔

فمن شاء فلیکثر: دونوں امر تہدید کے لیے ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا﴾ [الکھف: ۲۹] "جو چاہے مؤمن ہو جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے، ہم نے تو ظالموں کے لئے دوزخ کی آگ تیار کر رکھی ہے۔"

۱۸۵۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْاَنْصَارِ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُهُ فَقَالَ اَمَا فِیْ بَيْتِكَ شَیْءٌ فَقَالَ بَلٰی حِلْسٌ نَّلْبَسُ بَعْضَهُ وَنَبْسُطُ بَعْضَهُ وَقَعْبٌ نَشْرَبُ فِيْهِ مِنَ الْمَآءِ قَالَ ائْتِنِیْ بِهِمَا فَاَتَاهُ بِهِمَا فَاَخَذَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ وَقَالَ مَنْ يَّشْتَرِیْ هٰذَيْنِ قَالَ رَجُلٌ اَنَا اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمٍ قَالَ مَنْ يَّزِيْدُ عَلٰی دِرْهَمٍ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا قَالَ رَجُلٌ اَنَا اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمَيْنِ فَاَعْطَاهُمَا الْاَنْصَارِیَّ وَقَالَ اشْتَرِ بِاَحَدِهِمَا طَعَامًا فَانْبِذْهُ اِلٰی اَهْلِكَ وَاشْتَرِ بِالْاٰخِرِ قُدُوْمًا فَاْتِنِیْ بِهٖ فَاَتَاهُ بِهٖ فَشَدَّ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُوْدًا بِيَدِهٖ ثُمَّ قَالَ اِذْهَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ وَلَا اَرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْمًا فَقَالَ فَذَهَبَ الرَّجُلُ يَحْتَطِبُ وَيَبِيْعُ فَجَاءَهٗ وَقَدْ اَصَابَ عَشَرَةَ دَرَاهِمَ فَاشْتَرٰی بِبَعْضِهَا ثَوْبًا وَبِبَعْضِهَا طَعَامًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ تَجِیْءَ الْمَسْاَلَةُ نُكْتَةً فِیْ وَجْهِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ الْمَسْاَلَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا لِثَلَاثَةٍ لِذِیْ فَقْرٍ مُّدْقِعٍ اَوْ لِذِیْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ اَوْ لِذِیْ دَمٍ مُوْجِعٍ۔ (رواہ ابو داود وروی ابن ماجۃ الی قولہ یوم القیامۃ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۹۲/۲ حدیث رقم ۱۶۴۱۔ وابن ماجه ۷۴۰/۲۔ حدیث رقم ۲۱۹۸۔ واحمد فی المسند ۱۱۴/۳۔

ترجمه: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن انصار میں سے ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کسی چیز کا سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ کیا تمہارے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے عرض کیا کہ صرف ایک موٹی سی کملی ہے جس میں سے کچھ حصہ اوڑھتا ہوں اور کچھ حصہ بچھا لیتا ہوں' اس کے علاوہ ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں چیزوں کو لے آؤ۔ وہ دونوں چیزیں لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں چیزیں اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ ان چیزوں کو کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم میں خریدنے کے لئے تیار ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان چیزوں کو ایک درہم سے زیادہ میں کون خریدنے والا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو یا تین دفعہ فرمایا' ایک شخص نے کہا کہ میں ان چیزوں کو دو درہم میں خریدتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے دیں اور اس سے دو درہم لے کر انصاری کو دیئے اور اس سے فرمایا کہ اس میں سے ایک درہم کا کھانے کا سامان خرید کر اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ' وہ شخص کلہاڑی خرید کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلہاڑی میں اپنے دست مبارک سے ایک مضبوط لکڑی لگا دی اور پھر اس سے فرمایا کہ اسے لے کر جاؤ' لکڑیاں کاٹ کر جمع کرو اور انہیں فروخت کرو' اب اس کے بعد میں تمہیں پندرہ دن تک یہاں نہ دیکھوں چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں جمع کر کے فروخت کرنے لگا جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو اب وہ دس درہم کا مالک تھا' اس نے ان درہموں میں سے کچھ کا کپڑا خریدا اور کچھ کا غلہ خرید لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حالت کی اس تبدیلی کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ صورتحال تمہارے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس چیز کہ کہ کل قیامت کے دن تم اس حالت میں آؤ کہ تمہارے سوال تمہارے منہ پر برے نشان یعنی زخم کی صورت میں ہو اور یہ یاد رکھو کہ

صرف تین طرح کے لوگوں کو سوال کرنا مناسب ہے ایک محتاج کے لئے کہ جس کی مفلسی نے زمین پر گرا دیا ہو دوسرے اس قرض دار کے لئے جو بھاری اور عدم ادائیگی کی صورت میں ذلیل کرنے والے قرض کے بوجھ سے دبا ہوا اور تیسرے صاحب خون کے لئے جو درد پہنچائے یعنی اس شخص کے لئے جس پر دیت واجب ہو خواہ اس نے خود کسی کا ناحق خون کیا ہو اور اس کا خون بہا اس کے ذمہ ہو یا کسی دوسرے شخص نے کوئی خون کر دیا ہو اور اس کی دیت اس نے اپنے ذمہ لے لی ہو مگر اس کی ادائیگی کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے بھی جائز ہے کہ اس خون بہا کے بقدر کسی سے مانگ کر ادائیگی کر دے۔ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو یوم القیامۃ تک نقل کیا ہے۔"

تشریح: ان رجلا من الانصار اتى النبی یسالہ : حال ہے یا استیناف کا بیان ہے۔

فقال امافی بیتك شئ: ہمزہ استفہام تقریری ہے اور ما نافیہ ہے اور ہمزہ اسی کے شروع سے حذف کر دیا گیا ہے۔اس وجہ سے ابن حجر نے یہ کہہ دیا کہ:اس میں حرف استفہام محذوف ہے۔

فقال :بلى حلس :اى فيه حلس ۔ "حلس" یعنی اس میں ٹاٹ ہے۔"حاء" کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔موٹا کپڑا جھل وغیرہ اونٹ کے پیٹ طرف کجاوے کے نیچے کا کپڑا۔

فنلبس: "باء" کے فتحہ کے ساتھ۔

قعب : فتحہ اور سکون کے ساتھ مراد پیالہ ہے۔

نشرب فيه من الماء : من تبعیضیہ ہے اور اخفش نے اسے زائدہ قرار دیا ہے۔

فأتاه : یعنی وہ دونوں چیزیں لے آیا جس طرح ایک نسخہ میں ہے۔

فاخذ هما رسول الله ﷺ بيده و قال من يشترى هذين: یعنی جو انتہا درجے کا اطاعت گزار اور علم کے لیے اس کے علم میں جب ان دونوں چیزوں کو نکالا آپ نے زیادہ سے زیادہ قیمت کی رغبت دلائی اس حکم میں بہت سختی ہے۔

قال رجل انا آخذهما : خاء کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ کا بھی احتمال ہے۔

قال :من يزيد على درهم مرتين: یہ قال کا ظرف ہے۔

قوله أو ثلاثا : راوی کو شک ہے۔

قال رجل أنا أخذهما بدرهمين فأعطا هما أياه فأخذ لررهمين فاعطا هما الارنصاری) اس میں بیع تعاطی کا جواز ہے۔

اشتر : راء کے کسرہ کے ساتھ ایک لغت میں سکون کے ساتھ ہے۔

فانبذ ہباء کے کسرہ کے ساتھ یعنی اس کو پہنچا دے۔

الى اهلك : یعنی جن کا خرچہ اور نفقہ آپ پر لازم کرتی ہے۔

قدوما : قاف کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ کلہاڑا۔

ولا أرينك خمسة عشر يوما : یعنی اتنی مدت یہاں نہ رہنا کہ میں تجھے دیکھوں۔اور یہاں سبب کو مسبب کے قائم

مقام کیا گیا ہے۔آدمی کو اس بات سے منع کیا ہے کہ اتنی مدت کے دوران تو نے اکتساب (کمانے) سے نہیں رُکنا۔آپؐ نے رویت کی نفی نہیں کی۔

وهذا خير لك من أن تجئ المسألة : یعنی جب سوال غلط طریقے سے کیا جائے۔یا مطلق سوال کیونکہ مانگنے میں ذلت ہے تو پھر کون سا راستہ ہے۔

إن المسألة لا تصلح : یعنی نہ حلال' نہ جائز اور نہ صحیح ہے۔

مدقع : یعنی شدید حاجت مند۔

لذی غرم : یعنی غرامت یا قرض۔

مفظع : انتہائی قبیح' بوجھل' رسوائی۔ابن الملک کہتے ہیں کہ یہ حدیث کا لفظ ہے لیکن قرض ادائیگی کے لئے اگر چہ کم ہی ہو سوال کرنا جائز ہے اس کے لیے صدقہ حلال ہے اور اس کو غارمین کے حصے میں سے دیا جائے گا۔

اس حدیث میں لفظ حکم کا مخالف ہے یا حکم اس کی مخالفت کر رہا ہے۔اس میں اختلاف اور یہ مذہب (حنفیہ) کے بھی خلاف ہے جب قرض ادا کرنے کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔نہ کہ مانگنا جیسے پیچھے گزر چکا ہے اس کا یہ کہنا کہ غارمین کے حصہ تو یہ امام شافعی کا مذہب ہے اور احناف کے خلاف ہے۔

أو لذی د م موجع : جیم کے کسرہ اور فتح کے ساتھ یعنی تکلیف دہ عذاب اس سے مراد وہ خون جو قاتل اور اس کے اولیاء کو تکلیف اور مشقت میں ڈال دے وہ اس طرح کہ قتل کی وجہ سے ان پر دیت لازم ہو جاتی ہے اور ان کے پاس اتنا مال ہوتا نہیں کہ جس سے وہ دیت ادا کر دیں اور دوسری طرف مقتول کے اولیاء پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور دیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔جس سے فتنہ اور ان میں مخاصمت پیدا ہوتی ہے۔

یہ کہا گیا ہے کہ وہ چیز جس سے مقتول کے اولیاء تکلیف محسوس کرتے ہیں پس کوئی امید نہیں ہوتی کہ فتنے کا مشغلہ بجھ جائے ایسے میں کوئی آدمی کھڑا ہو اور دیت اپنے ذمہ لے لے۔جس کی وجہ سے فتنہ ختم ہو جائے ہو اس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کو دیت پر محمول کیا جائے جس کے لیے وہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور لوگوں سے مانگتا ہے اور دیت مقتول کے اولیاء کو ادا کرتا ہے تا کہ جھگڑا ختم ہو جائے اور یہ تب ہے جب اس کے پاس اور اس کے اولیاء کے پاس مال نہ ہو اور اسی طرح بیت المال سے ادا نہیں کی جاتی اگر وہ ادا نہیں کرے گا تو وہ اس کو قتل کر دیں گے یا اس مقتول کے بھائی دوست ہوں گے جن کو مقتول کے قتل سے تکلیف ہوتی ہے۔

تخریج و اسنادی حیثیت : شیخ جزری کہتے ہیں اس کو سنن اربعہ نے سیدنا انسؓ سے طویل حدیث نقل کی ہے۔امام ترمذی کہتے ہیں: کہ یہ حدیث صرف اخضر بن عجلان سے معروف ہے۔ابن معین کہتے ہیں کہ صالح ہے۔امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں لکھی جاتی ہیں اس قول کو میرک نے ذکر کیا ہے۔

لوگوں سے سوال کرنے کی ممانعت

۱۸۵۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ مَنْ اَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَاَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ وَمَنْ اَنْزَلَهَا بِاللّٰهِ اَوْشَكَ اللّٰهُ لَهُ بِالْغِنٰى اِمَّا بِمَوْتٍ عَاجِلٍ اَوْ غِنًى اٰجِلٍ۔ (رواہ ابو داود والترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۹٦/۲ حدیث رقم ۱٦٤٥۔ والترمذی فی السنن ٤٨٧/٤ حدیث رقم ۲۳۲٦۔ واحمد فی المسند ٤٠٧/١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص فاقہ سے دوچار ہو اور اس کو لوگوں کے سامنے بیان کر کے ان سے حاجت روائی کی خواہش کرے تو اس کی حاجت پوری نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے صرف اپنے اللہ سے حاجت کو بیان کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جلد فائدہ اور اطمینان عطا فرمائے گا بایں طور کہ اسے جلد ہی یا تو موت سے ہمکنار کر دے گا یا اسے کچھ دنوں میں مالدار بنا دے گا'' (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: **من اصابته فاقة**: یعنی سخت حاجت اس کا اکثر استعمال فقر اور تنگ معیشت پر ہوتا ہے۔

فانزلها بالناس: یعنی اس فاقہ کی حالت کو لوگوں پر پیش کیا اور ان پر اپنی شکایت عرض کی اور فاقہ کا ازالہ کرنے کے لیے ان سے درخواست کی۔ طیبی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے وہ مکان میں اترا وہ بلندی سے اترا اور مجاز میں سے ہے کہ اس پر ناپسندیدہ چیز اتاری میں نے اپنی حاجت معزز (مال دار) آدمی پر پیش کی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس نے فاقہ کے ختم کرنے میں لوگوں سے سوال کرنے پر اعتماد کیا۔

لم تسد فاقته: یعنی اس کی حاجت پوری نہیں ہوتی اور اس کا فاقہ ختم نہیں ہوتا اور جب بھی اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو دوسری اس سے سخت مصیبت آ پڑتی ہے۔

بالله: اس نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا۔

بالغناء: غین کے فتحہ اور مد کے یعنی جو اس کو کفایت کرے۔ ایک نسخہ میں ''بالغنی'' ہے۔ مصابیح کے شارحین کہتے ہیں: بالغنی کسرہ کے ساتھ پڑھنے سے اسم مقصورہ ہے اور مالداری کے معنی میں ہے اور معنی کو بدلنا ہے چونکہ اس نے کہا اس کو پورا پورا اس میں مل جاتا ہے۔

اما بموت عاجل: کہا گیا ہے یعنی کسی قریبی غنی رشتہ دار کے موت کے ساتھ کہ یہ اس کا وارث بن جائے۔ شاید کہ حدیث کا اقتباس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ۳] ''جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے پیچھے راستہ بنا دیتا ہے۔ اور وہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے تا ہے۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ پر توکل کرے وہ اس کو کافی ہے۔

أو غنى: کسرہ کے ساتھ اسم مقصور بمعنی خوشحالی۔

آجل: یعنی اس کو مال دے کر غنی کر دے گا۔

طیبی فرماتے ہیں: وہ اس طرح ہے یعنی غین کے ساتھ مصابیح کے اکثر نسخوں اور جامع الاصول سنن ابی داؤد اور ترمذی میں ہے أو غنی اجل ہمزہ ممدودۃ کے ساتھ درایت کے اعتبار سے یہی زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿ إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ [النور: ۳۲] ''اگر وہ فقراء ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے غنی کر دے گا''۔ اس میں جو بحث ہے اس پر غور کر۔

الفصل الثالث:

ضرورت کے وقت سوال اچھے لوگوں سے کیا جائے

۱۸۵۳: عَنِ ابْنِ الْفِرَاسِيِّ اَنَّ الْفِرَاسِيَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْاَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا وَاِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَسَلِ الصَّالِحِيْنَ۔

(رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/ ۳۰۰ حدیث رقم ۱٦٤٦۔ والنسائی ۹۵/۵ حدیث رقم ۲۵۸۷۔ واحمد فی المسند ۳۳٤/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن فراسیؒ کہتے ہیں کہ میرے والد مکرم حضرت فراسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں لوگوں سے مانگ سکتا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ ہر حالت میں خدا ہی پر بھروسہ رکھو ہاں اگر کسی شدید ضرورت اور سخت حاجت کی وجہ سے مانگنا ضروری ہے تو پھر نیک بختوں سے مانگو''

(ابوداؤد' نسائی)

تشریح: الفراسی: ''فاء'' کے کسرہ کے ساتھ۔ فراسی بنی فراس ابن غنم بن مالک بن کنانہ ہیں۔ یہ صحابی ہیں اور ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت ثابت ہے۔ اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

قال لرسول الله ﷺ: ایک دوسرے نسخہ میں'' قال: قلت لرسول الله'' ہے۔

أسأل: حرف استفہام کو حذف کے ساتھ یعنی کیا میں طلب کر سکتا ہوں؟

فقال النبی ﷺ لا: ای لاتسأل: یعنی لوگوں کے مال میں سے کسی چیز کا سوال نہ کر اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر توکل کر۔

وإن كنت: ای سائلا۔

لابد: تیرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

فسل: دو طریقوں (فاسأل اور سل) پڑھا جا سکتا ہے۔ بمعنی اطلب۔

چونکہ نیک آدمی صرف اور صرف حلال مال سے خرچ کرے گا اور وہ تیرے لیے رحیم وکریم بھی ہوگا اور تجھے بے عزت بھی نہیں کرے گا اور تیرے لیے دعا کرے گا۔ وہ قبول کی جائے گی۔ اس لیے فقراء بغداد امام احمد سے سوال کیا کرتے تھے۔

ایک عجیب وغریب قصہ ہے کہ ایک دفعہ امام صاحب کے گھر والوں کو آٹے میں خمیر پیدا کرنے کی ضرورت تھی انہوں نے اپنے بیٹے کے گھر سے منگوایا جو قاضی بن چکے تھے۔ان کی نیکی اور تقویٰ کا یہ حال تھا کہ یہ سوچ کر دروازے میں بیٹھ جاتے کہ شاید کسی کو میری ضرورت ہو۔جب انہوں نے روٹیاں پکالیں تو نے امام اصاحب کو پتہ چلا کہ اس میں کچھ شبہ ہے امام صاحب نے ان سے پوچھا تو انہوں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔امام صاحب کھانے سے رک گئے اور وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے پھر کہا کیا ہم فقراء کو دے دیں۔امام صاحب نے کہا کہ ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ اس کا عیب واضح کر دیں۔تو فقرا نے وہ نہ لیا۔گھر والوں نے امام صاحب کے حکم کے بغیر سمندر میں پھینک دیا۔امام صاحب کو جب واقعہ کی خبر ہوئی کہ سمندر میں پھینک دیا ہے تو امام صاحب نے ساری زندگی مچھلی نہ کھائی۔

بغیر مانگے اگر کوئی چیز مل جائے تو قبول کر لینی چاہیے

۱۸۵۴: وَعَنِ ابْنِ السَّاعِدِيِّ قَالَ اسْتَعْمَلَنِيْ عُمَرُ عَلَى الصَّدَقَةِ فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنْهَا وَاَدَّيْتُهَآ اِلَيْهِ اَمَرَ لِيْ بِعُمَالَةٍ فَقُلْتُ اِنَّمَا عَمِلْتُ لِلّٰهِ وَاَجْرِيْ عَلَى اللّٰهِ قَالَ خُذْ مَا اُعْطِيْتَ فَاِنِّيْ قَدْ عَمِلْتُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَعَمَّلَنِيْ فَقُلْتُ مِثْلَ قَوْلِكَ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُعْطِيْتَ شَيْئًا مِّنْ غَيْرِ اَنْ تَسْاَلَهٗ فَكُلْ وَتَصَدَّقْ۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۲۹۶ حدیث رقم ۱۶۴۷۔

ترجمہ: ابن عدیؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے زکوٰۃ لینے کے لیے عامل بنایا۔جب میں اس سے فارغ ہوا اور میں نے زکوٰۃ حضرت عمرؓ کو پہنچائی تو حضرت عمرؓ نے میرے لیے زکوٰۃ کی مزدوری کا حکم فرمایا' میں نے کہا میں نے یہ عمل اللہ کے لیے کیا ہے اور میرا ثواب اللہ پر ہے۔فرمایا جو چیز تجھے دی جائے اس کو لے لے۔تحقیق میں نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عمل کیا۔تو آپ ﷺ نے مجھے مزدوری دینے کا ارادہ کیا۔پس میں نے بھی تیری طرح کہا۔پس نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا۔جس وقت تجھے بغیر مانگے کوئی چیز مل جائے اس کو کھاؤ اور (جو تیری حاجت سے بچ جائے اس کو) اللہ کے لیے دو۔اس کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قال استعملنی عمر: یعنی مجھے عامل مقرر کیا۔

علی الصدقة: یعنی صدقہ لینے اور جمع کرنے اور اس کی حفاظت پر مقرر کیا۔

عمالة: عین کے ضمہ کے ساتھ۔کام کی اجرت لینے کا حکم دیا۔

اجری: اس کو دو طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔

قال خذما اعطیت: مفعول کے صیغہ کے ساتھ۔

قوله فعملنی: میم کی تشدید کے ساتھ یعنی مجھ کو کام کی اجرت دی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دینے کا ارادہ کیا یا مجھے دینے کے لیے کسی کو حکم دیا۔

أو تصدق : اگر آپ مالدار ہیں۔ اس حدیث سے عام لوگوں کے کام کے بدلے میں بیت المال سے عوض لینے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اگر چہ وہ کام فرض ہو جیسے قاضی' محتسب اور تدریس کرنے والا تو ان کی ضرورت کے مطابق پر فرض ہے کہ ان کو دے۔ اس حدیث اور دوسری احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان پر یہ واجب ہے کہ جو چیز اسے بغیر مانگے اور بغیر اشراف نفس کے دی جائے وہ قبول کرلے یہ قول امام احمد اور بعض دوسرے لوگوں کا ہے۔ جمہور نے اس حکم کو استحباب اور اباحت پر محمول کیا ہے واللہ اعلم۔

غیر اللہ سے مانگنا بہت برا عمل ہے

۱۸۵۵: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ سَمِعَ يَوْمَ عَرَفَةَ رَجُلاً يَسْأَلُ النَّاسَ فَقَالَ اَفِيْ هٰذَا الْيَوْمِ وَفِيْ هٰذَا الْمَكَانِ تَسْأَلُ مِنْ غَيْرِ اللّٰهِ فَخَفَقَهُ بِالدِّرَّةِ۔

رواهما رزين

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرفہ کے دن ایک شخص کو سنا کہ وہ لوگوں سے مانگ رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ کیا تو اس دن میں اور اس مقام پر (خدا کی ذات کے علاوہ) لوگوں سے مانگتا ہے۔ پس اس کو درے کے ساتھ مارا۔ اس کو رزین نے نقل کیا ہے۔

تشریح: أفي هذا اليوم و فی هذا المكان : یعنی دعا قبول ہونے کے زمانے اور ثنا کی جگہ اور امید کے حصول کے محل میں مانگ رہا ہے۔

يسال من غير الله : حقیر چیز جیسے صبح و شام کا کھانا وغیرہ۔ طیبی فرماتے ہیں: یہ جگہ اور یہ دن غیر اللہ سے مانگنے سے روکتے ہیں۔ اسی طرح مساجد میں سوال کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ مساجد صرف عبادت کے لیے بنائی گئی ہیں۔

اس کی مثال شیخ ابوالعباس قدس سرہ کے ساتھ جو پیش آیا۔ کہ وہ ایک دن مدینہ سیدنا حمزہ کی زیارت کا قصد کر کے نکلے۔ ان کے پیچھے ایک آدمی چلا۔ تو شیخ کے لیے بغیر چابی کے زمین کا دروازہ کھل گیا۔ وہ اس میں داخل ہوئے اور نامعلوم آدمیوں کو دیکھا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عفو، عافیت اور دنیا و آخرت کی خیر طلب کی۔ پھر مجھے اپنے رفیق پر ترس آیا میں نے اسے کہا: تو نے قبولیت کا وقت پالیا ہے اللہ تعالیٰ سے اپنا مقصد مانگ لے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے دینار مانگے۔ میں واپس آیا اور مدینہ کے دروازے میں داخل ہوا تو اس کو کسی آدمی نے دینار دیئے۔ میں اپنے شیخ سید ابوالحسن الشاذلی کے پاس پہنچا انہوں نے میرے مقصد بیان کرنے سے پہلی ہی آدمی سے کہا: اے کم حمیت تو نے قبولیت دعا کا وقت پایا اور اللہ تعالیٰ سے دینار مانگے۔ تو نے ابو العباس کی طرح عفو و عافیت کیوں نہ مانگی۔

اسی طرح کی حکایت شیخ بہاء الدین نقشبندی سے بھی بیان کی گئی ہے۔ ان سے پوچھا گیا آپ نے اپنے حج کے دوران کوئی عجیب چیز دیکھی ہے انہوں نے کہا میں نے ایک نوجوان دیکھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوا۔ اسی طرح ایک بوڑھے کو دیکھا جو بیت اللہ کی چادر کے ساتھ لپٹ کر اللہ تعالیٰ سے دنیا طلب کر رہا ہے۔ بعض عارفین کہتے ہیں جس نے اللہ

تعالیٰ سے غیر اللہ چیز مانگی اس پر قبولیت کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

بالدرة : دال کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔ قاموس میں ہے۔ وہ چیز جس کے ساتھ مارا جاتا ہے۔ طیبی کہتے ہیں: خفق سے مراد ضرب جو کسی چوڑی چیز سے لگائی جائے۔

طمع فقر ہے

۱۸۵۶: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ تَعْلَمُوْنَ اَيُّهَا النَّاسُ اَنَّ الطَّمَعَ فَقْرٌ وَاَنَّ الْاِ يَاسَ غِنًى وَاَنَّ الْمَرْءَ اِذَا يَئِسَ عَنْ شَيْءٍ اسْتَغْنٰى عَنْهُ۔ (رواه رزين)

رواهما رزين ـ

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے اے آدمیو! جان لو طمع محتاجگی ہے اور آدمیوں سے نا اُمید ہونا تونگری (مالداری) ہے اور بے پروائی ہے اور تحقیق جب آدمی کسی چیز سے ناامید ہو جاتا ہے تو اس چیز سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اس کو رزین نے نقل کیا ہے۔

تشریح: تعلمن: خبر بمعنی امر ہے ایک صحیح نسخہ میں ہے۔ تعلمن طیبی فرماتے ہیں۔ ای لتحلمن تاکہ وہ جان لیں لیکن اس میں دو شذود ہیں۔ ا۔ امر حاضر میں لام داخل کرنا اور اس کے حذف کرنے سے مراد (معنی) واضح ہے جس طرح یہ مثال ہے: محمد تغد نفسك یہ بھی کہا گیا ہے کہ "تعلمن" مقدر قسم کا جواب ہو اور لام مقدرہ مفتوح یعنی و الله تعلمن ۔

فقر: یعنی طمع و فقر حاضر ہے یا اس کی طرف کھینچتا۔

قوله :وأن المرء : یہ پہلے کی تفسیر ہے۔

اذا يئس: ایک صحیح نسخہ میں ہے: اذا أيس ۔

اسی لیے کہا گیا ہے لوگوں سے بے پرواہ (مایوس) رہنا دو راحتوں میں سے ایک ہے۔

سید ابوالحسن شاذلی سے علم کیمیاء کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ دو کلمے ہیں: مخلوق کو اپنے سے دور ہٹانا اور اپنے خواہش کو اللہ تعالیٰ سے کاٹ کر وہ لے جو تیرے علاوہ کے لیے تقسیم کیا گیا۔

انسانوں سے نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت

۱۸۵۷: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّكْفُلُ لِيْ اَنْ لَّا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا فَاَتَكَفَّلُ لَهٗ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ ثَوْبَانُ اَنَا فَكَانَ لَا يَسْأَلُ اَحَدًا شَيْئًا۔ (رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٢/٢٩٥ حديث رقم ١٦٤٣ ـ واحمد في المسند ٥/٢٧٥ـ

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو شخص میرے ساتھ عہد کرے کہ وہ آدمیوں سے نہ مانگے گا میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ پس ثوبانؓ نے کہا میں عہد کرتا ہوں میں کسی سے نہیں مانگوں گا۔ پس

ثوبانؓ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے اگرچہ تنگی بھی ہوتی۔اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

ثوبان:

طیبی فرماتے ہیں: وہ ابوعبداللہ ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن ہیں اور "سراۃ" جگہ سے ان کا تعلق ہے جو مکہ اور یمن کے درمیان ہے۔وہ غلام بنالے گئے نبی ﷺ نے اس کو خریدا۔وہ حضور ﷺ کے وفات تک سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔پھر وہ شام کی طرف نکلے رملہ میں پراؤ ڈالا اس کے بعد حمص چلے گئے وہاں ۵۴ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔

تشریح: من یکفل: "یا" کے فتحہ اور "فاء" کے ضمہ کے ساتھ مرفوع ہے۔طیبی فرماتے ہیں: من استفہامیہ ہے۔ ایک نسخہ میں باب تفعیل سے صیغہ ماضی ہے۔یعنی کون اس کا ضمانت دے گا اور کون اس کا التزام کرے گا۔

لی: یعنی میرے لیے (میری رضا کے لیے) قبول کرے گا۔

أن لا یسأل الناس شیأ: یہ سوال کے متعلق ہے یا اشیاء کے متعلق ہے۔

فأتکفل: نصب اور رفع کے ساتھ یعنی میں اس کو ضمانت دیتا ہوں۔

بالجنۃ: بغیر سرکاٹے جنت میں جانا۔اس میں حسن خاتمہ کی بشارت کی طرف اشارہ ہے۔

فقال ثوبان: أنا: یعنی میں ضامن بنا یا ضمانت دیتا ہوں۔

لا یسال احدا شیئا: اگرچہ اضطراری حالت ہو۔اس سے وہ صورت استثنیٰ ہے جب آدمی کو اپنے مرنے کا ڈر ہو۔ چونکہ قاعدہ ہے "الضرورت تبیح المفطورات" ضروریات ممنوع چیزوں کو جائز کر دیتا ہے بلکہ ایک قول یہ ہے: اگر وہ لوگو ں سے نہ مانگے اور اسی حالت میں موت آئی تو وہ آدمی گناہ گار مرا۔

ادنیٰ چیز کے لیے بھی سوال نہیں کرنا چاہیے

۱۸۵۸: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ دَعَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یَشْتَرِطُ عَلَیَّ اَنْ لَّا تَسْاَلَ النَّاسَ شَیْئًا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ وَلَا سَوْطَكَ اِنْ سَقَطَ مِنْكَ حَتّٰی تَنْزِلَ اِلَیْہِ فَتَاْخُذَہٗ۔ (رواہ احمد)

اخرجہ احمد فی المسند ۱۸۱/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا اور شرط لگائی کہ میں لوگوں سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ میں نے کہا ہاں یعنی میں نے آپ سے شرط کی اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تیرا کوڑا بھی گر پڑے تو کسی سے نہ مانگ یہاں تک کہ تو خود اس کی طرف اتر کر اسے اٹھا۔اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: دعانی رسول اللہ ﷺ: یعنی ایک خاص بیعت پر مجھ کو بلایا۔

وھو یشترط علی: یعنی یہ جملہ حال ہے۔آپؐ نے مجھ سے بطور شرط کے کہا کہ میں تجھے بیعت کراتا ہوں اس بات پر کہ تو کسی سے نہیں مانگے گا۔

اَن لاتسأل الناس شیئا: لام کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ہے۔لام کے فتحہ کے ساتھ اکثر نسخوں میں ہے۔طیبی کہتا ہوں:

ان مفسرہ نہی پر داخل ہے اس لیے کہ یشترط میں قول کا معنی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مصدر یہ ہے۔

قلت :نعم : یعنی میں اس چیز پر آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

اس "نزول" اترنے میں بلندی کا حصول ہے۔

بَابُ الْاِنْفَاقِ وَكَرَاهِيَةِ الْاِمْسَاكِ

خرچ کرنے کی فضیلت اور بخل کی مذمت

الفصل الاول:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ سخاوت

۱۸۵۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ لِیْ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِیْ اَنْ لَّا یَمُرَّ عَلَیَّ ثَلَاثُ لَیَالٍ وَعِنْدِیْ مِنْهُ شَیْءٌ اِلَّا شَیْءٌ اُرْصِدُهٗ لِدَیْنٍ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۵/۵ حدیث رقم ۲۳۸۹۔ ومسلم فی صحیحه ۱۸۷/۲ حدیث رقم (۳۱۔ ۹۹۱)۔ وابن ماجه ۱۳۸۲/۲ حدیث رقم ۴۱۳۲۔ واحمد فی المسند ۲۵۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہوتا۔ تو مجھے یہ بات پسند تھی کہ میں تین راتیں ایسی نہ گزارتا کہ میں میرے پاس اس سونے سے کچھ باقی ہو سوائے اس کے کہ قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ رکھ لیتا۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: أحد : ہمزہ اور "حاء" کے ضمہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں ایک معروف پہاڑ ہے۔

ذهبا : تمیز ہے۔

سرنی : مجھے تعجب میں ڈالتا ہے اور مجھے خوش کر دیتا ہے۔

ان لا یمر علیه ثلاث لیال وعندی منه شیئ: ابن الملک فرماتے ہیں: واؤ حال کے لیے ہے یعنی یہ چیز مجھ کو خوش کر دیتی ہے کہ اس پر تین سے زیادہ راتیں نہ گزریں۔ اور حال یہ ہو کہ ان میں سے میرے پاس کوئی چیز ہو اور نفی حقیقتاً حال کی طرف لوٹ رہی ہے۔

الاشیئ : طیبی فرماتے ہیں: مرفوع ہونے کی وجہ أن ۔

یعنی یہ بات میرے باعث مسرت ہے کہ اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رہے۔

ارصده: ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ یعنی میں اس کی حفاظت کرتا ہوں اور اس کو استعمال کرتا ہوں۔

لدین: یعنی قرض ادا کرنے کے لیے جو مجھ پر ہے۔ کیونکہ قرض ادا کرنا صدقہ پر مقدم ہے۔ کتنے ہی جاہل عوام اور کھانے

پینے خیرات کرنے والے ہیں اوران پر لوگوں (مخلوق) کے حقوق ہیں جن پر وہ ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ کتنے ہی صوفی جو غیر عارف ہیں اور وہ ریاضت میں کوشش کرتے ہیں۔ اور کثرت سے اطاعت وعبادات کو انجام دیتے ہیں اور جو ان پر دنیاوی معاملات ہیں ان کو وہ ادا نہیں کرتے۔

سخی اور بخیل کے لیے فرشتوں کی دُعا

۱۸۲۰:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَّيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۰٤/۳۔ حديث رقم ۱٤٤۲۔ ومسلم فی صحيحه ۷۰۰/۲ حديث رقم (۵۷۔ ۱۰۔ ۱۰)۔ واحمد فی المسند ۳۰۵/۲۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں بندے صبح کرتے ہوں مگر یہ کہ دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک فرشتہ کہتا ہے۔ یاالٰہی خرچ کرنے والے کو بدلہ دے۔ جو مال مخلوق پر خرچ کرتا ہے اس کو بہت بدلہ دے یا تو دنیا میں مال دے یا آخرت میں ثواب عطا فرما۔ اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ اے الٰہی! بخیل کو تلف دے یعنی جو مال جمع کرتا ہے اور بے محل خرچ کرتا ہے اس کا مال تلف ہو جائے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ما من يوم : ما نافیہ ہے۔ من زائدہ استغراق کی تاکید کے لیے ہے اور اس کا معنی یہ ہے ''کوئی دن نہیں''۔

يصبح العباد فيه : یہ یوم کی صفت ہے۔

ملكان : مبتدا ہے اس کی خبر (ينزلان) ہے۔ یعنی اس دن میں۔ یہ جملہ اور اس کے متعلقات محل خیر میں ہے وہ اس محذوف سے مستثنیٰ ہے یعنی على وجه إلا هذا الوجه اس قول کو طیبی نے ذکر کیا ہے۔

اللّٰهم اعط منفقا : یعنی اس جگہ سے اس جگہ میں اور یہ خرچ کرنے کی مدح میں مبالغۃً اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

خلفا : بڑا عوض اور وہ ہے۔ نیک وصالح کے عوض یا مطلب یہ ہے۔ کہ دنیا میں اس کا عوض اور آخرت میں اس کا بدلا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [سبا:۳۹] ''اور تم جو چیز بھی خرچ کرو وہ (اللہ تعالیٰ) اس کا بدلا دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔

تلفًا: یعنی اس کے مال کو حسی طور پر یا معنوی طور پر برباد کر دے۔ اس میں لفظ اعطاء مشاکلت کے معنی کے لیے ہے۔

اللہ کے راستے میں دِل کھول کر خرچ کرو

۱۸۲۱:وَعَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْفِقِيْ وَلَا تُحْصِيْ فَيُحْصِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ اِرْضَخِيْ مَا اسْتَطَعْتِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۱۷/۵۔ حديث رقم ۲۵۹۱۔ ومسلم فی صحيحه ۷۱۳/۲ حديث رقم (۸۸۔

۱۰۲۹)۔ واحمد فی المسند ۳۵۴/۶۔

ترجمه: حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا خرچ کر (یعنی جس خرچ سے اللہ راضی ہو جائے) اور شمار نہ کر کہ کتنا دوں اور کیا دوں۔ پھر اللہ تعالیٰ تجھے بھی شمار کر کے دیں گے۔ تیرا رزق برکت کے نہ ہونے کی وجہ سے کم ہو جائے گا اور اس کو ایک گنی چنی چیز کی طرح کر دے گا یا تیرا آخرت میں محاسبہ کرے گا اور جو مال حاجت سے زیادہ ہو اس کو فقیر سے نہ روک۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تجھ سے مال کی زیادتی کو روک لے گا اور جو ہو سکے اللہ کے راستے میں دیتی رہ۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن اسماء: صدیق اکبرؓ کی بیٹی ہیں۔

قولها: قالت: قال رسول الله ﷺ انفقی: یعنی اللہ تعالیٰ کے رضا وخوشنودی کے لیے خرچ کر۔

قولها: ولا تحصی: یعنی کوئی چیز ذخیرہ کرنے کے لیے باقی نہ رکھ۔ اس لیے کہ جو کوئی کوئی چیز بچا کر رکھتا ہے تو اس نے ذخیرہ کیا۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جو تو نے خرچ کیا اگر اس کو شمار نہ کرے گی اس لیے کہ اگر شمار کرو گی۔ تو تم اس کو زیادہ خیال کرو گی۔ تو تیرے لیے خرچ نہ کرنے کا سبب بن جائے گا اور یہی اس قول کا معنی ہے (فیحصی الله علیك) منصوب ہے اور جواب نفی کے لیے۔ یعنی برکت نہ دینے کی وجہ سے رزق کم ہو جائے گا اور اس کو معدوم شے بنا دے گا اور آخرت میں اس کا تجھ سے حساب لے گا۔ طیبی فرماتے ہیں: احصاء کا اصل معنی کسی چیز کو روکنا اور گن کر اس کا احاطہ کرنا۔ یہاں مراد چیز کو کمائی کے لیے گننا ہے اور ذخیرہ اندوزی کے لئے شمار کرنا اور اس مال میں سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا چھوڑ دیا جائے

چنانچہ **فیحصی الله علیك:** باب مشاکلہ سے ہے یا طریقہ تجرید (کسی چیز کو اس کی صفت یا تعلق سے ذہنی طور پر الگ کر کے اصل پر اعتماد کرنا اور نتیجہ نکالنا) سے ہے۔

ولا توعی فیوعی الله علیك: الایعاء کا معنی کسی چیز کو برتن میں محفوظ کرنا۔ یعنی زائد مال فقیر سے نہ روکو۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے اپنے فضل روک لے گا اور تجھ کو زائد عطا کرنے کا دروازہ بند کر دے گا۔

أرضخی: ضاء کے فتحہ کے ساتھ چھوٹے عطیہ کو کہتے ہیں یعنی جو دیا جائے۔

ما استطعت: یعنی جس پر تجھ کو قدرت ہے اگرچہ وہ کم ہو۔ اور تو (اے اسماءؓ) جو تیرے لیے آسان ہو اور اس کو حقیر مت سمجھ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ ہے اور میزان میں اس کا درجہ قبولیت بہت بڑا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۷] ”جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا“۔

﴿وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ [الانبياء:۴۷] ”اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو لا حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں“۔

اللہ عزوجل نے فرمایا: ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ۴۰] ”اور اگر نیکی (کی) ہوگی تو اس کو دو چند کر دے گا اور اپنے ہاں سے اجر عظیم بخشے گا“۔

ابن ملک کہتا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رضخ کا حکم حالات سے واقفیت کے بعد دیا ہے کیونکہ وہ اپنے مال میں تصرف کی قدرت نہیں رکھتی تھی اور نہ اپنے خاوند کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کر سکتی تھی سوائے اس چیز کے جو تھوڑی ہو اور خاوند بھی ایسی چیز کو صرف نظر کرے گا جیسے روٹی کا ٹکڑا اور کھجور وغیرہ اور بچا ہوا زائد کھانا جس کو ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا بدلہ

۱۸۶۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۹/۴۹۷۔ حدیث رقم ۵۳۵۲۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۶۹۰ حدیث رقم (۳۶۔ ۹۹۳)۔ واحمد فی المسند ۲/۲۴۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے آدم کے بیٹے! خرچ کر۔ میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: یہ اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی موجود ہے:

ما عندکم ینفد وما عند الله باق۔ جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فانی مال کو دنیا میں خرچ کر دے تاکہ تجھ کو آخرت میں اس کا بلند مقام و مرتبہ مل سکے ایک قول یہ بھی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جو تیرے پاس رزق ہے اس میں سے لوگوں کو عطا کر یہاں تک میں دنیا اور آخرت میں رزق سے نوازوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی یہ اشارہ ہے: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ﴾ [سبا ۳۹] ''تم جو چیز بھی خرچ کرو گے وہ (اللہ تعالیٰ) اس کا نعم البدل عطا کرے گا۔''

مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو

۱۸۶۳: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَهٗ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰی كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۷۱۸ حدیث رقم ۹۷۔ ۱۰۳۶۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے آدم کے بیٹے! اپنے مال کو خرچ کر جو حاجت سے زائد ہو۔ وہ تیرے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہے اور تیرے لیے اس کو روکے رکھنا برا ہے اور بقدر کفایت پر تجھے ملامت نہیں کی جائے گی اور اس مال کو خرچ کرنا ان لوگوں سے شروع کر جو تیرے عیال میں ہوں۔ نقل کی یہ مسلم رحمہ اللہ نے۔

تشریح: قال رسول الله یا ابن آدم ان تبذل الفضل خیر لك: یعنی جو تیری ضرورت اور کفایت سے زیادہ

ہو اس کو خرچ کر۔ ان مصدر یہ مبتدا پر داخل ہے۔ اس کی خبر (خیر لك) یعنی دنیا اور آخرت میں مطلق مال کو چھوڑ کر فضل کے ساتھ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں وہ مال ضائع کرے حدیث میں ہے: **كفى بالمرء اثما ان يضيع من يقوت**۔ آدمی کے گناہ گار ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ غلہ کو ضائع کرے۔

اسی طرح ایک آدمی سونے کا انڈہ لے کر آیا اور عرض کے اے اللہ کے رسول! یہ قبول کیجئے صدقہ ہے اور اس کے علاوہ میرے پاس کوئی مال نہیں۔ آپؐ نے اس سے منہ پھیر لیا یہاں تک کہ اس نے تین دفعہ یہ بات دہرائی۔ پھر آپ نے وہ انڈا اس سے لے کر پھینک دیا اگر وہ انڈا اس کو لگتا تو اسے سخت تکلیف پہنچتی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایک وہ چیز لے کر آتا ہے جس کا وہ مالک ہے پھر کہتا ہے یہ صدقہ ہے (اسے صدقہ کرنے کے بعد) پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے بہتر صدقہ وہ ہے جو غنی سے زائد ہو مراد غنی مالدار ہے او جو اس کی ضرورت سے زائد ہو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دے دے۔ یا غنی ہے کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کے فضل پر کامل یقین والا ہو۔ اسی لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال صدقہ کر دیا اور اللہ کے رسول نے اس کو برقرار رکھا کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی کمال حالت کو پہچان لیا تھا۔ عمرؓ نے یہی ارادہ کیا تو آپ نے اس کو بعض مال روک لینے کا حکم دیا۔

قوله: ولا تلام على كفاف:

كفاف: فتحہ کے ساتھ اور وہ رزق ہے جو قوت ہو اور جو اُس لوگوں سے (مانگنے سے) روک دے اور ان سے بے پرواہ کر دے اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے روکنے اور محفوظ کرنے سے تیری مذمت نہیں ہوگی۔ یا اس کے حاصل کرنے اور کمانے پر کوئی بے عزتی نہ ہوگی۔ اسکا مفہوم یہ ہے کہ اگر تو زیادہ مال کی حفاظت کرے گا اور جو زائد ہے اس کو صدقہ نہیں کرے گا تو تیری مذمت کی جائے گی۔ بخیل کہلائے گا اور تو ملامت ہوگی۔

قوله: وابدا: یعنی زائد مال اعطا کرنے میں برابر ابتدا کر ان لوگوں سے جن کا تو مکلف ہے اور ان کا خرچہ تیرے ذمہ ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں: اور امام بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے حدیث بیان کی ہے "**وابدأ بمن يقول**" اسی کے الفاظ ہیں۔

صدقہ دینے والے اور بخیل کی مثال

۱۸۶۴: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْبَخِيْلِ وَالْمُتَصَدِّقِ كَمَثَلِ الرَّجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُنَّتَانِ مِنْ حَدِيْدٍ قَدِ اضْطُرَّتْ اَيْدِيْهِمَا اِلٰى ثُدِيِّهِمَا وَتَرَاقِيْهِمَا فَجَعَلَ الْمُتَصَدِّقُ كُلَّمَا تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ انْبَسَطَتْ عَنْهُ وَجَعَلَ الْبَخِيْلُ كُلَّمَا هَمَّ بِصَدَقَةٍ قَلَصَتْ وَاَخَذَتْ كُلَّ حَلْقَةٍ بِمَكَانِهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٠٥/٣۔ حديث رقم ١٤٤٣ ومسلم في صحيحه ٧٠٨/٢ حديث رقم (٧٥۔ ١٠٢١)۔ واحمد في المسند ٣٨٩/٢۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بخیل اور صدقہ دینے والے کا حال دو شخصوں کے حال کی طرح ہے کہ ان پر دولوہے کی زرہیں ہیں جن کی تنگی کی وجہ سے انکے ہاتھ اوران کی گردنیں ان کی چھاتی کی طرف چمٹے ہوئے ہیں۔ پس جب صدقہ دینے والے نے صدقہ دینے کا قصد کیا تو وہ زرہ کھل جاتی ہے اور بخیل جب صدقہ دینے کا قصد کرتا ہے تو سب حلقے اپنی جگہ پر مل جاتے ہیں۔اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: قوله :مثل البخيل و المتصدق : کیونکہ دونوں کی صفات مراد ہیں۔

جنتان : جیم کے ضمہ کے ساتھ اور نون کی تشدید کے ساتھ یعنی ڈھال۔

اس کو با کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔شرح السنہ میں بھی اسی طرح ہے ایک قول یہ ہے کہ یہاں ''نون'' کے ساتھ ہی صحیح ہے اوراس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ درع کا نام''باء'' کے ساتھ جبہ نہیں لیا جاتا۔یہی قول طیبی کا بھی ہے۔بعض محققین کا یہ قول ہے کہ یہ نون کے تصحیف ہے بعض کہتے ہیں:الجنۃ ضمہ کے ساتھ وہ چیز جس کے ذریعے اسلحہ سے بچا جاتا ہے۔لیکن یہاں مراد دو درعیں ہیں جن کی مشابہت دو صفات بخل اور صدقہ کرنے کے ساتھ ہے جن پر انسان کی جبلت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اشارہ ہے(ومن یوق شح نفسه) اور جو نفس کی بخل سے بچا لیا گیا۔

اور''با'' کے ساتھ جبتان روایت کیا گیا ہے وہ تصحیف ہے اس لیے کہ جبہ لوہے سے نہیں بنایا جاتا۔اس لیے بعض روایات میں ہے:ان علیها درعان کے الفاظ ہیں۔ولقولہ ایک ایک چیز اپنی جگہ پر ہوگی۔اے اللہ (ہمیں ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھ)اگر اسے سے مراد دو جیسے جو وقوع پذیر ہونے والے ہیں اور وہ جو درعوں کو شامل ہیں۔

قد اضطرت : طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے بمعنی شدت و عصرت و ضمت و الصقت: یعنی سختی ہیں ملنے میں چھپنے میں۔ایک نسخہ میں''طاء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ''ایدیهما'' کو نصب دیا ہے کہ فعل کی ضمیر جنس جنۃ کی طرف راجع ہے جس میں تثنیہ کا مفہوم ہے۔

ثديهما : ''ثاء'' کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ''ثدی'' کی جمع ہے''ثا'' کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ اور''یا'' کی تشدید کے ساتھ ثدی عورت کے ساتھ خاص ہے یا عام ہے۔اسی طرح قاموس میں ہے یعنی اس سے مراد سینے کی دونوں جانب ہیں۔

تراقيهما: ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ ترقوۃ کی جمع ہے کندھوں سے نیچے اور سینے کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں۔

جعل المتصدق :یعنی شروع کرتا ہے۔

قلصت :لام کے فتحہ کے ساتھ یعنی اس کی ڈھال اس پر تنگ ہو جاتی ہے اور ساتھ چمٹ جاتی ہے۔

حلقة :لام کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

بمكانها: یعنی ہر ایک کڑی دوسری کڑی کے ساتھ سختی سے مل جاتی ہے۔''فاء'' زائدہ ہے۔یعنی انتہاء درجے کی تنگ ہو جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سخی صدقہ کرتا ہے تو یہ وسیع ہو جاتی ہے اور اس کے ہاتھ صدقہ دینے کے لیے پھیل جاتے ہیں:۔اور بخیل آدمی اسکا سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔اور اس کے ہاتھ خرچ کرنے سے رک جاتے ہیں۔

جَعَلَ بمعنی طَفِقَ ہے۔كلما تصدق یہ اس کی خبر ہونے پر دلالت ہے یعنی سخی صدقہ دینے کے لیے شروع ہوتا ہے تو

اس کا سینہ وسیع ہو جاتا ہے۔اس قول کی طیبی نے بھی تصدیق کی ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ سخی جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس پر کام کرنا آسان ہو جاتا ہے اور بخیل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

بخل سے بچو

۱۸۶۵:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰى اَنْ سَفَكُوْ اِدِمَاءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١٩٩٦/٤ حديث رقم (٥٦ـ ٢٥٧٨)۔ واحمد في المسند ٣٢٣/٣۔

ترجمہ:حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:ظلم کرنے سے بچو۔پس ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی صورت میں ہوگا اور بخیلی سے بچو کیوں کہ بخیلی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔انہوں نے خونریزی کی اور حرام کو حلال جانا۔اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اتقوا الظلم :یعنی جو بخیلی،بداخلاقی اورافعال ردیہ(بے کار) پر مشتمل ہو۔

فان اظلم ظلمات يوم القيامة: طیبی فرماتے ہیں اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔ظلم فاعل پر تاریکیاں بن جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتا۔جیسا کہ مومنوں کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوتا ہے۔یا اس سے مراد سختیاں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:قل من ينجيكم من ظلمات البر والبحر۔ "کون ہے(وہ ذات) جو تمہیں خشکی اور تری کے اندھیروں سے نجات دیتا ہے"۔یعنی ان دونوں کی سختیوں اور مصیبتوں سے نجات دیتا ہے۔

قوله :واتقو الشح :یعنی بخل۔وہ بھی ظلم کی ایک قسم ہے۔ایک قول یہ ہے شح سے مراد آدمی کے کسی دوسرے کے مال سے بخل کرنا اور بخل اپنا مال روک لینا ہے یہ بھی کہا گیا ہے بخل مال میں ہوتا ہے اور شح مال میں بھی ہوتا ہے اور مال کے علاوہ نیکی اور اطاعت میں بھی ہوتا ہے۔اس لیے اس کی منوعیت زیادہ سخت ہے۔یہ بھی کہا گیا۔شح بخیلی اور حرص کو کہتے ہیں اور یہی زیادہ مناسب ہے۔شح کو ذکر کیا ہے یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ ظلم کی بڑی قسموں میں سے ایک ہے۔یہ بڑے بڑے فساد پیدا کر دیتی ہے نتیجتاً اس ذلیل دنیا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [التغابن: ١٦] "جو بھی نفس کی آزمائش سے بچا گیا تو یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں"۔

قوله :فان الشح اهلك من كان قبلكم :یہ بہت پرانی روش اور بہت بڑی آزمائش ہے۔ابن الملک فرماتے ہیں: ہلاک ہونے سے مراد ان کو عذاب دیا گیا اور اس بات کا احتمال ہے کہ یہ دنیا میں بھی ہو سکتا ہے اور آخرت میں بھی ہو سکتا ہے۔

حملهم على ان سفكوا دماء هم واستحلوا محارمهم :یہ بھی کہا گیا ہے کہ شح ان کاموں کا سبب ہے کیونکہ مال خرچ کرنے سے مواساۃ،اخوت،محبت اور صلہ رحمی پیدا ہوتی ہے۔جبکہ مال روک لینے سے شح،ایک دوسرے سے منہ موڑنا اور قطع تعلقی پیدا ہوتی ہے۔تو اسے سے جھگڑے دشمنی اور خون بہایا جاتا ہے اور محرمات میں سے زنا اور اموال وغیرہ مباح سمجھ لیے۔

جاتے ہیں۔

صدقہ دینے کو غنیمت جانو

۱۸۶۲: وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقُوْا فَاِنَّهٗ يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يَمْشِي الرَّجُلُ بِصَدَقَتِهٖ فَلَا يَجِدُ مَنْ يَقْبَلُهَا يَقُوْلُ الرَّجُلُ لَوْ جِئْتَ بِهَا بِالْاَمْسِ لَقَبِلْتُهَا فَاَمَّا الْيَوْمَ فَلَا حَاجَةَ لِيْ بِهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۸۱/۳ حدیث رقم ۱۴۱۱۔ ومسلم فی صحیحه ۷۰۰/۲ حدیث رقم (۵۸۔ ۱۰۱۱)۔ والنسائی فی السنن ۷۷/۵ حدیث رقم ۲۵۵۵۔ واحمد فی المسند ۳۰۶/۴۔

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی اپنا صدقہ لے کر پھرے گا۔ پس وہ کوئی ایسا شخص نہیں پائے گا جو اس کو قبول کر لے۔ آدمی کہے گا اگر تو کل لے کر آتا تو میں اس کو قبول کر لیتا۔ آج مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (متفق علیہ)

تشریح: قال رسول الله ﷺ تصدقوا : یعنی جب مال موجود ہو تو صدقہ کرنے کو غنیمت سمجھو جب اُسے قبول کرنے والا بھی ہو اور تم سے وہ مال فقیر لے لیتے ہیں معنی یہ ہوا کہ صدقہ کرو قبل اس کے کہ تم مسنون کاموں پر صدقہ نہ کر سکو حج کرو قبل اس کے کہ تم حج نہ کر سکو۔

فانه : یعنی یہ ضمیر شان ہے۔

یأتی علیکم : یعنی تمہارے بعض لوگوں پر۔

زمان یمشی الرجل بصدقته : وہ صدقہ لے کر چلے گا۔

فلا یجد من یقبلها : کہا گیا ہے کہ وہ مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا زمانہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ جب قیامت کی شرطیں پوری ہو جائیں گی جیسا کہ آپ کا فرمان ہے:

لا تقوم الساعة حتی یکثر المال و یفیض حتی یخرج الرجل زکاة ماله فلا یجدًا احد ایقبلها : قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مال کثرت سے پھیل جائے گا۔ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے گا تو اُسے کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔

ویقول الرجل : یعنی فقیر۔ معنی یہ ہے کہ ہر اس آدمی پر صدقہ پیش کیا جائے گا جو اس سے پہلے مستحق تھا۔

لو جئت : یعنی پہلے صدقہ لے آتا۔

بالامس : یعنی زمانہ ماضی میں جب میری حالت فقر پر مشتمل تھی۔

لقبلتها فاما الیوم : یعنی اب۔

فلا حاجة لی بها : اور اُس فقیر کو مالی طور پر غنی حاصل ہو چکا ہے یا آسے زہد کی وجہ سے غنی معنوی مل چکی ہے۔ ابن الملک

فرماتے ہیں: اس وقت تمام لوگ اغنیاء ہوں گے اور آخرت کی طرف رغبت کرنے والے ہوں گے۔ دنیا کو چھوڑنے والے وہ ایک دن کی قوت (غلہ) پر قناعت کرنے وہ امید پر مال ذخیرہ نہیں کریں گے۔

اپنے تقاضوں کو دباتے ہوئے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنا افضل صدقہ ہے

۱۸۶۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَعْظَمُ اَجْرًا قَالَ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰی وَلَا تُمْهِلُ حَتّٰی اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۸٤/۳۔ حدیث رقم ۱٤۱۹۔ ومسلم فی صحیحه ۷۱٦/۲ حدیث رقم (۹۲۔ ۱۰۳۲)۔ والنسائی فی السنن ٦۸/٥۔ حدیث رقم ۲٥٤۲۔ واحمد فی المسند ۲۳۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! ثواب کی رو سے کونسا صدقہ بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو صدقہ کر اس حال میں کہ تو تندرست ہو مال جمع کرنے کی حرص رکھتا ہو اور فقر سے ڈرتا بھی ہو اور دولت کی امید رکھتا ہو اور صدقہ دینے میں ڈھیل نہ دو یہاں تک کہ موت کا وقت قریب آ جائے' پھر تو یہ کہے کہ فلان کے لیے اتنا ہے اور فلاں کے لیے اتنا ہے۔ حالانکہ وہ تو (تیرے مرتے ہی) فلاں کا ہو چکا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اعظم اجرًا ، جو زیادہ ثواب کا باعث ہو اور کامل اجر حاصل ہو۔

ان تصدق : صاد کی تخفیف کے ساتھ اور دو ''تاؤں'' میں سے ایک ''تاء'' حذف ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابدال وادغام کی وجہ سے ''مشدد'' ہے۔

قوله : وأنت صحیح : معنوی اعتبار سے عبارت یوں ہے: اعظمها صدقتك وهو أن تصدق فی حال صحتك واختصاص المال بك وشح نفسك......۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اس وقت تیرا صدقہ کرنا بڑے ثواب کا باعث ہے اور جملہ حالیہ ہے۔ یعنی وہ اپنی حالت صحت میں جب مال تجھے پسند ہو اور نفس اُس پر حریص ہو اس وقت صدقہ کرے اور یہ حالت نفس کے لیے بہت پسندیدہ ہوتی ہے اس قول کو طیبی نے ذکر کیا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: آپ کا کہنا شحیح تا کید اور صحیح کے بیان کے لیے ہے۔ کیونکہ آدمی حالت صحت میں شحیح ہوتا ہے۔

تخشی الفقر : خبر کے بعد دوسری خبر یا حال کے بعد دوسرا حال ہے یا جملہ استنافیہ ہے کہ تو اپنے نفس میں کہے۔ اپنا مال ضائع نہ تو فقیر نہ بن جائے۔

تأمل الغنی: میم کے ضمہ کے ساتھ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تو طمع اور امید رکھو اور اپنے دل میں کہے مال کو گھر میں رہنے دے تاکہ تو غنی رہے اور اس غنا کے سبب لوگوں میں تیرا مقام و مرتبہ ہے۔

ولا تمهل: منصوب ہے اور ''اَنْ تصدق'' پر اس کا عطف ہے۔ اگر ''لا'' کو لائے نہی مانیں تو جزم دینا بھی جائز ہے۔

یعنی صدقہ کو مؤخر نہ کر اور نہ اپنے نفس کو ڈھیل دے۔

حتی اذا بلغت الحلقوم: اس سے مراد روح جب حلق کے قریب پہنچ جائے۔

لفلانٍ: یعنی یہ فلاں کے لیے ہے اور یہ کنایہ ہے جس کو وصیت کی جائے۔

کذا: اشارہ موصی لہ کی طرف ہے۔

ولفلان: یعنی اس کے علاوہ کسی دوسری کے لیے۔

اور اس کو مکررہ لانا تکثیر افادہ کے لئے ہے جملہ مبتدا اور خبر ہیں۔ ابن حجر کہتے ہیں: یعنی وہ یوں کہے میں نے فلاں کے لیے اس طرح وصیت کی اور کذا اس کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تو اپنا مال نیکی کے کاموں میں صرف کرے۔

وقد کان لفلان: کہا گیا ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے۔ اس حالت میں مال کو تو ایک تہائی تصرف کر سکتا ہے۔ باقی وارثوں کا حق ہے اور تو تمام مال صدقہ کرے تو یہ تجھ سے کیسے قبول کیا جائے گا۔ طیبی فرماتے ہیں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وصیت وارث کے حق کے متعلق ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔

ممکن ہے اس طرح کہا جائے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ میرے پاس فلاں کے لیے اتنا اتنا مال ہے۔ تو اس حالت میں تاخیر کی وجہ سے اس کی مذمت ہوگی۔ یقیناً حالت صحت میں نیکی کا کام کرنا کمال درجے کا عمل ہے اور حقوق ادا کرنا اور یہ ایسی چیز ہے جس میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ مال میں بہت زیادہ خطرہ ہے اور حدیث کا شروع والا حصہ اس پر دلالت کرتا ہے اور دوسری وہ حدیث جو دوسری فصل میں ہے۔

مال جمع کرنے والے خسارے میں ہیں

۱۸۶۸: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ انْتَهَيْتُ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ فِیْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا رَاٰنِیْ قَالَ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَقُلْتُ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ مَنْ هُمْ قَالَ هُمُ الْاَكْثَرُوْنَ اَمْوَالاً اِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِيْلٌ مَّاهُمْ۔

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٢٤/١١۔ حدیث رقم ٦٦٣٨۔ ومسلم فی صحیحه ٦٨٦/٢ حدیث رقم (٣٠۔ ٩٩٠)۔ الترمذی فی السنن ١٢/٣ حدیث رقم ٦١٧۔ والنسائی فی السنن ١٠/٥ حدیث رقم ٢٤٤٠۔ واحمد فی المسند ١٥٢/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس گیا آپ ﷺ کعبہ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ جب آپ ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا رب کعبہ کی قسم! وہ نہایت خسارے میں ہیں پس میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! کون ہیں وہ؟ فرمایا کہ مال کو بہت زیادہ جمع کرنے والے۔ مگر جس شخص نے اِدھر اُدھر یعنی اپنے ہر طرف آگے پیچھے دائیں بائیں خرچ کیا اور ایسے ان میں تھوڑے سے ہیں یعنی ایسا کرنے والے بہت کم ہیں۔ اس کو امام بخاری

اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: هم الا خسرون: یعنی وہ تاجر جن کا مالِ تجارت زیادہ ہو وہ مال میں خسارہ پاتے ہیں۔

ابن ملک کہتے ہیں: هم ضمیر کا مرجع ذکر نہیں ہے لیکن یہ تفسیر کے لیے آتا ہے اور وہ آپ کا فرمان هم الا كثرون ہے ابن حجرؒ نے ایک عجیب قول ذکر کیا ہے هُمْ ضمیر مبہم ہے اس کی تفسیر اس کی خبر بیان کر رہی ہے اور وہ (خبر) "الاخسرون" ہے۔

ورب الكعبة: قسم مقام ومحل کے مناسب ہے۔

قوله: فقلت فداك أبي وأمي: "فاء" کے فتحہ کے ساتھ تمام نسخوں میں ہے کیونکہ خبر بمعنی دعا ہے اور "فاء" کو کسرہ دینا اور مقصورہ پڑھنے کا بھی احتمال ہے۔ یعنی آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں اور وہ دونوں میرے لیے دنیا کی تمام چیزوں سے اہم ہیں۔

من هم: اس میں ایسی لطافت ہے جو مخفی نہیں۔ اخسرون کا معنی وہ لوگ جن کے اوصاف آپ نے بیان کر دیئے۔

قوله: هم الاكثرون اموالاً: تمیز جمع لانا شاید انواع کی وجہ سے ہے۔ یا جمع کا مقابلہ جمع سے ہے۔ یعنی الا خسرون مالاهم الا كثرون مالاً۔ ابن الملک کہتے ہے۔ جس کے پاس زیادہ مال ہوگا اس کا نقصان بھی زیادہ ہوگا۔

قوله: الا من قال هكذا و هكذا وهكذا: صحیح نسخوں میں هكذا تین مرتبہ ہے۔ آپ نے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کے لحاظ سے مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کیا ہے شاید آپ کا اشارہ دائیں بائیں اور سامنے تھا۔ لیکن آپ کا قول (من بين يديه و من خلفه وعن يمينه ومن شماله) اس ظاہر کی مخالفت کر رہا ہے پس (هكذا هكذا هكذا) تینوں سے جمع ہے۔ کیونکہ تین جمع کا اقل مرتبہ ہے۔ اس لیے ابن ملک کہتے ہے۔ جس نے چاروں جانب ضرورت مندوں پر خرچ کیا۔ وہ گھاٹا پانے والوں میں سے نہیں بلکہ کامیاب ہونے والوں میں سے ہے۔ ممکن ہے کہ ثلاث سے مراد آپ کے آگے پیچھے اور دو جوانب میں سے کوئی ایک ہو اور جس نسخہ میں تثنیہ کے ساتھ ہے اس سے مراد تکثیر اور تکریر ہے

طیبی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے "قال بيده" یعنی اشارہ کیا "وقال بيده" یعنی پکڑا "وقال برجله" یعنی مارا "وقال بالماء على يده یعنی پانی بہایا" و قال بثوبه یعنی اُسے اُٹھایا قول کا اطلاق تمام افعال پر ہے اور حدیث میں جو "قال" ہے اس معنی میں کہ اپنے ہاتھ سے اس اشارے کی طرف اشارہ کیا۔ اور اشارہ بیان کے لیے ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ اس کا تعلق اس فعل کے ساتھ ہے جو عَنْ کے ساتھ آتا ہے۔ مبتدا کی اصل عبارت یوں ہے: من بين يديه ومن خلفه اور اس سے تجاوز کر کے عن يمينه و عن سماله۔

قليل ماهم: هُمْ مبتدا اور "قليل" اس کی خبر ہے اور ما زائدہ قلیل کی تاکید ہے یعنی جن کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ تھوڑے ہیں یا جو یہ کام کریں گے وہ تھوڑے ہیں اور یہ اقتباس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے: ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ﴾ [ص: ۲٤] "ہاں جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت کم ہیں"۔

اسی طرح اللہ کے اس فرمان میں بھی اشارہ ہے: ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ [سبا: ۱۳] "اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھوڑے ہی ہیں"۔ اس میں فقر کی افضلیت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ یہ سلامت رہنے کا راستہ ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثانی:

سخاوت کو بخل پر برتری حاصل ہے

۱۸۶۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِنَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ وَالْجَاهِلُ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۲/٤۔ حدیث رقم ۱۹٦۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سخی اللہ کی رحمت سے جنت سے لوگوں سے نزدیک ہے۔ آگ سے دور ہے اور بخیل اللہ سے جنت سے لوگوں سے دور ہے اور آگ کے نزدیک ہے اور البتہ جاہل سخی اللہ کے نزدیک عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: السخی : وہ شخص جو اللہ کی رضا کو غنی کے بدلے اختیار کر لے۔

قریب من الله : یعنی اس کی رحمت کے قریب۔ اسی طرح کہا گیا ہے۔ وہ اس کے قریب ہے صفت کرم کے ساتھ موصوف ہونے ہیں۔

قریب من الجنة : فی الحال جو چیز اس پر واجب ہے اس میں مال خرچ کرنے کی وجہ سے اور اچھی امید اس کے لیے فرض ہو جاتی ہے۔

قریب من الناس : فقراء کے ساتھ احسان کرنے کی وجہ سے اور حقیقت میں یہی لوگ انسان ہیں یا خاص و عام پر سخاوت کی وجہ سے۔ کیونکہ سخی کے ساتھ تمام لوگ محبت کرتے ہیں اگرچہ بعض لوگوں کو اس کی سخاوت سے نفع حاصل نہ ہو جس طرح کہ عادل کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

بعید من النار : چونکہ سخی حرام مال لینا اور غلط مقاصد میں اُسے صرف کرنے کو ناپسند کرتا ہے اگر وہ ایسا کرے تو اسراف کرنے والا بن جائے گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔ اسراف میں خیر نہیں اور خیر اسراف میں نہیں۔

والبخيل : وہ شخص جو اپنے واجب کو ادا نہیں کرتا۔

قاعدہ ہے: وتبين الا شياء باضدادها "اشیاء اپنی اضداد سے واضح ہوتی ہیں۔

قوله : ولجاهل سخی: اس سے مراد عابد کی ضد ہے۔ وہ جو نوافل کے علاوہ صرف فرائض ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے لاعلمی میں ارادہ کیا ہے وہ جو اس پر فرض عین نہیں۔ أحب الى الله من عابد: یعنی کثرت سے نوافل کا اہتمام کرنے والا خواہ اس کو علم ہو یا لاعلم ہو۔

چونکہ دنیا کی محبت تمام غلطیوں کی اصل ہے۔ اور اسی طرح شرعی بخیل وہ ہے جس نے شریعت کے واجب کو چھوڑا جو اس مال پر فرض تھا اور سخی اس کی ضد ہے اس میں کوئی شک نہیں جس نے فرائض کو قائم کیا اور نوافل کو چھوڑ دیا اس سے بہتر ہے

جس نے نوافل کو اختیار کرتے ہوئے فرائض کو چھوڑ دیا اور اکثر مال دار اس آزمائش میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے بعض عارفین کہتے ہیں: انہوں نے اصلاً کو ضائع کر کے حرام کما لیا۔ اور یہ جو ہم نے بیان کیا ہے یہ طیبی کے قول سے افضل ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جاہل جو عابد نہیں جو عالم عابد سے زیادہ پسندیدہ ہے مطابقت کے مطابق چلتا ہے۔ ہائے افسوس نیکی کو دو مذموم خصلتوں نے گھیر لیا ہے۔ اے افسوس کہ برائی حسن کو دو اچھے کاموں نے گھیر رکھا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے ہم اس حدیث کو یحیی بن سعید عن الأعرج عن ابی هريرة جانتے ہیں حدیث سعید بن محمد جانتے وہ وراق کو اور کوفی ہے۔ اس کی کنیت ابوالحسن ہے اور ائمہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام دارقطنی اس راوی کو متروک کہتے ہیں۔

تندرستی میں مال خرچ کرنا مرتے وقت مال خرچ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے

۱۸۷۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یَّتَصَدَّقَ الْمَرْءُ فِیْ حَیَاتِہٖ بِدِرْھَمٍ خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّتَصَدَّقَ بِمِائَۃٍ عِنْدَ مَوْتِہٖ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۸۸/۳ حدیث رقم ۲۸۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ البتہ اللہ کی رضا کے لیے تندرستی کی حالت میں ایک درہم دینا مرتے وقت سو درہم دینے سے بہتر ہے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: لان يتصدق المرء: یعنی اپنے صدقہ کی وجہ سے۔

في حياته: یعنی اپنی صحت کے دنوں میں۔

بدرهم: یہ بطور تمثیل ہے طیبیؒ کہتے ہیں: اس سے مراد تقلیل (کم دینا) ہے۔

خير له ان يتصدق بمائة: یہ بھی مثال کے لیے ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: بعض روایات میں "مائة" مال کے الفاظ ہیں۔ اور اس سے مراد تکثیر ہے اور سارا مال مراد ہے اور یہ بلیغ کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ چاہیں آپ درہم کو حقیقت پر محمول کر لیں یا بطور مثال قلت کے معنی کے لیے استعمال کریں۔ اور امام ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ بعض نسخوں میں بمالہ کے الفاظ کا ذکر ہے وہ تحریف ہے حافظ ابن حجرؒ کا یہ کہنا بے محل ہے۔

عندموته: یعنی جب موت کا وقت حاضر ہو تو اس وقت گویا وہ میت ہی ہے۔ یہ قول طیبی کا ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی (صحت) کے حالات میں صدقہ کرنا۔ موت کے وقت بہت زیادہ صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

زندگی میں خیرات کرنے پر زیادہ ثواب ملتا ہے

۱۸۷۱: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الَّذِیْ یَتَصَدَّقُ عِنْدَ مَوْتِہٖ اَوْ یُعْتِقُ کَالَّذِیْ یُھْدِیْ اِذَا شَبِعَ۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی والترمذی وصححه)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٢٨٦/٤ حديث رقم ٣٩٦٨، والترمذی ٣٧٨/٤ حديث رقم ٢١٢٣۔ والنسائی ٢٣٨/٦ حديث رقم ٣٦١٤۔ والدارمی ٥٠٥/٢ حديث رقم ٣٢٢٦۔ واحمد فی المسند ١٩٧/٥۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس شخص کی مثال جو مرتے وقت خیرات کرتا ہے یا مرتے وقت غلام آزاد کرتا ہے اس شخص کی طرح ہے جو کھانا کھانے کے بعد کھانے کا تحفہ بھیجتا ہے۔ اس کو امام احمدؒ نسائیؒ اور دارمی اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

تشریح: عند موته: یعنی جس وقت موت حاضر ہو جائے۔

یعتق: اپنی موت کے وقت اسی معنی میں یہ بھی کہ مملوک کے موت کے وقت مملوک کو آزاد کر دے۔

طیبیؒ کہتے ہیں ہے: اس ہدیہ دینے میں جس کو ہدیہ دیا جا رہا ہے اس کی ایک ایک طرح سے استخفاف ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ سب سے ناقص ہے۔ کیونکہ صدقہ اور آزاد کرنا حالت صحت میں افضل ہے جیسا کہ سخاوت بھوک کے وقت زیادہ کامل ہے۔

مؤمن مذکورہ دو خصلتوں کا حامل ہوتا ہے

١٨٧٢: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ الْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٠٢/٤ حديث رقم ١٩٦٢۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ مؤمن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں۔ ایک بخل، دوسری بدخلقی، اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: خصلتان لا يجتمعان فی مؤمن یا کامل مؤمن ابن ملک فرماتے ہیں: خبر موصوف سے ہے اور مبتداء البخل ہے۔

البخل: خا کے ضمہ اور خاء کے سکون اور فتحہ کے ساتھ۔

الخلق: دونوں کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ۔ یعنی کسی کے لائق نہیں یہ دونوں خصلتیں اس میں جمع ہوں یا اس سے مراد ان دو خصلتوں میں انتہا کو پہنچنا ہے کہ نہ تو وہ آدمی ان دونوں خصلتوں سے جدا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ خصلتیں اس سے جدا ہوں۔ وہ شخص جس میں کبھی کبھی یہ خصلت ہوتی یا بعض حصہ کو بعض میں خلت مسلط کر دیا۔ یا بعض میں وہ المراض کرنے والا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: **خصلتان** مبتدا ہے اور معرفہ ا(لبخل وسوء الخلق) کو اس سے بدل بنایا جائز ہے اور اس کی خبر **لایجتمعان** ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ **لایجتمعان** صفت تخیص کے لیے جو یہاں لائی گئی ہے۔ لیکن مبتدا نکرہ ہے اور خبر وہ بخل اور سوء الخلق ہے اور کہا کہ اس حدیث کو صرف صدقہ بن موسیٰ کے لیے جانتے ہیں اور صدقہ کے ضعیف ہونے کو میرک نے ذکر کیا ہے اور اس کی تائید سنن نسائی کے اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: **لا يجتمع الشح والايمان فی قلب عبد أبدًا)** بخیلی اور ایمان دونوں کسی بندے میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوء خلق کو ایمان کے مخالف محمول کیا جائے۔ اچھا اخلاق وہ اوامر کو بجا لانا اور منہیات سے بچنا ہے۔

مکار اور بخیل جنت میں داخل نہیں ہوگا

۱۸۷۳: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ ﹰالصِّدِّیْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا بَخِیْلٌ وَلَا مَنَّانٌ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۳/٤ حدیث رقم ۱۹٦٤۔ واحمد فی المسند ۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہشت میں مکار اور بخیل داخل نہ ہوگا اور نہ ہی اللہ کی رضا کے لیے دے کر احسان جتلانے والا داخل ہوگا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: لا یدخل الجنة یعنی پہلے داخل نہ ہوگا۔

خب: "خاء" کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ یعنی دھوکے باز لوگوں میں دھوکے سے فساد کراتا ہے۔

بخیل: جو صدقہ اس کے مال پر فرض ہے اس کو ادا کرنے سے روک لیتا ہے۔

منان: "منة" سے ہے۔ یعنی فقیروں کو دینے کے بعد پھر ان پر احسان جتلاتا ہے یا "من" سے ہے اس کا معنی یہ ہے کہ صلہ کا کاٹنے والا۔ ایک قول یہ بھی ہے جس کی یہ صفت ہوگی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک اس صفت سے پاک نہ ہو جائے دنیا میں وہ توبہ کے ذریعے پاک ہو سکتے اور آخرت میں اس کی مقدار کے برابر اس کو سزا ہوگی۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور احسان سے اُسے معاف کر دے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے: ونزعنا ما فی صدورهم من غل۔ "ہم ان کے سینوں سے میل کچیل کھینچ لیں گے"۔

حرص اور بزدلی بری خصلتیں ہیں

۱۸۷۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ شَرُّ مَا فِی الرَّجُلِ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ وَسَنَذْكُرُ حَدِیْثَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ: لَا یَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ فِیْ کِتَابِ الْجِهَادِ۔

(رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲٦/۳ حدیث رقم ۲۵۱۱۔ واحمد فی المسند ۳۰۲/۲۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ انسان میں جو خصلتیں ہوتی ہیں ان میں سے دو خصلتیں سب سے بدترین ہیں۔ ایک تو انتہائی درجہ کا بخل اور دوسری انتہائی درجہ کی بزدلی۔" (ابوداؤد)

تشریح: هالع: یعنی جازع اس کو تحصیل مال کی حرص پر محمول کیا جائے گا اور جزع سے مراد اس کے ختم ہونے پر چلانا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا﴾ [المعارج ۱۹ تا ۲۱] "کچھ شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے" ایک قول یہ بھی ہے: شح بخل سے زیادہ شدید ہے کیونکہ بخل اس کو کہتے ہیں کہ جو کچھ

اس کے مال میں خرچ کرنا واجب ہو اس کے روکے اور خرچ نہ کرے اور شح کہتے ہیں مال' افعال اور اقوال کے واجباء کو روکنا۔
وجبن خالع : یعنی سخت ہو جانا گویا کہ اس کے دل میں کفار کے ساتھ لڑائی کے خوف سے ہیبت اور رعب بیٹھ جاتا ہے اور یہ چیز اسے نیک اعمال میں داخل ہونے سے روکتی ہے اور آدمی کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ دونوں ممدوح ہیں عورتوں کے لیے چونکہ دونوں ایک ہی نوع سے ہیں۔ یا آدمیوں کی ان صفات کی وجہ سے مذمت عورتوں کی مذمت سے زیادہ ہے۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی موسیٰ بن علی (عین کے ضمہ کے ساتھ) کی سند سے عن أبیه عن عبد العزیز بن ودان عن أبی هریرة ۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: محمد بن طاہر کی سند سے متصل ہے۔ لایجتمع الشح : یعنی کامل ایمان والا۔ اس سے مراد زجر و توبیخ ہے اس کو اس جگہ سے اس جگہ یعنی کتاب جہاد میں ذکر کرنے کی علت واضح نہیں (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

الفصل الثالث:

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا خیرات کرنے والی کی طرف اشارہ کرنا

۱۸۷۵: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ بَعْضَ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّنَا اَسْرَعُ بِكَ لُحُوْقًا قَالَ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا فَاَخَذُوْا قَصَبَةً يَذْرَعُوْنَهَا وَكَانَتْ سَوْدَةُ اَطْوَلَ لَهُنَّ يَدًا فَعَلِمْنَا بَعْدُ اِنَّمَا كَانَ طُوْلُ يَدِهَا الصَّدَقَةُ وَكَانَتْ اَسْرَعَنَا لُحُوْقًا بِهٖ زَيْنَبُ وَكَانَتْ تُحِبُّ الصَّدَقَةَ (رواه البخاری وفی روایة مسلم) قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَسْرَعُكُنَّ لُحُوْقًا بِيْ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا قَالَتْ وَكَانَتْ يَتَطَا وَلْنَ اَيَّتُهُنَّ اَطْوَلُ يَدًا قَالَتْ فَكَانَتْ اَطْوَلَنَا يَدًا زَيْنَبُ لِاَنَّهَا كَانَتْ تَعْمَلُ بِيَدِهَا وَتَتَصَدَّقُ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۸۵/۳ حدیث رقم ۱۴۲۰۔ ومسلم فی صحیحه ۱۹۰۷/۴ حدیث رقم (۱۰۱۔ ۲۴۵۲)۔ والنسائی ۶۶/۵ حدیث رقم ۲۵۴۱۔ واحمد فی المسند ۱۲۱/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بعض بیبیوں (یعنی بیویوں) نے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے پوچھا کہ ہم میں سے کون آپ کے ساتھ جلدی ملنے والی ہے (یعنی آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی وفات کے بعد کون ہم میں سے پہلے فوت ہو گی)؟ فرمایا جو لمبے ہاتھ والی ہو (یعنی جو اللہ کے لیے بہت زیادہ خیرات کرتی ہو) میرے بعد وہ پہلے مرے گی۔ انہوں نے کھپانچ (یعنی بانس وغیرہ) کا ٹکڑا لے کر اپنے ہاتھ ماپنے شروع کیے تو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بیوی حضرت سودہؓ لمبے ہاتھ والی تھی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد صدقہ تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہم میں سے جلد ملنے والی تھی اور خیرات کرنا پسند کرتی تھیں اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے اور مسلم شریف کی ایک روایت میں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا تم میں سے بہت جلد ملنے والی وہ ہے جو لمبے ہاتھوں والی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بیویاں اپنے ہاتھوں کی لمبائی کو ناپتی تھیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم میں سے لمبے ہاتھ والی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں اور وہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے خود کرتیں اور اللہ کی رضا کے لیے دیتی تھیں۔

تشریح: لحوقًا : یعنی موت کے بعد کون پہلے ملاقات کرے گا؟ اسی سے حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کا قول ہے: لإنك اول اهلي لحوقًا بي قال فضحكت: بے شک تو گھر والوں میں سے سب سے پہلے میرے ساتھ ملاقات کرے گی تو حضرت فاطمہؓ ہنس پڑیں۔

یدًا : یعنی جو تم میں سے جو زیادہ صدقہ کرنے والی اور نیکی میں زیادہ ہوگی۔ لفظ ید بول کر احسان، نعمت اور نیکی بھی مراد لی جاتی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: الهملا تجعل لفاجر علي يدًا يحبه قلبي۔ ''اے اللہ! کسی فاجر کو مجھ سے زیادہ خرچ کرنے والا نہ بنا کہ میرا دل اُس سے محبت کرے'' اسی طرح شاطبی کا قول ہے:

إليك يدى منك الا يادى تمدها ۔ تجھ پر احسان جو میری طرف سے ہیں اور

فاخذوا: بمعنی اخذن اور اُسے ''اخذوا'' کی طرف پھیرنا تعظیم کے لیے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ [التحریم: ۱۲] ''فرمانبرداروں میں سے تھی''۔

شاعر کا قول ہے:

وإن شئت حرمت النساء سواكم۔ اگر تو پسند کرے تو تیرے سوا میں ساری عورتوں کو حرام قرار دے دوں۔

اس قول کو طیبی نے ذکر کیا ہے۔ اس کا دوسرا شاید واضح ہے مخفی نہیں ہے۔ یہ عدول جنس اشرف کی تغلیب کے لیے ہے۔ لیکن وہاں تغلیب نہیں ہے کیونکہ تمام کی تمام عورتیں ہیں۔

قصبة يذرعونها فعلمنا بعد: اس کے بعد سے مراد جب زینب سب سے پہلے فوت ہوئیں اور وہ کثرت سے صدقہ دیا کرتی تھیں۔

أنما : ہے۔

طول : مرفوع ہے۔

الصدقة : نصب کے ساتھ۔ صحیح نسخوں میں اسی طرح ہے۔ اور ابن حجر عسقلانی نے اس کے خلاف کہا ہے طیبی فرماتے ہیں: یعنی پہلے ہم نے ظاہر پر محمول کیا جب ان (زینبؓ) کی صدقہ کرنے سے محبت بڑھ گئی ہمیں پتا چل گیا تو آپؐ کی ''ید'' سے مراد اعطاء کرنا تھا۔ اس میں غور کریں۔

وکانت : واؤ حالیہ ہے۔ مشکوۃ کے بعض نسخوں میں ''لحوقًا'' کے بعد ''زینت'' ملحقًا کے الفاظ زیادہ ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ صحیح بخاری کے تمام نسخوں میں اس کے بغیر ہے۔ جیسے امام ابن حجر نے شرح میں اس کی صراحت کی ہے۔

اور یہ اس کا وہم ہے کہ سودہؓ نبی ﷺ سے سب سے پہلے ملی تھیں۔ یہ بالا جماع باطل ہے اگرچہ سودہ رضی اللہ عنہا امہات المؤمنین میں سے سب سے لمبے اعضاء والی تھیں اور صحیح بات وہی ہے جو امام مسلم نے صحیح مسلم میں ذکر کی ہے اور محدثین کے ہاں بھی معروف ہے کہ وہ زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔ تو صحیح بات یہ ہے کہ وہاں زینبؓ کو مقدر نہیں یا اس کے وجود کو۔

کرمانی فرماتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ حدیث میں اختصار ہوا اور یہ زینبؓ کی شہرت کے لیے کافی ہے۔ یا کلام کی تاویل کی جائے گی کہ ضمیر اس عورت کی طرف لوٹتی ہے جس کے متعلق آپ کو علم تھا کہ وہ آپ سے سب سے پہلے ملے گی اور وہ

زیادہ صدقہ کرے گی۔ میں کہتا ہوں: پہلی بات ہی قابل اعتماد ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اختصار مخل ہے اولیٰ یہ ہے کہ آخری دو قول صحیح ہیں اور تیسرا قول باریک وارق ہے۔

و كانت : یعنی زینبؓ۔

تحب الصدقة: یعنی وہ عطاء کرتی تھیں۔ وہ ان کا کوئی کاروبار تھا اور اپنی معیشت اپنے ہاتھ سے کماتی تھیں اور یہ دوسرا معنی ہے ہاتھ کا فاطولکن یدا کا معنی جو ہاتھ کے لحاظ سے تم میں افضل ہوگی یعنی وہ اپنے ہاتھ سے کماتی ہے اور اپنے ہاتھ سے خرچ کرتی ہے رواه البخاری وفی روایة مسلم: یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔

اسرعكن لحوقًا بی اطولكن يدا: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لمبی زندگی آپ کی موجودگی میں افضل تھی اور آپ کی موت کے بعد موت افضل ہے۔ اسی لیے بلال نے کہا:

غد نلقى الأحبة ☆ محمد و حزبه

کل ہم اپنے محبوب ﷺ اور اس کے لشکر سے ملاقات کریں گے

قولها (قالت) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔

و كانت : امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی عورتوں کی جماعت۔

يتطاولن: یعنی اپنے ہاتھوں کی لمبائی ماپنے لگیں۔

ايتهن: ضمہ کے ساتھ۔

يدا : طیبیؒ کہتے ہیں: محلاً منصوب ہے حال یا مفعول بہ ہے یعنی وہ اپنے ہاتھوں کی لمبائی دیکھنے لگیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے بخاری کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر بعض وجہات المؤمنین حاضر تھیں اور کہ سودہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہلے ۵۴ھ میں فوت ہوگئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ستاون یا اٹھاون ہجری میں فوت ہوئیں اور مسلم کی روایت میں ہے کہ تمام امہات المؤمنین اس وقت حاضر تھیں اور زینبؓ ۲۰ ہجری میں تمام ازواج مطہرات سے قبل فوت ہوگئیں تھیں۔ اس میں لمبی بحث ہے جو آپ سے مخفی نہیں۔

فكانت: ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ ہے۔ یعنی ظاہر ہوئی۔

یہ محل نصب میں ہے حال ہونے کی بناء پر یا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے۔

زينب : عسقلانی نے یہاں یہ بات کی ہے کہ زینب رضی اللہ عنہا کوتاہ قد عورت تھیں۔

لانها كانت تعمل بيدها و تتصدق : یعنی اپنے ہاتھ سے چمڑا رنگتی تھیں پھر اسے فروخت کرتیں تھیں اور اس سے حاصل ہونے والی قیمت صدقہ کر دیتیں۔ اس قول سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہاتھ لمبا ہونا حرص کے کم ہونے اور نفس کو زیادتی سے روکنا سے "کنایہ" ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: علت بیان کے قائم مقام ہے اقول سے "يتطاولن" یہ معنوی مراد ہے صوری مراد نہیں ہے۔

صدقہ وخیرات کے ضمن میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ

۱۸۷۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لَاَ تَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِیْ يَدِ سَارِقٍ فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى سَارِقٍ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ لَاَ تَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِیْ يَدِ زَانِيَةٍ فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى زَانِيَةٍ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى زَانِيَةٍ لَاَ تَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِیْ يَدِ غَنِيٍّ فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى غَنِيٍّ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ وَزَانِيَةٍ وَغَنِيٍّ فَاُتِیَ فَقِيْلَ لَهٗ اَمَّا صَدَقَتُكَ عَلٰى سَارِقٍ فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهٖ وَاَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا اَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا وَاَمَّا الْغَنِیُّ فَلَعَلَّهٗ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ۔

(متفق عليه ولفظه للبخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳/ ۲۹۰ حدیث رقم ۱۴۲۱۔ ومسلم فی صحیحه ۲/ ۷۰۹ حدیث رقم (۷۸۔۱۰۲۲)۔ والنسائی ۵/ ۵۵ حدیث رقم ۲۵۲۳۔ واحمد فی المسند ۲/ ۳۲۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اپنے دل میں کہا یا اپنے دوست سے کہا۔ میں کچھ اللہ کے لیے دوں گا۔ پس اس نے خیرات نکالی جس کی اس نے نیت کی تھی۔ تا کہ وہ کسی مستحق کو دے۔ پس اس نے خیرات بغیر جانے چور کو دے دی کہ وہ چور ہے تو لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کہ آج رات چور کو خیرات دی گئی ہے لوگوں کو الہام خداوندی سے یا چور سے سن کو معلوم ہوا ہوگا۔ پس اس شخص نے کہا۔ یا اللہ تعریف تیری ذات کے لیے ہے چور کو دینے میں۔ البتہ میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے صدقہ دونگا۔ تا کہ وہ مستحق کو پہنچ جائے۔ پھر اس نے اپنی خیرات نکالی اور زنا کرنے والی کے ہاتھ میں دی پھر صبح ہوئی تو لوگ باتیں کرنے لگے۔ آج کی رات زنا کرنے والی کو خیرات دی گئی پس اس نے کہا اے اللہ تعریف تیرے ہی لائق ہے زنا کرنے والی کو خیرات دینے میں اس نے کہا میں اللہ کی رضا کے لئے خیرات کروں گا اور دولت مند کو خیرات دی گئی۔ اس نے کہا یا الٰہی تیرے لیے تعریف ہے چور اور زنا کرنے والی اور دولت مند کو خیرات دینے میں اس کو خواب میں دکھایا گیا اور اس کو کہا گیا۔ تیرے سب صدقات قبول ہوئے اور تیرا چور پر خیرات کرنا بے فائدہ نہیں ہے یعنی ثواب سے خالی نہیں ہے پس شاید کہ وہ چوری سے باز رہے مطلقاً باز آ جائے۔ یا جب تک اس کے پاس مال موجود رہے تو وہ باز آ جائے اور زنا کرنے والی شاید کہ زنا سے باز آ جائے اور دولت مند شاید کہ وہ اس خیرات سے نصیحت پکڑے اور اس مال سے خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے اور اس کے لفظ بخاری کے ہیں۔

تشریح: بصدقة: اس عظیم جگہ پر خرچ کروں گا۔ جہاں وہ قبولیت عظیم کو پہنچ جائے۔

فوضعها فی ید سارق: اس کو علم نہ تھا کہ وہ چور ہے اس کا مستحق نہیں ہے۔ چور نے صبح یہ خبر پھیلا دی کہ رات اس پر

صدقہ کیا گیا ہے۔

فاصبحوا : یعنی لوگ۔

یتحدثون: یہ بعض چوروں میں سے تھے یا اس چور کے گھر والوں میں سے تھے۔اس کا معنی یہ ہے کہ لوگ باتیں کرنا شروع ہو گئے۔یا اس کا معنی یہ ہے کہ اس سخی نے لوگوں کو صبح صبح تعجب اور ناپسندیدگی کی باتیں کرتے پایا۔

الليلة : ظرف ہے۔

علي سارق: یہ نائب فاعل ہے یا پھر صدقہ نائب ہے۔

اللّٰهم لك الحمد علي سارق: یعنی چور پر صدقہ کرنے پر۔طیبی فرماتے ہیں جب اس کو صدقہ کرنے کی جگہ کا یقین ہو گیا جیسا کہ چور کے ہاتھ صرصدقہ رکھنے پر تنکیر (ناپسندیدگی) ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور اس کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس آدمی پر صدقہ کیا جس سے زیادہ بری حالت والا اور کوئی نہ تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے وہ اپنے فعل پر تعجب کر رہا تھا جیسے دوسرے لوگوں نے تعجب کیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد تعجب کی وجہ سے ہے جس طرح تعجب پر اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی جاتی ہے۔

لأتصدقن بصدقة : دوسری دفعہ نیت کی کہ شاید اب صحیح جگہ پر خرچ کر سکے۔

فاصبحوا يتحدثون : یعنی تعجب اور انکار کی وجہ سے باتیں کر رہے تھے۔

فاصبحوا يتحدثون تصدق : یعنی رات کو صدقہ کیا گیا اور ایک نسخہ میں "الليلة" کے الفاظ ہیں۔

قوله :قال :اللهم لك الحمد علي سارق، وزانية وغني) یہ کل حساب ہے۔اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حمد وثناء بیان کرنی چاہیے۔اس جگہ پر اس کا جواز مقصد پورا ہونے کی وجہ سے ہے۔

ان يستعف عن سرقته : مطلق طور پر یا جب تک وہ صدقہ اس کو کفایت کرے گا تب تک درکار ہے۔

اس میں اشارہ ہے کہ چوری اور زنا میں غالب امکان یہی ہوتا ہے کہ ضرورت کی وجہ سے دونوں افعال سرزد ہوتے ہیں اور حدیث کی ایک روایت اس معنی میں بھی آئی ہے۔كاد الفقر ان يكون كفرا۔

واما الغني فلعله يعتبر : وہ نصیحت وعبرت پکڑے۔

فينفق مما اعطاه الله :یہ بات جان لیں کہ جب کوئی شخص زکوۃ اپنے ظن کے مطابق کسی فقیر پر خرچ کرے پھر پتا چلے کہ وہ غنی تھا تو دوبارہ نہیں لوٹائے گا امام ابو یوسف کا قول اس کے خلاف ہے۔لیکن جو اس نے ادا کیا ہے اس پر لوٹانے کا مطالبہ نہیں ہوگا۔پہلے والے کو اس بات کا علم ہو جائے تو کیا اس سے واپس لیا جائے گا اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ہے لیکن اس میں اختلاف ہے۔ایک قول یہ بھی ہے۔دینے والا اُسے لوٹائے گا تملیک کی وجہ سے تاکہ وہ اداء کو لوٹائے۔ یہ قول امام ابو یوسف کا ہے چونکہ اس کی غلطی بالیقین واضح ہوگئی ہے چونکہ اب غلط مقام سے درستگی کی طرف جانا ہے۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی نے پانی کے ساتھ وضو کیا یا کسی کپڑے میں نماز پڑھی پھر اُسے پتہ چلا کہ وہ نجس ہے۔ان دونوں کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے:

عن معن بن يزيد قال :بايعت رسول الله ﷺ أنا وأبي وجدي وخطب علي فانكحني و خاصمت إليه وكان أبي يزيد أخرج دنانير يتصدق بها فوضعها عند رجل في المسجد فجئت فأخذتها فاتيته بها فقال: والله ما اياك اردت فخاصمتُ إلى رسول الله ﷺ فقال :يا يزيد!لك ما نويت و لك ما أخذت يا معن!"معن بن یزید سے روایت ہے کہ میں اور میرے والا اور میرے دادا نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔اس کے بعد انہوں نے میری منگنی اور نکاح کر دیا۔ میں اپنا جھگڑا آپ کی طرف لے کر گیا میرے باپ یزید نے صدقہ کرنے کے لیے دینار نکالے اور ایک آدمی کے پاس رکھ دیئے جو مسجد میں تھا میں آیا اور اُس سے لے لیے۔ میں انہیں لے کر والا کے پاس گیا تو وہ کہنے لگے "اللہ" کی قسم (یہ دینار) میں نے تجھے تو نہیں دیے۔ چنانچہ میں اپنا جھگڑا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آیا آپؐ نے کہا: اے یزید! تیرے لیے وہی ہے جو تو نے نیت کی اور تیرے لیے ہے اے معن جو تو نے لے لیا"۔اگر چہ یہ واقعہ ہے لیکن جب نفلی صدقہ ہو تو اس حالت میں صدقہ جائز ہے۔آپؐ کے عمومی الفاظ "ملك ما" کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔اسی بات کو ابن ہمام نے بھی اختیار کیا ہے۔اور مسلم کے اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔

خیرات کرنے کا دُنیا میں ثمرہ

۱۸۷۷:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَا رَجُلٌ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ فَسَمِعَ صَوْتًا فِیْ سَحَابَةٍ اِسْقِ حَدِيْقَةَ فُلَانٍ فَتَنَحّٰى ذَالِكَ السَّحَابُ فَاَفْرَغَ مَاءَهٗ فِیْ حَرَّةٍ فَاِذَا شَرْجَةٌ مِّنْ تِلْكَ الشِّرَاجِ قَدِ اسْتَوْعَبَتْ ذَالِكَ الْمَاءَ كُلَّهٗ فَتَتَبَّعَ الْمَاءَ فَاِذَا رَجُلٌ قَائِمٌ فِیْ حَدِيْقَتِهٖ يُحَوِّلُ الْمَاءَ بِمِسْحَاتِهٖ فَقَالَ لَهٗ يَا عَبْدَاللّٰهِ مَا اسْمُكَ قَالَ فُلَانٌ اَلْاِسْمُ الَّذِیْ سَمِعَ فِی السَّحَابَةِ فَقَالَ لَهٗ يَا عَبْدَ اللّٰهِ لِمَ تَسْاَلُنِیْ عَنْ اِسْمِیْ فَقَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ صَوْتًا فِی السَّحَابِ الَّذِیْ هٰذَا مَاءُهٗ وَيَقُوْلُ اِسْقِ حَدِيْقَةَ فُلَانٍ لِاِسْمِكَ فَمَا تَصْنَعُ فِيْهَا قَالَ اَمَّا اِذَا قُلْتَ هٰذَا فَاِنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰى مَا يَخْرُجُ مِنْهَا فَاَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهٖ وَاٰكُلُ اَنَا وَعِيَالِیْ ثُلُثًا وَاَرُدُّ فِيْهَا ثُلُثَهٗ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲۲۸۸/۴ حديث رقم (۴۵۔ ۱۹۸۴)۔ واحمد في المسند ۲۹۶/۲۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص جنگل میں کھڑا تھا۔اس نے بادلوں میں سے ایک آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے دو۔ پھر بادل ایک طرف چلا۔ پھر اس نے پتھریلی زمین پہ پانی برسایا پس اچانک ان نالیوں میں سے ایک نالی نے جو اس زمین میں تھی پانی کو جمع کیا پھر وہ شخص پانی کے پیچھے چلا یعنی نالے میں سے پانی بہنے لگا اور وہ شخص بھی ساتھ چلا تا کہ معلوم کرے کہ کس کے باغ میں پانی پہنچا ہے؟ پس اچانک ایک شخص اپنے باغ میں کھڑا تھا اور بیلچہ کے ساتھ پانی پھیر رہا تھا اس شخص نے اس سے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا میرا نام فلان ہے وہ نام بتایا جو اس نے ابر میں سنا تھا۔ پس اس نے کہا کہ میں نے ابر سے یہ آواز سنی تھی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے یعنی تیرا نام لے کر کہا تھا۔ پس تو اپنے باغ میں کیا نیکی کا کام کرتا ہے جس کی

وجہ سے تو اس بزرگی کے لائق ہوا ہے؟ اس نے کہا تو نے اس موقع پر بات پوچھی ہے اس لیے میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ پس جو چیز باغ سے حاصل ہوتی ہے میں اس کا ایک تہائی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دیتا ہوں اور ایک تہائی میں اور میرا کنبہ کھاتے ہیں اور ایک تہائی باغ میں لگاتا ہوں۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **بینا** : بالاتفاق الف کے فتحہ کے ساتھ یعنی اپنے اوقات کے درمیان۔

لفلاة : یعنی وسیع وعریض صحرا میں

اسق : ہمزہ قطعی اور ہمزہ وصل کے ساتھ

حديقة فلان : ایسا باغ جس کے اردگرد دیوار ہو۔ فلان سے کنایہ ہے آپ کا باغ والے کے نام سے جیسا کہ اس کا صریح بیان آگے آئے گا۔

حرة : یہ سیاہ پتھروں والی زمین تھی۔

الشرجة : راء کے سکون کے ساتھ۔ پانی کا سھل (نرم) زمین کی طرف چلنا۔

الشراح : شین کے کسرہ کے ساتھ یعنی اس پتھریلی زمین میں۔

ذلك الماء : بادلوں سے نازل ہونے والا پانی جو اس پتھریلی زمین میں جمع ہوتا ہے۔

كله : تاکید ہے۔

الماء : پانی کے نشان کی پیروی کی۔

يحول الماء : یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے باغ میں پانی اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔

مسحاة : میم کے کسرہ کے ساتھ یہ لوہے کا آلہ ہے (جیسے کسی وغیرہ)

قال : فلان الاسم : رفع کے ساتھ۔ ایک قول نصب کے ساتھ ہے طیبی فرماتے ہیں: اس کے نام کی صراحت کی گئی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ فلان سے کنایہ کیا ہے پھر اس کے اسم کی صراحت بھی کی ہے۔
شاید تصریح سے کنایہ کی طرف پلٹنا اس میں (اشارہ ہے کہ بعض جگہوں میں مبہم اسماء کی پہچان اہم امور (معاملات) میں سے نہیں ہے۔

يقول : یعنی یہ آواز۔ ان بادلوں سے صاحب باغ کے نام کی آواز تھی۔ ایک نسخہ میں ہے "ويقول"۔

اسق حديقة فلان لاسمك : طیبی فرماتے ہیں: یعنی میں ہی وہ ہوں جس کا یہ مخصوص نام ہے۔ غیبی آواز دینے والے نے مخصوص اسم کے ساتھ صراحت کی اور کنایہ سامع کی طرف سے ہے۔

أما : میم کی تشدید کے ساتھ

اذا قلت : ایک نسخہ میں اِذْ قلت ہے۔

یعنی باغ کی کھیتی اور اس کا پھل

ثلثه : دونوں کے ضمہ کے ساتھ یا دوسرے کے سکون کے ساتھ۔

وأردفيها: یعنی باغ اور کھیتی اور آبادکاری کے لیے لگادیتا ہوں۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے ماضی کو فراموش نہ کرے اور اللہ عزوجل کا شکر بجالائے

۱۸۷۸: وَعَنْهُ اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ ثَلَاثَةً مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَبْرَصَ وَاَقْرَعَ وَاَعْمٰى فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّبْتَلِيَهُمْ فَبَعَثَ اِلَيْهِمْ مَلَكًا فَاَتَى الْاَبْرَصَ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ لَوْنٌ حَسَنٌ وَجِلْدٌ حَسَنٌ وَ يَذْهَبُ عَنِّي الَّذِيْ قَدْ قَذِرَنِيَ النَّاسُ قَالَ فَمَسَحَهُ فَذَهَبَ عَنْهُ قَذَرُهُ وَاُعْطِيَ لَوْنًا حَسَنًا وَجِلْدًا حَسَنًا قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْاِبِلُ اَوْ قَالَ الْبَقَرُ شَكَّ اِسْحٰقُ اِلَّا اَنَّ الْاَبْرَصَ اَوِ الْاَ قْرَعَ قَالَ اَحَدُهُمَا الْاِبِلُ وَقَالَ الْاٰخَرُ الْبَقَرُ قَالَ فَاُعْطِيَ نَاقَةً عُشَرَاءَ فَقَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا قَالَ فَاَتَى الْاَ قْرَعَ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ شَعْرٌ حَسَنٌ وَيَذْهَبُ عَنِّيْ هٰذَا الَّذِيْ قَدْ قَذِرَنِيَ النَّاسُ قَالَ فَمَسَحَهُ فَذَهَبَ عَنْهُ قَالَ وَاُعْطِيَ شَعْرًا حَسَنًا قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْبَقَرُ فَاُعْطِيَ بَقَرَةً حَامِلاً قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْهَا قَالَ فَاَتَى الْاَعْمٰى فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ اَنْ يَّرُدَّ اللّٰهُ اِلَيَّ بَصَرِيْ فَاُبْصِرَ بِهِ النَّاسَ قَالَ فَمَسَحَهُ فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيْهِ بَصَرَهُ قَالَ فَاَيُّ الْمَالِ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ الْغَنَمُ فَاُعْطِيَ شَاةً وَالِدًا فَاَنْتَجَ هٰذَانِ وَوَلَّدَ هٰذَا فَكَانَ بِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْاِبِلِ وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْبَقَرِ وَلِهٰذَا وَادٍ مِنَ الْغَنَمِ قَالَ ثُمَّ اَنَّهُ اَتَى الْاَبْرَصَ فِيْ صُوْرَتِهٖ وَهَيْئَتِهٖ فَقَالَ رَجُلٌ مِسْكِيْنٌ قَدِانْقَطَعَتْ بِيَ الْحِبَالُ فِيْ سَفَرِيْ فَلَا بَلَاغَ لِيَ الْيَوْمَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ اَسْاَلُكَ بِالَّذِيْ اَعْطَاكَ اللَّوْنَ الْحَسَنَ وَالْجِلْدَ الْحَسَنَ وَالْمَالَ بَعِيْرًا اَتَبَلَّغُ بِهٖ فِيْ سَفَرِيْ فَقَالَ الْحُقُوْقُ كَثِيْرَةٌ فَقَالَ اِنَّهُ كَاَنِّيْ اَعْرِفُكَ اَلَمْ تَكُنْ اَبْرَصَ يَقْذُرُكَ النَّاسُ فَقِيْرًا فَاَعْطَاكَ اللّٰهُ مَا لًا فَقَالَ اِنَّمَا وَرِثْتُ هٰذَا الْمَالَ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ فَقَالَ اِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ اِلٰى مَا كُنْتَ قَالَ وَاَتَى الْاَ قْرَعَ فِيْ صُوْرَتِهٖ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ مَا قَالَ لِهٰذَا وَرَدَّ عَلَيْهِ مِثْلَ مَارَدَّ عَلٰى هٰذَا فَقَالَ اِنْ كُنْتَ كَاذِبًا فَصَيَّرَكَ اللّٰهُ اِلٰى مَا كُنْتَ قَالَ وَاَتَى الْاَعْمٰى فِيْ صُوْرَتِهٖ وَهَيْئَتِهٖ فَقَالَ رَجُلٌ مِّسْكِيْنٌ وَابْنُ سَبِيْلٍ اِنْقَطَعَتْ بِيَ الْحِبَالُ فِيْ سَفَرِيْ فَلَا بَلَاغَ لِيَ الْيَوْمَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ بِكَ اَسْاَلُكَ بِالَّذِيْ رَدَّ عَلَيْكَ بَصَرَكَ شَاةً اَتَبَلَّغُ بِهَا فِيْ سَفَرِيْ فَقَالَ قَدْ كُنْتُ اَعْمٰى فَرَدَّ اللّٰهُ اِلَيَّ بَصَرِيْ فَخُذْمَا شِئْتَ وَدَعْ مَا شِئْتَ فَوَاللّٰهِ لَا اَجْهَدُكَ الْيَوْمَ بِشَيْءٍ اَخَذْتَهُ لِلّٰهِ فَقَالَ اَمْسِكْ مَالَكَ فَاِنَّمَا ابْتُلِيْتُمْ فَقَدْ رَضِيَ عَنْكَ وَسَخِطَ عَلٰى صَاحِبَيْكَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٠٠/٦ حديث رقم ٤٣٦٤۔ ومسلم في صحيحه ٢٢٧٥/٤ حديث رقم (١٠۔٢٩٦٤)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ بنی اسرائیل میں تین شخص تھے ایک کوڑھی اور دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا (کہ یہ نعمت کا شکر یہ ادا کرتے ہیں یا نہیں؟) پس ان کی طرف ایک فرشتہ مسکین کی صورت میں بھیجا۔ پس وہ کوڑھی کے پاس آیا اس نے آ کر کہا کہ تمہیں کون سی چیز زیادہ پسند ہے؟ کوڑھی نے کہا کہ اچھا رنگ اور اچھا بدن اور مجھ سے وہ چیز دور ہو جائے جس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں یعنی کوڑھ جاتا رہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پھر اس پر فرشتے نے ہاتھ پھیرا اور اس سے گھن دور ہو گئی یعنی کوڑھ دور ہو گیا اور اچھا رنگ دے دیا گیا یعنی خوبصورتی دے دی گئی پھر فرشتے نے پوچھا تمہیں کونسا مال زیادہ محبوب ہے اُونٹ یا گائیں؟ اسحٰق جو حدیث کے راوی ہیں انہوں نے شک کیا ہے کہ گنجے نے کہا یا کوڑھی نے کہا۔ ایک نے ان میں سے اونٹ کہا اور دوسرے نے گائیں۔ فقط تعین میں شک ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے کیا کہا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کو حاملہ اونٹنیاں دے دی گئیں پھر فرشتے نے کہا اللہ تعالیٰ تیرے لیے ان میں برکت دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر فرشتہ گنجے کے پاس آیا پس فرشتے نے کہا کہ تمہیں کون سی چیز زیادہ محبوب ہے؟ اس نے کہا اچھے بال۔ اور وہ چیز مجھ سے دور ہو جائے۔ جس سے لوگ گھن کھاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس سے اس کا گنج جاتا رہا اور اچھے بال یعنی خوبصورت بال اس کو دے دیئے گئے۔ فرشتے نے کہا کہ تمہیں کونسا مال زیادہ پسند ہے اس نے کہا کہ حمل والی گائیں۔ فرشتے نے کہا اللہ تجھ کو ان میں برکت دے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فرشتہ اندھے کے پاس آیا تو تمہیں کونسی چیز زیادہ پسند ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میری بینائی واپس کر دے۔ تاکہ میں لوگوں کو دیکھ سکوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ فرشتے نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بینائی عطاء کر دی پھر فرشتے نے کہا کہ تمہیں کونسا مال زیادہ محبوب ہے اس نے کہا بکریاں۔ تو اس کو بہت زیادہ بچے دینے والی بکریاں دے دی گئیں پس کوڑھی اور گنجے نے اونٹوں اور گایوں کے بچے لیے اور اندھے نے بکریوں کے بچے لیے۔ کوڑھی کے لیے ایک جنگل اونٹوں کا ہو گیا اور اندھے کے لیے ایک جنگل بکریوں کا ہو گیا اور گنجے کے لیے ایک جنگل گایوں کا۔ پھر فرشتہ اپنی پہلی صورت میں کوڑھی کے پاس آیا یعنی جس صورت میں پہلے اس کے پاس آیا تھا اسی طرح پھر آیا پس فرشتے نے اس کے لیے کہا کہ میں مسکین آدمی ہوں۔ میرا سامان سفر گم ہو گیا ہے میں آج اپنی منزل مقصود تک سوائے اللہ کی عنایت کے نہیں پہنچ سکتا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت کے ساتھ پھر میں تم سے اس ذات کا واسطہ دے کر ایک اونٹ مانگتا ہوں جس نے تجھے اچھے رنگ اور اچھی جلد سے نوازا ہے میں اس اونٹ کے ذریعے اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں پس کوڑھی نے کہا کہ حقدار بہت ہیں۔ تجھے ایک اونٹ نہیں مل سکتا۔ اس نے اس کو ٹالنے کے لئے جھوٹ بولا۔ پس فرشتے نے کہا میں تم کو پہچانتا ہوں تو کوڑھی تھا لوگ تجھ سے گھن کھاتے تھے اور تو محتاج تھا تو اللہ تعالیٰ نے تجھے صحت و مال سے نوازا۔ پس کوڑھی نے کہا یہ تو مجھے وراثت میں دیا گیا ہے باپ دادا سے پس فرشتے نے اس سے کہا کہ اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے ایسا ہی کر دے جیسا کہ تو پہلے تھا۔ یعنی کوڑھی محتاج بنا دے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فرشتہ گنجے کے پاس پہلی صورت میں آیا۔ اس کو بھی اسی طرح کہا اور گنجے نے بھی ایسا ہی جواب دیا جیسے کوڑھی نے جواب دیا تھا پھر فرشتے نے کہا اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ تجھے پہلی حالت کی طرح کر دے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فرشتہ اندھے کے پاس آیا اپنی پہلی شکل و صورت میں اس نے کہا میں مسکین ہوں ... ہوں۔ میرا سامان سفر میں گم ہو گیا ہے میں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت کے ساتھ۔ پھر تم

سے اس ذات کا واسطہ دے کر ایک بکری مانگتا ہوں جس نے تمہیں بینائی عطا کی ہے تاکہ سفر میں میرے کام آئے پس اندھے نے کہا میں تحقیق اندھا تھا اللہ نے میری نظر لوٹا دی۔ پس جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے پس اس نے کہا اللہ کی قسم میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا اس چیز کی وجہ سے جو اللہ نے مجھ پر لوٹا دی ہے۔ یعنی نظر۔ تو اللہ کے واسطے لے جا۔ پھر فرشتے نے کہا کہ تو اپنا مال اپنے پاس رکھ۔ مجھے ضرورت نہیں ہے پس اللہ کی قسم تمہاری آزمائش کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارا امتحان لیا ہے کہ تمہیں اپنا حال یاد ہے یا نہیں اور شکر کرتے ہو یا نہیں؟ پس تجھ سے اللہ راضی ہوا اور ان دونوں سے ناراض ہوا یعنی کوڑھی اور گنجے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابرص واقرع واعمٰی: تینوں ثلاثۃ سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

فاراد الله ان یبتلیهم: یعنی ان کی پہچان کے لیے ان کا امتحان لے تاکہ لوگ ان کو جان لیں یا اللہ تعالیٰ ان کی ظاہری احوال جان لے جس طرح وہ باطن کو جانتا ہے طیبی فرماتے ہیں: یہ ان کی خبر ہے جن کے نزدیک اس کی خبر فاء کا داخل پر کرنا جائز ہے۔ اور جو اس کو جائز نہیں سمجھتے انہوں نے خبر کو مقدر مانا ہے یعنی میں تمہیں قصہ بیان کرتا ہوں۔ یہ ''اراد'' کی تفسیر ہے۔ اگر ''ابرص'' کو مرفوع پڑھا جائے اور جو اس پر عطف ہوگا اس کا تعین تفسیر کے لیے ہوگا۔ اگر اس کو رفع دیں تو تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ ''احدهم ابرص أومنهم ابرص''

فبعث إلیهم ملكا: یعنی ایک مسکین آدمی کی صورت میں بھیجا جس طرح کہ آنے والا قول اس کی ہیئت اور حالت پر دلالت کررہا ہے۔

ویذهب عنی: رفع کے ساتھ جیسے اس کا قول: احضر الوغی ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے یعنی مجھ سے زائل (دور) ہو جائے۔

قد: قذر نی الناس: ذال کے کسرہ کے ساتھ یعنی وہ اس برص کی وجہ سے مجھے ساتھ بٹھانے سے نفرت کرتے ہیں۔

قذرہ: حرف اول ودوم کے فتحہ کے ساتھ۔

قال: الإبل أو قال البقر شك اسحاق: طیبیؒ کہتے ہیں: وہ اسحاق بن عبداللہ ہیں اور اس حدیث کے راویوں میں سے ایک ہیں۔ میں کہتا ہوں آنے والا قول اس بات پر قرینہ ہے کہ ابل ہی راجح ہے قول یہ ہے۔ فأعطنی ناقة بصیغه الجزم اس نے مجھے اونٹنی دی یہ صیغہ جزم کے ساتھ ہے۔

الا ان الابرص او الا قرع: شک سے استثناء ہے۔

احدهما الإبل وقال الأخر البقر: یعنی اسحاق کو اس میں شک نہیں ہے بلکہ تعیین کی ہے۔ یہ قول طیبی کا ہے۔

قال: یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔

فأعطی: یعنی اونٹ مانگنے والا الا ابن حجرؒ نے اس کو صیغہ جزم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ناقة عشراء: عین کے ضمہ، شین کے فتحہ او مد کے ساتھ ہے یعنی وہ اونٹنی جس کو حمل ٹھہرنے کے دس مہینے گزر چکے ہوں پھر مطلق طور پر حاملہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

قوله :قال فاتي الا قرع فقال اى شى أحب إليك قال شعر حسن۔ "شین" کے فتحہ اور عین سکون کے ساتھ۔

قوله:ويذهب عنى ...... الى بصرى۔

فأبصر: نصب اور رفع کے ساتھ۔

به الناس قال فمسحه فرد الله اليه بصره قال فاى المال أحب إليك قال الغنم فاعطى شاة والا: کہا گیا ہے۔ یہ اس شخص کی پہچان ہے جس کا وسیع تجربہ ہوا یک قول یہ ہے۔ حامله

فأنتج: انتاج سے ہے طیبی فرماتے ہیں: اسی طرح کی روایت ہے اور اس کا معنی جو ولادت کے قریب ہو۔ مشہور بات یہ ہے کہ "فتح، ناقیخ اونٹ کے لیے ہے جیسے "قابلة" عورتوں کے لیے ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: اونٹنی اور گائے نے بچہ جنا۔

وولد: فعل ماضی ہے باب تولید سے اور انتاج کے معنی میں ہے۔

أتى الابرص فى صورته: یعنی جس طرح پہلی مرتبہ اس کے پاس آیا تھا۔

وهيته: طیبی فرماتے ہیں: کہ یہ بات بعید نہیں کہ ضمیر ابرص کی طرف راجع ہو اور ضمیر۔ شاید اس نے اپنی حالت کا ذکر کیا تا کہ کوڑھی کے ساتھ اس پر رحم کھائے۔ پہلا قول ظاہر ہے اس پر حجت بھی ہے کہ اس شکل وصورت میں آیا تا کہ اس کے جمال میں اضافہ ہو اور زیادہ مال حاصل کرے۔

رجل مسكين: یعنی میں۔

قد انقطعت بى الحبال :یعنی اسباب وغیرہ۔

فى سفرى: طیبی فرماتے ہیں: باء تعدیت کے لیے ہے۔ سید جمال الدین کہتے ہیں: اس میں غور کریں چونکہ معنی تعدیت میں معاون ثابت نہیں ہو رہا۔ درست بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے۔ باء من کے معنی میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ [الدهر:٦]

ظاہر قول یہ ہے کہ "باء" سببیت اور ملابست کے لیے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾ [البقرہ:١٤٤] اور ان کے ساتھ تمام اسباب کٹ جائیں گے۔ حبال "حاء" کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے بعد باء ہے اور حبل کی جمع ہے۔ اس سے مراد عہد زمان اور وسیلہ ہے وہ چیز جس میں بھلائی وغیرہ کی امید کی جائے اور ضرر کو دفع کیا جائے حبل بھی سبب ہے۔ گویا کہ اس نے کہا کہ سفر کے اسباب منقطع ہو چکے ہیں۔ ابن حجر کی شرح میں ہے یعنی اسباب سے مراد وہ جس سے حصول رزق منقطع ہو جاتا ہے۔ مسلم کے بعض رواۃ اس کو حیال حيلة کی جمع پڑھتے ہیں: یعنی میرے پاس کوئی حيلة (ذریعہ) نہیں بچا۔ یہ قول سید جمال الدین نے ذکر کیا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں: صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں "جبال" جبل کی جمع ہے۔ جیم کے ساتھ ہے یعنی میرا سفر لمبا ہو گیا ہے اور میں اپنی حاجت تک پہنچنے سے قاصر ہوں۔

فلا بلاغ :یعنی جو کافی ہو۔

لى اليوم الابالله :یعنی وہی مدد کرنے والا ہے۔

ثم بك : یعنی تیری مدد اور تعاون سے۔ اس کلام میں حسن ادب ہے جو کسی سے مخفی نہیں اس حیثیت سے کہ اس نے "وَبِكَ" نہیں کہا "ثم" تراخی مرتبہ کے لیے ہے۔ طیبی کہتے ہیں فرشتوں سے ایسی مثالیں اخبار نہیں ہیں بلکہ ان کی کلام میں پیش آنے والا قول ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کہا "إني سقيم" میں بیمار ہوں۔ ان هذا أخي له تسع وتسعون نعجة [ص:۲۳] میرا یہ بھائی اس کے پاس ننانوے اونٹنیاں ہیں۔

أسالك : یعنی تجھ سے مدد مانگتا ہوں جو تجھے دیا گیا ہے۔

بعيرا : أسالك کا مفعول ہے یعنی تجھ سے اونٹ مانگتا ہوں۔

أتبلغ به في سفري : یعنی اپنے مقصد اور اپنے وطن تک پہنچ جاؤں۔

فقال: الحقوق كثيرة : حقوق مال مجھ پر بہت زیادہ ہیں اور میرے پاس ادا کرنے کی قدرت نہیں یا مستحقین کے حقوق بہت زیادہ ہیں آپ کو اونٹ نہیں ملے گا یعنی وہ اس کو بھگانا چاہتا تھا اور اس بات میں وہ جھوٹا تھا۔

فقال انه: یعنی شان یہ ہے کہ

ألم تكن أبرص : یعنی پہلے تو کوڑھی تھا

يقذرك الناس: ذال کے فتحہ کے ساتھ وہ تجھ کو ناپسند کرتے تھے تجھ سے نفرت کرتے تھے اور وہ اس قول سے حال ہے فَقِيرًا۔ یا دوسری خبر ہے اور یہی ظاہر ہے۔

كابرًا : حال ہے

(عَنْ كابر) یعنی میں نے نسل در نسل باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے یعنی میری یہ حالت قوم، ریاست اور نسبت کے لحاظ سے ہے۔ کسی نے مال داروں کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

كان الفتى لم يعريوما اذا اكتسى ☆ ولم يك صعلوكا اذا ما تمولا

یہ باب اکتفاء میں سے ہے جس آدمی کا کسی چیز میں جھوٹا ہونا معلوم ہو جائے تو ایسے آدمی کے لیے آخر تک جھوٹا ہونا لوگوں کی نظر میں لازم ہو جاتا ہے۔

ان كنت كاذبا : صیغہ ماضی کے ساتھ اس پر بددعا کی اس سے دعا میں مبالغہ مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ فتح الباری میں ہے اور اس کی وجہ واضح نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے اس کا ذکر اس وجہ سے کہ وہ اپنے جھوٹ کی وجہ سے مالک ہونے کے باوجود مال روک رہا ہے اس سے مقصود زجر و توبیخ ہے۔ نقشہ کشی اس لیے کہ اس مقام پر جھوٹ صرف اپنی غرض کے لیے ہے۔

سب سے واضح قول یہ ہے کہ اذا كذبت کو ان كنت كاذبا صیغہ ماضی میں تبدیل کیا گیا ہے اور یہ وصف جو متصف بالكذب ہے اس پر دال ہے۔ غالبًا اس طرف اشارہ ہے کہ اس جیسا شخص بددعا کا مستحق ہے۔ إن بمعنی إذ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں کہا گیا ہے۔ و خافون ان كنتم مومنين اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

فصيرك الله إلى ما كنت : یعنی برص اور فقر و فاقہ کی طرف یعنی تجھے دوبارہ حقیر فقیر بنا دے۔

قال واتى الاقرع في صورته فقال له مثل ما قال لهذا : یعنی اس سے کہا۔

ورد عليه مثل مارد على هذا فقال إن كنت كازبا صيرك الله إلى ماكنت: میرک فرماتے ہیں: اگر تو کہے جزا پر فاء داخل کیوں نہیں ہے حالانکہ وہ فعل ماضی ہے۔ میں کہتا ہوں: هو دعا ہے یعنی اس معنی میں دعا۔ ہے اسلئے فاء داخل کرنا جائز ہے۔ اگر آپ خبر بنائیں تو تقدیری عبارت یوں ہوگی: فقد صيرك الله و أتى الاعمى فى صورته و هيئته۔ فقال رجل مسكين و ابن سبيل: یعنی مسافر۔

انقطعت بى الحبال فى سفرى فلا بلاغ لى اليوم إلا بالله ثم بك۔ أسألك بالذى رد عليك بصرك شاة اتبلغ بها فى سفرى وقال: یعنی اس نے اللہ کی نعمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

قدكنت أعمى فرد الله الى بصرى فخذ ما شئت ودع ما شئت فو الله لا أجهدك: ہمزہ اور ھا کے فتحہ کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں ہمزہ کے ضمہ اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی میں اپنی طاقت ضائع نہیں کروں گا۔

اليوم بشئ: کسی چیز میں نہیں روکوں گا۔

اخذته لله تعالى: اسی طرح طیبیؒ کا قول ہے: یہ بات مخفی نہیں کہ یہ معنی اس جگہ غیر مناسب ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ یوں اس معنی میں کہا جائے: لا اشق عليك فى رد شى تطلبه منى أو تاخده من مالى۔ اس طرح ابن حجر عسقلانی کے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے واللہ اعلم۔ اسی طرح سید جمال الدین نے بھی ذکر کیا ہے۔ فقال أمسك مالك فانما ابتيلتم یعنی تو اور تیرے دونوں ساتھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہیں آزمایا گیا کہ تم اپنی بری حالت کو یاد رکھتے ہو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو تم پر نعمتیں عطا کی ان نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہو یا نہیں۔

رضى عنك وسخط: دونوں فعل صیغہ معروف کے ساتھ۔

سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے

۱۸۷۹: وَعَنْ اُمِّ بُجَيْدٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمِسْكِيْنَ لَيَقِفُ عَلٰى بَابِىْ حَتّٰى اَسْتَحْيِىْ فَلَا اَجِدُ فِىْ بَيْتِىْ مَا اَدْفَعُ فِىْ يَدِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْ فَعِىْ فِىْ يَدِهٖ وَلَوْ ظِلْفًا مُحَرَّقًا ۔ (رواه احمد وابو داود والترمذى وقال هذا حديث صحيح حسن)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٣٠٧/٢ حديث رقم ١٦٦٧ ـ والترمذى فى السنن ٥٢/٣ حديث رقم ٦٦٥ ـ والنسائى ٨٦/٥ حديث رقم ٢٥٧٤ ـ واحمد فى المسند ٣٨٣/٦ ـ

ترجمہ: ام بجیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! ایک مسکین میرے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مانگتا ہے یہاں تک کہ مجھے حیا آتی ہے پس میں اپنے گھر میں کوئی چیز نہیں پاتی کہ اس کو دوں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ہاتھ میں دو اگرچہ جلا ہوا کھر ہو۔ اس کو امام احمدؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: ام بجيد: ''باء'' کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ ان کا نام حواء بنت یزید بن السکن ہے۔

المسكين: یعنی جنس مراد ہے اور الف لام عہد کا ہے۔

حتی استحيي: چونکہ دروازے پر کھڑا ہونا حیا کے دروازے کو کھول دیتا ہے۔ حیاء کی تلوار کی وجہ سے (رکاوٹ) وہ صدقہ لینے کو حرام سمجھتا ہے۔ ہمارے بعض خضراء اصحاب کے بارے میں کہتے ہیں: وہ دروازہ باہر آ کر سواری کرتے ہوئے کہتے ہیں: یا فتاح یا رزاق، اور دروازے پر کھڑے نہیں ہوتے (فلا أجد في بيتي ما أدفع) یعنی کوئی چیز جو میں دوں۔

ظلفا: ای ولو كان ما يدفع به ظلفا۔ "ظلف" یعنی گائے، بکری اور ہرن وغیرہ کا کھر ہی دے کر لوٹا۔ قدم سے مشابہت سے مراد وہ چیز جو آسانی سے مل جائے

محرقا: مبالغہ کے لیے یعنی جلا ہوا۔

سائل کو واپس نہیں لوٹانا چاہیے

۱۸۸۰: وَعَنْ مَوْلًى لِعُثْمَانَ قَالَ اُهْدِيَ لِاُمِّ سَلَمَةَ بَضْعَةٌ مِّنْ لَحْمٍ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ اللَّحْمُ فَقَالَتْ لِلْخَادِمِ ضَعِيْهِ فِي الْبَيْتِ لَعَلَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُهُ فَوَضَعَتْهُ فِي كُوَّةِ الْبَيْتِ وَجَاءَ سَائِلٌ فَقَامَ عَلَى الْبَابِ فَقَالَ تَصَدَّقُوْا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكُمْ فَقَالُوْا بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ فَذَهَبَ السَّائِلُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا اُمَّ سَلَمَةَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ اُطْعِمُهُ فَقَالَتْ نَعَمْ قَالَتْ لِلْخَادِمِ اِذْهَبِيْ فَاْتِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذٰلِكَ اللَّحْمِ فَذَهَبَتْ فَلَمْ تَجِدْ فِي الْكُوَّةِ اِلَّا قِطْعَةَ مَرْوَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ ذٰلِكَ اللَّحْمَ عَادَ مَرْوَةً لِمَا لَمْ تُعْطُوْهُ السَّائِلَ۔

رواه البيهقي في دلائل النبوة۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سے روایت ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو گوشت کا پکا ہوا ٹکڑا بطور تحفہ بھیجا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت بہت پسند تھا پس امّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے لونڈی کو کہا کہ اس گوشت کو گھر میں رکھ دے شاید کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نوش فرمائیں۔ لونڈی نے اس کو گھر کے طاقچے میں رکھ دیا۔ پس مانگنے والا آیا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا اے گھر والو! دو اللہ تم کو برکت دیں گے۔ پس گھر والوں نے کہا اللہ تجھے زیادہ دے۔ پس مانگنے والا چلا گیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے پس کہا اے ام سلمہ! کیا تمہارے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟ پس ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے لونڈی کو کہا جاؤ حضورؐ کے لیے گوشت لے کر آؤ۔ پس لونڈی گئی تو اس نے دیکھا طاقچہ میں سفید پتھر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارے سائل کو نہ دینے کی وجہ سے وہ گوشت سفید پتھر ہو گیا ہے۔ اس کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: بضعة: "باء" کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ یعنی ٹکڑا۔

من لحم: اس حال میں کہ پکا ہوا ہو۔

وكان النبي ﷺ يعجبه اللحم: جملہ معترضہ ہے۔

"خدم" کی واحد ہے اس کا اطلاق مذکر مؤنث پر ہوتا ہے کیونکہ یہ اسماء کے قائم مقام ہے۔ یہاں پر مؤنث مراد ہے اس کی دلیل یہ قول (ضعیه) یعنی گوشت۔

کوۃ : کاف کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ یعنی طاقچے وغیرہ میں۔

بارك الله فيكم فقالوا بارك الله فيك : اس میں سائل کی جانب سوال کرنے کے ساتھ ساتھ لفظ دعا کی طرف تعریض اور اسی طرح مسئول کی طرف سے بھی ہے۔

فقال: یاام سلمة هل عندكم : اس میں تغلیب، تعظیم یا استفہام مقدر ہے۔ یعنی أعندكم

قوله شي أطعم یعنی اگر کوئی چیز ہے تو وہ کھلاؤ۔

بذلك : کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

مروة : "را" کے سکون کے ساتھ یعنی سفید چمکدار یہ بھی کہا گیا ہے۔ اس سے مراد آگ ہے۔

ذلك : کاف کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

عاد : یعنی صارَ (ہوگیا)۔

لما : لام کے کسرہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث پاک کا خلاصہ یہ ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے۔ قرآن پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ﴿وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (الضحی : ۱۰) "سائل کو نہ ڈانٹئے" اس لیے سوالی کے سوال کو پورا کرنا چاہیے کیا معلوم کہ وہ کس قدر ضرورت مند ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کی حالت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ واللہ اعلم

خدا کے نزدیک بدترین آدمی جو سائل کا سوال پورا نہ کرے

۱۸۸۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ النَّاسِ مَنْزِلاً قِيْلَ نَعَمْ قَالَ الَّذِيْ يَسْئَلُ بِاللّٰهِ وَلَا يُعْطٰى بِهٖ۔ (رواه احمد)

اخرجه النسائی فی السنن ۸۳/۵ حدیث رقم ۲۵۶۹۔ والدارمی ۲۶۵/۲ حدیث رقم ۲۳۹۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک مرتبے کے لحاظ سے بدترین شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں بتا دیجیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ شخص ہے جو خدا کا نام لے کر سوال کرے اور اسکے سوال پر اس کو نہ دیا جائے۔ یعنی سوال پورا نہ کیا جائے۔ اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یسأل : مجہول پر مبنی ہے۔

ولا يعطى : معروف صیغہ کے ساتھ بہ یعنی اللہ کے ساتھ۔ اس سوال کے ساتھ طیبی فرماتے ہیں باء باء کی طرح ہے۔ باء ... طرح۔ جیسے "كتبت بالقلم" یعنی انہیں گے واسطے سوال کیا جائے۔ یا زمرالغرا یعنی سائل کہتا ہے کہ جو تجھے ملا اللہ کے

فضل سے، مجھے اس میں کچھ دے دو۔ یہ مشکل ہے چونکہ مسائل نے حق اللہ کے ساتھ اہتمام کیا ہے۔ اسکے لئے اور حالانکہ وہ مستحق نہیں ابن حجر کہتے ہیں اس پر اللہ کا نام لے کر تقسیم کرے اور اس کو دینے پر ابھارنا ہے یعنی اس طرح کہا جائے: بحق الله (اعطی کذا ولا یعطی مع ذلك شیئا) یعنی صورت حال یہ ہے کہ سائل نے سوال کیا ہے۔ اس پر حلیم کا قول سائل کی اضطراری حالت مقصود ہو۔ فقیر کو لوٹا دے چونکہ سائل جو اللہ کا نام لے کر مانگے اس کو لوٹانا کبیرہ گناہ ہے۔ ایک نسخہ میں صیغہ معلوم کے ساتھ ہے۔ جو اس قول میں حقدار تھا۔

ولا یعطی به: میں "الذی" مقدر ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا زُہد وتقویٰ

۱۸۸۲: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّهٗ اسْتَأْذَنَ عَلٰی عُثْمَانَ فَاَذِنَ لَهٗ وَبِيَدِهٖ عَصَاهُ فَقَالَ عُثْمَانُ يَا كَعْبُ اِنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ تُوُفِّیَ وَتَرَكَ مَالًا فَمَا تَرٰی فِيْهِ فَقَالَ اِنْ كَانَ يَصِلُ فِيْهِ حَقَّ اللّٰهِ فَلَا بَأْسَ عَلَيْهِ فَرَفَعَ اَبُوْذَرٍّ عَصَاهُ فَضَرَبَ كَعْبًا وَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُحِبُّ لَوْ اَنَّ لِیْ هٰذَا الْجَبَلَ ذَهَبًا اُنْفِقُهٗ وَيُتَقَبَّلُ مِنِّیْ اَذَرُ خَلْفِیْ مِنْهُ سِتَّ اَوَاقِیَّ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ يَاعُثْمَانُ اَسَمِعْتَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَ نَعَمْ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۱/ ۶۳۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ پس انہوں نے ان کو اجازت دی اور ان کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے کعبؓ! تحقیق عبدالرحمن نے وفات پائی ہے اور بہت زیادہ مال چھوڑ گئے ہیں تم اس کے حق میں کیا کہتے ہو؟ (یعنی اس کا کثیر المال ہونا اس کے لیے مضر تھا یا نہیں؟) پس کعبؓ نے کہا۔ اگر عبدالرحمٰن اللہ کا حق (یعنی زکوۃ) ادا کرتے تھے تو ان پر کوئی ڈر نہیں ہے تو ابوذرؓ نے اپنی لاٹھی اٹھا کر حضرت کعبؓ کو ماری اور فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے میں پسند نہیں کرتا ہوں کہ اگر میرے واسطے احد پہاڑ یا کوئی دوسرا پہاڑ سونے کا ہو۔ میں اس کو خرچ کردوں اور وہ قبول بھی ہو جائے اس کے باوجود میں اسے پسند نہیں کرتا کہ دنیا میں چھ اوقیہ چاندی یعنی دوسو چالیس درہم چھوڑ جاؤں۔ اے عثمان! میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم نے بھی اس کو سنا ہے؟ یہ کلام ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے تین بار کہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: "بیدہ" میں واؤ حال کے لیے اور ضمیر کا تعلق ابوذر سے ہے۔

و ترك مالاً: یعنی بہت مال چھوڑا چھوتائی مال کی قیمت اسی ہزار دینار تھی۔

فما تری فیه: یعنی آپ مال اور اس کے ورثاء کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یہ معنی واضح ہے۔ دوسرا معنی کیا مال کی کثرت ان کے کام درجہ میں کمی کے باعث ہوگی۔

ان كان: "ان" شرطیہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ مخففہ ہو۔

یصل فیه: ای فی ماله۔ اور یعنی اپنے مال میں۔ ابن حجر کی کتاب میں اس طرح ہے انہوں نے کہا: ان اموال کے بارے میں جو اس نے چھوڑا۔

فضرب كعبا: یہ ضرب تادیب تھی' تہذیب پر محمول ہے۔ ابوذر نے عصا اُٹھایا پس مارا یعنی اس کے ساتھ کعب کو مارا۔ طیبی نے کہا حضرت ابوذرؓ نے اس لئے مارا کہ کعبؓ نے بالکل ہی حرج کی نفی کی تھی حالانکہ ان کا حساب بھی ہوگا اور وہ بھی داخل ہونگے مگر فقراء مہاجرین سے کہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ مارنا کیسے جائز ہوا جب کہ انہوں نے جان لیا کہ جس وقت اللہ کا حق نکال دیا جائے تو وہ کنز نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ پانچ سو سال کے بعد اور اس سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا میں مال خرچ کرنا اعلیٰ مقام ہے۔ یعنی اکثر انبیاء اور صلحا کا طریق ہے۔

لیکن اس میں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ کعب رضی اللہ عنہ نے مخفی طور پر اس کے معنی کی طرف اشارہ کیا ہے اپنے اس قول کے ساتھ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ رخصت کے علاوہ عزیمت میں استعمال ہوگا اور اس کے ساتھ امانت کی وجہ ظاہر نہیں ہوتی لازمی طور پر خلیفہ کی موجودگی میں ہے اور اغلب طور پر ابوذر نے مار کی وجہ سے ادا کرنے سے روک لیا۔ اور اس کا جواب دیا گیا ہے کہ جس طرح شافعیہ کی اصطلاح ہے کہ انہوں نے نفی کی حرمت اور کراہیت کا ارادہ بغیر کسی حرج کے کیا پہلا اس میں زیادہ واضح ہے اور یہ بھی گمان ہے کہ یہ فعل اور اس کی مثا جوان سے صادر ہوا روک بنے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ سے زیدہ کی طرف نکلنے کا حکم دیا اور وہ وہیں فوت ہو گئے۔

هذا الجبل: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ پہاڑ میرے لیے سونے کا ہو۔ غالباً وہ احد تھا یا اس کے علاوہ کوئی اور تھا یا انہوں نے جنس پہاڑ کا ارادہ کیا۔

ذهبا أنفقه: سونے کا ہو اور میں اسے خرچ کروں یہ مال ہے۔

ويتقبل مني أذر: اور وہ مجھ سے قبول کیا جائے اور میں چھوڑوں۔ طیبی فرماتے ہیں: اجت کا مفعول إن کے بعد حذف ہے اور انہوں نے اس فعل کو رفع دیا ہے یعنی یہ ایسے ہے أحب ان أترت میں پسند کرتا ہوں کہ میں چھوڑوں۔

اوقیہ کی یا کو تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس میں تخفیف اور حذف دونوں جائز ہیں غالباً جو آپ نے قلیل مقدار چھوڑنے کا ذکر کیا ہے یہ کفن ودفن کے لیے یا ایسا قرض جو نا معلوم ہے اس کے لیے ہو۔

ثلاث مرات: تین مرتبہ "أنشد" کے لیے یا سمعته کے لیے ظرف ہے۔

اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ ابوذر کا قول صبر کرنے والا الفقیر افضل ہے یہی جمہور کا موقف ہے ابوذر کا قول ان کے خلاف ہے جو کہتے ہیں: کہ شکر کرنے والا الغنی زیادہ افضل ہے پہلوں کے دلائل زیادہ واضح تسلیم کیے گئے اور زیادہ محفوظ ہیں اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں زیادہ جاننے والے ہیں۔

قولہ مصنف کے قیاس کرنے کا منہج یہی ہے کہ دونوں احادیث کو ان کے اس قول کے ساتھ جمع کر دیا جائے کہ ان دونوں

...ت واحمد رحمۃ اللہ نے بیان کیا۔

دُنیا کا مال اور اسباب قربِ الٰہی میں رکاوٹ کا باعث ہے

۱۸۸۳: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعًا فَتَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ اِلٰى بَعْضِ حُجَرِ نِسَائِهٖ فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهٖ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ فَرَاٰى اَنَّهُمْ قَدْ عَجِبُوْا مِنْ سُرْعَتِهٖ قَالَ ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا فَكَرِهْتُ اَنْ يَّحْبِسَنِيْ فَاَمَرْتُ بِقِسْمَتِهٖ. (رواہ البخاری وفی روایة له) قَالَ كُنْتُ خَلَّفْتُ فِي الْبَيْتِ تِبْرًا مِّنَ الصَّدَقَةِ فَكَرِهْتُ اَنْ اُبَيِّتَهٗ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۹/۳ حدیث رقم ۱۴۳۰۔ والنسائی فی السنن ۸۴/۳ حدیث رقم ۱۳۶۵۔ واحمد فی المسند ۷/۴۔

ترجمہ: عقبہ بن حارث ؓ سے روایت ہے کہتے ہیں میں نے مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی۔ پس آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور جلدی سے کھڑے ہوئے۔ لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی بعض عورتوں ؓ کے حجرے کی طرف گئے پس لوگ حضور ﷺ کے جلدی کرنے کی وجہ سے گھبرا گئے۔ پھر حضور ﷺ صحابہ کرام ؓ پر واپس آئے تو دیکھا کہ صحابہ کرام ؓ نے آپ کے جلدی کرنے کی وجہ سے تعجب کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے سونے کی ایک چیز یاد آئی میں نے اس کو ناپسند جانا کہ وہ مجھے قربِ الٰہی سے روک لے۔ پس میں نے اہل بیت کو اس کے بانٹنے کا حکم کیا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے بخاری شریف کی ایک روایت میں آیا ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں گھر میں ایک ڈلا سونے کا زکوٰۃ میں سے چھوڑ آیا تھا میں نے رات بھر اس کو اپنے پاس رکھنا پسند نہ کیا۔

تشریح: صليت وراء النبی ﷺ بالمدينة العصر فسلم ثم قام مسرعا فتخطی رقاب الناس: عقبہ بن حارث ؓ روایت کرتے ہیں میں نے مدینہ میں عصر کی نماز نبی اکرم ﷺ کے پیچھے ادا کی آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے جلدی سے اُٹھے یعنی جہت اختیار کرتے ہوئے۔

إلى بعض حجر نسائه: لفظ حجر حا کے ضمہ کے ساتھ اور (ج) کے فتحہ کے ساتھ حجرۃ کی جمع ہے۔

من سرعته: یعنی ان کی جلدی کرنے کی وجہ سے۔

عجبوا من سرعته: یعنی صحابہ کرام ؓ آپ ﷺ کی حالت سے گھبرائے ہوئے ہیں۔

وقال: ذكرت شيئا من تبر عندنا فكرهت أن يحبسنی: یعنی اس مال کو اس کے قریبی مقام پر تقسیم میں تاخیر کرنے کو ناپسند کیا اور اس بات کو بھی ناپسند کیا کہ اس مال کی موجودگی اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہونے سے غافل نہ کر دے۔ جس طرح ابوجہم کی انبجانیہ چادر والی روایت میں ہے۔

فأمرت: یعنی اہل بیت کو حکم دیا۔

قوله خلفت: خلفت کو لام کی تشدید کے ساتھ خَلَّفْتُ بھی پڑھا گیا ہے یعنی جو میں نے مال پیچھے چھوڑا ہے۔

أن أبيته : یاء تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی میں اس مال کو چھوڑوں اور اس پر رات آ جائے۔

وراثت کے مال کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

۱۸۸۴: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدِیْ فِیْ مَرَضِهٖ سِتَّةُ دَنَانِيْرَ اَوْ سَبْعَةٌ فَاَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اُفَرِّقَهَا فَشَغَلَنِیْ وَجَعُ نَبِیِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ سَاَلَنِیْ عَنْهَا مَا فَعَلَتِ السِّتَّةُ اَوِالسَّبْعَةُ قُلْتُ لَا وَاللّٰهِ لَقَدْ كَانَ شَغَلَنِیْ وَجَعُكَ فَدَعَابِهَا ثُمَّ وَضَعَهَا فِیْ كَفِّهٖ فَقَالَ مَا ظَنُّ نَبِیِّ اللّٰهِ لَوْ لَقِیَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَهٰذِهٖ عِنْدَهٗ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٦/١٠٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں ان کی چھ یا سات اشرفیاں میرے پاس تھیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ان کو بانٹ دوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی مشغولیت نے مجھے ان کو بانٹنے سے روکے رکھا۔ یعنی بیماری کی وجہ سے بانٹنے کی فرصت نہ ملی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ان چھ یا سات اشرفیوں کا کیا ہوا؟ میں نے کہا نہیں بانٹیں۔ خدا کی قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی مشغولیت نے مجھے ان کے بانٹنے سے باز رکھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشرفیوں کو منگوایا اور ان کو اپنے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا کیا گمان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے نبی کی اللہ رب العزت سے ملاقات ہو۔ اس حال میں کہ اس کے پاس اشرفیاں ہوں۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: سبعة : کو تنوین اور بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔

أفرقها: فرق تشدید کے ساتھ ہے۔

ما فعلت الستة أو السبعة: رفع کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر نصب کے ساتھ روایت کیا جائے تو کان فعلت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خطاب ہے تقدیری عبارت یوں ہو گی۔ ما فعلت بالستة أو السبعة۔ یعنی کیا تو نے تقسیم کر دیا یا اس تقسیم کا کیا بنا؟

ماظن نبی الله : ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے۔

عنده: ای ثابتة وباقية: یعنی میرے پاس موجود اور باقی ہوتے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ منہج نبوی کے خلاف ہے یعنی کمال کے خلاف ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آڑے وقت (مشکل وقت) کیلئے مال بچا کر رکھنے کو ناپسند فرمایا

۱۸۸۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى بِلَالٍ وَعِنْدَهٗ صُبْرَةٌ مِّنْ تَمْرٍ فَقَالَ مَا هٰذَا يَا بِلَالُ قَالَ شَیْءٌ اِدَّخَرْتُهٗ لِغَدٍ فَقَالَ اَمَا تَخْشٰى اَنْ تَرٰى لَهٗ غَدًا بُخَارًا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنْفِقْ بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا۔ (رواهما البيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ١١٨/٢ حديث رقم ١٣٤٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس داخل ہوئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کھجور کا تو دہ تھا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے بلال! یہ کیا چیز ہے؟ عرض کیا یہ ایک چیز ہے جو کل کے لیے میں نے ذخیرہ کیا ہے یعنی اپنی ضرورت کے لیے جو کل کو پیش آنے والی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو ڈرتا نہیں ہے کہ تو کل کو یعنی قیامت کے دن آگ کا دھواں دوزخ میں دیکھے۔ اے بلال! تو اس کو خرچ کر دے اور صاحب عرش سے فقر کا ڈر نہ رکھ۔

تشریح: صبرة : صاد کے ضمہ اور "باء" کے سکون کے ساتھ بمعنی "کومة"۔

فقال اما تخشى ان ترى له : یعنی اس چیز یا کھجور کی وجہ سے۔

غدا : یعنی قیامت کے دن۔

بخارا في نار جهنم: یعنی اس کا اثر جو تجھ کو پہنچے گا۔ یہ اُسے قرب یہ کنایہ ہے۔

يوم القيامة : تمام زمانہ مراد ہے اور یہ "غد" کی تاکید ہے۔

قوله :ولا تخش من ذى العرش إقلالا : یعنی فقر و فاقہ اور مال کے نہ ہونے سے۔ یہ ایسا کام ہے جو تجھے کمال کے عروج تک پہنچادے گا۔

مگر تیرے لیے جائز ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال کا ذخیرہ جمع کر لے اگر تو فقر و فاقہ سے ڈرے۔ یہ صورت ضعفاء کے لیے ہے یعنی جو مالی طور پر کمزور ہیں۔ ایک قول یہ ہے اس مقام میں عرش والے کے ہاں کیا ہی اچھی جگہ ہے یعنی کیا تو ڈرتا ہے کہ تیرے جیسے کو زمین و آسمان کی تدبیر کرنے والا ضائع کر دے گا۔ ذوالعرش لفظ الرحمٰن سے کنایہ ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: الرحمن على العرش استوى [طٰہٰ:٥] یعنی کیا تو ڈرتا ہے کہ وہ جس چیز کا تو مالک ہے وہ ضائع کر دے اور تیرا رزق کم کر دے گا حالانکہ یہ تو رحمت جو زمین و آسمان والوں کے لیے عام ہے خواہ وہ مؤمن و کافر، چرند پرند ہوں یا جانور ہوں۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں رجع عبارت کا تقاضا ہے کہ اقلالا پر وقف کر کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے یا یوں کہا جائے یا بلالا جوڑ بنانے کے لئے جیسے کہا گیا ہے غدایا اور عشایا۔ میں کہتا ہوں یہ سجع تکلف ہے اور شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

سخی اور بخیل کو درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے

١٨٨٦:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّخَاءُ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ فَمَنْ كَانَ سَخِيًّا اَخَذَ بِغُصْنٍ مِنْهَا فَلَمْ يَتْرُكْهُ الْغُصْنُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَالشُّحُّ شَجَرَةٌ فِي النَّارِ فَمَنْ كَانَ شَحِيْحًا اَخَذَ بِغُصْنٍ مِنْهَا فَلَمْ يَتْرُكْهُ الْغُصْنُ حَتّٰى يُدْخِلَهُ النَّارَ . (رواهما البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤٣٥/٧ حديث رقم ١٠٨٧٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سخاوت جنت میں ایک درخت ہے جو شخص سخی ہوگا اس کی ٹہنی پکڑے گا۔ پس وہ ٹہنی اس کو نہیں چھوڑے گی۔ یہاں تک اس کو جنت میں داخل کر دے گی اور بخیلی دوزخ میں ایک درخت ہے اور جو شخص بخیل ہوگا اس درخت کی ٹہنی پکڑے گا۔ پس وہ ٹہنی اس کو نہیں چھوڑے گی۔ یہاں تک کہ اس کو دوزخ میں داخل کر دے گی۔ یہ دونوں حدیثیں بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کی ہیں۔

تشریح: وعنہ: یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

السخاء شجرۃ: یعنی کَشَجَرَۃٍ فی الجنۃ: شاید جنت کے ساتھ مشابہت اس کی عظمت اور زیادہ ٹہنیوں اور شاخوں کی وجہ سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سخاوت کی صورت جنت میں درخت کی ہوگی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ دنیاوی درختوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ درخت سخاوت کا ہے جس کی جڑیں جنت میں ہیں اور اس کی شاخیں دنیا میں ہیں جس نے دنیا میں اسکا بعض لے لیا وہ اس کو آخرت میں جنت کی طرف پہنچا دے گا۔ جس طرح کے اس قول میں اشارہ ہے: فمن کان سخیا۔

أخذ بغصن منها: یعنی سخاوت کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

صدقہ دینے سے آزمائش دُور ہو جاتی ہیں

۱۸۸۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَإِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا۔ (رواہ رزین)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان بلفظ باكروا حديث رقم ۳۳۵۳۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کے لیے مال دینے میں جلدی کرو (یعنی موت یا بیماری سے پہلے ادا کرو) تحقیق آزمائش صدقہ سے بڑھتی نہیں ہے (یعنی اللہ کی رضا کے لیے دینے سے بلا دفع ہو جاتی ہے) اس کو رزین نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بادروا یعنی موت، مرض یا کسی دوسرے اور سبب سے آنے سے پہلے

جو مستحق ہو اس کو دے دو چونکہ بلاء و مصیبت اس سے تجاوز نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ وہ ٹھہر جاتی ہے یا اُس پر لوٹ آتی ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: جلدی جلدی کرنے کے حکم میں کوئی علت ہے اور متمثل ہے۔ صدقہ اور بلاء کو رہن کے دو گھوڑوں کی طرح قرار دیا گیا ہے ان دونوں میں سے جو بھی سبقت لے گیا دوسرا اس کے ساتھ نہیں ملے گا اور اس سے تجاوز نہیں کرے گا التخطی خلو۔ سے باب تفعل ہے۔ اس میں ایک اعتراض یہ ہے کہ صدقہ واقع ہونے والی بلاء کو دور نہیں کرتا حالانکہ ''حدیث ان الصدقة تدفع البلاء'' مطلق ہے۔ اسی لیے طیبیؒ نے کہا ہے: مناسب اور اولیٰ بات یہ ہے کہ صدقہ متصدق کے لیے حجاب اور ستر بن جائے گا آزمائش اس تک تجاوز کر کے نہیں پہنچ سکتی۔

بَابُ فَضْلِ الصَّدَقَةِ

صدقہ کی فضیلت

جس کو انسان اپنے مال سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے فرض یا نفل (نفلی صدقہ) اپنے مال سے نکالے۔ یہ نام اس کا اس وجہ سے ہے کہ صاحب صدقہ صدقہ کر کے یہ بتلایا ہے کہ وہ جنت کی سچی طلب رکھتا ہے۔ یا اس بات پر دلالت ہے کہ صاحب صدقہ صدقہ کر کے اپنے ایمان کا اظہار کرتا ہے۔

الفصل الاول:

صدقے کا اجر و ثواب

۱۸۸۸: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِّنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّيِّبَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يُرَبِّيْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّيْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۷۸/۳ حدیث رقم ۱۴۱۰۔ ومسلم فی صحیحه ۷۰۲/۲ حدیث رقم (۶۳۔ ۱۰۱۴)۔ والترمذی فی السنن ۴۹/۳ حدیث رقم ۶۶۱۔ والنسائی ۵۷/۵ حدیث رقم ۲۵۲۵۔ وابن ماجه ۵۹۰/۱ حدیث رقم ۲۵۲۵ والدارمی ۴۸۵/۱ حدیث رقم ۱۶۷۵۔ ومالك فی الموطأ ۹۹۵/۲ حدیث رقم ۱ من كتاب الصدقة۔ واحمد فی المسند ۳۳۱/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص (صورت کے لحاظ سے یا قیمت کے لحاظ سے) اپنی حلال کمائی سے کھجور کے برابر خیرات کرے اور اللہ حلال مال کے علاوہ قبول نہیں کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ پھر اس کو خیرات دینے والے کے لیے پالتا ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی بچھڑے کو پالتا ہے یہاں تک کہ اس کا ثواب یا صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **بعدل:** فتحہ اور کسرہ کے ساتھ یعنی اس کی مثل یا اس کی قیمت۔

کسب: یعنی صنعت تجارت، زراعت اس کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش ہو یا وہی وراثت ہو۔

ولا یقبل اللہ إلا الطیب: شرط اور جزاء کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حلال کے علاوہ صدقہ غیر مقبول ہے۔ حلال کمائی سے انسان بہت بڑے رتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔

ہمارے شیخ عارف باللہ ولی شیخ متقی رحمۃ اللہ کسی نیک انسان کی حکایت بیان کرتے ہیں: وہ انسان کمائی کرتا تھا ایک حصہ

صدقہ کر دیتا ایک حصہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا اور تیسرا حصہ پھر اپنے کام میں لگا تا۔ ایک دن ایک مال دار آدمی اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ یا شیخ! میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں مجھے بتلائیے کہ مستحق کون ہے؟ شیخ نے جواب دیا حلال مال کما۔ پھر اس کو خرچ کر تو وہ مستحق تک پہنچ جائے گا۔ غنی ان کے ساتھ چمٹ گیا تو آپ نے کہا: یہاں سے نکل جا جب تجھے کوئی راستے میں ملے، تیرا دل اس پر رحم اور ترس کھائے تو اس کو صدقہ دے دے۔ وہ وہاں سے نکلا اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو کہ نابینا فقیر تھا تو اس نے اس پر صدقہ کر دیا۔ پھر دوسرے دن وہ مال دار اس فقیر کے پاس سے گزرا تو اس نے سنا کہ وہ فقیر اونچی آواز میں کہہ رہا تھا کہ میرے پاس سے کل کوئی شخص گزرا اس نے مجھے اس اس طرح صدقہ دیا۔ میں نے وہ صدقہ لے لیا اور اس کی وجہ سے میں نے گزشتہ رات شراب کی حالت میں فلاں گانے والی کے ساتھ گزاری۔ تو وہ مال دار آدمی شیخ کے پاس دوبارہ آیا اور سارا قصہ انہیں بیان کیا تو شیخ نے اپنے مال کی کمائی سے ایک درہم اُسے دیا اور اس سے کہا: جب تو گھر سے نکلے اور پہلی نظر جس پر پڑے تو یہ درہم اس کو دے دے۔ وہ نکلا اور ایسے شخص کو دیکھا کہ وضع قطع کے لحاظ سے اُس میں غنی کے اثرات پائے جا رہے تھے وہ اسے دینے سے ڈر گیا لیکن شیخ کا حکم اس پر غالب آ گیا تو وہ درہم اُس نے اس شخص کو دے دیا۔ وہ درہم لے کر اپنے راستے پر چل پڑ اور مال دار آدمی بھی چھپ چھپ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک ویرانے میں داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا اور شہر کی طرف لوٹ آیا۔ وہ مال دار آدمی بھی اس ویرانے میں داخل ہوا تو اس نے وہاں سوائے ایک مردہ کبوتری کے اور کچھ نہ دیکھا۔ اس نے اُس کا پیچھا کیا اور اللہ کی قسم اس کو دے کر کہا کہ وہ اُسے تمام قصہ سنائے اس آدمی نے بتلایا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو بھوک کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں ان کی یہ حالت دیکھ کر وہ مضطرب ہو گیا وہ آدمی خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اُس نے وہ کبوتری دیکھی تو ان بچوں کے لیے پکڑ لایا۔ جب اُس یہ درہم مل گیا تو اس نے اس کبوتری کو اس جگہ واپس لوٹا دیا۔ اس مال دار نے شیخ کے کلام کا معنی سمجھ لیا۔

فان الله يتقبلها بيمينه: یہ قبولیت احسن پہ دلالت ہے اور صدقہ کا واقع ہونا ایسا ہے کہ اللہ کی رضا اور کامل درجے کا حصول ہے کیونکہ اچھی چیز کا واقع ہونا عادتاً دائیں جانب سے ہے۔

ثم يربيها رحصا رحبها: تربیۃ زیادتی سے کنایہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ کر دے گا اور عظیم بنا دے گا یہاں تک کہ میزان میں اس کا وزن بہت بھاری ہو گا۔

كما يربي احدكم فلوه: ''فاء'' کے فتحہ کے اور ضمہ، لام کے ضمہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ یعنی مہر اور وہ گھوڑے کے بچے کو کہتے ہیں: ایک صحیح نسخہ میں ہے فا کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ اور یہ ہی صحیح لغت ہے۔ قاموس میں کسرہ کے ساتھ الفلو جیسے ''عدوّ'' ہے۔ اس کا نام جحش اور مہر ہے جس وہ دودھ چھوڑ دے اور بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے۔

حتى تكون: تانیث کے ساتھ۔ یعنی صدقہ یا اس کا ثواب یا وہ کھجور

مثل الجبل: یعنی وزن میں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ تمثیل معنی کو جلا سمجھا دینے والی ہے اور اس کو ''کو'' کے ساتھ خاص کیا ہے۔ یعنی وہ بڑی واضح دلیل ہے اور حدیث میں یہ اقتباس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [البقرة: ٢٧٦] ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے'' ربا سے مراد تمام حرام مال ہیں اور صدقات کو تمام

حلالات سے مقید کیا ہے۔ سنن نسائی کی روایت میں ہے۔

الا اخذها الرحمن عزوجل بيمينه وإن كانت تمرة فتربو في كف الرحمن: مگر اللہ تعالیٰ اس کو دائیں ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے۔ اگر کھجور ہو تو وہ اس کے ہاتھ میں (ہتھیلی میں) نمو پانا شروع کر دیتی ہے۔ شاید الرحمٰن کا ذکر لانا اس لیے ہے کہ یہ اس کی رحمت اور وسیع کرم ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں: جب کوئی چیز جس کا انتخاب حصول دائیں کے ساتھ سے ہو اور اس کا استعمال دائیں ہاتھ سے ہو تو وہ اس مثال کی طرح ہی ہے۔ یہ حدیث سلف کے ہاں متشابہات میں سے ہے حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور ہم تمام مشتبہ اقسام تنزیہ کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

صدقہ دینے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے

۱۸۸۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَالٍ وَمَازَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلاَّ عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٠٠١/٤ حديث رقم (٦٩۔ ٢٥٨٨)۔ والترمذي السنن ٣٣٠/٤ حديث رقم ٢٠٢٩۔ والدارمي ٤٨٦/١ حديث رقم ١٦٧٦۔ ومالك في الموطأ ١٠٠٠/٢ حديث رقم ١٢ من كتاب الصدقة۔ واحمد في المسند ٢٣٥/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا صدقہ مال کو کم نہیں کرتا اور جو بندہ کسی کی غلطی کو معاف کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کر دیتے ہیں اور جو خدا کے لیے تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مرتبے کو بلند کر دیتے ہیں اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه: یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔

قوله :ما نقصت صدقة :

من مال ''ما'' نافیہ ہے اور مِنْ'' جو آپ کے فرمان میں ہے مِنْ زائدہ ہے یا تبعیضیہ یا بیانیہ ہے یعنی مانقصت صدقة مالاً أوبعض مال او شيأ من مال بلکہ وہ کئی گناہ بڑھ جاتا ہے جو اس مال سے دیا جائے یعنی اس میں خفیہ برکت، یا عظیم عطیہ یا بہت اعلیٰ ثواب ملے گا۔

قوله :وما زاد الله عبد البفو الاعزا: یعنی کسی کو انتقام قدرت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دیا۔

قوله :وما تواضع احد لله : یعنی اس نے بغیر کسی دوسری کی غرض سے صرف اللہ کے تقرب کے لیے اپنے آپ کو مرتبے سے نیچے گرایا۔

الا رفعة الله: اس سے دنیا کی رفعت مراد ہے یا پھر آخرت کی رفعت مراد ہے۔ اور دونوں کو جمع کرنے سے کوئی ممانعت نہیں ہے جیسا کہ امام نووی نے علماء کی جماعت سے نقل کیا ہے۔

۱۸۹۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ زَوْجَيْنِ مِنْ شَيْءٍ مِّنَ الْاَشْيَاءِ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ دُعِيَ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ وَلِلْجَنَّةِ اَبْوَابٌ فَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصَّلَاةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجِهَادِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصَّدَقَةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ وَمَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الصِّيَامِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الرَّيَّانِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ مَا عَلٰى مَنْ دُعِيَ مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ مِنْ ضَرُوْرَةٍ فَهَلْ يُدْعٰى اَحَدٌ مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ كُلِّهَا قَالَ نَعَمْ وَاَرْجُوْاَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤/حديث رقم ١٨٩٧۔ ومسلم في صحيحه ٢/٧١١ حديث رقم (٨٥۔ ١٠٢٧)۔ والنسائي في السنن ٩/٥ حديث رقم ٢٤٣٩۔ والدارمي ٢/٢٦٨ حديث رقم ٢٤٠٣۔ ومالك في الموطأ ٢/٤٦٩ حديث رقم ٤٩ من كتاب الجهاد۔ واحمد في المسند ٢/٣٦٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو کوئی دوہری چیز خرچ کرے اللہ کے راستے میں تو اس کو بہشت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور بہشت کے بے شمار (یعنی آٹھ) دروازے ہیں۔ پس جو شخص اہل نماز میں سے ہوگا۔ بہت نفل پڑھتا ہوگا یا اچھی طرح نماز پڑھتا ہوگا' اس کو نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ (جو نمازیوں کے لیے خاص ہوگا) اس کو کہا جائے گا اے بندے اس میں سے داخل ہو جاؤ اور جو کوئی اہل جہاد سے ہوگا۔ یعنی بہت زیادہ جہاد کیا ہوگا۔ اس کو جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو اہل صدقہ سے ہوگا (یعنی اللہ کی رضا کیلئے دیتا ہوگا) اس کو صدقہ کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو روزوں والوں سے ہو یعنی روزے بہت رکھتا ہو۔ اس کو ریان دروازے سے بلایا جائے گا۔ یعنی باب الصیام سے جس کا نام ریان ہے پس ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ بات ضروری ہے کہ اس شخص کو ان دروازوں سے صرف ایک دروازے سے (ہی) بلایا جائے؟ یعنی یہ ضروری نہیں کہ کسی کو سب دروازوں سے بلایا جائے کیونکہ اگر ایک بھی دروازے سے بلایا جائے تو وہ بہشت میں ہی داخل ہوگا۔ لیکن اس کے جاننے کے باوجود میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان سب دروازوں میں سے بھی کوئی بلایا جائے گا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں اور میں امید رکھتا ہوں تو ان میں سے ہوگا۔ یعنی تو سب دروازوں سے بلایا جائے گا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: من أنفق زوجين ......دعي من أبواب الجنة:

زوجين : جوڑا: یعنی ایک جنس سے جفت خرچ کیا۔ ابن الملک فرماتے ہیں: زوج کا اطلاق دوہرے اور ان میں سے ایک پر بھی ہوتا ہے۔ چونکہ وہاں مراد ایک دوسرا زوج ہے۔ زوجین سے مراد ایک جنس کی دو چیزیں ہیں نا کہ دو قسمیں مراد ہیں۔ جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے آپ اس پر غور کریں طیبی فرماتے ہیں: جیسے دو درہم دو دینار یا کھانے کے دو مد یا اس سے جو چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ ابوذر سے پوچھا گیا ''زوجان'' کیا ہیں؟ کہا: دو گھوڑے: دو غلام۔ دو اونٹ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ بار بار صدقہ اور اس پر ہمیشگی کرنا اور یہی اولیٰ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اپنے صدقہ کو دوسری چیز کے ساتھ جفت کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں سے مراد دو صدقے ہیں ایک پوشیدہ طور پر اور دوسرا اعلانیہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہ اقتباس ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرۃ: ٢٧٤] ''وہ لوگ جو اپنے اموال دن اور رات پوشیدہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے [illegible] اجر ہے ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے'' ایک قول یہ ہے یعنی دو نمازیں یا دو روزے اور حدیث کو تمام

نیک اعمال پر محمول کیا جائے گا۔ یہ قول بہت بعید ہے مگر اس کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ نماز اور نفلی روزہ فقراء کے لیے اس صدقہ کے قائم مقام ہے جو اغنیاء کرتے ہیں۔

من شی من الاشیاء: یعنی جوڑ الغیر کسی قید کے کسی صنف سے یا نوع سے ہو۔

فی سبیل الله: یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کسی کام کے لیے ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ نوویؒ نے کہا ہے کہ پہلا قول صحیح اور ظاہر ہے یعنی عام ہے مکمل اور مشہور ہے آپ اس پر غور کریں۔

دعی من ابواب الجنة: یعنی دربان جنت اس کو تمام دروازوں سے بلائے گا۔ اس قول میں تنبیہ ہے کہ اس نے ایسے اعمال کیے جنہوں نے اُسے ان دروازوں سے داخلے کا مستحق بنا دیا یا یہ اس کے اعلیٰ مرتبے پر دلالت ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے لیے ایک دروازہ مختص ہو جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا کہ صدقہ کے لیے ایک دروازہ ہے اور وہ صدقہ کرنے والے کے متعلق پوچھے گا یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے۔

قوله: وللجنة ابواب: یعنی آٹھ دروازے جیسا کہ صحیح احادیث میں موجود ہے۔ طیبی فرماتے ہیں انہوں نے طیبی نے ایک لمبی بحث ذکر کی ہے اس میں ہے کہ یہ مناسبت بہت واضح ہے کہ ہر دروازہ کے نام عبادت کے ساتھ منسوب ہے اور یہ اطاعت امہات میں سے ہے (دروازوں کے نام) آدمی اس دروازے میں سے داخل ہوگا جس عبادت کا اس پر غلبہ ہوگا۔ اور جو تمام عبادتوں میں کثرت کرے گا تو اس کو تکریماً آٹھ دروازوں سے بلایا جائے گا اور یہ ربّ العالمین کے قاصدوں کی عزت و تکریم ہے۔ جیسا کہ اس قول میں اشارہ ہے۔

قوله: فمن كان من أهل الصلواة: یعنی جس کے نفل زیادہ ہوں گے۔ یہ قول طیبیؒ کا ہے یا جو اس کو احسن طریقہ سے ادا کرے گا۔

دعی من باب الصلٰوة: یعنی سب سے پہلے اور یہ سب سے افضل و اعلیٰ دروازہ ہے یعنی کہا جائے گا اے اللہ کے بندے! جنت میں اس دروازے سے داخل ہو جا۔ ومن کان من اهل الجهاد یعنی جس پر جہاد کا غلبہ ہوگا۔

قوله: ومن كان من اهل الصيام دعى من باب الريان یعنی باب الصیام سے ریان عطشان کی ضد ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ وہ ایسا دروازہ ہے جس میں روزے داروں کو شراب طہور پلائی جائے گی اور یہ ان کو جنت کے درمیان میں پہنچنے سے پہلے پہلے پلائی جائے گی تا کہ ان کی پیاس زائل ہو جائے۔ طیبی فرماتے ہیں: اگر یہ دروازے کا نام ہے تو اس پر کوئی کلام نہیں مگر نام ہو تو یہ رواء سے "را" ضمہ کے ساتھ ہے یہ وہ پانی جو زمین کو سیراب کرتا ہے کہا جاتا ہے: روی یردی فهوریان یعنی روزے دار جو دنیا میں پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ باب ریان سے داخل ہوں تا کہ وہ پیاس سے محفوظ رہے۔

امام حاکم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے: قال (رسول الله ﷺ ان للجنة بابا يقال له باب الضحى فاذا كان يوم القيامة نادى مفاد اين الذين كانوا يداومون على صلوة الضحىٰ؟ هذا بابكم فادخلوه برحمة الله) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام باب الضحیٰ ہے قیامت کے دن اعلان کرنے والا اعلان کرے گا۔ صلٰوۃ الاضحی پر ہمیشگی کرنے والے کون ہیں؟ یہ دروازہ تمہارے لیے خاص ہے تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ

اس سے داخل ہو جاؤ۔

ابن قیم نے اسے الہدیٰ میں ذکر کیا ہے ایک دوسری حدیث جو: باب التوبة و باب الكاظمين و العافين عن الناس و باب الراجين میں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ستر ہزار لوگ بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے اور وہ باب الایمان سے داخل ہوں گے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں: شاید کہ وہ آٹھواں دروازہ ہے۔

قوله : فقال ابوبکر ما علی من دعی من تلك الابواب من ضرورة ...... "ما" نافیہ اور مِنْ زائدہ ہے۔ اور یہ "ما" کا اسم ہے۔ کوئی ضرورت اور محتاجگی نہیں کہ جس کو ایک دروازے سے بلایا جائے اس کو اگر تمام دروازوں سے نہ بھی بلایا جائے مقصود تو ایک دروازے سے حاصل ہو گیا وہ دخول جنت ہے۔

قوله : فهل يدعى احد من تلك الابواب كلها : یعنی میں نے سوال کیا جبکہ اس بات کا مجھے علم ہو چکا تھا کہ اس بات کی ضرورت اور محتاجی نہیں کہ جس کو ایک سے پکارے جائے اس کو ان تمام دروازے سے بلایا جائے۔ تب اس سے مراد جنت میں داخل ہونا ہے۔

قال : نعم : یعنی ایک جماعت ہوگی جس کو تمام دروازوں سے بلایا جائے گا اور یہ ان کے لیے عزت و تکریم کا باعث ہوگا اور یہ درجہ انہیں کثرت نماز، جہاد اور روزوں کی وجہ سے اور دوسرے خیر کے کاموں کے بدولت حاصل ہوگا۔

قوله : وارجوان تكون منهم کیونکہ ابوبکر صدیقؓ میں یہ تمام خوبیاں جمع تھیں جیسا کہ اگلی حدیث میں آ رہا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ: قال ابوبکر : یا رسول الله ﷺ ذلك الذی لاتوی۔ ابوبکر صدیقؓ نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! یہ وہ شخص ہے جس کے لیے ضیاع و ہلاکت میں خسارہ نہیں ہے۔ قولہ سنن نسائی کی ایک روایت میں ہے (دعی من ابواب الجنة یاعبدالله) اے اللہ کے بندے! تو جنت کے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔ هذا خير : یعنی یہ تیرے گمان کے مطابق ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان و عظمت عیاں ہو رہی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جامع الخصائل تھے

۱۸۹۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ صَائِمًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ تَبِعَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ جَنَازَةً قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ اَطْعَمَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مِسْكِيْنًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا قَالَ فَمَنْ عَادَ مِنْكُمُ الْيَوْمَ مَرِيْضًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اجْتَمَعْنَ فِىْ اِمْرِىءٍ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۱۳/۲ حدیث رقم (۱۰۲۸/۸۷)۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آج کے دن تم میں سے کون شخص روزے سے ہے؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا میں ہوں پھر فرمایا: آج کے دن تم میں سے جنازے کے ساتھ کون گیا ہے؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں۔ پھر فرمایا کون ہے جس نے آج کے دن مسکین کو کھلایا ہو؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا میں ہوں۔

پھر فرمایا کون ہے تم میں سے جس نے (آج) بیمار کی عیادت کی ہو؟ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا میں ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کے اندر یہ چیزیں جمع ہو گئیں۔ وہ بہشت میں داخل ہوگا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :من أصبح منكم اليوم صائما؟ قال أبوبكر :أنا: مَنْ استفہامیہ ہے اور''اَصْبَحَ'' صار کے معنی میں ہے اس کی خبر "صائما" ہے۔ یا''دَخَلَ فی القباح'' کے معنی میں ہے۔ تو اس وقت اصبح تامہ ہوگا اور صَائِمًا اس کی ضمیر سے حال ہوگا۔

أنا: ألف پر وقف کیا جائے گا اور نون پر وقف کرنا غلط العام ہے۔ طیبی فرماتے ہیں: یہاں أنا کا ذکر خبر میں تعیین کے لیے ہے نا کہ اپنے نفس کی گنتی کے لیے۔ جیسا کہ عزت وفخر کے مقام پر ذکر کیا جاتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو صوفیہ نے ناپسند کیا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ [الكهف: ١١٠] وما أنا من المتكلفين [ص: ٨٦] اسی طرح دوسری آیات ہیں۔

حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا رد کیا ہے جو دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اس سے پوچھا جانے کون تو وہ کہے۔ أَنَا (میں) اس حدیث میں أَنَا خبر کی تعیین کے لیے ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس حدیث میں أَنَا مذموم کلام میں سے نہیں ہے یہ اس وقت قابل مذمت ہوتا جب یہ قول فخر کے لیے ہوتا جیسے ابلیس نے کہا تھا ﴿ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ﴾ [الاعراف: ١٢] اسی طرح کی مثالیں یہ کہنا میں عالم ہوں میں زاہد ہوں اور میں عابد ہوں لیکن یہ کہنا درست ہے میں فقیر عاجز گناہ گار بندہ اور اس سے ملتے جلتے جملے۔

قوله :فمن تبع منكم اليوم جنازة :یعنی نماز سے پہلے یا اس کے بعد۔

قال ابوبكر أنا قال فمن أطعم منكم اليوم مسكينا قال ابوبكر :اس میں أنا کہنے کا جواز ہے جیسے آیت میں ہے: ﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الانعام: ١٦٣] اور حدیث میں ہے۔ (أنا سيد ولد آدم) ایک جماعت نے اس قول کو ناپسند کرتے ہوئے اس قول کو رد کیا ہے لیکن اس کا محل تب ہے جب اپنے آپ کو بڑا اور اپنی ذات کی اکملیت اور حقیقت کا وہم ہو جیسا کہ ابلیس سے یہ الفاظ صادر ہوئے جب اس نے کہا

(أنا خير منه) جیسا کہ حضرت جابر کی صحیح حدیث ہے: أتيت النبي ﷺ في دين كان على أبي فدققت الباب فقال من ذا فقلت أنافقال أناأنا كانه كرهها: یعنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس قرضے کے سلسلے میں آیا جو میرے باپ پر تھا میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ نے پوچھا کو؟ میں نے کہا''میں'' آپؐ نے فرمایا''میں میں''(کیا مطلب) گویا کہ آپ نے اس کلام کو ناپسند کیا۔ گویا کہ کراہت کی وجہ اس کا اقتصار کرنا اور اپنا نام نہ بتانا بنی۔ پھر اگر آپ اس کی آواز کو پہچان لیتے تو سوال کیوں کرتے ابن حجر نے جو سوال جواب کا وہاں اصل میں ذکر کیا ہے اس کو ملا علی قاری نے ذکر نہیں کیا۔ واللہ اعلم

قوله :فقال رسول الله ﷺ ما اجتمعن في امرى الا دخل الجنة :یعنی یہ مذکورہ چاروں خصلتیں ایک دن میں جن کا بالترتیب ذکر کیا گیا ہے۔ ابن الملک کا بھی اسی طرح قول ہے۔ اور جو ترتیب ہے اس میں''فاء''تعقیب کے لیے ہے اور وہ ضروری نہیں ہے جب تعقیب کو سوال پر محمول کرنا ممکن ہو۔ جیسا کہ فقہاء نے''ثم'' کے بارے میں بحث کی ہے کہ سوال میں

تراخی اور تقدیر کے لیے جیسے تم یہ بات کہو (فمن فعل هذا) حاصل کلام یہ ہے کہ خصلتیں جب ایک ہی میں پائی جائیں۔

الادخل الجنة :یعنی بغیر محاسبہ کے ورنہ جنت میں مطلق داخلے کے لیے ایمان کافی ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ جنت کے جس دروازے میں سے چاہے داخل ہو جائے جیسا کہ پہلے اس پر بحث گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

ہمسایوں کا خیال رکھو

۱۸۹۲ :وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۴۴۵۔ حدیث رقم ۶۰۱۷۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۷۱٤ حدیث رقم(۹۰۔۱۰۳۰)۔ والدارمی فی السنن ۱/۴۸٤ حدیث رقم ۱۶۷۲۔ واحمد فی المسند ۶/۴۳۵۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے مسلمان عورتو! کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کو (تحفہ بھیجنے کے لیے) حقیر نہ جانے اگر چہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: یا نساء المسلمات :طیبی فرماتے ہیں: اس میں اعراب کی تین وجہیں ہیں: نساء کو نصب اور مسلمات کو اضافت کی بناء پر جر ہے یعنی موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے بصریوں کے ہاں موصوف مقدر ہے۔ یعنی نساء الطوائف المسلمات دوسری وجہ نداء کی وجہ سے مضموم ہے ''مسلمات'' مرفوع ہے اس کا عطف اس کے لفظ پر ہے۔ تیسری وجہ:اس کے محل پر نصب ہے۔

لاتحقرن: حرف مضارع کے فتحہ کے ساتھ اور نون ثقیلہ کے ساتھ یعنی کسی چیز کو ہدیہ کرنے یا صدقہ کرنے کو حقیر نہ سمجھ۔

جارة :یعنی کوئی فقیر ہو یا غنی تم (عورتوں) میں سے یا تمہارے علاوہ یہ ''جار'' کی مؤنث ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیوی کی لونڈی خاوند کی عورت ہے۔

لجارتها :یعنی اس کی وجہ سے اگر چہ وہ اکابر ہے۔

ولو فرسن شاة: ''فا'' اور سین کے کسرہ کے ساتھ یعنی اگر چہ وہ بکری کا کھر صدقہ کرے یا ہدیۃ دے۔ یہ بکری کے ناخن کے درمیان والا گوشت ہے۔ اور اس سے مراد مبالغہ ہے یعنی وہ کوئی چیز دے جو آسانی سے میسر ہو یا معمولی نیکی پر بھی عمل کرے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۷] ''جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا''۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پڑوسی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ [النساء: ۳۶] اس کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس وجہ سے صدقہ یا ہدیۃ پڑوسی کو دینے سے اس لیے نہ رک جائے کہ اسکے پاس جو چیز ہے وہ معمولی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب اس سے ہے کہ جس کو ہدیۃ دیا جا رہا ہے تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا تم میں کوئی بھی اپنے ہمسائے کے تحفے کو معمولی نہ سمجھے بلکہ اُسے قبول کر لے اگر چہ

وہ مقدار میں کم ہو۔ اس حدیث میں ہدیہ وغیرہ پر رغبت دلانا ہے اور عطیہ کی وجہ سے دلوں کو ملانا ہے۔

۱۸۹۳: وَعَنْ جَابِرٍ وَحُذَيْفَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٤٧/١٠ حدیث رقم ٦٠٢١۔ ومسلم فی صحیحه ٦٩٧/٢ حدیث رقم (٥٢-١٠٠٥) وابوداوٗد فی السنن ٢٣٥/٥ حدیث رقم ٤٩٤٧۔ والترمذی ٣٠٦/٤ حدیث رقم ١٩٧٠۔ واحمد فی المسند ٣٤٤/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نیکی صدقہ ہے اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: معروف یعنی جو نیکی کے کام ہیں خواہ وہ عطیہ مال یا حسن خلق ہو یا ایسے اقوال و افعال جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی معلوم ہو۔

صدقة: یعنی اس کا ثواب صدقے کے ثواب کی طرح ہے۔

میرک فرماتے ہیں: اس حدیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ دونوں راوی بخاری اور مسلم کے ہیں یعنی حدیث جابرؓ اور حذیفہؓ دونوں کو امام بخاری اور امام مسلم نے ذکر کیا ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت جابرؓ سے حدیث بیان کی ہے۔ اور امام مسلم نے حضرت حذیفہؓ سے بیان کی ہے۔ حدیث جابر امام بخاری کے افراد میں سے ہے۔ اور حدیث حذیفہؓ امام مسلم کے افراد میں سے ہے۔ حدیث اصلاً دو راویوں سے ہے۔

حقیر چیز یعنی ادنیٰ چیز بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا نیکی ہے

۱۸۹۴: وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٦/٢ حدیث رقم (١٤٤-٢٦٢٦)۔ واحمد فی المسند ٢٧٣/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نیکی میں سے کسی چیز کو حقیر نہ جانو اگرچہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: المعروف شيئا: طیبیؒ کہتے ہیں: المعروف جامع اسم ہے جو ہر اللہ کے حکم کی پیروی اور لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کو شامل ہے اور یہ غالب صفات میں سے ہے۔ یعنی وہ حکم جو لوگوں کے درمیان معروف ہو جب وہ اُسے دیکھیں تو اس کا انکار نہ کریں۔ انصاف اور حسن سلوک اہل و عیال اور دوسروں کے ساتھ کرنا نیکی ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ کھلے چہرے کے ساتھ ملنا۔ ولو أن تلقى أخاك بوجه طليق۔ "طليق عبوس" کی ضد ہے۔ طلیق وہ چہرہ جس میں رونق و بشاشت ہو جس کی وجہ سے دل میں سرور پہنچے۔ اس میں کوئی شک نہیں مسلم کے دل میں نیکی کی وجہ سے سرور پہنچتا ہے یعنی اس کا دل خوشی سے لبریز

ہوجاتا ہے۔

بطور شکر الٰہی کے ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے

۱۸۹۵:وَعَنْ اَبِیْ مُوسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَۃٌ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ قَالَ فَلْیَعْمَلْ بِیَدَیْہِ فَیَنْفَعُ نَفْسَہٗ وَیَتَصَدَّقُ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ اَوْلَمْ یَفْعَلْ قَالَ فَیُعِیْنُ ذَاالْحَاجَۃِ الْمَلْھُوْفَ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْہُ قَالَ فَیَاْمُرُ بِالْخَیْرِ قَالُوْا فَاِنْ لَّمْ یَفْعَلْ قَالَ فَیُمْسِكُ عَنِ الشَّرِّ فَاِنَّہٗ لَہٗ صَدَقَۃٌ. (متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ٤٤٧/١٠ حدیث رقم ٦٠٢٢۔ ومسلم فی صحیحہ ٦٩٩/٢ حدیث رقم (٥٥۔ ١٠٠٨)۔ والنسائی ٦٤/٥ حدیث رقم ٢٥٣٨ والدارمی ٣٩٩/٢ حدیث رقم ٢٧٤٧۔ واحمد فی المسند ٣٩٥/٤۔

ترجمہ:حضرت ابی موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے۔یعنی بطور نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا اگر وہ اس قدر چیز نہ پائے کہ صدقہ کرے پھر اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کمائی کرے اور نفع حاصل کرے اور اپنی ذات کو بھی فائدہ پہنچائے اور دوسروں پر بھی خیرات کرے۔صحابہ نے پوچھا اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے یا کہا کہ وہ نہ کر سکے؟ پھر فرمایا کہ وہ بدن یا مال سے مدد کرے۔کسی غمگین حاجت مند کی۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہے اگر یہ بھی نہ کر سکے؟ تو فرمایا نیکی کا حکم کرے۔صحابہ نے کہا اگر یہ بھی نہ کر سکے؟ تو فرمایا پھر باز رکھے اپنے آپ کو اور دوسروں کو برائی پہنچانے سے۔یہ بھی اُن کے لیے صدقہ ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ(فینفع نفسہ)اور لوگوں سے نقصان اور تکلیف دور کرے۔

ویتصدق :یعنی جو اس کی ضرورت سے زائد ہو۔

قالو افان لم یستطع أو لم یفعل :راوی کو شک ہے یعنی اگر کام کرنے کی قدرت نہ ہو۔

فیعین ذا الحاجۃ الملھوف: یعنی اس وصف والا یعنی اپنے کسی کام میں پریشان اور غمگین یا کمزور ایسا مظلوم جو مدد کا مستحق ہو اس چیز کا بھی احتمال ہے کہ مدد فعل کے ساتھ ہو جاہ کے ساتھ یا وعظ و نصیحت یا دعا کے ساتھ ہو۔

قولہ قال فیامر بالخیر :امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خیر سے مراد ہے یعنی علمی افادہ اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت۔

قالوا فان لم یفعل قال:نیمسک :یعنی اپنے آپ کو یا لوگوں کو روکے۔عن الشر :علیحدہ ہو جائے یا اور طریقہ اختیار کرے۔

فان لہ صدقۃ :یعنی شر سے اپنے آپ کو روک لینا اپنے نفس پر صدقہ ہے۔یا اس سے مراد اگر اُس نے اپنے آپ کو شر سے روک لیا اس کے لیے صدقہ کی طرح اجر ہے۔

انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہے

١٨٩٦: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ سَلَامٰى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيْهِ الشَّمْسُ يَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ وَيُعِيْنُ الرَّجُلَ عَلٰى دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُ عَلَيْهَا اَوْيَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ وَكُلُّ خَطْوَةٍ يَخْطُوْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ وَيُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٣٢/٦ حدیث رقم ٢٩٨٩۔ ومسلم فی صحیحه ٦٩٩/٢ حدیث رقم (٥٦۔ ١٠٠٩)۔ واحمد فی المسند ٣٢٩/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کے بدن کے ہر جوڑ پر صدقہ ضروری ہے۔ یعنی ان کے مقابلہ میں۔ ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے۔ دو شخصوں کے درمیان عدل کرنا یہ بھی صدقہ ہے اور کسی آدمی کی مدد کرنا' اس کو جانور پر سوار کرا دینا یا اس پر سامان لا د دینا اور اچھی بات کرنا بھی صدقہ ہے اور ہر قدم جو نماز کی طرف اٹھتا ہے صدقہ ہے اور تکلیف دہ چیز کا راستے سے ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: سلامی : ''سین'' کے ضمہ کے ساتھ اور وہ انگلی کی بڑی ہڈی ہے۔

من الناس : یعنی ان میں سے ہر ایک۔

علیه : یعنی ہر جوڑ (ہڈی) پر۔ اس کا معنی یہ ہے لوگوں میں سے ہر ایک پر اس کے اعضاء کے جوڑوں کی تعداد برابر۔

صدقة : جوڑوں پر صدقہ کا واجب ہونا مجازا ہے اور حقیقی طور پر انسان پر واجب ہے۔ اس کی واحد اور جمع برابر ہے۔ اس کی جمع ''سلامیات'' لائی جاتی ہے اور اس سے مراد انسان کے انگلیوں کے درمیانی حصے (جوڑ) ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اعضاء کے ہر جوڑ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے شکر ادا اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ہر اعضاء کے جوڑ پر اُسے پھیلانے اور بند کرنے کی قدرت دی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے انگلیوں کے جوڑ خاص ہیں کیونکہ یہ کھولنے اور بند کرنے میں سب سے عمدہ ہیں۔

كل يوم : ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی ''فی كل يوم''۔

تطلع فيه الشمس : دن کو خاص کرنے کی صفت مطلق وقت سے ہے اس سے مراد دن ہے۔

يعدل : غیب کے صیغہ کے ساتھ اس خطاب کی تقدیر یوں ہے۔ ان يعدل یہ مبتدا ہے۔

بين اثنين : اس کا ظرف ہے اور مبتدا کی خبر ہے۔

صدقة : یعنی وہ عدل کرتا ہے اور دو ناراض ہیں آدمیوں میں صلح کرواتا ہے۔ مظلوم سے ظالم کے ظلم کو ہٹانا دور کرنا صدقہ ہے۔

ويعين الرجل : یعنی آدمی اس کی مدد کرتا ہے۔

على دابته : یعنی آدمی کی اونٹنی یا مدد کرنے والا۔

فيحمل عليها : یعنی اس کو سوار کرتا ہے یا اس کا سامان اپنی اونٹنی پر لادتا ہے

أو يرفع : راوی کو شک ہے۔

عليها متاعه صدقة، والكلمة الطيبة : یعنی مطلق طور پر یا لوگوں کے ساتھ۔

صدقة و كل خطوة : ''خاء'' کے فتحہ کے ساتھ ایک دفعہ گزرنا اور ضمہ کے ساتھ دونوں قدموں کے درمیانی فاصلے کو کہتے ہیں۔

يخطوها الى الصلوٰة : عیادۃ کے لئے جانا، جنازہ میں شرکت کرنا اور طلب علم کے لئے چلنا بھی اس معنی میں۔

صدقة و يميط الاذى : یعنی راستے سے کوئی چیز ہٹاتا ہے مثلاً کانٹے، ہڈی اور گندگی وغیرہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اذی النفس'' سے مراد اپنے آپ سے تکلیف کو دور اتا ہے یا لوگوں سے ہٹانا ہے۔

۱۸۹۷: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُلِقَ كُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْ بَنِيْ اٰدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِ مِائَةِ مَفْصِلٍ فَمَنْ كَبَّرَ اللّٰهَ وَحَمِدَ اللّٰهَ وَهَلَّلَ اللّٰهَ وَسَبَّحَ اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ وَعَزَلَ حَجَرًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ اَوْ شَوْكَةً اَوْ عَظْمًا اَوْ اَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ نَهٰى عَنْ مُّنْكَرٍ عَدَدَ تِلْكَ السِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِ مِائَةِ فَاِنَّهٗ يَمْشِيْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْ زَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه في صحيحه ٦٩٨/٢ حديث رقم (٥٤ - ١٠٠٧)۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ہر آدمی کے اندر تین سو ساٹھ جوڑ ہیں پس جو شخص اللہ اکبر کہے اور اللہ کی حمد بیان کرے اور لا الٰہ الا اللہ کہے اور سبحان اللہ کہے اور استغفار کرے اللہ سے اور دور کرے لوگوں کے راستے سے ہڈی یا کانٹا یا نیکی کا حکم کرے اور بری چیز سے منع کرے اور یہ سب اقوال وافعال تین سو ساٹھ جوڑوں کے بقدر کرے۔ پس اس وجہ سے اس نے اس دن اپنے آپ کو آگ سے دور رکھا ہے۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت: قال رسول الله ﷺ خلق كل انسان من بنى آدم : اس کا بیان فائدہ عموم کے لیے ہے

على ستين و ثلاث مائة مفصل : اضافت کے ساتھ اور یہ ''صاد'' کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو جسم میں دو بڑی ہڈیوں کا نام بن جاتا ہے۔

فمن كبر الله : یعنی اس کو عظیم جانا یا اللہ اکبر کہا۔

وحمد الله : یعنی اس کی ثناء بیان کی اور اس کا شکر ادا کیا۔

وهلل الله : یعنی اس کی وحدانیت بیان کی یا لا الٰہ الا اللہ کہا۔

سبح الله : یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسی صفات سے منزہ قرار دیا جو اس کی شایان شان نہیں ہیں یا اس نے سبحان اللہ کہا۔

واستغفر الله : یعنی توبہ کی یا زبان سے استغفار پڑھا۔

أو شوكة او عظما : أو نوع (اقسام) بیان کرنے کے لیے ہے شاید کہ توبہ کا ذکر نہ کرنا آداب حسن میں سے ہے۔

أو امر معروف، أو نهي عن منكر: یعنی ہاتھ، زبان اور اعضاء کے انکار کے ساتھ۔

عدد تلك: یعنی اس کی تعداد کے برابر یہ منصوب نزع عن الخافض کی بنا پر ہے اس کا تعلق اذکار اور اس کے مابعد کے ساتھ ہے۔ یا فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یعنی جو نیکیوں کے کام ذکر کیے گئے ہیں ان کو ساتھ شمار کیا۔

ثلاث مائة: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "ثلاث" کی اضافت کی گئی اور یہ معرفہ ہے اس کی اضافت مائة کی طرف ہے جو نکرہ ہے۔ انہوں نے عذر یہ کہا ہے کہ لام زائدہ ہے لہٰذا اس کا شمار نہیں ہے۔ اگر اس قول کو اختیار کیا جائے کہ معرفہ اضافت کے بعد ہے جیسا کہ "خمسۃ عشر" میں ترکیب کے بعد ہے تو اس میں دو طریقے ہیں۔ یعنی جس نے ان جوڑوں کی تعداد کی برابر نیکیاں کی اذکار کیئے اس کو کافی ہو جائیں گے۔ فانه يمشي) شین کے نقطوں کے ساتھ۔ یہ قول قاضی کا ہے ایک نسخہ میں بغیر نقطوں کے "یمسی" ہے۔ یہ بحث "ازھار" میں ہے۔ اسی طرح مسلم کی شرح میں ہے یعنی "يمسي امساء" میں سے یا پھر "مشی" سے ہے دونوں صحیح ہیں۔

یو مئذ: یعنی جس وقت وہ یہ کام کرے گا۔

وقد زحزح نفسه: یعنی اس کو اللہ تعالیٰ دور کر دے گا۔

ایک نسخہ میں مفعول کے صیغہ کے ساتھ ہے اور "نفس" مرفوع ہے اور جملہ حالیہ ہے۔

تسبیحات پڑھنا بھی صدقہ ہے

١٨٩٨ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَفِيْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَاْتِيْ اَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا اَجْرٌ قَالَ اَرَاَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ اَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهِ وِزْرٌ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ اَجْرٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٦٩٧/٢ حديث رقم (٥٣۔ ١٠٠٦)۔ واحمد في المسند ١٦٧/٥۔

ترجمہ: حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور ہر تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا اور ہر تحمید الحمد للہ کہنا صدقہ ہے اور ہر تہلیل یعنی لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے اور نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے اور بری بات سے منع کرنا صدقہ ہے اور اپنی بیوی یا لونڈی سے صحبت کرنا صدقہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک آدمی اپنی شہوت دور کرے اور اس کو ثواب ملے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بتاؤ اگر وہ حرام طریقے سے اپنی شہوت پوری کرتا تو اس پر گناہ آ جاتا۔ اسی طرح جب وہ حلال طریقے سے شہوت کو دور کریگا تو اس کو اس میں ثواب ملے گا۔ اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: "كل" اور "صدقة" مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہیں۔

صدقة: امام نووی نے کہا: "صَدَقَةٌ" کو مرفوع جملہ استنافیہ ہونے کی وجہ سے روایت کیا ہے۔ منصوب اِنَّ کے اسم پر

عطف کی وجہ سے ہے۔منصوب پڑھنے کی بنا پر ''كل تكبيرة'' مجرور ہوگا۔عطف دو مختلف عاملوں کی بنا پر ہے۔اور واوٗ ''با'' کے قائم مقام ہے۔

وكل تحميده صدقة و كل تهليلة صدقة: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں ان امور کو صدقہ قرار دیا گیا ہے اس کی مال کے ساتھ تشبیہ اثبات جزاء اور مشاکلت کی بنا پر ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے نفس پر صدقہ ہے۔

وأمر بالمعروف صدقة: یہاں مضاف کو پچھلے پر اعتماد کرتے ہوئے ساقط کر دیا ہے۔یہ قول طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

ونهى عن منكر: ایک نسخہ میں ''منکر'' کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

صدقة: یعنی تیرے ساتھی پر صدقہ ہے اگر نصیحت اور منفعت کا ارادہ ہو خواہ وہ خود اس سے پہلے اس پر کار بند ہو یا نہ ہو۔

وفي بضع أحدكم: باء کے ضمہ کے ساتھ ''الفرج'' ہے۔یعنی تمہارا بیوی سے مجامعت کرنا حلال ہے۔طیبی فرماتے ہیں: لبضع جماع ہے ظرف (جار) کے اعادہ میں اس بات پر دلالت ہے کہ ''باء'' اس قول میں إلكل **تسبيحة صدقة ثابتة** اور یہ بمعنی ''فِيْ'' ہے یہ بعض نسخوں میں وارد ہے اس میں ''باء'' کا اعادہ اس لیے ہے کہ یہ نوع غریب ہے ابن الملک فرماتے ہیں: ''**بضع احدكم**'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تب صدقہ ہے جب اپنے نفس کی عفت، یا بیوی کی عفت یا نیک اولاد کے حصول کا ارادہ ہو۔اگر چہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں اور وہ اسی طرح نفس کے متعلق ہے لیکن اشارہ ظاہر نہیں ہے اسی وجہ سے معنی بھی ظاہر نہیں ہے۔

أياتي أحدنا شهوة اى اليفضيها و يفعلها: یعنی کیا وہ اس کو پورا کرتا ہے اپنے بیوی کے ساتھ۔

أكان فيه: یعنی یہ کام کرنے میں۔

وزرٌ: طیبی فرماتے ہیں: ہمزہ استفہام تقریری کی وجہ سے لایا گیا ہے جو لَوْ کے درمیان کے ہے۔اس کا جواب تاکیداً ہے جو اَرَاَیتُم کی خبر میں پوچھا گیا ہے۔

فكذلك: یعنی اس قیاس پر۔

اذا وضعها في الحلال...... حرام حلال سے زیادہ ہے۔نفس کا میلان حرام کی طرف ہوتا ہے اکثر شادی شدہ بھی یہ لذت حاصل کرتے ہیں چونکہ ہر جدید میں لذت ہوتی ہے۔نفس طبعی طور پر اس کی طرف مائل ہے اور شیطان اس کام کی طرف کوشش کر کے متوجہ کرواتا ہے اور اس میں محنت کم صرف ہوتی ہے۔

كان له أجر: ایک نسخہ میں ''آجرًا'' منصوب ہے۔اجر نفس شہوت کے پورا کرنے میں نہیں ہے بلکہ اس کو اس کے اصل محل میں رکھنے کی وجہ سے ہے۔جیسے کہ عید کے دن افطاری کرنے اور سحری کھانے میں جلدی ہوتی ہے اور ان دونوں کے علاوہ نفسانی شہوات جو امور شرعیہ کے موافق ہوتی ہیں۔اس وجہ سے کہا گیا ہے ''**الهوى اذا صادف الهدى**'' خواہش وہ جب اچانک ہدایت اس کے سامنے آ جائے اسی طرح ہے جیسے شہد کے ساتھ جھاگ ہوتی ہے اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اشارہ ہے: ﴿**ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدىٍ من الله**﴾ [القصص:٥٠] اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے علاوہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے یہ چیز میرے لیے ذکر کا باعث ہے۔واللہ اعلم

بہترین صدقے کی طرف نشاندہی

۱۸۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الصَّدَقَةُ اللِّقْحَةُ الصَّفِیُّ مِنْحَةً وَّالشَّاةُ الصَّفِیُّ مِنْحَةً تَغْدُوْا بِاِنَاءٍ وَّتَرُوْحُ بِاٰخَرَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۰/۱۰ حدیث رقم ۵۶۰۸۔ ومسلم فی صحیحه ۷۰۷/۲ حدیث رقم (۷۴۔۱۰۲۰)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بہترین صدقہ یہ ہے کہ دودھ دینے والی اونٹنی بطور عاریت کے دے۔ دودھ پینے کے لیے اور اچھا صدقہ دودھ دینے والی بکری کو عاریتاً دینا ہے جو صبح کو برتن بھر کر دودھ دیتی ہے اور شام کو بھی برتن بھر کر دودھ دیتی ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: **نعم الصدقة اللقحة الصفی منحه**: لام کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ بھی جائز ہے۔ ایسی اونٹنی جو دودھ والی اور جننے کے قریب ہو۔

الصفی: یہ "اللقحة" کی صفت ہے۔ یعنی خوب دودھ والی۔

میم کے کسرہ کے ساتھ یعنی عطیہ تمیز ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ایک قول یہ ہے منحہ وہ جانور جو کسی فقیر کو ایک مدت تک دودھ پینے کے لیے دے دے پھر وہ فقیر اصل مالک کی طرف لوٹا دے جب اس کی حاجت پوری ہو جائے اور نبی ﷺ کے قول کا یہی معنی ہے۔

المنحة مردودة: ایک قول یہ ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ یہ عاریتاً لیا جاتا ہے پھر پورے اور ایک قول اس کے برعکس ہے۔

والشاة الصفی منحة تغدو...... یعنی صبح کے وقت اس کا دودھ دھویا جاتا ہے اور برتن بھر کر اسی طرح شام کو برتن بھر کر دودھ دھویا جاتا ہے اور یا جملہ استنافیہ ہے جس نے اس کی صفات کے متعلق پوچھا۔ شاید اس وجہ سے بعض عرب سخی اس عطیہ کی مذمت کرتے تھے چونکہ یہ عادتاً شریف لوگوں کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اس کی مدح ان پر رد ہے چونکہ یہ نہ سارا حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ سارا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اور یقیناً تھوڑے کے لیے بہترین اجر اور اچھی مدح ہے۔

زراعت اور درخت لگانا صدقے میں شامل ہے

۱۹۰۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُّسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْیَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْکُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْ طَیْرٌ اَوْ بَهِیْمَةٌ اِلَّا کَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۳۷/۱۰ حدیث رقم ۶۰۰۸۔ ومسلم فی صحیحه ۱۱۸۹/۳ حدیث رقم (۱۲۔۱۵۵۳) والترمذی فی السنن ۶۶۶/۳ حدیث رقم ۱۳۸۲۔ والدارمی ۳۴۷/۲ حدیث رقم ۲۶۱۰۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی کھیتی کاشت کرتا ہے پھر اس

آدمی یا پرندے یا چوپائے کھائیں اگرچہ وہ مالک کی مرضی کے بغیر کھائیں۔ مگر وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے یہ امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یغرس : ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی ''یغوز''۔

غرسا : غین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

أویزرع زرعا: أو نوع بیان کرنے کے لیے ہے شک کے لیے نہیں اور مصدر یہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا مفعول ہے۔

فیأکل منه یعنی جو اُس نے درخت' کھیتی وغیرہ لگائے۔

انسان أو طیر أو بھیمة: یعنی اس کے اختیار کے بغیر۔

الا کانت له صدقة۔ طیبیؒ کہتے ہیں: روایت میں صدقہ۔ رفع کے ساتھ ہے تو اس شکل میں ''کَانَ'' تامہ ہے۔ ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے تو اس شکل میں ضمیر ''ماکون'' کی طرف لوٹے گی اور یہ مؤنث خبر مؤنث کے لیے ہے۔

۱۹۰۱: وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ وَمَاسُرِقَ مِنْهُ لَهُ صَدَقَةٌ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۸۸/۳ حدیث رقم (۷۔۱۵۵۲)۔

ترجمہ: مسلمؒ کی ایک روایت میں' حضرت جابر سے منقول یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور اس میں سے جو کچھ چوری ہو جاتا ہے وہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔''

تشریح: یعنی اُسے ثواب ملے گا جیسے کسی کا صدقہ چوری کر لیا گیا ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمان کا مال کسی بھی طریقہ سے کھایا جائے اُسے ثواب ملے گا اور اس حدیث میں اس کے لیے مال کے نقصان پر صبر کی تلقین ہے اور اس کا اجر بے حساب کے ہے۔

جانور پر احسان کرنے کی وجہ سے بدکار عورت کی بخشش

۱۹۰۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِامْرَاَةٍ مُوْمِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَكِیٍّ یَلْهَثُ كَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَآءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۹/۶ حدیث رقم ۳۳۲۱۔ ومسلم فی صحیحه ۱۷۶۰/۴ حدیث رقم (۱۵۴۔ ۲۲۴۵)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک بدکار عورت کی بخشش کر دی گئی وہ ایک کتے کے قریب سے گزری جو کنویں کے قریب زبان باہر نکالے کھڑا تھا پیاس کی وجہ سے ہلاک ہونے کے قریب تھا۔ پس اس عورت نے اپنا موزہ اُتارا اور اپنی اوڑھنی کے ساتھ باندھا پھر اس کے لیے پانی نکالا۔ اس وجہ سے اس کی بخشش ہو گئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا جانوروں کے ساتھ احسان کرنے پر بھی ثواب ملے گا؟ فرمایا ہر تر جگر پر احسان کرنے سے ثواب ملتا

ہے یعنی جاندار پر احسان کرنے سے ثواب ملتا ہے اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مومسة: دوسری ''میم'' کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ یعنی فاجرہ۔

على رأس ركى: یعنی کنویں پر۔ ایک قول یہ کہ وہ کنواں ویران تھا۔

یلهث: ''لھث'' سے مراد جب کتا پیاس اور سختی کی وجہ سے زبان نکالتا ہے۔

بخمارها: رسی اور ڈول کی جگہ پر۔

فنزعت: یعنی ان کو کھینچا۔

له: یعنی کتے کے لیے۔

من الماء: یعنی کنوئیں کا پانی۔

فغفر لها بذلك: خبر کی تاکید ہے۔

قيل إن: حرف اِستفہام محذوف ہے أإنّ۔

ذات كبد رطبة: یعنی تمام حیوان۔

کہا گیا ہے: اس کا تعلق چیز کے وصف کے ساتھ ہے جس کی طرف اس کو لوٹایا جاتا ہے یعنی کوئی جگر (ی روح) اس کو پانی پلانے والا تر کرتا ہے وہ دوبارہ تر (زندہ) ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ''كبد'' کے ساتھ ''حرى'' بھی آتا ہے جو کہ ''حیران'' کی تانیث ہے۔

مظہر کہتے ہیں۔ ہر حیوان کو کھلانے پلانے پر اجر ہے سوائے اس کے جن کے قتل کا حکم دیا گیا ہے جیسے سانپ اور بچھو وغیرہ۔ ابن الملک فرماتے ہیں: اس حدیث میں دلیل ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف ہو گیا اور یہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے حدیث میں نیکی پر جو فائدہ ہے اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اگرچہ وہ نیکی معمولی ہو۔

چھوٹی سی برائی کو حقیر نہ جانو

١٩٠٣: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِيْ هِرَّةٍ أَمْسَكَتْهَا حَتّٰى مَاتَتْ مِنَ الْجُوْعِ فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَأْكُلَ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٣٥٦/٦ حديث رقم ٣٣١٨۔ ومسلم فی صحيحه ١٧٦٠/٤ حديث رقم (١٥١ ـ ٢٢٤٢) واخرجه ابن ماجه فی السنن ١٤٢١/٢ حديث رقم ٤٢٥٦۔ والدارمی ٤٢٦/٢ حديث رقم ٢٨١٤۔ احمد فی المسند ٥٠٧/٢۔

ترجمہ: سیدنا ابن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اس سبب سے عذاب دیا گیا کہ اس نے بلی کو باندھے رکھا اور اسی حالت میں وہ بھوک کی وجہ سے مر گئی۔ وہ عورت اس بلی کو نہ کھلاتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ زمین کے جانوروں کو کھا لے۔ یعنی چوہا وغیرہ۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عذبت امرأة فی هرة ای فی شأنها وبسببها ولأجلها: یعنی اس بلی کی [illegible]

اس میں "فِیْ" علت کے لیے ہے۔

أمسكتها: یعنی اس کو عورت نے باندھے رکھا اور شکار نہ کرنے دیا۔

کہا گیا ہے کہ یہ چھوٹی سی غلطی اور نافرمانی ہے اگر اُس پر اصرار کیا جائے تو کبیرہ ہو جائے گی یہ قول ابن الملک کا ہے۔اس میں ایک اعتراض ہے کہ حدیث میں اس کے اصرار پر دلالت نہیں ہے۔سزا (عذاب) چھوٹے گناہ ہونے پر بھی ہے جیسا کہ عقائد میں ہے اگر چہ اس کا مرتکب کبیرہ گناہوں سے بچے یا نہ بچے۔یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت ہے ﴿ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النساء: ٤٨] یہ قول معتزلہ کے خلاف ہے۔اس میں ہے کہ جب کبیرہ سے اجتناب کیا جائے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر قول ہے:﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ [النساء: ٣١] اس قول کے متعلق اہل سنت کے ہاں کئی جوابات ہیں جن کا بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔

فلم تكن تطعمها ولا ترسلها فتأكل: منصوب ہے چونکہ نفی کے جواب میں ہے۔

من خشاش الارض: "خا" کے فتحہ کے ساتھ۔کسرہ اور ضمہ بھی جائز ہے یعنی اس کے کیڑے مکوڑے اور حشرات وغیرہ۔اس میں (حدیث میں) گناہ کا حکم بہت بڑا ابتلایا گیا ہے اگر چہ وہ گناہ صغیرہ ہی ہو۔

راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا دخولِ جنت کا باعث ہے

۱۹۰۴: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ فَقَالَ لَاُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٣٩/٢ حديث رقم ٦٥٢۔ ومسلم في صحيحه ٢٠٢١/٤ حديث رقم (١٢٧۔ ١٩١٤)۔ وابن ماجه في السنن ١٣١٤/٢ حديث رقم ٣٦٨٢۔ واحمد في المسند ٣٠٤/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ایک شخص درخت کی ٹہنی کے پاس سے گزرا جو راستے کے اوپر تھی۔پس اس نے کہا میں مسلمانوں کے راستے سے البتہ ٹہنی کو دور کر دوں گا۔تا کہ مسلمانوں کو تکلیف نہ ہو۔پس اس کو اس عمل کی وجہ سے جنت میں داخل کر دیا گیا۔اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علی ظهر طريق: یعنی اس راستہ کے درمیان میں نہ کے ایک جانب۔

لانحين: "حا" کی شد کے ساتھ یعنی میں دور کروں گا۔

لا يوذيهم: رفع کے ساتھ۔چونکہ جملہ استنافیہ ہے اور اس میں علت کا معنی ہے یعنی تا کہ ان کو تکلیف نہ پہنچائے۔

فأدخل: ماضی مجہول۔

الجنة: منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول ثانی ہے یعنی اس نے اس درخت کو راستے سے دور کر دیا اور وہ اس وجہ سے جنت میں داخل کر دیا گیا۔اسی طرح بعض لوگوں کا قول ہے۔طیبیؒ کہتے ہیں: صرف نیک نیت ہی جنت میں داخلے کے لیے ممکن ہے چاہے اس چیز کو نہ ہٹائے اگر چہ اس نے (آدمی نے) اس کو ہٹا دیا تھا۔

۱۹۰۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ رَأَيْتُ رَجُلاً يَتَقَلَّبُ فِي الْجَنَّةِ فِيْ شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِيْقِ كَانَتْ تُؤْذِي النَّاسَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٢١ حديث رقم (١٢٩۔ ١٩١٤)۔ واحمد في المسند ١٥٤/٣۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو جنت میں پھرتا تھا (امن وسکون سے) کیونکہ اس نے ایک ایسے درخت کو کاٹ ڈالا تھا جو راستے پر تھا اور لوگوں کو تکلیف پہنچاتا تھا۔'' (مسلم)

تشریح: في شجرة قطعها (یہاں مضاف محذوف ہے) ای فی شانها۔ اور (من ظهر الطريق) "فِيْ" کی علت بیان کرنے کے لیے ہے یعنی اس کے سبب اور علت کی وجہ سے۔

كانت تؤذي الناس: یعنی وہ (لوگ) اس درخت کی وجہ سے اذیت میں تھے۔ اس میں مبالغہ ہے کہ تکلیف دہ چیز کو قتل کرنا یا اس کو زائل کرنا کسی طریقے سے ہو۔

تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا نفع سے خالی نہیں ہے

۱۹۰۶: وَعَنْ أَبِيْ بَرْزَةَ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ شَيْئًا أَنْتَفِعُ بِهٖ قَالَ اِعْزِلِ الْأَذٰى عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ اِتَّقُوا النَّارَ فِيْ بَابِ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

اخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٠٢١ حديث رقم (١٣١۔ ٢٦١٨)۔ وابن ماجه في السنن ١٢١٤/٢ حديث رقم ٣٦٨١۔ واحمد في المسند ٤٢٢/٤۔

ترجمہ: حضرت ابی برزہؓ سے روایت ہے میں نے کہا اے اللہ کے نبی مجھے کوئی ایسی چیز سکھلائیں جس سے میں نفع حاصل کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تکلیف دینے والی چیز کو مسلمانوں کے راستے سے ہٹا دو۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ ہم عدی بن حاتم کی حدیث کو علاماتِ نبوت کے باب میں ذکر کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس کا آغاز اِتَّقُوا النَّارَ سے ہے۔

تشریح: علمني شيئا انتفع به: مجزوم جواب امر کی وجہ سے ہے۔ اگر مرفوع پڑھیں تو کسی چیز کی صفت ماننا پڑے گا۔ یعنی أنتفع بعمله۔

قال أعزل الاذى عن طريق المسلمين: کہا گیا ہے کہ وہ کبار صحابہ کرام میں سے ہیں۔ اس میں ایمان کی ادنیٰ شاخ سے اعلیٰ کی طرف تنبیہ کی گئی ہے یعنی نیکی کا کوئی کام نہ چھوڑ۔ میں کہتا ہوں۔ اس حدیث کا معنی اس حدیث کی طرح ہے (المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده) اور دوسری حدیث (لا يومن احدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه) کہا گیا نفس کی تکفیل یا صرف تکلیف وہ نفس کی خواہش ہے اور نفس ہی خیر وشر کا منبع وماویٰ ہے۔ بعض نے کہاں جودرا ذنب تیر سخاوت گناہ اس کے ساتھ گناہ کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔ اس میں اشارہ ہے کہ پرہیز دوا کے استعمال سے اولیٰ ہے۔

و سنذكر حديث عدى بن حاتمؓ اتقوا النار ولو بشق تمرة فإن لم تجدوا فبكلمة طيبة۔

"شق تمرة" کا مطلب اس کے نصف کے ساتھ معنی یہ ہے کہ اس (آگ) کو اپنے نفسوں سے نیکیوں کی وجہ سے دور ہٹاؤ چاہے اس سے بچنا کھجور کا بعض حصہ صدقہ کر کے ہی ہو یعنی صدقہ کو کم نہ کرو۔

فان لم تجدوا فبکلمة طیبة : یعنی اس کے ساتھ مسلمان کا دل پاک صاف ہوتا ہے۔

یا از قبیل اذکار کوئی کلمہ چونکہ یہ بمنزلہ صدقہ فقیر کے ہے۔

فی باب علامات النبوة ان شاء الله تعالٰی : یعنی ایک حدیث طویل کے ضمن میں اگر چہ اس باب میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن اس کے لفظ ہیں: فمن لم یجد فبکلمة طیبة : اگر وہ کوئی چیز نہ پائے تو اچھا کلمہ کہے۔ صاحب المصابیح بعض حدیث لائے ہیں یا مکمل حدیث جو یہاں اس باب سے مناسبت رکھتی ہے۔ مؤلف نے ان کو تکرار سمجھا اور ساقط کر دیا اور اس باب میں اس حدیث کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الثانی:

اخلاقِ حسنہ کی تعلیم

۱۹۰۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ جِئْتُ فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ وَجْهَهٗ عَرَفْتُ اَنَّ وَجْهَهٗ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ فَكَانَ اَوَّلُ مَا قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٦٢/٤ حدیث رقم ٢٤٨٥۔ وابن ماجه ٤٢٣/١ حدیث رقم ١٣٣٤۔ والدارمی ٤٠٥/١ حدیث رقم ١٤٦٠۔ واحمد فی المسند ٤٥١/٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے۔ تو میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا میں نے حضور ﷺ کا چہرہ دیکھا تو میں نے فوراً جان لیا کہ یہ چہرہ جھوٹے آدمی کا نہیں ہے پس آپ ﷺ کا سب سے پہلا کلام یہ تھا کہ اے انسانو! سلام کو عام کرو اور بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور رشتے داروں سے اچھا سلوک کرو اور رات کو نماز پڑھو اس حال میں کہ لوگ سو رہے ہوں۔ یعنی تہجد کی نماز پڑھو۔ عذاب سے سلامتی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو گے۔ اس کو امام ترمذیؒ، ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: فلما تبینت وجهه: یعنی میں نے آپ کے چہرے کو دیکھا چمکتا ہوا۔ یا یہ کہا گیا کہ میں نے غور کیا تو فراست اور کچھ نشانیاں آپ کی پیشانی پر دیکھیں۔

بوجه کذاب: اضافت کے ساتھ اگر اس پر تنوین پڑھی جائے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جھوٹے چہرے والا نہیں۔ ظاہر باطن پر عنوان (دلیل) ہے۔

أول :ماقال: رفع اور نصب کے ساتھ

یا أیها الناس : خطاب عام ہے اور جامع کلمات کے ساتھ مخلوق اور حق والوں کو مخاطب کیا ہے۔

أفشو السلام : یعنی اس کو ظاہر کرو اور جن کو تم پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے ان پر عام کرو۔
واطعموا الطعام : یعنی مساکین اور یتیموں کے لیے۔
وصلو الارحام : یعنی اگرچہ سلام کے ساتھ ہو۔
وصلوا بالليل : یعنی رات کے شروع میں یا آخر میں۔
والناس ينام : چونکہ یہ غفلت کا وقت ہے اور اللہ کے حضور پیش ہونے کا وقت ہے یا ریا اور سمعۃ سے بچنے کا وقت ہے۔
تدخلوا الجنة بسلام : یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے کسی سختی یا مشقت وغیرہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

۱۹۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَاَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٢٥٣/٤ حدیث رقم ١٨٥٥۔ وابن ماجه ١٢١٨/٢ حدیث رقم ٣٦٩٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رحمان کی بندگی کرو' کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کرو' جنت میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ گے۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''اعبدوا الرحمن'' جس یعنی جنہوں نے تمہیں قرآن پاک سکھایا۔

صدقہ ربّ کی ناراضگی کو دور کر دیتا ہے

۱۹۰۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِىءُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٢/٣ حدیث رقم ٦٦٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ ربّ کے غضب کو دور کر دیتا ہے اور مرتے وقت بری حالت کو دور کر دیتا ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یعنی حال میں بری آفتوں اور آزمائشوں کو روکتا ہے اور برے خاتمے کو دفع کرتا ہے۔ المیتۃ کسرہ کے ساتھ اس کی اصل ''موِتۃ'' واؤ کو یاء میں تبدیل کیا جو کہ ساکن تھی اور ماقبل کو کسرہ دے دیا۔ انسان کی یہ وہ حالت ہے جو موت کے وقت ہوتی ہے۔ لفظ ''سوء'' سین کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ اس سے مراد یہ ہے کہ جو آفت سے محفوظ نہ ہو اور اس کا انجام اچھا نہ ہو۔ جیسا کہ انتہائی رسوا کن فقر، طوفانی بارش اور قید میں جو انسان کو نعمتوں کے انکار تک پہنچا دیتی ہیں اور آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بھول جاتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اچانک موت جیسے زندہ جل جانا، پانی میں ڈوب جانا دیوار کے نیچے آ جانا یا اس جیسی اور علتیں اور سبب ہیں۔ میرک کے حاشیہ میں شارح کہتے ہیں پہلی مراد ''ميتة بالسوء'' سے وہ حالت جو انسان پر موت کے وقت ہوتی ہے جیسے انتہائی فقر و فاقہ کے وقت، طوفانی بارش، انتہائی سخت تکلیف اور زنجیریں (قید وغیرہ) جو انسان کو کفرانِ نعمت تک پہنچا دیتی ہیں۔ وہ خطرات جو اس کو درپیش ہیں اور اچانک موت وہ مایوس کو اچانک پکڑتی ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: انہوں نے مظہر سے نقل کیا ہے اس کی مراد وہ تعوذ (پناہ مانگنا) ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے:

اللّٰھم أنی اعوذبك من الھدم، و اعوذبك من التردی و من الغرق والحرق والھرم و اعوذبك من ان یتخبطنی الشیطان عند الموت و اعوذبك من أن أموت فی سبیلك مدبرا و اعوذبك من ان اموت لدیغا۔

پھر فرمایا: غصے کا نہ آنا حرام کام پر دنیا میں کسی مصیبت کی نازل پر اس کو محمول کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ "**لا یرد القضا الاالصدقة**" "**قفئا**" (تقدیر) کو صدقہ لوٹا دیتا ہے۔ بڑی موت جس کا اختتام بڑا ہو۔ آخرت میں مذہب میں تخفیف جیسا کہ حدیث میں وارد ہے (**الصدقة تطفی الخطیئة**) صدقہ برائیوں کو مٹا دیتا ہے۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ اس کا تعلق باب اطلاق السبب علی المسبب سے ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ مکروہ کی نفی اس کی ضد سے ثابت ہوتا ہے اس کے برعکس زیادہ بلیغ ہے گویا کہ غضب کی نفی سے اس نے رضا کا ارادہ کیا۔ میری موت کی تنگی گویا کہ اس نے دنیا میں اچھی زندگی کا ارادہ کیا اور آخرت میں اچھے انجام کا سوچا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [النحل: ۹۷] "اور (آخرت میں) ان کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔"

کسی مسلمان سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا صدقہ ہے

۱۹۱۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ وَاِنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ وَاَنْ تُفْرِغَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ اِنَاءِ اَخِيْكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٣٠٦/٤ حدیث رقم ١٩٧٠۔ واحمد فی المسند ٣٤٤/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صدقہ نیکی ہے اور منجملہ نیکیوں کے یہ ہے کہ تو مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈال دے۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **کل معروف صدقة**: یعنی شرع میں یا ہر نیکی جو تو اپنے ساتھ کرے یا دوسرے کے ساتھ۔

صدقة و إن من المعروف بوجه طلق۔

بوجه: تنوین کے ساتھ۔

طلق: "طاء" کے فتحہ اور "لام" کے سکون کے ساتھ۔ ایک قول یہ کہ "طاء" کو تینوں حرکتیں اور "لام" کو سکون، فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے **طَلِيق**: یعنی ہنسنے والا کھلے چہرے والا۔

وأن تفرغ: افراغ سے ہے یعنی تو ڈالے۔

تا کہ وہ پانی کی طلب کا محتاج نہ رہے۔ یا ڈول کو ضرورت نہ رہے۔

محمد بن منکدر عن جابر کی سند سے امام ترمذی نے کہا حدیث حسن صحیح ہے۔ اسی طرح اس کو جزری نے نقل کیا ہے۔ ترمذی

کے اکثر نسخوں میں فقط حَسَنٌ کے الفاظ ہیں اور اس سند میں منکدر بن محمد بن المنکدر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ذہبی نے کہا: اس سند میں کمزوری ہے امام احمد نے اس کی توثیق کی ہے اور اسی طرح میرک نے ذکر کیا ہے۔

صدقے کی تفصیل

۱۹۱۱: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَبَسُّمُكَ فِیْ وَجْهِ اَخِیْكَ صَدَقَةٌ وَاَمْرُكَ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْیُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَاِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِیْ اَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ وَنَصْرُكَ الرَّجُلَ الرَّدِیَّ الْبَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِمَاطَتُكَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِیْقِ لَكَ صَدَقَةٌ وَاِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِیْ دَلْوِ اَخِیْكَ لَكَ صَدَقَةٌ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۹/٤ حدیث رقم ۱۹۵٦۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے تیرا بھائی کے سامنے مسکرانا صدقہ ہے اور تیرا نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے اور تیرا بری بات کو منع کرنا صدقہ ہے اور تیرا کسی کو راستہ بتادینا صدقہ ہے یعنی جس زمین میں کوئی راستے کا نشان نہ ہو اور لوگ اس میں راستہ بھول جاتے ہوں اس میں کسی بھولے ہوئے کو راستہ بتادینے پر صدقے کا ثواب ملتا ہے اور تیرا مدد کرنا یعنی اندھے کو پکڑ کر لے جانا یا کم عقل والے کو یہ بھی صدقہ ہے اور راستے سے پتھر' کانٹے اور ہڈی کو دور کر دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے برتن سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالنا بھی صدقہ ہے۔ اسے امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: صدقة: یعنی اس کے ساتھ نیکی ہے یا تیرے لیے اس میں صدقے کا ثواب ہے۔

وأمرك بالمعروف صدقة ونهيك عن المنكر صدقة: صدقات کے مختلف مراتب ہیں۔

وإرشادك الرجل في ارض الضلال: الضلال کی طرف اضافت گویا کہ وہ اس کے لیے پیدا کی گئی۔ یہ وہ علاقہ ہوتا ہے جس میں راستے کی نشان دہی یا علامت نہ ہو اور آدمی وہاں گم ہو جائے۔

لك صدقة: اس میں آپ کے لیے زید قرینہ ہے اور جو بعد میں ہے وہ اختصاص کے لیے ہے۔

ونصرك: یعنی تیرا مدد کرنا۔

الرجل الردی البصر: همزه اور ادغام کے ساتھ۔ یعنی وہ شخص جو نابینا ہے یا جس کو بہت کم نظر آتا ہے۔

لك صدقة: لفظ "نصر" کو "قیاد" کی جگہ لانا مدد میں مبالغہ ہے۔ گویا کہ وہ ہر اُس چیز پر مددگار بنے جو اُسے تکلیف دے۔

وإماطتك: یعنی تیرا اس کو ہٹادینا۔

الحجر والشوك والعظم: یعنی اس جیسی دوسری چیزیں۔

عن الطريق: یعنی مسلمانوں کے راستہ سے۔

لك صدقة وافراغك: یعنی تیرا پانی ڈالنا۔

من دلوك في دلو أخيك : یعنی پانی کا بعض حصہ۔

لك صدقة : لہٰذا جب تیرے بھائی کے پاس ڈول ہی نہ ہو (تو کیا اس صورت میں صدقہ کرنا لازم نہ ہوگا؟) یا تو اپنے ڈول سے اس کو پانی دے۔

کنواں کھدوانا اور ضرورت مند کو ضرورت کی چیز مہیا کر دینا بھی صدقہ ہے

۱۹۱۲: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمَّ سَعْدٍ مَاتَتْ فَاَيُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ قَالَ الْمَاءُ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ۔ (رواہ ابو داود والنسائی)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۲/ ۳۱۳ حديث رقم ۱۶۷۹۔ والنسائي ۶/ ۲۵٤ حديث رقم ۳٦٦٤۔ وابن ماجه في السنن ۲/ ۱۲۱٤ حديث رقم ۳٦٨٤۔

ترجمہ: حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہنے لگے اے اللہ کے رسولؐ! میری ماں مر گئی ہے تو کونسا صدقہ بہتر ہے اُس کی روح کے لیے؟ فرمایا: پانی۔ پس سعدؓ نے کنواں کھدوایا اور فرمایا یہ کنواں سعدؓ کی ماں کے لیے صدقہ ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد اور نسائی نے نقل کی ہے۔

تشریح: قال : الماء: پانی افضل ہے چونکہ اس کا دینی اور دنیوی امور میں نفع نام ہے خصوصاً گرم علاقوں میں۔ اس وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ [الفرقان: ٤٨] جیسا کہ اس کو طیبی نے ذکر کیا ہے وہاں افضلیت کی وجہ سخت گرمی کی ضرورت اور پانی کی کمی ہے۔

فحفر : یعنی سعد نے ایک نسخہ میں اس نے کہا: یعنی راوی نے عن سعد محفر۔

بئرا : ہمزہ کے ساتھ اور کبھی ہمزہ کو ''یا'' میں بدل دیا جاتا ہے۔

لام سعد: میرکؒ فرماتے ہیں: ابوداؤد نے ''من طريق أبي اسحاق السبيعي ، عن رجل عن سعد بن عبادة'' روایت کیا ہے ان الفاظ کے ساتھ۔ اس میں رجل مجہول ہے: وروى ايضا من طريق سعيد بن المسيب کہ سعد وہ سعد بن عبادہ ہیں وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور سوال کیا۔ کون سا صدقہ آپ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے آپ نے کہا الماء پانی (کنواں) اسی سند سے امام نسائی نے روایت بیان کی ہے اور ابن حبان نے بھی اسی سند سے روایت بیان کی ہے۔ ابوداؤد نے سعید بن میسب اور حسن بصری کی سند بیان کیا ہے وہ دونوں سعد بن عبادۃ سے بیان کرتے ہیں یہ سند منقطع ہے۔ چونکہ سعید بن میسب اور حصن بصری نے سعد بن عبادہ کو نہیں پایا (ان سے نہیں ملے)۔

ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے پر جنت کا وعدہ

۱۹۱۳: وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرًى كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ

وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَإٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيقِ الْمَخْتُوْمِ۔ (رواہ ابو داود والترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ٣١٤/٢ حديث رقم ١٦٨٢۔ والترمذی فی السنن ٥٤٦/٤ حديث رقم ٢٤٤٩۔ واحمد فی المسند ١٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مسلمان کسی مسلمان کو ننگے حالت میں کپڑا پہنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے سبز لباسوں سے لباس پہنائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو کھلائے گا۔ اللہ اس کو بہشت (جنت) کے میووں سے کھلائے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کو پیاس پر پانی پلائے گا۔ اللہ اس کو مُہر لگی ہوئی شراب پلائیں گے۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله : ایما مسلمًا ...... من خضر الجنة : ایما مسلمًا) ما زائدہ ہے اور "ای" مبتدا کی وجہ سے مرفوع ہے۔

کسا: یعنی پہنایا۔

"عری" پہلے ضمہ اور سکون کے ساتھ۔ اس کی عریانی حالت میں عریانی کی وجہ سے تاکہ یہ تکلیف اس سے دور ہو جائے۔ اور شرم گاہ سمیت تمام اعضاء کو شامل ہے۔

من خضر الجنة : یعنی سرسبز کپڑے جنت میں سے یہ "خضر" "اخضر" کی جمع ہے باب افعال سے اور یہ صفت کو موصوف کے قائم مقام کرنے کی قبیل ہے۔ اس بات کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی اشارہ ہے۔ یلبسون ثیابا خضرا۔ وہ سرسبز لباس پہنیں گے۔ ترمذی کی روایت میں ہے جنت کے عمدہ پوشاکوں میں سے پہنیں گے۔ امام منذری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے اس میں کوئی تعارض نہیں۔

قوله : اطعمه الله من ثمار الجنة : اس میں اشارہ ہے کہ جنت کا پھل وہاں کی کھانے والی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے۔

أیما مسلم سقی مسلمًا علی ظمأ : دونوں پر فتحہ ہے اور اس کو بغیر کھینچے پڑھتے ہیں اور کبھی کبھی "مد" کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور کبھی کبھی جملہ وہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ یعنی پیاسا۔

الرحیق المختوم : یعنی جنت کی شراب رحیق شراب کی ایک قسم ہے ایسی خالص شراب جس میں نشہ نہیں ہے۔ "مختوم" وہ سیل بند ہے اس کی وجہ سے وہ خراب نہیں ہوگی اور جو اس کے اہل نہیں ہوں گی ان کو نہیں ملے گا۔ اور یہ اس کے عمدہ و نفیس ہونے پر دلالت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ کستوری کی ہوگی نا کہ مٹی اور موم وغیرہ سے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: اس شراب کے برتن سیل بند ہوں گے اس نفاست اور عمدگی کی وجہ سے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ جو اس کا آخری ذائقہ ہوگا وہ کستوری کی خوشبو کا ہوگا جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے: ختمت الكتاب۔ یعنی شروع سے آخر تک مکمل کی۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے۔ **يسقون من رحيق مختوم ختامه مسك** [المطففین: ٢٥۔٢٦] ایک دوسرا معنی جس کا تعلق ارباب ذوق کے ساتھ ہے "ختم الاوانی" کا معنی یہ برتن ان کے لیے ممنوع ہیں جو

جنت کے لائق نہیں وہ: جنت لامقطوعة ولاممنوعة۔ [محمد:۱۵]

وفیها انهار من ماء غیر أسن وانهار من خمر لذة بالشاربین۔ [الواقعه:۳۳]

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ۔ [الزخرف:۷۱]

زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں دوسروں کا حصہ ہے

۱۹۱۴: وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِى الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ ثُمَّ تَلَا لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۸/۳ حدیث رقم ۶۵۹۔ وابن ماجه ۵۷۰/۱ حدیث رقم ۱۷۸۹۔ والدارمی ۴۷۱/۱ حدیث رقم ۱۶۳۷۔

ترجمہ: قیس کی بیٹی فاطمہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: البتہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ صرف یہی نیکی نہیں کہ اپنے چہرے کو مشرق و مغرب کی طرف پھیرلو۔ اس کو امام ترمذی، ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :إن فی المال لحقا سوی الزکاة : اس کی صورت یہ ہے کہ سائل اور قرض مانگنے والے کو محروم نہ کرے اور نہ روکے اپنے گھر کا مال عاریۃً مانگنے والے سے جیسے ہنڈیا و بڑا پیالہ یا ان دونوں جیسی کوئی چیز۔ کسی کو پانی، نمک اور آگ کے استعمال سے نہ روکے۔ اس کو طیبیؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ حق سے مراد وہی ہے جو آیت ''بر'' میں مذکور ہے زکوٰۃ کے علاوہ صلہ رحمی کرنا اور یتیم، مسکین مسافر اور سائل کے ساتھ بھلائی کرنا۔ اور قیدیوں کو آزاد کرو (انا ثم تلا) یعنی بطور استشہاد آیت پڑھی۔

البر: رفع اور نصب کے ساتھ۔

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [البقرہ:۱۷۷] ''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اور جب عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں'' طیبیؒ کہتے ہیں: وجہ استشہاد یہ کہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اولاً ان طریقوں میں خرچ کرنے کا ذکر کیا پھر ان کو زکوۃ دینے کا ذکر کیا یہ اس بات پر

دلالت ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے۔ایک قول ہے کہ حق دو قسم کے ہیں پہلا: وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر واجب کرتے ہیں۔ دوسرا حق وہ ہے جو انسان اپنے اوپر لازم کرتا ہے تا کہ اپنے نفس کا تزکیہ کر کے اپنی اس جبلت سے بچ جائے جو بخل کی انسان میں پائی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستفاد ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾[البقرہ۔۱۷۷] ”وہ اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں جب وہ وعدہ کریں“۔

یعنی جب وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کریں مثلاً نذر مان کر جس کو اپنے اوپر واجب کر لیں ان کو پورا کرنا شرعی لحاظ سے درست ہے۔عرف میں اس کو کہتے ہیں کہ اس کی وفا مشہور ہے وہ اس کو پورا کرتا ہے۔ میرک فرماتے ہیں: ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے چونکہ اس حدیث میں انقطاع ہے میرکؒ ہی کہتا ہے: صحیح بات ہے کہ یہ شعبی کا قول ہے۔

عام ضرورت کی چیزوں سے منع نہیں کرنا چاہیے

۱۹۱۵: وَعَنْ بُهَيْسَةَ عَنْ اَبِيْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ لَا يَحِلُّ مَنْعُهُ قَالَ الْمَاءُ قَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ لَا يَحِلُّ مَنْعُهُ قَالَ الْمِلْحُ قَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ مَا الشَّيْءُ الَّذِىْ يَحِلُّ مَنْعُهُ قَالَ اَنْ تَفْعَلَ الْخَيْرَ خَيْرٌ لَّكَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۵۰/۳ حديث رقم ۳٤۷٦۔ واحمد فی المسند ٤۸۰/۳۔ والدارمی فی السنن ۳٤۹/۲ حديث رقم ۲٦۱۳۔

ترجمہ: حضرت بہیسہؓ نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ بہیسہؓ کے باپ نے کہا یا رسول اللہ! کیا کوئی ایسی چیز ہے جس کا روکنا اور نہ دینا حلال نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ پانی ہے اس نے کہا اے اللہ کے نبی اور کیا چیز ہے جس کو روکنا حلال نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ نمک ہے۔انہوں نے کہا اللہ کے نبی اور کوئی چیز ہے کہ جس کا منع کرنا حلال ہے؟ فرمایا تیرا نیکی کرنا بہتر ہے تیرے لیے۔اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

بہیسہ: ”باء“ کے ضمہ اور ”ھا“ کے فتحہ کے ساتھ۔وہ صحابیہ ؓ ہیں۔مؤلف نے اس کا ذکر کیا ہے۔

تشریح: قال : الماء : یعنی جب پانی کے مالک کو اس کی ضرورت نہ ہو مطلقاً پانی دینے کا حکم دیا عام طور سے طاقی کثیر ہونے کی وجہ سے ہے۔

قال الملح : چونکہ لوگوں کو اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور عرف میں اس کا بہت استعمال ہے۔

یا نبی الله ما الشیء الذی لا یحل منعه : یعنی اس کے بعد۔

قال أن تفعل الخیر : جملہ مصدریہ ہے یعنی نیکی کے تمام کام کرنا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس پر دال ہے : ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۷] ”جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا“۔نیکی کو روکنا تیرے لئے جائز نہیں۔یہ عموم تخصیص کے بعد ہے۔اس قول میں اس بات کی طرف

اشارہ ہے کہ "لا یحل" لا ینبغی کے معنی میں ہے۔

اسنادی حیثیت: میرک فرماتے ہیں: اس روایت میں سکوت ہے اور منذری نے اس کو صحیح کہا ہے حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے۔

خشک زمین کو آباد کرنا صدقہ ہے

۱۹۱۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَلَهُ فِيْهَا اَجْرٌ وَمَا اَكَلَتِ الْعَافِيَةُ مِنْهُ فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۳/۴۵۴ حدیث رقم ۳۰۷۴۔ والترمذی فی السنن ۳/۶۶۳ حدیث رقم ۱۳۷۹۔ والدارمی ۲/۳۴۶ حدیث رقم ۲۶۰۷۔ ومالک فی الموطأ ۲/۷۴۴ حدیث رقم ۲۷ من کتاب الاقضیۃ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص بنجر زمین میں کھیتی کرے یعنی آباد کرے۔ پس اس کے لیے اس کے آباد کرنے میں ثواب ہے اور جو کچھ جانور یا آدمی اس سے حاصل ہونے والی چیزوں کو کھالیں۔ تو وہ اس کے لیے صدقہ ہو جائے گا۔ (دارمی)

تشریح: العافیۃ: اور وہ ہر طالب رزق ہے خواہ وہ انسان ہو جانور ہو یا پرندے۔ اور یہ عفوتہ سے ہے یعنی میں اس کے پاس آیا تاکہ کچھ خیر مانگوں۔ اور عافیۃ الماء: سے بھی ہو سکتا ہے ارادہ کرنے کے معنی میں بعض روایات میں "العوافی" یعنی رزق کے طلبگاروں نے اس سے کھایا۔

منہ: یعنی زمین کھیتی سے خواہ اس کو کھایا جائے یا نباتات میں سے ہو۔

یعنی زمین کی پیداوار میں سے کچھ کھالیں یا اس کی نباتات میں سے کچھ کھالیں۔

ایک نسخہ میں ہے۔ رواہ الدارمی۔ پہلا قول میرک کا کے قول کی وجہ سے صحیح ہے۔ میرک قول یہ ہے: دونوں نے اس سند سے روایت بیان کی ہے: عن ھشام بن عروۃ عن عبد اللّٰہ بن عبد الرحمن بن رافع عن جابر۔ یہ قول شیخ جزری کا ہے۔

کسی کو چیز عاریتاً دینا بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں ہے

۱۹۱۷: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَنَحَ مِنْحَةَ لَبَنٍ اَوْوَرَقٍ اَوْهَدٰى زُقَاقًا كَانَ لَهُ مِثْلُ عِتْقِ رَقَبَةٍ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۴/۳۰۰ حدیث رقم ۱۹۵۷۔ واحمد فی المسند ۴/۲۸۵۔

ترجمہ: حضرت براء سے روایت ہے۔ جو شخص کسی کو جانور دودھ کے لیے عاریتاً دے یا قرض دے یا چاندی دے۔ یعنی پیسہ روپیہ وغیرہ یا بھولنے والے کو راستہ بتلائے یا نابینے کو گلی بتائے اس کے لیے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: منحۃ لبن: اس کا معنی پیچھے گزر چکا ہے۔ اس میں اضافت بیانیہ ہے اس طرح ہی کہا گیا ہے۔ اکیلے منحہ

میں مطلق عطیہ کا معنی ہے تاکہ عطف درست ہو۔ اس قول کے ساتھ (أو ورق) را کے کسرہ اور سکون کے ساتھ اور یہ درہموں کے قرض کو کہتے ہیں کیونکہ منحہ اس مانگے کی چیز کو کہتے ہیں جس کو واپس کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے "الصلة" یعنی جس نے کوئی عطیہ دیا اور سونے کو ذکر نہ کرنے کی وجہ سے اہل کرم (شریف) اس طرف گئے ہیں کہ وہ گویا اس وقت موجود نہ تھا یا اس کا حکم دلالت اولیٰ سے جانا گیا ہے۔

أو هدى : دال کی تخفیف کے ساتھ۔

زقاقا : "زا" کے ضمہ کے ساتھ یعنی راستہ بتلایا یعنی اس نے کسی راستے سے بھٹکے ہوئے کا پہچایا یا کسی کی نگاہ کمزور تھی اور وہ راستہ بھول گیا تو ان دونوں کو ان کی جھونپڑی اور گھر کا راستہ بتلا دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی جھونپڑی یا گھر کی طرف اس کو پہنچا دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ هدی دو مفعلوں کی طرف متعدی ہے یا ایک مفعول کی طرف۔ (دال کی تشدید کے ساتھ جو روایت ہے اس سے مراد مبالغہ ہے ہدایۃ میں الهدية میں۔ یعنی اس نے کھجوروں کی قطار کو صدقہ کیا یا درختوں کی قطار تھی اس کو وقت کر دیا۔)

كان له : یعنی اس کے لیے ثابت ہو گیا۔

مثل عتق رقبة : جو چیز ذکر کی گئی اس کی مثال گردن آزاد کرنے کی طرح ہے۔ وجہ شبہ مخلوق کو نفع پہنچانا اور ان کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ مصابیح میں ہے كعدل رقبة أو نسمة۔ یعنی جیسے کسی گردن یا روح کو آزاد کرنا ہے۔ ایک روایت میں ہے: كان له مثل عتق رقبة۔ شارح کہتے ہیں: كمثل عبد أو امة أوشك کے لیے ہے۔ نسمۃ سے مراد انسان ہے أو عدل رقبة یعنی اس نے تنہا اس کو غلام کو آزاد کیا ہو۔ نسمہ سے مراد یہ ہے کہ اس کی گردن چھڑانے میں اس کی مدد کرے۔ میرک فرماتے ہیں: صحیح حسن غریب۔

آپ ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قیمتی نصیحتیں

١٩١٨: وَعَنْ اَبِيْ جُرَيِّ جَابِرِ بْنِ سُلَيْمٍ قَالَ اَتَيْتُ الْمَدِيْنَةَ فَرَاَيْتُ رَجُلًا يَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَاْيِهٖ لَا يَقُوْلُ شَيْئًا اِلَّا صَدَرُوْا عَنْهُ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قُلْتُ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ لَا تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلَامُ عَلَيْكَ السَّلَامُ تَحِيَّةُ الْمَيِّتِ قُلْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ قُلْتُ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ الَّذِيْ اِنْ اَصَابَكَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَهٗ كَشَفَهٗ عَنْكَ وَاِنْ اَصَابَكَ عَامُ سَنَةٍ فَدَعَوْتَهٗ اَنْبَتَهَا لَكَ وَاِذَا كُنْتَ بِاَرْضٍ قَفْرٍ اَوْفَلَاةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُكَ فَدَعَوْتَهٗ رَدَّهَا عَلَيْكَ قُلْتُ اِعْهَدْ اِلَيَّ قَالَ لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهٗ حُرًّا وَلَا عَبْدًا وَلَا بَعِيْرًا وَلَا شَاةً قَالَ وَلَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا مِّنَ الْمَعْرُوْفِ وَاَنْ تُكَلِّمَ اَخَاكَ وَاَنْتَ مُنْبَسِطٌ اِلَيْهِ وَجْهُكَ اِنَّ ذَالِكَ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَارْفَعْ اِزَارَكَ اِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَاِنْ اَبَيْتَ فَاِلَى الْكَعْبَيْنِ وَاِيَّاكَ وَاِسْبَالَ الْاِزَارِ فَاِنَّهَا

مِنَ الْمَخِيلَةِ وَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيلَةَ وَإِنِ امْرُءٌ شَتَمَكَ وَعَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيكَ فَلَا تُعَيِّرْهُ بِمَا تَعْلَمُ فِيهِ فَإِنَّمَا وَبَالُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ۔

(رواه ابو داود وروى الترمذى منه حديث السلام وفى رواية فيكون لك اجر ذالك ووباله عليه)

اخرجه ابوداوٗد فى السنن ٣٤٤/٤ حديث رقم ٤٠٨٤۔ والترمذى ٥٠٢/٥ حديث رقم ٢٧٢٢۔ واحمد فى المسند ٦٣/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوجری جابر بن سلیمؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں مدینے میں آیا پس میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اس کی عقل سے پھرتے ہیں یعنی اس کی بات پر عمل کرتے ہیں یعنی اس کے فرمان کے مطابق چلتے ہیں جیسا کہ راوی نے کہا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں میں نے کہا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ راوی نے دوبارہ کہا۔ میں نے علیک السلام کہا یعنی تجھ پر اے اللہ کے رسول! سلام ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علیک السلام نہ کہو علیک السلام مردے کے لیے دعا ہے اور السلام علیک کہو۔ یعنی تجھ پر سلام ہو۔ میں نے کہا تم اللہ کے رسول ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں جو ایسی ذات ہے اگر تجھ کو تکلیف پہنچے اور تو اللہ کو پکارے تو وہ تیری تکلیف کو دور کر دے گا اور اگر تجھ کو قحط پہنچے اور تو اس کو پکارے تو وہ تیرے لیے زمین میں سبزہ پیدا کر دے گا اور جس وقت تم ایسی زمین میں ہو جہاں نہ پانی ہو اور نہ درخت ہو یا جنگل میں یعنی آبادی سے دور ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے تو اسی کو پکارو۔ پس اللہ تیری سواری کو واپس لے آئے۔ جابر ؓ نے کہا مجھے نصیحت کیجیے فرمایا برا نہ کہو کسی کو۔ پس جابر ؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد نہ کسی آزاد کو اور نہ کسی غلام کو برا کہا اور نہ اونٹ کو اور نہ بکری کو برا کہا یعنی آدمیوں کو برا کہنا تو بہت دور کی بات ہے میں نے تو حیوانوں کو بھی برا نہیں کہا۔ جیسا کہ عوام کی عادت ہوتی ہے اور پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیکی میں سے کسی چیز کو حقیر نہ جانو یعنی کوئی تم سے نیکی کرے یا تو کسی سے نیکی کرے اگرچہ تھوڑی ہی ہو۔ بلکہ اگر کوئی تجھ سے نیکی کرے اگرچہ تھوڑی ہو بہت جان اور جو کچھ تیرے ہاتھ سے نیکی ہو سکے کر اور اس کو غنیمت جان اور اپنے بھائی سے بات کر اس حال میں کہ خوش ہو جائے تیرا چہرہ یعنی تواضع اور خوش کلامی سے پیش آ تا کہ اس کا دل تیرے حسن اخلاق سے خوش ہو جائے۔ اس لیے کہ یہ بھی نیکی ہے اور اپنی تہبند یعنی ازار آدھی پنڈلی تک بلند کرو یعنی اونچی کرو۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تو ٹخنوں تک اور ازار کو لٹکانے سے بچو۔ اس لیے کہ ازار کا لٹکانا تکبر ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص تمہیں گالی دے اور تجھے عار دلائے اس عیب کے ساتھ جو وہ تمہارے بارے میں جانتا ہے تو عار نہ دلا اس عیب کے بارے میں جو اس کے اندر ہے اس لیے کہ اس کا گناہ تو اسی پر ہے اس کو ابوداوٗد اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اس حدیث سے سلام کی حدیث اور حدیث کے آغاز میں سلام کا ذکر ہے۔ باقی حدیث روایت نہیں کی ہے اور ایک روایت میں: فَإِنَّمَا وَبَالُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ کی بجائے فيكون لك اجر ذلك ووباله عليه کے الفاظ ہیں یعنی تیرے لیے اس سے ثواب ہوگا اور اس کا وبال اس پر ہوگا۔

تشریح: وعن أبي جرى: جیم کے ضمہ "را" کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ۔

جاء بن سليم: تصغیر کے ساتھ۔

قال اتيت المدينة فرأيت رجلا يصدر الناس: یعنی لوٹتے ہیں۔

عن رأية: وہ اس پر عمل کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے اور جس چیز سے انہیں وہ روکتا ہے اس سے بچتے ہیں۔ طیبیؒ کہتے ہیں اس چیز سے انصراف کرتے ہیں جس کو اس نے سیراب کیا۔ اور وہ انصراف کے ساتھ مشابہت کو درست قرار دیتے ہیں ان کے سوال کی مصلحت معاش ٹھہرنے کی جگہ کی بدولت ان کے وارد ہونے کے ساتھ جب وہ چشمے سے سیراب ہو جائیں۔

لا يقول شيا الاصد رواعنه: یعنی اس کے ساتھ عمل کیا (کام کیا) صفت مقصد کی وضاحت کرنے والی ہے۔

قلت من هذا، قالوا هذارسول الله قال قلت عليك السلام يا رسول لله مرتين: عدم سماع یا عدم جواب کی وجہ سے تادیباً۔ قال لا تقل: نہی تنزیہ کے لیے ہے۔

عليك السلام: یعنی ابتداء۔

عليك السلام تحية الميت: یہ زمانہ جاہلیت میں تھا جب انہیں شرعی امور کا علم نہ تھا۔ طیبی فرماتے ہیں: اس کا ارادہ احیاء والے (زندہ کرنے والے "یَحْیَا" کا نہیں چونکہ شرع نے کہا کہ اپنے بھائی پر تحفہ پیش کرے اور اسی طرح دوسرے ساتھی کو حکم ہے۔ یہ کوئی احسن انداز نہیں تھی کی جگہ پر جواب کہہ دے۔ اگر چہ سلام کا تحفہ مقدم کرنا جائز ہے جیسے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے (السلام عليكم رادقوم مومنين)۔

اس کی وضاحت ہمارے بعض علماء کا کلام پیش کرتا ہے۔ اس صیغہ کے ساتھ یہ لائق نہیں کہ میت کو زندہ کرنا مراد لیا جائے۔ جب کہ آپ ﷺ نے مردوں پر سلام پیش کیا ہے جیسا کہ آپ کا قول (السلام عليكم) ہے اس سے مراد کہ یہ تحفہ آپ نے مردہ پر پیش کیا ہے نہ کہ زندہ پر۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی کہ یہ کلمہ تحیۃ کے جواب کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔ اس مسلمان کے حق میں یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی کو وہ تحفے پیش کرے جو شریعت نے اس کے لیے مشروع قرار دیئے ہیں اور اس کے ساتھ حشروعیت کے ساتھ جواب دے۔ اس کے لیے جائز نہیں کہ تحیۃ کی جگہ جواب پیش کرے۔ میت پر سلام پیش کرنا اس غرض سے ہے کہ اس پر سلام کی برکت شام ہو جائے وہاں جواب اکا انتظار نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں صیغوں سے سلام پیش کرے۔

دوسرا معنی۔ سلام کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو لفظ سلام ابتداءً ضرور سنائے تاکہ اس کے دل کی جانب سے امن حاصل ہو۔ جب آپ اس کو ابتدا میں عَلَيْكَ سے سلام شروع کرتے ہیں اور یہی لفظ سناتے ہیں اور لفظ سلام اپنے منہ میں ادا کرتے ہیں تو وہ وہم کا شکار و پریشان ہو جائے گا کہ آپ اس کو بد دعاء دے رہے ہیں۔ پس سلام کو پہلے اور جلد ادا کرنے کا حکم اس لیے کہ اپنے مسلمان بھائی سے مانوس ہو جائے اور میت میں یہ معنی مطلوب نہیں ہے پس مسلمان کو اختیار ہے کہ ان دونوں کلمات میں سے جس کے ساتھ چاہے ابتدا کر لے۔ جب وہ عرف میں (معاشرے میں) دیکھ لے کہ قبر پر عَلَيْكَ السلام کہتے ہیں تو یہ آپ کا قول ہے۔ "عليك اسلام تحية الميت" یعنی لوگوں کے طرف اور ان کی عادت کے مطابق ہے۔ اگر عرف میں اس کے خلاف ہو تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ مردں پر اس صیغہ کے سلام کہے۔ آخری قول کو عرف خاص پر محمول کیا جائے گا یا وہ آدمی یا عرف سے ناآشنا ہے۔ اور جاہل میت کے قائم مقام ہے۔ تو اس سے اچھا موقع کون سا ہے آپ کے اس کلام کا عليك السلام تحية الميت' عليك السما جواب کہہ کر حد سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ تحية

الميت مبتدا محذوف کی خبر ہے ممکن ہے وہ اس سے یہ قصد کرے هذا و هذا والله أعلم۔

قل السلام عليك: گر تو یہ سلام کہے تو وہ تیرے لئے افضل ہے۔

قلت أنت رسول الله فقال انا رسول الله الذى: مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھُوَ ہے اور اس میں ضمہ ہونے کی بناء پر دو احتمال ہیں یا تو یہ لفظ اللہ کی یا رسول اللہ ﷺ کی صفت ہے جس کی بنیاد صیغہ متکلم ہے جس کا ذکر آپ ﷺ کی دعوت میں تین آنے والی جگہوں پر ہے۔آپ کا قول: أنا رسول الله اس کا تعلق معجزہ کے ساتھ ہے۔اگر چہ آپ کی رسالت ان کے نزدیک تواتر سے ثابت ہے۔نبوت کے دلائل کا اظہار اور رسالت کی نشانیاں میں یا اس کے سوال سے مراد ایسا ہے جو رسالت کے وصف موسوہے اور نبوت مدعی ہے اس کا اثبات معجزہ سے نہیں تو یہ "تا" کے فتحہ کے ساتھ خطاب کا صیغہ ہے۔

ان اصابك ضر: "ضا" کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ۔

فدعوته: یعنی تو میرے وسیلے سے مانگے یا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے دعا کروں۔

كشفه: یعنی اللہ تعالیٰ اس سے یہ نقصان زائل کردے۔

ان اصابك عام سنة: یعنی ایسی قحط سالی ہو کہ زمین کچھ نہ اگائے۔

فدعوته أنبتهالك: یعنی وہ اس کو تیرے لئے سرسبز بنادے۔

واذا كنت بأرض قفر: ایک نسخہ میں اضافت کے ساتھ ہے یعنی چٹیل میدان جو پانی اور درخت سے خالی ہو اور یہ ہلاکت کا گڑھا ہے۔

أو فلاة: یعنی ایسا علاقہ جو آبادی سے دور ہو یہ پرخطر علاقہ ہوتا ہے۔اُو نوع بیان کرنے کے لیے ہے۔اس بات کا بھی احتمال ہے کہ شک کے لیے ہو۔

فضلت راحلتك: یعنی وہ راستے سے ایک جانب چلی گئی یا تجھ سے غائب ہوگئی۔یہی قول ظاہر ہے اس کی دلیل یہ عبارت ہے۔(فدعوته ردها عليك) (قلت اعهدا إلى)۔یعنی مجھے وصیت کریں اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ﴾ "اے بنی آدم کیا تم نے ہم سے وعدہ نہیں کیا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کروگے"۔

قال لاتسبن أحدا: یعنی اس کو گالی نہ دے۔

نبی ﷺ نے اس سے گالی نہ دینے کا وعدہ اس لئے لیا کہ آپ ﷺ کو علم تھا کہ یہ اس کی حالت پر غالب ہے اس لیے اس کو منع کردیا۔

قال فما سببت بعده: یعنی اس عہد کے بعد کسی کو گالی نہ دی۔

حرا ولا عبدا ولا بعيرا اولا شاة: یعنی نہ کسی انسان کو اور نہ کسی حیوان کو۔اگر چہ کسی خاص انسان کو برا بھلا کہنے کا جواز ہے جب علم ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی نہ کہنے میں کوئی نقصان نہیں۔افضل یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جائے۔

قال یعنی نبی ﷺ نے فرمایا۔

لا تحقرن شیئًا من المعروف: یعنی نیک اعمال کو۔ یا افعال خیر' نیکی اور صلہ رحمی وغیرہ اگر چہ وہ کم اور چھوٹی ہو۔

وإن تکلم أخاك: اصل عبارت یوں ہے کلم أخاك تکلیمًا فعل کا عامل حذف کر دیا گیا اور مصدر کی اضافت فاعل کی طرف کر دی گئی۔ یعنی تکلیمك اخاك۔ پھر فعل کو مصدر کی جگہ پہ لایا گیا اور اس کا عطف نہی پر ڈالا گیا ہے۔ شرح میں بھی اسی طرح ہے اور یہ تکلف ہے۔ اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ طیبیؒ کے علاوہ کسی دوسرے کا قول ہے: و أن تکلم أخاك کا عطف شئی پر ہے اور ''ان ذلك من المعروف '' جملہ متانفہ ہے اور ''ان تکلم'' کے لئے علت ہے یا ''ان تکلم'' مبتدا ہے اور یہ اس کی خبر ہے۔

وانت منبسط: یعنی ہشاش بشاش۔

وجھك: مرفوع ہے منبسط کا فاعل ہے اور جملہ حالیہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تو اس کے لیے تواضع اور انکساری کر اور احسن انداز میں کلام کر یہاں تک کہ تیرے حسن خلق سے اس کا دل خوشی سے بھر جائے۔

ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ غالب طور پر استناف ہے ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے اور علت ہونے کی وجہ سے معنی یہ ہے کہ کلام کھلے چہرے کے ساتھ کرے۔

المعروف: وہ نہ اس کا انکار کرتا ہے۔ نہ حقیر سمجھتا ہے، نہ اس کو ترک کرتا ہے۔

وارفع اذازك الی نصف الساق: یعنی تمہاری قمیصیں اور شلواریں چھوٹی ہونی چاہئیں۔

قوله: فإن ابیت:

وإیاك و أسبال الازار: یعنی اس سے اجتناب کر۔

فانھا: یعنی یہ خصلت اور فعل اسبال۔

من المخیلة: میم کے فتحہ اور ''خاء'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی تکبر۔

وإن امرؤ شتمك: یعنی تجھ کو گالی دے اور لعنت کرے۔

وعیرك: یعنی تیرے ماں اور قبیلے (خاندان) کو

بما یعلم فیك: یعنی تجھ میں جو عیب ہے خواہ نہ ہو۔

فلا تعیرہ بما تعلم فیه:

فانما وبال ذلك: یعنی گناہ جو گالی گلوچ اور عار کی وجہ سے ہوگا۔

علیه: یعنی اُس شخص پر ہوگا تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جزری، منذری اور ترمذی نے اس طرح بیان کیا ہے اور نسائی نے مختصر بیان کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام میرک فرماتے ہیں: امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ شیخ جزری اور منذری کے کلام سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ امام ترمذی کے ہاں حدیث مکمل ہے۔ لیکن یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔

وفی روایة یعنی ترمذی کی۔

فیکون لك اجر ذلك ووباله علیه : میرکؒ فرماتے ہیں: یہ روایت بھی ترمذی کی ہے۔ لہٰذا بہتر یہ تھا کہ مؤلف یوں کہتے: ''وفی روایة له'': میں کہتا ہوں کہ اس میں دلالت ہے کہ حدیث ترمذی مکمل ہے۔

صدقے میں دی جانے والی چیز آخرت میں ملے گی

۱۹۱۹: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُمْ ذَبَحُوْا شَاةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَقِيَ مِنْهَا قَالَتْ مَا بَقِيَ اِلَّا كَتِفُهَا قَالَ بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَتِفِهَا. (رواہ الترمذی وصححه)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٥٥ حدیث رقم ٢٤٧٠۔ واحمد فی المسند ٦/٥٠۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اہل بیت یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بکری ذبح کی۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس میں سے کیا چیز باقی ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا سوائے کندھے کے کچھ باقی نہیں ہے یعنی کندھے کے علاوہ سب تقسیم کر دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کندھے کے علاوہ سب باقی ہے اور اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث صحیح ہے۔

تشریح: انهم ذبحوا شاة: یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے۔ یہ قول ابن الملک کا ہے۔ یا اہل بیت میں سے کسی نے (رضی اللہ عنہم) یہ قول واضح ہے۔

فقال النبی ﷺ ما بقی منها: جملہ استفہامیہ ہے یعنی کیا بکری کے گوشت سے کوئی چیز باقی بچی ہے۔

قالت مابقی: یعنی منها۔ جیسا کہ ایک صحیح نسخہ میں ہے۔

الا کتفهاء: یعنی وہ چیز جو صدقہ نہیں کی گئی۔

قال بقی کلها غیر کتفها: نصب اور رفع کے ساتھ۔ یعنی جو صدقہ کیا گیا وہ باقی ہے اور جو آپ کے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ [النحل:٩٦] ''جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو کپڑا پہنانے پر انعام

۱۹۲۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا اِلَّا كَانَ فِيْ حِفْظٍ مِّنَ اللّٰهِ مَادَامَ عَلَيْهِ مِنْهُ خِرْقَةٌ. (رواہ احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٦٢ حدیث رقم ٢٤٨٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جب وہ کسی دوسرے مسلمان کو کپڑا پہنائے گا یعنی ازار یا چادر یا اور کوئی چیز وہ اللہ کی طرف سے بڑی حفاظت میں ہوتا ہے جب تک وہ کپڑے کا ٹکڑا مسلمان کے بدن پر رہتا ہے۔ (احمد و ترمذی)

تشریح: الا کان فی حفظ: امام طیبیؒ کہتے ہیں: ''فی حفظ'' ای حفظ۔

ابن الملک فرماتے ہیں: فی حفظ اللہ نہیں کہا تا کہ نکرہ لانے سے تفخیم کی نوع پر دلالت ہو جائے پر دلالت ہو جائے یہ دنیا میں ہے اور آخرت میں بغیر حصر کے ہے اور اس کے ثواب کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حفاظت سے مراد پردہ پوشی ہے اور اس کے موافق یہ حدیث بھی ہے: من ستر مسلما ستره الله فی الدنيا والآخرة۔ تنوین تعظیم کے لیے ہے یا قسم بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ وہ کپڑے کی دوروقمت کے مطابق اور دینے اور لینے والے کے حالات کے مطابق ہوگا۔ (رواہ احمد والترمذی) یعنی من طریق حصین بن مالک عن ابن عباس اور کہا یہ حدیث اس سند سے حسن غریب ہے۔ حصین بن مالک البجلی الکوفی ہیں۔ ابوزرعۃ نے ان کے بارے میں "لیس به باس" کے الفاظ کہے ہیں۔

اللہ کے محبوب بندوں کا ذکر

۱۹۲۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ يَرْفَعُهُ قَالَ ثَلَاثَةٌ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ رَجُلٌ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَتْلُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَرَجُلٌ يَتَصَدَّقُ بِصَدَقَةٍ بِيَمِيْنِهٖ يُخْفِيْهَا اُرَاهُ قَالَ مِنْ شِمَالِهٖ وَرَجُلٌ كَانَ فِيْ سَرِيَّةٍ فَانْهَزَمَ اَصْحَابُهٗ فَاسْتَقْبَلَ الْعَدُوَّ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غير محفوظ احدرواته ابو بكر بن عياش كثير الغلط)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/١٠٦ حديث رقم ٢٥٦٧۔ والنسائی ٥/٨٤ حديث رقم ٢٥٧٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے اس حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ہیں ان کو اللہ دوست رکھتا ہے یعنی پسند کرتا ہے ایک وہ شخص ہے کہ وہ رات کو اس حال میں کھڑا ہو کہ قرآن مجید کی تلاوت کرے نماز یا نماز کے علاوہ میں اور ایک شخص وہ ہے جو کوئی نفل صدقہ دے اپنے دائیں ہاتھ سے پھر اس کو چھپائے۔ راوی نے کہا میں گمان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے بائیں ہاتھ سے (چھپائے) اور ایک وہ شخص جس کے دوستوں نے لشکر میں شکست پائی۔ پھر وہ دشمن کے سامنے ہوا۔ یہ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث غیر محفوظ ہے یعنی ضعیف ہے اور ایک راوی ابوبکر ابن عیاش ہے اور وہ اکثر غلطی کرتا ہے۔

تشریح: قوله: وعن عبد الله بن مسعود يرفعه: یعنی حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع بیان کرتے ہیں اگر چہ کسی نے نہیں کہا یہ وہم ہے اور حدیث موقوف ہے ابن مسعود پر اس قول کی وجہ سے جو بعد میں ہے۔

قال: ثلاثة: لہٰذا اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں کی۔

قوله: يحبهم الله: اگر علامت ظاہر ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے۔

يتلو كتاب الله: گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرتا ہے اور خلوت میں کلام کرتا ہے اور یہ علامت اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی ہے۔

ورجل يتصدق بصدقة بيمينه: اس میں جو دینے کا طریقہ ہے اس کا ادب سکھلایا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ سے دو دائیں ہاتھ سے دینے میں برکت ہے یا پھر اس کو جو دائیں جانب ہو۔

یخفیھا: ریاکاری اور سمعہ سے بچنے کے لیے انتہائی مخفی صدقہ کرتا ہے یہ اس کی انتہاء درجہ کی محبت اور رضا الٰہی حاصل کرنا ہے۔

اراہ :"اراءۃ" سے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ یعنی میرا خیال ہے۔

من شمالہ: یعنی بائیں ہاتھ سے خفیہ طور پر صدقہ کرتا ہے اور اس سے مراد کمال درجے کا مبالغہ ہے یا دائیں۔

فاستقبل العدو: یعنی ان سے لڑائی لا اصل لیے کہ تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے۔ دونوں کے درمیان مناسب جمع ہو سکتی ہے کہ وہ مجاہدین تھے۔ پہلا وہ جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے وہ اپنے آپ سے نیند، غفلت اور آرام کو روک لیتا ہے۔ دوسرا وہ جو اپنے مال میں جہاد کرتا ہے۔ اس کو نکال کر لوگوں کو دیتا ہے اور ان میں سے کسی کو نہیں جانتا اور اس کے مخالف جو نہ تو مال دیتے ہیں اور نہ اس سے سچی دوستی کرتے ہیں۔ تیسرا وہ جو اپنی روح کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اس کی نفس میں غنیمت کی طمع اور لالچ نہیں اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی مدح اور تعریف کریں۔ اور اس کے ساتھی لڑائی سے بھاگ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ پہلے مجاہد اور تیسرے مجاہد کے درمیان مناسبت صحیح حدیث سے بھی ثابت ہے اور وہ حدیث یہ ہے (ذاکر اللہ فی الغافلین ، بمنزلۃ الصابر فی الغازین) دوسرا مجاہد اس لحاظ سے ان میں داخل ہے کہ وہ نیکی کے کام میں مشغول ہوتا ہے اور لوگ اس سے غافل ہوتے ہیں اور اس کے طریقہ سے اعراض کرتے ہیں۔

قولہ :و قال ھذا حدیث غیر محفوظ: امام طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی ضعیف ہے

میرک فرماتے ہیں: وروی الترمذی من طریق أبی بکر بن عیاش عن الأعمش عن منصور عن ربعی بن حراش، عن ابن مسعود وقال: یہ حدیث غریب ہے اور غیر محفوظ ہے صحیح وہ ہے جس کو شعبہ نے روایت کیا ہے عن منصور عن زید بن ظبیان عن أبی ذر عن النبی ﷺ ۔ ابو بکر بن عیاش کثیرا الغلط ہے۔ یہ جامع ترمذی کی عبارت جو مؤلف نے ذکر کی ہے وہ تکلف سے خالی نہیں آپ اس پر غور کریں۔

آپ یہ بات جان لیں کہ امام ترمذی کا مقصود صرف یہ ہے کہ ابوبکر بن عیاش نے شیخ منصور کے بارے میں غلطی کی ہے اور اسی طرح صحابی کے نام میں بھی۔ اور شعبہ کی حدیث ابوذرؓ کی اسناد سے ذکر کی ہے۔ جو حدیث اس کے بعد ہے وہ صحیح ہے۔ اسے امام ترمذی نے بیان کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ ابوداؤد، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور امام نسائی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے واللہ اعلم۔

اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ لوگ

۱۹۲۲: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ وَثَلَاثَةٌ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ فَاَمَّا الَّذِيْنَ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ فَرَجُلٌ اَتٰى قَوْمًا فَسَاَلَهُمْ بِاللّٰهِ وَلَمْ يَسْاَلْهُمْ لِقَرَابَةٍ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهُمْ فَمَنَعُوْهُ فَتَخَلَّفَ رَجُلٌ بِاَعْيَانِهِمْ فَاَعْطَاهُ سِرًّا لَا يَعْلَمُ بِعَطِيَّتِهٖ اِلَّا اللّٰهُ وَالَّذِیْ اَعْطَاهُ وَقَوْمٌ سَارُوْا لَيْلَتَهُمْ حَتّٰى اِذَا كَانَ النَّوْمُ اَحَبَّ اِلَيْهِمْ مِمَّا يُعْدَلُ بِهٖ فَوَضَعُوْا رُءُوْسَهُمْ فَقَامَ يَتَمَلَّقُنِیْ وَيَتْلُوْا اٰيَاتِیْ

وَرَجُلٌ كَانَ فِي سَرِيَّةٍ فَلَقِيَ الْعَدُوَّ فَهَزَمُوْا فَاَقْبَلَ بِصَدْرِهٖ حَتّٰى يُقْتَلَ اَوْ يُفْتَحَ لَهٗ وَالثَّلَاثَةُ الَّذِيْنَ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ الشَّيْخُ الزَّانِيْ وَالْفَقِيْرُ الْمُخْتَالُ وَالْغَنِيُّ الظَّلُوْمُ ۔ (رواه الترمذى والنسائى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤/٦٠١ حديث رقم ٢٥٦٨۔ والنسائى ٥/٨٤ حديث رقم ٢٥٧٠۔ واحمد فى المسند ٥/١٥٣۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخصوں کو اللہ دوست رکھتا ہے اور تین شخص ایسے ہیں جن کو دشمن رکھتا ہے پس جن اشخاص کو اللہ دوست رکھتا ہے وہ یہ ہیں: ایک تو دینے والا اس شخص کا کہ ایک جماعت کے پاس آیا اس نے اللہ کی قسم کے ساتھ مانگا یعنی یوں کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں' مجھے دو اور ان سے واسطے رشتہ داری کے نہ مانگا۔ یعنی یہ نہیں کہا مجھے قرابت داری کی وجہ سے دو۔ جو اس کے اور ان کے درمیان ہے۔ پس انہوں نے اس کو نہ دیا پھر اس شخص نے قوم کو پیچھے چھوڑا یعنی وہی دینے والا جو اسی قوم سے تھا اور وہ شخص آگے بڑھا۔ پس اس نے مانگنے والے کو خاموشی سے دے دیا اس کے دینے کو خدا اور دینے والے کے کوئی نہیں جانتا تھا اور دوسرا وہ شخص تھا جو رات کو قیام کرنے والا ہے اور تمام رات سفر کرتا رہا یہاں تک کہ جب نیند بہت پیاری ہوگی ان کے نزدیک اور پوری قوم سو رہی تھی تو وہ شخص کھڑا ہوا اور میرے سامنے گڑگڑا رہا ہے اور میری آیتیں پڑھ رہا ہے' تیسرا شخص وہ ہے جو لشکر میں شامل تھا دشمن سے مقابلہ ہوا تو اس کے لشکر کو شکست ہوگئی اور یہ شخص سینہ سپر ہو کر دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ مارا گیا یا اسے فتح ہوگئی اور تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ بغض رکھتا ہے۔ ایک بوڑھا زانی' دوسرا فقیر متکبر اور تیسرا ظلم کرنے والا دولتمند۔ یعنی جو کہ قرض دینے والے کو نہ دے یا کچھ اور ظلم کرے۔ امام ترمذیؒ اور نسائیؒ کے اس کے مانند نقل کیا ہے اور نسائی یہ عبارت ذکر نہیں کی۔ وَثَلَاثَةٌ يُبْغِضُهُمْ ۔ امام نسائیؒ نے ان اشخاص کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ محبوبانِ الٰہی کا ذکر کیا ہے۔

تشریح: قوله: فاما الذين يحبهم الله فرجل یعنی آنے والے شخص کو دینے والا۔

أتى قوما: طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی اپنی قوم کے پاس۔

فتخلف رجل بأعيانهم: ''باء'' تعدیہ کے لیے ہے۔

فاعطاه سرًا: کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے گھر کی طرف جو ایک جانب تھا اس کی طرف پیچھے ہٹا یہاں تک کے اس کی قوم کے اشخاص میں ایک مددگار ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: لوگوں نے مسئول کو اپنے سے پیچھے چھوڑ دیا وہ آگے بڑھا اور خاموشی سے اس کو دے دیا۔ اعیان سے مراد اشخاص ہیں۔ یعنی وہ اس خیر میں آگے بڑھ گیا تو انہوں نے اُسے پیچھے چھوڑ دیا۔ طبرانی کی روایت میں ہے: فتخلف رجل عن اعيانهم۔ یہ معنی سخت ہے۔ پہلا معنی سنداً مضبوط ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا یہاں تک اکیلا سائل کے ساتھ رہ گیا تو اس کو خاموشی سے دے دیا کہا گیا ہے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ باعيانهم کسی محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی تخلف عنهم مستترا بظلالهم وأعيانهم أى أشخاصهم۔

مظہر فرماتے ہیں: میں اللہ تعالیٰ سے اس کے نام کی عظمت کے باعث سوال کرتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں یہاں تک کہ ایک قوم نے اس میں مخالفت سب سے واضح بات یہ ہے کہ محبت کی زیادی کا سبب اور جن کا تذکرہ آگے آ رہا ہے

میں مخلوق کی مخالفت اور حق کے موافق اخلاص اور صدق کے ساتھ ہے۔

لا یعلم بعطیتۃ الا اللہ والذی أعطاہ : پوشیدگی کے معنی کو پکار کرنے کے لئے یہ کلام ہے۔

وقوم سار ولیلتھم حتی اذا کان النوم ...... یعنی مزیدار اور طیب پاکیزہ۔

مما یعدل بہ: یعنی ہر چیز کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے اور نیند کو دور کرتا ہے۔

یملقنی: طیبیؒ کہتے ہیں بے بسی کے ساتھ چلنا محبت، دعا اور تفرع میں زیادتی کا باعث ہے۔ کہا گیا ہے حدیث کا اول دلالت کرتا ہے کہ وہ آپ کا کلام ہے اور آخر دلالت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اسی کی وجہ یہ کہ سرگوشی کا محل اسرار (خاموشی پوشیدگی) کو شامل ہے اور مناجاۃ محبت اور محبوب کے درمیان ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے وہ قصہ بیان کیا ہے جو اس کے روز بندے کے درمیان ہے اور نبی ﷺ نے اس کو بیان کیا ہے۔

ورجل کان فی سریۃ: یعنی لشکر میں

حتی یقتل أو یفتح لہ : یعنی دو اچھے کاموں میں سے ایک کے ساتھ کامیاب ہو گیا۔

والثلاثۃ الذین یبغضھم اللہ الشیخ الزانی......:

احتمال ہے کہ شیخ سے مراد بوڑھا ہے اور نوجوان کی ضد ہے۔ اور وہ شادی شدہ جو کہ کنوارہ کی ضد ہے۔ جیسا کہ سورۃ النور کی منسوخ آیت میں ہے: **الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم والفقیر المختال**) یعنی تکبر کرنے والا۔ اس سے وہ تکبر مستثنیٰ ہے جو کسی متکبر پر کرے کیونکہ وہ صدقہ ہے۔

والغنی الظلوم : یعنی بہت ظلم کرنے والا شیخ اور لوگوں کو خاص طور پر ذکر کیا ہے چونکہ یہ مذموم خصلتیں ان میں ہونا بہت برا اور سخت انکار کی چیز ہے۔

صدقے کی برتری تمام مادی چیزوں پر

۱۹۲۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِهَا عَلَيْهَا فَا سْتَقَرَّتْ فَعَجِبَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ شِدَّةِ الْجِبَالِ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ قَالَ الْحَدِيْدُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِيْدِ قَالَ نَعَمْ النَّارُ فَقَالُوْا يَا رَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِ قَالَ نَعَمْ اَلْمَاءُ فَقَالُوْ يَارَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ قَالَ نَعَمْ اَلرِّيْحُ فَقَالُوْا يَارَبِّ هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّيْحِ قَالَ نَعَمِ ابْنُ اٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَةً بِيَمِيْنِهٖ يُخْفِيْهَا مِنْ شِمَالِهٖ۔

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب وذکر حدیث معاذ اَلصَّدَقَةُ تُطْفِيءُ الْخَطِيْئَةَ فِيْ كِتَابِ الْاِيْمَانِ)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۴۲۳/۵ حدیث رقم ۳۳۶۹۔ واحمد فی المسند ۱۵۱/۵۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو زمین ہلنے لگی

پھر پہاڑ پیدا کیے اور پہاڑوں کو زمین پر ٹھہرایا۔ تو زمین ٹھہر گئی۔ فرشتوں نے پہاڑ کی سختی پر تعجب کیا اور کہنے لگے اے پرور دگار! کیا تیری مخلوقات میں سے کوئی چیز پہاڑوں سےسخت ہے؟ فرمایا ہاں کہ لوہا ہے یعنی لوہا پتھر کو بھی توڑ ڈالتا ہے پھر فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار کیا تیری مخلوقات میں لوہے سے بھی زیادہ سخت چیز ہے؟ فرمایا آگ ہے یعنی وہ لوہے کو بھی نرم کر دیتی ہے پھر فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں سے کوئی چیز آگ سے زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں! پانی ہے یعنی وہ آگ کو بھی بجھا دیتا ہے پھر فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں سے کوئی چیز پانی سے زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں وہ ہوا ہے یعنی وہ پانی کو بھی خشک کر دیتی ہے۔ پھر فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار! کیا تیری مخلوقات سے کوئی چیز ہوا سے زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں آدم کے بیٹے کا صدقہ دینا ہے کہ وہ دائیں ہاتھ سے دیتا ہے اور بائیں سے چھپاتا ہے اور امام ترمذیؒ نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **لما خلق الله الارض**: یعنی زمین کی شکل وصورت اور اس مختلف جوانب میں بچھا دیا اور اس کو پانی کی سطح پر رکھ دیا۔

جعلت: یعنی شروع ہوئی۔

تميد: دال کے ساتھ یعنی وہ ایک جانب ہوگئی، حرکت کرنے لگی اور اس میں شدید اضطراب پیدا ہوگیا۔ ایک جگہ پر کھڑی نہ تھی یہاں تک کہ فرشتوں نے کہا: انسان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

فخلق الجبال: کہا گیا ہے۔ پہلا پہاڑ ابوقبیس تھا۔

فقال بها عليها: یعنی حکم دیا اور اشارہ کیا کہ زمین پر کھڑے ہو اور اس کو استقرار بخشو۔

فاستقرت: یعنی جو اس پر پہاڑ گاڑے ان کی وجہ سے۔ اور زمین اپنے جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنی حالت اور جگہ سے نہ ہٹی یہ قول اور حکم اس بات کے محتمل ہے یہ کام "کُنْ" کے لفظ سے ہوا ہو۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد مجرد اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہو۔

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰسٓ: ۸۲] "جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کُنْ کہتا ہے وہ ہو جاتا ہے"۔ یہ مسلک میرے نزدیک دقیق ہے اور قبول کرنے کے لائق ہے۔ ان شارحین کے خلاف جنہوں نے اس جگہ پر مختلف تشریحات بتلائی ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں:۔ کئی دفعہ یہ بات گزر چکی ہے قول کو ہر فعل سے تعبیر کیا جائے۔ اختصاص کا قرینہ اس مقام کا تقاضا ہے تقدیری عبارت ہوں۔ **ألقى بالجبال على الارض** اس نے پہاڑ ﷺ کو زمین پر ڈال دیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ [لقمٰن: ۱۰] "اور اس نے زمین پر پہاڑ ڈال دیئے تاکہ زمین تمہیں لیے ایک جانب نہ چلی جائے" مفعول میں "باء" زائدہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے فرمان میں ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرہ: ۱۹۵] "اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ قول کو القاء اور (رسال کے معنی میں لینا اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی پر دلیل ہے۔ اس عظیم امر کی مثال اس کے قول سے عظیم قدرت کے موافق ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ قول ''امر'' کے معنی کو متضمن ہے یعنی پہاڑوں کو یہ کہتے ہوئے حکم دیا۔ اس پر ٹھہر جاؤ۔

ایک قول یہ ہے۔ پہاڑوں کو زمین پر ڈالا یہاں تک کہ زمین ٹھہر گئی۔

ایک قول یہ ہے قول بمعنی امر ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ پہاڑوں کو زمین پر رکھ دیں۔ آخری قول وارد دلیل کے خلاف ہے جو یہ ہے **فاصبحت الملٰكة فرأو الجبال عليها۔** فرشتوں نے صبح کی تو زمین پر پہاڑوں کو دیکھا۔

فعجبت الملائكة من شدة الجبال فقالوا يا رب هل من خلقك: یعنی یہ بھی تیری مخلوق ہے۔

شي اشد من الجبال قال نعم الحديد: ان سے پتھر توڑے جاتے ہیں اور پہاڑوں کو اکھاڑا جاتا ہے۔

قوله: قال نعم النار: وہ لوہے کو نرم کر دیتی ہے اور اس کو پگھلا دیتی ہے۔

فقال يا رب هل من خلقك شي اشد من النار قال نعم الماء: کیونکہ وہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔

فقالوا يا رب هل من خلقك شئ اشد من الماء قال نعم الريح: چونکہ وہ پانی میں تفریق کر دیتی ہے اور اس کو خشک کر دیتی ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: ہوا بادلوں کو چلاتی ہے جو پانی کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

فقالوا يا رب هل من خلقك شئ اشد من الريح قال نعم ابن آدم تصدق صدقة بيمينه يخفيها من شماله) کہا گیا ہے کہ اس کا سخت ہونا یا اس اعتبار سے کہ اس نے اپنے نفس کو مسخر کر لیا جو فطرتی لحاظ سے بہت سخت ہے اس کو آگ، پانی اور ہوا نہیں بدل سکتی اور یہ ہر چیز سے سخت ہے۔ یا اس لحاظ سے اپنے نفس کو مسخر کیا کہ اس نے صدقہ میں ریاکاری، لوگوں کی محبت اور اس کی تعریف کرنا اس سے روک لیا یا اس اعتبار سے کہ اس پر شیطان کا غلبہ ہے یا اس اعتبار سے اس نے اللہ رب رحمان کی رضا کو حاصل کر لیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدقہ ہوا کی سختی سے بھی سخت ہے جو اس سے پہلے اس کی سختی بیان ہوئی کیونکہ مخفی صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے جب غصہ کا مقابلہ کوئی سخت چیز بھی نہیں کر سکتی کیونکہ جب انسان کوئی عمل کرتا ہے تو وہ اس کے ذریعہ لہٰذا اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔ لہٰذا ان تمام مخلوقات سے زیادہ سخت اور قوی ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: ابن آدم کی جبلت کسی چیز کو لینا اور بخل کرنا ہے یہ زمین کی طبیعت ہے اور ابن آدم کی جبلت بلندیوں کو حاصل کرنا ہے اور شہرت حاصل کرنا ہے اور یہ دونوں خصلتیں آگ اور ہوا کی ہیں۔ دیتے وقت ناگواری کا اظہار یہ زمین کی جبلت ہے اور نار کی جبلت آگ و ہوا کی ہے جو ہر چیز سے سخت ہے۔

(وذكر حديث معاذ الصدقة تطفئ الخطيئة) یعنی گناہوں کو زائل کر دیتا ہے اور ان کو مٹا دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [هود: ١١٤] ''بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔'' **(في كتاب الايمان)** یعنی وہاں طویل حدیث موجود ہے اور اس باب میں تکرار کی وجہ سے ساقط ہے۔

الفصل الثالث:

اللہ کے راستے میں زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کا حکم

۱۹۲۴: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُنْفِقُ مِنْ كُلِّ مَالٍ لَهُ زَوْجَيْنِ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا اسْتَقْبَلَتْهُ حَجَبَةُ الْجَنَّةِ كُلُّهُمْ يَدْعُوْهُ اِلٰی مَا عِنْدَهُ قُلْتُ وَكَيْفَ ذَالِكَ قَالَ اِنْ كَانَتْ اِبِلاً فَبَعِيْرَيْنِ وَاِنْ كَانَتْ بَقَرَةً فَبَقَرَتَيْنِ۔ (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ٤٨/٦ حديث رقم ٣١٨٥۔ والدارمی ٢٦٨/٢ حديث رقم ٢٤٠٣۔ واحمد فی المسند ١٥١/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مسلمان بندہ اپنے مال میں سے دو چیزیں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو بہشت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے وہ اس چیز کی طرف پکاریں گے جوان کے پاس ہے ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ کس طرح سے خرچ کرنا ہے فرمایا اگر اونٹ ہوں۔ تو دو اونٹ دے اور اگر گائیں ہوں تو دو گائیں دے۔ اس کو امام نسائی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن أبی ذر قال: قال رسول الله ﷺ مامن عبد مسلم ینفق: یعنی صدقہ کرتا ہے۔

من کل مال له: یعنی اپنے سارے مال سے۔

زوجین: یعنی دو چیزیں یا دو قسمیں۔

فی سبیل الله: یعنی اس کی رضا تلاش کرتے ہوئے۔ یعنی وہ اس کی اطاعت میں جیسے حج، جہاد اور طالب علم وغیرہ میں خرچ کرتا ہے۔

قوله حجبة الجنة: ''حاء'' اور ''جیم'' کے فتحہ کے ساتھ۔ حاجب کی جمع ہے یعنی ان دروازوں کے دربان۔

کلهم یدعوه: مفرد ضمیر لفظ ''کل'' کے وجہ سے ہے یا پھر معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس کو پکارے گا۔

الی ماعنده: یعنی بڑی بڑی نعمتوں اور عطیات سے۔ یا وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوگا وہ اس سے استدعاء کرے گا اس غرض سے کہ وہ داخلے کا شرف اس کو بخشے۔

قلت وکیف ذلك: ہو۔ کیسے خرچ کرے گا جس کے عدد مخصوص ہے (مخصوص مال ہے) إن کانت إبلاً) ضمیر جماعت کے اعتبار سے ہے یا خبر کے اعتبار سے۔ اجل مؤنث ہے۔

فبعیرین وإن کانت بقرة: یعنی بقرًا فبقرتین:

۱۹۲۵: وَعَنْ مَرْثَدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَدَقَتُهُ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ١٤٧/٤۔

ترجمہ: حضرت مرثد بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہ نے حدیث بیان کی کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ تحقیق مؤمن کا سایہ قیامت کے دن صدقہ ہوگا۔ امام احمدؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

۱۹۲۵: وَعَنْ مَرْثَدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَدَقَتُهُ ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ١٤٧/٤۔

ترجمہ: ''حضرت مرثد بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بعض صحابہ ؓ نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کے دن مؤمن کا سایہ اس کا صدقہ ہوگا۔'' (یعنی مؤمن آدمی کا صدقہ دینا اس کے لیے سائے کا سبب ہوگا) ۔ (احمد)

راویٔ حدیث:

مرثد بن عبداللہ: طیبیؒ کہتے ہیں وہ ابوالخیر مرثد بن عبداللہ مزنی مصری ہیں۔

تشریح: ان ظل المؤمن یوم القیامة صدقة: طیبیؒ کہتے ہیں یہ تشبیہ مقلوب ہے یہاں حرف محذوف ہیں۔ اصل یہ ہے: أن الصدقة کا صدقہ سایہ کی طرح ہے کہ قیامت کے دن گرمی کی تکلیف سے بچائے گا۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اس کا معنی دراصل یہ ہے قیامت کے دن مؤمن کا سایہ اس کا صدقہ ہوگا یعنی نیک سلوک وہ لوگوں سے کرے گا۔ اور صدقہ کو خاص کیا گیا ہے جو اس کے لیے حقیقی ثواب ہے جیسے کپڑے اور خیمہ۔ جیسا کہ بعض احادیث وغیرہ میں وارد ہے۔

عاشوراء کے دن اہل وعیال پر وسعت کرنا

۱۹۲۶: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ وَسَّعَ عَلٰى عَيَالِهٖ فِى النَّفَقَةِ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ سَائِرَ سَنَتِهٖ قَالَ سُفْيَانُ اِنَّا قَدْ جَرَّبْنَاهُ فَوَجَدْنَا كَذٰلِكَ ۔ (رواه رزين)

اخرجه الطبرانی فی الکبیر۔ ذکره فی کنز العمال ٥٧٦/٨ حدیث رقم ٤٤٢٥٩۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے کنبے پر خرچ کرنے میں عاشورے کے دن کشادگی کرے گا اللہ تعالیٰ سارا سال اس کے باقی مال میں کشادگی کر دے گا۔ سفیان ثوریؒ نے کہا ہے کہ ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے اور ہم نے اس کو اسی طرح پایا ہے اس کو رزینؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وسع الله علیه سائر سنته: یعنی اس کے باقی سال یا تمام سال۔

قد جربناه: یعنی حدیث کو تاکہ ہم اس کی صحت کو جان لیں۔ یا ہم وسعت کے لیے بار بار کوشش کریں۔

فوجدنا: اس کی جزا۔

كذلك: سارا سال (رواہ رزین) یعنی صرف ابن مسعودا کیلے سے انہوں نے بیان کی ہے۔

۱۹۲۷: وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْه وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَاَبِيْ سَعِيْدٍ وَجَابِرٍ وَضَعَّفَهٗ ۔

ترجمہ: اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں' ابن مسعود ابوہریرہ' ابوسعید اور جابر رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ نیز انہوں نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔''

تشریح: وعن أبي هريرة : لفظ ''عَنْ'' کا اعادہ شاید اس لیے کہ ضمیر مجرور پر عطف ہے بغیر جار کے اعادہ کے اور یہی فصیح ہے۔

امام میرک نے نقل کیا ہے منذری سے ترغیب میں کہ بیہقی نے اس حدیث کو مختلف اسناد سے بیان کیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اور کہا ہے کہ یہ اسانید اگر چہ ضعیف ہیں لیکن اگر ان کو ایک دوسرے سے ملایا جائے تو قوت والی بن جاتی ہیں۔ عراقی کہتے ہے: اس کے کئی طرق ہیں۔ بعض کو اس نے صحیح کہا اور بعض کو مسلم کی شرط پر کہا ہے۔ حدیث اکحال یعنی یوم عاشوراء میں سرمہ لگانے والی حدیث کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح دوسری اشیا کی بھی اصل نہیں سوائے روزے اور توسیع کے۔

صدقے کا ثواب کئی گنا ملتا ہے

۱۹۲۸: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ الصَّدَقَةَ مَاذَا هِیَ قَالَ اَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ وَعِنْدَ اللّٰهِ الْمَزِیْدُ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٣٦٦/٣ حديث رقم ٣٧٩٥۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ ابوذر نے کہا اے اللہ کے نبی! مجھ کو بتایئے صدقہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کا ثواب چند در چند ہے۔ یعنی کئی گنا ہے اور اللہ کے نزدیک بہت زیادہ ہے۔ اس کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبي امامة قال: قال ابو ذر يا نبي الله أرأيت : یعنی مجھے خبر دیجئے۔

الصدقة: مبتدا اور جملہ خبر ہے۔

ماذاهي: یعنی کون سی چیز اس کے ثواب میں ملتی ہے۔

قال أضعاف: یعنی اس کا ثواب بہت زیادہ یعنی دس گنا۔

مضاعفة: سات سو تک۔

وعندالله المزيد: یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ [البقرہ: ۲۶۱] ''اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے''۔ طیبی کہتے ہیں جملہ استفہامیہ تاویل کے ساتھ خبر ہے۔ یعنی وہ صدقہ جس کے متعلق میں پوچھ رہا ہوں کیا ہے۔ سوال صدقہ کے متعلق ہے اور جواب اس کے مطابق نہیں ہے۔ أضعاف لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اسلوب کے متعلق ہے۔ یعنی اس کی حقیقت کے متعلق سوال نہ کر، وہ تو معلوم ہے۔ اس کے ثواب کے متعلق سوال کرتا کہ تو مزید اس میں رغبت کرے۔ تکلف سے قطع نظر کہ حکم معلوم ہے اس کے متعلق اس نے نہیں پوچھا لیکن اس کو سوال سے روک دیا۔ اور اس کے سوال سے اعراض کر کے ایک دوسرا جواب دے دیا۔

پھر طیبی کہتے ہیں نحویوں کے قول کے متعلق: أرأیت زیدا ماذا صنع؟ اس معنی میں کہ مجھے اس کی خبر دو یہ باب تعلیق سے نہیں ہے بلکہ زید کو نصب دینا واجب ہے معنی أرأیت کا أخبِرْ۔ یہ رأیت سے بمعنی أبصرت یا عرفت منقول ہے۔ گویا کہ کہا گیا کہ کیا تو نے اپنی آنکھوں سے اس کی عجیب حالت کا مشاہدہ کیا۔ کیا تو نے اس کو پہچانا مجھے اس کی خبر دے۔ یہ صرف کسی عجیب خبر کی طلب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد والا اسم منصوب ہوتا ہے کہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور کبھی کبھی حذف کر دیا جاتا ہے: ﴿قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ بَغْتَۃً اَوْ جَھْرَۃً ھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [الانعام: ٤٧] ''کہو کہ بھلا بتاؤ تو اگر تم پر خدا کا عذاب بے خبری میں یا خبر آنے کے بعد آئے تو کیا ظالم لوگوں کے سواء کوئی اور بھی ہلاک ہوگا؟'' استفہام ظاہر اور مقدر سے بدل نہیں ہے۔ جملہ مَاصَنَعَ کے لیے محل اعراب نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس کا وہم ہے کہ یہ دوسرا مفعول ہے بلکہ جس کے متعلق پوچھا گیا ہے اس کے حال کے لیے بیان ہے جس کے لیے اس نے کہا: رأیت زیدًا۔ مخاطب نے کہا تو اس کی کونسی حالت کے متعلق پوچھ رہا ہے؟ اس نے کہا: ما صنع کما فی الرضی اس قول میں یعنی أرأیت میں صدقہ کو نصب دینا واجب ہے۔

ایک روایت میں رفع کے ساتھ تو اس کی توجیہ متعین کی جائے گی۔ یوں کہا جائے گا کہ وہ اس کا مابعد محلاً مفعول ہیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں: اس قول کے متعلق: ﴿أرأیت الذی ینھا عبدًا اذا صلی﴾ [القلم: ٩، ١٠] اگر آپ پوچھیں: اَرأیت کے متعلق کیا ہے؟ میں کہتا ہوں الذی ینھی جملہ شرطیہ کے ساتھ اور وہ دونوں محل مفعول لین ہیں۔ ابوحیان کہتا ہے۔ جس بات کا یہاں زمخشری نے ثابت کیا ہے اس کے ہمارے ثابت شدہ قول کے سامنے کوئی وقعت نہیں یعنی أنعام میں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جملہ شرطی ہے مفعول کی جگہ پر ہے اور موصول دوسرا مفعول ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ مفعول ثانی جملہ استفہامیہ ہی ہوسکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰی وَاَعْطٰی قَلِیْلًا وَّاَکْدٰی اَعِنْدَہٗ عِلْمُ الْغَیْبِ فَھُوَ یَرٰی﴾ [النجم: ٣٣ تا ٣٥] ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے منہ پھیر لیا اور تھوڑا سا دیا (پھر) ہاتھ روک لیا کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے؟'' اور یہ قرآن میں بہت زیادہ ہے تو یہ آیت اس قانون سے نکل جاتی ہے اعلان میں کہا ہے ''أرأیت بمعنی أخبر نی باب تعلیق سے نہی یہ سیبویہ کا قول ہے اس نے علاوہ دوسرے نے کہا: اکثر اس کو باب تعلیق سے شمار کرتے ہیں:۔

کلام رضی زید کے منصوب ہونے پر ثبوت ہوگی۔ اس لیے اعلان میں کہا: انہوں نے جملہ استفہامیہ کا منصوب کے بعد واقع ہونے پر اختلاف کیا ہے جو أرأیتك کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے أرأیتك زید ماصنع جمہور اس جملہ پر ہیں۔ أن زیدا ماصنع اس بات پر ہیں کہ أن زیدًا مفعول اول ہے اس کے بعد والا جملہ محلاً منصوب اور مفعول ثانی کے قائم مقام ہوگا۔ اس میں تعلیق جائز نہیں۔ اس کی اخوت میں جائز ہے۔ جیسے: علمت زیدا من ھو قال اسفاقسی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں ہے: ﴿اَرَءَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ﴾ [الاسراء: ٦٢] ''کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔''

یہاں کئی ایک وجوہات ہیں: پہلی وجہ: اس کو زمخشری نے بیان کیا ہے۔ التی بمعنی أخبرنی۔ یہ جملہ ابتدائیہ پر داخل ہوتا ہے اس میں خبر استفہام ہوتی ہے۔ اگر اس کی صراحت نہ ہوتی مقصد ہوتی ہے۔ اور وہ مقصود میں صریح ہے جیسا کہ مخفی نہیں۔

بَابُ اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ

یہ باب بہترین صدقہ کے بیان میں ہے

الفصل الاول:

بہترین صدقے کی صورت

۱۹۲۹: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ وَحَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔ (رواه البخاري ورواه مسلم عن حكيم وحده)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۹۴/۳ حديث رقم ۱۴۲۶۔ ومسلم في صحيحه ۷۱۷/۲ حديث رقم (۹۵۔ ۱۰۳۴)۔ واخرجه ابوداؤد في السنن ۳۱۲/۲ حديث رقم ۱۶۷۶۔ والنسائي ۶۸/۵ حديث رقم ۲۵۴۲۔ واحمد في المسند ۴۰۲/۲

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حکیم بن حزامؓ دونوں سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو بے پروائی سے ہو اور اس شخص کے ساتھ شروع کرو۔ جس کا نفقہ تجھ پر لازم ہے۔ اس کو بخاری نے اور مسلمؒ دونوں نے روایت کیا ہے صرف حکیم بن حزام سے۔

تشریح: حزام: ''حا'' پر کسرہ ہے اور اس کے بعد ''زا'' ہے۔

قولہ: خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى: امام طیبیؒ کہتے ہیں: جو اس کی ضرورت سے زائد ہو۔ اس کا صدقہ کی نسبت یہ بتلاتی ہے کہ وہ مال میں قوی ہے۔ غنی کا ارادہ کامل اعتماد والا ہو اور وہ اپنا مال آفتوں پر مصائب پر جب اس سے مدد طلب کی جائے دیتا ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: الظہر زائد ہے یہ بھی کہا گیا ہے ظہر غنی صدقہ کرنے والا جو اس کے ہم مثل ہیں ان سے صاحب حیثیت ہو یہ اسی سے عبارت ہے جیسا کہ ان کا کہنا ''هو على ظهر سير'' یعنی اس سے ممکن ہے۔ و تنکیر غنی تا کہ فائدہ دے متصدق کے لیے ضروری ہے۔ وہ مستغنی ہو یا تو نفس کے غنی سے اور وہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نفس سے مستغنی ہو کر سارا خرچ کر دے جیسا کہ ابوبکر صدیقؓ نے کہا یا غنی المال جو اس کے ہاتھ میں ہے۔ پہلا دو آسانیوں میں سے افضل ہے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ليس الغنى عن كثرة العرض إنما الغنى غنى النفس۔

اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسکے تمام مال صدقہ کرنا مستحب نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال بھوک اور سختی مبتلا کر دے گا۔ یہی پر کلام ختم ہوئی۔

وابدابمن تعول: یعنی جن کا خرچہ تیرے ذمہ لازم ہے۔ (متفق علیہ)

گھر والوں پر خرچ کرنا دوسری تمام جگہوں پر خرچ کرنے سے افضل ہے

۱۹۳۰:وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَهْلِهٖ وَهُوَ یَحْتَسِبُهَا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةً۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۷/۹ حدیث رقم ۵۳۵۱۔ ومسلم فی صحیحه ۷۱۷/۲ حدیث رقم (۳۵۔ ۱۰۳۴)۔ والنسائی فی السنن ۶۹/۵ حدیث رقم ۲۵۴۵۔ والدارمی ۳۷۰/۲ حدیث رقم ۳۶۶۴۔ واحمد فی المسند ۲۷۳/۵۔

ترجمہ:حضرت ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت کوئی مسلمان اپنے اہل پر یعنی بیوی پر اور رشتے داروں پر کچھ خرچ کرتا ہے اور وہ اس میں ثواب کی توقع رکھتا ہے تو اس کے لیے بڑا صدقہ یا مقبول صدقہ ہوتا ہے اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اذا انفق المسلم نفقة علی أهله :یعنی بیوی اور عزیز واقارب پر۔

وهو يحتسبها : وہ اس کو شمار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ذخیرہ ہوتا ہے۔ یا ثواب حصول چاہتا ہے۔

كانت له:یعنی اس کا خرچ کرنا۔

صدقة: عظیم ہوگا یا مقبول ہوگا یا صدقہ کی قسم ہے۔

ثواب کی رُو سے بڑا صدقہ

۱۹۳۱:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَدِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ رَقَبَةٍ وَدِیْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰی مِسْكِیْنٍ وَدِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۶۹۲/۲ حدیث رقم (۳۹۔ ۹۹۵)۔ واحمد فی المسند ۴۷۶/۲۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک دینار ایسا ہے کہ تو اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے یعنی حج کے لیے جہاد کے لیے طلب علم میں اور ایک ایسا دینار ہے کہ خرچ کرے تو اس کو غلام آزاد کرنے کے لیے اور ایک دینار ایسا ہے کہ تو مسکین کو اللہ کے لیے دے اور ایک دینار ہے کہ تو خرچ کرے اپنے اہل پر تو یہ از روئے ثواب کے ان تمام دیناروں سے بڑا ہے جو دینار تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا ہے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال رسول الله دينار : مبتدا کی صفت ہے۔

أنفقته فی سبيل الله :یعنی جہاد، حج یا طلب علم وغیرہ میں

ودينار أنفقته فی رقبة :یعنی ان کی آزادی میں گردن چھڑوانے میں

ودينار تصدقت به علی مسكين و دينار أنفقته علی أهلك :طیبی کہتے ہیں کہ دینار اور اس پر جو عطف ہے مبتدا

ہے اور اس کی خبر آنے والا جملہ ہے۔

أعظمها أجر الذی أنفقته علی أهلك: کہا گیا ہے یہ اس پر فرض ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ صدقہ ہے اور صلہ رحمی ہے۔

اہل وعیال پر خرچ کرنا بہترین صدقہ ہے

۱۹۳۲:وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ دِیْنَارٍ یُنْفِقُهُ الرَّجُلُ دِیْنَارٌ یُنْفِقُهُ عَلٰی عِیَالِهٖ وَدِیْنَارٌ یُنْفِقُهُ عَلٰی دَابَّتِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَدِیْنَارٌ یُنْفِقُهُ عَلٰی اَصْحَابِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۶۹۱/۲ حدیث رقم (۳۸۔ ۹۹۴)۔ واحمد فی المسند ۲۷۷/۵۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بہتر دینار وہ ہے جو آدمی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے اور پھر وہ دینار ہے کہ وہ اس کو اپنے جانور پر خرچ کرے جو جہاد کے لیے پال رکھتا ہو اور وہ دینار کہ وہ اپنے دوستوں پر خرچ کرے اس حال میں کہ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہوں۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ثوبان قال: قال رسول اللہ ﷺ افضل دینار۔ اس سے مراد عموم ہے۔

دینار ینفقه الرجل علی عیاله و دینار ینفقه علی دابة۔ یعنی وہ جانور جس کو باندھ کر رکھتا ہو۔

فی سبیل الله۔ یعنی جہاد جیسی نیکیوں کے لیے

و دینار ینفقه علی أصحابه۔ جو مجاہد حالت جہاد میں۔

فی سبیل الله: یعنی ان تینوں پر بالترتیب خرچ کرنا غیر پر خرچ کرنے سے افضل ہے ابن سلک نے یہ بات ذکر کی ہے لیکن حدیث میں ترتیب پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لیے ہے مگر یہ کہا جائے کہ ترتیب جس کو نبی ﷺ نے بیان کیا ہے حکمت سے خالی نہیں ہے لہٰذا یہی افضل ہے مگر جب کوئی خاص سبب پایا جائے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا: ابدؤوا بما بدأ الله تعالی به ہے: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۵۸] ''بیشک (کوہ) صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں سے ہیں۔''

اپنی اولاد پر خرچ کرنا بھی ثواب ہے

۱۹۳۳:وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلِیَ اَجْرٌ اَنْ اُنْفِقَ عَلٰی بَنِیْ اَبِیْ سَلَمَةَ اِنَّمَا هُمْ بَنِیَّ فَقَالَ اَنْفِقِیْ عَلَیْهِمْ فَلَكِ اَجْرُ مَا اَنْفَقْتِ عَلَیْهِمْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۸/۳ حدیث رقم ۱۴۶۷۔ ومسلم فی صحیحه ۶۹۵/۲ حدیث رقم (۴۷۔ ۱۰۰۱)۔ واحمد فی المسند ۵۰۳/۳۔

ترجمہ: حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! آیا میرے لیے ابوسلمہ کے بیٹوں پر خرچ کرنے میں ثواب ہے علاوہ ازیں وہ میرے ہی بیٹے ہیں۔ پس فرمایا خرچ کر وان پر تیرے لیے اس چیز کا ثواب ہے جو تو ان پر خرچ کرے گی۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ام سلمة قالت: قلت يا رسول الله الى اجر: ''یاء'' کے فتحہ اور سکون کے ساتھ۔

أن أنفق: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ یعنی میرے خرچ کرنے میں۔ ایک نسخہ میں ''أن'' شرطیہ ہے۔

علي بني أبي سلمة: ابن حجرؒ کہتے ہیں: ابوسلمۃ عبداللہ بن عبدالاسد۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ام سلمہ کے خاوند تھے۔ ان سے یہ اولاد تھی۔ عمر، محمد، زینب، درہ۔

اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کا دوہرا ثواب ملتا ہے

۱۹۳۴: وَعَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ قَالَتْ فَرَجَعْتُ اِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ اِنَّكَ رَجُلٌ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ فَأْتِهٖ فَاسْأَلْهُ فَاِنْ كَانَ ذَالِكَ يُجْزِئُ عَنِّيْ وَاِلاَّ صَرَفْتُهَا اِلٰى غَيْرِكُمْ قَالَتْ فَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بَلِ ائْتِيْهِ اَنْتِ قَالَتْ فَانْطَلَقْتُ فَاِذَا امْرَأَةٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجَتِيْ حَاجَتُهَا قَالَتْ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ فَقَالَتْ فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ فَقُلْنَا لَهٗ اِئْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْهُ اَنَّ امْرَاَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْاَلَانِكَ اَتُجْزِئُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى اَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى اَيْتَامٍ فِيْ حُجُوْرِهِمَا وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ قَالَتْ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَهٗ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هُمَا قَالَ امْرَأَةٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَزَيْنَبُ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الزَّيَانِبِ قَالَ امْرَأَةُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُمَا اَجْرَانِ اَجْرُ الْقَرَابَةِ وَاَجْرُ الصَّدَقَةِ۔ (متفق عليه واللفظ لمسلم)

اخرجه البخاري في صحيحه ۳۲۸/۳ حديث رقم ۱۴۶۶۔ ومسلم في صحيحه ۶۹۴/۲ حديث رقم (۴۵۔ ۱۰۰۰)۔ والنسائي في السنن ۹۲/۵ حديث رقم ۲۵۸۳۔ وابن ماجه ۵۸۷/۱ حديث رقم ۱۸۳۴۔ والدارمي في السنن ۴۷۷/۱ حديث رقم ۱۶۵۴۔ واحمد في المسند ۳۶۳/۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے عورتوں کی جماعت صدقہ کرو۔ اگرچہ تمہارے زیوروں سے ہو۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس لوٹ کر آئی۔ میں نے کہا کہ آپ مالی اعتبار سے کمزور ہیں اور تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور پوچھو ان سے کہ آیا یہ کافی ہے کہ میں آپ پر اور آپ کی اولاد

پر صدقہ کروں یا نہیں؟ اگر یہ صدقہ کرنا میرے لیے کافی ہو تو تم پر صدقہ کروں اگر یہ کفایت نہ کرے تو تمہارے غیر پر خرچ کروں۔ انہوں نے کہا تو ہی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس جا۔ پس زینب رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس گئی۔ اچانک ایک انصاری عورت دروازے پر کھڑی تھی، وہ بھی میری جیسی حاجت لے کر آئی تھی۔ یعنی میرا والا سوال وہ بھی پوچھ رہی تھی کہ میں خاوند اور اس کے متعلقین کو دوں یا نہ دوں؟ حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ہیبت و رعب سے نوازا گیا تھا۔ تو بلال رضی اللہ عنہ باہر آئے۔ تو ہم نے ان سے کہا کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس جاؤ اور بتاؤ کہ دو عورتیں دروازے پر کھڑی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ کیا وہ اپنے خاوندوں کو اور یتیموں کو جو ان کی پرورش میں ہیں صدقہ دے سکتی ہیں یا نہیں اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نہ بتانا کہ ہم کون ہیں۔ یعنی انہوں نے ریا کی نفی کے بارے میں مبالغہ کیا ہے یعنی اس میں بالکل ریاکاری کو دخل نہیں ہے۔ پس زینب رضی اللہ عنہا نے کہا۔ بلال رضی اللہ عنہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس گئے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے مسئلہ پوچھا نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ دونوں کون ہیں؟ بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے ایک عورت انصار میں سے ہے اور دوسری حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔ پس حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کونسی زینب؟ (یعنی کئی زینبیں ہیں) یہ کونسی ہے؟ کہا عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی۔ پس حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ان کو دوہرا ثواب ہے ایک ثواب رشتے داری کا دوسرا ثواب صدقہ دینے کا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔

تشریح: حليكن: ''حاء'' کے ضمہ اور کسرہ اور ''یا'' کی تشدید کے ساتھ ''حلی'' کی جمع ہے۔ ''حاء'' کی فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے جس کو معدنیات یا پتھر وغیرہ سے بنا کر زینت حاصل کی جاتی ہے

فاسأله: ایک نسخہ میں ''فسله'' ہے۔

يجزى: ''یاء'' کے فتحہ اور ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی يغنى و يقضى کفایت کرے گا۔ ایک نسخہ میں ''یا'' کے ضمہ اور آخر میں ہمزہ کے ساتھ یعنی کافی ہوگا کفایت کرے گا۔

قال لى عبد الله بل ائتيه أنت: شاید کہ وہ اس لیے رک گئے چونکہ سوال طمع پر مبنی تھا۔

فاذا امرأة من الانصار: یعنی کھڑی تھی یا حاضر (موجود) تھی۔

باب رسول الله ﷺ: حدیث بزار سے پتہ چلتا ہے کے دروازے سے مراد مسجد کا دروازہ ہے۔

حاجتى حاجتها: مبتدا اور خبر یا تشبیہ بلیغ ہے۔ پہلا قول راجح ہے۔

قوله :وكان رسول الله ﷺ قد القيت عليه المهابة:

مهابة: میم کے فتحہ کے ساتھ یعنی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے ہیبت اور عظمت سے نوازا تھا۔ لوگ آپ کی عزت و تکریم اور تعظیم کرتے تھے اور آپؐ سے ڈرتے تھے اسی وجہ سے کوئی آپ کے ہاں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ طیبیؒ کہتے ہیں: ''کان'' استمرار پر دلالت کر رہا ہے) اس وجہ سے آپؐ کے صحابہ مجلس میں ایسے بیٹھے ہوتے تھے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ یہ آپ کی عزت اور اچھے اخلاق کی بدولت تھا نا کہ تکبر اور برے اخلاق کی بدولت۔ یہ عزت کا لباس انہیں اللہ تعالیٰ نے پہنایا تھا نہ کہ ان کے اپنے نفس کی طرف سے تھا

حجورهما: ''حاء'' کے ضمہ کے ساتھ حجر کی جمع ہے اس کو بھی فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ فلاں

فی حجر فلان فلاں فلاں کی حفاظت میں ہے۔اصل معنی ان کی پرورش وتربیت میں ہیں۔

ولا تخبره من نحن: چھپانے سے ان کا مقصد ریاء کی نفی یا افضلیت کی رعایت رکھنا تھا۔شاید یہی وجہ ان کے نہ داخل ہونے کی تھی۔

فقال رسول الله ﷺ ای الزیانب؟ : ابن الملک فرماتے ہیں: آپ نے "ایّة" نہیں کہا کیونکہ وہ مذکر ومؤنث دونوں کے لیے جائز ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ [لقمان: ٣٤] "کوئی نفس نہیں جانتا وہ کسی زمین پر مرے گا"۔ بلکہ کہا گیا ہے تانیث زیادہ فصیح ہے۔

قولها (قال إمرأة عبد الله) یہ محدثین کی اصطلاح کی تائید کرتی ہے جب اس کا اطلاق عبداللہ پر ہو تو وہ ابن مسعود ہوتے ہیں نہ کہ ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر ابن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم۔باوجود اس کے کہ تمام کے تمام جلیل القدر ہیں۔لیکن وہ اَجَلّ ہیں۔مطلق کو اکمل کی طرف لوٹایا جاتا ہے ہمارے علماء نے کہا ہے کہ خلفاء اربعہ کے بعد وہ سب سے زیادہ فقیہ ہیں کہا گیا ہے کہ بلال تو نے ان دونوں کے متعلق ضروری باوجود اس کے ان دونوں نے منع کیا تھا۔کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے کے بعد حضرت بلالؓ پر فرض ہو گیا تھا کہ آپؐ کے فرض کے علاوہ دوسروں کے فرض کو چھوڑ دیں۔

شمنی فرماتے ہیں: اس کو ابوداؤد کے علاوہ جماعت نے روایت کیا ہے۔آپ یہ بات جان لیں کہ آدمی اپنی عورت کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔اس پر علماء کا اتفاق ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورت (بیوی) خاوند کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی کیونکہ دونوں کے درمیان منافع عادتاً مشترک ہوتے ہیں۔امام ابو یوسف اور محمد کہتے ہیں بیوی اپنے خاوند دے سکتی ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں ان دونوں کی دلیل بخاری ومسلم اور سنن نسائی کی زینبؓ والی حدیث ہے۔اس کو بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور اس میں کہا ہے: آپؐ پلٹے اور اپنے گھر میں آئے زینب زوجہ عبداللہ بن مسعودؓ آئیں اور اجازت طلب کی۔آپؐ نے اجازت دے دی پھر اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! آج آپ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے میرے پاس میرا ہار ہے میں اُسے صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ابن مسعود نے گمان کیا کہ وہ اور اس کی اولاد زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان پر صدقہ کیا جائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن مسعود نے سچ کہا: تیرا خاوند اور تیری اولاد زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان پر صدقہ کیا جائے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: اس حدیث اور پہلے والی میں کوئی تعارض نہیں آپ غور کریں۔آپؐ کا کہنا ولاك ربائب سے مجازاً جائز ہے وہ یتیم بچے تھے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔اور حقیقتاً ہونا بھی مراد ہے۔معنی یہ ہے کہ جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے مالک تھے وہ ان پر خرچ کرتے۔جواب یہ ہے یہ نفلی صدقہ میں ہے۔یہ اس لیے ہے کہ چونکہ نبی وعظ کے ساتھ ان کی ذہن سازی کیا کرتے تھے اور اس پر رغبت دلاتے تھے۔اس کا کہنا، فقہاء کے عرف میں حادث کے لیے ہے اور غالباً اس کا استعمال واجب میں ہوتا ہے لیکن اس میں جو الفاظ ہیں وہ نفل سے عام ہیں چونکہ وہ لغت بھی کفایت کر کے ہیں۔معنی یہ ہوا کیا کفایت کرے گا صدقہ کرنا اس پر صدقہ کے مسمّٰی کو۔اور حقیقی طور پر اس کا مقصد تقرب الی اللہ ہے۔

رشتے داروں کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے

۱۹۳۵: وَعَنْ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّهَا اَعْتَقَتْ وَلِيْدَةً فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ ذَالِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَوْ اَعْطَيْتِهَا اَخْوَالَكِ كَانَ اَعْظَمَ لِاَجْرِكِ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه حدیث رقم ۲۵۹۲۔ ومسلم فی صحیحه ۶۹۴/۲ حدیث رقم (۴۴۔ ۹۹۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۲۰/۲ حدیث رقم ۱۶۸۹۔

ترجمه: حارث کی بیٹی ام المؤمنین حضرت میمونہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ کے زمانے میں ایک لونڈی آزاد کی۔ پھر میمونہؓ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تو یہ لونڈی اپنے ماموں کو دیتی تو تجھ کو بڑا ثواب ہوتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **اعتقت ولیدة** : یعنی اس لونڈی کو جو اس کی ملکیت میں پیدا ہوئی تھی

لو أعطیتها : ایک صحیح نسخہ میں (أما انك لو أعطیتها) ''تا'' کے کسرہ کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں اشباع کسرہ کے ساتھ یہاں تک ''یاء'' بن گئی۔

اخوالك : ''خال'' کی جمع ہے۔ کیونکہ حالات کی تنگی کے باعث انہیں ایک خادم کی ضرورت تھی۔

کان أعظم لأجرك : کیونکہ یہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔

قریبی پڑوس ہدیئے کا زیادہ مستحق ہے

۱۹۳۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ جَارَيْنِ فَاِلٰى اَيِّهِمَا اُهْدِيْ قَالَ اَقْرَبِهِمَا مِنْكِ بَابًا۔

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱۹/۵ حدیث رقم ۲۵۹۵۔ واحمد فی المسند ۱۷۵/۶۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اے اللہ کے نبی میرے دو ہمسائے ہیں میں ان میں سے کس کو دوں؟ یعنی کس کو تحفہ بھیجوں یعنی پہلے یا زیادہ کس کو بھیجوں؟ فرمایا اس کی طرف بھیجو جس کا دروازہ تیرے نزدیک ہو۔ امام بخاریؒ نے اس کو نقل کیا ہے۔

تشریح: نہ کہ دیوار چونکہ وہ اکثر ملتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے باخبر رہتے ہیں: یہ حسن معاشرت ہے اور ان سے صحبت کا اظہار اولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ [النساء: ۳۶] ''اور والدین کے ساتھ احسان کرو، قرابت داروں کے ساتھ یتیموں، مساکین، قریبی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ (ان کے ساتھ حسن سلوک کرو)۔'' یہ اس پہ دلالت ہے کہ قریبی ہمسایہ نیکی کے زیادہ قریب ہے۔ قریبی کو تحفہ دینے پر انحصار کرنا مراد نہیں جیسا کہ یہی حدیث کا ظاہر ہے اس وجہ سے کہ آیت میں یہ ہی موجود ہے اور آگے والی حدیث

میں بھی اسی طرح ہے۔

ہمسائے کے حقوق کا خیال کرو

۱۹۳۷: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِذَا طَبَخْتَ مَرَقَۃً فَاَکْثِرْ مَاءَ ھَا وَتَعَاھَدْ جِیْرَانَکَ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۲۵/٤ حدیث رقم (۱٤۲۔ ۲٦۲۵)۔ والدارمی فی السنن ۱٤۷/۲ حدیث رقم ۲۰۷۹۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تو شوربا پکائے تو اس کے پانی کو زیادہ کرلو اور ہمسایوں کی خبر گیری کرو۔ یہ امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اس ارشادگرامی کا منشاء یہ ہے کہ جب سالن پکاؤ تو اپنی لذت وخواہش ہی کو مقدم نہ رکھو بلکہ ہمسایہ اور پڑوسی کی ضرورت کا بھی خیال رکھو اور اس کی شکل یہ ہے کہ سالن میں پانی زیادہ ڈالو تاکہ شوربا زیادہ ہو اور تم اپنے ہمسایہ میں ضرورت مندلوگوں کو بانٹ سکو۔

قولہ: وتعاھد جیرانک: "جارٌ" کی جمع ہے۔ یعنی کھانا زیادہ پکا کر ان کو دینے سے ان کے حالات سے باخبر ہوگا اور اس کے ذریعہ تجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوگا اور اسی طرح پڑوسی کا حق بھی محفوظ ہو جائے گا۔ ابن الملک کہتے ہیں: کھانے میں پانی زیادہ کرنے کے حکم سے مقصود اس بات پر ابھارنا ہے کہ پڑوسی کو کھانے میں سے اس کا حصہ دیدیا جائے چاہے وہ کھانا لذیذ بھی نہ ہو۔

الفصل الثانی:

مال کی کمی کے باوجود صدقہ کرنا یہ افضل صدقہ ہے

۱۹۳۸: عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الصَّدَقَۃِ اَفْضَلُ ؟ قَالَ جُھْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۲/۲ حدیث رقم ۱٦۷۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا اے اللہ کے رسول ﷺ کونسا صدقہ زیادہ ثواب رکھتا ہے؟ فرمایا کم مال والے کی بہت زیادہ کوشش کرنی صدقہ دینے میں اور اس کو پہلے دو جس کی ضروریات تمہاری ذات کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: جھد: جیم کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی وہ صدقہ جو اس حالت میں کرے جب مالی حالت کمزور ہو تو وہ افضل صدقہ ہے۔ اس حدیث میں اور اس سے پہلی والی حدیث میں تطبیق اس طرح ہے کہ فضیلت میں تفاوت لوگوں کے توکل کی قوت اور یقین کی کمزوری کے لحاظ سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جس کا دل غنی ہوتا کہ یہ

اس حدیث کے موافق ہو جائے

"افضل الصدقة ما كان عن ظهر غني": ابن الملک کہتے ہیں یعنی افضل صدقہ وہ ہے کہ فقیر اسے دے کر بھوک پر صبر کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور (افضل الصدقة ما كان عن ظهر غني) میں "غنغ" سے مراد وہ شخص ہے جو بھوک اور سختی میں صبر نہیں کرتا ان دونوں میں موافقت کی صورت یہ ہے کہ جو دے کر صبر کر سکتا ہے اس کے دینے میں افضلیت ہے۔ اور جو صبر نہ کر سکے اس کے حق میں بہتر یہ ہے کہ وہ غلہ (قوت) روکے پھر جو ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کرے۔

اب فقہاء نے جو حاصل کلام ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس فقیر کا صدقہ جس کا دل غنی ہے افضل ہے اس غنی کے صدقہ سے جس کے پاس مال کی کثرت ہے اگر چہ وہ زیادہ صدقہ کرے۔ یہ دلائل ہیں کہ صابر فقیر کی غنی شاکر پر افضلیت ہے۔ پہلے کی عبادت باوجود قلت (کمی) کے دوسرے کی کثرت کے باوجود افضل ہے۔ ان دونوں کے درمیان کس طرح مساوات (برابری) ہو سکتی ہے۔ اور اس بات کا احتمال بھی ہے کہ اس حدیث سے مراد وہ ہے جو دوسری مرفوع حدیث میں ہے:

سبق درهم مائة الف درهم رجل له درهمان أخذ أحدهما فتصدق به و رجل له مال كثير فأخذ من عرضه مائة الف فتصدق بها۔

اس حدیث کو امام نسائی نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کیا ہے۔ امام حاکم اور ابن حبان نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور جامع صغیر میں بھی موجود ہے۔

قولہ : وابدأ : یعنی اے صدقہ کرنے والے یا اے کم مال والے (اس شخص سے ابداء کر) جو تیری ذمہ داری میں ہے۔

صدقہ دیتے وقت رشتے دار کا خیال رکھنا چاہیے دوہرا ثواب ملتا ہے

۱۹۳۹: وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ۔ (رواه احمد والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٦/٣ حديث رقم ٦٥٨۔ والنسائی ٩٢/٥ حديث رقم ٢٥٨٢۔ وابن ماجه ٥٩١/١ حديث رقم ١٨٤٤۔ والدارمی ٤٨٨/١ حديث رقم ١٦٨٠۔ واحمد فی المسند ٢١٤/٤۔

ترجمہ: حضرت سلیمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے یعنی ایک ہی ثواب صدقے کا ہوتا ہے اور رشتے دار کو صدقہ دینا دوہرا ثواب رکھتا ہے ایک صدقے کا اور دوسرا رشتے داری کا۔

اس کو امام احمد ترمذیؒ ترمذیؒ اور نسائی اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: (عن سلیمان بن عامر) جیسا کہ بعض نسخوں میں تصغیر ہے: میرک فرماتے ہیں: سلمان بغیر تصغیر کے ہے سلیمان کتابت میں غلطی ہے یا صاحب کتاب کی غلطی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مؤلف اسمائے رجال میں کہتے ہیں وہ سلمان بن عامر الضبی ہیں ان کا شمار بصریوں میں ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں: رواۃ صحابہ میں ضبی ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہاں کلام مکمل ہوا۔ ان کو سلمان فارسیؓ کے بعد ذکر کیا ہے یہ کتابت کی غلطی پر دلالت ہے اگر صاحب کتاب کی طرف سے غلطی ہوتی تو

اس کا شمار سلیمان بن صرد، سلیمان بن اکوع اور سلیمان بن بریدہ ہوتا۔

قرابت داروں پر صدقہ افضل ہے۔ کیونکہ اس میں دو نیکیاں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں میں سے ایک افضل ہے۔

مال خرچ کرنے کا طریقہ

۱۹۴۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدِیْ دِیْنَارٌ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی وَلَدِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی اَهْلِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ اَعْلَمُ۔ (رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۲۰/۲ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ والنسائی ۶۲/۵ حدیث رقم ۲۵۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا میرے پاس ایک دینار ہے یعنی اس کو خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا اس کو اپنے اوپر خرچ کر۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے؟ فرمایا اس کو اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے؟ فرمایا خرچ کرو اس کو اپنے اہل پر یعنی بیوی (بچوں) پر اور ماں باپ اور رشتے داروں پر۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے؟ فرمایا خرچ کرو اس کو اپنے خادم پر اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے؟ فرمایا تو دانا تر ہے۔ یہ ابوداؤدؒ اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام طیبیؒ کہتے ہیں: اولاد کو بیوی پر مقدم کرنا اس لیے کہ اولاد پر خرچ کرنے کی ضرورت بخلاف بیوی کے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کو طلاق دے دے تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ دوسری کر لے۔ واضح اور ظاہر بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے۔

قال عندی آخر قال أنفقه علی خادمك قال عندی آخر قال انت أعلم: یعنی اپنے عزیز و اقارب، ہمسائے اور ساتھیوں کو تو بہتر جانتا ہے کہ کون مستحق ہے؟

بدترین اور بہترین آدمیوں کی طرف نشاندہی

۱۹۴۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ النَّاسِ رَجُلٌ مُمْسِكٌ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِالَّذِیْ یَتْلُوْهُ رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ غُنَیْمَةٍ لَهٗ یُؤَدِّیْ حَقَّ اللّٰهِ فِیْهَا اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِشَرِّ النَّاسِ رَجُلٌ یَسْئَلُ بِاللّٰهِ وَلَا یُعْطِیْ بِهٖ۔ (رواه الترمذی والنسائی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۶/۴ حدیث رقم ۱۶۵۲۔ والنسائی ۸۳/۵ حدیث رقم ۲۵۶۹۔ والدارمی ۲۶۵/۲ حدیث رقم ۲۳۹۵۔ ومالك فی الموطأ ۲۴۵/۲ حدیث رقم ۴ من كتاب الجهاد۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ بہترین آدمی کون ہے وہ شخص جو اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہے۔ اللہ کے راستے میں سوار ہو کر کافروں کے ساتھ جنگ کا منتظر ہے کیا میں

نہ بتاؤں تم کو اس شخص کے بارے میں جو مذکورہ شخص کے مرتبہ میں ہے وہ شخص جو اپنی چند بکریوں کے ساتھ گوشہ نشینی میں ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہے۔ یعنی لوگوں سے الگ ہو کر جنگل میں جا رہا ہے اور اپنا گزارا بکریوں سے کرتا ہے اور ان کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے کیا میں تمہیں یہ بتاؤں بدترین آدمیوں کے بارے میں کہ وہ شخص ہے کہ سائل اس سے اللہ کی قسم دے کر سوال کرتا ہے کہ مجھ کو دو اور وہ سائل کو کچھ نہیں دیتا۔ یہ روایت امام ترمذیؒ اور نسائیؒ اور دارمیؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: قال رسول الله ألا اخبركم :"اَلَا" میں استفہام اور بتائے ہوئے تنبیہ کرنے کا احتمال ہے۔

بخير الناس: یعنی بہترین لوگوں میں سے ایک بہتر شخص ہے۔ یہ مطلب اس لئے ہے کہ غازی سب انسانوں سے افضل نہیں ہے اور "شر الناس" کا مطلب بھی اسی طرح ہے یعنی بدتعین لوگوں میں سے ایک شخص۔ ظاہر بات یہ ہے کہ وہاں لوگوں سے مراد مومن ہیں۔ کیونکہ مقصود انہی کے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کو قتل کرنے والا وہ بھی شریر ہے لیکن اس کا تعلق بھی مومنوں سے ہے۔ شاید کہ مطلق ہونا پہلے قول پر ابھارنا ہے اور ڈرانا دوسرے سے ہے۔

رجل: رفع کے ساتھ تقدیری عبارت یوں ہے هُوَ رَجُلٌ اور بدل ہونے کی بناء پر مجرور بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ممسك: رَجُلٌ کی صفت ہے یعنی اس کو پکڑنے والا۔

بعنان فرسه في سبيل الله: یعنی آخر تک لڑائی کے آخر تک دشمن سے قتال کرنے والا۔

رجل معتزل: دو وجہوں سے۔ یعنی لوگوں سے دور رہنے والا ان سے الگ تھلگ صحرا و وادی وغیرہ میں رہنے لگا۔

غنيمة: یہ "غنم" کی تصغیر بمعنی "قطيع من الغنم"

يسأل: مجہول کے صیغے کے ساتھ "يطلب" کے معنی میں مفعول یعنی طلب کرتا ہے۔

لايعطى: فاعل کے لیے۔ یعنی الرجل المسئول منه

ابن ملک کہتے ہیں۔ یسأل صیغہ فاعل کے ساتھ اور "لايعطى" صیغہ مفعول کے ساتھ یعنی "يسأل مالك لفسه بالله ولا يعطى بالله اذا سئل به" آپ اس پر غور کریں یہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں اس بات کا احتمال ہے کہ دونوں فعل مبنی علی الفاعل ہیں۔ دوسرے میں مفعول مقدر ہے معنی یوں ہوگا لوگوں میں سے براوہ ہے جو اللہ کا نام لے کر یعنی قسمیں دے کر اور مجمع عبارت بنا کر سوال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں کو مشقت میں ڈالتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ اس سائل کو "حیاء" کی وجہ سے دے دیتا ہے اس کا لینا حرام ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے نام لینے والے کو نہیں دیتا یعنی قسم اور حلف کھانے والے کو باوجودیکہ مسئول کے پاس قدرت ہے تو اس نے اللہ کی عظمت بزرگی کو بھلا دیا اور فقیر کی ظاہری حالت پر ترس کھانے سے اعراض کیا جو بے بس تھا اور فقر کی وجہ سے قسم اُٹھا کر اس سے پناہ کا طالب تھا۔ اور یہ صورت تو اس وقت اور زیادہ بری ہے جب مسئول وہ ہو جس پر زکوٰۃ اور صدقہ فرض ہو۔ (رواہ الترمذی) یعنی عطاء بن یسار عن ابن عباس کی سند کے ساتھ اور حدیث کو حسن کہا ہے۔ یہ قول میرک کا ہے۔

سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ

۱۹۴۲: وَعَنْ أُمِّ بُجَيْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظُلْفٍ مُحْرَقٍ۔

(رواه مالك والنسائي وروى الترمذي وابو داود معناه)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٣٠٧/٢ حديث رقم ١٦٦٧۔ والترمذي ٥٢/٣ حديث رقم ٦٦٥۔ والنسائي ٨١/٥ حديث رقم ٢٥٦٥۔ ومالك في الموطأ ٩٢٣/٢ حديث رقم ٨ من كتاب صفة النبي ﷺ واحمد في المسند ٤٣٥/٦۔

ترجمہ: ام بجیدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مانگنے والوں کو دو۔ اگر چہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو امام مالکؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے بھی اسی کے ہم معنی روایت کی ہے۔

اُم بجید:

''باء'' کے ضمہ کے ساتھ ''جیم'' کے فتحہ اور سکون کے ساتھ اس قول کو طیبی، قاموس اور عسقلانی نے ذکر کیا ہے۔ ابن حجر کا قول جو نون کے ساتھ ہے وہ صحیح نہیں وہ حواء بنت زید بن سکن انصاریہ ہیں اور یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ یہ قول مؤلف نے ذکر کیا ہے۔

تشریح: قالت قال رسول الله ﷺ ردوا السائل : ابن الملک کہتے ہیں کہ بعض نسخوں میں یوں الفاظ ہیں ''لاتردو السائل'' یعنی اس کو محروم نہ کروان کو کچھ نہ کچھ دو۔

بظلف: ''ظا'' کے کسرہ کے ساتھ گائے اور بکری کے کھر۔

محرق : باب افعال ''أحراق'' سے ہے مبالغہ واو ہے یعنی سائل کو معمولی سے معمولی چیز بھی دو انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ او مسئول سے یہ فعل صادر نہیں ہوتا جلا ہوا کوئی نافع نہیں ہے۔ (غیر نفع بخش ہے) صرف قحط کے زمانے میں کارآمد ہو سکتا ہے (رواہ مالک ......) یعنی ان الفاظ کے ساتھ اس طرح امام احمد نے اپنی مسند میں، حاکم نے تاریخ میں حواء بنت سکن سے بیان کیا ہے

اخلاقِ حسنہ کی تعلیم

١٩٤٣: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَعَاذَ مِنْكُمْ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ وَمَنْ سَاَلَ بِاللّٰهِ فَاَعْطُوْهُ وَمَنْ دَعَاكُمْ فَاَجِيْبُوْهُ وَمَنْ مَنَعَ اِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا مَا تُكَافِئُوْهُ فَادْعُوْا لَهٗ حَتّٰى تَرَوْا اَنْ قَدْ كَافَاْتُمُوْهُ۔ (رواه احمد وابو داود والنسائي)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٣١٠/٢ حديث رقم ١٦٧٢۔ والنسائي ٨٢/٥ حديث رقم ٢٥٦٧۔ واحمد في المسند ٦٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ پناہ مانگے پس اس کو پناہ دو۔ پس جو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ سوال کرے۔ پس اس کو دو اور جو شخص تم کو کھانے کے لیے بلائے۔ پس اس کی دعوت قبول کرو اگر کوئی حسی یا شرعی مانع نہ ہو اور جو شخص تمہاری طرف احسان کرے قولی یا خطی پس اس کو بدلہ دو یعنی تم بھی اس پر احسان کرو۔ جیسے اس نے کیا ہے پس اگر مال نہ پاؤ بدلہ دینے کے لیے تو محسن کے لیے دعا کرو۔ یہاں تک کہ تم گمان کرو کہ تم نے بدلہ دے دیا۔

اس کو امام احمد، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: استعاذ بالله : طیبیؒ کہتے ہیں: جو تم سے پناہ مانگے اور تمہارا شر دور کرنے کا مطالبہ کرے یا تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے شر کو دور کرنے کا مطالبہ کرے اور یوں کہے: تجھ پر اللہ کی قسم تو مجھ سے اپنا شر دور کر دے اس کی پکار قبول کرو اور اس سے اللہ کے نام کی عظمت کی بدولت شر ہٹا دو۔ جو تم سے اللہ کا وسیلہ دے کر پناہ مانگے تو اس پر نرمی کرو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ "استفاذ" کا صلہ ہو یعنی "من استعاذ باللّٰہ" اس سے منہ نہ پھیرو بلکہ اس کو پناہ دو اور برائی اس سے دور کر دو۔ اعیذوہ کو ادفعوا کی جگہ ذکر کیا ہے۔ لا تتعرضوا مبالغہ کے لیے ہے۔

ومن سأل بالله فاعطو : یعنی اللہ کے نام کے عظمت کی خاطر اور مخلوق پر شفقت کرتے ہوئے۔

ومن صنع إليكم معروفا : یعنی جو تمہارے ساتھ قولی لحاظ سے نیکی کرے یا فعلی لحاظ سے نیکی کرے۔

فكافئوه : مکافات سے ہے یعنی اس کے ساتھ نیکی کرو جس طرح اس نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے: ﴿هل جزاء الا حسان الا الا حسان﴾ "کیا نیکی کا بدلہ نیکی نہیں ہے"۔ دوسری آیت: وأحسن كما أحسن الله إليك۔

فان لم تجدوا ما تكافئوه : مال کے ساتھ۔ اصل میں "تکافئون" تھا نون بغیر ناصب اور جازم کے۔ یا تو تخفیف کے لیے یا ناسخین سے "سھو" ہوا ہے۔ اسی طرح طیبیؒ نے اس قول کو ذکر کیا ہے۔ پہلا قول معتمد ہے چونکہ حفاظت حدیث کا سلسلہ موجود ہے اس کی مثال (كما تكونوا يول عليكم) اس کو طیبی نے مسند الفردوس میں "ابوبکرۃ" سے روایت کیا ہے۔

فادعوا له : یعنی نیکی کرنے والے کے لیے دعا کرو اس دعا کے ساتھ بدلہ دو۔

أن قد كافأتموه : یعنی بار بار دعا کرو یہاں تک کہ تمہیں گمان ہو جائے کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ ابن ملک کہتے ہیں: ایک دوسری حدیث میں ہے جس کے ساتھ نیکی کی جائے اور وہ نیکی کرنے والے سے جزاک اللہ کہے تو اس نے اس کی تعریف کا حق ادا کر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کو نسائی، ترمذی اور ابن حبان نے اسامہؓ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کوئی کسی سے کہے: "جزاك الله خيرا" ایک مرتبہ تو اس نے اس کا حق ادا کر دیا اگرچہ اس کا حق بہت زیادہ ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ ؓ کی عادت مبارکہ تھی جب کوئی سائل ان کے لیے دعا کرتے تو وہ بھی اس کی مثل جواب دیتی تھیں پھر اس کو مال بھی دیتیں پھر ان سے کہا گیا آپ سائل کو مال بھی دیتی ہیں اور جیسی وہ دعا کرتا ہے آپ بھی اس کے لیے دعا کرتی ہیں تو کہنے لگیں میں اس حق کو نہیں چھوڑتی جو اس کا دعا کی وجہ سے مجھ پر ہوتا ہے اور یہ حق میرے صدقہ سے زیادہ ہے تو وہ جیسی دعا میرے لیے کرتا ہے تو ویسی دعا میں اس کے لیے کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میں دعا کو اس کی کے ساتھ برابر کر دیتی ہوں۔ تاکہ میرا صدقہ باقی رہ جائے۔

اللہ ربّ العزت سے صرف جنت کا سوال کرو

۱۹۴۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُسْئَالُ بِوَجْهِ اللّٰهِ اِلَّا الْجَنَّةُ۔

(رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۳۰۹ حدیث رقم ۱۶۷۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی ذات کا واسطہ دے کر کوئی چیز نہ مانگو۔ سوائے بہشت کے۔ یہ ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: إلا الجنة: رفع کے ساتھ ہے۔ ای لا سئل بوجه اللّٰه شئ الا الجنة۔ مثال کے طور پر یوں کہا جائے: (اللّٰهم إنا نسالك بوجهك الكريم ان تدخلنا جنة النعيم) صیغہ لایسأل غائب، نفی، نہی اور مجہول کے ساتھ راویت کیا گیا ہے تو اس صورت میں "جنة" مرفوع ہوگا اور نہی، غائب، مخاطب، معلوم اور مفرد کے ساتھ بھی مروی ہے لہٰذا اس صورت میں "جنة" منصوب ہوگا۔ طیبیؒ کہتے ہیں: لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات کی بدولت کچھ نہ مانگو مثال کے طور پر تم یوں کہو! اعطنی شيئًا بوجه اللّٰه أو لله۔ اللہ تعالیٰ کا نام اس چیز سے بہت بلند اور عظمت والا ہے کہ اس کے بدلے دنیا کا فائدہ مانگا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو۔ اللہ تعالیٰ سے دنیا کا ساز وسامان نہ مانگو بلکہ اس کی رضا مانگو۔ اور "وجہ" کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

الفصل الثالث:

محبوب مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنا

۱۹۴۵: عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَبُوْطَلْحَةَ اَكْثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ وَكَانَ اَحَبُّ اَمْوَالِهِ اِلَيْهِ بِيْرُحَاءَ وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَّاءٍ فِيْهَا طَيِّبٌ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. قَامَ اَبُوْ طَلْحَةَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَاِنَّ اَحَبَّ مَالِيْ اِلَيَّ بِيْرُحَاءَ وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰى اَرْجُوْ بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَيْثُ اَرَاكَ اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ وَاِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْاَقْرَبِيْنَ فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَفْعَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْطَلْحَةَ فِيْ اَقَارِبِهٖ وَبَنِيْ عَمِّهٖ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۳۲۵ حدیث رقم ۱۴۶۱۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۶۹۳ حدیث رقم (۴۲۔

٩٩٨)۔ والدارمي في السنن ٤٧٧/١ حديث رقم ١٦٥٥۔ واحمد في المسند ١٤١/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ابوطلحہ مدینہ کے انصار میں سے کھجوروں کے اعتبار سے بہت مالدار تھے اور ان کے پسندیدہ مالوں سے ان کا بیرحاء کے نام سے ایک باغ تھا اور وہ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ میں تشریف لے جاتے اور شیریں پانی پیتے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں جب یہ آیت اتری کہ تم ہرگز نیکی کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے محبوب مال کو اللہ کے راستے میں خرچ نہ کردو۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے اللہ کے رسول۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم ہرگز نیکی حاصل کرسکو گے۔ جب تک تم اپنا محبوب مال اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو اور میرے پسندیدہ مال میں بیرحاء ہے میں اس کو اللہ کے واسطے صدقہ کرتا ہوں اور اس کی نیکی کی امید کرتا ہوں آیت کریمہ کی وجہ سے اور میں اس کا امیدوار ہوں کہ یہ اللہ کے پاس ذخیرہ ہوگا۔ پس اے اللہ کے نبی اس کو رکھو۔ جہاں اللہ آپ کو بتلا دیں یعنی آپ جس جگہ چاہیں خرچ فرمائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاباش شاباش یہ بیرحاء مال ہے۔ نفع دینے والا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے سن لیا ہے جو تو نے مجھ سے بیان کیا ہے میں اس کو مناسب سمجھتا ہوں کہ تو اس کو اپنے رشتہ داروں میں خرچ کردے تاکہ صدقہ کا ثواب حاصل ہوجائے اور صلہ رحمی کا بھی ثواب ملے۔ ابوطلحہؓ نے فرمایا میں وہی کرونگا جس کا آپ نے حکم فرمایا ہے پھر ابوطلحہؓ نے وہ باغ اپنے رشتے داروں اور چچا کے بیٹوں میں تقسیم کردیا۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن أنس قال كان أبو طلحة: یعنی ان کا والدہ کا خاوند (والد)

اكثر الأنصار بالمدينة مالاً: تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

من نخل: مِنْ بیانیہ ہے۔

وكان أحب امواله: رفع کے ساتھ۔

قوله بير حاء: "باء" کے فتحہ یاء کے سکون اور "راء" کے فتحہ کے ساتھ اسی طرح ابن حجر العسقلانیؒ نے اعراب بیان کیا ہے پھر کہا: اس کے اعراب کے متعلق کئی ایک وجوہات ہیں ابن اثیر نے نھایہ میں انہیں جمع کیا ہے۔ پس ابن اثیر نے کہا: "باء" کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ "راء" کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مد او قصر کے ساتھ یہ آٹھ لغات ہیں۔ ابن سلمہ کی روایت میں "بریحا" ہے "باء" کے فتحہ اور "را" کے کسرہ کے ساتھ اور باء اور راء پہلے ہیں اور یاء بعد میں ہے ابوداؤد میں "باریحا" اس کی مثال ہے لیکن اس میں "الف" زیادہ ہے۔

"مغرب" میں ہے "البراح" وہ مکان جس میں کوئی درخت وغیرہ سے کوئی آڑ نہ ہو گویا کہ وہ گھر ہے۔ "بیر حا" اس سے بلند ہوتا ہے۔ اور یہ مدینہ میں ابوطلحہ انصاری کا باغ تھا۔ ہمارے شیوخ سے ایک روایت ہے انہوں نے کہا: میں مکہ میں نئی نئی چیزیں دیکھ رہا تھا وہ ان کو "بیر حا" کہتے تھے۔ "حاء" ایک آدمی کا نام ہے جس کی اضافت کنویں کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن پہلی روایت ہی درست ہے۔ پہلے اس کے ضبط (اعراب) میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول ہے۔ لفظ "بئر" کے ساتھ ہے اور اضافت حرف تہجی کی طرح ہے اس طرح "راء" میں اعراب کی تینوں حالتیں ہیں۔ ابوذر نے اس کا انکار کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہر حال میں "راء" کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صوری کہتا ہے کہ یہ ہر حال میں "راء" اور "یا" کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ہم نے چار اقوال

پر خلاصہ بیان کیا ہے مد اور قصر کے ساتھ اعراب والا قول بھی ہے تو یہ آٹھ اقوال ہوئے طیبیؒ کہتے ہیں: "بیرحا" و بیرحا" دونوں میں مد ہے "بیرحا" قصر کے ساتھ ہے۔ ایک قول ہے کہ "البراح" سے درجہ میں اعلیٰ ہے یہ زمین خوبصورت اور اعلیٰ ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کہ تمام نقل شدہ اقوال سے پہلی وجہ قابل اعتماد ہے جس کو ہم نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ بعض میں "باء" کے کسرہ اور "را" کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ صحیح شدہ نسخوں میں "احب کے" رفع کے ساتھ ہے کیونکہ وہ "کَانَ" کا اسم ہے اس کی خبر "بیرحا" ہے اس کا نصب لفظی ہے یا تقدیری۔ بعض نسخوں میں "احب" نصب کے ساتھ ہے کیونکہ یہ خبر ہے اور بیرحاء اسم مؤخر ہے۔

کانت : یعنی ٹکڑا یا کنواں۔

مستقبلة المسجد : یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد۔

وکان رسول الله ﷺ یدخلها : بقعہ میں یعنی اس باغ میں یا باغ کے کنواں پر۔

ویشرب من ماء فیها : یعنی باغ سے یا کنویں سے۔

طیب: یعنی میٹھا پانی، یا حلال پانی جس میں کوئی شبہ نہ ہو۔

قال أنس فلما نزلت هذه الایة لن تنالوا البر : "بر" سے مراد جنت ہے۔ یہ قول ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور مجاہد کا ہے۔ ایک قول کے مطابق تقوی: ایک قول کے مطابق اطاعت۔ ایک قول ایک قول کے مطابق نیکی۔ حسن نے کہا ہے: لن تکونوا ابرارًا۔ تم نیک نہیں ہو سکتے۔

حتی تنفقوا مما تحبون: یعنی جو تمہیں محبوب اور پسندیدہ ہیں۔

قام ابوطلحة الی رسول الله ﷺ فقال یا رسول اللّٰه ان الله تعالٰی یقول لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (وإن أحب مالي إلى بيرحا وانها صدقة لله تعالى أرجو برها) یعنی خیر ها۔

وذخرها: یعنی اس کا نتیجہ ذخیرہ ہو جائے۔ میں اس کا پھل اور نتیجہ اس فانی دنیا میں نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا ثواب اس آخرت میں چاہتا ہوں جو باقی رہنے والی ہے۔

عند الله فضعها: یعنی اس کو خرچ کر دیں۔

یارسول الله حیث اداك الله : جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم دی ہے (بتلایا ہے) وہاں اس کو خرچ کر دیں۔ "معالم" میں "حیث شئت" کے لفظ کے ساتھ ہے۔

فقال رسول الله ﷺ بخ بخ : "باء" کے فتحہ اور "خاء" کے سکون کے ساتھ اور کسرہ مع تنوین کے۔ اس کا تکرار مبالغہ کے لیے ہے۔ صحاح میں ہے کہ یہ ایسا کلمہ ہے جس کو قائل کسی چیز سے تعجب کے وقت کہتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی مدح اور پسندیدگی کے وقت کہا جاتا ہے۔ اگر اکٹھا پڑھیں تو کسرہ اور تنوین کے ساتھ اور مقدمہ اس کے اعراب کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ "باء" کو ساکن اور کسرہ دینے کے ساتھ، تنوین اور لغتین کے۔ ضمہ اور تنوین کے ساتھ۔ تشدید، خطابی کے ہاں یہ قول

پسندیدہ ہے اگر تکرار کے ساتھ ہو تو پہلے کو تنوین اور دوسرا ساکن ہوگا۔

ذلك : یعنی جس کو تو نے ذکر کیا۔یا تذکیری خبر کی وجہ سے ہے اور وہ یہ قول ہے

مال رابح : ''باء'' کے ساتھ ایک قول یہ ہے کہ فاعل بمعنی مفعول یعنی ''مربوح'' ''یاء'' کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے یعنی رائح علیک نفعہ یہ قول طیبی نے ذکر کیا ہے۔اس کا قول ''یاء'' کے ساتھ اصل کے اعتبار سے ہے اگر اس اصل کا اعتبار نہ کریں تو پھر یاء کو ہمزہ سے بدل کر پڑھتے ہیں۔جیسے؟؟ قائل بائع عائشۃ اور معالم میں ہے۔''**بخ ذاك مال رابح** (**وقد سمعت ماقلت وأني أرى أن تجعلها**) یعنی صدقہ۔

في الاقربين : یعنی جو فقراء اور مساکین جو تمہارے قرابت دار ہوں تا کہ صدقہ اور صلہ رحمی اکھٹے ہوئے جائیں طیبیؒ کہتے ہیں: یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان پر صدقہ کرنا افضل ہے۔

فقال أبو طلحة افعل : یعنی میں آپ کے حکم کے مطابق کروں گا۔

یارسول الله فقسمها ابو طلحه في أقاربه وبني عمه : اس میں تخصیص اور تفسیر کا احتمال ہے۔

ہمارے شیوخ میں سے شیخ عطیہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔حدیث کو امام بخاری ومسلم، مالک، احمد، ترمذی ابوداؤد، نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے مسلم کی اور دوسری روایت میں ہے انہوں نے حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا۔مسند احمد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ اے اللہ کے رسول! اگر آپ چاہیں تو میں یہ پوشیدہ کروں اس کو ظاہر نہ کروں۔

جاندار کو کھلانا بھی صدقہ ہے

۱۹۴۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ تُشْبِعَ كَبِدًا جَائِعًا۔

(رواه البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲۱۷/۳ حديث رقم ۱۹۴۶۔

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین صدقہ یہ ہے کہ بھوکے جگر کا پیٹ بھر دے۔بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: امام طیبیؒ کہتے ہیں: یہ عام ہے مؤمن کافر اور ناطق وغیرہ کو شامل ہے۔اس حکم سے مستثنیٰ گزر گیا ہے۔

بَابُ صَدَقَةِ الْمَرْأَةِ مِنْ مَّالِ الزَّوْجِ

بیوی اپنے شوہر کے مال میں سے جو چیز خرچ کرسکتی ہے اس کا بیان

سکون اور تنوین کے ساتھ ابن الملک کہتے ہیں: بعض نسخوں میں ''**باب النفقه**'' ہے اور بعض میں ''**باب ما تنفقه**

المرأة من مال زوجها"۔

الفصل الاول:

صدقہ کرنے والی عورت کے ثواب کا تذکرہ

١٩٤٧: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْاَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا غَيْرَ مُفْسِدَةٍ كَانَ لَهَا اَجْرُهَا بِمَا اَنْفَقَتْ وَلِزَوْجِهَا اَجْرُهٗ بِمَا كَسَبَ وَلِلْخَازِنِ مِثْلَ ذَالِكَ لَا يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ اَجْرَ بَعْضٍ شَيْئًا۔

اخرجه البخاري في صحيحه ١٦٧/٣ حديث رقم ١٤٣٧۔ ومسلم في صحيحه ٧١٠/٢ حديث رقم (٧٩۔ ١٠٢٣)۔ واحمد في المسند ٤٤/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت عورت اپنے گھر کے کھانے میں سے صدقہ کرتی ہے اس حال میں کہ وہ اسراف کرنے والی نہ ہو تو اسے اس کے خرچ کرنے کی وجہ سے ثواب ملتا ہے اور شوہر کو اس کے کمانے کا ثواب ملتا ہے اور خازن کو بھی اس کی مثل ثواب ملتا ہے اور ان میں سے کسی کو ثواب دینے کی وجہ سے دوسرے کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: غير مفسدة : حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی صدقہ میں اسراف کرنے والی نہ ہو۔ یہ خاوند کی اجازت پر صریحاً یا دلالتاً محمول ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ اہل حجاز کی عادت کے مطابق ہے ان کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنی بیویوں کو اور خادموں کو اجازت دے دیتے تھے کہ مہمانوں کی ضیافت کریں سائل، مسکین اور پڑوسیوں کو کھلائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اچھی عادت کی ترغیب دلائی ہے۔

قولها (كان لهااجر لها بما أنفقت) یعنی خرچ کرنے کے سبب۔

ولا ينقص بعضهم أجر بعض شيئا: یعنی اس میں سے خرچ کرے جو کھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے عورت کو متصرفہ اور خازن قرار دیا ہے۔ چنانچہ جب عورت اس میں سے اس پر خرچ کرتی ہے یا جو اس کے رشتہ دار وغیرہ ہیں ان پر بغیر فضول خرچی کے تو اس کا اجر اُس کے لیے ہے۔ اس صدقہ کرنے کے جواز پر کوئی صریح دلالت اس حدیث میں نہیں ہے۔ بغیر اجازت صدقہ کرنے پر جواز والی حدیث آگے آ رہی ہے۔

اور محی السنۃ کہتے ہیں: اکثر علماء کا یہی موقف ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا جائز نہیں۔ اس طرح خادم کے لیے بھی جائز نہیں اور جو حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے وہ اہل حجاز کی عام عادت کے مطابق ہے کہ وہ بیوی و خادم وغیرہ کو عام اجازت دے رکھتے تھے جیسا کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے: لاتوعی فيوعى الله عليك۔

عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنے کا حکم

۱۹۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَتِ الْمَرْاَۃُ مِنْ کَسْبِ زَوْجِهَا مِنْ غَیْرِ اَمْرِهٖ فَلَهَا نِصْفُ اَجْرِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۰۴/۹ حدیث رقم ۵۳۶۰ ومسلم فی صحیحه ۷۱۱/۲ حدیث رقم (۸۴۔ ۱۰۲۶)۔ وابوداوٗد فی السنن ۳۱۷/۲ حدیث رقم ۱۶۸۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب عورت اپنے خاوند کی کمائی سے صدقہ اس کے حکم کے بغیر کرتی ہے تو اس کے واسطے آدھا ثواب ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: من غیر أمرہ: خاوند کی رضا کو جانتے ہوئے۔ یا اس نوع پر محمول کیا جائے کہ جس میں بغیر اجازت کے کی گنجائش ہے۔

فلها نصف أجرہ: کہا گیا ہے یہ روایت مفسر ہے اس صورت کی کہ جب وہ اپنے خاوند کے مال سے اپنے نفقہ سے بھی زیادہ لے اور اس کو صدقہ کر دے کہ اس پر تاوان ہے جو اس سے زیادہ لیا۔ اور جب خاوند کو علم ہوا وہ راضی ہو گیا تو اس کی بیوی کے لئے لیے نصف اجر ہے جو اس نے خرچ کیا۔ اور نصف اجر اس کے خاوند کو ہوگا کیونکہ اس نے اپنے نفعقہ سے بھی زیادہ صدقہ کیا اور یہ زیادتی شوہر کا حق ہے۔

داروغہ کے اوصاف اور مالک کے حکم کی تعمیل

۱۹۴۹: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْخَازِنُ الْمُسْلِمُ الْاَمِیْنُ الَّذِیْ یُعْطِیْ مَا اُمِرَ بِهٖ کَامِلًا مُّوَفَّرًا طَیِّبَةً بِهٖ نَفْسُهٗ فَیَدْفَعُهٗ اِلَی الَّذِیْ اُمِرَ لَهٗ بِهٖ اَحَدُ الْمُتَصَدِّقِیْنَ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۰۲/۳ حدیث رقم ۱۴۳۸۔ ومسلم فی صحیح ۷۱۰/۲ حدیث رقم (۷۹۔ ۱۰۲۳)۔ وابوداوٗد فی السنن ۳۱۵/۲ حدیث رقم ۱۶۸۴۔ والنسائی ۶۵/۵ حدیث رقم ۲۵۳۹۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان امانتدار داروغہ صدقہ دے کہ جو اس کو مالک نے حکم دیا ہے پورا دے اور خوش دلی کے ساتھ دے تو وہ صدقہ کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ الخازن المسلم الا مین الذی یعطی ما أمربه: یعنی صدقہ وغیرہ سے کاملاً: مفعول سے حال ہے یا مصدر محذوف کی صفت ہے۔

مؤفرا: ''فاء'' کے فتحہ اور شد کے ساتھ یعنی پورا پورا اور یہ تاکید ہے۔ اگر 'فاء'' کو کسرہ دیں تو یہ فاعل سے حال ہوگا۔ یعنی مکمل عطا کرتا ہے۔

طیبة: یعنی نفس کی چاہت کے ساتھ نا کہ نفس کے بخل کے ساتھ۔

به: یعنی عطا کرنے کے ساتھ۔

نفسه فيه فعه: "یعطی" پر عطف ہے۔

الی الذی امر له به: اس میں چار شرطیں ہیں: ① اجازت ہو کیونکہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے ما امر به ۔ ②: جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس میں کمی نہ کرے کیونکہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے کاملا موفرا۔ ③: خوش دلی کے ساتھ صدقہ کرنا بعض خزانچی اور خادم ناپسندیدگی سے صدقہ دیتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ ④: جس کے متعلق حکم دیا گیا اس کو دینا نہ کہ کسی دوسرے مسکین کو۔ خازن مبتدا اس کا مابعد اس کی صفات اور اس کی خبر۔

احد المتصدقين ہے: تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ یعنی مالک اور خازن۔ صحیح نسخہ میں جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ جمع والی روایت درست ہے۔ جیسا کہ ریاض الصالحین میں ہے۔ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں: صحیحین کی تمام روایات میں اس کا اعراب قاف کے فتحہ تثنیہ کا صیغہ ہونے کی بنا پر ہے۔ قرطبی کہتے ہیں: جمع پر کسرہ جائز ہے یعنی: متصدق من المتصدقين۔

میت کو صدقہ دینے کا ثواب ملتا ہے

۱۹۵۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّي اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَاَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَهَلْ لَهَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۲/۳ حدیث رقم ۱۳۸۸۔ ومسلم فی صحیحه ۶۹۶/۲ حدیث رقم (۵۱۔ ۱۰۰۴)۔ وابن ماجه ۹۰۶/۲ حدیث رقم ۲۷۱۷۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا میری ماں اچانک وفات پا گئی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر وہ بول پاتی تو کچھ اللہ کے لیے دیتی یا وصیت کر جاتی اگر میں صدقہ دوں تو کیا اس کو ثواب ملے گا؟ فرمایا: ہاں! یہ بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت: إن رجلا کہا گیا ہے کہ "رجل" سے مراد سعد بن عبادہ ہیں۔

قال للنبی ﷺ إن امی: میرک فرماتے ہیں وہ عمرو بنت مسعود بن قیس بن عمر بن زید ہیں۔ یہ بھی ان میں شامل ہیں جنہوں نے بیعت کی تھی۔ ہجرت کے پانچویں سال فوت ہو گئیں۔

افتلتت: افتلاف سے صیغہ مجہول ہے۔

نفسها: اکثر نسخوں میں منصوب ہے اور مفعول ثانی ہے۔ رفع کے ساتھ نائب فاعل ہے۔ "فلتة" سے مراد "بغتة" "اچانک" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے نفس کو (اچانک اُچک لیا ہے (موت دے دی ہے) اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ پھر فاعل کا ذکر ترک کر کے اس کی جگہ مفعول قائم مقام بنا دیا۔ جیسے آپ کہتے ہیں: اختلست الشی واستلبته' یہ بھی کہا گیا ہے أخذت نفسها فلتة یعنی وہ اچانک فوت ہو گئیں اور کلام کرنے پر قادر نہ ہو گئیں۔

قولہ :(فهل لها أجر إن تصدقت عنها قال نعم) کہا گیا ہے کہ میت تک صرف صدقہ اور دعا پہنچتی ہے یہ قول طیبیؒ کا ہے۔

الفصل الثانی:

خاوند کی اجازت کے بغیر ادنیٰ چیز بھی صدقہ نہیں کرنی چاہیے

۱۹۵۱: عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِهٖ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ شَیْئًا مِنْ بَیْتِ زَوْجِهَا اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِهَا قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا الطَّعَامَ قَالَ ذٰلِكَ اَفْضَلُ اَمْوَالِنَا۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷/۳ حدیث رقم ۶۷۰۔ وابن ماجه ۷۰۰/۲ حدیث رقم ۲۲۹۵۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے آپ حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرماتے تھے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر سے بغیر اذن کے کچھ خرچ نہ کرے۔ خاوند کا اذن صریحاً ہو یا دصالتاً اور کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا کھانا بھی نہ دے؟ فرمایا کھانا تو ہمارا نفیس ترین ہے۔ یہ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حجة الوداع : واؤ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ۔

لا تنفق: بصیغہ نفی ہے۔ ایک قول ہے کہ مصابیح میں ''نہی'' کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ ألا لا تنفق۔

قولها (إمرأة شيئا من بيت زوجها الا باذن زوجها) یعنی صراحتاً یا معناً اس کی اجازت ہو۔

افضل أموالنا: یعنی ہمارے نزدیک ایک نسخہ میں اُموال الناس یعنی جب اس چیز کا صدقہ کرنا جائز نہ ہوا جو درجہ میں کم ہے تو جس چیز کا درجہ زیادہ ہے یعنی کھانا تو اس کا صدقہ کرنا کیسے جائز ہوگا۔

تازہ چیزوں کو بغیر اذن کے استعمال کریں اور ان کا صدقہ کرنا بھی جائز ہے

۱۹۵۲: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ لَمَّا بَایَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النِّسَاءَ قَامَتِ امْرَأَةٌ جَلِیْلَةٌ كَاَنَّهَا مِنْ نِسَاءِ مُضَرَ فَقَالَتْ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اِنَّا كَلٌّ عَلٰی اٰبَائِنَا وَاَبْنَائِنَا وَاَزْوَاجِنَا فَمَا یَحِلُّ لَنَا مِنْ اَمْوَالِهِمْ قَالَ الرَّطْبُ تَاْكُلْنَهٗ وَتُهْدِیْنَهٗ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۶/۲ حدیث رقم ۱۶۸۶۔

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے جب آپ ﷺ نے بیعت لی یعنی احکام شریعت کے قائم کرنے پر عہد لیا۔ ایک بزرگ عورت یا دراز قد والی عورت کھڑی ہوئی گویا کہ وہ قبیلہ مضر کی عورتوں میں سے تھی پس اس نے کہا اے اللہ کے نبی ﷺ ہم اپنے باپوں بیٹوں اور شوہروں پر بوجھ ہیں تو ہمارے لیے ان کے مالوں سے کیا حلال ہے یعنی ان کے حکم کے بغیر۔ فرمایا تازہ مال کھاؤ اور بطور تحفے کے بھیجو۔ یہ ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''کاف'' کے فتحہ کے ساتھ یعنی ہمارا خاندان برا ہے۔

الرطب : ''راء'' کے فتحہ اور ''طاء'' کے سکون کے ساتھ۔ یعنی جو چیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً دودھ، شوربہ، پھل اور سبزیاں وغیرہ۔ اس میں اجازت کا پہلو ہے بغیر ان کی اجازت ہے اور اس کا اطلاق اچھی عادت پر جاری ہوتا ہے۔ برخلاف'' کے یہ قول طیبی کا ہے۔

الفصل الثالث:

مالک کی رضامندی سے خرچ کرو

۱۹۵۳: عَنْ عُمَيْرٍ مَوْلَى اٰبِى اللَّحْمِ قَالَ اَمَرَنِىْ مَوْلَاىَ اَنْ اُقَدِّ دَلَحْمًا فَجَاءَ نِىْ مِسْكِيْنٌ فَاَطْعَمْتُهُ مِنْهُ فَعَلِمَ بِذَالِكَ مَوْلَاىَ فَضَرَبَنِىْ فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرْتُ ذَالِكَ لَهُ فَدَعَاهُ فَقَالَ لِمَ ضَرَبْتَهُ قَالَ يُعْطِىْ طَعَامِىْ بِغَيْرِ اَنْ اٰمُرَهُ فَقَالَ الْاَجْرُ بَيْنَكُمَا وَفِىْ رِوَايَةٍ قَالَ كُنْتُ مَمْلُوْكًا فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَصَدَّقُ مِنْ مَالِ مَوَالِىَ بِشَىْءٍ قَالَ نَعَمْ وَالْاَجْرُ بَيْنَكُمَا نِصْفَانِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۷۱۱ حدیث رقم (۸۲۔ ۱۰۲۵)۔

ترجمہ: حضرت ابی اللحم کے آزاد کردہ غلام عمیرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے مالک نے مجھے گوشت کے پارچے بنانے کا حکم کیا یعنی سکھانے کے لیے پس میرے پاس ایک مسکین آیا۔ میں نے اس کو کھانے کے لیے دے دیا تو جب میرے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے مجھے مارا۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے مالک کو بلایا اور فرمایا اس کو تو نے کیوں مارا ہے؟ اس نے کہا۔ یہ کھانا میری اجازت کے بغیر دیتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ثواب تمہارے دونوں کے درمیان ہے اور ایک روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے کہا میں کسی کا غلام تھا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں اپنے مالک کے مالوں میں سے صدقہ کر سکتا ہوں قلیل چیز یا وہ چیز صدقہ کر سکتا ہوں جس کی عادۃً اجازت ہوتی ہے؟ فرمایا کہ ہاں تم دونوں کو آدھوں آدھ یعنی نصف نصف ثواب ملے گا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عمیر مولیٰ اَبی اللحم: یعنی اس کے آزاد کردہ۔ یہ نام ان کا اس لیے ہے کہ وہ گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ بتوں کے لیے ذبح کیا ہوا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ان کا نام عبداللہ تھا یہ قول طیبیؒ کا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی وجہ تسمیہ ابی لحم اس لیے کہ وہ اپنے مولا کے حکم پر مسکین وغیرہ کو دیتے تھے۔ جیسا کہ حدیث کے اگلے قول میں اس کی وضاحت ہے۔

تشریح: أقدد : دال کی تشدید کے ساتھ ''قد'' سے ہے۔ یعنی لمبائی میں کاٹوں۔

فقال الأجر بینکما: اگرتو چاہے اور پسند کرے ~~طیبی کہتے~~ ہیں: آپؐ نے غلام (خادم) کا ہاتھ نہیں روکا۔ بلکہ جو اس نے

مولا نے اس واضح نیکی کے کام میں اپنے غلام کے ساتھ کیا تھا اس کو ناپسند کیا ہے اور سید (مالک) کو اجر حاصل کرنے اور ان سے درگزر کرنے پر ابھارا ہے۔ یہ تعلیم اور زجید ذات ابوالحم کے لیے تھے تا کہ غلام کے فعل کو مغب بنانے کے لیے۔

موالی: "یاء" کی تشدید کے ساتھ

بشيئ: یعنی وہ چیز جس کے دینے کی عام طور سے اجازت ہوتی ہے۔

بَابُ مَنْ لَا يَعُوْدُ فِي الصَّدَقَةِ

صدقہ واپس نہ لینے والے کا بیان

یعنی صدقہ نہ حقیقی طور واپس لیا جائے اور پر نہ صوری طور واپس لیا جائے۔

الفصل الاول:

صدقہ دے کر واپس نہیں لینا چاہیے

۱۹۵۴: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ حَمَلْتُ عَلٰى فَرَسٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاَضَاعَهُ الَّذِيْ كَانَ عِنْدَهٗ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَشْتَرِيَهٗ وَظَنَنْتُ اَنَّهٗ يَبِيْعُهٗ بِرُخْصٍ فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تَشْتَرِهٖ وَلَا تَعُدْ فِيْ صَدَقَتِكَ وَاِنْ اَعْطَاكَهٗ بِدِرْهَمٍ فَاِنَّ الْعَائِدَ فِيْ صَدَقَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا تَعُدْ فِيْ صَدَقَتِكَ فَاِنَّ الْعَائِدَ فِيْ صَدَقَتِهٖ كَالْعَائِدِ فِيْ قَيْئِهٖ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٥٣/٣ حديث رقم ١٤٩٠۔ ومسلم في صحيحه ١٢٤١/٣ حديث رقم (٧۔ ١٦٢٢)۔ وابوداوٗد في السنن ٨٠٨/٣ حديث رقم ٣٥٣٩۔ والنسائي ٢٦٥/٦ حديث رقم ٣٦٩٠۔ وابن ماجه ٧٩٧/٢ حديث رقم ٢٣٨٤۔ واحمد في المسند ٢٧/٢۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں نے خدا کے راستے میں کسی کو گھوڑا دیا یعنی ایک غازی کے پاس گھوڑا نہیں تھا میں نے اس کو گھوڑا دے دیا پس اس نے گھوڑے کو ضائع کر دیا لاپرواہی کی وجہ سے دبلا کر دیا۔ میں نے چاہا کہ میں اس کو خرید لوں اور میں نے گمان کیا کہ وہ اس کو سستا بیچ دے گا۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو نہ خرید و اور اپنے صدقے کو نہ لوٹاؤ۔ اگرچہ وہ تجھ کو ایک درہم کے بدلے میں دے۔ (یہ صورۃً عود ہے نہ کہ حقیقتاً) کیونکہ اپنے دیئے ہوئے صدقہ کو واپس لینے والا کتے کی مثل ہے جو قے کر کے چاٹ لے اور ایک روایت میں ہے اپنے صدقے کو نہ لوٹا۔ اس لیے کہ صدقے سے رجوع کرنے والا اپنی قے کو چاٹنے والے کی طرح ہے۔ اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حملت: کی تخفیف کے ساتھ یعنی میں نے سوار کیا کسی شخص کو۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی مجاہدین سے کسی کے پاس سواری نہیں تو میں نے ایک گھوڑا دیا جس مجاہدین کے پاس سوار ہونے کے

لیے گھوڑے تھے ان پر گھوڑے وغیرہ صدقہ کیے جاتے تھے۔

فأضاعه: یعنی گھوڑے کو

الذی کان عنده: اس کی تربیت چلنا وغیرہ اچھا نہ تھا۔ گویا کہ وہ ضائع اور ہلاک کرنے والی چیز کی طرح تھا۔

فارت ان اشتریه: یعنی میں نے چاہا کہ وہ گھوڑا اُس سے خرید لوں۔

وظننت أنه يبيعه برخص: راء کے ضمہ اور ''خاء'' کے سکون کے ساتھ۔ یا تو گھوڑے کی حالت بدل جانے کی وجہ سے یا انہیں سستے داموں ملا تھا۔ یا میرے اس پر (سابقہ) احسان کرنے کی وجہ سے

فسألت النبي فقال لا تشتره: ''ھا'' ضمیر کے ساتھ یا بغیر ضمیر کے۔ نھی تنزیہی ہے۔

ولا تعد في صدقتك: یعنی صورتاً۔

وإن أعطاكه: (وأن) وصلیہ ہے یعنی اگر چہ۔

(قوله بدرهم) جار کا تعلق اس قول کے ساتھ ہے۔ "لا تشتره" یا "أعطاكه" کے ساتھ ہے ابن الملک کہتے ہیں کہ بعض علماء کا موقف ہے کہ صدقہ کرنے والے کا اپنی صدقہ کی ہوگی چیز کو خریدنا حرام ہے۔ یہ حدیث کے ظاہر سے مفہوم ہے۔ کبھی کبھار صدقہ کرنے والا قیمت میں نیکی کی وجہ سے کمی کرتا ہے تو وہ صدقہ میں واپس لوٹنے والے کی طرح ہو جائے گا جتنی مقدار اس نے سخاوت کی۔

قوله: فإن العائد في صدقته كالكلب يعود في قيئه: طیبیؒ کہتے ہیں۔ اس میں بہت بڑی نفرت ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد انتہائی تنگی اور خستہ چیز پر ہے اور مروت سے نکلنا ہے۔

بغوی کی کتاب ''معالم'' میں ہے۔ حمزہ بن عبداللہ بن عمر سے۔ یہ آیت عبداللہ بن عمرؓ کے دل پر بہت اثر ڈالتی تھی: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران: ۹۲] ابن عمر کہتے ہیں: میں نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں غور کیا تو میرے نزدیک سب سے پسندیدہ چیز لونڈی تھی میں نے اللہ کی رضا کی خاطر اس کو آزاد کر دیا اور وہ یہ کہتے تھے کہ: باندی مجھے اتنی محبوب تھی کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میں اللہ کی رضاء کے لئے آزاد کی ہوئی باندی میں عود کرنے والا شمار ہوں گا تو میں اس سے نکاح کر لیتا۔

صدقے کا مال واپس ہو جانے کی ایک صورت

۱۹۵۵: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ اَتَتْهُ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىْ تَصَدَّقْتُ عَلٰى اُمِّىْ بِجَارِيَةٍ وَاِنَّهَا مَاتَتْ قَالَ وَجَبَ اَجْرُكِ وَرَدَّهَا عَلَيْكِ الْمِيْرَاثُ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهُ كَانَ عَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ اَفَاَصُوْمُ عَنْهَا قَالَ صُوْمِىْ عَنْهَا قَالَتْ اِنَّهَا لَمْ تَحُجَّ قَطُّ اَفَاَحُجَّ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ حُجِّىْ عَنْهَا۔ (رواه مسلم)

[illegible] مسلم في صحيحه ۸۰۵/۲ حديث رقم (۱۵۷۔ ۱۱۴۹)۔ وابوداؤد في السنن ۶۰۴/۳ حديث رقم

۳۳۰۹-

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا آپ کے پاس ایک عورت آئی اس نے کہا کہ میں نے اپنی ماں کو ایک لونڈی بطور صدقہ کے دی تھی اور تحقیق میری ماں مرگئی ہے تو کیا میں اس لونڈی کو لے لوں اور کیا وہ میری ملک میں لوٹ آئے گی یا نہیں؟ فرمایا صدقہ کرنے کی وجہ سے تیرا ثواب ثابت ہوگیا ہے اور میراث نے لونڈی کو تجھ پر واپس لوٹا دیا۔ عورت نے کہا اے اللہ کے رسول میری ماں پر ایک مہینہ کے روزے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں فرمایا اس کی طرف سے روزے رکھو اس عورت نے کہا کہ میری ماں نے حج نہیں کیا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ فرمایا ہاں اس کی طرف سے حج کرو۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: قوله :عليك الميراث : مجازی نسبت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تجھ پر میراث کے ذریعے لوٹا دے گا اور لونڈی تیری ملکیت میں آجائے گی اور تیری طرف حلال طریقے سے لوٹے گی۔ معنی یہ ہے کہ اس کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں جس میں صدقہ کی طرف لوٹنے کی مذمت بیان ہوئی ہے کیونکہ یہ اختیاری امر نہیں ہے۔ ابن الملک کہتے ہیں اکثر علماء کا قول ہے کہ جو شخص کسی قریبی پر صدقہ کرے پھر اس کا وارث بن جائے اس کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کو کسی فقیر پر لوٹا دیا جائے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق بن چکا ہے۔

اس تعلیل کے ذریعے نص صریح سے اعراض کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔

يا رسول الله إنه : ضمیر شان ہے۔

قوله :قال صومي عنها : یعنی کفارۃ کے طیبیؒ کہتے ہیں: امام احمد نے جائز قرار دیا ہے کہ میت کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے جو اس پر قضائے رمضان نذر یا کفارہ وغیرہ کے ہیں۔ امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ نے اسے جائز قرار نہیں دیا بلکہ اس کا ولی اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک صاع جو یا نصف صاع گندم کھانا دے گا۔ اسی طرح ہر نماز کے لیے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پورے دن کی تمام نمازوں کے لیے۔

قوله :قالت إنها لم تحج قط أفأتحج عنها قال نعم حجي عنها۔

یعنی برابر ہے کہ اس پر واجب ہے یا نہیں۔ اِس کی اُس نے وصیت کی یا نہیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں: بالاتفاق جائز ہے کہ کوئی میت کی طرف سے حج کرے۔

❀ ❀ ❀

كِتَابُ الصَّوْمِ

روزوں کا بیان

لُغوی تشریح: لغوی طور پر اس کا معنی مطلقاً رُک جانا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا﴾ [مریم: ٢٦] یعنی کلام سے رک جانا۔

شرعاً اس سے مراد جماع طلوع فجر سے غروب آفتاب تک نیت کر کے اور بطن میں کچھ داخل کرنے سے رُک جانا۔ یہ تعریف ابن ہمام نے کی ہے۔

پھر کہا: یہ اسلام کا تیسرا رُکن ہے اور اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے فوائد کے لئے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ جیسا کہ روزہ کا ان دو چیزوں کے لئے موجب ہے کہ ان میں ایک دوسرے سے پیدا ہوتا ہے ان میں سے ایک نفس امارہ اور فضول قسم کی شہوات کا ٹوٹ جانا، جن کا تعلق تمام اعضائے جسمانی آنکھ، کان، زبان اور شرمگاہ وغیرہ سے ہے۔ ان کی حرکت محسوسات میں کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ جب نفس بھوکا ہو جائے تو تمام اعضاء سیر ہو جاتے ہیں۔ جب سیر ہو جائے تو تمام اعضاء بھوکے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اعراض کرنا گویا کہ یہ گندے پن سے دِل کی صفائی ہے۔ زبان، آنکھ اور دوسرے اعضاء کا فضولیات میں مشغول ہونے سے دل کی کدورت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی طہارت و پاکیزگی اور صفائی سے مصالح اور درجات پروان چڑھتے ہیں۔ ان مصالح میں سے مساکین پر رحمت وشفقت کا پہلو واجب ہو جاتا ہے۔ جب وہ بعض اوقات بھوک کے عذاب کو چکھتا ہے، تو عمومی اوقات میں یہ چیز یاد آتی ہے۔ تو اس پر نرمی، رحمت غالب آ جاتی۔ اور بھوک کی تکلیف کی حقیقت اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ تو وہ اس کو دور کرنے کے لئے جلدی جلدی نیکی کی غرض سے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین جزاء حاصل کر لیتا ہے۔ انہی مصالح میں سے ہے کہ وہ فقراء کی حالت کی موافق ہو جاتا ہے کہ جو تکالیف فقراء برداشت کرتے ہیں بعض اوقات یہ بھی وہی تکلیف برداشت کرتا ہے۔ اس حالت میں اس کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ بشر حافی سے حکایت ہے:

سردیوں میں ایک آدمی ان کے پاس آیا، اس نے انہیں اس حال میں بیٹھا ہوا پایا کہ کانپ رہا ہے اور اس کے کپڑے کھونٹی پر لٹکے ہوئے ہیں۔ اس آدمی نے اُس سے کہا: کیا آپ کپڑے اتارے ہیں یا اس کے مثل کوئی جملہ کہا۔ بشر نے کہا: اے

میرے بھائی! فقیر بہت زیادہ ہیں۔ میرے پاس طاقت نہیں کہ میں کپڑوں کے ساتھ ان کی غمگساری کروں، میں سردی برداشت کر کے ان سے مواسات کرتا ہوں، جس طرح وہ سردی کی مشقت اٹھاتے ہیں۔

اس لئے بعض اولیاء وصوفیاء کرام ہر لقمے کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں: ''اے اللہ! بھوکوں کے حق کی وجہ سے میرا مواخذہ نہ کرنا''۔ یہ باب ثابت ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام قحط کے زمانے میں سیر ہو کر نہ کھاتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس غلہ وافر تھا۔ اس لئے کہ کہیں وہ بھوک اور فاقہ زدہ لوگوں کو نہ بھول جائیں۔ ان کی ضرورت وحاجت میں ان کے مشابہ ہو جائیں۔ رمضان کی فرضیت تحویل قبلہ کے بعد شعبان میں ہجرت کے اٹھارویں مہینے کے بعد ہوئی۔ جس طرح کہ شمنیؒ نے ذکر کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے روزہ فرض نہیں تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ پہلے تھا روزہ فرض پھر منسوخ ہو گیا۔ کہا گیا ہے وہ عاشوراء کا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایام بیض کے روزے۔ تھے

ابن حجر کہتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ جب روزے فرض ہوئے تو انہوں (لوگوں) نے ناپسند کیا اور ان پر مشقت محسوس ہوئی۔ تو انہیں روزہ رکھنے اور ہر دن مسکین کو کھانا کھلانے کے درمیان اختیار دیا گیا۔ جیسا کہ آیت کے شروع میں ہے۔ پھر آیت کے آخری حصے سے اس کو منسوخ کر دیا گیا ﴿فمن شهد منكم الشهر فليصمه﴾ [البقرہ: ۱۸] جو اس مہینے میں حاضر ہو اُسے چاہیئے کہ وہ روزہ رکھے۔ جب روزہ فرض ہو گیا تو مفطر کے لئے سونے سے پہلے یا عشاء کا وقت داخل ہونے سے پہلے وطی کرنے جائز تھا۔ اس کے بعد حرام تھا۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور وطی (جماع) طلوع فجر تک جائز قرار دیا گیا۔

الفصل الاول:

رمضان المبارک میں خدا کی رحمتیں

۱۹۵۶: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَفِیْ رِوَایَةٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَفِیْ رِوَایَةٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۲/٤ حدیث رقم ۱۸۹۹۔ ومسلم فی صحیحه ۷۵۸/۱ حدیث رقم (۱۰۷۹/۲) والدارمی فی السنن ٤۱/۲ حدیث رقم ۱۷۷۵۔ ومالك فی الموطأ ۳۱۰/۱ حدیث رقم ۵۹ من کتاب الصیام۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب رمضان داخل ہوتا ہے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ایک روایت میں آتا ہے بہشت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کیے جاتے ہیں اور شیاطین قید کیے جاتے ہیں اور ایک روایت میں آتا ہے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اذا دخل رمضان : یعنی رمضان کے مہینے کا وقت اور یہ "رمضاء" سے ماخوذ ہے۔ قاموس میں ہے: رمض یومنا کفرح اشتد حره و قدمه احترقت من الرمضاء۔ سخت حرارت والی زمین کو کہا جاتا ہے۔ اس کا نام شہر رمضان اس وجہ سے رکھا گیا ہے۔ کہ جب انہوں نے قدیم لغت سے مہینوں کے نام نقل کیے، تو وہ ان اوقات کے نام پر تھے جن میں وہ واقع ہوئے۔ اس کی موافقت گرم زمانے سے ہے یا "صائم" کے رمض سے جب اس کے پیٹ کی گرمی بڑھ جاتی ہے۔ یا پھر وہ گناہوں کو جلاتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو غیر مشتق ہے یا غافر کے معنی کے طرف لوٹنے والا ہے۔ یعنی وہ گناہوں کو مٹاتا ہے اور انہیں صاف کر دیتا ہے۔

"فتحت" تخفیف کے ساتھ اور یہی کثیر استعمال ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے اور تشدید کے ساتھ مفعول کی کثرت کے لیے ہے۔ "ابواب السماء" کہا گیا ہے کہ ان کا کھولنا کنایہ ہے نزول رحمت اور اطاعت الٰہی میں شوق اور رغبت کے طلوع ہونے سے۔ اس کی مؤید "ابواب رحمت" والی روایت ہے۔

زرکشی کہتا ہے: مگر یہ کہا جائے کہ رحمت جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے کا نام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ جو اس میں فوت ہو گیا، یا کوئی عمل کیا، وہ اس پر فاسد نہیں ہوگا۔

قوله: وفي رواية فتحت ابواب الجنة:

فعل سے کنایہ ہے جو جنت میں داخل کر دے۔

غلقت: تشدید کے ساتھ اکثر روایات میں ہے۔

أبواب جهنم: یہ کنایہ ہے کہ ایسے کاموں سے رک جانا۔ جو جہنم میں داخل کر دیں، کیونکہ روزے دار کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور روزے کی برکت سے صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے: "الصیام جنة"۔

تورپشتی رحمہ اللہ کہتا ہے: آسمان کے دروازوں کا کھولا جانا نزولِ رحمت سے کنایہ ہے اور بند نہ ہونا بندوں کے اعمال کے چڑھنے کی وجہ سے ہے۔ کبھی توفیق کی وجہ سے اور کبھی حسن قبولیت کی وجہ سے۔ جہنم کے دروازوں کا بند ہونا روزے داروں کا نواحش کی بلیدگی سے اپنے نفسوں کو پاک صاف کرنا ہے۔ نافرمان اور شہوات کے کاموں سے اپنے آپ کو چھڑوانا اور نجات دلانا ہے۔ اگر کہا جائے کہ تمہارے لیے کونسی چیز مانع ہے کہ تم اس کو اصل معنی پر محمول کرو۔

ہم کہتے ہیں: چونکہ ان کا ذکر روزے داروں پر احسان اور ان پر اتمام نعمت کی وجہ سے ہے۔ جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا، اور اس کی طرف بلائے گئے، یہاں تک وہ ان کے لیے آڑ بن گیا۔ گویا کہ جنت کے دروازے کھول دیئے گئے اور اس کی نعمت مباح کر دی گئیں۔ اور آگ (دوزخ) گویا کہ اس کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس کے عذاب روک دیے گئے۔ اور اگر ان کو ہم ظاہری معنی پر محمول کریں تو احسان کا معنی اپنی جگہ واقع نہیں ہوتا۔ اور اس کا فائدہ نظر نہیں آتا، کیونکہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے تو وہ ان دونوں گھروں (جنت، جہنم) میں داخل نہیں ہو سکتا۔

شیخ محی الدین النووی نے "فتح ابواب السماء" میں دو وجہیں جائز قرار دی ہیں، اسی طرح "تغلیق ابواب" "جہنم

میں۔ یعنی حقیقت اور مجاز۔ میں کہتا ہوں: ممکن ہے کہ دروازوں کو کھولنے کا فائدہ کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو توفیق دیتے ہیں، کہ وہ روزہ داروں کے افعال پر ان کی تعریف کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اسی طرح جب روزہ دار کو اس اعتقاد کا خبر صادق سے علم ہوگا۔ تو جوش و خروش کے ساتھ اپنے اچھے افعال میں بڑھے گا۔ اس کو راحتیں محسوس ہوں گی۔ اس کی تائید میں حدیث عمرؓ ہے، جس کا تعلق تیسری فصل سے ہے: "ان الجنة تزخرفت لرمضان". [الحدیث]۔ اس کو طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

وسلسلت الشياطين: ان کے سرکشوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے: روکنے سے کنایہ ہے، تاکہ وہ نفسوں کو پھسلا نہ سکیں، اور روزہ داروں کو ان کے وسوسے قبول کرنے سے بچانا ہے۔ روزہ قوت حیوانی کو توڑ دیتا ہے۔ جو غصہ اور شہوات کی بنیاد اور طرح طرح کی برائیوں کی طرف بلاتی ہے۔ قوت عقلیہ نشو و نما پاتی ہے اور اطاعت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جیسا کہ رمضان میں اس کا مشاہدہ ہے۔ کہ اس میں معصیت کم اور عبادت زیادہ ہوتی ہے۔

وفي رواية فتحت ابواب الرحمة: اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔
امام میرکؒ کہتا ہے: ابواب السماء والی روایت میں امام بخاریؒ منفرد ہیں، اور ابو الرحمة والی روایت میں امام مسلم ہیں۔

فتحت ابواب الجنة: اس کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: اصل روایت ابواب الجنة والی ہے۔ آخری دو روایات راویوں کا تصرف ہے۔ مصنف کو چاہئے تھا کہ پہلے متفق علیہ روایت ذکر کرتا، پھر کہتے: وفي رواية فتحت ابواب السماء وفي رواية فتحت ابواب الرحمة۔ پھر ان الفاظ کو ذکر کرتا: وغلقت ابواب جهنم وسلسلت الشياطين۔

روزے دار کے لیے جنت کا ایک خاص دروازہ ہوگا

۱۹۵۷: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجَنَّةِ ثَمَانِيَةُ اَبْوَابٍ مِّنْهَا بَابٌ يُّسَمَّى الرَّيَّانُ لَا يَدْخُلُهُ اِلَّا الصَّائِمُوْنَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٢٨/٦ حديث رقم ٣٢٥٧۔ ومسلم في صحيحه ٨٠٨/٢ حديث رقم (١٦٦۔ ١١٥٢)۔ وابن ماجه ٥٢٥/١ حديث رقم ١٦٤٠۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان میں سے ایک دروازہ جس کا نام ریان رکھا گیا ہے اس میں سے صرف روزہ دار داخل ہونگے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: سهل بن سعد: یعنی ساعدی الانصاری۔ ان کا نام "حزن" تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام "سہل" رکھا۔ مؤلف نے اس کو ذکر کیا ہے اور یہ دونوں صحابی ہیں۔

قال رسول الله ﷺ فی الجنة ثمانية ابواب : یعنی عبادت کے درجات کے مطابق درجات ہیں۔ جار اس چیز سے روکتا ہے، کہ باب کو باب پر محمول کیا جائے، ہاں یوں کہا جائے کہ تقدیری عبارت: فی سور الجنة ثمانية أبواب ہے۔ جنت کی چار دیواری میں آٹھ دروازے ہیں، ہر دروازے سے گزرنے والوں کی تقسیم ہے، اہل ایمان سے صادر ہونے والے اعمال کے لحاظ سے ان دروازں کی تقسیم ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

منها باب يسمی الريان : نفس نفیس اس کا نام ریان ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ کثرت کے سے میں نہریں جاری ہیں۔ پھول اور پھلوں کے وجہ سے جو اس کے آس پاس ہیں۔ یا اس وجہ سے کہ ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ تو اس کی پیاس بجھ جائے گی اور ہمیشگی کے مقام میں اس کو لطف، تراوٹ اور لطافت حاصل ہوگی۔ زرکشیؒ کہتا ہے: ریان فعلان کے وزن پر ہے۔ کثیر الری: سیراب ہونا عطش پیا اس کی ضد ہے، اور روزے داروں کو یہ جزاء ان کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی وجہ سے ہے۔ اور لفظ ”الری“ ذکر کر کے اکتفا کیا ہے، بجائے اس کے کہ لفظ شبع ذکر کرتے۔ اس لیے کہ ”ری“ ”شبع“ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ”ری“ تبع کو مستلزم ہے کہا گیا ہے کہ اس کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا کہ اس کی مشقت سخت ہے کیونکہ اس میں جگر پیاسا ہوتا ہے خصوصاً گرمیوں میں۔ گرمیوں میں لوگ بھوک پر تو صبر کر لیتے ہیں۔ لیکن پیاس پر نہیں کر سکتے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اس کو رمضان کے ساتھ خاص کرنا یہ مراد نہیں ہے، بلکہ نوافل کو لازم پکڑنا اور کثرت سے اداء کرنا ہے۔

الا الصائمون : پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ اس طبقہ کے داخل نہ ہونے سے ایک مرتبہ میں تنقیص واقع ہوتی ہے، برخلاف دوسرے معنی کے۔ وہ کبھی دوسرے دروازے بھی داخل ہوتا ہے۔

روزے کی مقبولیت کے لیے دو شرطیں: ① ایمان ② واحتساب

١٩٥٨ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١١٥/٤ حدیث رقم ١٩٠١۔ ومسلم فی صحیحه ٥٢٤/١ حدیث رقم (١٧٥۔ ٧٦٠)۔ والترمذی فی السنن ٦٨٣/٣ حدیث رقم ٦٨٣۔ وابن ماجه ٥٢٦/١ حدیث رقم ١٦٤١۔ والدارمی فی السنن ٤٢/٢ حدیث رقم ١٧٧٦۔ واحمد فی المسند ٣٢/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے ایمان کی حالت میں روزہ رکھا یعنی شریعت کو سچ جانتا ہوا اور رمضان کی فرضیت کا اعتقاد رکھتا ہوا اور ثواب کا طلبگار رہا اسکے پہلے گناہوں کو بخش دیا جائیگا۔ اگر اس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوتا تو ان کے مکفرات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں درجات بلند فرماتے ہیں۔

تشریح: قال رسول الله ﷺ من صام رمضان : یعنی اس کے ایام میں۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے۔ کہ رمضان کو بغیر شہر کے ذکر کرنا ناپسند نہیں کرتے تھے۔ بعض علماء نے لیے خبر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے کی وجہ سے نا

پسند کیا ہے، یہ قول شاذ ہے کیونکہ خبر ضعیف سے اللہ تعالیٰ کا نام ثابت نہیں ہوتا۔

ایماناً : مفعول لہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی لا ایمان اور یہ کہتے جو کچھ نبی علیہ السلام لے کر آئے اس کی تصدیق کرنا اور روزے کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ثواب کی تصدیق کرنے والا اور یہ بھی کہا گیا ہے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی اس حال میں کہ اس کی تصدیق کرنے والا ہو۔ یا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی صوم ایمان، صوم مؤمن۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول **واحتساباً** : یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب طلب کرنا یا نجات پانا، یعنی اس کو روزے پر آمادہ کیا، ثواب وغیرہ جس کا ذکر کیا گیا۔ نہ کہ لوگوں کے خوف کی وجہ سے اور نہ ان سے شرم وحیاء محسوس کرتے ہوئے اور نہ دکھلاوہ وریا کاری کا قصد کرتے ہوئے۔ کہا گیا ہے: **احتساباً** کا معنی اس کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے روزے وغیرہ کا اس پر صبر کے ساتھ تیاری کرنا ہے۔ اور اسے جھوٹ، غیبت اور ناپسندیدہ باتوں سے روکنا ہے۔ روزے کی وجہ سے اور دنوں کی لمبائی کے لحاظ سے اس پر بوجھ نہیں ڈالنا۔

غفر له ما تقدم من ذنبه : یعنی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور کبائر کے معاف ہونے کی امید رکھے۔

ومن قام رمضان : یعنی اس کی راتوں کو۔ یا رات کو نماز تراویح، تلاوت، ذکر اور طواف وغیرہ کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ ابن ملک کہتا ہے: لیلۃ القدر کے علاوہ یعنی اس کی آگے تصریح ہو چکی ہے۔ یا اس کا معنی ہے اس کی راتوں میں تراویح ادا کرنا۔

ایماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه ومن قام لیلة القدر : چاہے اس کو لیلۃ القدر معلوم ہو یا نہ ہو۔

ایماناً : یعنی اس کے وجود کے ساتھ۔

واحتساباً : اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب کی نیت سے۔

غفر له ما تقدم من ذنبه : نووی کی کلام پہلے گزر چکی ہے۔ کہ اگر نیکیاں جب برائیوں پر آتی ہیں۔ تو اس کو مٹا دیتی ہیں جب وہ صغیرہ ہوں اگر وہ کبیرہ ہوں۔ تو ان کو ہلکا کر دیتی ہیں۔ اور یہ جنت میں رفع درجات کا باعث ہوگا۔

امام طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: تینوں امور پر ایک ہی حکم مرتب ہوتا ہے اور وہ بخشش ہے۔ یہ اس بات پر تنبیہ ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا کھلنا ہے اور پے در پے اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا تسلسل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ......﴾ [الفتح: ۲،۱]۔ ''(اے محمد) صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تم کو فتح دی فتح بھی صریح وصاف تا کہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے اور تم کو سیدھے راستے چلائے'' مالکی اصل میں ہے۔ **من یقم** : مضارع شرط واقع ہے، اور جواب لفظاً ماضی ہے معناً نہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ کا قول ہے: **ان ابا بکر رجل اسیف متی یقم مقامك رق**۔ نحوی اس کو کمزور قرار دیتے ہیں۔ بعض حضرات اس کو ضرورت کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ فصحاء کے کلام میں مطلق طور پر اس کے جواز کا حکم ہے اور چوٹی کے شعراء کے کلام میں کثرت کے ساتھ واقع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَه﴾ [الانعام: ۱۶]

﴿مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَه﴾ [ال عمران: ۱۹۲]

﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ [التحریم۔ ٤]

ابن حاجب' امالی میں کہتے ہیں: جواب شرط فقد صغت قلوبکما اخبار کی حیثیت سے ہے جیسا کہ نحویوں کا کہنا: ان تکرمنی الیوم فقد اکرمتك امس۔ اکرام جس کا ذکر کیا گیا ہے، شرط اور خبر دینے کا سبب ہے جو اکرام متکلم کی جانب سے واقع ہوا ہے۔ نہ کہ نفس اکرام سے۔ اسی پر آیت میں موجود جواب ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ [التحریم: ٤] کو محمول کیا جائے گا کہ یہ خبر کے ذکر کا سبب ہوگا اور وہ ہے "فقد صغت قلوبکما"۔ صاحب مفتاح' پہلی مثال کو ترجیح دیتا ہے۔ فان تعتد باکرامك لی الان فاعتد باکرامی ایاك امس۔ اس حدیث کی تاویل۔ من یقم لیلة القدر فلیحتسب قیامه۔ جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بخشش کا فیصلہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا

۱۹۵۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعِفُ الْحَسَنَةَ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِيْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِّيْحِ الْمِسْكِ وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّيْ امْرُءٌ صَائِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١١٨/٤ حدیث رقم ١٩٠٤۔ واخرجه مسلم فی صحیحه ٨٧/٢ حدیث رقم (١٦٤۔ ١١٥١) والترمذی فی السنن ١٣٦/٣ حدیث رقم ٧١٤ والنسائی ١٦٢/٤ حدیث رقم ٢٢١٥۔ وابن ماجه ٥٢٥/١ حدیث رقم ١٦٣٨۔ والدارمی ٤٠/٢ حدیث رقم ١٧٧٠۔ واحمد فی المسند ٢٦٦/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدم کے ہر عمل کا ثواب ایک سے سات سو گنا تک زیادہ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مگر روزہ میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا۔ یعنی اس کی جزاؤں کو میں ہی جانتا ہوں اور میں ہی دونگا اس کو اپنے غیر کے سپرد نہیں کروں گا روزے دار اپنی خواہش اور اپنا کھانا میرے لیے چھوڑتا ہے یعنی میرے حکم کی وجہ سے اور میری رضامندی کی وجہ سے اور روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہوتی ہیں۔ ایک خوشی افطار کے نزدیک اور ایک خوشی پروردگار کی ملاقات کے وقت ثواب ملنے کی وجہ سے اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے اور روزے کی وجہ سے شیاطین کے شر سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے۔ پس وہ فحش بات نہ کرے اور نہ آواز بلند کرے۔ بیہودگی کے ساتھ پس اگر اس کو کوئی برا کہے یا اس سے لڑنے کا ارادہ کرے تو پس چاہیے کہ وہ کہے کہ بھائی میں روزے دار ہوں۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: کل عمل ابن آدم: یعنی ابن آدم کا ہر عمل۔

یضاعف: یعنی ثواب کو اپنی رحمت سے بڑھائے گا۔

الحسنة : مبتداء اور خبر، یعنی نیکی کی تمام اقسام اطاعت کی تمام اقسام کو شامل ہے اور تمام کو بڑھایا جائے گا۔

بعشر امثالها: بقوله تعالٰی ﴿من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها﴾[الانعام : ١٦٠] یہ بڑھانے (دوگنا) کرنے کا سب سے کم درجہ ہے۔ ورنہ اس سے کہیں زیادہ بڑھا دیا جائے گا۔

سبعمائة ضعف: ضاد کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی اس کی مثل کئی گنا کی طرف بڑھا دیا جائے گا۔ جس طرح کہ قرآن میں ہے: ﴿ مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾[البقرة : ٢٤٥]، والله يضاعف لمن يشأ ۔ بعض کہتے ہیں: اس کی تقدیر حسنته ہے۔ لام اس ضمیر کے عوض ہے جو مبتداء کی طرف لوٹ رہا ہے، اور وہ "کل" ہے یا عائد محذوف ہے، یعنی "الحسنة منه"۔

قاضی کہتے ہیں: اس سے مراد اعمال میں سے ہر نیک عمل ہے۔ اسی لئے نیکی (حسنة) کو ضمیر کی جگہ پر لکھا ہے۔ جو کہ مبتداء کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی نیکیوں کے اجر دس سے لیکر سات سو گنا تک بڑھایا جائے گا۔ (قال الله تعالٰی الا الصوم) : یعنی اس کا ثواب اور اجر دینے کی قدرت اور شمار کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ایسی ذات ہے، جو یہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس نیکی میں اتنی خصوصیات ہیں، جو دوسری میں نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی جزاء کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو مقدس فرشتوں کے سپرد نہیں کرے گا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ غیر حکائی کلام سے استثناء ہے اس کا ماقبل اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: اس بات کا احتمال ہے کہ پہلا کلام حکایت ہو، مگر اس کی وضاحت درمیان میں کر دی گئی ہے۔

اور یہ پہلے سے زیادہ واضح ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جملے کا فائدہ بتلایا تو "حتی" کی استثناء کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نازل شدہ الفاظ کو حکایت کر دیا۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کے ساتھ خاص کرنے کی دو وجہیں ہیں:

① یہ راز ہے۔ جس پر بندوں کو علم نہیں۔ بخلاف تمام عبادات کے۔ کیونکہ روزہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے اور یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے۔

فانه لي : کیونکہ روزے کا وجود میں کوئی صورت نہیں، بخلاف تمام عبادات کے۔

وانا اجزی به : میں اس کی جزاء کو جاننے والا ہوں، اور معاملہ میری طرف ہے۔ اور میں اس کو کسی دوسرے کے سپرد نہیں کروں گا۔

② یہ خواہش نفسانی کو توڑتا ہے، اور بدن کو نقصان کے لئے پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھوک اور پیاس پر صبر کرنا ہے۔ باقی تمام عبادات مال خرچ کی طرف لوٹتی ہیں اور بدن کو اپنی خوشی وغیرہ سے مشغول کرتا ہے۔ اس کے اور روزے کے درمیان بہت دوری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں بھی اس طرف اشارہ ہے:

يدع شهوته : یعنی وہ روزے کے روک دینے کی وجہ سے ان چیزوں کو ترک کر دیتا ہے، جو نفس چاہتا ہے۔

وطعامه : عموم کے بعد تخصیص ہے یا شہوت جماع سے کنایہ ہے۔ اور طعام تمام مفطرات سے عبارت ہے۔ ایک جماعت نے اس کو قبیح مفسدات میں شمار کیا ہے۔ (من أجلي : یعنی میرے حکم، میری رضا کے حصول اور میرے اجر کے لئے۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزے میں نیت اور اخلاص کا اعتبار ہوگا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں ''ریاء'' نہیں ہے۔

ابن ملک کہتے ہیں: یہ کہنا "وانه لی" یعنی اس میں کوئی بھی شریک نہیں۔ کیونکہ تمام عبادات جس میں بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اس عبادت کے ذریعے مشرک اپنے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن یہ کسی جماعت سے نہیں سنا گیا کہ روزے کے ساتھ انہوں نے اپنے معبودوں کی عبادت کی اور نہ ہی کسی زمانے میں اس سے تقرب حاصل کیا گیا روزے دار کی خدمت کرنے والے جیسے جن اور ستارے وغیرہ نہ کہ ان کے ذاتیں بلکہ چاہئے کہ جسمانی کدورات سے خالی ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ روحانی تصور پیدا کر لیں۔

للصائم فرحتان: یعنی دو مرتبہ دو بڑی خوشیاں۔ ایک دنیا میں، دوسری آخرت میں ہے۔

فرحة عند فطره: افطار کے ساتھ اس کا عہدہ سے نکلنا، جس کا حکم دیا گیا ہے۔ یا روزے کو پورے کرنے کی توفیق کے پائے جانے کی وجہ سے یا بھوک اور پیاس کے بعد کھانے پینے کی وجہ سے یا حصولِ ثواب کی امید کی وجہ سے حدیث میں ہے: **ذهب الظماء وثبت الا** کہ روزہ دار کی افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

فرحة عند لقاء ربه: بدلہ ملنے کی وجہ سے۔ یا ثنا کے حصول اور کامیابی پانے کی وجہ سے۔

ولخلوف: لام ابتداء کے فتحہ کے ساتھ۔ ''خاء'' کے ضمہ کے ساتھ۔ جب منہ خراب ہو تو ہوا بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔

زرکشیؒ کہتے ہیں: ''خاء'' کے فتحہ کے ساتھ۔ خطابیؒ کہتے ہیں: وہ غلط ہے۔ یعنی جو کھانے کے بعد خلاف عادت روزے دار کے منہ میں ناپسند بو ہوتی ہے۔

أطيب: یعنی افضل، محبوب اور پسندیدہ۔

عند الله من ريح المسك: تمہارے پاس۔ کیونکہ روزے دار کے منہ کی بو روزے کے اثر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور وہ عبادت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ خود ہی اپنی طرف سے اس کو جزاء دے گا۔ ابن ملکؒ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ ہمارے بعض علماء کہتے ہیں: اس کی فضیلت جو روزے دار کو ناپسندیدہ ہے، اچھی چیز پر جو اس کی جنس سے لذت حاصل کی جائے، تاکہ اس پر قیاس کیا جائے، جو روزے کے آثار اور نتائج کے لحاظ سے اس سے اوپر ہے۔

اس میں اشارہ ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسواک وغیرہ سے اس بُو کو زائل نہ کرے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے اس سے استدلال کیا ہے۔ کہ زوال کے بعد مسواک مکروہ ہے۔ کیونکہ اس کی مثال ماں کے قول کی طرح ہے کہ میرے بچے کا پیشاب میرے نزدیک گلاب کے پانی سے اچھا ہے۔ اس سے لازم نہیں آتا کہ پیشاب کے وقت اس کو نہ دھوئیں۔ تو اسی طرح یہ بھی ان شاءاللہ اس مسئلہ پر مکمل بحث "باب تنزيه الصوم" کے میں آئے گی۔

والصيام جنة: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ یعنی ڈھال کی طرح بچانے والا۔ اس سے مراد ہے کہ یہ روزے دار کے لئے پردہ اور قلعہ ہے تاکہ وہ دنیا میں نافرمانی کے کاموں سے بچ کر آخرت میں جہنم میں جانے سے بچ جائے۔ (**واذا**: صحیح نسخہ میں **فاذا**'' یعنی جب تجھ کو روزے کے مکمل فضائل اور فوائد کا علم ہو جائے۔

كان يوم صوم احدكم : "يوم" کے رفع کے ساتھ کہ کان تامّہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: نصب کے ساتھ۔ تو تقدیری عبارت یوں ہوگی۔ "اذا كان الوقت يوم صوم احدكم"۔

فلا يرفث : فاء کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ زرکشیؒ کہتے ہیں: "فاء" پر تینوں حرکتیں ہیں۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔

ولا يصحب : "فاء" کے فتحہ کے ساتھ۔ وہ اپنی آواز کو ہذیان (بری بات) کے ساتھ بلند نہ کرے۔ ان دونوں باتوں سے اس لئے منع کیا ہے۔ تاکہ اس کا روزہ مکمل ہو جائے۔ معنی یہ ہے کہ روزے دار تمام منع شدہ اور ملامت والے کاموں سے رک جائے۔ بخاریؒ کی روایت میں ہے **ولا يجهل** : زرکشیؒ کہتے ہیں: کہ جہل: علم جس کا تقاضا کرتا ہے اس کے خلاف عمل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ تخصیص کے بعد عموم ہے۔

فان سابه احد : یعنی اس کی ابتداء سب وشتم کے ساتھ ہو۔

أو قاتله : یعنی لڑائی، مار پیٹ، جھگڑا اور مجادلہ کا ارادہ کرے۔

فليقل انى امرؤ صائم : یا تو زبان کے ساتھ جھگڑنے والے کو ڈانٹے گویا کہ اُس سے کہے: جب میں روزے سے ہوں تو میرے لئے جائز نہیں تیرے ساتھ جھگڑا۔ یا سب وشتم کروں اور نہ تیرے لائق ہے کہ اس وقت میرے ساتھ تو معارضہ کرے۔ یہ عادتاً مروت کے خلاف ہے۔ تو جھگڑنے والا چلا جائے گا۔ یا اس کا یہ معنی ہے تیرے لائق نہیں کہ تو میرے اوپر زبان یا ہاتھ کو دراز کرے۔ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں ہوں۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہو۔ تو اس سے ٹکرانے والے کو وہ ہلاک کر دیتا ہے۔ میرے لائق نہیں کہ میں تجھ سے ناراض ہو جاؤں اور میں تجھ کو معاف کرتا ہوں۔ یا اپنے دل میں کہے: اس کو جان لینا چاہئے کہ فحش گوئی اور غضب ناک ہونا اس کے لئے جائز نہیں۔ بخاری کی روایت میں ہے "فليقل انى صائم" دو مرتبہ۔

زرکشیؒ کہتے ہیں: دل اور زبان کے ساتھ کہے نہ کہ دل میں کہے، اس کو یہ فائدہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو لڑائی اور جھگڑے سے روک لے۔ زبان سے کہنے سے یہ مطلب کہ وہ جھگڑنے والے کو زیادتی سے روکے۔ یہ شریعت کے اہم امور میں سے ہے۔

الفصل الثانی:

رمضان کی فضیلت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک

۱۹۶۰ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَيْلَةٍ مِّنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَّفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَّيُنَادِیْ مُنَادٍ يَا بَاغِیَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَيَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذَالِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٦/٣ حدیث رقم ٦٨٢۔ وابن ماجه ٥٢٦/١ حدیث رقم ١٦٤٢۔ والنسائی فی السنن ١٢٩/٤ حدیث رقم ٢١٠٧۔ واحمد فی المسند ٣١١/٤۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جس وقت رمضان کے مہینے کی پہلی رات ہوتی ہے شیطان قید کیے جاتے ہیں اور سرکش جنات اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور کوئی دروازہ نہیں کھولا جاتا ہے مگر بہشت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اور بہشت کا کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور پکارتا ہے پکارنے والا اے خیر کے طلب کرنے والے یعنی عمل اور ثواب کے متوجہ ہو یعنی اللہ کی طرف۔ اے برائی کے ارادہ کرنے والے بندہ اور اللہ کے واسطے آزاد کئے ہوئے آگ سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بہت سے بندوں کو آزاد کرتا ہے آگ سے اس ماہ مبارک کی حرمت کی وجہ سے۔ پس شاید تو بھی ان میں سے ہو اور یہ پکارنا ہر شب میں ہوتا ہے یعنی رمضان کی راتوں میں یہ روایت ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: **صفدت** : تشدید کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ۔ یعنی قید کر دیئے جاتے ہیں۔

مردة الجن : "مارد" کی جمع جیسے **طلبة** اور **جهلة** کے وزن پر اور وہ شر کے لئے ہے۔ اس سے لفظ "امرد" ہے۔ اس لئے کہ وہ شعور سے خالی ہوتا ہے۔ عموم کے بعد تخصیص ہے یا عطف تفسیر یا بیان ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مارد وہ ہے جو سخت رو اور درشت ہو۔ شیطانوں کو جکڑنا رمضان کے ساتھ خاص ہے۔ یا رمضان میں اور اس کے بعد والے ایام میں۔ کلام مختصر ہے۔ اس میں ہے اگر ان سے مراد ایام اللیالی کی ضد ہیں۔ تو بعینہ یہی حدیث اس کی تردید کرتا ہے: جیسا کہ فرمایا **اذا کان اول لیلة** ۔ اگر اس سے مراد اوقات ہوں تو صحیح ہے، لیکن اس قول **واما فیها** کا کوئی معنی نہیں

میں نے طیبی رحمہ اللہ کی شرح کو دیکھا اس میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ **روی البیهقی عن الامام احمد عن الحلیمی** انہوں نے کہا: احتمال ہے کہ اس سے مراد خاص ایام ہوں، اور شیاطین سے مراد وہ جو شیاطین ہوں باتوں کو چراتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ سرکش شیطان کہتے ہیں کہ رمضان کا مہینہ ایسا وقت ہے جس میں قرآن کے نزول کا وقت آسمان دنیا کی طرف ہے اور پہرے دار فرشتے وہ شعلے پھینکتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وحفظناها**﴾ [الحجر : ١٧] رمضان کے مہینے میں تصفید حفاظت میں مبالغہ کے لیے ہے۔ احتمال ہے اس سے مراد رمضان کے ایام اور بعد کے ایام ہیں۔ معنی یہ ہے کہ شیاطین لوگوں کے فساد سے جدا نہیں ہوتے جو وہ رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں ہوتے ہیں۔ رمضان میں یہ بہت کم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا روزے میں مصروف ہونا جس میں شہوات کا قلع قمع ہے اور اسی طرح تمام عبادات اور تلاوتِ قرآن کے ساتھ خواہشاتِ نفس کو ختم کیا جاتا ہے۔ پہلے احتمال پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ پیچھے گزر چکا ہے۔ اسی طرح اس وصف سے ایام نزول وحی کا اختصاص لازم آتا ہے، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اختلاف ظاہر ہے۔ تصفید کے اطلاق کی نفی کرتا ہے۔ اور باقی اوصاف اس کے مناسب نہیں ہیں۔ جو آگے آ رہے ہیں، بطور استحقاق کے۔ کہا گیا ہے شیطانوں کو جکڑنا اور انہیں قید کرنا۔ تا کہ وہ روزے داروں میں وسوسے نہ ڈالیں۔ اور اس کی یہ نشانی ہے کہ ان کا شہوات وغیرہ سے رک کر

پاک صاف ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں سے اس مہینے میں گناہوں کا صدور ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شیطانوں کے وسوسے ان شریر نفوس میں گہرے نفوذ کو چکے ہوتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ بڑے بڑے شیطانوں کو جکڑا جاتا ہے یعنی ان کو خاص کیا گیا ہے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ قیدان کے گمراہ کرنے اور سرکشی میں کمزوری سے کنایہ ہے۔

وفتحت ابواب الجنة فلم يغلق منها باب : شاید کہ وہ مخصوص دروازے ہیں۔ یا ان دونوں کے دروازے رمضان کے علاوہ کبھی بند کیے جاتے ہیں اور کبھی کھولے جاتے ہیں۔ لیکن اس مبارک زمانے میں اس کی عظمت کی بدولت بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ اس مہینے کے عظیم ہونے پر دلالت ہے۔ اور اس بابرکت مہینے کے لطیف ترین خوبیاں یہ بھی ہیں: کثرتِ اطاعت، معصیت کا کم ہونا، اور اس کا مشاہدہ احساسات سے ہوتا ہے۔ اس فرصت کو غنیمت سمجھیں، اور اس قول میں بھی یہ اشارہ موجود ہے۔ **وينا دى مناد** : یعنی زبانِ حال سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ یہ بات کہتا ہے۔

يا باغي الخير : یعنی عمل اور ثواب کو طلب کرنے والے۔

أقبل : یعنی عبادات اور اطاعت میں زیادہ سے زیادہ کوشش کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ اور یہ حکم "اقبال" یعنی "تعال" سے ہے۔ یہ تیری گھڑیاں ہیں تجھے کم عمل پر زیادہ ثواب دیا جائے گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے اے خیر کو طلب کرنے والے! ہم سے اور ہمارے اطاعت سے منہ پھیرنے والے ہماری طرف اور ہماری عبادات کی طرف متوجہ ہو جا، تمام قسم کی خیر ہماری قدرت اور ارادے کے ماتحت ہے۔

يا باغي الشر : یعنی معصیت کا ارادہ کرنے والے۔

أقصر : ہمزہ کے فتحہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی معصیت سے رک جا اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آ۔ یہ توبہ کے قبول ہونے کے اوقات ہیں اور مغفرت کی تیاری کا زمانہ ہے۔ شاید اطاعت کرنے والوں کی اطاعت، گناہ گاروں کی توبہ اور مقصرین کا رجوع رمضان میں پکارنے والوں کے اثر سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے اقبال کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ اکثر مسلمان بڑے ہوں یا چھوٹے وہ روزے کی حالت میں ہوں گے۔ بلکہ اکثر وہ لوگ جو نمازیں چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ ان دنوں میں نمازی ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ روزہ نماز سے مشکل ہے۔ اور روزہ سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ جو عبادت میں سستی کا مقتضی ہے اور کثرت نیند عادت بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود آپ مساجد کو بھرا ہوا پائیں گے اور رات کو اٹھ کر عبادت کرنا چاروں طرف پائیں گے۔ "والحمد لله ولا حول ولا قوة الا بالله"۔

ولله عتقاء : یعنی بہت زیادہ۔

من النار : شاید کہ آپ ان میں سے ہوں۔

وذلك : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ذلک سے یا تو بعید کی طرف اشارہ ہے جو کہ "نداء" ہے۔ یا قریب کی طرف جو کہ "ولله عتقاء" ہے۔ **كل ليلة** : یعنی رمضان کی ہر رات میں۔

جندی کہتے ہیں: دونوں (ترمذیؒ و ابن ماجہؒ) نے "**من طريق أبي بكر بن عياش عن الأعمش عن أبي صالح عن أبي هريرة**" کی سند سے روایت نقل کی ہے اور یہ اسناد صحیح نہیں۔ میرکؒ کہتے ہیں: یہ غور و فکر سے خالی نہیں ہے۔ ابوبکر بن

عیاش مختلف فیہ ہے۔ اکثر کہتے ہیں: وہ کثیر الغلط ہے۔ اگر یہ اعمش سے روایت کرے تو ضعیف۔ اس لئے امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ روایت غریب ہے۔ ہم اس کو نہیں جانتے سوائے ابو بکر کی روایت کے۔ میں نے محمد بن اسماعیل البخاریؒ سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: **حدثنا الحسن بن الربیع، عن أبي الاحوص عن الاعمش عن مجاهد قوله** ۔ یہ میرے نزدیک ابو بکر کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی اس کا مجاہد پر موقوف ہونا درست ہے۔ امام ترمذیؒ کا کلام ختم ہوا۔

لیکن شیخ ابن حجر عسقلانیؒ کے کلام سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ حدیث مرفوع ہے۔ اس حدیث کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں۔ اسی طرح بیہقی نے ابن مسعود سے بیان کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں: **"فتحت ابواب الجنة فلم يغلق باب منها الشهر كله"**۔

حدیث کے مرفوع ہونے کی تائید اس ہوتی ہے کہ اس جیسی بات رائے سے نہیں کہی جا سکتی اور جو بات رائے نہیں کہی جا سکتی وہ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے لہٰذا یہ حدیث بھی حکماً مرفوع ہے۔ واللہ اعلم۔ میرکؒ کا کلام پورا ہوا۔ اس میں سب سے پہلی بات یہ کہ ابن عیاش اگر چہ اکثر کے نزدیک کثیر الغلط لیکن کچھ لوگوں کے ہاں ضابط ہے۔ ان میں سے جزری ہیں اسی لیے انہوں نے کہا: اس کی اسناد صحیح ہیں۔ ان کا یہ کہنا **"وهو ضعيف عن الاعمش"** غرابت سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ضعیف ضعیف ہی ہے چاہے وہ اعمش سے روایت کرے یا کسی دوسرے۔ ان کا کہنا: **"ولذا قال الترمذی غريب"** یہ ضعف پر دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کے غریب ہونے پر دلالت ہے۔ اس لحاظ سے کہ انہوں نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے۔ برخلاف اس کے جس نے اس کو موقوفاً ذکر کیا ہے، غرابت حسن اور صحیح کے منافی نہیں۔ جیسا کہ اصول میں یہ بات طے ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے کہا: کہ اس کا مجاہد سے موقوف ہونا مرفوع ہونے سے زیادہ صحیح ہے۔ باوجود اس کے اس میں نزاع ہے۔ آخری فیصلہ (حکم) جو حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ اس کا مرفوع ہونا صحیح ہے۔ یہ اور ابو بکر بن عیاش امام عاصم کا شاگرد ہے، جو قراء سبعہ میں سے ہیں۔ اور یہ نام شعبہ نے ذکر کیا ہے، اور وہ قراءۃ حفص میں بہت مقدم ہیں اور ان کے ساتھی (شاگرد) فضائل میں بہت فوقیت والے ہیں۔ لیکن ابو بکر کے ضعف میں اس وجہ سے اختلاف ہے کہ حدیث پر ان کا ضبط کم تھا۔ واللہ اعلم

۱۹۶۱:ورواه احمد عن رجل وقال الترمذی هذا حديث غريب ـ

اخرجه احمد فی المسند ۴/۳۱۲۔

ترجمہ: امام احمدؒ نے بھی اس روایت کو ایک شخص سے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: عن رجل : ضعف کی طرف اشارہ ہے، راوی کی جہالت کی وجہ سے۔ لیکن پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ روایت دوسرے طرق سے صحیح ہے۔ یہ جہالت نقصان دہ نہیں۔ یعنی اسناد کے لحاظ سے جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔

الفصل الثانی:

رمضان اور لیلۃ القدر کی فضیلت

١٩٦٢: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَاكُمْ رَمَضَانُ شَهْرٌ مُبَارَكٌ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَتُغَلُّ فِيْهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِيْنِ لِلّٰهِ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ۔ (رواه احمد والنسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ١٢٩/٤ حديث رقم ٢١٠٦۔ واحمد فی المسند ٢٣٠/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ رمضان کا بابرکت مہینہ تمہارے پاس آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کیے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور سرکش شیطانوں کو طوق پہنائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رمضان کے مہینے میں آخری عشرے میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یعنی اس میں عمل کرنا ہزار مہینوں کے عمل کرنے میں افضل ہے جو کوئی لیلۃ القدر کی خیر سے محروم رہا۔ پس وہ بھلائی سے محروم رہا۔ اس کو امام احمدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ أتاكم: ای جاء كم۔

رمضان: یعنی اس کا زمانہ اور اس کے دن۔

شهر مبارك: بدل ہے یا بیان ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے۔ هو شهر مبارك۔ اس کے ذریعے خبر دینا مقصود ہے کہ اس مہینے میں حسی اور معنوی خیر زیادہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے مشاہدہ میں ہے۔ اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ دعا ہو، یعنی "جعله الله مباركًا علينا وعليكم"۔ اور یہی اصل ہے تمام مہینوں کے نیک خواہشات کے مبارک باد دیتے ہیں پہلے قول کی تائید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہے: "اللهم بارك لنا فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان" اس میں اشارہ ہے کہ رمضان شروع سے مبارک ہے، اس کے لئے دعا کی ضرورت نہیں، لیکن کہا جا سکتا ہے یہ برکت کی زیادتی کے قبول ہونے میں کوئی مانع نہیں۔

فرض الله عليكم صيامه: یعنی کتاب و سنت اور اجماع امت سے۔

تفتح فيه ابواب السماء: جملہ استینافیہ بیان کے لئے ہے۔ حال ہونے کا بھی احتمال ہے اور صیغہ مجہول ہے۔ تینوں افعال مؤنث کے ہیں اور ان کو مذکر پڑھنا بھی جائز ہے۔ پہلے دونوں فعل مخفف ہیں، اور مشدد بھی ہو سکتے ہیں۔

وتغلق فيه أبواب الجحيم: ایک نسخہ میں "حمیم" ہے۔ اور یہ تصحیف ہے۔

وتغل: باب افعال سے تشدید کے ساتھ۔

فيه مردة الشياطين: اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مقید صرف سرکش شیطان ہیں۔ یہ ایک لطیف معنی ہے

جس سے پچھلا اشکال زائل ہو سکتا ہے۔ "المردة" کا عطف شیاطین پر ہے، پہلے حدیث میں عطف بیان اور تفسیر ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قید عام شیاطین کی بھی ہو بغیر اغلال کے۔ صحیح بات اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

لله فيه : یعنی فی لیالی رمضان: مضاف محذوف ہے۔ یا رمضان کے آخری عشرہ میں غالباً۔ ورنہ تو یہ تمام رمضان میں مبہم ہے۔ یا سارے سال میں مبہم ہے؟ جیسا کہ ہمارا مذہب ہے۔ اسی لئے اگر کوئی اپنی عورت سے کہے: تجھے لیلۃ القدر میں طلاق، تو اُسے طلاق نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ اس پر پورا سال گذر جائے۔

ليلة خير من ألف شهر : یعنی اس رات میں عمل ہزار مہینوں سے افضل ہے جن میں لیلۃ القدر نہ ہو۔

و من حرم : صیغۂ مجہول کے ساتھ۔

خيرها : نصب کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: يقال حرمه الشيء يحرمه حرمانا و أحرمه، ایضاً۔ یعنی اس سے روک دیا ہے۔ قاموس میں ہے: أحرمه لغية یعنی اس کی خیر سے روکنا۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ جس کو اس رات کو زندہ کرنے (جاگ کر عبادت کرنے) کی توفیق نہ ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے اور بعد میں اطاعت ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: "أن من صلى العشاء والصبح بجماعة فقد ادرك حظه من ليلة القدر"۔ اور مسلم کی شرح میں ہے کہ کوئی بھی اس فضیلت کو نہیں پا سکتا مگر جس کو اللہ تعالیٰ اس پر مطلع کر دے، اس سے مراد کامل فضیلت ہے۔

فقد حرم : یعنی اس سے تمام بھلائی روک لی گئی، جیسا کہ صراحتاً آگے آئے گا۔ اس میں بہت مبالغہ ہے۔ مراد کامل ثواب سے محرومی ہے۔ یا اس بخشش سے جس کا تعلق اس رات کو زندہ کرنے کے ساتھ ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شرط اور جزاء کا متحد ہونا عظیم جزاء پر دلالت ہے۔ یعنی وہ اس خیر سے محروم ہو گیا۔ جس کی کوئی مقدار معلوم نہیں۔

میرک کہتے ہیں: اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ تمام نے أبو قلابہ عن أبي ہريرة۔ اور اس سے نہیں سنا جو میں جانتا ہوں۔ یہ قول منذری کا ہے۔

روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن سفارش کریں گے

۱۹۶۳ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَىْ رَبِّ اِنِّىْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِىْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

رواه البيهقى فى شعب الايمان۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا روزہ اور قرآن بندے کے لیے شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا اے میرے رب تحقیق میں نے اس کو کھانے سے منع کیا اور دن کو چیزوں میں رغبت کی یعنی پانی بمعہ جماع اور رغبت وغیرھا سے پس میری شفاعت کو قبول کرو۔ اس کے حق میں اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو سُلا تھا نیند سے۔ تو پس میری اس کے حق میں شفاعت قبول کر۔ تو پھر اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس کو بیہقی

نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: وعن عبداللّٰہ بن عمرو: واؤ کے ساتھ رضی اللّٰہ عنہما۔

الصیام: یعنی رمضان کا روزہ۔

والقرآن: یعنی قراءتِ قرآن۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: قرآن یہاں تہجد اور قیام اللیل (تراویح) سے عبارت ہے۔ جیسا کہ قرآن کے ذریعے سے نماز کو تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وقرآن الفجر﴾ [الاسراء: ۷۸] اور حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ہے: "ویقول القرآن منعته النوم باللیل"۔ ابن حجرؒ نے اس کا تعاقب کیا ہے۔

یشفعان للعبد: یعنی صفات اور اعمال کو جسم دیا جائے گا اور حالت کے بیان کا بھی احتمال ہے۔

یقول لصیائم أی رب: یعنی یارب۔

منعته الطعام والشهوات: الأعم کا عطف ہے۔

بالنهار فشفعنی: تشدید کے ساتھ، یعنی میری سفارش قبول کر۔

فیه: یعنی اس کے حق میں۔

ویقول القرآن: چونکہ قرآن کلام اللہ ہے۔ مخلوق نہیں۔ اس لیے "أی رب" نہیں کہا۔ ابن حجرؒ نے یہاں بہت سنگین غلطی کی ہے۔ کہ انہوں نے یہاں "ای رب" مقدر مانا ہے جو کہ اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے۔ جو معتزلہ کے خلاف ہے۔ یہ نہ کہا جائے گا کہ قرآن سے مراد جو قرآن پڑھا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں: کہ ایسی تقدیر نکلنا صحیح نہیں جو مشکوک و گمراہ ہو اور سیدھے راستہ سے ہٹا کر غلط تفسیر و تاویل کی طرف لے جائے۔ علاوہ اس کے کہ قاعدہ مقررہ ہے۔ کہ مراداً اعتراض کو دفع نہیں کرتا۔ کلام صحیح نہیں اس کی تاویل نہیں کی جائے گی، آپ اس پر غور کریں، وہ معول ہے۔ لیکن محققین شافعیہ کہتے ہیں: اگر آپ کہیں: کیا یہ کہنا جائز ہے؟ کہ قرآن مخلوق ہے، اور اس سے مراد قرآن لفظی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس میں ابہام ہے جو کفر کی طرف لے جائے۔ اگرچہ اس اعتبار سے معنی صحیح ہے، جیسا کہ جبار لغت میں لمبی کھجور ہے۔ کو کہتے ہیں لیکن یہ ممنوع ہے کہ کہا جائے "الجبار مخلوق" اور مراد کھجور ہو۔ ابہام کی وجہ۔ واللہ اعلم۔

میں نے ابن حجر کے کلام کو دیکھا جو انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے ایک آدمی کو کہتے ہوئے سنا: اے قرآن کے ربّ: اس سے کہا: یہ کہنا چھوڑ۔ تجھے پتا نہیں، قرآن اس سے ہے، یعنی قدیم صفت جو اس کے ذات کے ساتھ قائم ہے۔ یہ جائز نہیں اس کو ربوبیت کی صفت کے ساتھ موصوف کیا جائے۔ جو حادث اور ذات سے تفصال کا تقاضا کرے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ بات دعویٰ میں صریح ہے۔ الحمد لله علی ما أولی وهوله أولی فی الاخرة أولی ولأولی۔

منعته النوم باللیل فشفعنی فیه فیشفعان: شد کے ساتھ مجہول یعنی ان دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔ یہ ان دونوں کے عظمت پر دلال ہے۔ رمضان کی سفارش برائیوں کو مٹانے کے لیے ہے، اور قرآن کی سفارش درجات کی بلندی کے

لئے ہے۔ الشفاعة و القول کا تعلق صیام سے ہے، یہ مضبوط سہارا اور صراط مستقیم ہے۔ عقول بشری عوالم الٰہیہ کے ادراک سے مضمحل ہیں، ہمارے پاس تسلیم اور قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ جس نے تاویل کی اس نے کہا: شفاعت اور قول صیام اور قرآن کے لئے استعارۃً اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھانے کے لیے ہیں۔ اور عزت وتکریم عطا کرنے کے لئے ہیں۔ رفع درجات اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس کو احمد نے اور طبرانی نے معجم الکبیر میں روایت کیا۔ اس کے رجال صحیح ہیں۔ روایت قبول کرنے میں قابل حجت ہیں۔ ابن ابی دنیا نے کتاب الجوع میں ان کے علاوہ دوسروں سے بھی حسن اسناد سے بیان کیا ہے۔ امام حاکمؒ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہا: صحیح ہے اور مسلم کی شرط پر ہے۔ اسی طرح امام منذریؒ نے ذکر کیا ہے۔

رمضان شریف کی رحمت سے محرومی بڑی بدنصیبی ہے

۱۹۶۴: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ دَخَلَ رَمَضَانُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذَا الشَّهْرَ قَدْ حَضَرَكُمْ وَفِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَلَا يُحْرَمُ خَيْرَهَا اِلَّا كُلُّ مَحْرُوْمٍ۔

اخرجه ابن ماجه في السنن ۵۲۶/۱ حديث رقم ۱۶۴۴۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رمضان داخل ہوا۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تحقیق تم پر یہ مہینہ آیا ہے اور اس میں ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے یعنی شب قدر جو شخص محروم رہا اس سے یعنی اس کی خیر سے کہ اس میں اس کو عبادت کی توفیق نہ ہوئی۔ پس تحقیق وہ ہر خیر سے محروم رہا اور نہیں محروم کیا جاتا اس کی خیر سے مگر بدنصیب۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ان هذا الشهر: اشارہ تعظیم کے لئے ہے اور جس کی طرف اشارہ ہے وہ مقربین کے ہاں محسوس ہے، جیسا کہ میرے سید عبدالقادر روح اللہ روح الکریم سے منقول ہے۔

قد حضرکم: یعنی اس کے دن میں روزہ رکھنے اور رات کو قیام کرنے کو اس کے آنے کی وجہ سے غنیمت سمجھو۔

وفيه ليلة: اس کی راتوں میں سے۔

خير من ألف شهر: یعنی اس کو تلاش کرو، ہر رات میں اس امید کے ساتھ کہ تم اس کو پالو گے۔

من حرمها: یعنی اس کی نیکی اور اس رات عبادت کی توفیق اور اس رات میں تھوڑی سی دیر کے قیام سے روک دیا گیا۔

فقد حرم الخير كله ولا يحرم خيرها: یعنی اس سے پیچھے رہ گئے۔

الا كل محروم: بدل ہونے کی وجہ مرفوع ہے۔ استثناء کی بناء پر نصب دینا جائز ہے۔ یعنی "كل ممنوع من الخير" ہر کوئی جو خیر سے روک دیا گیا۔ اس کا سعادت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور عبادت میں اس کا کوئی ذوق نہیں۔

رواه ابن ماجه منذریؒ نے کہا ہے: اس کے راوی حسن ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ طبرانیؒ نے حضرت انسؓ سے معجم الاوسط

میں روایت کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

"قال سمعت رسول الله ﷺ يقول : هذا رمضان قد جاء كم يفتح ابوب الجنة ويغلق فيه ابواب النار وتغل فيه الشياطين فبعد المن ادركه رمضان فلم يغفر له اذا لم يغفر له فمتى"۔ اس کو میرکؒ نے نقل کیا ہے۔

آپ ﷺ کا شعبان کے آخری دنوں میں وعظ

۱۹۶۵ :وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُّزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْءٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ كُلُّنَا نَجِدُ مَا نُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ اَوْ تَمْرَةٍ اَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَاُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ۔

(روى البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٣/٣٠٥ حديث رقم ٣٦٠٨۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں شعبان کے آخری ایام میں جمعہ کا خطبہ وعظ فرمایا پس آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! تحقیق ایک بڑے مہینے نے تم پر سایہ ڈالا ہے۔ یعنی رمضان کا مہینہ قریب آیا ہے یہ بابرکت مہینہ ہے اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یعنی لیلۃ القدر۔ اس کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور رات کا قیام نفل کیا ہے جو شخص اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے نیکی کی کسی خصلت کے ساتھ یعنی نفل کی قسموں سے وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں فرض ادا کیا۔ یعنی نفل کا ایسے ثواب ملتا ہے جیسے دوسرے دنوں میں فرض کا ملتا ہے اور جس نے رمضان میں فرض ادا کیا اس کو ستر فرضوں کے برابر ثواب ملتا ہے جو اس نے رمضان کے علاوہ ادا کیے اور یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے یہ مہینہ غمخواری کا ہے اور اس مہینے میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے یعنی حسی اور معنوی رزق اور مؤمن خواہ غنی ہو یا فقیر ہو۔ جس نے رمضان میں روزہ دار کا روزہ افطار کروایا حلال کمائی سے اس کے لیے گناہوں کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے اس کے لیے آگ سے آزادی کا سبب بن جاتا ہے اور اس کو اس کے ثواب میں

کمی کیے بغیر روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا۔ صحابہ نے کہا اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے کہ ہم روزہ دار کو افطار کروائیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دیتا ہے جو روزہ دار کو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے افطار کروائے اور جو شخص روزہ دار کا پیٹ بھر دے گا اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے یعنی حوض کوثر سے پانی پلائے گا پھر وہ اس کے بعد پیاسا نہ ہوگا یہاں تک کہ بہشت میں داخل ہو جائے گا اور وہ مہینہ ہے اس کا پہلا عشرہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ بخشش کا ہے یعنی وہ زمانہ مغفرت کا ہے اور آخری عشرے میں آگ سے آزادی ہے یعنی یہ تینوں چیزیں مؤمنوں کے لیے ہوتی ہیں۔ نہ کہ کافروں کے لیے اور جس شخص نے لونڈی یا غلام سے رمضان کے مہینے میں بوجھ ہلکا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے اور اس کو آگ سے آزاد کر دیتا ہے۔

تشریح: الفارسي: ''را'' کے کسرہ کے ساتھ۔

قال خطبنا رسول الله ﷺ: اس بات کا احتمال ہے کہ یہ خطبہ وعظ ہو۔

في آخر يوم شعبان فقال: یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد۔ جیسا کہ خطبہ میں ہر خطیب کرتا ہے۔ گویا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اختصار کی وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔ میں کہتا ہوں: کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اس کا اختصار نہیں کیا بلکہ انہوں اقتصار کیا جس کو بعد میں ''خطبنا'' سے بیان فرمایا۔ کیونکہ خطبہ حمد وثناء کو کہتے ہیں جیسا کہ علماء اور فقہاء میں مشہور ہے۔

أيها: ایک نسخہ میں ''یا ایها'' ہے۔

الناس قد أظلكم: ''ظائے مشالہ'' کے ساتھ یعنی تمہارے اوپر اور تمہارے قریب ہے۔

شهر عظيم: ای قدره یعنی وہ مہینوں کا سردار ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: تمہاری عزت وبڑائی ہے اور اس نے تمہارے اوپر اپنا سایہ کر دیا ہے۔ محی السنۃ سے نقل کیا گیا ہے، کہ وہ 'ظاء'' کے ساتھ ہے۔ نہایہ میں ہے أظل علينا یعنی أي اشرف اور تم پر رمضان نے سایہ کیا ہے، یعنی تم پر متوجہ ہوا ہے۔ اور تمہارے قریب ہے، گویا کہ وہ تم پر اپنا سایہ ڈالنے والا ہے۔ اس کی عبارت طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے اُحسن ہے۔

شهر مبارك: یعنی جو اس کی قدر پہچانتا ہو۔

شهر فيه ليلة: یعنی عظمت والی۔ ابن حجر نے ليلة القدر نقل کیا ہے اور یہ سہو ہے۔

خير من ألف شهر جعل الله صيامه: یعنی دن کا روزہ۔

فريضة: یعنی فرض قطعی۔

وقيام ليلة: یعنی رات کو تراویح وغیرہ پڑھنا۔

تطوعًا: یعنی سنت مؤکدہ جس نے یہ کام کیا۔ تو وہ بہت زیادہ ثواب سے فیض یاب ہوا۔

من تقرب: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف۔

فيه: یعنی دن میں یا رات میں۔

بخصلة من الخير: یعنی نوافل کی اقسام میں سے۔

كان كمن : یعنی اس کا ثواب اس کی طرح۔

ادى فريضة فيما سواه ومن ادى فريضة فيه : بدنی یا مالی۔

كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه : یعنی دوسرے مہینوں میں ۔حرم والوں کے علاوہ میں ۔ اس لیے کہ اس کی نیکیاں اس کے علاوہ دوسری جگہ کے ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہیں۔

وهو شهر الصبر : اس لیے کہ اس کا روزہ اس کا کھانے' پینے اور اس جیسی چیزوں سے صبر کا نام ہے۔ اس کا قیام بیداری پر محنت کے ساتھ ڈٹ جانا ہے۔ صبح سحری کھانا سنت ہے، اس لئے روزے پر صبر کا اطلاق کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾[البقرة : ٤٥] اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ باقی مہینے شکر کے مہینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی اشارہ ہے اسی طرف ﴿ أَيَّامًا مَّعْدُودٰتٍ ﴾[البقرة : ١٨٤] یعنی بہت کم مدت ہے روزہ داروں کیلئے۔ روزہ داروں پر آسانی کی وجہ اور قیام کرنے والوں کے لئے تسلی ہے۔

والصبر : اس کا کمال شکر کو بھی متضمن ہے۔ جیسا کہ غزالیؒ نے لکھا ہے۔ کہ کمال درجے میں وجود کے اعتبار سے یہ دونوں لازم وملزوم ہے۔ تحقیق میں دونوں آپ میں جڑے ہوئے ہیں اور اطاعت اور اچھی خصلت کے ساتھ ان دونوں کا تعلق ہے۔ ایمان دو نصف ہیں۔ ایک نصف صبر دوسرا نصف شکر۔ معصیت کو چھوڑ دینا صبر اور اطاعت پر ڈٹ جانا شکر ہے۔

ثوابه الجنة : یا کہا جائے اطاعت ومعصیت پر صبر اس کی جزاء جنت ہے، جس نے اس پر عمل کیا وہ کامیاب لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ ابن حجرؒ کا قول یعنی من غير مقاساة شدائد الموقف (میدانِ حشر کی سختیوں کو برداشت کیے بغیر) یہ زائد حکم ہے، جس کا معنی حدیث سے سمجھ نہیں آتا، اور نہ اس پر جرأت کرنا کسی کے شایان شان ہے۔

وشهر المواساة : رزق اور معاش میں حصہ لینا اور شریک ہونا۔ اس کی اصل ہمزہ کو واؤ میں تبدیل کیا، تخفیف کی غرض سے۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ سخاوت اور احسان تمام انسانوں کے ساتھ کرنا چاہئے۔ صرف فقراء اور ہمایوں پر نہیں۔

وشهر يزاد في رزق المومن : صحیح نسخہ میں يزاد فيه رزق المؤمن' خواہ وہ فقیر ہو یا غنی۔ اس امر کا مشاہدہ ہم کرتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رزق کا عموم حسی اور معنوی ہو۔ حدیث میں سخاوت پر حوصلہ افزائی ہے۔ اور اس سے قبل اور ما بعد پر ابھارنا ہے۔

فطر : طاء کی تشدید کے ساتھ۔

فيه صائمًا : حلال کمائی سے، افطاری کے وقت اس کو کھلایا، اور پلایا جیسا کہ اگلی روایت میں آ رہا ہے۔

كان : یعنی افطاری۔

له : یعنی افطار کروانے والے کے لئے۔

مغفرة لذنوبه وعتق رقبته : یعنی مفطر۔

عن النار : ان دونوں کے حصول کا سبب۔ ایک نسخہ میں "مغفرة" اور "عتق" مرفوع ہیں معنی یہ ہوا کہ اُسے مغفرت اور

آزادی حاصل ہوگی۔

وکان له : یعنی مفطر کو حاصل ہوا۔

مثل أجره : یعنی روزے دار کی طرح ثواب۔

من غیر ان ینتقص : باب افتعال سے۔

من أجره : یعنی روزے دار کے اجر میں سے۔

شيء : مزید وضاحت اور تاکید کے لئے ہے کیونکہ اجر کا کم نہ ہونا پہلے ہی لفظ ''مثل اجرہ'' سے معلوم ہوگیا۔

قلنا یا رسول الله ألیس کلنا نجد ما نفطر به الصائم : دونوں فعل متکلم کے صیغوں کے ساتھ ہیں۔ایک نسخہ میں غائب کے صیغوں کے ساتھ ہیں۔یعنی لا یجد کلنا ما یشبعه وانما یجد بعضنا نما الحکم من لایجد ذلك۔یعنی ہم میں سے ہر ایک کے پاس اتنا نہیں ہوتا کہ اس کو شکم سیر کر کے کھلائے اور ہمارے بعض یہ پاتے ہیں۔اس کا کیا حکم ہے، جو یہ نہ پائے؟

فقال رسول الله ﷺ یعطی الله هذا الثواب : یعنی اسی قسم کا ثواب ملے گا، یا پھر مکمل ثواب ملے گا، اگرچہ وہ مفطر کو سیر کرانے سے عاجز ہی کیوں نہ ہو۔

من فطر صائما علی مذقة لبن : میم کے فتحہ کے ساتھ اور ذال کے سکون کے ساتھ۔یعنی پانی ملے ہوئے دودھ کا پینا۔

أو تمرة : یعنی اشارہ ہے کہ دودھ افضل ہے، کھجور سے۔یہ فضیلت یا تو دودھ کی وجہ سے ہے تو یا دو نعمتوں کے مل جمع ہو جانے کی بناء پر ہے۔

او شربة من ماء : لفظ'' أو'' دونوں جگہوں میں نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔اور ابن حجرؒ کا کہنا کہ تم سب ان تینوں میں سے کسی ایک پر قدرت رکھتے ہو۔ان کا یہ کہنا درست نہیں۔

ومن اشبع صائمًا سقاه الله : شرط میں صرف پیٹ بھر کھلانے پر اکتفاء کرنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ یہ افضل ہے یا دنیا میں یہی اصل ہے اور جزاء میں ''سقا'' پلانے پر اکتفاء کرنا اس وجہ سے کہ آخرت میں صرف پینے ہی کی طرف احتیاج ہوگا۔

من حوضی : یعنی حوض کوثر سے روزِ قیامت میں۔

شربة لا یظمأ : یعنی اس کے پینے کے بعد۔(وانك لا تظمأ فيها)[طٰہٰ:۱۱۹] گویا کہ اسے کبھی بھی دوبارہ پیاس نہیں لگے گی۔وهو : یعنی رمضان۔شهر اوله رحمة : یعنی اللہ کی رحمت کا نزول عام ہوتا ہے۔اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو بندوں میں سے کوئی بھی نہ روزہ رکھتا اور نہ نماز پڑھتا۔

لو	لا	الله	ما	اهتدينا
ولا	تصدقنا		ولا	صلينا

اگر اللہ تعالیٰ نہ ہوتے تو ہم کو ہدایت نہ ملتے ☆ اور نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾[الاعراف : ٤٣] ''اور کہیں خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں کا راستہ دکھایا۔ اور اگر خدا ہمیں یہ راستہ نہ دکھاتا تو ہم راستہ نہ پا سکتے۔ بیشک ہمارے خدا کے رسول حق بات لیکر آئے تھے۔ اور اس روز منادی کردی جائے گی کہ تم ان اعمال کے صلے میں جو دنیا میں کرتے تھے اس بہشت کے وارث بنا دئے گئے ہو''

و أوسطه مغفرة : یعنی مغفرت کا زمانہ جو کہ رحمت پر مترتب ہے اس لئے کہ کام ختم ہونے کے قریب ہو جائے تو اجیر کو بعض اجرت پہلے ہی دے دیا جاتا ہے جلدی کرتے ہیں، فراغت پر۔

و آخره : یہ وقت ہوتا ہے مکمل اجر حاصل کرنے کا۔

عتق : یعنی ان کی آزاد ہونے کا

من النار : یہ سب اللہ جل جلالہٗ کا فضل ؒ وکرم ہے اور غفار کی توفیق سے مؤمنین کے لئے نیک اعمال کرنا آسان ہو گئے ہیں جو کہ رحمت اور مغفرت کو واجب کرنے اور آگ سے خلاصی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ومن خفف : یعنی خدمت میں۔

عن مملوكه فيه : یعنی رمضان میں اس پر شفقت کرتے ہوئے اور اس کے لئے روزے کا آسان ہونا اس کی مدد ہے

غفر الله له : یعنی جو اس نے اس سے قبل گناہ کیے ہوں۔

واعتقه من النار : اپنے غلام کو مشقت والے کام سے خلاصی دلانے کا یہ بدلہ ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں، اسے ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا اور کہا: اگر یہ خبر صحیح ہو۔ اسی طرح بیہقیؒ نے بھی ایک طریق سے روایت کیا ہے۔ اور ابوالشیخ ابن حبان نے کتاب الثواب میں اختصار کے ساتھ اسے ذکر کیا ہے۔ اور ابوشیخ کی ایک روایت کے مطابق تو اس طرح ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **قال رسول الله "من فطر صائما فی شهر رمضان من كسب حلال صلت عليه الملائكة ليالی رمضان كلها وصافحه جبريل ليلة القدر ومن صافحه جبريل عليه السلام يرق قلبه وتكثر د موعه" قال فقلت يا رسول الله! من لم يكن عنده؟ قال : " فقبضه من طعام" قال افرايت ان لم يكن عنده لقمة خبز؟ قال : "فمذقة لبن" قلت افرأيت ان لم يكن عنده؟ قال : "فشربة من ماء"۔**

منذریؒ کہتے ہیں: کہ اس کی اسناد میں علی بن جدعان ہے، اور اسے ابن خزیمہ نے بھی روایت کیا ہے، اور بیہقی نے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے اور اس کی سند میں کثیر بن زید ہے۔

آپ ﷺ کا حسن سلوک رمضان کے مہینے میں

١٩٦٦ : **وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ كُلَّ اَسِيْرٍ وَاَعْطٰى كُلَّ سَائِلٍ۔** (روى البيهقى فى شعب الايمان)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ٣/ ٣١١ حديث رقم ٣٦٢٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا تھا ہر قیدی کو چھوڑ دیتے تھے اور ہر مانگنے والے کو دیتے تھے۔

تشریح: کان رسول اللہ ﷺ اذا دخل شهر رمضان اطلق كل اسير : یعنی جیسے قید کیا گیا میں اللہ کے حق' یا بندے کے حق کی وجہ سے۔ اس کو قید سے خلاصی دینا اللہ تعالیٰ کی اخلاقی صفت کے ساتھ متصف ہونا ہے۔ اس لیے کہ قید سے رہائی دینا آزاد کرنے کے معنی میں ہے قید ہونے کے بعد کفر کی وجہ سے محبوس رہا۔ تا کہ آپ ﷺ کو اس پر احسان کرنے اور اس کو قتل کرنے کا اختیار حاصل ہو اور یہی مذہب شافعیہ کا ہے۔ کہ اگر کوئی آزاد مرد جو کہ مکلف بھی ہو قیدی بن کر آئے تو امام کو اختیار ہے، اس کے قتل کرنے، اور احسان کرتے ہوئے چھوڑ دینے میں، اور اسی طرح فدیہ لے کر چھوڑ دینا یا اسے غلام بنانا بھی امام کے اختیار میں ہے۔ لیکن احناف کے نزدیک یہ منسوخ ہے۔ یا پھر یہ صرف معرکۂ بدر کے اسیروں کے لئے خاص تھا۔ کیونکہ ان کے ہاں متعین ہے کہ یا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کو غلام بنا دیا جائے گا اور یہی بیضاوی کے کلام کا خلاصہ ہے۔

صاحب مدارک کہتے ہیں: کہ مشرکین کے قیدیوں کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ انہیں قتل کیا جائے گا، یا پھر غلام بنایا جائے گا، اور باقی رہا مسئلہ احسان اور فدیہ لینے کا تو یہ اللہ کے اس قول سے منسوخ ہوا ہے ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾ [التوبة : ٥] ''تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور گھیر لو اور'' کیونکہ یہ آیت سورت برأت کی ہے، اور یہ سورۃ نزول کے اعتبار سے آخری ہے۔

احسان کرنے سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان پر احسان کرتے ہوئے انہیں قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ غلام بنا کر رکھ لیں۔ یا پھر ان کے جزیہ قبول کرنے کی صورت میں ان پر احسان کرتے ہوئے انہیں چھوڑ دینا۔ یا پھر فدیہ لے کر چھوڑنا ہے جیسا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ معاملہ کیا گیا تھا۔ اور اسے طحاوی نے ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے۔ اور یہ ان دونوں کا قول ہے۔ اور مشہور قول یہ ہے کہ نہ اس سے فدیہ لیا جائے نہ مال۔ کیونکہ کہ یہ نہ ہو کہ کل دوبارہ تمہارے مقابلہ میں جنگ کے میدان میں نہ آجائیں۔

اور امام شافعیؒ کے نزدیک امام کو چار/۴ چیزوں میں اختیار ہے۔ یا وہ قتل کرنے کو پسند کرے یا پھر فدیہ لیتے ہوئے چھوڑ دے یا غلام بنا لے، یا پھر اسے احسان کرتے ہوئے آزادی کی راہ دکھائے۔

پس زیادہ لائق ہے حدیث پر کلام کرنے والے کے لئے کہ وہ حدیث کو احسن وجہ پر محمول کرے۔ جس پر تمام علماء کا اتفاق ہو۔ نہ کہ ایسے احتمال پر جس میں بعض علماء کا اختلاف ہو اور نہ ہی کسی جگہ بھی یہ وارد ہوا ہو کہ نبی ﷺ نے اس فضیلت کو عام قرار دیتے ہوئے کسی کافر کو بھی آزادی میں شامل کیا ہو کہ رمضان میں خصوصی طور پر اللہ نے کسی کافر کو جہنم سے آزاد کیا ہو اور بھیجا ہو، اس کے دوبارہ داخل ہونے کی بناء پر۔ تو آپ اس خفی یا عرفی معنی کا احتمال کس طرح رکھ سکتے ہیں، جبکہ استفادۂ رمضان کا مفہوم ہر اول رمضان پر انحصار کیے ہوئے ہے۔ واللہ المستعان۔

واعطى كل سائل : یعنی اس کی کثرت اور زیادتی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ رمضان سے قبل آپ ﷺ اس طرح کی سخاوت نہ کرتے جیسی رمضان میں کرتے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے صحابی کہتے ہیں: ''انه ما سئل شيئا الا اعطاه فجاء ه رجل فاعطاه غنما بين جبلين فرجع الى قومه فقال يا قوم اسلموا فان محمدا يعطي عطاء من لا يخشى

الفقر"۔ اور اسی طرح صحیح بخاری میں آتا ہے: حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:"ما سئل رسول اللہ عن شیء قط فقال لا"۔ اور مسلم کے الفاظ بھی اسی طرح کے ہیں، یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جب آپ سے دنیاوی چیزوں میں سے کوئی چیز طلب کی گئی ہو اور آپ ﷺ نے اسے نہ دی ہو۔

فرزدق کہتے ہیں:

ما قال لا قط الا فی تشهده
لو لا التشهد کانت لاؤه نعم

آپ ﷺ نے کبھی کلمہ کے علاوہ "لا" نہیں کہا اور اگر کلمہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ کا "لا" بھی "نعم" ہوتا۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی چیز نہ دینے کے لیے لفظ "لا" نہیں کہا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے کبھی بطور معذرت کے بھی "لا" نہ کہا ہو۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ﴿ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ [التوبۃ: ۹۲] اس آیت سے لا اجد ما احملکم اور لا احملکم کے درمیان فرق واضح ہے۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث بخاری و مسلم میں آتی ہے آپؐ نے فرمایا:

کان النبی ﷺ اجود الناس، واجود ما یکون فی رمضان حین یلقاه جبریل فیدارسه القرآن. فلرسول اللہ ﷺ حین یلقاه جبریل اجود بالخیر من الریح المرسلة۔

رمضان کی آمد پر جنت کو مزیّن کیا جاتا ہے

۱۹۶۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْجَنَّةَ تُزَخْرَفُ لِرَمَضَانَ مِنْ رَّأْسِ الْحَوْلِ اِلٰى حَوْلٍ قَابِلٍ قَالَ فَاِذَا كَانَ اَوَّلُ يَوْمٍ مِّنْ رَمَضَانَ هَبَّتْ رِيْحٌ تَحْتَ الْعَرْشِ مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ عَلَى الْحُوْرِ الْعِيْنِ فَيَقُلْنَ يَارَبِّ اجْعَلْ لَنَا مِنْ عِبَادِكَ اَزْوَاجًا تَقَرُّبِهِمْ اَعْيُنُنَا وَتَقَرُّ اَعْيُنُهُمْ بِنَا۔

(رواه البيهقی والاحاديث الثلاثة فی شعب الایمان)

اخرجه البيهقی فی شعب الايمان ۳۱۲/۳ حديث رقم ۳۶۳۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جنت کو مزین کیا جاتا ہے شروع سال سے لے کر آئندہ سال تک۔ جس وقت رمضان کا پہلا دن ہوتا ہے عرش کے نیچے بہشت کے پتوں میں حورعین پر ہوا چلتی ہے تو حوریں کہتی ہیں: اے ہمارے رب! بنا ہمارے لیے اپنے بندوں سے خاوند تا کہ ان کی محبت سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ یعنی ان کی وجہ سے لذت اٹھائیں اور ہماری وجہ سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ بیہقی نے تینوں حدیثیں شعب الایمان میں ذکر کی ہیں۔

تشریح ✿ شروع سال سے مراد محرم کے ابتدائی ایام ہیں اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ یہ شروع سال شوال سے ہو حاصل یہ کہ جنت کو پورے سال مزین کیا جاتا ہے رمضان کی آمد کے لیے اور اس چیز کے لیے جو رمضان میں کثرت سے ہوتی ہے یعنی مغفرت کی کثرت اور جنت میں درجات بلند ہوتے ہیں نیک اور روزہ داروں کے لیے اور رات کو تراویح پڑھتے ہیں

اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو رمضان کے ایک دن کا روزہ رکھے مگر اس کو حور عین سے ایک زوجہ دی جائے گی۔ موتیوں کے خیمہ میں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے: ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ (الرحمٰن:۷۲)

تشریح: ان الجنة تزخرف: یعنی مزین کی جاتی ہے سونے اور دیگر زیورات کے ساتھ۔

لرمضان: یعنی اس کی آمد پر۔

من راس الحول الی حول قابل: یعنی اس کی تزئین اور ڈیکوریشن کا کام سال کے شروع سے لے کر آخر تک چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ محرم کی ابتداء ہونے تک، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنت مکمل سال رمضان کی آمد کی وجہ سے مزین رہتی ہے۔ اور اسی بناء پر بندوں کے لئے مغفرت کے دروازے کھل جاتے ہیں، درجات بلند ہوتے ہیں، اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی بعید نہیں کہ یہ عام کام رمضان کی وجہ سے سارے سال چلتے رہتے ہوں، یہ بعید نہیں کہ کہا جائے کہ سال کی ابتداء رمضان کے بعد شروع ہوتی ہے اور شاید کہ یہی اصطلاح اہل جنت کی ہو اور اسی کے مناسب ہے کہ وہ دن عید کا خوشی اور زینت کا دن ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہاں سال سے مراد فرشتوں کا شوال سے لے کر رمضان کے ابتداء تک جنت کی تزئین وتحسین کرنے میں لگے رہنا ہے اور رمضان کے آتے ہی جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جس کی خبر مہینے کے شروع ہوتے ہی فرشتے پھیلا دیتے ہیں۔ صرف رمضان کے شرف واکرام کی وجہ سے اور اس امت کے اشرف ہونے کی بناء پر۔ اور اسی طرح یہ لوگ اپنے روزوں کے سبب ظاہری اور باطنی نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔

لیکن زیادہ اظہر بات یہ ہے کہ جنت کی تزئین وتحسین کا کام رمضان کے شروع ہونے سے ہوتا ہے، جیسا کہ اس پر حدیث نبوی دلالت کرتی ہے، فرمایا "فتحت ابواب الجنة......" کیونکہ زینت کبھی تو خوشی سے پہلے اختیار کی جاتی ہے۔ اور کبھی خوشی کے بعد۔ لیکن یہاں پہلی وجہ زیادہ راجح ہے "لرمضان" میں لفظ "لام" وقتیہ بھی ہوسکتا ہے اور بیانیہ بھی اور یہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ شعبان کے مہینے میں مکمل سال کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد رمضان کے مہینے کو مخصوص زینت اور ا ور کے ساتھ ترجیح حاصل ہے جیسا کہ جنت کے دروازوں کا کھل جانا، اور جہنم کے دروازوں کا بند ہونا اور اس کی مثل دوسری چیزیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

قال: یعنی نبی ﷺ نے فرمایا، کیونکہ ممکن تھا کہ عام شخص سمجھتا کہ یہ قول ابن عمرؓ کا ہو، لیکن "قال" دوبارہ کہہ کر واضح کر دیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔

فاذا کان اول یوم من رمضان هبت ریح تحت العرش: یعنی عرش عظیم کے نیچے سے معطر ہوائیں چلتی ہیں۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ "تحت العرش" سے مراد جنت ہے، کیونکہ جنت کی چھت رحمان کا عرش ہے۔ جیسا کہ اس کا ذکر حدیث میں موجود ہے۔ اور اس سے چھت ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ اوپر ہونے کے معنی میں ہے۔ درحقیقت جنت اور عرش کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں کہ ان کے درمیان سے ہوائیں چلیں، بلکہ ظاہر ہے کہ ہوا کا نزول عرش کے نیچے سے ہوتا ہے، جنت کے بدائی حصے کے ظہور کے اعتبار سے۔ من ورق الجنة یعنی اس کے درختوں کے پتے۔

علی الحور العین : یعنی ان کے سروں پر سائے کئے ہوئے پھیلے ہوئے ہوں گے، اور شاید کہ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کے ہاں کستوری سے بھی بڑھ کر پاک ہو۔

فقلن : یا رب! اجعل لنا من عبادك : یعنی صالحین، قیام کرنے والے (نماز پڑھنے والے) اور روزے داروں میں سے۔

ازواجا تقر : قاف کے فتحہ اور راء کے تشدید کے ساتھ۔ یعنی لطف لینا۔

بھم : ان کی صحبت اور ان کی دیدار حاصل کرنے کی وجہ سے۔

اعیننا : یعنی ہماری آنکھیں اور دوسرے اعضاء۔

تقر اعینھم بنا : طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ قر بمعنی برد یعنی ٹھنڈک کے ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے (قر اللہ عینیہ جعل دمع عین باردًا) جو کہ خوشی سے کنایہ ہے، کیونکہ اس کے آنسوں ٹھنڈے ہوتے تھے، یا قرار سے ماخوذ ہے۔ تو اس صورت میں یہ اپنی مراد میں کامیاب ہونے سے کنایہ ہوگا۔ کیونکہ جو کامیاب ہوا، گویا اس نے اپنے نفس کو ٹھنڈک رسائی، نہ کہ اس میں آنکھوں کا عمل ہے، کہ وہ اپنے ماحصول کو دیکھ کر قرار پکڑیں۔

تین احادیث ذکر کی ہیں: میرک رحمۃ اللہ کہتے ہیں: کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن مسعود غفاری کی شاہد ہے، اسے ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، اور اسے بیہقی نے بھی روایت کیا ہے، اور ابوالشیخ نے کتاب الثواب میں ان لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

"سمعت رسول اللہ ﷺ ذات یوم واھل رمضان فقال : لو یعلم العباد ما رمضان لتمنت امتی ان تکون السنة کلھا رمضان' فقال رجل من خزاعة یا نبی اللہ حدثنا فقال ان الجنة لتزین لرمضان من رأس الحول الی الحول فاذا کان اول یوم من رمضان ھبت ریح من تحت العرش فصفقت ورق اشجار الجنة فینظر الحور العین الی ذلك، فیقلن! یا رب اجعل لنا من عبادك فی ھذا الشھر ازواجًا تقر اعیننا بھم واعینھم بنا) قال : فما مٍن عبد یصوم یومًا من رمضان الازوج زوجة من الحو العین فی خیمة من ذرة کما نعت اللہ عزو جل۔ ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ﴾ [الرحمن : ۷۲]

ابن خزیمہ کہتے ہیں: ان کے درمیان جریر بن ایوب ہے، یعنی ایک راوی یہ بھی ہیں۔ کیونکہ اس کے بارے میں امام منذری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واھی فی الحدیث ہے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: اس حدیث کے لئے ابن عباس کی حدیث شاہد ہے جسے ابوالشیخ نے کتاب الثواب میں نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح بیہقی نے بھی ذکر کیا، لیکن امام منذری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایسا کوئی راوی نہیں جس کا ضعف متفق علیہ ہو۔ لہٰذا اس حدیث کے متعدد طرف ہونے کی وجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل ہے۔

رمضان کے آخر میں روزے دار کو پورا ثواب دے دیا جاتا ہے

۱۹۶۸ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ يُغْفَرُ لِاُمَّتِهٖ فِیْ اٰخِرِ لَيْلَةٍ فِیْ رَمَضَانَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَهِیَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ قَالَ لَا وَلٰكِنَّ الْعَامِلَ اِنَّمَا يُوَفّٰى اَجْرُهٗ اِذَا قَضٰى عَمَلَهٗ۔

(رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۲/۲۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان کی آخری رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت (کے روزہ داروں) کی بخشش کی جاتی ہے۔ کہا گیا یا رسول اللہ! کیا وہ لیلۃ القدر ہے فرمایا نہیں لیکن کام کرنے والے کو اس کو مزدوری پوری دی جاتی ہے جب وہ اپنا کام پورا کر لے اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قال یغفر لامته : یعنی ہر روزے دار کے لئے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں معنی کو روایت کیا گیا ہے نہ کہ بعینہ آپ علیہ السلام کے الفاظ۔ یعنی یہ روایت بالمعنی ہے نہ کہ بالفظ۔ وہ ذات جو میری امت کے لئے بخشش کرے۔

فی آخر لیلة رمضان : اور ایک نسخے کے مطابق "من رمضان" ہے اور مغفرت سے مراد مغفرت کاملہ اور رحمت شاملہ ہے۔

یا رسول الله اهی لیلة القدر؟ قال : لا : اس میں بظاہر ان لوگوں کا رد ہے۔ جنہوں نے اس سے مراد لیلۃ القدر کو لیا ہے۔ جو آخری دس راتوں میں ہوتی ہے۔ اور اس کی ایک یہ تاویل بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس سے مراد لیلۃ القدر نہیں۔ کیونکہ بخشش کا سبب اس رات کا ہونا نہیں۔ بلکہ اس کا اصل سبب تو رمضان کی آخری رات کا ہونا ہے۔ جس میں بندے کی بخشش ہوتی ہے اور یہ بھی کوئی محال نہیں کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہی ہو۔ اور اس کی تائید یہ قول بھی کرتا ہے۔ ولکن : تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ۔

العامل : لیکن اس کا سبب عامل کہ۔

انما یوفّٰی : یعنی پورا پورا دیا جائے گا۔

اجره : نصب کے ساتھ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر۔ اور ایک نسخے میں رفع کے ساتھ ذکر ہے نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور مفعول ثانی مقدر ہوگا، یعنی "ایاہ"۔

اذا قضی عمله : یعنی مکمل کر لے، اور وہ اس سے فارغ ہو جائے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان کے سوالوں کا پہنچنا ہوتا ہے مغفرت کی بناء پر شاید کہ وہ لوگ اس گمان میں ہوں، کہ آج کی آخری رات ہی لیلۃ القدر کی رات ہے، جو کہ مغفرت کا سبب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا کہ یہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اصل وجہ بندے کا اعمال سے فارغ ہونا ہے۔ جس کی بنا پر اس کی مغفرت ہوتی ہے۔

... زیادہ راجح بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ لیلۃ القدر خود بنفسہٖ کوئی سبب نہیں ہے۔ یہ تو ایک زمانہ ہے عبادت کرنے کا،

جو کہ بندے کی مغفرت کا سبب بنتا ہے، اور "قضی" کے بارے میں کہ یہ بمعنی فرغ مجاز مشارفہ ہے، یا اس لئے کہ وہ اس وقت آنے والے دن کے روزے کی نیت کرتا ہے، گویا کہ اس نے روزہ رکھ لیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آخر لیلۃ فی رمضان یا من رمضان" سے مراد عید کی رات ہوئی اسی ملابست کی وجہ سے رمضان کی طرف نسبت کی گئی جیسا کہ "عید رمضان" میں ہوتا ہے۔

بَابُ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ

چاند کے دیکھنے کا بیان (یعنی اس کے متعلقہ احکام)

الفصل الاول:

رمضان کا آغاز اور اختتام چاند دیکھ کر کرو

۱۹۶۹: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوْا لَهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ الشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ لَيْلَةً فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۹/٤ حدیث رقم ۱۹۰٦۔ ومسلم فی صحیحه ۷٥۹/۲ حدیث رقم (۳۔ ۱۰۸۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۷٤۰/۲ حدیث رقم ۲۳۲۰۔ والترمذی فی السنن ٦۸/۳ حدیث رقم ٦۸٤۔ والنسائی ۱۳٤/۲ حدیث رقم ۲۱۲۱۔ وابن ماجه ٥۲۹/۱ حدیث رقم ۱٦٥٤۔ والدارمی ٦/۲ حدیث رقم ۱٦۸٤۔ ومالك فی الموطأ ۲۸٦/۱ حدیث رقم ۲ من كتاب الصیام۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا رمضان کی نیت سے تیسویں شعبان کو روزہ نہ رکھو۔ یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اور افطار نہ کرو۔ یہاں تک کہ اس کو یعنی عید کے چاند کو دیکھ لو اور اگر ڈھانک دیا جائے تم پر عید کا چاند۔ یعنی تیسویں شب کو ابر کی وجہ سے یا غبار یا اور کسی سبب سے تو اندازہ کرو اس کے واسطے یعنی تیس دن پورے کر لو اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے۔ تو رمضان کی نیت سے روزہ نہ رکھو۔ یہاں تک کہ چاند دیکھ لو پس اگر تم پر بادل چھا جائے تو تیس دن کی گنتی پوری کرو۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: لا تصوموا: یعنی شعبان کے تیسویں دن جیسا کہ سیاق اس پر دلالت کرتا ہے۔

حتی تروا الهلال: یعنی یہاں تک کہ رمضان کے چاند کی گواہی نہ مل جائے، دو گواہوں کے ذریعہ سے۔ یا اس سے زیادہ۔ اگر آسمان پر بادل چھائے ہوں، تو ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایک آدمی کی گواہی بھی کافی ہے اور امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے۔ جو کہ زیادہ صحیح ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک مطلقاً کافی ہے، اگرچہ آسمان صاف ہی کیوں نہ ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک اصلاً ہی قبول نہیں چاہے آسمان پر بادل ہوں یا نہ ہوں۔

قاضیؒ کہتے ہیں کہ رمضان کے ارادے سے روزہ نہ رکھو، ہاں اگر ثابت ہو جائے، تو روزہ رکھو۔ وہ اس طرح کہ یا تو یہ خود [illegible]۔ یا پھر یا جن پر بھروسہ ہو۔ اگر اکیلا آدمی چاند دیکھے اور اس کی شہادت قبول نہ کی جائی تو اس صورت میں ہمارے

نزدیک اس پر روزہ رکھنا واجب ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کا معنی کہ نہ وہ کھائے نہ افطار کرے گا نہ پیئے گا، اور نہ ہی وہ اس صورت میں روزے کی نیت کرے گا، جو کہ تقرب الٰی کے زیادہ نزدیک ہے، کیونکہ عید کا دن ایک حقیقت ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: احتیاط والی علت اس قول کے نفی کی تاویل ہے۔ ایک قول یہ ہے۔ اگر اس کو یقین ہے تو وہ چھپ کر کھا سکتا ہے اور اس قول کی بناء پر کہ وہ افطار نہیں کرے گا۔ اگر افطار کرے گا تو قضا کرے گا۔ پھر ان میں سے بعض فقہاء کا یہ مؤقف ہے کہ اس بات میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، کہ اس پر کوئی کفارہ نہیں اور ان میں سے بعض نے کفارہ کے لازم ہونے میں اختلاف نقل کیا ہے۔ جب شہادت رد ہو جائے اور شہادت دینے سے پہلے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں لازم نہیں ہے، حدیث کے معنی کو اس بات پر محمول کریں گے، کہ روزے رمضان کی نیت کے ساتھ نہ رکھو، جب تک رؤیت ہلال تمہارے لیے واضح نہ ہو جائے۔ **ولا تفطروا حتی تروہ**: یعنی شوال کا چاند۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: رؤیت کا ثبوت دو عادل گواہوں سے ہوگا۔ اس سے کم پر نہیں۔ یہ بالاتفاق ہے۔ اس نہی کا ظاہری عموم جیسے آنے والی آحادیث ہیں شافعیہ پر رد ہیں، کہ ان کا کہنا ہے: شروع رمضان میں چاند دیکھنے والا اپنی عید کے دن اپنے افطار کو چھپائے اگر چہ شوال کا چاند نظر نہ آیا ہو۔ تاکہ حاکم کی سزا سے بچ سکے۔

رہا ابن حجر کا قول کہ نہی ان دونوں میں تحریم کی بنیاد ہے۔ یہ عام لوگوں کے لحاظ سے ہے جیسا کہ اس پر جمع کی واؤ دلالت کرتی ہے۔ جس اکیلے نے دیکھا اور گواہی نہیں دی یا قبول نہیں کی یا اس کی خبر دی جس نے اس کے سچ کا اعتقاد رکھا، اس کی رؤیت کی وجہ سے اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اگر چہ رمضان ثابت نہ ہونہ عمومی طور پر شوال کا ثبوت ہو۔ یہ جواب ہمارے سوال کے مطابق نہیں ہے۔ جیسے کہ اہل علم پر ظاہر ہے۔ آپ حق کو حق سمجھ کر غور کریں۔

فان غم: یعنی تیسویں رات کو بادلوں کی وجہ سے چاند چھپ جائے۔

علیکم: یعنی اس کے شروع میں یا آخر میں۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یعنی بادلوں کی وجہ سے چھپ جائے۔ یہ ماخوذ ہے: **غممت الشیء اذا غطیتہ**۔ اور بادلوں میں چاند کا چھپ جانا ہے۔ جائز ہے کہ اس کی نسبت جار مجرور کی طرف ہو اس معنی میں کہ اگر تم پر بادل چھا جائیں، حاجت نہ ہونے کی وجہ سے ہلال کا ذکر چھوڑ دیا۔

فاقدروا: دال کے کسرہ اور ضمہ بھی دیا جاتا ہے اور مغرب میں ضمہ کے ساتھ غلط ہے۔

لہ: یعنی چاند کے لئے۔ معنی مقدر ہے اور چاند آنے والے مہینے کے لئے ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جو مہینہ تم گزار رہے ہو، اس کی گنتی تیس کی پوری کرلو۔ اصل مہینے کا باقی رہنا ہے اور ہلال کا اخفاء ہے جب تک امکان ہو۔ یعنی تیس سے پہلے۔ معنی یہ ہے کہ مہینے کو تیس کا تصور کرلو۔ زرکشیؒ نے کہا ہے کہ شعبان کے ایام کی مقادیر تحقیق کرتے رہو۔ یہاں تک کہ اس کی تیس دنوں کی گنتی پوری کرو۔

شرح السنہ میں ہے: تقدیر کا معنی گنتی کو پورا کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے **قدرت الشیء أقدرہ قدرًا**، اس معنی میں کہ میں نے اس کا اندازہ مقرر کیا۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: بعض نے کہا ہے کہ تقدیر سے مراد چاند کا حساب منازل کے اعتبار سے ہے۔ یعنی چاند کی منازل

کے اعتبار سے اندازہ مقرر کرو۔ یہ تمہارے لیے راہنما ثابت ہوگا، کہ مہینہ تیس دنوں کا ہے، یا انتیس دنوں کا ہے۔

شرح السنہ میں ہے: ابن سریج کہتے ہیں: **فاقدروا** کا خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس علم کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور یہ قول "**فأكملوا العدة**" یہ خطاب عام ہے یہ قول اس حدیث کی وجہ سے مردود ہے: "**انا امة أمية لا نكتب ولا نحسب**" یہ اس بات پر دلالت ہے کہ مہینے کی پہچان لکھنے اور حساب و کتاب سے نہیں ہے۔ جیسا کہ اہل نجوم (ستاروں کا علم رکھنے والوں) کا دعویٰ ہے۔ اس بات پر اجماع ہے کہ اہل نجوم کی گنتی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ گرچہ وہ سب اس پر متفق ہوں، کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بدولت جو اس نے "**خير امة**" کو مخاطب کیا ہے۔ عام خطاب ہے: **فمن شهد منكم الشهر فليصمه** اور آپ ﷺ کے اس عام خطاب کی وجہ سے "**صوموا لرؤيته وأفطروا لرويته**" اس حدیث۔ کے مضمون میں ہے "**لا تصوموا حتى تروه**" ۔ ابوداؤد اور ترمذیؒ کی حدیث میں ہے جس کے راوی ابو ہریرہؓ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "**الصوم يوم يصومون والفطر يوم يفطرون**"۔

بلکہ میں کہتا ہوں: اگر کوئی ستارہ شناس رؤیت سے قبل رمضان کا روزہ رکھ لیتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ وہ اس کی معرفت میں ماہر ہے، تو وہ اس روزہ رکھنے کی وجہ سے نافرمان ہوگا۔ اس کے روزے کا کوئی اعتبار نہیں۔ جب تک چاند کی رؤیت کا ثبوت نہ مل جائے۔ اگر اسی طرح اس کے فاسد دعوے کے مطابق عید الفطر کو ادا کیا جائے۔ تو وہ فاسق ہوگا۔ اور اس کے قول کی بناء پر کفارہ واجب ہوگا اور یہی بات صحیح ہے۔ اگر اس کے افطار کو فرض سے واجب شمار کرتے ہوئے حلال سمجھا جائے۔ تو کافر ہو جائے گا۔

صاحب نہایہ نے جو قول نقل کیا ہے۔ وہ بھی غریب ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ **أكملوا العدة**، خطاب عام ہے اور صاحب نہایہ کا عمل اس سے بھی غریب ہے۔ ان کا کلام نقل کیا اور اس کے متعلق سکوت اختیار کر کیا، گویا یہ اس قول کے قبول کرنے کے وہم کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کا کلام صرف اور صرف رد کرنے کی نیت سے نقل کیا جا سکتا ہے۔

وفي رواية الشهر تسع وعشرون ليلة : یعنی مہینہ کبھی کبھی تیس کا اور کبھی اس سے کم ہوتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: یہ بات محقق ہے۔ اس میں تیسویں رات کو چاند تلاش کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ (**فلا تصوموا**) : یعنی رمضان کا ارادہ کر کے روزہ نہ رکھو۔ (**حتى تروه** : یعنی مہینہ۔ مہینہ مکمل ہو جانے کے بارے میں جان لو۔ یا پھر تم رمضان کا چاند دیکھ لو اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة: ١٨٥] "تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے"۔

فان غم : مہینے کا حکم یا چاند کا معاملہ۔

عليكم : یعنی بادلوں یا اس جیسی کسی اور وجہ سے۔

فأكملوا : یعنی پورا کرو۔

العدة : مفعول بہ ہے، یعنی شعبان کی گنتی۔ جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

ثلاثين : یعنی تیس دن۔ یہ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ ایک قول ہے، اس کی تقدیری عبارت یوں ہے: "**أكملوا هذه العدة**" اس گنتی کو پورا کرو۔

ثلاثين : مبدل منہ سے بدل الکل ہے۔

اَبر کی صورت میں شعبان کی گنتی پوری کرو

۱۹۷۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِيْنَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۹/٤۔ حدیث رقم ۱۹۰۹۔ ومسلم فی صحیحه ۷٦۱/۲ حدیث رقم (۱۸۔ ۱۰۸۱)۔ والنسائی فی السنن ۱۳٥/٤ حدیث رقم ۲۱۲٤ والدارمی رقم ٦/۲ حدیث رقم ۱٦۸٥۔ واحمد فی المسند ٤۲/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چاند دیکھنے کے بعد روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو یعنی چاند دیکھنے کے بعد عید کرو۔ پس اگر ابر ہو جائے تم پر تو شعبان کی گنتی تیس دن پوری کرو۔ یہ حدیث بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کی۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : قال رسول الله ﷺ صوموا لرؤيته : یعنی چاند دیکھنے کے بعد روزہ رکھنا ہے۔ اور لام تعلیل کے لئے ہے۔ اور "ہ" کی ضمیر ہلال کی طرف لوٹتی ہے۔ حتی توارت بالحجاب سیاق کے قرینہ پر اکتفاء کرتے ہوئے۔ وبقولہ تعالیٰ: ﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ [النساء : ۱۱] یعنی میت کے والدین کے لئے اور طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: لام توقیت کے لئے آیا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ [الاسراء : ۷۸] یعنی اس کے ڈھلنے کے وقت، اور اس میں یہ بھی ہے کہ ایک طویل زمانے سے چلا آرہا ہے، کہ روزہ رؤیت ہلال کے بعد ہی رکھا جاتا ہے۔ اور نماز کا قائم کرنا بھی سورج کے ڈھلنے کے اثبات کے ساتھ واقع ہو جاتا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: کہ "لام" بعد کے معنی میں ہے، یعنی سورج ڈھلنے کے بعد نماز قائم کرنا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: "جئته لثلاث خلون من شهر كذا" تیسری فصل میں ابو البختری کی حدیث رؤیت کی مدت بیان کرتی ہے۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: یعنی اللہ تعالیٰ دیکھنے کی مدت لمبی کرے۔ اور یہ قول "جئته لثلاث خلون من شهر كذا" اور یہ بھی احتمال ہے کہ "بَعْد" کے معنی میں ہو۔ آخری قول ہی زیادہ مناسب ہے۔

وأفطروا : یعنی اس کو عید الفطر قرار دے لو۔

لرؤيته : اس کی وجہ سے یا اس کے بعد یا اس کے وقت۔

فان غم عليكم فأكملوا عدة شعبان : یعنی اس کی گنتی پوری کرلو۔

ثلاثين : اسی طرح رمضان کا حکم بطریق اولیٰ ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: جب شہر والے بغیر رؤیت کے رمضان کا روزہ رکھ لیں، بلکہ انہوں نے صرف شعبان کے اٹھائیس دن پورے کیے ہوں۔ پھر انہوں نے شوال کا چاند دیکھا، پھر انہوں نے اگر شعبان کی گنتی اس کے چاند سے پوری کی ہے۔ کہ انہوں

نے رمضان کا چاند نہیں دیکھا، تو ایک دن کی قضا کریں۔ اس کو شعبان کے نقصان پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن اتفاق سے انہوں نے تیسویں رات چاند نہیں دیکھا۔ اگر شعبان کو مکمل کیا ہے بغیر رؤیت کے تو دو دن کی احتیاطاً قضا کریں گے، اس احتمال کے ساتھ کہ اس سے پہلے شعبان میں بھی کمی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ جب انہوں نے شعبان کا چاند نہیں دیکھا تو بدیہی طور پر رجب کو مکمل کریں گے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: ابوداودؒ اور ترمذیؒ میں حسن درجے کی روایت ہے: **"فان حال بينكم وبين سحاب فكملوا العدة ثلاثين ولا تستقبلوا الشهر استقبالا"۔**

ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ روایت اور اس سے پہلی روایت اس روایت کی طرح ہیں: **"فان اغمي عليكم الشهر فعدوا ثلاثين ثم صوموا"۔**

ایک اور روایت **"فاقدروا له ثلاثين' ورواية "فان اغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين يومًا، ثم صوموا' ورواية كان ﷺ يتحفظ من شعبان مالا يتحفظ من غيره ثم يصوم برؤية رمضان' فان غم عليه عد ثلاثين يومًا ثم صام"۔**

یہ تمام صحیح روایات کوئی تاویل قبول نہیں کرتیں۔ انہوں نے امام احمدؒ کے قول کو رد کیا ہے، جو کسی ایک کے متعلق ہے۔ ایک چھوٹی جماعت مراد انہوں نے اندازہ نکالا، تو ان کے لئے مشکل ہو گیا، انہوں نے یہ کام بادلوں کی موجودگی میں کیا تھا۔ تو ان پر شعبان کے تیسویں دن کا روزہ لازم ہے، جب تیسویں رات بادل چھائے ہوں۔ ابن سریج اور بعض دوسروں نے منازلِ چاند کا حساب رکھا ہے۔ ہمارے ائمہ کہتے ہیں جس نے بادلوں کی موجودگی میں یہ اندازہ نکالا، تو وہ صریح روایات کو چھوڑنے والا ہے جس نے کے حساب سے کیا، تو اس پر صحیحین کی روایت رد کرتی ہے "اِنا أمة" جو آگے آ رہی ہے۔ بعض حنابلہ کہتے ہیں کہ جو امام احمد نے کہا ہے، اس پر صحابہ کا اجماع ہے، یہ ان کا وہم ہے۔

میں کہتا ہوں: بالفرض اگر یہ صحیح ہو تو اجماع، یا بعض کا قول یا فعل کو وجوباً احتیاط پر محمول کیا جائے گا، جس کا مقتضی امام احمد کا مذہب ہے، اور استحباباً جس کا تقاضا ہمارا مذہب کرتا ہے۔ کہ خاص لوگوں کے لئے اس دن کا روزہ افضل ہے۔ جو خالص نیت کی کیفیت کو جانتے ہیں اور تردید کرتے ہیں۔ شک کے ساتھ روزہ رکھنا کہ مطلق روزے کی نیت کرنے اور یہ نہ کہے کہ رمضان کا روزہ ہے اور نہ یہ کہے کہ اگر رمضان کا روزہ ہو تو میں رمضان کا روزہ رکھتا ہوں۔ اگر رمضان کا روزہ نہ ہو تو میں نفل روزہ رکھتا ہوں۔ تو یہ مکروہ ہے۔ اگر اس نے کیا، اگر رمضان سے ہے، تو میں روزے سے ہوں، وگرنہ نہیں، تو اس کا روزہ صحیح نہ ہوگا۔ پھر جس صورت میں اس کا روزہ صحیح ہوا اور اتفاق سے وہ دن رمضان کا نکلا تو ہمارے ہاں اس کا فرض روزہ ہوگیا شافع کا اس میں اختلاف ہے۔

مہینے کے ایّام کا حساب

۱۹۷۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ الشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا وَعَقَدَ الْاِبْهَامَ فِي الثَّالِثَةِ ثُمَّ قَالَ الشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا يَعْنِي تَمَامَ الثَّلَاثِيْنَ يَعْنِي مَرَّةً تِسْعًا وَّعِشْرِيْنَ وَمَرَّةً ثَلَاثِيْنَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲٦/٤۔ حدیث رقم ۱۹۱۳۔ ومسلم فی صحیحه ۷٦۱/۲ حدیث رقم (۱۵۔ ۱۰۸۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۳۹/۲ حدیث رقم ۲۳۱۹۔ والنسائی ۱۳۰/٤ حدیث رقم ۲۱٤۱۔ واحمد فی المسند ۱۲۲/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہم یعنی عرب امّی لوگ ہیں ان پڑھ ہیں حساب و کتاب نہیں جانتے۔ مہینہ ایسا ایسا اور ایسا ہوتا ہے اور تیسری دفعہ انگوٹھے کو بند فرمایا یعنی دوبارہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بند کر کے کھول دیں اور تیسری مرتبہ نو انگلیاں کھولیں اور ایک انگوٹھا بند رکھا۔ یہ بتلانے کے لئے کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے پھر ارشاد فرمایا مہینہ ایسا اور ایسا اور ایسا ہوتا ہے یعنی اس مرتبہ تیسری مرتبہ بھی انگوٹھا بند نہیں فرمایا یہ بتلانے کے لئے کہ مہینہ کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔ یہ بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: انا : یعنی عرب کے قبائل۔

أمة : یعنی جماعت۔

أمية : کہا گیا ہے کہ یہ "امة العرب" کی طرف منسوب ہے۔ وہ زیادہ تر نہ لکھتے تھے اور نہ پڑھتے تھے۔ امّی کا اطلاق ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ وہ زمانہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ پھر بعد والا پہلے کی نسبت اور حکم میں تابع ہے۔ یا "اُم" کی طرف منسوب ہے، اس حال پر باقی رہا جس پر اس کی والدہ نے اس کو جنا یعنی ولادت کے وقت وہ نہ پڑھنا جانتا تھا، اور نہ لکھنا جانتا تھا۔ ایک قول ہے کہ وہ اُم القرٰی مکہ کی طرف منسوب ہے، یعنی "انا أمة مكية"۔

لا نكتب ولا نحسب : سین کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ حکم اکثر کے لحاظ سے ہے یا پھر اس کا مطلب ہے ہم اچھی طرح لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ابن حجرؒ کا قول نہایت غریب ہے۔ انہوں نے کہا ہے: یہ "اُم" کی طرف منسوب ہیں، یعنی ایسی حالت پر جب ماں نے ان کو جنم دیا، تو اس وقت اچھی کتابت اور حساب نہ جانتے تھے۔ غرابت کی وجہ یہ ہے کہ ان کی حالت عدم کتابت تھی نہ کہ عدم احسان تھی۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: ہم لکھنا اور ستاروں کا حساب نہیں جانتے، کہ ہم علم نجوم اور چاند کے چلنے پر اعتماد کر کے مہینے کو پہچان سکیں۔ اس میں علم نجوم پر عمل کرنے کے جواز کا شائبہ ہے، اور یہ مردود ہے۔ اس کی صراحت بذات خود پیچھے گزر چکی ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "انا" یہ "جيل العرب" سے کنایہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "لا نكتب ولا نحسب" اس کے قول "أمية" کے بیان کے لئے ہے۔ یہ بیان ہے پھر ہاتھ کے ساتھ اشارہ ہے پھر زبان کے ساتھ قول ہے، یہ اس بات پر دلالت

ہے کہ مہینے کی پہچان میں ہم کم ہیں، نا کہ کتابت اور حساب کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ اہل نجوم موقف ہے۔

معنی یہ ہے کہ وہ عمل جس جو اہل نجوم کی عادت ہے وہ ہمارا طریقہ اور سنت نہیں بلکہ ہمارا طریقہ یہ ہے جس کا تعلق رؤیت ہلال سے ہے۔ بعض دفعہ ہم انتیس کو دیکھتے ہیں۔ بعض دفعہ ہم تیس کو دیکھتے ہیں جیسا کہ آپ نے کہا۔

الشهر : مبتداء۔

هكذا : ان کے ساتھ دس انگلیوں کو پھیلا کر آپ ﷺ نے اشارہ کیا۔

وهكذا : دوسری مرتبہ۔

وهكذا : تیسری مرتبہ، اس کی خبر عطف کے بعد عطف ہے۔

وعقد الابهام : یعنی دو انگلیوں میں سے ایک یا تقدیراً دونوں ہاتھوں میں سے ایک یا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا۔ لام مضاف الیہ کے عوض ہے، اور یہ ظاہر ہے۔

في الثالثة : یعنی تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے اس طرح کیا۔ تو عبارت انتیس کی مکمل ہوگئی۔

ثم قال : الشهر : یعنی دوسری مرتبہ۔

هكذا، وهكذا، وهكذا : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: پہلی مرتبہ انگوٹھے کو بند کیا، تا کہ انتیس کی گنتی مکمل کریں۔ دوسری مرتبہ اُسے بند نہیں کیا، تا کہ تیس کی گنتی بیان کریں، اور اس کی طرف اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا۔

يعني تمام الثلاثين : پھر راوی نے اپنے بیان کو زیادہ کیا، اس نے کہا۔

يعني مرة تسعًا وعشرين مرة ثلاثين۔

اس میں ایہام ہے کہ پہلا لفظ "یعنی" راوی کا کلام نہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ بلکہ آپ ﷺ کے فعل کی تفسیر ہے **هكذا، وهكذا وهكذا** دوسری مرتبہ میں۔ راوی نے کہا: کہ نبی ﷺ کی مراد ایسے ایسے ہے اور دوسری مرتبہ تیس کے لئے انگوٹھے کو بند نہیں کیا۔ پھر کلام میں مزید اضافہ کیا اور دونوں مرتبہ کی اکھٹی کیفیت بیان کر دی۔ راوی نے اس کی وضاحت میں اضافہ کیا ہے، اس کی بنیاد آپ ﷺ کا فعل ہے۔ یعنی نبی ﷺ اس کا مجموعہ بیان کرنا چاہتے تھے۔ کہ مہینہ کبھی انتیس کا ہوتا ہے، اور کبھی تیس کا ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس نے بیان میں مبالغہ کیا ہے، اور اس کو مذکورہ اشارہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تا کہ جس پر اہل حساب اور اہل نجوم ہیں، اس باطل سے رجوع کر لیں۔ اس کے ساتھ ابن سریج کا قول بھی باطل ہو جاتا ہے، اور جنہوں نے ابن سریج کے قول کی موافقت کی ہے۔ پھر کہا کہ ہمارے ائمہ علم نجوم پر عمل نہیں کرتے، نجومی وہ شخص ہوتا ہے کہ جو کہتا ہے کہ فلاں ستارہ طلوع ہوگا تو مہینہ کی ابتداء ہوگی اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مراد ﴿وبالنجم هم يهتدون﴾ [النحل : ١٦] یعنی رہنمائی۔ اسی طرح سفر وغیرہ رہنمائی کی دلیل ہے، نہ کہ حساب کرنے والے کے حساب سے۔ یہ اسی قبیل سے ہے کہ جو چاند کی منازل اور اس کے چلنے کی مقدار کو جانتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے اپنی ذات کی حد تک عمل کرتا ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اس کو کفایت کرے گا اور اس پر قضاء لازم نہ ہوگی یا کافی نہیں اور قضاء لازم ہے۔ اگر پہلے قول پر ہیں، فتأمل۔ یہ پھسلنے کی جگہ۔ مراد

شاید یہ کہ یہ رمضان کے آغاز سے مقید ہے۔ پھر ان دونوں انتیس اور تیس سے مراد ہے کہ جیسے چاند دیکھا اس کے مطابق ہوں گے اس ترتیب اور تعاقب کا کوئی لحاظ نہیں۔ نوویؒ اور ابن عبدالبرؒ نے صراحت کی ہے کہ مہینہ چار مہینہ مسلسل کم ہوتا ہے پانچ دفعہ نہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ ان دونوں نے استقراء پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو پھر اس پر عمل ہوگا۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ کا کہنا "الشهر هكذا وهكذا" اس قول تک مرة ثلاثين، مسلم کے الفاظ ہیں۔ بخاری کے الفاظ: الشهر هكذا، وهكذا یعنی مرة تسعًا وعشرين ومرة ثلاثين۔ شیخ ابن حجرؒ کہتے ہیں: هكذا کو بخاری کے شیخ ادم نے مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس میں اختصار اس روایت سے جو غندر عن شعبہ نے روایت کیا ہے۔ مسلم نے ابن مثنیٰ سے بیان کیا ہے۔ اور مسلم کے علاوہ غندر سے بیان کرتے ہیں۔ پھر مذکورہ لفظ مسلم سے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

حدیث میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے جیسے تبلیغ کا مقصد تھا، ویسے ہی ادا کر دیا۔ اس کو اشارہ کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نکاح وطلاق وغیرہ میں عرف کے لحاظ سے اعتبار ہوگا۔

عید کے مہینوں کا ذکر

۱۹۷۲: وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شَهْرَا عِيْدٍ لَا يَنْقُصَانِ رَمَضَانُ وَذُوالْحِجَّةِ.

(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٢٤/٤۔ حديث رقم ١٩١٢۔ ومسلم في صحيحه ٧٦٦/٢ حديث رقم (٣١۔ ١٠٨٩) وابوداؤد في السنن ٧٤٢/٢ حديث رقم ٢٣٢٣۔ والترمذي ٣/ ٧٥ حديث رقم ٦٩٢ وابن ماجه ٥٣١/١ حديث رقم ١٦٥٩ واحمد في المسند ٣٨/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ دو مہینے عید کے ناقص نہیں ہوتے رمضان اور ذی الحجہ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: شهرا عيد : یعنی رمضان اور ذی الحجہ کا مہینہ۔ رمضان کو عید کا مہینہ اس لئے کہا کہ وہ اسی مہینے کے ساتھ ملا ہوا ہے، یا پھر عید کے احکام کا تعلق اس کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کا نام یدالفطر ہے۔

لا ينقصان : یعنی غالب طور پر تیس سے کم یا پھر ثواب کم نہیں ہوتا، اگرچہ مہینے کا عدد کم ہو جائے۔ یا ایک ہی سال میں وہ دونوں اکھٹے کم نہیں ہو سکتے۔ یا پھر آپ کی مراد معین سال ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حساً کم نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس پر اجماع ہے۔ بعض شیعہ کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں۔ اور صحابہ کرام سے جو صحیح سند سے ثابت ہے، اس کے منافی ہے۔ "ضمنا مع رسول الله ﷺ تسعاً وعشرين اكثر مما صمنا معه ثلاثين"۔ بعض حفاظ نے اسی لئے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو (۹) رمضان المبارک کے روزے رکھے ہیں (آپ ﷺ کی زندگی میں نو ر

۹ رمضان آئے ہیں) ان میں سے دو (۲) رمضان تیس تیس دنوں کے تھے۔ اسی طرح ابن حجرؒ کی شرح میں ہے۔

رمضان و ذوالحجة : دونوں بدل ہیں یا عطف بیان ہیں۔ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس میں کئی ایک وجوہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک سال میں اکٹھے کم نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے اسے امر غالب پر محمول کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عشرہ ذی الحجہ کی فضیلت ہے کہ وہ اجر و ثواب میں عشرہ رمضان سے کم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: آخرت میں ان دونوں میں سے کسی کے عمل کا ثواب دوسرے سے کم نہ ہوگا۔ پھر کہ ایک تیسرا قول بھی ہے: ان کا ثواب کم نہیں ہوتا، اگرچہ عدد میں کمی ہو، یہ توجیہہ زیادہ قوی اور درستگی کے زیادہ مشابہ ہے۔

انتیس کا ثواب تیس کی طرح ہے، یہ دونوں میں ہے۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کیا ہے۔ اس میں دو قسم کی ابحاث ہیں:

پہلی بحث: کثیر اور قلیل عبادت میں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ [الانعام: ۱۶۰] ''جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی''

دوسری بحث: ذی الحجہ کم نہیں ہے، اس کی ثواب کی کمی کا وہم ہے۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے ذی الحجہ کی ناقص عدد اس کے کامل کی طرح ہے۔

پہلی بحث کا یہ جواب ہے کہ رمضان کا اجمالی ثواب جیسا کہ حدیث میں ہے ''من صام رمضان غفر له'' کامل طور پر دیا جائے گا خواہ چاند مکمل ہو یا کم ہو۔ اس طرح دوسری بحث کا جواب یہی ہو سکتا ہے۔ اختصاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان دو مہینوں کو فضیلت دی ہے۔ نہایہ میں ہے کہ وہ حکم میں کم نہیں ہیں۔ عید میں غلطی کی وجہ سے گناہ نہیں ہے۔ تمہارے دلوں میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے۔ جب مہینہ انتیس کا ہو۔ یا حج میں کوئی غلطی ہو تو تمہارے ارکان میں کوئی نقص نہیں ہوگا۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: ذوالحجہ کا ثواب رمضان سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں مناسک اور دس دن ہیں۔ ایک قول ہے کہ ان دونوں کا ثواب روزے، قیام اور حج وغیرہ کی وجہ سے ہے۔ پھر ان دونوں کو خاص کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں مہینے میں دوسرے مہینوں کی طرح نہیں کہ جن میں کمی کی وجہ سے اس کی فضیلت میں بھی کمی آ جاتی ہے فضیلت کا کم نہ ہونا ان دو مہینوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مہینے کی فضیلت ثابت ہے خواہ مہینہ مکمل ہو یا ناقص، لیکن ثواب کم نہیں ہوگا، اگرچہ دونوں کی تعداد میں نقص ہو۔ جیسا کہ نوویؒ وغیرہ نے اس کو درست کہا ہے۔ ہر فضیلت رمضان یا ذوالحجہ کو ثابت ہے خواہ یہ مہینے مکمل ہو یا ناقص ہو۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان دونوں مہینوں کا جو حدیث کے سیاق سے ظاہر ہے، ایسے خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ حاصل ہو نا جو باقی مہینوں میں نہیں یہ مراد نہیں کہ حکم بجالانے کا ثواب دوسرے مہینوں میں کم ہوتا ہے۔ پس لائق ہے کہ حکم کو گناہ اور حرج کے رفع کرنے پر محمول کیا جائے۔ قریب ہے کہ حکم میں خطا ہو، ان دونوں کو عیدین کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے دونوں میں خطا کے احتمال کے جواز ہونے کی وجہ سے اور اس لیے نہیں کہا رمضان اور ذی الحجہ۔

شعبان کو رمضان کے ساتھ نہ ملاؤ

۱۹۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَقَدَّمَنَّ اَحَدُكُمْ رَمَضَانَ

بِصَوْمِ يَوْمٍ أَوْ يَوْمَيْنِ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ رَجُلٌ كَانَ يَصُوْمُ صَوْمًا فَلْيَصُمْ ذَالِكَ الْيَوْمَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٢٧/٤۔ حديث رقم ١٩١٤۔ ومسلم في صحيحه ١٠٨٢/٢١ وابو داؤد في السنن ٧٥٠/٢ حديث رقم ٢٣٣٥۔ والترمذي ٦٩/٣ حديث رقم ٦٨٥۔ والنسائي ١٣٦/٤۔ حديث رقم ٢١٣٠۔ وابن ماجه ٥٢٨/١ حديث رقم ١٦٥٠۔ والدارمي ٨/٢ حديث رقم ١٦٨٩۔ واحمد في المسند ٥٢١/٢۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص آگے نہ کرے روزے کو رمضان سے ایک دن پہلے یا دو دن مگر جو شخص روزہ رکھنے کی عادت رکھتا ہو۔ پس چاہیے کہ وہ اس دن کا روزہ رکھے اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **لا يتقد من أحدكم رمضان** : ابن ہمامؒ کہتے ہیں: نہی تنزیہی ہے اور خلاف اولیٰ ہے یہ مغصوب شدہ زمین میں نماز کی طرح ہے۔

بصوم يوم أو يومين : ابن ملکؒ کہتے ہیں: یہ اہل کتاب سے تشبیہ سے بچانا مقصود ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ''کہ ہر مہینے کے آخر میں روزہ رکھنے کا حکم فرمایا'' تخصیص ہوگی۔ اس کے ساتھ جو عمار بن یاسر سے ثابت ہے سے بھی تخصیص ہوگی، انہوں نے کہا: ''**من صام يوم الشك فقد عصى أبا القاسم**''۔ ہمارے مذہب میں معتمد علیہ بات یہی ہے کہ شک کے دن کا روزہ حرام ہے بلکہ اُس سے پہلے بھی جیسا کہ آرہا ہے۔ اس کے متعلق جواب حضرت عمارؓ کی حدیث میں آئے گا۔

مظہرؒ کہتے ہیں: شعبان کے آخر میں ایک دن یا دو دن روزہ مکروہ ہے۔

الا ان يكون رجل كان يصوم صوماً : معین نذر، عادتاً نفلی روزے کی وجہ سے یا رمضان کی قید کے بغیر مطلق روزہ رکھنا۔

فليصم ذلك اليوم : یعنی اگر یہ وقت ہو، تو اس کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شاید اس کی علت رمضان کے لئے چستی کے لئے استراحت کو لازم کرنا ہے۔ ایک قول ہے کہ نفل کا فرض کے ساتھ اختلاط ہے۔ یہ لوگوں میں شک کا باعث ہے۔ کہ وہ اُسے ہلال رمضان سمجھیں گے۔ بعض لوگ اس ظن کے ساتھ ان کی روزہ رکھنے کی موافقت کریں گے کہ انہوں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ یہ نہی نفل میں ہے۔ قضاء اور نذر دونوں ضروری ہیں۔ اس لئے کہ یہ فرض ہیں، ان کو مؤخر کرنا مکروہ ہے۔ جو ورد (وظیفہ) ہے، اس کا ترک درست نہیں ہے۔ کیونکہ عبادات میں افضل ہمیشگی ہے۔ جس کو عادت پڑ جائے ان کے لئے اس عبادت کو چھوڑنا دشوار ہوتا ہے۔

ایک قول ہے کہ اس کی علت یہ بھی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے آگے بڑھنا ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی قید رؤیت کے ساتھ رکھی ہے۔ تو گویا کہ رؤیت حکم کے لئے علت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة: ١٨٥] ''تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے''۔ جس نے اس سے پہلے روزہ رکھا اس نے اس علت پر طعن و تشنیع کی۔ میں کہتا ہوں: یہ بات زیادہ لائق ہے کہ وہ کہے کہ اس نے

نعن کا ارادہ کیا۔ فرماتے ہیں اور اسی طرف آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اشارہ کیا ہے: "من صام يوم الشك فقد عصى أبا القاسم"۔ یعنی جب رمضان کی نیت سے روزہ رکھے یا شک کی نیت سے رکھے یعنی نیت یہ کرے اگر اگلا دن رمضان ہو تو میں روزہ رکھتا ہوں۔ اور اگر نہ ہو تو اس کے علاوہ روزہ رکھتا ہوں۔ اس وقت وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اگر وہ نفلی روزہ رکھے یا کوئی اور روزہ تو اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ نہ اُس نہی میں۔ جس سے روکا گیا ہے۔ اس قول کی طرف اشارہ ہے "لا يتقدمن"۔ حدیث میں ہے "من صام يوم الشك فقد عصى أبا القاسم عليه السلام" یہ عمار بن یاسر کا قول ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ جب وہ تین دن سے مقدم کرے گا، تو وہ اس نہی کے تحت داخل نہیں ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: اس کو "اصحاب ستہ" نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

نصف شعبان کے بعد نفلی روزہ نہ رکھیں

۱۹۷۴: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُوْمُوْا۔

(رواه ابوداود والترمذي وابن ماجة والدارمي)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۲/ ۷۵۱ حديث رقم ۲۲۳۷۔ والترمذي ۳/ ۱۱۵ حديث رقم ۷۳۸ ۔ وابن ماجه ۱/ ۵۲۸ حديث رقم ۱۶۵۱۔ والدارمي ۲/ ۲۹ حديث رقم ۱۷۴۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا جس وقت شعبان کا آدھا مہینہ گزر جائے تو نفلی روزے نہ رکھو اس کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ و دارمی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اذا انتصف شعبان: یعنی جب پہلا نصف گزر جائے۔

فلا تصوموا: یعنی پہلے نصف کے ساتھ ملائے بغیر یا مذکورہ اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر۔ ایک روایت ہے۔ "رمضان تک اس کا کوئی روزہ نہیں" نہی تنزیہی کے لئے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امت پر رحمت ہے کہ وہ رمضان کے قیام کو نشاط کے ساتھ ادا کرنے سے کمزور نہ ہوں، رہا وہ شخص جس نے سارا شعبان روزہ رکھا۔ وہ عادی ہو جائے گا اور اس سے مشقت اور اکتاہٹ زائل ہو جائے گی۔ اسی لئے نصف کی قید لگائی ہے۔ یا اس سے بھی نہی ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا تقدم ہے۔ واللہ اعلم

قاضیؒ کہتے ہیں: مقصد یہ کہ جو مسلسل روزے نہیں رکھ سکتا، اس کو بچانا ہے۔ اس کے لئے روزہ افطار کرنا مستحب ہے۔ جس طرح عرفہ کا روزہ افطار کرنا مستحب ہے، تاکہ وہ دعا کی قوت قائم کر سکے۔ جو قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے ممانعت نہیں ہے۔ اسی لئے نبی نے دو مہینوں کے روزے کو جمع کیا ہے۔ یہ اچھا کلام ہے۔ لیکن یہ اس کے مشہور مذہب کے خلاف ہے کہ بغیر سبب کے نصف شعبان کے بعد روزہ مکروہ ہے۔ ابن حجرؒ کی شرح میں ہے ہمارے بعض ائمہ نے کہا ہے۔ نصف کے بعد بلا کراہت روزہ جائز ہے۔ اس لئے کہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ یا اس پر محمول ہے کہ جو روزے کی وجہ سے کمزوری سے ڈرتا ہے۔ محققین نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث ثابت ہی نہیں، بلکہ صحیح ہے۔ اور انہوں نے کمزوری کو سبب قرار دیا ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: ترمذی نے ابوہریرہؓ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اذا بقی النصف من شعبان فلا تصوموا" اور اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث اسی سند کے ساتھ انہی الفاظ سے مذکور ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: احمد کے قول پر تفکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس پر سکوت کیا ہے، اس کو نقل کرنے کے ساتھ کہ اس کے علاوہ دوسری کتب میں انکار ہے، گویا یہ حدیث ان کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ کہ امام احمدؒ نے اس کے راویوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں، سوائے اس حدیث کے۔ اور انکار کا سبب بیان نہیں کیا، اور اس کے رد پر کوئی جرح نہیں کی۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: بعض اہل علم کے ہاں اس کا معنی یہ ہے کہ جب نصف شعبان گزر جائے تو آدمی روزہ نہ رکھے۔

۱۹۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُحْصُوْا هِلَالَ شَعْبَانَ لِرَمَضَانَ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۷۱/۳ حدیث رقم ۶۸۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان کے لیے شعبان کے مہینے کو شمار کرو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: احصوا : باب "احصاء" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ امر ہے۔ اصل میں پتھر کے ساتھ گننا ہے۔

ھلال شعبان : یعنی اس کے دنوں میں۔

لرمضان : یعنی رمضان کی وجہ سے۔ یا رمضان کے مہینے پر محافظت کے لئے۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: تاکہ تمہیں رمضان شروع ہونے کا علم ہو جائے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شمار کرنے (گنتی) میں "احصاء" مبالغہ ہے اور یہ انتہائی مشقت کے ساتھ۔ اسی لئے آپ ﷺ کے قول میں طاقت سے کنایہ ہے "استقیموا ولن تحصوا"، ممکن ہے اس کے معنی میں کہا جائے، "ولن تعدو استقامتکم شیئًا معتدا به" چونکہ اس کا مدار اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کے شمار کرنے اور ضبط میں کوشش کرو، اور اس کو پالینے اور اس کی منازل دیکھنے کی جستجو کرو، تاکہ اس وجہ سے تم ہلال رمضان کے ادراک کی حقیقت پالو، اور تم سے کوئی رہ نہ جائے۔

پے در پے دو مہینوں کے روزے نہ رکھیں جائیں

۱۹۷۶: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ مَا رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ اِلَّا شَعْبَانَ وَرَمَضَانَ۔ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۵۰/۲ حدیث رقم ۲۳۳۶۔ والترمذی ۱۳/۳ حدیث رقم ۷۳۶۔ والنسائی ۱۵۰/۴ حدیث رقم ۲۱۷۵۔ وابن ماجه ۵۲۸/۱ حدیث رقم ۱۶۴۸۔

ترجمہ: حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا کہ دو مہینے پے در پے روزے رکھتے ہوں۔ مگر شعبان اور رمضان کے اس کو ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: أم سلمة : ام المومنین ہے۔

ما رأيت النبي : یعنی میں نے نہیں دیکھا۔

بصوم شهرين متتابعين الا شعبان ورمضان : یعنی سارا شعبان رکھتے یا اکثر شعبان کے روزے رکھتے۔

ان شاء اللہ "باب صيام التطوع" میں اس معنی پر مشتمل تفصیل کے ساتھ حدیث آئے گی۔ اور اس حدیث کو بیان کرنا اس باب کے مناسب تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

روزہ رکھنے میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی اتباع ضروری ہے

۱۹۷۷: وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيْهِ فَقَدْ عَصٰى اَبَا الْقَاسِمِ ﷺ.

(رواه ابو داود والترمذي والنسائي وابن ماجة والدارمي)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤/ تعليقاً باب اذا رايتم الهلال فصوموا۔ وابوداوٗد في السنن ٧٤٩/٢ حديث رقم ٢٣٣٤۔ والترمذي ٧٠/٣ حديث رقم ٦٨٦ والنسائي ١٥٣/٤ حديث رقم ٢١٨٨۔ وابن ماجه ٥٢٧/١ حديث رقم ١٦٤٥۔ والدارمي ٥/٢٠ حديث رقم ١٦٨٢۔

ترجمہ: حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو شخص شک کے دن روزہ رکھے تحقیق اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ اور نسائی اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عمار بن ياسر : یعنی حدیث موقوف ہے۔

من صيام اليوم الذي يشك فيه : یشک: مجہول کا صیغہ ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: يوم الشك نہیں کہا، مبالغہ کے لئے موصول کو ذکر کیا۔ اس بات پر تنبیہ کے لئے لایا گیا ہے، کہ روزہ اس دن کا جس میں ذرا بھر بھی شک ہو تو اس سے ابو القاسم کی نافرمانی لازم آتی ہے، وہ جو اللہ کے بندوں کے درمیان ان کی قدرت اور اقتدار کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم تقسیم کرتے ہیں) جس نے یوم شک کا روزہ رکھا تو وہ قائم و ثابت کیسے رہ سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ [هود : ۱۱۳] یعنی ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ذرا برابر بھی ظلم کو پسند کیا۔ تو اس ظالم کا کیا حال ہوگا؟ جس نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہو۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: کہ یہ اس پر محمول ہے کہ جو رمضان کی نیت کرتے ہوئے روزہ رکھے۔

فقد عصى أبا القاسم :

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: شک کہتے ہیں کہ ادراک کے دونوں طرف نفی اور اثبات برابر ہوں۔ یہاں اس کے وجوب کی وجہ شعبان کی تیسویں رات چاند کا بادلوں میں چھپنا ہے۔ شک تیسویں دن کا ہے کہ وہ رمضان کا ہے یا شعبان کا ہے۔ یا رجب جس شعبان کا چاند کا بادلوں میں چھپنا ہے اور اس کے تیس دن پورے کر دیئے اور پھر رمضان کا چاند نظر نہ آیا۔ تو شعبان کے تیسویں دن میں شک واقع ہوتا ہے کہ وہ تیسواں ہے یا اکتیسواں۔ اس میں ہمارے اصحاب کے علاوہ دوسروں کی بحث ہے کہ جب

گواہوں کی گواہی رد کی گئی، جب انہوں نے گواہی دی گویا کہ انہوں نے اس کا اعتبار نہیں کیا، اگر وہ "صحو" (آسمان صاف) تھا۔ تو ہمارے اس کو ظاہر ہونے کی وجہ غلط کہا جائے گا اور غلط کے مقابلہ میں وہم آتا ہے نہ کہ شک اور اگر بادلوں کی وجہ سے چھپا ہوا پہلے تو شک ہے۔ اگر چہ کسی نے بھی اس کے ساتھ گواہی نہ دی ہو پھر کہا: ہمارا مذہب اس میں اباحت کا ہے۔ امام شافعیؒ کا مذہب کراہت ہے اگر چہ روزہ اس کے موافق نہ ہو۔

امام احمدؒ کا مذہب اس کے وجوب کا ہے رمضان کے روزے کی نیت کے ساتھ۔ یہ ان سے صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ اس کو ابن جوزی نے ذکر کیا ہے۔ یہ یوم شک کے بارے میں۔ رہا اس سے ایک دن پہلے روزہ کی تحفہ میں ہے انہوں نے کہا: کہ روزہ ایک دن، یا دو دن کا مکروہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے: "لا تقدموا رمضان" ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ڈر سے نا پسند کیا کہ وہ جب عادت بنا لیں گے، تو وہ گمان کریں گے کہ یہ رمضان کے روزے پر زیادہ ہے۔ اس کے متعلق ابو یوسف نے کہا: شوال کے چھ روز دن کو رمضان کے ساتھ ملانا مکروہ ہے۔ صاحب ہدایہ کا استدلال مخفی نہیں ہے۔ اس روایت سے استدلال ہے "ان تصومو اغدًا" ۔ ابن ہمام کا احتمال اس روایت پر مبنی ہے: 'فلیصوموا" اس میں کوئی معارضہ نہیں۔

میرکؒ کہتے ہیں: تمام سندیں صلہ بن زفر عن عمار ہیں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ بخاری نے صیغۂ جزم کے ساتھ اس کو تعلیقاً روایت کیا ہے۔ امام حاکم نے روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ خطیب اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کو موقوف روایت کیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: ائمہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ صغانی کا قول ہے: انه موضوع ليس في محله۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: علم موجب دو آدمیوں کی اخبار کے ساتھ حاصل ہوتا ہے یا ایک آدمی دو عورتوں یا ایک صاحب عدل سے۔ ان دونوں کے ہاں، عدل، بلوغت اور آزادی کی شرط نہیں ہے۔ پھر کہا: ظاہر الروایہ میں ہے کہ عدل سے مراد جس کی عدالت ثابت ہو۔ حسن کی روایت میں ہے۔ مستور (غیر معروف آدمی) کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس کو حلوانی نے اختیار کیا ہے۔ مذہب میں ثابت شدہ اختلاف کا حاصل کہ عدالت کے ظہور کی شرط ہے یا ستر پر کافی ہے۔

پھر کہا: مستور کے بارے نوادر کے قول کی وجہ سے اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی متمسک نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اسلام کا ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ہونے کے ساتھ ہے، جب شہادتین کے متعلق پوچھا اگر چہ یہ اسلام کے شروع کا واقعہ ہے۔ اس کی عدالت کے ثبوت میں کوئی شک نہیں۔ تو اس کے وجوب کا حکم اس کے باقی رکھنے کا ہے، جب تک خلاف ظاہر نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہل اسلام پر فسق غالب نہ تھا۔ اس اصل کی وجہ سے غلبہ پیش آتا ہے، تو اس کے ظہور کے وقت توقف واجب ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: یہ عمارؓ پر موقوفاً ثابت ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کو تعلیقاً ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: "وقال صلة عن عمار من صام يوم الشك" ۔ حدیث کی اصل جس کو اصحاب سنن اربعہ نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کیا ہے۔ عن صلة بن زفر قال : كنا عند عمار في اليوم الذي يشك فيه، فأتي بشاة مصلية فتنعى بعض القوم فقال عمار ومن صام هذا اليوم فقد عصى أبا القاسم' : پھر کہا حدیث موقوف ہے۔ اور "حدیث سرر" کے متعارض نہیں ہے۔ جیسا کہ آئے گا۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس کو رمضان کے روزے کے ارادہ پر محمول کیا جائے۔ گویا کہ انہوں آدمی کے

پہلوتہی کرنے سے اس کے قصد کو سمجھا تو اس وقت یہ تعارض نہیں ہے۔

رمضان کے چاند میں فاسق کی گواہی قبول نہیں ہوتی

۱۹۷۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَيْتُ الْهِلَالَ يَعْنِیْ هِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَ تَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَتَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ قَالَ يَا بِلَالُ اَذِّنْ فِی النَّاسِ اَنْ يَّصُوْمُوْا غَدًا۔

(رواه ابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۷۵٤/۲ حديث رقم ۲۳٤۰۔ والترمذی ۷٤/۳ حديث رقم ٦۹۱۔ والنسائی ۱۳۲/٤ حديث رقم ۲۱۱۳۔ وابن ماجه ۵۲۹/۱ حديث رقم ۱٦۵۲ والدارمی ۹/۲ حديث رقم ۱٦۹۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا میں نے چاند دیکھا ہے یعنی رمضان کا چاند۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اس نے کہا ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر ہیں اس نے کہا ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بلال! لوگوں کو کہو کہ کل روزہ رکھیں۔ اس کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: أعرابی : أعراب کی واحد ہے، دیہات کے رہنے والے

الی النبی ﷺ فقال انی رأیت الهلال : اس میں دلیل ہے کہ اخبار کافی ہے لفظ شہادت اور دعویٰ کی ضرورت نہیں ہے۔

يعنی هلال رمضان : حسن نے اپنی حدیث میں رمضان کو ذکر کیا ہے۔ یہ قول ابن ہمامؒ نے ذکر کیا ہے۔ اس قول سے ابن حجرؒ کا قول ضعیف ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس کے قائل ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔

فقال : أتشهد أن لا اله الا الله قال نعم! قال أتشهد أن محمداً رسول الله، قال نعم : ابن ملکؒ کہتے ہیں: کہ گواہی میں اسلام (مسلمان ہونا) شرط ہے۔ شہادتین میں فصل دونوں قضیوں میں سے پہلے مقدمے کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

قال : يا بلال اذن فی الناس : ان کے سامنے اور ان کو بتادو۔

أن يصوموا : ای بأن يصوموا.

غدًا : ابن ہمامؒ کی روایت میں ہے فليصوموا۔ رمضان کی قید کا نہ ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ ہمارا موقف ٹھیک ہے۔ اس کو مطلق روزے کی نیت کے ساتھ ادا کرنا صحیح ہے۔ صاحب ہدایہ نے "غد" کی قید سے دن میں نیت کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں: اس میں احتمال ہے کہ اس نے دن میں شہادت دی اور یہ بھی احتمال ہے کہ رات کو۔ لہٰذا اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں۔

یہ بات مخفی نہیں کہ صاحب ہدایہ کا استدلال اس روایت سے ہے: "ان يصوموا غدا"۔ ابن ہمامؒ کا احتمال اس روایت

یٰیں ہے: "فليصوموا فلا معارضة"۔

مظہرؒ کہتے ہیں: حدیث اس پر دال ہے کہ جس کا فسق غیر معروف ہو تو اس کی شہادت قبول کی جائے گی اور اس پر بھی دال ہے کہ اکیلے کی شہادت ہلال رمضان کے متعلق مقبول ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ تمام صحابہ عادل ہیں۔ اور حاکمؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں کہ ایک سند سے موصول ہے اور ایک سند سے مرسل ہے۔ اگرچہ متصل سند صحیح ہے۔

چاند دیکھنے کا ثواب

۱۹۷۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَرَاءَىٰ النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ رَاَيْتُهُ فَصَامَ وَاَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهٖ۔ (رواه ابو داود والنسائي)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۷۵٦/۲ حديث رقم ۲۳٤۲۔ والدارمي ۹/۲ حديث رقم ۱٦۹۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ چاند دیکھنے کے لیے جمع ہوئے پس میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ تحقیق میں نے چاند دیکھا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ (یہ ابوداؤد و دارمیؒ نے نقل کیا ہے)۔

تشریح: تراءى الناس الهلال: مظہر کہتے ہیں: الترائی یعنی کہ بعض لوگ بعض کو دیکھیں۔ یہاں مراد رؤیت کے لئے اجتماع ہے۔

فأخبرت: یعنی میں اکیلے نے۔

رسول الله ﷺ أني رأته: یعنی چاند دیکھا۔

فصام وأمر الناس بصيامه: یعنی رمضان کے روزے کا حکم دیا۔

میرکؒ کہتے ہیں کہ تصحیح سے منقول ہے۔ حاکمؒ نے اس کو روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلم کی شرط پر ہے۔ اور اس کو بیہقیؒ نے روایت کیا ہے۔ ابن حبانؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: اس کیا سند مسلم کی شرط پر ہے۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ حق وہ ہے جس کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے، کہ اکیلے آدمی کی رؤیت ہلال کا ثبوت احتیاطاً ہے۔ ہمارے بعض متاخر علماء کی ایک جماعت نے دعویٰ کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے اکثر علماء کی موافقت میں اکیلے کی رؤیت سے رجوع کر لیا ہے، کہ دو کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ باقی مہینے ہیں۔ اس قول کو اختیار کرنے اس کے علاوہ اور بھی نفوس جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض پہلے اکابرین نے اس کو اختیار کیا اور اس کو وہم قرار نہیں دیا۔ چونکہ دو کی طرف رجعت قیاس کے ساتھ ہے۔ کیونکہ سنت سے ثابت نہیں۔ جیسا کہ مختصر میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت ثابت ہے کہ اکیلے آدمی کی گواہی کو قبول کیا۔ اکیلے ابن عمرؓ کی شہادت قبول واحد والے مذہب پر دال ہے، کیسے گمان کیا جائے کہ قیاس کی وجہ حدیث کو چھوڑ دیا۔ ساتھ اس کے کہ ان کا قول ہے: "اذا صح الحديث فهو مذهبي واضربوا بقولي الحائط"۔ محل خلاف جو خبر واحد کے ساتھ حکم نہیں لگاتے، مگر روزہ واجب ہو جائے گا، اور اجماعاً ثابت ہے کہ حکم میں نقض نہیں ہے۔

الفصل الثالث:

رمضان کی حفاظت کی خاطر‘ شعبان کی گنتی پر خصوصی توجہ دیتے تھے

۱۹۸۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَفَّظُ مِنْ شَعْبَانَ مَالاَ يَتَحَفَّظُ مِنْ غَيْرِهٖ ثُمَّ يَصُوْمُ لِرُؤْيَةِ رَمَضَانَ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْهِ عَدَّ ثَلاَثِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ صَامَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲/ ۷۴٤ حدیث رقم ۲۳۲۵۔ واحمد فی المسند ۱٤۹/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے کے دن اتنے اہتمام سے گنتے تھے کہ شعبان کے علاوہ مہینوں کے اتنے اہتمام سے نہیں گنتے تھے پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھتے اور اگر ابر ہوتا تو تمیں دن پورے کرتے پھر روزہ رکھتے اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: كان رسول الله يتحفظ من شعبان : رمضان کے روزے کی محافظت کے لئے ایام شعبان کی گنتی میں خوب مشقت اٹھاتے۔

ما لا يتحفظ من غيره : کیونکہ دوسرے مہینوں کے ساتھ کوئی امر شرعی متعلق نہیں۔ ہاں حج کا مہینہ۔ مگر وہ نادر ہے، اور ہر سال ہر کسی کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے ساتھ حج کے مہینے کا ضبط رمضان پر موقوف ہے۔

ثم يصوم لرؤية رمضان فان غم عليه : یعنی شعبان۔ عد ثلاثين يومًا، ثم صام۔

چاند دیکھ کر روزہ رکھو

۱۹۸۱: وَعَنْ أَبِي الْبَخْتَرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا لِلْعُمْرَةِ فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَةٍ تَرَاۤ أَيْنَا الْهِلاَلَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلاَثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَيْلَتَيْنِ فَلَقِيْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَقُلْنَا إِنَّا رَأَيْنَا الْهِلاَلَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلاَثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَيْلَتَيْنِ فَقَالَ اَيَّ لَيْلَةٍ رَاَيْتُمُوْهُ قُلْنَا لَيْلَةَ كَذَا وَكَذَا فَقَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَدَّهٗ لِلرُّؤْيَةِ فَهُوَ لَيْلَةٌ رَاَيْتُمُوْهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ اَهْلَلْنَا رَمَضَانَ وَنَحْنُ بِذَاتِ عِرْقٍ فَاَرْسَلْنَا رَجُلاً إِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ يَسْأَلُهٗ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ اَمَدَّهٗ لِرُؤْيَتِهٖ فَإِنْ اُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲/ ۷٦٦ حدیث رقم (۳۰۔ ۱۰۸۸)۔

ترجمہ: حضرت ابوالبختری سے روایت ہے کہ ہم اپنے شہر کوفہ سے عمرہ کرنے کے لیے نکلے پس جب ہم بطن نخلہ میں

اترے جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک مکان کا نام ہے ہم چاند دیکھنے کے لیے جمع ہوئے پس بعض لوگوں نے کہا کہ وہ تیسری شب کا ہے اور بعض نے کہا کہ دوسری شب کا ہے پس ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تم نے کس رات دیکھا ہے ہم نے کہا کہ ہم نے دیکھا ہے ایسی ایسی رات کو یعنی فلانی شب کو بتایا اس کو دیکھا تھا ہم نے پیر کی رات کو یا منگل کی رات کو فرمانے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی مدت چاند دیکھنے کے ساتھ قائم کی ہے یعنی صاحب دیکھیں تو رمضان کا روزہ رکھیں۔ پس وہ اس رات کا ہے۔ ابوالبختریؒ سے ایک روایت ہے کہ ہم نے رمضان کا چاند دیکھا اور ہم ذات عرق میں تھے جو ایک جگہ کا نام ہے بطن نخلہ کے قریب ہم نے ایک شخص ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ ان سے پوچھ کر آئے کہ یہ چاند کس رات کا ہے اختلاف مذکورہ کی وجہ سے پس ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے شعبان کی مدت کو بڑھا دیا ہے تاوقتیکہ رمضان کا چاند دیکھ لیں پس اگر ابر کیا جائے تم پر پس تم گنتی پوری کرو۔ پس تمیں دن شمار کرو اور روزہ رکھو یہ مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبي البختري : ''تاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور خاء ساکن کے ساتھ۔ ثقہ اور ہیں۔ ثبت فیه تشیع قلیل، کثیر الارسال تقریب میں اسی طرح ہے، تو جو روایت سماع کے ساتھ روایت کرے وہ مقبول ہے اور جو ''عن'' کے ساتھ نقل کرے تو وہ ضعیف ہے۔ انہوں نے یہ بات مقدمہ میں ذکر کی ہے۔ بعض نسخوں میں ''ضمہ'' کے ساتھ ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کا نام اسعد بن فیروز کوفی ہے۔

قال : خرجنا : یعنی اپنے شہر سے نکلے۔

للعمرة : یعنی عمرہ کا قصد اور اس کو ادا کرنے کی غرض سے۔

فلما نزلنا ببطن نخلة : مکہ کی شرقی جانب مشہور بستی ہے۔ اب اس کا نام ''مضبیق'' ہے۔ یہ قول ابن حجرؒ کا ہے۔

تراء ينا الهلال : یعنی ہم رؤیت ہلال کے لئے جمع ہوئے اس کے مکمل ظاہر ہونے کی وجہ سے۔ یا ہم میں سے بعض نے بعض کو دکھلایا، اس لئے کہ بعض کی نظروں سے مخفی تھا۔ یا چاند کے کی پیدائش کی جگہ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: چاند کی طرف اشارہ مکروہ ہے اس لئے کہ یہ اہل جاہلیت کا فعل ہے۔ لیکن اس میں یہ بات ہے کہ دیکھنے کے وقت تو اشارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ لہٰذا کراہت کو عدم ضرورت پر محمول کریں گے۔

فقال بعض القوم هو ابن ثلاث : یعنی تیسری رات والا تھا، یہ اس کے بلند ہونے کی وجہ سے تھا۔

وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فلقينا : ہم ملے۔ ابن عباس : نصب کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں رفع اور ''لقینا'' یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس کا معنی ہے ''هو لقينا'' پہلا قول لفظاً اور معناً صحیح ہے کیونکہ اس میں ادب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

فقلنا : یعنی اسے کہا۔

انا : یعنی قبیلے والے۔ (ارينا الهلال : یعنی بہت بلند دیکھا۔ فقال بعض القوم هو ابن ثلاث، وقال بعض القوم، هو ابن ليلتين فقال : یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا۔ (ای ليلة : رفع کے ساتھ۔ صحیح نسخہ میں نصب کے ساتھ اور یہ ''اية ليلة'' سے زیادہ فصیح ہے۔ رأيتموه : یعنی اس میں چاند کو دیکھا۔ قلنا ليلة كذا : ہم نے اس رات دیکھا مثلاً وہ پیر کی رات تھی۔ وكذا : وہ منگل کی رات تھی۔ فقال ان رسول الله قال ان الله مده برؤية : یعنی رمضان کی مدت چاند کی رؤیت

سے ہے، یہ قول طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول کہ اس کا وقت ظاہر نہیں ہے، اگر لام توقیت کے لئے ہے۔ ان کے درمیان جمع کی کوئی وجہ نہیں ہے اگر لام بمعنی "بعد" ہے تو وقت ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ معنی اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔
فهو : یعنی رمضان۔ للیلة رائیتموه : ابن حجرؒ کہتے ہیں: لیلۃ کی اضافت جملہ کی طرف ہے۔ صحیح نسخوں میں تنوین کے ساتھ ہے۔ جیسا ماقبل ای لیلة رائیتموه غایته أنه یقدر فیها فیهما" زیادہ سے زیادہ بات یہ ہے کہ دونوں جگہ لفظ "فیھا" مقدر ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ رمضان کا وقت اس رات میں چاند کی رؤیت سے شروع ہے۔ اس کے بڑے ہونے کا اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ حدیث ہے کہ چاند کا بڑھنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور ابن حجرؒ کا قول: اس کے وقت کا حساب رؤیت والی رات ہے صحیح نہیں، وقت کی اضافت رات کی طرف ہے۔ اور وہ بھی وقت ہے۔

وفی روایة عنه : یعنی ابوالبختری ہی سے ہے۔ قال أهللنا رمضان : نہایہ میں ہے۔ حاجیوں نے حج کا تلبیہ پکارا اور اپنی آواز کو بلند کیا اسی سے ہے۔ "اهلال الهلال و استهلاله" جب وہ تکبیر کے ساتھ رؤیت کے وقت اپنی آواز کو بلند کرتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: بمعنی "تراء يناه" ہے جیسا کہ پہلی روایت میں ہے۔
(ونحن بذات عرق : عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ "بطن نخله" سے ایک دن کے فاصلے پر اور مکہ سے دو مرحلوں پر ہے اور "بطن نخلہ" مکہ سے ایک مرحلے پر ہے۔ فارسلنا رجلا الی ابن عباس یسأله فقال : جو ان کے درمیان واقع ہوا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

ابن عباس قال رسول الله ﷺ ان الله قد أمده لرؤیته : قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ اس نے رؤیت کی مدت کو لمبا کیا یعنی شعبان کی مدت کو یعنی رمضان کی رؤیت کے زمانے تک رہا۔ ابن حجر کا قول! اس سے یہ زیادہ واضح ہے کہ کہا جائے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی مدت کی ابتداء کا حصول اس کی رؤیت کے بغیر واضح نہیں ہے۔ بلکہ فاسد ہے کیونکہ ضمیر "أمده" کی شعبان کی طرف راجح ہے۔ اور رؤیته میں ضمیر رمضان کی طرف راجح ہے اور ابن حجر رحمہ اللہ کی تقدیر کے مطابق دونوں ضمیریں رمضان طرف راجع ہیں جس طرح کہ ان کا گمان ہے۔ تو اس کا کوئی معنی نہیں امد رمضان لرؤیة رمضان۔ حدیث میں ابتداء پر دلالت نہیں ہے۔ اگر ہم کہیں کہ لام بمعنی "بعد" ہے۔ معنی یہ ہے کہ رمضان کی مدت کا شروع ہونا رؤیت ہلال کے بعد ہے تا کہ جملہ میں معنی صحیح ہو جائے۔ لیکن ابن عباس رضی اللہ کی طرف ان کے سوال کا بطور جواب کے صحیح نہ ہوگا۔ تدبر

فان اغمی علیکم : کہا جاتا ہے: اغمی علیه الخبر، یعنی اگر تم پر مخفی ہو جائے جیسے بادل وغیرہ چھا جائیں۔
فأکملوا العدة : یعنی شعبان کے تیس دن پورے کرلو۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ روایت پہلی روایت کے منافی نہیں ہے کہ انہوں نے ذات عرق میں دیکھا اور وہاں ان کے درمیان جھگڑا ہوا۔ انہوں نے آدمی بھیجا تا کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھے۔ تو انہوں نے یہ جواب دیا۔ جب وہ بطن نخلہ پہنچے تو وہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے براہ راست ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو انہوں نے سوال کے مطابق ان کو جواب دیا۔ ان دونوں کا حاصل کلام یہ ہے کہ حکم ضروری ہے، رمضان ... نے تیس تیسری رات شعبان سے اس کی رؤیت سے۔ یہ اس قول سے مستفاد ہے: "للیلة رایتموه" مغرب سے

پہلے کی رؤیت ہلال کا اعتبار نہیں ہے۔ یا اگر شعبان کی تیسری رات یا رمضان کی تیسرے دن زوال سے پہلے یا زوال کے بعد تو پچھلی رات اور آنے والی پر کوئی حکم نہ ہوگا۔ نہ رمضان کو اس سے افطار کرے گا اور نہ اس کو شعبان سے جوڑے گا۔ اگر رؤیت غروب کے بعد ہے تو آنے والی رات کے لئے حکم ہے وگرنہ نہیں، یہ پہلے حدیث کی وجہ سے

صوموا لرؤيته : اور حضرت عمرؓ سے صحیح روایت ثابت ہے: "**أرسل الى جند له بالعراق ان هذه الأهلة بعضها أكبر من بعض. فاذا رأيتم الهلال نهاراً فلا تفطروا حتى يشهد شاهدان أنهما رأياه بالأمس**"۔ ابن عمرؓ سے صحیح ثابت ہے: "**ان ناسا راؤ أوالهلال الفطر نهارًا فأتم صيامه الى الليل وقال لا حتى يرى من حيث يرى بالليل**"۔ ایک دوسری روایت ہے: "**لا يصلح حتى تروه ليلاً من حيث يرى**"۔ بیہقی کہتے ہیں: اس موضوع میں ہم نے عثمانؓ اور ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ بیہقی کے علاوہ ایک اور نے روایت کیا ہے یہ روایت انسؓ اور حضرت علیؓ سے ہے اور ان کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ امام مالکؒ کی بلاغیات میں سے ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں چاند عشاء کے وقت دیکھا گیا انہوں نے افطار نہیں کیا، یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر رؤیت زوال سے پہلے کی ہے تو گزشتہ رات اگر زوال کے بعد ہے تو آنے والی رات کے لئے ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا انتیسویں کو دیکھا تو گزشتہ کے لئے ہوگا اس لئے کہ مہینے کا ۲۸ کا ہونا مستحیل ہے، اس سے ہمارے مذہب کو تائید حاصل ہوتی ہے کہ شک کے دن کا روزہ حرام ہے اور جو امام شافعیؒ سے نص منقول ہے کہ اس کا رد ہے۔ اور ان کے جمہور اصحاب اس روزے کو مکروہ کہتے ہیں حرام نہیں۔ پھر کہا جب بادل چھائے ہوں تو اس کا روزہ سنت کے مطابق نہیں ہے۔ جیسا کہ امام احمد کا قول ہے کہ واجب ہے۔ اس لیے کہ خلاف حسب سنت صحیحہ کے مخالف ہو تو اس کی رعایت نہیں رکھی جاتی اور اس میں ہے کہ یہ صریح انکل ہے۔ حق بات ہمارا متوسط مذہب ہے آپ اس پر غور کریں تا کہ آپ اس دلدل میں گرنے سے بچ جائیں۔

باب (أی فی مسائل متفرقة من كتاب الصوم)

الفصل الاول:

سحری کھانے میں برکت ہے

۱۹۸۲: عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسَحَّرُوْا فَإِنَّ فِي السُّحُوْرِ بَرَكَةً۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٣٩/٤۔ حديث رقم ١٩٢٣۔ ومسلم فی صحيحه ٧٧٠/٢ حديث رقم ١٠٩٥/٤٥۔ والترمذی فی السنن ٨٨/٣ حديث رقم ٧٠٨۔ والنسائی ١٤٠/٤۔ حديث رقم ٢١٤٤۔ وابن ماجه ٥٤٠/١ حديث رقم ١٦٩٢۔ والدارمی ١١/٢ حديث رقم ١٦٩٦ واحمد فی المسند ٩٩/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سحری کھاؤ۔ اس لیے کہ سحری کے کھانے میں

برکت ہے یہ بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن أنس قال : قال رسول الله ﷺ تسحروا : مندوب حکم ہے۔اور اس پر اجماع ہے۔یعنی سحری کے وقت کوئی چیز ضرور تناول کرو اور یہ بھی حدیث ہے (تسحروا ولو بجرعة ماء) اس کو ابن حبانؒ نے صحیح کہا ہے۔ایک قول ہے کہ یہ ضعیف ہے لیکن ضعیف قول اعمال میں قبول ہیں۔قاموس میں ہے کہ سحر صبح سے تھوڑا پہلے ہوتا ہے۔کشاف میں ہے: رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔ایک قول ہے کہ وقت نصف رات کو شروع ہو جاتا ہے۔فان فی السحور :سین کے فتحہ کے ساتھ۔محدثین کے ہاں روایت محفوظ ہے۔اس سے مراد جو سحری کے وقت کھایا پیا جاتا ہے۔

بركة : سنت کو قائم کرنے سے بہت بڑا اجر ملتا ہے۔سحری روزہ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔کیونکہ سحری دن کے کھانے کے قائم مقام ہے نہایہ میں ہے کہ فتحہ کے ساتھ ہے،ایک قول ہے کہ ضمہ کے ساتھ درست ہے۔وہ مصدر ہے اور اجر فعل میں ہے کھانے میں نہیں ہے۔ممکن ہے کہا جائے کہ فتحہ کے ساتھ درست ہے،کیونکہ فعل پر ثواب اس لیے دیا جاتا ہے کہ سنت کے مطابق ہے۔تو اس سنت کے اثر (کھانا کھانے) ر اجر ملتا ہے تو خود اس پر تو بطریق اولی اجر ملے گا۔تو مبالغہ سے جو فائدہ ہے تو مخفی نہیں۔جیسا کہ حدیث میں ہے: "مداد العلماء أفضل من دماء الشهداء" لیکن اس کی تفسیر برکت کے ساتھ حصول ثواب غریب قول ہے جیسا کہ آئے گا۔"مهلم الى الغداء المبارك في الحديث"۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: کل کے روزے پر آدمی کو طاقت حاصل ہو جاتی ہے یہی برکت کا معنی ہے۔اس کی دلیل نبی علیہ السلام کا فرمان ہے: "استعينوا بمقابلة النهار على قيام الليل وبأكل السحور على صيام النهار" ثواب کی زیادتی سے مراد سید المرسلین کی سنت پر عمل کرنا ہے۔نبی ﷺ نے فرمایا: "فرق ما بين صومنا وصوم أهل الكتاب أكلة السحر"۔دونوں میں کوئی منافات نہیں۔برکت سے مراد دونوں حکم ہیں۔سحور سے مراد وہ کھانا جو رات کے آخری حصے میں کھایا جاتا ہے۔نہایہ میں ہے کہ اس کا مضاف محذوف ہے تقدیری عبارت ہے: "فی اکل السحور بركة" یہ سین کے ضمہ کے ساتھ سحر کی جمع ہے۔فتحہ کے ساتھ روایت زیادہ معروف ہے۔مضاف کو مقدر مان کر سین کے فتحہ کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سحری کھانے میں برکت ہے نہ کہ صرف سحری میں برکت ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔جو ہم نے کہا ہے اس پر آپ ﷺ کا قول دلالت کر رہا ہے: "بأكل السحور"۔واللہ اعلم

سحر کے وقت کھانا نبی کریم ﷺ کی سنت ہے

۱۹۸۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصْلُ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَصِيَامِ اَهْلِ الْكِتَابِ اَكْلَةُ السَّحَرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۷۰/۲ حدیث رقم (٤٦ - ١٠٩٦)۔ والترمذی فی السنن ۸۸/۳ حدیث رقم ۷۰۸۔ والنسائی ١٤٦/٤ حدیث رقم ٢١٦٦۔ والدارمی ١١/٢ حدیث رقم ١٦٩٧۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے

درمیان فرق صرف سحری کھانا ہے۔اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عمرو بن العاص قال : قال رسول الله ﷺ فصل ما بین صیامنا وصیام أهل الکتاب : ''ما'' زائدہ اس کی اضافت لفظ''فصل'' کی طرف ہے جس کا معنی فرق ہے۔تورپشتی ؒ کہتے ہیں: صاد کو ضاد پڑھنا تصحیف ہے۔أکلة السحر : ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ''المرة'' کے معنی میں ہے۔یہ قول میرکؒ کا ہے۔زین العربؒ کہتے ہیں: ''الأکلة'' ضمہ کے ساتھ لقمہ کے معنی میں ہے۔اور نسخہ میں بھی اسی طرح ہے۔اس کا معنی کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے صبح تک کھانا حلال قرار دیا ہے جو ابتداء اسلام میں ہمارے اوپر بھی حرام تھا،اور ان پر سو جانے کے بعد حرام تھا یا مطلق حرام تھا۔اور ہمارا ان کی مخالفت کرنا اس نعمت کی وجہ سے شکر کی جگہ ہے۔ابن ہمامؒ کا قول ''انه من سنن المرسلین'' صحیح نہیں ہے۔

افطاری کرنے میں جلدی کرو

۱۹۸۴: وَعَنْ سَهْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۸/٤۔ حدیث رقم ۱۹۵۷۔ ومسلم فی صحیحه ۷۷۱/۲ حدیث رقم (٤٨۔ ١٩٨)۔ والترمذی فی السنن ٨٢/٣ حدیث رقم ٦٩٩۔ وابن ماجه ٥٤١/١ حدیث رقم ١٦٩٧۔ والدارمی ١٢/٢ حدیث رقم ١٦٩٩ ومالك فی الموطأ ٢٨٨/١ حدیث رقم ٦ من کتاب الصیام۔ واحمد فی المسند ٣٣٩/٥۔

ترجمہ: حضرت سہلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگ ہمیشہ بھلائی کے ساتھ رہیں گے۔جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔یہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن سهل قال : قال رسول الله ﷺ لا یزال الناس بخیر : یعنی صفت خیر کے ساتھ موصوف رہیں گے۔یا خیر سے مراد شر اور فساد کی ضد ہے۔ما عجلوا الفطر : یعنی جب تک اس سنت پر رہیں گے۔صحیح حدیث کے مطابق یہ سنت صلوٰۃ پر متقدم ہے۔تورپشتی ؒ کہتے ہیں: جلدی کرنے میں اہل کتاب کی مخالفت ہے،کیونکہ وہ روزے کو تاروں کے چمکنے تک مؤخر کرتے تھے۔پھر ہمارے علت میں سے اہل بدعت کی یہ عادت ہوگئی۔ہمارے بعض علماء کہتے ہیں: اگر اس نے نفس کی تادیب اور عشائین کی مواصلت کے لئے کیا،اور تاخیر کے وجوب کا اس کا اعتقاد نہیں ہے تو یہ اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔میں کہتا ہوں بلکہ یہ اس کے لئے نقصان دہ ہے جب سنت فوت ہو جائے۔پانی کے گھونٹ کے ساتھ افطاری میں جلدی کرنا تادیب کے منافی نہیں ہے۔جلدی کرنا اس بات کا اظہار ہے کہ بندہ اللہ کی عبادت میں سر تسلیم خم ہے اور رب العالمین کی رخصت کو قبول کرنے میں جلدی کرنے والا ہے۔

پھر میں نے تورپشتی ؒ کو کہتے ہوئے سنا: یہ ایسی خصلت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ناپسند کیا ہے۔میں کہتا ہوں: یہ تاخیر ایک دن کے روزے یا دو دن کے روزے کو رمضان پر مقدم کرنے کے مشابہ ہے۔اور رسول اللہ ﷺ کی متابعت ہی صراط

مستقیم ہے اور اس سے منہ موڑا۔تو اس نے کج روی کا ارتکاب کیا۔اگر چہ عبادت میں ہو۔اس کی تائید اس فعل سے ہوتی ہے جو صحابہ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ افطاری میں جلدی کرتے تھے اور سحری میں تاخیر کرتے تھے۔احمدؒ نے یہ الفاظ زائد بیان کئے ہیں: وأخروا السحور۔

غروبِ آفتاب ہوتے ہی روزہ افطار کرنا چاہیے

۱۹۸۵:وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هٰهُنَا وَاَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هٰهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۶/٤۔ حدیث رقم ۱۹۵٤۔ ومسلم فی صحیحه ۷۷۲/۲ حدیث رقم (۵۱۔ ۱۱۰۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۷٦۲/۲ حدیث رقم ۲۳۵۱۔ والترمذی ۸۱/۳ حدیث رقم ٦۹۸۔ والدارمی ۱۳/۲ حدیث رقم ۱۷۰۰۔

ترجمہ:حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت رات آئے (یعنی مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی اٹھے) اور دن اس جگہ سے چلا جائے یعنی مغرب سے اور آفتاب چھپ جائے۔اس وقت روزے دار افطار کرے۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عمر قال : قال رسول الله ﷺ اذا أقبل الليل :یعنی اس کا اندھیرا۔من ھھنا :یعنی مشرق کی جانب سے۔وأدبر النهار :یعنی اس کی روشنی۔من ھنھا :یعنی مغرب کی طرف۔

وغربت : راء کے فتحہ کے ساتھ۔یعنی ''غابت''۔الشمس :یعنی تمام سورج۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''وغربت الشمس'' کہ سورج غروب ہو جائے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔یہ بیان کرنے کے لئے کہ سورج مکمل غروب ہو جائے۔تا کہ وہ گمان نہ کریں کہ افطار اس کے بعض کے غروب کے ساتھ ہے۔بعض علماء کہتے ہیں: ان دونوں کا ذکر اس بات کی وضاحت کے لئے ہے کہ اس کا آنکھوں سے غروب ہونا کافی نہیں، کیونکہ کبھی کبھی غائب ہوتا ہے، حقیقی طور پر غروب نہیں ہوتا، تو رات کا آنا ضروری ہے۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: کہ کبھی رات ہو جاتی ہے اور وہ حقیقتاً غروب نہیں ہوتا۔اور اس کا حقیقتاً غروب ہونا ضروری ہے۔یہ قول نامانوس اور صحیح نہیں، اور یہ پہلے قول کے علاوہ ہے۔اس میں اقتصار ہے، اور علماء نے اس کے ذکر پر اقتصار کیا ہے۔لیکن اس میں دوسری قید اس سے مستغنی ہے اور ان کا کلام مکمل ہو جاتا ہے، اگر اس کو غریب مانا جائے جو پیچھے گزر چکا ہے، تو وہ حکم راجح قرار پائے گا، جس کو طیبی رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے۔

فقد افطر الصائم :یعنی وہ حکماً مفطر کہلائے گا، اگر چہ حساً مفطر نہ ہو۔نہایہ اور شرح السنہ میں اسی طرح ہے کہ اس کا حکماً مفطر ہونے کی دلیل یہ ہے۔کہ کل کے روزے کی نیت کا ہونا ضرورت ہے اگر چہ اس نے کھایا پیا نہ ہو۔ایک قول ہے کہ وہ افطار کے وقت میں داخل ہو گیا۔ابو عبید کہتے ہیں: اس میں مواصلین پر ردّ ہے، یعنی مواصل (بغیر کھائے پیئے روزہ رکھنے والا) کو کھانے والے پر فضیلت نہیں ہے۔کیونکہ رات روزے کے لئے نہیں ہے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ممکن ہے کہ اس خبر کو انشاء پر

محمول کیا جائے اور جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کرنے پر ابھارنے کے لئے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: کہ جب رات چھا جائے تو روزے دار کو افطار کر لینا چاہئے۔ اس لئے کہ خیر (بھلائی) کا دار و مدار جلدی افطار کرنے میں ہے۔ گویا کہ وہ واقع ہو گیا اور حاصل ہو گیا، اور وہ اس کے متعلق خبر دے رہا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [الصف: ١٠، ١١] ''مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دی۔ (وہ یہ کہ) خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' رہا یہ قول کہ روزہ غروب مکمل ہو جانے سے پورا ہو جاتا ہے۔ اس پر اجماع ہے۔

پے در پے روزے رکھنے کی ممانعت

١٩٨٦: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِى الصَّوْمِ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ اِنَّكَ تُوَاصِلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَاَيُّكُمْ مِثْلِىْ اِنِّىْ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِىْ رَبِّىْ وَيَسْقِيْنِىْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤/ ٢٠٠ـ حديث رقم ١٩٦٠ـ ومسلم في صحيحه ٢/ ٧٧٤ حديث رقم (٥٧ـ ١١٠٣)ـ وابوداؤد في السنن ٢/ ٧٦٧ حديث رقم ٢٣٦١ والدارمي ٢/ ١٤ حديث رقم ١٧٠٣ـ ومالك في الموطأ ١/ ٣٠١ حديث رقم ٣٩ من كتاب الصيام، واحمد في المسند ٦/ ٢٥٨ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے طے کے روزے (یعنی وصال کے روزے) رکھنے سے۔ پس ایک شخص نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو طے کا روزہ رکھتے ہیں اے اللہ کے رسول۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے میری طرح کون ہے تحقیق میں رات گزارتا ہوں کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا ہے اور مجھ کو پلاتا ہے۔ یہ بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبي هريرة قال نهى رسول الله ﷺ عن الوصال في الصوم: یعنی رات کو بغیر افطار کے پے در پے روزے رکھنا۔ ممانعت میں یہ حکمت ہے کہ ایسا کرنے سے وہ کمزور اور ضعیف ہو جائے گا۔ وصال کرنے سے گویا وہ احکامات کو ادا کرنے سے احتراز کر رہا ہے۔ ایک قول ہے کہ نہی تحریمی ہے دوسرا قول ہے کہ نہی تنزیہی ہے۔ قاضیؒ کہتے ہیں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ دوسرے قول کی تائید حدیث عائشہؓ سے ہوتی ہے: "أنه ﷺ نها هم عن الوصال رحمة لهم" جیسا کہ ریاض الصالحین میں حدیث ہے۔ ایک قول ہے: کہ صوم وصال یہ ہے کہ پورے سال روزے رکھے اور ایام مہینہ میں بھی افطار نہ کرے بلکہ اس میں بھی روزہ ہی رکھے اور اس کے متعلق جو سوال ہے، وہ اس کا رد ہے۔ فقال له رجل انك تواصل يا رسول الله قال وأيكم مثلي: میم کے کسرہ کے ساتھ۔ اني: جملہ استنافیہ اس نہی کو برابر کرنے کے بیان کے لئے ہے جو نفی

استفہام انکاری کے بعد ہے۔ (أبیت یطعمنی ربی : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یا تو خبر ہے یا حال ہے اگر کانَ تامّہ ہو۔ ویسقینی : ''یاء'' کے فتحہ کے ساتھ اور ضمہ کے ساتھ بھی وارد ہے۔ قاضیؒ کہتے ہیں: "أیکم مثلي" ۔ سے آپ ﷺ کی مراد آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے علاوہ کے درمیان فرق بیان کرنا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر وہ چیز ڈال دیتا ہے، کہ کھانے پینے کے قائم مقام ہے۔ اس طرح کہ وہ آپ ﷺ کو بھوک اور پیاس کے احساس سے مستغنی کر دیتا ہے، یہ آپ کے لئے طاعت پر تقویت کے لئے اور آپ کو خلل سے بچاؤ کے لئے ہے۔ جو قوت اور اعضاء کو کمزور کر دیتا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ خطابی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دوسرا قول ''شرح السنۃ'' میں ہے اور اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو روزوں کی راتوں میں کھلاتا پلاتا ہے یہ آپ ﷺ کا معجزہ ہے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے چونکہ "أیکم مثلي" استفہام توبیخ کا فائدہ دیتا ہے۔ اسی طرح لفظ "مثلي" اس کا معنی یہ ہے کہ کون میرے اوصاف، مقام و مرتبہ اور قرب الٰہی میں ہم پلہ ہے اور اس طرح اس کے بعد جو آپ ﷺ کا قول "أبیت" ہے، وہ ظاہر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے، کہ آپ ﷺ کا یہ قول ''ایکم مثلي'' رد کرتا ہے اس قول کو اس پر محمول کیا جائے کہ آپ ﷺ کے پاس کھانے پینے کا رزق جانب اللہ ہے جو آپ ﷺ کا معجزہ ہے۔ اسی طرح اس قول کے: ''انك تواصل فان الوصال مع تناول الطعام والشراب من المحال''۔

روزے کی نیت رات سے کرنا ضروری ہے

۱۹۸۷: عَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ يَجْمَعِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهٗ ۔ (رواه الترمذی وابو داود والنسائی والدارمی وقال ابو داود وقفه علی حفصة معمر والزبیدی وابن عیینة ویونس الایلی کلهم عن الزهری)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۸۲۳/۲ حدیث رقم ۲۴۵۴۔ والترمذی ۱۰۸/۳ حدیث رقم ۷۳۰ والنسائی ۱۹۶/۴ حدیث رقم ۲۳۳۳۔ والدارمی ۱۲/۲ حدیث رقم ۱۶۹۸۔ ومالك فی الموطأ ۲۸۸/۱ حدیث رقم ۵ من کتاب الصیام۔ واحمد فی المسند ۲۸۷/۶۔

ترجمہ: حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کرے۔ پس اس کے لیے روزہ نہیں ہے یعنی اس کے لیے مکمل روزہ نہیں ہوتا۔ اس کو امام ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' دارمی اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ معمر' زبیدی' ابن عیینہ اور یونس ایلیؒ نے اس روایت کو امام زہری سے نقل کیا ہے اور امّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر موقوف کیا ہے۔

تشریح: عن حفصة : ام المؤمنین۔ قالت : قال رسول الله ﷺ من لم یجمع : تخفیف اور تشدید کے ساتھ۔ ایک قول ہے کہ ''اجماع، ازماع اور عزم'' نیت کو پختہ کرنا۔ ایک قول ہے کہ اجماع سے مراد عزم تام ہے اور اس کی حقیقت ہے کہ اپنی رائے اس پر جمع کرنا۔

الصیام : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ کہا جاتا ہے: "اجمع الامر وعلی الأمر وأزمع علیه وأزمعه" اسی طرح جب اس کا پختہ عزم کیا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وما كنت لديهم اذ اجمعوا أمرهم﴾ [یوسف : ۱۰۲] یعنی پختہ عزم کیا عزیمت کے ساتھ۔ معنی یہ ہے کہ جو روزے پر پختہ عزم نہیں کرتا۔ قبل الفجر فلا صیام له : حدیث کے ظاہر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ روزہ فرض ہو یا نفلی جب اس کی نیت فجر سے پہلے نہ ہو، وہ روزہ صحیح نہیں۔ یہ مذہب ابن عمرؓ، جابر بن زیدؒ، مالکؒ مزنیؒ اور داؤدؒ کا ہے۔ ان کے علاوہ دوسروں کا مذہب یہ ہے کہ نفلی روزے کی نیت دن میں کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے یہ عائشہؓ کی حدیث سے خاص کیا ہے: "انها قالت كان النبي ﷺ يأتيني فيقول أعندك غداءً فاقول لا فيقول اني صائم۔ وفي رواية اني اذن لصائم"۔ "اذن" : مستقبل کے لئے ہے اور جزاء اور جواب ہے۔

"الغداء" : غین کے فتحہ اور دال کے ساتھ نام ہے اس چیز کا جو زوال سے پہلے کھایا جاتا ہے۔ اسی لئے زوال کے بعد نیت کرنا جائز نہیں اور نہ زوال کے وقت۔ صحیح بات یہ ہے کہ نیت اکثر نہار شرعی میں پائی جائی تو زوال کبریٰ سے پہلے پہلے ہوگا۔ ابن حجرؒ امام شافعیؒ وغیرہ کے قول کے متعلق کہتے ہیں کہ نفلی روزے کی نیت غروب سے پہلے کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ حذیفہؓ کا فعل ثابت ہے اور "تبییت" (فجر سے پہلے نیت) کی شرط اس فرض میں ہونے پر اتفاق ہے۔ جس کا تعلق زمانہ معین کے ساتھ نہیں۔ جیسے قضاء، کفارہ اور مطلق نذر وغیرہ۔ اگر اس فرض کے لئے وقت متعین ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ جیسے رمضان اور معین نذر۔ امام شافعیؒ، احمدؒ اور ابو حنیفہؒ کے ہاں نصف نہار شرعی سے قبل نیت جائز ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مالکؒ، اسحاقؒ اور امام کی دو روایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی رمضان کی پہلی رات میں سارے مہینے کی نیت کر لے تو اس کو کفایت کر جائے گی، کیونکہ "کل" (تمام) روزے ایک دن روزے کی طرح ہے، یہ زکوۃ پر قیاس ہے، اور نص سے ثابت نہیں ہے۔

ترمذیؒ کہتے ہیں: یہ نافع عن ابن عمر روایت کی گئی ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں۔ کہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے مرفوعاً نہیں۔ ابو داؤدؒ کہتے ہیں کہ ابن لیث، اسحاق بن حازم اور یحیٰ بن ایوب نے عبداللہ بن ابو بکر بن حزم سے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابو بکر بن حزم نے مرفوعاً بیان کیا ہے اور وہ ثقات میں سے ہے۔ اور خطابی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ ثقات کی زیادتی مقبول ہے۔ بیہقیؒ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن ابو بکر جس سند میں ہو یا جس کو مرفوع بیان کرے وہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ وہ ثقہ اثبات میں سے ہے۔ دار قطنیؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے وہ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں: "من لم يبيت الصيام من الليل فلا صيام له" اور کہا ہے کہ اس کے تمام رواۃ ثقہ ہیں۔

اسی طرح شیخ جزریؒ نے کہا ہے۔ شیخ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس حدیث کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے۔ ترمذیؒ اور نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے اور نسائی نے اس کی مختلف اسناد کے بعد یہ حکم لگایا ہے۔ ترمذیؒ نے علل میں امام بخاریؒ سے اس کے موقوف ہونے کی ترجیح کو ذکر کیا ہے۔ ظاہری اسناد پر عمل کیا ہے اور اس کے مرفوع ہونے کو صحیح قرار دیا ہے ان میں ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور ابن حزم ہیں۔ اسی طرح اس قول کو میرکؒ نے ذکر کیا ہے۔

وقال ابو داؤد وقفه علی حفصة معمر : دو میموں کے درمیان عین کے سکون کے ساتھ ہے۔ والزبیدی : تصغیر کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ محمد بن ولید زہریؒ کے استاد ہیں۔ وابن عیینة ویونس : یعنی ابن یزید۔ الایلی : ہمزہ

کے فتحہ اور یاء کے ساتھ اس کے نیچے دو نقطے ہیں کچھ اور لام کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ شام کے ایک شہر کی طرف نسبت ہے۔ یہ بات انہوں نے جامع میں ذکر کی ہے۔

کللهم عن الزهری : نوویؒ کہتے ہیں: حدیث صحیح ہے اور مزید کہا ہے کہ اصحاب سنن اور دوسرے حضرات نے بہت ساری اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان میں کچھ مرفوع ہیں، کچھ موقوف ہیں، کچھ صحیح ہیں اور کچھ ضعیف ہیں۔ لیکن اکثر صحیح ہیں اور قابل اعتماد ہیں کیونکہ ان سے اس کے علم مرفوع ہونے کا زائد علم حاصل ہوتا ہے۔ تو اس کا قبول کرنا واجب اور ضروری ہے۔ دار قطنیؒ نے اس کی بعض اسناد کو موصول قرار دیا ہے، اس لئے کہ ان اسناد کے رجال ثقات ہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: جب حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہے اور اصولی قاعدہ ہے کہ نفی جب مطلق ہو تو اس کو حقیقت کی نفی کی طرف پھرتے ہیں نہ کہ نفی کمال کی طرف۔ اس سے وجوب نیت کا علم حاصل ہوتا ہے اور عطاء، مجاہد اور زفر کا قول رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ رمضان کی تعین ہونے کی وجہ سے نیت واجب نہیں ہے اور اس مہینے میں رمضان کے روزے کے علاوہ کوئی دوسرا روزہ منعقد ہی نہیں ہوسکتا۔ ابن ہمام کہتے ہیں اس حدیث کو اصحاب سنن اربعہ نے ذکر کیا ہے۔ اور اس لفظ میں اختلاف کیا ہے کہ **"لا صیام لمن لم ینو الصیام من اللیل" "یجمع"** : تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ **'یبیت'** سے مراد کہ جس نے فرضی روزے کی نیت رات کو نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں، یہ ابن ماجہ کی روایت ہے جس کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے۔ اکثر نے اس کو موقوف قرار دیا ہے۔

ہماری دلیل وہ روایت ہے جو صحیحین میں ہے: **"عن سلمة بن الاکوع أنه علیه السلام أمر رجلا من أسلم أن أذن فی الناس ان من أکل فلیصم بقیة یومه ومن لم یکن أکل فلیصم فان الیوم یوم عاشوراء"**۔ یوم عاشوراء کا جاہلیت میں قریش روزہ رکھا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی روزہ رکھتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ جب رمضان کے روزے فرض ہوگئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چاہے اس کا روزہ رکھے اور جو چاہے چھوڑ دے۔ طحاویؒ کہتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ رمضان کی وجہ سے منسوخ ہونے سے پہلے یہ حکم واجب تھا۔ جو روزہ فرض ہو اور اس کی ابتداء کی تعین ہو تو اس دن باقی دن کھانے پینے سے روکنے کا حکم ہوسکتا ہے۔ بخلاف رمضان کی قضائی کے۔ اس کو علم ہے کہ اس پر معین دن کا روزہ ہے اگر وہ رات کو نیت نہ کرے تو دن کو نیت کرنا اس کو کافی ہوگا۔ پھر کہا کہ واجب وہی ہے جو پہلے ہم نے صحیحین کی روایت نقل کی ہے، وہ اس روایت سے زیادہ مضبوط ہے جو ہم نے اس کے بعد نقل کی ہے اور اس کے مرفوع ہونے کی صحت میں اختلاف ہے۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس سے مراد نفی کمال ہے جیسا کہ اس کے امثال میں سے یہ ہے: **"لا وضوء لمن لم یسم"**۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں۔

اذان سنتے ہی سحری کھانا نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ وقت کا خیال کرنا چاہیے

۱۹۸۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ اَحَدُكُمْ وَالْاِنَاءُ فِیْ يَدِهٖ فَلَا يَضَعْهُ حَتّٰى يَقْضِیَ حَاجَتَهٗ مِنْهُ۔ (رواه ابوداود۔)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۶۱/۲ حدیث رقم ۲۳۵۰۔ واحمد فی المسند ۵۱۰/۲

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی اذان سنے صبح کی اور برتن اس کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی (پانی پینے کا ارادہ رکھتا ہو یا کچھ کھانے کا ارادہ رکھتا ہو) پس وہ برتن کو نہ رکھے یہاں تک کہ وہ اپنی حاجت پوری کر لے۔ یہ ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرةؓ قال : قال رسول الله ﷺ اذا سمع النداء : یعنی صبح کی آذان۔ أحدكم والاناء : یعنی وہ برتن جس کے ساتھ وہ کھاتا پیتا ہے۔ في يده : جملہ حالیہ ہے۔ فلا يضعه : یعنی برتن۔ حتی يقضي حاجته منه : کھانے پینے کی حاجت۔ یہ اس وقت ہے جب اس کو عدم طلوع کا ظن یا علم ہو۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: یہ جب ہے کہ اس کو صبح طلوع ہونے کا علم نہ ہو اور اگر اس کو معلوم ہو کہ صبح ہو گی؟ یا اس کو صبح ہونے کا شک ہو۔ تو اس وقت جائز نہیں۔

خطابی کہتے ہیں: اس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: "ان بلالا یؤذن بلیل فکلوا واشربوا حتی یؤذن ابن ام مکتوم"۔ لیکن اس میں یہ بات ہے کہ اس وقت قید کا فائدہ واضح نہیں ہوتا۔ پھر خطابی نے کہا: اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے اس کی اذان سنی لیکن وہ بادل چھا جانے کی وجہ سے صبح کے بارے میں متردد ہے اور اذان کی وجہ سے اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے کیونکہ فجر معلوم کرنے کی علامات معدوم ہیں۔ اگر وہ مؤذن کے لئے واضح ہو جائیں تو اسی طرح روزے دار کے لئے واضح ہو جائیں گی۔ جب اسے طلوع ہونے کا علم ہو جائے تو آذان کی آواز سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو رک جانے کا حکم ہے جب سفید دھاگا سفید دھاگے سے واضح ہو جائے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: دلیل خطاب سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ وہ روزہ افطار نہیں کرے گا۔ جب برتن ہاتھ میں نہ ہو۔ یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ افطار میں جلدی کرنا مسنون ہے لیکن یہ مفہوم مخالف ہے، اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ ابن حجرؒ نے اس کا تعاقب کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مفہوم مخالف نہیں ہے۔ جملہ حالیہ کی قید یہ مفہوم اتفاقی ہے یعنی شافعیہ کے ہاں۔ احناف کے ہاں مسائل میں اعتبار ہے دلائل میں نہیں ہے۔ ابن حجرؒ نے طیبی رحمہ اللہ کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے: یہ بات صحیح ہے کہ حدیث سے مراد افطار میں جلدی کرنا ہو، یعنی جب تم میں سے کوئی بھی مغرب کی اذان سنے اور اتفاق سے برتن اس کے ہاتھ میں ہو کسی دوسری وجہ سے پس اس کو افطار میں جلدی کرنی چاہئے، اس کو مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔ اس قول کی وجہ سے شارح کے قول کا رد ہوتا ہے۔ کہ وہ اس طرح سے یہ قول کہ برتن ہاتھ میں ہو تقیید کے لئے نہیں بلکہ جلدی میں مبالغہ کے لئے ہے۔

یہ معنی مفہوم سے بہت بعید ہے اس قول کی وجہ سے "لحاجة أخرى" کو صریح حدیث رد کرتی ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "حتى يقضي حاجته"۔ درست بات یہ ہے کہ قید احترازی ہے اور وہ صبح کے وقت میں ہے اور یہ بات سمجھ آتی ہے، کہ وقت قریب ہونے کی وجہ سے کھانے پینے میں جلدی کرنی چاہئے، حاجت کو مکمل کرے۔ استشراف نفس، خواہش کی قوت، شہوت کا آ جانا تمام ہمت کے ساتھ اس سے جس پر وہ ڈرتا ہے، اگر اس کو اس سے روکا جائے تو وہ رک جائے گا۔ شمنیؒ نے ذکر کیا ہے: جمہور علماء کے ہاں پہلی طلوع صبح کا اعتبار ہے۔ ایک قول ہے کہ جب روشنی ہو جائے۔ یہ عثمانؓ، ابن عباسؓ اور حذیفہؓ سے مروی ہے۔ اسی طرح علیؓ، عطاء بن ابی ریاحؒ اور اعمش سے یہ قول ہے۔ مسروق کہتے ہیں: وہ تمہارے فجر کا اعتبار نہیں کرتے تھے، بلکہ اس فجر کا اعتبار کرتے تھے جو گھروں کو بھر دیتا ہے۔ شمس الائمہ حلوانی کہتے ہیں: پہلا قول سختی پر مبنی ہے اور دوسرے میں

نرمی ہے۔

شاید کہ یہ حدیث رفق (نرمی پر مبنی ہے) واللہ اعلم۔ اس کی تائید آیت میں موجود لفظ تبین سے ہوتی ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: جو جمہور صحابہ سے منقول ہے کہ آیت میں فجر سے مراد اسفار ہے یہ اجماع کے قریب قریب ہے۔ جو اعمش اور اسحاق سے منقول ہے وہ قول نہایت غریب ہے کہ طلوع شمس تک کھانا پینا حلال ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: میرے گمان کے مطابق جو ان دونوں اماموں سے منقول ہے کہ وہ ان دونوں سے صحیح نہیں ہے اور یہ بات بھی مخفی نہیں کہ یہ نص کے مخالف ہے اور نص اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرة: ۱۸۷] طلوع شمس کا قائل کفر کا مرتکب ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث پر ابو داؤدؒ اور منذریؒ نے سکوت کیا ہے۔ حاکمؒ کہتے ہیں: صحیح ہے، اور مسلم کی شرط پر ہے۔

افطار کرنے میں جلدی کرو

۱۹۸۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُهُمْ فِطْرًا۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۸۳/۳ حدیث رقم ۷۰۰۔ واحمد فی المسند ۳۲۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے اپنے بندوں میں سے وہ لوگ زیادہ محبوب ہیں جو افطار کرنے میں جلدی کریں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے۔ قال: قال رسول الله ﷺ: قال الله تعالٰی أحب عبادی الیّ أعجلهم فطرا: یعنی یہ ان کا اکثر طور پر افطاری میں جلدی کرنا ہے، جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس محبت کا سبب شاید سنت کی پیروی ہے اور بدعت سے دور رہنا اور اہل کتاب کی مخالفت ہے۔ اس حدیث میں اس امت کی افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ حدیث کی پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت کو واجب کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ۳۱] اور آنے والی حدیث میں بھی اس طرف اشارہ ہے: "لا یزال الدین ظاهرا ما عجل الناس الفطر لان الیهود والنصارٰی یؤخرون" اس کا سبب (اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں)۔ یہ علت ان کے لئے سہولت ہے تاکہ ان کو قیام میں سہولت اور اس پر ہمیشگی کے لئے کوئی تنگی نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے "علیکم بدین العجائز" بخلاف اہل کتاب کے۔ انہوں نے اپنے اوپر سختی کی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مشقت میں ڈال دیا وہ مغلوب ہوگئے اور دین کو قائم نہ کر سکے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: یہ اس لئے کہ جب وہ نماز سے پہلے افطار کرے گا تو اطمنان نفس اور حضور قلب کے ساتھ نماز ادا کرے گا۔ تو اس وصف کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوگا اس کے مقابلہ میں جو یہ نہیں کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد نماز پڑھنا اس نماز سے بہتر ہے جو کھانے کے ساتھ خلط ملط ہو۔ اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ میرکؒ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمدؒ نے ابن خزیمہ و ابن حبانؒ نے اپنی اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔

کھجور سے روزہ افطار کرنا مسنون ہے

۱۹۹۰: وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَفْطَرَ اَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى تَمْرٍ فَاِنَّهٗ بَرَكَةٌ فَاِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلٰى مَاءٍ فَاِنَّهٗ طَهُوْرٌ۔

رواہ الترمذی وابوداود وابن ماجۃ والدارمی ولم یذکر فانه بركة غير الترمذى۔

ترجمه: حضرت سلیمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی افطار کرے چاہیے کہ کھجور سے افطار کرے پس کھجور برکت کا سبب ہے۔ اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کرے۔ پس وہ پاک کرنے والا ہے۔ یہ احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ فَاِنَّهٗ بَرَكَةٌ کا لفظ ترمذی کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا۔

تشریح: وعن سلمان بن عامر قال : قال رسول اللہ ﷺ اذا افطر أحدكم فليفطر : امر مندوب کے لئے ہے۔ على تمر : یعنی کھجور کے ساتھ۔ دراصل سنت پر عمل کرنا ہے۔ کامل تین کھجوروں کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ آئے گا اور "تمر" اسم جنس ہے۔ فانه : یعنی کھجور۔ بركة : یعنی برکت اور خیر کثیر والی ہے۔ اس سے مبالغہ مراد ہے شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ مٹھاس قوت بحال کرنے میں تیز ہے اور اس میں ایمان کی مٹھاس کی طرف اشارہ ہے اور نافرمانی کی کڑواہٹ کی طرف اشارہ ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کھجور کے ساتھ افطاری میں بہت زیادہ ثواب اور برکت ہے۔ لیکن اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں اس کا مقابلہ فانه طهور سے بہتر نہ ہوگا۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ اس کی علت کو شارع کی جانب سپرد کیا جائے۔ لیکن جو علت ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کھجور میٹھی اور نفس کے لئے غذا ہے اور نفس بھوک کی کڑواوٹ کی وجہ سے تھک چکا ہے۔ تو شارع نے اس تھکاوٹ کو زائل کرنے کے لئے اس چیز کا حکم دیا، جس میں قوت اور مٹھاس ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: کھجور کے خواص میں سے یہ بھی ہے جب وہ معدہ میں پہنچ جاتی ہے، اگر وہ خالی ہو تو غذا کا سبب بن جاتی ہے، اور بقیہ کھانوں سے مستغنی کر دیتی ہے۔ اطباء کا قول ہے: اگر ان کو زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو یہ بینائی کو کمزور کر دیتی ہے، اور قلیل مقدار میں استعمال قوت کا باعث ہے۔ فان لم يجد : کھجور یا اس جیسی دوسری میٹھی چیزیں۔

فليفطر على ماء فانه : یعنی پانی۔ طهور : طہارت تک پہنچانے والا ہے۔ اس کے ساتھ مختلف انداز میں ظاہر و باطن کی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس لیے کہ یہ ادائے عبادت میں جو چیز مانع ہے، اس کو زائل کرنے کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر عظیم نعمت ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا﴾ [الفرقان : ٤٨]۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: پانی نفس سے پیاس کو دور کر دیتا ہے اس کی تائید آپ علیہ السلام کے اس قول سے ہوتی ہے: "ذهب الظمأ" اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ولم يذكر : یعنی ایک قول۔ فانه بركة غير : ایک دوسرے نسخہ میں انہوں نے جمع کا صیغہ ذکر نہیں کیا۔ لفظ "غير" استثناء کی وجہ سے منصوب ہے۔ وفي رواية أخرى : پہلی روایت انہوں نے بیان کی ہے اور یہ اکثر نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس طرح کی حدیث ترمذی نے بیان کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے: "اذا كان أحدكم صائما فليفطر على التمر فان لم يجد التمر فعلى الماء فانه طهور" یہ ترتیب کمال سنت کے لئے ہے۔ اس میں

بحث ہے جو مخفی نہیں۔ کہ اگر کھجور موجود ہو اور وہ پانی سے ابتداء کرے یا اس پر اکتفا کرے تو اس میں سنت کی مخالفت میں کوئی شک نہیں۔ اگر کھجور موجود نہ ہو تو وہ سنت پر ہی عمل کر رہا ہے۔ ترتیب معتبر ہے جیسا کہ اس جیسی مثال آیاتِ قرآنیہ اور احکام حدیثیہ ہیں اور آنے والی حدیث میں اس کی تاکید ہے۔

کھجور اور پانی سے روزہ افطار کرنا مسنون ہے

۱۹۹۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ عَلٰى رُطَبَاتٍ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَيْرَاتٌ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تُمَيْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِّنْ مَاءٍ۔

(رواه الترمذی وابوداود وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۷٦٤/۲ حدیث رقم ۲۳۵٦۔ والترمذی ۷۹/۳ حدیث رقم ٦۹٦۔ واحمد فی المسند ۱٦٤/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ مغرب سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے روزہ افطار کرتے تھے اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار کرتے۔ اگر خشک کھجوریں نہ ہوتیں تو پانی کے چند چلو پی لیتے۔ یعنی تین چلو۔ یہ روایت ابوداؤد، ترمذی نے نقل کی ہے اور امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: وعن انس قال : کان النبی ﷺ یفطر : یعنی روزوں میں۔ قبل ان یصلی : مغرب کی نماز۔ اس میں افطار کی جلدی کے مستحب ہونے میں مبالغہ ہے۔ رہا یہ کہ عمرؓ و عثمانؓ رمضان میں مغرب کی نماز رات کی تاریکی دیکھ کر پڑھا کرتے تھے پھر نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ یہ تاخیر کے جواز کے لئے ہے کہ کہیں تعجیل کو واجب نہ سمجھ لیا جائے۔ ممکن ہے اس کی یہ وجہ بھی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں افطار کرتے تھے پھر مغرب کی نماز کے لئے نکلتے۔ وہ دونوں مسجد میں ہوتے تھے اور ان کے پاس کھجور اور پانی نہ ہوتا تھا یا وہ دونوں معتکف نہ تھے اور انہوں نے سمجھا کہ کھانا پینا غیر معتکف کے لئے مکروہ ہے۔ لیکن احادیث کا اطلاق حالت افطار کے میں واضح اور ظاہر ہیں۔ واللہ اعلم

علی رطبات فان لم یکن رطبات : رفع کے ساتھ۔ موجود نہ ہوں یا نہ ملیں۔ فتمیرات : جر کے ساتھ۔ یعنی ان کے ساتھ افطار کرتے۔ ایک دوسرے نسخہ میں رفع کے ساتھ یعنی تمیرات ان کے عوض میں۔ فان لم یکن تمیرات حسا ای شرب۔ حسوات : ''حاء اور سین'' کے فتحہ کے ساتھ۔ یعنی تین مرتبہ۔ من ماء : نہایہ میں ہے حسوة ملانے کے ساتھ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ختم کے ساتھ ترجیح ہے اور اس سے کم کا جواز نہیں ہے۔ ''حسا زید الماء شربه شیئا بعد شیء'' حسوة سے مراد کسی چیز کے ساتھ ملانا ہے۔ ''حسو'' کو فتحہ کے ساتھ پڑھنا زیادہ فصیح ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سردیوں میں کھجور مقدم ہو گی اور گرمیوں میں پانی مقدم ہوگا، اس کی دلیل بھی روایت ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ میں پہلے وہ چیز داخل نہ کرے جو آگ پر پکی ہو۔ قضیہ یہ ہے کہ منقی پانی پر مقدم ہے۔ ایک قول ہے کہ تمام میٹھی چیزیں مراد ہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ تمام اقوال ضعیف ہیں۔ میں کہتا ہوں: اگر کھجور موجود نہ ہو تو قیاس صحیح ہے۔ بلکہ حدیث میں اسی طرح وارد ہے جیسا

کہ پیچھے گزر چکا ہے وگرنہ یہ قول نص کے صریح مخالف ہے۔ کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ مکہ میں سنت یہ ہے کہ زمزم کا پانی کھجور پر مقدم ہے یا اس کے ساتھ ملا لے، یہ مردود ہے، اور سنت کے خلاف ہے اس لئے کہ آپ ﷺ فتح مکہ کے سال اکثر دنوں کے روزے رکھے۔ آپ ﷺ سے منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے خلاف عادت کیا ہو، یعنی پانی کھجور پر مقدم کیا ہو۔

غریب : اور دارقطنیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ ہیں: "كان رسول الله ﷺ يحب ان يفطر على ثلاث تمرات أو شيء لم تصبه النار"۔ وعن أنس قال : قال رسول الله ﷺ من وجد تمرا فليفطر عليه ومن لا فليفطر على الماء فانه له طور"۔ اس روایت کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام حاکمؒ نے کہا ہے یہ روایت صحیح ہے اور بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔

افطاری کروانے اور جہاد پر بھیجنے والے کے لیے اجر

۱۹۹۲: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا اَوْ جَهَّزَ غَازِيًا فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ۔

(رواه البيهقي في شعب الايمان ومحي السنة في شرح السنة وقال صحيح)

اخرجه احمد في المسند ٤/ ١١٤۔

ترجمہ: حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص روزہ دار کو افطار کروا دے یا کسی غازی کا سامان درست کر دے پس اس کو اس کے مانند پورا ثواب ملے گا۔ بیہقی نے شعب الایمان میں یہ روایت کی ہے اور محی السنۃ نے شرح السنۃ میں یہ روایت کی ہے اور کہا یہ صحیح ہے۔

تشریح: وعن زيد بن خالد قال : قال رسول الله ﷺ من فطر صائما : ابن ملکؒ کہتے ہیں: یعنی کسی ایک کو افطاری کروائی۔ کسی روزے دار کو کھانا کھلایا افطاری کے وقت۔ أو جهز غازيا : یعنی اس کے اسباب جیسے گھوڑا، اسلحہ اور خرچہ وغیرہ۔ فله مثل أجره : یعنی روزے دار اور نمازی کی طرح۔ "أو" نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔ یہ ثواب تقویٰ پر تعاون اور خیر پر دلالت کی بدولت ہے۔ طیبی ؒ کہتے ہیں: روزے دار کو غازی کیس ساتھ ایک ہی لڑی میں پر دیا کیونکہ دونوں مجاہد کے معنی میں برابر ہیں، اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ اور جہاد اکبر کو مقدم کیا ہے۔

وقال صحيح : جزری کہتے ہیں: اس کو نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے، ابن ماجہ نے مقطوع بیان کیا ہے۔ ترمذیؒ نے دونوں کو حسن صحیح کہا ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں زید بن خالد الجہنیؓ سے بیان کیا ہے عن النبی ﷺ "من فطر صائما كان له مثل أجره غير أنه لا ينقص من أجر الصائم شيء"۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ ابن خزیمہ اور نسائی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "من جهز غازيا او جهز حاجا او خلفه في اهله او فطر صائما كان له مثل اجورهم من غير ان ينقص من أجورهم شيء"۔ مصنف نے یہ دونوں حدیثیں بیان نہیں کیں۔ حدیث کی نسبت بیہقی اور شرح السنۃ کی طرف کی ہے۔ اصحاب سنن کی طرف اولی اور زیادہ درست ہے۔ واللہ اعلم۔ اس میں ہے کہ ان دونوں کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ ان دونوں کے الفاظ اسناد

کے مختلف ہونے سے مظاہر ہیں۔ پہلا مختصر ہے دوسرا مطول ہے قطع نظر اس کے بقیہ الفاظ مخالف ہیں۔

روزے کی افطاری کے وقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی دُعا مبارکہ

۱۹۹۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ٢/ ٧٦٥ حديث رقم ٢٣٥٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب افطار کرتے تو فرماتے تھے پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عمر قال : كان النبي ﷺ اذا افطر : افطار کے بعد۔ذهب الظماء : ''ظا اور میم'' کے فتحہ کے ساتھ۔نوویؒ اذکار میں کہتے ہیں: ''الظمأ'' مہموز اور مقصور ہے، اور اس کا معنی پیاس ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے ذکر کی ہے کہ اس کو دیکھنے سے اشتباہ اور وہم پیدا ہوتا ہے۔لیکن اس میں یہ بات ہے کہ اس کو ''لا يصيبهم ظماء'' مد اور قصر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔قاموس میں ہے: ''ظمی فرح'' کی طرح ہے۔ ظمأ وظماء وظماءة پیاس یا سخت پیاس کو کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نووی کا کلام اس پر محمول ہو کہ یہ روایت کے خلاف ہے۔ نہ یہ کہ لغت میں موجود ہی نہیں۔وابتلت العروق : اس خشکی کے زائل ہونے کی بدولت جو پیاس کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ابن حجرؒ کا قول کہ یہ پہلے کی تاکید ہے۔اس نے راحت کو پالیا کیونکہ وہ مستقل نعمت ہے۔ ہاں اگر عطف اس کے الٹ ہوتا تو تاکید ہوتا جیسا کہ کسی حد تک ظاہر ہے وثبت الأجر :یعنی مشقت چلی گئی اور ثواب مل گیا۔ یہ عبادات پر ترغیب دلانا ہے۔کیونکہ مشقت چلے جانے اور ختم ہونے کے بعد خوشی حاصل ہوتی ہے۔اجر زیادہ ہے اس کے ثابت اور باقی ہونے کی وجہ سے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مشقت کے زائل ہونے کے بعد اجر کا ذکر مزید لذت کا باعث ہے۔اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان جس میں اہل جنت کی حکایت ہے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ [فاطر : ٣٤] ''وہ کہیں گے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بخشنے والا (اور) قدردان ہے'' ان شاء الله : بطور تبرک کے اس کا تعلق خیر کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اجر کا دینا لازمی نہیں اس لیے تعلیق صحیح ہے معتزلہ پر رد کرتے ہوئے۔اجر کا مفرد ہونا مشیت کے تحت ہے۔ممکن ہے کہ ''ان'' ''اذ'' کے معنی میں ہو، تو اس کا تعلق اس تمام کے ساتھ ہو جائے گا، جو گزر چکا ہے۔

نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔حاکمؒ نے ''حصن'' میں بیان کیا ہے۔

روزہ افطار کرتے وقت مسنون دُعا

۱۹۹۴: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ زُهْرَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ

صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ ۔ (رواہ ابوداود مرسلا)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/۷۶۵ حدیث رقم ۲۳۵۸۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن زہرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب افطار کرتے تو فرماتے اے الٰہی میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر میں افطار کرتا ہوں۔ ابوداؤدؒ نے یہ روایت بطریق ارسال نقل کی ہے۔

تشریح: وعن معاذ بن زهرة : تابعی ہیں، ان سے حصین بن عبدالرحمٰن السلمی نے روایت کیا ہے۔ یہ قول طیبی ﷫ کا ہے۔قال : ان النبی ﷺ کان اذا أفطر قال : دعا کرتے۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: افطار کے بعد پڑھتے۔ ان میں سے۔ یہ دعا ہے: (اللهم لك صمت وعلى رزقك افطرت : طیبی ﷫ کہتے ہیں: جار مجرور دونوں جملوں میں عامل پر مقدم ہیں جو کہ اختصاص پر دلالت ہے افتتاح میں اختصاص کا اظہار ہے۔ کرنے والے کے لئے شکر کا اظہار ہے جس کو اختتام کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ ابن حجرؒ نے تقریب میں بیان کیا ہے: معاذ بن زہرہ اس کو ابوزہرہ کہا جاتا ہے۔ تیسرے درجے میں اس کا تعلق ہے اس کو مرسل بیان کیا ہے۔ اس کو بیان کرنے سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صحابہ کے ساتھ ہے۔

میرکؒ کہتے ہیں: ابوداؤد کی عبارت اس طرح ہے: "عن معاذ بن زهرة بلغه ان النبی قرأة" اس کے مثل کو یہ نہیں کہا جاتا "انه کان اذا افطر" آخر تک۔ معاذ بن زہرہ بن حبان ثقات میں سے ہے، امام ابوداؤد نے ان سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی حدیث نہیں۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ مرسل ہونے کے باوجود حجت ہے علاوہ ازیں دارقطنی اور طبرانی نے اس کو متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ وہ بھی اسی طرح ضعیف ہیں اور قابل حجت ہیں۔ ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔ روزے دار کے افطاری کے وقت دعا رد نہیں ہوتی۔ حدیث میں منقول ہے کہ آپ ﷺ کہا کرتے تھے: "یا واسع الفضل اغفر لی وانه کان یقول الحمد لله الذی اعانی فصمت ورزقنی فافطرت"۔ زبانوں پر یہ روایت مشہور ہے: "اللهم لك صمت وبك امنت وعلى رزقك أفطرت" وبك أمنت کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اس کی کوئی اصل نہیں اگرچہ ان کا معنی صحیح ہے۔ اسی طرح یہ بھی اضافہ ہے "وعليك توكلت"۔ اسی طرح کل کے روزے کی نیت زبان سے ادا کرنا بدعت حسنہ ہے۔

الفصل الثالث:

افطار کرنے میں جلدی کرنا چاہیے

۱۹۹۵: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الدِّيْنُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ لِاَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى يُؤَخِّرُوْنَ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/۷۶۳ حدیث رقم ۲۳۵۳۔ وابن ماجه ۱/۵۴۲ حدیث رقم ۱۶۹۸۔ واحمد فی المسند ۲/۴۵۰۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دین ہمیشہ غالب رہے گا جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔ اس لیے کہ یہود و نصاریٰ افطار کرنے میں دیر کرتے ہیں۔ یہ ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی ھریرۃ قال : قال رسول اللہ ﷺ لا یزال الدین ظاھرًا : غالب، بلند، واضح اور روشن۔ ما عجل الناس الفطر : یعنی افطاری کے وقت میں جلدی۔ لان الیھود والنصاری یؤخرون : یعنی تاروں کے چمکنے تک۔ ہمارے زمانے میں رافضیوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس تعلیل میں یہ دلالت ہے کہ دین حنیف کو قائم رکھنا اس کے دشمنوں اہل کتاب کی مخالفت پر ہے اور ان کی پیروی گویا دین کو ضائع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ﴾ [المائدہ : ۵۱] ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ ان میں سے بعض بعض لوگوں کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہ ان ہی میں سے ہوگا''۔

دو معتبر صحابیوں رضی اللہ عنہما کا ذکر جو نماز اور افطاری میں جلدی و تاخیر کرتے تھے

۱۹۹۶: وَعَنْ اَبِیْ عَطِیَّۃَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَمَسْرُوْقٌ عَلٰی عَائِشَۃَ فَقُلْنَا یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ رَجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحَدُھُمَا یُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَیُعَجِّلُ الصَّلٰوۃَ وَالْاٰخَرُ یُؤَخِّرُ الْاِفْطَارَ وَیُؤَخِّرُ الصَّلَاۃَ قَالَتْ اَیُّھُمَا یُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَیُعَجِّلُ الصَّلَاۃَ قُلْنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ ھٰکَذَا صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ اَبُوْمُوْسٰی۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۷۷۱/۲ حدیث رقم (۴۹۔ ۱۰۹۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۶۲/۲ حدیث رقم ۲۳۵۴۔ والترمذی ۸۳/۳ حدیث رقم ۷۰۲۔ والنسائی ۱۴۴/۴ حدیث رقم ۲۱۶۱۔ واحمد فی المسند ۴۸/۶۔

ترجمہ: حضرت ابوعطیہؒ سے روایت ہے کہ میں اور مسروق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ پس ہم نے کہا اے مؤمنوں کی ماں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں دو شخص ہیں ایک ان میں سے جلدی افطار کرتا ہے اور جلد نماز پڑھتا ہے اور دوسرا شخص دیر سے افطار کرتا ہے اور دیر سے نماز پڑھتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا ان میں سے کون جلد افطار کرتا ہے اور جلد نماز پڑھتا ہے؟ ہم نے کہا عبداللہ بن مسعودؓ جلدی کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کرتے تھے اور دوسرے وہ جو افطار اور نماز میں دیر لگاتے ہیں وہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ (صحیح مسلم)

تشریح: وعن ابی عطیۃ قال دخلت أنا ومسروق : دونوں تابعی ہیں۔ علی عائشۃ فقلنا یا ام المؤمنین رجلان : مبتدا۔ من أصحاب محمد ﷺ : صفت ہے۔ مبتدا کے نکرہ ہونے کی وجہ سے۔ خبر جملہ ہے ''أحدھما یعجل الافطار ویعجل الصلاۃ والآخر یؤخر الافطار ویؤخر الصلاۃ'' یعنی ان دونوں کو مؤخر کرنا پسند تھا۔ ظاہر ہے کہ ترتیب ... میں ترتیب فعل کا فائدہ دیتا ہے وگرنہ ان کا قول ہے، کہ تاخیر کی صورت میں اس سے کوئی مانع نہیں کہ افطار کو نماز پر ...

کیا جائے۔قالت ایھما یعجل الافطار ویعجل الصلاۃ قلنا عبد اللہ بن مسعود قالت ھکذا صنع رسول اللہ ﷺ والآخر ابو موسیٰ: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: پہلے میں عزیمت پر عمل ہے اور سنت سے دوسرے میں رخصت ہے۔ یہ تب صحیح ہے، جب اختلاف صرف فعل میں ہو۔ اگر اختلاف قول میں ہو تو ابن مسعودؓ کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ کہ انہوں نے تعجیل کے اختیار میں مبالغہ کیا اور ابو موسیٰ نے عدم مبالغہ کو اختیار کیا۔ وگرنہ رخصت پر دونوں کا اتفاق ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کے عمل کو سنت پر محمول کیا جائے اور ابو موسیٰ کا عمل بیان جواز کے لئے ہو۔ جیسے حضرت عمرؓ و عثمانؓ کا عمل گزر چکا ہے۔ ابن حجرؒ کا قول: ابو موسیٰؓ کو آپ ﷺ کا فعل نہیں پہنچا، یہ کمزور عذر ہے، واللہ اعلم۔

سحری کا کھانا بابرکت ہوتا ہے

۱۹۹۷: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ دَعَانِيْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى السُّحُوْرِ فِيْ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلُمَّ إِلَى الْغَدَاءِ الْمُبَارَكِ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۵۷/۲ حدیث رقم ۲۳۴۴۔ والنسائی ۱۴۵/۴ حدیث رقم ۲۱۶۳۔

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ کو بلایا اور رمضان کی سحری کی طرف بلایا اور فرمایا بابرکت کھانے کی طرف آ ؤ۔ یہ ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن العرباض: عین کے کسرہ کے ساتھ۔ ابن ساریۃ قال: دعانی رسول اللہ ﷺ الی السحور: سین کے فتحہ کے ساتھ، ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ فی رمضان فقال: عطف ہے یا تفسیر اور بیان ہے۔ ھلم: یعنی آؤ۔ نہایہ میں ہے کہ اس کو پڑھنے میں دو لغت ہیں۔ اہل حجاز اس کا اطلاق واحد اور جمع اور تثنیہ پر کرتے ہیں۔ ایک لفظ کے ساتھ جو مبنی علی الفتح ہے، اور بنو تمیم تثنیہ، جمع اور مؤنث پر اطلاق کرتے ہیں۔ قرآن میں لغت حجاز کے ساتھ ہے: ﴿قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمْ﴾ [الانعام: ۱۵۰] یعنی ان کو حاضر کرو۔ الی الغداء المبارك: غداء اس کھانے کو کہتے ہیں، جو صبح صبح کھایا جاتا ہے اور اس کا اطلاق سحری پر کیا ہے، کیونکہ سحری وہ اس کا قائم مقام ہے۔ بعض نے اس میں تصحیف کر کے ذال اور پہلے حرف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں: اس کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

مؤمن کی بہترین سحری کھجور سے ہے

۱۹۹۸: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نِعْمَ سُحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۵۸/۲ حدیث رقم ۲۳۴۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مؤمن کی اچھی سحری کھجور ہے۔ اس کو ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

وعن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ نعم سحور المؤمن: سین کے فتحہ کے ساتھ۔ التمر: طیبی رحمہ اللہ

کہتے ہیں: اس وقت کھجور کی تعریف کی گئی ہے، اس لئے کہ بذات خود سحری میں برکت ہے، اور ''تمر'' (کھجور) کے ساتھ تخصیص برکت پر برکت ہے، جب کوئی تم میں سے افطار کرے تو کھجور کے ساتھ۔ تو یہ برکت کے ساتھ ابتداء ہے، اور انتہا بھی برکت کے ساتھ ہے۔ اور ابن ماجہؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

بَابُ تَنْزِيهِ الصَّوْمِ

یہ باب اس بارے میں ہے کہ روزے کو ان اعمال سے بچانا جن سے روزہ باطل ہو جاتا ہے یا اس کا ثواب زائل یا اس میں کمی ہو جاتی ہے

عرضِ مرتب:

اس باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ روزہ کس چیز سے جاتا رہتا ہے اور کس چیز سے اس کا ثواب باطل ہوتا ہے اور کس چیز سے اس کا ثواب کم ہوتا ہے پس ان سے پرہیز کرنا واجب ہے۔

فائدہ: اس کتاب کا مؤلف عرض کرتا ہے اگر چہ بعض روزے کے مفسدات آگے متفرق حدیثوں میں مذکور ہیں لیکن میں نے پسند کیا کہ کسی معتبر فقہ کی کتاب سے یہ مسائل تفصیل کے ساتھ ایک جگہ لکھوں تا کہ مفید ہوں۔ تو میں نے امداد الفتاح شرح نور الایضاح جو کتاب معتبر اور عرب میں مروج ہے خوب ترتیب سے یہ مسائل مذکور تھے اس میں سے لکھے جاتے ہیں اور بعض درمختار میں سے بھی لکھے جاتے ہیں۔

فَصْلٌ: یہ فصل ان چیزوں کے بیان میں ہے جو روزے کو توڑتی نہیں ہیں اگر بھول کر کھا لے یا جماع کرلے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر بھول کر جماع شروع کیا پھر یاد آ گیا۔ اگر فی الفور ستر کو نکال لیا۔ روزہ ٹوٹے گا نہیں اور اگر نہ نکالا تو ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہوگی نہ کفارہ اور بعضوں نے کہا ہے یہ مسئلہ اس وقت ہے کہ جب وہ اپنے جسم کو حرکت نہ دے یعنی یاد آنے کے بعد دھکا نہ لگائے۔ یہاں تک کہ انزال ہو جائے اگر نفس کو حرکت دے گا تو اس پر کفارہ لازم آئے گا۔ جیسے کہ اگر نکال کر پھر داخل کیا تو کفارہ لازم ہوتا ہے اگر فجر سے پہلے قصداً جماع کیا اور پھر فجر طلوع ہو جائے تو ستر کا نکالنا فی الحال واجب ہوگا۔ اگر نفس کو حرکت دے گا تو کفارہ لازم ہوگا اور روزہ فقط تیرے سے ٹوٹ جائے گا اور اگر فجر کے طلوع ہونے کے خوف سے ہی نکال لیا۔ پھر اس کو فجر کے طلوع ہونے کے بعد انزال ہوا تو اس شخص پر کچھ لازم نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص بھول کر کھاتا ہے اور وہ قدرت رکھتا ہے روزہ پورا کرنے کی بغیر مشقت کے تو دیکھنے والا اس کو یاد دلا دے اور یاد نہ دلانا اس کو مکروہ ہے اور اگر اس کو کوئی کھانے کے وقت یاد دلا دے اور اس کو یاد نہ آئے تو قضا لازم آئے گی اور اگر طاقت نہیں رکھتا ہے تو نہ یاد دلائے اگر روزہ دار کو کسی عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھ کر انزال ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں اختلاف ہے کہ اگر جانوروں کے ساتھ بدفعلی کرنے سے

انزال ہو جائے بعضوں کے نزدیک روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعضوں کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر انزال نہ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا بلا خلاف اور اگر ہاتھ سے منی گرائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا لازم آتی ہے نہ کہ کفارہ اور یہ فعل غیر رمضان میں بھی حلال نہیں ہے اگر شہوت کو پورا کرنے کا قصد کرے اور اگر شہوت کی تسکین کا قصد کرے تو امید ہے کہ اس پر وبال نہ ہو یعنی فقط لذت کے لیے تو حلال نہیں ہے اور اگر نکالنے میں بیقرار ہو اور نہ نکالنے میں زنا کا خوف رکھتا ہو تو امید ہے کہ وہ گنہگار نہ ہو اور اگر اس پر مداومت کرے تو گنہگار ہوگا۔ اگر کسی عورت کا دھیان کرے اور اس کو انزال ہو جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر دو عورتیں آپس میں قصداً فعل بد کریں اور انزال نہ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر انزال ہو جائے گا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم آئے گی اور اگر تیل لگائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا' اس لیے مسامات میں سے کسی چیز کا داخل ہونا منافی صوم نہیں ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ نہائے اور جگر کو ٹھنڈک پہنچے اور سرمہ لگانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر چہ اس کا مزہ حلق میں محسوس کرے یا اس کا رنگ رینٹ اور تھوک میں دکھائی دے کیونکہ آنکھ اور دماغ کے درمیان راستہ نہیں ہے اور آنسو جو ٹپک کر نکلتے ہیں وہ ایسے عراق کی مانند ہیں جس کو کشید کیا گیا ہو' الغرض جو چیز بھی مسام کے ذریعے سے جسم میں داخل ہو' وہ روزے کے منافی نہیں ہے جیسے کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اگر آنکھ میں دوا یا دودھ ڈالے تیل کے ساتھ پھر اس کا مزہ یا تلخی محسوس کرے تو اس سے اس کا روزہ نہیں جاتا اور اگر کوئی شخص ایسی بندھی ہوئی روئی نگل جائے جس کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا جب تک ڈور سے کھل کر گر نہ پڑے۔ جب گرے گی تو روزہ ٹوٹ جائے گا اگر حلق میں لکڑی یا اس کے مانند کوئی چیز داخل کرے اور ایک سرا اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اسی طرح کوئی شخص اگر اپنی انگلی دبر میں یا عورت اپنی شرمگاہ میں داخل کرے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر انگلی پر پانی یا تیل لگا ہوا ہوگا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ سینگی اور غیبت سے روزہ نہیں ٹوٹتا البتہ ثواب میں کمی آتی ہے۔ اگر روزہ افطار کرنے کی نیت کرے لیکن کچھ کھائے پئے نہیں تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کسی شخص کے حلق میں اس کے فعل کے بغیر دھواں داخل ہو جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس سے بچنا ناممکن ہے۔ ایسے موقع پر اگر وہ شخص دھوئیں سے بچنے کی خاطر اپنا منہ بند بھی کرلے تو دھواں ناک کے راستے داخل ہو جائے گا۔ پس یہ اس تری کی مانند ہے جو کلی کرنے کے بعد بھی منہ میں باقی رہتی ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے منہ میں دھواں داخل کرے تو ایسی صورت میں اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا چاہے وہ دھواں عنبر کا ہو' اگر بتی کا ہو یا کسی اور چیز کا' پس اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی چیز کا دھواں اپنے منہ میں داخل کرے گا حالانکہ اس کے علم میں ہے کہ میں روزہ دار ہوں تو اس عمل سے اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ اس کے لئے دھوئیں سے بچنا ممکن ہے' اس مسئلہ سے اکثر لوگ نابلد ہیں اس بارے میں احتیاط کا پہلو اپنانا چاہیے۔ اس مسئلے سے یہ وہم نہیں ہونا چاہیے کہ مشک وگلاب اور دوسری خوشبوؤں کو سونگھنے کے بارے میں بھی یہی مسئلہ ہے کیونکہ صرف خوشبودار دھوئیں کے اس جوہر میں جو جان بوجھ کر منہ میں جائے جو فرق ہے اس سے سب واقف ہیں۔ اسی طرح حقہ کے دھوئیں سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ وہ جان بوجھ کر منہ میں داخل کیا جاتا ہے اور اس سے نفس کو سکون پہنچتا ہے اور اس کو عام طور پر دوا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پسینہ اور آنسو اگر تھوڑی سی مقدار میں حلق میں چلا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر زیادہ مقدار میں ہو تو روزہ ٹوٹ جاتا

ہے۔ پھول وعطر وغیرہ کو سونگھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کسی شخص کے حلق میں گرد وغبار یا چکی پیستے ہوئے آٹا یا دوائیں پیستے ہوئے کچھ اُڑ کر داخل ہو جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا' کیونکہ اس سے بچنا بھی ممکن نہیں ہے' اگر کوئی شخص جنابت کی حالت میں صبح کرے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ چاہے وہ اس حالت میں کئی دن رہے اور غسل جنابت نہ کرے۔ مگر ناپاک رہنے اور نماز وغیرہ نہ پڑھنے کے باعث گناہ کا مستحق ہوگا۔ اگر ذکر کے سوراخ میں دوا یا تیل وغیرہ ڈالے اور وہ مثانے میں پہنچ جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس لیے کہ مثانے سے معدہ راستہ اندر کو نہیں جاتا۔ اگر پانی میں بیٹھے اور کان میں پانی چلا جائے یا تنکے سے کان کھجلائے اور اس سے میل نکلے اور اس تنکے کو کئی بار کان میں ڈالے تو روزہ نہیں جاتا۔ اگر دماغ سے رینٹ اترے اور وہ اس کو چڑھا جائے یا نگل جائے تو روزہ نہیں جاتا اور اگر منہ سے تھوک نکلا اور منقطع نہ ہوا بلکہ اس کا تار لگا رہا اور ٹھوڑی تک لگا رہا۔ پھر اس کو نگل گیا تو روزہ نہیں ٹوٹا اور اگر منقطع ہوا تھوک پھر منہ میں ڈال لیا تو روزہ جاتا رہے گا۔ اگر منہ کے بھراؤ کے برابر بلغم نگل جائے امام ابو یوسف کے نزدیک روزہ جاتا رہے گا اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک نہیں اور تھوک دینا مناسب ہے تاکہ روزہ نہ ٹوٹے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک جب کہ بلغم وغیرہ کے تھوک دینے پر قادر ہو اور اس کے باوجود نگل جائے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔

اختیار کے بغیر قے ہو جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا خواہ قے کسی قدر ہو منہ بھر کر یا اس سے زیادہ اسی طرح صورت میں بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا جب کہ آئی ہوئی قے بے اختیار حلق کے نیچے اتر جائے خواہ وہ کسی قدر ہو لیکن امام یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں روزہ جاتا رہتا ہے ہاں اگر وہ قصداً نگل جائے اور منہ بھر کر ہو تو سب ہی کے نزدیک روزہ جاتا رہے گا' البتہ کفارہ لازم نہیں آئے گا اور اگر منہ بھر کر نہیں ہوگی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اگر کوئی شخص قصداً قے کرے اور منہ بھر کر ہو تو متفقہ طور پر مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہے گا اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوگا اور صحیح یہی ہے۔ حضرت امام محمدؒ کا قول ہے کہ منہ بھر کر نہ ہونے کی صورت میں بھی روزہ جاتا رہتا ہے جو قے عمداً کی جائے اور منہ بھر کر نہ ہو اور وہ بے اختیار حلق کے نیچے اتر جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا' قصداً نگل جانے کے بارے میں دو قول ہیں صحیح قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

غذا وغیرہ قسم سے کوئی چیز جو ہو اور رات میں دانتوں میں پھنس گئی تو دن میں اسے نگل جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ چنے کی مقدار سے کم ہو اور منہ سے باہر نکال کر نہ کھائی جائے' اسی طرح کسی کے دانتوں سے یا منہ کے کسی دوسرے اندرونی حصے سے خون نکلے اور حلق میں چلا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا بشرطیکہ وہ پیٹ تک نہ پہنچے جائے' مگر تھوک کے ساتھ مخلوط ہو کر اور تھوک سے کم اور اس کا مزہ حلق میں محسوس نہ ہوا اگر خون پیٹ تک پہنچ جائے گا اور وہ تھوک پر غالب ہوگا یا تھوک کے برابر ہوگا تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔

تل کے بقدر اگر کوئی شخص چیز باہر سے منہ میں ڈال کر چبائے اور وہ منہ میں پھیل بھی جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا بشرطیکہ حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو' ہاں اگر وہ چیز منہ میں پھیلے نہیں نیز اس کا مزہ حلق میں محسوس ہو یا یہ کہ بغیر چبائے ہی اس چیز کو نگل

جائے اور حلق میں اس کا مزہ محسوس نہ ہو تب بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر وہ چیز ان چیزوں میں سے ہو گی جن سے کفارہ لازم آتا ہے تو کفارہ ضروری ہوگا نہیں تو قضاء لازم ہے۔

یہ فصل ان چیزوں کے بیان میں ہے جن سے کفارہ اور قضا لازم ہو جاتے ہیں:

یہ بات سمجھ لو کہ روزہ فاسد ہو جانے کی صورت میں کفارہ کن لوگوں پر اور کن حالات میں لازم ہو گا۔ کفارہ اس وقت لازم ہوتا ہے جب کہ روزہ رکھنے والا مکلف یعنی عاقل و بالغ ہو' روزہ رمضان کا ہو اور رمضان ہی کے مہینے میں ہو یعنی رمضان کے قضاء روزوں میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوتا' نیت رات ہی سے کئے ہوئے ہو اگر طلوع فجر کے بعد نیت کی ہو گی' تو روزہ توڑنے پر کفارہ لازم نہیں ہوگا' روزہ توڑنے کے بعد ایسا کوئی امر پیش نہ آئے جو کفارہ کو ساقط کر دینے والا ہو جیسے حیض و نفاس' اگر روزہ توڑنے کے بعد ان میں سے کوئی چیز پیش آ جائے گی تو کفارہ لازم نہیں ہوگا' چنانچہ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا' اسی طرح روزہ توڑنے سے پہلے ایسی کوئی چیز پیش نہ آئے جس سے کفارہ ساقط ہو جاتا ہے' جیسے سفر کہ اگر کوئی شخص سفر کے حالت میں روزہ توڑے گا تو کفارہ لازم نہیں آئے گا ہاں اگر کوئی شخص سفر سے پہلے روزہ توڑ دے گا تو کفارہ ساقط نہیں ہوتا لہٰذا جب یہ تمام شرائط پائی جائیں گی اور مندرجہ ذیل مفسدات صوم (روزہ کو توڑنے والی چیزوں) میں سے کوئی صورت پیش آئے گی تو کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوں گے۔

اب پڑھیے کہ وہ کون سی صورتیں ہیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور جن کی وجہ سے کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوتے ہیں۔ جماع کرنا' غلام کرنا ان دونوں صورتوں میں فاعل اور مفعول دونوں پر کفارہ اور قضا لازم آتی ہے کھانا پینا خواہ بطور غذا یا بطور دوا۔ غذائیت کے معنی اور محمول میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ غذا کا محمول اس چیز پر ہو گا جس کو کھانے کے لئے طبیعت خواہش کرے اور اس کے کھانے سے پیٹ کی خواہش کا تقاضہ پورا ہوتا ہو۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ ''غذا کی چیز'' وہ کہلائے گی جس کے کھانے سے بدن کی اصلاح ہو اور بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ''غذا'' انہیں چیزوں کو کہیں گے جو عادۃً کھائی جاتی ہوں۔

اگر کوئی شخص بارش کا پانی' اولہ اور برف نگل جائے یا کچا گوشت کھائے خواہ وہ مردار ہی کا کیوں نہ ہو تو کفارہ لازم ہوگا اسی طرح چربی' خشک کیا ہوا گوشت اور گیہوں کھانے سے بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے ہاں اگر آدھ گیہوں منہ میں ڈال کر چبایا جائے اور وہ منہ میں پھیل جائے تو کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ اپنی بیوی یا محبوب کا تھوک نگل جانے سے بھی کفارہ واجب ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی طبیعت کی خواہش کا دخل ہوتا ہے ہاں ان کے علاوہ دوسروں کا تھوک نگلنے کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا' البتہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔ نمک کو کم مقدار میں کھانے سے تو کفارہ لازم ہوتا ہے زیادہ مقدار میں کھانے سے نہیں۔ مستغنی میں اس قول کو روایت مختار کہا گیا ہے لیکن خلاصہ اور بزاریہ میں لکھا ہے کہ مختار (یعنی قابل قبول اور لائق اعتماد) مسئلہ یہ ہے کہ مطلقاً نمک کھانے سے کفارہ واجب ہوتا ہے یعنی خواہ نمک زیادہ ہو یا کم اگر بغیر بھنا جو کھایا جائے گا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ کچا جو کھایا نہیں جاتا' لیکن یہ خشک جو کا مسئلہ ہے۔ اگر تازہ خوشہ میں سے جو نکال کر بغیر بھنا ہوا بھی کھایا جائے گا تو

کفارہ لازم آئے گا۔گل ارمنی کے علاوہ وہ مٹی مثلاً ملتانی وغیرہ کھانے کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ عادۃ کھائی جاتی ہو تو اس پر بھی کفارہ لازم آئے گا اور اگر نہ کھائی جاتی ہو تو پھر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

حدیث مبارکہ میں ہے: الغيبة تفطر الصيام (غیبت روزہ کو ختم کر دیتی ہے) بظاہر تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار غیبت کرے گا تو اس کا روزہ جاتا رہے گا لیکن علماء امت نے اجتماعی طریقے پر اس حدیث کی تاویل یہ کی ہے کہ حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ غیبت کرنے سے روزہ جاتا رہتا ہے بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ جو روزہ دار غیبت میں مشغول ہوگا اس کے روزے کا ثواب جاتا رہے گا۔

حدیث :الغيبة تفطر الصيام کے برخلاف اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پچھنے لگانے یا لگوانے کے بعد اس حدیث کے پیش نظر اس گمان کے ساتھ کہ روزہ جاتا رہا ہے قصداً کچھ کھا پی لے تو اس پر کفارہ صرف اسی صورت میں لازم آئے گا جب کہ وہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تاویل سے جو جمہور علماء سے منقول ہے واقف ہو یا یہ کہ کسی فقیہ اور مفتی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ پچھنے لگوانے یا لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ اس کا یہ فتویٰ حقیقت کے خلاف ہوگا اور اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی اور اگر اسے حدیث کی تاویل معلوم نہ ہوگی تو کفارہ لازم نہیں ہوگا الغيبة تفطر الصيام وافطر الحاجم والمحجوم دونوں حدیثوں کے احکام میں مذکورہ بالا فرق اس لئے ہے کہ غیبت سے روزہ کا ٹوٹنا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تفریق تمام امت کا اتفاق ہے جب کہ پچھنے سے روزہ کا ٹوٹ جانا نہ صرف یہ کہ خلاف قیاس نہیں ہے بلکہ اس حدیث کی مذکورہ بالا تاویل پر تمام امت کا اتفاق نہیں ہے کیونکہ بعض علماء مثلاً امام اوزاعی وغیرہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پچھنے لگانے یا لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے ایسے ہی کسی شخص نے شہوت کے ساتھ عورت کو ہاتھ لگایا' یا کسی عورت کا بوسہ لیا' یا کسی عورت کے ساتھ' ہم خواب ہوا' یا کسی عورت کے ساتھ بغیر انزال کے مباشرتِ فاحشہ کی یا سرمہ لگایا' فصد کھلوائی یا کسی جانور سے بدفعلی کی مگر انزال نہیں ہوا یا اپنی دبر میں انگلی داخل کی اور یہ گمان کر کے کہ روزہ جاتا رہے گا۔اس نے قصداً کچھ کھا پی لیا تو اس صورت میں بھی کفارہ اسی وقت لازم ہوگا جب کہ کسی فقیہ یا مفتی نے مذکورہ بالا چیزوں کے بارے میں یہ فتویٰ دیا ہو کہ ان سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اگرچہ اس کا یہ فتویٰ غلط اور حقیقت کے خلاف ہوگا اگر مفتی فتویٰ نہیں دے گا تو کفارہ لازم نہیں ہو گا کیونکہ مذکورہ بالا چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

اس عورت پر کفارہ واجب ہوگا جس نے روزہ کی حالت میں کسی ایسے مرد سے برضا و رغبت اور بخوشی جماع کرایا جو جماع کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا چنانچہ کفارہ صرف عورت پر واجب ہوگا اس مرد پر نہیں۔

کسی عورت نے فجر طلوع ہونے کے باوجود جانتے بوجھتے اسے اپنے خاوند سے چھپایا' چنانچہ اس کے خاوند نے اس سے صحبت کر لی اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ فجر طلوع ہوگئی ہے تو اس صورت میں بھی صرف عورت پر کفارہ واجب ہوا اور مرد پر واجب نہیں ہوگا۔

یہ فصل ان چیزوں کے بیان میں ہے جو کفارہ کو لازم کرنے والی ہے:

خاتون نے قصداً کھانا کھایا' یا برضا ورغبت جماع کرایا اور اسی دن اس کے ایام شروع ہو گئے یا نفاس میں مبتلا ہو گئی تو اس کے ذمہ سے کفارہ ساقط ہو جائے گا' اسی طرح اگر کوئی شخص اس دن کسی ایسے مرض اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا جس میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور یہ کہ وہ مرض و تکلیف قدرتی ہو تو کفارہ ساقط ہو جائے گا قدرتی کی قید اس لئے ہے کہ فرض کیجئے کسی شخص نے قصداً روزہ توڑ ڈالا اور پھر اپنے آپ کو اس طرح زخمی کر لیا کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے یا اپنے آپ کو چھت یا پہاڑ سے گرایا تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ تکلیف اور مرض اس کا خود اپنا پیدا کیا ہوا ہوگا۔ ایسی صورت میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی کفارہ ساقط ہو جائے گا جب کہ دوسرے حضرات کا قول ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوگا اور کمال کے قول کے مطابق مختار اور زیادہ صحیح یہی ہے کہ کفارہ ساقط نہیں ہوتا۔

جمع العلوم میں ہے کہ اگر کسی شخص نے زیادہ چلنے یا کوئی کام کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تکلیف و مشقت میں مبتلا کیا یہاں تک کہ اسے بہت زیادہ اور شدید پیاس لگی اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ کفارہ لازم نہیں ہوگا اور اسی قول کو بقائی نے بھی اختیار کیا ہے جیسا کہ تاتارخانیہ میں منقول ہے۔

یہ فصل ان چیزوں کے باین میں ہے کہ کفارہ کیسے ادا کیا جائے؟ ایک روزے کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرنا چاہئے خواہ وہ غلام کافر ہی کیوں نہ ہو اگر عدم استطاعت کے سبب غلام آزاد کرنا ممکن نہ ہو یا کسی جگہ غلام نہ ملتا ہو تو پھر دو مہینے یعنی پورے ساٹھ دن پے درپے روزے رکھنا واجب ہے' ان روزوں کا علی الاتصال اور ایسے دنوں میں رکھنا ضروری ہے جن میں عیدین کے دن اور ایام تشریق (ذی الحجہ کی گیارہ' بارہ' تیرہ' تاریخیں) واقع نہ ہوں کیونکہ ان دنوں میں کسی بھی طرح کے روزے رکھنا منع ہیں' اگر درمیان میں کسی عذر کی وجہ سے یا بلا عذر کسی دن کا روزہ فوت ہو جائے تو پھر نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا ناغہ سے پہلے جس قدر روزے ہو چکے ہوں گے ان کا کوئی حساب نہیں ہوگا ہاں اگر کسی عورت کو حیض آ جائے اور اس سبب سے درمیان کے روزے ناغہ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر نفاس کی وجہ سے ناغہ ہو جانے کی صورت میں نئے سرے سے روزے شروع کئے جائیں گے اور اگر مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے ساٹھ روزے رکھنے کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلانا واجب ہے اس طرح کہ چاہے تو انہیں ایک ہی دن دو وقت یعنی صبح و شام کھلا دے چاہے دو دن صبح کے وقت یا دو دن شام کے وقت یا عشاء و سحر کے وقت کھلا دے مگر شرط یہ ہے کہ اول وقت جن محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے تو دوسرے وقت بھی انہیں محتاجوں کو کھانا کھلانا ہوگا چنانچہ اگر کسی نے ایک وقت ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا دیا اور پھر دوسرے وقت ان کے علاوہ دوسرے ساٹھ محتاجوں کو کھلایا تو یہ کافی نہیں بلکہ کفارہ اسی وقت ادا ہوگا جب کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کو پھر دوبارہ ایک وقت کا کھانا کھلائے' ہاں اگر کوئی شخص ایک ہی محتاج کو مسلسل ساٹھ روز تک کھانا کھلائے یا مسلسل ساٹھ روز تک ہر روز نئے محتاج کو کھلائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس طرح کفارہ ادا ہو جائے گا' ایک بات اور' اگر کوئی شخص ایک ہی روز ساٹھ یا ان سے کچھ کم محتاجوں کے کھانے کے بقدر صدقہ کسی ایک محتاج کو دے دے گا تو سب کے لئے ادا نہیں ہوگا بلکہ ایک محتاج کے لئے ادا ہوگا۔

ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلانے کے سلسلہ میں گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے کافی ہو جاتی ہے یعنی اگر ساٹھ محتاجوں کو صرف گیہوں کی روٹی ہی بغیر سالن کے پیٹ بھر کر کھلا دی جائے تو حکم پورا ہو جائے گا' بخلاف جو کی روٹی کے کہ اس کے ساتھ سالن ضروری ہے کیونکہ جو کی روٹی سخت ہونے کی وجہ سے عادۃً بغیر سالن کے پیٹ بھر کر نہیں کھائی جا سکتی جب کہ گیہوں کی روٹی بغیر سالن کے بھی پیٹ بھر کر کھائی جا سکتی ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ گیہوں کی روٹی اپنی سالن خود اپنے اندر رکھتی ہے لہٰذا جس شخص نے گیہوں کی روٹی کے ساتھ سالن مانگا وہ بھوکا نہیں ہے۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ جن ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے وہ سب بھوکے ہوں' ان میں سے کوئی پیٹ بھرا نہ ہو اگر کوئی پیٹ بھرا ہوگا' اور بھوکے کی مانند نہیں کھائے گا تو اس کے بجائے کسی دوسرے بھوکے کو کھانا کھلانا ضروری ہوگا۔

ان شرائط کے مطابق محتاجوں کو کھانا کھلایا جائے یو پھر یہ کہ چاہے تو ہر محتاج کو نصف صاع یعنی ایک کلو گرام ۶۳۳ گرام گیہوں یا اس کا آٹا یا اس کا ستو دے دیا جائے چاہے ایک صاع یعنی تین کلو ۲۶۶ گرام جو یا انگور یا کھجور یا اس کی قیمت دی جائے اور چاہے اس طرح تمام محتاجوں کو ایک ہی وقت دے دیا جائے اور چاہے مختلف اوقات میں دیا جائے۔

کسی نے جانتے بوجھتے جماع کر کے یا قصداً کھا کر کئی روزے توڑے تو ان سب کے لئے ایک ہی کفارہ کافی ہوگا بشرطیکہ ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا ہو مثلاً کسی شخص نے دس روزے توڑے اور ان کے درمیان کفارہ ادا نہ کیا تو ان دس روزوں کے لئے ایک کفارہ کافی ہو جائے گا اگر درمیان میں کوئی کفارہ ادا کیا تو پھر بعد کے روزوں کے لئے دوسرا کفارہ ضروری ہوگا پھر یہ کہ وہ توڑے ہوئے کئی روزے چاہے ایک رمضان کے ہوں اور چاہے دو رمضان کے ہوں اس بارے میں صحیح مسئلہ یہی ہے جیسا کہ درمختار میں مذکور ہے مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا حکم اس صورت کے لئے ہے جب کہ وہ روزے ایک ہی رمضان کے ہوں اگر وہ روزے کئی رمضان کے ہوں گے تو ہر رمضان کے لئے علیحدہ علیحدہ کفارہ ضروری ہوگا چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔

یہ فصل ان چیزوں کے بیان میں ہے جن سے روزہ کی قضاء لازم آتی ہے: اس بارہ میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر کسی ایسی چیز سے روزہ فاسد ہو جو غذا کی قسم سے نہ ہو یا اگر ہو تو کسی شرعی عذر کی بناء پر اسے پیٹ یا دماغ میں پہنچایا گیا ہو یا کوئی ایسی چیز ہو جس سے شرمگاہ کی شہوت پوری طرح ختم نہ ہوتی ہو جیسے جلق وغیرہ تو ایسی چیزوں سے کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ صرف قضا ضروری ہے لہٰذا اگر روزہ دار رمضان میں کچے چاول اور خشک یا گندھا ہوا آٹا کھائے تو روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا واجب ہوتی ہے اور اگر کوئی جو یا گیہوں کا آٹا پانی میں گوندھ کر اور اس میں شکر ملا کر کھائے تو اس صورت میں کفارہ لازم ہو جائے گا۔

کوئی یکدم بہت زیادہ نمک کھائے یا گل ارمنی کے علاوہ کوئی ایسی مٹی کھائے جس کو عادۃً کھایا نہیں جاتا یا گٹھلی یا روئی یا اپنا تھوک نگل لے جو ریشم و کپڑے وغیرہ کے رنگ مثلاً زرد' سبزہ وغیرہ سے متغیر تھا اور اسے اپنا روزہ بھی یاد تھا یا کاغذ یا اس کے مانند ایسی کوئی چیز کھائی جو عادۃً نہیں کھائی جاتی یا کچی بھی یا اس کے مانند ایسا کوئی پھل کھائے جو پکنے سے پہلے عادۃً کھائے نہیں جاتے اور انہیں پکا کر یا نمک ملا کر نہیں کھایا' یا ایسا تازہ اخروٹ کھایا جس میں مغز نہ ہو یا کنکر' لوہا' تانبا' سونا' چاندی' اور پتھر خواہ وہ

زمرد وغیرہ ہی ہو نگل گیا تو ان صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہوگا' صرف قضا لازم ہوگی' اسی طرح اگر کسی نے حقنہ کرایا' یا ناک میں دوڈالی یا منہ میں دوا رکھی اور اس میں سے کچھ حلق میں اتر گئی اور یا کانوں میں تیل ڈالا تو ان صورتوں میں بھی صرف قضا لازم آئے گی کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

کان میں جان بوجھ کر پانی ڈالنے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ہدایہ ملتقی' درمختار' شرح وقایہ اور اکثر متون میں مذکور ہے کہ اس صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا مگر قاضی خان اور فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اس بارے میں صحیح مسئلہ یہ ہے کہ روزہ جاتا رہتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔

پیٹ کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ پیٹ میں پہنچ گئی' یا سر کے زخم میں دوا ڈالی اور وہ دماغ میں پہنچ گئی' یا حلق میں بارش کا پانی یا برف چلا گیا اور اسے قصداً نہیں نگلا بلکہ از خود حلق میں سے نیچے اتر گیا' یا چوک میں روزہ جاتا رہا مثلاً کلی کرتے ہوئے پانی حلق کے نیچے اتر گیا' یا ناک میں پانی دیتے ہوئے دماغ کو چڑھ گیا' یا کسی نے زبردستی روزہ تڑوا دیا خواہ جماع ہی کے سبب سے یعنی خاوند نے زبردستی بیوی سے جماع کیا' یا بیوی نے زبردستی خاوند سے جماع کرایا تو ان سب صورتوں میں بھی کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا لازم ہوگی ہاں جماع کے سلسلہ میں زبردستی کرنے والے پر کفارہ لازم ہوگا اور جس کے ساتھ زبردستی کی گئی اس پر صرف قضا واجب ہوگی۔

لونڈی (خواہ حرم یا منکوحہ) خدمت وکام کاج کی وجہ سے بیمار ہو جانے کے خوف سے روزہ توڑ ڈالے تو اس پر قضا لازم ہوگی' اسی طرح اگر لونڈی اس صورت میں روزہ توڑ ڈالے جب کہ کام کاج مثلاً کھانا پکانا یا کپڑا وغیرہ دھونے کی وجہ سے ضعف و توانائی لاحق ہوگئی تو اس صورت میں بھی قضا واجب ہوگی اس ضمن میں یہ مسئلہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر کسی لونڈی کو اس کا آقا کسی ایسے کام کے لئے کہے جو ادائے فرض سے مانع ہو تو اس کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا چاہئے۔

کسی نے روزہ دار کے منہ میں سونے کی حالت میں پانی ڈال دیا یا خود روزہ دار نے سونے کی حالت میں پانی پی لیا تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر قضا واجب ہوگی' اس مسئلہ کو بھول کر کھا پی لینے کی صورت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اگر سونے والا یا وہ شخص کہ جس کی عقل جاتی رہی ہو کوئی جانور ذبح کرے تو اس کا مذبوحہ کھانا حلال نہیں ہے اس کے برخلاف اگر کوئی ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو اس کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا جائز ہے اسی طرح یہاں بھی مسئلہ یہ ہے کہ بھول کی حالت میں کھانے پینے والے کا روزہ نہیں ٹوٹے گا' ہاں کوئی شخص سونے کی حالت میں کھا پی لے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

بھول کر روزے میں کچھ کھا پی لیا پھر اس نے بعد قصداً کھایا' یا بھول کر جماع کر لیا اور اس کے بعد پھر قصداً جماع کیا یا دن میں روزہ کی نیت کی پھر قصداً کھا پی لیا یا جماع کیا' یا رات ہی سے روزہ کی نیت کی پھر صبح ہو کر سفر کیا اور پھر اس کے بعد اقامت کی نیت کر لی اور کچھ کھا پی لیا اگرچہ اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا' یا رات سے روزہ کی نیت کی' صبح کو مقیم تھا' پھر سفر کیا اور مسافر ہو گیا اور حالت سفر میں قصداً کھایا یا جماع کیا اگرچہ اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا جائز نہیں تھا تو ان تمام صورتوں میں صرف قضا لازم ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا مسئلہ مذکورہ میں ''حالت سفر میں کھانے'' کی قید اس لئے لگائی

گئی ہے کہ اگر کوئی شخص سفر شروع کر دینے کے بعد پھر اپنی کوئی بھولی ہوئی چیز لینے کے لئے اپنے گھر واپس آئے اور اپنے مکان میں یا اپنے شہر وا پنی آبادی سے جدا ہونے سے پہلے قصداً کھا لے تو اس صورت میں قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

تمام دن کھانے پینے اور دوسری ممنوعات روزہ سے رکا رہا مگر نہ تو اس نے روزہ کی نیت کی اور نہ افطار کیا' یا کسی شخص نے سحری کھائی یا جماع کیا اس حالت میں کہ طلوع فجر کے بارے میں اسے شک تھا حالانکہ اس وقت فجر طلوع ہو چکی تھی' یا کسی شخص نے غروب آفتاب کے ظن غالب کے ساتھ افطار کیا حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو ان دونوں سورتوں میں صرف قضا واجب ہوگی کفارہ لازم نہیں ہوگا' اور اگر غروب آفتاب میں شک ہونے کی صورت میں افطار کیا اور حالانکہ اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس صورت میں کفارہ لازم ہونے کے بارے میں دو اقوال ہیں جس میں سے فقیہ ابوجعفر کا مختار یہ ہے کہ غروب آفتاب کے شک کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا اس طرح اگر کسی شخص کا ظن غالب یہ ہو کہ آفتاب غروب نہیں ہوا ہے مگر اس کے باوجود وہ روزہ افطار کرے اور حقیقت میں بھی سورج غروب نہ ہوا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔

جانور یا میت کے ساتھ (نعوذ باللہ) فعل بد کرنے کے سبب انزال ہو گیا یا کسی کی ران یا ناف یا ہاتھ کی رگڑ سے منی گرائی یا کسی کو چھونے یا اس کا بوسہ لینے کی وجہ سے انزال ہو گیا یا غیر ادائے رمضان کا روزہ توڑا تو ان سب صورتوں میں کفارہ واجب نہیں ہوگا بلکہ قضا لازم ہوگی' اسی طرح اگر کسی نے روزہ دار عورت کے ساتھ اس کے سونے کی حالت میں جماع کیا تو اس عورت کا روزہ جاتا رہے گا اور اس پر صرف قضا لازم ہوگی کفارہ واجب نہیں ہوگا' یا کسی عورت نے رات سے روزہ کی نیت کی اور جب دن ہوا تو دیوانی ہو گئی اور اس کی دیوانگی کی حالت میں کسی نے اس سے جماع کیا تو اس صورت میں اس عورت پر اس روزہ کی قضا لازم ہوگی۔

اپنی شرمگاہ میں پانی یا دوائی ٹپکائی' یا کسی نے تیل یا پانی سے بھیگی ہوئی انگلی اپنے مقعد میں داخل کی یا کسی نے اس طرح استنجاء کیا کہ پانی حقنہ کی جگہ تک پہنچ گیا اگرچہ ایسا کم ہوتا ہے یا استنجاء کرنے میں زیادتی ومبالغہ کی وجہ سے پانی فرج داخل تک پہنچ گیا تو قضا واجب ہوگی۔

بواسیر والے کے مسے باہر نکل آئیں اور وہ ان کو دھوئے تو اگر ان مسوں کو اوپر اٹھنے سے پہلے خشک کر لیا جائے تو ان کے اوپر چڑھ جانے سے روزہ نہیں ٹوٹ گا کیونکہ اس طرح پانی بدن کے ایک ظاہری حصہ پر پہنچا تھا اور پھر بدن کے اندرونی حصہ میں پہنچنے سے پہلے زائل ہو گیا ہاں اگر مسے اوپر چڑھنے سے پہلے خشک نہ ہوں گے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

تیل یا پانی سے تر کی ہوئی انگلی اپنی شرمگاہ کے اندرونی حصے میں داخل کرے گی یا کوئی شخص روئی یا کپڑا یا پتھر اپنی دبر میں داخل کرے گا یا کوئی عورت ان چیزوں کو اپنی شرمگاہ کے اندرونی حصہ میں داخل کرے گی اور یہ چیزیں اندر غائب ہو جائیں گی تو روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم ہوگی۔ ہاں اگر لکڑی وغیرہ کا ایک سرا ہاتھ میں رہے یا یہ چیزیں عورت کی شرمگاہ کے بیرونی حصہ تک پہنچیں تو روزہ فاسد نہیں ہوگا' اسی طرح اگر اس کا ایک سرا ہاتھ میں نہ ہو بلکہ سب نکل جائے تو یہ روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا لازم ہوگی۔

قصداً اپنے فعل سے کسی چیز کا دھواں اپنے دماغ یا اپنے پیٹ میں داخل کرے گا تو بعید نہیں کہ کفارہ بھی لازم ہو جائے کیونکہ ان کا دھواں نہ صرف یہ کہ قابل انتفاع ہے بلکہ اکثر دواء بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح سگریٹ' بیڑی اور حقہ کا دھواں داخل کرنے کی صورت میں بھی کفارہ لازم ہو سکتا ہے۔

قصداً قے کی خواہ وہ منہ بھر کر نہ آئی ہو تو اس کا روزہ جاتا رہے گا اور قضا لازم آئے گی' اس بارے میں روایت یہی ہے لیکن حضرت امام یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قصداً قے کرنے کی صورت میں روزہ فاسد ہوگا اور قضا لازم ہوگی جب کہ قے منہ بھر کر آئی ہو اگر منہ بھر کر نہ آئی تو نہ روزہ فاسد ہوگا اور نہ قضا لازم ہوگی چنانچہ زیادہ صحیح اور مختار یہی قول ہے۔

خود بخود منہ بھر کر قے آئی اور وہ اسے نگل گیا' یا کسی شخص نے دانتوں میں اٹکی ہوئی کوئی چیز جو ایک چنے کے بقدر یا اس سے زیادہ تھی کھالی یا کسی شخص نے رات سے نیت نہیں کی' دن میں بھی اس نے نیت نہیں کی تھی کہ بھول کر کچھ کھالیا پی لیا اور اس کے بعد اس نے روزہ کی نیت کی تو ان سب صورتوں میں روزہ نہیں ہوگا اور قضا لازم ہوگی' یا اسی طرح کوئی روزہ دار بے ہوش ہو جائے اور خواہ وہ مہینہ بھر تک بے ہوش رہے تو اس پر قضا لازم ہوگی ہاں اس دن کے روزہ کی قضا لازم نہیں ہوگی جس دن میں یا جس رات سے بیہوشی شروع ہوئی ہو کیونکہ مسلمان کے بارے میں نیک گمان ہی کرنا چاہئے اس لئے ہو سکتا ہے اس نے رات میں نیت کر لی ہو اور اس طرح اس دن کا روزہ پورا ہو جائے گا اب اس کے بعد جتنے دنوں بیہوش رہے گا ان کی قضا کرے گا۔ بیہوشی شروع ہونے والے دن کے بارے میں بھی اگر یہ یقین ہو کہ نیت کی تھی تو اس دن کے روزہ کی بھی قضا ضروری ہوگی۔ بیہوشی کے دنوں کے روزوں کی قضا اس لئے ضروری ہوگی کہ اگرچہ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں مگر چونکہ روزہ کی نیت نہیں پائی گئی اس لئے بیہوشی کی حالت میں اس کا بغیر نیت کچھ نہ کھانا پینا اور تمام چیزوں سے رکے کافی و کارآمد نہیں ہوگا اگر کسی شخص پر رمضان کے پورے مہینے میں دیوانگی طاری رہی تو اس پر قضا واجب نہیں ہوگی ہاں اگر پورے مہینے دیوانگی طاری نہ رہی تو پھر قضا ضروری ہوگی اور اگر کسی شخص پر پورے مہینے بایں طور دیوانگی طاری رہی کہ دن میں یا رات میں نیت کا وقت ختم ہو جانے کے بعد اچھا ہو جاتا جو جب بھی قضا ضروری نہیں ہوگی بلکہ یہ پورے مہینے دیوانگی طاری رہنے کے حکم میں ہوگا۔

رمضان میں روزے کی نیت نہیں کی اور پھر اس نے دن میں کھایا پیا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اس صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوگا صرف قضا لازم ہوگی مگر صاحبینؒ کا قول یہ ہے کہ کفارہ واجب ہوگا۔

روزہ ٹوٹ گیا خواہ کسی عذر ہی کی بناء پر ٹوٹا ہو پھر وہ عذر بھی ختم ہو گیا ہو تو اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دن کے بقیہ حصہ میں رمضان کے احترام کے طور پر کھانے پینے میں ممنوع دوسری چیزوں سے اجتناب کرے' اسی طرح اس عورت کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں روزہ میں ممنوع چیزوں سے اجتناب ضروری ہے جو حیض یا نفاس میں مبتلا تھی اور طلوع فجر کے بعد پاک ہو گئی ہو' نیز مسافر جو دن میں کسی وقت مقیم ہو گیا ہو بیمار جو اچھا ہو گیا ہو' دیوانہ شخص جس کی دیوانگی جاتی رہی ہو' لڑکا جو بالغ ہوا ور کافر جو اسلام قبول کرلے ان سب لوگوں کو بھی دن کے بقیہ حصہ میں کھانے پینے دوسری ممنوع چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے ان سب پر اس دن کے روزہ کی قضا لازم ہوگی البتہ مؤخر الذکر دونوں پر قضا لازم نہیں ہوگی۔

حیض و نفاس میں مبتلا ہو یا جو شخص بیماری کی حالت میں ہو جو شخص حالت سفر میں ہو ان کے لئے کھانے پینے سے اجتناب ضروری نہیں ہے تاہم ان کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ عام نگاہوں سے بچ کر پوشیدہ طور پر کھائیں پیئیں۔

ان چیزوں کا بیان جن سے روزہ مکروہ ہوتا ہے: روزہ دار کے لئے کسی چیز کا چکھنا (یعنی چکھ کر تھوک دینا) ذخیرہ میں منقول ہے کہ روزہ دار کے لئے بلاضرورت کسی چیز کا چکھنا مکروہ ہے ہاں عذر کی صورت میں مکروہ نہیں ہے مثلاً کوئی شخص کھانے پینے کی کوئی چیز خریدے اور یہ خوف ہو کہ اگر اسے چکھ کر نہیں دیکھوں گا تو دھوکہ کھا جاؤں گا یا یہ چیز میری مرضی کے مطابق نہیں ہوگی تو اس صورت میں اگر وہ اس چیز کو چکھ لے تو مکروہ نہیں ہوگا۔

فتاویٰ سفی میں منقول ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند بد خلق اور ظالم ہو اور جو کھانے میں نمک کی کمی و بیشی پر اس کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہو تو اس کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ کھانا چکھ لے تاکہ اپنے خاوند کے ظلم و تشدد سے بچ سکے اور اگر خاوند نیک خلق و نیک مزاج ہو تو پھر عورت کے لئے چکھنا جائز نہیں ہوگا یہی حکم لونڈی کا بھی ہے بلکہ وہ نوکر و ملازم بھی اس حکم میں شامل ہیں جو کھانا پکانے پر مقرر ہیں۔

کسی چیز کا چبانا (بلا عذر) مکروہ ہے مثلاً کوئی عورت چاہے کہ روٹی وغیرہ چبا کر اپنے چھوٹے بچے کو دیدے تو اگر اس کے پاس کوئی ہوشیار بچی یا کوئی حائضہ ہو تو اس سے چبوا کر بچے کو دیدے خود نہ چبائے اس صورت میں خود چبا کر دینا مکروہ ہے ہاں اگر غیر روزہ دار ہاتھ نہ لگے تو پھر خود چبا کر دیدے اس صورت میں مکروہ نہیں ہوگا۔

روزہ دار کو مصطگی چبانا مکروہ ہے خواہ مرد یا عورت کیونکہ اس کے چبانے سے روزہ ختم کرنے یا روزہ نہ رکھنے کا اشتباہ ہوتا ہے ویسے تو مصطگی مرد کو غیر روزہ کی حالت میں بھی چبانا مکروہ ہے ہاں کسی عذر کی بناء پر اور وہ بھی خلوت میں چبانا جائز ہے بعض حضرات نے کہا ہے کہ مصطگی چبانا مردوں کے لئے مباح ہے جب کہ عورتوں کے لئے مستحب ہے کیونکہ وہ ان کا حق میں مسواک کے قائم مقام ہے۔

روزہ کی حالت میں بوسہ لینا اور عورتوں کے ساتھ مباشرت یعنی انکے گلے لگانا اور چمٹانا وغیرہ مکروہ ہے بشرطیکہ انزال کا خوف ہو یا اپنے نفس و جذبات کے بے اختیار ہو جانے کا اور اس حالت میں جماع کر لینے کا اندیشہ ہو اگر یہ خوف و اندیشہ نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں۔

جانتے بوجھتے منہ میں تھوک جمع کرنا اور اسے نگل جانا مکروہ ہے اسی طرح روزہ دار کو وہ چیزیں اختیار کرنا بھی مکروہ ہے جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جانے کا خوف ہو جیسے فصد پچھنے وغیرہ ہاں اگر فصد اور پچھنے کی وجہ سے ضعف ہو جانے کا احتمال نہ ہو تو پھر مکروہ نہیں ہے۔

سرمہ لگانا مونچھوں کو تیل لگانا اور مسواک کرنا خواہ زوال کے بعد ہی مسواک کی جائے اور یہ کہ خواہ مسواک تازی ہو یا پانی میں بھیگی ہوئی ہو مکروہ نہیں ہے۔

وضو کے علاوہ کلی کرنی اور ناک میں پانی دینا مکروہ نہیں ہے اسی طرح غسل کرنا اور تراوٹ و ٹھنڈک حاصل کرنے

کے لئے بھیگا ہوا کپڑا بدن پر لپیٹنا مکروہ نہیں ہے' مفتی بہ قول یہی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ بات ثابت ہے چنانچہ یہ روایت آئندہ صفحات میں آئے گی۔ روزہ دار کے لئے جو چیزیں مستحب ہیں' سحری کھانا' سحری کو دیر سے کھانا اور وقت ہو جانے پر افطار میں جلدی کرنا جب کہ فضا ابر آلود نہ ہو' جس دن فضا ابر آلود ہو اس دن افطار میں احتیاط یعنی دو تین منٹ کی تاخیر ضروری ہے۔

اور روزہ دار کو تین چیزیں مستحب ہیں: ! سحری کھائی۔" سحری میں دیر کرنی اور # افطار میں جلدی کرنی۔ ابر کے دن علاوہ اور ابر کے روز احتیاط ضروری ہے۔

فصل: ایسے اعذار کا بیان جن کی بناء پر روزہ نہ رکھنا جائز ہے اور وہ دس ہیں:

① بیماری۔ ② سفر۔ ③ اکراہ زبردستی کرنا۔ ④ حمل۔ ⑤ دودھ پلانا۔ ⑥ بھوک۔ ⑦ پیاس۔ ⑧ بہت زیادہ بڑھاپا۔ ⑨ حیض۔ ⑩ نفاس۔

اب ان اعذار کو مفصلاً بیان کیا جاتا ہے:

بیماری:

روزہ رکھنے سے کسی نئے مرض کے پیدا ہو جانے یا موجود مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو' تو اس صورت میں روزہ نہ رکھنا چاہئے۔ اسی طرح اگر یہ گمان ہو کہ روزہ رکھنے سے صحت وتندرستی دیر میں حاصل ہوگی تو بھی روزہ نہ رکھنا چاہئے کیونکہ بسا اوقات مرض کی زیادتی اور اس میں طوالت ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے اس لئے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

مرض نام ہے اس چیز کا جو طبیعت کے اتار چڑھاؤ کا باعث ہوتی ہے اور جس کے سبب طبیعت کا سکون کرب و بے چینی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت پہلے اندرونی طور پر محسوس ہوتی ہے پھر اس کا اثر جسم پر ظاہر ہوتا ہے لہٰذا مرض کسی بھی قسم کا ہو خواہ آنکھ دکھنے اور جسم و بدن کے کسی زخم کی صورت میں ہو یا دردسر و بخار وغیرہ کی شکل میں' جب اس میں زیادتی یا اس کے طول پکڑ جانے کا اندیشہ ہوگا تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوگی' بلکہ روزہ کی نیت کرنے کے بعد بھی اگر کوئی مرض پیدا ہو جائے مثلاً کسی کو سانپ بچھو کاٹ لے یا بخار چڑھ آئے یا دردسر ہونے لگے تو اس کو اس دن کا روزہ رکھنا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ روزہ توڑ دیا جائے۔ علماء لکھتے ہیں کہ اگر کسی غازی اور مجاہد کو رمضان کے مہینہ میں دشمنان دین سے لڑنا ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ روزہ کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا جس کی بناء پر لڑائی میں نقصان پیدا ہوگا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے خواہ مسافر ہو یا مقیم۔ اسی پر علماء نے اس مسئلہ کو بھی قیاس کیا ہے کہ جس شخص کو باری کا بخار آتا ہو اور وہ باری کے دن بخار چڑھنے سے پہلے اپنا روزہ ختم کر دے اس خوف کی بناء پر کہ آج بخار چڑھے گا جس کی وجہ سے ضعف لاحق ہو جائے گا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور اس دن بخار نہ بھی آئے تو صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا جب کہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ دونوں صورتوں میں کفارہ لازم ہوگا۔

اگر بازار والے رمضان کی تیس تاریخ کو طبل نقارہ یا گولے وغیرہ کی آوازیں سنیں اور یہ گمان کر کے کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان ہے روزہ توڑ ڈالیں اور پھر بعد میں معلوم ہو کہ یہ آج عید کا دن ہونے کا اعلان نہیں تھا بلکہ کسی اور سبب سے طبل ونقارہ بجایا

گیا تھا یا گولا داغا گیا تھا تو اس صورت میں بھی ان پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

سفر:

جائز ہو یا ناجائز' بے مشقت ہو جیسے پیادہ پا یا گھوڑے وغیرہ کی سواری پر' ہر حال میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر بے مشقت سفر میں مستحب یہی ہے کہ روزہ رکھا جائے بشرطیکہ اس کے تمام رفقاء سفر بغیر روزہ نہ ہوں اور سب کا خرچ مشترک نہ ہو' ہاں اگر اسکے تمام رفقاء سفر روزہ نہ رکھیں اور سب کا خرچ بھی مشترک ہو تو پھر روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہوگا تا کہ پوری جماعت کی موافقت رہے۔

کوئی طلوع فجر سے پہلے سفر شروع کر کے مسافر ہو جائے تو اس دن کا روزہ نہ رکھنا اس کے لئے مباح ہے ہاں اگر کوئی شخص روزہ کی حالت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرے تو اب اس کے لئے روزہ نہ رکھنا مباح نہیں ہوگا البتہ بیمار ہو جانے کی صورت میں طلوع فجر کے بعد سفر شروع کرنے والے کے لئے روزہ نہ رکھنا مباح ہوگا اور بہر صورت کفارہ لازم نہیں ہوگا بلکہ صرف قضا واجب ہوگی خواہ سفر کی حالت میں بیماری کی وجہ سے روزہ توڑے یا بغیر بیماری کے۔

اکراہ (یعنی زبردستی):

اگر کوئی روزہ نہ رکھنے پر مجبور کیا جائے اس کو بھی شریعت نے روزہ نہ رکھنے یا روزہ توڑنے کی اجازت دی ہے مثلاً کوئی شخص کسی روزہ دار کو زبردستی پچھاڑ کر اس کے منہ میں کوئی چیز ڈال دے' یا کوئی شخص روزہ دار کو مجبور کرے کہ اگر تم نے روزہ رکھا تو تمہیں جان سے مار دیا جائے گا یا تمہیں ضرب شدید پہنچائی جائے گی یا تمہارے جسم کا کوئی عضو کاٹ ڈالا جائے گا تو اس صورت میں اس کے لئے روزہ توڑنا یا روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

حاملہ خاتون:

حاملہ کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے بشرطیکہ اپنی یا اپنے بچے کی مضرت کا خوف ہو' یا عقل میں فتور آ جانے کا اندیشہ ہو مثلاً اگر حاملہ یا خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے خود اپنی دماغی وجسمانی کمزوری انتہاء کو پہنچ جائے گی یا ہونے والے بچہ کی زندگی اور صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا یا خود کیا بیماری و ہلاکت میں مبتلا ہو جائے گی تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ قضا کر دے۔

ارضاع (یعنی دودھ پلانا):

جیسے حاملہ عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے' اسی طرح دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے خواہ وہ بچہ اسی کا ہو یا کسی دوسرے کے بچہ کو باجرت یا مفت دودھ پلاتی ہو بشرطیکہ اپنی صحت وتندرستی کی خرابی یا بچے کی مضرت کا خوف ہو۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں ''دودھ پلانے والی عورت'' سے صرف دایہ ہی مراد ہے غلط ہے' کیونکہ حدیث میں مطلقاً دودھ پلانے والی عورت کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی ہے چاہے ماں ہو یا دایہ' چنانچہ ارشاد ہے:

ان اللہ وضع عن المسافر الصوم وشطر الصلوۃ وعن الحبلی والمرضع الصوم

''اللہ عزوجل نے مسافر کو روزہ اور آدھی نماز معاف کی' بعینہ حاملہ ودودھ پلانے والی کے لئے بھی روزہ معاف کیا''۔

اگر اس بارے میں کوئی تخصیص ہوتی تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ تخصیص ''دایہ'' کی بجائے ''ماں'' کے لئے ہوتی کیونکہ دایہ کے لئے کسی بچہ کو دودھ پلانا واجب اور ضروری نہیں ہے وہ تو صرف اجرت کے لئے دودھ پلاتی ہے اگر وہ چاہے تو اس کام کو چھوڑ سکتی ہے جب کہ ماں کا معاملہ برعکس ہے اپنے بچے کو دودھ پلانا اس پر دیانۃً واجب ہے جب کہ باپ غریب ہو۔

ارضاع کو دوا پینا جائز ہے جب کہ طبیب وڈاکٹر کہے کہ یہ دوا بچے کو فائدہ کرے گی' مسئلہ بالا میں بتایا گیا ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے جب کہ اسے اپنی یا اپنے بچہ کی مضرت کی گمان غالب ہو یا یہ کہ مسلمان طبیب حاذق جس کا کردار عقیدہ وعمل کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو یہ بات کہے کہ روزہ کی وجہ سے ضرر پہنچے گا۔

بھوک اور پیاس:

بھوک وپیاس کا اس قدر غلبہ ہو کہ اگر کچھ نہ کھائے یا پانی نہ پئے تو جان جاتی رہے یا عقل میں فتور آجائے یا ہوش وحواس ختم ہو جائے تو اس کے لئے بھی روزہ رکھنا جائز ہے اور روزہ کی نیت کر لینے کے بعد اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے تب بھی اس کو اختیار ہے' اگر روزہ توڑ دے گا تو کفارہ لازم نہ ہوگا صرف قضا واجب ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ روزہ دار نے از خود اپنے نفس کو اس قدر مشقت میں مبتلا کر کے یہ حالت پیدا نہ کر دی ہو مثلاً کسی شخص نے از خود اپنے نفس کو بایں طور مشقت میں مبتلا کیا کہ بغیر کسی شدید ضرورت کے کوئی لمبی چوڑی دوڑ لگائی جس کی وجہ سے پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر روزہ توڑ ڈالا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا اگرچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

حضرت علی بن احمدؒ سے پیشہ ومزدوری کرنے والوں کے بارے میں پوچھا گیا کہ کوئی مزدور یہ جانے کہ اگر میں اپنے اس کام میں مشغول ہوں گا تو ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤں گا جس میں روزہ نہ رکھنا مباح ہے درآنحالیکہ وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالنے کیلئے اس کام کے کرنے پر مجبور ہے تو آیا بیماری میں مبتلا ہونے سے پہلے اس کے لئے کھانا مباح ہے یا نہیں؟ تو علی بن احمدؒ نے اس بات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔

لیکن اس بارے میں جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو درمختار میں لکھا ہے کہ اس صورت میں اگر اسے مذکورہ بالا خوف ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ آدھے دن تو محنت ومزدوری کرے اور آدھے دن آرام کرے تاکہ اسبابِ معیشت بھی فراہم ہو جائیں اور روزہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

شیخ فانی (بہت بڑھاپا):

''شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ'' کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں ''شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ'' اس مرد اور عورت کو کہتے ہیں جو زندگی کے آخری مرحلے پر پہنچ چکے ہوں' ادائیگی فرض قطعاً مجبور اور عاجز ہوں اور جسمانی طاقت وقوت روز بروز گھٹتی چلی جارہی

ہو یہاں تک کہ ضعف وناتوانی کے سبب انہیں یہ قطعاً امید نہ ہو کہ آئندہ بھی کبھی روزہ رکھ سکیں گے۔

حیض ونفاس:

حیض یا نفاس میں مبتلا کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

فدیہ:

مذکورہ بالا اعذار میں صرف شیخ فانی اور بڑھیا فانیہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے روزوں کا فدیہ ادا کریں ہاں اس شخص کے لئے بھی فدیہ دینا جائز ہے جس نے ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر مانی ہو مگر اس سے عاجز ہو یعنی کوئی شخص یہ نذر مانے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا مگر بعد میں وہ اسباب معیشت کے حصول یا کسی اور عذر کی وجہ سے اپنی نذر کو پورا نہ کر سکے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے البتہ ہر دن فدیہ دے دیا کرے' ان کے علاوہ اور تمام اعذار کا مسئلہ یہ ہے کہ عذر زائل ہو جانے کے بعد روزوں کی قضا ضروری ہے فدیہ دینا درست نہیں یعنی فدیہ دینے سے روزہ معاف نہیں ہوگا اسی لئے اگر کوئی معذور اپنے عذر کی حالت میں مر جائے تو اس پر ان روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جانا واجب نہیں ہے جو اس کے عذر کی وجہ سے فوت ہو جائے اور نہ اس کے وارثوں پر یہ واجب ہوگا کہ وہ فدیہ ادا کریں خواہ عذر یا بیماری کا ہو یا سفر کا' مذکورہ بالا اعذار میں سے کوئی اور عذر ہاں اگر کوئی شخص اس حالت میں انتقال کرے کہ اس کا عذر زائل ہو چکا تھا اور وہ قضا روزے رکھ سکتا تھا مگر اس نے قضا روزے نہیں رکھے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان ایام کے روزوں کے فدیہ کی وصیت کر جائے جن میں مرض سے نجات پا کر صحت مند رہا تھا' یا سفر پورا کر کے مقیم تھا اور یا جو بھی عذر رہا ہو وہ زائل ہو چکا تھا۔

اگر شیخ فانی سفر کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کی طرف اسے ان ایام کے روزوں کا فدیہ دینا ضروری نہیں ہوگا جن میں وہ مسافر رہا کیونکہ جس طرح اگر کوئی دوسرا شخص سفر کی حالت میں مر جائے تو اس کے لئے ایام سفر کے روزے معاف ہوتے ہیں اسی طرح اس کے لئے بھی ان ایام کے روزے معاف ہوں گے۔

جس شخص پر فدیہ لازم ہوا اور وہ فدیہ دینے پر قادر نہ ہو تو پھر آخری صورت یہی ہے کہ وہ اللہ رب العزت سے استغفار کرے عجب نہیں کہ ارحم الرحمین اسے معاف کر دے۔

مقدار فدیہ: ہر دن کے روزے کے بدلے فدیہ نصف صاع یعنی ایک کلو ۶۳۳ گرام گیہوں یا اس کی مقدار ہے فدیہ اور کفارہ میں جس طرح تملیک جائز ہے اسی طرح اباحت طعام بھی جائز ہے یعنی چاہے تو ہر دن کے بدلے مذکورہ بالا مقدار کسی محتاج کو دے دی جائے اور چاہے ہر دن دونوں وقت بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ صدقہ فطر کے برخلاف کہ اس میں زکوٰۃ کی طرح تملیک ہی ضروری ہے اس بارے میں یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جو صدقہ لفظ اطعام یا طعام (کھلانے) کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک اور اباحت دونوں جائز ہیں اور جو صدقہ لفظ ''ایتا' یا ادا'' (دینے) کے ساتھ مشروع ہے اس میں تملیک شرط اور ضروری ہے اباحت قطعاً جائز نہیں ہے۔

قضاء روزے:

قضاء روزے پے در پے رکھنا شرط اور ضروری نہیں ہے تاہم مستحب ضرور ہے تاکہ واجب ذمہ سے جلد اتر جائے اسی طرح یہ بھی مستحب ہے کہ جس شخص کا عذر زائل ہو جائے وہ فوراً روزے شروع کر دے کیونکہ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے' ویسے مسئلہ یہ ہے کہ قضاء روزوں کا معاً عذر زائل ہوتے ہی رکھنا بھی ضروری ہے اختیار ہے کہ جب چاہے رکھے۔ نماز کی طرح اس میں ترتیب بھی فرض نہیں ہے قضا روزے رکھے بغیر ادا کے روزے رکھے جا سکتے ہیں۔

یہ بات سمجھ لیجئے کہ شریعت میں تیرہ قسم کے روزے ہیں جن میں سے سات قسم کے روزے تو وہ ہیں جو علی الاتصال یعنی پے در پے رکھے جاتے ہیں: ① رمضان کے مہینے کے روزے۔ ② کفارۂ ظہار کے روزے۔ ③ کفارۂ قتل کے روزے۔ ④ کفارۂ یمین کے روزے۔ ⑤ رمضان میں قصداً توڑے ہوئے روزوں کا کفارہ کے روزے۔ ⑥ نذر معین کے روزے ⑦ اعتکاف واجب کے روزے۔

اور چھ قسم کے روزے ایسے ہیں جن میں اختیار ہے چاہے تو پے در پے رکھے جائیں چاہے متفرق طور پر یعنی ناغہ کے ساتھ: ① نفل روزے۔ ② رمضان کے قضا روزے۔ ③ متعہ کے روزے۔ ④ فدیہ حلق کے روزے۔ ⑤ جزاء عید کے روزے۔ ⑥ نذر مطلق کے روزے۔

یاد رکھو کہ نفل روزے کا بھی بغیر کسی عذر کے توڑ ڈالنا جائز نہیں ہاں اتنی بات ہے کہ نفل روزے شروع ہو جانے کے بعد واجب ہو جاتا ہے لہٰذا وہ کسی بھی حالت میں توڑا جائے گا تو اس کی قضا ضروری ہوگی ہاں پانچ ایام ایسے ہیں جن میں اگر نفل روزہ بعد شروع کر چکنے کے توڑ دیا جائے تو قضا واجب نہیں ہوتی' دو دن تو عید بقر عید کے اور تین دن تشریق (ذی الحجہ کی ۱۱' ۱۲' ۱۳ تاریخ) کے چونکہ ان ایام میں روزے رکھنے ممنوع ہیں لہٰذا ان ایام میں جب روزہ شروع ہی سے واجب نہیں ہوگا تو اس کے توڑنے پر قضا بھی واجب نہیں ہوگی۔

اگر کوئی شخص ان پانچوں ایام کے روزے کی نذر مانے یا پورے سال کے روزے کی نذر مانے تو ان صورتوں میں ان ایام میں روزے نہ رکھے جائیں بلکہ دوسرے دنوں میں ان کے بدلے قضا روزے رکھے جائیں۔

آخری مسئلہ یہ ہے کہ جب بچہ روزہ رکھنے کے قابل ہو جائے تو اسے روزہ رکھنے کی تلقین کی جائے اور جب اس کی عمر دس سال ہو جائے اور وہ روزہ نہ رکھے تو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے اور اس کو زبردستی روزہ رکھنے کا حکم دیا جائے جیسا کہ نماز کے بارے میں سختی کرنے کا حکم ہے۔

الفصل الاول:

روزہ کی حالت میں گناہوں سے بچنا چاہیے

۱۹۹۹: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١١٦/٤۔ حدیث رقم ١٩٠٣۔ وابن ماجه فی السنن ٥٣٩/١ حدیث رقم ١٦٨٩۔ واحمد فی المسند ٤٥٢/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص برا کام اور جھوٹ بولنا روزہ میں نہ چھوڑے اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس شخص نے اپنا کھانا پینا چھوڑا ہے۔

تشریح: **وعن ابی ھریرۃ قال : قال رسول اللّٰہ ﷺ من لم یدع** : جس نے ترک نہیں کیا۔**قول الزور** : یعنی باطل کو، وہ چیز جس کے کرنے میں گناہ ہے۔اضافت بیانیہ ہے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: زور، جھوٹ اور بہتان ہے یعنی جس نے نہیں چھوڑا باطل قول کو یعنی کفریہ باتوں کو، جھوٹی گواہی، افتراء پردازی، غیبت، بہتان، قذف، گالی گلوچ، شتم اور لعنت وغیرہ جن سے بچنا انسان پر واجب اور ان کا ارتکاب انسان پر حرام ہے۔

والعمل : نصب کے ساتھ ہے۔**بہ** : یعنی ''بالزور'' اعمال فواحش۔کیونکہ وہ گناہ میں ''زور'' کی طرح ہیں۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ ان فواحش پر عمل کرنا ہے، جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔**فلیس للّٰہ حاجة** : التفات اور مبالات۔مجاز ہے عدم قبول سے اس طرح کہ سبب کے نفی سے مراد مسبب کی نفی ہے۔**فی ان یدع** : یعنی چھوڑ دے۔**طعامه وشرابه** : کسی حد تک یہ دونوں مباح ہیں۔جب ان کو چھوڑے اور ایک قطعی حرام کا ارتکاب کرے تو وہ سزا کا مستحق ہوا، اور اس دوران اس نے حکم ماننے سے انکار کیا، اور اس سے مطلوب معاصی کا ترک ہے، مطلق طور پر یہ نہیں کہ ایک گناہ کو چھوڑے اور دوسرے کو کرتا رہے اور یہ اس مقولہ سے ماخذ ہے: **ان التوبة عن بعض المعاصی غیر صحیحة والصحیحة صحتها**۔جیسا کہ یہ صحت اور قبول کے درمیان فرق پر مبنی ہے۔عدم قبول سے عدم صحت لازم نہیں آتی بخلاف اس کے عکس (الٹ) کے۔

قاضیؒ کہتے ہیں: روزے کا مقصود شہوت وغیرہ کو توڑنا ہے جب یہ عظیم مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے روزے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس نے اس کو عنایت نظر سے نہیں دیکھا۔عدم حاجت، عدم التفات اور عدم قبول سے عبارت ہے۔وہ کیسے اس کی طرف متوجہ ہوگا۔اس کی حالت یہ ہے کہ اس نے روزے کے زمانے کے علاوہ جو چیز حلال ہے اس کو روزے میں ترک کردیا اور اس چیز کا مرتکب ہوا جو ہمیشہ حرام ہے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جھوٹ اور زور فواحش کی بنیاد فحیات کی معدن بلکہ شرک کا ساتھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ [الحج : ۳۰]۔''سوا ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو'' یہ بات سمجھ

میں آتی ہے کہ شرک اور ''زور'' اخلاص اور روزے کی ضد ہیں، تو روزہ ختم ہو جائے گا اس چیز کی وجہ سے جو اس کی ضد ہے۔

اس کے ہم معنی حدیث حاکمؒ میں ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ ''ليس الصيام من الأكل والشرب فقط انما الصيام من اللغو والرفث''۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے دار کے لئے معاصی سے اجتناب فرض ہے۔ جیسے حج میں کہا گیا ہے۔ لیکن اس اصل ثواب باطل نہ ہوگا۔ بلکہ کمال سے محروم ہوگا۔ اس کو روزے کا ثواب اور معصیت کا گناہ ہوگا۔ رہا وہ جو بیہقی نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے اور ان کے بعض اصحاب نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کہ اس کا اصل ثواب باطل ہوگا۔ اس کی دلیل اور واضح تعلیل کی ہونی چاہئے۔ ابن حجرؒ کا قول کہ ''روزے کے لحاظ سے روزے دار کے لئے تاکید ہے۔ یہ اس کے منافی نہیں کہ دوسرے اعتبار سے وہ واجب ہو۔ کہ وہ اپنی زبان اور دوسرے اعضاء کو مباحات سے روکے اور اس سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام گناہوں سے جس کا ذکر ہو چکا سے رک جائے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول درست نہیں۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ مباحات سے رکنا واجب نہیں ہے بلکہ ان کا یہ کہنا ''ریاحین'' کو سونگھنا، اس کو دیکھنا اور اس کو چھونا مکروہ ہے''۔ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

روزے کی حالت میں بیوی سے بوس وکنار کی اجازت ہے

۲۰۰۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ وَ يُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ وَكَانَ اَمْلَكَكُمْ لِاَرْبِهٖ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٤٩/٤۔ حديث رقم ١٩٢٧۔ ومسلم فی صحيحه ٧٧٧/٢ حديث رقم (١١٨٦/٦٥)۔ وابوداؤد فی السنن ٧٧٨/٢ حديث رقم ٢٣٨٢۔ وابن ماجه ٥٣٨/١ حديث رقم ١٦٨٧۔ واحمد فی المسند ٤٢/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے تھے اور بدن سے بدن لگاتے تھے یعنی اپنی بیوی سے معاملہ کرتے تھے۔ اس حال میں کہ روزہ دار ہوتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حاجت پر تم سے زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ یہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يقبل : شرح السنہ میں ہے روزے دار کا روزے کی حالت میں بوسہ دینا حضرت عمرؓ، ابوہریرہؓ اور عائشہؓ نے رخصت دی۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں: جب شہوت پیدا نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نوجوان کے لئے ممانعت اور بوڑھے کے لئے رخصت ہے۔ ويباشر :یعنی بعض بیویوں کے ساتھ۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: اپنی بعض بیویوں کو ہاتھ سے چھوتے تھے۔ وهو صائم :اس حال میں کہ وہ روزے دار ہو۔ مسلم نے یہ الفاظ بڑھائے ہیں: ''في رمضان''۔ شمنیؒ کہتے ہیں: اگر کوئی اپنے نفس پر جماع اور انزال کی وجہ سے ڈرے۔ تو ہمارے نزدیک اس کے لئے لمس، بوسہ دینا اور مباشرت کرنا مکروہ ہے۔ امام محمدؒ کہتے ہیں: مطلق بوسہ بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ وہ بھی فتنہ سے خالی نہیں ہے۔ کسی کو لائق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قیاس کرے، اُس قول کی وجہ سے جو حضرت عائشہؓ نے بیان کیا

ہے۔

وكان أملككم : "ملك" سے ہے، جب کسی چیز پر قادر ہو جائے یا اس پر حاکم ہو جائے۔ لأربه : ہمزہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ مشہور ہے۔ یہ وہ حاجت ہے جس سے شہوت کا ارادہ ہوتا ہے۔ اور کبھی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اور راء کے سکون کے ساتھ روایت کیا جاتا ہے اور اس کی تفسیر کی جاتی ہے کہ حاجت مراد ہے اور کبھی اس کی تفسیر کی جاتی ہے عقل مراد ہے اور کبھی تفسیر کی جاتی ہے کہ عضو مراد ہے۔ یہاں عضو سے مراد عضو مخصوص ہے۔

جیسا کہ شرح السنۃ میں اور شرح الفائق میں مذکور ہے۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ادب سنن کے خلاف ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: شاید یہی درست ہے کیونکہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے شہوت کی انواع پے در پے ادنیٰ سے اعلیٰ بیان کی ہیں۔ انہوں نے اس کی ابتداء بوسہ سے کی ہے، پھر مباشرت جو ملاعبت اور معانقہ سے ہے۔ پھر انہوں نے ارادہ کیا کہ کو مجامعت تعبیر کریں۔ تو انہوں نے اس کو کنایتاً ادب بیان کیا ہے جو عبارت کے حسن کی طرف اشارہ ہے۔

یہ مستحسن تب ہے جب ادب بمعنیٰ حاجت مجامعت سے کنایہ ہو۔ ہاں ذکر کا بیان کرنا عورت کے لئے خصوصاً مردوں کے سامنے مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو کرنا صحیح نہیں ان سے اپنے آپ کو روکنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قادر اور غالب ہیں۔ ابن ملک کہتے ہیں: اس کی مِلک سے مراد حاجت کے وقت اپنی شہوت کو مغلوب اور قابو میں رکھے اور اُسے انزال کا ڈر نہ ہو۔ اسی لئے ایسے شخص کے علاوہ دوسرے کے لئے بوسہ اور ہاتھ سے چھونا جائز نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو ان دونوں سے بچانے پر قادر ہو، اس لئے کہ وہ اپنی خواہش پر غالب ہے۔ اس کے ساتھ جو بوسہ دیتا اور مباشرت کرتا ہے، وہ اس کے چھوڑنے پر قادر ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسرا اپنی خواہش کا مالک ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آپ کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے یہ دونوں کام مکروہ نہیں ہیں۔ اس کی تائید اس صحیح حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے: "فقبل فأتي النبي قائلاً صنعت امرا عظيما فقال ارأيت لو تمضمضت من الماء وأنت صائم"۔

متفق عليه : ابن ہمام نے کہا ہے: "وعن أُم سلمة أن النبي ﷺ كان يقبلها وهو صائم"۔

غسل کیے بغیر روزہ رکھنے کی اجازت ہے

۲۰۰۱: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ جُنُبٌ مِنْ غَيْرِ حُلْمٍ فَيَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٥٣/٤۔ حديث رقم ١٩٣٠۔ ومسلم في صحيحه ٧٨٠/٢ حديث رقم (٧٦۔ ١١٠٩)۔ وابوداؤد في السنن ٧٨١/٢ حديث رقم ٢٣٨٨۔ والترمذي ١٤٩/٣ حديث رقم ٧٧٩۔ وابن ماجه ٥٤٤/١ حديث رقم ١٧٠٤۔ والدارمي ٢٣/٢ حديث رقم ١٧٢٥۔ واحمد في المسند ٣٠٨/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالت جنابت میں صبح کرتے تھے اور یہ جنابت احتلام کے باعث نہیں ہوتی تھی۔ پس آپؐ (ایسی حالت میں) غسل کرتے اور روزہ رکھے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنها : یعنی حضرت عائشہؓ سے ہی یہ بھی روایت ہے۔ قالت کان رسول اللہ ﷺ یدرکه الفجر : یعنی صبح۔ رمضان : بعض دفعہ ایسے ہوتا۔

وهو جنب : یہ نام اس لئے کہ جنابت نماز اور طواف وغیرہ سے دور کرنے کا سبب ہے۔ اور ان جیسے جو دوسرے شرعی احکام سے۔ انزال اور التقاء ختانین سے جنابت ہوتی ہے۔ یہی حکم ہے حائضہ اور نفساء کا بھی۔

من غير حلم : حاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ۔ اور ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ یہ صفت ممیزہ ہے۔ احتلام کے بغیر جماع سے۔ کیونکہ دوسرا امر اختیاری ہے۔ لہٰذا حکم بطریق اولیٰ معلوم ہوگا۔ بلکہ اگر احتلام روزے کی حالت میں ہو جائے۔ تو کوئی نقصان نہیں دیتا، علاوہ ازیں کہ انبیاء احتلام سے محفوظ ہیں۔ کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ شیطان نیند کی حالت میں انسان کے پاس آتا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: رہا حضرت عائشہؓ کا قول بغیر حلم کے۔ باوجود یہ کہ انبیاء کو احتلام نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ نفی مطلق نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے، کہ وہ جماع کی رؤیت کے ساتھ محتلم نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ کھیل شیطان کی طرف سے ہے اور انبیاء اس سے معصوم ہیں۔ بہر حال احتلام اس معنی میں کہ نیند کی حالت میں جماع دیکھے بغیر کا انزال ہو تو یہ انبیاء علیہم السلام سے محال نہیں کیونکہ وہ بدن کے پُر ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خلقی یا عادی امور میں سے ہیں۔ جس میں انبیاء اور دوسرے برابر ہیں۔ اس میں احتمال استدلال کی جگہ غیر مفید ہے۔

فيغتسل ويصوم : حدیث کے ظاہر سے علماء کا قول ہے۔ جو صبح جنابت کی حالت میں کرے تو وہ غسل کرے اور روزہ پورا کرے۔ ایک قول ہے: روزہ باطل ہو جائے گا۔ ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں: فرض روزہ باطل ہو جائے گا نفل باطل نہیں ہوگا۔ اسی طرح کا قول ابن ملکؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ قول شرح السنہ سے نقل کیا گیا ہے۔ بیضاویؒ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں کہتے ہیں: ﴿ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ [البقرة: ۱۸۷]۔ مباشرت کا صبح تک جائز ہونا غسل کے تاخیر کرنے کے جواز پر دال ہے اور صبح جنابت کی حالت روزہ رکھنے سے صحیح ہوگا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مباشرت فجر تک مباح ہے۔ تو غسل صرف صبح کے بعد ہی ممکن ہے۔ یہ ایک جماعت کا قول ہے جن میں سے حضرت ابو ہریرہؓ بھی ہیں، لیکن انہوں نے اس رجوع کیا کہ فجر سے پہلے غسل واجب ہے، اس کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے: ”من أصبح جنبا فلا صوم له“ انہوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ ابن منذرؒ نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے۔ یا اس کو اس پر محمول کریں گے جس نے صبح مجامعت کی حالت میں کی اور جماع میں مصروف رہا۔

روزے کی حالت میں سینگی لگوانے کی اجازت ہے

۲۰۰۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۷٤/٤۔ حدیث رقم ۱۹۳۸۔ وابو داوٗد فی السنن ۷۷۳/۲ حدیث رقم ۲۳۷۳۔ والترمذی ۱٤٦/۳۔ حدیث رقم ۷۷۵۔ وابن ماجه ۵۳۷/۱ حدیث رقم ۱٦۸۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں اور روزے کی حالت میں سینگی بھری ہوئی کھنچوائی۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال رسول الله ﷺ احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم : شیخ جزریؒ کہتے ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد ہے کہ حالت صوم اور احرام میں سینگی لگوائی۔ اسی طرح ابوداؤدؒ نے حدیث بیان کی ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے اور احرام کی حالت میں سینگی لگوائی۔ ترمذیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''وهو محرم صائم'' ۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں؛ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول: ''وهو صائم'' سے یہ بات باطل ہو جاتی ہے کہ ''آپ علیہ السلام نے پچھنے اس لئے لگوائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسافر تھے اور مسافر کے لئے حجامت کی وجہ افطار جائز ہے۔ بطلان اس طرح سے ہے کہ ابن عباسؓ نے حجامت ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے روزہ ثابت کیا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح نہیں کہا جاتا ''کل وهو صائم'' کہ اس نے کھایا اور وہ روزے سے تھا۔ اس میں لمبی بحث ہے۔

مظہر کہتے ہیں: محرم کے لئے سینگی لگوانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وہ بالوں کو نہ اکھیڑے اسی طرح روزے دار کے لئے بغیر کراہت کے جائز ہے۔ یہ قول امام ابوحنیفہؒ، مالک اور شافعیؒ کا ہے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں: سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ باطل ہو جائے گا، اور دونوں پر کفارہ نہیں ہے۔ عطاء کہتے ہیں: سینگی لگوانے والے کا روزہ باطل ہو جائے گا، اور اس پر کفارہ ہے۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اوزاعیؒ کہتے ہیں: کمزوری کے ڈر سے مکروہ ہے۔ اس کی دلیل اور مفصل بحث آگے آئے گی۔

اگر کسی شخص نے روزے کی حالت میں بھول کر کھالیا تو معاف ہے

۲۰۰۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَسِیَ وَ هُوَ صَائِمٌ فَاَكَلَ اَوْ شَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَهٗ فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵۵/٤۔ حدیث رقم ۱۹۳۳۔ ومسلم فی صحیحه ۸۰۹/۲ حدیث رقم (۱۷۱۔ ۱۵۵)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۸۹/۲ حدیث رقم ۲۳۹۸۔ والترمذی ۱۰۰/۳ حدیث رقم ۷۲۱۔ والدارمی ۲۳/۲ حدیث رقم ۱۷۲٦۔ واحمد فی المسند ۳۹۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص روزہ کی حالت میں بھول کر کھا پی لے اسے چاہیے کہ وہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ اس کو اللہ نے کھلایا ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : قال رسول الله ﷺ من نسی : یعنی وہ روزے کی حالت میں ہو۔ وهو صائم فاكل او شرب : بخاری کی روایت میں ہے فأكل وشرب۔ فليتم صومه : حدیث کا اطلاق ہمارے مذہب کی تائید کرتا ہے کہ اس پر روزے کا پورا کرنا واجب ہے۔ خواہ نفلی روزہ ہو یا فرض۔ اس قول کے ساتھ ابن حجر کا قید لگانا باطل ہو جاتا ہے۔ کہ: ''وجوبا علیه ان كان فرضا'' اگر فرض روزہ ہو تو واجب ہے۔ اس روایت کی سند صحیح یا حسن ہے۔ ''من أفطر فی

شهر رمضان ناسيًا فلا قضاء عليه ولا كفارة" مشہور حدیث ہے۔"رفع عن امتی الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه"۔

ابن ہمام کہتے ہیں: اس بات میں اختلاف ہے کہ وہ بھول کر کھا رہا ہو۔ اور اس سے کہا گیا کہ تو روزے دار ہے۔ اس کو یاد نہیں آیا۔ اور وہ کھاتا رہا۔ بعد میں آیا و آیا۔ تو ابو حنیفہؒ اور ابو یوسف کے ہاں اس کا روزہ افطار ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کو خبر دی گئی کہ اس پر کھانا حرام ہے۔ دیانات میں خبر واحد حجت ہے۔ اس پر واجب ہے کہ اپنے حال پر غور کرے۔ امام زفر اور حسن کہتے ہیں: وہ افطار نہیں کرے گا۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: حدیث کا اطلاق دلالت کرتا ہے کہ وہ افطار نہیں کرے گا۔ اگر چہ وہ کثیر مقدار میں کھائے پیئے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں: روزہ باطل ہو جائے گا۔ یہ شافعیؒ کا قول ہے پھر جب اس نے اپنے اختیار سے نہیں کھایا جیسے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس کو بھولانے کی وجہ سے کھایا ہے۔ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نرمی ہے اور اس پر آسانی ہے۔ تاکہ اس کے نفس سے حرج کو دفع کر دے۔ تو اس کی تعلیل آپ ﷺ نے فرمائی "فانما أطعمه الله وسقاه"۔ شرح نقایہ میں جو شمنیؒ کی تالیف ہے امام مالک کا قول ہے کہ اس پر قضاء ہے کفارہ نہیں ہے۔ اوزاعیؒ کہتے ہیں: کھانے پینے کے علاوہ جماع میں قضاء واجب ہے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں: جماع میں قضاء اور کفارہ واجب ہے۔ کھانے پینے میں نہیں ہے۔ ہماری دلیل جو ابن حبان اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے اور حاکمؒ نے امام مسلم کی شرط پر قرار دیا ہے، اور صحیح قرار دیا ہے۔ أبي هريرة ان النبي ﷺ قال من افطر في رمضان ناسياً فلا قضاء عليه ولا كفارة واما ان افطر خطأ او مكرها فانه يقضي فقط"۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔ شافعیؒ کہتے ہیں: دونوں حالتوں میں اس پر قضاء نہیں ہے۔ دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُمْ بِهِ﴾ [الاحزاب : ٥] "اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں" نبی ﷺ کا فرمان ہے: "رفع عن امتي الخطأ والنسيان وما استكرهوو عليه"۔

ہمارا مذہب یہ ہے کہ مفطر کی پیٹ میں جب کوئی چیز پہنچ جائے تو اس کا روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بھول جانے میں بھی یہی قیاس ہے مگر ہم نے اس کو حدیث سابق پر کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ تو یہ ایسے ہوا کہ جیسے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے ہاتھ کھائے۔ آیت اور حدیث کا جواب دے دیا گیا ہے۔ ان دونوں میں مراد گناہ کی نفی ہے، جیسا کہ شمنی نے ذکر کیا ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: حدیث جو صحیحین وغیرہ میں ہے۔ اس کو اس بات پر محمول کرنا کہ "صوم سے صوم لغوی مراد ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ باقی دن کھانے پینے سے رک جائے۔ جیسے حائضہ ہے جو دن میں پاک ہو جائے، مدفوع ہے۔ پہلی وجہ سے ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ مفہوم شرعی پر محمول کیا جائے گا۔ جہاں ممکن ہو لفظ شارع میں واجب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ ہی اس کو دفع کرتا ہے اور وہ یہ قول ہے "فليتم صومه"۔ اس کا روزہ شرعی ہو تو اتمام اس کا جب شرعی ہو۔ تیسرا قول: صحیح ابن حبان اور سنن دار قطنی میں ہے: "ان رجلا سأل رسول الله ﷺ فقال : انی كنت صائما فأكلت وشربت ناسيا فقال عليه الصلاة السلام : أتم صومك فان الله أطعمك وسقاك"۔ ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ ہیں: "ولا قضاء عليك" نے لفظ جماعت کے ساتھ

مذکورہ مسئلہ میں کفارہ اپنی ذات واہل وعیال پر خرچ کرنا صحابی کی خصوصیت تھی

۲۰۰۴: وَعَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلَكْتُ قَالَ مَالَكَ قَالَ وَقَعْتُ عَلٰى امْرَأَتِيْ وَاَنَا صَائِمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا قَالَ لَا قَالَ فَهَلْ تَسْتَطِيْعُ اَنْ تَصُوْمَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ قَالَ لَا قَالَ هَلْ تَجِدُ اِطْعَامَ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا قَالَ لَا قَالَ اجْلِسْ وَمَكَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيْنَا نَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِيْهِ تَمْرٌ وَالْعَرَقُ الْمِكْتَلُ الضَّخْمُ قَالَ اَيْنَ السَّائِلُ قَالَ اَنَا قَالَ خُذْ هٰذَا فَتَصَدَّقْ بِهٖ فَقَالَ الرَّجُلُ اَعَلٰى اَفْقَرَ مِنِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَ اللّٰهِ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا يُرِيْدُ الْحَرَّتَيْنِ اَهْلُ بَيْتٍ اَفْقَرُ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى بَدَتْ اَنْيَابُهٗ ثُمَّ قَالَ اَطْعِمْهُ اَهْلَكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٦٣/٤۔ حدیث رقم ١٩٣٦۔ ومسلم فی صحیحه ٧٨١/٢ حدیث رقم (٨١۔ ١١١١)۔ وابوداوٗد فی السنن ٧٨٣/٢ حدیث رقم ٢٣٩٠۔ والترمذی ١٠٢/٣ حدیث رقم ٧٢٤۔ وابن ماجه ٥٣٤/١ حدیث رقم ١٦٧١۔ والدارمی ١٩/٢ حدیث رقم ١٧١٦۔ ومالك فی الموطأ ٢٩٦/١ حدیث رقم ٢٨ من کتاب الصیام۔ واحمد فی المسند ٢٤١/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا اے اللہ کے رسول! میں ہلاک ہو گیا (یعنی گناہ کرنے کی وجہ سے) فرمایا کیا ہے تیرے لیے؟ اس نے کہا کہ میں نے روزے کی حالت میں اپنی عورت سے جماع کر لیا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تیرے پاس غلام ہے کہ تو اس کو آزاد کر دے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم میں مسلسل دو ماہ روزہ رکھنے کی طاقت ہے؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی طاقت رکھتے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بیٹھ جا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے رہے یعنی انتظار کرتے رہے کہ کوئی کچھ لے کر آئے تو اس کو دیں تاکہ وہ کفارہ ادا کرے پس اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عرق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور اس میں کھجوریں تھی اور عرق بڑے تھیلے کو کہتے تھے یعنی کھجور کے پتّے کا بنا ہوا ہوتا ہے اور اس میں پندرہ سیر سے لے کر بیس سیر تک کھجوریں آتی ہیں فرمایا پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں حاضر ہوں فرمایا یہ کھجوریں لے لو اور اللہ کی راہ میں بانٹ دو پھر اس شخص نے کہا کیا میں اس کو اس شخص کو دوں جس سے زیادہ میں خود محتاج ہوں میں فقیروں کو کس طرح دوں ۔ پس خدا کی قسم مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان کوئی گھر والا میرے گھر والوں سے بڑھ کر محتاج نہیں ہے دونوں کناروں سے مراد دو پہاڑیاں تھیں جو مدینے کے مشرق و مغرب کے درمیان واقع ہیں پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کچلیاں ظاہر ہوئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ کھجوریں اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔

اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے بھی راوی ہیں۔قال بينما نحن جلوس : یعنی ہم بیٹھے ہوئے تھے۔عند النبي ﷺ اذ جاءه رجل :تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: رجل، سلمہ بن صخر انصاری بیاضی ہیں۔ایک قول ہے سلمان یا سلمہ ہے اور پہلا قول صحیح ہے۔اس نے اپنی عورت سے ظہار کر لیا، اس ڈر سے کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے گا۔ پھر رمضان میں اس کے ساتھ جماع کر لیا۔ہم نے متعدد کتب اصحاب حدیث میں اسی طرح پایا ہے۔فقہاء کے ہاں اس نے اپنی عورت کے ساتھ رمضان میں دن کے وقت جماع کیا تھا۔

فقال يا رسول الله هلكت :یعنی اس گناہ کی وجہ سے۔مصابیح میں "أهلكت" کے الفاظ ہیں۔یعنی میری بیوی کی وجہ سے گناہ کا مرتکب ہوا۔قال :یعنی نبی ﷺ نے فرمایا۔مالك :یعنی تیرے ساتھ کیا واقعہ رونما ہوا؟ مصابیح میں یہ الفاظ ہیں: "ما شأنك؟ یعنی تیرا کیا معاملہ ہے؟ قال : آدمی نے کہا۔وقعت على امرأتي :میں نے اس سے مجامعت کی ہے۔مصابیح میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "في رمضان"۔ وأنا صائم : اسی طرح ابن ملکؒ نے نقل کیا ہے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مصابیح کے اکثر نسخوں میں یہ الفاظ ہیں: "وقعت على امرأتي في نهار رمضان"۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: ہمارے ائمہ نے اسی وجہ سے کہا ہے: جماع کی وجہ سے رمضان میں کفارہ واجب ہے کفارہ دینا صرف رمضان کے اداء روزوں کے ساتھ خاص ہے اداء روزوں کے علاوہ میں کفارہ نہیں کیونکہ وہ دوسرے مہینوں سے کئی ایک خصائص کی وجہ سے متمیز ہے، اسی طرح عورت پر بھی کفارہ واجب ہے یہ قول امام شافعیؒ کے خلاف ہے۔

ہدایہ میں نبی علیہ السلام کا قول ہے: "من أفطر في رمضان فعليه ما على المظاهر"۔ابن ہمامؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔یہ محفوظ نہیں ہے۔بخاریؒ و مسلمؒ میں ابو ہریرہؓ سے حدیث ہے: "انه عليه الصلاة والسلام أمر رجلاً افطر في رمضان ان يعتق رقبة أو يصوم شهرين متتابعين او يطعم ستين مسكينا علق الكفارة بالافطار"۔ اگر کہا جائے کہ مطلوب کا فائدہ نہیں دیتا۔کیونکہ یہ حال کے واقعہ کی حکایت جس میں عموم نہیں ہے۔تو ضروری ہے کہ فطر کسی خاص امر کی وجہ سے ہو نہ کہ عام کی وجہ سے۔اس میں جماع وغیرہ کی دلیل نہیں ہے۔اس میں کسی کے لئے دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل یہ ہے کہ آدمی کا جماع مراد ہے اور وہ سائل تھا، وہ اس لیے آیا تا کہ مسئلہ واضح ہو جائے۔روایت اسی طرح بیس آدمیوں نے ابو ہریرہؓ سے بیان کی ہے۔ہم کہتے ہیں: وجۂ استدلال راوی کی عبارت ابو ہریرہؓ سے افطار کے لحاظ سے مطلق ہے۔یہ افادہ خصوصی احوال سے سمجھا جا رہا ہے۔جو آپ ﷺ کی زندگی میں پیش ہوا۔یا اس نے سنا جو یہ فائدہ دیتا ہے، کہ اس پر واجب باعتبار خصوص افطار ہے، اس کو دلیل پکڑنا صحیح ہے۔انہوں نے یہ بات اپنے اصولوں میں اس مسئلہ کے متعلق کہی ہے، کہ جب راوی لفظ کے ظاہر سے عموم نقل کرے۔اس قول کو انہوں نے اختیار کیا ہے اور اس کا اعتبار کیا ہے۔اور اس کی مثال راوی کے اس قول سے بیان کی ہے۔اس نے ہمسائے کے لئے شفعہ کا فیصلہ کیا ہے۔یہ اس معنی میں ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔یہ مثال بغیر کسی فرق کے ہے جو اس پر غور کرے۔اس لیے کہ عورت پر حد واجب ہوتا ہے اگر وہ خود مرد کو اپنے اوپر قدرت دے۔تو کفارہ بطریق اولیٰ آئے گا۔اسی طرح جیسے ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ابن ہمامؒ نے صاحب ہدایہ کے متعلق کہا ہے۔ہمارا مذہب یہ ہے کہ کفارہ

کا تعلق جنایت افطار کی وجہ سے ہے یعنی یہ عام ہے خواہ جماع سے ہو یا اس کے علاوہ سے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: یہ اس حدیث سے ماخوذ ہے جو ابو ہریرہؓ سے منقول ہے: "من أفطر في رمضان"۔

دارقطنیؒ نے روایت کیا ہے: عن ابی هريرة ان رجلا أكل في رمضان فأمره النبي ﷺ ان يعتق"۔ ابو معشر کی وجہ سے معلول ہے۔ دارقطنیؒ نے اپنی کتاب عدل میں اسی طرح حدیث بیان کی ہے، جس میں ایک آدمی نے اپنی عورت کے ساتھ جماع کیا۔ عن سعيد بن المسيب ان رجلا أتى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ﷺ أفطرت في رمضان"۔ حدیث معتمد علیہ ہے۔ یہ حدیث مراسیل سعید بن مسیّب میں سے ہے۔ یہ ان کے ہاں مقبول ہے جو مرسل کو قبول نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک مرسل حدیث مطلق مقبول ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ قیاس جلی ہے جو نہایت واضح ہے نہ کہ قیاس خفی جس میں مقیس اور مقیس علیہ، قیاس اور اس کی باریکیوں کی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ اس محتاجی کے لئے جو جامع و مانع کے ادراک کے لئے ہے۔ واللہ اعلم

(فقال رسول الله ﷺ هل تجد رقبة : غلام عورت یا مرد۔ تعتقها : یہ اس گناہ کا کفارہ ہے۔ قال : لا، قال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال، لا قال هل تجد : فاء کے بغیر۔ اطعام ستين مسكينا قال: لا : قاضیؒ کہتے ہیں: شرح السنہ میں دوسرے کو فاء کے ساتھ مرتبہ کیا ہے۔ جب پہلی قسم موجود نہ ہو۔ پھر تیسری قسم کو فاء کے ساتھ مرتبہ کیا ہے جب کہ دوسری قسم موجود نہ ہو۔ یہ ترتیب پر دلالت ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اختیار ہے۔ اس کہ جماع کرنے والے کو ان تین قسموں میں اختیار ہوتا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ کفارہ ظہارہ الا کفارہ ہے، جو سورۂ مجادلہ میں مذکور ہے۔ یہ امام شافعیؒ اور اکثر ائمہ کا قول ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں: کفارہ میں اختیار ہے جیسے سورہ المائدہ میں ہے یہ اختیار ابوداؤد کی روایت کی وجہ سے ہے، کہ وہ گردن آزاد کرے یا دو مہینوں کے پے در پے روزے رکھے۔ یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ انہوں نے جواب دیا ہے کہ "أو" ترتیب کا تقاضا نہیں کرتا، جیسا کہ میں نے دوسری روایات بیان کی ہیں، اس وقت تقدیری عبارت یوں ہوگی، یا وہ روزے رکھے، اگر آزاد کرنے سے عاجز ہو یا کھانا کھلائے اگر روزہ رکھنے سے عاجز ہو۔ اس کے رواۃ اکثر مشہور ہیں۔ اس روایت کو بیس صحابہ نے روایت کیا ہے، یہ نبی ﷺ کے الفاظ کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ یہ دو راوی ہیں، یہ لفظ راوی کے ہیں۔ یہ حدیث کہ گردن آزاد کرنے اور اونٹ کی قربانی کرنے میں اختیار ہے، ضعیف ہے۔ اگرچہ اس کو امام حسنؒ اختیار کیا ہے۔ آپ جان لیں! "فاء" ہماری کتابوں میں صحیح نسخوں کے موافق ہے اور دوسری "فاء" موجود نہیں ہے۔ اور بخاری کے بعض نسخوں میں موجود ہے، اور بعض نسخوں میں مفقود ہے۔ پہلے میں "فاء" اتفاقاً موجود ہے۔ اور وہ ترتیب پر دلالت کے لئے کافی ہے۔ فاصلے کے لئے نہیں ہے۔ واللہ اعلم

قال اجلس ومكث النبي ﷺ : کاف کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ۔ رہا ابن حجرؒ کا قول: انہوں نے سین اور "تاء" کے ساتھ سکت پڑھا ہے، یہ تصحیف ہے اور معتمد اصول کے خلاف ہے۔ فبينا نحن على ذلك : جو انہوں نے بیٹھنے اور ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے۔ الى النبي ﷺ : یعنی آپ ﷺ کے پاس لائی گئی۔ بعرق فيه تمر: والعرق : عین اور "را" کے فتحہ کے ساتھ۔ زرکشیؒ کہتے ہیں:۔ "را" کے سکون کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ المكتل : میم کے کسرہ کے ساتھ۔ اس کا معنی زنبیل ہے۔

الضخم : خاء کے سکون کے ساتھ۔ معنی بہت بڑی۔ ایک قول ہے کہ جو کھجور کے پتوں سے بنائی گئی ہو۔ ''مغرب'' میں ہے۔ اس میں تیس صاع کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک قول پندرہ صاع۔ شرح السنہ میں ہے: اس میں پندرہ صاع کی گنجائش ہوتا ہے تو یہ ساٹھ مد ہو گئے، اس لئے کہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں۔ یہ اس پر دلالت ہے کہ کھانے میں کفارہ ہر مسکین کے لئے ایک مد ہے۔ قال : أين السائل : جو مسئلہ پوچھنے والا تھا۔

قال أنا : یعنی میں ہوں، یا سائل میں ہوں۔ قال : خذ هذا فتصدق به : یعنی فقراء پر صدقہ کر دے۔ فقال الرجل اعلى افقر منى : ہمزہ استفہام کے ساتھ۔ مجرور کسی محذوف کے متعلق ہے، یعنی میں اس کو اپنے سے زیادہ ضرورت مند پر خرچ کروں۔ ''أتصدق به على اكثر حاجة منى''۔ يا رسول الله : اس میں ایک قسم کا تعاون اور مدد کا پہلو ہے۔ پھر اس نے قسم کھا کر اپنے ظن سے تاکید پیدا کی کہ میں سب سے زیادہ فقیر ہوں۔ فو الله ما بين لا بيتها : یعنی مدینہ میں۔ یرید الحرتين : مدینہ میں مشرق و مغرب کے اطراف۔ نہایہ میں ''حرہ'' کی تعریف یہ ہے۔ وہ زمین جو سیاہ پتھروں والی ہو، معنی یہ ہوا کہ اس کے اطراف میں سیاہ پتھر ہیں۔ اهل بيت : یعنی جماعت جو ایک گھر میں جمع ہیں۔

افقر منى : وصف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اگر خبر مانیں تو منصوب ہے۔ زرکشی کہتے ہیں: مرفوع قرار دینے والے کہتے ہیں: یہ ''ما'' کا اسم ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور ''أفقر'' اس کی خبر ہے، اگر اس کو ''مجازی'' قول مانیں۔ اور مرفوع ہوگا اگر آپ اس کو تمیمی قول قرار دیں ''أفقر'' کے ساتھ۔ فضحك النبى ﷺ حتى بدت : یعنی ظاہر ہوئیں۔ انيابه : ''ناب'' کی جمع ہے اور رباعی کے بعد ہوتی ہے۔ ثم قال أطعمه أهلك : صحیح روایت میں ہے: ''فلا تفطر''۔ اس میں دلیل ہے کہ حالت ادا کا اعتبار ہے نہ کہ فعل کا۔ کیونکہ محضور کا ارتکاب کرتے وقت اس کے پاس کچھ موجود نہیں تھا اور جب اس پر صدقہ کیا گیا تو کھانا کھانے پر قادر ہو گیا تو آپ ﷺ نے اس کو کھانا کھلانے کا حکم فرما دیا۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ظاہر اور واضح یہی قول ہے: جب اس نے اپنی حاجت کا ذکر کیا تو اس سے پالینے تک اس کو مؤخر کر دیا۔

متفق عليه : ابن ہمام کہتے ہیں: اس کو اصحاب ستہ نے روایت کیا ہے، لیکن اس کے آخر میں یہ الفاظ بیان کیے: ''حتى بدت منایاه'' دوسری میں یہ الفاظ ''أنيابه'' ایک میں یہ الفاظ نواجذه ہیں۔ ''ثم قال : خذه فأطعمه أهلك''۔ ابوداؤد کی روایت میں زہریؒ نے یہ الفاظ زائد کیے ہیں۔ یہ رخصت خاص اُس کے لیے تھی۔ اگر کوئی آدمی آج یہ کرتا ہے تو اس کے پاس کفارہ ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ منذرؒ کہتے ہیں: زہریؒ کا قول صرف دعویٰ ہے اس کی دلیل نہیں ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے سعید بن مسیب کا مذہب ہے کہ رمضان میں خواہ کسی چیز کے ساتھ بھی افطار کرے اس پر کفارہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حدیث کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں: ''كلها انت وعيالك'' کی وجہ سے حدیث شروع والا حصہ منسوخ ہے۔ جمہور علماء نے زہریؒ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے مرفوع حدیث بیان کیا ہے: ''يجزئك ولا يجزئ أحدا بعدك'' اس کی سند میں کوئی چیز قابل جرح نہیں۔ اور نہ ہی اس میں لفظ ''فرق'' فاء کے ساتھ ہے، بلکہ عین کے ساتھ ہے، اس سے مراد وہ ٹوکری جس میں پندرہ صاع کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس پر ہم نے کہا: اگر چہ یہ ثابت نہیں، معاملے کی غایت یہی ہے کہ اس سے آسانی تک کفارہ مؤخر کر دیا جب کہ وہ فقیری کی حالت میں تھا اور روزے سے عاجز تھا، اس چیز کو ذکر کرنے

کے بعد جو اس پر واجب تھی، اسی طرح امام شافعیؒ وغیرہ کا قول ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ اس کے ساتھ خاص ہے کیونکہ دار قطنی میں جو حدیث ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ''کفر اللہ عنك'' اللہ تعالیٰ نے تیری طرف سے کفارہ ادا کر دیا۔ ''أھلکت'' کے الفاظ کتب ستہ میں نہیں ہیں۔ دار قطنیؒ اور بیہقی کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں اور امام حاکمؒ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ یہ ان سب کا خلاصہ ہے۔

الفصل الثانی:

روزے کی حالت میں بیوی کی زبان چوسنے کی اجازت ہے

۲۰۰۵: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یُقَبِّلُهَا وَهُوَ صَائِمٌ وَیَمُصُّ لِسَانَهَا۔

(رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/ ۷۸۰ حدیث رقم ۲۳۸۶ واحمد فی المسند ۶/ ۱۲۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بوسہ لیتے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ دار ہوتے تھے اور ان کی زبان چوستے۔ اس کو ابوداودؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''روزے کی حالت میں مجھے بوسہ دیتے تھے''۔ شارح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: یہ روزہ رمضان کا ہوتا یا غیر رمضان کا۔ اس حدیث میں لفظ ''یمص'' کی میم کو فتح کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔

لسانها: امام میرکؒ اس حدیث کی صحت کے بارے میں کہتے ہیں: کہ اس کی سند میں محمد بن دینار اطاحی بصری ہیں۔ جن کو ابن معین نے ضعیف اور ابن مرۃ نے ''لا بأس به'' کہا ہے، اور ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ اور دیگر ائمہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں: کہ متن میں ''یمص لسانها'' کے الفاظ صرف محمد بن دینار نے بیان کئے ہیں جو کہ اس حدیث کے راوی ہیں اور اسی طرح اس حدیث میں سعد بن اوس راوی ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ یہ بصری ہے اور ضعیف ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیر کی لعاب کو نگلنے سے بالا جماع روزہ افطار ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس حدیث کی صحت کو درست مان لیا جائے، تو یہ واقعہ حالتِ فعلی کا ہے اور اس کے اندر یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لعاب کو تھوک دیتے تھے۔ نگلتے نہیں تھے۔

اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ آپ حضرت عائشہؓ کی زبان کو چوستے اور پھر اپنے منہ کے اندر کی ساری لعاب عائشہؓ کے منہ میں ڈال دیتے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جب واقعہ فعلی محتمل ہو تو اس سے کوئی دلیل ثابت نہیں ہوتی اور یہ دوسری وجہ جو کہ بعید از مفہوم ہے اس کا تصور اسی وقت کیا جائے گا جب کہ وہ روزہ کی حالت میں نہ ہو۔ واللہ اعلم

جماع کے خوف کی وجہ سے جوان کو اجازت نہ ملی

۲۰۰۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُبَاشَرَةِ لِلصَّائِمِ فَرَخَّصَ لَهُ وَاَتَاهُ اٰخَرَ فَسَأَلَهُ فَنَهَاهُ وَ اِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَهُ شَیْخٌ وَاِذَا الَّذِیْ نَهَاهُ شَابٌّ ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۷۸۰/۲ حدیث رقم ۲۳۸۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے کی حالت میں مباشرت کے بارے میں سوال کیا یعنی مرد کا اپنی عورت سے بدن لگانا ۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی اور ایک دوسرا شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے مباشرت کے بارے میں پوچھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع کیا پس وہ شخص جس کو اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور وہ شخص جس کو اجازت نہیں دی تھی وہ جوان تھا۔ یہ حدیث ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روزے کی حالت میں (بیوی سے) مباشرت کے بارے میں سوال کیا"۔

① یہاں مباشرت سے مراد یہ لی گئی ہے کہ شرمگاہ کے علاوہ بیوی سے بغلگیر ہونا، (ہاتھ وغیرہ سے چھونا)۔ ② بوس وکنار کرنا۔

فرخص له واتاه اخر فسأل له : آپ نے اسے اس بارے میں اجازت دے دی۔ پھر ایک اور آدمی آیا، اس نے بھی وہی سوال پوچھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرما دیا۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی وہ بوڑھا آدمی تھا اور جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا وہ جوان تھا۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو حکمت کے موافق جواب دیا۔ کیونکہ بوڑھے کو شہوت کم آتی ہے، اس لئے اس سے فتنہ کا ڈر نہیں تھا، اسے اجازت دے دی۔ جب کہ نوجوان سے فتنہ وغیرہ کا ڈر تھا تو اہتماماً اُسے اس سے منع کر دیا۔

اور علماء نے نہی کے تنزیہی اور تحریمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ اور ابن ہمام نے اسے "جید" قرار دیا ہے۔

قصداً قے کرنے سے قضاء لازم آتی ہے

۲۰۰۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَرَعَهُ الْقَیْءُ وَهُوَ صَائِمٌ فَلَیْسَ عَلَیْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمْدًا فَلْیَقْضِ۔ (رواہ الترمذی وابوداود وابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب لا نعرفه الا من حدیث عیسٰی بن یونس وقال محمد یعنی البخاری لا اراہ محفوظا)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۷۷۶/۲۔ حدیث رقم ۲۳۸۰۔ والترمذی فی السنن ۹۸/۳ حدیث رقم ۷۲۰۔ وابن ماجه ۵۳۶/۱ حدیث رقم ۱۶۷۶۔ والدارمی ۲٤/۲ حدیث رقم ۱۷۲۹۔ واحمد فی المسند ٤۹۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص پر قے غلبہ کرے۔ یعنی خود ہی

آ جائے اور وہ روزے سے ہو۔ پس اس پر قضاء نہیں ہے اور جو شخص قصداً حلق میں انگلی ڈال کر قے لے آئے پس اس کو چاہیے کہ وہ روزہ قضا کرے۔ یہ امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کی ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے ہم نہیں جانتے اس کو مگر حدیث عیسیٰ بن یونس کی سند سے اور محمدؒ نے کہا یعنی بخاریؒ میں اس حدیث کو محفوظ گمان نہیں کرتا ہوں۔ یعنی یہ حدیث منکر ہے۔

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس روزہ دار کو خود بخود قے آ جائے، اس پر قضا نہیں ہے۔ یہاں پر لفظ "ذرعه"، ذال کے نقطے کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے غالب آ جانا اور نکلنے میں سبقت لے جانا۔ کیونکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ البتہ جو روزہ دار قصداً قے کرے۔ وہ قضاء روزہ رکھے۔ قے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے نکلنے کا سبب اختیار کرے یا ''قصداً'' سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی حرمت کا علم رکھتا ہو، اور خود مختار بھی ہو جیسا کہ ابن حجرؒ نے کہا ہے: اور ظاہر یہ ہے کہ یہاں بھولنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہمارا مذہب ہے۔ کیونکہ جہالت عذر نہیں ہے، اور اسی طرح خطاء اور اکراہ بھی۔

فلیقض : ابن ملکؒ اور اکثر نے کہا ہے۔ کہ اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ جب کہ شرح السنہ میں اہل علم نے اس حدیث کے ظاہر کو لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ جو قصداً قے لائے اس پر قضاء ہے اور جس کو خود بخود آ جائے، اس پر قضاء نہیں ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف نہیں کیا۔

ابن عباس اور عکرمہ نے کہا کہ روزہ کسی چیز کے داخل ہونے سے باطل ہوتا ہے۔ نہ کہ کسی چیز کے خارج ہونے سے۔ ابن ہمامؒ نے کہا: کہ ابویعلی موصلی نے اپنی مسند میں روایت بیان کیا ہے، **قال : حدثنا احمد بن منیع حدثنا مروان بن معاویة عن رزین البکری قال حدثتنا مولاة لنا یقال لها سلمی من بکر بن وائل أنها**'' کہ ہماری ایک لونڈی نے حضرت عائشہؓ سے سنا کہ انہوں نے کہا میرے پاس رسول اللہ ﷺ آئے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''**یا عائشة هل من کسرة؟ فأتته بقرص فوضعه علی فیه فقال : یا عائشة هل دخل بطینی منه شيء؟**'' ''اے عائشہ! کیا تمہارے پاس روٹی کا ٹکڑا ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس ایک روٹی کا ٹکڑا لائیں، تو آپ نے اُسے اپنے منہ پر رکھا اور فرمایا: اے عائشہ! کیا میرے پیٹ میں اس میں سے کوئی چیز داخل ہوئی ہے؟ اسی طرح روزے دار کا بوسہ ہے۔ روزہ تو کسی چیز کے داخل ہونے سے افطار ہوتا ہے نہ کہ خارج ہونے سے''۔

بعض اہل حدیث نے اس کے راوی ''مولاۃ'' کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔ اور بعض نے اس کے موقوف ہونے میں شک نہیں کیا۔ اور امام بخاریؒ نے اپنی بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ سے تعلیقاً نقل کیا۔ کہ انہوں نے کہا "**الفطر مما دخل ولیس مما خرج**"۔ کہ روزہ افطار کسی چیز کے داخل ہونے سے ہوتا ہے، نہ کہ خارج ہونے سے۔ اور امام عبدالرزاق نے ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ کہ وضوء کسی چیز کی کے خروج سے ہوتا ہے، نہ کہ دخول سے اور اسی طرح افطار کسی چیز کے دخول سے ہوتا ہے نہ کہ خروج سے اور یہی بات حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے۔ امام بیہقی نے کہا کہ اس کو ہر حال میں حدیث استقاء کے ساتھ مخصوص مانا جائے گا۔ جب کہ روزے کے افطار میں کسی چیز کے لوٹنے کا اعتبار ہے چاہے وہ چیز تھوڑی ہو اور

محسوس بھی نہ ہو۔

ابن ہمامؒ نے کہا: کہ اسے اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے، اور الفاظ ترمذیؒ کے ہیں۔ اور امام ابن ہمامؒ نے اس کو حسن غریب کہا ہے اور امام ترمذیؒ کے یہ الفاظ **"لا تعرفه"** ہم اسے نہیں جانتے، یعنی **هشام بن حسان عن ابن سرین عن ابی هریرة** کے طریق سے مرفوع (سوائے عیسیٰ بن یونس کے طریق سے) اور امام بخاریؒ نے کہا **(لا اراه محفوظا)** ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ یعنی میں اسے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اور امام طیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ 'ہُ' کی ضمیر حدیث کی طرف راجع ہے اور امام بخاری کے الفاظ کی تعبیر یہ ہوئی کہ یہ حدیث منکر ہے جب کہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ بخاری کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کو اس کی غرابت کی وجہ سے محفوظ نہیں جانتا اور راوی کی تصدیق کے بعد اس میں جرح نہیں کی جا سکتی اور یہ راوی شاذ مقبول ہے اور امام حاکمؒ اور ابن حبان نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا اور دار قطنیؒ نے اسے روایت کرنے کے بعد کہا ہے۔ کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ پھر عیسیٰ بن یونس کی متابعت کی حفص بن غیاث نے اور اسے ابن ماجہ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے، اور اس پر سکوت کیا ہے اور امام مالکؒ نے موطاً میں حضرت ابن عمرؓ سے پھر موقوفاً روایت کیا ہے اور نسائی نے اوزاعی کی حدیث سے ابو ہریرہؓ پر موقوف بیان کیا ہے۔ اور عبد الرزاق نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما پر موقوف قرار دیا ہے۔ اور ابن ماجہ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے: **"خرج في يوم كان يصومه فدعا باناء، فشرب فقلنا يا رسول الله هذا يوم كنت تصومه قال: أجل ولكن قيئت"**. کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے جس میں آپ روزہ رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگایا اور پی لیا، ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! یہ تو آپ کے روزے کا دن تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! لیکن میں نے قے کر دی تھی"۔ اس کو روزہ شروع کرنے سے پہلے پر محمول کیا جائے گا۔ یا پھر کمزوری لاحق ہونے پر۔ پھر اگر ان احادیث کے درمیان جن میں ہے کہ کسی چیز کے داخل ہونے سے روزہ ٹوٹتا ہے اور قے والی احادیث کے درمیان جمع کی صورت نکالی جائے تو قے والی احادیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قے کیے ذریعے جو چیز نکلتی ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ واپس ہو ہی جاتا ہے۔ چاہے وہ تھوڑا ہی واپس ہو۔ لہٰذا اس اعتبار سے روزہ ٹوٹتا ہے۔ اور رہی یہ بات کہ جس کو خود بخود قے آ جائے، تو اس میں بھی یہ بات ثابت ہے لیکن اس کو بھولنے پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا، جیسے بھول کر کھا' پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ایسا ہی خود بخود قے آنے پر بھی نہیں ٹوٹے گا، اور اس کو اکراہ اور خطاء پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

شمنیؒ نے کہا: کہ امام ابو یوسف کے نزدیک اگر وہ منہ بھر کر قے نہ کرے تو اس پر قضاء نہیں ہے، کیونکہ اس کو حکماً عدم خروج پر محمول کیا جائے گا۔ اور امام محمدؒ کے نزدیک مطلق قے کرنے پر قضاء ہے، کیونکہ حدیث مطلق ہے اور اس میں یہ قید نہیں ہے۔

معدان بن طلحه: (میم کے فتحہ کے ساتھ) سے روایت ہے کہ انہیں ابو درداء نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی جان بوجھ کر کیونکہ خود بخود آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) پھر آپ نے روزہ افطار کر دیا یعنی نفلی روزہ اور اس کو بیماری یا کمزوری کے عذر پر محمول کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ﴿**ولا تبطلوا اعمالكم**﴾ [محمد: ۳۳] کہ تم اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ معدان کہتے ہیں: کہ میں ثوبان سے ملا (یہ غلام تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر انہیں آزاد کر

دیا) دمشق کی مسجد میں (دمشق) دال کے کسرہ اور میم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اس کو بعض نے منصرف اور بعض نے غیر منصرف پڑھا ہے، مراد شام کی مسجد ہے، تو میں نے کہا کہ ابو درداء نے مجھے بیان کیا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے قے کی اور روزہ افطار کر دیا تو ثوبان نے کہا کہ ابو درداء نے سچ کہا اور میں نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر وضوء کا پانی انڈیل رہا تھا۔ (وضوعه: کو واوَ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے، مراد وضو کا پانی ہے۔

امام میرکؒ نے کہا: کہ اس سے امام ابوحنیفہ، امام احمد، اسحاق، ابن المبارک اور ثوری نے دلیل پکڑی ہے کہ قے ناقض وضو ہے۔ جب کہ امام شافعیؒ نے اسے منہ اور چہرے کے دھونے یا استحباب وضو پر محمول یا ہے اور ان کی دوسری بات پہلی سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جب شارع کے کلام کو شرعی معنی پر محمول کرنا ممکن ہو تو شرعی کو چھوڑ کر لغوی معنی کی طرف جانا درست نہیں، اور اگر قرینہ سیاق تقاضا کرتا کہ یہاں ماءِ مصبوب چہرے کی صفائی کے لئے ہے تو ہاں! ایسی صورت میں سابق وضو کے ثبوت پر نقض کے استدلال پر توقف کیا جاتا، جب کہ اصل آپ کا فعل قرینہ سے خارج ہے کہ اُسے استحباب پر محمول کیا جائے۔ جیسا کہ اس بارے میں اصول فقہ میں اختلاف مذکور ہے۔

ابن الملکؒ نے کہا کہ کہا گیا ہے کہ ابو درداء کی روایت نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی قے کی حکایت ہے، کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ نے کس وجہ سے روزہ کو افطار کیا، قے کی وجہ سے یا اس کے علاوہ۔ جب کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حدیث کے ان الفاظ "من ذرعه القیء......" سے معلوم ہوتا ہے کہ قے افطار کا سبب نہیں، بلکہ سبب قے کا واپس لوٹنا یا چہرے کو دھوتے وقت پانی کا پیٹ میں جانا ہے۔

صدق: ثوبان کا یہ قول قے اور افطار کی تصدیق میں ہے نہ کہ افطار قے کی وجہ سے ہے۔ اور میرکؒ نے کہا کہ اسے نسائی نے بھی روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ حسین معلم نے اس حدیث کو عمدہ کیا اور حسین کی اس باب میں باقیوں کی نسبت صحیح ترین یہ حدیث ہے۔

قصداً قے کر کے روزہ توڑ ڈالنے سے قضا آتی ہے

۲۰۰۸: وَعَنْ مَعْدَانَ ابْنِ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ فَلَقِيْتُ ثَوْبَانَ فِيْ مَسْجِدِ دِمَشْقٍ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ صَدَقَ وَاَنَا صَبَبْتُ لَهٗ وُضُوْءَهٗ۔ (رواہ ابوداود والترمذی والدارمی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/۷۷۷ حدیث رقم ۲۳۸۱۔ والترمذی ۱/۱۴۲ حدیث رقم ۸۷۔ والدارمی ۲/۲۴ حدیث رقم ۱۷۲۸۔ واحمد فی المسند ۶/۴۴۳۔

ترجمہ: حضرت معدان بن طلحہؓ سے روایت ہے کہ ابوداوٗدؓ نے ان کو یہ حدیث بیان کی کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے قے کی۔ پھر افطار کیا پس معدان نے کہا میں ثوبانؓ سے دمشق کی مسجد میں ملا اور میں نے کہا کہ ابوداوٗد نے مجھ کو حدیث بیان کی کہ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے قے کی پھر افطار کیا فرمایا ابوداوٗدؓ نے سچ کہا ہے اور میں نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لیے وضو کے لئے پانی ڈالا

تھا۔ان کے وضو کا۔اس کو ابوداؤد' ترمذی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

روزے دار کو مسواک کرنی جائز ہے

۲۰۰۹ :وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ مَا لَا اُحْصِيْ يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ۔

(رواه الترمذی وابو داود)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۷٦۸/۲ حديث رقم ۲۳٦٤۔ والترمذی ۱۰٤/۳ حديث رقم ۷۲۵۔ واحمد في المسند ۴٤۵/۳۔

ترجمہ:حضرت عامر بن ربیعہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو روزے کی حالت میں اس قدر مسواک کرتے ہوئے دیکھا کہ میں شمار نہیں کرسکتا۔اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح:عن عامر بن ربيعة قال رأيت النبى ﷺ ما لا احصى :یعنی میں نے آپ کو مسواک کرتے ہوئے اتنی کثرت سے دیکھا کہ اس کی تعداد کو شمار میں نہیں لاسکتا۔يتسوك : یہ دوسرا مفعول ہے،اور حقیقت میں یہ خبر ہے اور ''ما'' موصولہ ہے،اور ''لا احصٰی''اس کی صفت ہے اور یہ ''يتسوك'' کا ظرف ہے،جس کا معنی یہ ہوا کہ آپ کئی بار مسواک کرتے تھے جس کا شمار میری قدرت میں نہیں ہے یہ امام طیبی ؒ کا قول ہے۔اور میرکؒ نے کہا کہ شاید انہوں نے رؤیت کو علم کے معنی پر محمول کیا ہے اس لئے ''يتسوك'' کو دوسرا مفعول بنایا ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ابصار کے معنی میں ہو تو ایسی صورت میں ''يتسوك'' حال ہوگا۔

وهو صائم : یہ بھی اسی طرح یا تو حال مترادفہ ہے یا حال متداخلہ، واللہ اعلم۔شارح کہتے ہیں کہ میں کہتا ہوں یہ احتمال اُس مقال سے زیادہ واضح ہے۔اور تداخل حال میں معین ہے۔مظہر نے کہا کہ پورے دن میں روزے دار کے لئے مسواک کرنا مضر نہیں بلکہ یہ اکثر اہل علم کے نزدیک سنت ہے،جیسا کہ امام مالک اور ابوحنیفہؒ کیونکہ یہ منہ کی صفائی کا ایک ذریعہ ہے۔اور ابن عمر ؓ زوال کے بعد مسواک کو ناپسند کرتے تھے،اس لئے کہ صائم کے منہ کی بو عبادت کا اثر ہے،اور یہ خوشبو اسی وقت آتی ہے جب کہ معدہ کھانے سے خالی ہو اور معدہ غالباً زوال کے بعد ہی خالی ہوتا ہے اور عبادت کے اثر کو زائل کرنا یہ مکروہ ہے اور یہی مسلک امام شافعیؒ اور احمدؒ کا ہے۔

شمنیؒ نے امام مالکؒ کے قول کو نقل کرتے ہوئے کہا کہ روزے دار کے لئے تر وتازہ مسواک کا استعمال' چاہے وہ دن کے پہلے حصہ میں ہو یا آخری میں' مکروہ نہیں ہے اور کہا کہ امام ابو یوسف تر وتازہ مسواک کو ناپسند کرتے تھے اور امام شافعیؒ زوال کے بعد اس لئے کہ اس سے خلوف زائل ہو جاتی ہے،جس کی تعریف آپ ﷺ نے ان الفاظ سے کی ہے: ''لخلوف فم الصائم اطيب عند الله من ريح المسك'' کہ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کے نزدیک کستوری سے بھی عمدہ ہے۔شارح کہتے ہیں: کہ ہماری دلیل وہ روایت ہے جسے ابن ماجہ اور دارقطنی نے حضرت عائشہ ؓ کے طریق سے بیان کیا ہے، کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ روزہ دار کی بہترین خصلتوں میں سے مسواک ہے''۔

الخلوف : صحیح قول کے مطابق خاء کے ضمہ اور نقطہ کے ساتھ ہے جس کا معنی معدہ کا خالی ہونے سے منہ کی بو کا تبدیل ہونا ہے، اور یہ خوشبو وخلوف مسواک کے ساتھ بھی باقی رہتی ہے جیسا کہ ابن ہمامؒ نے کہا ہے کہ مسواک تو صرف اس کی زردی کو دانتوں سے زائل کرتی ہے جب کہ مسواک کا کھانے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس وجہ سے سبب اٹھ جائے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: "لخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك".اور ہمارے پاس وہ روایت بھی موجود ہے جو کہ ابن ماجہ اور دارقطنی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے' فرماتی ہیں: کہ رسول اللہ نے فرمایا: "من خير خصال الصائم السواك" اور اسی لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہماری بات کی تائید کرتی ہے، جسے طبرانی نے عبدالرحمٰن بن غنم کے طریق سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: کہ میں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روزے کی حالت میں مسواک کرنے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: کہ ہاں! کر سکتے ہو تو میں نے کہا کہ پورے دن میں، انہوں نے کہا: ہاں! پورے دن میں (چاہے صبح کرو یا شام)، میں نے کہا: کہ لوگ تو شام کو یعنی زوال کے بعد ناپسند کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا"لخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك".کہ روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کو کستوری سے بھی زیادہ پسند ہے۔تو معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سبحان اللہ! یقیناً آپ نے ان کو مسواک کرنے کا حکم دیا اور آپ جانتے تھے کہ مسواک کرنے سے روزے دار کے منہ کی خوشبو باقی رہے گی' ختم نہیں ہوگی۔اور آپ ان کو ایسا حکم دینے والے نہیں' جس میں جان بوجھ کر وہ اپنے مونہوں کو بدبودار کرنے والے ہوں اور ان کے لئے اس میں خیر وبرکت نہ ہو بلکہ شر ہی شر ہو مگر جو اس مصیبت میں مبتلا کر دیا گیا ہو اور اس کے لئے کوئی اور راستہ نہ ہو۔

شارح کہتے ہیں کہ اسی طرح اللہ کے راستے میں غبار آلود ہونا ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "من اغبرت قدماه في سبيل الله حرمه الله على النار".اس میں اجر اسی کو ملے گا جو اس کی طرف مجبور ہوتا ہے، اور نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتا۔اور جو اپنے آپ کو جان بوجھ کر مصیبت میں ڈالتا ہے، تو اس کے لئے کوئی اجر نہیں اور اسی طرح اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی آدمی آپ کے اس قول "كثرت الخطأ الى لمساجد" کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو مسجد کی طرف بہت زیادہ چکروں کی تکلیف میں مبتلا کر لیتا ہے اور اسی طرح جو آدمی اس حدیث "من شاب شيبة في الاسلام" کو دیکھتا ہوا اپنے آپ کو بوڑھا بنانے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے تو کیا اس کو اس پر اجر ملے گا؟ نہیں! بلکہ اجر تو اس کو ملے گا جو ان میں مبتلا کر دیا جائے۔

اور ہمارے مطلوب ومقصود پر ضعیف احادیث بھی ہیں، جن میں سے کچھ کو ہم بطور استشہاد اور تقویت ذکر کرتے ہیں، اگرچہ اثبات میں ان سے حجت نہیں لی جا سکتی۔ان میں سے جیسے بیہقی نے روایت کیا ہے ابراہیم بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے کہا: ہمیں اسحاق الخوارزمی نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے عاصم احول سے سوال کیا کہ روزے دار تازہ مسواک کر سکتا ہے، انہوں نے کہا: کہ ہاں! کیا تو اس کی رطوبت کو پانی کی رطوبت سے زیادہ شدید جانتا ہے، میں نے کہا کہ دن کے اول اور آخر دونوں میں کر سکتا ہے، انہوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا اللہ تجھ پر رحم کرے یہ کس نے بیان کی ہے انہوں نے کہا: عن انس عن النبي ﷺ اور ابن حبان نے ابن عمر سے روایت کی ہے: "كان النبي ﷺ يستاك آخر النهار".کہ آپ ﷺ دن کے آخری حصہ میں مسواک کیا کرتے تھے"۔اور وہ ابن عمر کے اقوال میں سے صحیح قول ہے۔ہم کہتے ہیں: کہ ضعیف روایات کے

باوجود ابن عمر سے اس کا ثبوت کافی ہے کیونکہ عمومی احادیث مسواک کی فضیلت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اور رہی طبرانیؒ کی وہ روایت جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اذا صمتم فاستاكوا بالغدوة، ولاتستاكوا بالعشى فان الصائم اذا يبست شفتاه كانت له نوراً يوم القيامة"۔

کہ صبح کے وقت مسواک کرو اور شام کو نہ کرو کیونکہ روزے دار کے جب دونوں ہونٹ خشک ہوتے ہیں تو قیامت کے دن ان کے لئے نور ہوگا۔ یہ روایت ضعیف ہے اور ہماری سابقہ روایتوں کے مدمقابل نہیں ہو سکتی۔

اور اس سے ابن حجرؒ کے قول کے بطلان کا بھی پتہ چلتا ہے، جو کہ انہوں نے کہا کہ ابوحنیفہؒ اور مالکؒ کے لئے زوال سے قبل مسواک کی عدم کراہت کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مانع دلیل کا محتاج نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب کہ شارع سے مطلق احادیث وارد ہوں جو کہ قبل از زوال اور بعد از زوال پر شامل ہوں اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خود اس پر عمل اور دوسروں کو فتویٰ دینا بھی وارد ہے کہ زوال کے بعد مسواک جائز ہے۔ تو ان سب کے باوجود حدیث خلوف امام شافعیؒ اور ان کے ساتھیوں کے لئے بعد از زوال مسواک نہ کرنے پر کیسے درست دلیل بن سکتی ہے اور کس طرح مطلق کو بغیر دلیل صریح اور تعلیل صحیح کے ماقبل از زوال کی طرف پھیرا جا سکتا ہے۔

اور امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے، اور اسی طرح اس کو امام احمد اور ابن خزیمہ نے بھی روایت کیا ہے۔

روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت ہے

۲۰۱۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اشْتَكَيْتُ عَيْنِيَّ اَفَأَكْتَحِلُ وَاَنَا صَائِمٌ قَالَ نَعَمْ۔ (رواه الترمذی وقال ليس اسناده بالقوی وابو عاتكة الراوی يضعف)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۷۷۹/۲ حديث رقم ۲۳۷۸۔ والترمذی ۱۰۵/۳ حديث رقم ۷۲۶۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میری آنکھیں دکھتی ہے کیا میں سرمہ لگاؤں حالانکہ میں روزے دار ہوں؟ فرمایا کہ ہاں۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے اور ابو عاتکہ اس حدیث کے راوی ضعیف ہیں۔

تشریح: وعن انس قال جآء رجل الى النبى ﷺ قال : اشتكيت عينى : عینی کو تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، یعنی میں نے اپنی آنکھوں کی درد کی شکایت کی۔ افاكتحل وانا صائم : یعنی روزے کی حالت میں۔

قال : نعم : اس میں روزے دار کے لئے بلا کراہت سرمہ ڈالنا جائز ہے، اور یہی اکثر کا قول ہے، جب کہ امام مالک، احمد اور اسحاق اس کو مکروہ جانتے ہیں، اس کو میرکؒ نے نقل کیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اختلاف اس بنا پر ہو جب کہ عذر کی وجہ سے نہ ڈالا جائے اور مظہر نے کہا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک روزے دار کو سرمہ لگانا مکروہ نہیں ہے، اگرچہ اس کا ذائقہ حلق میں ہی ظاہر ہو جائے۔ لیکن امام احمد اسے مکروہ جانتے ہیں۔

اور اسی طرح کہا کہ اس باب میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے۔ اور اس کو امام میرکؒ نے نقل کیا ہے۔ **وابو عاتكة الراوي يضعف** : ابن ہمام نے کہا کہ اس کے ضعف پر اجماع ہے۔ اور امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: "**اكتحل النبي ﷺ وهو صائم**"۔ کہ نبی ﷺ نے روزے کی حالت میں سرمہ لگایا"۔ اور اسی طرح اس کی سند میں بھی ایسا راوی ہے جس کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے، اور بیہقی نے ایک مرفوع روایت ضعیف سند سے بیان کی ہے۔ اور اسی طرح ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوف سند نقل کی ہے۔ تو اس طرح یہ مختلف طرق کی روایات جن میں سے ایک بھی حجت کے قابل نہیں ہے، ان تمام مجموع طرق کو اکٹھا کر کے حجت لی جا سکتی ہے۔

اور رہی وہ حدیث جو کہ ابوداؤد میں ہے: "**انه امر بالأثمد عند النوم وقال ليتقه الصائم**"۔ کہ آپ ﷺ نے سوتے وقت اثمد (سرمہ) لگانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ روزے دار اس سے بچے"۔ یہ ضعیف ہے۔ ابن حجرؒ نے کہا: اور اس کی موافقت کرتی ہے بیہقی اور حاکمؒ کی روایت: "**أنهٗ عليه الصلاة السلام كان يكتحل بالأثمد وهو صائم**"۔ "کہ آپ ﷺ روزے کی حالت میں اثمد لگایا کرتے تھے"۔ لیکن یہ بھی مجموعی طور پر ضعیف ہے اور امام ترمذی نے کہا: کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: "**خرج علينا رسول الله ﷺ وعيناه مملوئتان من الكحل ولك في رمضان وهو صائم**" کہ نبی ﷺ ہمارے پاس آئے اور آپ کی دونوں آنکھیں سرمہ سے بھری ہوئی تھیں، اور یہ روزے کی حالت میں رمضان کا واقعہ ہے"۔ لیکن اس کی سند میں بھی مختلف فیہ راوی ہیں، جن کی ثقاہت پر جرح کی گئی ہے۔

غسل برودت جائز ہے

۲۰۱۱: وَعَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ يَصُبُّ عَلٰى رَأْسِهِ الْمَاءَ وَهُوَ صَائِمٌ مِّنَ الْعَطْشِ اَوْمِنَ الْحَرِّ۔ (رواه مالك وابو داود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۲/۷۶۹ حديث رقم ۲۳۶۵۔ ومالك في الموطأ ۱/۲۹۴ حديث رقم ۲۲ من كتاب الصيام۔ واحمد في المسند ۳/۴۷۵۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو عرج میں روزے کی حالت میں پیاس کو دور کرنے کے لیے یا گرمی کو دفع کرنے کے واسطے اپنے سر پر پانی ڈالتے ہوئے دیکھا۔ یہ روایت مالکؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: **وعن بعض اصحاب النبي** : "المواہب" میں کہا: کہ صحابی کی جہالت نقصان نہیں دیتی، اس لئے کہ صحابہ سب کے سب عادل ہیں۔ **لقد رأيت النبي ﷺ بالعرج** : عین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ، مکہ اور مدینہ کے درمیان جگہ ہے، اور بعض نے کہا کہ مدینہ میں ہے، اور ابن حجرؒ نے کہا: کہ مدینہ سے قریب ایک محل ہے۔ **يصب على رأسه الماء وهو صائم من العطش أو من الحر** : یہ راوی کی طرف سے شک ہے، یعنی ان دونوں میں سے کسی ایک سے بچاؤ

کے لیے آپ نے سر پر پانی ڈالا۔ ابن الملکؒ نے کہا: کہ اس میں دلیل ہے کہ روزے دار کا سر پر پانی ڈالنا مکروہ نہیں، اور نہ ہی پانی میں غوطہ لگانا، اگرچہ اس کی ٹھنڈک اندرونی حصہ میں ہی کیوں نہ ظاہر ہو جائے۔

ابن ہمام نے کہا: کہ اگر روزے دار سرمہ لگا لے، تو اس کا ذائقہ حلق تک پہنچے یا نہ پہنچے روزہ افطار نہیں ہوگا۔ کیونکہ جو چیز حلق میں موجود ہے اس کا اثر مسام سے داخل ہوا ہے، اور روزہ اس وقت افطار ہوگا جب کہ کوئی چیز مدخل اور مخرج یعنی کھانا کھانے کی جگہ یا نکلنے کی جگہ سے داخل ہو، نہ کہ پورے جسم کے مسام سے اور اسی لئے اس پر اتفاق ہے کہ پانی کے اندر روزہ نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس کی ٹھنڈک باطن میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے پانی میں داخل ہونے اور اپنے اوپر پانی سے تر کپڑا لپیٹنے کو اس لئے مکروہ جانا ہے، کیونکہ اس میں عبادت کو بجالانے میں تنگی کا اظہار ہوتا ہے، نہ کہ یہ چیزیں روزہ کے افطار کے قریب ہیں۔ پس امام صاحب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو آلام و مصائب کے وقت عاجزی وانکساری اور نقصان کے دفاع میں ارتکابِ حکمت پر محمول کیا ہے، اور مالک کے فرائض کو بجالانے میں ان اسباب کو بطور استعانت استعمال کیا ہے اور اپنی امت پر نرمی اور آسانی کرنے کی وجہ سے کہ وہ بھی ان آسانیوں میں میری مشارکت کر لیں، اس فعل سے اشارہ دیا ہے اور حاصل کلام یہ ہے کہ امام صاحب کے کلام کو کراہت تنزیہہ اور خلاف اولیٰ پر محمول کیا جائے گا، اور رہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل تو یہ جواز اور اظہار عجز کے لئے ہے، تا کہ امت کے کمزور لوگوں پر رحم ہو جائے۔

یعنی انہوں نے ابوبکر بن عبداللہ کے طریق سے اور انہوں نے آپ کے اصحاب سے بیان کیا ہے اور میرکؒ نے کہا: کہ اسے نسائی نے بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ اس کو مالک، ابوداؤد وغیرھما نے طرق صحیح سے بیان کیا ہے، تو یہ بات غیر صحیح ہے کیونکہ اس کے طرق کا انحصار ایک ہی راوی یا سند پر ہے۔

روزے کی حالت میں سینگی لگانے کی اجازت ہے

۲۰۱۲: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ رَجُلاً بِالْبَقِيْعِ وَهُوَ يَحْتَجِمُ وَهُوَ اٰخِذٌ بِيَدِيْ لِثَمَانِيْ عَشَرَةَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ فَقَالَ اَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُوْمُ (رواه ابوداود وابن ماجة والدارمی) قَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ مُحِي السُّنَّةِ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَتَاَوَّلَهُ بَعْضُ مَنْ رَخَّصَ فِي الْحِجَامَةِ اَيْ تَعَرَّضَا لِلْاِفْطَارِ الْمَحْجُوْمِ لِلضُّعْفِ وَالْحَاجِمِ لِاَنَّهُ لَا يَاْمَنُ مِنْ اَنْ يَصِلَ شَيْءٌ اِلٰى جَوْفِهِ بِمَصِّ الْمَلَازِمِ۔

اخرجه ابوداؤد في السنن ۷۷۲/۲ حديث رقم ۲۳۶۹۔ وابن ماجه ۵۳۷/۱ حديث رقم ۱۶۸۱۔ والدارمی ۲۵/۲ حديث رقم ۱۷۳۰۔ واحمد في المسند ۱۲۳/٤۔

ترجمہ: حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی اٹھارہ تاریخ کو جنت البقیع (مدینے کا قبرستان ہے) میں ایک ایسے شخص کے پاس آئے جو بھری ہوئی سینگیاں کھنچوا رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرا ہاتھ میں

پکڑے ہوئے تھے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سینگی کھینچنے والے اور کھنچوانے والے دونوں نے روزہ توڑ ڈالا۔ یہ روایت ابوداؤد' ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کی ہے۔ شیخ امام محی السنہؒ نے فرمایا کہ جو علماء کرام حالت صوم میں سینگی کھینچنے اور کھنچوانے کے قائل ہیں' انہوں نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ سینگی والا کمزوری کی وجہ سے روزہ توڑنے کے قریب ہو جاتا ہے اور سینگی کھینچنے والا اس وجہ سے کہ ممکن ہے کہ اس عمل کے دوران خون کا کوئی حصہ اس کے جسم میں چلا گیا ہو افطار کے قریب ہو جاتا ہے

تشریح: وعن شداد بن اوس ان رسول الله ﷺ اتى رجلا : یعنی آپ ایک آدمی کے قریب سے گزرے۔ بالبقیع : یعنی جنت البقیع میں جو کہ مدینہ کا مشہور قبرستان ہے۔ وھو : یہاں ھو سے مراد آدمی ہے۔ یحتجم وھو : اور یہاں ھو سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آخذ : فاعل کا صیغہ ہے۔ بیدی : کہ وہ آپ کے بہت ہی قریب تھا اس کی طرف اشارہ ہے۔ لثمانی عشرۃ : شین کے سکون کے ساتھ اور مکسور پڑھا گیا ہے۔ خلت : یعنی گزر گئے۔ من رمضان : یہ راوی کے کمال حفظ پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے مکان، زمان، اور اس کی حالت سب کچھ ضبط کر کے اسے بیان کر دیا۔

فقال : اور بعض نسخوں میں صرف قال ہے۔ افطر الحاجم والمحجوم : طیبی رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر حدیث پر امام احمد اور اسحاق کا عمل ہے، اور ابن ہمام نے کہا کہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے، اور یہ معارض ہے، پھر اس کی تاویل یہ ہے کہ وہ دونوں غیبت کر رہے تھے یا یہ کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

اور ابن ہمام کہتے ہیں: کہ اسے نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسے صحیح کہا ہے۔ قال الشیخ الامام محیی السنۃ : یعنی صاحب المصابیح۔ رحمۃ الله علیه : اور صحیح نسخے میں رحمه الله ہے۔ وتأویله : یعنی اس حدیث کی۔ (بعض من رخص في الحجامة : یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے کہا یعنی (تعرضًا للافطار) جیسا کہ کہا جاتا ہے (هلك فلان) کہ فلاں ہلاک ہو گیا، یعنی ہلاکت کے درپے ہوا۔ المحجوم للضعف : یعنی پچھنے کی کمزوری کی وجہ سے، اور یہ کمزوری اسے افطار پر متحمل کرتی ہے۔

والحاجم لأنه لا یأمن من ان یصل شيء : یعنی خون میں سے۔ الی فه یمص الملازم : اپنے مفعول کی طرف مصدری اضافت کے ساتھ اور یہ میم کے فتحہ کے ساتھ، مِلزمة کی جمع ہے اس کا معنی حاجم کی بوتل وغیرہ جس کے اندر خون جمع ہو جاتا ہے، اس کو ملزمة اس لئے کہا کیونکہ یہ جسم پر چمٹ کر اس کو قبض کر لیتی ہے۔ میرکؒ نے کہا کہ اس میں ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں یعنی حاجم اور محجوم کے پاس سے شام کے وقت گزرے اور ان سے یہ بات کہی، اور اس سے ان دونوں کو معذور جانا، کیونکہ وہ شام کر چکے تھے، یا افطار کے وقت میں داخل ہو چکے تھے۔ اور ایک اور وجہ ہے وہ یہ کہ آپ ان دونوں کے قریب سے گزرے اور وہ غیبت کر رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فقال افطرا. أي بطل اجرهما بالغيبة". انہوں نے افطار کر لیا یعنی ان کا اجر افطار کی طرح غیبت سے باطل ہو گیا۔ اور اسے امام بیہقی نے بھی بعض طرق سے روایت کیا ہے اور بطلان سے مراد اس کا کمال اجر ہے، نہ کہ اصل ثواب جیسا کہ گزر چکا ہے۔

سید علی نے کہا: کہ حدیث کے ظاہر کی طرف ائمہ میں سے ایک جماعت حاجم اور محجوم کے روزہ میں افطار کی طرف گئی ہے،

ان میں سے امام احمدؒ اور اسحاقؒ ہیں، اور مسروق، حسن بصری، اور ابن سیرین یہ لوگ روزے دار کے لئے سینگی لگوانے کو مکروہ جانتے ہیں اور ان کے ہاں سینگی سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، اور انہوں نے حدیث کو تشدید پر محمول کیا ہے۔ اور یہ کہ ان دونوں نے اپنے روزے کے اجر کو کم اور اس مکروہ فعل کے ارتکاب سے باطل کر دیا ہے اور اکثر اہل علم نے یہ کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت ثابت ہے: "احتجتم وهو محرم، واحتجم وهو صائم"۔ "کہ آپ نے احرام اور روزے کی حالت میں سینگی لگوائی ہے"۔ تو پھر لگوانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اسی کی طرف مالک، شافعیؒ اور اصحابہ ابوحنیفہؒ گئے ہیں۔ اور انہوں نے افطر کا معنی تعرض للافطار سے کیا ہے، جیسا کہ متن میں اس کی شرح موجود ہے۔

اور بعض علماء نے یہ بات ذکر کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جس میں آپ نے پچھنے لگوائے یہ حجۃ الوداع ۱۰ ہجری کا واقعہ ہے جب کہ حدیث "افطر الحاجم والمحجوم" فتح مکہ ۸ ہجری کا واقعہ ہے اور رہی شداد بن اوس کی حدیث جس میں ہے کہ آپ نے یہ بات مدینہ میں کہی تھی، تو اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ بعض دفعہ آپ نے یہ مکہ میں کہی اور بعض دفعہ مدینہ میں اور روزہ کی حالت میں آپ کے پچھنے لگوانے کا واقعہ حجۃ الوداع کا ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ جعفر بن ابی طالب نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اس نے افطار کر دیا پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگی لگوانے کی اجازت دے دی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی سینگی لگواتے تھے۔ امام دار قطنی نے کہا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور میں اس کی کوئی علت نہیں جانتا۔ حازمی نے کہا کہ اس میں پہلی حدیث کے منسوخ ہونے کی تصریح ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا: کہ اس سے متعلقہ ٹکڑے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حدیث ثوبان کو روایت کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس آئے وہ رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ: "أفطر الحاجم والمحجوم". پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں نے افطار کر دیا۔ اسے امام حاکم اور ابن حبان نے روایت کیا ہے، اور دونوں نے صحیح کہا ہے، اور مستدرک میں امام احمد سے نقل کیا ہے، کہ انہوں نے کہا کہ اس باب میں یہ صحیح ترین روایت ہے پھر حدیث سابق کو ذکر کیا اور پھر کہا کہ امام ترمذیؒ نے اسے اپنی علل الکبری میں امام بخاری سے نقل کیا ہے، کہ انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک دونوں روایتیں یعنی ثوبان اور شداد کی صحیح ہیں اور یہی قول علی ابن المدینی سے بھی ذکر کیا ہے، اور اسی طرح امام ترمذی اسی حدیث کو (افطر الحاجم والمحجوم) کو رافع ابن خدیج کے طریق سے نقل کرنے کے بعد صحیح کہا ہے، اور اس کے اس سند کے علاوہ بہت سارے طرق ہیں، اور اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کو جب ابن معین کی یہ بات پہنچی کہ انہوں نے اس کو ضعیف، مضطرب کہا ہے اور یہ کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، تو امام احمد رحمہ اللہ نے کہا کہ انہوں نے بے تکی اور بے دلیل بات کہی۔ اور بعض حفاظ نے کہا کہ یہ متواتر ہے، اور ان میں سے بعض نے کہا کہ جو ابن معین نے کہا، وہ بھی بعید نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے مسند احمد، طبرانی اور امام نسائی کی سنن الکبری دیکھئے۔

اور جو لوگ سینگی سے روزہ نہ ٹوٹنے کے قائل ہیں، انہوں نے دو جواب دیئے ہیں:

① انہوں نے اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور اس حوالے سے بخاری کی یہ روایت ذکر کی ہے، جس میں ابن

عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: کہ "ان النبی ﷺ احتجم وهو محرم واحتجم وهو صائم" اور اسی طرح دارقطنی کی روایت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کہ سب سے پہلے سینگی کو میں ناپسند کرتا تھا کیونکہ حضرت جعفر بن ابی طالب نے روزے کی حالت میں سینگی لگوائی اور نبی اکرم ﷺ ان کے قریب سے گزرے، تو آپ نے فرمایا: "افطرا هذان ثم رخص النبی بعد ذالك فی الحجامة للصائم". کہ ان دونوں نے روزے کو افطار کرلیا، پھر آپ نے اس کے بعد روزے دار کو سینگی لگوانے کی اجازت دے دی، اور اسی لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ روزے کی حالت میں خود بھی سینگی لگواتے تھے۔ اور دارقطنی نے کہا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور میرے نزدیک اس میں کوئی علت نہیں ہے۔ اور اسی طرح جو روایت نسائی نے ابوسعید الخدری کے طریق سے ذکر کی ہے: "کہ رسول اللہ ﷺ نے روزے کی حالت میں بوسہ لینے اور سینگی لگوانے کی اجازت دی ہے"۔ اور اسی طرح طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے طریق سے روایت بیان کی ہے "کہ رسول اللہ ﷺ نے خود "افطر الحاجم والمحجوم" کہنے کے بعد سینگی لگوائی اور اسی طرح مسند ابوحنیفہ میں بھی ابوسفیان طلحہ بن نافع عن انس کے طریق سے یہی حدیث: "احتجم النبی ﷺ بعد ما قال :...... " مروی ہے جو کہ صحیح ہے اور اس طلحہ کو امام مسلم وغیرہ نے حجت مانا ہے، اور رہی یہ روایت "کہ آپ ﷺ نے احرام اور روزے کی حالت میں سینگی لگوائی"۔ جس کو ابن حبان وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے نقل کیا ہے تو اس کی سند بھی واضح ہے اور تاویل بھی، وہ یہ کہ آپ سفر تو احرام کی حالت میں ہی کرتے تھے، تو مسافر کے لئے تو سفر شروع کرنے کے بعد افطار کرنا مباح ہو جاتا ہے۔ اور اس کا اعتراف امام شافعیؒ نے بھی کیا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہی ابن خزیمہ کا جواب ہے۔

یا یہ کہا آپ نے غروب ہونے کے ساتھ ہی سینگی لگوائی جیسا کہ ابن حبان نے کہا ہے اور ابوزبیر عن جابر کے طریق سے روایت کرتے ہیں: "أنه علیه الصلاة السلام أمر أبا طیبة أن یاتیه مع غیوبة الشمس فأمره أن یضع المحاجم مع افطار الصائم فحجمه ثم سأله کم خراجك؟ قال صاعان فوضع عنه صاعًا"۔ "کہ آپ نے ابوطیبہ کو سورج کے غروب ہوتے ساتھ ہی آنے کا حکم دیا اور انہیں روزے کے افطار ہوتے ہی سینگی کا آلہ رکھنے کا حکم دیا، تو اس نے آپ کو سینگی لگا لی، تو پھر آپ نے پوچھا کہ تیری کتنی مزدوری ہے، اس نے کہا کہ دو صاع تو آپ نے اس سے ایک صاع کم کروایا"۔

اور دوسری تاویل کہ اس سے مراد روزہ کا اجر ختم ہو جانا ہے تو اس کا سبب ان دونوں کی غیبت کرنا تھا جیسا کہ بزار نے ذکر کیا ہے، اس لئے کہ یہ الفاظ ثوبان کی روایت کے آخر میں یا بعد میں وارد ہوئے ہیں، جیسا کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "انما قال رسول اللهﷺ افطر الحاجم والمحجوم لانهما کانا یغتابان" آپ نے اس لئے کہا کہ حاجم اور محجوم کا روزہ افطار ہو گیا کیونکہ وہ دونوں غیبت کر رہے تھے۔ جیسا کہ عقیلی نے اپنی کتاب "الضعفاء" میں عبداللہ بن مسعودؓ کے طریق سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ دو آدمیوں پر سے گزرے ان میں سے ایک دوسرے کو سینگی لگا رہا تھا، اور ایک غیبت کر رہا تھا اور دوسرا اسے منع نہیں کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "افطر الحاجم والمحجوم" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ یہ آپ نے سینگی کی وجہ سے نہیں کہا بلکہ غیبت کرنے کی وجہ سے کہا۔ لیکن اس میں اضطراب ہونے کی وجہ سے اسے معلول قرار دیا گیا ہے کیونکہ سینگی لگوانے سے منع اس لئے کیا کہ کہیں روزے داروں پر سینگی کی وجہ سے کمزوری نہ آ جائے۔

محقق کا مختصر کلام مکمل ہوئی۔

رمضان کا روزہ قصداً افطار کرنے کا بہت بڑا نقصان ہے

۲۰۱۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ افْطَرَ يَوْمًا مِّنْ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ رُخْصَةٍ وَّلَا مَرَضٍ لَمْ يَقْضِ عَنْهُ صَوْمَ الدَّهْرِ كُلِّهِ وَاِنْ صَامَهُ (رواه احمد والترمذی وابو داود وابن ماجة والدرمی والبخاری فی تر جمة باب) وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ سَمِعْتُ مُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِیَّ يَقُوْلُ اَبُو الْمُطَوِّسِ الرَّاوِیْ لَا اَعْرِفُ لَهُ غَيْرَ هٰذَا الْحَدِيْثِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۰/۴۔ تعلیقاً باب اذا جامع فی رمضان من کتاب الصیام۔ وابوداوٗد فی السنن ۷۸۸/۲ حدیث رقم ۲۳۹۶۔ والترمذی فی السنن ۱۰۱/۳ حدیث رقم ۷۲۳۔ وابن ماجه ۵۲۵/۱ حدیث رقم ۱۶۷۲۔ والدارمی ۱۸/۲ حدیث رقم ۱۷۱۴۔ واحمد فی المسند ۳۸۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص رمضان کے ایک دن بھی بغیر رخصت کے اور بغیر مرض کے قصداً افطار کرے۔ تمام عمر کا روزہ رکھنا بھی اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ اگر چہ تمام عمر روزے رکھے۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابوداوٗد اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اور بخاریؒ نے نقل کیا ہے اور امام بخاریؒ نے اس حدیث کو بخاری کے ترجمۃ الباب میں نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے کہا کہ میں نے محمد کو بخاری کو سنا' انہوں نے کہا کہ میں ابو المطوس راوی کو اس حدیث کے علاوہ نہیں جانتا۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : قال رسول الله ﷺ : من أفطر يومًا من رمضان من غير رخصة : جیسا کہ سفر۔ ولا مرض : یعنی ایسا مرض جو افطار کو مباح کرنے والا ہو یہ عطف الخاص ہے عام پر۔ لم يقض عنه : یعنی اس دن کے ثواب کو نہیں پہنچ سکتے۔ صوم الدهر كله : یعنی پورے زمانے کے روزے، یہاں اضافت معنوی ہے، جیسا کہ مکر اللیل میں ہے اور "کله" تاکید کے لئے ہے۔ وان صامه : یعنی اگر چہ وہ پوری زندگی روزے رکھے۔ امام طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ فرض روزے کی فضیلت کو نفلی کے ساتھ نہیں پا سکتا، اگر چہ اس کی قضاء کو ایک دن کا روزہ ہی ساقط کر دیتا ہے اور یہ بات مبالغہ اور تشدید کے طور پر کہی ہے، اور اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید اپنے اس قول "وان صامه" سے کی ہے، یعنی حق الصیام سے۔ اور ابن الملکؒ نے کہا بصورتِ دیگر اس بات پر اجماع ہے کہ اس روزہ کی قضا اس کی جگہ ایک روزہ رکھنے سے ہو جاتی ہے۔

ابن حجر نے کہا: کہ اس کا ظاہر جو تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر پوری زندگی کے روزے اس رمضان کے روزے کی قضا کی نیت سے رکھے تب بھی یہ روزے اس روزے کی کفایت نہیں کر سکتے اور یہی قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعودؓ کا ہے، جب کہ اکثر علماء کا کہنا ہے کہ ایک دن کے بدلے میں دوسرے دن کا روزہ کفایت کر جائے گا اگر چہ اس کا چھوڑا ہوا روزہ انتہائی لمبے اور گرمی کے دن کا، اور اس کے بدلے میں رکھا ہوا روزہ انتہائی چھوٹے دن اور سردی کا ہو۔ اور ربیعہ نے اس ایک دن کے

بدلے ۱۲ دن کے روزے واجب قرار دیئے ہیں، کیونکہ سال ۱۲ مہینوں کا ہوتا ہے اور ابن مسیب ۳۰ دن کے روزے، جب کہ امام نخعی نے تین ہزار دن کے روزے واجب قرار دیئے ہیں اور رمضان کی قضاء کسی بھی وقت میں مکروہ نہیں ہے اور اس نے شذوذ اختیار کیا جس نے اس کو ذی الحجہ کے مہینے میں ناپسند کیا ہے۔ اور جو آدمی بغیر کسی عذر کے فرض روزے کو افطار کرتا ہے تو اس پر عید الفطر کے دن کے بعد فوراً اس کی قضاء دینا لازم ہے۔ لیکن عذر کی صورت میں یہ سنت ہے واجب نہیں۔

اور ظاہر یہ ہے کہ نماز روزے کے معنی میں ہے اس لئے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، بلکہ جمہور علماء کے نزدیک نماز روزے سے افضل ہے۔ واللہ اعلم

یعنی اس کی تفسیر میں جیسا کہ کہا جاتا ہے باب الصلوٰۃ باب الصوم یہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ **وقال الترمذی سمعت محمدًا یعنی البخاری یقول ابو المطوس** : اسے واؤ مکسورۃ مشددۃ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ **الراوی لا اعرف له غیر هذا الحدیث** : امام بخاریؒ نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ ابوالمطوس نے ابو ہریرہؓ سے سماعت کیا ہے، یا نہیں! ابن خلف القرطبی نے کہا: کہ یہ حدیث ضعیف ہے لہٰذا اس سے حجت نہیں لی جا سکتی اور ایسا ہی قول میرکؒ نے نقل کیا ہے۔ اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ یہاں سے اس کی سند غریب ہے جس وجہ سے اس کے ظاہر کو لینے والے کے لئے اس میں حجت نہیں ہے، اگرچہ ابوداؤد نے اس پر سکوت بھی کیا ہے اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کو تشدید پر محمول کیا جائے گا، اور حدیث کے غریب ہونے کی وجہ سے اس کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا، اور نہ ہی یہ بات لازمی ہے کہ جو روایت ترمذی کے طریق سے ضعیف ہے تو وہ ابوداؤد کے طریق سے بھی ضعیف ہوگی اور امام ابوداؤد کا سکوت اس کے ''حسن'' ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس کو احمد وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور اس کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام طرق ایک ہی طریق میں مل جاتے ہیں، اور دوسری بات یہ کہ اس کے متصل ہونے میں بھی شک ہے، لہٰذا خود غور کرو۔ (وضعفه الالبانی مترجم)

روزہ رکھ کر رزائل اخلاق سے بچنا ضروری ہے ورنہ نقصان ہوگا

۲۰۱۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَیْسَ لَهُ مِنْ صِیَامِهِ اِلَّا الظَّمَاُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَیْسَ لَهُ مِنْ قِیَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ۔

(رواه الدارمی وذكر حدیث لقیط بن صبرة فی باب سنن الوضوء)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۵۳۹/۱ حدیث رقم ۱۶۹۰۔ والدارمی ۳۹۰/۲ حدیث رقم ۲۷۲۰۔ واحمد فی المسند ۳۷۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ ان کو روزے سے سوائے پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ ان کو ان کے قیام سے سوائے بے خوابی (بے آرامی) کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ دارمیؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: وعنه : یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ (قال : قال رسول اللہ ﷺ : **كم من صائم لیس له** : یعنی

اس کو حاصل کچھ نہیں ہوتا یا اس کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔ **من صیامه** :یعنی اس کی وجہ سے۔ **الا الظمأ** :یعنی پیاس اور اس کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور پیاس کے ساتھ بھوک بھی شامل ہے، لیکن لفظ "پیاس" کو اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ اس کی شدت بنسبت بھوک کے زیادہ ہوتی ہے۔ **وکم من قائم** :یعنی رات میں قیام کرنے والے۔

لیس له من قیامه : یعنی اس کا کوئی اثر اور بدلہ نہیں۔ **الا السھر** :سوائے تھکاوٹ، چہرہ کی زردی اور بدن کی کمزوری کے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ جب روزے دار نیکی سمجھ کر روزہ نہ رکھے یا پھر روزہ رکھ کر فواحش یا جھوٹ، بہتان، غیبت اور دیگر منہیات سے اجتناب نہ کرے تو اس کو ایسی صورت میں بھوک اور پیاس کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا، ہاں! اس کی قضاء ساقط ہو جائے گی۔ اور اسی طرح غصب شدہ مکان میں، یا بلا عذر بغیر جماعت کے نماز اداء کرنے سے اس کی قضاء تو ساقط ہو جائے گی، لیکن اس پر ثواب مرتب نہیں ہوگا۔

اور ابن الملک ؒ نے کہا: اسی طرح تمام عبادات میں جیسا کہ حج، زکوٰۃ ہیں، تو ان میں بھی ایسی صورت میں مال کے نقصان اور بدن کی تھکاوٹ کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تو ظاہر یہ ہے کہ ان کا اس سے مراد مبالغہ، یا پھر نفی کو نفی کمال پر محمول کرنا ہے یا پھر اس سے مراد دکھلاوا (ریاکاری) ہے کیونکہ ریاکاری میں اصلاً ثواب نہیں ہوتا۔

میرک ؒ نے کہا: کہ اسے ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، اور ان کے الفاظ یہ ہیں: "**رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع ورب قائم لیس له من قیامة الا السھر**"۔ اور نسائی، ابن خزیمہ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے، اور حاکم نے اسے بخاری کی شرط پر صحیح کیا ہے، اور ان کے الفاظ یہ ہیں: "**رب صائم حظه من صیامه الجوع والعطش ورب قائم حظه من قیامه السھر**"۔ اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور ان کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: "**رب قائم حظه من القیام السھر ورب صائم حظه من الصیام الجوع والعطش**"۔

وذکر : یہ صیغہ مجہول کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ **حدیث لقیط بن صبرة** : **صبرة** کو صاد کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ یہ ابورزین لقیط بن عامر صبرۃ مشہور صحابی ہیں، اور بعض کو دو شخص ہونے کے بارے میں وہم ہوا ہے۔ **فی باب سنن الوضوء** :اور وہ حدیث یہ ہے: "**بالغ فی الاستنشاق الا ان تکون صائمًا**"۔ "ناک میں پانی اچھی طرح ڈالو لیکن اگر روزہ ہو تو پھر ایسا نہ کرو"۔ اس کو طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور یہ "صاحب المصابیح" پر "صاحب المشکوۃ" کی طرف سے اعتراض ہے۔ اور یہ اعتراض اپنے محل پر ہے جیسا کہ یہ مخفی نہیں ہے، لیکن حدیث کو سابقہ حکم کے مطابق اس کے موضوع کے باب میں لانا زیادہ مناسب ہے۔

الفصل الثالث:

روزہ نہ توڑنے والی چیزوں کا ذکر

۲۰۱۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ لَا یُفَطِّرْنَ

الصَّائِمَ الحِجَامَةِ وَالْقَيْءُ وَالْاِحْتِلَامُ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غير محفوظ وعبد الرحمن ابن زيد الراوی يضعف فی الحديث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۹۷/۳ حديث رقم ۷۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں روزہ دار کے روزے کو فاسد نہیں کرتیں: ① سینگی۔ ② قے (جوخود سے آئے)۔ ③ احتلام۔ یہ حدیث امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور فرمایا یہ حدیث محفوظ نہیں ہے اور عبدالرحمٰن بن زید حدیث میں ضعیف راوی ہیں۔

تشریح: **عن ابی سعید** : یعنی الخدری، جیسا کہ بعض نسخوں میں ہے۔ **قال : قال رسول الله ﷺ ثلاث** : یعنی تین خصلتیں یا چیزیں۔ **لا یفطرن الصائم الحجامة** : حاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی ''سینگی'' اور اس بارے میں پہلے آپ اختلاف کی وجاحت جان چکے ہیں۔ **والقیء** : یعنی قے جب غالب آ جائے جیسا کہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ **والاحتلام** : یعنی اگر چہ سونے والے کو یاد بھی ہو اور وہ منی کو دیکھ بھی لے روزے کے دنوں میں، اگر چہ یہ جماع کے معنی میں ہے، لیکن اس کے اختیار میں نہیں ہے، تو اس لئے یہ اسے بالا جماع نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

یضعف فی الحدیث : میرکؒ نے کہا: کہ اسے دارقطنی، بیہقی اور ابوداؤد نے بھی نبی اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے بیان کی ہے۔ اور ابوحاتم نے کہا: کہ ابوداؤد کی روایت جواب کے زیادہ مشابہ ہے۔

اور ابوزرعہ نے بھی اس بارے میں ''أصح'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا: کہ اسے ''بزار'' نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے بیان کیا ہے، کہ: **''قال رسول الله ﷺ ثلاث لا یفطرن الصائم القیء، ولحجامة والاحتلام''** اور کہا کہ یہ سنداً زیادہ صحیح ہے، اور طبرانی نے بھی ثوبان رضی اللہ عنہ کے طریق سے اسے بیان کیا ہے، تو اس سے ظاہر ہوا کہ اس کو ''حسن'' کے درجہ پر فائز کرنا واجب ہے، اور اس کے راویوں کا ضعیف ہونا یہ حافظہ کے قبیل سے ہے نہ کہ علالت۔

اور کامیابی اپنی خصوصیت میں دلیل کے عمدہ ہونے میں ہوتی ہے۔

روزہ دار کو سینگی لگوانے کی اجازت ہے

۲۰۱۶: وَعَنْ ثَابِتٍ الْبُنَانِيِّ قَالَ سُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ كُنْتُمْ تَكْرَهُوْنَ الْحِجَامَةَ لِلصَّائِمِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اِلَّا مِنْ اَجْلِ الضُّعْفِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۷۴/۴۔ حديث رقم ۱۹۴۰۔

ترجمہ: حضرت ثابت بنانیؒ سے روایت ہے کہ انس رضی اللہ عنہ بن مالکؓ سے پوچھا گیا کہ کیا تم نبی کریم ﷺ کے زمانے میں روزہ دار کے لئے سینگی لگوانے کو مکروہ جانتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں مگر ضعف کی وجہ سے۔ یہ روایت امام بخاریؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: وعن ثابت البناني : با کے ضمہ کے ساتھ۔طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ ثابت بن اسلم مشہور تابعی ہیں،اور بصرہ کے کبار علماء میں سے ہیں،اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی چالیس سال صحبت اختیار کی۔سئل انس بن مالك كنتم :اور ابن ہمام کے ہاں "أكنتم" کے لفظ کے ساتھ ہے۔تكرهون الحجامة للصائم على عهد رسول الله ﷺ : قال لا :یعنی ہم اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔الا من اجل الضعف :یعنی مجوم کے لئے یہ موقوف ہے،لیکن مرفوع کے حکم میں ہے،جیسا کہ "اصول" میں ہے،کہ صیغہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ظاہر ہے۔اور یہ سند کے ساتھ ہی ہوتا ہے،اس لئے اکثر علماء کے ہاں یہ "حجت" ہے،جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔واللہ اعلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا عمل سینگی لگوانے کے بارے میں

۲۰۱۷:وَعَنِ الْبُخَارِيِّ تَعْلِيقًا قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ ثُمَّ تَرَكَهُ فَكَانَ يَحْتَجِمُ بِاللَّيْلِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۷۳/٤۔ تعلیقاً باب ۳۲ من كتاب الصوم۔

ترجمہ: امام بخاریؒ سے بطور تعلیق کے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سینگی کھنچواتے اس حال میں کہ وہ روزے سے ہوتے تھے پھر انہوں نے سینگی کھنچوانا چھوڑ دی اور رات کو کھنچوایا کرتے تھے۔

تشریح: قال كان ابن عمر يحتجم وهو صائم ثم تركه : یعنی احتیاط کے طور پر یا کمزوری کے خوف سے سینگی کو ترک کر دیا۔فكان يحتجم بالليل :میرکؒ نے کہا کہ اس حدیث کو بیان کرنے کا طریقہ بھی مصنف کی اصطلاح کے مطابق ہی ہونا چاہئے تھا۔وہ اس طرح کہ پہلے وہ یہ کہتے "عن ابن عمر رضی الله عنه. انه كان يحتجم...... "پھر کہتے "رواه البخاری تعلیقاً"۔یعنی آخر میں کہتے اسے بخاری نے تعلیقاً روایت کیا ہے

مصطگی کے چبانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

۲۰۱۸:وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ اِنْ مَضْمَضَ ثُمَّ اَفْرَغَ مَا فِیْ فِیْهِ مِنَ الْمَاءِ لَا یَضُرُّهٗ اَنْ یَزْدَرِدَ رِیْقَهٗ وَمَا بَقِیَ فِیْ فِیْهِ وَلَا یَمْضَغُ الْعِلْكَ فَاِنْ اَزْدَرِدَ رِیْقَ الْعِلْكِ لَا اَقُوْلُ اِنَّهٗ یُفَطِّرُ وَلٰكِنْ یُنْهٰی عَنْهُ۔

(رواه البخاری فی ترجمة باب)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵۹/٤ تعلیقاً باب ۲۸ من كتاب الصوم۔

ترجمہ: حضرت عطاءؒ سے روایت ہے کہ اگر روزے دار کلی کرے اور پانی منہ سے نکال دے تو اس کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا کہ وہ تھوک یا وہ چیز جو منہ کے اندر باقی ہے نگل جائے اور وہ مصطگی نہ چبائے اگر وہ مصطگی کا تھوک نگل گیا تو میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے روزہ افطار کیا ہے بلکہ اس سے منع کیا جاتا ہے۔یہ روایت بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں نقل کی ہے۔

تشریح: وعن عطاء : جلیل القدر تابعی ہیں۔قال ان مضمض :یعنی روزے دار۔ثم أفرغ :گرا دے۔ما في فیه : جو کچھ اس کے منہ میں ہے، سارا کا سارا۔(من الماء : یہ ''ما'' موصولہ کا بیان ہے۔(لا یضر :یعنی اس کے روزے کو نقصان نہیں پہنچے گا، یہ لغۃ ضار میں سے ہے اور ضرر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ان یزدرد ریقه :یعنی اس کو نگل لیتا ہے۔وما بقي في فیه :یعنی اس کے منہ میں اور یہ ریق پر عطف ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''ما'' نافیہ ہے، اور جملہ حالیہ ہے۔ابن بطال نے کہا: کہ میرے خیال سے کلمہ ''ذا'' کاتب سے ساقط ہو گیا ہے، اور اصل میں تھا''ما ذا بقي في فیه''.اور اسی طرح علامہ کرمانی نے بھی بخاری کی شرح میں کہا ہے۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ نے اپنی شرح میں کہا ہے کہ اس تعلیق کو سعید بن منصور نے ابن المبارک سے انہوں نے ابن جریج کے طریق سے موصول بیان کیا ہے، ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے پوچھا کہ روزے دار کلی کرتا ہے اور پھر اپنی تھوک کو نگل لیتا ہے، روزے کی حالت میں۔تو انہوں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں اگر چہ منہ میں باقی بچا ہوا (پانی وغیرہ) بھی چلا۔اور اسی طرح عبدالرزاق نے ابن جریج سے اسے بیان کیا ہے۔تو اس سے بھی ابن بطال والی ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

اور اسے امام میرکؒ نے ذکر کیا ہے۔ابن ہمام اور ہمارے دیگر علماء نے اس سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اگر روزے دار کے منہ میں غبار، دھواں، مکھی اور اس جیسی دیگر اشیاء جن سے بچنا ناممکن ہے جیسا کہ وضوء یا کلی کی بچی ہوئی تری' یہ داخل ہو جائیں، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ولا یمضغ العلك :ابن سیدہ نے ضاد کو فتحہ اور ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ''لا'' کو نافیہ یا ناہیہ کہا ہے، اور قاموس میں مضعه منعهُ کی طرح ہے، جس کے معنی ہیں دانتوں سے چبانا۔اور ''علك'' صنوبر، بادام، پستہ، سرو، ینبوت اور بطم وغیرہ کی گوند کو کہتے ہیں۔

اور بعض نسخوں میں ''وبمضغ العلك'' کے الفاظ ہیں، جیسا کہ بخاری کے رواۃ نے اس کو کلمہ ''لَا'' کے حذف کے ساتھ بیان کیا ہے، اور یہ بات سیاق سے بھی زیادہ موافقت رکھتی ہے، جیسا کہ غور وفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور سیاق کے ذکر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ سابق کلام کو رخصت میں بیان کیا گیا ہے، تو ایسی صورت میں کلام کا مثبت میں ہونا مناسب ہے، نہ کہ نفی یا نہی میں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دو متعاطفین کے درمیان میں فرق کیا گیا ہے، یعنی پہلی چیز میں نگلنے کی اجازت دی گئی ہے، اور دوسری چیز کے نگلنے سے منع کیا گیا ہے، تو اس معنی کی مناسبت عدم اثبات پر دلالت کرتی ہے۔

اور نفی' نہی کے معنی میں ہے اور نہی' نہی تنزیہہ ہے، اور یہی معنی زیادہ درست ہیں، اور اسی لئے ہمارے علماء نے کسی چیز کے چبانے یا چکھنے سے منع کیا ہے، سوائے بچے کے کھانے کے جب کہ اس کو چکھنا ضروری ہو، کیونکہ ضرورت ممنوع چیز کو مباح کر دیتی ہے۔

اور مناسب تو یہ ہے کہ مکروہ کو مباح سمجھا جائے اگر چہ درزی کا تھوک رنگے ہوئے دھاگے سے متغیر ہو جائے اور وہ اسے نگل لے، لہذا اگر اس کے تھوک کی رنگت دھاگے کی رنگت کی طرح ہو جائے، تو روزہ فاسد ہو جائے گا، اور بصورت دیگر فاسد نہیں۔

ہوگا۔ یہ ان کا کلام تھا جس سے اشارہ ملتا ہے کہ اعتبار غلبہ کا ہوگا (واللہ اعلم)۔

وان ازدرد ریق العلك : کسرہ کے ساتھ اور بعض میں فتحہ بھی پڑھا گیا ہے۔ ابن حجرؒ نے کہا: کہ یہاں پر عین کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ درست ہے۔ یعنی جو تھوک گوند سے یا اس چبانے سے پیدا ہو۔ **لا اقول انه یفطر** :تشدید کے ساتھ اور ایسی صورت میں ضمیر "ازدراد" کی طرف ہے، اور بعض نسخوں میں تخفیف کے ساتھ ہے، اور اس صورت میں ضمیر صائم کی طرف لوٹے گی۔

اور اس کے کلام میں اشارہ ہے کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ ابن حجرؒ نے کہا کہ یہ مفطر نہیں ہے، کیونکہ اس کے سینے میں عین اجنبی چیز داخل نہیں ہوئی نازل ہونے والی تو محض تھوک ہے نہ کہ کوئی اور چیز۔

ولکن ینھی : یہ نہی تنزیہہ ہے۔ **عنه** :یعنی نگلنے سے، اور ابن حجرؒ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ ضمیر "**مضغ العلك**" کی طرف راجع ہے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔ اسی کی طرف ہمارے مذہب کے ائمہ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ روزے دار کے لئے مسنون یہ ہے کہ وہ گوند وغیرہ چبانے سے بچے، اور انہوں نے اس فعل کو مکروہ جانا ہے، کیونکہ اس سے تھوک جمع ہوتا ہے اور اگر وہ اس کو نگل لے گا تو اس کا روزہ افطار ہو جائے گا، کسی ایک وجہ سے۔ اور انہوں نے کہا کہ شرح المہذب کی عبارت یہ ہے کہ ہمارے ساتھیوں نے کہا کہ مجرد گوند وغیرہ کے چبانے اور اس میں سے تھوک کا پیٹ میں جانے سے روزہ افطار نہیں ہوگا، ہاں! اگر وہ گوند ٹوٹ کر ٹکڑے ہو جاتی ہے اور اس کے ٹکڑوں میں سے عمداً کوئی ٹکڑا پیٹ میں جاتا ہے، تو پھر روزہ افطار ہو جائے گا۔ اور اگر اس کا ذائقہ یا خوشبو، اس گوند کے ٹکڑے کے علاوہ پایا جاتا ہے، تو ایسی صورت میں بھی روزہ افطار نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ذائقہ وغیرہ اس گوند کے ساتھ تھوک لگنے کی وجہ سے آ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ تھوک کو نگل لیتا ہے اور اس میں اس کا ذائقہ بھی آتا ہے، تو اس کا روزہ افطار ہو جائے گا۔ لیکن اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا کہ کسی بھی چیز کا چبانا چاہے وہ درخت کا گوند ہو یا اور کوئی چیز ہو، مکروہ ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا کہ جب وہ اکٹھی نہ ہو، یعنی اسے کسی نے چبایا نہ ہوا گر وہ سفید ہو، اور جب وہ سفید اور سیاہ ہو تو پھر چبانے سے پہلے ہی اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور وہ پیٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اور امام محمدؒ کا عدم فساد پر اطلاق کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جب کہ ٹکڑوں کی صورت ایسی نہ ہو کہ وہ ٹوٹ کر جلدی سے پیٹ میں پہنچ گئے ہیں، اس لئے کہ یہ عدم وصول پر معلول ہے اور بالفرض اگر بعض ٹکڑوں کے پہنچنے کی وجہ سے پتہ چل جائے کہ یہ عادۃً اندر چلا گیا ہے، تو ایسی صورت اس پر روزے کے فاسد ہونے کا حکم واجب ہوگا، اس لئے کہ اب یہ متیقن کی طرح ہے، اور اس کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر فساد اور افطار سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اور اسی بارے میں غالباً آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: "**من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یقفن مواقف التھم**"۔ "کہ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے الزام یا تہمت لگنے والی جگہوں پہ نہیں کھڑا ہونا چاہئے"۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "جس چیز کا انکار دلوں کی طرف سبقت کرے تو اس سے بچو! اگرچہ تمہارے پاس اس کا عذر بھی موجود ہو"۔ لیکن عورتوں کے لئے ان کے حقوق کے بارے مستحب ہے کہ وہ اس کو مسواک کے قائم مقام بنالیں، کیونکہ ان کی نیت کمزور ہوتی ہے۔ کہ مسواک پر احتمال نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ اس کے قائم مقام ہے تو وہ اس طرح کرلیا کریں، اھ۔ اور ایک دوسری وجہ مردوں کے بارے میں اس کی کراہت کی ہے کیونکہ تب عورتوں کے ساتھ مشابہت ہوجاتی ہے۔

بَابُ صَوْمِ الْمُسَافِرِ

مسافر کے روزے کا بیان

"باب صوم المسافر" یعنی مسافر کا حالت سفر میں روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا حکم اور ان دونوں میں سے افضل کا بیان۔

الفصل الاول:

سفر میں افطار کی اجازت ہے

۲۰۱۹: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرِ والْاَسْلَمِيّ قَالَ لِلنَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصُوْمُ فِي السَّفَرِ وَكَانَ كَثِيْرَ الصِّيَامِ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٧٩/٤۔ حديث رقم ١٩٤٣۔ ومسلم فی صحيحه ٧٨٩/٢ حديث رقم (١٠٣۔ ١١٢١)۔ وابوداؤد فی السنن ٧٩٣/٢ حديث رقم ٢٤٠٢۔ والترمذی ٩١/٣ حديث رقم ٧١١۔ والنسائی ٢٠٧/٤ حديث رقم ٢٣٨٤۔ وابن ماجه ٥٣١/١ حديث رقم ١٦٦٢۔ والدارمی ١٥/٢ حديث رقم ١٧٠٧۔ ومالك ٢٩٥/١ حديث رقم ٢٤ من كتاب الصيام۔ واحمد فی المسند ٤٦/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمیؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا میں سفر میں روزہ رکھوں اور حمزہؓ بہت زیادہ روزے رکھنے والے تھے پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر چاہے تو روزہ رکھ اور اگر چاہے تو افطار کر۔ یہ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن عائشة رضی الله عنها– قالت : ان حمزة بن عمرو الاسلمی قال للنبی ﷺ: اصوم فی السفر : یعنی سفر کے روزے کا حکم کیا ہے؟ کیا مجھے اس کے رکھنے پر گناہ ملے گا یا ثواب؟ یا یہاں پر استفہام مقدر مانا جائے گا۔ وکان : یعنی حمزہ رضی اللہ عنہ کثیر الصیام :اور عنقریب آئے گا کہ وہ پورا سال ہی روزے رکھتا تھا، یہ جملہ معترضہ ہے، اور بیان حال کے لئے ہے، جو کہ اسے اس سوال پر ابھارنے والا ہے۔ فقال ان شئت :یعنی اگر تم روزہ کا ارادہ رکھتے ہو۔ فصُمْ : یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة : ١٨٤] کے مطابق ہے۔ کہ تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔ اس حکم کو مقدم کرنے میں اشارہ ہے کہ حالت سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ اور ابن الملکؒ نے کہا کہ اکثر علماء کے ہاں روزہ رکھنا بہتر ہے کیونکہ انسان اپنے ذمہ سے بری ہوجاتا ہے۔

وان شئت : یعنی اگر تو افطار کو اختیار کرتا ہے فافطر ہمزہ قطعی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جیسا

کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ''کہ جو مریض ہو یا حالت سفر میں ہو تو وہ روزوں کو افطار کر دے''۔ ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [البقرة: ۱۸٤] تو بعد میں اس پر اتنے ہی روزوں کی قضاء ہے۔

شرح السنہ میں کہا ہے کہ یہ ''تخییر'' عام اہل علم کا قول ہے۔ سوائے ابن عمر کے، انہوں نے کہا کہ اگر سفر میں روزہ رکھے تو اس کی قضاء حضر میں دے اور سوائے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے، کہ انہوں نے کہا: کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اور متأخرین میں سے اسی قول کی طرف داؤد بن علی بھی گئے ہیں، گویا کہ انہوں نے آیت کے ظاہر کو لیا ہے۔ پھر ان دونوں میں سے افضل ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ تو بعض نے کہا کہ روزہ رکھنا سفر میں افضل ہے، یہ قول مالک، شافعی، ثوری اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے اصحاب کا ہے اور جنہوں نے کہا کہ ''افطار'' کرنا افضل ہے، ان میں سے ایک ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور بعض نے کہا کہ ان دونوں کاموں میں سے افضل کام وہ ہے جو آسان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ......﴾ [البقرة: ۱۸۵] کہ اللہ تو تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتے ہیں اور جو آدمی روزے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود سفر میں مشقت اٹھا کر روزہ رکھتا ہے تو اس کے لئے افطار کرنا زیادہ بہتر ہے، آپ کے اس قول کے مطابق کہ جب آپ نے ایک ازدحام شدہ آدمی کو دیکھا کہ لوگ اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں، تو فرمایا: "ليس من البر الصيام في السفر" کہ سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: "اولئك العصاة...... '' کہ یہ لوگ نافرمان ہیں۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جن کے بارے میں آپ کو پتہ چلا کہ انہوں نے ابھی تک روزہ رکھا ہوا ہے جب کہ میں نے سب کے سامنے افطار کر دیا ہے اور آپ کا یہ قول ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس رخصت کو دل سے قبول نہیں کیا اور رہا وہ شخص جو افطار کو مباح جانتا ہے اور روزہ رکھنے پر طاقت رکھتا ہے بغیر مشقت کے تو ایسے آدمی کا روزہ رکھنا مجھے زیادہ محبوب ہے اور عنقریب شیخین کی حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے آئے گا کہ وہ تخییر کے قائل تھے۔ پس جو ان سے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے تو اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اسے صوم العصاة پر محمول کیا جائے گا۔ اور اسی وجہ سے اہل تشیع، اور اہل ظاہر کی بات کا قلع قمع ہوتا ہے جو کہ سفر میں مطلق طور پر روزے کے عدم جواز کی طرف گئے ہیں، ان دونوں کے قول کو دلیل بناتے ہوئے۔ اس مقام پر مجھے تو یہی ظاہر ہوا ہے۔ اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ ابن عباس کو حدیث تخییر پر عدم اطلاع کی وجہ سے معذور سمجھا جائے گا' بخلاف ان لوگوں کے کہ انہوں نے اطلاع پانے کے باوجود اسے ترک کر دیا ہے۔

اور رہا قول کہ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ ان دونوں میں سے افضل یہ ہے جو کہ دونوں میں سے آسان ہے جب کہ پہلے یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ اکثر علماء نے سفر میں روزہ رکھنے کو افضل بیان کیا ہے اور امام شافعیؒ کا یہ قول ''شرح السنہ'' کے قول کے مخالف ہے کہ امام شافعیؒ جمہور علماء کے ساتھ ہیں اگرچہ یہ قول کرنا کہ ''اُیسر ہی افضل ہے'' یہ بات تحقیق کے مطابق اکثر علماء کے قول کی طرف لوٹتی ہے۔

پس غور کرو! اور اسی لئے ابن دقیق العید نے آپ کے اس قول کے بارے میں کہا ہے: "عليكم برخصة الله التي رخص لكم" کہ جب ضرورت بھی رخصت لینے کا تقاضا کرلے، تو پھر رخصت پر عمل کرنا یا اس کو لینا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اس کے مندوب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا زیادہ غلو اور باریکی کو ترک کر دینا چاہئے اور جس کو سفر میں روزہ رکھنا دشوار نہیں ہے، تو

اس کے لئے روزہ ہی افضل ہے کیونکہ وہ اپنے ذمہ سے جلد بری ہوتا جاتا ہے، اور اس مبارک وقت کی فضیلت کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان کے اس قول کی تائید ہمارے علماء کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے کہ جب سفر میں روزہ رکھنا نقصان دہ نہ ہو تو روزہ رکھنا زیادہ محبوب ہے۔

اور ہدایہ میں ہے کہ امام شافعیؒ نے کہا: کہ سفر میں افطار کرنا افضل ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کا قول بھی ہمارے قول کی ہی طرح ہے، لیکن ان سے بیان یا حکایت نہیں کیا گیا، جب کہ یہ مذہب تو امام احمد بن حنبل کا ہے۔ (مسلم)

روزے دار اور مفطر کا آپس میں عمدہ رویہ اور ایک دوسرے کے عیب نہ نکالنا

۲۰۲۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِسِتَّ عَشْرَۃَ مَضَتْ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ یَعِبِ الصَّائِمُ عَلَی الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَی الصَّائِمِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۸٦/٤۔ حدیث رقم ۱۹٤۷۔ ومسلم فی صحیحه ۷۸٦/۲ حدیث رقم (۹۳۔ ۱۱۱٦)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۹٥/۲ حدیث رقم ۲٤۰٥۔ والترمذی ۹۲/۳ حدیث رقم ۷۱۲۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم سولھویں رمضان کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جہاد کو چلے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے روزہ رکھا (یعنی طاقتوروں نے) اور بعضوں نے ہم میں سے افطار کیا (یعنی ضعیفوں نے یا امیروں کے خادموں نے) پس روزے دار نے افطار کرنے والے پر عیب نہیں کیا اس لیے کہ اس نے رخصت پر عمل کیا اور نہ افطار کرنے والے نے روزے دار پر۔ اس لیے کہ اس نے عزیمت پر عمل کیا ہے یہ مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعن ابی سعید الخدری قال غزونا** : یعنی ہم نے کفار سے جہاد کیا۔ **مع رسول اللہ ﷺ** : اس میں تجدید اور تاکید ہے کیونکہ غزوہ تو ہوتا ہی آپ ﷺ کے ساتھ ہے، بخلاف سریہ کے۔ **لِستّ عشرة** : یعنی راتیں۔ **مضت من شهر رمضان** : ابن الملکؒ نے کہا: کہ حدیث میں اس آدمی کے قول کے غلط ہونے پر دلالت ہے جس نے کہا کہ اثناءِ رمضان میں سفر کو شروع کرنے والے کے لئے روزہ افطار کرنا جائز نہیں ہے۔ **فمنا من صام** : یہ قوی لوگ تھے۔ **ومنا من افطر** : یہ کمزور لوگ یا کبراء کے خادم تھے۔ **فلم یعب** : یاء کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ، یعنی کسی نے ایک دوسرے کو ملامت نہیں کیا۔ **وفی روایة "فلا یجد"** : کے الفاظ ہیں یعنی نہ تو کسی نے ایک دوسرے پر غصہ کیا، اور نہ ہی کسی پر اعتراض کیا۔ **الصائم علی المفطر** : اس لئے کہ اس نے رخصت پر عمل کیا۔ **ولا المفطر علی الصائم** : کیونکہ اس نے عزیمت کو اختیار کیا۔

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قوی آدمی کے لئے روزہ رکھنا بہتر خیال کرتے تھے، اور ضعیف آدمی کے حق میں افطار کرنا بہتر خیال کرتے تھے"۔ اور ایسے ہی ایک اور روایت بیان کی گئی ہے: **"کنا نسافر مع رسول اللہ ﷺ فیصوم الصائم، ویفطر المفطر، ولا یعیب بعضهم علی بعض"** : "کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے، تو روزہ رکھنے والا روزہ رکھتا، افطار کرنے والا افطار کرتا، تو ان کا بعض بعض کو عیب دار قرار نہ دیتا" اور شیخین نے ابودرداء

کے طریق سے بیان کیا ہے: "كنا خرجنا مع رسول الله ﷺ في شهر رمضان في حر شديد، ما فينا صائم الا رسول الله ﷺ وعبد الله بن رواحة" "کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے' آپ ﷺ کے بعض غزوات میں سخت گرمی کے دنوں میں' اور ہم میں صرف رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ ہی روزے دار تھے"۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا: کہ یہ غزوہ فتح کے علاوہ کا واقعہ ہے کیونکہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ غزوہ فتح سے قبل جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے۔ اور اسی طرح یہ غزوہ بدر کا بھی واقعہ نہیں ہے، کیونکہ ابودرداء اس غزوے میں حاضر تو تھے' لیکن اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اس میں یہ بھی ہے کہ انہیں نہیں علم کہ آپ ﷺ نے ان دو غزووں کے علاوہ رمضان میں سفر کیا ہو۔

ابن ہمام نے کہا کہ "صحیح" میں ابودرداء کے طریق سے یہ بیان کیا گیا ہے: "خرجنا مع رسول الله ﷺ في بعض غزواته حر شديد، حتى أن احدنا ليضع يده على رأسه من شدة الحر وما فينا صائم الا رسول الله ﷺ وعبد الله بن رواحة" "کہ ہم شدید گرمی کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے بعض غزوات میں نکلے، یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی گرمی کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ کو اپنے سر پر رکھ لیتا، اور ہم میں صرف رسول اللہ ﷺ ہی روزے دار تھے' اور یہاں پر رمضان کا ذکر نہیں کیا اور مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: "خرجنا مع رسول الله ﷺ في شهر رمضان في حر شديد حتى ان أحدنا ليضع يده على رأسه من شدة الحر وما فينا صائم الا رسول الله ﷺ وعبد الله بن رواحة" "کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سخت گرمی میں رمضان کے مہینے میں نکلے، حتیٰ کہ ہم میں سے کوئی گرمی کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ کو اپنے سر پر رکھ لیتا، اور ہم میں سے روزے دار صرف رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ تھے"۔

اور ایک روایت میں اس طرح ہے: کہ ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: "لقد رأيتنا مع رسول الله ﷺ في بعض أسفاره في يوم شديد الحر، حتى ان الرجل ليضع يده على رأسه من شدة الحر وما منا احد صائم الا رسول الله ﷺ وعبد الله بن رواحة" "کہ ہم نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے بعض سفروں میں سخت گرمی کے دنوں میں دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنے سر پر شدت گرمی کی وجہ سے اپنے ہاتھ کو رکھ لیتا اور ہم میں روزے دار صرف رسول اللہ ﷺ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ تھے"۔ اور بخاری کے الفاظ مسلم کی آخری روایت کے موافق ہیں۔ اور ربیع نے پہلی روایت کو شیخین کی طرف منسوب کیا ہے۔ واللہ اعلم

سفر میں افطار کرنے کی اجازت ہے

۲۰۲۱ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَفَرٍ فَرَاٰى زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا قَالُوْا صَائِمٌ فَقَالَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحة ١٨٣/٤ حديث رقم ١٩٣٦ و مسلم فی صحيحة ٧٨٦/٢ حديث رقم ٩٢-١١٥۔ وابوداوٗد في السنن ٧٩٦/٢ حديث رقم ٢٤٠٧۔ والنسائي ١٧٧/٤ حديث رقم ٢٢٦٢۔ وابن

ماجه ۵۳۲/۱ حدیث رقم ۱٦٦٤۔ والدارمی فی السنن ۱٦/۲ حدیث رقم ۱۷۰۹۔ واحمد فی المسند ۲۹۹/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجمع دیکھا اور ایک شخص کو دیکھا کہ اس پر سایہ کیا گیا تھا یعنی دھوپ کے بچاؤ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' اس کو کیا ہے؟ لوگوں نے کہا روزے دار ہے یعنی کمزوری کی وجہ سے گر پڑا ہے۔ پس فرمایا سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔

تشریح: **وعن جابر قال : کان رسول الله ﷺ فی سفر فرای زحاما** : زاء کے کسرہ کے ساتھ، یعنی لوگوں کا مجمع جو کہ ایک آدمی کی حالت معلوم کرنے کے لئے اکٹھا ہوا تھا۔ **ورجلاً** : یہ ابواسرائیل تھے، اوران کا نام قیس ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام **قشیر** ہے، اور ایک قول میں یہ کہا گیا ہے، کہ ان کا نام قیصر تھا، اور میرک رحمہ اللہ کے ذکر کے مطابق یہ زیادہ صحیح ہے۔ **قد ظلل علیه** : یعنی سورج کی گرمی سے بچانے کے لئے اس پر سایہ کیا گیا تھا، یا پھر افاقہ سے امان دینے کے لئے کیا گیا تھا، کیونکہ یہ شدتِ گرمی کی وجہ سے گر پڑا تھا، یا روزے کی کمزوری کی وجہ سے' یا پھر غشی کی وجہ سے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے سر پر خیمہ کی طرح ایک سائبان بنا دیا گیا اور یہ بھی قول ہے کہ قیام کے ذریعہ سے اس کے سر کی دونوں جانب سے سایہ کیا گیا، اور اخیر میں کہا کہ یہ غزوہ تبوک کا واقعہ ہے، اور آپ درخت کے سایہ میں تھے۔

اور اسی طرح یہ مسند شافعی رحمہ اللہ میں ہے، اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا: کہ یہ غزوہ فتح کا واقعہ ہے، جیسا کہ دوسری روایتوں میں وضاحت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور اس میں پیاس، اور حرارتِ صوم کی انتہاء پر دلالت ہے۔ **فقال ما هذا** : یعنی یہ ہجوم اور سایہ کیسا ہے؟ **قالوا صائم** : یہ روزے دار ہے، جو کہ کمزوری کی وجہ سے گر گیا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ "ما" **من ای**، یا **من هذا الساقط** کے معنی میں ہو، اسے میرک رحمہ اللہ نے ازہار سے نقل کیا ہے۔

فقال لیس من البر الصوم : امام زرکشی نے کہا: کہ 'مِنْ' زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لئے آیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "مِن" تبعیضیہ ہے لیکن یہ بات فضول ہے۔ اور اہل یمن نے اس روایت کے الفاظ کو اس طرح بیان کیا ہے: **"لیس من امبر امصیام فی امسفر"**۔ انہوں نے لام سے میم کو بدل دیا، اور یہ لغت بہت ہی قلیل ہے۔

ابن ہمام نے کہا: کہ اسے عبدالرزاق نے کعب بن عاصم الاشعری کے طریق سے روایت کیا ہے۔ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں "صوم" کی بجائے "صیام" یعنی جو اس حالت میں ادا کرتا ہے۔

فی السفر : اس لئے اللہ تعالیٰ کو یہ **"ان الله تعالٰی یحب أن تؤتی رخصة کما یحب أن تؤتی عزائمه"** پسند ہے، کہ اس کی رخصت کو بھی ایسے ہی قبول کیا جائے جس طرح کہ اس کے فرض، یا لازمی احکامات کو لیا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵]۔ خطابی نے کہا: کہ اس حدیث کو محمول کیا جائے گا اس حالت پر جس کو روزہ ایسی حالت کی طرف لے جائے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ کیا یعنی اس کو مشقت والے روزے پر محمول کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام الفتح کے موقع پر سفر کی حالت میں روزہ رکھا ہے اور حمزہ اسلمی کو اختیار دیا

ہے۔ اور شمنی نے کہا: کہ بغیر ضرر کے سفر میں روزہ رکھنا مجھے افطار سے زیادہ محبوب ہے اور یہی قول مالک اور شافعیؒ کا ہے۔ اور امام احمد اور اوزاعی نے کہا: کہ مطلقاً سفر میں افطار کرنا زیادہ محبوب ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ روزہ ہر ایک کے حق میں فرض، ضروری ہے، اللہ کے اس قول کے مطابق: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵]، اور عزیمت کو لینا افضل ہے، بنسبت رخصت کے اور اسی طرح رمضان دونوں وقتوں میں سے افضل ہے تو رمضان میں ادا کرنا افضل ہے۔ میرکؒ نے کہا: کہ اس میں دلیل ہے کہ قوت ہونے کے باوجود افطار کرنا افضل ہے، ایسے روزے سے جس میں بے بسی اور لاچارگی ہو۔ جیسا کہ امام شافعیؒ اور اکثر علماء کا قول ہے۔ اور اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے، کہ نیک لوگوں کی خدمت کرنا نوافل سے افضل ہے۔ جیسا کہ "شیخ" نے "العوارف" میں ذکر کیا ہے۔

سفر میں افطار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی

۲۰۲۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السَّفَرِ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلاً فِيْ يَوْمٍ حَارٍ فَسَقَطَ الصَّوَّامُوْنَ وَقَا مَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِيَةَ وَسَقَوُا الرِّكَابَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْاَجْرِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٨٤/٦ حديث رقم ٢٨٩٠۔ ومسلم فى صحيحه ٧٨٨/٢ حديث رقم (١١١٩/١٠٠)۔ والنسائى فى السنن ١٨٢/٤ حديث رقم ٢٢٨٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے ہم میں سے بعض روزے دار تھے اور بعض ہم میں سے افطار کرنے والے۔ پس ہم گرمی کے دن میں ایک منزل میں اترے۔ پس روزے دار گر پڑے یعنی ضعف کی وجہ سے کاروبار کے لائق نہ رہے اور افطار کرنے والے کھڑے رہے یعنی خدمت میں مشغول ہوئے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: افطار کرنے والے آج کے دن ثواب لے گئے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: وعن انس رضی الله عنه– قال : كنا مع النبی ﷺ فی السفر فمنا الصائم : یہاں پر "الف لام" جنس کے لئے ہے۔ ومنا المفطر فنزلت منزلا فی يوم حار فسقط الصوامون : "الصوامون" مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی وہ اٹھنے بیٹھنے اور اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے سے عاجز آ گئے۔ وقام المفطرون : خدمت کے لئے۔ فضربوا الابنية : یعنی غیر روزے دار کھڑے ہوئے اور انہوں نے خیمے وغیرہ لگائے۔ وسقوا الركاب : یعنی سواری کے اونٹوں کو۔

فقال رسول الله ﷺ "ذهب المفطرون اليوم بالأجر : یعنی پورا کا پورا ثواب آج غیر روزے دار لے گے ہیں، کیونکہ اس وقت ان کے حق میں افطار بہتر تھا۔ اور "الیوم" کے ذکر کرنے میں اس حکم کے مطلق نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ وہ چلے اور انہوں نے اجر کو اپنا ساتھی بنالیا یا اجر بھی ساتھ لے گئے۔ اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لئے

اس میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا یہ مبالغہ کے طور پر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "ذهب به اذا استصحبه" یعنی ذهب به وہ اس کو لے گیا، اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب وہ اسے اپنا ساتھی بنالے، "ومضى به معه" وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ یعنی اس کے پورے اجر کو لے گیا اور جو یہ بات طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ﴾ [البقرة: ۱۷] الکشاف میں یہ کہا گیا ہے کہ: "ذهب به اذا استصحبه ومضى معه" یہ "مبرد" کا مذہب ہے، جو کہ غیر صحیح ہے آیت کے بارے میں، اس لئے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ اُسے لے گیا اور ان کے لئے اس میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے نور کے ساتھ جانا اور لے جانا' اللہ کے حق میں محال و ناممکن ہے۔

حالتِ سفر میں روزہ توڑنے کی گنجائش ہے

۲۰۲۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ عُسْفَانَ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَهُ اِلٰى يَدِهٖ لِيَرَاهُ النَّاسُ فَاَفْطَرَ حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ وَذٰلِكَ فِيْ رَمَضَانَ فَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ قَدْ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَفْطَرَ فَمَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ اَفْطَرَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٨٦/٤۔ حديث رقم ١٩٤٨۔ ومسلم في صحيحه ٧٨٥/٢ حديث رقم (٨٨۔ ١١١٣)۔ والنسائي ١٨٤/٤ حديث رقم ٢٢٩٠۔ واحمد في المسند ٢٩١/١۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھا یہاں تک کہ جب عسفان نامی مقام پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا' پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے افطار کرلیا (یعنی توڑ دیا) یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے اور یہ سفر رمضان میں پیش آیا تھا' چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھا بھی اور نہیں بھی رکھا' لہٰذا جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو شخص نہ چاہے وہ روزہ نہ رکھے'' (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن ابن عباس قال : "خرج رسول الله ﷺ من المدينة الى مكة" : یعنی فتح مکہ کے سال۔ فصام حتى بلغ عسفان : عین کے ضمہ، اور سین کے سکون کے ساتھ۔ اور دونوں بغیر نقطوں کے پڑھے گئے ہیں، یہ ایک جگہ کا نام ہے جو کہ مدینہ کے قریب ہے، یہ ابن الملک کا بیان ہے۔ یا تو یہ قلم کی بھول ہے یا پاؤں کی لرزش ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ ثم دعا بماء : یعنی طلب کیا۔ فرفعه الى يده : جار مجرور حال بن رہا ہے، یعنی جہاں تک آپ کے ہاتھ بلند ہو سکتے تھے، آپ نے پانی کو اٹھا کر دکھایا تا کہ لوگ دیکھ لیں

اور زرکشی نے کہا: کہ اکثر نے یہی الفاظ بیان کئے ہیں۔ اور ابن سکن کی روایت میں "الى فيه" کے الفاظ ہیں جو کہ واضح ہیں۔ ہاں! اکثر کی روایت میں "الى" کو جب "على" کے معنی میں لیا جائے تو پھر معنی اور کلام درست ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں ان بعض حضرات کا قول بھی باطل ہو جاتا ہے جنہوں نے "الى يده" کے الفاظ پر تصحیف کا حکم لگاتے ہوئے، ابوداؤد کے

الفاظ "فرفعه الی فیه" کو صحیح کہا ہے۔ جب کہ "الی" "مع" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿من انصاری الی اللّٰه﴾ [الصف: ١٤] اور ﴿ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ﴾ [المائدة: ٦] اور ﴿وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ﴾ [النساء: ٢] یہاں پر "الی" "مع" کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ قول ابن الملکؒ اور دیگر حضرات کا ہے تو ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ آپ نے پانی کو اپنے ہاتھ کے ساتھ اٹھایا تا کہ وہ دیکھ کر آپ کی اقتداء کریں۔ لیکن رضی اور کچھ لوگوں نے کہا: کہ محقق بات یہ ہے کہ یہ تینوں الفاظ انتہائے غایت کے لئے استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ اصل ان میں غایت کا معنی ہی پایا جاتا ہے، تو ہم نے بھی اصل کو دیکھتے ہوئے اسے اختیار کیا ہے جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے، تو اس کا معنی یہ ہوا کہ آپ نے اُسے خوب اچھی طرح بلند کیا جہاں تک آپ کا ہاتھ بلند ہو سکتا تھا۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا:

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "الی" "فی" ظرفیة کے معنی میں ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ﴿ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ [الانعام: ١٢] یعنی اللہ تمہیں ضرور قیامت کے دن میں جمع کرے گا۔ تو ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ آپ نے پانی کے برتن کو اٹھایا اس حال میں کہ وہ آپ کے ہاتھ میں تھا۔

لیراه الناس : یہ آپ نے اس لئے کیا تا کہ لوگوں کو اس کے جواز کا علم ہو جائے یا وہ آپ کی متابعت اختیار کر لیں۔

فافطر : طیبی رحمہ اللہ نے کہا: اس کے اندر اس بات کی دلیل ہے کہ جو آدمی روزے کی حالت میں سفر کرے، تو روزہ افطار کر لینا اس کے لئے جائز ہے۔ اور ابن حجرؒ نے ان کی پیروی کی ہے اور کہا کہ اس میں زیادہ ظاہر ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل شدہ ہو وہ یہ کہ اس میں کوئی دلالت نہیں ہے کہ آپ مطلق طور پر اس دن میں روزہ دار تھے۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ آپ نے مدینہ سے عسفان تک روزہ رکھا اور پھر افطار کر لیا، یعنی اس سے اور بعد میں آپ مفطر ہی رہے۔ حتی قدم مکة : یا تو یہ بیان جواز کے لئے، یا پھر یہ پیش آنے والے حصول عذر کے لئے اور وہ یہ کہ قتال کے لئے تیاری کے طور پر آپ نے کیا اگر مستقبل میں اس کی ضرورت پڑی تو۔ اللہ تعالیٰ ہی حالت سے بخوبی واقفیت رکھنے والا ہے۔

وذلك : یعنی جو روزہ رکھنے اور افطار کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ تھا۔ فی رمضان فکان ابن عباس یقول قد صام رسول الله ﷺ وافطر : یعنی رمضان کے مہینے میں سن ۸ ہجری اور حالت سفر کا یہ واقعہ ہے۔ (فمن شآء صام ومن شآء أفطر : یعنی ان دونوں میں سے کسی پر کوئی حرج نہیں، اور شرح السنہ میں ہے کہ عام "اہل علم" کے نزدیک ایک آدمی کا رمضان المبارک کے مہینے میں سفر شروع کرنے یا کسی مسافر پر رمضان کے آنے میں کوئی فرق نہیں ہے، اور عبیدہ السلمانی نے کہا: کہ جب رمضان المبارک کے مہینے میں سفر شروع کرے، تو اس کے لئے افطار جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ظاہر کو لیتے ہوئے: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ﴾ [البقرة: ١٨٥] "تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے"۔

اور یہ حدیث عبیدہ السلمانی پر حجت ہے، اور آیت کا معنی ہے کہ پورا مہینہ پائے اور جو پورا مہینہ نہیں پاتا تو گویا اس نے اس مہینہ کو نہیں پایا۔

اوراس سے بھی زیادہ واضح معنی آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے جو اس مہینے میں سے کچھ پائے بغیر مرض اور سفر کے۔ اوراس بات میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ فتح مکہ کے لئے کس دن کو نکلے تھے۔ایک قول تو یہ ہے کہ رمضان کے دس دن گزرنے کے بعد' بعد از عصر آپ ﷺ روانہ ہوئے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان کی دو راتیں گزرنے کے بعد' اور یہی زیادہ صحیح قول ہے۔

۲۰۲۴:وفی روایة لمسلم عن جابر انه شرب بعد العصر ۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ۷۸۱/۲ حديث رقم (۹۱ ـ ۱۱۱٤)۔

ترجمہ:اور مسلم کی ایک روایت جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے عصر کے بعد پانی نوش فرمایا۔"

تشریح: وعن جابر انه : یہاں ضمیر سے مراد نبی ﷺ ہیں۔شرب بعد العصر :یعنی جس طرح پہلے تفصیل گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے پانی کو اپنے ہاتھ کے ساتھ بلند کیا' تا کہ لوگ جان لیں کہ سفر میں افطار کرنا جائز ہے۔اور یہ دلالت میں طیبی رحمہ اللہ کے قول کے زیادہ قریب ہے باوجود اس کے کہ یہ مطلوب میں نص نہیں ہے جیسا کہ واضح ہے۔

الفصل الثانی:

مسافر روزہ چھوڑ سکتا ہے

۲۰۲۵:عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكِ الْكَعْبِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ شَطْرَ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمَ عَنِ الْمُسَافِرِ وَعَنِ الْمُرْضِعِ وَالْحُبْلٰى۔

(رواه ابوداود والترمذی والنسائي وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۹٤/۳ حديث رقم ۲٤۰۸۔ والترمذی فی السنن ۹٤/۳ حديث رقم ۷۱۵ والنسائی ۱۸۰/٤ حديث رقم ۲۲۷۵۔ وابن ماجه ۵۳۳/۱ حديث رقم ۱٦٦۷ واحمد فی المسند ۲۹/۵۔

ترجمہ:حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کعبی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لیے آدھی نماز موقوف کردی ہے اوراس طرح دودھ پلانے والی' مسافر عورت اور حاملہ عورت کے لیے روزہ معاف کردیا ہے۔ یہ ابوداوٗد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن انس بن مالك الكعبی : اور ابن ماجہ نے یہ زیادہ بیان کیا ہے کہ یہ بنی عبداللہ العشری میں سے ایک آدمی تھا۔صحیح بات یہ ہے کہ یہ ابن ماجہ سے غلطی ہوئی ہے۔اور وہ بنی عبداللہ بن کعب میں سے تھا، جیسا کہ امام بخاری نے اس کے ترجمہ میں اس پر جزم کیا ہے۔اور ابوداوٗد نے اس طرح نقل کیا ہے کہ وہ عبداللہ بن کعب جس کا بھائی قشیر تھا، ان میں سے ایک آدمی تھا۔لہٰذا وہ کعبی ہے، قشیری نہیں ہے، بخلاف ابن عبدالبر کے، کیونکہ کعب کے دو بیٹے تھے۔اور عبداللہ اس انس کا دادا

تھا، اور قشیر عبداللہ کا بھائی تھا۔ اور اس سے جو طیبی رحمہ اللہ کے کلام میں تھا وہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ابو امامۃ الکعبی ہے، جسے القشیری، العقیلی اور العامری کہا جاتا ہے۔

ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے، جو کہ مسافر، حاملہ، اور مرضع کے صوم کے بارے میں مروی ہے۔ یہ بصرہ میں رہتے تھے اور ابوحمزہ انس بن مالک جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں وہ انصاری، تجاری، خزرجی ہیں، جن سے بہت ساری احادیث مروی ہیں۔

قال : قال رسول الله ﷺ ان الله وضع عن المسافر : حافظ ابن حجرؒ نے کہا: کہ اس میں امام شافعیؒ کے قول پر دلیل ہے کہ "قصر" جائز ہے واجب نہیں، کیونکہ "وضع" أسقط "گرانے کے معنی میں ہے، اور اسقاط الشي اپنے خاص کے وجوب کے اسقاط کا تقاضا کرتا ہے، نہ کہ اپنے عام کے جواز کا، اور یہ بات مردود ہے کیونکہ "موضوع" وضع اس معنی میں نہیں ہے جس میں انہوں نے ذکر کیا ہے نہ لغتاً اور نہ اصطلاحاً اور رہا "لغوی" معنی جو کہ ظاہر ہے۔ اور رہا اس کا شرعی معنی تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے واضح ہو جاتا ہے: "ان الله تعالٰی وضع عن امتی الخطأ و النسیان" یعنی ان دونوں کی تکلیف اور جو ان دونوں پر گناہ وحرج وغیرہ مرتب ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ویضع عنهم اجرهم والاغلال التی کانت علیهم﴾ اور آپ ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے دور فرماتے یا اتار دیتے۔

ابن ہمام نے کہا: کہ ہدایہ کے شارحین میں سے بعض مشائخ کا اختلاف بیان کرتے ہیں جو کہ قصر کے بارے میں ہے کہ وہ عزیمت ہے یا کہ رخصت اور ان کی عبادات کا اس بارے میں اختلاف نقل کرنا غلط ہے، کیونکہ جس نے کہا کہ رخصت ہے تو اس کی مراد رخصت اسقاط ہے اور یہی عزیمت ہے جس کو مجازی معنی میں رخصت کہا جاتا ہے۔ اور یہ بحث کسی پر بھی مخفی نہیں ہے۔

اور ہمارے مذہب کی صریح دلیل ہمارے مقصود کے بارے میں گزر چکی ہے اور اس میں سے ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی ہے جو کہ صحیحین میں مروی ہے انہوں نے کہا: "فرضت الصلاۃ رکعتین رکعتین فأقرت صلاۃ السفر وزید فی صلاۃ الحضر"۔ کہ نماز پہلے دو دو رکعت فرض ہوئی، پھر اس کو سفر کی نماز پر برقرار رکھا گیا اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔ تو معنی "وضع" کا یہ ہوا کہ شروع میں مسافر سے اٹھالینا۔ ای رفع ابتداءً عن المسافر۔ شطر الصلوۃ : یعنی چار رکعت والی نماز میں سے نصف کو اٹھالیا گیا، اور اس اٹھائی ہوئی نماز (دو رکعت) کی حالت اقامت میں قضاء نہیں ہے۔ والصوم : یعنی روزے کے وجوب کو۔ عن المسافر : لیکن جب وہ مقیم ہوگا تو پھر اس پر روزوں کی قضاء ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: صوم کے بعد مسافر کا اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ مرضع پر عطف کرنا درست ہو جائے کیونکہ نصف نماز مرضع سے نہیں اٹھائی گئی بلکہ اس سے تو روزوں کا وجوب حالت مرضع میں اٹھایا گیا ہے۔ وعن المرضع : اس پر "التاء" اس کے اختصاص کی وجہ سے نہیں داخل کی گئی، جیسا کہ "حائض" پر نہیں داخل کی جاتی۔

والحبلی : ہمارے مذہب کے مطابق ان پر قضاء ہے، فدیہ نہیں ہے۔ جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمد ان دونوں پر فدیہ کو واجب قرار دیتے ہیں، اور امام مالکؒ صرف "حاملہ" پر واجب قرار دیتے ہیں "مرضع" کے علاوہ اسی طرح اس کو ابن الملکؒ نے نقل کیا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ جب وہ اپنی جانوں کے خوف کی وجہ سے افطار کریں تو پھر

ان پر قضاء ہے، فدیہ نہیں ہے، اور اگر بچے کے خوف کی وجہ سے افطار کریں، تو پھر ان پر ایسے ہی ''فدیہ'' ہے جیسے کفارات میں ہے۔

اور ہمارے مذہب کے مطابق خلاف قیاس فدیہ صرف اور صرف لاغر اور کمزور بوڑھے پر ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو نہیں ملایا جاسکتا۔ خطابی نے کہا: کہ نظم کلام نے بہت ساری اشیاء کو جمع کر دیا جو کہ ذکر میں تابع تھیں، لیکن حکم میں متفرق۔ ترمذی اور دیگر حضرات نے اسے صحیح کہا ہے۔

اگر سفر آرام دہ ہو تو روزہ رکھنا بہتر ہے

۲۰۲٦: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهُ حَمُوْلَةٌ تَأْوِىْ اِلٰى شِبْعٍ فَلْيَصُمْ رَمَضَانَ حَيْثُ اَدْرَكَهُ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۷۹۸/۲ حدیث رقم ۲٤۱۰۔ واحمد فی المسند ۷/۵۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس اچھی سواری ہو اور وہ اس کو بخیر و عافیت آسانی کے ساتھ منزل تک پہنچا دے یعنی اچھی حالت میں سفر کرتا ہو۔ پس چاہیے کہ وہ رمضان کا روزہ رکھے جہاں اس کو رمضان آ جائے۔

تشریح: وعن سلمة بن المحبق : باء مشددہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ باء کے کسرہ کے ساتھ ہے جب کہ محدثین اسے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں: کہ لغویوں کے مقابلے میں محدثین کی بات اقویٰ ہے، اور باقی اعراب واضح ہے۔

قال : قال رسول الله ﷺ من كان له حمولة : حاء کے فتحہ کے ساتھ مراد ہر وہ سواری جس پر سوار ہوتا ہے، مثلاً اونٹ، گدھا وغیرہ۔ اور ''فعول'' پر ''ھاء'' اس وقت داخل ہوتی ہے جب وہ مفعول کے معنی میں ہو۔ مطلب یہ کہ جس کے پاس سواری ہو۔ تأويه : یعنی جو اسے پناہ دے اور ''أوى'' لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور رہا ابن حجرؒ کا قول: کہ ''أوى'' مد، اور ''قصر'' دونوں کے ساتھ لازم بھی استعمال ہوتا ہے، اور متعدی بھی یہ غیر صحیح ہے، اور طیبی رحمہ اللہ کے قول کے مخالف ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ اگر مد کے ساتھ استعمال ہو تو پھر اکثر متعدی ہوتا ہے، اور حدیث میں دونوں طرح ٹھیک ہے۔ تو معنی یہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھی کو پہنچا دیں یا پناہ دیں۔

الى شبع : شین کے کسرہ اور باء کے سکون کے ساتھ' معنی جو تجھے سیر کر دے۔ اور جب اسے باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھیں گے تو ایسی صورت میں یہ مصدر ہوگا اور اس سے پہلے مضاف مقدر ماننا پڑے گا، اور یہ اکثر روایات میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اس میں ہے ''من كانت له حمولة تأويه الى حال شبع ورفاهية أو الى مقام يقدر على الشبع فيه''. اور اسے سفر میں مشقت، تکلیف اور تھکاوٹ وغیرہ نہ پہنچے۔ اور پہلا معنی ہی زیادہ واضح اور مناسب ہے۔ اور رہی ابن حجرؒ کی مندرجہ ذیل الفاظ کی زیادتی ''ومسكن يقيه الحر والبرد'' کہ اس کے پاس ایسا گھر ہو جو اس گرمی اور سردی سے بچائے' تو

یہ حدیث سے نہیں لی گئی اور نہ ہی یہ شرط میں معتبر ہے۔ جیسا کہ یہ شرع میں طے شدہ ہے۔

فلیصم رمضان حیث أدرکہ : یعنی رمضان کو۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ امر کو مندوب پر محمول کیا جائے گا۔ اور اولیٰ وافضل کی ترغیب دی جائے گی، ایسی نصوص کی بناء پر جو سفر میں مطلقاً افطار کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ اور مظہرؒ نے کہا: کہ جس آدمی کا سفر تھوڑا ہوا اور وہ اسی دن اپنے گھر پہنچ سکتا ہو تو اسے رمضان کا روزہ رکھ لینا چاہئے اور داؤد نے کہا: کہ چاہے سفر کتنا بھی ہو افطار کرنا جائز ہے۔

میرکؒ نے کہا: کہ اس سند میں عبدالصمد بن حبیب الازدی ہے، جسے امام احمدؒ نے ضعیف اور امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے، لہٰذا یہ حدیث کسی شمار میں نہیں، اور عقیلی نے کہا: کہ یہ حدیث صرف اسی طریق سے پہچانی جاتی ہے اور اس کی کوئی متابعت نہیں ہے۔ اسی طرح ''تصحیح'' میں ہے۔ ابن حجرؒ نے کہا: کہ اسے امام احمدؒ نے ضعیف کہا ہے جب کہ یحییٰ بن معین نے ''لا بأس بہ'' یعنی کوئی حرج نہیں' کہا ہے۔ اور حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حقیقت میں یہ حدیث ضعیف ہے اور ایک ہی طریق سے مروی ہے۔ لہٰذا ابن حجرؒ کا قول درست نہیں ہے۔ علامہ البانی علیہ الرحمہ۔ ہدایۃ الرواۃ میں ضعیف کہا ہے ۲/۳۳۳۔ مترجم

اور اس حدیث میں اس کا ردّ ہے جس نے تھوڑے سفر پر بھی افطار کو جائز کہا' جیسا کہ لمبے سفر پر ہے۔ اور اس کا بہتر ردّ اور جواب کتاب الصلٰوۃ باب صلٰوۃ المسافر میں بیان ہو چکا ہے۔

الفصل الثالث:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخصت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہونا

۲۰۲۷: عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰى مَكَّةَ فِيْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهُ حَتّٰى نَظَرَ النَّاسُ اِلَيْهِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِيْلَ لَهُ بَعْدَ ذٰلِكَ اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ اُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ اُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۷۸۵/۲ حدیث رقم (۹۰۔ ۱۱۴)۔ والترمذی فی السنن ۸۹/۳ حدیث رقم ۷۱۰۔ والنسائی ۱۷۷/۴ حدیث رقم ۲۲۶۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال رمضان میں مکہ کی طرف چلے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کراع الغمیم تک پہنچے اور روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھا' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو یہاں تک اٹھایا کہ لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پیا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا کہ بعض آدمیوں نے روزہ رکھا ہے یعنی روزے ہی سے رہے' افطار نہ کیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ پکے گنہگار ہیں' یہ پکے گنہگار ہیں۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن جابر ان رسول اللہ ﷺ خرج عام الفتح الی مکۃ فی رمضان فصام حتی بلغ کراع

الغميم : کاف کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ، حجاز میں وادی ہے جس کی انتہاء عسفان کے قریب ہوتی ہے۔ اس منتہاء کو کراع اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ بکری کے کھر کے مشابہ ہے (یعنی گھٹنے سے نیچے ٹخنے اور پنڈلی والے حصہ کو کراع کہتے ہیں) یہ قول ابن حجرؒ کا ہے اور النہایہ میں ہے کہ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے، اور ''کراع'' ''حرۃ'' سے مستطیل جانب کو کہتے ہیں جو کہ کراع سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور ''غمیم'' حجاز میں ایک وادی ہے۔

فصام الناس : اس کا پہلے والے **فصام** پر عطف ہے، یعنی آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے روزہ رکھا۔ **ثم دعا بقدح من ماء فرفعه** : یعنی پیالے یا پانی کو۔ **حتی نظر الناس اليه** : ضمیر سے مراد آپ ﷺ ہیں۔ **ثم شرب** : تا کہ لوگ آپ ﷺ کی رائے کی پیروی کریں، جو کہ ہر قیاس پر فوقیت رکھتی ہے۔ **فقيل له** : یعنی نبی ﷺ کو۔ **بعد ذلك** : یعنی آپ کے افطار کرنے کے بعد۔ **ان بعض الناس** : یعنی ان کا خیال یہ تھا کہ آپ ﷺ نے افطار بیان جواز کے لئے کیا ہے۔ **قد صام**: یہاں پر ضمیر کو لفظ بعض کی وجہ سے مفرد لایا گیا ہے، لیکن یہ لوٹتی اس کے معنی کی طرف ہے۔ **فقال اولئك العصاة** : یعنی انہوں نے یقین کو چھوڑ کر ظن پر عمل کیا، جب کہ ان کو سوال پر بھی قدرت تھی۔

اولئك العصاة : اس کا تکرار تاکید کے لئے ہے، یا تشدید کے لئے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ ''خبر'' پر لام تعریف جنس کے لئے ہے یعنی انہوں نے پوری نافرمانی کی، یا یہ مکمل نافرمان ہیں، اس لئے کہ نبی ﷺ نے پانی کے پیالے کو اس لئے بلند کیا تا کہ لوگ دیکھ کر آپ ﷺ کی پیروی کریں، اور اللہ کی رخصت کو قبول کر لیں۔ پس جس نے اس کے باوجود روزہ رکھا اور افطار نہ کیا تو گویا اس نے نافرمانی کی حد کراس کر لی۔ اور آپ کی اس بات (**اولئك العصاة**) کو زجر و توبیخ پر محمول کیا جائے گا، کیونکہ ظاہری طور پر یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی، اس لئے کہ ان کے افطار کرنے کے بارے میں کوئی صریح حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ امام نوویؒ نے کہا: کہ اس کو محمول کیا جائے گا، اکیلے روزہ رکھنے والے پر۔ کیونکہ انہیں روزہ افطار کرنے کا قطعی حکم ملا تھا بیان جواز کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے۔ اور ابن ہمام نے کہا: کہ اس کو محمول کیا جائے گا، ان کا اپنے آپ کو مشقت، تکلیف اور نقصان میں ڈالنے پر۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث بھی اس بارے میں شاہد ہے کہ آپ سے کہا گیا کہ لوگوں پر روزہ بڑا شاق ہے اور وہ اس وجہ سے پریشان ہیں، اور واقدی نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں روزہ افطار کرنے کا حکم دیا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ اور اگر چہ عبرت عموم لفظ سے ہوتی ہے خصوص سبب سے نہیں، لیکن اس کو اس پر محمول کیا جائے گا احادیث کا تعارض دور کرنے کے لیے کیونکہ وہ سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں صریح ہیں۔

سفر میں روزہ رکھنے کو آپ ﷺ نے ناپسند کیا

۲۰۲۸: وَ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَائِمُ رَمَضَانَ فِي السَّفَرِ كَالْمُفْطِرِ فِي الْحَضَرِ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه النسائي في السنن ۱۸۳/٤ حديث رقم ۲۲۸۵۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰنؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سفر میں رمضان کا روزہ رکھنے والا حضر میں

افطار کرنے والے کی طرح ہے۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عبد الرحمٰن بن عوف قال : قال رسول اللہ ﷺ صائم رمضان فی السفر : یعنی جس میں نقصان اور مشقت کا احتمال ہو۔ کالمفطر فی الحضر : یعنی اس کا گناہ اتنا ہی ہے جتنا کہ ایک انسان کمال قدرت کے باوجود افطار کردے۔ میرکؒ نے کہا: کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا ایسے ہی منع ہے جیسے حضر میں افطار کرنا منع ہے۔

میں کہتا ہوں: کہ یہ حدیث کا ظاہر ہے، اور اسی کی طرف اہل ظاہر بھی گئے ہیں۔ تو ہم اس حدیث اور جو اس کے صریحاً خلاف احادیث وارد ہیں ان میں جمع کی صورت نکالتے ہیں۔ جیسا کہ جمہور علماء کا طریقہ ہے، پہلا قول کہ یہ دونوں برابر ہیں کیونکہ ایک رخصت کے ترک کے بارے میں ہے اور دوسری عزیمت کے ترک کے بارے میں۔ اس کو طیبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہیں کیونکہ رخصت کا ترک مباح ہے جب کہ عزیمت کا ترک حرام ہے۔ (واللہ اعلم)

ابن ہمام نے کہا: یہ حدیث عبداللہ بن موسیٰ التیمی سے مروی ہے انہوں نے اسامۃ بن زید سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے انہوں نے اپنے باپ سے بیان کی۔ اور اسی طرح اس کو بزارؒ نے بیان کیا ہے: قال : عن عبد اللہ بن عیسی المدینی حدثنا أسامه بن زید به پھر کہا کہ اس حدیث کو اسامہ بن زید نے مسند بیان کیا ہے اور یونس نے ان کی متابعت کی ہے۔ اور اسے ابن ابی ذئب وغیرہ نے زہری سے انہوں نے ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے اپنے باپ سے' اور یہ عبدالرحمٰن پر موقوف ہے، اور اگر بالفرض یہ مرفوع بھی ثابت ہو جائے تو پھر یہ حدیث کہ "کان خروجه ﷺ حین خرج فصام حتی بلغ الکدید ثم افطر وامر الناس بالفطر" اس کے منسوخ ہونے پر دلیل ہے۔ اور "کدید" جو حرمین کے درمیان میں جگہ ہے اس کو کہتے ہیں۔

ابن ہمام نے کہا: کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حدیث صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے، قال: "خرج رسول اللہ ﷺ عام الفتح فی رمضان فصام حتی بلغ الکدید ثم افطر"۔ امام زہری نے کہا: کہ افطار کرنا دو اَمرُوں میں سے آخری امر ہے، اور اسی چیز کو دلیل بناتے ہوئے روزہ کی ممانعت کے قائلین نے حالت سفر میں روزہ کو منع قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے دونوں حکموں میں سے آخری حکم کو لیا جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بظاہر تو ہمیں تعارض نظر آتا ہے لیکن جب جمع کی صورت ممکن ہو تو پھر کسی ایک کو چھوڑنے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ ان میں جمع کی صورت پیدا کر کے دونوں پر عمل کیا جائے۔ اور اسی طرح بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی حدیث کو منسوخ بھی قرار نہ دیا جائے۔

تو ان احادیث میں جمع کی صورت یہ ہے کہ جن احادیث میں روزہ نہ افطار کرنے والوں کو گناہ اور عدم ثواب کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ تو یہ اس صورت میں ہے جب کہ کوئی انسان مشقت و تکلیف اٹھا کر روزہ رکھے، جیسا کہ اس بارے میں پہلے احادیث گزر گئی ہیں۔

اور وہ احادیث جن میں روزہ رکھنے کا جواز ہے، تو وہ ثبوت کے لحاظ سے بھی زیادہ مضبوط ہیں اور صحت کے لحاظ سے بھی، اور وہ کتاب اللہ سے بھی موافقت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ

اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ......﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] ''اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرلے۔ خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ اور (یہ آسانی کا حکم) اس لیے (دیا گیا ہے) کہ تم روزوں کا شمار پورا کرلو اور اس احسان کے بدلے کہ خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔''

تو اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے روزوں کو مؤخر کرنے کی علت یہ بیان کی ہے کہ تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اور تمہیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تو آسانی روزے کے افطار کرنے کے ساتھ متعین نہیں ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو روزہ رکھنے میں آسانی ہوتی ہے جب کہ وہ رکھنے کی قدرت رکھتا ہو، اور روزہ رکھنے سے اسے کبھی نقصان کا بھی سامنا نہ ہوتا ہو، تو اس صورت میں لوگوں کی موافقت اور ان کے ساتھ مل جل کر روزہ رکھنے میں آسانی ہوتی ہے، اور اس وقت میں نفس بھی روزہ رکھنے کا عادی بن چکا ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں انسان پر روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے۔ بصورت دیگر اگر کوئی بھی روزہ رکھنے والا نہ ہو اور نفس بھی اس وقت میں روزہ رکھنے کا عادی نہ ہو تو پھر روزہ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تو اس تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرۃ: ۱۸۴] اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ افطار کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اگر وہ افطار کرے تو افطار کی ہوئی گنتی پوری کرلے، یا معنی یہ ہوا کہ اس پر ان دونوں کی گنتی ہے جس کے لئے تاخیر کرنا جائز تھی، نہ کہ وہ معنی جس کی طرف اہل ظاہر گئے ہیں۔

سفر میں رخصت پر عمل کرنا بہتر ہے

۲۰۲۹: وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الْاَسْلَمِیِّ اَنَّهٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَجِدُبِیْ قُوَّةً عَلَی الصِّیَامِ فِی السَّفَرِ فَهَلْ عَلَیَّ جُنَاحٌ قَالَ هِیَ رُخْصَةٌ مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَبِهَا فَحَسَنٌ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یَصُوْمَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۹۰/۲ حدیث رقم (۱۰۷۔ ۱۱۲۱)۔ والنسائی فی السنن ۱۸۶/۴ حدیث رقم ۲۳۰۳۔

ترجمہ: حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں کیا روزہ رکھنے کی وجہ سے مجھ پر کوئی گناہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا افطار کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے۔ پس جس شخص نے یہ رخصت لے لی پس اس نے اچھا کیا پس جو شخص روزہ رکھنا چاہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

تشریح: وعن حمزة بن عمرو الاسلمی انه قال یا رسول الله انی اجد بی قوة : یعنی زائد۔ علی الصیام فی السفر فهل علی جناح : یعنی کوئی گناہ یا روزہ رکھنے یا افطار کرنے میں کوئی مضائقہ وغیرہ ہے۔ قال : هی : یعنی افطار۔ رخصة خبر مؤنث ہونے کی وجہ سے ضمیر بھی ~~مؤنث~~ آئی ہے۔ من الله عز و جل : اس لئے کہ روزہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ”تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہئے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے“۔

اور طیبی رحمہ اللہ نے کہا: "هي رخصة" کی ضمیر سوال کے معنی کی طرف لوٹتی ہے، یعنی "هل عليّ اثم أن أفطر" اور ضمیر خبر کی وجہ سے مؤنث لائی گئی ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے "من كانت امّك"۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ سائل نے یہ سنا ہو کہ سفر میں روزہ رکھنا ”عصیان“ نافرمانی ہے، جیسا کہ جابر کی روایت میں ہے "اولئك العصاة" تو اس نے سوال کیا کہ کیا مجھ پر کوئی گناہ ہے، کہ اگر میں قدرت ہونے کے باوجود روزہ رکھوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! کیونکہ افطار رخصت ہے۔ اور لفظ "الحسن" پہلی وجہ کو تقویت دیتا ہے۔ کیونکہ نافرمانی تو رخصت کو رد کرنے پر ہے نہ کہ رخصت پر عمل کرنے میں۔

ابن حجرؒ نے کہا: کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ کیا افطار کرنے پر مجھے کوئی گناہ ہے۔ کیونکہ میں تو قوی ہوں اور رخصت تو ضعیف کے لئے ہے۔ یا روزہ رکھنے میں مجھ پر کوئی گناہ ہے اس لئے کہ افطار کرنا رخصت ہے اور رکھنا واجب ہے۔

هي: یعنی یہ مذکورہ فعل یا خصلت، یعنی سفر میں روزہ افطار کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے، تاکہ اس کے بندوں کے لیے آسانی ہو جائے اور مشقت اور تکلیف ان سے دور ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ما جعل الله عليكم في الدين من حرج﴾ [الحج: ۷۸] اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اور خبر کے مونث ہونے کی وجہ سے ضمیر بھی مونث لائی گئی ہے۔ فمن اخذ بها: یعنی رخصت کو۔ فحسن: یعنی اس کا یہ کام اچھا اور پسندیدہ ہے۔ اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے: ”بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح فرائض پر عمل کرنے کو پسند کرتا ہے ایسے ہی رخصت پر بھی عمل کرنے کو پسند کرتا ہے“۔ ومن احب ان يصوم: دو شرطوں کے درمیان عبارت کا مختلف ہونا وہ روزے کی افضلیت کی طرف لطیف اشارہ کرتا ہے۔

فلا جناح عليه: یہاں پر بھی ظاہری مقابلہ کا تقاضا تو یہ تھا "فلا جناح عليه" کی بجائے "فحسن" یا احسن کہا جاتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بھی تقاضا ہے: ﴿وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة: ۱۸٤] بلکہ ہونا تو اس طرح چاہئے کہ پہلے میں رخصت ہوتی اور ثانی میں عزیمت ہوتی اور جزاء میں بھی اس کے برعکس معاملہ ہوتا، یعنی پہلے کے بارے میں "فلا جناح عليه" کہا جاتا اور دوسرے کے بارے میں "فحسن" کہا جاتا لیکن یہاں پر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے کیونکہ جب رخصت پر عمل کرنے کو ”حسن“ کہا گیا ہے تو عزیمت پر عمل کرنا تو بالاولی ”احسن“ ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نور نبوت سے جان لیا ہو کہ سائل کی مراد "هل على جناح" "افطار" کی بجائے "صوم" ہو یعنی کیا سفر میں روزہ رکھنے سے مجھ پر کوئی گناہ ہے، جیسا کہ حدیث کا شروع والا حصہ "انی اجد بی قوة على الصيام" بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے اور ایسے حضرت حمزۃ بن عمرو سے حدیث پہلے باب میں بھی گزر چکی ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

بَابُ الْقَضَاءِ

یعنی روزوں کی قضاء کا حکم اور اس کے آداب کا بیان

فائدہ: اس باب میں قضاء روزوں کے احکامات اور آداب بیان کئے گئے ہیں اور ظاہر ہے اس سے مراد رمضان کے روزوں کی قضاء ہے اور جو شخص رمضان کا روزہ توڑ ڈالے اس کے تین حکم ہیں اگر بھول کر افطار کرے نہ قضاء ہے نہ کفارہ اگر قصداً ہو بغیر عذر کے تو کفارہ آئے گا اگر سفر اور مرض کے عذر کی وجہ سے ہوگا تو اس میں قضاء ہے۔

الفصل الاول:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول قضاء روزوں کے بارے میں

۲۰۳۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ عَلَيَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ فَمَا اسْتَطِيْعُ اَنْ اَقْضِيَ اِلَّا فِيْ شَعْبَانَ قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ تَعْنِي الشُّغْلُ مِنَ النَّبِيِّ اَوْ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۸۹/۴۔ حدیث رقم ۱۹۵۰۔ ومسلم فی صحیحه ۸۰۲/۲ حدیث رقم (۱۵۱۔ ۱۱۴۶)۔ والترمذی فی السنن ۱۵۲/۳ حدیث رقم ۷۸۳۔ واحمد فی المسند ۱۷۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھ پر رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے میں ان کی قضاء کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی مگر شعبان میں۔ یحیٰ کے بیٹے نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے رمضان کے قضاء روزے نہیں رکھ سکتی تھی یا یہ فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن عائشه رضی الله عنها — قالت : کان : یعنی واقعہ اور معاملہ۔

یکون علی الصوم : یعنی روزوں کی قضاء۔

من رمضان : طیبی رحمہ اللہ نے کہا: "صوم" کان، کا اسم ہے۔ اور "علیّ" اس کی خبر ہے۔ اور "یکون" زائدہ ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے: "ان من افضلهم......"۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ کان زائدہ ہے، اور ابن حجرؒ نے ان کی پیروی کرتے ہوئے اس بارے میں یہ مثال بیان کی ہے: "وما علمی بما کانوا یعملون" کی جیسا کہ بیان پر "کانوا" زائدہ ہے۔ لیکن ان کی مثال ٹھیک نہیں ہے، جیسا کہ واضح ہے۔ اور اسی طرح ان کا یہ قول بھی غیر صحیح ہے، کہ یہاں پر "یکون" غیر زائدہ ہے، کیونکہ یہ "حَضَرَ" کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ "کان الصوم من رمضان یحضر علی"، یعنی مجھ پر رمضان

کے روزے حاضر ہوتے۔ یعنی ان کی قضاء کا وقت مجھ پر اس حالت میں آتا کہ میں طاہرہ اور صحیحہ ہوتی اور اس کی مقدر عبارت اس طرح بھی ہو سکتی ہے: "كان الصوم" "يحضر الصوم"" اور كان کا مرجع غیر مذکور کی طرف ہوتا۔

اگر کہا جائے كان کی زیادتی کے ساتھ ماضی سے حال کی طرف پھیرنا مقصود ہوگا، لیکن یہ ان کے قول کے مناسب نہیں۔

فما استطيع : یعنی میں قدرت نہیں رکھتی تھی۔ **ان أقضي الا في شعبان قال : يحيى بن سعيد** : حدیث کے راوی ہیں روایت میں ان کے غیر کی زیادتی ہے، اور یہ ابن حجر کا قول ہے —— کہ ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی تفسیر ہے۔

الشغل : امام نوویؒ نے کہا: کہ دیگر نسخوں میں بھی "الف لام" کے ساتھ مذکور ہے، اور فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے ان "يمنعني الشغل" یعنی مجھے شغل منع کر دیتا۔

اور ظاہر بھی یہی ہے کہ آپ کو روزے رکھنے سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مشغولیت مانع تھی۔ **من النبي او بالنبي ﷺ** : "من" تعلیلہ اور 'باء' سببیہ ہے۔ مطلب یہ ہوا: کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے نفس کو ہر وقت نبی ﷺ کے استمتاع کے لئے تیار رکھتیں، اگر آپ ﷺ اس کا ارادہ کرتے تو۔ اس کو طیبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روزوں کی قضاء کو شعبان تک مؤخر کر دیتیں آپ ﷺ کے استمتاع کی وجہ سے، اور اس لئے بھی کہ شعبان روزوں کی قضاء کا آخری وقت ہے اور اشرف نے کہا: کہ شعبان تک مؤخر کرنے کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ بھی شعبان میں اکثر روزے رکھتے تھے، جب کہ روایات میں آیا ہے "كان يصوم شعبان الا قليلا"۔ لہٰذا آپ ﷺ کی مشغولیت اس مہینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم ہو جاتی، اور ان کو روزے رکھنے کی فرصت مل جاتی اور اس میں یہ بھی ہے کہ آپ کو ان کی ضرورت رات کو ہوتی تھی۔

پھر "او" راوی کی طرف سے شک ہے اور ظاہری بات ہے کہ وہ یحییٰ کی طرف سے ہے۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ 'نوع' (قسم) کے لئے ہو، (الشغل) مبتداء ہے اور مقدر عبارت اس طرح ہے "الشغل المانع لقضاء الصوم" یعنی صوم کی قضاء کے لئے مشغولیت مانع تھی۔ یا تو وہ مشغولیت نبی ﷺ کی طرف سے تھی، یا پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ آپ کی خدمت میں مشغول رکھنے کی وجہ سے روزوں کی قضاء ادا نہ کر سکتیں۔

زرکشی نے کہا: کہ یہ فعل مضمر کی وجہ سے مرفوع ہے، یعنی اصل میں اس طرح ہے "اوجب لك الشغلُ" او "منّي الشغل" اور بخاری کا بیان ہے کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نہیں ہے بلکہ کسی غیر کا "مدرج" ہے۔ اور بعض حضرات نے مسلم کی اس روایت سے اعتراض اٹھایا ہے اس پر کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو خود بیان کرتی ہیں "کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزوں کی قضاء ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتی تھی، لیکن اس میں نظر ہے۔

نفلی روزہ خاوند کی اجازت سے رکھنا چاہیے

۲۰۳۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ لِلْمَرْاَةِ اَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ وَلَا تَاْذَنَ فِیْ بَيْتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۹۵/۹۔ حديث رقم ۵۱۹۵۔ ومسلم في صحيحه ۷۱۱/۲ حديث رقم (۱۰۲۶/۸٤)۔ وابوداؤد في السنن ۸۲٦/۲ حديث رقم ۲٤۵۸۔ والترمذی ۱۵۱/۳ حديث رقم ۷۸۲۔ وابن ماجه ۵٦۰/۱ حديث رقم ۱۷٦۱۔ والدارمی ۲۱/۲ حديث رقم ۱۷۲۰ واحمد في المسند ٤٤٤/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عورت کو خاوند کی موجودگی میں بدوں اس کی اجازت کے نفلی روزہ رکھنا درست نہیں۔ اور خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہ دے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ لا يحل للمرأة ان تصوم : یعنی نفلی روزہ۔ تاکہ خاوند پر اس سے استمتاع نہ چھوٹ جائے۔ وزوجها شاهد : یعنی اس کا خاوند گھر میں یا اس کے شہر میں موجود ہو تو۔ الا باذنه : یہ اجازت صراحت کے ساتھ ہو یا اشارۃً ہو۔ اور نفلی روزے کی ممانعت پر حدیث کا مطلق ہونا شافعیہ پر حجت ہے۔ جنہوں نے عرفہ، اور عاشورا کے روزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں روزے کے ساتھ نفلی نماز کو بھی نہیں ملایا جا سکتا، کیونکہ نماز کا وقت کم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ روزے کی طرح اعتکاف بھی ہے خصوصاً اس قول کے مطابق جس کے ہاں اعتکاف کے لئے روزہ شرط ہے۔ اور بغیر روزے کے اعتکاف درست نہیں ہے۔

اور رہا شافعیؒ کے اصحاب کا یہ قول کہ خاوند اپنی بیوی کو مندوب اعتکاف کی اجازت دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہے، کیونکہ نفلی عبادت کو شروع کر لینے کے بعد اس سے رجوع کر لینے میں قضاء نہیں ہے، اور ایسا ہی روزے کا معاملہ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ انتہائی درجہ کی بعید بات ہے اگر ایسی بات تھی تو اس کو اجازت دینے کی طرف رخ ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور ویسے بھی یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ظاہر کے خلاف ہے ﴿لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۳۳]۔ اور اس قول "لا يحل" کو "لا ينبغي" کے معنی پر محمول کرنا بعید نہیں ہے۔ تو عبارت اس طرح ہوگی "لا ينبغي ان تصوم قضاء رمضان أو قضاء صوم النفل اذا كان الوقت متسعًا"۔ یعنی اس کے لئے مناسب، یا جائز نہیں کہ وہ رمضان کے روزوں کی یا نفلی روزوں کی قضاء کرے جب کہ اس کے پاس وقت وسیع ہو، تاکہ اس ترجمے سے باب کے عنوان سے مناسبت ہو جائے (واللہ اعلم بالصوب)۔

ولا تأذن : اور بعض صحیح نسخوں میں "نصب" کے ساتھ اور "تصوم" پر عطف ہے۔ یعنی اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی اجنبی یا رشتے دار حتیٰ کہ عورتوں کو بھی خاوند کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اجازت دے۔

اور اسی صورت میں "لا" زائدہ تاکید کے لیے ہے اور ابن حجرؒ نے کہا کہ "خبر" ہونے کی بناء پر اسے رفع دینا بھی جائز ہے۔ اور اس صورت میں مراد نہی ہوگی۔ اور نہی ہونے کی بناء پر جزم دینا بھی درست ہے۔

فی بيته : یعنی اس کے گھر میں داخل ہونے کی۔ الا باذنه : یعنی اس کی رضامندی سے۔

عورت کے ذمے روزے کی قضاء ہے نہ کہ نماز کی

۲۰۳۲: وَعَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ لِعَائِشَةَ مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ وَ لَا تَقْضِي الصَّلٰوةَ

قَالَتْ عَائِشَةُ كَانَ يُصِيبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلٰوةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٦٥/١ حديث رقم (٦٩ ـ ٣٣٥)۔

ترجمہ:حضرت معاذہ عدویہؒ سے روایت ہے کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ حائضہ عورت کا کیا حال ہے کہ روزہ قضا کرتی ہے اور نماز قضا نہیں کرتی۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم حیض سے ہوتی ہیں تو ہمیں روزے کی قضا کا حکم ہوتا تھا اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں کیا جاتا تھا۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن معاذة العدوية انها قالت لعائشة ما بال الحائض: یعنی حائضہ کا کیا حال ہے؟ اور "الحائض" اور "ۃ" اس کے اختصاص کی وجہ سے داخل نہیں ہوئی کیونکہ لفظ "حائض" یہ صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ تقضي الصوم : یعنی وہ روزے جو حیض کے دنوں میں چھوٹ جاتے ہیں۔ولا تقضي الصلاة : جب کہ یہ دونوں فرض ہیں اور ایک ہی علت کی وجہ سے دونوں کو چھوڑا جاتا ہے، اور وہ حیض ہے اور حیض کے معنی میں نفاس بھی آتا ہے۔قالت عائشة كان : یعنی حالت وکیفیت۔يصيبنا ذلك :"کاف" کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے، یعنی حیض۔فنؤمر: یعنی ہم عورتوں کی جماعت کو۔بقضاء الصوم :یعنی شاید روزے کی کمیابی یا قلت کی وجہ سے۔

ولا نؤمر بقضاء الصلاة : نمازوں کی کثرت اور ان کی ادائیگی کی وجہ سے جو کہ مشقت کو لازم کرنے والی ہے۔"شرح الطیبی" میں کہا گیا ہے کہ یہ حکیم کے اسلوب میں سے ہے کہ علت کے متعلق سوال کو چھوڑ کر اہم چیز کا جواب دے دینا نص کی متابعت اور شرع کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہوئے اور ایسی حالت میں جب کہ سائلہ غیر واقف ہو اصل مسئلہ سے تو پھر کی وضاحت نہیں کی جاتی بلکہ اہم کام کے متعلق آگاہ کر دیا جاتا ہے، اور ظاہر اس کے خلاف ہے کہ ان کا یہ جواب یا تو علت کی واقفیت سے عاجز آکر انہوں نے دیا، یا پھر عبودیت کے سمندر میں غوطہ زن ہونا ذھنی امور میں عبادت کی غرض سے، پس میں نصف علم کو نہیں جانتا۔قولہ تعالیٰ: ﴿ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا...... ﴾ [البقرة : ٣٢] "انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں، بیشک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔"

یا پھر سائلہ نے اس علت کا ارادہ کیا جس کی وضاحت آپ نے کر دی ہو، تو مسئولہ نے واضح کر دیا کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کچھ سنا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سنا ہے۔واللہ اعلم

اور یہ علت بیان کرنا اس کے منافی نہیں ہے، کہ روزوں کی قضاء اداء کرنے میں مشقت نہیں ہے، کیونکہ وہ سال میں ایک دفعہ آتے ہیں بخلاف نماز کی قضاء کے' کیونکہ اس میں مشقت بہت زیادہ ہے۔کیونکہ حیض غالباً مہینے میں ۶ یا ۷ دن اور بعض دفعہ ۱۰ دن تک بھی چلا جاتا ہے، تو اس لحاظ سے سال میں تقریباً چار مہینے نمازوں کی قضاء لازم آئے گی، اور یہ انتہاء درجہ کی مشقت ہے۔

اور رہا ابن حجرؒ کا قول: کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے علت کے سوال کا جواب اس لے چھوڑ دیا کہ علت خفی تھی، اور وہ اس کے سمجھنے سے قاصر تھیں۔یہ بات بالکل سمجھ سے بالاتر ہے۔

جب کہ صحابیات اس جیسی فہم سے خالی نہیں تھیں، ابن حجرؒ کے قول کی طرح ہی علامہ التفتازانی کا بھی قول ہے جیسا کہ انہوں

نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق کہا: ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ [البقرة: ١٨٩] (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے)'' کہ یہ بھی حکیم کے اسلوب میں سے ہے کیونکہ صحابہ ''علم ہیئت'' کے متعلق دقائق کو نہیں جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ اسلوب اختیار کر لیا، جب کہ ہمارے شیخ جلال الدین السیوطی نے کہا کہ یہ ان کی فحش غلطی ہے کیونکہ من جملہ سائلین میں سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انه اعلم الصحابة بالحلال و الحرام'' ''کہ یہ حلال وحرام کے معاملہ میں تمام صحابہ سے زیادہ جانتے ہیں''۔ اور دونا مور باعزت صحابہ میں سے تھے۔ اور ان سائلین میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کہ ''مدينة العلم'' علم کا دروازہ تھے۔

ورثاء کی طرف سے قضا روزوں کا فدیہ

۲۰۳۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهٗ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٩٢/٤۔ حديث رقم ١٩٥٢۔ ومسلم في صحيحه ٨٠٣/٢ حديث رقم (١٥٣۔ ١١٤٧)۔ وابوداوٗد في السنن ٧٩١/٢ حديث رقم ٢٤٠٠۔ وابن ماجه ٦٨٩/١ حديث رقم ٢١٣٣۔ واحمد في المسند ٦٩/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص مر جائے اور اس پر روزہ ہو تو اس کی طرف سے اس کا وارث روزہ رکھے۔ یہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: وعن عائشة قال: قال رسول الله ﷺ من مات وعليه صوم: یعنی روزوں کی قضاء ہو، ابن حجرؒ نے کہا: کہ چاہے وہ رمضان کے روزے ہوں یا رمضان کے روزوں کی قضاء ہو، یا نذر اور کفارے کے روزے ہوں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صام: یعنی کفارہ دے۔ عنه وليه: طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ اس حدیث کی تأویل یہ ہے کہ ولی کھانا کھلا کر اس کا تدارک کر دے گا اور اس کا کھانا کھلانا ہی گویا کہ روزہ رکھنا ہے، اور مختار قول کے مطابق ولی ہر قریبی رشتہ دار ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی اس کے ظاہر کی طرف گئے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ احمد اور اسحاق کا قول ہے اور اگر اجنبی ولی کی اجازت سے روزہ رکھ لے تو ان کے نزدیک جائز ہے، جو ولی کے روزہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اور داؤد نے کہا: کہ نذر اور قضاءِ رمضان میں یہ ہے کہ ولی ان کی طرف سے کھانا کھلا دے، روزہ نہ رکھے۔ میرکؒ نے کہا: کہ علماء نے اختلاف کیا ہے اس آدمی کے بارے کہ جو فوت ہو جائے اور اس پر واجب روزے ہوں تو جمہور علماء امام مالک، ابوحنیفہ، شافعی کے دو قولوں میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس کی طرف سے کوئی روزہ نہ رکھا جائے۔ اور حدیث والے اسی طرف گئے ہیں کہ ولی اس کی طرف سے کھانا کھلائے، اور باقی بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ ولی عملاً اس کی طرف سے روزہ رکھے، کیونکہ ظاہر حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے اور یہی قول امام احمدؒ کا اور شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول ہے اور نوویؒ نے اسے

صحیح کہا ہے اور محققین شافعیہ کی ایک جماعت سے یہ نقل کیا ہے کہ جو روزے کا کہتا ہے تو اس کے لیے کھانا کھلانا جائز ہے اور ولی کو روزے اور کھانے کے درمیان اختیار دے دیا جائے گا۔ اس لئے کہ قیاس اور صحابہ کا فتویٰ اس کے مخالف ہے
اور اسی طرح آنے والی حدیث بھی اگرچہ وہ موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے پھر ہمارے نزدیک وصیت میں لزوم اطعام وارث پر لازمی ہے، بخلاف شافعی کے کہ اگر وہ ثلث مال کی وصیت کرتا ہے تو پھر تو وارث پر اس کا نکالنا لازم ہے اور اگر ثلث سے زیادہ کرتا ہے تو پھر لازم نہیں ہے، ہاں! اگر وہ اپنی خوشی سے اس کی وصیت کو پورا کر دیتا ہے تو میت کی طرف سے نفلی صدقہ، یا عبادت سمجھی جائے گی اور ایسی صورت میں اس کے اجزاء کے جواز کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اسی طرح ابن ہمام نے کہا ہے۔ اور سب کچھ اس صورت میں ہے جب کہ قضاء کے امکان کے بعد اس سے کوئی چیز چھوٹ جائے، اور جس آدمی سے قضاء کے امکان سے قبل ہی رمضان میں سے کوئی چیز چھوٹ جائے تو ایسی صوت میں نہ اس پر اس کا کوئی تدارک ہے اور نہ ہی کوئی گناہ ہے اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے طاوس اور قتادۃ کے' کہ وہ صوم اور کفارۃ کے ساتھ اس کے تدارک کو واجب قرار دیتے ہیں اگرچہ وہ قضاء کے امکان سے قبل ہی مر جائے۔

احمد، اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس مرنے والی عورت کی قریبی رشتہ دار کوئی عورت آئی اور اس نے کہا کہ اس پر ایک ماہ کی نذر تھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "صومی عنها" کہ تم اس کی طرف سے روزے رکھو، یعنی اس کی نذر کو پورا کرو۔

الفصل الثانی:

روزے کے فدیہ کا بیان

۲۰۳۴: عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَلْيُطْعَمْ عَنْهُ مَكَانَ كُلِّ يَوْمٍ مِسْكِيْنٌ۔ (رواه الترمذی وقال والصحيح انه موقوف على ابن عمر)

اخرجه الترمذی فی السنن ۹۶/۳ حديث رقم ۷۱۸۔ وابن ماجه ۵۵۸/۱ حديث رقم ۱۷۵۷۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے روایت ہے انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مر جائے اور اس پر رمضان کے مہینے کے روزے ہوں تو چاہیے کہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک فقیر کو کھانا کھلایا جائے۔ یہ روایت امام ترمذی نے نقل کی ہے اور کہا کہ یہ حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔ یعنی یہ قول حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے۔

تشریح: عن نافع عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال: من مات وعليه صيام شهر رمضان فليطعم عنه: يطعم کو مجہول پڑھا گیا ہے۔ مكان كل يوم: یعنی جتنے بھی فوت شدہ روزوں کے دن ہیں، اور اسی طرح ہر نماز میں بھی، اور یہ بھی قول ہے کہ ہر دن کی ہر نماز میں۔ مسكين: یعنی آدھا صاع گندم کا ایک صاع جَو کا یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی

قیمت۔ وقال والصحیح انه موقوف علی ابن عمر : تصحیح کے بارے میں نقل کرتے ہوئے میرکؒ نے کہا: کہ ہم اسے نہیں پہچانتے مگر اسی طریق سے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ موقوف ہے جیسا کہ ترمذی نے کہا ہے اور امام نوویؒ نے کہا: کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے، اور اگر بالفرض ثابت ہو بھی جائے تو پھر اس کے اور اس سے پہلے والی حدیث کے درمیان جمع ممکن ہے، وہ اس طرح کہ دونوں حکموں کو جواز پر محمول کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: کہ آنے والی حدیث اس محمول سے انکار کرتی ہے۔ اور ابن ملقن نے کہا: کہ اس حدیث کو ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے جیسا کہ ترمذی، دارقطنی اور بیہقی وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔

اور یہ بات تو واضح ہی ہے کہ یہ موقوف 'مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ راوی اس جیسی بات اپنی طرف سے نہیں کر سکتا۔

الفصل الثالث:

کسی کی طرف سے نماز اور روزہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے

۲۰۳۵: عَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُسْئَلُ هَلْ يَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ اَوْ يُصَلِّي اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ فَقَالَ لَا يَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا يُصَلِّيْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ۔ (رواه فی الموطأ)

اخرجه مالك في الموطأ ۱/۳۰۳ حديث رقم ٤٣ من كتاب الصيام۔

ترجمہ: حضرت مالکؒ سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی کسی طرف سے روزہ رکھے یا کوئی کسی کی طرف سے نماز پڑھے؟ پس ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے اور نہ نماز پڑھے۔ یہ روایت مؤطا نے نقل کی ہے۔

تشریح: عن مالك بلغه ان ابن عمر كان يسأل : یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ هل يصوم احد عن احد أو يصلی احد عن احد فيقول لا يصوم احد عن احد : یعنی اس کی طرف سے یا بدلے میں۔ ولا يصلی احد عن احد : شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا مذہب ہے اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے اور یہی قول احمدؒ کا بھی ہے اور حسن بصری نے کہا: کہ اگر اس کی طرف سے ایک ہی دن میں تیس آدمی روزہ رکھیں، تو یہ بھی جائز ہے اور اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے' کہ نماز کا کفارہ نہیں ہے۔

اور یہ شافعیؒ کا قول ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے ساتھیوں نے کہا: کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے گا۔

اور ایک قوم نے کہا: کہ اس کی طرف سے نماز ادا کی جائے گی۔

تو گویا کہ انہوں نے اتفاق سے مراد شافعیہ کا اتفاق لیا ہے۔ پس انہوں نے روزے میں اختلاف کیا ہے۔

رواه : یعنی مالک نے۔ فی المؤطا: اور مصنف کی پہلی عبارت میں جو کلام وارد ہوتا تھا وہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن ہمام نے کہا: کہ شافعیؒ کے قول کی وجہ یا دلیل وہ ہے جو کہ صحیحین میں ''ابن عباس رضی اللہ عنہ'' سے مروی ہے: "جاء رجل الى النبى ﷺ فقال ان امى ماتت وعليها ﷺ صوم شهر، أفأ قضيه عنها؟ فقال : لو كان على أمك دين، أكنت قاضيه عنها، قال نعم! قال : فدين الله احق" ''کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میری والدہ فوت ہو گئی اور اس پر ایک ماہ کے روزے تھے، تو کیا میں اس کی طرف سے اداء کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں پر قرض ہوتا' تو تم اس کو اداء کرتے؟ اس نے کہا' ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ کا قرض تو زیادہ حقدار ہے''۔

ہم کہتے ہیں: کہ اس حدیث کو اس کے ظاہر سے پھیرنے پر اتفاق ہے۔ اس لئے کہ نماز میں قرض درست نہیں، جیسا کہ نسائی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے ''سنن الکبریٰ'' میں روایت نقل کی ہے، کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کی طرف سے نہ نماز پڑھے، اور نہ ہی روزہ رکھے''۔ اور راوی کا اپنی مرویہ عنہ کے خلاف فتویٰ اس کی روایت کے ناسخ کے مقام میں ہے اور نسخ کا حکم اس اعتبار سے علت کے اخراج پر دلالت کرتا ہے۔ اور عبدالرزاق نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور امام مالکؒ کا اس کو "بلاغًا" کے ساتھ ''موطأ'' میں ذکر کرنا، امام مالک نے کہا کہ میں نے نہ تو مدینہ میں کسی صحابی سے اور نہ ہی تابعین میں سے یہ سنا کہ انہوں نے کسی کو کسی کی طرف سے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور کسی کو کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھنے کا حکم دیا ہو۔ اور اس سے نسخ کی تائید ہوتی ہے۔ اور وہ حکم جس پر شرع برقرار ہے تو وہ دوسرا ہے۔

اور رہی یہ روایت جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "قال ان من البر بعد البر بالوالدين، أن تصلى لهما مع صلاتك وتصوم لهما مع صومك" ''کہ نیکی کے بعد نیکی والدین کے ساتھ یہ ہے کہ تم اپنی نماز کے ساتھ ان کے لئے بھی نماز پڑھو، اور اپنے روزے کے ساتھ ان کے لئے بھی روزہ رکھو''۔ تو یہ حدیث ''معضل، مرسل'' ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے لئے دعا ہے۔

متأخرین شافعیہ میں سے محبّ الطبری نے کہا: کہ میت کو ہر قسم کی عبادت کا ثواب پہنچتا ہے۔ چاہئے وہ آپ ﷺ اس کی طرف سے واجبہ کو اداء کریں یا کہ مندوب کو۔

اور خاص طور پر ہمارے حنفی بھائیوں نے لکھا ہے کہ انسان کو اپنے عمل کا ثواب دوسروں کے لئے بھی مختص کرنا چاہئے، چاہے وہ نماز ہو یا اور کوئی عبادت۔ بلکہ ان میں سے اکثر کی عبارت یہ ہے کہ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

بَابُ صِيَامِ التَّطَوُّعِ

یعنی یہ نفلی روزے خوشی اور رغبت سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے رکھے جائیں، نہ کہ ڈر پر مرتب ہونے کی تکلیف کی وجہ سے۔ واللہ اعلم

الفصل الاول:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ شعبان کے اکثر روزے رکھنے کی تھی

۲۰۳۶: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يُفْطِرُ وَيُفْطِرُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يَصُوْمُ وَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَاَيْتُهٗ فِيْ شَهْرٍ اَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِيْ شَعْبَانَ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ كُلَّهٗ كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۱۳/٤ حديث رقم ۱۹٦۹۔ ومسلم في صحيحه ۸۱۰/۲ حديث رقم (۱۷۵۔ ۱۱۵٦) واخرجه ابوداؤد في السنن ۸۱۳/۲ حديث رقم ۲٤۳٤۔ والترمذي ۱۱٤/۳ حديث رقم ۷۳٦ وابن ماجه ۵٤۵/۱ حديث رقم ۱۷۱۰۔ ومالك في الموطأ ۳۰۹/۱۔ حديث رقم ۵٦ من كتاب الصيام۔ واحمد في المسند ۱۰۷/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم افطار نہیں کریں گے اور جب افطار کرتے تو ہم کہتے کہ آپ روزہ نہیں رکھیں گے اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تمام مہینے کے روزے پورے کیے ہوں سوائے رمضان کے مہینے کے اور میں نے شعبان کے مہینے کی بنسبت کسی مہینے کے روزے رکھتے نہیں دیکھا یعنی شعبان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے روزے رکھتے تھے کہ غیر شعبان میں اتنے نہیں رکھتے تھے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام شعبان میں روزہ رکھتے تھے۔ یعنی شعبان کے سوائے چند دنوں کے مکمل روزے رکھتے تھے۔ (متفق علیہ)

تشریح: عن عائشة رضي الله عنها : قالت : كان رسول الله ﷺ : یعنی بعض دفعہ۔ يصوم : یعنی نفلی روزے لگا تار۔ حتى نقول لا يفطر : یعنی کبھی کبھی۔ التورپشتی رحمہ اللہ نے کہا: کہ "نقول" نون کے ساتھ والی روایت 'بعض نسخوں' میں نے تاءِ خطاب کے ساتھ بھی پائی ہے، گویا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سامع سے کہا: کہ اگر تم (اے سامع) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتے اور اکثر کے کلام میں ایک روایت "لام" کے نصب کے ساتھ ہے۔ اور بعض ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے اس جیسے مقامات پر مستقل طور پر "رفع" دیا ہے۔ اور ابن الملک نے کہا کہ اس کو "یائے غائب" کے ساتھ پڑھنا بھی جائز

ہے۔یعنی "ویقول القائل" کہ کہنے والا کہتا اور اس میں ضمیر الگ ہے، اور اس کے جواز میں اختلاف ہے اور زیادہ واضح عدم جواز ہے، خصوصاً جب کہ کلام کے ایک جملہ میں ہو۔

ویفطر حتی نقول لا یصوم وما رأیت رسول اللہ ﷺ استکمل صیام شهر قط : یہ سابقہ کلام سے استثناء کے قائم مقام ہے۔**الا رمضان وما رأیته فی شهر اکثر** : رأیت کے دو مفعولوں میں سے دوسرا ہے، اور ضمیر **منه** : آپ ﷺ کے لئے ہے۔**صیامًا** : تمیز ہے۔**فی شعبان** : یہ صیامًا کے متعلق ہے، معنی یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے سوا دوسرے مہینوں یعنی شعبان اور باقی میں روزے رکھتے تھے، اور شعبان میں باقی مہینوں کی نسبت زیادہ روزے رکھتے تھے، یہ بات طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔

اور بعض شارحین نے "فی شهر" کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے مراد غیر شعبان ہے، اور یہ کائن سے "اکثر" میں حال بن رہا ہے، اور "شعبان" یہ مجرور سے حال بن رہا ہے اور "منه" میں ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے، پوری عبارت اس طرح بنی "ما رأیته کائناً فی غیر شعبان اکثر صیاماً منه کائنا فی شعبان" یعنی میں نے آپ ﷺ کو اتنے زیادہ روزے رکھتے ہوئے غیر شعبان میں نہیں دیکھا جتنے کہ میں نے شعبان میں دیکھا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے اس مثال میں ہے: "زید قائمًا احسن منه قاعدًا" یعنی زید کے کھڑے ہونے سے اس کا بیٹھنا زیادہ اچھا ہے یا یہ دونوں ظرف ہیں' پہلا "اکثر" باعتبار زیادت کے' اور دوسرا باعتبار اصل معنی کے' اور ایسی صورت میں اس کا رؤیت کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا، اور بصورت دیگر تفضیل الشیء علی نفسه، حالت واحد کے اعتبار سے لازم آئے گی۔

وفی روایة قالت کان یصوم شعبان کله : یعنی پہلے زمانے یا ابتداء میں پورے مہینے کو روزہ رکھتے۔ **کان** : اور بعض نسخوں میں "وکان" ہے۔**یصوم شعبان الا قلیلا** : امام نوویؒ نے کہا: کہ دوسرا قول پہلے والے قول کی تفسیر ہے۔اور "کله" کے قول کا بیان ہے، یعنی غالب اس مہینے کے روزے زیادہ ہوتے تھے اور یہ تأویل بعید ہے۔ اس پر حضرت عائشہ کے اس قول کو محمول کیا جائے گا، جو کہ پہلی روایت میں ہے" کہ میں نے آپ ﷺ کو رمضان کے مہینے کے علاوہ کبھی بھی کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا"۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک سال میں اس مہینے کے پورے روزے رکھتے، اور دوسرے سال میں اس مہینے کے اکثر روزے رکھتے، ایسی صورت میں عطف پر معنی ہوگا، اور یہ معنی ظاہر الفاظ کے زیادہ قریب ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ بعض دفعہ اس مہینے کے شروع والے روزے رکھ لیتے، اور بعض دفعہ آخر والے اور بعض دفعہ درمیان والے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ لفظ "کله" تاکید ہے، جو کہ شمول کا فائدہ دیتا ہے اور مجاز کا اٹھنا بعض کے احتمال سے ہے اور بعض کے ساتھ اس کی تفسیر کرنا اس کے منافی ہے۔ اور اگر "کان الثانی" اور اس کے متعلقات کو استیناف بنایا جائے، تو یہ دو حالتوں کا بیان ہو جائے گا، یعنی حالت اتمام اور حالتِ غیر اتمام' تو یہ بہت ہی اچھا ہوتا۔ اور اگر واؤ پر عطف کیا جائے تو پھر اس کو اس تاویل پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

شعبان کے روزوں کے بارے میں آپ ﷺ کا معمول

۲۰۳۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ شَهْرًا كُلَّهٗ قَالَتْ مَا عَلِمْتُهٗ صَامَ شَهْرًا كُلَّهٗ اِلَّا رَمَضَانَ وَلَا اَفْطَرَهٗ كُلَّهٗ يَصُوْمُ مِنْهُ حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۲/۸۱۰ حديث رقم (۱۷۳۔ ۱۱۵۶)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ تمام مہینہ روزہ رکھتے تھے؟ فرمایا میں نہیں جانتی آپ ﷺ کو کہ آپ نے تمام مہینہ روزے رکھے ہوں۔ سوائے رمضان کے اور تمام مہینے افطار بھی نہیں کیے یہاں تک کہ اس میں سے کچھ روزے رکھتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اس کو امام مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عبد الله بن شقيق قال : قلت لعائشة لكان النبي ﷺ يصوم شهرا كله قالت : ما علمته صام شهرا كله الا رمضان ولا افطره : یہاں "ہ" ضمیر سے مراد شھر ہے۔ كله : یہ شھر کی تاکید ہے۔ يصوم منه : یعنی اس کے بعض۔ حتى مضى لسبيله : یہ موت سے کنایہ ہے اور لسبيله کے اندر "لام" ایسے ہی ہے جیسے آپ کے اس قول میں "لقيته لثلاث بقين من الشهر" یعنی میں نے اس سے ملاقات کی جب کہ مہینے سے تین دن باقی تھے۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ آپ تین کے لیے مستقبل کا ارادہ رکھتے ہوں۔

یعنی آپ آخری وقت تک مذکورہ حالت پر رہے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کو ادائے رسالت کے لیے مبعوث کیا گیا اور جب آپ ﷺ نے رسالت کو اداء کر دیا تو پھر اپنے اصلی مستقر اور ٹھکانے کی طرف چلے گئے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: کہ پہلا "حتی"، "کی" (تاکہ) کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے اس قول میں ہے: "سرت حتى ادخل البلد" میں نے سفر کیا تاکہ میں شہر میں داخل ہو جاؤں۔ نصب کے ساتھ ہے، جب کہ آپ کا دخول انتظار اور نگرانی کے ساتھ ہو جو کہ پایا جاتا ہے، گویا کہ آپ نے کہا: "سرت حتى ادخلها" میں نے سفر کیا تاکہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔ "سرت" یہ ماضی ہے، لیکن مضارع کے حکم میں داخل ہے، اس وجہ سے کہ یہ سیر کے وجود کے وقت مفعول لہ تھا۔

اور ان کی یہ تحریر کہ پہلا "حتی" روزہ نہ رکھنے کی غایت ہے، کہ آپ ﷺ افطار کرتے رہے کرتے رہے اور پھر مہینے کے آخر میں کچھ روزے رکھ لئے۔

اور دوسرا "حتی" آپ ﷺ کی دونوں حالتیں "روزہ رکھنے اور افطار کرنے کے بارے میں"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عدم معرفت کی غایت کے بارے میں ہے۔

اور استمرار کا علم ماضی پر نفی کے دخول سے ہوتا ہے اور اس حدیث کے وارد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کسی پورے مہینے کے روزے نہ رکھنے کا عزم کرتے، تو آپ ﷺ انتظار میں رہتے اور آخر میں کچھ روزے رکھ لیتے۔ اور پہلا حتی

تمام سابقہ جملوں کی غایت کے لیے ہے۔

شعبان کے آخری دنوں کے بارے میں آپ ﷺ کی تاکید

۲۰۳۸: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ سَأَلَهُ اَوْسَأَلَ رَجُلًا وَعِمْرَانُ يَسْمَعُ فَقَالَ يَا اَبَا فُلَانٍ اَمَا صُمْتَ مِنْ سَرَرِ شَعْبَانَ قَالَ لَا قَالَ فَاِذَا اَفْطَرْتَ فَصُمْ يَوْمَيْنِ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤/ ٢٣٠۔ حديث رقم ١٩٨٣۔ ومسلم في صحيحه ٢/ ٨٢٠ حديث رقم (١٩٩۔ ١١٦١)۔ والدارمي في السنن ٢/ ٣٠ حديث رقم ١٧٤٢۔ واحمد في المسند ٤/ ٤٤٤۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کی کہ انہوں نے عمرانؓ سے یا کسی اور شخص سے پوچھا' عمرانؓ سن رہے تھے۔ پس فرمایا اے فلاں کے باپ! کیا تو نے شعبان کے آخر میں روزے نہیں رکھے؟ اس نے عرض کیا: نہیں! پس آپ نے فرمایا کہ جب رمضان ہو چکے اور افطار کر لے اس کے بدلے دو روزے رکھ لینا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعن عمران بن حصين عن النبي ﷺ انه** : یعنی نبی ﷺ۔ **سأله** : یعنی عمران رضی اللہ عنہ۔ **أو سأل رجلا** : راوی کی طرف سے شک ہے۔ **وعمران يسمع** : جملہ حالیہ ہے۔ **فقال** : یعنی نبی ﷺ۔ **يا أبا فلان أما صمت** : ہمزہ استفہام کے لیے اور ''ما'' نافیہ ہے۔ **من سرر شعبان** : سین کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ اور ایسے ہی ''السرار'' کو پڑھا گیا ہے، جو کہ دوسری روایت میں ہے۔

شاعر کہتا ہے:

شهور ينقضين وما شعرنا ☆ لا نصاف لهن ولا سرار

''مہینے گزر گئے ہمیں نہ ان کے نصف کا پتہ چلا اور نہ اخیر کا''۔

اس سے مراد مہینے کا آخر ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ ''السرار'' ''سحاب'' کی طرح ہے، مراد مہینے کی آخری رات ہے۔ اور اسی طرح ''سررہ'' ہے۔ اور الزہری نے مختصر النہایہ میں کہا: یہ مہینے کی آخری رات ہے، کیونکہ چاند، سورج کی روشنی کی وجہ سے چھپ جاتا اور پوشیدہ رہتا ہے۔

علامہ سیوطی نے کہا: کہ امام بیہقیؒ نے اپنی سنن صحیح میں کہا: ''سرره'' آخره یعنی سرر کا مطلب مہینے کا آخر ہے، اور اس سے انہوں نے ایک یا دو آخری دنوں کا کیا ہے۔ جن میں چاند چھپ جاتا ہے۔ اور فارسی نے کہا کہ یہی زیادہ مشہور ہے۔ ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں: ''صوموا الشهر وسره'' اور ''سر'' کا معنی بعض نے مہینے کا آغاز اور اول کیا ہے، اور ایک قول کے مطابق ''درمیان'' ہے، کیونکہ وسر كل شي سے مراد (جوفه) یعنی ہر چیز کے درمیان کو بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ (پیٹ وغیرہ) اور فارسی نے کہا: کہ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''هل صمت من سرة هذا الشهر'' گویا کہ

آپ کی مراد اس سے درمیانی روزہ تھا (مہینے کے درمیان کا) اس لئے کہ "سرۃ" "ناف" پر بولا جاتا ہے، اور یہ انسان کے جسم کے درمیان میں ہوتی ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا: "السرر" مہینے کی دو آخری راتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور مہینے کے آخری دو دنوں کو سررا اور سرارا اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ان دو راتوں میں چاند چھپ جاتا ہے۔

قال لا قال فاذا افطرت : یعنی شعبان کے آخری دو دن۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ رمضان سے فارغ ہو جائیں۔ فصم یومین : یعنی ان دونوں کی قضاء یا ان کے بدلے میں اور اگر اس سے مراد حقیقت تعقیب ہے تو پھر یہ امر مندوب کے لیے ہے، وگرنہ امر وجوب میں وسعت ہے۔

انہوں نے کہا کہ اس آدمی نے نذر کے ذریعے اپنے اوپر مہینے کے آخری دو دنوں کے روزے واجب کر لئے تھے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کی عادت تھی، تو اسے بیان کر دیا کہ اس کے یہ روزے اس نہی میں داخل نہیں ہیں جس میں آپ نے فرمایا: "اذا افطرت من رمضان فصم یومین"۔ کہ کوئی آدمی رمضان کی آمد پر اس سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے، جب اس کے یہ روزے رہ گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے یہ مستحب جانا کہ یہ ان کی قضاء ادا کرے۔

ابن ہمامؒ نے کہا: کہ اس سے امام احمد نے شک کے دن کے وجوب پر استدلال کیا ہے جو کہ صحیحین میں ہے کہ آپ نے ان سے کہا "هل صمت من سرر شعبان؟ قال : لا" کیا تو نے اس کے آخر یا درمیان میں روزہ رکھا ہے، اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فاذا افطرت من رمضان فصم یومًا مكانه" اور ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں: فصم یوما. جب تو نے اس کو افطار کر دیا ہے تو پھر فصم یومًا مكانه، اس کے بدلے ایک دن کا روزہ رکھ۔ اور ایک روایت کے الفاظ ہیں "فصم یومًا" یعنی ایک دن کا روزہ رکھ، اور ایسے ہی صحیحین میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: "صم یومًا وأفطر یومًا وانه صوم داؤد علیه السلام" کہ ایک دن روزہ رکھ اور ایک دن افطار کر اس لئے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے ہیں"۔ اور "سرار الشهر" مہینے کے آخر کو کہتے ہیں چاند کے چھپ جانے کی وجہ سے۔ علامہ منذری اور دیگر حضرات نے کہا ہے کہ واعلم ان السرار قد یقال علی الثلاث الاخیرة من لیالی الشهر. کہ جان لو! کہ سرار مہینے کی آخری تین راتوں کو کہا جاتا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول "فصم یومًا" یعنی ایک دن روزہ رکھ' دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کے آخری دن کا روزہ ہے، نہ کہ وہ سارے، اور اگر ایسی بات ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: "فصم ثلاثة ایام مكانه" کہ ان کی جگہ تین دن کے روزے رکھو۔ اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول "من سرر الشهر" تو یہ تبعیض کا فائدہ دیتا ہے اور ہمارے نزدیک تبعیض اس روزے کے استحباب کا فائدہ دیتی ہے، نہ کہ وجوب کا، اس لئے کہ یہ اس نہی کے معارض ومخالف ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک سے ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔

تو تمام ادلہ کو جمع کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھنے والی نہی کو وجوب پر محمول کیا جائے گا، جب کہ ممکن ہو، اور "حدیث سرر" یعنی شعبان کے آخری دن کے روزے والی حدیث کو استحباب پر خاص حضرات کے لیے، نہ کہ عوام کے لیے (جو پہلے روزہ رکھتے ہی نہیں)۔

بہترین روزہ اور بہترین نماز

۲۰۳۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ وَاَفْضَلُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ صَلَاةُ اللَّيْلِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۲۱/۲ حدیث رقم (۲۰۲۔ ۱۱۶۳)۔ وابوداوٗد فی السنن ۸۱۱/۲ حدیث رقم ۲٤۲۹۔ والترمذی ۱۱۷/۳ حدیث رقم ۷٤۰۔ وابن ماجه ۵۵٤/۱ حدیث رقم ۱۷٤۲۔ والدارمی ۳۵/۲ حدیث رقم ۱۷۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہترین روزے رمضان کے روزوں کے بعد اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں اور بہترین نماز فرض نماز کے بعد رات کی نماز ہے۔ یہ امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : قال : رسول الله ﷺ افضل الصیام بعد رمضان شهر الله : یعنی اس کے روزے اور یہاں پر "شهر الله" میں جو اضافت ہے یہ اضافت تعظیمی ہے۔ المحرم : رفع کے ساتھ یہ مضاف کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہاں صیام سے مراد یوم عاشوراء کے روزے ہیں، جیسا کہ کل ذکر کر کے جزء مراد لیا جاتا ہے، یہاں بھی ایسے ہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی افضلیت کے بارے میں کہا جائے، کیونکہ اس میں عاشوراء کا دن آجاتا ہے لیکن ظاہر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مراد پورے محرم کے مہینے کے روزے ہیں، یا پورا محرم کا مہینہ مراد ہے اور ابو داؤدؒ وغیرہ کی حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صم من المحرم واترك......" کہ محرم سے روزے رکھ اور افطار کر، محرم کے روزے رکھ اور افطار کر، محرم کے روزے رکھ اور افطار کر اور رہی رجب کے روزوں والی حدیث' تو بعض حفاظ نے کہا ہے کہ وہ موضوع ہے، اور ابن حجرؒ نے کہا کہ ہمارے ائمہ نے کہا: کہ نفلی روزوں کے لیے افضل مہینہ محرم ہے، اور پھر بقیہ حرمت والے مہینے یعنی رجب، ذی الحجہ اور ذی القعدہ ہیں۔

وافضل الصلاة بعد الفریضة : اور فرائض کے توابع سنن مؤکدہ ہیں، اور فریضہ میں وتر بھی داخل ہے، کیونکہ یہ عملی فرض ہے اور علمی واجب ہے۔ صلوٰة اللیل : یا یہ کہا گیا ہے کہ صلاة اللیل رواتب سے من حیثیته المشقة والتکلیف کے لحاظ سے افضل ہے، اور اسی طرح ریاء کاری اور شہرت سے دوری کی وجہ سے یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ آپ پر ہمیشہ فرض رہی ہے یا پھر اس لحاظ سے یہ افضل ہے کہ یہ پہلے فرض تھی، اور پھر نسخ کے ذریعے سے سنت ہوگئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سنتوں میں سے افضل ترین سنت ہے۔ واللہ اعلم

امام نوویؒ نے کہا کہ یہ حدیث ہمارے ساتھی ابو اسحاق المروزی کی اور ان کے ساتھیوں کی دلیل ہے کہ صلوٰة اللیل سنن رواتب سے افضل ہے، کیونکہ یہ فرائض کے مشابہ ہے۔ اور اکثر علماء نے کہا کہ رواتب افضل ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ قوی اور اس نص کے موافق ہے۔ اور طیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ میری عمر کی قسم! کہ اگر صلوٰۃِ تہجد میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [الاسراء : ۷۹] اور اس فرمان ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ

الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ [السجدة: ١٦] اس قول تک ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [السجدة: ١٧] ''ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے یہ ان کے اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔'' وغیرھما من الآیات. کے سوا کوئی اور فضیلت نہ بھی ہوتی تو یہی آیات ہی اس کی خوبی اور فضیلت کے لیے کافی ہوتیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صلوٰۃ اللیل سے مراد وتر ہے، تو ایسی صورت میں تو اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔

یوم عاشوراء کے روزے کی اہمیت

۲۰۴۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَرّٰى صِيَامَ يَوْمٍ فَضَّلَهُ عَلٰى غَيْرِهِ إِلَّا هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَهٰذَا الشَّهْرَ يَعْنِيْ شَهْرَ رَمَضَانَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٤٥/٤۔ حديث رقم ٢٠٠٦۔ ومسلم في صحيحه ٧٩٧/٢ حديث رقم (١٣١۔ ١١٣٢)۔ واحمد في المسند ٢٢٢/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا کہ کسی دن کے روزے کا اس لئے قصد کریں کہ اس کو دوسرے دنوں پر فضیلت دیتے ہوں مگر اس دن یعنی یوم عاشوراء کو اور اس مہینہ یعنی ماہ رمضان کو (دیگر ایام پر فضیلت دیتے تھے)۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا۔

تشریح: وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال : ما رأیت النبی ﷺ یتحری : ''تحری'' کا معنی زیادہ لائق، بہتر اور اولیٰ چیز کو طلب کرنا ہے، اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے صحیح بات یا صحیح چیز کو طلب کرنا، اور طلب شیء کے اندر مبالغہ کرنا۔

صیام یوم : اور صیام منصوب ہے، حرف جر کے ہٹانے کی وجہ اور مطلب حدیث یہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی چیز کی طلب میں مبالغہ اور کوشش کرتے نہیں دیکھا، جتنا کہ آپ ﷺ اس دن کے روزہ رکھنے میں مبالغہ اور کوشش کرتے تھے۔

فضله : ضاد کے نقطے اور تشدید کے ساتھ اس کو پڑھا گیا ہے۔ علی غیرہ الا ھذا الیوم : یعنی اس کے روزے کو۔ یوم عاشوراء : یا تو یہ بدل بن رہا ہے یا ''اعنی'' محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ محرم کا دسواں دن ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے کلام کے علاوہ باقیوں کے کلام میں مدّ کے ساتھ فاعولاء کے وزن پر نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ نویں دن کو بھی ملایا گیا ہے۔

اور بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ ''عِشر'' سے مأخوذ ہے جس کا معنی اونٹ کا دسویں یا نویں دن گھاٹ پر جانا ہے، اور اسی لئے انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ نویں اور دسویں دو دوروز کے درمیان میں جو ہے اور وہ آٹھ دن ہیں اس سے مراد یہ ہے۔

اور اس کو نواں دن اس لئے بنایا ہے کیونکہ جب اونٹ پانی پر وارد ہو جاتا ہے تو پھر آٹھ دن تک وارد نہیں ہوتا۔ تو گویا یہ

نویں تاریخ کو وارد ہوا اور اس سے مراد دسویں تاریخ لی جاتی ہے، اور جب وہ آٹھویں تاریخ کو پانی پر وارد ہو تو مراد اس سے نویں تاریخ لی جاتی ہے۔ اور اسی طرح کہا جاتا ہے "فلان حم ربعا" کہ اس نے چار کی حفاظت کی جب کہ وہ تیسرے دن کی حفاظت کرے۔ اور عاشوراء باب صفت میں سے ہے اس کے لئے کوئی فعل نہیں آیا۔

اور مقدر عبارت یہ ہوگی: "یوم مدته عاشوراء" یعنی ایسا دن جس کی مدت عاشوراء ہے، یا اس کی صفت عاشوراء ہے۔ زرکشی نے کہا کہ یہ فاعولاء کے وزن پر ہے۔ اور اس میں ہمزہ تانیث کے لیے ہے جو کہ عاشر سے معدول ہو کر آیا ہے۔ مبالغہ اور تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اصل میں یہ عاشر، عاشر تھا، تو اس سے عاشوراء بنالیا۔

وهذا الشهر: نصب کے ساتھ ہے اور مراد اس کے دن ہیں، اور هذا الیوم پر عطف ہے۔ یعنی شهر رمضان: یہ راوی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف سے تفسیر ہے۔ اور یہ باب ترقی میں سے ہے، یا یہ کہ اس کو مقدم اس کے اہتمام کے لیے کیا ہے یا اس کی تقدیم وجوب صوم کے اصل کے لیے ہے یا یہ کہ یہ پہلی ہے۔

طیبی رحمہ اللہ نے کہا: فضله کے بارے میں کہ یہ مصابیح کے بعض نسخوں میں ضاد کے سکون کے ساتھ جیسا کہ شرح السنہ کی اس روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، "ما كان النبي ﷺ يتحرى صوم يوم يبتغي فضله الا صيام رمضان وهذا اليوم عاشوراء". اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "فضله" یہ صیام سے بدل ہے یعنی عبارت اس طرح ہے ای يتحرى فضل صيام يوم على غيره اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ مبدل منہ ہمیشہ ترک کرنے کی نیت میں نہیں ہوتا۔ مظہرؒ نے کہا کہ یہ مبدل حکم حتمی نہیں ضمیر کو طلب کرنے کے لیے ہے جو اس کی طرف لوٹے۔

جیسا کہ آپ کے اس قول میں ہے: "زيدا رأيت غلامه رجلاً صالحًا۔ نہیں دیکھا میں نے اسے پوری کوشش کے باوجود کہ کسی یوم کو دوسرے یوم پر کوئی فضیلت ہو سوائے عاشوراء اور رمضان کے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ عاشوراء کا روزہ مستحب ہے نہ کہ واجب اور ابن حجر کا قول جو کہ ہمارے اکثر اصحاب کے نزدیک اصح قول کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ روزہ اصلاً کوئی واجب نہیں ہے جیسا کہ اس کی صراحت صحیح احادیث میں موجود ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان هذا اليوم يوم عاشوراء ولم يكتب عليكم صيامه من شاء فليصم ومن شاء فليفطر". یہ دن عاشوراء کا دن ہے اس دن کا روزہ تم پر فرض نہیں ہے جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔

اور اس کی تائید ایک اور مرفوع روایت جو کہ صحیحین میں آتی ہے کرتی ہے۔ جو کہ سلمہ بن اکوع سے مروی ہے فرمایا: عن سلمة بن الاكوع انه عليه الصلاة والسلام امر رجلا من اسلم ان اذن في الناس ان من اكل فليصم بقية يومه ومن لم يكن اكل فليصم فان اليوم يوم عاشوراء وكان يوم عاشوراء تصومه قريش في الجاهلية وكان عليه الصلاة والسلام يصومه فلما قدم المدينة صامه وامر بصيامه فلما فرض رمضان قال عليه الصلوة والسلام من شاء صامه ومن شاء تركه". یہ اس قول پر رد میں صریح ہے۔ یہ حکم رمضان کے ساتھ منسوخ ہونے پہلے فرض کیا گیا ہے یہ اس پر دلیل ہے۔ جس دن روزہ فرض ہوا اس دن کے علاوہ باقی دن میں اس کو کھانے پینے سے رُک جانے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ اس میں واضح بیان ہے۔ بخاری و مسلم نے جو کہا ہے اس کا وقوع آخر میں ہے۔ واللہ اعلم

عاشوراء کا روزہ فرض تھا پھر رمضان کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا گیا۔ کوئی شک نہیں سنت جو فرض ہو وہ سنت سے افضل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ قول اسی طرح ابن الملک کا ہے اور طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے اکثر نسخوں میں "فضله" فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "یتحری" سے بدل ہے، اور یہ پہلی صفت پر محمول ہوگا چونکہ "هذا الیوم" مستثنیٰ ہے اور اس کا مستثنیٰ ہونا ضروری ہے۔ یہاں پر ان کا قول "یوم" نکرہ ہے اور نفی کے سیاق میں عموم کا فائدہ دے رہا ہے، معنیٰ کیا ہے "ما رأيته عليه السلام يتحرى في صيام يوم من الايام"۔ اس کی صفت کہ اس کو تمام دنوں کے روزوں پر فضیلت ہے، سوائے اس دن کے روزے۔ وہ اس دن کے روزے کی فضیلت کا متلاشی ہوگا اور کسی دن کے روزے کی فضیلت کا متلاشی نہ ہوگا۔ "هذا الشهر"" على هذا اليوم" پر عطف ہے تاویل کے ساتھ ہی درست سمت چلا جا سکتا ہے، یا تو اس میں مستثنیٰ منہ مقدر مانا جائے فضيام شهر فضله على غيره۔ اگر یوں اعتبار کیا جائے "في الشهر ايامه يوما" یوم، اس وصف کے ساتھ موصوف ہو گا۔ کہا گیا ہے شاید کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فہم ہے ورنہ یوم عرفہ افضل الایام ہے، اور ردّ کیا ہے کہ روزے کی فضیلت پر کلام یوم کے متعلق ہے، مطلق یوم کی فضیلت نہیں ہے۔ باوجود اس کے یوم کے متعلق اختلاف ہے۔

عاشوراء کے روزے میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت

۲۰۴۱: وَعَنْهُ قَالَ حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ يَوْمٌ يُعَظِّمُهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَ صُوْمَنَّ التَّاسِعَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۷۹۸/۲ حديث رقم ۱۱۳۴/۱۳۳۔ وابوداوٗد في السنن ۸۱۸/۲ حديث رقم ۲۴۴۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم صادر فرمایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اس دن کی تو یہود و نصاریٰ تعظیم کرتے ہیں اور ہمیں تو ان کی مخالفت پسند ہے تو ہم ان کی تعظیم کرنے میں ان کی کیوں موافقت کریں پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو ۹ محرم الحرام کو بھی ضرور روزہ رکھوں گا۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه: یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ قال حين صام رسول الله ﷺ يوم عاشوراء: بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ محرم کے دسویں دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس روزے کے متعلق سوال کیا انہوں نے کہا' ہم اس دن کی عزت وعظمت اس لئے مناتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون پر کامیابی دی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موافقت کا زیادہ حق رکھتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن کا روزہ رکھا۔

وامر بصيامه: یعنی اپنے صحابہ کو وجوب کے ساتھ پھر منسوخ ہو کر مستحب ہو گیا جب ہجرت کا دسواں سال تھا۔ قالوا:

یعنی صحابہ کرام نے۔ یا رسول اللہ انہ : یعنی یوم عاشوراء۔ ابن حجرؒ کا اندازہ یہ جگہ صحیح اصول کے مخالف ہے۔ یوم یعظمہ الیہود والنصارٰی : یعنی ان کی مخالفت واجب ہے، تو ہم اس دن کی تعظیم پر ان کی موافقت کیسے کریں۔ فقال رسول اللہ ﷺ لئن بقیت : یعنی دنیا میں یا اگر میں زندہ رہا۔

الی قابل : ای "الی عام قابل" یعنی آئندہ آنے والا سال۔ لا صومن التاسع : یعنی صرف نو، یا ساتھ دسواں دن، مخالفت من جملہ ہے۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے اور اس کے ساتھ اس دن کی تعظیم کو چھوڑ دینا ہے۔ جس میں دین کی مدد ہوتی ہو، چونکہ وہ شکر کے طور پر روزہ رکھتے تھے۔ شکر کو مشارفت پر مقدم کرنا جائز ہے جس زمانے میں اس نعمت کا وقوع ہو بلکہ دسواں دن اسی طرح اس پر تقدیم ہے، جب کہ فتح دن کے درمیان میں حاصل ہوئی، اور روزہ صبح سے ہی شروع کرنا صحیح ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کلیۃً ان کی مخالفت کا ارادہ کرتے تو روزے کو مطلق طور پر چھوڑ دیتے۔ واللہ اعلم

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اگلے سال زندہ نہ رہے، بلکہ بارہ (۱۲) ربیع الاول کو فوت ہو گئے۔ تو نویں دن محرم کا روزہ رکھنا سنت ہوگا۔ اگرچہ آپ ﷺ نے روزہ نہیں رکھا، چونکہ پختہ ارادہ کیا تھا۔ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس کے ایک دن اور ملایا جائے تا کہ آپ کا طریقہ ہدایت اہل کتاب کے مخالف ہو جائے۔ اور یہ وہ وجہ ہے چونکہ جواب کی جگہ واقع ہے اس لئے کہ ان کا کہنا وہ دن ہے جس کی عزت و عظمت یہود مناتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے: انہوں نے کہا: صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیہود، نویں اور دسویں دن کا روزہ رکھو، یہود کی مخالفت کرو۔ یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔ بعض کہتے ہیں: فقط نو تاریخ کا روزہ مستحب ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: عاشوراء کے دن کا روزہ مستحب ہے یہ بھی مستحب ہے، کہ ایک دن پہلے اور ایک دن بعد رکھے اگر ایک دن رکھے تو مکروہ ہے اور یہود کے ساتھ مشابہت ہے۔ امام احمدؒ نے حدیث بیان کی ہے: "صوموا عاشوراء وخالفوا الیہود وصوموا قبلہ یوما وبعدہ یومًا"۔ اس کے ظاہر سے معلوم ہوا کہ واؤ بمعنی اُو ہے، چونکہ مخالفت ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ ہے۔ امام شافعیؒ نے حدیث کے ظاہر سے یہ معنی اخذ کیا ہے وہ تینوں کے درمیان جمع (تطبیق) پیدا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

حج کرنے والے کے لیے عرفہ کا روزہ مسنون نہیں ہے

۲۰۴۲: وَعَنْ اُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ اَنَّ نَاسًا تَمَارَوْا عِنْدَهَا يَوْمَ عَرَفَةَ فِيْ صِيَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ صَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَيْسَ بِصَائِمٍ فَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ بِقَدَحٍ وَهُوَ وَاقِفٌ عَلٰى بَعِيْرِهٖ بِعَرَفَةَ فَشَرِبَهٗ ۔ (متفق علیه)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۹۱/۲ حدیث رقم (۱۱۰۔ ۱۱۲۳)۔ والبخاری فی صحیحه ۴/ حدیث رقم ۱۹۸۸۔ وابوداؤد فی السنن ۸۱۷/۲ حدیث رقم ۲۴۴۱۔ والنسائی ۱۸۴/۴ حدیث رقم ۲۲۸۹۔

ترجمہ: امّ فضلؓ کی بیٹی سے روایت ہے کہ کتنوں شخصوں نے عرفہ کے روزے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے روزہ

رکھنے میں (عرفہ کے دن) جھگڑا کیا۔ بعض حضرات نے کہا کہ حضور ﷺ روزے سے ہیں اور بعضوں نے کہا کہ روزے سے نہیں ہیں پس میں نے حضور ﷺ کے پاس دودھ کا پیالہ بھیجا۔ اس وقت آپ ﷺ میدانِ عرفہ میں اپنے اونٹ پر کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے اس دودھ کو پی لیا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أم الفضل : یہ عباسؓ کی بیوی ہیں۔ بنت الحارث، ان ناسا : یعنی لوگوں کی ایک جماعت۔ تماروا : یعنی شک کیا۔ لڑائی جھگڑا کیا اور اختلاف کیا۔ عندها یوم عرفة : یعنی عرفات۔ في صیام رسول الله ﷺ : یعنی اس دن کے روزے کے متعلق۔ فقال بعضهم هو صائم : عادت کی بناء پر یا حسن ظن کے ساتھ۔ وقال بعضهم لهو صائم : روکنے کی وجہ سے اصل پر بنا رکھتے ہوئے۔ یا اس وقت سے استدلال کرتے ہوئے جو روزے کا وقت تھا ضعف اطاعت کی قوت اور عبادت سے مانع ہے۔ آپ ﷺ کی پیروی جو عام حرج سے ہو وہ اس عام کے ساتھ وارد نہیں ہوئی۔ فأرسلت : صیغہ متکلم۔ الیه بقدح لبن : ان کا معلوم تھا کہ آپ دودھ کو پسند کرتے ہیں' جب وہ کھانے اور پینے کی جگہ ٹھہرے۔ اس لئے جب آپ ﷺ کھانا کھاتے تو کہتے "اللهم بارك لي فيه واطعمني خيرا منه"۔ اور جب دودھ ہوتا تو کہتے "اللهم بارك لي فيه وزدني منه" جگہ اور زمانے کی مناسبت سے۔ وهو واقف على بغيرة بعرفة : ظاہر ہے کہ یہ دعا کا وقت تھا۔ فشربه : یعنی سرداروں کے سروں پر بلند کرتے ہوئے تا کہ ان کے سامنے رحمۃ اللعالمین کا حکم واضح ہو جائے جو سراسر رحمت پر مشتمل تھا۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: اکثر کے نزدیک یوم عرفہ کا روزہ افطار کرنا مستحب ہے تا کہ وہ قوت کے ساتھ دعا کر سکے۔ مظہر کہتے ہیں: یوم عرفہ کا روزہ غیر حاجیوں کے لئے سنت ہے۔ حاجیوں کے لیے سنت نہیں۔ امام شافعیؒ اور مالکؒ اور ان کے علاوہ دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے تا کہ وہ عرفہ کی دعا میں پیچھے (کمزور) نہ رہ جائے۔ اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں: سنت ہے۔ احمدؒ کہتے ہیں سنت ہے اگر وہ کمزور نہ ہو۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: حاجیوں اور غیر حاجیوں کے لئے مستحب ہے اور اگر حاجیوں کو وقوف اور دعوات سے کمزور کر دے تو چھوڑنا مستحب ہے۔ کہا گیا ہے مکروہ ہے اور مکروہ تنزیہی ہے، چونکہ اس اہم وقت میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے چونکہ یہ وقت اللہ سے دعا کرنے کا ہے۔ اگر وہ برے اخلاق والا ہو اور حرام میں پڑنے کا خطرہ ہو تو وہ رکھ لے۔ اسی طرح "یوم ترویہ کا روزہ" چونکہ وہ بندے کو افعال حج سے عاجز کر دیتا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: حاجیوں کے لیے اس دن کا روزہ رکھنا خلاف اولیٰ ہے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ مکروہ ہے یعنی اس سے رکنا فرض ہے اور جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی اسناد میں مجہول راوی ہے یہ بات اس کو رد نہیں کرتی۔ ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام حاکمؒ نے اس کو بخاری کی شرح پر قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اس کی توثیق کی ہے۔

عشرہ ذی الحجہ کے روزوں کا مسئلہ

۲۰۴۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَائِمًا فِي الْعَشْرِ قَطُّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۳۳/۲ حدیث رقم (۹-۱۱۷۶)۔ وابوداؤد فی السنن ۸۱۷/۲ حدیث رقم ۲۴۳۹۔

والترمذی ۱۲۹/۳ حدیث رقم ۷۵۶۔ وابن ماجه ۵۵۱/۱ حدیث رقم ۱۷۲۹۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عشرہ میں روزہ رکھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة رضی الله عنها قالت : ما رأیت رسول الله ﷺ صائما فی العشر : یعنی ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں۔ قط : کہا گیا ہے مشہور حدیث:

"ما من ایام احب الی الله ان یتعبد له فیها من عشر ذی الحجة، یعدل صیام کل یوم منها بصیام سنة وقیام کل لیلة منها بقیام لیلة القدر علی ان صوم تسعة ایام من أول ذی الحجة سنة فکیف لا یصوم؟" دلالت کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ایام ہیں کہ ان میں عبادت کی جائے ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں۔ ان دنوں میں ایک دن کا روزہ پورے سال کے روزے کے برابر ہے۔ ہر رات کا قیام ان دنوں میں لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے۔ ذی الحجہ کے پہلے نو دنوں کے روزے سنت ہیں، تو کیسے روزہ نہ رکھا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کہنا "ما رأیت" سنت ہونے کے منافی نہیں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جواز ہے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علم نہیں ہے۔ جب نفی اور اثبات میں تعارض ہو جائے تو اثبات کو ترجیح ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ اثبات اولیٰ فرض اثبات پر۔ رہا احتمال کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے تھے اور وہ نہ جانتی تھیں، جملہ ایام اس کے اوقات کے رجوع الی اللہ کے ہیں۔

ان کا کہنا "قط" قول کی نفی کرتا ہے کہ رؤیت کو رؤیت علمی پر محمول کرنا اور اس طرح عدم صیام سنت ہونے کے منافی نہیں ہے جس طرح کہ فعل سے ثابت ہے، اور قول سے ثابت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں میں ثواب ذکر کے روزہ رکھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ شاید کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں میں روزہ افطار کرنے کا جو مقتضی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن روزہ رکھتے تھے، اور ایک دن افطار کرتے تھے، اسی لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أحب الصیام الی الله صیام داود علیه الصلاة السلام"۔ اگلی حدیث میں جو موقع محل کے مناسب ہو اس کا ذکر آئے گا جس میں (ثم رأیت انه)' احمد، ابوداؤد اور نسائی نے بیان کیا ہے۔ "انه علیه السلام کان یصوم تسع الحجة" اس پر محمول کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس کا روزہ رکھتے تھے۔ بیہقی میں حدیث ہے "سید الشهور رمضان وأعظمها حرمة ذو الحجة"۔ اسی لئے غزالی وغیرہ نے کہا ہے: ذو الحجه حرمت والوں میں افضل ہے، برخلاف اس کے جس نے کہا وہ رجب ہے یا محرم ہے۔ واللہ اعلم

نفلی روزوں کے احکام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

۲۰۴۴: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَیْفَ تَصُوْمُ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهٖ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ غَضَبَهٗ قَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ فَجَعَلَ عُمَرُ یُرَدِّدُ هٰذَا الْکَلَامَ حَتّٰی

سَكَنَ غَضَبُهُ فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ مَنْ يَصُوْمُ الدَّهْرَ كُلَّهُ قَالَ لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ اَوْ قَالَ لَمْ يَصُمْ وَلَمْ يُفْطِرْ قَالَ كَيْفَ مَنْ يَصُوْمُ يَوْمَيْنِ وَيُفْطِرُ يَوْمًا قَالَ وَيُطِيْقُ ذٰلِكَ اَحَدٌ قَالَ كَيْفَ مَنْ يَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا قَالَ ذٰلِكَ صَوْمُ دَاوُدَ قَالَ كَيْفَ مَنْ يَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمَيْنِ قَالَ وَدِدْتُ اَنِّي طُوِّقْتُ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثٌ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ فَهٰذَا صِيَامُ الدَّهْرِ كُلِّهِ صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهُ وَ السَّنَةَ الَّتِيْ بَعْدَهُ وَصِيَامُ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۱۸/۲ حديث رقم (۱۹٦۔ ۱۱٦۲)۔ وابوداؤد في السنن ۸۰۷/۲ حديث رقم ۲٤۲۵۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ آپ ﷺ کس طرح روزہ رکھتے ہیں؟ پس اس شخص کی بات سن کر نبی کریم ﷺ غصے ہوئے تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے غصے کو دیکھا تو فرمایا ہم اللہ کے رب ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں اور ہم اللہ کے رسول ﷺ کے غضب سے پناہ مانگتے ہیں اور پھر حضرت عمر ﷺ بار بار اس جملہ کو کہتے تھے یہاں تک حضور ﷺ کا غصہ ختم ہوگیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا اے اللہ کے رسول! اس شخص کا کیا حال ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے؟ فرمایا نہ ہی اس نے روزہ رکھا اور نہ ہی افطار کیا۔ پس راوی کو شک ہوا ہے کہ کونسے لفظ ارشاد فرمائے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! اس شخص کا کیا حال ہے جو دو دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے؟ فرمایا کوئی طاقت رکھتا ہے اس کی؟ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! اس شخص کا کیا حال ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے فرمایا یہ روزہ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اس شخص کا کیا حال ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے یہ طاقت دی جائے کہ میں ایسا کروں۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مہینے میں تین روزے اور رمضان تا رمضان رکھو۔ یہ ہمیشہ کے روزے ہیں یعنی ان کا ثواب ایسا ہوتا ہے ان کو ہمیشہ روزہ رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ اور عرفہ کے دن کا روزہ غیر حاجی کے لیے کہ میں امید رکھتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو جھاڑ دے گا۔ ایک سال کے پہلے جو اس سے ہیں اور ایک سال کے جو اس سے بعد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس میں گناہ کرنے سے محفوظ رکھے گا۔ اگر گناہ ہو جائیں تو بخش دیے جائیں گے اور عاشوراء کے دن روزہ رکھنا ایک سال کے گناہوں کو جھاڑ دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو چکے ہیں۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبي قتادة ان رجلا أتى النبي ﷺ فقال كيف تصوم؟ : یعنی تو۔ فغضب رسول الله ﷺ : یعنی آپ ﷺ کے چہرے پر غصے کے اثرات نمودار ہوئے۔ من قوله : یعنی آدمی کے قول یا بُرے سوال کی وجہ سے۔ نوویؒ کہتے

ہیں: علماء نے کہا ہے: غضب کا سبب ناپسندیدہ سوال تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ڈر گئے اس کے جواب کے مفسد کی وجہ سے اور وہ یہ ہے کہ سائل اس کے وجوب کا اعتقاد رکھتا ہے، یا اس کو کم سمجھتا ہے یا اس پر اقتصار کر لیتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے میں مبالغہ نہیں کرتے تھے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے مصالح کے ساتھ مشغول رہتے تھے اسی طرح حقوق ازدواج، مہمانوں کے ساتھ تاکہ ہر ایک اس کی اقتداء کرے بعض کو نقصان ہوتا ہے۔ سائل کو چاہیئے تھا کہ وہ یوں کہتا "کیف اصوم او کم اصوم" سوال کو اپنے ساتھ خاص کرتا تاکہ اس کی حالت کے تقاضے کے مطابق جواب دیا جائے، جیسا کہ اس کے علاوہ دوسروں کو ان کے احوال کے مطابق جواب دیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ ایک ہی حالت پر نہ تھا بلکہ احوال کے مختلف ہونے پر مختلف ہوتے تھے، کبھی کبھار کثرت سے روزہ رکھتے اور کبھی کبھار کثرت سے افطار کرتے۔ اس جیسے حالات میں پوچھنے والے کے لیے اپنانا ممکن نہ تھا۔ وہ سوال کے جواب میں معذور تھے۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے متعلق منقول ہے، کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادتِ الٰہی کے متعلق سوال کیا، اور انہوں نے اس میں مبالغہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر سخت ناراض ہوئے اور کہا' میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے زیادہ متقی اور اس سے ڈرنے والا ہوں۔ یعنی اس سے کثرت عبادت لازم نہیں آتا، بلکہ اس کا حسن، شرائع، حقائق، باریکیوں اور اس کے اقات کی تقسیم جس طرح لائق ہو ویسا کرنا ہے۔

فلما رأى عمر غضبه : سائل پر، خاص یہ بددعا کے خوف سے ڈر گئے، اور عام آدمی تک اس کے سرایت کر جانے سے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **واتقوا فتنة لا تصبين الذين ظلموا منكم خاصة قال**: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کرتے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے: **اليس منكم رجل رشيد**۔ یعنی جو سیدھی سیدھی بات کرے۔

رضينا بالله : یعنی اس کے فیصلے کے ساتھ۔ **ربا وبالاسلام** :یعنی اس کے احکامات کے ساتھ۔ **دينا وبمحمد** :یعنی ان کی اطاعت کے ساتھ۔ تمیزات ہونے پر منصوب ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ حال کی تاکید ہوں۔ **نعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله** : اللہ تعالیٰ کے غضب کا ذکر تزیین کلام کے لیے اور اس بات کی تعیین کے لیے کہ آپ کے غضب سے موافق اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ **مجعل عمر يردد** :یعنی بار بار دہرانے لگے۔ **هذا الكلام** :اور وہ "رضینا" ہے۔ **حتى سكن غضبه** :یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا (**قوله فقال عمر يا رسول الله كيف من**) یعنی حال ہوگا۔ (**يصوم الدهر كله** :کیا وہ محمود ہے یا مذموم۔ کلام کا حسن ادب دیکھو جب اس شخص نے برائے سوال سے بات شروع کی اور پھر سوال عموم پر کیا۔ اس لئے کہا گیا ہے "**حسن السوال نصف العلم**". **قال لا صام ولا أفطر** : ای "**لا صام صوما**، اس میں کمال فضیلت ہے **ولا أفطر فطرا** وہ اپنی بھوک اور پیاس کو روکتا ہے۔

أو قال لم يصم ولم يفطر : شرح السنہ میں اس کا معنی یہ ہے کہ اس پر بددعا اس پر زجر کے لیے ہے اور جائز ہے کہ اضبار ہوں۔ مظہرؒ کہتے ہیں: یعنی یہ شخص گویا کہ افطار نہیں کرے گا چونکہ وہ کوئی چیز نہیں کھائے گا، اور روزہ نہیں رکھے گا اور شارع نے اس کا حکم نہیں دیا۔ کیا یہ صحیحین کی اس حدیث کی طرح ہے: "**لا صام من صالم الابد**" رہی وہ حدیث: "**من صام الدهر ضيقت عليه جهنم هكذا وعقد تسعين**" اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ روایت کراہت کے نفی میں عمدہ ہے یہی

قول بعض حنفیہ کا ہے۔ اور دعویٰ کیا ہے وہ دلیل اس کے لیے ضاد واضح ہے۔ جب اس کا معنی ضیقت علیہ یعنی اس پر وہ اس میں داخل نہیں ہو گا یا اس کے لیے اس میں جگہ نہیں ہے۔ کہا گیا ہے: ایسی احادیث چونکہ وہ جب یہ عادت بنا لے گا اس کو ریاضت نہیں ملے گی اور نہ مشقت جس کا تعلق مزید ثواب کے ساتھ ہے۔ گویا کہ اس نے روزہ نہیں رکھا۔ اس وجہ سے بھی کہ اس کو افطار کرنے والوں جیسی راحت اور لذت نہ ملے گی۔ اور جو اس میں داخل نہیں ہوا، اس پر کوئی حرج نہیں' کہ وہ اس کے علاوہ میں روزہ رکھ لے۔ چونکہ ابوطلحہ انصاری اور حمزہ بن عمرو اسلمی وہ دونوں سارے زمانہ روزہ رکھتے تھے، ان دنوں کے علاوہ اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر انکار نہیں کیا۔ یا اس کی ممانعت کی علت اس کو کمزور کر دینا ہے۔ وہ جہاد اور حقوق اداء کرنے سے عاجز آ جائے گا۔ جو کمزور نہ ہو اس پر کوئی حرج نہیں۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: ہمیشہ روزہ مکروہ ہے، چونکہ وہ اس کو کمزور کر دیتا ہے یا اس کی طبع کو ایسا کر دیتا ہے کہ اس کی عادت عام عادت کے مخالف ہو جاتی ہے۔

قال کیف من یصوم یومین ویفطر یوما : یعنی عبادت کو عادت پر غالب کر لینا ہے۔ **ویطیق** : استفہام مقدر ماننے کے ساتھ۔ یعنی "**اتقول ذلك ویطیق**"۔

ذلك احق : اس میں اشارہ ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت کی علت ضعف ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ اگر کسی کے پاس کی طاقت ہے تو کوئی حرج نہیں، بلکہ افضل ہے۔ **قال** : یعنی عمرؓ نے کہا۔ **کیف من یصوم یوما ویفطر یوما قال ذلك صوم داؤد** : یعنی یہ اعتدال کی انتہاء ہے اور عبادت کے دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔ اور عادت اچھے احوال کے ساتھ ہے اسی لئے بعض علماء نے کہا ہے کہ "**اجتهد في العلم لا یمنعك من العمل**" علم تلاش کر جو تجھ کو عمل سے منع نہ کرے، "**واجتهد في العمل بحیث لا یمنعك عن العلم**" عمل میں کوشش کر جو تجھ کو علم سے نہ روکے۔ اور بہترین امور وہ ہیں جن میں درمیانی راہ اختیار کی جائے، اور بدترین وہ امور ہیں جن میں افراط وتفریط ہو۔ اسی طرح حدیث ہے: "**افضل الصیام صیام داؤد علیه الصلوٰة والسلام**۔

قال کیف من یصوم یوما ویفطر یومین : بدن کو کمزوری سے بچا کر باقی دوسری عبادات کے لیے مضبوط کرنا ہے۔ **قال وددت** : دال کے کسرہ کے ساتھ، یعنی میں نے پسند کیا اور خواہش کی۔ **أي** : کمال؛ قوت کے ساتھ۔ **لحوقت** : اس کی بنا مفعول بہ ہے یعنی "**جعلني الله مطیقاً**"۔ **ذلك** : یعنی جس روزے کا ذکر کیا گیا ہے۔ طیبی ؒ کہتے ہیں: جب مجھے حقوق مشغول نہیں رکھتے، تو میں روزہ رکھتا ہوں۔ اگرچہ وہ اس سے زیادہ کی طاقت رکھتے تھے اور جب مسلسل رکھتے تھے تو انہوں نے کہا کہ میں نے حدیث کا انکار کیا۔

مذکورہ سوال روزوں کے متعلق جمیع احوال کے لیے ہے اور وصال مداومت کے طریقے پر نہیں ہے۔ اس کا ظاہر اس پر دال ہے کہ وہ افضل ہے اور اس کی دلیل جو صحیحین میں وارد ہے: "**افضل الصیام صیام داؤد کان یصوم صوما ویفطر یوماً**"۔ اس طرح صحیحین میں آور روایت ہے۔ اس سے کوئی افضل نہیں۔ عبدالسلام کہتے ہیں: تیرے لئے افضل نہیں چونکہ صوم الدھر افضل ہے، چونکہ نیکی اس کی مثل دس ہیں۔

ثم قال رسول الله ﷺ : یعنی اس جواب کی تفصیل کے بعد جب دیکھا کہ مزید سوال کی ضرورت نہیں۔ **ثلاث** : یعنی

انسان کا روزہ تین ایام کا ہے، ممیز کی وجہ سے ''تاء'' حذف کر دی، چونکہ وہ مؤنث ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: معدود کے حذف کی وجہ سے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''تاء'' کا حذف لیالی کا اعتبار کرتے ہوئے۔ کشاف میں ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق ﴿ اربعه الشهر وعشرا ﴾ [البقرۃ: ۲۳۴] کہا گیا ہے: راتوں کی جانب نسبت کرنے سے دن ان میں داخل ہیں۔ اور آپ نہیں دیکھیں گے کہ وہ مذکر کا اس میں استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ ایام کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔ وہ کہتا ہے: ''صمت عشرا'' مگر اس کا ذکر کیا جانا تو ان کے کلام سے خارج ہو جاتا۔

ہم مناقشہ کریں گے کہ آیت میں لیالی کا ذکر اغلب طور پر ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ عدۃ کو ان سے شمار کیا گیا ہے۔ ''صمت شهرا'' مثال واضح ہے، روزے میں لیالی کا اعتبار نہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اگر کہا گیا ہے کہ وہ ساعی ہے۔ ہم کہتے ہیں: صوم شرعی صرف اور صرف شارع کے بتلانے پر پہچانا جا سکتا ہے۔ لغت کو اس میں دخل نہیں۔ میں کہتا ہوں: صوم شرعی کی پہچان شارع علیہ السلام سے ہو سکتی ہے، لغت کا استعمال منع نہیں ہے، مثلاً کوئی کہے: قمت شهرا لیالی کو وارد کرنا مجازی معنی سے۔ آپ غور کریں۔ من کل شهر: کہا گیا ہے وہ ایام بیض ہیں، ایک قول یہ ہے کہ کوئی سے تین دن۔ وہ اس ثواب کو پا لے گا اور مؤلف عائشہؓ کی آنے والی حدیث سے ثابت ہے۔ رمضان: یعنی رمضان کے روزے ہر سال انتہا تک۔ الی رمضان: قیاس ان دونوں سے انصراف کرنا ہے۔ صحیح نسخوں میں اس کا اعراب غیر منصرف ہے۔

فهذا صیام الدهر: یعنی جس کو پسند کیا گیا ہے۔ کله: یعنی اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ﴾ [الانعام: ۱۶۰] اسی طرح کہا گیا ہے: یہ بات مخفی نہیں کہ کلی حکم رمضان کے علاوہ ہے۔ رمضان کا ذکر اسی وہم کو دور کرنے کے لیے، کہ اس میں ہر مہینہ داخل ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس کا روزہ ثواب میں رمضان کے روزے کی طرح ہے لیکن اس کی بڑھوتری کی حد نہیں۔ سورۃ اخلاص ثلث قرآن کے برابر ہے۔ قیل. ثلاث مبتداء ہے، اور اس کی خبر ''هذا صیام الدهر'' ہے، فاء زائدہ ہے، یا اس جملہ پر دلالت ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: خبر پر ''فاء'' اس لئے داخل کی گئی تا کہ مبتداء شرط کو متضمن ہو جائے۔ اس طرح ''ان ثلاث'' مبتداء ہے، یا ''کل شهر'' سے صفت ہے۔ یعنی ''صوم ثلاثه ایام یصوم الرجل من کل شهر صیام الدهر کله''۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: ایام بیض یعنی تیرہ، چودہ، پندرہ کا روزہ مستحب ہے، جب تک یہ گمان نہ ہو کہ وہ واجب کے ساتھ مل جائے گا۔

صیام یوم عرفة احتسب علی الله ان یکفر: یعنی یا اللہ یا روزہ۔ السنة التی قبله: یعنی اس کے گناہ۔ والسنة التی بعده: امام الحرمین کہتے ہیں: کہ یہ اس کے چھوٹے گناہوں کے لیے کفارہ ہوگا۔ قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: جو کہ اہل سنت کا بھی مذہب ہے کہ کبیرہ گناہ کے لیے توبہ شرط ہے جو کہ صرف توبہ اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ہی معاف ہو سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: کہ اللہ کی رحمت سے گناہوں کے کفارہ کی امید کی جا سکتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: کہ اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، ہاں کبیرہ میں تخفیف کی امید کی جا سکتی ہے، اگر چہ درجات بلند نہ ہوں۔ مظہرؒ کہتے ہیں: کہ یہ جو کہا گیا یہ آنے والے سال کا بھی کفارہ بن جاتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو محفوظ رکھا جائے گا گناہ کرنے سے اس سال میں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ بندے کو اپنی رحمت اور ثواب کے ذریعے اعمال کرنے کی

توفیق دے گا، کہ جو گزشتہ سال اور آنے والے سال کے لئے کفارہ ثابت ہوں، اور اس کے گناہ مٹ جائیں۔

وصیام یوم عاشوراء احتسب علی اللہ ان یکفر السنۃ التی قبلہ : نہایہ میں ہے کہ اعمال صالحہ کرنے والے کے لیے: اجر طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے، اور نیکی کی مختلف انواع اور قیام کے ذریعہ جو کہ مسموم ہے ثواب کی طلب میں پر امید ہونا چاہیئے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ اس طرح کہا جائے کہ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے گناہ مٹا دے، اور اس کو احتسب کی جگہ پر لایا گیا ہے۔ جو اس کے علاوہ ہے وہ وجوب کے لیے ہے نہ کہ وعید کے لیے اور حصول ثواب میں مبالغہ کے لئے ہے۔

سوموار کے دن کی اہمیت

۲۰۴۵: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ الْاِثْنَيْنِ فَقَالَ فِيْهِ وُلِدْتُّ وَفِيْهِ اُنْزِلَ عَلَیَّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/ ۸۲۰ حدیث رقم (۱۹۸۔ ۱۱۶۲)۔ واحمد فی المسند ۵/ ۲۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے دن کے روزہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس دن میں پیدا کیا گیا ہوں اور اسی دن مجھ پر کتاب اُترنی شروع ہوئی۔ اس کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنہ : یعنی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ۔ قال سئل رسول اللہ ﷺ عن صوم الاثنین : یعنی اس دن اور ہمزہ وصل کے ساتھ ہے، اور اس پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے لیکن اکثر اہل علم اس کو ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ لیکن وقف اور وصل میں کوئی فرق نظر نہیں رہا بلکہ وہ نہیں جانتا کہ ابتداء کی کیفیت ابتدفاء سے انتہاء باوجود اس کے دعوے کے کیا ہے۔ پھر سوال میں دو احتمال ہیں: (۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں کثرت سے روزہ رکھنا۔ (۲) مطلق روزے سے اس دن کو دوسرے دنوں سے خصوصی برتری ہو۔

فقال فیہ ولدت، وفیہ انزل : یعنی وحی۔ علیّ : یعنی اس میں چھ کمال صوری کی ابتداء کا حصول ہوا، اور طلوع صبح معنی مقصود ظاہری اور باطنی ہے۔ اور ابتدائی وانتہائی فضل کا حاصل ہونا۔ یہ وقت دنیوی اور اخروی نعمتوں کے پیدا ہونے کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اطاعت ظاہری اور باطنی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا مجھ پر صوم اور قیام کے ساتھ فرض ہے، جو اس نے اپنی نعمتوں کا تتمہ کر کے مجھ کو برتری وفضیلت دی۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: دوسرا احتمال زیادہ پسندیدہ ہے۔ یعنی اس میں تمہاری نبوت کا وجود، تمہاری کتاب کا نزول اور تمہاری نبوت کو ثبوت ہے۔ تو اس دن سے کون سا دن صوم کے لحاظ افضل ہے۔ اس کو علت پر محمول کیا جائے گا۔ تو اس کی فضیلت کے بارے میں سوال کر اور اس روزے کے بارے میں کوئی بات کہنے والا نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اسلوب ہے اس میں ہے کہ ظاہر ہے سوال علت کے بارے میں ہے، اور جواب سوال کے مطابق ہے۔ تقدیری عبارت یوں کہ سوال نفس صوم کے مطابق ہو۔ معنی یہ ہے کہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔ اس وقت جو اس نے اس طرح ذکر کیا وہ فصل خطاب سے نار حوادث میں اسلوب حکیم۔

حدیث میں ہے کہ یہ ایسا زمانہ جس سے شرف اور عزت وتکریم اس میں واقع ہوتی ہے اس لیے کہا گیا ہے: مکان کی عزت وتکریم وشرف مکین کی وجہ سے ہے۔

مہینے کے تین روزوں کا ذکر

۲۰۴۶: وَعَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا سَأَلَتْ عَائِشَةَ اَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ قَالَتْ نَعَمْ فَقُلْتُ لَهَا مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ كَانَ يَصُوْمُ قَالَتْ لَمْ يَكُنْ يُبَالِيْ مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ يَصُوْمُ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲/ ۸۱۸ حديث رقم (۱۹٤ ـ ۱۱٦۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۲/ ۸۲۳ حديث رقم ۲٤۵۳ـ والترمذی فی السنن ۳/ ۱۳۵ حديث رقم ۷٦۳ـ وابن ماجه ۱/ ۵٤۵ حديث رقم ۱۷۰۹ـ

ترجمہ: حضرت معاذہ عدویہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھتے تھے؟ فرماتی ہیں کہ ہاں رکھتے تھے پھر میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ مہینے کے کون سے دنوں میں روزے رکھتے تھے؟ فرمایا کہ مہینے کے کسی بھی دن کی پرواہ نہ کرتے تھے یعنی جس دن چاہتے رکھتے تھے کسی دن کی تعین نہیں تھی۔

تشریح: وعن معاذة العدوية انها سألت عائشة: أ كان رسول الله ﷺ يصوم من كل شهر ثلاثة ايام: قالت نعم! : یہ کم از کم ہے، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفاء کیا۔ فقلت لها من أی ایام الشهر : ہفتے کے دنوں سے احتراز کرتے ہوئے۔ کان یصوم : یہ تین روزے شروع میں، درمیان میں، یا آخر میں علیحدہ علیحدہ یا اکٹھے۔ قالت لم یکن یبالی: اس کی تعین کا اہتمام کرتے تھے۔ من ای ایام الشهر یصوم : آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چاہتا۔

شوال کے روزوں کی فضیلت

۲۰۴۷: وَعَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهُ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲/ ۸۲۲ حديث رقم (۲۰٤ ـ ۱۱٦٤)۔ وابوداؤد فی السنن ۲/ ۸۱۲ حديث رقم ۲٤۳۳ـ والترمذی ۳/ ۱۳۲ حديث رقم ۷۵۹ـ وابن ماجه ۱/ ۵٤۷ حديث رقم ۱۷۱٦ والدارمی ۲/ ۳٤ حديث رقم ۱۷۵٤ـ

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ابوایوب نے راوی عمرو بن ثابتؓ سے یہ حدیث بیان کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو رمضان کے روزے رکھے۔ پھر اس کے بعد شوال کے چھ دن روزے رکھے وہ ہمیشہ روزہ رکھنے والے کی طرح ہوگا۔ یہ امام مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: وعن ابی ایوب الانصاری انه حدثه : یعنی ابوایوب سے راوی نے بیان کیا یا انہوں نے حدیث بیان کی اور آپ ﷺ کا قول بیان کیا۔ان رسول الله ﷺ قال : بدل ہے۔اور قول معول ہے۔اور راوی سے مراد جو سند میں مذکور ہے۔اور اس کی تائید دوسرے نسخہ سے ہوتی ہے:عن ابن عمرو بن ثابت عن ابی ایوب۔من صام رمضان ثم اتبعه : ہمزہ قطعی کے ساتھ۔یعنی ان کے بعد روزوں کو رکھا۔(ستاً :یعنی ستة ایام، چھ دن۔مذکر کے لیے مؤنث ممیز ہے یا پھر راتوں کے اعتبار سے ہے۔من شوال :اور وہ مسلسل یا علیحدہ علیحدہ انہیں رکھتا ہے۔کان کصیام الدهر :طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس وجہ سے کہ ہر نیکی کے بدلے دس نیکیاں ہیں۔اس نے اسے تشبیہ کے حمل سے مبالغہ کے لئے نکالا ہے اور چھ روزوں پر ترتیب دی ہے۔

اس بحث میں ہے: اگر چھ ہوں تو مبالغہ کا فائدہ ہے اور منفرد طور پر سنت کے...... پر کھڑا ہوگا۔اگر اس کو رمضان کے ساتھ ملا دیں تو جو وجہ تشبیہ مبالغہ کے لئے ہے، وہ واضح نہیں ہوتی، چونکہ "صیام الدهر" اس حکم کی بناء ان الحسنة بعشر امثالها پر ہے، جیسا کہ نسائی نے حسن سند کے ساتھ حدیث بیان کی ہے: "صیام شهر رمضان بعشرة اشهر" وصیام ستة ایام بشهرین تو یہ پورے سال کے روزے ہوگئے۔اللہ ہمیں ان کی توفیق دے۔مگر اس طرح نہ کہا جائے: کصیام الدهر فرضًا جیسے ابن حجرؒ نے اپنے معلل قول کو ذکر کیا ہے۔مگر اس کے ساتھ وہ ذکر نہ کیا جائے جو ہر مہینے کے تین روزوں سے حاصل ہوتا ہے اور یہ بحث پیچھے گزر چکی ہے۔

اس تعلیل میں نظر ہے شارع کا کسی چیز کو خاص کر دینا اس سے کسی حکم کی تخصیص لازم نہیں آتی جب اس کا کلام اس حکم میں ترغیب کے لیے ہو۔ہمارا کلام تشبیہ میں مشہور کی بنیاد پر ہے، یا اغلب یہ ہے کہ مسئلہ یہ ضروری ہے کہ مشبہ سے اقوی ہو اگر "کصیام الدهر" کو حقیقی طور پر مراد لیا جائے مبالغہ کے لئے تو وہ صاحب بلاغ کے کلام سے ظاہر ہے۔واللہ اعلم۔

حدیث میں اشارہ ہے کہ صوم الدهر محمود ہے، اگر وہ ایسے دنوں میں روزہ چھوڑتا ہے جن میں روکا گیا ہے تو مذموم حرام ہے۔پہلی اور اس حدیث میں یہ فرق ہے کہ رمضان کو اس حدیث میں شمار کیا گیا ہے بخلاف پہلی حدیث کے۔آپ غور کریں۔

شیخ محی السنہ کہتے ہیں: ایک قوم (جماعت) نے شوال کے چھ روزوں کو مستحب قرار دیا ہے۔مختار (پسندیدہ) بات یہی ہے کہ مہینے کے شروع میں ان کو لگاتار رکھا جائے، یعنی عید کے بعد چھ دن' کسی حدیث میں یہ دلالت نہیں کہ مسلسل رمضان کے بعد اور چھ دنوں تتابع ہو۔

اور حقیقی طور پر عید کے دن کے روزے سے منع کیا گیا ہے۔اگر اس کو مجاز مشارفہ پر محمول کیا جائے تو حکماً تتابع ہے ایک دن کے فاصلے ساتھ۔یا مطلق بُعد مراد ہے۔اس پر ابن ماجہ وغیرہ کی حدیث دلالت کرتی ہے: "عن ثوبان مرفوعًا من صام ستة ایام بعد الفطر كانه صام السنة"۔پھر فرمایا: وان فرقها مجاز"۔امام مالکؒ نے ان روزوں کے متعلق اہل علم سے ناپسندیدگی بیان کی ہے۔نوویؒ نے کہا ہے: امام مالکؒ کہتے ہیں: میں نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس نے یہ روزے رکھے ہوں۔وہ کہتے ہیں: ان کی کراہت کی وجہ کوئی انہیں واجب گمان نہ کرے۔

ابن ہمام کہتے ہیں:ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ ~~شوال~~ کے چھ روزے ناپسندیدہ ہیں، انہوں نے مکروہ کہا ہے اور عام مشائخ

کہتے ہیں: کہ کوئی حرج نہیں۔ اس میں ان کا اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے: افضل یہ ہے کہ عید فطر کے بعد انہیں مسلسل رکھا جائے۔ ایک قول یہ ہے: بلکہ علیحدہ علیحدہ رکھا جائے، اس کی وجہ جواز ہے، چونکہ ان کے نزدیک فطر کے فصل کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ اہل کتاب کے ساتھ تشبیہ لازم نہیں آتی۔ کراہت کی وجہ شاید کثرت مداومت کی بناء پر اس کے لزوم کا اعتقاد ہے۔ ہم نے بعض لوگوں کو کہتے ہوئے سنا: **یوم الفطر نحن الی الان لم یأت عیدنا**" یوم الفطر عید کا دن اور ہمارے پاس ابھی تک ہماری عید نہیں آئی۔ جو اس جیسی باتوں سے محفوظ ہو، تو اس کے حدیث پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ روزوں میں تفریق افضل ہے، چونکہ یہ ناپسندیدہ تشبی اور اس کے لزوم کے اعتقاد سے دور کرتی ہے۔ اور اہل کے علوم کا کلام بھی اس سے متعلق ہو جاتا ہے جیسا کہ یہ بات جان لی گئی ہے۔ پھر بات بھی مخفی نہیں کہ ہمیشہ کے روزے کا ثواب ان چھ کو رمضان کے ساتھ ملانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور شاید تخصیص کی وجہ اس حکم کے حاصل کرنے میں جلدی کرنا ہے۔ اور اس معنی پر ابن ماجہ کی روایت دال ہے، جو ہم نے پیچھے ذکر کردی ہے۔ واللہ اعلم

شیخ جزریؒ کہتے ہیں: ابوایوبؓ کی حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں اور نہ ترمذی کی اس روایت کی جانب التفات کیا جائے جو حسن ہے اور صحیح نہیں، اور اس حدیث میں سعید بن سعید راوی ہے۔ حافظ ابو محمد عبدالمؤمن بن خلف دمیاطی نے اس کے تمام طرق ذکر کیے ہیں، اور تیس آدمیوں کو اس کی طرف منسوب کیا ہے، جنہوں نے سعید بن سعید سے روایت کیا ہے۔ اکثر ان میں ثقات اور حفاظ ہیں۔ سعد نے اس کے روایات میں اس کی متابعت کی ہے۔ اس کے بھائی عبدربی، یحییٰ اور صفوان بن سلیم وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ان سے اور عن النبی ﷺ روایت کرنے والے ابو ہریرہ، جابر، ثوبان، براء بن عازب، ابن عباس اور عائشہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

میرکؒ کہتے ہیں: ابو ہریرہؓ کی حدیث کو بزار اور طبرانی نے روایت کیا ہے، اور دونوں کی اسناد حسن ہیں۔ منذری کہتے ہیں: بزار کے ہاں ایک سند صحیح ہے۔ حدیث جابر کو طبرانی، احمد، بزار اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حدیث ثوبانؓ کو ابن ماجہ، نسائی، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور الفاظ ابن ماجہ کے یہ ہیں: "**من صام ستة ايام بعد الفطر كصيام السنة** ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الانعام: ۱۶۰] لفظ **بقیه** بھی اس کے قریب قریب ہے۔ حدیث عباسؓ اسے طبرانی، احمد، بزار اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حدیث عائشہ کو طبرانیؒ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔

عید کے دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے

۲۰۴۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحة ۳۲۹/۴ حدیث رقم ۱۹۹۱ و مسلم فی صحیحة ۸۰۰/۲ حدیث رقم (۱۴۱۔ ۸۲۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۸۰۳/۲ حدیث رقم ۲۴۱۷۔ والترمذی ۱۴۲/۳ حدیث رقم ۷۷۲۔ وابن ماجه ۵۴۹/۱ حدیث رقم ۱۷۲۱۔ والدارمی ۳۴/۲ حدیث رقم ۱۷۵۳۔ واحمد فی المسند ۷۱/۳۔ فی المحصوصة ((اعتراض))۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فطر (یعنی عید الفطر) کے دن اور نحر (یعنی دس ذی الحجہ) کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ یہ بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **عن ابی سعید الخدری قال : نھی رسول اللہ ﷺ** : یعنی نہی بمعنی تحریم۔ **من صوم یوم الفطر** : یہ شوال کی پہلی تاریخ (پہلا دن) ہے۔ **والنحر** : اس سے جنس مراد ہے یعنی قربانی کے ایام اس میں تغلیب ہے کہ ایام تشریق کے روزے اسی طرح حرام ہیں۔ "ایام نحر" تین ہیں۔ اور ایام تشریق بھی تین ہیں۔

اور متفق علیہ بات یہ ہے کہ ایام نحر چار ہیں، اور ان کا تعلق عشرہ ذی الحجہ کے ساتھ ہے۔ یعنی دو دن پہلے عشرہ کے بعد اور یوم تشریق ان دونوں کے بعد تشریق کا دن ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: عید کے دن روزے کی حرمت پر اتفاق ہے۔ یہ حدیث معناً ہے اور جو انہوں نے بیان کی ہے وہ لفظاً ہے، اور جو اس پر نص ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ راوی تمام روایت کرنے والے کے لئے ایک ہی ہے۔ اور ابن حجرؒ نے اس کی متابعت کی ہے۔ لیکن اس سے لزوم لازم نہیں آتا، اس کی وجہ سے تعدد سماع کا احتمال ہے، اس نے کہا ہے کہ شاید آپ ﷺ کے اس فرمان سے اعراض ہے: "**نھی عن صوم العیدین الی ذکر الفطر والنحر**" یہ اشعار ہے اور حرمت کی علت یہی وصف ہے۔ ان کو یوم فطر اور یوم نحر ہونا اور روزہ ان دونوں کی نفی کرتا ہے۔

اس میں یہ بحث بھی ہے کہ عید کا دن فائدہ کے لحاظ سے مختصر ہے۔ اس میں روزہ رکھنا گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ضیافت جو مخلوق کے لئے ہے اس سے اعراض کرنا ہے۔ اور اس وہم کو دور کرنا ہے کہ اس سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے یہ رمضان میں آخر اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ شرح السنہ میں ہے اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ عید کے دن کا روزہ جائز نہیں۔ شرح السنہ ہی میں ہے: علماء کا "متمتع" کے لئے ایام تشریق کے روزے رکھنے پر اختلاف ہے، جب اس کے پاس قربانی نہ ہو، اس کے علاوہ ہر ایک کے لیے روزے رکھنے حرام ہے، اس پر ان کا اتفاق ہے۔

حدیث کے ظاہر سے متمتع اور اس کے علاوہ کوئی بھی ہو فرق نہیں، ہمارے نزدیک عید کے بعد متمتع کے لئے روزہ رکھنا جائز ہے پہلے جائز ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: متمتع جس کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق ہمارا موقف ہی قابل اعتماد ہے۔ اس کے لئے روزہ حرام ہے۔ امام شافعیؒ کے لئے ایک قول ہے: کہ اس کے لئے روزہ رکھنا صحیح ہے۔ حدیث کے صحیح ہونے کی وجہ سے ان کے پیروکاروں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ حدیث میں بیان کی ضرورت ہے۔ اور اگر حدیث صحیح ہو تو ان کے مذہب کی بنیاد مشہور قول پر ہے: "**ولو نذر صوم لم ینعقد عند الاکثر**" اگر اس نے نذر کے روزے کی نیت کی تو اکثر کے نزدیک روزہ نہیں ہوگا۔ اور اصحاب ابوحنیفہ کے ہاں ہو جائے گا، اور اس پر دوسرے کسی دن پھر روزہ رکھنا ہے۔

۲۰۴۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَوْمَ فِي يَوْمَيْنِ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰى۔

(متفق علیہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۷۰/۳ حدیث رقم ۱۱۹۷۔ ومسلم فی صحیحہ ۷۹۹/۲ حدیث رقم (۱۴۰۔ ۸۲۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۸۰۲/۲ حدیث رقم ۱۱۹۷۔ والترمذی ۱۴۱/۳ حدیث رقم ۷۷۱ وابن ماجہ ۵۴۹/۱ حدیث رقم ۱۷۲۲۔

ترجمه:حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: روزہ رکھنا دو دنوں میں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن جائز نہیں۔اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعنه** :یعنی ابوسعید خدری۔**قال : قال رسول اللہ ﷺ لا صوم** :یعنی جائز۔**فی یومین** :یعنی دو وقت یا دو قسم کے ایام یا دو عیدین۔**الفطر** :بدل،اور یہ ایک دن ہے۔**والاضحیٰ** :چار دن ہیں۔

ایامِ تشریق میں روزے رکھنا منع ہیں

۲۰۵۰ :وَعَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَّامُ التَّشْرِيْقِ اَيَّامُ اَكْلٍ وَّشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٨٠٠/٢ حديث رقم (١٤٤۔ ١١٤١)۔ وابوداوٗد فی السنن ٨٠٤/٢ حديث رقم ٢٤١٩۔ والترمذی ١٤٣/٣ حديث رقم ٧٧٣۔ وابن ماجه ٥٤٨/١ حديث رقم ١٧٢٠۔

ترجمه:حضرت نبیشہ ہذلیؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کے یاد کرنے کے دن ہیں۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعن نبيشة** :نون کے ضمہ''باء'' کے فتحہ''یاء'' کے سکون کے ساتھ اس کے بعد''شین''اور''ھاء''۔**الهذلی** : ''ھاء'' کے ضمہ اور ذال کے فتحہ کے ساتھ۔**قال : قال رسول اللہ ﷺ ایام التشریق** : یہ تین دن ہیں،اور یہ عید الاضحیٰ کے ساتھ بعد والے تین دن ہیں۔چونکہ وہ ان دنوں میں قربانی کے گوشت لٹکاتے تھے سورج کے روشنی میں۔یعنی وہ انہیں لٹکاتے تھے اور سورج کی روشنی میں سوکھنے کے لئے پھیلاتے تھے۔چونکہ قربانی کے گوشت کا منی میں ایسے کرتے تھے۔کہا گیا ہے کہ ان کا نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ ہدی اور قربانی اس وقت تک ذبح نہ کرتے جب تک سورج نہ چمکتا،بمعنی طلوع ہوتا۔نہایہ میں اسی طرح ہے۔**ایام أکل وشرب** : یعنی اغلب طور پر۔چونکہ قربانی کا دن کھانے پینے کا ہے،اور باقی ایام بھی اسی طرح ہیں۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: تمام اس دن روزہ رکھنے کی حرمت پر متفق ہیں۔اسی طرح عید اور ایام تشریق کے دن روزہ حرام ہے، چونکہ لوگ اس میں اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ابن ہمامؒ کہتے ہیں:اور وہ یوم نیروز اور مہرجان کا روزہ ناپسند کرتے تھے،چونکہ اس میں دنوں کی عظمت وتوقیر ہے اور ہم کو اس سے منع ان کی تعظیم سے منع کر دیا گیا ہے۔اگر کوئی پہلے سے روزہ رکھنے والا ہو تو اور اس کا روزہ موافق ہو جائے،تو اس میں کوئی حرج نہیں۔**وذکر اللہ** :جر کے ساتھ،اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: ﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ [البقرة : ٢٠٣]۔''اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے دنوں میں۔''اشرفؒ کہتے ہیں: کھانے اور پینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے شاید کہ بندہ اپنے نفس کے لئے ہی مستغرق ہو جاتا ہے،اور ان ایام میں اللہ تعالیٰ کا حق بھول جاتا ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: طبرانی نے اپنی سند سے ابن عباس ؓ سے بیان کیا ہے: ''أن رسول اللہ ارسل ایام منی صائحا یصیح ان لا تصوموا هذه الایام فانها ایام أكل وشرب وبعال'' یعنی جماع کرنے کے دن ہیں۔دار قطنیؒ

نے ابو ہریرہؓ کی سند اور اسی طرح عبداللہ بن حذافہ سے بھی بیان کیا ہے: "بعثنی رسول اللہ ﷺ علی راحلته ایام منی أنادی: الها الناس انها ایام اکل وشرب وبعال"۔ ابن ابی شیبہ نے کتاب الحج میں بیان کیا ہے اور اسحاق بن راہویہ نے بھی روایت کیا ہے: "انه بعث علیا ینادی ایام أکل وشرب"۔ ایک دوسری سند سے زیادہ بیان کیا ہے: "وذکر اللہ" اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے مضی شرح اللہ؟

تنہا دن کا روزہ نہ رکھے بلکہ ایک دن اور ساتھ ملا لے

۲۰۵۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَصُوْمُ اَحَدُکُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا اَنْ یَصُوْمَ قَبْلَهٗ اَوْ یَصُوْمَ بَعْدَهٗ۔ (متفق علیه

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۳۲/۴ حدیث رقم ۱۹۸۵۔ ومسلم فی صحیحه ۸۰۱/۲ حدیث رقم (۱۴۷۔ ۱۱۴۴) وابوداؤد فی السنن ۸۰۵/۲ حدیث رقم ۲۴۲۰۔ والترمذی ۱۱۹/۳ حدیث رقم ۷۴۳۔ وابن ماجه ۵۴۹/۱ حدیث رقم ۱۷۲۳۔ واحمد فی المسند ۴۵۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے مگر اس طرح کہ وہ روزہ اس سے ایک دن پہلے رکھے یا اس سے ایک دن بعد رکھے۔ یہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال: قال رسول اللہ ﷺ لا یصوم أحدکم یوم الجمعة: نفی بمعنی نہی ہے اور یہ نہی تنزیہی ہے۔ الا ان یصوم قبله: ایک دن یا زیادہ۔ أو یصوم بعده: اگرچہ ایک دن ہو۔ ابن ہمام کہتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ اور محمدؒ کے نزدیک اکیلے جمعہ کا دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

شیخ التورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے جمعہ کے دن اکیلے روزہ رکھنے کی ممانعت کی علت کے متعلق سوال کیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ اس پر عمل کرنے کا مشورہ کیا۔ ہم نے دیکھا کہ شارع نے روزہ رکھنے کو اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ ملانا ناپسند نہیں کیا۔ اور اکیلا رکھنے کو ناپسند کیا ہے۔ ہمیں پتا چلا کہ نہی کی علت جو یوم جمعہ پر اقامت نماز اور ذکر اللہ کے حوالے سے آتی ہے وہ قوی نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کی رائے ہے۔ اس معنی میں جمعہ اور ہفتہ کے دن کے روزے میں مناسبت نہیں اور اسی طرح جس نے اکیلے جمعہ کے دن کا روزہ رکھا۔ ہم نے جان لیا کہ اس کی کوئی اور وجہ ہے۔ اور یہ معنی (واللہ اعلم) دو وجوہ سے خالی نہیں جو ہمارے لئے واضح ہوئے۔

أحدهما: ہم کہتے ہیں: کہ ہمارے لیے جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ خاص کرنے کی تعظیم کی کراہت اس لئے ہے کہ یہودی ہفتہ کے دن کو عظمت کی خاطر روزے کے ساتھ خاص کرتے تھے، اور عیسائی اتوار کے دن کو تعظیم کی خاطر روزے کے ساتھ خاص کرتے تھے، لیکن اس امت کیلئے جمعہ کے دن کی حیثیت ان دونوں جماعتوں کے دو دنوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو پسندیدہ کیا ہمارا طریقہ ان کے مخالف ہو تو مناسب نہیں سمجھا کہ ہم جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ خاص کریں۔

والآخر: ہم کہتے ہیں: کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے یوم جمعہ کو فضائل کے ساتھ خاص کر دیا، کسی اور دن

کو وہ فضائل نہیں دیئے۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں بھی وارد ہے۔ اس دن میں نماز کا اجتماع جو شہروں میں ہوتا ہے بندوں پر فرض کیا گیا ہے۔ پھر ان کو بخش دیا گیا ہے، جو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک گناہوں سے بچتے ہیں اور تین دنوں کی فضیلت اور کسی جگہ ایام کی فضیلت زیادہ نہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کو خاص کر دیا ہے۔ اور اعمال جو اس دن کے ساتھ خاص ہیں وہ کسی دوسرے کے ساتھ خاص نہیں، یہ انتہاء درجہ کی تحقیق ہے۔ پہلی وجہ زیادہ معقول ہے وہ مقصود کے لائق ہے، لیکن اس کی رات کے اختصاص سے نہی کی وجہ واضح نہیں، کہ اس کو قیام کے ساتھ باقی راتوں سے خاص کر لیا جائے۔ باوجود اس کے کہ اس سے منع کیا گیا ہے، جس طرح کہ اس کے دن کو روزے کے ساتھ خاص کرنا۔ شاید کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت دوسروں دنوں میں سے صرف اس دن کے روزے پر اکتفاء نہ کر لے، اور ان کی کوشش صرف اس کی رات کے ساتھ باقی راتوں سے منحصر نہ ہو جائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ تمام اوقات میں اطاعت وعبادات کو قائم کرے اور شارع کا ارادہ بھی یہ ہے کہ وہ اپنے وقت میں سے کچھ حصہ قیام وصیام کو دے، اور عبادت کی اقسام میں سے ہر قسم کو بعض ایام کے لئے خاص نہ کر لے۔ جیسا کہ عوام کی عادت ہے، عاجزی کے ساتھ یہی اعتراف ہے کہ رب تعالیٰ کے حکم کو ماننا اولیٰ ہے۔ اور احکام کے ظواہر سے عبادت میں لگ جانا اور انہیں قبول اولیٰ واعلیٰ ہے۔

کسی دن کو عبادت کے لیے خاص کرنا منع ہے

۲۰۵۲: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَخْتَصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِيْ وَلَا تَخْتَصُّوْا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ مِّنْ بَيْنِ الْاَيَّامِ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ فِيْ صَوْمٍ يَصُوْمُهُ اَحَدُكُمْ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲/ ۸۰۱ حديث رقم (۱۴۸۔ ۱۱۴۴)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام راتوں میں جمعہ کی رات کو اللہ کی عبادت کے لئے خاص نہ کرو۔ اسی طور پر تمام دنوں میں جمعہ کے دن کو روزہ رکھنے کے لئے خاص نہ کرو مگر یہ کہ تم میں سے کسی ایک کے روزے کے درمیان جس کو رکھنے کا پہلے سے معمول تھا اس دن جمعہ کا دن آ جائے (تو پھر ایسی صورت میں) جمعہ کے دن روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه : یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ قال : قال رسول اللّٰه ﷺ لا تختصوا ليلة الجمعة بقيام : ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی نماز کے ساتھ۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ قیام معنی مرادی میں عام ہے۔ من بين الليالي : نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے خاص کرنے کے حوالے سے حدیث میں صریح نہی ہے، اور یہ متفق علیہ ہے۔ اور علماء نے اس حدیث سے اس نئی نماز (مبتدعہ) کو مکروہ قرار دیا ہے، جس کا نام ''الرغائب'' ہے۔ اور علماء نے کئی ایک تصنیفات اس کی قباحت، گمراہی اور موضوع ہونے پر لکھیں ہیں۔ شاید عادت سے زیادہ عبادت کرنے سے اس منع فرمایا تا کہ جمعہ کے باقی وظائف ادا کرنے پر قوت باقی رہے۔ واللہ اعلم

ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یوم منصوب ہے مفعول ہونے کی بناء پر۔ یوم شھدنا : اختصاص لازم ومتعدی ہے، اور حدیث میں متعدی ہے۔ مالکی کہتے ہیں: اختص میں مشہور ہے کہ وہ خصّ کے متعدی ہونے کے موافق ہو ایک مفعول کی طرف۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [آل عمران: ۷۴]۔ عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے: ولا یختص قوما، اختص مطاوع کے لئے خص متعدی نہیں، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا: "خصصتك بالشیء فاختصصت"۔

اس کلام کا محل صدر حدیث ہے اور وہ ہے "لا تختصوا لیلة الجمعة" لیکن ہم نے اس کی اتباع لفظ کی رعایت سے کی ہے، شاید کہ ان کے نسخہ میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اور اسی طرح اس کے اصل پر محافظت بھی ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول کہ "یوم الجمعة" مفعول بہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا﴾ [النور: ۳۷] اس کی تقدیری عبارت یوں ہے: عذاب یوم۔ چونکہ دن سے نہیں ڈرا جاتا۔ اور ان کا کہنا "یوم مخوف ای مخوف فیه" یعنی جس میں ڈر ہو۔ یا مجاز ہے مبالغہ کیلئے۔ الا ان یکون فی صوم : تقدیری عبارت یوں ہے: الا ان یکون یوم الجمعة واقعا فی یوم صوم ۔ یصومه أحدکم : نذر کی وجہ سے بطور وظیفہ وعادت کے۔ اسی طرح جمعہ کی رات کا استثناء ہے۔ شاید کہ اس کا ذکر مقاسیت کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔

اختصاص سے ممانعت کی وجہ گزر چکی ہے۔

مظہر کہتا ہے: وہاں کہا گیا ہے کہ نہی کی علت تمام دنوں میں سے ایک خاص دن میں یہود کی موافقت کو ترک کرنا ہے۔ یعنی یہودیوں نے ہفتہ کے دن تعظیم کی۔ تو تم خاص جمعہ کے دن کی تعظیم روزے اور نماز وغیرہ کے ساتھ نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: اگر علت یہود کی مخالفت ہے تو روزہ رکھنا اولیٰ ہے۔ کیونکہ وہ اس دن آرام کرتے تھے اور کھانے پینے سے مزہ لیتے تھے۔ اس کی مصداق ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے: جو اس باب کی تیسری فصل میں آئے گی۔

اور اس میں مقصود ان کی تعظیم اس دن میں اس وجود کی مخالفت ہے، وہ دن ان کے ہاں بہت عظیم ہے، خواہ وہ کسی نوع سے بھی خاص ہو۔ اگر عبادت ہے تو مخالفت کی کوئی اور وجہ ہے باوجود اس کے لئے کہ یہ الفاظ ہیں: "لا تصوموا یوم السبت الا فیما افترض علیکم" اور ظاہر یہ ہے کہ نہی ان کی مخالفت کے لئے ہے۔ ہوسکتا ہے۔ اس مراد دو جماعتیں ہوں۔ واللہ اعلم

پھر کہا: لیکن علت نص کا وارد ہونا اور ہر دن کو ایسی عبادت کے ساتھ خاص کرنا ہے جو دوسرے دن میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کو فضائل کے ساتھ دوسرے دنوں سے فضیلت دی ہے، جو کسی دوسرے دن کو نہیں دی۔ اس دن میں بندوں کا شہروں میں فرض نماز کے لئے اجتماع ہے۔ تو یہ بات پسند نہیں فرمائی کہ جمعہ کو ان اعمال کے علاوہ دوسرے اعمال کے ساتھ خاص کرے۔ بعض ایام کو کسی عمل کے ساتھ خاص کیا ہے جو دوسرے دنوں میں نہیں، تاکہ عمل کی ہر نوع خاص ہو، اور خاص کرنے سے اس کی فضیلت واضح ہو۔

اور اس میں ہے کہ جمعہ کو بہت سے فضائل کی وجہ سے فضیلت دی ہے۔ اس میں منع صوم کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کا انکار نہیں ہونا چاہئے۔ وہ عالم کو ایک اور میں جمع کر دے۔ ساتھ اس کے کہ نہی کا اطلاق اس پر نہیں۔ جی ہاں! اگر نہی

مطلق ہوتی، تو اس کی وجہ ہوتی یہ کہ کہا جائے۔ ان کو منع کیا ان پر معاملے کو آسان اور سہولت کی غرض سے۔ جیسا کہ یوم عرفہ کے روزے کی کراہت کے بارے میں کہا گیا ہے۔ یا کہا جائے کہ عید کے دن کے ساتھ مشابہت ہے۔ کیونکہ جمعہ کا دن مؤمنین میں فقراء اور مساکین کے لئے عید ہے۔ جنت میں اس کا نام یوم مزید ہے۔ جو نیکوں میں زیادہ اور ان کے حصول کا ارادہ رکھنے والا ہے، لیکن شارع نے ایک دن پہلے یا بعد کے ملانے کا استثناء کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ان باریکیوں اور اسرار کو جانتا ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے: "ان جابرًا سُئل أنهى النبی ﷺ عن صوم یوم الجمعة قال نعم! ورب الکعبة"

صحیح حدیث میں وارد ہے: "یوم الجمعة یوم عید فلا تجعلوا یوم عیدکم یوم صیامکم الا ان تصوموا قبله او بعده"۔ امام حاکمؒ نے اس کو بغیر استثناء کے ذکر کیا ہے۔ ذہبیؒ کہتے ہیں: اس کی اسناد میں مجہول راوی ہیں۔ لیکن صحیحین میں اس کا شاہد موجود ہے۔ ایک ضعیف حدیث میں ہے: "یوم الجمعة عیدنا اهل الاسلام" مجموعہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی امت پر آسانی اور سہولت کے لئے منع فرمایا، کیونکہ آپ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ جب صحابہ نے عبادات میں تکلف کیا، آپ ﷺ کو ان کے متعلق خوف ہوا کہ وہ اس کے ساتھ روزہ ملا نہ لیں، اور وہ کلی طور پر اس سے عاجز آ جائیں۔ اور یہ حکمت جو اس ملت کے لئے ہے یہ مشکل راستہ ہے ان کو اکیلے اس دن کے روزے سے' اس لئے منع کیا کہ وہ ان کے لئے بطور عید ہے۔ اس کے مناسب کھانا پینا ہے اور روزہ عید کے منافی ہے کہ کھایا پیا نہ جائے، اور اس کا تقاضا ہے اطاعت پر اعانت کی جائے اس کے ساتھ ساتھ کہ اس میں مخالفین کی مخالفت ہے جیسے کہ گزر چکا ہے، اس لئے کہا گیا ہے کہ مبالغہ نہ کرو، جیسے یہود نے ہفتہ کے دن کی تعظیم میں کیا ہے، اور عیسائیوں نے اتوار میں کیا ہے۔ کہا گیا تا کہ وہ اس کے وجوب کا اعتقاد نہ رکھے، ایسی صورت میں نہی کی مثال یوم شک کے روزے کے ساتھ ہے۔ کہ مکروہ نہیں ہوگا جب کہ اس دن کے ساتھ موافق ہو جس میں اس کی عادت تھی۔ یا ایک دن پہلے ملالے یا اس کے نے رمضان کا ارادہ نہیں کیا، تو اس وقت نبی ﷺ کے قول کی وجہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ الا ان یصوم یوما قبله أو بعده أو یکون فی صوم یصومه أحد کم۔

اللہ کے راستے میں روزہ رکھنے کی فضیلت

۲۰۵۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ یَوْمًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بَعَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٧/٦۔ حدیث رقم ٢٨٤٠۔ ومسلم فی صحیحه ٨٠٨/٢ حدیث رقم (١٦٨۔ ١١٥٣)۔ والترمذی فی السنن ١٤٣/٤ حدیث رقم ١٦٢٣۔ والنسائی فی السنن ١٧٢/٤ حدیث رقم ٢٢٤٤۔ وابن ماجه ٥٤٧/١ حدیث رقم ١٧١٧۔ والدارمی ٢٦٧/٢ حدیث رقم ٢٣٩٩۔ واحمد فی المسند ٥٩/٣۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص ایک دن راہِ الٰہی میں روزہ رکھے اللہ تعالیٰ اس کی ذات سے ستر برس کی مسافت کے مقدار آگ کو دور کر دے گا۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: وعن أبی سعید الخدری قال: قال رسول اللّٰه ﷺ من صام یوما فی سبیل اللّٰه: یعنی جس نے

روزے اور غزوہ کی مشقت کو جمع کیا، یا اس کا معنی ہے جس نے ایک دن کا روزہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے رکھا۔ بعد اللہ وجهه : اس آدمی کو۔ عن النار سبعين خريفًا : یعنی ستر سال کی مسافت۔ نہایہ میں ہے: خریف وہ زمانہ ہے جو سردی اور گرمی کے درمیان ہے اور اس سے مراد سال بھی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ خریف سال میں ایک ہی دفعہ ہوتا ہے۔ جب خریف مکمل ہو جائے۔ تو سال مکمل ہو جاتا ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: باقی موسموں کے علاوہ اس کو ذکر کر کے خاص کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ پھلوں کے پک کر حاصل کرنے اور کھیتوں کو کاٹنے اور زندگی کے ساز و سامان کو وسیع کرنے کا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ کہنے والا اس سے یہ سمجھا کہ خریف سے مراد وہی ہے جو عربوں کے ہاں رائج ہے، اور اہل حساب کے ہاں یہ موسم گرما ہے خریف کے علاوہ اور یہ بات غریب ہے کہ علامہ فاضل پر یہ بات کیسے مخفی رہی، جس کے ملک میں نہ کھیتی باڑی ہے اور نہ ہی خشک سالی ہے اور وہ خریف کی تعریف موسم گرما سے کرتا ہے۔ صاحب نہایہ کا کلام دلالت میں بہت اعلیٰ ہے، کہ انہوں نے اس موسم گرما مراد نہیں لیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ پھولوں اور پھلوں کے ظہور کی ابتداء ماہ حمل سے لے کر موسم گرما کے انتہاء سے تک ہوتا ہے، جب موسم خریف داخل ہوتا ہے تو پھل پک جاتے ہیں، اور یہی وجہ تشبیہ ہے۔ قاموس میں ہے کہ خریف تین مہینوں کا سردار سردی اور گرمی کے درمیان ہوتا ہے، اس میں پھل چنے جاتے ہیں۔ یہ لغت عرب کی کتب بول رہی ہیں، کہ موسم خریف ان کے نزدیک اس کی ابتداء ماہ میزان ہوتا ہے وہ پھلوں اور فواکہ کی انتہاء کا وقت ہے، اس پر سال ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد سردی شروع ہو جاتی ہے۔ اور سردی دشمنی ہے اور اس سے عمر کا زمانہ شمار نہیں ہوتا۔

رہا جو اس نے ذکر کیا ہے کہ خریف عرب کے ہاں موسم گرما ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ شاید اس کی بنیاد یہ ہے کہ پھلوں کی کثرت کا وقت ہے۔ اس نے پھلوں کی کثرت کا زمانہ متعین کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اصطلاح قائم کرنے میں کوئی جھگڑا نہیں۔ اہل عرب اور اہل حساب کے ہاں وہی معروف ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اگر کوئی عجمی کلام عرب کی پہچان میں غلطی کرے تو کوئی عجیب بات نہیں۔ غریب بات یہ ہے کہ عربی اپنا کلام نہ سمجھے اور نظم کو مرتب نہ کر سکے' اس لیے ان کی تعریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہوئی ہے: "لو كان العلم في الثريا لناله رجال من فارس" اور یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مصداق ظاہر ہوا۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کرامت کو متضمن ہے کہ علوم شرعیہ (فضائل عقلیہ سے قطع نظر کر کے) کی تحقیقات کی انتہائے علماء عجم کے ائمہ التفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد وغیرہ پر ہے۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے: علم عرب سے عجم منتقل ہو گیا ہے، پھر ان کی طرف نہیں لوٹے گا۔

عبادت کرنے میں راہ اعتدال اختیار کرو

۲۰۵۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَاللّٰهِ اَلَمْ اُخْبِرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ

وَنَمْ فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ صَوْمُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهِ صُمْ كُلَّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَاقْرَأْ الْقُرْآنَ فِي كُلِّ شَهْرٍ قُلْتُ إِنِّي أُطِيقُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ صُمْ أَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوُدَ وَصِيَامُ يَوْمٍ وَإِفْطَارُ يَوْمٍ وَاقْرَأْ فِي كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً وَلَا تَزِدْ عَلَى ذٰلِكَ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٢١٧/٤۔ حدیث رقم ١٩٧٥۔ ومسلم فی صحیحه ٨١٢/٢ حدیث رقم (١٨٢۔ ١١٥٩) وابوداؤد فی السنن ٨٠٩/٢ حدیث رقم ٢٤٢٧۔ والنسائی ٢٠٩/٤ حدیث رقم ٢٣٨٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عبداللہ! کیا مجھے خبر نہیں دی گئی یعنی مجھ کو خبر پہنچی ہے کہ تو (روزانہ) دن کو روزے رکھتا ہے اور ساری رات اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول! جی ہاں ایسا ہی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو اور قیام بھی کرو اور سو بھی جاؤ اس لیے کہ تیرے بدن کا تجھ پر حق ہے یعنی اپنے آپ کو بہت زیادہ مشقت میں نہ ڈالو تا کہ بیمار و ہلاک نہ ہو جاؤ اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی کبھی سو بھی جایا کرو۔ تا کہ آنکھیں آرام حاصل کریں اور تحقیق تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی اس کے ساتھ سو جاؤ اور صحبت و مخالطت کرو اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی اس سے کلام کرو اور اس کی خاطر داری کرو اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا (وہ ایسا ہے جیسا کہ) اس نے روزہ نہیں رکھا (البتہ) ہر ماہ میں تین دنوں کے روزے ہمیشہ روزہ رکھنے کے مساوی ہیں۔ پس ہر ماہ کے تین دن (خواہ ایام بیض کے یا اس کے علاوہ کے) روزے رکھا کرو اور اسی طرح ہر ماہ (مکمل) قرآن پڑھا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں تو اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر بہترین روزہ صوم داؤدی رکھ لیا کرو (اس کا طریقہ یہ ہے) ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن روزہ نہ رکھو یعنی کھاؤ پیو اور سات راتوں میں مکمل قرآن ختم کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص : قال : قال رسول اللہ ﷺ یا عبد اللہ : علمیت اور وصف کا احتمال ہے۔ ألم أخبر : مجہول کا صیغہ ہے۔ أنك تصوم النهار : یعنی تو افطار نہیں کرتا۔ وتقوم الليل : یعنی ساری رات تو نہیں سوتا۔ فقلت بلى يا رسول الله : طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ جواب ہے کہ اس کا جو آپ ﷺ کے قول "الم اخبر" سے لازم آتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کو اس صیام اور قیام کے متعلق خبر دی گئی تھی، گویا کہ یوں کہا گیا: ألم تصم النهار؟ الم تقم الليل؟ : اس نے کہا بَلٰی. گویا کہ آپ کہہ رہے تھے: صحابی نہیں جانتا، کہ آپ ﷺ نے خبر دی یا نہیں۔ وہ کیسے کہہ سکتا تھا بلٰی. اس کے معنی ہے کہ خبر دی گئی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ استفہام تقریر کے لیے ہے، اور مخاطب کو اقرار پر مجبور کرنا ہے۔ اس نے کہا بَلٰی. برابر ہے کہ خبر وحی تھی، یا اس کے علاوہ کیونکہ وہ نفس الامر کے مطابق ہے۔ قال فلا تفعل : وہ تیرے لیے مضر ہے وہ دونوں عمل تجھے بدن کی کمزوری کی طرف لے جائیں گے۔ جو کہ بعض واجب عبادات کو چھوڑنے کو منفضی ہے۔ اگرچہ عمر کے آخری حصے میں ہو۔ صم : نشاط کے وقت اور نشاط بعض ایام میں حاصل ہوتا ہے۔ یا روزہ رکھو نفس کی سرکشی کے وقت' تا کہ اس کی سرکشی کو توڑا جا

سکے۔

وأفطر : اکتاہٹ کے وقت اور کچھ نفس بجھا ہوا ہو، اور شہوت ٹوٹنے کے وقت اور فضیلت والے دنوں میں روزہ رکھ۔ تا کہ تو فضائل کو پا سکے۔ ان کے علاوہ دنوں میں افطار کر' تا کہ تیرا بدن طاقت اور تیرے اخلاق وشمائل اچھے ہو جائیں۔ قم : رات کے شروع اور آخر میں۔ و نم :دونوں کے درمیان۔ آپ ایسے طبیب جو کہ حبیب بھی ہے، کی بات اور نصیحت بغیر کسی علت کی پہچان کے سن اور آپ ﷺ نے اس کو کیسے بیان کیا اس قول کے ساتھ: "فان لجسدك عليك حقًا" کھانے پینے کی محافظت، سونے اور جاگنے پر محافظت اور روزوں کی ہیشگی۔ راتوں کے قیام پر دوام سے قوی کمزور ہو جاتے ہیں اور بدن نظام سے ہٹ جاتا ہے۔ تیرے لیے جائز نہیں، کہ تو اس کو افراط وتفریط سے ضائع نہ کرے، اس طور پر کہ تو بعض عبادات اور ادائے حقوق سے عاجز آ جاؤ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تمام امور میں اعتدال ہونا چاہیئے۔ وان لعينك: قيل : تیرے آنکھ کے لئے اور کہا گیا ہے: ذات مراد ہے۔ عليك حقًا : پہلا قول اولی ہے، کیونکہ تأسیس تاکید سے افضل ہے۔ نیند اور بیداری سے جو نقصان قوت باصرہ کو ہوتا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ وان لزوجك :یعنی تیری بیوی کے لئے۔ عليك حقًا :یعنی فائدہ اٹھانا، جماع کرنا، روزہ رکھنے، قیام کرنے سے وہ فوت ہو جاتے ہیں۔ وان لزورك :"زاء" کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ تیرے دوست واحباب جو تیرے پاس آتے ہیں۔

عليك حقًا : تو روزے اور قیام سے ان کے ساتھ حسن معاشرت سے عاجز آ جائے گا۔ ان کی خدمت کیلئے کھڑا ہونا اور ان کے ساتھ بیٹھنے سے تو رُک جائے گا۔ بدن کی کمزوری یا برے اخلاق کی وجہ سے۔ نہایہ میں ہے "زور" اصل میں مصدر ہے، اور اسم کی جگہ پر ہے، جیسے "صوم ونوم" بمعنی "صائم ونائم" ہیں۔ "الزور" جمع ہے، جیسے رکب جمع راکب۔ کہا گیا ہے: الزور اسم جمع ہے، اور "ضيف" مہمان کے معنی میں ہے۔ (لا صام :نووی کہتے ہیں: خبر ہونے کا احتمال ہے یا پھر دعا ہے، جیسے پیچھے گزرا۔ پہلا قول ظاہر ہے۔ من صام الدهر : کیونکہ جو مشقت دوسروں کو ہوتی ہے عادت پڑنے کی وجہ سے اس کو وہ مشقت لاحق نہیں ہوتی۔

قاضیؒ کہتے ہیں: گویا کہ اس نے روزہ نہیں رکھا۔ کیونکہ جب اس کی عادت ہو جائے گی تو اس کو ریاضت اور مشقت لاحق نہیں ہوگی جو اس کے ثواب کو بڑھا دے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تاویل سیاق کے خلاف ہے۔ کیونکہ سیاق سختی اور بوجھ دور کرنے کے لئے ہے۔ کیا آپ نے پہلے دیکھا نہیں' کہ کس طرح صوم دہر سے منع فرمایا، پھر انہیں صوم داؤد کی رغبت دلائی۔ اولی یہ ہے کہ لا صام کو خبر کی جگہ پر رکھا جائے۔ کیونکہ اس نے وہ شارع کے حکم کو پورا نہیں کیا اور اس نے افطار نہیں کیا، کیونکہ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں' جیسا کہ ابوقتادہ کی حدیث گزر چکی ہے۔

اس کی تعلیل ایام مہینہ میں روزے رکھنے سے کرنا انتہائی بعید ہے۔ کیونکہ ان کو ان روزں کی حرمت کا علم تھا اور شارع نے صوم الدهر سے مطلقاً منع کیا ہے، باوجود اس احتمال کے کہ جن ایام کے روزوں سے منع کیا گیا ہے۔ اگر اس معنی کا ارادہ ہوتا، تو نہی کی تاکید ان ایام کے لئے بالخصوص ہوتی۔ واضح اور ظاہر وہی ہے جس پر سیاق وسباق دلالت کرتا ہے۔ خواہ وہ خبر ہو، دعا ہو۔ کیونکہ اس کے ساتھ وہ ضرر لاحق ہے جو تمام حقوق واجبہ سے کمزور کر دے گا۔ شاید یہی اس حکمت کی وجہ سے کہ ایک مہینے کے

روزے امت پر فرض ہیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] وقال : وما جعل عليكم في الدين من حرج اور نبی ﷺ نے فرمایا: "عليكم بالملة الحنيفية السمحاء" وروى. عليكم بدين العجائز ولا تشددوا فيشدد الله عليكم.اس کے علاوہ بے شمار دلائل ہیں،جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

صوم ثلاثة ايام من كل شهر : مبتداء ہے اوراس کی خبر "صوم الدهر" ہے۔کیونکہ ایک نیکی کا بدل دس نیکیاں ہیں۔ كله :یعنی حکماً "جر" کے ساتھ "دھر" کی تاکید ہے۔ صم :یعنی تو بالخصوص اور جو اس معنی میں تیری مثل ہے۔اس کے ساتھ تکرار کا وہم دور ہوتا ہے، جو پہلے سے مستفاد ہوتا ہے۔ كل شهر :منصوب بنزع خافض ہے۔یعنی ہر مہینے۔ ثلاثة ايام : ظرف ہے۔کہا گیا ہے کہ یہ ایام بیض ہیں۔ واقرأ القرآن :یعنی تمام۔

في كل شهر :ایک مرتبہ۔ قلت انى أطيق اكثر من ذلك :یعنی جو مہینے کے تین روزے ذکر کیے گئے ہیں۔ قال : صم افضل الصوم صوم داؤد : منصوب ہے،بدل یا بیان یا أعني کو مقدر ماننے کی وجہ سے۔اس کو جر کے علاوہ رفع دینا بھی جائز ہے۔فساد معنی کے ساتھ۔ صيام يوم وافطار يوم :دونوں مرفوع ہیں،اور دونوں مبتداء محذوف کی خبر ہیں،اور وہ هُوَ ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے اور وہ ظاہر ہے۔ واقرأ :یعنی قرآن۔ في كل سبع ليال مرة :یعنی ایک مرتبہ ختم کرنا۔"ليالي" کو "ايام" پر اختیار کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان میں قراءت کی فضیلت ہے۔ ولا تزد على ذلك :یعنی مذکورہ روزے اور ختم قرآن۔یا سوال میں زیادتی نہ کر اور زیادہ طاقت کا دعویٰ نہ کر۔میرک کہتا ہے: چاروں نے الفاظ کے اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے،اور معنی ایک ہے۔

الفصل الثّانی:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول آپ ﷺ کا پیر اور جمعرات کو روزہ رکھنے کا معمول

۲۰۵۵:عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسَ .

(رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۱/۳ حدیث رقم ۷۴۵۔ حدیث رقم ۲۳۶۱۔ وابن ماجه ۵۵۳/۱ حدیث رقم ۱۷۳۹۔ وأحمد فی المسند ۱۰۶/۶۔

ترجمہ:حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔اس کو امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن عائشة رضي الله عنها قالت : كان :یعنی کبھی کبھار۔ رسول الله ﷺ يصوم الاثنين :نون کے کسرہ کے ساتھ،ان کا اعراب حرف کے ساتھ قیاسی ہے۔اور یہ معتبر روایت ہے۔جیسا کہ میرکؒ نے شرح الشمائل میں ذکر کیا ہے،اور ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے۔(والخميس :نصب کے ساتھ۔

اور ترمذیؒ نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ان دونوں کے حقوق تلاش کرتے تھے۔اس کا نام ''الاثنین'' اس لئے، کہ یہ ہفتے میں دوسرا ہے، والخمیس اس لئے کہ وہ پانچواں ہے۔اسی طرح نوویؒ نے اہل لغت سے نقل کیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: ہفتے کا پہلا دن ''الاحد'' ہے۔ابن عطیہ نے اکثر سے یہ نقل کیا ہے لیکن سہیلی کہتے ہیں: درست یہ ہے کہ ہفتہ کا پہلا دن ''السبت'' ہے اور یہ قول تمام علماء کا ہے۔اس پر اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے اور اس کی مثال جو اس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں دیکھا ہے۔''ان عاشوراء تاسع المحرم'' اس پر بحث گزر چکی ہے۔میں کہتا ہوں: جو اس میں گزرا ہے وہ مبنی ہے اس پر جو گزرا ہے۔اور صحیح نہیں' جو وہاں علت ہے یہاں اس کے منافی ہے۔درست یہ ہے کہ ''احد'' اور ''اثنین'' کا اطلاق دو دنوں پر ہے۔ان کی بنا اللہ تعالیٰ کے عالم کو پیدا کرنے کی ابتداء سے ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول میں مقرر ہے:﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ [الاعراف: ٥٤] ''کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار خدا ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا'' شارح نے احادیث میں بیان کیا ہے کہ اس کا پہلا دن ''الاحد'' ہے۔اور یہ ''اسبوع'' میں اختلاف کے منافی نہیں، کہ اس کا پہلا ''الأحد'' ہے یا ''السبت'' ہے۔ظاہر یہ ہے کہ پہلے کی بنیاد لغت پر ہے جو سنت کے مطابق ہے، اور دوسرا قول عرف پر مبنی ہے۔لہٰذا یہ اختلاف لفظی ہے۔واللہ اعلم

اللہ ربّ العزت کے دربار میں اعمال پیش کیے جاتے ہیں

٢٠٥٦: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تُرْفَعُ الْاَعْمَالُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسَ فَاُحِبُّ اَنْ یُّرْفَعَ عَمَلِیْ وَاَنَا صَائِمٌ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٢٢/٣ حدیث رقم ٧٤٧۔ والدارمی ٣٣/٢ حدیث رقم ١٧٥١ واحمد فی المسند ٢٥٠/٥۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔اللہ رب العزت کے دربار میں سوموار اور جمعرات کے دن اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔پس مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے اعمال بھی پیش کیے جائیں' اس حال میں کہ میں روزے سے ہوں۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ تعرض الاعمال : یعنی اللہ تعالیٰ پر۔یوم الاثنین والخمیس: جر کے ساتھ۔فأحب ان يعرض عملی وأنا صائم :یعنی وہ زیادتی طلب کر رہے تھے درجات کی بلندی کے لئے۔ابن ملکؒ کہتے ہیں: یہ آپ ﷺ کے قول کے خلاف نہیں: ''یرفع عمل اللیل قبل عمل النهار وعمل النهار قبل عمل اللیل'' کیونکہ رفع اور عرض میں فرق ہے۔اس لیے کہ اعمال ہفتے میں جمع ہوتے ہیں اور دو دنوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اور اس کو حسن قرار دیا ہے۔مسلم کی حدیث میں ہے: ''تعرض اعمال الناس فی کل جمعة مرتین'' پیر کے دن اور

جمعرات کے دن۔ فیغفر لکل مؤمن الا عبدًا بینه وبین أخیه شحناء فیقال انظروا هذین حتی یصطلحا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ شعبان میں رفع کے منافی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ ایسا مہینہ ہے جس میں اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور میں پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں اٹھائے جائیں کہ میں روزے کی حالت میں ہوں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہفتہ کے اعمال مفصل اور سال کے اعمال مجمل اٹھائے جاتے ہوں۔

میں کہتا ہوں: اس میں اشارہ ہے کہ شعبان سال کا آخر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان پہلا مہینہ ہے آخرت کے اعتبار سے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ شروع سال میں رمضان کے لئے جنت سجائی جاتی ہے، یہ حدیث پیچھے گزری ہے۔ اب میرے لیے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ نصف رات کو پچھلے سال کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جیسا کہ اگلے سال میں جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے وہ لکھا جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے کہا: "قوموا لیلها وصوموا نهارها" اس کا تقاضا ہے کہ سال کا اول عبادت کے لحاظ وہ نصف شعبان کا اخیر ہے، اور یہ رمضان سے پہلے بناؤ، سجاوٹ اور تزین کے لئے بطور مقدمہ اور تمہید ہے، جیسا کہ اہل زمانہ کے عرف میں ہے، وہ ان ایام کا نام "ایام النزاهة" رکھتے ہیں، اور وہ روزہ رکھنے کو رمضان کی تقویت کی وجہ سے سخت کراہت میں شمار کرتے تھے۔ واللہ المستعان۔

ایّام بیض کے روزے

۲۰۵۷: وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ فَصُمْ ثَلَاثَ عَشَرَةَ وَاَرْبَعَ عَشَرَةَ وَخَمْسَ عَشَرَةَ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳٤/۳ حدیث رقم ۷٦۱۔ والنسائی ۲۲۳/٤ حدیث رقم ۲٤۲۲۔ واحمد فی المسند ۱۵۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوذر! جب تو مہینے میں تین دن روزہ رکھنا چاہے تو تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کو روزہ رکھ (ان ایام کو ایّام بیض کہتے ہیں)۔ اس کو امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبی ذر قال: قال رسول اللہ ﷺ یا ابا ذر اذا صمت: یعنی جب تو روزے کا ارادہ کرے۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا یعنی عمل کرنا اس چیز پر جو تجھے معلوم ہے کہ ہر مہینے میں تین روزے رکھے۔ تو گویا کہ پورے سال کے روزے ہیں، لیکن حدیث میں اس کی دلالت نہیں ہے۔ من الشهر ثلاثة ایام فصم ثلاث عشرة واربع عشرة وخمس عشرة: سکون شین کے ساتھ، اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ یہ سفید راتوں کے دن ہیں، اور اس میں پے در پے روزے رکھنے کی فضیلت ہے ان تینوں کو جمع کرنا اور ان کا بیض ہونا اکمل ہے۔

اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا معمول مہینہ کے تین روزے رکھنے کا تھا

۲۰۵۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنْ غُرَّةِ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَقَلَّمَا كَانَ يُفْطِرُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۔ (رواه الترمذی والنسائی ورواه ابوداود الی ثلثة ايّام)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۸۲/۲ حديث رقم ۲۴۵۰۔ والترمذی فی السنن ۱۱۸/۳ حديث رقم ۷۴۲۔ والنسائی ۲۰۴/۴ حديث رقم ۲۳۶۸۔ واحمد فی المسند ۴۰۶/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے کے پہلے تین دن روزہ رکھتے تھے اور بہت کم جمعہ کے دن افطار کیا کرتے تھے۔ اس کو امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے اور ابوداوٗدؒ نے ثلثہ ایام تک روایت کی ہے۔

تشریح: وعن عبد الله بن مسعود قال : كان رسول الله ﷺ يصوم من غرّة كل شهر : یعنی اس کے شروع میں۔ ثلاثة ایام : اس حدیث اور حدیث عائشہؓ میں کوئی تعارض نہیں: ”وهو أنه لم يكن يبالي من اي ايام الشهر يصوم“ یعنی آپ علیہ السلام اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ مہینے کے کونسے دنوں میں روزہ رکھیں اور اس راوی نے حکم کو اس طرح پایا غالب طور پر جو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں سے پتہ چلا، اس نے حدیث بیان کی جو وہ جانتا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ جس پر مطلع ہوئیں جس پر یہ راوی مطلع نہیں ہوسکتا۔ مجھے جس حدیث کا پتہ چلا میں نے بیان کر دی۔ دونوں حکموں میں کوئی تعارض نہیں۔

قاموس میں ہے: کہ ”غرۃ“ ہلال کے طلوع ہونے کے ساتھ ہے ممکن ہے یوں کہا جائے: كلما طلع هلال صام ثلاثة ایام ، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ شروع ہی میں روزہ رکھتے تھے۔ تو یہ بقیہ حدیث کے موافق ہو جاتا ہے۔ (وقلما كان يفطر يوم الجمعة : میم کے ضمہ اور سکون کے ساتھ۔

مظہرؒ کہتے ہیں: اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ روزہ رکھتے اس طرح کہ یا تو پہلے کا ایک دن اس کے ساتھ ملا لیتے یا بعد والا دن ملا لیتے۔ یا یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جس طرح کہ وصال کرنا۔

قاضیؒ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے پہلے (امساک کرتے تھے) یعنی رک جاتے تھے اور صبح کا کھانا جمعہ اداء کرنے کے بعد کھاتے تھے۔ جیسا کہ سہل بن سعد ساعدی سے بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا افطار کا معنی ہے صبح کا کھانا۔ جو دن کے شروع میں کھایا جاتا ہے، نہ کہ وہ افطار جو کہ ”صوم“ کی ضد ہے، اور یہ تاویل سیاق وسباق کے اعتبار سے بعید ہے۔ بلکہ اس کے ظاہر کا ہے اطلاق معلوم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کا مؤید ہے، کہ اکیلے جمعہ کا روزہ رکھنا' مکروہ نہیں۔ کیونکہ اختصاص احتمال سے ثابت نہیں ہوتا۔

ہفتہ کے دنوں میں روزہ رکھنے کا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا معمول مبارک

۲۰۵۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنَ الشَّهْرِ السَّبْتَ

وَالْاَحَدَ وَالْاِثْنَیْنِ وَمِنَ الشَّھْرِ الْاٰخِرِ الثَّلَاثَاءَ وَالْاَرْبِعَاءَ وَالْخَمِیْسَ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۱۲۲/۳ حدیث رقم ۷۴۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینے میں ہفتہ، اتوار اور پیر کو اور کسی مہینے میں منگل، بدھ اور جمعرات کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت : کان رسول اللہ ﷺ یصوم من الشهر : مہینوں میں سے ایک۔ السبت، والأحد، و الاثنین : نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اس بناء پر کہ اس کو اعراب حرف کے ساتھ ہے، یا حرکت کے ساتھ۔ ومن الشهر الآخر الثلاثاء : ثاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ۔ والاربعاء : ''باء'' کے کسرہ، فتحہ اور ضمہ کے ساتھ اور یہ دونوں اسمائے ممدودہ میں سے ہیں۔ والخمیس : دنوں کے درمیان برابری کے لئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ایام میں ہیں۔ بعض کو چھوڑنا مناسب نہیں تاکہ ہم تمام دنوں سے فائدہ حاصل کریں۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: پچھلی حدیث میں جمعہ کا ذکر تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے مہینے کے روزے رکھا کرتے تھے۔ ابن ملک رحمہ اللہ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ سال کے روزے کا تمام ہفتے میں فرق کردیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چھ روزے متواتر نہیں رکھے تاکہ امت پر اقتداء میں مشقت نہ ہو۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر رحمت اور شفقت ہے۔

ہفتے میں تین دن روزے رکھنے کا معمول اور اسکی ابتداء پیر یا منگل سے کرتے تھے

۲۰۶۰: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنِیْ اَنْ اَصُوْمَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ مِنْ کُلِّ شَهْرٍ اَوَّلُهَا الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسُ (رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۸۲۲/۲ حدیث رقم ۲۴۵۲۔ والنسائی ۲۲۱/۴ حدیث رقم ۲۴۱۹۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حکم فرماتے تھے کہ میں ہر مہینے کے تین روزے رکھوں پہلا دن پیر کا ہو یا جمعرات کا ہو۔

تشریح: وعن ام سلمة : ام المومنین۔ قالت : کان رسول اللہ ﷺ یأمرنی ان اصوم ثلاثة ایام من کل شهر أولها : رفع کے ساتھ۔ الاثنین : نون کے ضمہ، کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ والخمیس : تابع ہونے کی بنا تینوں حرکات ہیں۔ اشرف رحمہ اللہ کہتے ہیں: اثنان ظاہر ہے۔ کہا گیا ہے: اس کا اعراب حرکت کے ساتھ ہے نہ کہ حرف کے ساتھ۔ کہا گیا ہے کہ اس کا مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ اپنی حالت پر باقی ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہوگی: ''اولها یوم الاثنین''۔ کہا گیا ہے کہ وہ ''بحرین'' کی طرح علم ہے۔ اور اعلام اپنی اصل سے متغیر نہیں ہوتے اگرچہ عوامل مختلف ہو جائیں۔ والخمیس یعنی واو بمعنی أو ہے۔ اسی پر شیخ تورپشتی رحمہ اللہ کا ظاہر کلام محمول ہے۔ انہوں نے کہا: درست ہے ''أو الخمیس'' ہے معنی یہ ہے کہ تین دنوں میں اول ''الاثنین'' ہے یا ''الخمیس'' ہے اس لئے کہ ہفتہ اس کا افتتاح اس ہفتے سے وہ جمعرات کے بعد والی قسم میں ہے۔ اس کے روزے کا افتتاح اس مہینے میں سوموار سے ہوگا۔ یا اس قسم سے جو ''اثنین'' سوموار کے بعد ہے، اس مہینے کا آغاز

جمعرات کے ساتھ ہوگا۔اسی طرح میں نے اس حدیث کو پایا جس کو۔طبرانی روایت کیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: اپنے قول کے ساتھ اس معنی سے یعنی پہلا سوموار جو چاند کے ساتھ ملا ہوا ہے اگر چہ چاند جمعہ یا ہفتہ یا اتوار کو نکلے یا پہلی جمعرات' جو اس کے متصل ہے، اگر چہ چاند منگل یا بدھ کو طلوع ہو۔وہ مقصود سے قاصر ہے، جب وہ پیر یا جمعرات کو نکلے تو شامل۔قیاس یہ ہے کہ صوم ہلال اور جو اس کے ساتھ ہے اس کا روزہ افضل ہے، مگر جواب دیا جائے کہ آپ ﷺ نے پیر اور جمعرات کی فضیلت کا قصد کیا ہے۔تیسرے دن پیر کو روزہ رکھنے کے ساتھ اور کبھی کبھی دوسری جمعرات کے ساتھ۔

یہ جو شارحین کا کلام گزرا ہے آپ نے اس کو جان لیا ہے۔یہی اس کا مقصود ہے کہ وہ صوم ہلال اور جو اس کے ساتھ متصل ہے اس کو شامل ہے۔قیاس صحیح نہیں، اور نہ اس کا جواب دینے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ درستگی کی توفیق دینے والا ہے، ممکن ہے کہ اس کی تقدیری عبارت یوں ہو: "اجعل أولها الاثنين من شهر". یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ واؤ بمعنی اَوْ ہے۔

ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر اجر

۲۰۶۱: وَعَنْ مُسْلِمِ الْقُرَشِيِّ قَالَ سَأَلْتُ اَوْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صِيَامِ الدَّهْرِ فَقَالَ اِنَّ لِاَ هْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا صُمْ رَمَضَانَ وَالَّذِيْ يَلِيْهِ وَكُلَّ اَرْبِعَاءَ وَخَمِيْسَ فَاِذَا اَنْتَ قَدْ صُمْتَ الدَّهْرَ كُلَّهٗ۔ (رواہ ابو داود والترمذی)

اخرجه ابو داؤد ۸۱۲/۲ حدیث رقم ۲۴۳۲۔ والترمذی فی السنن ۱۲۳/۳ حدیث رقم ۷۴۸۔

ترجمہ: حضرت مسلم قرشیؓ سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا یا نبی کریم ﷺ سے ہمیشہ کے روزے رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا۔پس فرمایا کہ تیرے اہل والوں کا تجھ پر حق ہے رمضان کے روزے رکھو اور ان ایام کے جو ان کے قریب ہیں یعنی چھ عید کے روزے رکھو اور ہر بدھ اور جمعرات کو بھی روزہ رکھ لیا کرو۔پس تو یہ روزے رکھے گا۔تو ہمیشہ روزے رکھنے والا ہوگا۔اس کو ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن مسلم القرشی : قاف کے ضمہ اور "راء" کے فتحہ کے ساتھ۔قریش کی طرف نسبت ہے۔قال سألت أو سئل رسول الله ﷺ: رفع اور نصب کے ساتھ۔

عن صيام الدهر فقال : ایک صحیح نسخہ میں "قال" ہے۔ان لأهلك عليك حقاً : مجمل ہے جو پیچھے گزر چکا ہے۔اس میں اور جو پہلے گزر چکا ہے اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ "صوم دھر" کا معاملہ یہ ہے کہ ہمت حقوق اللہ اور حقوق العباد کے اداء کرنے سے کمزور کر دیتا ہے۔اس لئے اس کو ناپسند کیا ہے۔اور جس پر یہ اثر انداز نہ ہو اس کے لئے روزہ مکروہ نہیں ہے۔بلکہ مستحب ہے۔اس توجیہ سے تمام احادیث اور بعض سلف کے صوم دہر رکھنے میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

صم رمضان والذی یلیه : کہا گیا ہے کہ شوال کے چھ روزے مراد ہیں۔اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد شعبان ہے۔وکل اربعاء : مد کے ساتھ۔وخمیس : جر اور تنوین کے ساتھ۔فاذا : تنوین کے ساتھ۔أنت قد صمت الدھر : یعنی مرات۔طیبی ؒ کہتے ہیں: یہ لفظ اور ابوداؤد کے ہیں۔فا محذوف شرط کی جزاء ہے یعنی "ان فعلت ما

قلت لك فقد صمت". "اذن" جواب ہے ربط کی تاکید کے لئے ہے۔ کلہ: یعنی حکماً۔ شاید یہ حدیث مقدم ہے اس پر ہر مہینے کے تین روزوں کے ساتھ۔ نبی ﷺ خبر تھوڑے جز کے ساتھ بیان کرتے تھے، اور اس کا ثواب بہت عظیم اور جزیل بیان کرتے یہ اس صحابی اور امت پر احسان عظیم ہے، مگر اس حدیث کا تقاضا ہے کہ "صوم الدھر" حکم دو مرتبہ ہو۔ آپ اس پر غور کریں۔

یومِ عرفہ کو روزہ رکھنے کی ممانعت

۲۰۶۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ۔

(رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۸۱۶/۲ حدیث رقم ۲۴۴۰۔ وابن ماجه ۵۵۱/۱ حدیث رقم ۱۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۴۴۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عرفہ کے دن عرفات میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے اس کو ابوداوٗد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة أنه رسول الله ﷺ نهی: یعنی نہی تنزیہی۔ عن صوم یوم عرفة بعرفة: یعنی عرفات میں۔ تاکہ وہ دعا کرنے میں کمزور نہ ہو اور اس کا اخلاق اپنے رفقاء کے ساتھ برا نہ ہو اسی کی طرح دوسرے لوگ بھی اس معنی میں شامل ہیں۔ ابن ملک کہتے ہیں: یہ نہی تحریمی نہیں۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ عرفہ کے دن کا روزہ رکھتی تھیں۔ عطاء کہتے ہیں: میں سردیوں میں روزہ رکھتا ہوں، اور گرمیوں میں نہیں رکھتا۔ حاکمؒ کہتے ہیں: وہ شرط بخاری پر ہے اور ذہبی نے اس کی تاکید کی ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

اکیلے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت

۲۰۶۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ عَنْ اُخْتِهِ الصَّمَّاءَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَصُوْمُوْا یَوْمَ السَّبْتِ اِلَّا فِیْمَا افْتُرِضَ عَلَیْكُمْ فَاِنْ لَمْ یَجِدْ اَحَدُكُمْ اِلَّا لِحَاءَ عِنَبَةٍ اَوْ عُوْدَ شَجَرَةٍ فَلْیَمْضَغْهُ۔ (رواہ احمد و ابوداود والترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۸۰۵/۲ حدیث رقم ۲۴۲۱۔ والترمذی ۱۲۰/۳ حدیث رقم ۷۴۴ وابن ماجه ۵۵۰/۱ حدیث رقم ۱۷۲۶۔ والدارمی ۳۲/۲ حدیث رقم ۱۷۴۹ واحمد فی المسند ۱۶۸/۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے انہوں نے اپنی بہن سے نقل کی ہے کہ جس کا نام صماء تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم (اکیلے) ہفتے کے دن روزہ نہ رکھو۔ مگر اس صورت میں کہ تم پر فرض کیا جائے پس اگر تم میں سے کوئی انگور کے درخت کی چھال یا درخت کی لکڑی کے علاوہ کوئی چیز کھانے کی نہ پائے پس اس کو چاہیے کہ وہی چبا لے۔ اس کو امام

احمد ابوداوٗد ترمذی ابن ماجہ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعن عبد الله بن بُسر** : ''باء'' کے ضمہ اور سکون سین کے ساتھ۔**عن اخته الصماء** :میم کی تشدید۔نام بہیہ ہے اور ''صماء'' کے ساتھ معروف ہیں۔**أن رسول الله ﷺ قال لا تصوموا یوم السبت** :یعنی وہ اکیلا دن۔**الا فیما افترض** : صیغہ مجہول کے ساتھ۔**علیکم** :یعنی اگر چہ نذر کے ساتھ ہو۔طیبی ؒ کہتے ہیں: کہ اکیلے ہفتہ کے دن روزہ سے منع فرمایا جیسے جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔مقصود یہود کی مخالفت ہے۔جمہور کے نزدیک ان دونوں میں نہی تنزیہی ہے۔افتراض فرض کو بھی شامل ہے اور نذر قضا اور صوم کفارہ کو بھی شامل ہے۔اسی طرح جب یہ دن موافق ہوں سنت مؤکدہ کے جیسے عرفہ اور عاشوراء یا موافق ہوں وظیفہ کے دنوں کے۔ابن ملکؒ نے زیادہ کیا ہے۔**عشرة ذی الحجة** اور اس میں ''خیر الصیام، صیام داؤد**۔اس میں ممانعت شدت کے ساتھ اہتمام وانصرام کی ہے گویا کہ وہ اس کو واجب سمجھتا ہے،جیسا کہ یہود کرتے تھے۔اس صورت میں نہی تحریمی ہے۔اس کے علاوہ دوسری صورت میں صرف ممانعت تنزیہہ کے لئے ہے۔طیبی ؒ کہتے ہیں: جمہور نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ نہی اور جمعہ کے دن والی نہی تنزیہی ہے۔تحریمی نہیں۔**فان لم یجد أحدکم الالحاء عنبة** : لام کے کسرہ۔انگور کے دانے وغیرہ کا چھلکا' یہ لکڑی کے چھلکے سے استعارہ ہے۔**عنبه** سے مراد انگور کا درخت ہے اور وہ ''حبلة'' ہے۔

تورپشتی ؒ کہتے ہیں:اللحاء حاء ممدودہ کے ساتھ درخت کا چھلکا ہے۔اور ''عنبة'' یہ انگور کا دانہ ہے۔رہا ابن حجرؒ کا قول کہ اس سے مراد انگور کی شاخ ہے دانہ نہیں' یہ فحش غلطی ہے، کہ''حبہ'' مراد نہیں۔یہ صحیح نہیں۔باوجود اس کے کہ اس سے مراد مبالغہ ہے بلکہ اس مقام پر مبالغہ کیا جائے کہ عنب سے مراد ''حبہ'' ہے،انگور کا دانہ ہے،نہ کہ کھجور کا چھلکا،تو یہ صحیح ہوتا۔کیونکہ **العنبه** حقیقت لغویہ ہے۔قاموس میں ہے **عنب** معلوم ہے۔اور اس کی واحد ''عنبة'' ہے۔انہوں نے اصلاً عنب کا اطلاق ذکر نہیں کیا،نہ جنس کے لئے اور نہ واحد کے ساتھ ''حبلة'' (رسی) کے لئے۔اور اس قول کی تائید اس بات سے ہے کہ اصل عطف میں تغایر ہے خصوصاً اُو کے ساتھ۔**أو عود شجرة** :عطف ہے''لحاء'' پر۔

فلیمضغه : ضاد کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ۔قاموس میں ہے کہ ''مضغه''، **منعه** اور **نصره**'' کی طرح ہے وہ اس کو اپنے دانتوں سے چبائے۔افطار کی تاکید صوم کی نفی کے لئے ہے۔مگر روزے کی شرط نیت ہے۔جب نیت نہ ہوگا تو مشروط نہ ہوگا۔ اگر چہ اس نے نہ کھایا ہو۔اس کی مثال جیسے عید الفطر کے دن جلدی کھانا کھانا ہے روزے کی نفی کی تاکید کے لئے ہے،جس سے منع کیا گیا ہے۔

اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔اور امام حاکمؒ نے شرط بخاری پر اس کو صحیح قرار دیا ہے۔نوویؒ کہتے ہیں: ائمہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: ابوداوٗد کا قول کہ یہ منسوخ ہے قابل قبول نہیں۔جیسا کہ امام مالک کا قول ہے کہ یہ ''جھوٹ'' ہے۔یہ ابن حجرؒ سے بے تکی بات ہوئی ہے یہ دونوں حضرات حدیث کے امام ہیں وہ یہ بات بغیر کسی ثبوت اور سند کے نہیں کہہ سکتے۔ہمارے قول سے ان کے قول کا رد نہیں ہوتا کیونکہ ان دونوں حضرات کا منع کی سند ذکر یہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی سند ہو ہی نہ اور نہ ہماری کم علمی سے یہ لازم آتا ہے کہ ان کو بھی معلوم نہ ہو۔اس آدمی کے لیے تقلید اولیٰ ہے،جس کے پاس

تحقیق کی اہلیت نہ ہو۔

اذا لم تر الهلال فسلم
لأناس رأوه بالأبصار

''جب تو نے چاند کو نہ دیکھا ہو' تو ان لوگوں کی بات مان لے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا''۔

اس طرح کا رد امام شافعی کی طرف سے امام مالک بنسبت قابل قبول نہیں۔ تو کسی دوسرے کے لیے کیسے جائز ہوگا کہ امام مالخ پر رد کرے اللہ اس شخص پر رحم کرے جس نے ان کا مقام و مرتبہ پہچانا۔

اللہ کے راستے میں روزہ رکھنے کا اَجر

۲۰۶۴: وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ يَوْمًا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جَعَلَ اللّٰهُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّارِ خَنْدَقًا كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۳/٤ حديث رقم ۱٦۲٤۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص ایک دن خدا کے راستے میں روزہ رکھے گا' اللہ تعالیٰ اس کے اور (جہنم کی) آگ کے درمیان ایسی خندق بنا دے گا جس کا درمیانی فاصلہ آسمان و زمین کے مابین فاصلے کے برابر ہوگا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی امامة قال: قال رسول الله ﷺ من صام یومًا فی سبیل الله: یعنی جہاد میں۔ یا حج و عمرہ کے راستے میں یا طلب علم کے دوران یا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔ جعل الله بينه و بين النار خندقًا: یعنی سخت رکاوٹ یا ایسا مانع جو بہت دور کی مسافت سے رکاوٹ ہوگا۔ کما بین السماء والارض: یعنی پانچ سو سال کی مسافت۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: استعارہ تمثیلہ روکنے اور رکاوٹ سے۔ جیسے روزے کا قلعہ کے مشابہ ہونا اور اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خندق کو رکاوٹ بنا دے گا جو بندے اور دوزخ کے درمیان ہوگی، جو خندق دشمن کے لئے ہوتی ہے اس کے مشابہ ہے۔ پھر خندق کی مشابہت آسمان اور زمین کی گہرائی جتنی ہے۔

سردیوں کے موسم میں روزہ رکھنا غنیمت ہے

۲۰٦۵: وَعَنْ عَامِرِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغَنِيْمَةُ الْبَارِدَةُ الصَّوْمُ فِی الشِّتَاءِ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث مرسل وذكر حديث ابی هريرة) مَا مِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ فِیْ بَابِ الْاُضْحِيَّةِ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۱٦۲/۳ حديث رقم ۷۹۷۔ واحمد فی المسند ۳۳۵/٤۔

ترجمہ: حضرت عامر بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ٹھنڈی' غنیمت سردی کے موسم میں

روزہ رکھنا ہے(کیونکہ ایسے روزے میں بغیر کسی تھکاوٹ ومشقت کے ثواب ملتا ہے)اس کو امام احمد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قربانی کے باب میں ذکر کی گئی ہے۔

تشریح: عن عامر بن مسعود : یعنی عبداللہ بن مسعود کے بیٹے، مشہور تابعی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح طیبی رحمہ اللہ نے اس قول کو ذکر کیا ہے۔ میرکؒ نے تقریب سے نقل کیا ہے کہ وہ امیہ بن خلف جمحی کا بیٹا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صحابی ہے، ابن حبان وغیرہ نے اس کو تابعین میں ذکر کیا ہے، اور مولف نے اس کو صحابہ میں ذکر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ وہ عامر بن مسعود بن امیہ بن خلف جمحی ہے، صفوان بن امیہ کا بھتیجا ہے۔ اس سے......بن غریب نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کی حدیث کتاب الصوم میں ذکر کی ہے، اور وہ روایت مرسل ہے، کیونکہ عامر بن مسعود نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا۔ ابن مندہ اور ابن عبدالبر نے اس کو اسمائے صحابہ میں ذکر کیا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں: وہ صحابی نہیں ہے۔

قال : قال رسول اللہ ﷺ الغنيمة الباردة الصوم فى الشتاء : بغیر محنت کے کثرت ثواب کی وجہ سے۔ "افائق" میں ہے **غنيمت بارد** جو بغیر لڑائی کی آگ اور قتال کی گرمی کے حاصل ہو۔ کہا گیا ہے کہ اس مراد اچھی حالت ہے جو **عيش بارد** سے ماخوذ ہے۔ اصل میں "**برد**" کا وقوع اچھی اور طیب حالت سے عبارت ہے کہ پانی اور ہوا ان کا طیب اور ٹھنڈا ہونا ایسے شہروں میں جو گرم ہے۔ کہا گیا ہے ٹھنڈا پانی اور ٹھنڈی ہوا بطور شرینی کے، پھر اس کا استعمال کثرت سے شروع ہو گیا، یہ الفاظ بھی کہے جانے لگے: **عيش بارد، عنيمة باردة.وبردامرنا**

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ترکیب قلب تشبیہ ہے اصل عبارت یوں ہے: **الصوم فى الشتاء كالخنيمة الباردة**، اس میں مبالغہ ہے کہ ناقص کو کامل کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جیسے کہا جائے: "**زيد كالاسد**" اور جب اس کو الٹ کر دیا جائے اور کہا جائے: "**الاسد كزيد**" اصل کو فرع اور فرع کو اصل کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو تشبیہ مبالغہ میں انتہاء درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ معنی یہ ہوا کہ روزے دار کو بغیر پیاس کی گرمی کے چھوئے ثواب عظیم حاصل ہوگا۔ یا اس کو لمبے دن سے بھوک کی تکلیف پہنچے بغیر۔

حدیث کا تعلق تشبیہ بلیغ کے ساتھ ہے، وہ یہ ہوتی ہے کہ اداۃ تشبیہ محذوف ہوں۔ واضح اور صحیح یہ ہے کہ جملہ مبتداء اور خبر سے مرکب ہے، اپنے جزء کی تعریف کے حصر کے لئے۔ معنی یہ ہوا کہ ٹھنڈی غنیمت رمضان میں روزہ رکھنا ہے۔ مسند احمد میں حسن سند کے ساتھ روایت ہے اور ابو سعید سے مرفوعاً مروی ہے: "**الشتاء ربيع المؤمن**" بیہقیؒ نے زیادہ کیا ہے: "**قصر نهاره فصام وطال ليله فقام**"۔

کیونکہ عامر بن مسعود کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ثابت نہیں۔ وہ ابراہیم بن عامر قرشی کے والد ہیں۔ ترمذی کا کلام میرکؒ نے نقل کیا ہے اور کہا کہ اس حدیث کے سوا اس کی کوئی حدیث نہیں اور جو طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

عاشوراء کے روزہ رکھنے کی وجہ

۲۰۶۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَامًا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِىْ تَصُوْمُوْنَهٗ فَقَالُوْا هٰذَا

يَوْمٌ عَظِيْمٌ اَنْجَى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ وَغَرَّقَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهٗ فَصَامَهٗ مُوْسٰى شُكْرًا فَنَحْنُ نَصُوْمُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَحْنُ اَحَقُّ وَاَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْكُمْ فَصَامَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٢٤٤/٤۔ حدیث رقم ٢٠٠٤۔ ومسلم فی صحیحه ٧٩٥/٢ حدیث رقم (١٢٧۔ ١١٣٠)۔ وابوداوٗد فی السنن ٨١٨/٢ حدیث رقم ٢٤٤٤۔ وابن ماجه ٥٥٢/١ حدیث رقم ١٧٣٤۔ والدارمی ٣٦/٢ حدیث رقم ١٧٥٩۔ واحمد فی المسند ٣٥٩/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے۔ پس یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزے سے پایا پس ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ دن کیا ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا یہ بڑا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو ڈبو دیا۔ پس اس دن موسیٰ علیہ السلام نے شکرانے کے لئے روزہ رکھا۔ پس ہم بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پس ہم تم سے موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک زیادہ لائق تر ہیں۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھا اور اس دن کے روزے رکھنے کا حکم فرمایا۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وذکر حدیث أبی هريرة : ما من ايام أحب الى الله : صفت ایام محلاً مرفوع ہے اور لفظ کی وجہ سے نصب کے ساتھ ہے، اور مکمل جملہ یوں ہے "ان يتعبد" یہ محلاً مرفوع "أحب" کا فاعل ہے، یعنی اللہ کی قسم! ان دس دنوں (عشرہ ذی الحجہ) میں سے ہر دن کا روزہ سال کے روزے کے برابر ہے، اور ہر رات کا قیام لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے۔
في باب الأضحية : اگر اس کی مراد یہ ہو کہ صاحب مصابیح نے اس کو "باب الاضحية" میں ذکر کیا اور یہاں تکرار کی وجہ سے ساقط کر دیا۔ تو یہ بہتر معذرت ہے مگر اس کے برعکس اولیٰ ہے۔ اگر اس کی مراد یہ ہو کہ اس کا حق یہ ہے کہ یہ اس باب کے زیادہ لائق ہے۔ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ یہ درست نہیں۔

الفصل الثالث:

ہفتہ اور اتوار کے دن روزہ رکھنے میں یہود و نصاریٰ کی مخالفت مقصود ہے

٢٠٦٧: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ يَوْمَ السَّبْتِ وَيَوْمَ الْاَحَدِ اَكْثَرَ مَا يَصُوْمُ مِنَ الْاَيَّامِ وَيَقُوْلُ اِنَّهُمَا يَوْمَا عِيْدٍ لِّلْمُشْرِكِيْنَ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اُخَالِفَهُمْ۔

(رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٣٢٤/٦۔

ترجمہ: حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ اور اتوار کے دن دوسرے دنوں کی بہ نسبت زیادہ

روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے تھے یہ دو دن مشرکوں کے لئے عید ہیں یعنی وہ ان میں عید کی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے ۔ پس مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں ان کے خلاف کروں۔ اس روایت کو امام احمد رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ قدم المدينة** : یعنی مکہ سے ہجرت کے بعد۔ **فوجد اليهود** : یعنی انہیں مدینہ میں پایا۔ یہ دوسرا سال تھا، پہلے سال آپ ﷺ عاشوراء کے بعد ربیع الاول میں تشریف لائے تھے۔ **صياماً** : یعنی روزے والے یا روزہ رکھنے والے۔ **يوم عاشوراء فقال لهم رسول الله ﷺ ما هذا اليوم الذي تصومونه** : یعنی روزہ رکھنے کا سبب کیا ہے؟ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس میں دو اشکال ہیں۔ پہلا یہ کہ یہود مہینوں کی وہ تاریخ مقرر کرتے تھے، جو عربوں کے طریقے سے ہٹ کر تھی، دوسرا یہ کہ ان کی مخالفت مطلوب ہے۔

پہلے کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا کہ اس سال عاشورہ کا دن اسی دن واقع ہوا ہو جس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو فرعون سے نجات دی۔ ہاں ابتداء اس میں موافقت اور مخالفت کا احتمال ہوسکتا ہے۔ یعنی موافقت اور مخالفت کے احتمال کے ساتھ۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ کوئی مانع نہیں کہ یہ نجات عاشوراء عربی میں تھی۔ پھر اس سال ان سے تغیر واقع ہوگیا۔ اس قول کے ساتھ تغیر واقع ہوگیا' غیر صحیح ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کامل اعتقاد، غلو اور ان کی کوشش جو وہ اپنے زمانے میں عاشوراء کے دن کرتے تھے۔ تاریخی اختلاف لغت کے بدلنے اور مہینوں کے نام متغایر ہوجانے کی وجہ سے ہے۔

اما الخيام فانها كخيامهم
وأما نساء الحی غير نساء هم

دوسرے اشکال کا جواب: مخالفت اس چیز میں مطلوب ہے جس میں انہوں نے غلطی کی جیسا کہ ہفتہ کے دن میں غلطی کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **انما جعل السبت على الذين اختلفوا فيه**۔ تعظیم کی بنیاد ان کے اختیار اور اجتہاد پر تھی۔ حدیث میں گزر چکا ہے۔ ان کو جس دن کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔ میں کہتا ہوں: دوسرے کا واضح جواب یہ ہے کہ شروع ہجرت میں آپ ﷺ کو ان کی مخالفت کا حکم نہ تھا، بلکہ بہت سے امور میں آپ ﷺ ان کی تالیف (محبت) کرتے تھے۔ ان میں سے قبلہ کا حکم ہے۔ جب ان پر حجت ثابت ہوگئی، اور ان کی طرف سے دشمنی اور تکبر ظاہر ہوگیا۔ تو ان کی مخالفت کا حکم آگیا اور ان سے الفت چھوڑنے کا کہا گیا۔ اس لیے جب آپ ﷺ کو عاشوراء کے بارے میں کہا گیا (بعد اس کے کہ آپ نے اس کا روزہ رکھا) کہ یہودی اور عیسائی اس دن کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ آج کل ان سے مشابہت چھوڑنے کو پسند فرماتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ **"لئن بقيت لأصومن التاسع"**۔ پھر جس کا تعلق اس حدیث کے ساتھ ہے کہ نبی ﷺ نے بالفرض اجتہاد کے ساتھ روزہ رکھا، مطلق یہود کے قول پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ ان لوگوں کے خبر دینے پر اعتماد کیا جو ان میں سے اسلام لائے۔ یا ان کی جانب سے تواتر حاصل ہوگیا۔ تواتر میں اسلام کی شرط کی نہیں ہے۔

ابن حجر کا قول: وحی کے ساتھ یا اجتہاد کے ساتھ جو اس کی موافقت کرے یا ان میں سے جو کوئی اسلام لایا، اس کی خبر پر یہ صحیح نہیں۔ دوسرے میں جو 'اخر' ہے وہ اس کی تردید کر رہا ہے۔

فقالوا هذا يوم عظيم : اس دن بڑے بڑے امور متعلقہ ہوئے ہیں، جو اس دن کی تعظیم پر دال ہیں۔ **أنجى الله فيه**

موسی وقومه : یعنی مؤمنین کو۔ غرق : تشدید کے ساتھ۔ فرعون وقومه : دونوں میں نصب۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: غرق بمعنی أغرق اور ایک نسخہ میں "أغرق" ہے۔ ایک اور نسخہ میں راء مخففہ کے کسرہ کے ساتھ اور دونوں (فرعون قومہ) کے رفع ہے۔ فصامه : یعنی اس دن یا اس کی مثل۔ موسی شکرًا : دو عظیم اور جلیل القدر نعمتوں کے ملنے پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الانعام : ٤٥] "غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریف خدائے رب العالمین ہی کو (سزاوار) ہے"۔

فنحن نصومه : یعنی شکر اداء کرنے کیلئے۔ کیونکہ "آباء واجداد" کے باقی رہنے سے بیٹوں کا وجود ہے، یا موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی وجہ سے اور یہی آپ ﷺ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اس طرح طرح آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: فقال رسول الله ﷺ فنحن : اگر معاملہ اس طرح ہے، تو ہم بھی اسی طرح ہیں۔ أحق : یعنی ثابت شدہ ہے۔ و أولی : یعنی زیادہ قریب ہے۔ بموسیٰ : یعنی پیروی کے لحاظ سے۔ منکم : کیونکہ ہم اصول دین میں ان کی موافقت کرنے والے ہیں اور ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والے ہیں جس میں واضح حق ہے۔ اور تم اس کی مخالفت کرتے ہو تغیر و تحریف کر کے۔

فصامه رسول الله ﷺ : اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ: ﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ [الانعام : ٩٠] آپ ﷺ کا اس چیز کی تعظیم کرنا جس کی تعظیم موسیٰ علیہ السلام نے کی ان کی دین کی پیروی کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس لیے تھا آپ کی شریعت اس بارے میں موسیٰ علیہ السلام کے شریعت کے موافق تھی یا آپ کا روزہ موسیٰ کی نجات پر شکر کرتے ہوئے تھا۔ جیسا کہ سورہ "صٓ" میں سجدہ داؤد کی توبہ قبول ہونے پر شکر کی وجہ سے ہے۔ اور اس لیے کہ آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے تھے۔ جب تک اس بارے میں آپ کو کوئی حکم نہ دیا جاتا تھا ظاہر یہی ہے کہ پیچھے گزرا ہے وہاں روزے کا حکم وجوبی ہے اسی لیے پکارنے والے نے یہ آواز دی: من لم یاکل فیه فلیصم و من أکل فلیمسك. جس نے اس دن نہیں کھایا وہ روزہ رکھے اور جس نے کھایا وہ رک جائے۔ و أمر : یعنی اپنے صحابہ کرامؓ کو۔ (بصیامه : یہ اعلیٰ تواضع ہے موسیٰ کلیم اللہ کی بنسبت۔ وگرنہ آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے: "لو کان موسی حیاً لما وسعه الا اتباعی" اس میں قوم کی تالیف، ان سے انس و محبت ہے، شاید کہ وہ اپنی دشمنی سے باز آ جائیں۔

ابوموسیٰ سے بخاری میں جو روایت ہے اس کا ظاہر اس کے منافی ہے۔ "قال : کان یوم عاشوراء تعده الیهود عیدا قال النبی ﷺ فصوموه أنتم". یہ سمجھ آتی ہے کہ روزہ ان کی مخالفت کے لئے تھا۔ اور جو پیچھے گزرا وہ صریح ہے۔ کہ روزہ رکھنا ان کی موافقت میں تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ یہودیوں کے کئی گروہ تھے۔ دو وقتوں میں قضیے مختلف تھے۔ یا کہا جائے گا: کہ ان کے عید شمار کرنے سے یہ لازم آتا کہ یہ دن حقیقتاً بھی عید ہو۔ یہ ان کے نزدیک روزہ رکھنا ممنوع نہیں تھا، یا آپ ﷺ نے فرمایا: تم روزہ رکھو اُسے عید نہ بناؤ۔ واللہ اعلم

عاشوراء کے دن کی اہمیت

۲۰۶۸: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُ بِصِيَامِ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ

وَیُحُثُّنَا عَلَیْهِ وَیَتَعَاهَدُنَا عِنْدَهُ فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ لَمْ یَأْمُرْنَا وَلَمْ یَنْهَنَا عَنْهُ وَلَمْ یَتَعَاهَدُنَا عِنْدَهُ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۷۹٤/۲ حديث رقم (۱۲۵۔ ۱۱۲۸)۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنے کے بارے میں حکم فرماتے تھے اور ہمیں اس پر رغبت دلاتے تھے اور اس دن کے نزدیک آنے پر ہماری خبر گیری کرتے۔ پس جب رمضان فرض ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ہم کو اس دن کے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور نہ ہی منع فرمایا اور نہ ہی عاشوراء کا روزہ رکھنے سے اس دن کے آنے کی خبر گیری کی۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ام سلمة : ام المؤمنین۔ قالت كان رسول الله ﷺ يصوم يوم السبت ويوم الاحد اكثر ما يصوم من الايام : یعنی دوسرے دنوں میں۔ ويقول انهما يوما عيد للمشركين : ہفتہ یہودیوں کے لئے اور اتوار عیسائیوں کے لئے۔ ان کا نام مشرکین اس لئے رکھا کہ یہود نے عزیرؑ کو ابن اللہ کہا، اور عیسائیوں نے مسیحؑ کو ابن اللہ کہا۔ یا یہ تغلیباً کہہ دیا اور اس سے مراد کفار میں سے جو دین اسلام کا مخالف ہے۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: مشرک کافر ہے، خواہ وہ کسی بھی ملت پر ہو۔ اور کبھی کبھی اس کا اطلاق اہل کتاب کے مقابل پر ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مشرک موحد کی ضد ہے اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو شریک مانے چاہے وہ شریک بت ہو، سورج ہو، چاند اور ستاروں وغیرہ ہو اور کبھی کبھی جنس کافر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جو دہریہ، معطلہ اور اہل کتاب وغیرہ کو شامل ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ...... ﴾ [النساء: ٤٨] ”خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا“ ﴿لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ مُنْفَكِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ﴾ [البينة: ١] ”جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ (کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل (نہ) آتی“ فانا أحب ان اخالفهم : تمام گروہوں کی۔ اس حدیث اور پچھلی حدیث میں جمع اس طرح ہے کہ ہفتے کے دن کے روزے سے روکنا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، اور امت کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ پہلے قول کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں اشارہ ہے: ”فأنا أحب“۔ اور دوسرے قول کی طرف اشارہ اس قول میں ہے: لا تصوموا۔ یا روزے سے ممانعت تعظیم کی وجہ سے ہے۔ روزے کا پسندیدہ ہونا مخالفت کے طریقے پر ہے، ان کے کھانے پینے سے فائدہ اٹھانے کے وقت کھانے پینے کو چھوڑ کر۔ ممکن ہے کہ مخالفت صرف ہفتے کے دن کی ہو، اور اسی کے معنی میں اتوار ہو۔ اور مستحب یہ ہے کہ ان دونوں کا اکٹھا روزہ پے در پے دونوں فریقوں کی مخالفت ہے۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ وہ ان دنوں میں روزہ نہیں رکھتے تھے۔ بخلاف پہلی حدیث کے فتا مل

میرکؒ کہتے ہیں: ابن خزیمہ وغیرہ نے حدیث ام سلمہ کو اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ”ان رسول الله ﷺ اكثر ما كان يصوم من الايام السبت ويوم الأحد كان يقول انهما يوما عيد للمشركين وانا اريد ان

اخالفهم".

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار چیزوں پر مداومت

۲۰۶۹: وَعَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ اَرْبَعٌ لَّمْ يَكُنْ يَدَعُهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَامُ عَاشُوْرَاءَ وَالْعَشْرِ وَثَلَاثَةَ اَيَّامٍ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ۔ (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۴ / ۲۲۰ حدیث رقم ۲۴۱۶۔ واحمد فی المسند ج۶/ ۲۸۷۔

ترجمہ: حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ چار چیزیں سنت مؤکدہ سے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہیں چھوڑتے تھے: ① عاشوراء کا روزہ رکھنا ② عشرہ ذی الحجہ کے روزے ③ ہر مہینے میں تین روزے اور ④ فجر سے پہلے دو رکعتیں۔ یعنی فجر کی سنتیں۔ اس کو امام نسائی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن جابر بن سمرة قال : كان رسول الله ﷺ يأمر : یعنی ہمیں تاکیداً حکم دیتے تھے۔ بصيام يوم عاشوراء ويحثنا عليه : یعنی ہم کو اس پر رغبت دلاتے تھے۔ ويتعاهدنا : یعنی ہماری حفاظت کرتے، اور ہماری حالت کی رعایت رکھتے۔ ہمارے روزے کے متعلق پوچھتے اور ہمیں وعظ ونصیحت کرتے، اکتاہٹ کا شکار نہ کرتے۔ عنده، فلما فرض رمضان لم يأمرنا : یعنی اس کے ساتھ۔

ولم ينهنا عنه ولم يتعاهدنا : ہم سے نہ پوچھتے اور نہ جائزہ لیتے۔ عنده : ابن حجرا پنے قول میں کہتے ہیں۔ آپ یوم عاشوراء کے روزے کا حکم دیتے تھے۔ اس کیلئے حجت ہے جو کہتا ہے کہ عاشورہ کا روزہ واجب تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ صحیح بات شافعیؒ کی ہے کہ وہ اصلاً واجب نہ تھا، اس لیے کہ بخاری میں روایت ہے: "عن معاوية انه عام حج خطب بالمدينة يوم عاشوراء فقال : يا اهل المدينة اين علماء وكم سمعت رسول الله ﷺ يقول : هذا يوم عاشوراء ولم يكتب الله عليكم صيامه"۔ یہ نص ہے کہ وہ اصلاً فرض نہیں تھا۔

اور یہ قول مردود ہے کیونکہ اس حدیث میں ان کے لیے کسی طرح سے عدم وجوب پر دلالت نہیں۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: "وا ما كون ما بعده وما قبله" احتمال کا محل ہے تو نص کیسے ہوسکتا ہے، یا یہ صحیحین کی حدیث کے معارض ہے: "عن سلمة بن الاكوع انه عليه الصلاة السلام امر رجلاً من أسلم : أن اذن في الناس أن من أكل فليصم بقية يومه ومن لم يكن أكل فليصم. فان اليوم يوم عاشوراء" یہ صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی وجہ سے منسوخ ہونے سے پہلے واجب کا حکم دیا تھا۔ جمع (مطابقت) کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا وجوب پھر اس کا نسخ یا مراد ہے کہ قرآن میں مطلق پر فرض نہیں کیا گیا۔ یہ سب روایت نسائی کی صحت پر موقوف ہیں۔ کہ: "ولم يكتب الله عليكم صيامه من آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہو" مگر حفاظ کا اس پر بھی اتفاق ہے، کہ وہ معاویہؓ کا مدرج کلام ہے۔ رہا ابن حجرؒ کا قول، یہ دور کا احتمال ہے۔ فہم سے دور ہے۔ واللہ اعلم

ایّام بیض کے روزوں کے بارے میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا معمول

۲۰۷۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَا يُفْطِرُ اَيَّامَ الْبِيْضِ فِيْ حَضَرٍ وَّلَا سَفَرٍ۔ (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۱۹۸/٤ حديث رقم ۲۳٤۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایام بیض کے روزے نہ سفر میں اور نہ ہی گھر میں افطار کرتے تھے۔اس کو امام نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن حفصة : ام المؤمنین۔قالت : اربع :یعنی خصلتیں۔لم یکن :یعنی نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم۔یدعهن :یعنی ان کو ترک کرتے۔النبی صلی اللہ علیہ وسلم :فاعل میں دو فعل تنازع کرر ہے ہیں۔ایک نسخہ میں "لم تکن" تانیث کے ساتھ اور دوسرے نسخہ میں جمع کے ساتھ ہے،یعنی یہ خصلتیں چھوڑی نہیں گئیں۔

صیام عاشوراء والعشر : جر کے ساتھ۔کہا گیا ہے رفع کے ساتھ،یعنی عشرہ ذی الحجہ کے روزے اور عشر سے مراد مجازاً نو دن ہیں۔جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ [البقرة : ۱۹۷]۔اسی طرح کہا جائے گا کہ رمضان کے آخر عشرہ کا اعتکاف سب اگر چہ مہینہ ناقص ہو۔یا عید کے دن کا استثناء ثبوت شرعی کی وجہ سے ہے جیسے استثناء عقلی۔وثلاثة ایام : دو طریقوں سے۔

من کل شهر ورکعتان قبل الفجر : ان کی مراد صبح کی دو سنتیں ہیں۔پھر اس حدیث کا ظاہر پیچھے حضرت عائشہؓ کی گزری ہوئی حدیث کے معارض ہے: "ما رایت رسول الله صائما فی العشر".دونوں کے درمیان جمع اس طرح ہے کہ جس نے جو دیکھا وہ روایت کیا۔جو جانا وہ نقل کیا،ان دونوں کے درمیان کوئی معارضہ نہیں۔

اور اس کی تاکید حدیث بخاری سے ہے:

"ما من ایام العمل الصالح فیها أحب الی الله تعالیٰ من هذه الایام، یعنی ایام العشر قالوا ولا الجهاد فی سبیل الله . قال ولا الجهاد فی سبیل الله الا رجل خرج بنفسه وماله فلم یرجع من ذلك بشیء".

ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے: "صیام یوم منها یعدل صیام سنة وقیام لیلته منها بقیام لیلة القدر".

دونوں عشروں کی فضیلت میں اختلاف ہے۔کہا گیا ہے کہ راتوں کے لحاظ سے عشرہ رمضان افضل ہے کیونکہ اس میں لیلۃ القدر ہے۔اور یہ تمام راتوں سے افضل ہے،اور عشرہ ذی الحجہ دنوں کے لحاظ سے افضل ہے کیونکہ اس میں یوم عرفہ ہے اور وہ تمام دنوں سے افضل ہے۔ابن حبان نے دونوں کو فضیلت میں برابر قرار دیا ہے۔اور امام غزالیؒ وغیرہ نے عشرہ ذی الحجہ کے متعلق وہ ذکر کیا ہے،جو عشرہ محرم کے بارے میں ہے۔واللہ اعلم

۲۰۷۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ شَیْءٍ زَكَاةٌ وَزَكَاةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۵۵۵/۱ حديث رقم ۱۷٤۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر چیز کے لیے زکوۃ ہے اور بدن کی زکوۃ روزہ رکھنا ہے۔اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعن ابن عباس قال : كان رسول الله ﷺ لا يفطر ايام البيض** : یعنی سفید (روشن) راتوں میں اور وہ ہیں تیرہ، چودہ، اور پندرہ کیونکہ شروع سے آخر تک روشنی اور چاند ان میں چمکتا ہے،تو مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ان میں روزہ رکھا جائے۔ابن حجر کہتے ہیں: جس نے ان کو ایام بیض کے ساتھ تعبیر کیا،انہوں نے غلطی کی ہے کیونکہ دن تمام کے تمام بیض ہیں۔

ممکن ہے اس کی تقدیر یوں ہو: **الایام ابیض لیالیها**. یا مراد ہے کہ ان کے روزے گناہوں کو مٹانے والے اور دلوں کو سفید کرنے والے ہیں،یا اس کی طرف اشارہ ہے،جو روایت کیا ہے: **"أن آدم عليه السلام اسود أعضاء ه العظام بعد أخراجه من دار السلام فأمر بصيام هذه الايام فبصوم كل يوم يبيض ثلث جسده عليه السلام"**.

میں کہتا ہوں: یہ تاویلات متعین ہیں۔کیونکہ اکثر روایات میں "ایام بیض" ہے۔صاحب نہایہ کا قول: درست یہ ہے کہ ایام بیض نہ کہا جائے،کیونکہ بیض کی صفت راتوں کی ہے۔اور اس کی بناء عربی کے ظاہر پر ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم

في حضر ولا سفر : یعنی یہ سفر میں۔"لا" مزید تاکید کیلئے ہے۔

میرکؒ کہتے ہیں: علماء نے ایام بیض کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔شیخ زین العابدین عراقی شرح ترمذی میں کہتے ہیں: ایام بیض کے تقرر میں نو/۹ اقوال ہیں۔

① پہلا قول: تعین نہیں اور تعیین کو ناپسند کیا ہے۔
② دوسرا قول: حسن بصری کہتے ہیں: مہینے کے پہلے تین دن۔
③ تیسرا قول: بارہ سے لے کر چودہ تک۔
④ چوتھا قول: تیرہ سے لے کر پندرہ تک۔اور یہ اکثر اہل علم کا قول ہے۔
⑤ پانچواں قول: اس کا اول پہلے مہینے کا پہلے ہفتہ۔پھر اگلے مہینے کا پہلا منگل۔یہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔
⑥ چھٹا قول: پہلے مہینے کی پہلی جمعرات۔پھر بعد والے مہینے کا پہلا سوموار۔
⑦ ساتواں قول: پہلی سوموار پھر جمعرات۔
⑧ آٹھواں قول: پہلا دن،پھر دسواں اور پھر بیسواں۔یہ ابو درداء سے مروی ہے،اور امام مالک سے اسی طرح منقول ہے۔
⑨ نواں قول: یہ عشرے کا پہلا دن۔یہ ابن شعبان مالکی سے منقول ہے۔

عسقلانی کہتے ہیں: ایک قول رہتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مہینے کے آخری تین دن ہیں۔یہ دس پورے ہو گئے۔شاید انہوں نے اس کے ذکر سے اعراض وہ اس قول کے کمال ظہور اور ضبط کہ وجہ سے کیا ہے (تیرہ چودہ پندرہ)۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: نسائی کی روایات میں حسن سند کے ساتھ ہے: **"صيام ثلاثة ايام من كل شهر ايام البيض ثالث عشرة، ورابع عشره وخامس عشره"**.وہ اس وجہ سے ان نو یا دس اقوال کو شاذ قرار دیتے ہیں،جو تعین بیض کے لئے عراقی

نے ذکر کیے ہیں۔ یہ ابن حجرؒ کا تجاوز فہ ہے۔ کیونکہ عراقی نے خود ذکر کیا ہے کہ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے۔ اور باقی کتب بطور شزوذ کے ذکر کیے ہیں کہ ان میں سے بعض اقوال کی نسبت اکابر کی طرف ہے۔ اور بعض سے سکوت ہے، اس پر اصلاً کوئی اعتراض نہیں۔ اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ابن حجرؒ کی پیروی کی ہے، اور ان کو برقرار رکھا ہے۔ اور اس پر ایک زیادہ کیا ہے وہ دس مکمل ہو گئے۔

۲۰۷۲: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَصُوْمُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسَ فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تَصُوْمُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ فَقَالَ اِنَّ الْیَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ یَغْفِرُ اللّٰهُ فِیْهِمَا لِكُلِّ مُسْلِمٍ اِلَّا ذَاهَاجِرَیْنِ یَقُوْلُ دَعْهُمَا حَتّٰی یَصْطَلِحَا۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

اخرجه ابن ماجه ۵۵۳/۱ حدیث رقم ۱۷۴۵۔ واحمد فی المسند ۲۲۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کے دن روزہ رکھتے تھے پس کہا گیا اے اللہ کے رسول! تحقیق آپ اکثر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے ہو۔ فرمایا کہ تحقیق پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی بخشش کرتا ہے مگر دو شخص جو ملاقات چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان کو چھوڑ دو یہاں کہ صلح کریں۔ اس کو امام احمد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : قال رسول الله ﷺ لکل شیء زکاۃ : یعنی بڑھوتری جو بعض بعض کو دیتا ہے، یا طہارت ہے جس کے ساتھ وہ پاک صاف ہوتا ہے۔ وزکاۃ الجسد الصوم : اس سے بدن پگھل جاتا ہے اور کم ہو جاتا ہے اور وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ زکوۃ مالی عبادت ہے، اور روزہ بدنی عبادت ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ جسم کا صدقہ جو اس کو جہنم سے نجات دے دے، روزے کی ڈھال کے ساتھ ہے۔

خالص عمل کا اللہ کے نزدیک اجر

۲۰۷۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ یَوْمًا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ بَعَّدَهُ اللّٰهُ مِنْ جَهَنَّمَ کَبُعْدِ غُرَابٍ طَائِرٍ وَهُوَ فَرْخٌ حَتّٰی مَاتَ هَرِمًا۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۵۲۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک دن روزہ رکھے اللہ تعالیٰ اس کو اڑتے ہوئے کوے کی مسافت کے بقدر جہنم سے دور رکھے گا اور اس حال میں کہ وہ بچہ ہو اور یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو کر مر جائے۔ اس کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه : یعنی ابوہریرہؓ سے۔ ان النبی کان یصوم یوم الاثنین : اس کے اعراب کے بارے میں احتمال ہے کہ حرف کے ساتھ یا حرکت کے ساتھ ہے۔ والخمیس : نصب کے ساتھ۔ ایک قول جر کے ساتھ۔ لام مضاف سے بدل ہے، الی یوم الخمیس۔ ایک نسخہ میں جر کے ساتھ "اثنین" پر عطف ہے۔ فقیل یا رسول الله انك تصوم : یعنی زیادہ۔

الاثنين : نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ و الخميس :نصب کے ساتھ۔ ایک قول جر کے ساتھ۔ اس سے مراد ان کے دو دن ہیں، یعنی ان دونوں میں کیا حکمت ہے؟ فقال ان يوم الاثنين و الخميس : نصب اور جر کے ساتھ۔

يغفر الله فيهما لكل مسلم : یعنی جو ان میں روزہ رکھنے والا ہے۔ الا ذا : ذا، زائد ہے۔ هاجرين :تثنیہ کے ساتھ یعنی کاٹنے والے (قطع رحمی) یعنی اگر چہ وہ دونوں روزہ دار ہو۔ يقول :یعنی اللہ تعالیٰ جو بادشاہ ہے، اور اپنی مغفرت کے آثار سے گناہ مٹا دیتا ہے۔ دعهما : یعنی ان دونوں کو چھوڑ دے۔ حتى يصطلحا : کہ ان دونوں کے درمیان صلح ہو جائے اس وقت ان کو وہ بخش دے گا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اسی معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: "يفتح ابواب الجنة يوم الاثنين ويوم الخميس فيغفر لكل عبد لا يشرك بالله شيئا الا رجل كانت بينه وبين أخيه شحناء' فيقال انظروا هذين حتى يصطلحا"۔ دوسری حدیث میں ہے: "اتركوا هذين حتى يفيئا"۔ یہاں مخاطب مقدر ہونا ضروری ہے، کہ وہ کہے اتركوا، انظروا، دعهما۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوا سب کو بخش دیا۔ کہا گیا ہے: اے اللہ ان دونوں کو بخش دے۔ جواب دیا گیا، تو ان کو چھوڑ دے۔ دیکھو یا چھوڑ دو ان دونوں کو یہاں تک کہ صلح کر لیں۔ ہم نے وہ قول اختیار کیا جو ظاہر ہے تامل۔

۲۰۷۴ : وروى البيهقي في شعب الايمان عن سلمة بن قيس ـ

اخرجه البيهقي في شعب الايمان عن سلمة بن فيض ۲۹۹/۳ حديث رقم ۳۵۹۰۔

ترجمہ: اور بیہقی نے شعب الایمان میں سلمہ قیس سے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنه : یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ قال : قال رسول الله ﷺ من صام يوما ابتغاء وجه الله :علت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ایک نسخہ میں "ابتغاء لوجه الله"۔ ایک اور نسخہ میں لابتغاء وجه الله، یعنی اس کی ذات، اس کا قرب یا اس کی جہت جس کے ساتھ، اس کی رضاء کی امید ہو۔ یا اس کی سزاء کے خوف سے۔ مشکل الفاظ کے حل کے وقت تفسیر کی جاتی ہے بابتغاء مرضاته.

(بعده الله من جهنم كبعد غراب : یعنی بعد مثل بعد غراب۔ طائر وهو فرخ : فتح اور سکون کے ساتھ یعنی چھوٹا۔ حتى مات هرمًا : فتح کے ساتھ اور کسرہ یعنی کبیراً۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "طائر" غراب کی صفت ہے، "وهو فرخ" یہ طائر کی ضمیر سے حال ہے "حتى مات" طیران (اڑنے) کی غایت ہے۔ هرمًا مات کی ضمیر سے حال ہے، اور اس قول کے مقابل ہے "وهو فرخ" کہا گیا ہے غراب (کوّے) کی مثال لمبی عمر کے ساتھ ہے۔ روزے دار کی آگ سے دوری کی تشبیہ کوّے کے پہلے دن کے پرواز سے لے کر عمر کے آخری دن تک پرواز کرنے کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک قول ہے کہ کوّے کی عمر ایک ہزار سال ہے۔ رواہ احمد: یعنی ابوہریرہؓ سے۔

عن سلمة بن قيس : جیسا کہ مشکوۃ کے نسخہ میں ہے۔ اسی طرح مؤلف نے اسماء الرجال میں ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے۔ میرکؒ نے حاشیہ میں قیس کی جگہ قیصر لکھا ہے، راء کے فتحہ کے ساتھ خبراً اور تنوین کے ساتھ حمرہ ہے اور اس کے لفظ "ظ" لکھا ہوا ہے جو اشارہ ہے کہ وہ ظاہر ہے۔ مغنی میں قیصر "قاف" کے فتحہ، "یاء" کے سکون اور "ضاد" کے فتحہ کے ساتھ اور یہ غیر منصرف

ہے یہ قول میرکؒ کا ہے۔ اس کو بزارؒ نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں ایک آدمی ہے اس کا نام ذکر نہیں کیا۔ اس حدیث کو ابو یعلی اور بیہقی نے سلمہ بن قیصر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کا نام "سلامۃ" الف کی زیادتی کے ساتھ ذکر کیا ہے، اسی طرح منذری نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے: سلمه بن قيصر حضرى اور کہا ہے ابن لهيعه کے ہاں اس کی حدیث عن زياد بن خالد عن لهيعة بن عتبة عن عمرو بن ربيعة عن سلامة بن قيصر، قال سمعت النبى يقول : "من يصوم يوما ابتغاء وجه الله...... الخ". اور کہا: اس کا سماع ثابت نہیں، اس سند کے علاوہ نبی علیہ السلام سے ثابت نہیں۔ ابوزرعہ نے اس کے صحابی ہونے سے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس کی روایت اہل مصر میں ابو ہریرہؓ سے شمار کی جاتی ہے۔ ابن عبدالبر کا کلام مکمل ہوا۔

ذہبیؒ میزان میں کہتے ہیں: سلمہ بن قیصر تابعی ہے۔ اس نے مرسل حدیث بیان کی ہیں، اس کی حدیث صحیح نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو مشکوٰۃ کے نسخوں میں سلمۃ بن قیس واقع ہوا ہے وہ غلط ہے اور درست سلمہ بن قیصر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے۔

باب

یہ باب پہلے بابوں کے متعلق متفرق مسائل کے بیان میں ہے

تنوین کے ساتھ۔ ایک قول: سکون کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں فی توابع لصوم التطوع کا تابع ہے۔

الفصل الاول:

نفلی روزہ کی نیت کا بیان

۲۰۷۵: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ فَقُلْنَا لَا قَالَ فَاِنِّي اِذًا صَائِمٌ ثُمَّ اَتَانَا يَوْمًا اٰخَرَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ فَقَالَ اَرِيْنِيْهِ فَلَقَدْ اَصْبَحْتُ صَائِمًا فَاَكَلَ ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢/٨٠٩ حديث رقم (١٧٠۔ ١١٥٤)۔ وابوداؤد فى السنن ٢/٨٢٤ حديث رقم ٢٤٥٥۔ والنسائى ٤/١٩٣ حديث رقم ٢٣٢٢۔ واحمد فى المسند ٦/٢٠٧۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کی چیز ہے؟ ہم نے کہا نہیں پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اس وقت روزہ سے ہوں پھر

ایک دن آپ ﷺ ہمارے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا کھانے کی کوئی چیز ہے؟ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہمیں حیس بھیجا گیا ہے پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے وہ دکھاؤ۔ پس میں نے صبح روزہ رکھا تھا پھر آپ ﷺ نے حیس کھا لیا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **عن عائشة قال : دخل على النبي ﷺ ذات يوم** : یعنی کسی ایک دن۔ یا دن کی کسی گھڑی میں۔ یا اوقات یوم میں۔ یا دن میں۔ **فقال هل عندكم شيء** : یعنی کھانے کا۔ صحیح روایت میں **هل عندكم من غداء؟** ''غین'' کے فتحہ کے ساتھ، اور اس کے بعد دال ہے، وہ کھانا جو زوال سے پہلے کھایا جاتا ہے۔ **فقلنا لا قال فاني اذًا** تنوین کے ساتھ۔ **صائم** : ایک صحیح روایت میں ''**فاني اذن أصوم**''۔ یہ نفلی روزے کی دن میں نیت کے جواز کی دلیل ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ امام مالک اور داؤد کہتے ہیں: جیسا کہ فرض میں واجب ہے اسی طرح نفل میں بھی رغبت سے نیت ضروری ہے۔ آپ ﷺ کے فرمان کے عام ہونے کی وجہ سے کہ

صيام لمن لم يجمع الصيام من الليل : اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ **(ثم أتانا يومًا آخر فقلنا يا رسول الله أهدي لنا** : یعنی ہمارے لیے ہدیہ بھیجا گیا ہے۔ **حيس** : ''حاء'' کے فتحہ اور ''یاء'' کے سکون کے ساتھ، کھجور جس میں گھی اور پنیر ملایا گیا ہو۔ ایک قول ہے کھانا جو مکھن، کھجور اور پنیر سے ہے۔ اور کبھی کبھی پنیر کی جگہ آٹا بھی استعمال ہوتا ہے۔ گھی کی جگہ مکھن اور کبھی گھی کی جگہ تیل۔ **فقال أرينيه** : اراءۃ سے امر ہے، ایک روایت میں ''**أدنيه و ارينيه**'' اس سے کنایہ ہے۔ جو قریب ہو اس کو دیکھا بھی جاتا ہے۔ یہ قول طیبی ؒ نے ذکر کیا ہے۔ موجودہ نسخوں میں یہ دونوں موجود نہیں، شاید کہ وہ دونوں روایتیں یا دو نسخوں شیخ طیبی ؒ کے ہیں۔ **فلقد اصبحت صائما** : یعنی میں روزے کا ارادہ رکھتا تھا۔ **فأكل** : ابن ملکؒ کہتے ہیں: کہ آپ ﷺ نے کہا: میں نے روزے کی نیت شروع دن میں کی تھی۔

یہ مذہب کے خلاف ہے، اس میں تاویل کی ضرورت اور عذر مقدر ماننا پڑے گا۔ میرکؒ کہتے ہیں: نفل روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے، اور اکثر کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں: عذر کی وجہ سے جائز ہے، بلا عذر جائز نہیں۔ قاضیؒ کہتے ہیں: حدیث اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نفل میں شروع کرنا اس سے نکلنے کو منع نہیں کرتی۔ جیسا کہ کہا ہے **الصائم المتطوع أمير نفسه** نفل روزے دار اپنے نفس کا امیر ہے۔ ابوحنیفہؒ کے اصحاب کہتے ہیں: اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اگر افطار کرے گا تو قضا کرے گا۔ امام مالکؒ کہتے ہیں: تب قضائی دے گا جب اس کا کوئی عذر نہ ہو۔ اصحاب ابوحنیفہ نے حضرت عائشہؓ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے قضاء کا حکم دیا۔ حدیث مرسل ہے، وہ صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ علاوہ اس کے امر میں استحباب کا احتمال ہے جیسا کہ اصل روزہ مستحب ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: اس سے امام شافعیؒ نے دلیل پکڑی ہے کہ نفلی روزے کی نیت زوال سے پہلے جائز ہے، اس کے بعد نہیں کیونکہ عبادت کا ایک بڑا حصہ بغیر نیت کے گزر جائے گا۔ یہ قول امام احمد وغیرہ اور جس نے اس خلاف کیا' رد ہے۔ یہ قول امام شافعیؒ کا ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں: فرض کی طرح نیت فرض ہے، اس حدیث کی وجہ سے: ''**انما الاعمال بالنيات**'' پس شروع دن میں امساک بلا نیت کے عمل ہے اور انہوں نے اس کو نماز پر قیاس کیا ہے کیونکہ نیت کے اعتبار سے نفل نماز' فرض کی

طرح ہے اس حدیث میں دلالت نہیں اس احتمال کی سوال سے مراد کہ وہ مسئول کو افطار پر تیار کر دے، اور اس کا دل عبادت پر مطمئن ہو۔ جب انہوں نے اس سے کہا یعنی میں روزے سے ہوں، جیسے تو یا اس نے افطار پر ارادہ عذر سے کیا۔ جب اس سے کہا گیا روزے کو پورا کر۔ اس میں نیت اس کو شامل ہوگی، جیسا کہ اس کے ساتھ پہلے شامل تھی۔ اور جمہور کے مذہب پر یہ روایت دلالت کرتی ہے: ''اذن أصوم'' اور روایت ''غداء'' سے۔ واللہ اعلم

روزہ توڑنے کے لیے ضیافت عذر ہے یا نہیں

۲۰۷۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُمِّ سُلَيْمٍ فَاَتَتْهُ بِتَمْرٍ وَسَمْنٍ فَقَالَ اَعِيْدُوْا سَمْنَكُمْ فِيْ سِقَائِهِ وَتَمْرَكُمْ فِيْ وِعَائِهِ فَاِنِّيْ صَائِمٌ ثُمَّ قَامَ اِلٰى نَاحِيَةٍ مِّنَ الْبَيْتِ فَصَلّٰى غَيْرَ الْمَكْتُوْبَةِ فَدَعَا لِاُمِّ سُلَيْمٍ وَاَهْلِ بَيْتِهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه حدیث رقم ۱۹۸۲۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ ام سلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجوریں اور گھی لے آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گھی کو مشک میں اور کھجور کو اس کے برتن میں ڈال کے رکھو۔ اس لیے کہ میں روزے سے ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کے علاوہ نماز پڑھی اور ام سلیم اور ان کے گھر والوں کے لیے دعا کی۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: رواہ مسلم: ابن حجرؒ کہتے ہیں: مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے: ''فأكل ثم قال : كنت اصبحت صائما''۔ شمنی کہتے ہیں: نسائی نے زیادہ کیا ہے: ''ولكن اصوم يوما مكانه'' اور عبدالحق نے اس زیادتی کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے ابو یوسفؒ نے استدلال کیا ہے، کہ نفلی روزے دار بغیر عذر کے افطار کر سکتا ہے اور قضا کرے گا۔

ابن ہمام کہتے ہیں: ہمارے اصحاب میں روزے کی قضا کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں' خواہ وہ قضا عذر کی وجہ سے ہو یا بغیر عذر کے، اگرچہ نفلی روزے والی عورت کو حیض آ جائے، بخلاف امام شافعیؒ کے۔ ہاں اختلاف روایت صرف روزہ کے افساد کے بارے میں ہے کہ کیا وہ مباح ہے یا نہیں۔ ظاہر الروایہ یہ ہے کہ عذر کے ساتھ ٹھیک' ورنہ نہیں۔ منتقی کی روایت: بغیر عذر کے جائز ہے، پھر مشائخ کا ظاہر الروایہ اختلاف ہوا کہ کیا مہمان نوازی عذر ہے یا نہیں۔ ایک قول: عذر ہے۔ دوسرا قول: عذر نہیں۔ ایک قول: زوال سے پہلے عذر ہے، اس کے بعد نہیں۔ ہاں اگر والدین کی نافرمانی ہوتی ہو، تو ٹھیک۔ ان کے علاوہ کی نہیں۔

کہا گیا ہے: اگر صاحب طعام صرف اس کے پیش کر دینے سے خوش ہو، اگرچہ اس نے کھایا نہ ہو، تو اس کے لیے افطار جائز نہیں۔ اگر اس کو تکلیف ہو، تو افطار کرے گا۔ میرے نزدیک منتقی کی روایت زیادہ مناسب ہے امام شافعی کی سب سے عمدہ دلیل مسلم کی حدیث عائشہ ہے۔ جو پچھلی حدیث ہے ہمارے لیے کتاب اللہ، سنت رسول اور قیاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد: ۳۳] دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ [الحدید: ۲۷] یعنی جو ان کے ذمہ تھا اس سے اعراض کرنا اور ایسی چیز کا التزام کرنا جو ان پر لکھی (فرض)

نہیں کی گئی۔ ان دونوں نصوص کے ساتھ اعمال کو باطل کرنے سے بچنا چاہیے۔ جب وہ افطار کرے اس پر قضا واجب ہے یا فدیہ دے تا کہ وہ ابطال سے بچ سکے۔ دلیل سنت سے عائشہؓ کی حدیث آگے آ رہی ہے۔ قیاس: حج اور عمرہ جب نفل ہوں، جب ان کو فاسد کرے گا تو ان کی قضا واجب ہے۔

روزہ دار ضیافت کو قبول کرے

۲۰۷۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دُعِیَ اَحَدُكُمْ اِلٰی طَعَامٍ وَهُوَ صَائِمٌ فَلْيَقُلْ اِنِّی صَائِمٌ وَفِی روایۃ قَالَ اِذَا دُعِیَ اَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ فَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ وَاِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيَطْعَمْ۔

(رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۸۰۵/۲ حدیث رقم (۱۵۹۔ ۱۱۵۰)۔ والترمذی ۱۵۰/۳ حدیث رقم ۷۸۱۔ وابن ماجہ ۵۵۶/۱ حدیث رقم ۱۷۵۰۔ والدارمی ۲۸/۲ حدیث رقم ۱۷۳۷۔ واحمد فی المسند ۵۰۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس وقت تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے اور وہ روزے سے ہو۔ پس اس کو چاہیے کہ کہے میں روزے سے ہوں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت تم میں سے کسی کو بلایا جائے پس چاہیے کہ دعوت قبول کرلے۔ پھر اگر وہ روزے دار ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ دو رکعت نماز پڑھے اور اگر روزے سے نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ کھائے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن أنس قال : دخل النبی ﷺ علی أم سلیم فأتته بتمر وسمن فقال أعیدوا سمنکم فی سقائه وتمرکم فی وعائه فانی صائم. ثم قام الی ناحیة من البیت فصلی غیر المکتوبة فدعا لام سلیم واهل بیتها : ابن ملکؒ کہتے ہیں: اس میں دلیل کہ مہمان روزے دار کے لیے مستحب ہے کہ وہ میزبان کو دعا دے، یعنی جو حدیث میں ہے: ان من الدعا المستجاب دعاء الصائم، قبول کی جانے والی دعا روزے دار کی ہے۔

یہ حدیث اپنے ظاہر سے اس کے قول کی تائید کرتی ہے، جس نے کہا: ضیافت عذر نہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ وہ عذر ہے۔ ہاں اس کو اختیار ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ: "اذا دعی أحدکم الی طعام فلیجب فان شاء طعم وان شاء لم یطعم" اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے۔ ابن حجرؒ نے اس قول کو غریب قرار دیا ہے۔ تکلف سے ممانع ہے، اور قول اس روایت سے ہے: "أنا وصالحوا التی براء من التکلف". یہ وہ ہے جو مشقت کے تکلف کرتا ہے۔ اگر کوئی دیا گیا جو اس کے پاس ہے اگرچہ وہ اس کے لیے شرف ہو، اس کا نام متعکف نہیں ہوگا۔ غرابت اس لحاظ سے کہ یہ مقام اس سوال وجوب کا اصلاً متقاضی نہیں۔ واللہ اعلم

نفلی روزہ رکھنے والا با اختیار ہوتا ہے

۲۰۷۸: عَنْ اُمِّ هَانِیٍٔ قَالَتْ لَمَّا كَانَ يَوْمُ الْفَتْحِ فَتْحِ مَكَّةَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَجَلَسَتْ عَلٰی يَسَارِ رَسُوْلِ

اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمِّ هَانِيٍ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَجَاءَ تِ الْوَلِيْدَةُ بِاِنَاءٍ فِيْهِ شَرَابٌ فَنَاوَلَتْهُ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهُ اُمَّ هَانِيٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفْطَرْتُ وَكُنْتُ صَائِمَةً فَقَالَ لَهَا اَكُنْتِ تَقْضِيْنَ شَيْئًا قَالَتْ لَا قَالَ لَا فَلَا يَضُرُّكِ اِنْ كَانَ تَطَوُّعًا۔ (رواہ ابوداود والترمذی والدارمی وفی روایۃ لا حمد والترمذی نحوہ) وَفِيْهِ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَا اِنِّي كُنْتُ صَائِمَةً فَقَالَ الصَّائِمُ الْمُتَطَوِّعُ اَمِيْرُ نَفْسِهٖ اِنْ شَاءَ صَامَ وَاِنْ شَاءَ اَفْطَرَ)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۸۵۲/۲ حدیث رقم ۲٤٥٦۔ والترمذی ۱۰۹/۳ حدیث رقم ۷۳۱ والدارمی ۲۸/۲ حدیث رقم ۱۷۳٦۔ واحمد فی المسند ۳٤۲/٦۔

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ جب فتح مکہ کا دن ہوا تو حضرت فاطمہؓ آئیں اور رسول اللہ ﷺ کے بائیں طرف بیٹھیں' ام ہانی حضور ﷺ کے دائیں طرف تھیں پس ایک لونڈی برتن لے کر آئی کہ اس میں کچھ پینے کی چیز تھی پھر لونڈی نے وہ برتن حضور ﷺ کو دیا۔ آپ ﷺ نے اس سے پیا پھر وہ برتن آپ ﷺ نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کو دیا پھر ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پیا پس کہنے لگیں اے اللہ کے رسولؐ! تحقیق میں نے افطار کیا' میں روزے سے تھی۔ پس آپ ﷺ نے اس کے لیے فرمایا کہ کیا تم نے قضاء کا روزہ رکھا تھا یعنی یہ روزہ قضاء رمضان کا تھا یا نذر کا تھا؟ کہنے لگیں کہ نہیں فرمایا تجھے کوئی ضرر نہیں ہے اگر نفلی روزہ ہو۔ یہ ابوداؤد اور ترمذیؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے اور امام احمد اور ترمذی کی روایت اسی طرح ہے پس ام ھانیؓ نے کہا یا رسول اللہ میں روزے سے ہوں۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا مالک ہے اگر وہ چاہے روزہ رکھے اور اگر چاہے تو افطار کرے۔

تشریح: وعن ابی هريرة قال : قال رسول اللّٰه ﷺ اذا دعی أحدكم الی طعام وهو صائم : یعنی نفل۔ یہ قول ابن حجرؒ کا ہے۔ اور حدیث میں اس پر دلالت نہیں کیونکہ ہوسکتا کہ وہ قضا وغیرہ روزہ ہو۔ فليقل : یعنی آواز کے ساتھ پکار کر۔ انی صائم : ابن ملکؒ کہتے ہیں: آپ ﷺ نے حکم دیا کہ مدعو ہے اگر اس وقت دعوت دینے والے کے دعوت کو قبول نہ کرے تو ''انی قائم'' نوافل کو چھپانا مستحب ہے، تاکہ یہ چیز دعوت دینے والے کو عداوت اور بغض میں مبتلا نہ کردے۔

وفی رواية قال : اذا دعی أحدكم فليجب : یعنی دعوت قبول کرے۔ (فان كان صائما فيصل : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: گو کہ ایک کونے میں جس طرح نبی ﷺ نے ام سلیم کے گھر میں کیا۔ کہا گیا ہے کہ وہ صاحب بیت کے لئے مغفرت کی دعا کرے۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: برکت کی دعا کرے۔ میں کہتا ہوں: اُم سلیم کی حدیث سے ظاہر ہے کہ نماز اور دعا کو جمع کرے۔ مظہرؒ کہتا ہے: قابل اعتماد بات شافعیؒ کے ہاں یہ ہے: کہ اگر افطار نہ کرنے سے میزبان کو تکلیف ہو تو افطار کرلے۔ یہ افضل ہے، اگر تکلیف نہ ہو، تو افطار نہ کرے۔ وان كان مفطرًا فليطعم : یعنی اس کو دعوت پر کھانا کھانا چاہیئے۔ کہا گیا ہے کہ یہ واجب ہے۔ یہ قول ابن حجرؒ کا ہے۔ لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ تب واجب' اگر دعوت دینے والے کے ناراض ہونے کا خطرہ ہو، اور اس سے دشمنی پیدا ہونے کا خطرہ ہو، اگر نفلی روزہ ہو۔ اگر اس کو معلوم ہو کہ وہ کھانے سے خوش ہوگا، اور نہ کھانے سے ناراض نہیں ہوگا، تو مستحب ہے۔ اگر دونوں معاملے (خوشی اور ناراضگی) برابر ہوں، تو افضل یہی ہے کہ وہ کہے: ''انی صائم'' خواہ

حاضر ہو یا نہ ہو۔

ابو ہریرۃؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: "اذا دعی احدکم الی الطعام فلیجب فان کان مفطرا فلیأکل . وان صائما فلیصل"

طبرانی میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے: "وان کان صائما فلیدع بالبرکة"۔ اسی طرح جامع صغیر للسیوطی میں ہے۔

ابن ہمامؒ نے عجیب بات کہی ہے: محققین نے ضیافت کو عذر قرار دینے سے منع کیا ہے۔ جیسے کرخی اور ابوبکر رازی ہیں، ان دونوں کا استدلال نبی ﷺ کی اس روایت سے ہے: "اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب وان کان مفطرا فلیأکل وان کان صائما فلیصل"۔ یعنی ان کے لئے دعا کرے۔ والله اعلم بحال هذا الحديث۔

بعض کا قول ہے: یہ شروع سے ہی موقوف ثابت ہے۔ حدیث سلیمان بھی اس کو تقویت نہیں دیتی۔ یعنی حدیث بخاری: "آخی النبی ﷺ بین سلمان وأبی الدرداء فزار سلمان ابا الدرداء، فرای ام الدرداء متبذلة فقال لها ما شأنك قالت اخوك الدرداء ليس له حاجة في الدنيا فجاء ابو الدرداء فصنع له طعاما فقال كل، قال فانی صائم قال ما أكل حتى تأكل فأكل فلما كان الليل ذهب ابو الدرداء يقوم فقال له سلمان نم فنام ثم ذهب يقوم فقال نم. فلما كان من آخر الليل قال سلمان قم الأن قال فصلينا، فقال له سلمان ان لربك عليك حقا ولنفسك عليك حقا ولا هلك عليك فقا خاعط كل ذی حق حقه فأتی النبی ﷺ فذكر ذلك له فقال صدق سلمان"۔ "عون بن ابی جحیفہ، اپنے والد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان اور ابودرداء کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ سلمان ابودرداء سے ملاقات کو گئے تو ام درداء کو بہت پریشان حال پایا ان سے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا تمہارے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر ابودرداء آئے تو سلیمان کے لئے کھانا تیار کیا اور کہا کہ کھاؤ انہوں نے کہا کہ میں تو روزے سے ہوں۔ انہوں نے کہا میں تو نہیں کھاؤں گا جب تک تم نہ کھاؤ گے۔ چنانچہ انہوں نے کھا لیا جب رات آئی تو ابودرداء اٹھے تاکہ عبادت کریں۔ سلیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا سو رہو چنانچہ وہ سو گئے پھر عبادات کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہا سو رہو جب رات کا آخری حصہ آیا۔ تو سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اب اٹھو پھر دونوں نے نماز پڑھی۔ سلیمان نے ان سے کہا تیرے رب کا تجھ پر حق ہے اور تیری جان کا تجھ پر حق ہے اور تیرے بچوں کا تجھ پر حق ہے اس لیے ہر مستحق کا حق ادا کر۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے یہ بیان کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان نے ٹھیک کہا۔"

اس سے ضیافت کو عذر ماننے والوں نے استدلال کیا ہے۔ اسی طرح دارقطنی نے جابرؓ سے بیان کیا ہے: "صنع رجل من اصحاب النبی ﷺ طعامًا فدعا النبی ﷺ وأصحابه فلما أتی بالطعام تنحی رجل منهم فقال عليه الصلاة والسلام ما لك؟ قال: انی صائم. فقال: عليه الصلاة والسلام تكلف اخوك وصنع طعاما ثم تقول انی صائم، كل وصم يومًا مكانه"۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے کھانا تیار کیا، پھر نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کی دعوت کی، جب کھانا لگایا گیا تو ایک آدمی الگ ہو گیا، نبی ﷺ نے پوچھا' تیرا کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا، میں روزے

سے ہوں، آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: تیرے بھائی نے مشقت کر کے کھانا تیار کیا، اور تو کہتا ہے' میں روزے سے ہوں، کھانا کھا اور اس کی جگہ کسی دوسرے دن روزہ رکھ لے۔

شمنیؒ کہتے ہیں: ابوداؤدطیالسی نے اپنی مسند میں ابوسعید خدری سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث بیان کی ہے: "تكلف أخوك وصنع لك طعاما ودعاك أفطر واقض يوما مكانه". دارقطنی نے جابرؓ کی حدیث بیان کی ہے، اور کہا: ان الرجل الذی صنع" اور وہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔

الفصل الثانی:

نفلی روزہ افطار کرنے پر قضاء لازم آتی ہے

۲۰۷۹: وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَنَا وَحَفْصَةُ صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ فَقَالَتْ حَفْصَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ قَالَ اِقْضِيَا يَوْمًا اٰخَرَ مَكَانَهُ (رواه الترمذی وذكر جماعة من الحفاظ رووا عن الزهری عن عائشة مرسلا ولم يذكروا فيه عن عروة وهذا اصح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۲٦/۲ حديث رقم ۲٤٥٧۔ والترمذی فی السنن ۱۱۲/۳ حديث رقم ۷۳۵۔ ومالك فی الموطأ ۳۰٦/۱ حديث رقم ۵۰ واحمد فی المسند ۲٦۳/٦۔

ترجمہ: زہریؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے عروہؒ سے نقل کیا ہے۔ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اور حفصہ رضی اللہ عنہا روزے سے تھیں' ہمارے سامنے کھانا لایا گیا۔ ہم نے اس کی خواہش کی۔ ہم نے اس میں سے کھایا۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا تم دونوں ایک دن اس کے بدلے قضاء کرو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور حفاظ کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے انہوں نے زہریؒ سے ذکر کیا ہے اور زہریؒ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بطریق ارسال اور اس میں عروہ کا واسطہ ذکر نہیں کیا اور یہ صحیح تر ہے۔

تشریح: عن ام هانیٔ : ہمزہ کے ساتھ، نون مکسورہ کے بعد۔ ابوطالب کی بیٹی ہیں۔ قالت لما كان يوم الفتح : یعنی فتح اعظم۔ فتح مكة : بدل کی وجہ سے جر ہے یا بیان کیلئے۔ جاء ت فاطمة : یعنی رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی بیٹی۔ فجلست على يسار رسول الله ﷺ : یسار کو اختیار کرنے کی وجہ شاید آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اشارہ کیا ہو، یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ نے اپنا دل اور خاطر ان کی طرف متوجہ کیا اور دوسری جانب ام ہانی تھیں۔ یہ یا تو اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ تواضع کرتے ہوئے یا شوہر کی بیوی ہونے کے ناطے یا ان کے بچوں کی پھوپھی ہونے کے ناطے ان کے ساتھ تواضع کا معاملہ کیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فاطمہ سے بڑی تھیں ہے پھر دائیں جانب مصروف ہو جانے کی وجہ سے انہیں بائیں جانب بٹھایا اور وہ اس کے قول سے ظاہر ہے۔ وام هانیٔ عن يمينه : جملہ جلست کے فاعل سے حال ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتا ہے: حال ہے یعنی فاطمہؓ آئیں

اور بائیں جانب بیٹھ گئیں۔ اس حال میں کہ ام ہانی رضی اللہ عنہا دائیں جانب تھیں۔ عطف ایک تقدیری عبارت پر ہے۔ وجاء ت ام هاني فجلست عن يمينه. دو مقدر ماننے کی وجہ سے کلام جو ظاہر کا تقاضا ہے، اس کے خلاف ہے۔ یا صرف اس پر محمول کر لیا جائے، کہ وہ اپنے نفس کے متعلق بتا رہی تھیں۔ یا راوی نے اپنی کلام ان کے کلام کی جگہ رکھ دی، یعنی نقل بالمعنی ہے۔

فجاء ت الوليدة : یعنی لونڈی۔ باناء فيه شراب : یعنی پانی کا برتن۔ (فناولته : یعنی لونڈی نے۔ اور ضمیر کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ مفعول ثانی مقدر ہے اور وہ برتن ہے۔ فشرب منه ثم ناوله : یعنی برتن۔ مصابیح میں ہے پھر اس کو پکڑا دیا باقی بچا ہوا پانی۔ ام هانئ : دائیں جانب ہونے کی وجہ سے پلایا، یا اسلام میں سبقت کی وجہ سے یا عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے، یا وہ اجنبیہ کی طرح تھیں، ام اہل بیت کی بنسبت۔ فشربت منه فقالت يا رسول الله لقو أفطرت : اس میں ماضی اور حال کا احتمال ہے، اور وہ ظاہر ہے اور ابھی آگے آئے گا۔ وكنت صائمة : یعنی کیا حکم ہے؟ ابن حجرؒ کہتے ہیں: انہوں نے اس کا پہلے ایثار کے پیش نظر جو حضرت فاطمہؓ پر مقدم کرنے کی وجہ سے تھا۔ یہ ان کے لئے باعث شرف اور روزے سے اعلیٰ ہے۔

اور ممکن ہے کہ ان کو اس حال میں سوال پیدا ہوا ہو۔ پھر وہ تعلیل جو ابن حجرؒ نے ذکر کی ہے، محل نظر ہے کیونکہ مقدم کرنا تو صرف پکڑانے سے یا اس کا قصداً کرنے ہی سے حاصل ہو گیا تھا، انہوں نے اس خوف سے روزے کا ذکر نہیں کیا، کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوٹھا ان سے رہ نہ جائے۔ فقال لها أكنت تقضين : یعنی اس روزے کے ساتھ۔ شيئا : یعنی جو تیرے اوپر واجبات ہیں۔ قالت لا، قال فلا يضرك : یعنی تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔ ان كان : یعنی اگر تیرا روزہ ہو۔ تطوعًا : یہ تاکید کے لئے ہے۔ نفلی روزے والا وہ عذر کی وجہ سے افطار کر سکتا ہے، بلکہ بغیر عذر کے بھی۔ پھر اس میں قضا کرنے یا نہ کرنے پر کوئی دلالت نہیں۔ ابن ملکؒ نے اس قول کو غریب قرار دیا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ نفلی روزے والے پر کوئی قضا نہیں، جب وہ اس کو باطل کر دے۔ یہی قول امام شافعیؒ کا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کی اسناد میں کلام کیا گیا ہے۔ اسی طرح منذری نے کہا اور مزید کہا: یہ حدیث ثابت نہیں اس کی سند میں بہت اختلاف ہے اور نسائی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس قول کو میرکؒ نے ذکر کیا ہے۔

وفي رواية كا حمد والترمذي نحوه برفع کے ساتھ یعنی اس کے ہم معنی۔ وفيه : اس حدیث میں۔ فقالت يا رسول الله أما : تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لئے۔ اني كنت صائمة فقال الصائم : اس سے مراد جنس ہے۔ المتطوع : مفترض سے احتراز کیا ہے۔ امير نفسه : یعنی شروع سے اس کا حاکم ہے۔ ایک روایت میں "أمين نفسه"، نون کے ساتھ "راء" کے بدلے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نفلی روزے کے علاوہ دوسرے میں اختیار نہیں، کیونکہ وہ اس حکم پر مجبور ہے۔

ان شاء صام : اگر چہ وہ روزے کی نیت کرے۔ وان شاء أفطر : یعنی افطار کا اختیار ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ اپنے نفس کا امیر ہے روزے میں داخل ہونے کے بعد اگر چاہے تو روزے کو پورا کرے، اگر چاہے تو افطار کرے، خواہ عذر کی وجہ سے یا بغیر عذر کے۔ اور قضاء کا حکم اس حدیث میں ہے جو آگے آ رہی ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ گزر چکا ہے کہ وہ حدیث صحیح ہے۔ اور وہ

اس پر رد جو کہتا ہے کہ نفل سے نکلنا حرام ہے۔

اور وہ حدیث صحیح نہیں اور نہ ہی حسن ہے بلکہ گزر چکا ہے کہ وہ حدیث ضعیف ہے' ثابت نہیں۔ آپ ان لوگوں کی طرف رجوع کریں جو اسناد کی پہچان میں معرفت رکھتے ہیں، اور اس فن کے ماہر ہیں۔ ابن حجرؒ کا قول کہ ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں مقال ہے، مردود ہے، یا اس سند پر محمول کیا جائے جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اس کا دوسری سند سے صحیح ہونا مردود کے منافی نہیں۔ اسی طرح دوسری سند سے ثبوت کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو یہ ان کی بے تکی بات اور جرأت ہے۔

۲۰۸۰: وروا ه ابو داود عن زميل مولى عروة عن عروة عن عائشة.

اخرجه ابوداود في السنن ۸۲٦/۲ حديث رقم ۲٤۵۷۔ والترمذي في السنن ۱۱۲/۳ حديث رقم ۷۳۵۔ ومالك في الموطا ۳۰٦/۱ حديث رقم ۵۰ واحمد في المسند ۲٦۳/٦۔

ترجمہ: نیز اس روایت کو امام ابوداؤدؒ نے حضرت عروہؓ کے آزاد کردہ غلام زمیلؒ سے نقل کیا ہے' زمیلؒ نے عروہؓ سے اور عروہؓ نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن الزهرى عن عروة عن عائشة قالت : كنت انا وحفصة** : رفع کے ساتھ۔ **صائمتين** : یعنی نفلی روزہ۔ **فعرض لنا طعام** : فعل مجہول کے ساتھ، یعنی ہمارے لیے کسی نے بھیجا۔ یعنی بطور ہدیہ۔ ابن ہمامؒ کے لفظ: **فجاء رسول الله ﷺ فبدرتني اليه حفصة وكانت ابنة أبيها فقالت**۔ ایک نسخہ میں صیغہ معلوم کے ساتھ ہے۔ یعنی **فظهر لنا طعام۔ اشتهينا فأكلنا منه فقالت حفصة** : یعنی بطور حکایت کے جیسا کہ آگے آئے گا۔

يا رسول الله انا كنا صائمتين فعرض لنا طعام اشتهيناه فأكلنا منه، قال اقضيا يوما آخر مكانه : یعنی اس کی جگہ۔ ابن ملکؒ کہتے ہیں: یہ اس بات پر دلالت ہے کہ جو نفلی روزہ افطار کرے وہ کسی اور دن روزہ رکھ لے۔ خطابی کہتا ہے: یہ قضا اختیار اور استحباب پر ہے۔ کسی چیز کی قضا کا حکم اس کے اصل کا حکم ہے، جیسا کہ اصل میں شخص کو اختیار ہوتا ہے، اسی طرح قضا میں بھی اختیار ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ حج اور عمرہ سے ٹوٹ جاتا ہے، کہ جب یہ دونوں نفل ہوں اور ان کو فاسد کر دیا جائے۔ تو بالاتفاق ان کی قضاء واجب ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: کہ امر کو ندبیہ پر محمول کرنا۔ بغیر کسی وجہ کے ام کے مقتضی سے خروج ہے۔ بلکہ یہاں ایسے قرآئن موجود ہیں جو امر کے وجوب کا تقاضا کرتے ہیں۔ جو وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد : ۳۳]

وذكر : یعنی ترمذی نے۔ **جماعة من الحفاظ** : ان کی صفت ہے، کہ وہ۔ **رووا عن الزهرى عن عائشة مرسلاً** : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مرسل اس لیے ہے کہ زہری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہیں پایا تھا (ملاقات نہیں کی)، ترمذیؒ کا کہنا ہے مرسل یعنی منقطع ہے۔ **ولم يذكروا** : یعنی حفاظ کی ایک جماعت نے۔ **فيه** : یعنی حدیث کی اسناد میں۔ **عن عروة** : زہری اور حضرت عائشہؓ کے درمیان سند میں۔ **هذا** : اس کا مرسل ہونا (اصح) ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: ترمذیؒ نے اس کے متعلق بتلایا کہ زہری نے عروہ سے نہیں سنا، اس حدیث کو صالح بن ابوالخضر نے روایت کیا ہے اور محمد بن ابی حفصہ عن زہری عن عروۃ عن عائشۃ۔ مالک بن انس اور معمر بن عبیداللہ بن عمرو بن زیاد بن سعد نے

اس کو روایت کیا ہے۔ بہت سارے حفاظ نے عن الزہری عن عائشہ کیا ہے اور اس میں عروہ کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ زیادہ صحیح ہے۔ پھر ترمذیؒ نے ابن جریج کی طرف اس کی نسبت کی ہے اس نے کہا: میں نے زہری سے پوچھا: کیا عروہ نے آپ کو حضرت عائشہؓ سے بیان کیا ہے؟ انہوں نے کہا، میں نے عروہ سے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ لیکن ہم نے سلیمان بن عبدالملک کی خلافت میں بعض لوگوں سے سنا، جنہوں نے عائشہؓ سے اس حدیث کے متعلق سوال کیا۔

یعنی یزید بن ھاد کی حدیث سے۔ عن زمیل بتصغیر کے ساتھ۔ **مولی عروۃ عن عروۃ عن عائشۃ** : میرکؒ کہتے ہیں: صحیح بخاری میں منقول ہے: بخاری کہتے ہیں: زمیل کا عروہ سے سماع ثابت نہیں، اور نہ یزید کا سماع زمیل سے، اور نہ ہی وہ قابل حجت ہیں۔ خطابیؒ کہتے ہیں: اس کی اسناد ضعیف ہیں، اور زمیل مجہول ہے۔ زمیل "زاء" کے ضمہ کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اور عباس عروہ بن زبیر کے مولی ہیں۔ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو استحباب پر محمول ہوگی۔

محقق ابن ہمامؒ کہتا ہے: کہ امام بخاری کا قول اشتراط علم پر مبنی ہے۔ صحیح بات یہ ہے علم کے لئے ہم عصر ہونا کافی ہے، اگر ان کے علل اور ترمذی کے علل کو تسلیم بھی کر لیا جائے۔ تو تعلیل صرف اسی طریق سے متعلق ہوگی۔ پس یہ تب ہی لازم آتا اگر اس کا اور کوئی طریق نہ ہوتا۔ لیکن ابن حبان نے اپنی صحیح میں دوسرے طریق

عن جرير بن حازم، عن يحيى بن سعيد عن عروة عن عائشة "قالت : اصبحت أنا وحفصة صائمتين متطوعين". (الحدیث)۔ ابن ابی شیبہ نے دوسری سند سے روایت کیا ہے: **عن خصيف عن سعيد بن جبير "أن عائشة وحفصة".** (الحدیث)۔ طبرانی نے معجم میں حدیث **خصيف عن عكرمة عن ابن عباس "ان عائشة وحفصة".** بزارؒ نے ایک اور سند سے روایت کیا ہے: **عن حماد بن الوليد عن عبيد الله بن عمرو عن نافع عن ابن عمر قال : "أصبحت عائشة وحفصة".** اور حماد بن ولید **لين الحديث** ہے۔

طبرانیؒ نے "اوسط" میں یہ حدیث بیان کی ہے: **حدثنا موسى بن هارون حدثنا محمد بن مهران الجمال، قال : ذكره محمد بن أبي سلمة المكي عن محمد بن عمرويه عن أبي سلمة عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال : "اهديت لعائشة وحفصة هدية وهما صائمتان فأكلتا منه وذكرتا ذلك لرسول الله ﷺ فقال : اقضيا يوما مكانه ولا تعودا".**

یہ حدیث ثابت ہے اگر اس کے تمام طریق ضعیف بھی ہوں تو بھی اس کا انکار نہیں ہوسکتا۔ اس کے کثرت اس کے ضمن میں یہ بھی ثابت ہے کہ وہ مجہول راوی جو زہری کے قول میں جس کی طرف امام ترمذیؒ نے نسبت کی ہے، **عن بعض ما سأل عائشة عن هذا الحديث** ثقہ ہے اور انہوں نے واقع کے مطابق خبر بیان کی ہے۔ تو کیسے یہ روایت معتبر نہ ہوگی حالانکہ اس کے بعض طرق قابل حجت ہیں۔

اس کے ساتھ ابن حجرؒ کا قول بھی باطل ہو جاتا ہے۔ نوویؒ نے شرح مہذب میں بیہقی وغیرہ سے اس حدیث کی سند پر لمبی بحث کی ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ حدیث ضعیف ہے، اس سے قضا کے وجوب پر حجت نہیں پکڑی جا سکتی، اس کو صحیح تسلیم کر لیں، تو اس کو اس روایت کی طرح ندب پر محمول کیا جائے گا۔ **"خبأنا لك حيسا، فقال : انى كنت اريد الصوم ولكن قربيه**

واقضی یوما "۔ابوسعید خدری کی روایت کی وجہ سے :"أنه صنع لرسول الله ﷺ طعاما فقال بعض القوم عن نفسه انی صائم فقال علیه الصلاۃ السلام : دعاکم أخوکم وتکلف لکم ثم قال له، افطر وصم یوما مکانه ان شئت".اھ ہے

لیکن یہ ان کے مدعا پر نص نہیں ۔کیونکہ ہوسکتا ہے۔کہ شرط کا تعلق افطر سے ہو اور ان کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔یہ بات بتانے کے لئے کہ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں اور یہ کہ افطار کرنا افضل ہے۔کیونکہ افطار کے واجب نہ ہونے پر اتفاق ہے۔جوکہ مسلم کی روایت سے مفہوم ہوتا ہے تمام احادیث میں تطبیق کے لیے جتنا ممکن ہو۔

روزہ دار کے پاس کھانے کی وجہ سے روزہ دار کو اجر

۲۰۸۱:وَعَنْ اُمِّ عُمَارَةَ بِنْتِ كَعْبٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا فَدَعَتْ لَهُ بِطَعَامٍ فَقَالَ لَهَا كُلِيْ فَقَالَتْ اِنِّي صَائِمَةٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الصَّائِمَ اِذَا اُكِلَ عِنْدَهُ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى يَفْرُغُوْا. (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۳/۳ حدیث رقم ۷۸۵۔ وابن ماجه ۵۵۶/۱ حدیث رقم ۱۷۴۸۔ والدارمی ۲۸/۲ حدیث رقم ۱۷۳۸۔ واحمد فی المسند ۳۶۵/۶۔

ترجمہ:ام عمارہ بنت کعبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس آئے پس انہوں نے حضور ﷺ کے لیے کھانا منگوایا پس حضور ﷺ نے فرمایا اس کو کھاؤ تو انہوں نے کہا کہ میں روزے سے ہوں۔پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق جب روزے دار کے پاس کھانا کھایا جاتا ہے۔یعنی اس کا دل کھانے پر رغبت کرتا ہے اور روزہ اس پر دشوار ہوتا ہے تو اس پر فرشتے رحمت بھیجتے ہیں۔یہاں تک کہ کھانے والے فارغ ہو جائیں۔اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح:وعن ام عمارة : عین کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ، ان کا نام نسیبہ ہے۔ بنت کعب : یعنی انصاری۔ان النبی ﷺ دخل علیها فدعت :یعنی طلب کیا۔له طعام فقال لها کلی فقالت انی صائمة فقال النبی ﷺ : روزے کو پورا کرنے کے ساتھ۔ان الصائم اذا أکل عنده :نفس کھانے کی طرف مائل ہو، اور اس پر اس کا روزہ سخت ہوجائے۔صلت علیه الملائکة :کھانے کی مشقت برداشت کرنے کی وجہ سے اس کے لئے دعا استغفار کرتے ہیں۔حتی یفرغوا :یعنی کھانے والے لوگ۔

میرکؒ کہتا ہے: دونوں نے حبیب بن زید کی سند سے عن مولاۃ لهم لیلی عن جدته اُم عمارۃ.ترمذیؒ نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔اور نسائی نے لیلی سے مرسل روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

روزے دار کو بہترین رزق جنت میں دیا جائے گا

۲۰۸۲: عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَتَغَدّٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغَدَاءَ يَا بِلَالُ قَالَ اِنِّي صَائِمٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَأْكُلُ رِزْقَنَا وَفَضْلُ رِزْقِ بِلَالٍ فِي الْجَنَّةِ اَشَعَرْتَ يَا بِلَالُ اَنَّ الصَّائِمَ يُسَبِّحُ عِظَامُهُ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُ الْمَلَائِكَةُ مَا اُكِلَ عِنْدَهُ ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲۹۷/۳ حديث رقم ۳۵۸۶۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ بلالؓ نبی کریم ﷺ کے پاس داخل ہوئے' اس حال میں کہ آپ ﷺ صبح کا کھانا کھا رہے تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بلال! کھانے کے لیے حاضر ہو جاؤ۔ بلالؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں روزے سے ہوں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے بلال ہم اپنا رزق کھاتے ہیں اور بلالؓ کا بہترین رزق جنت میں ہے کہ اے بلال کیا تو جانتا ہے کہ تحقیق روزے دار کی ہڈیاں تسبیح کرتی ہیں اور فرشتے اس کے لیے بخشش مانگتے ہیں جب تک اس کے نزدیک کھایا جائے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: عن بريدة : تصغیر کے ساتھ۔ قال : دخل بلال على رسول الله ﷺ وهو يتغدى : یعنی کھانا کھا رہے تھے۔ یہ شروع دن کا کھانا ہے۔ فقال رسول الله ﷺ الغداء : منصوب کسی فعل مقدر کی وجہ سے۔ یعنی أحضره یا ائته ۔ یا بلال! قال انی صائم یا رسول الله، فقال رسول الله ﷺ نأكل رزقنا : یعنی اللہ تعالیٰ کا رزق جو اس نے ہم کو عطا کیا۔ وفضل رزق بلال : مبتداء۔ ای الرزق الفاضل على ما نأكل. فى الجنة : بطور جزاء کے روزے میں کھانے سے رک جانے پر۔ طیبی ؒ کہتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے: یعنی بلال کا رزق جنت میں۔ مگر انہوں نے لفظ "فضل" ذکر کر کے تنبیہ کی ہے، کہ وہ رزق اس کے بدلے ہے اور اس پر زائد ہے۔ کلام کا آخر دلالت کرتا ہے کہ پہلا حکم وجوب کے لئے نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے بلالؓ کی رغبت کو روزے میں زیادہ کیا، اپنے اس قول کے ساتھ۔ أشعرت : استفہام انکاری ہے۔ یعنی "أما علمت"۔

یا بلال ان الصائم یسبح عظامه : اس کو حقیقت پر محمول کرنے سے کوئی مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس تسبیح کا ثواب لکھتے ہیں۔ اس لیے اگر چہ کہ اس میں اختیار نہیں ہے۔ لیکن وہ فعل اختیاری روزے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس قول کو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ اس میں ہے کہ تعلیل کی ضرورت نہیں، جب کلام کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ ویستغفر له الملائكة : ایک نسخہ میں دونوں فعل تانیث کے ساتھ ہیں۔ ما أكل : یسبح و یستغفر کے لئے ظرف ہے۔ وعنده : جو روزے دار کے سامنے کھایا جائے، اور وہ بھوک کی حالت میں جو صبر کرتا ہے، اس پر جزاء (بدلہ) ہے۔

ابن ماجہ اور بیہقی دونوں بقیہ سے روایت کرتے ہیں، حدثنا محمد بن عبد الرحمٰن عن سليمان بن بريدة عن أبيه محمد بن عبدالرحمٰن یہ مجہول راوی ہے۔ بقیہ بن ولید مدلس ہے۔ اس کی حدیث کی صراحت جہالت کی وجہ فائدہ نہیں دیتی۔ اس کو میرک ؒ نے منذری سے روایت کیا ہے۔

بَابُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

یعنی اسکی فضیلت کے بارے میں، اور اس کے زیادہ امید والے

اوقات کا بیان

نوویؒ کہتے ہیں: علماء کا قول ہے' اس کا نام ''لیلۃ القدر'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ فرشتے اس رات اقدار (تقدیر) رزق اور اُجل جو اس سال میں وقوع پذیر ہونے ہوتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔ اس کے تائید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴾ [الدخان : ٤] اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴾ [القدر : ٤-٥]۔ اس کا معنی یہ ہے کہ فرشتوں کے سامنے جو کچھ اس رات ہونا ہے وہ واضح ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی ڈیوٹی سرانجام دینے کا حکم دیتا ہے۔ یہ تمام جو گزرا ہے اللہ تعالیٰ کے علم اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے: اس کی تعظیم اور اس کے معاملے کے شرف کی وجہ اس کا نام رکھا گیا ہے۔ قابل اعتماد حضرات نے اس کے وجود اور قیامت تک قائم رہنے پر اجماع کیا ہے۔ ان کا یہ موقف مشہور صحیح احادیث کی وجہ سے ہے۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: اس کے محل میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں: ایک سال ایک رات میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے سال میں رات ہوتی ہے۔ یہ ان احادیث کے درمیان تطبیق ہے۔ جو مختلف اوقات کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ قول امام مالک، احمد، اسحاق اور ابو ثورؒ وغیرہ کا ہے۔

ان کے علاوہ بعض کا قول ہے: یہ رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ یہ قول ابن مسعودؓ، اور ابو حنیفہؒ کا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سارے رمضان میں ہوتی ہے، یہ ابن عمرؓ کا قول ہے، اور صحابہ کی ایک جماعت کا ہے۔ ایک قول ہے کہ عشرہ کے طاق راتوں میں ہے۔ کہا گیا ہے یہ ستائیسویں رات کے ساتھ خاص ہے، اور یہ اکثر علماء کا قول ہے۔

ہمارے بعض علماء کہتے ہیں: اکثر اہل علم کا یہ موقف ہے کہ لیلۃ القدر آخری سات راتوں میں سے ایک ہے، اور وہ راتیں اکیسویں، تیئسویں، پچیسویں، اور ستائیسویں ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ رمضان کی پہلی رات یا نصف رمضان (پندرہویں) یا ستائیسویں رات۔ ایک قول شعبان کی نصف رات ہے۔ کیا یہ اس امت کے ساتھ خاص ہے۔ زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ہاں! اس امت کے ساتھ خاص ہے۔ یہ قول ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

سورۃ القدر کے نزول کا سبب اس امت کی عمر میں کمی کی وجہ سے حوصلہ کے لئے ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: قدر، دال کے سکون کے ساتھ ہے، قدر عام اور معروف ہے وہ قضاء کے معنی میں دال کے فتحہ کے ساتھ، تا کہ معلوم ہو کہ اس کے ساتھ وارد نہیں ہوئی۔ قضا زمانے کا گزرنا ہے۔ اس سے مراد تفصیل ہے، جس کے متعلق قضا ہو چکا اور تحدید مدت کے لئے ہے، جو اس کے بعد اس کی مثل آنے والی ہے، تا کہ اس کی مقدار معلوم ہو جائے۔

الفصل الاوّل:

طاق راتوں میں شب قدر کو تلاش کرو

۲۰۸۳: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَ وَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۵۹/٤۔ حدیث رقم ۲۰۱۷۔ ومسلم فی صحیحه ۸۲۸/۲ حدیث رقم (۲۱۹۔ ۱۱٦۹)۔ وابوداوٗد فی السنن ۱۱۱/۲ حدیث رقم ۱۳۸۵۔ والترمذی ۱۵۸/۳ حدیث رقم ۷۹۲۔ ومالك فی الموطأ ۳۱۹/۱ حدیث رقم ۱۰ من کتاب الاعتکاف۔ واحمد فی المسند ۵۰/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ شب قدر کو رمضان کی آخری طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت : قال رسول الله ﷺ تحروا : یعنی تلاش کرو۔ لیلة القدر فی الوتر : یعنی طاق راتوں میں۔ من العشر الأواخر من رمضان : نہایہ میں ہے کہ اس طلب (حاصل) کرنے میں پکا ارادہ کرو، اور اس کے لئے کوشش کرو۔

شب قدر کو آخری طاق راتوں میں تلاش کرنا چاہیے

۲۰۸۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَنَّ رِجَالاً مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرُوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَاَتْ فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الْاَوَاخِرِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۵٦/٤۔ حدیث رقم ۲۰۱۵۔ ومسلم فی صحیحه ۸۲۲/۲ حدیث رقم (۲۵۔ ۱۱٦۵) ومالك فی الموطأ ۳۲۱/۱ حدیث رقم ۱٤ من کتاب الاعتکاف واحمد فی المسند ۱۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شب قدر (رمضان المبارک کی) خواب میں دکھائی گئی۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے خوابوں کو دیکھ رہا ہوں جو اخیر کی سات راتوں پر متفق ہیں۔ پس جو کوئی اس کو (یعنی شب قدر کو) تلاش کرنا چاہے اس کو چاہیے کہ وہ اسے (رمضان المبارک کی) اخیر کی سات راتوں میں تلاش کرے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عمر رضی الله عنهما قال : ان رجالاً من اصحاب النبی ﷺ اروا: اراءة سے مبنی علی المفعول ہے۔ اس کی اصل "أريوا" ہے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ نے دکھلایا۔ لیلة القدر : یعنی اس کی تعیین۔ فی المنام : آبن

ملکؒ کہتے ہیں: نیند میں ان کے دل میں خیال پیدا کیا گیا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی قول کی طرح کہتے ہیں۔ کہ وہ خواب میں دکھلایا گیا۔ في السبع الأواخر :یعنی رمضان کے۔ بعض نے اُسے تیئسویں رات دیکھا۔ بعض نے پچیسویں رات دیکھا۔ اسی طرح تمام نے دیکھا۔

شاید کہ وتر کا لینا کوئی دوسری دلیل سے ہے اور سات سے مراد سات جو ثابت ہیں وگرنہ سبع اواخر کی ابتداء چوبیسویں یا بائیسویں رات سے ہوتی ہے۔ اس کی بناء پہلے مہینے کی گردش ہے۔ جیسے پہلا آخری دور پر مبنی ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "سبع" سے مراد مہینے کی آخری راتیں ہیں۔ یا سبع سے مراد چوبیس کے بعد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ زیادہ اولیٰ ہے کہ آپ اس میں اکیس اور تیئسویں کو شامل کرلیں۔

"سبع الاواخر" کا اطلاق بیس کے بعد سات پر کرنا غیر منطبق ہے، کیونکہ اکیسویں رات تیسرے ہفتے کا آخر ہے، اور چوتھے ہفتے کی ابتداء تیئسویں سے ہے اور اس کا پہلا وتر تیئسواں ہے، آپ اس میں گمراہی کے ڈر رکھتے ہوئے عذر کریں۔ بعض نے کہا ہے کہ السبع کا ذکر مہینے کی راتوں میں ان پر ہے جن کے ساتھ پہلا اعداد السبع ہے یعنی ستارہویں اور ستائیسویں رات۔ شاید کہ اواخر کا ذکر سات کی جنس کے اعتبار سے ہے۔ اور مطلب صرف اس کی تلاش کرنا ہے۔ اس میں اجتہاد اطاعت اور عبادت کی وجہ سے۔

فقال رسول الله ﷺ ارى رؤياكم قد تواطأت : صحیح نسخہ میں "تواطت" بغیر ہمزہ کے ہے۔ ایک نسخہ میں ہمزہ طاء اور "تاء" کے درمیان سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ ایک قول ہے کہ اصل تواطأت، ہمزہ کے ساتھ یعنی الف کو تبدیل کر کے حذف کر دیا گیا۔ اور ہمزہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ التواطؤ، توافق کے معنی میں ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں: بعض نسخوں میں طاء پھر تاء کے ساتھ اور وہ مہموز ہے۔ زیادہ لائق ہے کہ "طاء اور تاء" کے درمیان الف لکھا جائے۔ اس کی قراءت کو مہموز کے ساتھ ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ﴾ [التوبة : ٣٧]۔ شیخ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: المواطأة، موافقت کو کہتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھ اپنے بھائی کے روندے ہوئے کو روندتا ہے۔ بعض نے ہمزہ کے ساتھ روایت کیا ہے، اور وہی اصل ہے یعنی بمعنیٰ توافقت۔ في السبع الأواخر : یعنی اس پر۔ فمن كان متحريها : یعنی لیلۃ القدر کو طلب کرنے، اور اس کا قصد کرنے والا۔ یا اس کے اوقات کو تلاش کرنے کا ارادہ رکھنے والا، کا تعلق اسی مثال سے ہے: تحرى الشيء اذا قصد حراه ، یعنی اس کی جانب یا طلب تلاش۔

فليتحرها في السبع الاواخر : تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ مہینے کی آخری دس راتیں مراد ہیں اور بیس کے بعد بھی سات مراد لی گئی ہیں۔ اس پر اکیسویں اور تیئسویں کو بھی محمول کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں: آپ ان سات کی ابتداء کی یقینی طور پر تحقیق کریں وہ اس کے الٹ ہے۔ اگر چہ یہی متبادر ہے۔ سرائر (رازوں) کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

آپ کا کہنا "فليتحر ما في السبع الآواخر" یہ اس کے قول کے منافی نہیں ہے: "فالتمسوها في العشر الآواخر" کیونکہ آپ ﷺ نے حتمی طور پر اس کا وقت نہیں بتلایا۔ صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک کا موقف وہی ہے جو اس نے سنا اور دیکھا۔ شافعیؒ کہتے ہیں: والذى عندى. واللہ اعلم۔ کہ نبی ﷺ ایسے ہی جواب دیتے تھے جیسے آپ ﷺ سے سوال کیا گیا تھا۔

آپ ﷺ سے کہا گیا ہوگا: نلتمسها فی لیلة کذا. آپ ﷺ نے کہا: التمسوها فی لیلة کذا. اسی پر اہل علم میں سے ہر فریق منقسم ہے۔

اس کی اتباع ابن حجرؒ نے کی ہے، جس طرح اس نے ذکر ویسے ہی ابن حجرؒ نے ذکر کیا۔ لیکن ان الفاظ کے ساتھ کوئی بھی حدیث محفوظ نہیں تو اس پر نبوت کے تمام الفاظ کو کیسے محمول کیا جا سکتا ہے۔

پھر تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ستائیسویں رات کو لینے والے اکثر ہیں۔ اور احتمال ہے کہ ان میں سے ہر گروہ نے اس کا وقت جان لیا ہو۔ لیکن اس کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم اپنی تعیم میں عموم پر بہت زیادہ بلیغ ہے۔ تاکہ وہ اس پر ہی توکل کر کے نہ بیٹھ جائیں، تاکہ وہ زیادہ سے کوشش کریں، اور اس کے حصول میں محنت کریں۔ اس لیے یہ راز ہے، نبی ﷺ کو پہلے یہ رات دکھلائی گئی پھر بھلا دیا گیا۔

ابن حجرؒ کا بھی یہی موقف ہے۔ اس میں اشکالات ہیں۔ آخری کلام میں جو تناقض ہے وہ مخفی نہیں۔ جب نبی ﷺ بھول گئے۔ تو وقت کا علم کیسے ہے جب کہ اس میں ضمیر صحابہؓ کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ قوم کے لئے سعادت مند صوفیاء ہیں۔ تو علم کا اطلاق جو ان کو حاصل ہوتا ہے وہ الہام کے ذریعے ہے۔ اس کے علاوہ تمام جگہ توقف ہوگا۔ واللہ اعلم

خصوصی طور پر طاق راتوں میں شب قدر کو تلاش کرو

۲۰۸۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِلْتَمِسُوْهَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ فِیْ تَاسِعَةٍ تَبْقٰی فِیْ سَابِعَةٍ تَبْقٰی فِیْ خَامِسَةٍ تَبْقٰی۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۶۰/۴۔ حدیث رقم ۲۰۲۱ وابوداؤد فی السنن ۱۱۰/۲ حدیث رقم ۱۳۸۳۔ والترمذی ۱۶۰/۳ حدیث رقم ۷۹۴۔ والدارمی ۴۴/۲ حدیث رقم ۱۷۸۱۔ ومالك فی الموطأ ۳۲۰/۱ حدیث رقم ۱۳ من کتاب الاعتکاف۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کو (یعنی شب قدر) رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کرو۔ یعنی شب قدر کو باقی ماندہ نویں رات میں (جو کہ اکیسویں رات ہے) باقی ماندہ ساتویں رات میں (جو کہ ستائیسویں رات ہے) اور باقی ماندہ پانچویں رات میں (جو کہ پچیسویں رات ہے) تلاش کرو۔ اس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عباس ان النبی قال: التمسوها فی العشر الآواخر من رمضان فی لیلة القدر:

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ضمیر منصوب مبہم ہے "لیلة القدر" کا قول اس کی تفسیر کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ [البقرة: ۲۹]۔ مصابیح کے نسخوں میں یہ ضمیر نہیں ہے۔ رہا ابن حجرل کا قول کہ "مصابیح" کے نسخوں میں اس کا حذف صاحب کتاب کی طرف سے تحریف ہے۔ یہ قول محل بحث ہے۔ جب کہ احتمال ہے کہ روایت ایسے ہو، اگر تحریف ہوتی تو کیوں اس نسخہ پر اتفاق ہوتا۔ محی السنہ عظیم المرتبت ہیں، زیادہ لائق بات یہ ہے کہ نسبت قصور ہمارے عدم اطلاع پر ہے، جامع

صغیر میں ہے:

"التمسوا ليلة القدر لسبع وعشرين" محمد بن نصر نے اس کو کتاب الصلوۃ میں ذکر کیا ہے۔ راوی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ طبرانی نے معاویہؓ سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: التمسوا ليلة القدر لسبع وعشرين، نصر نے اس سے روایت کیا ہے: "التمسوا ليلة القدر آخر ليلة من رمضان"۔ یہ تمام روایات بغیر ضمیر کے ہیں، اس پر کہ جمہور نے بالمعنی نقل کیا ہے۔ في تاسعة : العشر الأواخر سے بدل ہے۔ تبقى : اس سے پہلے عدد کی صفت ہے، یعنی ترجى بقاء ها۔ في سابعة تبقى. في خامسة تبقى : ظاہر یہ ہے کہ آپ کی مراد انتیسویں، ستائیسویں اور پچیسویں رات ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: تاسعة میں بائیسویں رات ہے۔ نو، باقی اعداد میں سے ہے چوبیسویں ان میں سے ساتویں رات ہے۔ چھبیسویں ان راتوں میں سے پانچویں ہے۔ زرکشی کہتا ہے: باقی جو پہلی ہے وہ اکیسویں رات دوسری رات تیئسویں رات، تیسری پچیسویں رات۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بعض کہتے ہیں: وہ اس کا صحیح معنی ہے۔ لیلۃ القدر طاق راتوں کے موافق ہوتی ہے جب مہینہ ناقص ہو۔ اگر مکمل ہو تو جفت راتوں میں ہوتی ہے، تو نویں باقی رات بائیسویں ہے۔ پانچویں باقی چھبیسویں ہے، ساتویں باقی چوبیسویں ہے۔ یہ گنتی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ کوئی بھی ان کے وارد ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ یہ عرب کا طریقہ تاریخ میں ہے جب وہ نصف مہینہ گزار لیتے، پھر وہ باقی کے ساتھ تاریخ بتاتے نہ کہ ماضی کے ساتھ۔

اعتکاف کا مقصد لیلۃ القدر کی تلاش ہے

۲۰۸۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ ثُمَّ اعْتَكَفَ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ فِيْ قُبَّةٍ تُرْكِيَّةٍ ثُمَّ اَطْلَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ اِنِّيْ اِعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ اَلْتَمِسُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ اِعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ اَلْتَمِسُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ اِعْتَكَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ ثُمَّ اُتِيْتُ فَقِيْلَ لِيْ اِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ اعْتَكَفَ مَعِيْ فَلْيَعْتَكِفِ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ فَقَدْ اُرِيْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ ثُمَّ اُنْسِيْتُهَا وَقَدْ رَاَيْتُنِيْ اَسْجُدُ فِيْ مَاءٍ وَطِيْنٍ مِنْ صَبِيْحَتِهَا فَالْتَمِسُوْهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَالْتَمِسُوْهَا فِيْ كُلِّ وِتْرٍ قَالَ فَمَطَرَتِ السَّمَاءُ تِلْكَ اللَّيْلَةَ وَكَانَ الْمَسْجِدُ عَلٰى عَرِيْشٍ فَوَكَفَ الْمَسْجِدَ فَبَصُرَتْ عَيْنَايَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى جَبْهَتِهٖ اَثَرُ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ مِنْ صَبِيْحَةِ اِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ متفق عليه فِي الْمَعْنٰى وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ اِلٰى قَوْلِهٖ فَقِيْلَ لِيْ اِنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَالْبَاقِيْ لِلْبُخَارِيِّ۔

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٥٦/٤ـ حديث رقم ٢٠١٦ـ ومسلم في صحيحه ٨٢٤/٢ حديث رقم (٢١٣ـ ١١٦٧)ـ

وابو داؤد في السنن ١٠٩/٢ حديث رقم ١٣٨٢ـ ومالك في الموطأ ٣١٩/١ حديث رقم ٩ من كتاب الاعتكاف۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا پھر آپ ﷺ نے درمیانی عشرہ ایک ترکی خیمہ عشرہ میں اعتکاف کیا اس کے بعد آپ نے اپنا سر مبارک باہر نکال کر فرمایا کہ میں نے شب قدر کو تلاش کرنے کے لئے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا' پھر میں نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا' پھر میرے پاس فرشتہ آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ شب قدر آخری عشرہ میں ہے لہٰذا جو شخص میرے ساتھ اعتکاف کا ارادہ رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ آخری عشرہ میں اعتکاف کرے' مجھے خواب میں شب قدر متعین کر کے دکھلا دی گئی تھی پھر بھلا دی گئی اور میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اس کی صبح کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں اور چونکہ میں یہ بھول گیا ہوں کہ وہ کون سی رات تھی لہٰذا اسے آخری عشرہ میں تلاش کرو' نیز شب قدر کو طاق راتوں میں تلاش کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ اس رات بارش ہوئی اور چونکہ مسجد کی چھت کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی تھی اس لئے مسجد ٹپکی چنانچہ میری آنکھوں نے اکیسویں شب کی صبح کو نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا نشان دیکھا۔ اس حدیث کے نقل کے سلسلہ میں معنوی طور پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہیں البتہ فقیل لی انها فی العشر الاواخر تک اس روایت کے الفاظ مسلمؒ نے نقل کئے ہیں اور روایت کے باقی الفاظ بخاریؒ نے نقل کئے ہیں۔

تشریح: **عن ابی سعید الخدری أن رسول الله ﷺ اعتكف العشر الاول** : واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ اسی طرح نسخوں میں ہے۔ ظاہر ہمزہ کے ضمہ اور واؤ کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ شاید کہ یہ مفرد لفظ "عشر" کے اعتبار سے ہے۔ **من رمضان** : عشر کے لئے بیان ہے۔ **ثم اعتكف العشر الأوسط** : زرکشیؒ نے کہتا ہے: کہ قیاس وسطی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ "عشر" مؤنث ہے۔ دلیل دوسری روایت کے الفاظ: **العشر الأواخر** ہیں اوسط کی وجہ کہ وہ لفظ "عشر" پر استعمال ہوتی ہے، اور وہ لفظ مذکر ہے۔ بعض نے روایت کیا ہے۔ "وسط" واؤ اور "سین" کے ضمہ کے ساتھ واسط کی جمع ہے، "کبازل وبزل"۔ بعض نے واؤ کے ضمہ اور سین کے فتحہ کے ساتھ روایت وسطی کی جمع' جیسے "کبر، کبریٰ"۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا قول: مؤطا کی روایت میں لفظ "وسط" ضمتین کے ساتھ "وسطی" کی جمع صحیح نہیں۔ ضمتین کے ساتھ فعل وہ کسی فعلی کا جمع نہیں ہوتا، بلکہ "فاعل" کے لیے ہوتا ہے۔

فی قبة تركية : یہ چھوٹا سا گول قبہ اون سے بنا ہوا تھا۔ یہ نوویؒ کا قول ہے۔ مسجد میں لگایا گیا تھا اس کو "فرقان" کہتے ہیں۔ اس کا نام فارسی میں خرکاہ ہے۔ **ثم اطلع رأسه** : "طاء" کے سکون کے ساتھ۔ اس قبہ سے نکال دیا۔ **فقال انی اعتكفت** : صیغہ متکلم کے ساتھ۔ ماضی کے حال سے تصویر کے ساتھ حکایت ہے۔ یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔ ایک نسخہ میں اعتکف ہے۔ **العشر الاول التمس** : یہ حال ہے، بمعنی اسے طلب کر (تلاش کر)۔ **هذه الليلة** : یعنی لیلۃ القدر۔ **ثم اعتكفت** : دونسخوں کے ساتھ۔ **العشر الاوسط** :نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مسلم کے تمام نسخوں میں ایسے ہی ہے۔ اس کا مشہور استعمال عشر تانیث کے ساتھ ہے، اور مذکر ایام کے اعتبار سے صحیح ہے، یا وقت اور زمانے کے اعتبار سے۔ اس کے استعمال کے صحیح ہونے کے لئے صرف آپ ﷺ کی حدیث ہی کافی ہے۔ **ثم أتيت** : مجہول کا صیغہ ہے، یعنی میرے پاس فرشتوں میں سے کوئی آنے والا آیا۔ **فقيل لی** : یعنی کسی فرشتے نے [redacted]۔ **انها** : یعنی لیلۃ القدر۔

فی العشر الأواخر: طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ اوصاف میں اختلاف نہیں العشر کا وصف اول اور اوسط ہے۔ یہ مفرد ہے اور والآواخر جمع؟ میں کہتا ہوں: کہ آخری دس راتوں میں سے ہر رات لیلۃ القدر کا تصور کرنا اس لیے اس کو جمع لائے۔ جب کہ "عشرین" میں ایسا نہیں ہے۔ فمن کان اعتکف :یعنی اعتکاف کا ارادہ کیا۔ معی :ابن ملک کہتا ہے: یعنی میرے ارادے کے موافق۔ طیبی رحمہ اللہ کہتا ہے: ان لوگوں کو اعتکاف کا حکم دیا جو عشرہ اول اور اوسط میں آپ کے ساتھ تھے۔ تاکہ وہ اپنی کوشش اعتکاف اور لیلۃ القدر کی تلاش میں صَرف کریں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ تقیید کے لئے نہیں ہے، بلکہ افہام کے لئے ہے، اگر چہ وہ آپ کے ساتھ اعتکاف کرنے والا نہ ہی ہو۔ فلیعتکف العشر الأواخر :جمع لانے کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں تنبیہ ہے اس بات پر کہ ہر رات کو لیلۃ القدر تصور کیا جائے، بخلاف العشر اول اور اوسط کے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اعتکاف کا حکم دوام اور اثبات کے لیے ہے۔ نوویؒ مسلم کے بعض نسخوں میں کہتے ہیں: فلیثبت من الشوت بعض میں فلیلبث من اللبث اور اکثر نسخوں میں فلیبت فی معتکفه من المبیت اور تمام صحیح ہیں۔

ابن ہمام کہتے ہیں: حدیث میں ہے: "انه علیه الصلاۃ السلام اعتکف العشر الاوسط فلما فرغ أتاه جبریل علیه الصلاۃ السلام فقال : ان الذی تطلب أمامك یعنی لیلة القدر. فاعتکف العشرة الآخر"۔ کہ آپ نے عشرہ اوسط کا اعتکاف کیا۔ جب آپ فارغ ہوئے تو جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے، اور کہا: جس کو آپ تلاش کر رہے تھے وہ مزید آگے ہے، یعنی لیلۃ القدر، تو آپ ﷺ نے آخری عشرے کا اعتکاف کیا۔ اس دلیل کی وجہ سے اکثر کا موقف یہی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہے۔ انہیں میں سے بعض نے اکیسویں رات اور بعض نے ستائیسویں رات کہا، اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

ابو حنیفہؒ سے روایت ہے، کہ وہ رات رمضان میں ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کون سی رات ہے۔ کبھی پہلے ہوتی ہے کبھی بعد میں ہوتی ہے (یعنی آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے)۔ امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے ہاں متعین ہے وہ آگے پیچھے نہیں ہوتی۔ یہ بات ان سے منظوم اور شروحات میں منقول ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے: انہوں نے کہا: یہ ان سے مشہور یہ ہے کہ لیلۃ القدر پورے سال میں ہوتی ہے، کبھی رمضان اور کبھی رمضان کے علاوہ ہوتی ہے، قاضی خان نے اس کو امام صاحب سے ایک روایت بنایا ہے۔ ثمرۂ اختلاف اس سے ظاہر ہوگا کہ کوئی کہے: "أنت حر و انت طالق لیلة القدر" تو آزاد ہے یا طلاق والی لیلۃ القدر میں۔ اگر یہ بات رمضان آنے سے پہلے کہی، تو وہ آزاد ہو جائے گا، اور طلاق ہو جائے گی، جب مہینہ مکمل ہو جائے۔ اگر اس سے ایک رات کے بعد کہا یا اس سے کچھ اوپر، تو وہ آزاد نہ ہوگیا، یہاں تک کہ آئندہ سال والا رمضان گزر جائے۔ صاحبین کے نزدیک جب وہی رات آئندہ رمضان میں آئے۔ اس نے کہا کہ اس میں اور بھی اقوال ہیں:

ایک قول: رمضان کی پہلی رات۔

حسن کہتے ہیں: سترویں رات،

ایک قول: انیسویں رات،

زید بن ثابت سے مروی ہے کہ چوبیسویں رات۔

عکرمہ کہتے ہیں: پچیسویں رات۔

ابو حنیفہؒ نے ان دلائل کا جواب دیا ہے کہ آخری عشرہ میں ہے۔"ذلک رمضان" سے مراد کہ رسول اللہ ﷺ نے جس رمضان میں تلاش کیا۔سیاق اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جس نے احادیث کے طرق اور الفاظ پر غور کیا جیسے آپ ﷺ کا قول ہے:"ان الذی تطلب أمامك".اور وہ لیلۃ القدر کو اس سال میں تلاش کر رہے تھے۔اس کے علاوہ جو استقراء سے معلوم ہو سکتا ہے لیلۃ القدر کی نشانیاں۔وہ روشن رات ہوتی ہے۔نہایہ میں اسی طرح ہے۔اس رات ٹھہراؤ ہوتا ہے نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔صبح کا سورج بغیر شعاعوں کے طلوع ہوتا ہے، گویا کہ وہ صاف کر دیا گیا ہے۔اسی طرح انہوں نے کہا کہ وہ رات مخفی ہے تا کہ اس کو تلاش کرنے میں کوشش کی جائے۔اس اجر کو کوشش کرنے والے پا لیتے ہیں۔جیسے اللہ تعالیٰ نے قیامت کو پوشیدہ رکھا ہے، تا کہ وہ ان پر اچانک آ جائے۔واللہ اعلم۔

فقد أریت : صیغہ مجہول متکلم۔هذه اللیلة :یعنی معین۔ثم انسیتها :صحیح بخاری میں نسیتها "ن" کے ضمہ اور سین کی تشدید کے ساتھ۔اس سے مراد اس سال اس کی تعین ہے، یہ قول زرکشی کا ہے۔ایک قول ہے، شاید اس کے تعین کو بھلا دینے میں یہ حکمت ہے کہ کہیں لوگ اس کی تعظیم میں مشغول نہ ہو جائیں۔یا اس کی وجہ سے دوسری راتوں کی عظمت ترک نہ کر دیں۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے آپ ﷺ نے خبر دی کہ فلاں رات ہے، پھر آپ بھول گئے اور اس کے خبر دینے جبرائیلؑ تھے، اور رہا اس پر مطلع ہونے اس کو دیکھنے کا معاملہ محتمل ہے۔

میں کہتا ہوں: جب وہ محتمل ہے تو اس پر چاہئے وہ کہے۔مراد ظاہر ہے۔پھر میں نے اپنے ائمہ اصحاب میں سے قفال کو دیکھا انہوں نے کہا: اس کے معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نیند کی حالت میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ لیلۃ القدر فلاں رات ہے اور اس کی یہ نشانیاں ہیں۔اس کا معنی یہ نہیں کہ آپ علیہ السلام نے لیلۃ القدر کو بذات خود دیکھا، کیونکہ خود دیکھی ہوئی چیز نہیں بھولتی۔یعنی صحیح بیان کرنے سے۔وقد رأیتنی :یعنی نیند میں۔افعال قلوب کی خصوصیت میں سے ایک یہ ہے کہ فاعل مفعول اکٹھے آتے ہیں۔اسجد :رفع کے ساتھ حال ہے اور ایک قول ہے: کہ اس کی تقدیر یوں ہے أن اسجد یعنی ساجدًا . فی ماء و طین :یعنی گیلی زمین پر۔شاید اس کی اصل پانی اور مٹی ہے۔اس کا نام طین اس لیے کہ اس میں پانی شامل ہوتا ہے۔اس میں اشارہ ہے، کہ پانی کا غلبہ ہوتا ہے۔یا نہیں ہوتا۔ایک حدیث ہے: "کنت نبیا و آدم بین الماء و الطین".اسی طرح آیت میں ہے: ﴿خَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الاعراف : ۱۲]۔حدیث قدسی میں ہے: "خمرت طینة آدم بیدی أربعین صباحًا". من صبیحتها : مصابیح میں فی صبیحتها یعنی لیلۃ القدر کی صبح۔میں بھول گیا ہوں کہ وہ کون سی رات تھی۔ فالتمسوها فی العشر الأواخر :یعنی رمضان میں۔والتمسوها من کل وتر :یعنی اس عشرہ میں۔مجھے امید ہے۔کہ اسی کی راتوں میں سے ایک رات ہے۔

قال :یعنی ابو سعید نے کہا۔فمطرت :فتحتین کے ساتھ۔السماء تلك اللیلة :یعنی جو رات آپ ﷺ کو دکھلائی گئی۔ وکان المسجد علی عریش :فتحہ اور سکون کے ساتھ۔ایسا گھر جس کی چھت درخت کی ٹہنیوں سے بنی ہو۔یعنی بنی علی صوغ عریش اور یہ وہ چیز ہے جس سے سایہ حاصل کیا جائے۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: یعنی علی مثل العریش.اس کے ستون

کھجور کے تنے کے تھے۔ اس چھت پر وزن (بوجھ) نہیں ڈالا جائے گا۔ "عرش" بذات خود چھت ہے کہ وہ ٹہنیوں کے ساتھ سایہ کے لئے تھی۔ اور اس کا قول: عرش، بذات خود چھت تھی۔ یہ نہایہ کے قول کے مخالف ہے۔ دو ستون کھڑے کیے گئے، اور اس پر اس کو ڈالا گیا۔ قاموس میں ہے: عرش، وہ گھر جس میں سایہ حاصل کیا جائے چھتری کی طرح۔ "بيت جد ران" پتھر، مٹی یا لکڑی وغیرہ سے بنے ہوتے ہیں۔

فو كف المسجد: یعنی بارش کے قطرے چھت پر ٹپکے اور بارش کا پانی چھت سے نیچے آ گیا۔ فبصرت: یعنی میں نے دیکھا۔ عيناى رسول الله ﷺ: ایک قول: بصر: کو "صاد" کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے، یعنی علم۔ ابو سعید نے اس کو بمعنی أبصرت استعمال کیا ہے، علمت کے معنی میں نہیں۔ چونکہ صحابی نے کہا: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کتب لغت میں "بصر": بمعنی رأی نہیں ہے۔ شاید کہ وہ زوائد کو حذف کرنے کی وجہ سے ہے۔ یعنی وہاں بصر بمعنی "الابصار" ہے۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔ بیضاوی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق کہتے ہیں۔ ﴿بصرت مالم يبصروا﴾ [طه: ٩٦] یعنی علمت ورأيت. وعلى جبهته أثر الماء والطين: جملہ حالیہ ہے۔ طیبی رحمہ اللہ اس قول کے متعلق کہتے ہیں: فبصرت عيناى، آپ کے اس طرح کہنے کی مانند ہے: أخذت بيدى ونظرت بعينى. یہ ایسے حکم کے متعلق بولا جاتا ہے، جس میں کسی عجیب وغریب حالت کے متعلق اظہار تعجب کرنا ہے، اسی لیے اس نے لفظ رسول اللہ ﷺ کو مفعول کی جگہ رکھا ہے "وعلى جبهته" اس مفعول سے حال ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے: "رأيت على جبهته رسول الله ﷺ اثر الماء والطين".

نووی کہتے ہیں: امام بخاری کہتے ہیں: حمیدی اس حدیث سے حجت پکڑتے تھے، کہ نمازی کے لیے سنت ہے کہ وہ اپنی پیشانی کو نماز میں نہ پونچھے۔ اسی طرح علماء نے کہا ہے، یہ اس پر محمول ہے، کہ کوئی ہلکی سی چیز ہو جو زمین اور پیشانی کو ملنے سے نہ روکے۔ اگر وہ چیز زیادہ ہو معمولی نہ ہو تو اس کی نماز درست نہ ہوگی۔ شرح السنہ میں ہے: اس میں دلیل ہے کہ پیشانی پر سجدہ کرنا واجب ہے۔ اگر پیشانی پر سجدہ کرنا واجب نہ ہوتا تو آپ ﷺ پیشانی کو کیچڑ سے بچاتے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ محل نظر ہے کہ اس کو کس طرح مٹی سے بچاتے۔ حالانکہ آپ ﷺ کے لئے سب بڑی نشانی ہی یہی قرار دی گئی تھی۔ لیکن اس کے نشانی بنانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپؐ ٹوپی، پگڑی وغیرہ سے بچاؤ حاصل نہ کریں ظاہر بات یہ ہے کہ یہ بغوی کا کلام ہے۔ اس بات پر کوئی جھگڑا نہیں کہ سجدہ پیشانی پر کرنا واجب ہے۔

"محی السنہ" کہتے ہیں: اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے جو خواب میں دیکھا اس کی تاویل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے وہ بیداری میں دیکھا۔ من صبيحة احدى وعشرين: یعنی رات۔ وہ رات جس میں رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ القدر کو دیکھا وہ اکیسویں رات تھی۔ اس طرح کہا گیا ہے: کہ "من" بمعنی "فی" ہے، اور وہ آپ ﷺ کے اس قول کے متعلق ہے "فبصرت".

٢٠٨٧: وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ لَيْلَةُ ثَلَاثٍ وَعِشْرِيْنَ (رواه مسلم)

ترجمہ: عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ راوی نے کہا "وہ تئیسویں شب کی صبح تھی"۔ اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: وفي رواية عبد الله بن أنيس : تصغیر ہے۔اسی طرح اصول مصححہ میں ''في رواية عبد الله'' ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کی کتاب میں ''في حديث عبد الله'' ہے۔اس لئے کہا: اگر وہ ''في رواية'' کہتے تو اولیٰ تھا، کیونکہ یہ الگ سے کوئی حدیث نہیں بلکہ ایک دوسری روایت ہے۔اور اختلاف ''ليلة'' کے زیادہ ہونے میں اور عدد کا اختلاف کہ وہ سات ہے، یا گیارہ۔

قال ليلة ثلاث وعشرين : معتبر نسخوں میں ''ليلة'' جر کے ساتھ ہے۔اور ظاہر ہے یہ ''من صبيحة احدى وعشرين'' کے عوض ہے۔ابن ملک کہتا ہے۔لیلۃ القدر تیئسویں رات ہے۔کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قیام کا حکم دیا ہے۔''ليلة'' مرفوع ہے۔ایک نسخہ میں ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے۔رواہ مسلم: یعنی اس روایت کو

شبِ قدر کو پانے کا طریقہ

وَعَنْ زِرِّبْنِ حُبَيْشٍ قَالَ سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ إِنَّ أَخَاكَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ مَنْ يَقُمِ الْحَوْلَ يُصِبْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰهُ أَرَادَ أَنْ لَّا يَتَّكِلَ النَّاسَ أَمَا إِنَّهٗ قَدْ عَلِمَ أَنَّهَا فِيْ رَمَضَانَ وَأَنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ وَأَنَّهَا لَيْلَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ ثُمَّ حَلَفَ لَا يَسْتَثْنِيْ أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ فَقُلْتُ بِأَيِّ شَيْءٍ تَقُوْلُ ذٰلِكَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ قَالَ بِالْعَلَامَةِ أَوْ بِالْآيَةِ الَّتِيْ أَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا تَطْلُعُ يَوْمَئِذٍ لَا شُعَاعَ لَهَا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۲۷/۲ حديث رقم (۲۱۸۔ ۱۱٦۸)۔

ترجمہ: حضرت زر بن حُبیش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھنے کا ارادہ کیا میں نے کہا کہ تمہارے دینی بھائی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جو شخص پورا سال اللہ کی عبادت کی خاطر شب بیداری کرے تو وہ شب قدر کو پالے گا پس ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔انہوں نے اس وجہ سے یہ فرمایا تا کہ لوگ اس پر بھروسہ نہ کریں ارادہ کیا اس کے کہنے سے کہ لوگ اعتماد نہ کریں۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جانتے تھے شب قدر رمضان میں ہے اور تحقیق وہ آخری عشرے میں ہے اور وہ ستائیسویں رات ہے پھر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی اور ان شاء اللہ نہ کہا کہ تحقیق شب قدر ستائیسویں رات میں ہے۔پس میں نے کہا اے ابو منذر! (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) کس دلیل سے کہتے ہو؟ فرمایا: اس علامت اور نشانی کی وجہ سے جس کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ہمیں بتایا ہے کہ اس دن آفتاب طلوع تو ہوتا ہے لیکن اس میں روشنی نہیں ہوتی اور میں نے سورج کو دیکھا کہ اسی طرح نکلا۔اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن زر : ''زاء'' کے کسرہ اور ''راء'' کی تشدید کے ساتھ۔ابن حبيش : تصغیر ہے۔قال سألت أبي بن كعب : میں نے اس سے سوال کا ارادہ کیا۔یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے، یا وہ اپنے قول کی تفسیر کرتے ہیں۔فقلت : ابن حجر کا کہنا ''فقلت'' ''سألت'' سے بدل ہے' صحیح نہیں، ''فاء'' کا موجود ہونا فعل کے بدل کے جواز کے خلاف ہے۔پھر ان کا عجیب قول

ہے کہ شارح کا قول عجیب ہے کہ اس کا معنی ہے أردت أن اسأله فقلت على حد، : واذا قراء ت القران فاستعذ جب کہ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں، جس میں ہماری گفتگو ہو رہی ہے۔ آیت اس کی مثال نہیں۔ جیسا کہ واضح ہے۔ ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے وہم ہوا ہے: ﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ﴾ [الاعراف : ۲۰۴]۔ واللہ اعلم ۔

ان أخاك : دین اور صحبت میں۔ ابن مسعود : بدل ہے یا بیان ہے۔ يقول من يقم الحول : یعنی جو اطاعت کی غرض سے سال کی تمام راتوں میں کچھ وقت کے لیے قیام کرے۔ يصب : یعنی وہ پائے گا۔ ليلة القدر : یعنی یقینی طور پر اس کو دیکھ لے گا۔ کیونکہ اس کے واضح ہونے میں الہام اور اس کی تعین میں اختلاف ہے۔ اس کی تائید "عن امامنا" والی مشہور روایت سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ رمضان کے ساتھ خاص نہیں۔ چہ جائیکہ آخری عشرہ، طاق راتوں اور ستائیسویں رات کے ساتھ خاص ہو۔ فقال : اُبی نے کہا۔ رحم الله : ابن مسعودؓ کے لیے دعا ہے۔

اراد ان لا يتكل الناس : کہ وہ ایک قول پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اگرچہ وہ صحیح ہو اور اس آدمی کا ظن غالب ہو جس نے اپنے فتوے کی بنیاد اس پر رکھی۔ تو لوگ صرف اسی رات میں قیام کریں گے اور باقی راتوں کو چھوڑ دیں گے۔ تو اس سے لیلۃ القدر کو پوشیدہ رکھنے کی حکمت ختم ہو جائے گی۔ جس کے سبب نبی ﷺ بھول گئے۔ أما : تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لیے۔ انه : کسرہ کے ساتھ ابن مسعود ہے۔ قد علم : بطور ظن۔ لفظ "أما" ابن حجرؒ کے نسخہ سے ساقط ہے۔ اور یہ صحیح اصولوں کے مخالف ہے۔ انها فی رمضان : یعنی مجمل طور پر۔ وانها فی العشر الاواخر : یعنی غالب طور پر۔ وانها ليلة سبع وعشرين : اغلب طور پر۔ ثم خلفه : ابی بن کعب نے ظن غالب کی بناء پر۔ لا يستثنى : حال ہے۔ یعنی انہوں حتمی قسم اٹھائی اور اس کے بعد ان شاء اللہ نہیں کہا جیسے حلف اٹھانے والا کہتا ہے: لأفعلن الا ان يشاء الله. أو ان شاء الله. اس سے قسم منعقد نہیں ہوتی۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اور آدمی کا کہنا ان شاء اللہ۔ کہا جائے گا: حلف فلان يمينا ليس ضيه ثنى ولا ثنو ولا ثنية ولا استثناء تمام ایک ہی ہیں۔ اس کی اصل "الثنی" سے ہے، اس کا معنی رک جانا، رد کرنا۔ جب حلف اٹھانے والا کہتا ہے: والله لأفعلن كذا الا ان يشاء الله غيره، تو اس نے اس قسم کے منعقد ہونے کو رد کیا ہے۔ اگر میں کہوں کہ ابی بن کعب نے اس مخصوص رات کے اختصاص پر حتمی قسم کھائی ہے، تو ابن مسعودؓ کا کلام ارادہ خصوص کے ساتھ عموم پر محمول ہوگا۔ کیا یہ کسی چیز کے بارے میں خلاف واقع خبر دینا ہے؟ کیونکہ عموم اور خصوص میں منافات ہے۔ میں کہتا ہوں: وہ تعریض کی طرف گئے ہیں، جیسا ابراہیمؑ نے اپنی بیوی سارہ کو تعریضاً بہن کہا، اور وہ دین میں ان کی بہن تھیں۔

تعریض کی وجہ ظاہر نہیں۔ انها : مفعول ہے حلف کا۔ یعنی لیلۃ القدر۔ ليلة سبع وعشرين فقلت : یعنی اس سے۔ بأی شیء : دلائل سے۔ تقول ذلك : یہ بات۔ يا ابا المنذر : کعبؓ کی کنیت ہے۔ قال بالعلامة- أو بالآية : أو شک کے لئے ہے۔ یعنی نشانی۔ التی اخبرنا رسول الله ﷺ انها : ایک نسخہ میں کسرہ کے ساتھ، یعنی سورج۔ تطلع يومئذٍ : یعنی اس دن جس رات لیلۃ القدر ہو۔ ایک نسخہ میں "انها تطلع الشمس البيضاء" انها کی ضمیر قصّہ کے لیے ہے۔ لا شعاع لها : یہ دلیل أظهر من الشمس ہے، کہ ہم نے جو کہا کہ ان کا علم ظنی ہے قطعی نہیں۔ اس لحاظ سے کہ اس کے اجتہاد کی بنیاد اس

استدلال پر ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: "لا شعاع لها" میں نے ستائیسویں رات کی صبح کو دیکھا ہے، ایسے ہی طلوع ہوا۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شعاع جو سورج کی روشنی سے دیکھی جاتی ہے، اپنی تپش کے وقت جیسا کہ آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک قول ہے اس کا معنی ہے کہ اس کی شعاع نہیں ہوئی کہ فرشتے (اختلاف اور تردد کے ساتھ) اس رات زمین پر اترتے ہیں اور آسمان پر چڑھتے ہیں ان کے اجسام اور پروں سے سورج کی روشنی پردے میں چلی جاتی ہے۔

اس میں ہے کہ اجسام لطیف کثافت والے اجسام کو نہیں چھپاتے۔ اگر کہا جائے کہ لمبے وقت کے بعد اس رات کا نور سورج کی روشنی پر غالب آ جاتا ہے، تو یہ انوار ربانی کے اظہار میں مبالغہ ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس علامت کا فائدہ یہ ہے کہ یہ رات ختم ہونے کے بعد پائی جاتی ہے کیونکہ دن کو عبادت کرنا بھی سنت ہے، جس طرح رات کو عبادت کرنا سنت ہے۔ رہا یہ قول کہ دن کو عبادت کرنا سنت ہے یہ اثر (قول) محل نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس علامت کا فائدہ یہ ہے کہ جس نے رات بھر عبادت کی ہے، وہ اس نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے، اور جو اس نعمت سے بہرہ مند نہیں ہو سکا وہ افسوس کا اظہار کرے اور آئندہ سال اس کو پانے کا عزم اور تیاری کرے۔ اور بے شک یہی مقصود ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

رمضان شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک

۲۰۸۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٨٣/٢ حديث رقم (١١٧٥/٨)۔ وابن ماجه في السنن ٥٦٢/١ حديث رقم ١٧٦٧۔ واحمد في المسند ٨٢/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے اخیر عشرے میں اس قدر کوشش کرتے تھے کہ غیر رمضان میں اس قدر کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشةؓ قالت كان رسول الله ﷺ يجتهد في العشر الأواخر: یعنی لیلۃ القدر کی تلاش میں بہت محنت کرتے۔ اسی طرح یہ بھی قول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اطاعت اور عبادت میں بہت زیادہ جستجو کرتے۔ ما لا يجتهد في غيره: یعنی اس عشرہ کے علاوہ اس امید کے ساتھ کہ لیلۃ القدر اس رات میں ہوگی۔ یا اس کے اوقات کو غنیمت سمجھتے اور ان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالانے کا اہتمام کرتے۔ اور اس کی برکات کے حسن اختتام کی کوشش کرتے۔

آخری عشرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت میں خوب محنت کرتے

۲۰۹۰: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْيٰى لَيْلَهٗ وَاَيْقَظَ اَهْلَهٗ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٦٩/٤۔ حديث رقم ٢٠٢٤ ومسلم في صحيحه ٨٣٢/٢ حديث رقم (٧۔

(۱۱۷٤)۔ والنسائي في السنن ۲۱۷/۳ حديث رقم ۱٦۳۹۔ وابن ماجه ٥٦۲/۱ حديث رقم ۱۷٦۸۔ واحمد في المسند ٤۱/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہہ بند مضبوط باندھتے تھے اور رات کو زندہ کرتے اور اپنے گھر والوں کو جگاتے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنها : یعنی حضرت عائشہؓ سے ہی یہ روایت ہے۔ قالت کان رسول الله ﷺ اذا دخل العشر :یعنی آخری عشرہ، اور الف لام عہد کے لئے ہے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے: "الأخیر" یعنی لفظ اخیر کی تصریح ہے۔ شد مئزره : میم کے کسرہ کے ساتھ یعنی اپنا تہہ بند۔ یہ اس اہم اور مشقت والے کام کا قصد اور اس کی طرف توجہ کرنے سے عبارت ہے جیسے کہ "تشمیر الثوب" پنچے چڑھانے۔ ابن ابی شیبہ اور بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں: "اعتزل النساء" یہ اس بات کی تائید ہے "شد" سے مراد کوشش میں مبالغہ ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں: ایک قول یہ بھی ہے کہ "تشد مئزره" کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عادت و معمول سے ہٹ کر عبادات میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ عبادت میں سخت محنت اور جستجو کرتے۔ کہا جاتا ہے: "شددت في هذا الامر مزری" یعنی میں نے سخت کوشش اور اجتہاد کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ عورتوں سے الگ رہنے، ترک نکاح اور اس کے اسباب سے رک جانے سے کنایہ ہے۔ اور وہ عبادت پر کاربند اور عورتوں سے الگ رہنے سے کنایہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ ہمارے علمائے بیان کے ہاں کنایہ حقیقی ارادہ کے منافی نہیں ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: "فلان طویل النجاد" آپ نے طول نجاد سے اس کے لمبے قد کو مراد لیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ آپ اس عشرہ میں عبادت کے لیے مصروف ہو جاتے۔ اس قول کی طرف شاعر کا قول بھی اشارہ کرتا ہے:

دنیت للمجد والساعون قد بلغوا
جهد النفوس والقوا دونه الازرا

ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ اس لفظ کو حقیقت اور ممکنہ مجاز کریں۔ بعض کہتے ہیں: اس شرط کے ساتھ کہ جب متکلم کا دونوں کا ارادہ ہو۔ یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ ہمارے ہاں حقیقت اور مجاز کو اکٹھا کرنا ناجائز ہے۔ رہا طیبی رحمہ اللہ کا قول کہ یہ حقیقی معنی پر ہے لیکن یہ اصل معنی سے بعید ہے۔

وأحیا لیله : یعنی نماز، ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کو غالب کرتے۔ نوویؒ کہتے ہیں: نماز وغیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ مشغول ہو جاتے۔ ہمارے اصحاب کا یہ کہنا کہ ساری رات کا قیام مکروہ ہے، تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس پر ہمیشگی کرنا مکروہ ہے انہوں نے ایک رات یا دو راتوں کو مکروہ قرار نہیں دیا، یا ایک عشرہ کو مکروہ نہیں کہا انتہی کلامہ۔ لیکن یہ واضح نہیں کہ اس مطلب کی بنیاد کیا ہے۔ بہر حال ہم لیل کو رات کے اکثر حصے پر محمول کرتے ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام رات بیداری میں نہیں گزاری۔ واللہ اعلم۔ پھر ان کا قول ہے: کہ عید وغیرہ کی راتوں جاگنے کے مستحب ہونے پر اتفاق ہے۔ میں کہتا ہوں: کہ اس کو اکثر رات جاگنے پر محمول کرنا ممکن ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: أحيا الليل کی دو وجہیں ہیں: (۱) نفس عابد کی طرف راجع ہے چونکہ جب عابد نیند (جو کہ بمنزلہ موت کے ہے) کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے گویا کہ وہ اپنے نفس کو زندہ کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ [الزمر: ۴۲]۔ دوسری وجہ: نفس لیل مراد ہے جب رات قیام کی وجہ سے دن کے قائم مقام ہوگی تو گویا کہ اس نے رات کو زندہ کیا اور اُسے حکم الٰہی کی بجا آوری اور عبادت کے ساتھ مزین کیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فانظر الى أثا رحمة الله كيف يحيى الارض بعد موتها﴾ جس نے اس رات کوشش کی اور اسے عبادت کے ساتھ زندہ کیا اور اس سے وافر اپنا حصہ لے لیا۔ اور جس نے بعض رات کا قیام کیا، تو اپنے حصے کے قیام کے مطابق اپنا حصہ لے لیا۔ اور اسی بات کی طرف سعید بن میبّب نے اشارہ کیا ہے: "من شهد العشاء ليلة القدر فقد أخذ حظه منها"۔

ابن حجرؒ نے اس قول کی پیروی کی ہے۔ جامع صغیر میں حدیث ہے: "من صلى العشاء في جماعة فقد أخذ حظه من ليلة القدر"۔ اس کو طبرانی نے حسن اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ابو اُمامہ سے مرفوعاً حدیث منقول ہے: "ومن صلى العشاء في جماعة فكأنما قام نصف ليلة ومن صلى الصبح في جماعة فكأنما صلى الليل كله"۔ اس کو احمد اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ عثمانؓ سے مرفوع روایت ہے۔ اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ صبح کی نماز عشاء کی نماز کو ملا کر گویا کہ ساری رات زندہ کرنا ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ صبح کی نماز کو عشاء پر فوقیت ہو۔ کیونکہ اس میں قیام مشکل اور مشقت طلب ہے۔ واللہ اعلم

وايقظ أهله : یعنی بعض اوقات انہیں عبادت اور لیلۃ القدر کی تلاش میں جاگنے کا حکم دیتے۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے دیتے: ﴿وأمر أهلك بالصلاة﴾ آپ خود اس لیے حکم نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ آپ اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے۔

الفَصْلُ الثَّانی:

لیلۃ القدر میں مانگی جانے والی دعا کا ذکر

۲۰۹۱: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا قَالَ قُوْلِي اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي رواه احمد وابن ماجة والترمذی وَصَحَّحَهُ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۴۹۹/۵ حديث رقم ۳۵۱۳۔ وابن ماجه ۱۲۶۵/۲ حديث رقم ۳۸۵۰۔ واحمد فی المسند ۱۷۱/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے خبر دو اگر میں جان لوں کہ کونسی رات

شب قدر کی ہے کہ میں اس میں کیا کہوں۔یعنی کیا دعا مانگوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو کہہ اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس مجھے معاف فرما۔اس کو امام احمدؒ ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔

تشریح: عن عائشة رضي الله عنها قالت : قلت يا رسول الله أرأيت : یعنی مجھے خبر دیجیے۔ان علمت : اس کا جواب محذوف ہے، ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔أى ليلة :مبتداء اور خبر۔ليلة القدر : جملہ اور مفعولوں کے قائم مقام ہے "علمت" سے تعلق کی وجہ سے۔ایک قول ہے کہ قیاس کا تقاضا یہ ہے: "أية ليلة"ہو۔لیکن زمانے کا اعتبار کر کے اس کو مذکر لائے۔جیسا کہ آپ ﷺ کے قول میں ہے،یعنی "اى اية من كتاب الله معك أعظم" کلام اور لفظ کے اعتبار سے "ای" ملا کر ہے۔

ما أقول : أرأيت کے متعلق ہے۔(فيها :یعنی اس رات میں۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "ما أقول فيها" جواب شرط ہے۔جواب شرط میں "فاء" لانا ضروری ہے۔شاید کہ ناسخ کے قلم سے ساقط ہو گیا ہے۔میں کہتا ہوں: حدیث کے صحیح ہونے کی شرط ضبط اور حفظ ہے،تو اس کو سقوط غلط پر محمول کرنا صحیح نہیں،اسی لئے کہ روایت پر مدار ہے نہ کہ کتابت پر۔کیا آپ نے بخاری کی حدیث میں اس کی مثال نہیں دیکھی: "أما بعد ما بال رجال".[الحديث]۔اسی طرح حدیث میں ہے: "و أما الذين جمعوا بين الحج والعمرة طافوا"،ہاں "فاء" کا حذف قلیل ہے اور ثبوت اکثر ہے۔لیکن ہیں دونوں جائز۔قال : قولي : اللهم انك عفو : یعنی بہت زیادہ معاف کرنے والے ہیں۔تحب العفو :یعنی اس صفت کے ظہور کو پسند کرتے ہیں۔ جیسا کہ بزار کی حدیث میں ہے اور یہ حدیث ابو درداءؓ سے مرفوع ہے: "ما سأل الله العباد شيئا أفضل من أن يغفر لهم ويعافيهم"۔ فاعف عني : یعنی میں سب سے زیادہ قصور وار ہوں،اور تو بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے۔یہ دعا جوامع الکلم میں سے ہے۔دنیا اور آخرت میں یہ خیر مجھے حاصل ہو جائے۔اسی لیے تو نے گناہ گاروں کو پیدا کیا ہے،یا اس کا معنی یہ ہے کہ یہ صفت تیری شایان شان ہے۔

طاق راتوں میں شب قدر کو تلاش کرنے کا حکم

۲۰۹۲.وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِلْتَمِسُوْهَا يَعْنِىْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِىْ تِسْعٍ يَبْقِيْنَ اَوْ فِىْ سَبْعٍ يَبْقِيْنَ اَوْفِىْ خَمْسٍ يَبْقِيْنَ اَوْ ثَلَاثٍ اَوْ اٰخِرِ لَيْلَةٍ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۱۶۰/۳ حديث رقم ۷۹۴۔ واحمد فى المسند ۳۶/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ شب قدر کو (رمضان المبارک کی باقی ماندہ) نویں رات (یعنی انتیسویں رات میں) تلاش کرو یا باقی ماندہ ساتویں شب یعنی ستائیسویں رات میں یا باقی ماندہ پانچویں رات میں بھی یعنی پچیسویں رات میں بھی یا باقی ماندہ تیسری رات یعنی تیسویں رات میں یا آخری رات میں تلاش کرو۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن أبي بكرة قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول التمسوها يعني ليلة القدر : یہ ضمیر کی تفسیر

راوی کی طرف سے ہے۔ في تسع : یعنی نو راتیں۔ (يبقين : "یا" اور "قاف" کے فتحہ کے ساتھ اور وہ انتیسویں ہے۔ أو في سبع يبقين : اور ستائیسویں۔ أو في خمس يبقين : یہ پچیسویں ہے۔ أو ثلاث : اى يبقين، یہ تیئیسویں ہے۔ أو آخر ليلة : رمضان کی۔ یعنی مہینے کا اختتام۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: نو کا احتمال ہے یا اختتام مہینہ کا احتمال ہے۔ ہم نے اوتار (وتر کی جمع) کی وجہ سے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔ میرکؒ کہتے ہیں: "في تسع يبقين" کو اکیسویں پر محمول کریں گے۔ سبع يبقين کو چوبیسویں۔ وفي خمس کو پچیسویں پر۔ أو ثلاث کو اٹھائیسویں پر۔ "و آخر ليلة" کو انتیسویں پر محمول کریں گے۔ اس کو مہینے کے اختتام پر محمول کریں گے۔

۲۰۹۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ فَقَالَ هِيَ فِيْ كُلِّ رَمَضَانَ ۔

(رواه ابوداود وقال رواه سفيان و شعبة عن ابى اسحاق موقوفا على ابن عمر)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۱۱۱/۲۔ حديث رقم ۱۳۸۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب قدر کی حالت کے بارے میں پوچھا گیا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہر رمضان میں آتی ہے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ روایت سفیان اور شعبہ نے ابواسحٰق سے نقل کی ہے اور یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔

تشریح: وعن ابن عمر رضى الله عنه قال سئل رسول الله ﷺ عن ليلة القدر : کیا یہ پورے سال میں ہے۔ یا رمضان میں یا ہر رمضان میں یا صرف اس رمضان کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے۔ فقال هي في كل رمضان : ابن ملکؒ کہتے ہیں: یعنی یہ آخری عشرے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ رمضان کی ہر رات میں لیلۃ القدر ممکن ہے۔ اسی لیے اگر کوئی نصف رمضان یا اس کے بعد اپنی عورت سے کہے کہ تجھے لیلۃ القدر طلاق ہے، تو وہ مطلقہ نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگلے سال رمضان آ جائے، تو وہ اس رات مطلقہ ہوگی جس میں اس نے طلاق کو معلق کیا تھا۔ انتہى كلامه۔ حق تو یہ تھا کہ وہ صورت مسئلہ "في رمضان" سے بیان فرماتے یا صورت میں "أو اقل" کے بعد "أکثر" کے الفاظ بڑھاتے۔ مذہب احناف میں اس میں اختلاف ہے جیسا کہ اس پر محقق کلام ابن ہمام کے کلام میں گزر چکی ہے، گزشتہ احتمالات کی وجہ سے اصل حدیث مقصود پر نص نہیں اور اس کے مرفوع اور موقوف میں اختلاف کی وجہ سے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: حدیثوں میں دو وجوہات کا احتمال ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ (لیلۃ القدر) عام طور پر رمضان کے ساتھ خاص ہے، اس کو باقی مہینوں کے ساتھ خاص نہیں کیا جائے گا۔ دوسری وجہ: وہ رمضان کے ہر دن واقعہ ہوتی ہے اس کو آخری عشرے کے ساتھ خاص نہیں کیا جائے گا، چونکہ بعض کل کے مقابلہ میں ہے، اور یہ سارے مہینے میں واقع ہونے کے منافی نہیں ہے۔ ہاں یہ کہ اس کو خارجی دلیل کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔

دوسری وجہ پر مسئلہ کی فرع ہے کہ طلاق کو لیلۃ القدر معلق کرے رمضان کی دوسری رات میں۔ یا اس کے علاوہ رات میں مہینہ ختم ہونے تک۔ تو طلاق واقع نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگلا سال آ جائے، اور وہ وقت جس کے ساتھ طلاق معلق ہے۔ بخلاف پہلی رات کے آنے کے ساتھ۔ بلکہ طلاق مہینے کے اختتام پر واقع ہوگی۔

مرفوع بیان کیا ہے۔ وقال: یعنی ابوداؤد نے کہا۔ ابن عیینہ یا ثوری۔ (وشعبة عن أبي اسحاق موقوفا علی ابن عمر).

شبِ قدر مختلف طاق راتوں میں آتی ہے یعنی ہر طاق رات میں بدلتی رہتی ہے

۲۰۹۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ بَادِيَةً اَكُوْنَ فِيْهَا وَاَنَا اُصَلِّي فِيْهَا بِحَمْدِ اللّٰهِ فَمُرْنِي بِلَيْلَةٍ اَنْزِلُهَا اِلٰى هٰذَا الْمَسْجِدِ فَقَالَ انْزِلْ لَيْلَةَ ثَلَاثٍ وَعِشْرِيْنَ قِيْلَ لِابْنِهٖ كَيْفَ كَانَ اَبُوْكَ يَصْنَعُ قَالَ كَانَ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ اِذَا صَلَّى الْعَصْرَ فَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ لِحَاجَةٍ حَتّٰى يُصَلِّيَ الصُّبْحَ فَاِذَا صَلَّى الصُّبْحَ وَجَدَ دَابَّتَهٗ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ فَجَلَسَ عَلَيْهَا وَلَحِقَ بِبَادِيَتِهٖ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۲/ ۱۰۸۔ حديث رقم ۱۳۸۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن انیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! تحقیق میرے لیے جنگل ہے یعنی میں جنگل میں رہتا ہوں اور اس میں نماز پڑھتا ہوں اور اللہ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ پس مجھ کو حکم فرمائیں کہ ایک رات مسجد میں آؤں یعنی شب قدر میں مسجد نبوی میں آ کر عبادت کروں۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تئیسویں رات کو آؤ۔ عبداللہ کے بیٹے کے لیے کہا گیا کہ اس کا نام ضمرہ تھا کہ تیرا باپ کس طرح تھا۔ بیٹے نے کہا میرے والد مسجد میں داخل ہوتے اور عصر کی نماز پڑھتے ہیں یعنی رمضان کی بائیسویں تاریخ کو پس اس مسجد سے کسی کام کے لیے نہ نکلتے۔ جو کہ منافی اعتکاف ہے۔ پس جب فجر کی نماز پڑھ لیتے تو اپنا جانور مسجد کے دروازے پر پاتے پس اس پر سوار ہوتے اور اپنے جنگل میں پہنچ جاتے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عبد الله بن اُنیس: تصغیر ہے۔ قال قلت یا رسول الله ان لی بادیة أکون: یعنی رہنے والا ہوں۔ فیها: میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں: بادیة سے مراد دار اقامہ ہے۔ اس کا یہ کہنا: "ان لی بادیة" یعنی "ان لی دار ابادیة او بیتًا او خیمة هناك" اس بستی کا نام "الوطاءة" ہے۔ وأنا اصلی فیها بحمد الله: ابن ملکؒ کہتے ہیں: لیکن میرا ارادہ اعتکاف کا ہے، اور یہ مذہب کے صریح خلاف ہے۔ اس وجہ سے کہ اعتکاف بغیر روزے کے صحیح نہیں ہے، اور وہ رات کو قیام کر کے صبح کو واپس جانا چاہتا تھا۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ وہ شخص لیلۃ القدر کو پانا چاہتا تھا۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ فمرنی: یعنی کوئی ہلکا سا حکم دیجیے۔ بلیلة: مصابیح میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: "من هذا الشهر" یعنی رمضان کے مہینے میں۔

أنزلها: صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اگر مجزوم پڑھیں تو جواب امر ہے، یعنی تو اس رات قیام کرنا۔ نزول حلول کے معنی میں ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی تو اس رات کا قصد کرنے والا بن۔ الی هذا المسجد: مسجد نبوی کی طرف

اشارہ ہے۔ شاید کہ وقت اور جگہ کی فضیلت کا قصد کیا۔ فقال انزل ليلة ثلاث وعشرين : اگر حدیث صحیح ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا آنا لیلۃ القدر کی تلاش میں تھا۔ تو لیلۃ القدر کی تعیین ہو جائے گی۔ اس سے خلاصی اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہر سال میں ہے یا ہر رمضان میں ہے، یا ہر عشرہ میں ہے، یا اس کا جواب ظن غالب پر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس کا آنا صرف مسجد نبوی کی زیارت کے لئے تھا۔ اس رات کی تخصیص سائل کے مکان اور حالت کی مناسبت سے ہے۔ واللہ اعلم

قيل لا فيه : بنه: ان کے بیٹے ضمرہ سے۔ كيف كان أبوك يصنع : اس رات کے نزول کے وقت۔ قال كان يدخل المسجد اذا صلى العصر : رمضان کے بائیسویں دن۔ فلا يخرج منه لحاجة : یعنی دنیاوی معاملات کو اُخروی نیکیوں کو غنیمت سمجھنے کو۔ یا بغیر کسی ضرورت کے نہیں نکلتے تھے۔

ابن حجرؒ نے اپنے اس قول سے اس کو غریب قرار دیا ہے۔ اس سے وہ جو ضرورت اس سے زائد ہے نہ نکلے۔ اس کی غرابت کی وجہ کہ اس پر اطلاق درست نہیں ہے۔ جب اس کی مراد ضرورت انسانی حاجت ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ اگر کسی دنیوی حاجت کا ارادہ ہے تو اس کا ارادہ درست نہیں۔ پھر ایک خاص علامت کے ساتھ وارد اعتراض کے لئے کیا۔ پھر اس کا کہنا: "لحاجة" اس کو اس کے عموم پر باقی رکھنے کا احتمال ہے۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ انتظار کرنے والا اپنا وضوعصر سے باقی رکھے، اگر اس سے اس کا ارادہ حاجت انسان بول و براز کے علاوہ ہو۔ چونکہ غالب طور پر انسان اس مدت میں صبر نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے: "الا في حاجة" یعنی جس کا قصد کیا جائے۔ کبھی کبھی نکرہ عہد کے لیے ہوتا ہے۔

دوسرے احتمال پر دونوں روایتوں میں تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلے قول میں مراد بول و براز کے علاوہ ہے اور دوسرے میں حاجت سے مراد دونوں ہیں، بخلاف پہلے احتمال کے۔ کیونکہ ان دونوں میں منافات ہے۔ دو متعارض روایات کو جمع کرنے کی ضرورت کی وجہ سے دوسرا احتمال کا متعین ہے

"حاجة" دونوں روایات میں نکرہ ہے اور في تعليليه بمعنیٰ 'لام' ہے، روایات میں تعارض 'الا' کے وجود اور عدم وجود کی وجہ سے ہے۔ اور ان دونوں میں فرق پہلے گزر چکا ہے۔

طیبی ؒ کہتے ہیں: سنن ابی داؤد، جامع الاصول، شرح السنہ اور مصابیح میں اسی طرح ہے۔ "فلم يخرج الا لحاجة" نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔ پہلے قول کی مناسبت سے وہ ایسی حاجت کے لئے نہ نکلنے جو اعتکاف کے منافی ہو، جیسا کہ آگے باب الاعتکاف' حدیث عائشہؓ میں آئے گا۔ دوسرے قول پر وہ صرف ایسی حاجت کے لئے نکلتے جس میں معتکف بے بس ہو۔ اس سے اعتکاف لازم نہیں آتا باوجود اس کے کہ اسے لغوی معنی پر محمول کرنا ممکن ہے۔ یا نفلی اعتکاف پر، جو اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حتى يصلي الصبح : یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لیلۃ القدر ہے۔ یہ قول ابن ملکؒ کا ہے۔

فاذا صلى الصبح وجد دابته على باب المسجد فجلس عليها ولحق بباديته : ایک نسخہ میں "باديته" ہے۔ رواہ ابوداؤد یعنی ضمرہ بن عبداللہ بن اُنیس عن ابیہ کی سند سے، اور اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہے۔ اس کی حدیث اس وقت صحیح ہوتی ہے جب تحدیث کی صراحت ہو۔ اس حدیث کی اصل مسلم میں بشر بن سعید کی سند سے ہے، جیسا کہ پہلی فصل میں گزر چکا ہے۔ اس قول کو میرکؒ نے صحیح سے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

شب قدر متعین نہیں ہے

۲۰۹۵: عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ خَرَجْتُ لِاُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ فَالْتَمِسُوْهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲٦٧/٤۔ حدیث رقم ۲۰۲۳۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نکلے تاکہ ہمیں شب قدر کی خبر دیں۔ پس دو شخص مسلمانوں میں سے جھگڑے پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کے بارے میں بتاؤں۔ پس فلاں اور فلاں جھگڑے پس شب قدر کی پہچان اٹھالی گئی ہوسکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ پس تم انتیسویں میں اور ستائیسویں میں اور پچیسویں میں شب قدر کو تلاش کرو۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **عن عبادة بن الصامت، قال خرج النبی ﷺ لیخبرنا بلیلة القدر فتلاحی**: ''حاء'' کے ساتھ۔ یعنی لڑائی جھگڑا۔ **رجلان من المسلمین**: کہا گیا ہے وہ دونوں عبداللہ بن ابو حدرد اور کعب بن مالک تھے۔ یعنی دونوں میں تنازعہ ہوگیا۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ تنازعہ قرض پر تھا۔ عبداللہ کا قرض دوسرے پر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آدھا قرض معاف کرنے کا حکم دیا۔ اس نے معاف کر دیا۔ یہ قول ابن حجرؒ کا ہے۔ **فقال خرجت لأخبرکم بلیلة القدر فتلاحی فلان وفلان فرفعت**: صیغہ مجہول کے ساتھ، یعنی میرے لئے اس کا تعین تھا۔ اور مجھ سے جھگڑنے والوں کی وجہ سے بھلا دیا گیا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ لیلۃ القدر بذات خود اٹھالی گئی، جیسا کہ بعض شیعہ کا وہم ہے، اور یہ اس قول کے بھی منافی ہے جو آگے آرہا ہے **فالتمسوها**۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی پہچان (اس کا وقت) اٹھالی گئی ہے۔ جس کی طرف احادیث کی نسبت ہے۔

وعسی أن یکون: ابہام ہے۔ طیبی ؒ کہتے ہیں: الوقع۔ ابن حجرل کہتے ہیں: ''رفعها'' لیکن اس میں ابہام ہے۔ **خیرًا لکم**: اس لحاظ سے کہ وہ تمہیں تمام دن اور راتوں کو اس کی جستجو پر ابھارے گا اور یہ تمہیں غرور، تعجب، دکھلاوا اور ریاکاری سے بچائے گی۔ اس سے سبکی نے استنباط کیا ہے کہ جو اس رات کو پالے، تو سنت یہ ہے کہ اسے ظاہر نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِسے اپنے نبی کے لئے مقدر کیا ہے، اور آپ ﷺ کو اس کی خبر نہیں دی، جو کچھ آپ کے لیے مقدر کیا گیا۔ ان تمام میں خیر ہے اور اس میں آپ ﷺ کی پیروی کرنا مستحب ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس قول کو لینے میں رکاوٹ ہے جیسا کہ پہلے گزرا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر مطلع نہیں ہوئے۔ اور کہا گیا: یہ اسی رات میں تھا، پھر آپ ﷺ کو بھلا دیا گیا، جو آپ ﷺ بھول گئے گویا اس پر مطلع نہ تھے، چونکہ آپ ﷺ نہیں بھولے بلکہ اس کا علم بعینہٖ ایسے ہی جیسے بیان ہوا۔

اس بحث میں یہ کہنا کہ آپ ﷺ اس کی ذات پر مطلع نہیں ہوئے بہت بڑی جرأت ہے، آپ ﷺ پہلے اور آخر میں کہاں

سے پتہ چلا۔ پھر استنباط اور قیاس کی وجہ سے عدم اطلاع سے بلکہ اس کی معرفت میں نسیان ہے، مگر اطلاع کے مقدر ہونے پر متابعت ظاہر ہے یہ استنباط اور قیاس پر موقوف نہیں ہے، لیکن اس میں خدشہ ہے کہ جب اپ کو بھلانے کے ساتھ چھپا دی گئی، یا بتلانے کے بعد حکم کو چھپانا ہے۔ تو پھر مطلع نہ ہونے کی وجہ سے اس کو قطعی طور پر اس کا تعین کیسے ہے؟ کشف کا طریقہ ظنی ہے۔ اس کے ظاہر ہونے کی علامات کی وجہ اس میں غیر قطعی ہے، اس احتمال کے ساتھ اس سال میں ہو سکتی ہے۔ اس وقت اس کی خبر اور اخفاء برابر ہے۔ اسی وجہ سے ''سبکی'' نے کہا۔ اس کا چھپانا سنت ہے، شاید اسی وجہ سے اس نے یہ معنی مراد لیا ہے۔ واللہ اعلم

فالتمسوها : اس کو تلاش کرنے میں انتہائی کوشش کرو، شاید کہ تم اُسے پالو۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کے وقوع کو تلاش کرنا اس کی ذات کے علم کے اٹھائے جانے کے منافی نہیں ہے۔

اس بحث میں ہے کہ اس کے وقوع کو تلاش کرنا معین نہیں ہے۔ جس طرح یہ مخفی نہیں کہ اس کے وقوع کا تصور اس کا التماس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کا وقوع عدم التماس کی وجہ سے باہم مختلف نہیں ہے۔ پھر نبی ﷺ کا کہنا ''التمسوها'' یہ اس عینی (ذات) پر اٹھائے جانے کے منافی ہے۔ اس کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں، کہنے والوں کی یہ بات صحیح نہیں۔ تاکہ اس قول سے فیصلہ ہو سکے ''فلا ینا فی رفع علم عینها۔ آپ اس پر غور کریں۔

یہ بار بار کرنے کے مترادف ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ طیبی ؒ نے بھی اس کی پیروی کی ہے، وہ بھی اس بات میں واقع ہوئے جس میں وہ واقع ہوا۔ طیبی ؒ کہتے ہیں: یہ بھی ایک قول ہے کہ لوگوں کی مخاصمت کی وجہ سے لیلۃ القدر کی معرفت اٹھا لی گئی۔ میں کہتا ہوں: کہ اس کی نسبت کی تقدیر اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا وقوع اور حصول گزر چکا ہے۔

اگر وہ شب حاصل ہو جائے تو ''رفع'' کا کوئی معنی نہیں۔ ممکن ہے یوں کہا جائے: اس کے رفع سے ماد اس کا واقع ہونا مشروع ہے، تو جب انہوں نے جھگڑا کیا، تو وہ اٹھالی گئی تو اس کا مشروع ہونا اس کے وقوع کی جگہ ہے اس وجہ سے اس کے بعد آپ ﷺ کا قول ہے: ''فالتمسوها''، یعنی اس کا واقع ہونا تلاش کرو نہ کہ اس کی معفت۔ شاید درست وہ ہے جس کی تعبیر ''لعل'' کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ یوں کہا جائے: کہ وہ بذات خود اٹھالی گئی، یہ عقلاً اور نقلاً حق کے خلاف ہے جب کہ مخاصمت کسی چیز کی معرفت کے بھول جانے میں سبب ہے۔ یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی چیز کے وقوع کے اٹھائے جانے کا سبب ہے۔ اسی طرح جب اس کا وقوع مشروع ہے، پھر اس کو اٹھالیا گیا' یہ نہیں ہوگا۔ کہ آپ اس سے بھول گئے باوجود اس کے کہ اس کا مشروع وقوع کی جگہ پر ہے۔ اس سے اس کا معنی واضح نہیں ہوتا، پھر شرع کرنے وعالے کا یہ کہنا: ''ومن ثم عقبه بقوله فالتمسوها'' یعنی اس کا وقوع تلاش کرو نہ کہ اس کی معرفت' یہ صحیح نہیں اصلاً، آپ اس پر غور کریں۔ (فی التاسعة : یعنی باقی رہنے والی وہ انتیسویں رات ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: مہینے کا آخر سے ''التاسعة'' یہ اکیسویں رات ہے۔ السابعة و الخامسة : اس پر بحث گزر چکی ہے۔

رمضان شریف کا اہتمام کرنے والے کو مزدور کے ساتھ تشبیہ دی ہے

۲۰۹۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرِيْلُ فِيْ كَبْكَبَةٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدِهِمْ يَعْنِيْ يَوْمَ فِطْرِهِمْ بَاهٰى بِهِمْ مَلَائِكَتَهُ فَقَالَ يَا مَلَائِكَتِيْ مَا جَزَاءُ اَجِيْرٍ وَفّٰى عَمَلَهُ قَالُوْا رَبَّنَا جَزَاءُهُ اَنْ يُوَفّٰى اَجْرُهُ قَالَ مَلَائِكَتِيْ عَبِيْدِيْ وَاِمَائِيْ قَضَوْا فَرِيْضَتِيْ عَلَيْهِمْ ثُمَّ خَرَجُوْا يَعُجُّوْنَ اِلَى الدُّعَاءِ وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكَرَمِيْ وَعُلُوِّيْ وَارْتِفَاعِ مَكَانِيْ لَاُجِيْبَنَّهُمْ فَيَقُوْلُ اِرْجِعُوْا قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ وَبَدَّلْتُ سَيِّئَاتِكُمْ حَسَنَاتٍ قَالَ فَيَرْجِعُوْنَ مَغْفُوْرًا لَهُمْ۔ (رواه البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۱۳۵/۳ حديث رقم ۳۱۱۷۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت شب قدر ہوتی ہے جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی جماعت کے ساتھ اترتے ہیں۔ ہر بندے کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں کھڑا ہو یا نماز پڑھتا ہو یا طواف کرتا ہو یا کسی اور عبادت میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر مشغول ہو۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہو اور جس وقت ان کی عید (یعنی عید الفطر) کا دن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے اپنے فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے یعنی ان فرشتوں سے جنھوں نے بنی آدم پر طعن کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے فرشتو! اس مزدور کا کیا بدلہ ہے جس نے اپنا کام پورا کر لیا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! اس کا بدلہ یہ ہے اس کے عمل کی مزدوری پوری دی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے فرشتو! میرے غلاموں اور میری لونڈیوں نے میرا فرض ادا کیا جو ان پر تھا۔ یعنی روزہ پھر وہ اپنے گھروں سے عیدگاہ کی طرف دعا کے ساتھ نکل چلتے ہوں۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت کی اور اپنی بزرگی کی اور اپنی سخاوت کی اور اپنی بلند قدری کی اور اپنی بلند مرتبہ کی۔ البتہ میں ان کی دعا قبول کروں گا پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں پھر اپنے گھروں کو تو جاؤ تحقیق میں نے تم کو بخش دیا اور تمہاری برائیوں کو میں۔ نے نیکیوں سے بدل ڈالا ہے اور تمہارے نامۂ اعمال میں ہر برائی کے بدلے نیکی لکھی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگ پھرتے ہیں (واپس آتے ہیں عیدگاہ سے) اس حالت میں کہ ان کی بخشش ہو جاتی ہے۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

تشریح: وعن أنس رضی الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ اذا كان ليلة القدر نزل جبريل عليه الصلاة وسلام في كبكبة : دوضموں کے ساتھ۔ ایک قول یہ ہے کہ دونوں فتحہ کے ساتھ۔ جماعت جو لوگوں کی بھیڑ وغیرہ پر مشتمل ہو۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔ من الملائكة : اس بات کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بھی اشارہ ہے: تنزل الملائكة والروح روح سے مراد (جبریل آمین) ہیں۔ اور اس کا تعلق تخصیص کے ساتھ ہے، اس کی عظمت کی وجہ سے۔ اس سے پہلی حدیث اور اس کے بعد آنے والی آیت میں کوئی تعارض نہیں۔ يصلون على كل عبد : یعنی تمام بندوں کے لئے

مغفرت کی دعا کرتے ہیں، یا ہر بندے کی اچھی تعریف کرتے ہیں۔قائم : جیسے نماز پڑھنے والا اور طواف وغیرہ کرنے والا۔أو قاعد یذکر الله عز وجل : یہ "کل" کی صفت ہے۔فاذا کان یوم عیدهم : یعنی جب ان کے سرداروں اور غلاموں کے جمع ہونے کا وقت آتا ہے۔یعنی یوم فطرهم : عیدالاضحیٰ سے احتراز کیا ہے۔با هي : یعنی اللہ تعالیٰ۔بهم الملائكته : نہایہ میں ہے کہ "مباهاة" کا معنی فخر ہے۔اس کا سبب انسان کا ان عبادات کے ساتھ اختصاص ہے، جو قیام اللیل، راتوں کو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس جیسی دوسری عبادات ہیں۔اور اس پر فرشتوں کا رشک ہے۔پھر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کے سامنے فخر کرنا، جنہوں نے بنی آدم پر طعن کیا تھا، تو یہ اس کی قدرت کے اظہار اور احاطۂ علم کا بیان ہے۔

فقال یا ملائکتي : یہ اضافت فرشتوں کی تکریم کے لئے ہے۔ما جزاء أجیر وفي : تشدید اور تخفیف کے ساتھ۔(عمله قالوا ربنا : حرف ندا کی وجہ سے منصوب ہے۔جزاءه ان یوفي : صیغہ مجہول کے ساتھ، تشدید اور تخفیف دونوں طرح۔اجره : یعنی "اجر عمله" منصوب ہے۔ایک قول کے مطابق مرفوع ہے۔ایک نسخہ میں "توفی" مخاطب کے صیغہ کے ساتھ ہے۔قال ملائکتي : حرف نداء کے حذف کے ساتھ۔عبیدی و امائي : ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ "أمة" کی جمع یعنی لونڈی۔قضوا : یعنی اداء کر دیا۔(فریضتي : یعنی جو خاص الخاص میلے ہے، اور شاق روزہ ہے۔علیهم ثم خرجوا : اپنے گھروں سے عیدگاہ کی طرف۔

یعجون : عین کے ضمہ اور کسرہ، جیم مشدد۔یعنی اپنی آوازوں اور ہاتھوں کو بلند کرتے ہیں۔ الی الدعاء : یعنی اپنی آوازوں کو ذکر اور ثناء کے ساتھ بلند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہمہ جہت متوجہ ہو کر وہ اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔وعزتي : یعنی میری ذات کی قسم۔وجلالي : یہ بھی صفت ہے۔وکرمي : کسی فعل پر۔وعلوي : تمام میں۔ارتفاع مکاني : یعنی میرا مکان، میری مرتبہ جس کا تعلق مری قدرت اور میرے ارادے سے ہے، جو نقصان اور حوادث زمان و مکان سے پاک ہے، یہ تسبیح ہے تحمید کے بعد اور پاکیزگی ہے بزرگی کے بعد۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ارتفاع مکان اس کی عظمت اور اس کی بلند سلطانی سے کنایہ ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ تو مکان سے منزہ ہے، اور اس سے جو اس کی طرف علو اور سفل کی نسبت کی جاتی ہے۔یہ عطف تفسیری ہے اور تجھ پر جو درست بات ہے وہ مخفی نہیں۔تأسیس تاکید سے زیادہ اولیٰ ہے۔

لأجیبنهم : یعنی میں ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔فیقول : یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ارجعوا : اپنے نماز پڑھنے کی جگہوں سے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ، یا اپنے رب کی رضا کی طرف لوٹو۔فقد غفرت لکم : یعنی تمہاری غلطیاں۔بدلت سیئاتکم حسنات : یہ تمہارے نامہ اعمال میں برائی کے بدلے نیکی لکھی جاتی ہے، یہ اس بلند، بادشاہ اللہ کی طرف سے فضل عظیم ہے۔اس میں احتمال ہے کہ یہ روزہ داروں کے لئے عام ہے یا نافرمانوں کے لئے بخشش ہے، اور توبہ کرنے والے فرمانبرداروں کے لئے برائیاں نیکیوں میں تبدیل ہوتی ہیں۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے: ﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ [الفرقان : ۷۰]۔اس لیے رابعہ عدویہ کہتی ہیں: سخاء کی جماعت میں سے آدمیوں کے لئے تاج ہے۔میرے نیکیوں کا بدل جانا تمہاری نیکیوں سے زیادہ ہے، یہ اس بات کی

علامت ہے کہ جو اس سے کثرت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، توبہ اور سیدھا راستہ اختیار کرنے سے پہلے۔ قال: نبی ﷺ نے فرمایا: فیرجعون: وہ سارے کے سارے اس حال میں پلٹتے ہیں۔ مغفوراً لهم: اس میں عظیم اشارہ اور بہت بڑی بشارت ہے کہ انکی غلطیاں معاف کر دی گئیں، اور نیکیاں قبول ہو چکی ہیں، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر انسان مغفرت کا محتاج اور توبہ ورجوع کا ضرورت مند ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتُوبُوٓا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ [النور: ۳۱] ''اور (مؤمنو!) سب خدا کے آگے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔

بَابُ الِاعْتِكَافِ

لغت میں اعتکاف سے مراد کسی جگہ ٹھہرنا، اور اپنے آپ کو وہاں قید کر لینا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ [البقرة : ۱۷۸] وقولہ عز وجل: ﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ﴾ [البقرة : ۱۲۵] وقولہ سبحانہ: ﴿يَعْكُفُوْنَ عَلٰى اَصْنَامٍ لَّهُمْ﴾ [الأعراف : ۱۳۸] یعکفون، کاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔

شریعت میں اعتکاف سے مراد کسی خاص شخص کا خاص صفات کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنا ہے۔ ایک گھڑی کے لئے بھی اعتکاف صحیح ہے، جیسے نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنے والا ہے۔ یا آخرت کے کسی کام میں مصروف ہونے والا۔ یا دنیا کے کسی کام کے لئے اعتکاف کی نیت کرنے والا۔ ایک دفعہ نکلنے کے بعد دوبارہ داخل ہونے والا تجدید نیت کرے گا۔ یہ ہمارے اصحاب میں سے امام محمدؒ کا قول نفل اعتکاف کے بارے میں ہے۔ جب آدمی مسجد میں داخل ہو تو کہے: جب تک میں مسجد میں رہوں گا' اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔

قدوری کہتے ہیں: اعتکاف مستحب ہے۔ صاحب ہدایہ کہتے ہیں: صحیح بات یہ ہے کہ سنت مؤکدہ ہے۔ ابن ہمام کہتے ہیں: صحیح بات ان دونوں قولوں کے خلاف ہے اور وہ یہ ہے: اعتکاف کی تقسیم واجب کی طرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ نذر مان لے تنجیزا یا تعلیقا۔ اور تقسیم ہوتی ہے سنت مؤکدہ کی طرف، اور یہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہے۔ ان دونوں کے سوا مستحب ہے۔

الفصل الاول:

رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرنے کی آپ ﷺ کی عادت مبارکہ

۲۰۹۷: عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ اعْتَكَفَ اَزْوَاجُهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۲۷۱/٤۔ حديث رقم ۲۰۲٦۔ ومسلم في صحيحه ۸۳۱/۲ حديث رقم ۱۱۷۲/٥۔ وابوداوٗد في السنن ۸۲۹/۲ حديث رقم ۷۹۰۔ والترمذي ۱٥۷/۳ حديث رقم ۷۹۰۔ وابن ماجه ٥٦۲/۱ حديث رقم ۱۷۷۳۔ واحمد في المسند ۲۸۱/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ نے ان کی روح قبض کر لی۔ پھر آپ ﷺ کے بعد ان کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل

کیا ہے۔

تشریح: عن عائشة رضی اللہ عنها ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الأواخر من رمضان حتی توفاه اللہ : ابن ہمام کہتے ہیں: ایک طرف آپؐ کا بغیر چھوڑے اس طرح ہمیشگی اختیار کرنا اور دوسری طرف جن صحابہ نے اعتکاف نہیں کیا ان کو ملامت نہ کرنا۔ اعتکاف کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ وگرنہ اس کے وجوب پر دلیل ہے۔ یا ہم کہتے ہیں: کہ اس کے لفظ سے ظاہر عدم ترک ہے لیکن ہمارے پاس اس کے ترک کی صریح دلیل ہے، جو بخاری و مسلم اور دیگر احادیث کتب میں ہے:

آپ ﷺ ہر رمضان اعتکاف کرتے تھے۔ جب صبح کی نماز پڑھ کر اپنی اعتکاف والی جگہ پر آئے، تو حضرت عائشہؓ نے اعتکاف کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت دیدی، تو انہوں نے اپنا خیمہ مسجد میں لگا لیا۔ حضرت حفصہؓ نے سنا، تو انہوں نے بھی اپنا خیمہ مسجد میں لگا لیا، حضرت زینبؓ نے سنا، تو انہوں نے بھی خیمہ لگا لیا۔ صبح نماز سے پلٹے تو آپ ﷺ نے چار خیمے دیکھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ کو پورا واقعہ بتلایا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو اکھاڑ دو۔ خیمے اکھاڑ دیئے گئے، پھر آپ ﷺ نے شوال کے کسی عشرے میں اعتکاف کیا۔ ایک روایت میں ہے: ”فأمر بخبائه فقوض، وترك الاعتكاف فی شهر رمضان حتی اعتكف العشر الاول من شوال. وتقدم اعتكافه فی الشهر الأوسط“۔ ثم اعتكف ازواجه : یعنی اپنے گھروں میں، اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان کے بیٹھنے کو ناپسند کیا تھا۔ اس لئے ہمارے فقہاء کہتے ہیں: عورتوں کے لئے اپنے گھروں میں اعتکاف کرنا مستحب ہے۔ من بعده : یعنی آپ ﷺ کی وفات کے بعد اس سنت کو زندہ اور اس طریقے کو باقی رکھا۔

آپ ﷺ کی سخاوت کا بیان

۲۰۹۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدُ النَّاسِ بِالْخَيْرِ وَكَانَ اَجْوَدُ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ كَانَ جِبْرِيْلُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ فَاِذَا لَقِيَهُ جِبْرِيْلُ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱٦/٤۔ حدیث رقم ۱۹۰۲۔ ومسلم فی صحیحه ۱۸۰۳/٤ حدیث رقم (۵۰۔ ۲۳۰۸)۔ والنسائی فی السنن ۱۲٥/٤ حدیث رقم ۲۰۹۵ واحمد فی المسند ۲۳۱/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے میں بڑے سخی تھے اور رمضان میں بہت سخاوت کرتے تھے اور رمضان کی ہر رات میں جبرائیل علیہ السلام ملاقات کرتے تھے نبی کریم ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے قرآن پڑھتے تھے یعنی تجوید کے ساتھ پس جس وقت جبرائیل علیہ السلام حضور ﷺ سے ملاقات کرتے تو نبی کریم ﷺ کی سخاوت اس وقت ہوا کے جھونکوں سے بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عباس قال : كان رسول اللہ أجود الناس : یعنی ہمیشہ سے۔ بالخیر : یہ جامع اسم ہے، ہر

وہ چیز جس سے نفع حاصل ہو۔وكان أجود ما يكون : أجود مرفوع ہے۔ایک نسخہ میں منصوب ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے۔ مظہرؒ کہتے ہیں: ''ما'' مصدریہ اور جمع کے لئے ہے کیونکہ افعل التفضیل کی اضافت جمع کی طرف ہوئی ہے، اس کی تقدیری عبارت یوں ہوگی: كان أجود اوقاته وقت كونهه ۔ في رمضان : بعض نحوی کہتے ہیں: ''أجود'' مبتداء ہے ''في رمضان'' اس کی خبر ہے۔ جملہ 'كان' کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے یا پھر ''أجود'' كان کا اسم اور في رمضان اس کا حال ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ وہ ہے ''حاصلاً'' مگر کسی مصدر کا وقوع لازم طور پر تقدیری ماننا پڑے گا۔ طیبی رحمہ اللہ ''ما'' کے جھگڑا کے متعلق کہتے ہیں: کہ یہ مصدریہ ہے اور وقت مقدر ہے جیسا کہ پیچھے حاجیوں کے متعلق گزر چکا ہے، اس کی تقدیر یوں ہوگی: كان أجود اوقاته وقت كونه في رمضان . ''جود'' کی نسبت اوقات کی طرف ایسے ہے جس طرح روزے کی نسبت دن کی طرف ہے۔ كان جبريل ...... : یعنی اس پر نازل ہوتے۔ كل ليلة في رمضان يعرض : ''زاءٗ'' کے کسرہ کے ساتھ، یعنی پڑھتے۔ عليه النبي ﷺ القرآن : کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ جبریل امین کو شروع سے لے کر آخر تک تجوید کے ساتھ سناتے تھے۔ اور حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرتے تھے۔ تا کہ امت کے لئے سنت طریقہ بن جائے۔ کہ شاگرد اپنے شیوخ کو قرآن سنائیں۔ انتہی کلامہ۔ یہ سیکھنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ شیخ سے سننا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: ایک دوسرے کو سکھانے کے طور پر جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ تو دوسرے پر ایک معین مقدار قراءت کرے، پھر وہ وہی قراءت تجھ پر پڑھے یا وہ اس کے بعد والا معین مقدار قراءت کرے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے۔ قراءت کے دو طریقے معلوم ہو گئے۔ واللہ اعلم

فاذا لقيه جبريل كان : یعنی نبی ﷺ۔ أجود بالخير من الريح المرسلة : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کا احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے ''المرسلة'' سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی خوشخبری جو بھیجی گی ہے وہ مراد لی ہو۔ یہ اس کی روح اور عمومی نفع کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا﴾ [المرسلات : ۱] آیت میں جو وجوہات ہیں، ان میں سے ایک ہواؤں کو بھیجنا ایک احسان اور خیر ہے، اور ''عرفاً'' کا منصوب ہونا مفعول لہ کی وجہ سے ہے، یعنی وہ سخاوت اس ہوا سے عمومی نفع اور جلدی میں تیز ہوتی۔ ان دونوں کے درمیان جامع وجہ ہے اس کی دو اقسام ہیں، لفظ خیر تمام اقسام کو شامل ہے، اس اختلاف کی بناء پر جو لوگوں سے لے کر آئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان میں سے ہر ایک پر سخاوت کرتے تھے جس سے اس کی حالت ٹھیک ہو جائے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سخاوت کی مشابہت خیر کے ساتھ اور اس کا بندوں میں پھیل جانا' ہوا کے ذرات کے ساتھ ہے، جو ملکوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اور دونوں کے اثرات مختلف ہیں، ان میں ایک مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور دوسرا مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں: آپ ﷺ کی سخاوت کی فضیلت تمام لوگوں کی سخاوت پر ہے۔ پھر رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت کی رمضان کی سخاوت کے علاوہ پر فضیلت ہے، پھر رمضان کی راتوں میں سخاوت کرنا اس سے افضل ہے۔ پھر رمضان کے تمام اوقات میں جبرائیلؑ سے ملاقات کرنا اور سخاوت کرنا اس سے افضل ہے، پھر اس کی تیز ہوا کے ساتھ تشبیہ عمومیت اور جلدی کے لحاظ سے ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں: جب وقت افضل ہو تو اس میں سخاوت کرنا بھی افضل ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سخاوت کا رمضان

میں حاصل رہنا اس کے امکانات میں سے ہے اور کیونکہ آپ ﷺ کی طبع ہی سخاوت پر تھی، آپ ﷺ باقی فانیات سے مستغنی تھے۔ جب کوئی چیز ملتی اُسے سخاوت کر دیتے اور واپس آ جاتے، جب کوئی چیز نہ ملتی تو وعدہ کرتے اور وعدے کی خلاف ورزی نہ کرتے۔ رمضان کا زمانہ دوسرے زمانے کی نسبت نیکیوں کے موسم کے لئے زیادہ مناسب ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس مہینے میں خصوصی فضل فرماتا ہے، جو دوسرے زمانے میں نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے طریقے کی پیروی کا ارادہ کیا، اسی وجہ سے اچانک انہیں وحی سے اچانک ملاقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہے۔ اسی لئے دن اور رات سخاوت کو عام کرتے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کشادگی کی جگہ مٹھاس اور بشاشت محسوس کرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اللہ کی نعمتیں لوٹاتے، جو اللہ نے اس پر انعام کی ہے، گویا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر ہے۔ فتأمل۔ شیخ جزری کہتے ہیں: اس حدیث کو بخاری، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: شاید کہ امام مسلم نے اس کے ہم معنی روایت کیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: اگر تیرے دل میں خیال آئے کہ اس حدیث کو ذکر کرنے کی باب کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ میں کہتا ہوں: کہ سخاوت کرنے کی انتہاء حالت اعتکاف ہوتی ہے، اس لیے کہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ مذاکرہ کا افضل وقت آخری عشرہ تھا، اور آپ ﷺ اس عشرہ میں اعتکاف بیٹھتے تھے۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں گزر چکا ہے۔ مصنف اور شارح کہتے ہیں: اعتکاف کی تاکید آخری عشرے میں ہے، کیونکہ اس میں بہت بلند درجات ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سخاوت اس عشرے میں بہت زیادہ کرتے تھے، یہ آپ کی طبع حالت اعتکاف میں ہوتی تھی۔ شارح سے یہ بہت دور کی مناسبت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس نے کہا: میں کہتا ہوں: افضل فرشتے کا افضل خلیفہ کے پاس آنا اور افضل کلام، افضل متکلم کی طرف سے اور افضل اوقات میں تو اس کے مناسب یہی ہے کہ افضل جگہ ہو۔

اسی طرح شیخ کی اصل (کتاب) میں بھی ہے۔ صحیح بات کہ افضلؒ اوقات کی وجہ سے ہے۔ میں کہتا ہوں: صحیح بات وہ ہے جس کو شیخ نے ذکر کیا ہے۔ آپ اس پر غور کریں۔ پھر شیخ نے کہا: اور ان کا قول کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف افضل متکلم ہونے کی نسبت ہے، اس لحاظ سے سنگین غلطی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو افضل کے ساتھ متصف نہیں کر سکتے۔ تو وہ کلام افضل کی طرف سے کیسے ہوگا؟

میں کہتا ہوں: اگر اللہ تعالیٰ کو ''افضل متکلم'' کے متصف کرنے کا عدم جواز معنی کے اعتبار سے ہو تو ممنوع ہے اور توقیف کے لحاظ سے ہو تو درست ہے لیکن علماء کی جماعت نے اس جیسے قول کو جائز قرار دیا ہے، جیسے غزالیؒ وغیرہ۔ تو اس وقت اس جیسے اقوال پر طعن کرنا درست نہیں' تو اس وقت اس قبیل سے ہوگا: أحسن الخالقين، أرحم الراحمين. مقام مشاکلت اس بات کا متقاضی ہے، کہ عبارت اچھی ہو۔ رہا ان کا یہ کہنا: ''فكيف من افضل''. یہ ان کی غلطی ہے، جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ من تبعیضیہ ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ ''اتیان'' کے متعلق ہے، اس کا معنی ہے ''من عند افضل متكلم'' جو اپنے بھائی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعتکاف کا معمول

۲۰۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ یُعْرَضُ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً فَعُرِضَ عَلَیْهِ مَرَّتَیْنِ فِی الْعَامِ الَّذِیْ قُبِضَ وَكَانَ یَعْتَكِفُ كُلَّ عَامٍ عَشْرًا فَاعْتَكَفَ عِشْرِیْنَ فِی الْعَامِ الَّذِیْ قُبِضَ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاري في صحيحه ۴۳/۹۔ حديث رقم ۴۹۹۸۔ وابوداؤد في السنن ۸۳۲/۲ حديث رقم ۲۴۶۶۔ وابن ماجه ۵۶۲/۱ حديث رقم ۱۷۶۹۔ والدارمي ۴۳/۲ حديث رقم ۱۷۷۹ واحمد في المسند ۳۳۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہر سال قرآن پڑھا جاتا تھا۔ یعنی جبرائیل علیہ السلام نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے سال میں ایک بار قرآن پڑھتے تھے ۔ پس جس سال نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے وفات پائی اس سال آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے دو بار قرآن پڑھا گیا اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہر سال دس دن اعتکاف کرتے تھے جس سال وفات پائی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابی هریرة قال : كان يعرض : مبنی علی المجہول ہے۔ ایک نسخہ میں معلوم کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ بعض شارحین کہتے ہیں: ایسا فعل ہے جس کے فاعل کا نام علم کی وجہ سے نہیں ذکر کیا گیا۔ یعنی "جبريل كان يعرض". على النبی ﷺ القرآن كل عام مرة : یعنی ختم کرتے تھے۔ فعرض :قرآن پیش کیا۔ عليه : یعنی نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر۔ مرتين في العام الذی قبض : یعنی جس سال آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فوت ہوئے۔ ہمارے اصول میں "فيه" اصل حدیث سے نہیں ہے۔ پھر حدیث کی یہ مقدار۔ میرکؒ کہتا ہے: متفق عليه، اور اس حدیث کو نسائی اور ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: حدیث کے ظاہر سے یہی دلالت ہے کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر ہی پیش کیا گیا، جس سال فوت ہوئے اور اس کے علاوہ دوسرے سالوں میں بھی۔ ایک روایت ہے: ان زيد بن ثابت شهد العرضة الأخيرة التي عرضها رسول الله ﷺ في العام الذي توفي فيه. اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو قلب پر محمول کیا جائے گا، تاکہ پچھلی حدیث کے موافق ہو جائے۔

تمام احادیث کو جمع کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ قراءت کرنا اور سننا وسنانا جبرئیلؑ اور آپ کے درمیان تھا۔ ایک مرتبہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پڑھتے ایک مرتبہ جبریل امین پڑھتے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔

پہلا احتمال اور یہ زیادہ واضح ہے۔ جبریل امین قرآن کا بعض حصہ پڑھتے، پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بعینہ اس کو دہراتے حفظ اور ضبط کی غرض سے۔ دوسرا احتمال: ان میں ایک دس آیات پڑھتا پھر دوسرا اسی طرح پڑھتا۔ یہ قراء کرام کے ہاں معروف طریقہ ہے، جو ہم نے کہا اس کی تائید بعض روایات میں ہے۔ نہایہ میں ہے: كان يعارضه القران، یعنی میں نے اس کو پیش کی۔ واللہ اعلم۔ و كان : یعنی اکثر۔

يعتكف كل عام عشرا : رمضان کے آخری عشرہ میں۔ فاعتكف عشرين : "عین" اور "راء" کے کسرہ کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں دونوں پر فتحہ ہے اور یہ تثنیہ کی وجہ سے ہے۔ في العام الذی قبض : یعنی جس سال فوت ہوئے۔ شاید کہ آخری

سال کی طرف اضافت اسی وجہ سے ہے، اور اعتکاف آپ ﷺ کی قرب وفات کی نشانیوں میں سے تھا۔ اور امت کے لئے تنبیہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے آخر میں نیک اعمال کثرت سے انجام دے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کے سامنے کھڑے ہونے کی بڑھ چڑھ کر تیاری کرے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ ہر عشرہ میں ختم کیا۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، اور مولف نے پہلی حدیث اور اس کو ایک ہی کر دیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ دو حدیثیں ہیں۔ پہلی متفق علیہ اور دوسری صرف امام بخاری کی ہے۔ یہ قول جزری کا ہے۔

مسائل اعتکاف کا بیان

۲۱۰۰: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِذَا اعْتَكَفَ اَدْنٰى اِلَيَّ رَأْسَهُ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَأُرَجِّلُهُ وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ اِلَّا لِحَاجَةِ الْاِنْسَانِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۷۳/٤۔ حدیث رقم ۲۰۲۹۔ ومسلم فی صحیحه ۲٤٤/۱ حدیث رقم (۱۹۷۰٦) والترمذی فی السنن ۱٦۷/۳ حدیث رقم ۸۰٤۔ وابن ماجه ٥٦٥/۱ حدیث رقم ۱۷۷٦۔ واحمد فی المسند ۲٦٤/٦۔

ترجمه: حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اعتکاف کرتے تھے تو اپنا سر میرا نزدیک کرتے تھے اور وہ مسجد میں ہوتے تھے تو میں ان کے کنگھی کر دیتی اور گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر انسانی حاجت کے لیے۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ اذا اعتكف أدنى : یعنی قریب کرتے۔ الى رأسه : ابن الملکؒ کہتے ہیں: اپنا سر مسجد سے میرے حجرے میں نکالتے۔ وهو في المسجد : حال تاکید کے لئے ہے۔ فأرجله : الترجیل، بالوں کو درست کرنا اور یہ سر میں کنگھی کا استعمال ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کوئی مسجد سے اپنے سر کا بعض حصہ نکالے اس کا اعتکاف باطل نہ ہوگا۔ اور اسی لئے معتکف کے لئے کنگھی مباح ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: اگر مسجد میں کسی برتن میں اپنا سر دھوئے جس سے مسجد میں کیچڑ نہ ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ وكان لايدخل البيت : یعنی معتکف ہونے کی حالت میں گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ الا لحاجة الانسان : یعنی بول وبراز کے لئے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: کہ اسی پر وہ چیزیں بھی قیاس ہوں گی، جہاں پر انسان بے بس ہوتا ہے، جیسے کھانے پینے کی اشیاء میں کہتا ہوں: یہ قیاس فاسد ہے، کیونکہ ان دونوں کے برخلاف کھانے پینے کا تصور مسجد میں ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: یعنی کھانے پینے اور بول وبراز کے لئے یہ آپ ﷺ کے فعل اور مذہب حنفیہ کے بھی خلاف ہے۔ ابن خطابی کہتے ہیں: کہ معتکف پر بول وبراز کے علاوہ نکلنا ممنوع ہے، اور اسی طرح یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ گھر میں داخل نہیں ہوگا، اگر وہ اپنا سر اس میں داخل کرے تو حانث نہیں ہو گا۔ اور اسی طرح یہ مسئلہ ہے کہ حائضہ کا بدن پاک ہے۔ یہ قول طیبی ؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ شاید کہ اس لئے بعض روایتوں میں وارد ہے، کہ وہ حائضہ تھیں، لیکن اس روایت میں اس پر دلالت نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے: ”أنها كانت

تناول النبی ﷺ الخمرة وهو معتكف وهي حائض". قاموس میں ہے: "خمرة" وہ چٹائی جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے، اور دھاگے کے ساتھ اس کو باندھا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چٹائی ہے، جس کی اتنی مقدار کہ نماز پڑھنے والا سجدہ کرے، یا اس سے تھوڑی سی بڑی ہوتی ہے۔ اگر اس سے بڑی ہو جس پر آدمی کا پورا جسم آ جائے وہ حصیر کہلاتی ہے۔ حدیث میں ہے: "اتيت بخمرة" یعنی سترة.

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: اصحاب ستہ نے عائشہؓ سے اس حدیث کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔

اپنی نذروں کو پورا کرو

۲۱۰۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ اَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ قَالَ فَاَوْفِ بِنَذْرِكَ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٢٧٤/٤۔ حدیث رقم ٢٠٣٢۔ ومسلم فی صحیحه ١٢٧٧/٣۔ حدیث رقم (٢٧۔ ١٦٥٦) وابوداؤد فی السنن ٦١٦/٣ حدیث رقم ٣٣٢٥ والترمذی ٩٦/٤ حدیث رقم ١٥٣٩۔ والنسائی ٢٠/٧ حدیث رقم ٣٨٢٠۔ واحمد فی المسند ٣٧/١۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ میں ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن ابن عمر، أن عمر سأل النبی ﷺ قال كنت نذرت فی الجاهلية: یعنی عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جس طریقے پر تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ جاہلیت سے مراد وہ زمانہ ہے جو اسلام کے ظہور سے پہلے تھا۔ اور عمرؓ نے اسلام کے بعد نذر مانی تھی لیکن قریش کی تکالیف کی وجہ سے اسے پورا کرنا ممکن نہ ہوا اور انہوں نے اس سے روک دیا۔ (أن أعتكف ليلة: یعنی ایک دن رات کا اعتکاف۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

فی المسجد الحرام؟ قال فأوف بنذرك: ایک روایت میں "وصم" روزہ رکھ کے الفاظ ہیں۔ امر مندوب کے لئے ہے، اگر ان کی نذر اسلام سے پہلے تھی۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: حدیث ہمیں یہ راہنمائی دیتی ہے کہ اگر جاہلیت کی نذر اسلام کے حکم کے موافق ہو تو اُسے پورا کرنا واجب ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: اسلام کے بعد یہ موقف امام شافعیؒ کا ہے۔ ابوحنیفہؒ کہتے ہیں: اس کی نذر صحیح نہیں۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ جس نے کفر میں قسم اٹھائی، پھر اسلام لانے کے بعد حانث ہو گیا، اس پر کفارہ لازم ہے، اور یہ شافعیؒ کا مذہب ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی دلیل ہے کہ اعتکاف صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط نہیں ہے۔ اگر اس نے نذر مانی کہ مسجد حرام میں اعتکاف بیٹھے گا، تو وہ کسی اور جگہ اعتکاف بیٹھنے سے اپنے نذر سے نہیں نکل سکتا۔

آخری بحث محل نظر ہے روزے کے متعلق جو جواب ہے شمنیؒ کہتا ہے: حضرت عمرؓ کا اعتکاف اس کو ابوداؤد، نسائی اور

دار قطنی نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: **ان عمر جعل علی نفسه ان یعتکف فی الجاهلیة لیلة أو یومًا عند الکعبة فسأل النبی ﷺ فقال اعتکفه وصم**" نسائی اور دار قطنی کے الفاظ یہ ہیں: "**فأمره ان یعتکف ویصوم**". ابن ہمام کہتے ہیں: صحیحین میں اسی طرح ہے۔ "**عن عمر أنه جعل علی نفسه ان یعتکف یوما فقال أوف بنذك**" دونوں روایتوں میں جمع اس طرح کہ رات میں دن بھی شامل ہے اور دن میں رات بھی شامل ہے اور اس روایت میں "صوم" کے ذکر پر سکوت ہے اور تحقیق ثقہ راویوں کی روایت کو قبول کرنا واجب ہے۔ اسی سے ابن حجرؒ کا قول باطل ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا عمر رضی اللہ عنہ کو رات کے اعتکاف کا حکم دینا صریح امر ہے اس پر کہ انہوں نے صحت اعتکاف کے لئے "صوم" کو شرط قرار نہیں دیا۔

شمنیؒ کہتے ہیں: آپ جان لیں! کہ اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط ہے، جو اعتکاف واجب ہے، یہ ایک روایت میں ہے۔ اور نفلی اعتکاف میں روزہ کے شرط ہونے کی روایت حسن کی امام ابوحنیفہؒ سے ہے اور جو اصل کی روایت ہے، وہ امام محمد کا قول ہے، بلکہ کہا گیا ہے: کہ تینوں ائمہ سے منقول ہے کہ روایت کے ظاہر ہے، روزہ شرط نہیں ہے، چونکہ نفل کی بنیاد آسانی پر ہے۔ جو روایت میں ہے اس کو اس بات پر محمول کی جائے گا، کہ روزہ معتکف پر واجب نہیں، اگر وہ اپنے آپ پر واجب کر لے، تو پھر روزہ رکھنا ہوگا۔ یہ ابن حجرؒ نے آپ ﷺ کے اس قول سے کیا "**فاوف**" یعنی مندوب کے لئے نہ وجوب کے لئے۔ کافر کی نذر صحیح نہیں۔

رہا شارح کا قول تو انہوں نے بخاری کے شارح کرمائیؒ کی تقلید کی ہے۔ اس میں انہوں نے فقہ سے ثابت کیا ہے، کہ اگر جاہلیت کی نذر اسلام کے حکم کے موافق ہو، اس پر عمل کیا جائے گا، اور اسلام کے بعد اُسے پورا کرنا واجب ہے۔ اور کافر کی قسم منعقد ہوتی ہے اور اس کا ظہار صحیح ہے، اور کفارہ لازم آتا ہے، ان دونوں کا مذہب ضعیف ہے، جو نذر کے مسئلہ کی طرف منسوب ہے اور اس کا مابعد صحیح نہیں۔ چونکہ ان کے قیاس کی بنیاد اس ضعیف پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نذر اور آخری دو باتوں میں فرق ہے۔ قسم اور ظہار عبادات میں سے نہیں ہیں۔ اس نے دونوں کو جو صحیح کہا ہے' وہ نذر کے خلاف ہے یہ عبادت ہے اس کا کرنا صحیح نہیں۔

الفصل الثانی:

آپ ﷺ کے اعتکاف کا ذکر

۲۱۰۲: عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْتَکِفُ فِی الْعَشْرِ الْاَ وَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَلَمْ یَعْتَکِفْ عَامًا فَلَمَّا کَا نَ الْعَا مُ الْمُقْبِلُ اعْتَکَفَ عِشْرِیْنَ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۶/۳ حدیث رقم ۸۰۳۔ واحمد فی المسند ۲۰۱/۲۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری دس دن میں اعتکاف کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے ایک سال کسی عذر کی وجہ سے اعتکاف نہیں کیا اور جب آئندہ سال آیا تو بیس دن اعتکاف کیا۔ (ترمذی)

تشریح: عن أنس قال : کان النبی ﷺ یعتکف فی العشر الأواخر من رمضان فلم یعتکف عاما : شاید یہ عذر کی وجہ سے تھا۔

فلما کان العام المقبل : اقبال سے اسم فاعل ہے۔(اعتکف عشرین) شاید یہ حدیث پچھلی حدیث کی تفسیر ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب نفل جن کا وقت مقرر ہو، اگر فوت ہو جائیں تو ان کی قضاء دی جائے گی جس طرح فرائض کی قضا ہے ظاہر یہ ہے کہ تشبیہ صرف فوت ہونے کے بعد قضا کے ساتھ ہے۔ لیکن فرائض کی قضاء فرض ہے، اور نفل کی قضاء نفل ہے۔

۲۱۰۳: ورواہ ابو داود وابن ماجۃ عن ابی بن کعب ۔

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۲/ ۸۳۰ حدیث رقم ۲٤٦۳۔ وابن ماجه ۱/ ٥٦۲ حدیث رقم ۱۷۷۰۔

ترجمہ: ابن ماجہ نے اس روایت کو ابی بن کعب سے روایت کیا ہے۔"

آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا اعتکاف میں بیٹھنے کا طریقہ

۲۱۰۴: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْـ ... الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ فِىْ مُعْتَكَفِهٖ ۔ (رواہ ابو داود وابن ماجة)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/ ۸۳۱ حدیث رقم ۱۱۷۳/٦۔ وابو داؤد فی السنن ۲/ ۸۳۰ حدیث رقم ۲٤٦٤۔ والترمذی ۳/ ۱٥۷ حدیث رقم ۷۹۱۔ والنسائی ۲/ ٤٤ ... رقم ۷۰۹۔ وابن ماجه ۱/ ٥٦۳ حدیث رقم ۱۷۷۱۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ...یت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اعتکاف کرنے کا ارادہ کرتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھتے پھر اپنے اعتکا... کی جگہ پر داخل ہوتے۔ اس کو ابوداوٗدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعن عائشة قالت : کان رسول اللہ ﷺ اذا اراد ان یعتکف : یعنی جب دن کے شروع حصے میں نیت کرتے، اور رات مسجد میں گزارتے۔ **(صلیٰ الفجر، ثم دخل فی معتکفه :** صیغۂ مفعول یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ پر۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس پر دلالت ہے کہ اعتکاف کی ابتداء شروع دن سے ہوگی۔ اسی طرح اوزاعیؒ اور ثوریؒ نے کہا ہے۔ اور لیث کا بھی دو قولوں میں سے ایک قول ہے اور چاروں ائمہ کہتے ہیں' وہ غروب شمس سے پہلے داخل ہوگا، اگر اس کا ارادہ مہینے یا دس دن کا ہو۔ انہوں نے حدیث کی تاویل کی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم **معتکف** میں داخل ہوئے' لوگوں سے اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا کر لیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں لوگوں سے الگ تھلگ تھے یعنی ایسی جگہ پر جہاں سے لوگوں کو نظر نہ آئیں، جیسا کہ حدیث میں ہے: "**انه اتخذ فی المسجد حجرۃ من حضیر**". یہ مراد نہیں کہ اعتکاف کی ابتداء دن میں تھی۔

جزریؒ کہتے ہیں: یہ حدیث متفق علیہ ہے اسی طرح چاروں نے اس حدیث کو مفصل ذکر کیا ہے۔ زیادہ مناسب تھا ان کو صحاح میں ذکر کیا جائے۔ میرکؒ کہتا ہے: اس حدیث کو بخاری ومسلم، ترمذی اور نسائی نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ صاحب مشکوۃ

سے یہ اعتراض ختم ہو گیا۔ میں کہتا ہوں: صاحب مشکوۃ پر یہ اعتراض باقی ہے، کہ حدیث متفق علیہ ہونے کے باوجود ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ کی طرف نسبت کی ہے۔

اعتکاف کی حالت میں مریض کی عیادت کی جاسکتی ہے

۲۱۰۵: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَيَمُرُّ كَمَا هُوَ فَلَا يُعَرِّجُ يَسْأَلُ عَنْهُ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۸۳۶/۲ حديث رقم ۲۴۷۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (جب حاجت کے لیے نکلتے تھے تو اعتکاف کی حالت میں) بیمار کو پوچھتے تھے اور بیمار آدمی مسجد سے باہر ہوتا اور اس کو اس طرح پوچھتے جس طرح گزرنے والا پوچھتا ہے' ٹھہرتے نہیں تھے۔ یہ ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **وعنها** : یعنی حضرت عائشہؓ سے۔(**قالت : كان النبي ﷺ** : جب کسی حاجت کے لئے نکلتے، جیسے باقی حدیث دلالت کر رہی ہے۔**یعود المریض وهو معتكف** :یعنی جو مریض مسجد سے باہر ہوتا' یہ آپؐ کے قول سے بھی پتہ چل رہا ہے۔**فیمر كما هو** :طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کاف' محذوف مصدر کی صفت ہے، اور''ما'' موصولہ ہے،لفظ ''هو'' مبتداء ہے، اور خبر محذوف ہے، اور جملہ''ما'' کا صلہ ہے،یعنی **یمر مرورا مثل الهيئة التي هو عليها**، وہ ادھر اُدھر مائل نہیں ہوتا، اور نہ کہیں رکتا ہے۔**فلا یعرج** : یہ مجمل کا بیان ہے یعنی ٹھہرتے۔ کیونکہ **تعریج اقامة** ہے، اور راستے سے ایک جانب ہٹنا ہے۔

یسأل عنه : اس قول کا بیان ہے۔اور ایک نئے راستے کی طرف پلٹنا ہے۔حسن اور نخعی کہتے ہیں: معتکف کے لئے نماز جمعہ، عیادۃ مریض اور نماز جنازہ کے لئے جانا جائز ہے۔چاروں ائمہ کے ہاں جب قضائے حاجت کے لئے نکلے، تو عیادت مریض اور میت پر جنازہ کے لئے ان سب کا اتفاق ہے لیکن راستہ سے نہ ہٹے۔نماز کی مقدار (وقت) سے زیادہ نہ ٹھہرے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا، اگر اس سے زیادہ عرصہ ٹھہرا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے اور حدیث میں نماز جنازہ کی صراحت نہیں انہوں نے اسے عیادت مریض پر قیس کیا ہے، چونکہ اس پر اجماع ہے کہ وہ دونوں فرض کفایہ ہیں، لیکن دونوں میں فرق ہے کیونکہ عیادت بغیر رکے ممکن ہے، بخلاف نماز جنازہ کے اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کے ہاں نماز جنازہ پڑھنے سے اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا، یہ قول صاحبین کے خلاف ہے۔

میرکؒ کہتے ہیں: اس کی سند میں لیث بن ابوسلیم ہے، اس سے چاروں اصحاب نے اور امام مسلم نے روایت کیا ہے، اور یہ ثقہ ہے بعض نے اس کے سوء حفظ کے متعلق کہا ہے۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس روایت کو ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔لیکن بعض نے اس کے ثقہ ہونے کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔اس کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے، لیکن اس کو اس روایت سے تقویت مل جاتی ہے، جو مسلم کی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے: "**ان كنت لأدخل البيت للحاجة وفيه المريض فما أسأل عنه**۔

الا و أنا مارة"۔

محظوراتِ اعتکاف

۲۱۰۶: وَعَنْهَا قَالَتِ السُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَّا يَعُوْدَ مَرِيْضًا وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ الْمَرْأَةَ وَلَا يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ اِلَّا لِمَا لَابُدَّ مِنْهُ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اِعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۲/۸۳۶ حديث رقم ۲۴۷۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ معتکف کے لیے ضروری ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے اور نہ نماز جنازہ کے لیے حاضر ہو۔ یعنی مسجد سے باہر نہ جائے مطلقاً اور نہ صحبت کرے۔ عورت سے اور نہ عورت سے مباشرت کرے اور نہ کسی کام کے لیے مسجد سے باہر نکلے مگر ضرورت کے لیے یعنی پیشاب پائخانہ وغیرہ کے لیے اور اعتکاف روزے کے بغیر نہیں ہوتا اور اعتکاف جامع مسجد کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وعنها : حضرت عائشہؓ سے ہی یہ روایت ہے۔ قالت السنة : ابن ملکؒ کہتے ہیں: یعنی دین اور شریعت ہے۔ زیادہ واضح معنی یہ ہے کہ لازم طریقہ ہے۔ علی المعتكف : شمنیؒ کے الفاظ ہیں: "مضت السنة على المعتكف" یعنی ایسا اعتکاف جس کی نذر مانی ہو۔ أن لا يعود مريضا : یعنی قصداً اور ٹھہرنے کی نیت کر کے۔ ولا يشهد جنازة : یعنی مسجد سے اسی کام کے لئے نکلنا۔ ولا يمس المرأة : یعنی شہوت کی نیت سے۔ ولا يباشرها : اس سے مجامعت نہیں کرے گا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "مس" سے مراد مجامعت ہے اور بالاتفاق اعتکاف کے لئے مبطل ہے، رہا مباشرت جو بغیر شہوت کے ہو تو ایک قول پر اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اور دوسرے قول پر باطل نہیں ہوگا، یہ قول امام مالکؒ کا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے اگر انزال ہو تو باطل ہو جائے گا اگر انزال نہ ہو تو باطل نہیں ہوگا۔ ہمارے مذہب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

ولا يخرج لحاجة : خواہ دینی ہو یا دنیاوی۔ (الا لما لابد منه : ایسی حاجت جس سے جدا ہونا مشکل ہو اور نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، جیسے بول و براز وغیرہ ان دونوں کو مسجد میں کرنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے انہوں نے کھانے پینے کے علاوہ اس حاجت کے لئے نکلنے پر اتفاق کیا ہے یا ایسا معاملہ جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو یہ قضائے حاجت سے کنایہ ہے اور جو اس کے بعد استنجاء اور طہارت وغیرہ کرتے ہیں۔ ولا اعتكاف : کہا گیا ہے کہ اس کا اعتکاف مکمل اور فضیلت والا نہ ہوگا، یہ قول طیبی رحمہ اللہ کا ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا اعتکاف صحیح نہ ہوگا۔ (الا بصوم : ابن ملکؒ کا بھی یہی قول ہے، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا یہی موقف ہے۔

اس کی تائید ان احادیث سے ہوئی ہے جن کو ابن ہمامؒ نے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کو دار قطنی اور بیہقی نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا ہے: "قال رسول الله ﷺ ولا اعتكاف الا بصوم"۔ دوسری وہ حدیث جس کو بیہقی نے ابن عمرؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: "أنها قالا : المعتكف يصوم"۔ مؤطا امام مالکؒ میں ہے: أنه بلغه عن

القاسم بن محمدؒ ونافع مولى ابن عمر قالا لا اعتكاف الا بصوم" لقوله تعالىٰ ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ [البقرة: ۱۸۷]۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو روزے کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ یحییٰ نے کہا ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں: ہمارے نزدیک بھی یہی حکم ہے کہ اعتکاف صرف اور صرف روزے کے ساتھ ہے۔ شمنیؒ کہتے ہیں: آپ ﷺ سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے بغیر روزے کے اعتکاف کیا ہو۔ اگر کہا جائے کہ صحیحین میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے شوال کے پہلے عشرے میں اعتکاف کیا، تو اس میں صراحت نہیں کہ آپ ﷺ روزے کی حالت میں تھے یا بغیر روزے کے تھے۔

"عشر" کا اطلاق نو پر بھی ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: عشر الحجہ کا روزہ رکھا اور رمضان کے آخری عشرے کے روزے رکھے اور کبھی مہینہ انتیس کا ہوتا ہے۔ اس پر کوئی دلالت نہیں کہ یوم عید جملہ عشر سے ہے، جس کا روزہ حرام ہے۔ **ولا اعتكاف الا في مسجد جامع**: یعنی جس میں لوگ جماعت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

شمنیؒ کہتے ہیں: اعتکاف کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ جامع مسجد ہو اس کا مؤذن اور امام بھی ہو۔ اس میں پانچ وقت کی نماز یا بعض نمازیں جماعت کے ساتھ اداء ہوتی ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے: اعتکاف جامع مسجد میں ہی صحیح ہے، جس میں پانچ نمازیں باجماعت اداء ہوں یہ قول امام احمد کا ہے۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں: اس قول کو بعض مشائخ نے صحیح قرار دیا ہے۔

قاضی خان کہتے ہیں: ایک روایت میں ہے کہ اعتکاف صرف جامع مسجد میں ہی ان کے نزدیک صحیح ہے۔ یہ حدیث کا ظاہر ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کہتے ہیں: ہر مسجد میں صحیح ہے۔ یہی قول امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے اس قول کے اطلاق کی وجہ سے ہے: ﴿ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ امام ابوحنیفہؒ کی دلیل طبرانی کی روایت جو معجم میں ہے: "عن ابراهيم النخعي ان حذيفة قال لابن مسعود لا تعجب من قوم بين دارك ودار أبي موسى يزعمون أنهم معتكفون : قال لعلهم اصابوا وأخطأت او حفظوا ونسيت. قال أما أنا فقد علمت أنه لا اعتكاف في المساجد التي في الدور"۔ ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے اپنی اپنی مصنف میں بیان کیا ہے: "عن علي قال لا اعتكاف الا في مسجد جماعة"۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں: بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: "ان ابغض الامور الى الله تعالى البدع، وان من البدع الاعتكاف في المساجد التي في الدور" اس سے پہلے حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت گزر چکی ہے۔ ابن جوزی نے حضرت حذیفہؓ سے بیان کیا ہے: "أنه قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول: كل مسجد له امام ومؤذن فالا عتكاف فيه يصح"۔ ابن حجرؒ نے عجیب بات کی اور کہا ہے کہ امام شافعیؒ اور ان کے متبعین نے اس کا جواب دیا ہے، کہ جامع کا ذکر اولویت کے لیے ہے اختلاف سے بچنے کے لئے ہے۔ پھر تو جانتا ہے کہ وارد احادیث بالاتفاق نکلنے کی علت کو بیان نہیں کرتیں، ۔ پھر افضل اعتکاف مسجد حرام میں، پھر مسجد نبوی ﷺ میں، پھر مسجد اقصیٰ، پھر مسجد جامع میں۔ ایک قول یہ ہے کہ جس میں نماز باجماعت اداء کی جاتی ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اپنی مسجد میں افضل ہے، تاکہ نکلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر ہر اس مسجد میں جس

کی آبادی اکثر ہو۔

جزریؒ کہتے ہیں: اس روایت کو ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن اسحاق عن زہری، عن عروۃ عن عائشہ کی سند سے بیان کیا ہے۔ عبد الرحمٰن کے علاوہ دوسرے یہ الفاظ نہیں کہتے: "قالت السنة"۔ نسائی نے یونس کی سند سے روایت کیا ہے لیکن اس میں سنت کے الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح مالکؒ کی سند سے سنت کے لفظ کے بغیر ہے۔ عبدالرحمٰن نے سنت کا لفظ زیادہ کیا ہے، اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ثقہ کی زیادتی مقبول ہے۔ میرکؒ نے اس کو صحیح سے نقل کیا ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں: عبدالرحمٰن بن اسحاق کے متعلق اگرچہ بعض نے کلام کیا ہے، لیکن امام مسلمؒ نے ان سے روایت بیان کی ہے۔ ابن معین نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے، اور بعض نے ان کی تعریف کی ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: انہوں نے کہا ہے کہ جن سے بخاری و مسلم روایت کریں یا کوئی ایک روایت کرے تو طعن کرنے والے خواہ کتنے ہی ہوں، ان کو نہیں دیکھا جائے گا۔ یہ قول اس پر حجت ہے چونکہ لفظ سنت اس کی طرف سے زیادتی ہے، اور یہ زیادتی مقبول ہے، تو اس کا سنت ہونا ثابت ہوگیا، اور وہ مرفوع کے قائم مقام ہے۔ رہا شارح کا قول کہ ان مذکورات سے ان کا ارادہ اگر سنت ہے اور اس کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، تو یہ نصوص ہے، جس کی مخالفت جائز نہیں، یا اگر فتویٰ ہے، جس کو سنت سے تعبیر کیا گیا ہے تو ان کی بعض صحابہ نے مخالفت کی ہے اور جب صحابہؓ کسی مسئلہ میں اختلاف کریں، تو وہ محل نظر ہے۔ یہ اصول میں مقرر قاعدہ سے غفلت ہے کہ سنة کذا مرفوع کے حکم ہے۔ واللہ اعلم

الفصل الثالث:

اعتکاف کی حالت میں چارپائی پر بیٹھنے کا ثبوت

۲۱۰۷: عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اعْتَكَفَ طُرِحَ لَهٗ فِرَاشُهٗ اَوْ يُوْضَعُ لَهٗ سَرِيْرُهٗ وَرَاءَ اُسْطُوَانَةِ التَّوْبَةِ۔

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۵٦٤/۱ حدیث رقم ۱۷۷٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جب آپ ﷺ اعتکاف کرتے تھے تو آپ ﷺ کے لیے ستونِ توبہ کے پیچھے بچھونا بچھایا جاتا یا آپ ﷺ کی چارپائی رکھی جاتی تھی۔ اس کو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: عن ابن عمر عن النبی ﷺ أنه کان اذا اعتکف طرح: صیغہ مجہول کے ساتھ، یعنی کوئی چیز رکھی جاتی یا بچھائی جاتی۔ له فراشه أو یوضع له سریره: یہ بات ظاہر ہے کہ "او" نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔ وراء اسطوانة التوبة: ایک صحیح نسخہ میں "سین" کے بدلے "صاد" ہے۔ یہ مسجد نبوی کے ستونوں میں سے ہے اس کا یہ نام اس لئے ہے کہ ابولبابہؓ نے اس کے پاس توبہ کی تھی۔

معتکف کا قیام

۲۱۰۸: وعن ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ هُوَ يَعْتَكِفُ الذُّنُوْبَ وَيَجْرِیْ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا۔

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱/ ۵٦٧ حديث رقم ۱۷۸۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ﷠ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے حق میں ارشاد فرمایا کہ وہ گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے لیے تمام نیکیوں کے کرنے والے کی طرح نیکیاں جاری کی جاتی ہیں ۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

وعن ابن عباس أن رسول اللہ ﷺ قال في المعتكف : یعنی اس کے متعلق کہا۔ **وهو** :ایک نسخہ میں اکیلا ''هو'' ہے۔ **يعتكف الذنوب** :نزع خافض کی وجہ سے منصوب ہے۔ ان لمحات کے دوران وہ گناہوں سے رک جاتا ہے۔ جو اپنے آپ کو مسجد میں روک لیتا ہے، وہ اکثر گناہ کرنے سے بچ جاتا ہے، اسی لئے اعتکاف کو مسجد کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ **ويجری** : جیم اور ''راء'' کے ساتھ۔ **له من الحسنات** :یعنی ان کا ثواب۔ **كعامل الحسنات** :یعنی اس پر عمل کرنے کے اور ایک صحیح نسخہ میں جیم اور ''زاء'' مجہولہ کے ساتھ۔ یعنی ان نیکیوں کا اجر جو اعتکاف کی وجہ سے وہ انجام نہیں دے سکتا۔ جیسے مریض کی عیادت، نماز جنازہ، دوستوں و بھائیوں کی زیارت کے لئے جانا، اور اس کے علاوہ دوسرے نیکی کے کام۔ ''الحسنات'' لام عہد کے لئے ہے۔ **''كلها''** :معہود کی تاکید کے لئے ہے۔